وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (الحجر:۲۲)

تفسیرِ کبیر

مُصنّفہ

حضرت مرزا بشیر الدّین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثّانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد نہم

سُورتہائے الشّمس، الّیل، الضّحٰی، الم نشرح، التّین، العلق، القدر

البیّنہ، الزّلزال، العادیات، القارعہ، التّکاثر، العصر، الھمزۃ

+++

نظارت نشر و اشاعت قادیان

نام کتاب : تفسیر کبیر جلد نہم۔دہم
تصنیف لطیف : حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ
سن اشاعت : فروری رتبلیغ 2004
باہتمام : نظارت نشر و اشاعت قادیان
تعداد : 2000 (دو ہزار)
مطبع : پرنٹ ویل امرتسر

ISBN- 81-7912-051-1

نوٹ : تفسیر کبیر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے اس کے چار ایڈیشن ربوہ اور لندن سے شائع ہو چکے ہیں۔ایک عرصہ سے ہندوستان میں تفسیر کبیر کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ازراہ شفقت مکمل سیٹ کو پانچ جلدوں میں قادیان سے شائع کرنے کی منظوری عنایت فرمائی ہے۔الحمدللہ۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے ہر لحاظ سے مبارک اور بابرکت کرے اور لوگوں کے ایمانوں کو جلا بخشنے کا باعث ہو۔آمین۔

ناظر نشر و اشاعت قادیان

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ —— نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

خُدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

هُوَ النَّاصِرُ

تفسیر پارہ عَمَّ کے متعلق کچھ

یہ تفسیر قرآن کریم کے آخری پارہ کی ہے۔ پچھلے سال نصف اول شائع کیا گیا تھا نصف ثانی میں سے آدھا حصہ اب شائع کیا جا رہا ہے بقیہ حصہ آئندہ شائع کیا جائے گا۔ پانچ سورتوں کا مضمون تیار ہے دوسرا حصہ خدا تعالیٰ چاہے تو جلد تیار ہو جائے گا۔

پارہ عَمَّ کی تفسیر کی طباعت کے لئے مَیں نے دس ہزار روپیہ دیا ہے اور یہ پارہ اس رقم سے شائع کیا جائے گا۔ یہ رقم اور اِس کا منافع بطور صدقہ جاریہ میری مرحومہ بیوی مریم بیگم اُمِّ طاہر غَفَرَاللّٰهُ لَهَا وَاَحْسَنَ مَثْوٰهَا کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے لئے وقف رہے گا اور اِس کی آمد سے قرآن کریم، احادیث اور سلسلہ احمدیہ کی بعض کتب جو تائیدِ اسلام کے لئے لکھی جائیں شائع کی جاتی رہیں گی اور اِس کا انتظام تحریکِ جدید کے ماتحت رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اِس صدقہ جاریہ کو مرحومہ کے درجات کی بلندی اور قُربِ الٰہی کا موجب بنائے۔

خاکسار

مرزا محمود احمد

۱۲/۱۹۴۷ ۲۵

الفہرست

سُوْرَۃُ الشَّمْسِ مَکِّیَّۃٌ

سُورۃ الشمس۔ یہ سورۃ مکی ہے [1]

وَهِيَ خَمْسَ عَشْرَةَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور بسم اللہ کے سوا اِس میں پندرہ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

[1] یہ سورۃ مکی ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے نَزَلَتْ بِمَكَّةَ۔ کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی ایسی ہی روایت ابن الزبیرؓ سے بھی ہے۔ عقبہ ابن عامر کی روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ظہر کی نماز میں سُوْرَۃُ الشَّمْسِ اور سُوْرَۃُ الضُّحٰی پڑھا کریں۔ مطلب یہ کہ اُس وقت زیادہ لمبی سورتیں نہ پڑھا کریں۔ نیز ان دونوں سورتوں کو ظہر کے وقت سے مناسبت بھی ہے (فتح البیان)

پادری ویری کے نزدیک پہلا نصف حصہ پہلے سال کا اور آخری نصف تیسرے چوتھے سال کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ آخری حصہ میں مخالفتِ انبیاء کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں چونکہ اس سورۃ کے آخری حصہ میں انبیاء کی مخالفت کا ذکر ہے اور انبیاء کی مخالفت کا ذکر اُسی وقت اور اُسی سلسلہ میں ہوسکتا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ظاہری مخالفت مکہ میں شروع ہوگئی ہو اور منظم مخالفت تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے شروع میں ہوئی ہے اس لئے سُورۃ کا یہ حصہ اُسی وقت کا ہے۔

یہ تو درست ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی زمانہ کی ہے اور بالکل ممکن ہے کہ پہلے سال کی ہو یا دوسرے سال کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیسرے سال کے ساتھ اس کا تعلق ہو لیکن ویری کا یہ قیاس کرنا بالکل لغو بات ہے کہ چونکہ اس میں مخالفتِ انبیاء کا اجمالاً ذکر ہے اس لئے آدھا حصہ پہلے نازل ہوچکا تھا اور آدھا حصہ بعد میں نازل ہُوا۔ پہلا حصہ پہلے سال میں نازل ہُوا اور دوسرا حصہ تیسرے یا چوتھے سال میں نازل ہُوا کیونکہ محض مخالفتِ انبیاء کا ذکر مخالفت کے شروع ہوجانے سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہم تو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور اس شک میں پڑنا بالکل خلاف عقل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آئندہ مخالفت کا علم تھا یا نہیں لیکن پادری ویری اور اُن کے ہم خیالوں کے نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھ کر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا اجمالی ذکر مخالفت کا بھی اُسی وقت آسکتا ہے جبکہ مخالفت کے آثار شروع ہوچکے ہوں۔ اگر یہ لوگ قرآن کریم کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو بھی انہیں یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہر شخص جو ایک نئی بات دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے وہ قدرتی طور پر اُن کے انکار کی امید بھی کرتا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ انکار کی شدت یا اس کی نوعیت کا اندازہ نہ لگا سکے مگر انکار و تردید کی امید ضرور رکھتا ہے آخر کون عقلمند یہ خیال بھی کرسکتا ہے کہ ایک شخص اپنی قوم کے عقائد کے خلاف، اُس کے مذہب کے خلاف اور اُس کے رسم و رواج کے خلاف دعویٰ کرے اور پھر وہ یہ امید رکھے کہ لوگ مجھے فوراً ماننے لگ جائیں گے۔ پس ضروری ہے کہ لوگ اُس کی بات کا انکار کریں۔ ہاں اگر وہ سچا ہو تو آخر میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے قبولیت کے آثار دیکھ لے گا۔

سورۃ الشمس مکی سورۃ ہے [1]

سورۃ الشمس کے نزول کے متعلق پادری ویری کا خیال اور اُس کا رد [2،1]

جیسا کہ میں اوپر کئی مواقع پر بیان کرچکا ہوں یہ درست ہے کہ اگر مخالفت کی تفصیلات بیان کی جائیں تو ایک حکمت ہے پر کتاب

ضرور اس امر کو ملحوظ رکھ لیتی ہے کہ وہ تفصیلات یا تو اشارے کنائے میں بیان ہوں اور یا ایسے وقت کے قریب بیان ہوں جب وہ واقعات رُونما ہونے والے ہوں تا مخالف یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں انگیخت کی گئی ہے۔ مخالفت کی انگیخت کا الزام دُور کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اگر پیشگوئی کے طور پر واقعات بیان کئے جائیں تو اُس کے الفاظ چبھنے والے نہ ہوں۔ مگر یہ امر ہم صرف تفصیلات کے متعلق تسلیم کرتے ہیں۔ محض یہ بات بیان کرنا کہ سچائی کی مخالفت ہُوا ہی کرتی ہے یہ کوئی ایسا مضمون نہیں جس سے لوگ چڑ جائیں۔ ہر روز ہر مجلس میں جب بھی صداقت کا ذکر ہو تو لوگ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر نئی صداقت کی مخالفت ہوتی ہے مگر اس سے نہ انگیخت ہوتی ہے نہ کسی کے دل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی فتنہ و فساد رُونما ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق تو پادری وہیری کو قیاس کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ کئی صدیاں اُس کے نزول کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور عقل سے اُسکے نزول کی تاریخیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ چونکہ اس میں مخالفت کا ذکر ہے اور وہ بھی آپ کی مخالفت کا نہیں بلکہ ایک گذشتہ نبی کی مخالفت کا۔ اس سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ یہ آخری حصہ اُس وقت کا ہے جبکہ آپ کی منظم مخالفت مکہ میں شروع ہو گئی تھی۔ مگر ہم یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُن کا طریقِ استدلال بالکل غلط ہے ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جو تاریخی واقعات پر مبنی ہے اور جس سے کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانی سلسلہ احمدیہ جن کا سب زمانہ تاریخی ہے آپ کو براہین احمدیہ کی اشاعت سے بھی پہلے الہام ہُوا کہ "دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اُس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا" (تذکرہ صفحہ ۱۰۴) اس الہام میں مخالفت کا ذکر ہے اور مخالفت کے مقابلہ میں خدا تعالےٰ کے زور آور حملوں کا بھی ذکر ہے لیکن ایک تو دنیا کا لفظ استعمال کر کے مفہوم کو ایسا وسیع کر دیا کہ مسلمان سمجھیں شاید عیسائیوں کا ذکر ہے اور عیسائی سمجھیں شاید مسلمانوں کا ذکر ہے۔ پھر بجائے خصوصیت سے یہ ذکر کرنے کے کہ صوفیاء بھی مخالفت کریں گے اور اکابر اور علماء بھی مخالفت کریں گے عام رنگ میں اللہ تعالےٰ نے اس مخالفت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کر دیا کہ "دنیا نے اُس کو قبول نہ کیا"۔ مگر یہ الہام آپ کو اُس وقت ہُوا جب آپ براہین احمدیہ لکھ رہے تھے اور لوگ آپ پر بڑا اعتقاد رکھتے تھے یہاں تک کہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو بعد میں شدید مخالف ہو گئے اور احمدیت کی دشمنی کو انہوں نے انتہاء تک پہنچا دیا اور جو اپنے تکبّر اور رعونت کی وجہ سے کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے انہوں نے بھی براہین احمدیہ کو پڑھ کر لکھا کہ:-

"ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا"

پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق لکھا کہ:-

"اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی، جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی گئی ہے"

پھر اس خیال سے کہ کہیں لوگ مبالغہ سمجھ کر اس رائے کو غلط نہ قرار دے دیں انہوں نے زور دیتے ہوئے لکھا کہ:-

"ہمارے اِن الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم سے کم ایک ایسی کتاب بتا دے جس میں جملہ فرقہ ہائے مخالفین اسلام خصوصاً آریہ سماج و برہمو سماج سے اس زور شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو اور دو چار ایسے اشخاص انصارِ اسلام کی نشان دہی کرے جنہوں نے اسلام کی نصرت مالی و جانی و قلمی و لسانی کے علاوہ نصرتِ حالی کا بیڑا اُٹھا لیا ہو اور مخالفینِ اسلام اور منکرینِ الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدّی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو

کہ جس کو وجودِ الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس
آکر اس کا تجربہ و مشاہدہ کرے اور اس تجربہ و مشاہدہ
کا اقوامِ غیر کو مزا بھی چکھا دیا ہو۔"
(اشاعۃ السنۃ جون۔جولائی۔اگست ۱۸۸۴ء)

اب دیکھو جس وقت دنیا تعریف کر رہی تھی، جب بڑے بڑے رؤساء اور نواب آپ سے خط و کتابت رکھتے اور آپکو دعا کے لئے لکھتے رہتے تھے، جب علماء اور عوام آپ سے عقیدت رکھتے تھے اور جب مخالفت کے دنیا میں کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہام ہوا:-

"دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اُسکو قبول نہ کیا
لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں
سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"

وہ مخالفتیں جو اب ہو رہی ہیں یا گذشتہ عرصہ میں ہو چکی ہیں اُن کا کیسا مختصر مگر مکمل نقشہ اُوپر کے الفاظ میں کھینچکر رکھ دیا گیا ہے آخر یہ غور کرنیوالی بات ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو یہ بات کس نے بتا دی تھی کہ آپ کی دنیا میں شدید مخالفت ہوگی۔ ایسی مخالفت کہ اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کو بھی سچائی کے اظہار کے لئے زور آور حملوں سے کام لینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس امر کے مدعی تھے کہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خادم ہوں۔ پس جس ہستی نے ایک خادم اور غلام کو ایسے زمانہ میں جبکہ مخالفت کا نام و نشان تک نہیں تھا اِس امر کی اطلاع دے دی کہ تیری مخالفت ہونے والی ہے۔ ویری جیسے عقلمند کو اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہستی آقا کو بھی قبل از وقت خبر دے سکتی تھی۔ مگر بوجہ اُس تعصب کے جو مسیحی پادریوں میں بالعموم پایا جاتا ہے اور بوجہ اُس مخالفت کے جو لوگوں کو اسلام سے ہے پادری ویری کے لئے یہ سمجھنا بڑا مشکل ہے کہ ابتدائی زمانہ میں ہی جب مخالفت کا کہیں وجود نہیں تھا آپ کو اس کا کیونکر علم ہو گیا۔ وہیری صاحب کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم کا سوال نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کے علم کا سوال ہے لیکن فرض کر و یہ سُورۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی ہے تب بھی اُنہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ تفصیلات کا بیشک علم نہ ہو لیکن قوم کے اعتقادات اور اُس کے رسوم و رواج کے بالکل خلاف ایک نئی بات پیش کرنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ قوم میری مخالفت کریگی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پہلی وحی کے نزول کے بعد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور اُس نے آپ سے کہا کہ تیری قوم سخت مخالفت کریگی یہانتک کہ تجھے مکہ میں سے نکال دے گی۔ تو آپ نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ لوگ میری مخالفت کریں؟ اُس نے کہا آج تک کوئی ایسا رسول نہیں آیا جس کی اُس کی قوم نے مخالفت نہ کی ہو۔ پس اگر یہ سورۃ پہلے سال کی سمجھو تب بھی ورقہ بن نوفل نے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ دنیا آپ کی مخالفت کرے گی۔ الغرض محض مخالفت کا ذکر اس امر کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ یہ سورۃ مخالفت کے قریب زمانہ کی یا خود مخالفت کے زمانہ کی ہو۔ ہاں بعض تفصیلات معینہ اس امر کی ایک غالب دلیل ہوتی ہیں کہ وہ اُس زمانہ یا اُس کے قریب کی ہیں مگر قطعی ثبوت اور حجت وہ بھی نہیں ہو سکتیں۔ بہرحال محض سورۃ کے آخری حصہ میں مخالفتِ انبیاء کا ذکر آجانے سے یہ خیال کر لینا کہ یہ حصہ تیسرے یا چوتھے سال کا ہے بالکل بعید از قیاس امر ہے۔

ہم کُلّی طور پر انکار نہیں کرتے ممکن ہے یہ سورۃ تیسرے سال کی ہی ہو مگر اس وجہ سے اسے تیسرے یا چوتھے سال کے ابتدائی حصہ کی قرار دینا کہ اس میں مخالفتِ انبیاء کا ذکر آتا ہے محض دشمنی اور عداوت کا نتیجہ ہے۔

سورۃ الشمس کے متعلق سرمیور کا خیال اور اس کی تردید

ترتیب سرمیور کہتے ہیں کہ یہ چند سورتیں یعنی سورۃ شمس اور اس سے دو پہلی اور دو بعد کی سورتیں یعنی سورۂ فجر سورۂ بلد۔ سورۂ لیل اور سورۂ ضحٰی اظہارِ خیالات کا رنگ رکھتی ہیں اور ایسی ہی ہیں جیسے کوئی شخص اپنے نفس سے باتیں کر رہا ہو۔ میور کے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے

غار حرا میں رہ کر اپنی قوم کے حالات پر جو کچھ غور کیا اور اُس کے نتیجہ میں آپ کو جو خرابیاں اپنی قوم میں نظر آئیں اور جو کچھ فیصلے آپ کے دل نے اُن دنوں میں کئے اب ان سورتوں میں آپ اُن کا اظہار کر رہے ہیں۔ یوروپین مصنفین اس قسم کے اظہار خیالات کو سیلیلوکیز SOLILOQUIES کہتے ہیں یعنی دل کے خیالات سے متاثر ہو کر خود اپنے آپ سے باتیں کرنا۔

گویا یوروپین مصنفین کے نزدیک یہ سورتیں کیا ہیں یہ وہ آہیں ہیں جو آپ کے تڑپتے ہوئے دل سے اُٹھیں، یہ وہ نالے ہیں جو قوم کی حالتِ زار پر آپ نے بلند کئے اور یہ وہ فغاں ہے جس نے حرا کی تاریکیوں میں ایک شور پیدا کیا۔ دُنیا اپنی عیاشیوں میں مبتلا تھی، لوگ اللہ تعالیٰ سے غافل و بیگانہ ہو چکے تھے اور شیطانی افعال کو وہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا چکے تھے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی حالت پر تنہائی کی گھڑیوں میں آہیں بلند کر رہے تھے، نالہ و فریاد سے ایک شور بپا کر رہے تھے، درد و کرب اور انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنے دن گذار رہے تھے اور آخر آپ کی آہیں، آپ کے نالے اور آپ کی فریادیں اِن سورتوں کی شکل میں دنیا پر ظاہر ہو گئیں۔

دشمن نے یہ بات خواہ کسی رنگ میں کہی ہو مگر ہے ایک لطیف بات۔ دشمن کی غرض تو اِن الفاظ سے یہ ہے کہ اِن سورتوں میں جن جذبات کا اظہار ہے وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے جذبات ہیں آپ اپنے دل میں جو کچھ سوچا کرتے تھے اور جن جذبات و کیفیات سے آپ گذرا کرتے تھے اُنہی جذبات و کیفیات کا آپ نے اِن سورتوں میں اظہار فرما دیا ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بھی اپنے کلام میں انسانی جذبات کو ظاہر کیا کرتا ہے۔ اگر یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جذبات تھے تو ہم اس کے معنے یہ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لئے صحیح انتخاب کیا اور ایسے شخص کو اس عظیم الشان کام کی سرانجام دہی کے لئے چُنا جس کے اپنے جذبات بھی خدا تعالیٰ کے ارادوں کے ساتھ مل گئے تھے پس ہم دشمن کی اس بات کو رد نہیں کرتے بلکہ ایک نئے نقطۂ نگاہ کے ماتحت تسلیم کر لیتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ ان سورتوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس دُکھ اور اُس درد اور اُس تألم کا اظہار کیا گیا ہے جو آپ اپنی قوم کے متعلق محسوس کرتے تھے تو یہ امر بتاتا ہے کہ کس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غلاموں اور یتیموں کی حالت کو دیکھ دیکھ کر زار ہو رہے تھے۔ کیا کیا خیالات تھے جو آپ کے دل میں پیدا ہوتے تھے اور کیا کیا جذبات تھے جو آپ کے دل میں ہیجان بپا رکھتے تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ میری قوم جب تک اپنے ان افعال میں تبدیلی پیدا نہیں کریگی وہ کبھی ترقی نہیں کر سکے گی۔ تم اسے انسانی کلام سمجھ لو۔ تم اس کلام کو بناوٹی کلام قرار دے دو بہرحال تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس انسان کے آگے آنے کی وجہ یہ ہو کہ ظلم اور استبداد کو میں برداشت نہیں کر سکتا، یتیموں اور بیکسوں کی آہ و زاری کو میں دیکھ نہیں سکتا، غریبوں اور ناداروں کے حقوق کا اتلاف کبھی جائز نہیں سمجھا جا سکتا، غلاموں پر تشدد کبھی روا نہیں رکھا جا سکتا اُس کی بڑائی اور اُس کی نیکی اور اُس کی عظمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہی حالات کو دیکھ دیکھ کر وہ حراء کی تاریکیوں کو پسند کرتا ہے، وہ دنیا سے ایک عرصہ تک جُدا رہنا پسند کرتا ہے اور پھر جب وہ دنیا کی طرف واپس آتا ہے تو اس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنے لئے مال چاہتا ہے، اس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنے لئے عزت چاہتا ہے، اِس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنے لئے حکومت چاہتا ہے بلکہ اس لئے آتا ہے کہ قوم کے گرے ہوئے طبقہ کو اُبھارے، اُنکی بُرائیوں کو دور کرے اور اُس کی اصلاح کر کے اُسے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں لا کر کھڑا کر دے۔ میور کہتا ہے یہ سولیلوکیز SOLILOQUIES ہیں یہ وہ باتیں ہیں جو انسان اپنے نفس سے کیا کرتا ہے، یہ وہ خیالات ہیں جو گہری خلوت میں انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہو جایا کرتے ہیں لیکن اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہی خیالات تھے اور اگر آپ کے قلب کی گہرائیوں میں بار بار یہی جذبات موجزن ہوتے تھے کہ ان غلاموں کو کون پوچھے گا، ان یتیموں کو کون پوچھے گا،

اِن مساکین کو کون پوچھے گا مجھے خلوت کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اُس وقت تک مجھے دم نہیں لینا چاہیئے جب تک بڑے بڑے رئیس اور سردار اپنے اِن مظالم سے توبہ نہیں کر لیتے۔ تو میں سمجھتا ہوں یہی خیالات اپنی ذات میں اتنے پاکیزہ ہیں کہ دنیا کا کوئی ہوشمند انسان آپ کی فضیلت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بہرحال دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو قرآن مجید کو خدا تعالےٰ کا کلام قرار دیا جائے یا انسان کا۔ اگر خدا تعالےٰ کا کلام مان لیا جائے تب تو کوئی اعتراض ہی نہیں رہتا لیکن اگر یہ انسان کے خیالات ہیں تو ایسے پاک نفس انسان کے خیالات ہیں جس کی پاکیزگی اور تقدس سے کوئی شخص انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس سورۃ کا تعلق دوسری سورتوں سے سمجھنے کے لئے اس امر کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ یہ پانچوں سورتیں جن کا ذکر سورتوں کی ترتیب کے سلسلہ میں پہلے کیا جا چکا ہے اپنے اندر یہ مضمون رکھتی ہیں کہ غرباء اور یتامیٰ و مساکین کی مدد کرنی چاہیئے چنانچہ سورۃ الفجر میں آتا ہے كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ پھر سورۃ البلد میں آتا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ پھر انہی اخلاق کا سورۃ شمس میں ذکر ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ پھر سورۃ الیل میں فرماتا ہے فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ اِسی طرح آتا ہے وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ پھر سورۃ الضحیٰ میں آتا ہے فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ پانچوں سورتیں آپس میں ایک گہرا تعلق رکھتی ہیں اور اِن میں زیادہ تر اخلاقِ فاضلہ پر زور دیا گیا ہے بالخصوص ایسے اخلاق پر جو قومی ترقی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں غریب، مظلوم، بے کس اور گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے اور اُن کے لئے ترقی کے وسائل اختیار کرنے کی تحریک پائی جاتی ہے۔ اِن جذبات کو خواہ دشمن محمد رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے جذبات قرار دے تب بھی ظاہر ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جن جذبات سے متأثر ہو کر اصلاح کا بیڑا اُٹھایا وہ جذبات غرباء اور یتامیٰ و مساکین کی خدمت کے تھے۔

سورۃ الشمس کا تعلق پہلی سورتوں سے

بحر محیط کے مصنف لکھتے ہیں کہ پہلی سورۃ سے اس کا تعلق یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے مکہ کی قسم کھائی تھی اب کچھ بلندیوں اور پستیوں کی قسم کھاتا ہے۔ میرے دل میں سب سے زیادہ قدر بحر محیط کے مصنف کی ہے کیونکہ تفسیر کا وہ حصہ جس سے مجھے لگاؤ ہے یعنی ترتیب سُور کا مضمون۔ اُس سے اُن کو بھی لگاؤ ہے مگر یہاں آ کر وہ بڑی پھسپھسی بات کہہ گئے ہیں یہاں پانچ سورتوں کا مضمون (جن سورتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) آپس میں بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اگر ہم سورۃ البلد کو سورۃ الشمس کے مضمون سے ملا دیں تو یہ سورۃ اگلی سورۃ سے جا ملتی ہے۔ پس اس سورۃ کی ترتیب کے متعلق تو کوئی مشکل پیش ہی نہیں آ سکتی۔ اس سے پہلی سورۃ میں بھی غرباء کی امداد کا ذکر آتا ہے اور اس سے بعد کی سورۃ میں بھی غرباء کیلئے اموال کو خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے پس کم سے کم اِن مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سورۃ ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اگر بحر محیط کے مصنف اتنی بات ہی بیان کر دیتے تو ایک معقول بات ہوتی مگر یہ کیا پھسپھسی بات ہے کہ

پہلے چونکہ مکہ کی قسم کھائی تھی اس لئے اللہ تعالےٰ نے کہا کہ آؤ اب لگتے ہاتھوں ایک اونچی اور ایک نیچی چیز کی قسم بھی کھالیں یہ محض مجبوری کی بات ہے چونکہ اُن کا ذہن اصل ترتیب کی طرف نہیں گیا انہوں نے یہ تاویل کرلی۔ بیشک جہاں تک ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز یعنی بات سے بات پیدا ہو جانے' کا سوال ہے یہ بات صحیح ہے کہ جب انسان کو ایک خیال پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی اس قسم کا دوسرا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے جب انسان کہتا ہے کہ مجھے فلاں شخص نہیں ملا تو اُس کی بیوی اور اس کے بچوں کا بھی خیال آجاتا ہے۔ پھر اُن کے وطن کا بھی خیال آجاتا ہے اور پھر اسی طرح یہ خیالات بڑھتے بڑھتے اور کئی رنگ اختیار کر لیتے ہیں پس ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ ایک سے دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ قاعدہ انسانوں کی نسبت ہے نہ کہ اللہ تعالےٰ کی نسبت۔ انسان تو چیزوں کو بُھولا ہُوا ہوتا ہے پس جب ایک چیز کا خیال کسی وجہ سے آتا ہے تو اُس کے ساتھ تعلق رکھنے والی اشیاء بھی اُسے یاد آنا شروع ہو جاتی ہیں مگر ہم اس جگہ کسی شاعر کے شعروں کے ربط پر غور نہیں کر رہے بلکہ اللہ تعالےٰ کے کلام پر غور کر رہے ہیں جو عالم الغیب ہے اور جو ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز' یا بات سے بات یاد آجانے کے قاعدہ سے بالا اور پاک ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں خانۂ کعبہ کی بنیاد کی غرض بیان کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ ہم اس شہر کی قسم کھاتے ہیں اور پھر اس شہر کو بنانے والے ابراہیمؑ کی بھی قسم کھاتے ہیں ابراہیمؑ نے یہ شہر اس لئے بنایا تھا کہ یہاں امن قائم رہے اور لوگ اللہ تعالےٰ کے نام پر اپنی زندگیاں وقف کرتے رہیں مگر تم اب کیا ہے اب اس کی یہ حالت ہے کہ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ اے محمد رسول اللہ! تجھے اس میں تنگ کرنا حلال سمجھا جاتا ہے ابراہیمؑ نے جب مکہ بنایا تو اُس وقت اُس نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ ع ۱۵) یعنی اے میرے رب! میں اس بستی کو امن کیلئے بساتا ہوں۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ ابراہیمؑ کے اپنے بچہ یعنی محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکہ میں ہر قسم کی تکالیف کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس شخص نے دعا یہ کی تھی کہ خدایا یہاں باہر سے آنے والوں کو بھی امن میسر آجائے کیا اس کا کلیجہ یہ دیکھ کر ٹھنڈا ہو سکتا ہے کہ اُس کے اپنے بچہ کو اس شہر میں ہر قسم کے مصائب کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے اگر کہو کہ ابراہیمؑ نے بے شک امن کی دعا کی تھی مگر اب ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمارے عقائد کے خلاف باتیں پھیلانا شروع کر دی ہیں اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا ازالہ کریں خواہ اس کے نتیجہ میں مکہ کا امن برباد ہی کیوں نہ ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک یہ تمہارے عقائد کے خلاف باتیں پھیلا رہا ہے اور تمہیں ان باتوں کو سُن کر اشتعال پیدا ہوتا ہے مگر کیا ابراہیمؑ کی دوسری دُعا تمہیں یاد نہیں؟ اُس نے صرف یہی دعا نہیں کی تھی کہ مکہ میں امن قائم رہے بلکہ اُس نے یہ بھی دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (البقرۃ ع ۱۵) جب اُس نے یہ دعا کی تھی تو کیا اُس کے مدنظر یہ بات تھی یا نہیں کہ ایک دن آنے گا جبکہ تم لوگ خراب ہو جاؤ گے۔ اگر تم نے خراب نہیں ہونا تھا تو کسی رسول کے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لیکن جب اُس نے ایک رسول کے آنے کی پیشگوئی کر دی تو اس پیشگوئی کے ساتھ ہی اُس نے یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ میرے بعد میری قوم خراب ہو جائے گی اور اُس وقت ایک ایسے رسول کی ضرورت ہوگی جو اُن کے عقائد کی اصلاح کرے اور اُن کی خرابیوں کو دور کرے۔ اس قسم کی خرابیاں پیدا ہونے کے بغیر وہ رسول نہیں آسکتا تھا جو يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ کا مصداق ہوتا۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ مکہ والے آیاتِ الٰہیہ کو بھول جائیں گے

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ مکہ والے کتاب الٰہی کو بھول جائینگے۔ پھر کتاب کے ساتھ حکمت کے لفظ کا اضافہ بتاتا ہے کہ ایک زمانہ آئیگا جبکہ مکہ والوں کی عقلیں ماری جائیں گی اور وہ نہایت ہی احمقانہ عقائد میں مبتلا ہو جائینگے۔ اسی طرح يُزَكِّيهِمْ کا لفظ بتاتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ مکہ والے تقویٰ سے دُور جا پڑینگے اور ضرورت ہوگی کہ ایک رسول اُن میں مبعوث ہو جو دوبارہ اُن کو ہدایت پر قائم کرے۔ پس فرمایا کہ مکہ کی بنیاد ایک وسیع نظام کے قیام کے لئے تھی جس میں روحانی، اعتقادی، سیاسی، تمدنی، عائلی، اقتصادی، علمی، بین الاقوامی، فکری اور اخلاقی تعلیمات اور انکی حکمتوں اور ضرورتوں کا بیان ہو اور صرف خیال آرائی نہ ہو بلکہ عملی طور پر انسانی فکر اور عمل اور معاملہ کی اصلاح مدنظر ہو۔ روحانی اور اعتقادی تعلیمات کا ذکر يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ میں آتا ہے۔ سیاسی، تمدنی، عائلی، اقتصادی، علمی، بین الاقوامی، فکری اور اخلاقی تعلیمات کا ذکر يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ میں آتا ہے ان تمام تعلیمات کی حکمتوں اور ضرورتوں کا بیان تعلیم الحکمۃ میں آجاتا ہے اور یہ امر کہ صرف خیال آرائی نہ ہو بلکہ عملی طور پر انسانی فکر اور عمل اور معاملہ کی اصلاح مدنظر ہو اور یہ کام عملاً کیا جائے یہ يُزَكِّيهِمْ میں آجاتا ہے۔

غرض یہ ایک بہت بڑی پیشگوئی تھی اور بہت بڑا کام تھا جو دنیا میں ہونے والا تھا۔ اس بڑے کام کے لئے ابراہیمؑ کی نسل میں ایک کامل بیٹے کی ضرورت تھی ایسے بیٹے کے بغیر یہ کام کبھی تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب ابراہیمؑ نے یہ دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا تو یہ امر ظاہر ہے کہ فِيهِمْ سے مراد اُن کی اپنی قوم تھی اور اُن کا مطلب یہ تھا کہ تو میری قوم میں ایک کامل رسول بھیجو پس ابراہیم ایک کامل بیٹے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں جس کے بغیر یہ کام تکمیل نہیں پا سکتا تھا اب اس سورۃ میں اس شخص کامل کی استعدادوں کا تفصیلی ذکر فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ فلاں فلاں استعدادوں والے ہی یہ کام کر سکتے ہیں دوسری استعدادوں والے یہ کام نہیں کر سکتے۔

اصل میں بحر محیط کے مصنف کو سورج اور چاند کے لفظوں سے شبہ ہوا ہے یا آسمان اور زمین کے الفاظ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ شاید ان الفاظ کا تعلق پہلی سورۃ سے ہے کیونکہ اس سورۃ کے شروع میں ہی وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝ کے الفاظ آگئے ہیں۔ چونکہ ابتداء میں ہی یہ الفاظ آگئے ہیں انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ ان الفاظ کا پہلی سورۃ سے تعلق ہے اور چونکہ پہلی سورۃ میں مکہ کی قسم کھائی گئی تھی اور یہاں سورج اور چاند اور آسمان اور زمین کا ذکر آتا تھا انہوں نے خیال کر لیا کہ اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ پہلے مکہ کی قسم کھائی تھی اب کچھ بلندیوں اور پستیوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ اصل مقصود اس سورۃ میں نہیں بلکہ یہ مقصود کی تفاصیل بیان کرنے کیلئے بطور امثلہ کے آئے ہیں اصل مقصود تو وہ نفس کاملہ ہے جو تقویٰ اور فجور کی راہوں سے کامل طور پر واقف ہوتا ہے اور پھر اُسے اُبھارتا چلا جاتا ہے یعنی صرف دینِ فطرت پر نہیں رہتا بلکہ دینِ شریعت کو بھی حاصل کرتا ہے۔ اس نفس کاملہ اور اُسکی استعدادوں کو آسانی سے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں بعض مثالیں بیان فرمائی ہیں مگر انہوں نے سمجھا کہ اصل مقصود سورج اور چاند ہے حالانکہ اصل مقصود سورج اور چاند نہیں بلکہ نفس کاملہ ہے۔

پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ہم والد کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اُس کے ولد کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اب یہ بتانا چاہیئے تھا کہ وہ ولد کیسا ہونا چاہیئے چنانچہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ اس کی وضاحت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جس ولد کے متعلق ہماری طرف سے یہ خبر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرے گا،

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰىهَا ۪ۙ

(مجھے) قسم ہے سورج کی اور اس کے طلوع ہو کر اونچا ہو جانے کی ۵۲

کتاب اور حکمت سکھائے گا اور لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریگا وہ کن استعدادوں کا مالک ہوگا چنانچہ اُن استعدادوں کی یہاں تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نفس کامل میں کون کون سی استعدادیں ہونی چاہئیں۔ یہ بھی بتایا ہے کہ نفس کامل دو[2] قسم کے ہوتے ہیں اور پھر اُن دونوں کی مثالیں بیان کرکے اس امر کو واضح کیا ہے کہ اس زمانہ میں کس قسم کے نفس کامل کی ضرورت ہے اور یہ کہ جب تک ایسا نفس کامل نہ آئے ابراہیمؑ کی پیشگوئی پوری نہیں ہو سکتی۔ پس نفس کامل کی مثال میں سورج اور چاند کا ذکر کیا گیا ہے نہ کہ سورج اور چاند اصل مقصود ہیں۔

شَمۡسٌ

۵۲ حل لغات۔ شَمۡسٌ کے معنے سورج کے ہوتے ہیں۔ مگر ش۔ م۔ س کے مادہ ترکیبی کے لحاظ سے شَمۡسٌ کے معنے ایسے وجود کے بھی ہو سکتے ہیں جو کسی کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن پر رکھنے کے لئے تیار نہ ہو۔ بلکہ اپنی ذات میں کامل ہو۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں شَمَسَ الرَّجُلُ۔ اِمۡتَنَعَ وَاَبٰی۔ کہ اُس نے دوسروں کو اپنے سے کم درجہ کا سمجھ کر اُن کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب گھوڑے کے لئے شَمَسَ الۡفَرَسُ کہیں تو معنے یہ ہوتے ہیں کَانَ لَایُمَکِّنُ اَحَدًا مِنۡ ظَهۡرِهٖ وَلَا مِنَ الۡاِسۡرَاجِ وَالۡاِلۡجَامِ وَلَا یَکَادُ یَسۡتَقِرُّ۔ کہ گھوڑا کسی طرح بھی قابو نہ آسکا۔ اور اُس نے کسی کو اپنی پیٹھ پر نہ بیٹھنے دیا نہ زین ڈالنے دی اور نہ لگام ڈالنے دی (اقرب) گویا شَمۡسٌ ایسے وجود کو کہتے ہیں جس کی روشنی ذاتی ہو اور اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں کی اطاعت برداشت نہ کرے یہ مفہوم اس سے نکلتا ہے کہ شَمۡسٌ کے معنے ہیں ایسا وجود جو اطاعت برداشت نہیں کرتا۔ اب جو شخص اطاعت برداشت نہیں کرتا بوجہ اس کے کہ اُس میں تکبر پایا جاتا ہے وہ تو بُرا ہے لیکن جو شخص اس لئے اطاعت نہیں کرتا کہ خدا نے اُسے پیدا ہی دوسروں کے آگے چلنے کے لئے کیا ہے وہ بُرا نہیں۔ گویا دو[2] قسم کے اِبَاء ہوتے ہیں ایک اِبَاء وہ ہوتا ہے جس میں تابع یہ کہتا ہے کہ میں دوسرے کی بات نہیں مانتا لیکن ایک اِبَاء اُس انسان کا ہوتا ہے جسے پیدا ہی بڑا بننے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک عالم کا یہ کام ہے کہ وہ فتویٰ دے اب اگر کوئی جاہل شخص اُسے کہے کہ اِس طرح فتوے نہ دو بلکہ اُس طرح دو تو وہ فوراً انکار کر دے گا اور کہیگا کہ تمہارا حق نہیں کہ میرے معاملات میں دخل دو مگر اُس کا انکار متکبرانہ انکار نہیں ہوگا۔ قرآن کریم میں بھی اِن معنوں میں اِبَاء کا لفظ استعمال ہوا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَیَاۡبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ (توبہ ع۵) اللہ تعالیٰ اپنے نور کے قائم ہو جانے کے سوا ہر دوسری تحریک سے انکار کرتا ہے یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کا انکار تکبر والا انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عربی کا محاورہ ہے بادشاہ سے کہتے ہیں اَبَیۡتَ اللَّعۡنَ۔ آپ نے لعنت کا انکار کیا ہے مطلب یہ کہ آپ ایسے شریف ہیں کہ کسی قسم کی لعنت کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔ اسی طرح کہتے ہیں رَجُلٌ اَبِیٌّ فلاں شخص ظلم اٹھانے سے انکاری ہے پس شَمۡسٌ کے معنے گو سورج کے ہیں مگر شمس کے مادہ کے اعتبار سے اس کے معنے اِبَاء کے بھی ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے اس سے مراد وہ وجود ہوگا جو

کسی کی نالوا جب اطاعت سے انکار کرے اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسا وجود جس کی قابلیتیں ہی ایسی ہیں کہ وہ کسی کی اطاعت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ خدا نے اُسے دنیا کا لیڈر بنایا ہے اس کا کام صرف یہی ہے کہ وہ دوسروں کی راہنمائی کرے اُس کا یہ کام نہیں کہ کسی کی ماتحتی اختیار کرے۔

اَلضُّحٰی: ضَحَا (یَضْحُوْ ضَحْوًا) کے معنے ہوتے ہیں کوئی چیز ظاہر ہو گئی چنانچہ کہتے ہیں ضَحَا الطَّرِیْقُ: بَدَا وَظَهَرَ۔ کہ راستہ ظاہر ہو گیا (اقرب) اور جب سورج کی روشنی زیادہ نکل آئے تو اُس وقت کو ضُحٰی کہتے ہیں (اقرب) صبح جب سورج نکلتا ہے اُس وقت کو نہیں بلکہ جب سورج دو تین نیزے اُوپر آ جائے اُس وقت کو ضُحٰی کہتے ہیں لیکن اس سے پہلے وقت کو جو طلوعِ آفتاب کا ہوتا ہے اور جس میں روشنی پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی ضَحْوَۃٌ کہتے ہیں۔ بعض نے اور زیادہ فرق کیا ہے اُن کے نزدیک سورج نکلتے وقت کو ضَحْوَۃٌ کہتے ہیں جب سورج کچھ بلند ہوتا ہے تو اُس وقت کو ضُحٰی کہتے ہیں اور پھر نصف النہار سے زوال تک کے وقت کو ضَحَاءٌ کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں سورج کو اور اُس کے ظہور اور روشنی کو۔

دنیا میں ہر چیز دو حیثیتیں رکھتی ہے ایک اُسکی ذاتی حقیقت حساب اور وزن کے لحاظ سے اور ایک اُس کی حقیقت دوسری چیزوں کی نسبت کے لحاظ سے۔ مثلاً فرض کرو ایک درخت دس فٹ اونچا ہے یہ دس فٹ قد اُس کا اصلی قد ہوگا اور بغیر دوسری چیزوں کی نسبت کے اُسے اس درخت کا اصلی قد قرار دیا جائے گا مگر ایک قد اُس کا نسبتی ہوگا۔ مثلاً ایک شخص پندرہ بیس فٹ کے ٹیلے پر چڑھ جائے تو لازماً درخت کی ساری لمبائی اُسے نظر نہیں آئے گی بلکہ بعض دفعہ اونچائی اور زاویۂ نگاہ کے مطابق اُسے وہ درخت دو فٹ کا نظر آئیگا بعض دفعہ تین فٹ کا نظر آئے گا بعض دفعہ چار فٹ کا نظر آئے گا۔ یا ایک شخص گڑھے میں ہے تو اُسے وہ درخت بہت لمبا نظر آئے گا اور دس کی بجائے تیرہ یا چودہ فٹ کا معلوم ہوگا اسی طرح اگر کوئی شخص دُور سے درخت کو دیکھتا ہے تو وہ اُسے بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ دُور سے ہم پہاڑ دیکھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ بعض دفعہ دو ہزار بعض دفعہ چار ہزار اور بعض دفعہ بیس بیس ہزار فٹ اونچے ہوتے ہیں دُور سے دیکھنے کی وجہ سے ایسے نظر آتے ہیں جیسے کوئی اونچا سا خیمہ لگا ہوا ہو۔ اسی طرح اگر درخت کے نیچے لیٹ کر اوپر کی طرف دیکھا جائے تو درخت کا بالکل اور نظارہ نظر آئے گا کسی مینار کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھو تو خواہ وہ ایک سو یا ڈیڑھ سو فٹ کا ہو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانچ سو یا ہزار فٹ کا ہے لیکن اگر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مینار کو دیکھا جائے تو وہی مینار بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ غرض ہر چیز کی ایک حقیقت ذاتی حسابی ہوتی ہے جو طبعی حالات میں نظر آتی ہے اور ایک حقیقت اُس کی دوسری چیزوں کے لحاظ سے نظر آتی ہے۔ ایک شخص ساری رات سوچتا ہے بڑے بڑے اہم مسائل پر تدبّر کرتا ہے۔ فلسفہ اور ہیئت کی باریکیوں پر غور کرتا ہے، سیاست اور اقتصاد کے بڑے بڑے نکات حل کرتا ہے، قوموں کی ترقی اور اُن کے تنزّل کے وجوہ پر غور کرتا ہے اور اسی میں اپنی تمام رات بسر کر دیتا ہے۔ صبح اُسے کوئی شخص ملتا ہے تو وہ اُن مسائل میں سے کوئی ایک بات اُس کے سامنے بیان کرتا ہے۔ اب زید جس نے ساری رات سوچ کر سَو اہم مسائل حل کئے تھے اُس کی نسبت کے لحاظ سے جو علم دوسرے شخص کو اُس سے حاصل ہوا وہ صرف $\frac{1}{100}$ تھا۔ پھر ایک اور شخص ملتا ہے اور اُس سے بھی وہ بعض مسائل کا ذکر کر دیتا ہے فرض کرو وہ اُس کے سامنے دو مسئلے بیان کرتا ہے تو اب دوسرے شخص کو جو روشنی حاصل ہوئی وہ دو فی صدی ہے گویا ایک اُس کی ذاتی روشنی ہے اور ایک اُس کی وہ روشنی ہے جو دوسرے لوگوں کے لحاظ سے ہے۔ اُس کی ذاتی روشنی تو یہ ہے کہ اُس نے سَو مسئلے حل کئے ہیں لیکن اس کی نسبتی روشنی یہ ہے کہ ایک شخص ملتا ہے تو وہ اُس کے سامنے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے، دوسرا شخص ملتا ہے تو اُس کے سامنے دو مسئلے بیان کرتا ہے، تیسرا شخص ملتا ہے تو اُسکے سامنے

۱ اَلضُّحٰی

۲،۱ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۝ۙ

اور چاند کی جب وہ اس (یعنی سورج) کے پیچھے آتا ہے ۳؎

تین مسئلے بیان کرتا ہے اور وہ اُس کی ذاتی روشنی کا اُسی قدر اندازہ لگاتے ہیں جس قدر علم اُن کو اُس شخص سے حاصل ہو چکا ہوتا ہے پھر ایک اور شخص اُسے ملتا ہے اور وہ اُس کے سامنے اُنہی مسائل کے متعلق ایک بڑی لمبی تقریر کرتا اور سَو میں سے پچاس مسئلے بیان کر دیتا ہے اب اُس کے لحاظ سے اُس کی علمی روشنی کی بالکل اور کیفیت ہوگی اور وہ اس کا اندازہ اُن پچاس مسائل سے لگائے گا جو اُسے بتائے گئے تھے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص اُسے ملتا ہے اور وہ اُس کے سامنے سَو کے سَو مسائل بیان کر دیتا ہے تو وہ اُس کے سامنے بالکل گویا عرفانی طور پر ننگا ہو جاتا ہے۔ اب وہ شخص جس کے سامنے صرف ایک مسئلہ بیان ہوا تھا وہ بھی کہتا ہے کہ فلاں نے بڑے لمبے غور کے بعد یہ بات نکالی ہے مگر وہ اس کے صرف ۱/۱۰۰ حصہ کو جانتا ہے جس کے سامنے دو باتیں بیان ہوئی تھیں وہ اس کے ۱/۵۰ حصہ کو جانتا ہے جس کے سامنے دس باتیں بیان ہوئی تھیں وہ اُس کے ۱/۱۰ حصہ کو جانتا ہے اور جس کے سامنے پچاس باتیں بیان ہوئی تھیں وہ اس کی ۱/۲ حقیقت کو جانتا ہے اور جس کے سامنے سَو باتیں بیان ہوئی تھیں وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اُس کی ساری حقیقت کو جان لیا مگر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ اُس نے اُس سے پہلی رات بھی غور کیا ہوتا ہے اُس سے پہلی رات بھی غور کیا ہوتا ہے اور اُس سے پہلی رات بھی غور کیا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ خود بھی کئی باتیں بظاہر بھول گیا ہوتا ہے اور اُسے اپنی حقیقت کا اَب بھی پورا علم نہیں رہتا لیکن خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کے اندر کیا کیا حقیقتیں پیدا ہو چکی ہیں۔

درحقیقت ہر انسان میں ایک ملکہ ظہور ہوتا ہے اور ایک اُس کے اندر بالقوۃ طاقتیں ہوتی ہیں۔ اگر تم سے کوئی پوچھے کہ تم اُردو کے کتنے الفاظ جانتے ہو اور تم گننے لگو تو تم پچاس ساٹھ یا سو سے زیادہ الفاظ شمار نہیں کر سکو گے لیکن اگر تمہارے سامنے کوئی کتاب رکھ دی جائے تو تم کہو گے کہ میں یہ الفاظ بھی جانتا ہوں اور وہ الفاظ بھی جانتا ہوں تو ذہنی قابلیتوں کا انسان خود بھی اندازہ نہیں کر سکتا کجا یہ کہ وہ دوسرں کی قابلیتوں کا اندازہ لگا سکے۔ تم سورج کے سامنے مختلف درجہ کی صفائی کی چیزوں کو رکھ دو تو گو ان سب پر سورج کی پوری روشنی ہی پڑے گی مگر صفائی کے مختلف مدارج کی وجہ سے ہر چیز کے لحاظ سے اُس کی روشنیاں بالکل الگ الگ ہوں گی حالانکہ سورج کی ذاتی روشنی تو ایک ہی ہے۔ اسی طرح لیمپ کی ایک تو وہ روشنی ہے جو اُس کے اندر جلنے والے تیل کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے وہ ایک ہی درجہ کی ہے لیکن ایک وہ روشنی ہے جو مختلف چیزوں پر پڑ کر اپنے حجم اور اپنی وسعت کو بدلتی چلی جاتی ہے۔ یہی مضمون اس جگہ بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالشَّمْسِ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں سورج کو وَضُحٰهَا اور اُس کی اس روشنی کو جو اُس کی ذاتی روشنی ہے۔

۳؎ حل لغات۔ تَلَا فُلَانًا (تُلُوًّا) کے معنے ہیں تَبِعَهٗ۔ اُس کا پورا تابع ہو گیا (اقرب) اس آیت کی مفسرین نے مختلف تشریحات کی ہیں بعض نے کہا ہے کہ اتباع کے یہ معنے ہیں کہ جس وقت سورج ڈوبے معاً اُس کی جگہ چاند روشنی دینے لگے اور یہ مہینہ کی پہلی پندرہ تاریخوں میں ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ تابع کے معنے یہ ہیں کہ سورج کی سب روشنی اور نور اُس نے لے لیا اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ چاند پورا ہو جائے یعنی چودھویں پندرھویں سولھویں تاریخوں کا چاند۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب سورج چڑھے اُس وقت یہ ساتھ چڑھے تو یہ تَلٰهَا ہے۔ یعنی جب چاند بالکل نظر نہیں آتا یعنی مہینہ کی آخری دو راتیں۔ قتادہ کہتے ہیں اس سے مراد وہ دن ہیں جب چاند ہلال ہوتا ہے

تَلٰهَا

قرار کہتے ہیں کہ اس کے معنے ہیں کہ چاند سورج سے روشنی لیتا ہے۔ جہاں تک ہلال کے معنوں کا سوال ہے وہ تو بالبداہت غلط ہیں کیونکہ یہاں قمر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور چاند کو قمر اُسوقت کہتے ہیں جب وہ ہلال نہیں رہتا۔ باقی معنوں میں سے اُس کے پورا ہونے کے معنے زیادہ صحیح ہیں کیونکہ چودھویں رات کے چاند میں یہ دونوں مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر بھی سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ہی چڑھتا ہے اور سورج کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے اور روشنی کے لحاظ سے بھی وہی پورا تابع ہوتا ہے یعنی پوری سورج کی روشنی وہی لیتا ہے پس ان معنوں کو دوسرے معنوں پر ترجیح حاصل ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ہم شہادت کے طور پر قمر کو بھی پیش کرتے ہیں یعنی ایک ایسے وجود کو جس میں روشنی اخذ کرنے اور اُس کو اپنے اندر جذب کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے مثلاً شیشہ ہے اُس میں روشنی جذب کرنے کا مادہ ہوتا ہے یا سفید پانی ہے اُس میں بھی روشنی کو جذب کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے یا مثلاً ابرک کے ٹکڑے ہیں ان میں بھی روشنی جذب کرنیکا مادہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں روشنی جذب کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ ہمارے سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اُس پر سورج کی روشنی پڑ رہی ہوتی ہے مگر ہم اُسے یہ نہیں کہتے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ ایسا نہ ہو کہ ہم اندھے ہو جائیں۔ لیکن اگر وہی روشنی کسی شیشہ کے ذریعہ آنکھوں پر پڑے تو خطرناک نقصان پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ جب شیشہ کی چمک آنکھوں پر پڑتی ہے تو بینائی ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سارا دن سورج چمکتا ہے گھاس پر اُس کی روشنی پڑتی ہے تو انسان اُسے دیکھ دیکھ کر لطف اُٹھاتا ہے لیکن مصر میں بڑے بڑے ریت کے میدان ہیں چونکہ موٹی ریت میں چمکنے کا مادہ ہے اور ہر چمکدار چیز اپنی روشنی کو اپنے مقابل کی طرف بھی پھینکتی ہے ان میدانوں میں سے گذرتے ہوئے بعض لوگ ایک منٹ میں اندھے ہو جاتے ہیں مصر میں ایسے سینکڑوں اندھے پائے جاتے ہیں جن کی آنکھیں بالکل اچھی تھیں مگر وہ کسی ایسے ہی ریت کے میدان میں غلطی سے چلے گئے اور اندھے ہو گئے۔ یہی حال موٹر کی روشنی کا ہوتا ہے جب رات کو موٹر آرہا ہو اور اُس کے لیمپ میں سے تیز شعاعیں نکل رہی ہوں تو کئی حادثے ہو جاتے ہیں۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ حادثہ کسطرح ہو گیا جبکہ موٹر کے سامنے لیمپ روشن تھا اور اس کی دُور دُور تک روشنی پھیل رہی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ دُور سے اس کی روشنی اس طرح چمک کر پھیلتی ہے کہ انسان کو یہ پتہ ہی نہیں لگتا کہ موٹر یہاں ہے یا وہاں ہے اور وہ اُس کی لپیٹ میں آکر مارا جاتا ہے۔ درحقیقت ایک تو لیمپ کی ذاتی روشنی ہوتی ہے اور ایک وہ ری فلیکٹر ہوتے ہیں جو اُس روشنی کو دُور پھینک دیتے ہیں۔ اگر ری فلیکٹر نہ ہو تو روشنی بہت محدود جگہ میں رہتی ہے لیکن جب روشنی کے ساتھ ری فلیکٹر مل جاتا ہے تو اُس کی طاقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور وہ دُور دُور تک اندھیروں کو زائل کر دیتا ہے قمر کے معنے دراصل ری فلیکٹر کے ہی ہیں یعنی ایسا وجود جس میں ذاتی طور پر یہ قابلیت ہوتی ہے کہ وہ سورج سے نور لے کر اُسے دوسروں کی طرف پھینک دے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر قمر کی جگہ کوئی سا بھی اور ستارہ رکھ دیا جائے تو وہ بھی سورج کی روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کی طرف پھینک سکتا ہے ہر ستارہ یہ قابلیت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نظام شمسی میں صرف قمر میں ہی یہ قابلیت پیدا کی ہے کہ وہ سورج سے اُس کی روشنی اخذ کرے اور پھر اُسے اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کی طرف پھینک کر اُن کو منور کرے۔ اسی لئے چاند کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کی آبادی کے قابل نہیں ہے اگر وہ قابل آبادی ہوتا تو اُس میں درخت ہوتے گھاس ہوتا بڑے بڑے جنگلات ہوتے۔ مگر یہ چیزیں چاند میں نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہ چیزیں ہوتیں تو وہ روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کی طرف پھینک نہیں سکتا تھا۔ مگر چونکہ اللہ تعالےٰ نے چاند کو ری فلیکٹر کے طور پر بنایا ہے اس لئے اُس نے چاند میں ریت کے بڑے بڑے میدان پیدا کر دئے ہیں جب سورج کی روشنی اُن پر پڑتی ہے تو وہ ریت کے

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۞

اور دن کی جب وہ اس (یعنی سورج) کو ظاہر کر دیتا ہے [۵]

میدان وری فلیکٹر کے طور پر اس کو دنیا پر پھینک دیتے ہیں پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْقَمَرِ ہم تمہارے سامنے ایک ایسے وجود کو پیش کرتے ہیں جو قمری حیثیت رکھتا ہے مگر صرف قمر کے وجود کو نہیں بلکہ قمر کی اس حالت کو جب وہ پوری طرح سورج کے سامنے آ کر اس کی ساری روشنی کو اپنے سارے وجود میں لے لیتا ہے بے شک قمر میں یہ خوبی ہے کہ وہ روشنی لے کر دوسروں کی طرف پھینک دیتا ہے لیکن روشنی اس کے سامنے نہ ہوگی تو وہ پھینکے گا کیا؟ اسی لئے صرف قمر کو شہادت کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اِذَا تَلٰهَا ہم قمر کو ایسی حالت میں شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ سورج کے بالکل سامنے آ جاتا ہے۔ ذاتی خوبی تو قمر کی یہ ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو لے سکتا ہے اور پھر دوسروں کی طرف پھینک سکتا ہے لیکن یہ اس کی ذاتی خوبی اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک وہ سورج کے سامنے نہ آ جائے اگر سورج کے سامنے آ جائے تو اس کی یہ خوبی ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر سورج اور چاند کے درمیان کوئی اور چیز حائل ہو جائے جیسے بعض دفعہ زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے اور وہ سورج کی روشنی کو زمین کی طرف پھینکنے سے قاصر رہتا ہے یا مثلاً پہلی رات کا چاند ہے اس وقت بھی وہ سورج کے سامنے پورے طور پر نہیں ہوتا اسی لئے وہ اس وقت قمر یا بدر کی بجائے ہلال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے مگر جب چودھویں رات آ جائے تو چاند مکمل طور پر سورج کے سامنے آ جاتا ہے اور اس کی روشنی اپنی پوری شان کے ساتھ دنیا پر جلوہ گر ہوتی ہے پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ہم چاند کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں مگر خالی چاند کو نہیں بلکہ چاند کو اس حالت میں شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ کامل طور پر سورج کے سامنے آ جاتا ہے اور اس کی روشنی کو جذب کر کے دوسری دنیا کو منور کر دیتا ہے گویا اس کا کمالِ نور اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب سورج کے عین سامنے آ جاتا ہے اور یہی اس کے حسن کے کمال کا موقع ہوتا ہے کہ اس میں ذاتی طور پر یہ قابلیت بھی ہوتی ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو اپنے اندر جذب کرے اور پھر اس کے اندر یہ قابلیت بھی ہوتی ہے کہ اس روشنی کو دوسروں کی طرف پھینک دے اور دنیا کی تاریکیوں کو دور کر دے۔ اب مکمل طور پر دونوں آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ وَالشَّمْسِ ہم سورج کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں ذاتی روشنی پائی جاتی ہے وَضُحٰهَا اور اس کی ذاتی روشنی کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں وَالْقَمَرِ اور ہم چاند کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں روشن چیز کی روشنی کو لینے اور پھر اسے دوسرے وجودوں پر پھینک کر انہیں روشن کر دینے کی قابلیت پائی جاتی ہے اور چاند کی شہادت ہم اس حالت میں پیش کرتے ہیں جبکہ وہ عملاً سورج سے پوری روشنی لیکر دنیا کو روشن کر رہا ہوتا ہے۔

[۵] تفسیر۔ بظاہر تو دن کو سورج پیدا کرتا ہے نہ یہ کہ دن سورج کی روشنی کو ظاہر کرتا ہے مگر یہاں چونکہ استعارہ والا کلام ہے اور ضُحٰی سے مراد سورج کی ذاتی روشنی تھی اس نہار سے مراد زمین کا اس کے سامنے آ کر سورج کو دکھا دینا ہے۔ جب ہم دن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ سورج چمکنے لگ گیا ہے کیونکہ سورج تو ہر وقت چمکتا رہتا ہے۔ دن سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہماری زمین سورج کے سامنے آ گئی ہے پس وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا کے یہ معنے ہوئے کہ جب زمین نے سورج کے سامنے آ کر سورج کو دکھا دیا۔ ضُحٰهَا کا مطلب اور تھا ضُحٰهَا سے سورج کی ذاتی روشنی کی طرف اشارہ تھا خواہ وہ دنیا کے سامنے ہو یا نہ ہو سورج بہرحال چمک رہا ہوتا ہے اس کے سامنے بادل آ جائیں یا زمین اس کی طرف سے رخ بدل لے

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝

اور رات کی جب وہ اس کو ڈھانپ دے ۵۵

اس کی ذاتی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن باوجود سورج کے ہروقت چمکتے رہنے کے رات کے وقت کو نہار نہیں کہیں گے کیونکہ نہار یا دن اُس وقت کو کہتے ہیں جب سورج ہمارے حصۂ ملک کے سامنے ہوتا ہے خواہ اُس کے سامنے بادل ہی کیوں نہ آگیا ہو اور جب وہ ہمارے حصۂ ملک کے سامنے نہ ہو تو خواہ اُس کے آگے بادل نہ ہو ہمارے ملک والے اس وقت کو دن نہیں کہیں گے اور یہ نہیں کہیں گے کہ سورج روشن ہے پس نَھَار او رمفہوم پیدا کرتا ہے اور ضُحٰہَا اور مفہوم پیدا کرتا ہے ضُحَی الشَّمْسِ ہر وقت قائم رہتی ہے خواہ سورج کسی حصۂ دنیا کے سامنے ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ وہ سورج کی ذاتی روشنی پر دلالت کرتی ہے اور نہار دنیا کے مختلف حصوں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے کبھی یہاں دن کبھی وہاں۔ کیونکہ دن اُس وقت کو کہتے ہیں جب زمین سورج کے سامنے ہو کر لوگوں کو اپنی ضُحٰی دکھاتی ہے۔

۵۵ تفسیر۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا سے مراد رات کے وقت زمین کا مُنہ پھیر کر سورج کو اوجھل کر دینا ہے۔ رات کیا ہوتی ہے؟ جب سورج کی طرف سے زمین اپنی پیٹھ پھیر لیتی ہے اور اندھیرا ہو جاتا ہے تو اُسے رات کہتے ہیں پس چونکہ لَیل ایک زمینی فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اس لئے یہاں لَیل کے متعلق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے لیکن اصل مطلب یہ ہے کہ زمین سورج کی طرف سے چکر کاٹ کر لَیل پیدا کر دیتی ہے گویا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں تو زمین کی اُس حالت کا ذکر کیا تھا جب وہ سورج کے سامنے آکر آبادی کو سورج دکھا دیتی ہے اور وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا میں زمین کی اس کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے جب وہ سورج سے اپنا مُنہ موڑ کر لَیل پیدا کر دیتی اور دنیا کی نظروں سے سورج کو رُوپوش کر دیتی ہے۔

یہ چار چیزیں ہیں جو الگ الگ معنے رکھتی ہیں وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا سے سورج اور اُس کی ذاتی روشنی مراد ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا سے چاند اور اُس کی عکسی روشنی مراد ہے وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں زمین اور اُس کی انعکاسی کیفیت مراد ہے وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا میں زمین اور اُس کی نور سے محرومی مراد ہے سورج تو اپنے اندر ذاتی طور پر یہ وصف رکھتا ہے کہ وہ دنیا کو روشن کرے لیکن چاند میں بالقوہ روشنی اخذ کرنے کی طاقت ہوتی ہے یعنی اُس کے اندر یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ وہ سورج سے روشنی لے اور اپنے اندر جذب کر کے اُسے دوسروں تک پہنچا دے۔ جیسے ری فلیکٹر ہوتے ہیں کہ وہ لیمپ کی روشنی کو بہت دُور تک پھیلا دیتے ہیں۔ اب خواہ چاند چمک رہا ہو لیکن چمکنے کی قابلیت اُس میں موجود ہوتی ہے جب وہ سورج کے سامنے آجاتا ہے تو اُس کی یہ قابلیت ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ اُس کی روشنی کو دوسروں تک پھینکنے لگ جاتا ہے شمس اور قمر کے ذکر کے بعد اللہ تعالےٰ نے وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں دن کو بطور مثال پیش کیا ہے جب وہ سورج کو روشن کر دیتا ہے اور وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا میں رات کو بطور مثال پیش کیا ہے جب زمین کے چکر کاٹ کر جانے کے وقت سورج اوجھل ہو جاتا ہے۔

اِن چار آیات میں چار الگ الگ زمانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہم سورج کو تمہارے سامنے بطور مثال پیش کرتے ہیں جب تک اپنی ذات میں چمکنے والا وجود دنیا میں نہ آئے بالخصوص ایسے زمانہ میں جب نور بالکل مٹ چکا ہو اُس وقت تک دنیا کبھی ترقی کی طرف اپنا قدم نہیں اُٹھا سکتی جیسے بجھی ہوئی آگ ہو تو اُس سے دوسری آگ روشن نہیں ہوسکتی یا بُجھا ہوا دِیا ہو تو اُس سے دوسرا دیا روشن نہیں ہوسکتا۔ ری فلیکٹر اُسی وقت فائدہ

دیتا ہے جب نور موجود ہو۔ مثلاً اگر لیمپ جل رہا ہو اور اُس پر ری فلیکٹر لگا دیا جائے تو بے شک اس کی روشنی دور تک پھیل جائے گی یا جیسے بیٹریوں کی روشنی بہت معمولی ہوتی ہے لیکن اوپر کا شیشہ جو ری فلیکٹر کے طور پر لگا ہوا ہوتا ہے اُس کی معمولی روشنی کو بھی دُور تک پھیلا دیتا ہے اگر اُس شیشہ کو تم نکال دو تو بیٹری کی روشنی آدھی سے بھی کم رہ جائیگی۔ بہرحال ری فلیکٹر اسی صورت میں کام آسکتا ہے جب نور موجود ہو، روشنی اپنی کسی نہ کسی شکل میں قائم ہو لیکن اگر نور مٹ چکا ہو، تمام روشنیاں گُل ہو چکی ہوں تو اُس وقت ایسا ہی وجود کام آسکتا ہے جو ذاتی طور پر اپنے اندر روشنی رکھتا ہو۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے سورج کو پیش کرتے ہیں جو اپنے اندر ذاتی روشنی رکھتا ہے اور جو ظلمتوں کو دور کرنے کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد روشنی کا دوسرا ذریعہ چاند ہوتا ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب وہ سورج کے سامنے آجاتا ہے اُس وقت وہ بھی دنیا کو اپنی شعاعوں سے منور کر دیتا ہے۔ یہ دو ذرائع ہیں جو دنیا میں انتشارِ نور کے لئے کام آتے ہیں اللہ تعالےٰ نے ان مثالوں کو کفارِ مکہ کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تم اچھی طرح سوچ لو کیا تمہارے پاس ان دونوں ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ذریعہ موجود ہے، کیا تمہارے پاس کوئی شمس ایسا ہے جو اپنے اندر ذاتی روشنی رکھتا ہو۔ شمس سے مراد وہ وقت ہوتا ہے جب شریعت لانیوالا وجود براہِ راست دنیا کو فائدہ پہنچا رہا ہو۔ پھر فرماتا ہے اگر کسی شمس کو تم پیش نہ کر سکو تو تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ گو شمس ہم میں موجود نہیں مگر اس سے اکتسابِ نور کر کے ایک چاند ہم کو منور کر رہا ہے۔ بہرحال دو ہی چیزیں دنیا کو منور کر سکتی ہیں یا تو ذاتی روشنی رکھنے والا کوئی وجود ہو اور اگر اُس کی روشنی دُور چلی جائے تو پھر اُس کے بالمقابل آجانے والا کوئی ری فلیکٹر جو اُس کی روشنی کو جذب کر کے دوسروں تک پہنچا دے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ روشنی حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہیں۔ اسی قاعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ

شمس سے مراد شریعت لانے والا وجود

سورۃ کی پہلی چار آیات میں اسلام کے دو اہم زمانوں کی طرف اشارہ

اے مکہ والو! تمہیں تو ان دونوں حالتوں میں سے کوئی حالت بھی نصیب نہیں۔ مثلاً پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ شریعت موجود ہو مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ تمہارے پاس نہ نوحؑ کا قانون ہے نہ ابراہیمؑ کا قانون ہے نہ کسی اور نبی کا قانون ہے اور جب تمہارے پاس کوئی قانون ہی نہیں تو تم اپنے متعلق کیا امید کر سکتے ہو اور کس طرح اس غلط خیال پر قائم ہو کہ تمہارے باپ دادا کی بجھی ہوئی روشنیاں تمہارے کام آجائیں گی۔ تمہاری حالت تو ایسی ہے کہ تمہیں لازمی طور پر ایک شارع نبی کی ضرورت ہے کیونکہ ساری شریعتیں تم میں مفقود ہیں اور جبکہ سب کی سب شرائع مفقود ہو چکی ہیں تو اب ضروری ہے کہ کوئی شمسِ ہدایت آئے جو ان تاریکیوں کو اُجالے سے بدل دے۔ جب تک ایسا وجود نہیں آتا جو اپنے اندر ذاتی طور پر روشنی رکھنے والا ہو اُس وقت تک پُرانے لیمپ جو بجھ چکے ہیں تمہارے کسی کام نہیں آسکتے۔

روشنی کے حصول کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قمر ظاہر ہو جائے۔ مگر قمر بھی اُسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب شمس تو موجود ہو مگر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اس کے بغیر وہ کسی کام نہیں آسکتا۔ اگر تم یہ کہو کہ ہم قمر سے فائدہ اٹھالینگے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ تم میں کوئی شریعت موجود نہیں کہ غیر شریعت والا کوئی قمر ظاہر ہو جائے۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے زمین کی اُس حالت کو پیش کیا ہے جب وہ نہار پیدا کر دیتی ہے اور آخر میں اُس حالت کو رکھا گیا ہے جب زمین سورج سے پیٹھ موڑ کر لوگوں کے لئے لَیل پیدا کر دیتی ہے۔

ان آیات میں اسلام کے دو اہم زمانوں کی طرف نہایت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں تو اسلام کی غرض کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اپنی ذات میں چمکنے والے سورج ہیں جوں جوں یہ سورج طلوع کرتا جائے گا وہ نور جو ذاتی طور پر سورج کے اندر موجود ہے زمین میں پھیلتا چلا جائے گا۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نفسِ مطہر سے ہی نکل کر آیا ہے۔

خدا نے اس عظیم الشان کلام کے نزول کے لئے آپ کو چُنا اور پھر آپ کے ذریعہ یہ کلام ہمارے ہاتھوں تک پہنچا۔ وُہ تفصیلات جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور وہ غیر مبدّل تعلیمات جن کو اسلام نے پیش کیا ہے خواہ وہ تزکیۂ نفوس سے تعلق رکھتی ہوں یا سیاسی اور تنظیمی تعلیمات ہوں یا اخلاقی اور اقتصادی تعلیمات ہوں بہرحال وہ سب کی سب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے نکل کر ہم تک پہنچی ہیں پس آپ وہ شمس تھے جن کی ضُحٰی اپنی ذات میں آپکی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل تھی دُنیا خواہ آپ کو مانے یا نہ مانے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دنیا قرآن کریم کو بند کرکے رکھ دے اور کہے کہ قرآن کریم کے مضامین بالکل خراب ہیں پھر بھی جبتک قرآن دنیا میں موجود ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ضُحٰی دنیا میں موجود رہے گی۔ جب دن کے وقت ایک شخص اپنے کمرے کے دروازے بند کرکے اندر بیٹھ رہتا ہے یا جب زمین چکر کھاکر سورج کو لوگوں کی نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے اُس وقت سورج کا وجود تو غائب نہیں ہوجاتا۔ سورج بہرحال موجود ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ زمین اُس سے اپنی پیٹھ موڑ لے یا کوئی شخص اپنے کمرہ کے دروازے بند کرکے اُس کی روشنی کو اندر داخل نہ ہونے دے۔ اسی طرح وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں بتایا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ضُحٰی والے وجود ہیں چاہے تم اس نور سے فائدہ اٹھاؤ یا نہ اٹھاؤ ان کا نور بہرحال ظاہر ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ دنیا ایک دن تسلیم کرے گی کہ آپ حقیقت میں روحانی سورج تھے پس دنیا ان کے سامنے آئے یا نہ آئے اس کا کوئی سوال نہیں۔ دنیا اس شمس کے سامنے آئے گی تو منوّر ہوجائے گی اور اگر نہ آئے گی تو یہ شمس بہرحال شمس ہے اِس کی ضُحٰی پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا کہ لوگوں نے اِس کی طرف سے اپنی پیٹھ موڑلی ہے۔

فرض کرو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک آدمی بھی ایمان نہ لاتا تو اس سے کیا ہوسکتا تھا جو روحانی اور اخلاقی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو سیاسی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو اقتصادی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو عائلی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو تمدّنی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو علمی تعلیمات آپ نے دی ہیں اُن سے بہرحال آپ کا شمس ہونا ظاہر ہوجاتا۔ جب ایک وجود کو خدا تعالےٰ نے شمس بناکر بھیجا تو خواہ مکّہ والے آپ پر ایمان نہ لاتے اہلِ عرب آپ کو سچا تسلیم نہ کرتے وہ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ اس شمس سے نہار پیدا نہیں ہُوا، دنیا نے اس سورج سے روشنی اخذ نہیں کی مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ شمس، شمس نہیں تھا۔ جب ایک شخص نئی شریعت لاتا ہے تو خواہ ہزار سال کے بعد لوگ اُسے مانیں بہرحال اُس کا شمس ہونا پہلے دن سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ تو ہم کہیں گے کہ دنیا اُس کے سامنے دو سو سال کے بعد آئی یا ہزار سال کے بعد آئی مگر یہ نہیں کہیں گے کہ وہ شمس اپنی ذات میں ایک روشن وجود نہیں تھا پس وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں بتایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اپنی ذات میں ایسا نور رکھتے ہیں کہ تم چاہے مانو یا نہ مانو اُن کا کچھ بگڑ نہیں سکتا۔

پھر فرماتا ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا یعنی آپ کے بعد بعض اور وجود بھی آئیں گے جو قمر کی حیثیت رکھیں گے یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف ایسے شمس ہیں جو اپنی ذات میں روشن اور پُرانوار ہیں بلکہ خدا تعالےٰ نے آپ کے نور سے اکتساب کرنے کے لئے بعض قمر بھی پیدا کردئے ہیں جو ہر زمانہ میں ان کے نور کو دنیا میں پھیلاتے رہیں گے گویا اوّل تو یہ اپنی ذات میں سورج ہے پھر یہ ایسا سورج ہے جس کے لئے خدا تعالےٰ نے ری فلیکٹر بھی پیدا کردئے ہیں۔ اگر لوگ اِس سورج کی طرف سے اپنا مُنہ موڑ لیں گے تو خدا تعالےٰ پھر بھی اُنہیں بھٹکنے نہ دے گا اس کے مقابل پر ایک چاند آکھڑا ہوگا اور اس سے روشنی اخذ کرکے دنیا پر پھینکنے لگے گا۔ اور اس طرح پھر دنیا اس کے نور سے حصہ لینے لگے گی۔

اگر تم زمین سورج اور چاند کو آدمی سمجھ لو تو تمثیلی رنگ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین جب روٹھ کر سورج سے اپنا مُنہ پھیر لیتی ہے تو چاند کہتا ہے تم اس سے بھاگ کر کہاں جاتی ہو میں اُس سے نور حاصل کر کے تم پر ڈال دُوں گا۔ غرض بتایا کہ دنیا خواہ پیٹھ پھیر لے، خواہ وہ اس شمسِ روحانی سے منہ موڑ لے پھر بھی اِس سورج سے اکتساب نور کر کے قمر ہوتے ایسے قمر دنیا میں بھیجے جائینگے جو پھر ظلمت کدۂ عالم کو بقعۂ نور بنا دینگے اگر کوئی قمر نہ ہوتا اور دنیا اپنی پیٹھ سورج کی طرف پھیر دیتی تو لازماً تاریکی ہی تاریکی ہو جاتی۔ اُجالا ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی شارع نبی آیا دنیا نے کچھ عرصہ کے بعد اُس سے اپنا مُنہ موڑ لیا اور تاریکی و ظلمت کے بادل اُس پر چھا گئے۔ مگر فرمایا محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایسے نبی نہیں یہ وہ شمس ہیں جس کے پیچھے قمر لگے ہوئے ہیں یہ وہ معشوق ہے جس کے عاشق اُس کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ دنیا اگر روٹھیگی تو قمر اُسکو روشنی پہنچانے کیلئے ظاہر ہو جائینگے۔

وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا میں بتایا کہ ہمارا یہ سورج صرف اپنی ذات میں ہی روشنی نہیں رکھتا بلکہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ دنیا بھی اس سے روشنی لے لیگی۔ اس جگہ نہار سے مراد زمانۂ نبوی نہیں بلکہ نہار سے مراد بعد کا زمانہ ہے جب سورج تو نہ ہوگا مگر دن کا وقت سورج کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاتا رہے گا یہاں تک کہ رات آجائیگی اور وہ اسے ڈھانپ لے گی اور ایک بار دنیا پھر معلوم کر لے گی کہ سورج کے بغیر گذارہ نہیں اور اُس سے دُوری خسران و تباب کا موجب ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے جسمانی اور روحانی سورج میں ایک فرق بتایا ہے۔ جسمانی سورج تو جب تک موجود رہتا ہے دن چڑھا رہتا ہے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے رات آجاتی ہے لیکن روحانی سورج کی روشنی اُس کے غائب ہونے کے بعد بڑھنی شروع ہوتی ہے گویا دنیوی دن تو سورج کے ہوتے ہوئے چڑھتا ہے لیکن روحانی دن سورج کے غائب ہونے کے بعد اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن اور احادیث نے ساری دنیا کو منور کیا مگر اُس وقت جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا چکے تھے، جب روحانی سورج لوگوں کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ یہ روحانی اور جسمانی سورج میں ایک نمایاں فرق ہے۔ جسمانی سورج کا دن اُسوقت چڑھتا ہے جب سورج نکلتا ہے مگر روحانی سورج کا دن اُسوقت کمال کو پہنچتا ہے جب وہ غائب ہو جاتا ہے۔

جسمانی سورج کے طلوع ہونے پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں لیکن جب روحانی سورج طلوع کرتا ہے تو لوگ مخالفت کا ایک طوفان بپا کرتے ہیں۔ کوئی گالی نہیں ہوتی جو اُسے نہ دی جائے، کوئی الزام نہیں ہوتا جو اُس کے متعلق تراشا نہ جائے۔ ہر کوشش کا ماحصل یہی ہوتا ہے کہ کہیں اس سورج کی ضیاء دنیا میں نہ پھیل جائے۔ مگر جب وہ سورج دنیا کی جسمانی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے تو اُس کی روشنی بڑھنے لگتی ہے اور لوگ یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ بڑا اچھا آدمی تھا ہم بھی اُسے مانتے ہیں، ہم بھی اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہی اثر تھا جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک دفعہ ایسا رُلایا کہ میدہ کے نرم نرم پھلکے کا ایک لقمہ تک اُن کے گلے سے نیچے اُترنا مشکل ہو گیا جب کسریٰ کو شکست ہوئی اور مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اُس میں کچھ ہوائی چکیاں بھی تھیں جن سے باریک آٹا پیسا جاتا تھا۔ اس سے پہلے مکہ اور مدینہ کے رہنے والے سل بٹہ پر دانوں کو پیس لیا کرتے اور پھونکوں سے اُس کے چھلکے اڑا کر روٹی پکا لیا کرتے تھے۔ جب مدینہ میں ہوائی چکیاں آئیں اور اُن سے باریک میدہ تیار کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ پہلا آٹا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش کیا جائے تا کہ سب سے پہلے آپ ہی اس آٹے کی نرم نرم روٹی کھائیں۔ چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق وہ آٹا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ نے ایک عورت کو دیا کہ وہ اسے گوندھ کر روٹی تیار کرے۔ جب میدے کے گرم گرم اور نرم نرم پھلکے تیار کر کے آپ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک لقمہ توڑا اور اپنے مُنہ میں رکھ لیا مگر وہ لقمہ ابھی آپ نے اپنے منہ میں ڈالا ہی تھا کہ آپ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

دیکھنے والی عورتیں حیران رہ گئیں کہ آپ کے آنسو کیوں گرنے لگے ہیں۔ چنانچہ کسی نے آپ سے پوچھا خیر تو ہے کیسی عمدہ اور نرم روٹی ہے اور آپ کے گلے میں پھنس رہی ہے۔ انہوں نے جواب دیا میرے گلے میں یہ روٹی اپنی خشکی کی وجہ سے نہیں پھنسی بلکہ اپنی نرمی کے باعث پھنسی ہے۔ رنج کے واقعات نے مجھے رنجیدہ نہیں کیا بلکہ خوشی کی گھڑیوں نے مجھے افسردہ بنا دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود تھے انہی کی برکت سے آج یہ نعمتیں ہمیں میسر ہیں مگر آپ کا یہ حال تھا کہ مدتوں گھر میں آگ نہیں جلتی تھی اور اگر روٹی پکتی بھی تو اس طرح کہ ہم سل بٹہ پر غلہ پیس لیا کرتے اور پھونکوں سے اُس کے چھلکے اڑا کر روٹی پکا لیا کرتے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ یہ نعمتیں جس کے طفیل ہمیں میسر آئی ہیں وہ تو آج ہم میں نہیں کہ ہم یہ نعمتیں اُس کے سامنے پیش کرتے اور دولتیں اُس کے قدموں پر نثار کرتے لیکن ہم جن کا ان کامیابیوں کیساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ یہ خیال تھا جس نے مجھے تڑپا دیا اور جس کی وجہ سے میدے کا نرم نرم لقمہ بھی میرے گلے میں پھنس گیا۔ تو روحانی عالم میں یہی قانون جاری ہے کہ نہار اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب سورج نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

غرض اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا کہ ہم دن کو پیش کرتے ہیں جب وہ سورج کو ظاہر کر دے گا سورج سامنے نہیں ہوگا مگر دن اس بات کا ثبوت ہوگا کہ سورج ضرور چڑھا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت جس طرح ظاہر ہوئی اور اسلام کی دھاک دنیا کے قلوب پر بیٹھی یہ ظہور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں ہوا۔ غرض روحانی اور جسمانی دنوں میں یہ فرق ہے کہ جسمانی دن کے وقت سورج موجود ہوتا ہے مگر روحانی نہار کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب جسمانی طور پر سورج غائب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے "الوصیت" میں اپنی وفات کی خبر دیتے ہوئے جماعت کو نصیحت فرمائی ہے کہ "تم میری اس بات سے جو میں نے تمہارے پاس بیان کی ہے غمگین مت ہو اور تمہارے دل پریشان نہ ہو جائیں کیونکہ تمہارے لئے دوسری قدرت کا بھی دیکھنا ضروری ہے اور اُس کا آنا تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ وہ دائمی ہے جس کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہوگا اور وہ دوسری قدرت آنہیں سکتی جب تک میں نہ جاؤں۔ لیکن میں جب جاؤں گا تو پھر خدا تعالےٰ اُس دوسری قدرت کو تمہارے لئے بھیج دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی جیسا کہ خدا تعالےٰ کا براہین احمدیہ میں وعدہ ہے اور وہ وعدہ میری ذات کی نسبت نہیں ہے بلکہ تمہاری نسبت وعدہ ہے جیسا کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں اس جماعت کو جو تیرے پیرو ہیں قیامت تک دوسروں پر غلبہ دوں گا سو ضرور ہے کہ تم پر میری جدائی کا دن آوے تا بعد اس کے وہ دن آوے جو دائمی وعدہ کا دن ہے"

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا۔ پھر فرماتا ہے تیری اُمت پر ایک وہ زمانہ بھی آنے والا ہے جب سورج سے وہ اپنا منہ موڑ لے گی اور نہار کی بجائے لیل کا زمانہ اُس پر آ جائیگا۔ بجائے اس کے کہ اُمتِ محمدیہ کے افراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل پیرا رہیں وہ آپ کے مقام کو بھول جائیں گے آپ کے احکام کو فراموش کر دیں گے اور عیاشیوں میں مبتلا ہو کر شیطانی راستوں کو اختیار کر لیں گے اُس وقت اللہ تعالیٰ اُن سے فرمائے گا خواہ تم ہم کو بھول جاؤ ہم تمہیں نہیں بھول سکتے۔ خواہ تم ہم سے روٹھ جاؤ ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ چنانچہ جب رات اُن پر چھا جائے گی اور دنیا بزبانِ حال ایک سورج کا مطالبہ کر رہی ہوگی اللہ تعالےٰ پھر ایک چاند کو جو سورج کا قائم مقام ہوتا ہے چڑھا دے گا اور وہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روشنی لے کر اُسے ساری دنیا میں پھیلا دے گا۔

غرض اللہ تعالےٰ نے وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَا میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ بعض انفاس اپنے اندر ذاتی فضیلت رکھتے ہیں اور وہ دنیا کو چمکا دیتے ہیں۔ نور دراصل ایسے ہی وجود دنیا کی اصلاح کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل بعض انفاس قمر کی حالت رکھتے ہیں اور اُسی وقت دنیا کی ہدایت کا موجب ہوتے ہیں جب وہ سورج کے پیچھے آتے ہیں یعنی اُن کا نور ذاتی نہیں بلکہ مکتسب ہوتا ہے۔ اِن دونوں حالتوں کو اللہ تعالیٰ نے بطور شاہد پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اصلاح عالم بغیر اِن دو قسم کے وجودوں کے نہیں ہو سکتی یا نفس کامل یا متبع کامل۔ نفس کامل وہ ہے جس کا ذکر وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں آتا ہے اور متبع کامل وہ ہے جس کا ذکر وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا میں آتا ہے۔ جب تک اِن دونوں صفات میں سے کوئی ایک صفت موجود نہ ہو کوئی شخص اصلاح کا فرض سر انجام نہیں دے سکتا۔ یا تو اصلاح کا کام وہ شخص کر سکتا ہے جو شمس ہو اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اس غرض کے لئے پیدا کیا ہو کہ وہ شریعت لائے اور یا پھر وہ ایسا متبع کامل ہو کہ اپنے متبوع کے نور کو لے کر اُس غرض کو پورا کر دے جس کے لئے اُسے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ گویا اصل غرض شریعت سے ہوتی ہے۔ جب شریعت لفظی موجود نہیں ہوتی اُس وقت نفس کامل کے ذریعہ دنیا میں شریعت کو نازل کیا جاتا ہے اور جب شریعت لفظی غائب نہیں ہوتی صرف عمل مفقود ہوتا ہے اُس وقت ظلّی طور پر وہ شریعت دوبارہ متبع کامل پر نازل ہوتی ہے اور وہ دنیا میں قیامِ شریعت کا فرض سر انجام دیدیتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ اتفاقی بات ہے کہ ایک کو خدا تعالیٰ شریعت دے دیتا ہے اور ایک کو متبع بنا دیتا ہے اگر وہ یوں کرتا کہ متبع کو شریعت دے دیتا اور شریعت والے کو تابع کے مقام پر کھڑا کر دیتا تو کیا ایسا ہو جاتا؟ اس کے متعلق یہ امر سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ صاحب شریعت اور متبع محض اتفاق سے نہیں ہو جاتے بلکہ یہ دونوں الگ الگ استعدادیں ہیں اور شمس و قمر کی مثالوں میں یہ دونوں امر بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ بتایا جا چکا ہے کہ استعدادِ شمسی والا وجود پہلے آتا ہے اور استعدادِ قمری والے وجود پیچھے آتے ہیں جو اُس کے کام کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس سے ایک اور استدلال بھی ہوتا ہے جس سے احمدیت کے ایک اہم مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے ایک شخص شمس ہو اپنے زمانہ کا اور دوسرے زمانہ کا قمر بننے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بڑے زمانہ کا قمر ہو مگر چھوٹے زمانہ کا شمس ہونے کی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ یہ الگ الگ قابلیتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر استعداد کو دیکھ کر فطری مناسبت کے لحاظ سے اُن کو شمس و قمر کا مقام دیا ہے اس وجہ سے ایک زمانہ کا قمر خواہ کام کے لحاظ سے قمر ہو لیکن روحانیت کے لحاظ سے پہلے دَور کے شمس سے زیادہ ہو سکتا ہے لیکن اپنے شمس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس نے روشنی اپنے شمس سے لی ہوتی ہے اور بوجہ اس کا نور مکتسب ہونے کے اپنے شمس سے بڑھنے کی طاقت کسی قمر میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے زمانہ کے شمس سے بڑا ہو۔ مثلاً آگ اپنی ذات میں ایک شمس کا وجود رکھتی ہے کیونکہ خود جل رہی ہوتی ہے اس کا نور مکتسب نہیں ہوتا بلکہ اندر سے پیدا ہوتا ہے مگر قمر کی روشنی کے سامنے وہ بالکل ماند ہوتی ہے۔ جب ہم آگ جلاتے ہیں تو وہ صرف دو یا چار گز جگہ کو روشن کرتی ہے اس سے زیادہ نہیں اور اگر ہم اُسے اونچا بھی لے جائیں تب بھی وہ زیادہ دُور تک اپنی روشنی کو نہیں پھیلا سکتی بلکہ اگر ہم اُسے کافی اونچا لے جائیں تو وہ شاید تاریکی ہی بن جائے اور اس کا اپنا وجود بھی دکھائی نہ دے۔ آگ اور چاند کی روشنی میں یہ فرق اس لئے ہوتا ہے کہ گو قمر تابع ہے مگر اس کا متبوع اس قدر روشن ہے اور دوسری روشنیوں سے اس قدر زیادہ چمک اُس میں پائی جاتی ہے کہ اُس کا قمر بالذات روشنیوں سے زیادہ روشن ہو جاتا اور دوسرے شموس سے بھی اپنی روشنی میں بڑھ جاتا ہے۔

حقیقت وہی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں بارہا بتائی ہے کہ شموس ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جو اقدام اور جنگی قوت اور سیاسی اقتدار کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہیں کیونکہ شریعت کے نفاذ کے لئے ان قابلیتوں کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے کہ اُن میں یہ سب قابلیتیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن قمر ایسے وجود بنائے جاتے ہیں جو سوز و گداز اور نرمی اور نصیحت کا مادہ اپنے اندر زیادہ

رکھتے ہیں اس وجہ سے ہمیشہ اُن کی زندگیاں مختلف ہوتی ہیں
اور باوجود ایک کام کرنے کے دونوں دَور اس طرح مختلف
نظر آتے ہیں جس طرح دو الگ الگ وجود ہوتے ہیں مثلاً
حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں نے ایک کام کیا ہے مگر
موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی زندگیاں دیکھی جائیں تو وہ بالکل الگ قسم کی
نظر آتی ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگیوں کو دیکھا جائے
تو ان میں بھی ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
میں شروع سے ہی اقدام اور جنگی قوت اور تحکیم نظام کا مادہ نمایاں
تھا لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سوز و گداز اور
نرمی کا مادہ پایا جاتا تھا اور آپ اپنی جماعت کو بھی یہی نصیحت کرتے
تھے کہ سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھو تمہارا کام یہی ہے کہ تم نرمی
اور محبت سے اللہ تعالےٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤ۔ یہ ایسا ہی ہے
جیسے سورج کی روشنی ہی قمر کے ذریعہ آتی ہے مگر ان دونوں روشنیوں
میں کتنا عظیم الشان فرق ہوتا ہے سورج کی روشنی دیکھو تو وہ بالکل
الگ نظر آتی ہے اور چاند کی روشنی دیکھو تو وہ الگ نظر آتی
ہے یہی چیز ہے جس کا نام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
جلالی اور جمالی رکھا ہے۔ شمس اپنے اندر جلالی رنگ رکھتا ہے اور
قمر اپنے اندر جمالی رنگ رکھتا ہے۔ یوں شمس میں بھی ایک حد تک
جمال پایا جاتا ہے اور قمر میں بھی ایک حد تک جلال پایا جاتا ہے
مگر باوجود اس کے شمس کی غالب قوت جلالی ہوتی ہے اور قمر
کی غالب قوت جمالی ہوتی ہے پس چونکہ یہ دونوں الگ الگ
طرزیں ہیں اس لئے محض تابع ہونے کی وجہ سے ہر قمر کو ہر
شمس سے ادنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلا
شمس چونکہ شرعی نبی تھا اس لئے وہ سب قمروں سے بڑھ کر تھا
سب قمروں سے بڑھ کر نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے
قمروں سے بڑھ کر تھا کیونکہ ہر قمر صرف اپنے شمس سے ادنیٰ ہوگا
مگر اپنے شمس سے ادنیٰ قمر تمام دوسرے شموس سے بڑے درجہ
کا ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آگ بالذات روشنی
ہے مگر قمر کے مقابلہ میں اُس کی روشنی بہت ادنیٰ ہے یہی وہ چیز
ہے جس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
فرماتے ہیں ؎

تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

یعنی اے میرے شمس روحانی تُو چونکہ بہت روشن تھا اس لئے
تیرا قمر دوسرے تمام شموس سے اپنی روشنی میں بڑھ گیا۔ اس
نقطۂ نگاہ کے ماتحت ہمارا یقین ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے باقی تمام انبیاء
سے اپنے درجہ اور مقام کے لحاظ سے افضل ہیں۔ میں نے دیکھا
ہے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دوسرے شموس سے
کس طرح بڑھ سکتے ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت
نبی تھے اُن سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام
کس طرح بلند ہو گیا یا بعض اور قوموں میں جو صاحب شریعت
نبی گذرے ہیں اُن سے آپ بڑے کس طرح قرار دئے جا سکتے
ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ انبیاء بڑے تھے مگر
اُن شموس اور اس قمر میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ
بے شک قمر ہے مگر یہ قمر اُس شمس کا ہے جو پہلے تمام شموس سے
بہت زیادہ روشن تھا اس لئے یہ لازم تھا کہ اس شمس کا قمر اپنی
روشنی میں پہلے شموس سے بھی بڑھ جاتا۔ اس کی ایسی ہی مثال
ہے جیسے کسی جگہ پر ایک ہزار لیمپ ہو اور ہر لیمپ کا ایک ایک
ری فلیکٹر ہو تو اگر اُس ہزار لیمپ کے مقابلہ میں ایک لیمپ ایسا
ہو جس میں دو ہزار لیمپ کے برابر روشنی کی طاقت ہو تو اُس کا
ری فلیکٹر اپنی روشنی میں ایک ہزار لیمپ سے بڑھ جائے گا۔
فرض کرو اُس ہزار لیمپ میں سے کوئی پچاس کینڈل پاور کا
ہے کوئی سو کینڈل پاور کا ہے اور اس طرح مجموعی طور پر اُن کی
طاقت دو لاکھ کینڈل پاور کی بن جاتی ہے تو اگر اُن کے مقابلہ
میں تین لاکھ کینڈل پاور کا صرف ایک ہی لیمپ ہو تو اُس کا
ری فلیکٹر باقی تمام روشنیوں کو مات کر دے گا اور باوجود قمر
ہونے کے دوسرے شموس پر غالب آجائے گا۔

اس جگہ شمس و قمر سے مراد عام وجود بھی ہو سکتے ہیں۔
اور شمس و قمر سے شمس اسلام اور قمر اسلام بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۙ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۙ

اور آسمان کی اور اُس کے بنائے جانے کی ۔ اور زمین کی اور اُس کے بچھائے جانے کی ؂۵۶

ان دونوں شہادتوں سے یہ بتایا ہے کہ یہ دونوں وجود ابراہیمی پیشگوئی کی صداقت کا ثبوت ہوں گے اور مکہ کو عظیم الشان مرکز بنانے کا موجب ہوں گے۔

اور اگر عام معنے لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے ہی وجودوں سے اصلاح کی بنیاد پڑتی ہے جب تک ایسے وجود پیدا نہ ہوں اصلاح نہیں ہوسکتی اور اگر اب ایسا نہ ہوگا تو ابراہیم کی پیشگوئی غلط جائے گی۔

طَحٰهَا

؂۵۶ حل لغات۔ طَحَا الشَّیْءَ کے معنے ہیں بَسَطَهٗ وَمَدَّهٗ۔ کسی چیز کو پھیلایا (اقرب)

مَا طَحٰهَا میں مَا کے معنے

تفسیر۔ نحوی یہاں "ما" کے دو معنے کرتے ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ "ما" اَلَّذِیْ کے معنوں میں ہے اور مَنْ کا قائم مقام ہے گویا یہاں "ما" مَنْ کی جگہ استعمال ہوا ہے اور آیت دراصل یوں ہے کہ وَالسَّمَآءِ وَمَنْ بَنٰهَا ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں اور اُسے بھی جس نے اِسے بنایا۔

اس کے متعلق سورۃ البلد کے تفسیری نوٹوں میں یہ امر واضح کیا جاچکا ہے کہ قرآن کریم میں "ما" مَنْ کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام جب پیدا ہوئیں تو اُن کی والدہ نے کہا یا اللہ میں نے تو بیٹی جنی ہے حالانکہ میں چاہتی تھی کہ لڑکا پیدا ہو اور اُسے دین تبلیغ کے لئے وقف کردوں۔ اس موقع پر قرآن کریم میں یہ الفاظ آتے ہیں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ (آل عمران ع۴) حالانکہ لڑکی کے لئے مَنْ کا لفظ استعمال ہونا چاہیئے تھا اسی طرح فرماتا ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النساء ع۱) یعنی تمہیں عورتوں میں سے جو پسند آئیں اُن کے ساتھ شادی کرلو۔ دو کرو۔ تین کرو یا چار کرو یہ تمہارا اختیار ہے ہماری طرف سے اس میں کوئی روک نہیں۔ اب عورت ذوی العلم افراد میں سے ہے اور اس کیلئے مَا کی بجائے مَنْ کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا مگر بجائے یہ کہنے کے کہ فَانْكِحُوْا مَنْ طَابَ لَكُمْ اللہ تعالیٰ نے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ فرمایا ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دونوں جگہ ما کا لفظ کیوں رکھا ہے جبکہ مَنْ کا لفظ اس غرض کے لئے لُغت نے وضع کیا ہوا تھا اور وہ اس موقعہ پر استعمال بھی ہوسکتا تھا آخر وجہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک وضعی لفظ چھوڑ کر اُس کی جگہ ایک غیر وضعی لفظ رکھ دیا؟ اس کی صاحب کشاف نے ایک نہایت لطیف توجیہ کی ہے جو میرے نزدیک درست ہے وہ کہتے ہیں مَنْ کی جگہ "مَا" کا لفظ اُسی وقت استعمال ہوتا ہے جب وجود پر کوئی صفت غالب آگئی ہو یعنی کبھی کوئی وجود ایسا ہوتا ہے کہ اُس کی کوئی صفت اُس کے عام انسانی ہونے پر غالب آجاتی ہے اُس وقت چونکہ کسی مخصوص صفت پر زور دینا مقصود ہوتا ہے "مَا" کو مَنْ کا قائم مقام کردیا جاتا ہے۔ مثلاً وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تو خوب جانتا ہے یہ لڑکی جو تو نے جنی ہے اس میں وہ صفت جو تو لڑکے میں امید رکھتی تھی کس شان میں پائی جاتی ہے چونکہ صفت غیر ذوی العلم میں سے ہے اس لئے "ما" کا لفظ استعمال کرکے اُس کی ایک مخصوص قابلیت کی طرف اشارہ کردیا اگر وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ وَضَعَتْ کہا جاتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے کہ یہ لڑکی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو یہ پتہ ہی تھا کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانے والوں کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم ہے کہ تُو نے کیا جنا ہے وہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو جانتا ہے۔ پس اگر وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ وَضَعَتْ کہا جاتا تو اس میں کوئی خاص بات نہ ہوتی مگر

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ مریم کی ماں کو کیا پتہ ہے کہ اس میں کیا کیا صفات پائی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالےٰ جانتا ہے کہ اُس میں کیسی عظیم الشان صفات اور قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ پس "ما" کا لفظ مریم کی قابلیت اور اُس کی صفات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے استعمال کیا ہے اگر مَنْ ہوتا تو اس کے اتنے ہی معنے ہوتے کہ اللہ تعالےٰ کو پتہ ہے یہ لڑکی ہے مگر "ما" کا لفظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ؎

آگے آگے دیکھیو ہوتا ہے کیا

جب یہ بڑی ہوگی تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ کیسی عظیم الشان لڑکی ہے گویا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی بن گئی مگر وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَنْ وَضَعَتْ کے لحاظ سے محض ایک واقعہ کا اظہار ہوتا۔

اسی طرح فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بسا اوقات شادی بیاہ کے تعلقات محض جذباتی ہوتے ہیں اور انسان عورت کو نہیں دیکھتا بلکہ اُس کی کسی خاص صفت کو دیکھتا ہے۔ بہت سے لوگ عورت کے جمال پر اتنے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ عورت کس خاندان میں سے ہے، اُس کا آنا ہمارے ماں باپ کے لئے یا ہمارے خاندان کے لئے کسی تکلیف کا باعث تو نہیں ہو جائے گا۔ وہ اُس کی صورت پر اتنے عاشق ہوتے ہیں کہ اور تمام باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کئی لوگ صرف مال دیکھ کر شادی کرتے ہیں، کئی لوگ صرف حسب و نسب اور اعلیٰ خاندان دیکھ کر شادی کرتے ہیں، کئی لوگ صرف اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے عورت سے شادی کرتے ہیں اور کئی لوگ صرف اخلاق فاضلہ کی شہرت سُن کر شادی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض کوئی ایک صفت اتنی غالب آ جاتی ہے کہ انسان اُس صفت کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ عورت سے شادی کرے پس فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ میں اللہ تعالےٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم جانتے ہیں تم عورتوں کے ساتھ شادی کرتے وقت تمام وجوہ کو نہیں دیکھتے بلکہ کوئی ایک چیز تمہیں پسند آ جاتی ہے اور تم اُس پر لٹو ہو جاتے ہو۔ کبھی تمہیں حُسن پسند آ جاتا ہے اور تم شادی کر لیتے ہو، کبھی تمہیں مال اچھا لگتا ہے اور تم شادی کر لیتے ہو، کبھی تمہیں خاندان اچھا لگتا ہے اور تم شادی کر لیتے ہو، کبھی تمہیں اخلاق اچھے لگتے ہیں اور تم شادی کر لیتے ہو گویا اس آیت میں انسانی فطرت کے اس جوہر کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ عورت سے شادی نہیں کرتا بلکہ اُس کی کسی صفت سے شادی کرتا ہے۔ کبھی مال کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی حُسن کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی تعلیم کی وجہ سے شادی کرتا ہے کبھی حسب و نسب کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی دین کی وجہ سے شادی کرتا ہے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ (بخاری کتاب النکاح) یہ حدیث بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ شادی کسی صفتِ غالبہ کے لحاظ سے کی جاتی ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت فرمایا کہ جب تم نے صفتِ غالبہ کے لحاظ سے ہی شادی کرنی ہے تو پھر تم وہ "ما" نہ اختیار کرو جو حُسن کا قائم مقام ہو یا حسب و نسب کا قائم مقام ہو یا مال کا قائم مقام ہو بلکہ تم وہ "ما" اختیار کرو جو دین کا قائم مقام ہو۔ یہ عربی زبان کا ایک بہت بڑا کمال ہے کہ الفاظ کے معمولی ہیر پھیر سے اُس میں نئے سے نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنا آخری کلام اس زبان میں نازل فرمایا۔ واقعہ یہی ہے کہ بعض دفعہ کوئی صفت اس قدر غالب آ جاتی ہے کہ وہ وجود کو ڈھانپ دیتی ہے۔ مریمؑ کی ماں کو صرف ایک لڑکی نظر آتی تھی مگر اللہ کو صفتِ مریمیت نظر آتی تھی۔ اسی طرح مرد بعض دفعہ عورت کو بھول جاتا ہے اور اُس کے ساتھ تعلق رکھنے والے باقی سب امور کو نظر انداز کر دیتا ہے صرف اُس کا حُسن یا اُس کا خاندان یا اُس کی کوئی اور ادا اُسے اپنی طرف مائل کر لیتی ہے اُس وقت اس لحاظ سے وہ مَنْ نہیں بلکہ ما ہی ہو جاتی ہے۔ بہرحال جہاں ذات کی بجائے کسی صفت کا غلبہ

مدنظر ہواور اُس صفت پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہو وہاں قرآن کریم مَنۡ کی جگہ "ما" کا لفظ استعمال کرتا ہے پس انہی معنوں سے اس جگہ وَمَا بَنٰهَا کے الفاظ آتے ہیں یعنی یہ بتانے کیلئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت صنعت کو اپنے سامنے رکھو۔

وہ لوگ جنہوں نے اِن معنوں کو قبول نہیں کیا وہ "ما" کو مصدریہ قرار دیتے ہیں۔ قتادہ، مبرّد اور زجّاج یہی کہتے ہیں یہ قول درحقیقت اُن لوگوں کا ہے جو "ما" کو افرادِ ذوی العقل کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتے وہ ہر جگہ مصدر کے معنے کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جس جگہ "ما" آجائے وہ جملہ کو مصدریہ بنا دیتا ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہونگے کہ ہم آسمان اور اُسے بنانے کی یعنی خدا تعالیٰ کی صنعت کی شہادت تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اس صورت میں بھی شہادت تو خدا تعالیٰ کے فعل کی ہی ہوگی مگر براہِ راست آسمان کی بناوٹ کو پیش کرنا سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر "ما" کو مَنۡ کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم تمہارے سامنے آسمان کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اُس صانع عظیم کو کہ جب انسان اس کی صنعت کو دیکھتا ہے تو محو ہو جاتا ہے یعنی تم آسمان کو دیکھو اور جس نے اُسے بنایا ہے اُس کو بھی یعنی اس کی عظیم الشان صنعت کو دیکھو۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی اس صنعت کو دیکھے تو وہ حیران رہ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اُس کی جبروت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے پس چونکہ یہاں خدا تعالیٰ کی صفت پر زور دینا مقصود تھا اور کائناتِ عالم میں سے آسمان کی بناوٹ۔ اُس کی بلندی اور اُس کے فوائد کی طرف بنی نوع انسان کو متوجہ کرنا تھا اس لئے یہاں "ما" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

اسی طرح وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰهَا میں اگر "ما" کو مصدریہ قرار دیا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم شہادت کے طور پر زمین کو پیش کرتے ہیں اور اُس کے بچھے ہوئے ہونے کو بھی۔ لیکن اگر مَا کو مَنۡ کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ تم زمین کو دیکھو اور اُس کے اُس بچھانے والے کو دیکھو جس کی عظیم الشان صنعت کا یہ نمونہ ہے۔

بہت سے سیارے ایسے ہیں جو رہائش کے قابل نہیں اسی طرح بعض زمینیں ایسی ہیں جو انسانی رہائش کے قابل نہیں ہوتیں بعض تو ایسی ہوتی ہیں کہ انسان وہاں رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ ہوا جس پر انسانی زندگی کا تمام دار و مدار ہے وہاں اس قدر ہلکی ہوتی ہے کہ پھیپھڑوں میں جا ہی نہیں سکتی اور بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہاں ہوا تو موجود ہوتی ہے مگر وہ اپنے اندر ایسی کیمیائی ترکیب نہیں رکھتی کہ زندگی کا باعث بن سکے۔ اسی طرح کئی زمینیں ایسی ہیں جہاں انسان جیسی مخلوق ٹھہر ہی نہیں سکتی اگر اس قسم کی مخلوق وہاں ہو تو یا وہ زمین پر چل ہی نہیں سکے گی اور اگر چلے گی تو فوراً گر جائے گی اور یا پھر وہاں کی زہریلی ہوا اُس کو فوراً ہلاک کر دے گی۔ غرض زمین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اُس کے قابل رہائش ہونے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ بعض زمینیں ایسی ہیں جو انسانی رہائش کے قابل نہیں ہیں چنانچہ وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰهَا میں اللہ تعالیٰ اسی صنعت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہاری رہائش کے قابل بنایا ہے اور یہ اُس کا ایک بہت بڑا احسان ہے جس سے اُس نے تمہیں نوازا۔

میں نے دیکھا ہے بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر زمین رہائش کے قابل ہوتی ہے چنانچہ جب وہ قرآن کریم میں اس قسم کے الفاظ دیکھتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان یا اُس کی اِس صنعت کا ذکر ہوتا ہے کہ اُس نے زمین کو انسان کی رہائش کے قابل بنایا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس ذکر کا فائدہ ہی کیا تھا ہم نے بہرحال زمین میں ہی رہنا تھا اگر یہ زمین نہ ہوتی تو کوئی اور زمین ہو جاتی اِس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ وہ لوگ جو اس قسم کے خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں درحقیقت علم ہیئت سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ موجودہ تحقیقات نے اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہوتی۔ بعض زمینیں ایسی ہیں کہ اگر وہاں انسان جائے تو ایک منٹ کے اندر اندر ہلاک ہو جائے حقیقت یہ ہے کہ

کہ قرآن کریم نے ہی سب سے پہلے اس نکتہ کو دنیا پر ظاہر کیا ہے کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہے اور یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ قرآن ایک اُمّی پر نازل ہوا اور اُس زمانہ میں نازل ہوا جبکہ علم ہیئت کی ترقی بالکل محدود تھی اور اس قسم کے مسائل کی طرف کوئی انسانی نظر نہیں جا سکتی تھی اُس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا میں یہ ایک نہایت ہی لطیف راز بیان فرمایا کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہے اس لئے جب تم زمین کو دیکھو تو صانع عظیم کی اس صنعت پر غور کیا کرو کہ کس طرح اُس نے تمہارے لئے اس زمین کو قابلِ رہائش بنایا اور زندگی کے ہر قسم کے سامان اُس نے تمہارے لئے مہیا کئے۔ سپکٹروسکوپ SPECTROSCOPE کی ایجاد کو صرف ستر سال ہوئے ہیں یا اس آلہ کی ایجاد سے پہلے دنیا اس حقیقت سے ناواقف تھی مگر جب سے یہ آلہ ایجاد ہوا ہے علم ہیئت کے ماہرین نے اس راز کا انکشاف کیا ہے کہ ہر ستارہ رہنے کے قابل نہیں ہے وہ ستاروں کی روشنی کا سپکٹروسکوپ کے ذریعہ سے کیمیاوی تجزیہ کرتے ہیں اور اس سے اندازہ لگاتے ہیں کہ اُس ستارہ میں کیا کیا دھاتیں ہیں اور وہاں کی فضا کیسی ہے۔ اس ایجاد کے نتیجہ میں اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر زمین اس قابل نہیں کہ اُس میں رہائش اختیار کی جا سکے مگر اللہ تعالیٰ نے سپکٹروسکوپ کی ایجاد سے تیرہ سو برس پہلے یہ فرما دیا تھا کہ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ہماری اس صنعت پر تم غور کرو کہ ہم نے اس زمین کو تمہاری رہائش کے قابل بنایا ہے۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بھی ایک ویسی ہی زمین ہے جیسے اور زمینیں ہیں بلکہ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ وہ زمین ہے جسے خدا تعالیٰ نے خاص طور پر نسلِ انسانی کی رہائش اور اُس کی آبادی کے قابل بنایا۔ گویا خدا تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ وہ جو بھی کام کرتا ہے اُس کے مناسب حال ایک ماحول بھی تیار کرتا ہے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ انسان پیدا کرتا اور زمین کو اُس کے مناسب حال نہ بناتا۔ یا انسان پیدا کرتا اور وہ زمین سے فائدہ نہ اُٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی شان سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔

ان معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اُس عظیم الشان صنعت پر غور کرو جو آسمان اور زمین دونوں میں کام کر رہی ہے اور جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے آسمان کو اور جس نے اُسے اس طرح بنایا ہے بطور شہادت پیش کرتے ہیں اسی طرح ہم تمہارے سامنے زمین کو اور جس نے اُسے اس طرح بچھایا ہے بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ تم آسمان کو اُس کی بلندی اور رفعت کے لحاظ سے دیکھو اور زمین کو اُس کی ان قابلیتوں کے لحاظ سے دیکھو جن کی وجہ سے انسان اُس میں بسنے کے قابل ہوا ہے اور سمجھ لو کہ آسمانی اور زمینی شہادتیں جس کے حق میں ہوں وہ جھوٹا کس طرح ہو سکتا یا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اِدھر اللہ تعالیٰ آسمان بناتا جو بڑا مضبوط اور اعلیٰ درجے کا ہے دوسری طرف وہ زمین کو اس قابل بناتا کہ اُس میں بنی نوع انسان رہائش اختیار کر سکیں اور پھر یہ تمام کارخانۂ عالم محض عبث ہوتا اور انسانی پیدائش کا کوئی مقصد نہ ہوتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اُس نے زمین کو بہت سے دوسرے سیّاروں سے مختلف شکل دی ہے وہاں ذی روح زندہ نہیں رہ سکتے، وہ سانس نہیں لے سکتے، وہ چل پھر نہیں سکتے۔ مگر یہ زمین خدا تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اِس میں ذی روح افراد سانس لے سکتے ہیں، اُن کے دماغ پوری طرح کام کر سکتے ہیں اور وہ اپنی ہر ضرورت اس ماحول میں سے مہیا کر سکتے ہیں۔ ورنہ ایسی زمین بھی ہو سکتی تھی کہ مختلف گیسوں کی وجہ سے حیوان تو اُس میں بس سکتے مگر انسان نہ بس سکتا۔ مگر چونکہ انسان کے لئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت تھی جس میں اُس کا دماغی نشو و نما جاری رہتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر ایسی قابلیتیں پیدا کر دیں کہ انسان اس میں بلا دریغ رہائش اختیار کر کے اپنے دماغی ارتقاء کو جاری رکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی اس مثال کو پیش کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ جب اُس نے اتنا بڑا کارخانہ

بنایا ہے اور اس کارخانہ کا ہر پُرزہ انسان کی خدمت کے لئے لگا ہُوا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہاری پیدائش اپنے اندر کوئی حکمت نہ رکھتی ہو اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے بلاوجہ محض لغو طور پر دنیا میں پیدا کر دیا ہو۔ ادھر آسمان کو نہایت مضبوط اور اعلیٰ درجہ کا بنانا، اُدھر زمین کو رہائش کے قابل بنانا اور اس طرح قانونِ قدرت کا ایک وسیع اور طویل نظام کی شکل اختیار کر لینا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کام عبث نہیں جب تم اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تیاری کو عبث نہیں کہتے تو تم اتنے بڑے نظام کو عبث کس طرح قرار دے سکتے ہو تمہیں بہرحال ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بہت بڑا مقصد اور بڑا بھاری مدعا ہے جو اس کارخانۂ عالم کے پیچھے کام کر رہا ہے اور ضرور ہے کہ اُس کا وہ منشاء ایک دن ظاہر ہو اور وہ مقصد پورا ہو جس کے لئے اُس نے آسمان اور زمین کا یہ نظام قائم فرمایا تھا۔ اگر مادیات میں اُس نے ایک طرف آسمان میں بلندی اور فیوض کی طاقت رکھی ہے اور دوسری طرف زمین میں رہائش اور دماغ کو نشوونما دینے کی قابلیت رکھی ہے تو یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ وہ تمہارے جسمانی آرام کا تو خیال رکھے اور روحانی آرام کو نظر انداز کر دے۔ وہ تمہارے چند روزہ فوائد کے لئے تو اتنا بڑا کارخانہ جاری کر دے اور تمہارے ابدی فوائد کے لئے کوئی نظام قائم نہ کرے۔ جس خدا نے جسمانیات کے لحاظ سے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا وہ روحانیات کے لحاظ سے بھی تمہارا ساتھ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ تم زمین اور آسمان پر اگر تخلی بالطبع ہو کر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ جس خدا کی طرف سے تمہارے جسمانی آرام کے لئے اس قدر سامان مہیا کئے گئے ہیں اُسی خدا کی طرف سے تمہارے روحانی ارتقاء کے لئے بھی ایسے قوانین کا آنا ضروری ہے جو تمہارے اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیں تاکہ جس طرح اُس نے زمین کو جسمانیات کے لحاظ سے رہنے کے قابل بنایا ہے اسی طرح وہ روحانیات کے لحاظ سے بھی اس کو رہنے کے قابل بنائے ورنہ خدا تعالیٰ پر یہ الزام عائد ہو گا کہ اُس نے جسم کا تو خیال رکھا مگر رُوح کا خیال نہ رکھا۔ اُس نے مادی ترقی کے سامان تو مہیا کئے مگر رُوحانی ترقی کے سامان مہیا نہ کئے۔ اور یہ ایک ایسا الزام ہے جسے خدا تعالیٰ کی صفات بالکل رد کرتی ہیں۔ اُس نے جسمانی نظام کے بالمقابل ایک روحانی نظام بھی قائم کیا ہے اور جس طرح جسم کی ترقی کے اس نے سامان کئے ہیں اسی طرح رُوح کی ترقی کے بھی اُس نے سامان کئے ہیں۔ نادان انسان جسمانیات کو دیکھتا اور روحانیات سے آنکھیں بند کر لیتا ہے حالانکہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے زمین کو جسمانی لحاظ سے تو رہائش کے قابل بنائے مگر روحانی لحاظ سے وہ اُس کو قابل رہائش بنانے کا کوئی انتظام نہ کرے۔ یا تو یہ کہو کہ مادی لحاظ سے بھی زمین میں یہ قابلیت نہیں کہ اُس میں انسان رہ سکیں اور اگر تم یہ نہیں کہہ سکتے تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ روحانی لحاظ سے بھی اُس میں یہ ضرور قابلیت پائی جاتی ہے اور وُہی قابلیت ہے جس کے ماتحت وہ لوگ جو آج اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو قبول کرنے کے لئے دوڑتے چلے آئیں گے تم خواہ کس قدر زور لگا لو فطرتِ انسانی میں نیکی پائی جاتی ہے اور وہی نیکی ہے جو ایک دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گی۔ جس طرح زمین اپنے آپ کو آسمانی فیوض سے الگ نہیں کر سکتی اسی طرح انسانی قلوب بھی آسمانی وحی سے الگ نہیں رہ سکتے ضرور ہے کہ وہ ایک دن متاثر ہوں اور اس طرح جسمانی اور روحانی نظام کی ایک دن مطابقت ثابت ہو۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا کے دوسرے معنے

دوسری صورت میں اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تم آسمان اور اُس کی بناوٹ کو دیکھو اور سمجھ لو کہ آسمان کی بناوٹ ہی فیض رسانی کے لئے ہے اور زمین کی بناوٹ ہی سائل اور مانگنے والے کی ہے پس بغیر اس آسمانی نورانی وجود کے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ہے تم لوگ کوئی بھی خوبی ظاہر نہیں کر سکتے آسمان کا کام آسمان ہی کر سکتا ہے اور زمین اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی کہ وہ آسمان کی طرف مُنہ کرے اور اُس کے فیوض کو حاصل کر کے زندگی حاصل کرے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝

اور انسانی نفس کی اور اس کے بے عیب بنائے جانے کی ۵

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں آسمان سے مراد صرف جوّ نہیں ہوتا بلکہ تمام ستارے، سیارے اور روشنیاں وغیرہ اس سے مراد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جس طرح انکے بغیر زمین کام نہیں دیسکتی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر تم بھی کوئی خوبی ظاہر نہیں کرسکتے اور جس طرح آسمانی فیوض سے زمین انکار نہیں کرسکتی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فیوض سے بھی تم ہمیشہ کے لئے انکار نہیں کرسکتے اگر زمین کے سامنے سورج آئے تو کیا زمین اُس وقت کہہ سکتی ہے کہ مَیں روشنی نہیں لیتی۔ وہ مجبور ہے کہ سورج سے روشنی حاصل کرے۔ اسی طرح جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوگئے ہیں تو اب دنیا آپ کا زیادہ دیر تک انکار نہیں کرسکیگی وہ ضرور آپ پر ایمان لائے گی۔ اس مضمون کی وضاحت اللہ تعالےٰ نے اگلی آیت میں فرمائی ہے۔

۵ حل لغات۔ سَوّٰی کے لئے دیکھو حل لغات ۳ سورۃ الاعلیٰ جلد ہشتم۔

تفسیر۔ پہلی آیت کی طرح اِس آیت کے بھی دو[۲] معنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نفس کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں اور اُس کو بھی جس نے اُسے معتدل القویٰ بنایا۔ سَوّٰی کے معنے معتدل القویٰ بنانے کے ہوتے ہیں اور سورۃ الاعلیٰ کے تفسیری نوٹوں میں اس کا مفصل ذکر آچکا ہے جس طرح پہلی آیت میں یہ بتایا تھا کہ ہم نے زمین کو قابلِ رہائش بنایا اسی طرح یہاں یہ بتایا ہے کہ ہم نے نفس کا تسویہ کیا اور اُس میں ایسی قوت پیدا کی ہے کہ وہ اعتدال سے ترقی کی طرف جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اگر تمہارے نفس میں یہ شہادت موجود نہ ہوتی اور جس طرح ہم نے زمین کو طحی کیا ہے اسی طرح تمہارے نفوس کا تسویہ نہ کیا ہوتا تو تم کہہ سکتے تھے کہ ہم پر یہ مثال چسپاں نہیں ہوسکتی لیکن جب نفوسِ انسانی میں اعتدال کو اختیار کرکے ترقی کرنیکا مادہ پایا جاتا ہے تو تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ نفسِ انسانی خود اس امر پر شاہد ہے کہ کوئی نور اُسے آسمان سے ملنا چاہیئے جس طرح زمین آسمانی روشنی کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح تم آسمانی نور کے محتاج ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اگر آسمان سے پانی نہ برسے تو زمین کی تمام سرسبزی و شادابی مٹ جاتی ہے۔ اُس کے درخت مرجھا جاتے ہیں، اُس کے پانی خشک ہوجاتے ہیں، اُس کی روئیدگیاں گل سڑ جاتی ہیں اور وہی زمین جو اپنی لطافت سے انسانی آنکھوں میں نور پیدا کررہی ہوتی ہے ایک لمبے عرصہ تک بارش نہ ہونے کے نتیجہ میں ایسی بنجر اور ویران ہوجاتی ہے کہ اُسے دیکھ کر انسان گھبرا جاتا ہے یہی حال عالمِ روحانی کا ہے آسمان سے جب تک وحی و الہام کا پانی نازل نہ ہو روحانیت کے تمام کھیت مُرجھا جاتے ہیں تمام روئیدگیاں گل سڑ جاتی ہیں اور وحی والہام کی بارش منقطع ہونے سے ارتقاءِ دماغی بھی بند ہوجاتا ہے اُس وقت یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جس طرح آسمان کا زمین کے ساتھ تعلق ہے اسی طرح وحی والہام کا قلوبِ انسانی کے ساتھ تعلق ہے۔ اگر آسمان زمین کی ہوا کو صاف نہ کرتا رہے تو انسانوں کا زندہ رہنا مشکل ہوجائے کیونکہ وہ گندی ہوا جو سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں سے خارج ہوتی ہے جمع ہوتی رہے اور وہی دوبارہ انسان کو اندر لے جانی پڑے مگر اللہ تعالےٰ نے یہ قانون بنادیا ہے کہ گرم ہوا اوپر اُٹھتی ہے اور اُس کی جگہ سرد ہوا آجاتی ہے جو ہر قسم کے مضر اثرات سے پاک ہوتی ہے۔ اگر کسی کمرہ میں پانچ سو یا ہزار آدمی بیٹھے ہوں اور اُن کے سانس کی ہوا اُوپر کو نہ جائے اور نہ اُس کی جگہ تازہ ہوا آئے تو چند منٹ میں ہی تمام لوگ مرجائیں مگر اب کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے تنفس کر

سَوّٰی[۱]

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا[۲] کے دو معنے

ہوا کو کس قدر گندہ کر رہے ہیں کیونکہ آسمان ساتھ ہی ساتھ صفائی کا کام کر رہا ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ ضرورت سے بھی زیادہ آدمی ایک کمرہ میں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو اُن کو کوئی نقصان نہیں ہوتا کیونکہ انسان جس ہوا کو گندہ کرتا ہے آسمان اُسے اُٹھا کر لے جاتا ہے اور اُس کی جگہ پاکیزہ ہوا میسر آجاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زمین بغیر آسمانی اشتراک کے کوئی کام نہیں کر سکتی۔ اب بتاتا ہے کہ جس طرح زمین میں مختلف قسم کی قابلیتیں پائی جاتی ہیں اسی طرح نفسِ انسانی میں بھی مختلف قسم کی قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ انسان کے اندر ایک تڑپ ہے ترقی کی، پیاس ہے صداقت کی، ندامت ہے غلطی پر اور ہر شے کی حقیقت معلوم کرنے کی اس کے اندر جستجو ہے۔ بچہ ابھی بولنا ہی سیکھتا ہے تو ماں باپ کا دماغ چاٹ لیتا ہے اور بات بات پر پوچھتا ہے یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔ لیمپ نظر آتا ہے تو پوچھتا ہے یہ کیا ہے، بلی نظر آتی ہے تو پوچھتا ہے یہ کیا ہے، کتا نظر آتا ہے تو پوچھتا ہے یہ کیا ہے، غرض ہر نئی چیز جو اُس کے سامنے آتی ہے اُس کے متعلق وہ اپنی ماں یا اپنے باپ سے یہ ضرور دریافت کرتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ یورپ میں کئی کئی جلدوں میں اس قسم کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بچوں کے ان سوالات کے جوابات درج ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب بچہ اس قسم کے سوالات کرتا ہے درحقیقت وہی وقت اُس کے دماغی نشوونما کا ہوتا ہے مگر ماں باپ کو چونکہ خود اُن سوالات کا صحیح جواب معلوم نہیں ہوتا وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُس کے سوال کو نظر انداز کر دیتے ہیں جب وہ بجلی کے متعلق پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے تو ہر شخص فوراً جواب نہیں دے سکتا کہ یہ کیا ہے اگر وہ کہیگا کہ بجلی ہے تو بچہ کہیگا بجلی کیا ہوتی ہے؟ اس پر کئی لوگوں کو خاموش ہونا پڑتا ہے اور کئی یہ کہہ کر بچے کو خاموش کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں اس کا پتہ نہیں یہ لیمپ ہے جو جل رہا ہے۔ پس چونکہ اکثر ماں باپ بچوں کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے اس لئے یورپ میں اس قسم کی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بڑی بڑی علمی باتیں آسان الفاظ میں بیان ہوتی ہیں تاکہ جب بچہ تم سے پوچھے کہ یہ کیا ہے یا وہ کیا ہے تو تم ایسا جواب دے سکو جو صحیح ہو اور جسے بچہ سمجھ سکے۔ پھر بچہ میں ایک یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ جب اُس سے کوئی غلط بات کہہ دو تو وہ رونے لگ جاتا ہے اگر روٹی پڑی ہو اور کہہ دو کہ روٹی نہیں ہے تو وہ چیخیں مار کر رونا شروع کر دے گا یا بچہ بیمار ہو اور تم اُسے کہہ دو کہ تم بیمار نہیں ہو تو وہ جھٹ رونا شروع کر دے گا کیونکہ اُس میں یہ حس پائی جاتی ہے کہ میرے سامنے سچی بات بیان کی جائے۔ اسی طرح کوئی کھلونا بچے کو دے دو تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ اُسے توڑ پھوڑ دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پہلے وہ اُس کی شکل سے اُس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب شکل سے اُسے کچھ معلوم نہیں ہوتا تو وہ سمجھتا ہے شاید اس کے اندر کوئی حقیقت پائی جاتی ہے چنانچہ وہ اس حقیقت کی جستجو میں اُسے توڑ دیتا ہے اور پھر توڑ کر خود ہی رونے لگ جاتا ہے لوگ حیران ہوتے ہیں کہ خود ہی اس نے کھلونا توڑا ہے اور خود ہی رونے لگ گیا ہے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بچہ روتا اس لئے ہے کہ میں نے تو کھلونا اس لئے توڑا تھا کہ مجھے پتہ لگے اس کے اندر کیا ہے مگر مجھے پھر بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ وہ اس لئے نہیں روتا کہ کھلونا کیوں ٹوٹا ہے کیونکہ وہ تو اُس نے خود توڑا ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کھلونے کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اُس کو توڑتا ہے مگر جب اُس کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی تو رونے لگ جاتا ہے، سمجھتا ہے کہ کھلونا بھی گیا اور یہ بھی پتہ نہ لگا کہ اُس کی کیا حقیقت تھی۔ پھر جب بڑا ہوتا ہے تو مختلف علوم کا اُسے شغف ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ شغف بھی اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے ہوتا ہے کبھی بچے باہر جاتے ہیں اور وہ کسی لوہار کو کام کرتا دیکھتے ہیں تو وہیں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ کام کس طرح کرتا ہے۔ کبھی کسی نجار کو دیکھتے ہیں تو اس کے کام کو دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اپنی اپنی مناسبت کے

لحاظ سے کسی کو لوہارے کام کا شوق ہو جاتا ہے کسی کو نجاری کا کام پسند آجاتا ہے، کسی کو معماری کا کام پسند آجاتا ہے، کسی کو کوئی اور کام پسند آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک ملازمہ کا لڑکا ہے اس کو یہی شوق ہے کہ بڑا ہو کر میں کاتب بنونگا معلوم ہوتا ہے اُس نے کسی کاتب کو نہایت خوشخط حروف لکھتے دیکھا تو اُس کو بھی خیال آگیا کہ میں بھی بڑا ہو کر کاتب بنونگا اور اسی طرح خوبصورت طریق پر لکھا کروں گا۔

ہمارے ملک کی تباہی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بچوں کے مذاق اور اُن کی طبیعت کی مناسبت کا خیال نہیں رکھا جاتا اور بڑے ہو کر اُن کو ایسے کاموں پر لگا دیا جاتا ہے جن کے ساتھ اُن کی طبیعت کی کوئی مناسبت نہیں ہوتی نہ اُن کاموں کی طرف اُن کا کوئی ذاتی میلان ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر کام کرنے کے باوجود وہ ترقی سے محروم رہتے ہیں۔ حالانکہ طریق یہ ہونا چاہیئے کہ یا تو بچوں کے مذاق اور انکی طبیعت کے مطابق اُن کے لئے کام مہیا کیا جائے اور یا پھر بچپن میں ہی اُن کے اندر وہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو رنگ ماں باپ اُن میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں نہ والدین بچہ میں اپنی مرضی کا صحیح مذاق پیدا کرتے ہیں نہ اُس کے مذاق اور طبیعت کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس طرح اُس میں دوغلہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو چونکہ اُس کا طبعی میلان اور ہوتا ہے اور سپرد شدہ کام اور ہوتا ہے اس لئے اُس کے نفس میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس کا دماغ بالکل کُند ہو جاتا ہے۔ آئندہ نسلوں کی درستی اور قوموں کی ترقی کی صرف دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو وعظ اور نصیحت سے بچوں کو صحیح مذاق کی طرف لایا جائے اور اُن کے لئے بچپن سے ہی ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ وہ وہی کچھ سوچنے لگیں جو ہم چاہتے ہیں اور وہی کچھ دیکھنے لگیں جو ہم چاہتے ہیں۔ اور اگر ہم اُن کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی مرضی کا صحیح مذاق اُن میں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ بچوں کے مذاق کو ملحوظ رکھا جائے۔ اگر کوئی انجنیئر بننا چاہتا ہے تو اُسے انجنیئر بنا دیا جائے، اگر کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو اُسے ڈاکٹر بنا دیا جائے، اگر کوئی مدرس بننا چاہتا ہے تو اُسے مدرس بنا دیا جائے کیونکہ ہم نے اُس کے اندر اپنا وجود پیدا نہیں کیا اور جب اپنا وجود ہم نے اس کے اندر پیدا نہیں کیا تو اب اگر اُس کے ذاتی مذاق کو بھی ہم ٹھکرا دیں تو یہ بالکل بچوں والی بات ہو جائے گی جو کھلونے لیکر توڑ دیتے ہیں مگر پھر بھی اُن کو حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ ہم بھی اس ذریعہ سے قوم کے ایک مفید حصہ کو ضائع کرنے والے قرار پائیں گے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں مختلف علوم میں انسان کا شغف اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ بعض دفعہ غیب معلوم کرنے کیلئے اپنی عقل سے راستے تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے چنانچہ یورپ کو دیکھ لو وہ علوم میں کس قدر ترقی کر چکا ہے۔ مگر ادھر تو یہ حال ہے کہ یورپ خدا تعالےٰ کا انکار کر رہا ہے، مذہب سے بالکل لاپروا ہے اور اُدھر اس کی حماقت کا یہ حال ہے کہ ذرا کوئی کہہ دے میں ہتھیلی دیکھ کر آئندہ کے حالات بتا سکتا ہوں تو بڑے بڑے لائق پروفیسر اور وکیل اور ڈاکٹر اور انجنیئر اپنے ہاتھ کھول کر اُس کے سامنے بیٹھ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں آئندہ کے حالات بتایئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر فطرتی طور پر یہ مادہ ہے کہ وہ حقیقتِ عالم اور رازِ کائنات کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنے جھوٹے علم پر غرور کرتے ہوئے خدا تعالےٰ کا تو انکار کر دیا مگر فطرت میں جو جستجو تھی کہ اس دنیا کا ایک منبع ہے جس کو دریافت کرنا چاہیئے اس جستجو کو وہ نہ مٹا سکے چنانچہ غیب معلوم کرنے کے لئے ہاتھ دکھانا صاف بتا رہا ہے کہ انسان کی اس مادی دنیا سے تسلی نہیں ہو سکتی وہ علوم ماوراء الطبعیات کے حصول کے لئے ہر وقت پریشان رہتا ہے اور یہی پیاس ہے جو اُسے کبھی کسی راستہ پر لے جاتی ہے اور کبھی کسی راستہ پر۔ کوئی پامسٹری میں لگا ہوا ہے، کوئی تاش کے پتوں سے غیب معلوم کرنا چاہتا ہے، کوئی ستاروں کو دیکھ کر اُن سے آئندہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی

زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر غیب معلوم کرتا ہے، کوئی تسبیح کے منکے مار مار کر یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے غیب کی کوئی خبر معلوم ہو جائے۔ طاق منکا آجائے تو کہتے ہیں کامیابی ہوگی اور اگر جفت آجائیں تو کہتے ہیں ناکامی ہوگی۔ اسی طرح بعض لوگ قرعہ ڈالتے ہیں، بعض تیروں سے آئندہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ خواہش کہ رازِ کائنات دریافت کئے جائیں ہر شخص میں پائی جاتی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ اس کیلئے صحیح طریق اختیار کرتا ہے یا غلط۔ میں ایک دفعہ کراچی گیا تو مجھے معلوم ہؤا کہ منڈی میں کپاس کی قیمت بڑھنے لگی ہے اُس وقت بظاہر آثار ایسے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کپاس کی قیمت گر جائے گی مگر ہؤا یہ کہ اُس کی قیمت بڑھ گئی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ بات کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ امرتسر سے ایک سادھو آیا ہؤا اُس سے تاجروں نے آئندہ کے بعض حالات دریافت کئے تو اُس نے کہا کہ کپاس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ یہ سنتے ہی تمام تاجروں نے کپاس خریدنی شروع کر دی اور اُس کی قیمت بڑھ گئی۔ مگر چونکہ کوئی حقیقی طاقت اس کے پیچھے نہیں تھی دو چار دن تو قیمت چڑھی مگر پھر کم ہونے لگی اور اس قدر کم ہو گئی کہ کئی تاجروں کے دیوالے نکل گئے۔ طبعی اصول تو یہ ہے کہ چیز کم ہو اور کارخانوں کی مانگ زیادہ ہو اُس وقت قیمت بے شک بڑھتی ہے لیکن اگر چیز کافی ہو اور کسی عارضی وجہ سے گاہک زیادہ آگئے ہوں تو اس کی قیمت میں عارضی طور پر اضافہ ہو سکتا ہے چنانچہ اس کے بعد کراچی کے کئی تاجروں کے دیوالے نکل گئے کیونکہ بمبئی والوں نے اُس قیمت پر روئی خریدنے سے انکار کر دیا، نیویارک والوں نے انکار کر دیا، لنکاشائر والوں نے انکار کر دیا، اور اس طرح ہزاروں دیوالیہ ہو گئے۔ اب یہ ایک حماقت کی بات تھی کہ کسی سادھو سے دریافت کیا جائے کہ آئندہ کے حالات بتاؤ اور پھر جو کچھ وہ اناپ شناپ بتا دے اُس کے مطابق عمل شروع کر دیا جائے مگر اس حماقت کا ارتکاب اُن سے اسی لئے ہؤا کہ انسان چاہتا ہے مجھے علمِ غیب کا کسی طرح پتہ لگ جائے اور اس کے لئے بعض دفعہ ایسے ایسے احمقانہ طریق اختیار کرتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔ غرض انسانی فطرت میں رازِ کائنات معلوم کرنے کی جستجو پائی جاتی ہے اور یہ علوم خواہ کتنے غلط ہوں اس امر پر ایک کھلی شہادت ہیں کہ انسان علوم ماوراء الطبعیات کی پیاس رکھتا ہے اور اُن کے بغیر اُسے چین نہیں آتا۔ پھر وہ علوم دنیاوی کی تحقیق میں لگتا ہے، کہیں آسمانی عالم کی کھال اُدھیڑنے لگتا ہے، روشنیوں کو پھاڑ تا ہے ستاروں کی چالیں دیکھ دیکھ کر آئندہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر زمین کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو کہیں کانیں دریافت کرتا ہے، کہیں خزانوں کی دریافت کرتا ہے، کوئی شخص پیتل کی، کوئی لوہے کی، کوئی سونے اور کوئی چاندی کی کانیں دریافت کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے، کوئی جڑی بوٹیوں کے خواص معلوم کرتا ہے اُن کی تحقیق پر تحقیق کرتا چلا جاتا ہے، کوئی دھاتوں کے کُشتے بناتا ہے، کوئی ہوا، کوئی پانی۔ کوئی بجلی، کوئی آگ اور کوئی دخان کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ذرا ذرا سی بات پر جنات کے خیال میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کسی نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ میں نے فلاں عمل پڑھا تھا اُس کی اس قدر تاثیر ہوئی کہ بس جنات قابو ہوتے ہوتے رہ گئے۔ وہ سنتا ہے تو اُس کے سر پر بھی جنون سوار ہو جاتا ہے اور وہ بھی جنات کو قابو میں لانے کے لئے سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔ جس طرح کیمیاگر دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے کہہ دیا کرتے ہیں کہ میں نے فلاں نسخہ بنایا اور سونا بنتے بنتے رہ گیا۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ مَیں نے فلاں عمل کیا تو جنات قابو ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دوسرا شخص سُنتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ تو قابو نہ کر سکا مگر میں اُن کو ضرور قابو کر لوں گا چنانچہ وہ کسی میدان میں اپنے اردگرد لکیریں کھینچ کر بیٹھ جاتا اور مُنہ سے بُڑ بُڑانے لگ جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ابھی جنات میرے قابو میں آجائیں گے۔ اگر مادی تغیرات ہی کافی سمجھے جاتے تو عاقل اور جاہل دونوں اس قسم کی جدوجہد میں کیوں مشغول ہوتے۔ آخر وجہ کیا ہے کہ یورپ کا عاقل بھی اِسی میں مشغول ہے اور ہندوستان کا جاہل بھی اسی میں مشغول ہے۔ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ خالص مادی علوم سے انسانی قلب تسلّی نہیں پاتا بلکہ وہ ماوراء الطبعیات علوم کی جستجو چاہتا ہے۔

غرض ہر طرف سے مادی عالم میں سرنگ لگانے کی یہ جدوجہد بتاتی ہے کہ اس کے اندر کسی بالائی طاقت کو پانے کی ایک تڑپ ہے جو کبھی کبھی مادی بوجھوں میں دب کر سب کانشس حالت میں چلی جاتی ہے یعنی یہ حقیقت کہ خدا ہے اور اُس نے دنیا بنائی ہے غائب ہو جاتی ہے مگر اُس کی جدوجہد بتا رہی ہوتی ہے کہ اُس کے پیچھے بے جانے وہی جذبہ کارفرما ہے۔ بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ جاگتے ہوئے انسان اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب وہ سو جاتا ہے تو اُس کے قلب کے اندرونی خیالات بعض دفعہ اُس کی حرکات سے ظاہر ہو جاتے ہیں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کی کوئی چیز چُرا لیتے ہیں دن بھر تو وُہ اپنے نفس کو قابو میں رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو اُن کی اس چوری کا علم نہ ہو مگر چونکہ سارا دن اُن کے دماغ پر یہی خیال مسلّط رہتا ہے اس لئے جب وہ سوتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد ہی بُڑبڑانے لگتے ہیں اور اُن کی چوری کا لوگوں کو علم ہو جاتا ہے۔ بہت سے چور ایسے ہوتے ہیں جن کا لوگوں کو پتہ نہیں لگتا مگر چونکہ ہر وقت انہیں یہی خیال رہتا ہے کہ کہیں لوگوں کو ہماری چوری کا علم نہ ہو جائے اس لئے جب وہ سوتے ہیں خواب کی حالت میں بُڑبڑانے لگتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں دیکھنا دیکھنا فلاں کونہ میں نہ جانا وہاں میرا مال پڑا ہے۔ دیکھنا کہیں پولیس کو خبر نہ دے دینا۔ کبھی بُڑبڑاتے ہوئے کہیں گے میں نے فلاں کو خوب لُوٹا ہے۔ لوگ ان باتوں کو سُنتے ہیں تو انہیں فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ یہی چور ہے چنانچہ تحقیق پر تمام مال برآمد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض قاتل ایسے ہوتے ہیں جو جاگتے ہوئے تو اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب سو جاتے ہیں بُڑبڑانے لگتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں ارے فلاں شخص کی رُوح آ گئی ہے، ارے مجھے کیوں مارتے ہو، مجھے معاف کر دو میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ ہمسایہ ان آوازوں کو سُنتا ہے تو اُسے پتہ لگ جاتا ہے کہ یہی شخص قاتل ہے۔ تو انسان کے سب کانشس مائینڈ (غیر شعوری دماغ) میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جب اُس کا کانشس مائینڈ (شعوری دماغ) غافل ہوتا ہے تو سب کانشس مائینڈ اُن خیالات کو ظاہر کر دیتا ہے جیسے سوتے ہوئے یا رویا میں یا مسمریزم کے ماتحت دوسروں کی زبان سے کئی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی طرح دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں مگر اُن کی زندگی کے حالات اُن کے سب کانشس مائینڈ کی کیفیات کو ظاہر کر رہے ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی اور ہستی کی تلاش کی خواہش مٹانے میں کامیاب ہو گئے ہیں مگر اُن کے حالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خواہش کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے وہ صرف اُن خیالات کو دھکیل کر عارضی طور پر پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوتے ہیں مستقل طور پر نہیں۔ اور چونکہ یہ تڑپ اکثر سب کانشس حالت میں رہتی ہے انسان اُس کا اقرار نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی جھک کر جس طرح بچہ جب کھلونے کی ساخت کو سمجھ نہیں سکتا تو اُسے بُتّوں سے توڑنے لگتا ہے یہ بھی چڑ کر کسی پیدا کرنے والے کا انکار کر دیتا ہے اور آپ ہی آپ بنے ہوئے عالم کا وجود تسلیم کرنے لگتا ہے۔

گھروں میں اکثر یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ جب بچہ کسی کھلونے کو توڑ پھوڑ دیتا ہے تو بعض دفعہ کھسیانا ہو کر کہہ دیتا ہے کہ مجھے کھلونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ وُہ اس بات کا غصہ نکالتا ہے کہ میں نے کھلونا بھی توڑا اور مجھے اسکی حقیقت کا بھی علم نہ ہُوا۔ دہریہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں وہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کرتے ہیں ورنہ اُن کے سب کانشس مائینڈ میں خدا تعالیٰ کی ہستی کی شہادت موجود ہوتی ہے اور وہ اِدھر اُدھر اُس کو تلاش بھی کرتے ہیں مگر جب وہ ہستی اُن کو ملتی نہیں تو اُس کا انکار کر دیتے ہیں اور جس طرح بچہ کہتا ہے مجھے کھلونے کی ضرورت نہیں وہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں۔ بعض دفعہ ماں اپنے بچہ سے دل لگی کے طور پر کہہ دیتی ہے کہ میں نے فلاں چیز تجھے نہیں دینی۔ بچہ سُنتا ہے تو مُنہ بسورتے ہوئے کہہ دیتا ہے کہ میں نے یہ چیز لینی ہی نہیں مگر پھر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ کسی طرح یہ چیز مجھے مل جائے۔ اسی طرح انسان بعض دفعہ کھسیانا ہو کر کہہ دیتا ہے کہ مجھے خدا کی ضرورت نہیں مگر

اس سے بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی کیونکہ خود اسکی کوشش بتا رہی ہوتی ہے کہ اس کا یہ نتیجہ غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ آپ ہی آپ ہے اسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ہم اُس چیز کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر کسی دریا کے کنارے صرف دو میل تک چل کر کوئی شخص کہہ دے کہ اس دریا کا کوئی منبع نہیں تو یہ اُس کی حماقت ہوگی اگر وہ چلتا چلا جائے تو اُسے بہرحال اس کا منبع مل جائے گا۔ اسی طرح جب تک دنیا کے انتہائی سبب کو معلوم نہ کیا جائے یہ کہنا کہ دنیا کا کوئی خدا نہیں احمقانہ بات ہے یہ نتیجہ تو منتہائے اسباب پر پہنچکر نکالا جا سکتا ہے اس سے پہلے نہیں اور اگر اس کا یہ نتیجہ درست ہے تو اسے مزید تجسس اور تحقیق بند کر دینی چاہئے مگر یہ پھر بھی مزید تجسس اور جستجو میں لگا رہتا ہے بلکہ اب بھی نئی سے نئی باتیں نکل رہی ہیں اور جستجو اور تلاش کا ایک دریا ہے جو دنیا میں جاری ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ لوگ ابھی منبع تک نہیں پہنچے اور جب وہ منبع تک پہنچے ہی نہیں تو منبع کی تعیین کرنے کا اُنہیں کیا حق ہے؟ اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ ہم نے تمہارے قویٰ میں اعلیٰ درجہ کی طاقت پیدا کی ہے اور ایسا مادہ ہم نے تمہارے اندر ودیعت کیا ہے کہ تم پُل صراط پر چلنے کی قابلیت رکھتے ہو۔ پُل صراط پر وہی شخص چل سکتا ہے جو دائیں طرف گرنے سے بھی بچتا ہے اور بائیں طرف گرنے سے بھی بچتا ہی اور پھر اپنے اندر یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھتا چلا جائے گویا انسان میں اللہ تعالےٰ نے اِدھر ترقی کا مادہ پیدا کیا ہے اُدھر اُسے اپنا دایاں اور اپنا بایاں پہلو مضبوط بنانے کی طاقت عطا فرمائی ہے جب اُس نے انسان کو اس طرح معتدل القویٰ بنایا ہے تو کیس طرح ممکن تھا کہ وہ اُس کے لئے راستہ نہ بناتا اور منزلِ مقصود پر اُسے نہ پہنچاتا۔ انسان کی منزلِ مقصود خدا تعالےٰ ہے اور وہ اس منزلِ مقصود پر اُسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ دائیں طرف کا بھی خیال رکھے اور بائیں طرف کا بھی خیال رکھے معتدل القویٰ وہی شخص ہوتا ہے جو کسی ایک طرف کو جھکا ہوا نہ ہو۔ اسی طرح جب خدا تعالےٰ نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ اپنے اندر ایسی قابلیت رکھتا ہے کہ دائیں طرف گرنے سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے اور بائیں طرف گرنے سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔ انسان کی تمام تر کامیابی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ دائیں بائیں گڑھوں سے بچ کر سیدھا چلے اور منزلِ مقصود سے ورے نہ ٹھہرے۔ یہی دو چیزیں مذہب کی جان ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ مذہب کی بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ انسان خدا تعالےٰ سے بھی اعلیٰ درجہ کا تعلق رکھے اور بنی نوع انسان سے بھی اعلیٰ درجہ کا تعلق رکھے۔ نہ حقوق اللہ کے بجا لانے میں کوئی کوتاہی کرے اور نہ حقوق العباد کی بجاآوری میں کوئی کوتاہی کرے۔ غرض انسان کو ایک معتدل القویٰ نفس عطا کیا گیا ہے اُس میں ترقی کا مادہ ہے جو اعلیٰ درجہ کے مقصود تک پہنچنے کے لئے ہے۔ پھر اُس میں اپنے دائیں اور بائیں کو محفوظ رکھنے کا مادہ ہے جس سے اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فلاں کام مجھے کرنا چاہیئے اور فلاں نہیں۔ فلاں کام میرے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ جب انسان کے اندر یہ تمام قابلیتیں پائی جاتی ہیں تو تم کسی راہنما اور معلّم کا کیونکر انکار کر سکتے ہو؟

(۲) مصدری معنوں کے لحاظ سے اس کا یہ مطلب ہوگا کہ انسان معتدل القویٰ ہے اس لئے اس کا معتدل القویٰ ہونا کسی راہنما کی طرف بلاتا ہے گویا دلیل ایک ہی ہے صرف نقطۂ نگاہ کو بدلا ہے۔ پہلے معنوں کے لحاظ سے یہ کہا گیا ہے کہ انسان کو معتدل القویٰ بنانے والا اُس کی راہنمائی کی صورت کیوں پیدا نہ کرے گا اور دوسرے لحاظ سے یہ معنے ہونگے۔ کہ اُس کا معتدل القویٰ ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ کوئی اس اعتدال کو کام میں لانے والا راہنما بھی ہو۔ گویا مَا کے معنے اگر خدا تعالےٰ کی ذات کی طرف توجہ دلانے کے سمجھے جائیں تو آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ

جس ذات نے انسان میں یہ صفات پیدا کی ہیں وہ کوئی علاج
نہ بتاتا اور راہنمائی کی صورت پیدا نہ کرتا۔ لیکن اگر مصدری
معنے لئے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ
انسان میں یہ قوتیں تو موجود ہوں مگر ان قوتوں کے ظہور کا کوئی
سامان نہ ہو۔ مفہوم ایک ہی ہے مگر ایک استدلال نفس کی
بناوٹ سے کیا گیا ہے اور دوسرا استدلال نفس کو بنانیوالے
کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

تیسرے معنے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا کے یہ ہیں
کہ ہم اُس نفس کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو
عظیم الشان ہے اور جس کی طرف آپ ہی آپ انگلیاں اٹھتی
ہیں یعنی ہر زمانہ کے نفس کامل اور اُس خدا کو پیش کرتے ہیں
جس نے ایسے کامل وجود کو بنایا۔ یہاں نفس گو نکرہ کے طور
پہ استعمال کیا گیا ہے مگر حقیقتاً اس کی تنوین تفخیم اور تعظیم
کے لئے ہے اور نَفْسٍ سے مراد ہر نفس نہیں بلکہ عظیم الشان
نفس ہے (تنوین کا تفخیم اور تعظیم کے لئے آنا عربی زبان کا ایک
مروّج قاعدہ ہے) اور مراد یہ ہے کہ ہم اُس شخص کی طرف تم کو
توجہ دلاتے ہیں جو اپنی عظمتِ شان کی وجہ سے اس قدر بڑھا
ہوا ہے کہ گو اُس کا نام نہ لو مگر ہر انگلی اس کی طرف خود بخود
اُٹھنے لگتی ہے۔ اس امر کا قرآن کریم کے بعض اور مقامات
سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف کو
جو نبی آتا ہے اُس کے دعوٰے سے پہلے ہی لوگوں کی اُس کی
طرف انگلیاں اُٹھنی شروع ہو جاتی ہیں اور وہ تسلیم کرتے
ہیں کہ یہی وہ شخص ہے جو ہماری قوم کو کامیاب کر سکتا ہے
چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم
میں ذکر فرماتا ہے کہ اُن کی قوم کے افراد نے اُن سے کہا
يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود ع۶)
یعنی اے صالح ہمیں تو تم پر بڑی بڑی امیدیں تھیں اور ہم
سمجھتے تھے تو بڑے اعلیٰ اخلاق کا مالک ہے تیرے اندر
قوتِ عملیہ پائی جاتی ہے اور تو قوم کی ترقی کا بڑا فکر رکھتا ہے
ہمیں تو امید تھی کہ تو قوم کو اُٹھا کر کہیں کا کہیں لے جائے گا
مگر تو تو بڑا خراب نکلا اور تو نے ہماری تمام امیدوں پر پانی
پھیر دیا۔ تو ہمیں یہ کہنے لگ گیا ہے کہ ہم اپنے باپ دادا
کے طریقِ عمل کو چھوڑ دیں اور تیری بات کو مان کر بتوں کی
پرستش نہ کریں۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ جن باتوں میں
حضرت صالح علیہ السلام کی قوم اپنی ترقی سمجھتی تھی اُن باتوں
میں حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم کی ترقی نہیں سمجھتے تھے۔
وہ جھوٹ اور فریب اور خدا تعالےٰ سے بُعد میں اپنی ترقی سمجھتے
تھے اور حضرت صالح علیہ السلام صداقت اور ہدایت اور خدا تعالیٰ
سے تعلق میں اپنی قوم کی ترقی سمجھتے تھے۔ بہرحال اُنہیں یہ
امید ضرور تھی کہ ہماری ترقی صالحؑ کے ساتھ وابستہ ہے
اور اُن کی یہ رائے بالکل درست تھی گو اپنے تنزل کا علاج وہ
جن باتوں کو قرار دیتے تھے وہ درست نہیں تھا۔ یہی رنگ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظر آتا ہے اور یہی
رنگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام میں پایا جاتا تھا۔
حضرت خلیفۃ اول رضی اللہ عنہ کے خسر صوفی احمد جان صاحبؓ
لدھیانوی نے دعویٰ سے پہلے ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
کو لکھ دیا تھا کہ ؎

ہم مریضوں کی ہے تمہیں پہ نظر
تم مسیحا بنو خدا کے لئے

گویا دنیا کی نگاہیں اُسی وقت سے آپ کی طرف بلند ہو رہی
تھیں اور جو انگلی بھی اُٹھتی وہ آپ کی طرف اشارہ کرتی۔
مولوی بُرہان الدینؓ صاحب جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام
کے نہایت مخلص صحابی تھے انہوں نے سُنایا کہ جب ابتداء
میں مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر سُنا
اور مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا شخص ظاہر
ہوا ہے جس سے اسلام کی آئندہ ترقی وابستہ معلوم ہوتی ہے
اور وہی عیسائیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے اعتراضات کا جواب
دیتا ہے تو میں نے ارادہ کیا کہ آپ کو دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ
میں قادیان آیا مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام
کسی مقدمہ کے سلسلہ میں گورداسپور تشریف لے گئے ہیں۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا کے تیسرے معنے

میں گورداسپور پہنچا اور آپ کے جائے قیام کو دریافت کرتا ہُوا ڈاک بنگلہ میں گیا جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُن دنوں تشریف رکھتے تھے۔ باہر حافظ حامد علی صاحب بیٹھے تھے مَیں نے اُن سے کہا کہ میں حضرت مرزا صاحب کی زیارت کرنے کے لئے آیا ہوں کسی طرح مجھے آپؑ کی زیارت کرا دیں انہوں نے کہا اس وقت زیارت نہیں ہو سکتی حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایک ضروری اشتہار لکھ رہے ہیں۔ میں نے اُن کی منّتیں بھی کیں مگر انہوں نے کوئی پروا نہ کی۔ آخر میں ایک طرف مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور میں نے ارادہ کر لیا حافظ حامد علی صاحب ذرا اِدھر اُدھر ہوں تو میں بغیر پوچھے ہی کمرہ کی چِک اُٹھا کر آپ کی زیارت کر لوں گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد ہی حافظ صاحب جو کسی کام کیلئے اُٹھے تو میں چپکے سے دروازے کیطرف بڑھا اور چِک اٹھا کر اندر کیطرف جھانکا اُسوقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کاغذ ہاتھ میں لئے جلدی جلدی کمرہ میں ٹہل رہے تھے اور آپکی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ ابھی آپ کو واپس آنے میں کچھ دیر لگے گی اور میں اطمینان سے آپ کی زیارت کر سکونگا مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جلدی واپس لوٹ آئے اُس وقت مجھ پر ایسا رعب طاری ہُوا کہ میں ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ اُٹھا اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آپ ضرور سچے ہیں جو شخص اتنا تیز تیز چلتا ہے اُس نے ضرور دور تک جانا ہے۔

غرض الٰہی سُنّت یہ ہے کہ ہر زمانہ کا جو نفس کامل ہو اُس کی طرف خود بخود لوگوں کی انگلیاں اُٹھنی شروع ہو جاتی ہیں اور وہ اُسے دیکھ کر اِس حقیقت کا بر ملا اظہار شروع کر دیتے ہیں کہ یہ شخص دنیا میں ضرور کوئی اہم تغیر پیدا کر کے رہے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم ہر زمانہ کے نفس کامل اور اس خدا کو پیش کرتے ہیں جو ایسے کامل وجود پیدا کیا کرتا ہے یا اس زمانہ کا نفس کامل (جس سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں) اور جس نے اُسے بنایا ہے اُس کو اور اسی طرح اس نفس کامل کے اظلال کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو آپ زندگی کے ہر شعبہ میں کامل الوجود ثابت ہوئے ہیں۔ لوگ اپنے اموال کو اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اموال اپنی قوم کے لئے خرچ کرتے تھے۔ لوگ اپنے اوقات کو جُوئے اور شراب نوشی وغیرہ میں صرف کرتے تھے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات اپنی قوم کی بہبودی کے لئے خرچ کرتے تھے۔ لوگ اپنے اوقات جہالت کے لئے خرچ کرتے تھے اور آپؐ اپنے اوقات علم کے لئے خرچ کرتے تھے۔ لوگ اپنے دماغ دنیوی باتوں میں مشغول رکھتے تھے اور آپؐ اپنے دماغ کو اگر ایک طرف خدا تعالےٰ کے احکام کی اتباع میں مشغول رکھتے تھے تو دوسری طرف بنی نوع انسان کی تکالیف دُور کرنے کے لئے اس سے کام لیتے تھے اور یہ تو آپ کی دعوٰیٔ نبوت سے پہلے کی حالت تھی جب آپ نے اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت نبوت کا اعلان فرمایا اور عملی رنگ میں آپ کا ہر کام لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تو اُس وقت آپ اگر فوج کے ساتھ گئے تو بہترین جرنیل ثابت ہوئے، قضاء کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو بہترین قاضی ثابت ہوئے، اِفتاء کا وقت آیا تو بہترین مفتی ثابت ہوئے، تبلیغ کا وقت آیا تو بہترین مبلغ ثابت ہوئے، گھر میں گئے تو بہترین خاوند ثابت ہوئے، بچوں سے تعلق رکھا تو بہترین باپ ثابت ہوئے، دوستوں سے ملے تو بہترین دوست ثابت ہوئے۔ غرض کوئی ایک بات بھی نہیں جس میں آپ دوسروں سے دوسرے درجہ پر رہے ہوں بلکہ ہر خوبی میں آپ نے چوٹی کا مقام حاصل کیا اور اس طرح اپنے نفس کے کامل ہونے کا دنیا کے سامنے ایک ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر دیا۔ اللہ تعالےٰ نفس کامل کی اس شہادت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تم غور کرو کہ کیا ایسا شخص جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں کبھی ہار سکتا ہے؟ ایک فن کا ماہر ہار سکتا ہے، دو فنوں کا ماہر ہار سکتا ہے مگر یہ تو وہ ہے جو ہر فن میں کامل ہے۔ دنیا اس کے متعلق یہ خیال بھی کس طرح کر سکتی ہے کہ یہ ہار جائے گا اور وہ جیت جائیگی اُس میں اگر زیادہ قابلیتیں ہوں تو پھر بے شک وہ جیت سکتی ہے لیکن جبکہ اُس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کوئی قابلیت ہی نہیں پائی جاتی تو وہ جیت کس طرح سکتی ہے؟

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝

پھر اُس (یعنی خدا) نے اس (نفس) پر اس کی بدکاری (کی راہوں) اور اس کے تقویٰ (کے راستوں) کو کھول دیا۔ ۵۸

۵۸ **تفسیر**۔ پہلی آیت میں اگر "ما" کے معنے مَنْ کے ہونگے تو ضمیر "ما" کی طرف جائے گی اور اگر مصدری معنے لئے جائیں گے تو ضمیر بالمعنیٰ سمجھی جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے "ما" کو مَنْ کے معنوں میں لیا ہے وہ اس موقعہ پر "ما" کو مصدریہ کہنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ اُن کے معنے درست نہیں اگر درست ہیں تو وہ بتائیں کہ اَلْهَمَهَا میں اَلْهَمَ کا فاعل کون ہے مصدر تو فاعل نہیں ہوسکتا کیونکہ تسویہ الہام نہیں کرسکتا، الہام تو ایک طاقتور ہستی کرتی ہے مگر مصدر کے معنے کرنے والے بھی علم ادب کے بہت بڑے ماہر ہیں انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ تمہارا استدلال بالکل غلط ہے۔ عربی زبان میں معنوں کی طرف ضمیر پھیرنے کا کثرت سے رواج پایا جاتا ہے پس بناء۔ طحیٰ اور تسویہ جس کی طرف منسوب ہوں گے اُسی کی طرف بالمعنیٰ ضمیر بھی تسلیم کی جائے گی یعنی بناء طحیٰ اور تسویہ کا جو بانی ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی ذات اُس کی طرف بالمعنیٰ ضمیر تسلیم کی جائے گی۔ بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے آسمانی اور زمینی نظام کے بنانے اور انسانی نفس میں قابلیت رکھنے کے بعد اُسے چھوڑا نہیں بلکہ اُس کے اندر فجور و تقوےٰ کی حس رکھی ہے اور اس مادہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گویا دونوں صورتوں میں خواہ مصدری معنے لئے جائیں یا "ما" کے معنے مَنْ کے سمجھے جائیں آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے ہر انسان میں نفسِ لوّامہ پیدا کیا ہے اور ہر انسان میں یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ بعض باتوں کو اچھا اور بعض باتوں کو بُرا سمجھتا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سمجھنے میں بہت سے لوگ غلطی کھا جاتے ہیں اور وہ بجائے مسئلہ کو اس رنگ میں پیش کرنے کے کہ ہر انسان کچھ باتوں کو اچھا سمجھتا اور کچھ باتوں کو بُرا سمجھتا ہے وہ اس رنگ میں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہر انسان سمجھتا ہے کہ قتل بُرا ہے۔ یا ہر انسان سمجھتا ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے یا ہر انسان سمجھتا ہے کہ ڈاکہ ڈالنا بُرا ہے۔ اس پر اسکے مخالف جواب دے دیتے ہیں کہ تم کہتے ہو ہر شخص جھوٹ کو بُرا سمجھتا ہے حالانکہ دنیا میں کئی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر تمہاری یہ بات درست ہے کہ فجور اور تقویٰ کا الہام اللہ تعالےٰ نے نفسِ انسانی میں کیا ہے تو چاہیئے تھا کہ ہر شخص جھوٹ کو بُرا سمجھتا یا ہر شخص قتل کو بُرا سمجھتا مگر واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ دنیا میں جھوٹ بولتے ہیں اور چونکہ اُن کے نفس میں ہدایت نہیں ہوتی اور متواتر جھوٹ بول بول کر اُن کی فطرت مسخ ہوچکی ہوتی ہے وہ یہاں تک کہدیتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر دنیا میں گذارہ ہی نہیں ہوسکتا۔ یا مثلاً سختی کا مادہ ہے یہ بہت سے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ میں نے اپنی جماعت میں ہی دیکھا ہے بار بار لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ سختی سے کام نہ لیا کریں محبت اور پیار سے دوسروں تک اپنی باتیں پہنچایا کریں مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور ہونے کی وجہ سے بسا اوقات سختی پر اُتر آتے ہیں اور بعض تو مجھے بھی کہدیتے ہیں کہ لوگ سختی کے بغیر کبھی نہیں مان سکتے، نرمی کام خراب کر دیا کرتی ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ ہر شخص سختی کو بُرا سمجھتا ہے تو یہ واقعات کے خلاف ہوگا کیونکہ دنیا میں کئی لوگ سختی سے کام لیتے ہیں اور باوجود سمجھانے کے بھی وہ اپنی اس عادت کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نرمی اچھی نہیں دنیا کا اصل علاج سختی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو چوری کو بُرا نہیں سمجھتے، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جھوٹ کو بُرا نہیں سمجھتے، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قتل کو بُرا نہیں سمجھتے۔ پس اگر اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ ہر انسان چوری کو یا جھوٹ کو یا قتل وغیرہ جرائم کے ارتکاب کو بُرا سمجھتا ہے تو یہ بالکل غلط ہوگا سو دنیا میں کئی لوگ ایسے ہیں جو ان افعال کو بُرا نہیں سمجھتے۔ یا مثلاً گوشت خوری ہے اس کے متعلق مسلمانوں کو مستثنےٰ کرتے ہوئے دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اس میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتے اور ایسے لوگ بھی

اَلْهَمَهَا میں اَلْهَمَ کا فاعل

پائے جاتے ہیں جو اس کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں اور گوشت خوری سے ان کو اتنی شدید نفرت ہوتی ہے کہ کھانا تو الگ رہا اگر گوشت کا کوئی شخص اُن کے سامنے نام بھی لے لے تو انہیں قے آجاتی ہے۔ ہماری جماعت میں سردار فضل حق صاحب ایک نومسلم دوست تھے وہ سکھ مذہب کو ترک کرکے اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ کئی سال تک مسلمان رہے اور دوسروں کو بھی اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اُنکی یہ حالت تھی کہ وہ سالہا سال تک گائے کے گوشت سے شدید متنفر رہے (ممکن ہے قادیان سے جانے کے بعد اُن کا یہ حال نہ رہا ہو مگر جب تک وہ قادیان میں رہے اُن کا یہی حال تھا) مجھے خوب یاد ہے وہ ایک دفعہ مہمان خانہ میں آکر ٹھہرے چونکہ وہ گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے اس لئے بعض دوستوں نے یہ طے کر لیا کہ جس طرح بھی ہو سکے ان کو گوشت ضرور کھلانا ہے - ایک دن بھائی عبدالرحیم صاحب۔ شیخ عبدالعزیز صاحب اور بعض اور

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا میں ہستی باری تعالیٰ کیلئے ایک زبردست دلیل

دوست اُن سے اصرار کرنے لگے کہ آج تو ہم نے آپکو ضرور گائے کا گوشت کھلانا ہے۔ وہ یہ سنتے ہی اُٹھ کر بھاگے - وہ آگے آگے تھے اور یہ دوست اُن کے پیچھے پیچھے۔ مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے کہ وہ کبھی ایک چارپائی سے کود کر دوسری طرف چلے جاتے وہاں اُن کا پیچھا ہوتا تو تیسری چارپائی سے کود کر بھاگتے اور جب لوگوں نے اُن کو پھر بھی نہ چھوڑا تو وہ ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں بھاگ گئے مگر لوگ بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے آخر اسی بھاگ دوڑ میں اُن کو اتنے زور سے قے آئی کہ انکے دوست دیکھ کر ڈر گئے اور انہوں نے اُن کو چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ اگر اب بھی ہم اِن کو گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کریں گے تو یہ سخت ظلم ہوگا۔ تو دنیا میں کئی لوگ ایسے ہیں جو گوشت خوری سے سخت نفرت رکھتے ہیں اور کئی ایسے ہیں جن کو گوشت خوری کے بغیر چین ہی نہیں آتا۔ مگر اسکے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ گوشت کھانا انسانی فطرت میں داخل ہے یا گوشت نہ کھانا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کانشنس بالکل اور چیز ہے جس کی حقیقت کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ کانشنس کے معنے صرف اتنے احساس کے ہیں کہ انسان بعض باتوں کو بُرا اور بعض باتوں کو اچھا سمجھتا ہے کانشنس میں یہ بات شامل نہیں کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری - یہ بات عادت سے تعلق رکھتی ہے جیسی کسی کو عادت ہوگی ویسے ہی اس کا اُس چیز کے متعلق احساس ہوگا مگر بہرحال کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا جو ہر چیز کو اچھا کہتا ہو یا ہر چیز کو بُرا سمجھتا ہو۔ ہر انسان یہی کہے گا کہ بُرا کام نہیں کرنا چاہیئے اور ہر انسان یہی کہے گا کہ اچھا کام ضرور کرنا چاہیئے - یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بُرے کام کو اچھا سمجھتا ہو یا اچھے کام کو بُرا سمجھتا ہو مگر یہ احساس اُس کے اندر ضرور پایا جاتا ہے کہ دنیا میں کچھ چیزیں اچھی ہیں اور کچھ چیزیں بُری ہیں۔ مجھے اچھی چیزیں اختیار کرنی چاہئیں اور بُری چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ یہی معنے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا کے ہیں کہ ہر انسان یہ کہتا ہے کہ کچھ بُری چیزیں ہیں اور ہر انسان یہ کہتا ہے کہ کچھ اچھی چیزیں ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ ہر انسان میں بُری اور اچھی چیزوں کے امتیاز کا مادہ رکھا گیا ہے اور جب یہ بات ہے تو دلیل مکمل ہو جاتی ہے یعنی جب ہر انسان کے اندر یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھا اور کسی چیز کو بُرا کہتا ہے تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہو جو اُسے بتائے کہ کون کون سی چیزیں اچھی ہیں اور کون کون سی چیزیں بُری ہیں۔ یہ دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کے ثبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کی ہے اور یہ وہ دلیل ہے جس کا کوئی رد کسی بڑے سے بڑے دہریہ کے پاس بھی نہیں ہے۔ مگر میں نے دیکھا ہے لوگ بالعموم اس دلیل کو پورے طور پر سمجھتے نہیں لہٰذا وہ ایسے رنگ میں اسے مخالف کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو اپنے اندر کمزوری رکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اس دلیل کا اپنی کتب میں بعض جگہ ذکر فرمایا ہے مگر لوگ پھر بھی جب نفس لوامہ کی شہادت پیش کریں گے اس رنگ میں پیش کریں گے کہ ہر شخص جھوٹ کو بُرا سمجھتا ہے یا ہر شخص قتل اور چوری کو بُرا سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک سب کانشس مائنڈ کا سوال ہے اُس کے لحاظ سے یہ سب باتیں بُری ہیں اور ہر انسان سب کانشس مائنڈ میں ان کو بُرا سمجھتا ہے مگر کانشس مائنڈ میں وہ انکو بُرا نہیں سمجھتا

اور نہ وہ بحث کے وقت اِن چیزوں کی بُرائی کا قائل ہو سکتا ہے اور اگر قائل بھی ہو تو لمبی بحث کے بعد ہوتا ہے جس میں سب کانشس مائنڈ سے ان چیزوں کی بُرائی اُس کے کانشس مائنڈ میں لانی پڑتی ہے مگر ایسا ہر شخص نہیں کر سکتا یہ ماہرِ فن کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ سب کانشس مائنڈ سے کانشس مائنڈ میں کسی چیز کو منتقل کر دے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس ایک دفعہ ایک چور علاج کیلئے آیا۔ میں نے اُسے نصیحت کی کہ تم نے کیا لغو پیشہ اختیار کیا ہُوا ہے تمہیں چاہیئے کہ محنت کرو اور کماؤ۔ یہ کیسی بُری بات ہے کہ تم چوری جیسا ذلیل کام کرتے ہو اور تمہیں ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ تم مضبوط اور ہٹے کٹے ہو محنت کرو اور کماؤ چوری کیوں کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا مولوی صاحب ہمارے جیسی محنت بھی دنیا میں کوئی شخص کرتا ہے؟ لوگ تو دن کو محنت کرتے ہیں لیکن ہم وہ ہیں جو رات کو محنت کرتے ہیں سخت سردی کے دن ہوتے ہیں، جسم ٹھٹھر رہے ہوتے ہیں، تاریکی سے قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں، جان کا خوف ہوتا ہے مگر پھر بھی ہم ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب بتائیے ہم سے بڑھکر بھی دنیا میں کوئی محنت کرتا ہے؟ آپ فرماتے تھے جب اُس نے یہ جواب دیا تو میں نے سمجھ لیا کہ اس شخص کی فطرت بالکل مسخ ہو چکی ہے اب اِس کو چوری کی بُرائی کا قائل کرنے کے لئے کسی اور طریق سے کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اُس سے گفتگو کا رُخ بدل لیا اور بعض اور اُمور کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ جب کچھ دیر گذر گئی تو میں نے اُس سے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ تم چوری کرتے کس طرح ہو اور کتنے آدمی اس میں شریک ہوتے ہیں؟ کہنے لگا حکیم صاحب بات یہ ہے کہ چوری کے لئے کئی آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے سب سے پہلے تو ہم گھر کے کسی آدمی کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں جو ہمیں بتاتا ہے کہ کتنے کمرے ہیں، اُن کمروں کا کیا نقشہ ہے، اور کس کس رُخ میں وہ واقعہ ہوئے ہیں تاکہ ہم پکڑے نہ جائیں۔ پھر ہمیں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کس کس جگہ مال پڑا ہُوا ہے، کون سے ٹرنک میں زیورات ہیں، اُس ٹرنک کا رنگ کیسا ہے اور وہ کس کونے میں رکھا ہُوا ہے۔ یا اگر روپیہ کہیں دبا کر رکھا ہُوا ہے تو کس جگہ دبایا ہُوا ہے۔ یہ سب باتیں ہم اُس سے دریافت کر لیتے ہیں۔ اسکے بعد ہم ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں جو سینده لگانے میں ماہر ہوتا ہے تاکہ وہ اس طرح سینده لگائے کہ کسی کو پتہ تک نہ لگے اور باوجود دیوار توڑنے کے کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ وہ سینده لگا کر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ سینده لگانے کا اُس کی طبیعت پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ مزید کوئی کام کرنے کے ناقابل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا شخص آگے آتا ہے جسے گھر کا نقشہ یاد کرایا ہُوا ہوتا ہے وہ اندر داخل ہوتا ہے اور جہاں جہاں اسباب ہوتا ہے وہاں سے اٹھا کر باہر پہنچا دیتا ہے اُس وقت دیوار کے پاس ہی ہمارا ایک آدمی تیار کھڑا ہوتا ہے جوں جوں وہ اسباب پہنچاتا جاتا ہے ہمارا آدمی اُس کو سمیٹتا چلا جاتا ہے اور ایک آدمی ایسا ہوتا ہے جو دُور ایک کونے میں کھڑا رہتا ہے تاکہ اگر کوئی آدمی گذر رہا ہو تو وہ اطلاع دے سکے۔ جب اس طرح چوری کے کام سے ہمیں فراغت ہو جاتی ہے تو گھر پہنچ کر ہم تمام زیورات ایک سُنار کو دے دیتے ہیں جو اُن کو گلا کر سونے کی ڈلیاں بنا دیتا ہے۔ کیونکہ زیورات اپنی اصل شکل میں ہم فروخت نہیں کر سکتے اگر کریں تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں۔ اس لئے ہم نے سُنار رکھا ہُوا ہوتا ہے تاکہ جونہی کوئی زیور آئے فوراً اُس کو گلا دیا جائے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضؓ فرماتے تھے جب اُس نے یہ داستان بیان کی تو میں نے کہا تمہاری اتنی محنت اور عرقریزی کے بعد اگر وہ سُنار اُس سونے کو کھا جائے تو پھر؟ اس پر وہ بے اختیار ہو کر بولا اگر وہ چوری کرے تو ہم اُس بے ایمان اور خبیث کا سر نہ اُڑا دیں۔ ہم تو کبھی اُسکو زندہ نہ رہنے دیں۔ میں نے کہا ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ چوری کوئی عیب کی بات نہیں اور ابھی کہہ رہے ہو کہ وہ خبیث چوری کرے تو اُس کا سر اڑا دیں اِس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود تمہاری فطرت چوری کو ناپسند کرتی ہے اور وہ اسے خیانت اور بے ایمانی کا کام قرار دیتی ہے ورنہ وجہ کیا ہے کہ جو کام تم خود کرتے ہو اسی کام کی وجہ سے

فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا میں فجور کے بطور مصدر استعمال کرنیکی وجہ

تمہیں شکار پر غصہ آجائے اس پر وہ شرمندہ ہوگیا۔ تو فطرت جو مسخ ہو چکی ہو وہ بعض دفعہ اُبھر بھی آتی ہے مگر اس طرح فطرت کو اُبھارنا ہر شخص کا کام نہیں ہوتا یہ ماہر فن ہی کام کرسکتا ہے اور پھر بعض جگہ باوجود کوشش کے بھی مسخ شدہ فطرت نہیں اُبھرتی جیسے وہ لوگ جو گوشت کھانے کے مخالف ہیں اور وہ اِسے "جیو ہتیا" قرار دیتے ہیں۔ اُن سے جب گفتگو ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارے زخموں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو تم دواؤں سے اُن کیڑوں کو مارتے ہو یا نہیں؟ اگر تم مارتے ہو اور تمہارے دماغ میں اُس وقت جیو ہتیا کا خیال نہیں آتا بلکہ تم سمجھتے ہو کہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ کے لئے قربان ہی ہونا چاہیئے تو تمہیں گوشت خوری پر کیا اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اس رنگ میں جب اُن کو سمجھایا جائے تو بعض دفعہ تو وہ سمجھ جاتے ہیں مگر بعض دفعہ نہیں بھی سمجھتے۔ بہرحال اصل دلیل جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بار بار استعمال کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی کانشنس میں نیکی اور بدی کا احساس پایا جاتا ہے یعنی ہر شخص میں خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا پیرو ہو یہ احساس پایا جاتا ہے کہ کچھ چیزیں اچھی ہیں اور کچھ چیزیں بُری ہیں۔ یہ نہیں کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری۔ یہ علم الاخلاق ہے۔ کانشنس کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ ہر انسان میں ایک مادہ پایا جاتا ہے جو بتاتا ہے کہ کوئی چیز اچھی ہے اور کوئی چیز بُری ہے۔ تم ساری دنیا میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں دکھا سکتے جو یہ کہتا ہو کہ ہر چیز اچھی ہے یا ہر چیز بُری ہے۔ وہ کسی کو اچھا سمجھتا ہوگا اور کسی کو بُرا سمجھتا ہوگا۔ مثلاً چور چوری کو اچھا سمجھیگا مگر قتل کو بُرا سمجھیگا۔ یا قاتل قتل کو اچھا سمجھیگا مگر وعدہ کی خلاف ورزی کو بُرا سمجھیگا۔ یا ظالم ظلم کو اچھا سمجھیگا مگر جھوٹ پر اُسے غصہ آجائے گا۔ یا جھوٹا جھوٹ کو اچھا سمجھیگا مگر قتل پر اُسے غصہ آجائے گا۔ غرض اخلاق اور مذہب سے تعلق رکھنے والے جس قدر افراد دنیا میں پائے جاتے ہیں ہندو کیا اور عیسائی کیا اور مسلمان کیا اور سکھ اور یہودی کیا اور چوڑھے کیا اور عالم کیا اور جاہل کیا ہر انسان میں یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ کچھ کام مجھے کرنے چاہئیں اور کچھ کام نہیں کرنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مادہ کے لحاظ سے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ فرماتا ہے فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا۔ ہم نے اُس کو الہام کیا ہے اُس کے فجور اور اس کے تقویٰ کے متعلق۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں مصدر کا استعمال کیا ہے یہ نہیں کہا کہ ہم نے اُسے فجور والی باتوں کا الہام کیا ہے یا تقویٰ اور پاکیزگی کی تفصیلات اُس پر الہام کے ذریعہ روشن کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرمایا ہے کہ ہم نے اسے فجور اور تقویٰ کا الہام کیا ہے یعنی ہر انسان میں فجور اور تقویٰ کی حس پائی جاتی ہے اور ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے ایسا مادہ رکھا ہے کہ وہ اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ میرے نفس کے لئے کچھ باتیں اچھی ہیں اور کچھ باتیں بُری ہیں۔ یہی دلیل ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش کی ہے اور یہی دلیل ہے جو قرآن کریم پیش کرتا ہے اور یہی دلیل ہے جسے میں نے بھی اپنی کتب میں بعض مقامات پر بیان کیا ہے مگر لوگ غلطی سے تفصیلات میں چلے جاتے ہیں اور وہ معیّن نیکیوں اور معیّن بدیوں کو بطور مثال پیش کر دیتے ہیں حالانکہ اس دلیل کا یہ مطلب نہیں کہ جسے ہم فجور سمجھتے ہیں یا جسے ہم تقویٰ سمجھتے ہیں اس کا علم ہر انسان کو ہے یا ہر انسان اُن کو واقعہ میں بُرا یا اچھا سمجھتا ہے بلکہ دلیل یہ ہے کہ ہر شخص میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ کچھ چیزیں اچھی ہیں اور کچھ چیزیں بُری ہیں۔ اس کے بعد اختلاف ہو جاتا ہے کوئی کسی کو اچھا سمجھتا ہے اور کسی کو بُرا۔ کوئی کسی کو قابلِ تعریف قرار دے دیتا ہے اور کسی کو قابلِ مذمّت۔ مگر ہمیں اس اختلاف کی تفصیلات سے سروکار نہیں ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ اِدھر تو نیکی بدی کی حس ہر ایک میں ہے اُدھر انسان نیکی بدی کی تعیین میں شدید اختلاف رکھتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس فطرتی مادہ کی صحیح راہنمائی کرنے والی کوئی ایسی ہستی ہو جو انسانی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتی ہو اور پھر وہ انسان کو بتائے کہ کونسی باتیں واقعہ میں اچھی ہیں اور کونسی باتیں واقعہ میں بُری ہیں۔ کن باتوں پر تمہیں عمل کرنا چاہیئے اور کن باتوں سے تمہیں اجتناب کرنا چاہیئے۔ یہ تو اُن عام معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب ہے جو نَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا کے کئے گئے تھے لیکن اس کے علاوہ ایک خاص معنے بھی کئے گئے تھے یعنی اس میں

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ؕ

جس نے اس (نفس) کو پاک کیا۔ وہ تو (سمجھو کہ) اپنے مقصود کو پا گیا ۹

ہر زمانہ کے نفسِ کامل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُن معنوں کے لحاظ سے اِس آیت کا یہ مطلب ہے کہ ایسے نفسِ کامل کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ الہام کے ذریعہ فجور و تقویٰ کی راہیں بتاتا چلا آیا ہے گویا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا میں حذفِ مضاف سمجھا جائے گا اور اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ فجور والی باتیں بتاتا ہے یا تقویٰ والی باتیں بتاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ نفسِ کامل پر الہام نازل کرتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ فجور والی باتیں کونسی ہیں اور تقویٰ والی باتیں کونسی ہیں۔

۹ **حل لغات**۔ زَكّٰى۔ زَكّٰى سے باب تفعیل ہے اور زَكَى الشَّيْءُ کے معنے ہیں نَمَا۔ کوئی چیز بڑھ گئی (اقرب) اور جب زَكَّاهُ اللّٰهُ کہیں تو معنے ہوتے ہیں۔ اَنْمَاهُ۔ اللہ نے اُس کو بڑھایا اور اُونچا کیا (تاج) نیز زَكّٰى کے معنے ہیں طَهَّرَهٗ۔ اس کو پاک کیا (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے اس الہام کے بعد جو شخص اُسکی پیروی کرکے اپنے نفس کو ٹھیک راہ پر چلاتا ہے وہ بامراد ہو جاتا ہے یعنی الہامِ فطرت جو مجمل الہام ہوتا ہے اُس کی پیروی اور اطاعت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ نبی کا الہام تفصیلی ہوتا ہے لیکن فطرت کا الہام مجمل ہوتا ہے۔ یہاں تفصیلی الہام کا ذکر نہیں بلکہ مجمل الہام کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فجور اور تقویٰ کا وہ مجمل علم جو انسان کو ملا تھا اور جس کے مطابق وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کچھ بُری چیزیں ہیں اور کچھ اچھی چیزیں ہیں، مجھے بُری چیزوں سے بچنا چاہیئے اور اچھی چیزوں کو اختیار کرنا چاہیئے۔ جو شخص اس مجمل علم کو صحیح طور پر استعمال کرتا ہے اور فطرت کی اس راہنمائی کے ماتحت اپنے نفس کو اونچا کرتا ہے وہ فلاح پالیتا ہے یعنی اپنے خدا سے واصل ہو کر صاحبِ الہام ہو جاتا ہے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے قَدْ اَفْلَحَ میں وحیِ حقیقی کے پانے کا ذکر ہے اور اَلْهَمَهَا میں وحیِ مجمل کے نازل ہونے کا بیان ہے جو ہر فطرتِ انسانی پر نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی طرف بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ جو شخص اس بات کو سمجھتے ہوئے کہ خدا تعالیٰ نے میرے اندر اعتدال پیدا کیا ہے غور و فکر سے کام لیتے ہوئے اعتدال کی راہوں پر چلتا ہے اور فجور کی وہ حِس جو اللہ تعالیٰ نے اُس کی فطرت میں رکھی ہے اس سے کام لے کر وہ بُری باتوں سے بچتا ہے اور تقویٰ کی حِس جو اُس کے اندر پیدا کی گئی ہے اُس سے کام لے کر وہ اچھی باتوں کو اختیار کرتا ہے اور اپنے نفس کو اس پیہم جد و جہد اور کوشش کے نتیجہ میں اونچا کر دیتا اور اخلاقی زندگی بسر کرتا ہے ایک دن آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا الہام اُس پر نازل ہو جاتا ہے اور خدا کا قرب اُس کو حاصل ہو جاتا ہے۔ زَكّٰى کے معنے اونچا کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور زَكّٰى کے معنے پاک کرنے کے بھی ہوتے ہیں اس جگہ نفس کو اونچا کرنے کے معنے چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ ایسا شخص فجور اور تقویٰ کی حِس سے کام لے کر فطرت کے مقام سے بلند ہو کر اخلاقی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود صاحبِ الہام ہو جاتا ہے۔

اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا کے دوسرے معنے

زَكّٰى [1]

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا کے دو معنے [2، 1]

دوسرے معنے نفسِ کامل کے لحاظ سے اس آیت کے یہ ہیں کہ جب ہم نفسِ کامل کو تفاصیلِ فجور اور تفاصیلِ تقویٰ بتاتے ہیں اور دنیا کو اُن تفاصیل کا علم ہو جاتا ہے تو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وہ انسان جو اِن باتوں سے فائدہ اُٹھاتا اور نفسِ کامل کی تعلیم پر چل کر تزکیہ نفس کرتا ہے اُسے فلاح حاصل ہو جاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے مقربین میں شامل ہو جاتا ہے گویا نبی کی اطاعت اور اُس کے احکام کی پیروی کرکے وہ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور اُس تفصیلی الہام کا تابع بنتے ہوئے اپنے اپنے درجہ کے لحاظ سے نبی کا قمر بن جاتا ہے۔ درحقیقت ہر مومن اپنے اپنے درجہ کے مطابق نبی کا قمر ہوتا ہے اور اپنے اپنے

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝

اور جس نے اُسے (مٹی میں) گاڑ دیا (دبا کر) وہ نامراد ہو گیا ۝۱۱

رنگ میں کامل تعلیم پر چلنے کے نتیجہ میں فلاح حاصل کرلیتا ہے گویا پہلے معنوں کے رُو سے قَدْ اَفْلَحَ میں وحیِ جلی کا ذکر ہے اور اَلْهَمَهَا میں وحیِ خفی کا۔ اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے پہلی آیت میں وحیِ جلی کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں وحیِ تابع کا ذکر ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا میں اُس وحیِ جلی کا ذکر ہے جو نبی پر نازل ہوتی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا میں وحیِ تابع کا ذکر ہے۔ گویا وہ نور جو پہلے باہر سے آیا تھا نبی کی تعلیم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں انسان کے اندر بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

خَابَ ۝۱۱ **حل لغات۔** خَابَ: اَفْلَحَ کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں۔ ناکام ہُوا۔ نامراد ہُوا (اقرب)

دَسّٰی دَمٰی سے مزید ہے اور دَمٰی یَدْمُوْا (دَسْوًا وَدَمٰی یَدْسُوْا دَسِیًّا) کے معنے ہیں۔

اسلام کی ایک خوبی

نَقِیْضُ نَمٰی وَزَکٰی یعنی یہ نَمٰی اور زَکٰی کے مقابل کے الفاظ ہیں اور اس میں اُن کے اُلٹ معنے پائے جاتے ہیں یعنی وہ نہ بڑھا۔ اور اس میں برکت نہ ہوئی اور دَسّٰی کے معنے ہیں اَغْوَاهُ وَاَفْسَدَهُ۔ اسکو گمراہ کیا اور خراب کیا (اقرب) بعض نے دَسّٰهَا کا اصل دَسَّسَهَا قرار دیا ہے اس لحاظ سے اس کا اصل دَسَّ ہوگا۔ دَسَّ الشَّیْءَ دَسًّا تَحْتَ التُّرَابِ کے معنے ہوتے ہیں اَدْخَلَهٗ فِیْهِ وَاَخْفَاهُ کسی چیز کو زمین میں دبا دیا یا زمین کے نیچے دفن کر دیا اور دَسَّسَ کے معنے بھی یہی ہوتے ہیں۔ مگر دَسَّسَ دَسَّ سے زیادہ قوی ہوتا ہے اور مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے (اقرب) پس جب یہ لفظ کسی کے متعلق استعمال کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی طاقتوں کو اُبھارتا اُس نے اُن کو مٹا دیا۔ اسی طرح اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس نے اُن کو مٹی میں ملا دیا۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ جس نے اس وحی کو نہ مانا وہ ناکام ہُوا کیونکہ وحیِ الٰہی فطرت کی طاقتوں کو اُبھارنے کے لئے آتی ہے جس نے اسے ردّ کر دیا اُس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ صحیح تعلیم ہمیشہ فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو تعلیم فطرت کے جذبات کو کچلنے والی ہو وہ سچی نہیں ہو سکتی کیونکہ وحی اس لئے نازل ہوتی ہے کہ نفس کو اونچا کیا جائے اس لئے نازل نہیں ہوتی کہ اُسے مارا جائے اور اُس کی طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ اسی حکمت کے ماتحت قرآن کریم نے رہبانیت سے منع کیا ہے اور اسی حکمت کے ماتحت اُس نے طیّب چیزوں کو اپنے نفس پر حرام قرار دے دینا جائز نہیں رکھا۔ دوسرے مذاہب فطرت کی بعض طاقتوں کو کچلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نیکی ہے مگر اسلام اسے نیکی قرار نہیں دیتا۔ اسلام یہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر جو قوتیں پیدا کی ہیں صرف اُن کا تسویہ ہونا چاہیئے اور اُن کے استعمال میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ تم فطرت کو مار دو بلکہ وہ کہتا ہے تم فطرت سے اونچا مقام حاصل کرنے کی کوشش کرو کیونکہ فطرت کا علم ایک مجمل علم ہوتا ہے اور مجمل علم سے نجات نہیں ہو سکتی محض کسی کا یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص لاہور میں رہتا ہے ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ لاہور کے فلاں محلہ اور فلاں گلی میں رہتا ہے یا فلاں موڑ پر اُس کا مکان ہے تاکہ ہمیں اُس کی تلاش میں کوئی دقت نہ ہو اور آسانی سے ہم اُس کے مکان پر پہنچ سکیں پس قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کے یہ معنے ہوئے کہ اگر تم اپنی فطری طاقتوں کو اُبھارتے ہو تو الٰہی مدد کو حاصل کر لیتے ہو لیکن اگر تم اُن طاقتوں کو دباتے ہو اور اُس چیز کو ضائع کر دیتے ہو جو تمہیں ہتھیار کے طور پر دی گئی تھی تو تم کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝ۙ

ثمود نے اپنی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی کی وجہ سے (زمانے کے نبی کو) جھٹلایا ۱۲؎

اسکی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی شخص سفر پر جانے لگے تو ہم اُسے ہتھیار کے طور پر سونٹا بھی دیدیتے ہیں اور تلوار بھی دیدیتے ہیں۔ سونٹا ہم اس لئے دیتے ہیں کہ بعض جگہ تلوار کام نہیں آسکتی اور تلوار ہم اس لئے دیتے ہیں کہ بعض جگہ سونٹا کام نہیں آسکتا۔ اگر راستہ میں کوئی سانپ آجائے تو اُسوقت تلوار کام نہیں دے سکتی بلکہ سونٹا کام دیگا لیکن اگر کسی دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو اُسوقت سونٹا اتنا کام نہیں دے سکتا جتنا کام تلوار دے سکتی ہے یا مثلاً کسی جگہ کثرت سے کانٹے ہوں اور رستہ صاف کرنیکی ضرورت ہو تو وہاں سونٹا تو کام دے سکتا ہے مگر تلوار کام نہیں دے سکیگی۔ گویا سونٹا اور تلوار دونوں اُس کیلئے ضروری ہونگے کوئی ہتھیار کسی وقت کام آجائیگا اور کوئی ہتھیار کسی وقت کام آجائیگا۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہتھیار کو بھی لغو سمجھ کر پھینک دیگا تو یہ یقینی بات ہے کہ جب اُسے ضرورت پیش آئیگی وہ سخت تکلیف اُٹھائیگا اور اُسے اعتراف کرنا پڑیگا کہ میں نے اپنے ہتھیار کو پھینکنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جسقدر قوتیں پیدا کی ہیں سب انسان کی ترقی اور اسکے فائدہ کیلئے پیدا کی ہیں اور یہ وہ ہتھیار ہیں جن سے مختلف مقامات پر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اگر ہم ان میں سے کسی ایک ہتھیار کو بھی پھینک دیتے اور اپنی کسی قوت کو لغو قرار دیکر کچل دیتے ہیں تو ہم اپنی کامیابی کی منزل کو اپنے ہاتھ سے دُور کرنیوالے بن جاتے ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے انسان میں عفو کی بھی قوت پیدا کی ہے اور انتقام کی قوت بھی پیدا کی ہے اور یہ دونوں قوتیں ایسی ہیں جن کا برمحل استعمال دنیا کی ترقی میں بہت ممد ہوتا ہے۔ کئی مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں عفو سے کام لینا ضروری ہوتا ہے اور کئی مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں انتقام سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ نہ ہر جگہ عفو قابلِ تعریف ہوتا ہے نہ ہر جگہ انتقام قابلِ تعریف ہوتا ہے بہرحال یہ دونوں قوتیں اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری ہیں لیکن اگر ہم عفو کی قوت کو کچل دیتے ہیں یا انتقام کی قوت کو لغو قرار دیکر اُس سے کام نہیں لیتے تو ہم اپنی ناکامی کے سامان آپ مہیا کرتے ہیں۔ کامیابی اُسی وقت ہوسکتی ہے جب فطرت کو کچلا نہ جائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے جسقدر قویٰ پیدا کئے ہیں اُن کا جائز اور برمحل استعمال کیا جائے۔ جو شخص اپنی فطرت کو کچل کر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بڑا با اخلاق ہے یا اپنی فطری استعدادوں کو مٹا کر یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے نیکی کا کوئی بہت بڑا مقام حاصل کر لیا ہے وہ انتہا درجہ کی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے نیکی اس بات کا نام نہیں کہ فطرت کو کچل دیا جائے یا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ طاقتوں کو ضائع کر دیا جائے بلکہ نیکی یہ ہے کہ فطرت کو بیدار کیا جائے اور اُن قوتوں سے صحیح رنگ میں کام لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو شخص فطرت کو کچل دیتا اور اُسکی قوتوں کو ضائع کر دیتا ہے وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ دوسرے معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ جس شخص نے اپنی رُوح کو فطرتی نور سے ہدایت لے کر اُبھارا وہ بامراد ہوا یعنی نورِ الہام کو پالیا مگر جس نے ایسا نہ کیا وہ نامراد رہا یعنی نہ خود اُسے نور براہ راست مل سکیگا اور نہ دوسرے کے طفیل مل سکے گا کیونکہ فطرت تو ایک آئینہ تھی اور فطرت نے ہی شمس سے ری فلیکٹر کے طور پر نور لینا تھا جس نے اُس فطرت کو زمین میں دبا دیا اُسے روشنی کہاں سے آسکتی ہے وہ تو ظلمت میں ہی گرفتار رہے گا اور ظلمت میں ہی اس جہان سے گذر جائے گا۔

(حاشیہ: فطری استعدادوں کو ابھارنے کی تلقین)

۱۲؎ حل لغات ۔ طَغْوٰی: طَغٰی سے ہے اور یہ واوی بھی ہے اور یائی بھی۔ یعنی طَغٰی یَطْغُوْ طَغْوًا بھی استعمال ہوتا ہے اور طَغٰی یَطْغٰی طَغًا وَطُغْیَانًا بھی استعمال ہوتا ہے۔ واوی اور یائی دونوں میں معنوں کے لحاظ سے اختلاف ہے لیکن ایک معنے طَغٰی کے ایسے ہیں جو واوی اور یائی دونوں میں مشترک ہیں اور وہ معنے ہیں

(حاشیہ: طَغْوٰی)

اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا ۪ۙ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ

جبکہ ان (کی قوم) میں سے سب سے بڑا بدبخت (اس کی مخالفت کیلئے) کھڑا ہوا ۱۲؎ تب ان (یعنی ثمود کے آدمیوں) کو اللہ کے رسول نے کہا کہ

نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقۡيٰهَا ؕ

اللہ (کے دین) کی (خدمت کیلئے وقف) اونٹنی کو (آزاد پھرنے سے) اور اسے (گھاٹوں پر) پانی پلانے کو مت روکو ۱۳؎

جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ۔ فلاں شخص حد سے نکل گیا۔ لیکن طَغٰی یَطْغٰی جو یائی ہے اس کے بعض اور معنے بھی ہوتے ہیں چنانچہ جب کہیں طَغٰی الْکَافِرُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں غَلَا فِی الْکُفْرِ کہ کافر شخص کفر میں حد سے بڑھ گیا۔ اور طَغٰی فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں اَسْرَفَ فِی الْمَعَاصِیْ وَالظُّلْمِ۔ وہ ظلم اور معاصی میں حد سے بڑھ گیا اور طَغَی السَّمَآءُ کے معنے ہوتے ہیں اِرْتَفَعَ پانی بلند ہو گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ طَغْوٰی کے معنے گناہوں میں حد کر بڑھ جانے کے ہیں لیکن دراصل یہ معنے یائی کے ہیں واوی کے نہیں اور یہاں چونکہ طَغْوٰی ہے جو واوی ہے اس لئے اس کے معنے تَجَاوُزٌ عَنِ الْقَدْرِ وَالْحَدِّ کے ہی ہیں یعنی اپنے اندازہ اور حد سے آگے نکل جانا۔

مسلمانوں کی منظم مخالفت کی پیشگوئی ۱۱؎

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے مثال پیش کی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ دیکھو ثمود کے پاس نور آیا پھر جیسا کہ تم خود مانتے ہو کیونکہ وہ عرب کے نبی تھے تمہارے آباء نے اسکو رد کر دیا اور بوجہ اندازہ و حدود سے آگے نکل جانے کے رد کیا یعنی وہ سَوّٰىهَا کے مصداق نہ رہے اور اعتدال کو ترک کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتدل تعلیم ان کی برداشت سے باہر ثابت ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دس کا طریق بتایا ہے کہ وہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے یا تو جتنی قوت انسان کے اندر موجود ہوتی ہے وہ اس سے آگے نکل جاتا ہے اور یا پھر جتنی قوت موجود ہوتی ہے اس سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ حد سے نکل جانا دونوں طرح ہی ہوتا ہے اس طرح بھی کہ انسان اگلی طرف کو چلا جائے اور اس طرح بھی کہ پچھلی طرف کو آ جائے۔ ایسے

استعدادی طاقتوں کے کچلنے کا نتیجہ

کاموں سے فطرت کا نور مارا جاتا اور اس کی قوتیں نکل جاتی ہیں غرض یہ ثمود کی بھی یہی کیفیت تھی وہ لوگ اپنے کاموں سے حد سے آگے نکل گئے تھے خدا تعالیٰ نے ایک وسطی تعلیم ان کے لئے نازل کی تھی مگر وہ اس درمیانی خط پر کھڑے ہونے کی بجائے کبھی ادھر چلے جاتے اور کبھی ادھر چلے جاتے۔ درمیانی راستہ جو صراط ہوتا ہے اور جس پر ہر مومن کو اس دنیا میں چلنا پڑتا ہے اس راستہ پر وہ نہیں چلتے تھے بلکہ یا دائیں طرف کو نکل جاتے تھے یا بائیں طرف کو نکل جاتے، اعتدال کو انہوں نے ترک کر دیا تھا۔

۱۲؎ تفسیر۔ اس آیت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف سورۃ الغاشیہ کی آیت عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ کفار ایک منظم مخالفت شروع کرنیوالے ہیں اب اس سورۃ میں اسی قسم کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرکے بتایا ہے کہ جس طرح ثمود نے باقاعدہ لیڈر مقرر کرکے مخالفت کی تھی اسی طرح کفار کرنیوالے ہیں چنانچہ اس اشقی الناس نے جس طرح حضرت ثمودؑ کو تبلیغ سے روکا تم بھی تھوڑے دنوں تک ایسے ہی منصوبے کرو گے اور اسلام کو اپنی مجموعی قوت سے مٹانے کی کوشش کرو گے مگر یاد رکھو جس طرح انہیں ناکامی ہوئی اور وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بن گئے اسی طرح تم بھی اس مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۱۳؎ تفسیر۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے اسکی حکمت کو نہیں سمجھا اور انہوں نے خیال کر لیا ہے کہ وہ ناقہ اپنے اندر کوئی خاص عظمت اور شان رکھتی تھی جس کی کونچیں کاٹنے پر ثمود کی قوم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بن گئی۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس ناقہ کے متعلق یہ عجیب بات لکھدی

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ

اس پر انہوں نے اس (رسول) کو جھٹلایا۔ پھر اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ دیں ۱۴؎

ہے کہ وہ پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی عام اُونٹنیوں کی طرح نہیں تھی حالانکہ نبی کی موجودگی میں یہ ہو ہی کس طرح سکتا تھا کہ نبی کو دُکھ دینے کی وجہ سے تو قوم پر عذاب نازل نہ ہو اور ناقہ کی کونچیں کاٹنے پر عذاب نازل ہو جائے!

اصل بات یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام عرب میں مبعوث ہوئے تھے اور عرب میں اونٹوں پر سواری کی جاتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام بھی اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے اور اِدھر اُدھر تبلیغ کے لئے نکل جاتے۔ لوگ کھلے طور پر حضرت صالحؑ کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے کیونکہ اُن کے رشتہ دار موجود تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے صالحؑ کو کوئی تکلیف پہنچائی تو اس کے رشتہ دار ہم سے بدلہ لینے کے لئے کھڑے ہو جائینگے مگر چونکہ وہ تبلیغ بھی پسند نہیں کرتے تھے اس لئے وہ بعض اَور طریق آپکو دُکھ پہنچانے کیلئے اختیار کر لیتے تھے۔ اُنہی میں سے ایک طریق یہ تھا کہ جب حضرت صالح علیہ السلام تبلیغ کے لئے اردگرد کے علاقوں میں نکل جاتے تو کسی جگہ کے لوگ کہتے کہ ہم انکی اونٹنی کو پانی نہیں پلائینگے، کسی جگہ کے لوگ کہتے کہ ہم کھانے کے لئے کچھ نہیں دینگے۔ اُنکی غرض یہ تھی کہ جب انہیں اونٹنی کیلئے پانی اور چارہ وغیرہ نہ ملا تو یہ خود بخود اس قسم کے سفروں سے رُک جائیں گے اور تبلیغ میں روک پیدا ہو جائے گی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انکو سمجھایا کہ تم اس ناقہ کو آزاد پھرنے دو اور اس کے پانی پینے میں روک نہ بنو کیونکہ اس طرح میری تبلیغ میں روک واقع ہو جائیگی۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ تم مجھے تو اپنے پاس بیشک نہ آنے دو مگر یہ اونٹنی آئے تو اِسے پانی پلا دینا۔ انہیں اونٹنی سے کوئی دشمنی نہیں تھی انہیں اگر دشمنی تھی تو حضرت صالح علیہ السلام سے۔ اور وہ کہتے تھے کہ وہ اونٹنی پر سوار ہو کر اردگرد کے علاقوں میں ایک شور پیدا کر دیتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کیطرف توجہ دلاتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ چیز تھی جو انکی طبائع پر سخت گراں گزرتی تھی اور آخر اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ جب حضرت صالحؑ باہر نکلتے تو اُنکی اونٹنی کو وہ کہیں پانی نہ پینے دیتے اس پر حضرت صالح علیہ السلام نے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا کہ یہ طریق درست نہیں تم میری اس ناقہ کو آزاد پھرنے دو اور اس کے پانی میں روک نہ بنو یعنی تم مختلف ذرائع سے میری تبلیغ میں روک بن رہے ہو اپنے اس طریق کو چھوڑ دو اور مجھے آزاد پھرنے دو تاکہ میں خدا تعالیٰ کا پیغام سب لوگوں تک پہنچاتا رہوں۔

اونٹنی کو آزاد پھرنے دینے کے حکم کا اصل مقصد [۲۱۱]

میں نے بعض دفعہ گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے خود تجربہ کیا ہے کہ جب کسی احمدی گاؤں کے قریب سے گذروں تو وہاں کے لوگ بعض دفعہ میرے گھوڑے کی باگ پکڑ لیتے ہیں اُن کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں تو گھوڑے سے اُتر پڑوں اور گھوڑا اُن کے حوالے کر دوں تاکہ وہ اُسے اپنے گاؤں میں لے جائیں بلکہ اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں خود تھوڑی دیر کے لئے اُنکے گاؤں میں چلوں اسی طرح ثمود کی یہ غرض نہیں تھی کہ وہ ناقہ کو روکیں بلکہ انکی غرض یہ تھی کہ وہ حضرت صالح علیہ السلام کو تبلیغ سے روکیں اور جب حضرت صالح علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ میری اس ناقہ کو چھوڑ دو تو اُن کا بھی یہ مطلب نہیں تھا کہ میرے ساتھ تو جیسا چاہو سلوک کرو مگر اس ناقہ کو کچھ نہ کہو بلکہ اُن کا مطلب یہ تھا کہ تم میری تبلیغ میں روک مت بنو اگر تم اسی طرح میری اونٹنی کو پانی پینے سے روکتے رہے تو میری تبلیغ رُک جائے گی اور علاقوں کے علاقے ہدایت پانے سے محروم رہ جائیں گے۔

عَقَرُوْا [۲]

۱۴؎ حل لُغات۔ عَقَرُوْا، عَقَرَ سے جمع کا صیغہ ہے اور عَقَرَ الْاِبِلَ کے معنے ہوتے ہیں قَطَعَ قَوَائِمَهَا بِالسَّيْفِ یعنی اُس نے اُونٹوں کی کونچیں کاٹ دیں (اقرب) پس عَقَرُوْهَا کے معنے ہونگے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔

تفسیر۔ حضرت صالحؑ کے سمجھانے کے باوجود ثمود نے اُنکی

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ

جس پر اُن کے رب نے اُن کے گناہوں کی وجہ سے ہلاکت نازل کی اور اس (قوم) کو (مار کر زمین کے)

فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ ع ۱۶

برابر کر دیا ۝۱۵ اور وہ (اسی طرح) ان (مکہ والوں) کے انجام کی بھی پروا نہیں کریگا۔ ۝۱۶

بات کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ انہوں نے اُسے جھٹلایا اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں یعنی اپنے ارادوں کا انہوں نے علی الاعلان اظہار کر دیا اور کہہ دیا کہ تم خواہ کچھ کہو ہم تمہیں تبلیغ نہیں کرنے دینگے۔

عُقْبٰی

دَمْدَمَ

۝۱۵ حل لغات۔ دَمْدَمَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اَلْزَقَهٗ بِالْاَرْضِ اُسے زمین کے ساتھ پیوست کر دیا۔ دَمْدَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کے معنے ہوتے ہیں اَهْلَكَهُمْ۔ خدا تعالےٰ نے اُنکو ہلاک کر دیا اور دَمْدَمَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں كَلَّمَهٗ مُغْضِبًا۔ اُس سے غصہ کے ساتھ کلام کیا (اقرب)

عذاب کے متعلق فَسَوّٰىهَا کہنے سے انتہائی تباہی کی طرف اشارہ

تفسیر۔ فرماتا ہے چونکہ انہوں نے ہمارے رسول کی بات نہ مانی اس لئے ہم نے اُن پر عذاب نازل کیا اور عذاب بھی ایسا سخت کہ فَسَوّٰىهَا خدا نے اُنہیں زمین کے ساتھ ملا دیا اور اُن کے چھوٹوں اور بڑوں کو اس طرح تباہ کیا کہ اُن کا نشان تک دنیا میں نہ رہا۔

قرآن کریم اپنے کلام میں کیسی بلاغت کی شان رکھتا ہے کہ پہلے فرمایا تھا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ہم نے انسان کو معتدل القوٰی بنایا ہے اور خود انسانی نفس اس امر پر شاہد ہے کہ اُسے کوئی نور آسمان سے ملنا چاہیئے اب فرماتا ہے چونکہ انہوں نے اس تسویہ کی قدر نہ کی اور ہمارے احکام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لئے ہم نے اُن کا دوسری طرح تسویہ کر دیا کہ اُن کا نشان تک دنیا سے مٹا دیا۔ یہ بلاغت کا کمال ہے کہ جس چیز کا انہوں نے انکار کیا تھا عذاب کے معنوں میں بھی وہی لفظ لے آیا۔ انہوں نے تسویۂ نفس سے انکار کیا تھا اللہ تعالےٰ نے وہی لفظ اس جگہ استعمال کر دیا اور فرمایا کہ چونکہ انہوں نے تسویہ سے انکار کیا تھا ہم نے اُن کا اس رنگ میں تسویہ کر دیا کہ اُن کا ملک تباہ کر دیا، اُنکی عمارتیں

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا میں کفارِ مکہ کی تباہی کی طرف اشارہ

گر گئیں، قوم ہلاک ہو گئی اور اتنا بڑا زلزلہ آیا کہ اُن کا نشان تک باقی نہ رہا۔

۝۱۶ حل لغات۔ عُقْبٰی کے معنے ہوتے ہیں جَزَاءُ الْاَمْرِ کسی کام کی جزاء۔ اور عُقْبٰی کے معنے اٰخِرُ كُلِّ شَیْءٍ کے بھی ہوتے ہیں یعنی چیز کا آخری حصہ۔

تفسیر۔ عُقْبٰهَا میں هَا کی ضمیر دَمْدَمَة کی طرف جاتی ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب دَمْدَمَة نازل کرنے کا وقت آتا ہے اور کوئی قوم کلّی ہلاکت کی مستحق ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالےٰ یہ نہیں دیکھتا کہ اُن کے متعلقین کا کیا حال ہوگا یا یہ کہ اس سزا کا نتیجہ کیسا خطرناک نکلیگا بعض دفعہ ساری قوم ہلاک نہیں ہوتی بلکہ اُس کا کچھ حصہ بچ رہتا ہے جو دنیا میں انتہاء طور پر ذلیل ہو جاتا ہے مگر فرماتا ہے جب ہماری طرف سے کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر ہم اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس قوم کے بقیہ افراد کیا کیا تکالیف اٹھائیں گے۔ جب قوم کی اکثریت خدا تعالےٰ کے غضب کی مستحق ہو جاتی ہے اور خاموش رہنے والے گو مقابلہ نہیں کرتے مگر نبی کی تائید بھی نہیں کرتے تو وہ بھی اکثریت کے ساتھ ہی تباہ و برباد کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالےٰ ظلم کرتا ہے یا اندھا دُھند عذاب نازل کر دیتا ہے بلکہ جس قوم کے استیصال کا وہ فیصلہ کرتا ہے انصاف کے ماتحت کرتا ہے اور جبکہ وہ خود اپنے انجام کو نہیں دیکھتی تو اللہ تعالےٰ اُس کے انجام کو کیوں دیکھے۔ اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ کفارِ مکہ بھی ثمود کی طرح نبی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انکو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح ثمود کو تباہ کرتے وقت اللہ تعالےٰ نے ایک عام عذاب نازل کیا تھا

۝ اسی طرح وہ اہلِ مکہ پر بھی ایک عام عذاب نازل کریگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثمود کی قوم بحیثیت قوم تباہ ہو گئی تھی مگر مکہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کے بعد بھی باقی رہے لیکن اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ بعض دفعہ تباہی جسمانی نہیں روحانی ہوتی ہے۔ ثمود جسمانی طور پر کلّی ہلاکت میں مبتلا ہوئے اور مکہ والے مذہبی طور پر۔ چنانچہ ان کے مذہب اور طور و طریق کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ؂

سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ

سورۂ لیل ۔ یہ سورۃ مکی ہے [1]

وَهِيَ اِحْدٰى وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا اکیس[21] آیات ہیں اور ایک رکوع ہے ۔

[1] یہ سورۃ بقول مفسرین جمہور کے نزدیک مکی ہے ۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جمہور کا لفظ جو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس کے کبھی کبھی تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ اکثر کی رائے یہ ہے لیکن کبھی کبھی یہ لفظ صرف حسن کلام کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں ۔ در حقیقت سب تو الگ رہے اکثر بھی اس مسئلہ سے متفق نہیں ہوتے لیکن مصنف لکھ دیتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یوں اس طرح ہے اور اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اور ہمارے ہم خیال یوں کہتے ہیں ۔ جمہور کے معنے اصطلاحی طور پر عظیم الشان کثرت کے ہیں اور جب یہ لفظ واقعہ میں عظیم الشان کثرت کے معنے رکھتا ہو اور صحیح طور پر انہی معنوں میں استعمال ہو تو بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ صحابہ کی بڑی اکثریت یا تابعین یا تبع تابعین کی غالب اکثریت فلاں معنوں پر قائم تھی تو یہ امر واقعہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے لیکن جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں کبھی کبھی جمہور کے معنے ضرورتاً یہ بھی لے لئے جاتے ہیں کہ مصنف اور اُس کے ہم خیالوں کا کیا خیال ہے ۔ بعض دفعہ ایک معنوں کی رَو چل جاتی ہے ۔ ایک شخص کسی آیت کے ایک معنے لکھتا ہے پھر اس سے دوسرا نقل کرتا ہے اس کے بعد اُس سے تیسرا نقل کرتا ہے پھر چوتھا اور پھر پانچواں نقل کرتا ہے ۔ اس صورت میں جمہور کے معنے صرف اتنے ہی ہوتے ہیں کہ پانچ دس کتابوں میں ایک ہی معنے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ میں نے دیکھا ہے بعض دفعہ جمہور کا لفظ لکھ کر صحابہؓ کی ایک لسٹ دے دی جاتی ہے کہ یہ یہ صحابی ان معنوں کے خلاف ہیں ۔ گویا جمہور سے اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کے معنے لے کر چونکہ لوگوں نے اُن کو پے در پے نقل کرنا شروع کر دیا اس لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ جمہور کے نزدیک اس آیت کے یہی معنے ہیں یا دوسرے الفاظ میں جمہور سے اُن کی مراد نقالوں کی اکثریت ہوتی ہے نہ ان لوگوں کی اکثریت جو صحابہؓ ہیں یا تابعین ہیں یا تبع تابعین ہیں ۔ لیکن اس سورۃ کے متعلق جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جمہور کے نزدیک مکی ہے یہ اصلی معنوں میں ہے کیونکہ کسی صحابی کا قول مقابل میں نہیں آتا ۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس کو مدنی بھی کہا ہے مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں اس کو مکی قرار دیتے ہیں اور چونکہ یہ دو جلیل القدر صحابہؓ اس سورۃ کے مکی ہونے کی تائید میں ہیں اور اس کے خلاف کسی صحابی کا قول ثابت نہیں اس لئے ہم جمہور کے معنے یہاں غالب اکثریت کے ہی قرار دینگے ۔

بعض مفسرین کہتے ہیں یہ سورۃ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ۔ درحقیقت یہ ایسے ہی لوگوں کا خیال ہوتا ہے جو مضامین سے سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کیا کرتے ہیں ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مضامین کی بناء پر بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے بلکہ میں نے خود کئی مقامات پر مضامین سے استنباط کر کے بتایا ہے کہ ان مضامین کی بناء پر فلاں فلاں روایات کو ترجیح حاصل ہے مگر یہ درست نہیں ہوتا کہ کوئی شخص محض قیاس سے فیصلہ کر دے ۔ قیاس کسی واقعہ یا روایت کی تائید میں تو مفید ہو سکتا ہے مگر تاریخ کے مقابلہ میں صرف قیاس پر اعتماد درست نہیں ہوتا ۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص پوری کُنہ تک نہ پہنچ سکے اور وہ عقلی طور پر کوئی قیاس کر لے مثلاً مضمون سے قیاس کر لیا اور ایک نتیجہ نکال لیا مگر یہ کہنا کہ ضروری ہے کہ فلاں قسم کا مضمون مدنی سورتوں میں ہی پایا جائے یا مکی سورتوں میں ہی پایا جائے یہ وہی غلطی ہے جس میں یوروپین مصنفین مبتلا ہوئے ہیں ۔ مثلاً تاریخ کہتی ہے کہ فلاں سُورۃ

[1] سورۃ الیل مکی ہے ۔

مکی ہے مگر وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں یہ سورۃ تو مدنی ہے کیونکہ اس میں فلاں فلاں ذکر پایا جاتا ہے یا تاریخ کسی سورۃ کو مدنی کہتی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سورۃ تو مکی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں فلاں فلاں مضمون آتا ہے حالانکہ یہ صرف اُن کا قیاس ہوتا ہے اور قیاس تاریخ کے مقابل پر نہیں لایا جا سکتا۔ ہاں اگر تاریخ کسی سورۃ کو مکی کہتی ہو اور اُس کی تائید میں ہم کوئی قیاس لے آئیں تو یہ درست ہو سکتا ہے یا تاریخ کسی سورۃ کو مدنی کہتی ہو اور ہم اُس کی تائید میں کسی قیاس سے بھی کام لے لیں تو یہ جائز ہوگا۔ بہرحال مضمون سے قیاس کرنا دلیل مرجح تو بن سکتا ہے بالذات دلیل نہیں قرار پا سکتا۔ چنانچہ اس سورۃ کے متعلق برخلاف اُن لوگوں کے جنہوں نے اس کے مضمون کی وجہ سے بغیر کسی تاریخی شاہد کے اسے مدنی قرار دیا ہے میں یہ استنباط کرتا ہوں کہ یہ سورۃ مکی ہے اور وہ اس طرح کہ اس سورۃ سے پہلی دو سورتیں اور اس کے بعد کی دو سورتیں مکی ہیں اور ان دونوں سورتوں سے مضمون کے لحاظ سے یہ سورۃ بہت قریبی اشارکت رکھتی ہے اور چونکہ تاریخی شہادت بھی اس امر کی ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس لئے میری یہ دلیل دلیل کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ تاریخی شہادت کی تائید میں ہے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پہلی چند سورتوں میں مسلسل ایک خاص رنگ میں صدقہ و خیرات اور غریبوں کی خبرگیری کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ذکر تو ایسا ہوتا ہے جو اپنے اندر کوئی خصوصیت نہیں رکھتا صرف عمومی طور پر ایک بات کہہ دی جاتی ہے مگر یہ وہ سورتیں ہیں جن کے تمام مضامیں اس رنگ میں چلتے ہیں کہ صدقہ دینے والے یا نہ دینے والے، غرباء کی ضروریات پر خرچ کرنے والے یا نہ خرچ کرنے والے قومی لحاظ سے اپنی اپنی حالت کے مطابق ترقی پا جاتے ہیں یا تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہی مضمون اس سورۃ میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اِنِّیْ لَاَقُوْلُ اِنَّ ھٰذِہِ السُّوْرَۃَ نَزَلَتْ فِی السَّمَاحَۃِ وَالْبُخْلِ (فتح البیان تمہید تفسیر سورۃ الیل) یعنی میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ یہ سورۃ سخاوت اور بخل کے مضمون کے بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ پس جب ایک روایت موجود ہے جو تاریخی لحاظ سے اس سورۃ کو مکی قرار دیتی ہے تو دلیل مرجح کے طور پر اس سورۃ کی اندرونی شہادت بھی اُن لوگوں کے رد میں پیش کی جا سکتی ہے جو اس کو مدنی کہتے ہیں اور ہم یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ نہ صرف روایات اس کو مکی قرار دیتی ہیں بلکہ اس سورۃ کا مضمون بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ روایت کے خلاف ہم کسی قیاس کو پیش کر دیں سوائے اس کے کہ وہ قیاس بعض دوسری روایتوں پر مبنی ہو مثلاً بعض دفعہ قرآن کریم میں ایک مضمون آتا ہے جسے ہم لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں اب اگر اُس مضمون کے متعلق روایات میں اختلاف پایا جاتا ہو تو لازماً اُن روایات کو ترجیح حاصل ہوگی جن کی تائید قرآنی مضمون سے بھی ہوتی ہو۔ ورنہ واقعات کے بارہ میں محض قیاس آرائی ثابت شدہ تاریخی روایات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

سر میور کا خیال ہے کہ یہ سورۃ بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ پادری ویری لکھتے ہیں کہ یہ سورۃ ہے تو ابتدائی مگر تبلیغ عامہ کے زمانہ کی ہے یعنی تیسرے چوتھے یا پانچویں سال کی ہے کیونکہ اس میں منکروں کے لئے عذاب کی خبر ہے۔ پادری ویری کا یہ خیال میرے نزدیک درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس جگہ انذار عام قسم کا نہیں بلکہ اس میں خاص اور قریب میں آنیوالے واقعات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے

جابر بن سمرہؓ سے بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر اور عصر میں وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی اور اسی قسم کی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔

ترتیب اس سورۃ کا مضمون بھی وہی ہے جو پہلی سورتوں میں بیان ہوتا آ رہا ہے یعنی اس میں بھی ترقی اسلام کا ذکر ہے پہلی سورتوں اور اس سورۃ کے مضمون میں فرق صرف یہ ہے کہ اس سے پہلی سورۃ میں یہ نقطۂ نگاہ بیان کیا گیا تھا کہ ایک نظام کامل کے لانے والے کے بغیر کعبہ کی تعمیر کی غرض پوری نہیں ہوتی اور ایسے ہی وجود کے آنے سے قوم کو ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سورۃ میں بھی وہی مضمون ہے مگر اس میں زور معلّم کی زندگی پر اس قدر نہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ○

(مجھے) قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانک لے ؎۲

دیا گیا جس قدر کہ متعلّمین اور اُن کے مخالفوں کی زندگیوں کے فرق پر دیا گیا ہے۔ پہلی سورۃ میں یہ مضمون تھا کہ اچھے معلّم کے بغیر قوم ترقی نہیں کرسکتی اور اب یہ مضمون ہے کہ اچھے معلّم کو اگر اچھا متعلّم مل جائے تو وہ دنیا کی کایا پلٹ دیتا ہے اور یہ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو شاگرد ملے ہیں وہ ایسے اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ اُن کی زندگیوں کو دیکھکر انسان کے دل میں یہ مایوسی پیدا ہی نہیں ہوسکتی کہ عرب کی حالت کیونکر پلٹا کھائے گی۔ اللہ تعالےٰ کفارِ مکّہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مل رہے ہیں انکی زندگیاں تمہاری زندگیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دنیا میں اچھا اُستاد بڑا کام کرجاتا ہے اور لائق شاگرد بھی بڑا کام کرجاتا ہے لیکن جہاں لائق استاد اور لائق شاگرد مل جائیں وہاں تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کا معاملہ ہوجاتا ہے۔ اگر اچھے اُستاد کو بُرے شاگرد ملیں تو اُس کا کام اِس قدر نہیں چمکتا اور نہ نالائق اُستاد کے اچھے شاگرد زیادہ ترقی کرسکتے ہیں۔ مگر یہاں تو اچھے اُستاد کو اچھے شاگرد بھی مل گئے ہیں پس یہ دینِ محمدؐی کے غلبہ کی ایک بیّن علامت ہے (مزید تفصیل کیلئے دیکھو وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ؎۳)

؎۲ تفسیر۔ اس سے پہلی سورۃ میں فرمایا تھا وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰـہَا یعنی رات کو ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ وہ سورج کو ڈھانپ لیتی ہے مگر اس سورۃ میں یَغْشٰی کا کوئی مفعول بیان نہیں ہوا جس سے یہ پتہ لگے کہ غَشْیٌ کا عمل کس چیز پر ہوا ہے بلکہ اس کو بغیر کسی قید کے بیان کیا گیا ہے پس معلوم ہوا کہ یَغْشٰی کے معنے اس سورۃ میں زیادہ وسیع لئے گئے ہیں۔ پہلی سورۃ میں تاریکی کا صرف وہ پہلو مراد تھا جو سورج کے ڈھانپنے سے ظاہر ہوتا ہے تاریکی کے دوسرے نتائج کی طرف اشارہ نہ کیا گیا تھا مگر اس جگہ اس کے علاوہ اور معانی بھی لئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ الفاظ کے لحاظ سے اس کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ رات کی تاریکی کی وجہ سے سورج ہی نہیں پوشیدہ ہوا بلکہ دوسری اشیاء بھی اوجھل ہوگئی ہیں۔

قرآن کریم میں ایک جگہ یہ مضمون آتا ہے کہ رات دن کو ڈھانپتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ (الاعراف ع۷ پ۸) اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (الفلق) یعنی ہم پناہ مانگتے ہیں تاریک رات کے شر سے جب وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اور یہ بھی آتا ہے کہ رات سورج کو ڈھانپ لیتی ہے جیسا کہ اس سے پہلی سورۃ میں ہی فرمایا تھا وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰـہَا۔ چونکہ ان تینوں معنوں کی آیت زیرِ تفسیر متحمل ہوسکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم غور کریں کہ یہ تینوں معنے ہی اس جگہ پائے جاتے ہیں یا کسی دوسری دلیل کی وجہ سے ان میں سے صرف ایک یا دو معنے مراد ہیں ان کے سوا معنے مراد نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سورۃ میں ایک ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جو اس کے معنوں کو محدود کردیتا ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ صرف یہی معنے مراد ہیں کہ جب رات ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے۔ وہ قرینہ یہ ہے کہ یہاں وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی کے بعد وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی بیان ہوا ہے اگر وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی کی آیت وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی سے پہلے ہوتی تو اس آیت کے معنے کرتے ہوئے دن کو ڈھانکنے یا سورج کو ڈھانکنے کا مفہوم زیادہ قرینِ قیاس ہوتا مگر چونکہ یہاں وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی کی آیت کے بعد وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی کی آیت بیان

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ۝

اور دن کی جب وہ خوب روشن ہو جائے ۳؎

ہوتی ہے اس لئے یہ قرینہ اس بات کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ یہاں دن یا سورج کی بجائے دوسری چیزوں کو ڈھانکنے کا مفہوم غالب طور پر پایا جاتا ہے پس بجائے اس کے کہ ہم تینوں معنے یہاں مراد لیں اُس قرینہ کی وجہ سے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس آیت کے صرف یہی معنے ہوں گے کہ ہم رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے یعنی انسان۔ جانور اور دوسری چیزیں سب اندھیرے تلے آجاتی ہیں۔

۳؎ **تفسیر**۔ اس آیت اور سورۃ الشمس کی آیت وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا میں ایک فرق ہے وہاں نَهَار کے بعد إِذَا جَلّٰهَا کے الفاظ آتے ہیں مگر یہاں فرماتا ہے وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى وہاں یہ ذکر تھا کہ زمین سورج کے سامنے آکر اُس کو ظاہر کر دیتی ہے اور یہاں یہ ذکر ہے کہ سورج کی روشنی سے مستفیض ہو کر دن روشن ہو گیا۔ وہاں تمام اشارے اس بات کی طرف تھے کہ اُستاد اپنے فن میں کامل ہے وہ دنیا کو اپنے فیوض سے مستفیض کر دے گا گویا وہاں اُستاد کے وجود پر زور دیا گیا ہے مگر یہاں شاگردوں کی قابلیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ خواہ یہ کہہ دو کہ اُستاد نے شاگرد کو پڑھایا یا یہ کہہ دو کہ شاگرد نے اُستاد سے پڑھا۔ اس سے کلام میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا سوائے اس کے کہ جب ہم کہتے ہیں اُستاد نے پڑھایا تو اس میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ اُستاد نے محنت کی اور اُس نے توجہ سے اپنے فرض کو ادا کیا۔ اور جب ہم کہتے ہیں شاگرد نے اُستاد سے پڑھا تو اس میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ شاگرد نے بھی محنت سے کام لیا۔ اِسی طرح وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى میں زیادہ زور اس بات پر ہے کہ دن روشن ہو گیا یعنی جو زمین کی نسبت رکھنے والا یا شاگرد کی نسبت رکھنے والا وجود ہے اُس کی قابلیتوں پر زور دیا گیا ہے مگر وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا میں سورج یعنی اُستاد کی قابلیتوں پر زور دیا گیا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سورۃ میں گو مثال رات اور دن کی دی گئی ہے جیسے پہلی سورۃ میں رات اور دن کی مثال دی گئی تھی مگر مفہوم الگ الگ ہے۔ پہلی سورۃ میں دن کی روشنی کا پہلے ذکر کیا تھا اور اس کے مقابل پر شمس کا بھی پہلے ذکر تھا۔ چنانچہ پہلے نمبر پر وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا کہا گیا تھا اور اس کے مقابل میں وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا کا ذکر تھا۔ دوسرے نمبر پر قمر کا ذکر تھا جیسا کہ فرمایا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَا۔ اور اس کے مقابل میں وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا کا ذکر تھا۔ گویا شمس کے مقابلہ میں نہار کو رکھا گیا تھا اور قمر کے مقابلہ میں لیل کو۔ پھر جس طرح شمس کو پہلے بیان کیا تھا اور قمر کو بعد میں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نہار کو پہلے رکھا تھا اور لیل کو بعد میں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں شمسِ نبوت اور قمرِ رسالت کا ذکر تھا یا افاضہ اور استفاضہ کا مضمون بیان کیا گیا تھا اور اس امر کا ذکر کیا گیا تھا کہ فلاں نے نور کا افاضہ کیا اور فلاں نے اُس سے فیض حاصل کیا۔ اس مناسبت کی بناء پر پہلے نور اور دن کا ذکر تھا اور بعد میں رات اور قمر کا ذکر تھا مگر یہاں رات کا ذکر پہلے ہے اور دن کا بعد میں۔ کیونکہ اس جگہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کمالات کا ذکر اصل مطلوب نہیں بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور کفار کا مقابلہ کیا گیا ہے پس بوجہ کفر کے مقدم اور کثیر ہونے کے رات کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور دن کا بوجہ مسلمانوں کے موخر الزمان اور تھوڑے ہونے کے بعد میں کیا گیا ہے۔ پہلی سورۃ میں یہ ذکر تھا کہ دنیا کو منور کرنے کے لئے ہم نے ایک روحانی سورج اُفقِ آسمان پر پیدا کیا ہے دنیا اس سورج کی روشنی کو خواہ کس قدر چھپانا چاہے اب یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ وہ اس روشنی کو روک سکے یا اس نور کو پھیلنے نہ دے یہ قطعی

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰىٓ ۙ

اور نر و مادہ کی پیدائش کی ۵۴

اب بڑھنے گی اور بڑھتی چلی جانے گی یہاں تک کہ ساری دنیا کو ڈھانپ لے گی۔ مگر ایک لمبا عرصہ گذرنے کے بعد پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں یہ سورج لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیگا زمین والے اپنی پیٹھ موڑ لیں گے تاریکی چھا جائے گی اور روشنی جاتی رہے گی اُسوقت اللہ تعالےٰ پھر ایک قمر پیدا کرے گا جو اس شمس سے اکتسابِ نور کرکے دنیا کو منوّر کر دے گا۔ پس چونکہ وہاں اسلام کے زمانہ سے بات شروع کی گئی تھی طبعی طور پر شمس اور نہار کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا مگر یہاں کفر و اسلام کا مقابلہ ہے اور کفر چونکہ پہلے تھا اور اسلام بعد میں آیا اس لئے لَيْل کا پہلے ذکر کیا گیا اور نَهَار کا بعد میں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ کفر چونکہ اُس زمانہ میں کثیر تھا اور مسلمان اُس زمانہ میں قلیل التعداد تھے اس مناسبت کی بناء پر بھی اللہ تعالےٰ نے لَيْل کا ذکر پہلے کیا اور نَهَار کا بعد میں۔ اور اس طرح یہ پیشگوئی کی کہ رات کی حالت جو تم پر طاری ہے وہ اب دُور ہونے والی ہے اس کے بعد دن کی حالت آئے گی یا اس رات کے نتیجہ میں جو گمراہیاں اور خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ساکنینِ نہار اب اُن کو دُور کرنے والے ہیں (مزید تفصیل اسکی اگلی آیت کے نیچے آئے گی)

۵۴ تفسیر۔ اس آیت کے متعلق حضرت ابوالدرداء کو سخت غلو تھا۔ اُن کے خیال میں مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى کی جگہ اس آیت میں وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ علقمہ سے ابن جریر نے روایت کی ہے کہ میں ایک دفعہ شام گیا تو ابوالدرداء قافلہ میں آئے اور پوچھا کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ سے قرأت پڑھا ہُوا ہو؟ اس پر لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس پر میں نے بھی کہا کہ ہاں میں نے اُن سے قرآن پڑھا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ آپ نے عبداللہ بن مسعود کو یہ آیت کس طرح پڑھتے سُنا ہے میں نے بتایا کہ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى ۙ اس پر ابوالدرداء نے کہا کہ میں نے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پڑھتے سُنا ہے اور یہاں کے لوگ چاہتے ہیں کہ میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى پڑھوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا میں اُن کے پیچھے نہیں چلونگا۔ یہ مضمون بتغیّرِ الفاظ و مطالب مختلف راویوں کی مختلف کتبِ حدیث میں حضرت ابوالدرداء سے مروی ہے۔

قرآن مجید کے بعض الفاظ کی مختلف قرأتیں

اس بارہ میں یاد رکھنا چاہیئے کہ قرأتوں کا فرق شروع زمانہ سے چلا آیا ہے۔ پوری واقفیت نہ رکھنے والے مسلمان بعض دفعہ ایسی روایتوں سے گھبرا جاتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر یہ روائتیں درست ہیں تو پھر ہمارا یہ کہنا درست نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم کامل طور پر محفوظ ہے اور اُس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہُوا۔ مگر ایسا نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا اس لئے کہ شروع زمانہ سے ہی نسخ کے منکر اور حفاظتِ قرآنیہ کے قائل قرأت کے اس فرق کو تسلیم کرتے چلے آئے ہیں مگر باوجود اس فرق کے اُن کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ایک قرأت دوسری کو منسوخ نہیں کرتی اور دوسرے مضمون میں فرق نہیں ڈالتی یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک قرأت ایسا مضمون بیان کرے جس کی دوسری قرأت حامل نہ ہوسکے ہاں بعض دفعہ وہ مضمون کو وسیع کر دیتی اور اسکی مصدق ہوتی ہے۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى کی قرأت کے متعلق ایک اختلاف

دراصل بعض زبانوں کے فرق کی وجہ سے یا بعض مضامین کو نمایاں کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کو سبعۃ احرف پر نازل کیا ہے یعنی اس کی سات قرأتیں ہیں۔ ان قرأتوں کی وجہ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ قرآن کریم میں کوئی اختلاف ہے بلکہ اسے زبانوں کے فرق کا ایک طبعی نتیجہ سمجھنا چاہیئے بسا اوقات ایک ہی لفظ ہوتا ہے مگر ایک ہی ملک کے ایک حصہ کے لوگ اُسے ایک طرح بولتے ہیں اور اُسی ملک کے دوسرے حصہ کے لوگ اُسے اور طرح بولتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لفظ بدل گیا ہے یا اُس لفظ کا مفہوم تبدیل ہو گیا ہے۔

لفظ بتغیر قلیل وہی رہے گا اُس لفظ کے معنے بھی وہی رہیں گے صرف اس وجہ سے کہ کوئی قوم اُس لفظ کو صحیح رنگ میں ادا نہیں کرسکتی وہ اپنی زبان میں ادا کرنے کے لئے اُس کی کوئی اور شکل بنالے گی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں چونکہ عرب کی آبادی کم تھی قبائل ایک دوسرے سے دُور دُور رہتے تھے اس لئے اُن کے لہجوں اور تلفظ میں بہت فرق ہوتا تھا۔ زبان ایک ہی تھی مگر بعض الفاظ کا تلفظ مختلف ہوتا تھا اور بعض دفعہ ایک معنی کے لئے ایک قبیلہ میں ایک لفظ بولا جاتا تھا دُوسرے قبیلہ میں دوسرا لفظ بولا جاتا تھا ان حالات میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے اجازت دے دی کہ فلاں فلاں الفاظ جو مختلف قبائل کے لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھتے۔ اُن کی جگہ فلاں فلاں الفاظ وہ استعمال کرلیا کریں۔ چنانچہ جب تک عرب ایک قوم کی صورت اختیار نہیں کرگیا اُس وقت تک یہی طریق اُن میں رائج رہا۔ اگر اس کی اجازت نہ دی جاتی تو قرآن کریم کا یاد کرنا اور پڑھنا مکہ کے باشندوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے مشکل ہوتا اور قرآن کریم اس سرعت سے نہ پھیلتا جس طرح کہ وہ پھیلا۔ قبائل کی زبان کا یہ فرق غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں اب تک بھی ہے تعلیمیافتہ لوگ تو کتابوں سے ایک ہی زبان سیکھتے ہیں لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگ چونکہ آپس میں بول کر زبان سیکھتے ہیں ان میں بجائے ملکی زبان کے قبائلی زبان کا رواج زیادہ ہوتا ہے۔

مَیں جب حج کے لئے گیا تو ایک یمنی لڑکا جو سولہ سترہ سال کا تھا اور جو سیٹھ ابوبکر صاحب کا ملازم تھا قافلہ کے ساتھ چلا جارہا تھا۔ میں راستہ میں عربی زبان میں اُس سے گفتگو کرتا رہا اور میں نے دیکھا کہ وہ میری اکثر باتوں کو سمجھ جاتا اور اُن کا جواب بھی دیتا مگر بعض دفعہ وہ حیرت سے میرے مُنہ کو دیکھنے لگ جاتا اور کہتا کہ میں آپ کی بات کو سمجھا نہیں۔ میں حیران ہُوا کہ یہ بات کیا ہے کہ یہ لڑکا عربی سمجھتا بھی ہے مگر کبھی کبھی رُک بھی جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کی بات کو نہیں سمجھا۔ جب میں مکہ پہنچا تو میں نے کسی سے ذکر کیا کہ یہ لڑکا عرب ہے اور عربی کو خوب سمجھتا ہے مگر باتیں کرتے کرتے بعض جگہ رُک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری سمجھ میں بات نہیں آئی معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے تو اُن صاحب نے بتایا کہ یہ لڑکا یمنی ہے اور یمنیوں اور حجازیوں کے بعض الفاظ میں بڑا بھاری فرق ہوتا ہے اس لئے یہ ایسی اختلاف کے موقعہ پر ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے چنانچہ انہوں نے اس فرق کے بارہ میں یہ لطیفہ سُنایا کہ مکہ میں ایک امیر عورت تھی اُس کا ایک یمنی ملازم تھا وہ عورت حُقّہ پینے کی عادی تھی وہاں عام رواج یہ ہے کہ حُقّہ کے نیچے کا پانی کا برتن شیشے کا ہوتا ہے اس لئے اُسے کہتے بھی شیشہ ہی ہیں۔ ایک دن اُس عورت نے اپنے ملازم کو بُلایا اور اُس سے کہا غَيِّرِ الشِّيْشَةَ شیشہ بدل دو۔ لفظ تو اُس نے یہ کہے کہ شیشہ بدل دو مگر محاورہ کے مطابق اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کا پانی گراکر نیا پانی بدل کر ڈال دو۔ ملازم نے یہ فقرہ سُنا تو اُس کے جواب میں کہا سَتِّيْ هٰذَا طَيِّبٌ۔ بیگم صاحبہ یہ تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے عورت نے پھر کہا کہ قُلْتُ لَكَ غَيِّرِ الشِّيْشَةَ۔ میں نے جو تم کو کہا ہے کہ بدل دو تم انکار کیوں کرتے ہو۔ نوکر نے پھر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ سَتِّيْ هٰذَا طَيِّبٌ۔ میری آقا یہ تو اچھا بھلا ہے۔ آخر آقا نے ڈانٹ کر کہا تم میرے نوکر ہو یا حاکم ہو میں جو تم سے کہہ رہی ہوں کہ اسے بدل دو تم میری بات کیوں نہیں مانتے۔ نوکر نے شیشہ اُٹھایا اور باہر جاکر اس زور سے زمین پر مارا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ عورت نے کہا ارے یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اتنا قیمتی برتن تم نے توڑ کر رکھ دیا۔ نوکر نے کہا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ برتن بڑا اچھا ہے مگر آپ مانتی نہیں تھیں اب جو میں نے توڑ دیا تو آپ ناراض ہورہی ہیں۔ عورت نوکر پر سخت خفا ہوئی مگر ایک یمنی زبان کے واقف نے اُسے سمجھایا کہ نوکر کا قصور نہیں کیونکہ حجاز میں غَيِّرْ کے معنے بدلنے کے ہیں اور محاورہ میں جب شیشہ کے ساتھ بولا جائے تو اُس کا پانی بدلنے کے ہوجاتے ہیں یمنی زبان میں تَغْيِيْر کے معنے توڑنے کے ہوتے ہیں پس جب تم نے غَيِّرِ الشِّيْشَةَ کہا تو نوکر اپنی زبان کے مطابق یہ سمجھا کہ تم اُسے برتن توڑنے کا حکم دے رہی ہو اسی لئے وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ بی بی یہ تو اچھا بھلا ہے اسے کیوں تڑوا رہی ہو۔

مگر جب تم نہ مانیں اور بار بار زور دیا تو وہ غریب کیا کرتا۔ اب دیکھو غَـیْـرِ الشَّیْتَشَۃَ ایک معمولی فقرہ ہے مگر زبان کے فرق کی وجہ سے یمنی نوکر نے اس کے کچھ کے کچھ معنے سمجھ لئے۔ اس قسم کے الفاظ جو زبان کے اختلاف کی وجہ سے معانی میں بھی فرق پیدا کر دیتے ہیں اگر قرآن کریم میں اپنی اصل صورت میں ہی پڑھے جاتے تو یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ اُن قبائل کو سخت مشکلات پیش آتیں اور اُن کے لئے قرآن کریم کا سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ اس نقص کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ہم معنی الفاظ پڑھنے کی اجازت دی جن سے قرآن کریم کے سمجھنے اور اس کے صحیح تلفظ کے ادا کرنے میں مختلف قبائلِ عرب کو دقت پیش نہ آئے۔ پس مضمون تو وہی رہا صرف بعض الفاظ یا بعض محاورات جو ایک قوم میں استعمال ہوتے تھے اور دوسری قوم میں نہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن الفاظ یا اُن محاورات کی جگہ اُن کی زبان کے الفاظ یا اپنی زبان کے محاورات انہیں بتا دئے تا کہ قرآن کریم کے مضامین کی حفاظت ہو سکے اور زبان کے فرق کی وجہ سے اس کی کسی بات کو سمجھنا لوگوں کیلئے مشکل نہ ہو جائے۔ اسی طرح اس کا پڑھنا اور یاد کرنا بھی مشکل نہ رہے ورنہ اصل قرأت قرآن کریم کی وہی ہے جو حجازی زبان کے مطابق ہے۔ اس تفصیل کو معلوم کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک عارضی اجازت تھی اصل کلام وہی تھا جو ابتداءً رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اُن الفاظ کے قائم مقام اُسی وقت تک استعمال ہو سکتے تھے جب تک قبائل آپس میں متحد نہ ہو جاتے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب بجائے اس کے کہ مکہ والے مکہ میں رہتے۔ مدینہ والے مدینہ میں رہتے۔ نجد والے نجد میں رہتے۔ طائف والے طائف میں رہتے۔ یمن والے یمن میں رہتے اور وہ ایک دوسرے کی زبان اور محاورات سے ناواقف ہوتے۔ مدینہ دار الحکومت بن گیا تو تمام قومیں ایک ہو گئیں کیونکہ اُس وقت مدینہ والے حاکم تھے جن میں ایک بڑا طبقہ مہاجرین مکہ کا تھا اور خود اہلِ مدینہ بھی اہلِ مکہ کی صحبت میں حجازی عربی سیکھ چکے تھے پس چونکہ قانون کا نفاذ اُن کی طرف سے ہوتا تھا، مال اُن کے قبضہ میں تھا اور دنیا کی نگاہیں اُنہی کی طرف اُٹھتی تھیں۔ اس وقت طائف کے بھی اور نجد کے بھی اور مکہ کے بھی اور یمن کے بھی اور دوسرے علاقوں کے بھی اکثر لوگ مدینہ میں آتے جاتے تھے اور مدینہ کے مہاجر و انصار سے ملتے اور دین سیکھتے تھے اور اسی طرح سب ملک کی علمی زبان ایک ہوتی جاتی تھی۔ پھر کچھ اِن لوگوں میں سے مدینہ میں ہی آکر بس گئے تھے اُن کی زبان تو گویا بالکل ہی حجازی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ جب اپنے وطنوں کو جاتے ہونگے تو چونکہ یہ علماء اور اُستاد ہوتے تھے یقیناً اُن کے علاقہ پر اُن کے جانے کی وجہ سے بھی ضرور اثر پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں جنگوں کی وجہ سے عرب کے مختلف قبائل کو اکٹھا رہنے کا موقعہ ملتا تھا اور افسر چونکہ اکابر صحابہؓ ہوتے تھے اُن کی صحبت اور اُن کی نقل کی طبعی خواہش بھی زبان میں یک رنگی پیدا کرتی تھی۔ پس گو ابتداء میں تو لوگوں کو قرآن کریم کی زبان سمجھنے میں دقتیں پیش آتی ہوں گی مگر مدینہ کے دار الحکومت بننے کے بعد جب تمام عرب کا مرکز مدینہ منورہ بن گیا اور قبائل اور اقوام نے بار بار وہاں آنا شروع کر دیا تو پھر اس اختلاف کا کوئی امکان نہ رہا۔ کیونکہ اُس وقت تمام علمی مذاق کے لوگ قرآنی زبان سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ آئندہ صرف حجازی قرأت پڑھی جائے اور کوئی قرأت پڑھنے کی اجازت نہیں۔ آپ کے اس حکم کا مطلب یہی تھا کہ اب لوگ حجازی زبان کو عام طور پر جاننے لگ گئے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُنہیں حجازی عربی کے الفاظ کا بدل استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عثمانؓ کے اس حکم کی وجہ سے ہی شیعہ لوگ جو سُنّیوں کے مخالف ہیں کہا کرتے ہیں کہ موجودہ قرآن بیاضِ عثمانی ہے حالانکہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک عربوں کے میل جول پر ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا اور وہ آپس کے میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبانوں کے فرق سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ اُس وقت اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اور قرأتوں میں بھی لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی جاتی۔ یہ اجازت محض

قرآن کریم کے بعض الفاظ کو مختلف قرأتوں میں پڑھے جانے کی اجازت دئے جانے میں حکمت

حضرت عثمانؓ کا قرآن مجید کو حجازی قرأت میں محفوظ کرنا

وقتی طور پر تھی اور اس ضرورت کے ماتحت تھی کہ ابتدائی زمانہ تھا قومیں متفرق تھیں اور زبان کے معمولی معمولی فرق کی وجہ سے الفاظ کے معانی بھی تبدیل ہو جاتے تھے اس نقص کی وجہ سے عارضی طور پر بعض الفاظ کو جو ان قبائل میں رائج تھے اصل وحی کے بدل کے طور پر خدا تعالیٰ نے وحی کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی تاکہ قرآن کریم کے احکام کے سمجھنے اور اس کی تعلیم سے روشناس ہونے میں کسی قسم کی روک حائل نہ ہو اور ہر زبان والا اپنی زبان کے محاورات میں اُس کے احکام کو سمجھ سکے اور اپنے لہجہ کے مطابق پڑھ سکے۔ جب بیس سال کا عرصہ اس اجازت پر گذر گیا زمانہ ایک نئی شکل اختیار کر گیا، قومیں ایک نیا رنگ اختیار کر گئیں، وہ عرب جو متفرق قبائل پر مشتمل تھا ایک زبردست قوم بلکہ ایک زبردست حکومت بن گیا، آئینی ملک کا نفاذ اور نظام تعلیم کا اجراء اُن کے ہاتھ میں آگیا، مناصب کی تقسیم اُن کے اختیار میں آگئی، حدود اور قصاص کے احکام کا اجراء انہوں نے شروع کر دیا تو اس کے بعد اصلی قرآنی زبان کے سمجھنے میں لوگوں کو کوئی دقت نہ رہی اور جب یہ حالت پیدا ہو گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس عارضی اجازت کو جو محض وقتی حالات کے ماتحت دی گئی تھی منسوخ کر دیا اور یہی اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا مگر شیعہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا قصور اگر قرار دیتے ہیں تو یہی کہ انہوں نے مختلف قرأتوں کو مٹا کر ایک قرأت جاری کر دی۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے مختلف قرأتوں میں قرآن کریم پڑھنے کی اجازت اسلام کے دوسرے دَور میں دی ہے ابتدائی دَور میں نہیں دی جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کا نزول گو حجازی زبان میں ہوا ہے مگر قرأتوں میں فرق دوسرے قبائل کے اسلام لانے پر ہوا۔ چونکہ بعض دفعہ ایک قبیلہ اپنی زبان کے لحاظ سے دوسرے قبیلہ سے کچھ فرق رکھتا تھا اور یا تو وہ تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا تھا یا اُن الفاظ کا معنوں کے لحاظ سے فرق ہو جاتا تھا اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت بعض اختلافی الفاظ کے لہجہ کے بدلنے یا اُس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنے کی اجازت دے دی۔ مگر اس کا آیات کے معانی یا اُن کے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا بلکہ اگر یہ اجازت نہ دی جاتی تو فرق پڑتا۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سورۃ عبداللہ بن مسعودؓ کو اور طرح پڑھائی اور حضرت عمرؓ کو اور طرح پڑھائی کیونکہ حضرت عمرؓ خالص شہری تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ گڈریا تھے اور اس وجہ سے بدوی لوگوں سے اُن کا تعلق زیادہ تھا۔ پس دونوں زبانوں میں بہت بڑا فرق تھا۔ ایک دن عبداللہ بن مسعودؓ قرآن کریم کی وہی سورۃ پڑھ رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس سے گذرے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ کو کسی قدر فرق سے اس سورۃ کی تلاوت کرتے سُنا۔ انہیں بڑا تعجب آیا کہ یہ کیا بات ہے کہ الفاظ کچھ اَور ہیں اور یہ کچھ اَور طرح پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے گلے میں پٹکا ڈالا اور کہا چلو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس میں ابھی تمہارا معاملہ پیش کرتا ہوں تم سورۃ کے بعض الفاظ اور طرح پڑھ رہے ہو اور اصل سورۃ اور طرح ہے۔ غرض وہ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ نے یہ سورۃ مجھے اَور طرح پڑھائی تھی اور عبداللہ بن مسعودؓ اور طرح پڑھ رہے تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا تم یہ سورۃ کس طرح پڑھ رہے تھے؟ وہ ڈرے اور کانپنے لگ گئے کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہو گئی ہو مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ڈرو نہیں پڑھو۔ انہوں نے پڑھ کر سُنائی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ نے تو مجھے اور طرح پڑھائی تھی۔ آپ نے فرمایا وہ بھی ٹھیک ہے پھر آپ نے فرمایا قرآن کریم سات قرأتوں میں نازل کیا گیا ہے تم ان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑا نہ کرو۔ اس فرق کی وجہ در اصل یہی تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سمجھا عبداللہ بن مسعودؓ گڈریا ہیں۔ اور اُن کا اَور لہجہ ہے اس لئے اُن کے لہجہ کے مطابق جو قرأت تھی وہ انہیں پڑھائی۔ حضرت عمرؓ کے متعلق آپ نے سوچا کہ یہ خالص شہری ہیں اس لئے انہیں اصل مکی زبان کی نازل شدہ قرأت بتائی۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اُن کی اپنی زبان میں سورۃ پڑھنے

کی اجازت دے دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خالص شہری زبان میں وہ سورۃ پڑھا دی۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فرق ہیں جو مختلف قراٗتوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے مگر ان کا نفسِ مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا ہر شخص سمجھتا تھا کہ یہ تمدن اور تعلیم اور زبان کے فرق کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

میں ایک دفعہ کراچی میں تھا کہ وہاں ایک ایجنٹ ایک کروڑپتی تاجر کو مجھ سے ملانے کے لئے آیا۔ ایجنٹ شہری تھا اور تاجر گنواری علاقہ کا۔ جب وہ تاجر مجھ سے بات کرنے لگا تو مجھے مخاطب کر کے کہتا کہ "تم نوں" یہ بات معلوم ہو گی۔ اب اوّل تو تم کا لفظ شہریوں میں معزز آدمی کو خطاب کرتے ہوئے استعمال نہیں کرتے دوسرے تم کے ساتھ "نوں" لگانا تو اور بھی معیوب ہے۔ اُردو میں کہیں گے تم کو نہ کہ تم نوں۔ جب وہ تاجر مجھے تم نوں کہتا تو میں نے دیکھا اُسے ساتھ لانے والا ایجنٹ بے حد اضطراب کے ساتھ اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگ جاتا اور میری طرف دیکھتا کہ اِن پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا ہے اور مجھے تاجر کے تم نوں اور ایجنٹ کی گھبراہٹ پر لطف آرہا تھا۔ اب معنوں کے لحاظ سے "آپ کو" اور "تم نوں" میں کوئی بھی فرق نہیں لیکن ایک شہری کے لئے "تم نوں" کہنا اور ایک انبالہ پٹیالہ کے گنوار کے لئے "آپ کو" کہنا ایک مجاہدہ سے کم نہیں۔ پنجاب میں گجرات کی طرف کے لوگ پکڑنے کو "پھدنا" کہتے ہیں اور ہماری طرف کے لوگ "پھڑنا"۔ ہم لوگ پھدنا کہیں تو ملتھے پر پسینہ آجاتا ہے گجراتی پھڑنا کہے تو اس کے گلے میں پھندے پڑتے ہیں۔ گورداسپور میں شریر آدمی کو شُہدا کہتے ہیں۔ ضلع سرگودھا میں شریف اور نیک طبیعت کو شُہدا کہتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت خلیفۂ اول رضؓ کی ایک عزیزہ آئی کسی ذکر پر اُس نے آپ کی نسبت کہا "اوساں شُہدے نوں انہاں گلاں دا کی پتا" یعنی مولوی صاحب شریف آدمی ہیں ان کو ایسی باتوں کا کیا علم۔ اس طرف کی مستورات نے ایک دفعہ اس فقرہ کو سُنا اور حیاء کے ماتحت برداشت کر گئیں مگر اتفاق سے اُس نے پھر دُہرایا تو وہ اُس سے دست و گریباں ہونے کو تیار ہو گئیں اور کہا کہ کچھ حیاء کرو تم تو گالیاں دے رہی ہو اُس غریب نے حیرت سے پوچھا کہ میں تعریف کر رہی ہوں کہ گالیاں دیتی ہوں۔ "اوہ شُہدا تے ہے"۔ آخر کسی عورت نے جو اس فرق کو سمجھتی تھی اس جوش کو ٹھنڈا کیا۔ اب دیکھو اگر کسی کتاب میں جو سارے پنجاب کے لئے لکھی گئی ہو کسی بزرگ کی نسبت شُہدے کا لفظ آجائے تو اُس کی توضیح یا دوسرے علاقہ کے لئے دوسرے لفظ کا استعمال قرار کرنا ضروری ہو گا یا نہیں؟ یہی ضرورت اُس زمانہ میں مختلف قراٗتوں کی اجازت کی تھی لیکن جب تمدن اور حکومت کے ذریعہ سے قبائلی حالت کی جگہ ایک قومیت اور ایک زبان نے لے لی اور سب لوگ حجازی زبان سے پوری طرح آشنا ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے سمجھا اور صحیح سمجھا کہ اب اِن قراٗتوں کو قائم رکھنا اختلاف کو قائم رکھنے کا موجب ہو گا اس لئے اِن قراٗتوں کا عام استعمال اب بند کرنا چاہئے باقی کتبِ قرأت میں تو وہ محفوظ رہیں گی۔ پس اُنہوں نے اِس نیک خیال کے ماتحت عام استعمال میں حجازی اور اصل قرأت کے سوا باقی قراٗتوں سے منع فرما دیا اور عربوں اور عجمیوں کو ایک ہی قرأت پر جمع کرنے کے لئے تلاوت کے لئے ایسے نسخوں کی اجازت دی جو حجازی اور ابتدائی قرأت کے مطابق تھے۔

ابن اُمّ عبد کا یہ واقعہ بھی اسی قسم کے قرأت کے اختلاف کے متعلق ہے۔ عربی زبان میں مَا کا استعمال کئی معنوں میں ہوتا ہے مَا نافیہ بھی ہے اور مصدریہ بھی اور مَا مَنْ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ جب مصدری معنے اور مَنْ کے معنے دونوں ہی مراد ہوں تو ایسے مقام پر مَنْ کا استعمال کرنا یا مصدر کا استعمال کرنا مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ مصدر ایک معنے دے گا اور مَنْ دوسرے معنے دے گا دونوں معنے کسی ایک طریق کے استعمال سے ظاہر نہ ہوں گے مگر چونکہ ایسے کئی مواقع قرآن کریم میں آتے ہیں جبکہ مصدری معنے اور مَنْ کے معنے دونوں ہی بتلانے مقصود ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایسے مواقع پر مَا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تا یہ دونوں مفہوم ظاہر ہوں۔ مگر بعض عرب قبائل مَا کے مصدری معنے تو کرتے ہیں لیکن مَا کا استعمال مَنْ کی جگہ ناجائز سمجھتے ہیں اس لئے اس استعمال سے اُن کے لئے مشکل پیش آجاتی تھی پس اس کو دُور کرنے کے لئے وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثَى کی قرأت کی بھی اجازت دے دی گئی۔ جو جملہ ایک حد تک مَا کا مفہوم ادا کر دیتا ہے

لیکن چونکہ ویسا مکمل مفہوم ادا نہیں کرتا جیسے مَا اس لئے اصل قرآنی عبارت کے طور پر اسے استعمال نہیں کیا گیا صرف عارضی قرأت کے طور پر اس کا استعمال جائز رکھا گیا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابوالدرداءؓ کو کوئی غلطی لگی ہو جب وہ خود کہتے ہیں کہ صحابہ مجھ پر زور دیتے ہیں کہ میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى پڑھوں تو اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس بارہ میں ضرور کوئی بھول چوک واقعہ ہو گئی ہے ورنہ صحابہؓ کی اکثریت اُن پر یہ زور نہ ڈالتی کہ اصل قرأت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ہی ہے وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى نہیں ہے۔ پس اوّل تو ضروری نہیں کہ ہم اس کو دوسری قرأت قرار دیں جب کثرت سے صحابہؓ کہتے ہیں کہ یہ قرأت نہیں تو ضروری ہے کہ ہم اسے قرأت قرار نہ دیں بلکہ ابوالدرداءؓ کی رائے کو غلط سمجھیں لیکن اگر اس قرأت کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس سے آیت کے معنوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اور قرأت کا اختلاف قرآن کریم کے کسی نقص پر نہیں بلکہ اُس کے معنوں کی وسعت پر دلالت کرتا ہے۔

٢ اختلافِ قرأت کے فوائد

قریب کے زمانہ میں ایک انگریز نے قرآن کریم کے تین پُرانے نسخے نکالے ہیں وہ حلب میں ایک مسیحی مونسٹری MONESTRY میں پروفیسر مقرر تھا اُس نے اپنے زعم میں قرآن کریم کے تین پُرانے نسخے حاصل کئے ہیں اور اُن کے باہمی اختلافات کو اُس نے LEAVES FROM THREE DIFFRENT QURANS یعنی "قرآن کے پُرانے تین نسخوں کے متفرق اوراق" کے نام سے شائع کر دیا جب وہ کتاب شائع ہوئی تو لوگوں میں بڑا شور اُٹھا اور عیسائیوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ اب قرآن کریم کی حفاظت کا دعویٰ بالکل باطل ہو گیا ہے۔ میں نے بھی وہ کتاب منگوائی تاکہ میں دیکھوں کہ قرآن کی حفاظت کے خلاف اُس میں کون سے دلائل دئے گئے ہیں۔ جب میں نے اُسے پڑھا تو مجھے معلوم ہُوا کہ جو نسخے اُس کے پیش کئے گئے ہیں اُن میں اِسی قسم کا اختلاف ہے کہ کسی جگہ مَا کی جگہ مَنْ ہے اور کسی جگہ مَنْ کی جگہ مَا ہے۔ کسی جگہ قَالُوْا کے آگے الف ہے اور کسی جگہ الف نہیں۔ کسی جگہ ہٗ کی بجائے ھُمْ کی ضمیر استعمال کی گئی ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اِس قرآنی نسخہ کا اختلاف یا تو بعض قرأتوں پر مبنی تھا یا کتابت کی غلطیاں تھیں اور بس۔ میں نے اسے پڑھ کر نتیجہ نکالا کہ اگر ان مزعومہ قدیم نسخوں کو درست سمجھا جائے تب بھی اس سے قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اُس کی عبارات معنوں کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں کرتیں صرف کسی جگہ مَا کی جگہ مَنْ اور ہٗ کی جگہ ھُمْ کی ضمیر بدلی ہوئی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف قرأتوں کا فرق ہے اور کچھ بھی نہیں۔ غرض عیسائیوں کے کتب خانہ میں سے بھی کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جو قرأت کے اس فرق کے علاوہ قرآن کریم کے نسخوں میں کوئی اور فرق ثابت کر سکتی۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اِسی قرأت کے فرق کو بعض جگہ پیش کیا ہے۔ مثلاً وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مَوْتِهٖ کی بجائے ایک قرأت مَوْتِهِمْ بھی آتی ہے جو آپ کے بیان کردہ مضمون کی تائید کرتی ہے۔ پس قرأتوں کا اختلاف یا تو قبائلی زبانوں کے فرق کے ضرر سے بچانے کے لئے ہے یا قرآنی معنوں کی وسعت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے۔

اختلافِ قرأت کی حکمت بتانے کے بعد میں اب آیت کی تفسیر کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ رات کے وقت انسانی اعمال اور قسم کے ہوتے ہیں اور دن کے وقت اور قسم کے۔ مثلاً رات کو لوگ سونے کی تیاری کرتے ہیں اور دن کو کام کرنے کی تیاری کرتے ہیں۔ آدمی وہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اُس کے اعمال الگ الگ اوقات میں الگ الگ اقسام کے ہوتے ہیں۔ وہی آدمی جو دن کے وقت دوڑا بھاگا پھرتا ہے رات کے وقت بستر پر لیٹے ہوئے خراٹے مار رہا ہوتا ہے۔ دن کو اُس کی ہوشیاری اور چالاکی دیکھ کر حیرت آتی ہے اور رات کو اُس کی نیند اور غفلت دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ اور اگر فطرتیں ہی الگ الگ ہوں تو پھر تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ بعض کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جاگتے ہوئے بھی سو رہے ہوتے ہیں اور بعض کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ سوتے ہوئے بھی جاگ رہے ہوتے ہیں۔ حماسہ میں تأبّط شرًّا کا واقعہ

آتا ہے اُس صفاتی نام ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی بغل میں شرارت دبائے پھرتا تھا) اس لڑکے کا باپ مر گیا اور اپنے بیٹے کیلئے بہت بڑی جائداد چھوڑ گیا۔ اُس کی والدہ نے کسی اور سے نکاح کر لیا۔ سوتیلے باپ نے جائداد دیکھ کر چاہا کہ میں اس لڑکے کا خاتمہ کر دوں تا کہ کیلا اس جائداد سے فائدہ اٹھاؤں چنانچہ وہ اسے سیر کے بہانے کہیں باہر لے گیا اور اُس نے فیصلہ کیا کہ رات کو جب یہ سو جائے گا تو میں اُسے قتل کر دوں گا۔ جب لڑکا سو گیا تو باپ اٹھا تا کہ اُسے مار ڈالے مگر ابھی اُس کے پاؤں زمین پر پڑے ہی تھے کہ لڑکا تلوار لے کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا کیا بات ہے۔ باپ نے کہا کچھ نہیں یونہی کسی کام کے لئے اُٹھا تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹے گذرنے کے بعد وہ پھر اُٹھا کہ اُسے قتل کر دے مگر اُس کے اُٹھنے کے ساتھ ہی لڑکا پھر بیدار ہو گیا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے باپ نے پھر کوئی بہانہ کر دیا۔ اسی طرح ساری رات وہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح لڑکا سو جائے تو میں اُسے قتل کر دوں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جب بھی اٹھتا لڑکا تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا کیا بات ہے؟ لڑکا مضبوط تھا اور یہ بڑی عمر کا تھا اس وجہ سے بھی اُس پر ڈر غالب آ گیا اور آخر دوسرے دن وہ اسے واپس لے آیا اور اُس نے سمجھ لیا کہ میں اسے قتل نہیں کر سکتا۔ الغرض بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سوتے ہوئے بھی جاگ رہی ہوتی ہیں ذرا کوئی آہٹ ہو فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر دن کو بھی رات کی کیفیت طاری رہتی ہے وہ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگ جاتے ہیں اور بعض بڑے اطمینان کے ساتھ ایک طرف لیٹ کر سو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں انہی کیفیات کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے ایک رات کی حالت ہوتی ہے اور ایک دن کی۔ رات کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ خواہ کوئی چست اور ہوشیار ہو اُس پر بھی نیند طاری ہو جاتی ہے۔ بعض تو ایسے سوتے ہیں کہ کتنا جھنجھوڑو اُن کی آنکھ نہیں کھلتی۔ بار بار جگانے پر بھی بیدار نہیں ہوتے۔ سردیاں ہو تو لحاف میں سے نہیں نکلتے اور گرمیاں ہوں تو پانی کے چھینٹے مارنے پر بھی پہلو بدل کر سو جاتے ہیں لیکن دن کا وقت کام کا ہوتا ہے اُس میں چست آدمی تو اپنی ترقی کے لئے کئی قسم کے کاموں کو اختیار کر لیتا ہے لیکن سُست آدمی کو دن کے وقت تو کچھ نہ کچھ کام کرنا ہی پڑتا ہے مگر رات ساری اُس کی سوتے ہی گذرتی ہے۔ رات اور دن کی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں بعض قوموں پر رات کا زمانہ آیا ہوا ہوتا ہے اور بعض پر دن کا زمانہ ہوتا ہے۔ جو قومیں رات کے مشابہ ہوتی ہیں یا یوں کہو کہ جن پر رات آئی ہوئی ہوتی ہے وہ دن کو بھی سوتے ہیں اور رات کو بھی سوتے ہیں یعنی رات تو سوتے گذر جاتی ہے دن بھی کسی ایسے کام میں نہیں گذرتے کہ اُن کے لئے یا اُن کی قوم کے لئے کوئی اچھا نتیجہ نکلے۔ اور اس کے برخلاف جن اقوام پر دن کا زمانہ ہوتا ہے اُن کے دن تو کام میں گذرتے ہیں اُن کی راتیں بھی بیکار نہیں جاتیں اور وہ تاریکیوں اور مصیبتوں کے اوقات میں بھی اتنا کام کر جاتے ہیں کہ رات والی قوموں کو دن کے وقت یعنی ہر قسم کے سامانوں کی موجودگی میں بھی اتنے کام کا موقعہ نہیں ملتا۔ اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرماتا ہے وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی۔ ہم شہادت کے طور پر رات کو پیش کرتے ہیں جب وہ ڈھانپ لیتی ہے یعنی انسانی قویٰ پر چھا جاتی ہے جب سب لوگ سو جاتے ہیں اور حرکت کی جگہ سکون لے لیتا ہے گویا صرف تاریکی ہی نہیں ہوتی بلکہ عملاً ہر شئے کو رات ڈھانک لیتی ہے۔ رات کو اندھیرے میں سفر کرو تو راستہ بہت کم طے ہوتا ہے کیونکہ سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ موٹر میں بھی سفر کیا جائے تو رات کو اُس کی رفتار آدھی رہ جاتی ہے کیونکہ خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی نیچے نہ آ جائے یا اندھیرے کی وجہ سے کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔ اس وجہ سے ڈرائیور موٹر کی رفتار کو کم کر دیتا ہے۔ پھر اگر وہ خود ہی سو جائے تو اور بھی خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ بہرحال رات کو صرف تاریکی ہی نہیں ہوتی بلکہ عملاً ہر شئے کو وہ ڈھانپ لیتی ہے یعنی صرف جسم ہی نہیں بلکہ جب انسان سو جاتا ہے تو اُس کی عقل اور فکر بھی رات کی حکومت میں آ جاتا ہے پھر اُسے اپنے بُرے بھلے کی کچھ تمیز نہیں رہتی۔ یہ تو رات کی کیفیت تھی اس کے بعد فرمایا ہم اس کے بالمقابل تمہارے سامنے دن کو پیش کرتے ہیں جب وہ اس قدر روشن ہو جاتا ہے

کہ سونا اور غافل رہنا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالےٰ نے صرف رات کو پیش نہیں کیا کیونکہ رات کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں سب لوگ جاگ رہے ہوتے ہیں چنانچہ مسلمان تو لازماً سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کی نماز ادا کرتے ہیں پھر کچھ دیر کے بعد عشاء کی نماز پڑھتے ہیں اور سُنّتوں اور وتر کی ادائگی کے بعد ذکر الٰہی کرتے ہیں اِس کے بعد وہ سونے کی تیاری کرتے ہیں یا جو لوگ مطالعہ کرنا چاہیں وہ پہلے مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سوتے ہیں۔ عیاش قومیں تھیٹرز سینماؤں، ناچ گھروں، شراب خانوں میں اپنے وقت خرچ کرتی ہیں امراء کلبوں میں تاش و بلئیرڈ کھیلتے ہیں پس ساری رات سونے کے کام نہیں آتی بلکہ رات کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں لوگ بیدار رہتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے صرف لیل کو بطور شہادت پیش نہیں کیا بلکہ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى فرمایا ہے یعنی ہم رات کی اُس حالت کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں جب وہ عملاً ہر چیز کو ڈھانک لیتی ہے اور صرف جسم ہی نہیں بلکہ انسانی عقل اور دماغ کا بھی وہ احاطہ کر لیتی ہے۔ اس کے بعد خدا تعالےٰ نے نَہار کا ذکر کیا ہے مگر نَہار کے ساتھ بھی تَجَلّٰى کا لفظ رکھ دیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ ہم دن کے اُس حصہ کو شہادت کے طور پر پیش کر رہے ہیں جب وہ اس قدر روشن ہو جاتا ہے کہ سونا اور غافل رہنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حصہ کو پیش نہیں کر رہے کیونکہ صبح کے وقت کچھ لوگ سو جاتے ہیں مگر جب دن زیادہ چڑھ جائے تو پھر کوئی نہیں سوتا۔

صوفیاء میں یہ عام رواج رہا ہے کہ وہ صبح کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کیلئے سو جایا کرتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بھی یہی عادت تھی کہ آپ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر تک استراحت فرماتے۔ پس اللہ تعالےٰ یہاں نَہار کے ابتدائی حصہ کی مثال پیش نہیں کرتا بلکہ اُس حصہ کی مثال پیش کرتا ہے جب وہ پورا روشن ہو جاتا ہے یعنی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ انسان اگر سونا بھی چاہے تو وہ نہیں سو سکتا۔ یہ دونوں حالتیں یعنی رات کی وہ حالت جب وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اور دن کی وہ حالت جب سونے والے بھی جاگ اُٹھتے ہیں اللہ تعالےٰ بطور مثال کفار کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے یہی فرق تمہاری حالت اور محمد رسول اللہ صلے اللہ وسلم کے اصحاب کی حالت میں ہے۔ تمہاری تمام قوتوں پر تھکان اور خوابیدگی کا اثر ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عرب نے گو کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی مگر جتنی ترقی بھی کی تھی وہ اُن کی تھکان کا موجب بن گئی تھی۔ مکہ کا مجاور ہونا سب سے بڑی عزت سمجھا جاتا تھا اور جیسے مندر کے پوجاریوں کی حالت ہوتی ہے وہی حالت اُن کی تھی۔ قوت عملیہ فنا ہو چکی تھی اور اُن کے اعمال نے اُن میں کوفت پیدا کر دی تھی۔ غرض اللہ تعالےٰ اُن کو بتاتا ہے کہ تمہاری تمام قوتوں پر تھکان اور خوابیدگی کا اثر ہے تم لمبی جہالت اور لمبے عیش کے بعد زیادہ سے زیادہ سونا چاہتے ہو مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی حالت میں بیداری اور ہوشیاری اور قوت عملیہ پائی جاتی ہے۔ وہ جاگنا اور کام کرنا چاہتے ہیں اور تم سونا اور غافل رہنا چاہتے ہو پھر تمہارا اور اُن کا کیا مقابلہ؟ سونا جاگتے کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے؟ تمہاری حالتوں پر رات کی خوابیدگی طاری ہے اور اُن کی حالتوں پر دن کی بیداری غالب ہے۔ اُنکی راتیں بھی دن ہوتی ہیں اور تمہارے دن بھی رات ہوتے ہیں پھر تمہارا اور اُن کا کیا مقابلہ؟ جب تک تم بھی رات کے بعد دن کی حالت پیدا نہ کرو تم کبھی تسکھہ نہیں پا سکتے۔

اِس کے بعد فرماتا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ہم اُس خدا کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس نے نر اور مادہ پیدا کیا ہے اور جن سے دنیا میں آئندہ نسل ترقی کرتی ہے یعنی جس طرح دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکی حالتوں پر ہمیشہ دن کی بیداری طاری رہتی ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی حالتوں پر ہمیشہ رات کی خوابیدگی غالب رہتی ہے اِسی طرح کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں رجولیت کا مادہ ہوتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں نسوانیت کا مادہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو فیوض پہنچانیوالے

ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو استفاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جو لوگ افاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں وہ ذکر ہوتے ہیں اور جو استفاضہ کی قوت اپنے رکھتے ہیں وہ انثیٰ ہوتے ہیں اور جو لوگ نہ افاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں نہ استفاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں وہ خنثیٰ ہوتے ہیں۔ اُن سے دنیا میں کبھی کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ فرماتا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ۔ ہم نر و مادہ کی پیدائش کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی نر میں افاضہ کی قوت ہوتی ہے اور وہ دوسرے کو بچہ دیتا ہے اور مادہ میں استفاضہ کی قوت ہوتی ہے اور وہ بچہ کو اُس سے لیتی اور اُس کی پرورش کرتی ہے۔ یہی دو قومیں ہیں جن کے ملنے سے دنیا میں اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں اگر نر اور مادہ آپس میں نہ ملیں تو نسلِ انسانی کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جائے۔

بعض نے اس موقعہ پر اعتراض کیا ہے کہ قرآن کریم نے یہ تو کہا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ یعنی خدا تم نے ذکر اور انثیٰ کو پیدا کیا ہے مگر اُس نے خنثیٰ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ اُسے کس نے پیدا کیا ہے۔ مجھے علمی کتابوں میں اِس قسم کا اعتراض پڑھ کر حیرت آتی ہے اور پھر اَور زیادہ حیرت مجھے اس بات پر آتی ہے کہ مفسرین نے اس کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے اور جواب یہ دیا ہے کہ جو ہمارے نزدیک خنثیٰ ہے خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بہرحال یا ذکر ہے یا انثیٰ ہے اس سے باہر نہیں۔ یہ بھی ایک مجبوری کا جواب ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خنثیٰ کوئی پیدائش نہیں بلکہ وہ پیدائش کا ایک بگاڑ ہے اور اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے شربت بناتے وقت پاس سے کوئی خاکروب پیشاب کا پاٹ لیکر گزرے اور ٹھوکر سے اُچھل کر پیشاب کا کوئی قطرہ شربت کے گلاس میں جا گرے یا اپنا ہی بچہ کھڑے ہو کر پیشاب کر دے اور شربت میں کوئی قطرہ جا گرے تو ایسے شربت کو ہم شربت کی ایک قسم نہیں کہیں گے بلکہ یہ سمجھیں گے کہ وہ ناپاک شربت ہے۔ کیا کوئی عقلمند دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے احمق ہی ہے جو یہ کہے کہ ایک شربت تو وہ ہوتا ہے جس میں ایسنس ملا ہوا ہوتا ہے اور ایک شربت وہ ہوتا ہے جس میں پیشاب پڑا ہوا ہوتا ہے کیونکہ جس میں غلطی سے پیشاب کا کوئی قطرہ جا گرا ہے وہ شربت نہیں بلکہ ناپاک شدہ شربت ہے۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ نے ہر ایک کو یا ذکر پیدا کیا ہے یا انثیٰ پیدا کیا ہے۔ اگر ماں باپ اپنے اندر کوئی خرابی پیدا کر لیتے ہیں اور اُن کی صحت میں اس قسم کا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے کہ بجائے ذکر یا انثیٰ کے خنثیٰ پیدا ہو جاتا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ بھی ایک پیدائش ہے بلکہ صرف یہ کہا جائے گا کہ یہ پیدائش کا ایک بگاڑ ہے جو اس رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ خنثیٰ کو بھی پیدائش قرار دینا ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ خدا تعالیٰ آنکھیں دیتا ہے تو دوسرا جواب میں کہے کہ دنیا میں اندھے بھی تو ہوتے ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات کیسی بیہودہ ہے اگر کوئی اندھا ہوا ہے تو اپنے ماں باپ کی کسی نادانی یا غفلت یا بیماری کے نتیجہ میں ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ نے بہرحال ہر انسان کو آنکھوں والا بنایا ہے کسی کا اندھا پیدا ہونا ایک بگاڑ اور خرابی ہے نئی پیدائش نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت آتی ہے کہ ہمارے مفسرین نے اس بحث کو اٹھایا ہی کیوں کہ خدا تعالیٰ نے ذکر اور انثیٰ کا ہی کیوں ذکر کیا ہے خنثیٰ کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ خنثیٰ ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کا ناک کٹا ہوا ہو یا کسی کی آنکھ ماری ہوئی ہو یا کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سب انسانی پیدائش کے مختلف بگاڑ ہیں۔ کسی کی آنکھیں نہیں ہوتیں، کسی کے ہاتھ نہیں ہوتے، کسی کی زبان نہیں ہوتی، کسی کی انگلیاں کم و بیش ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے ہر چیز کو پیدائش کی ایک نئی قسم قرار دے دیا جائے تو پھر تو ہزار ہا اس قسم کی پیدائشیں نکل آئیں گی۔ دنیا میں ہر شخص کی خدا تعالیٰ نے دو ٹانگیں پیدا کی ہیں لیکن بعض دفعہ ماں باپ کی بے احتیاطی یا کسی رحمی نقص کی وجہ سے ایسا بچہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی تین ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے ہر ایک کو الگ الگ جسم عطا کیا ہے لیکن بعض دفعہ اِس قسم کے جُڑے ہوئے بچے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو اپریشن کے

ذریعہ ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑتا ہے اور بعض دفعہ تو آپریشن کے ذریعہ بھی اُن کو الگ نہیں کیا جا سکتا بظاہر دو دھڑ آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں لیکن دونوں کا جگر ایک ہوتا ہے یا دل ایک ہوتا ہے یا معدہ ایک ہوتا ہے، یا تلی ایک ہوتی ہے اور وہ ساری عمر اسی طرح جُڑے جُڑے گزار دیتے ہیں۔ پس خالی خنثیٰ کا ذکر ہی نہیں پھر تو انہیں اس قسم کے، تمام بگاڑ پیش کرنے چاہیئے تھے اور کہنا چاہیئے تھا کہ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں دو بچے آپس میں بالکل جُڑے ہوئے ہوتے اور پھر اُن کو الگ الگ کرنا پڑتا ہے۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں دونوں کا ایک ہی جگر، ایک ہی قلب، ایک ہی پھیپھڑا اور ایک ہی معدہ ہوتا ہے اور انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں بچہ تو ہوتا ہے مگر اُس کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں دو کی بجائے تین ٹانگیں بن جاتی ہیں حالانکہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو پیدائش کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں ان کو پیش کر کے قرآن مجید پر یہ اعتراض کرنا کہ اُس نے صرف ذکر اور اُنثیٰ کا نام لیا ہے خنثیٰ کا نام نہیں لیا معترضین کی نادانی اور حماقت کا ثبوت ہے اور مفسرین کو چاہیئے تھا کہ بجائے اس کے کہ اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے کہتے کہ یہ اعتراض کسی احمق کی زبان سے نکلا ہے دنیا میں دو ہی پیدائشیں ہوتی ہیں ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں ذکرانیت ہوتی ہے اور ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں نسوانیت ہوتی ہے یہ دونوں وجود آپس میں ملتے ہیں تب ایک تیسرا وجود پیدا ہوتا ہے اس کے بغیر نہیں۔

آیت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى میں مسلمانوں کے ترقی کر جانے کی وجہ کا ذکر

اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی سلسلۂ پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم دنیا میں غور کر کے دیکھو تو آئندہ نسلوں کی ترقی صرف ذکر اور اُنثیٰ سے ہوتی ہے ایک کے اندر افاضہ کا فعل پایا جاتا ہے اور دوسرے کے اندر استفاضہ کا فعل پایا جاتا ہے یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تب کوئی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اگر یہ دونوں آپس میں نہیں ملیں گے تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔ وہ شخص جس میں افاضہ کا مادہ نہیں اگر وہ کہے کہ مجھے کسی دوسرے سے فیض حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تو وہ نادان ہوگا۔ اسی طرح جس میں استفاضہ کا مادہ نہیں وہ بھی بغیر کسی دوسرے وجود کے اپنی قوت افاضہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ افاضہ اور استفاضہ کی قوتیں آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ اگر کسی قوم کے افراد یہ کہیں کہ ہم خود کام کر سکتے ہیں ہمیں کسی دوسرے کی راہنمائی یا مدد کی ضرورت نہیں، کسی دوسرے کی قوت کے ہم محتاج نہیں، ہمارے بازوؤں میں اتنی طاقت موجود ہے کہ ہم بغیر کسی کی مدد کے ترقی کی دوڑ میں حصہ لے سکتے ہیں مگر اُن میں افاضہ کی قوت نہ پائی جاتی ہو تو اُن کے سب دعاوی باطل ہوں گے۔ جب اُن میں افاضہ کی قوت ہی نہیں تو وہ بغیر کسی راہنما کی مدد کے آگے بڑھ ہی کس طرح سکتے ہیں؟ وہ اگر ترقی کر سکتے ہیں تو اسی صورت میں کہ اُن میں استفاضہ کی قوت ہو۔ اُن میں یہ مادہ ہو کہ وہ دوسرے سے فیض حاصل کر سکیں کیونکہ اُن کی حیثیت ری فلیکٹر کی سی ہے وہ اصل روشنی نہیں بلکہ ایک آئینۂ انعکاس ہیں۔ اگر اصل روشنی وہ اپنے آئینۂ قلب میں منعکس نہیں کریں گے تو سوائے تاریکی اور اندھیرے کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہرحال جس طرح نر اور مادہ کے باہمی اتصال سے نسل ترقی کرتی ہے اسی طرح قومیں اُسی وقت ترقی کرتی ہیں جب ایک راہنما ایسا موجود ہو جو قوت افاضہ اپنے اندر رکھتا ہو اور قوم کے افراد ایسے ہوں جو قوت استفاضہ اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ یہی مثال کفار کے سامنے پیش کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کا باہمی جوڑ دنیا میں ایک زبردست نتیجہ پیدا کرے گا کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہیں جن میں قوتِ افاضہ کامل درجہ کی پائی جاتی ہے اور صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن میں قوتِ استفاضہ کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ دونوں آپس میں مل بیٹھیں گے تو ایک نئی دنیا آباد کرنے کا باعث بنیں گے جس طرح مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں تو بچہ تولّد ہوتا ہے اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کرام کا روحانی تعلق ایک نئی آبادی کا پیش خیمہ ہے۔ مگر اے مکہ والو! تم وہ ہو کہ نہ تم میں ذکر کی قابلیت پائی جاتی ہے اور

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ

کہ تمہاری کوششیں یقیناً مختلف ہیں ۵؎

نہ اُنثیٰ کی قابلیت پائی جاتی ہے تم اسی طرح سوتے سوتے مر جاؤ گے تمہاری غفلتیں تم کو ڈبو دیں گی کیونکہ تم نر تو ہو نہیں اور نسوانی طاقتیں اپنے اندر پیدا نہیں کرتے گویا مخنّث کی صورت بن رہے ہو۔ تم آئندہ کس نیک انجام یا بھلائی کی امید کر سکتے ہو؟

لوگ کہتے ہیں کہ یہاں خنثیٰ کا ذکر نہیں حالانکہ یہ اگر خنثیٰ کا ذکر نہیں تو اور کیا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں افاضہ کی قوت ہے اور صحابہ میں استفاضہ کی قوت کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ مگر اے مکّہ والو! تم میں نہ افاضہ کی قوت پائی جاتی ہے اور نہ استفاضہ کی، اس لئے تم روحانی طور پر خنثیٰ ہو۔ نہ ذکر ہو نہ اُنثیٰ ہو۔ نہ تم میں نر کی قابلیت موجود ہے کہ تم دوسروں کو نور پہنچا سکو اور نہ تم میں نسائیت پائی جاتی ہے کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے اکتسابِ نور کر سکو۔ پھر تم دنیا میں ترقی کس طرح کر سکتے ہو تم تو خنثیٰ ہو اور خنثیٰ کی نسل نہیں چلتی۔ پس روحانی دنیا کے کامل آدم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور روحانی دنیا کی کامل حوّائیں صحابہ کرام ہیں اور خنثیٰ مکّہ کے منکرین ہیں۔

۵؎ **حل لغات۔** شَتّٰی:۔ اَشْیَاءُ شَتّٰی کے معنے ہوتے ہیں مُخْتَلِفَۃٌ۔ مختلف اشیاء (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے تمہاری اور مسلمانوں کی سعی آپس میں بڑا اختلاف رکھتی ہے۔ تمہاری تمام سعی سونے کی تیاری میں ہے اور اُن کی تمام سعی قومی بیداری اور ترقی کیلئے ہے تمہاری سعی تاریکی کے سردار شیطان کے حق میں ہے اور اُن کی سعی خدا تعالیٰ کے حق میں ہے جو خود نور اور نور کا پیدا کرنے والا ہے۔ پھر تمہاری اور اُن کی کوششوں کا نتیجہ ایک کس طرح ہو سکتا ہے؟ تمہاری تمام سعی اس بات کے لئے وقف ہو رہی ہے کہ بستر بچھاؤ۔ تکیہ لگاؤ اور لحاف رکھو تاکہ ہم سو جائیں اور صحابہؓ کی تمام سعی اس بات کے لئے وقف ہو رہی ہے کہ اٹھو ہل جوتو، زمینوں میں بیج ڈالو، زمین کو پانی دو، اور کاشت کی اچھی طرح نگرانی کرو تاکہ اعلیٰ درجہ کی فصل تیار ہو۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ سونے والے کچھ کمایا کرتے ہیں یا جاگنے والے کمایا کرتے ہیں؟ تم پر رات طاری ہے اور اُن پر دن کی کیفیت طاری ہے جب تم دونوں کی کوششیں بالکل الگ الگ ہیں تو اُن دونوں کا ایک نتیجہ کس طرح نکل سکتا ہے اور تم کس طرح خیال بھی کر سکتے ہو کہ رات کو سونے والوں اور دن کے وقت ہل جوتنے والوں کا ایک سا انجام ہوگا؟

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی کے دو معنے

دوسرے معنے اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم خنثیٰ ہو اور نر سے بھاگ رہے ہو مگر یہ اُنثیٰ ہیں اور نر سے بھاگ نہیں رہے بلکہ اُس سے تعلق پیدا کر رہے ہیں اب تم خود ہی سمجھ لو کہ تمہارے ہاں روحانی اولاد کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ اولاد اُنہی دُلہنوں کے ہاں پیدا ہوتی ہے جو دولہا کی طرف جاتی ہیں مگر جو دُولہا سے بھاگ جائیں اُن کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔ یہی حال محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخاطبین کا ہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ

شَتّٰی

جانتے ہیں کہ ہم میں رجولیت والی طاقت نہیں بلکہ استفاضہ والی طاقت ہے اس لئے وہ اپنے روحانی دولہا کے پاس جاتے ہیں مگر تم میں وہ طاقت تو ہے نہیں کہ اپنے زور سے کوئی نتیجہ پیدا کر سکو۔ صرف اللہ تعالیٰ نے تم میں استفاضہ والی قوت رکھی ہے مگر تم میں اپنی شامتِ اعمال سے ایسی بیماری پیدا ہو چکی ہے کہ تم دولہا کو پہچانتی تک نہیں اور اُس سے دُور بھاگ رہی ہو۔ تمہاری حالت تیل والی ہے اور اُن کی تمار والی۔ وہ اُنثیٰ ہونے کے لحاظ سے وقت کے دُولہا کی طرف جا رہے ہیں اور تم دُولہا سے بھاگ رہے ہو اور جب تمہاری اور اُن کی حالت میں اس قدر نمایاں فرق ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہیں ترقی حاصل ہو، تمہارے ہاں بھی نورِ آسمانی کی پیدائش ہو اور تم بھی دنیا میں سربلند ہو؟

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝

پس جس نے (خدا کی راہ میں) دیا اور تقویٰ (اختیار) کیا۔ اور نیک بات کی تصدیق کی

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝

اُسے تو ہم ضرور آسانی (کے مواقع) بہم پہنچائیں گے ۵۶

روحانی ثمرات تو اُنہی سے پیدا ہوں گے تم سے نہیں۔ اور آئندہ دنیا اُنہی دُلہنوں سے آباد ہوگی جو دولہا کے ہاں جاتی ہیں۔ اُن سے آباد نہیں ہو سکتی جو دولہا کے قرب جانا پسند نہیں کرتیں۔ تم مت خیال کرو کہ دنیا کی آئندہ ترقی میں تمہارا بھی کوئی حصہ ہوگا اب دنیا کی آبادی مسلمانوں کی وجہ سے ہوگی اور وہی قوم ترقی کرے گی جس پر دن چڑھا ہُوا ہے اور جو قربانیوں سے کام لے رہی ہے۔ تن آسانیوں کے لئے مرٹنے والے وجود ان نعمتوں کو حاصل نہیں کر سکتے۔

اب اگلی آیت میں اللہ تعالےٰ تاریکی اور روشنی کا فرق اور نسائیت کاملہ والی اور بانجھ کا فرق بتاتا ہے اور ایک مثال کے ذریعہ اس امر کو واضح کرتا ہے۔

یَسَّرَ

۵۶ حل لغات۔ يَسَّرَ الشَّيْءَ لِفُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں سَهَّلَهٗ لَهٗ۔ اُس کے لئے اِس امر کو آساں کر دیا (اقرب) پس نُيَسِّرُ کے معنے ہوں گے۔ ہم آسان کر دیں گے۔

ترقی کرنیوالی قوم کے افراد کی تین خصوصیات

تفسیر۔ فرماتا ہے دن کی مثال اور نسائیت کاملہ والی قوم کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو (۱) اَعْطٰى (۲) وَاتَّقٰى (۳) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى کا مصداق ہو۔ یہاں ایک نہایت ہی لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے اَعْطٰى کے معنے ہوتے ہیں دوسرے کو دیا۔ اور اِتَّقٰى کے معنے ہوتے ہیں پرہیزگاری اختیار کی۔ پس اَعْطٰى میں عمل کی درستی کی طرف اشارہ ہے اور اِتَّقٰى میں جذبات کی درستی اور اُن کی صحت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى میں اچھی باتوں کی تصدیق کا ذکر ہے اور تصدیق کا تعلق انسانی فکر کے ساتھ ہوتا ہے پس عمل اور جذبات کی درستی کے ساتھ فکر کی درستی کا ذکر بھی شامل کر دیا اور اس طرح بتایا کہ ترقی کرنے والی قوم کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے عمل میں بھی صحت ہو، اُس کے جذبات میں بھی صحت ہو اور اُس کے افکار میں بھی صحت ہو۔ اَعْطٰى میں عمل کی صحت کا ذکر ہے اِتَّقٰى میں جذبات کی صحت کا ذکر ہے اور صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى میں افکار کی صحت کا ذکر ہے کیونکہ اَعْطٰى کے معنے ہیں وہ دیتا ہے یعنی اس کا عمل صحیح ہے۔ اِتَّقٰى کے معنے ہیں وہ ہر بُری بات سے ڈرتا ہے یعنی اُس کے جذبات صحیح ہیں اور صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى کے معنے ہیں وہ اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی اُس کے افکار صحیح ہیں یہاں تین اصلاحوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسانی تکمیل کے لئے یہ تینوں اصلاحیں ضروری ہیں۔ الفاظ مختصر ہیں مگر ان مختصر الفاظ میں علم النفس کا ایک نہایت اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے اور بنی نوع انسان کے سامنے اس روشن حقیقت کو رکھا گیا ہے کہ عمل، جذبات اور فکر کی درستی سے ہی انسان پورے طور پر اچھا ہوتا ہے یعنی عمل صحیح، احساس صحیح اور فکر صحیح۔ یہ تین کمالات جب تک کوئی قوم اپنے اندر پیدا نہیں کر لیتی وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ علم کامل افکار کی درستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، احساس کامل جذبات کی درستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور عمل کامل اعمال کی درستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

یہ تین چیزیں ہیں جن سے کامیابی ہوتی ہے اگر علم صحیح نہ ہو تو یہ لازمی بات ہے کہ اُسکے جذبات بھی بگڑ جائیں گے اور اس کا عمل بھی بگڑا ہوا ہوگا مثلاً پسا ہوا نمک اور میٹھا دونوں ہم شکل ہوتے ہیں اگر ہم کسی کو میٹھا دے دیں اور وہ اُسے نمک سمجھ کر ہنڈیا میں ڈال لے تو چونکہ اُس کا علم صحیح نہیں ہوگا نتیجہ بھی خراب ہی پیدا ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ میٹھے کو نمک سمجھ کر ہنڈیا میں ڈال لے تو میٹھا نمک بن جائے۔ غلط علم ہمیشہ غلط عمل اور غلط جذبات پیدا کیا کرتا ہے۔

بسا اوقات عورتیں آنکھ میں ڈالنے والی دوا یا مالش کرنے کی دوا بچوں کو غلطی سے پلا دیتی ہیں اور وہ ہلاک ہو جاتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ اُن کے غلط علم کا کوئی غلط نتیجہ پیدا نہ ہو۔ پس غلط علم غلط عمل اور غلط جذبات پیدا کرتا ہے۔ فرض کرو کہ کسی شخص کا بچہ گم ہو جائے اور باوجود تلاش کے وہ اپنے ماں باپ کو نہ ملے لیکن ہو زندہ، اور کسی نہ کسی طرح پل کر کسی اور شہر میں اپنا کاروبار شروع کر دے اور اتنا لمبا عرصہ اس علیحدگی پر گذر جائے کہ وہ اپنے باپ کی شکل تک بھول جائے اس کے بعد فرض کرو ایک دن اُس کا باپ اُسی شہر میں آجائے اور بوجہ غربت کے مزدوری شروع کر دے اور بیٹا مثلاً سفر پر جاتے ہوئے یا گھر بدلتے ہوئے یا سودا گھر پہنچانے کے لئے ایک مزدور کا محتاج ہو اور اُس کی نظر اپنے باپ پر پڑے تو کیا اُس کے دل میں محبت اور رقّت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ بوجہ غلط علم کے وہ اپنے باپ کو ایک مزدور کی شکل میں ہی دیکھے گا اور بے تکلفی سے کہہ دے گا او بڈھے ادھر آؤ یہ سامان اٹھا کر فلاں جگہ تک لے چلو تم کو اتنے پیسے ملیں گے۔ تو باوجود اس کے کہ حقیقت کے لحاظ سے وہ جوان بیٹا ہوگا اور بڈھا اُس کا باپ ہوگا لیکن چونکہ اُسے علم نہیں ہوگا کہ یہ میرا باپ ہے بلکہ وہ اُسے ایک مزدور سمجھ رہا ہوگا۔ اس لئے اُس کے دل میں کوئی جذبۂ ہمدردی اپنے باپ کے متعلق پیدا نہیں ہوگا وہ اُس سے اُسی طرح کام لے گا جس طرح ایک عام مزدور سے کام لیا جاتا ہے پس غلط علم کے نتیجہ میں ہمیشہ غلط جذبات پیدا ہوتے ہیں اور غلط جذبات کے نتیجہ میں ہمیشہ غلط عمل پیدا ہوتا ہے۔ علم محرک ہے جذبات کا اور جذبات محرک ہیں عمل کے۔ صحیح عمل تبھی پیدا ہوتا ہے جب جذبات اعلیٰ درجہ کے ہوں اور صحیح جذبات تبھی پیدا ہوتے ہیں جب علم اعلیٰ درجے کا ہو۔ صحیح جذبات کے بغیر اچھا عمل کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ ماں کی محبت کو دیکھ لو وہ کس طرح اپنے بچہ کے لئے مرتی چلی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر کسی نوکر کو بیس گُنا معاوضہ بھی دے دیا جائے تب بھی وہ کبھی اُس طرح دن رات کام نہیں کرسکتا جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ نوکر جذبہ سے کام نہیں کرتا اُس کا کام صرف فکر سے تعلق رکھتا ہے جذبات غائب ہوتے ہیں۔ تو صحیح عمل کے لئے صحیح جذبات کی ضرورت ہوتی ہے اور صحیح جذبات کے لئے صحیح علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جب یہ تینوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں تو پھر تو وہ قوم یا فرد جو ان تینوں خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے اپنی ذات میں کامل ہو جاتا ہے۔ اَعْطٰی میں اللہ تعالیٰ نے اعمال کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ روپیہ جمع نہیں کرتے۔ اِتَّقٰی میں جذبات کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ پہلی سورتوں میں یہ ذکر کیا تھا کہ کفار کی یہ عادت ہے کہ وہ روپیہ قومی ضروریات کیلئے خرچ نہیں کرتے بلکہ لغو باتوں میں اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا تھا یَقُوْلُ اَھْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا (البلد ع) وہ کہتا ہے میں نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی تھی اور بتایا تھا کہ بے شک تم نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا مگر قومی

ضروریات کے لئے نہیں، یتامیٰ اور مساکین کی خبرگیری کے لئے نہیں، غرباء کی ترقی کے لئے نہیں بلکہ اپنی عزت اور اپنے نام و نمود کے لئے۔ اس لئے تمہارا وہ مال خرچ کرنا مال کو برباد کرنا تھا۔ گویا خرچ تو اُس نے بھی کیا تھا مگر غلط طریق پر۔ اسی طرح فرمایا تھا وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر ع۱) تم اپنے باپ دادا کی جائیدادوں کو تباہ کر دیتے ہو۔ غرض پہلی سورتوں میں بتایا ہے کہ کفار اپنا مال خرچ تو کرتے ہیں مگر صحیح مقامات پر خرچ نہیں کرتے اسراف میں اس کو ضائع کر دیتے ہیں اور جہاں خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں بخل اور امساک سے کام لیتے ہیں۔ اب یہ بتاتا ہے کہ مومن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اَعْطٰی وہ دیتا ہے یعنی قومی ضروریات کا خیال رکھتا ہے اور جب بھی کسی قربانی کی ضرورت ہو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ ایک نکتہ یاد رکھنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَعْطَی الْمَالَ نہیں فرمایا بلکہ صرف اَعْطٰی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ درحقیقت یہ عربی زبان کا کمال ہے جو کسی اور زبان کو حاصل نہیں کہ کسی جگہ مفعول حذف کر کے اور کسی جگہ الفاظ کو اضافتوں سے آزاد کر کے معانی میں وسعت پیدا کر دی جاتی ہے۔ اگر اَعْطَی الْمَالَ فرماتا تو اس کے معنے صرف مال خرچ کرنے کے ہوتے مگر اب چونکہ صرف اَعْطٰی فرمایا ہے اس لئے اس کے معنے اَعْطَی الْمَالَ کے بھی ہو سکتے ہیں اَعْطَی الْعِلْمَ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایسی چیز کے ہو سکتے ہیں جو کسی کو دی جا سکتی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ ع۱) ہم نے اُن کو جو کچھ دیا ہے اُس کا ایک حصہ وہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے عام رنگ میں انفاق کا ذکر کر کے اُس کے معنوں کو وسیع کر دیا یعنی اُس کے پاس مال ہو تو وہ مال خرچ کرتا ہے، علم ہو تو علم خرچ کرتا ہے، وقت ہو تو وقت خرچ کرتا ہے غرض جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُسے عطا کیا ہو وہ اُسے لوگوں کی بھلائی کے لئے خرچ کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح اَعْطٰی میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ ساری چیزیں جو اُس کو حاصل ہوں لوگوں کے لئے خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو طاقت دی ہو تو وہ طاقت دیتا ہے، وقت دیا ہو تو وقت دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی وقت کیلئے دینے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح مال دیا ہو تو مال دیتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے قوٰی عطا کئے ہوں تو اُن سے ایسا کام لیتا ہے جو بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے والا ہو۔ غرض اَعْطٰی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس کے معنوں کو وسیع کر دیا ہے۔ پھر وَاتَّقٰی میں یہ بتایا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے تقویٰ کے ماتحت کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ میں غلطی سے کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جس سے لوگوں کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچ جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کو اتنا روپیہ دے دیتا ہے کہ وہ اُسے عیاشی میں ضائع کرنا شروع کر دیتا ہے تو یہ اُس روپیہ کا بالکل غلط استعمال ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ظالم کو طاقت پہنچا دیتا ہے تو یہ بھی اُس قوت کا برمحل استعمال نہیں ہوگا۔ اسی لئے اَعْطٰی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وَاتَّقٰی کے الفاظ کا اضافہ کیا اور بتایا کہ وہ دیتا تو ہے مگر ساتھ ہی ڈرتا ہے کہ میں کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جس سے دنیا کی علمی یا عملی یا سیاسی یا عائلی حالت کو کوئی نقصان پہنچ جائے اور میں ثواب کی بجائے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جاؤں۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی میں یہ بتایا کہ وہ صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ وہ افکار کی درستی میں بھی لگا رہتا ہے۔ صحیح عقائد اختیار کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر عقیدہ کی تصدیق کرے۔ گویا صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی کہہ کر یہ بتایا کہ وہ علم کی زیادتی کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ حُسْنٰی کے معنے صرف اچھی چیز کے نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کی چیز کے ہیں اور معنے یہ ہیں کہ وہ احسن سے احسن چیز کی تصدیق کرتا ہے یعنی اپنے علم کو کمال تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو ترتیب اوپر بتائی گئی ہے

اس میں علم کو محرک جذبات بتایا گیا ہے اور جذبات کو محرک عمل قرار دیا گیا ہے مگر یہاں عمل پہلے ہے جذبات کا ذکر بعد میں ہے اور فکر کا اُس کے بعد میں۔ گویا ترتیب بالکل اُلٹ ہے اِسکی کیا وجہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ ترتیب اللہ تعالیٰ نے درجہ کی بلندی کے اظہار کے لئے اُلٹ دی ہے چونکہ یہاں قومی مقابلے کا ذکر تھا جس میں عمل نمایاں نظر آتا ہے اس لئے اسے پہلے، اُس کے محرک کو اس کے بعد اور اُس کے محرک کو اُس کے بعد رکھا گیا ہے ورنہ پیدائش کے لحاظ سے علم پہلے ہے جذبات دوسرے درجہ پر اور عمل تیسرے درجہ پر۔ لیکن قومی مقابلہ میں جذبات اور علم دونوں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ صرف عمل ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسروں کے سامنے آتی ہے۔ یہاں چونکہ کفار اور مسلمانوں کا مقابلہ کیا گیا ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تمہارا اپنی کامیابی کے متعلق ادّعا بالکل لغو ہے۔ جو خوبیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں وہ تم میں موجود ہی نہیں اس لئے یہ لازمی بات ہے کہ مسلمان کامیاب ہوں اور تم اُن کے مقابلہ میں شکست کھاؤ اس لئے یہاں عمل کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اگر جذبات اور افکار کو پہلے پیش کیا جاتا تو وہ اُن کی اہمیت کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے مثلاً اگر یہ کہا جاتا کہ صحابہؓ کا علم تمہارے علم سے بہتر ہے تو وہ کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے ہمارا علم ان سے ہزار درجہ بہتر ہے لیکن جب یہ کہا جاتا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو غریبوں کی خدمت کرتے ہیں اور تم وہ ہو جو غریبوں کے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتے تو اس کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا پس چونکہ یہاں کفر کا مقابلہ تھا اس لئے اس مقابلہ کی اہمیت کے لحاظ سے عمل کا پہلے ذکر کیا گیا ہے ورنہ جہاں تک محرکات کا سوال ہے علم پہلے ہے جذبات بعد میں اور عمل اس کے بعد ہے۔ مگر جہاں تک بُرے اور بھلے کے مقابلہ کا سوال ہے سب سے پہلے لوگوں کے سامنے عمل آتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے وہ آسانی کے ساتھ اپنا اور مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اس غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ترتیب اُلٹ دی ہے عمل کا پہلے ذکر کیا ہے اور جذبات اور افکار کا بعد میں۔ کیونکہ کفار کو عمل کے ذکر سے ہی جھوٹا کیا جا سکتا تھا جذبات اور علم کے متعلق وہ سَو سَو حجتیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد فرماتا ہے جو شخص ان صفات کا حامل ہو

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۔ ہم ایسے آدمی کو ضرور یُسْرٰی مہیا کر دیں گے۔ اس جملہ کے دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ اُسے ایسے حالات میسّر آ جائیں گے جن سے وہ آسانی کے ساتھ غالب آ سکے۔ آسانی میسّر آ جانے کے یہی معنے ہوا کرتے ہیں کہ افعال کے نتائج انسانی ارادوں کے مطابق نکلنے شروع ہو جائیں اور جب کسی کو اُس کے ارادوں کے مطابق سامان میسّر آ جائیں تو اُسے آسانی ہو جاتی ہے پس اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ ہم اُس کے ہر کام میں آسانی پیدا کر دیں گے۔ دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم رفتہ رفتہ اُس پر عملِ نیک کو آسان کر دیں گے یعنی عملِ صالح پہلے بڑا گراں گذرتا ہے جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے اعمال کو بھی درست کرو، اپنے جذبات کو بھی درست کرو، اپنے افکار کو بھی درست کرو تو وہ گھبرا جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ تو بڑا مشکل ہے مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ مگر فرماتا ہے جب کوئی شخص اس راستہ پر چل پڑے اور ہمت کے ساتھ ان افعال کی بجا آوری میں مشغول ہو جائے تو ہماری سُنّت یہ ہے کہ ہم اِن کاموں کی سرانجام دہی اُس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔ پھر اُس کی طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں رہتا بلکہ وہ دلی خوشی اور بشاشت کے ساتھ ان کو بجا لاتا ہے۔ پہلے دن جب کسی کو نماز پڑھنے کے لئے کہا جائے تو اُسے بڑی مشکل نظر آتی ہے مگر رفتہ رفتہ اُسے ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ کسی ایک نماز کو چھوڑنا بھی اُسے موت سے بدتر معلوم ہوتا ہے لیکن ابتداءً انسان کے سامنے جب کوئی اہم عملِ صالح آتا ہے وہ گھبرا جاتا ہے اور کہتا ہے اس کا بجا لانا مشکل ہوگا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى حقیقت یہ ہے کہ اصل میں آسان عملِ صالح ہے اور مشکل چیز بُرائی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر:۱۸)

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى کے دو معنے

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ

اور ایسا (شخص) جس نے بخل سے کام لیا اور بے پرواہی کا اظہار کیا اور نیک بات کو جھٹلایا

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۙ

اُسے ہم تکلیف (کا سامان) بہم پہنچائیں گے ۵ـ

ہم نے قرآن کو ہدایت کے لئے بالکل آسان بنا دیا ہے کیا تم میں سی کوئی ایسا شخص نہیں جو اس نسخہ کو استعمال کرے اور اپنے رب کو راضی کرے۔ اصل یُسْرٰی خدائی تعلیم ہے جس سے انسان کی روح کو ترقی حاصل ہوتی ہے مگر پہلے وہ عُسْرٰی ہی نظر آتی ہے اور انسان اُس پر عمل کرنے سے گھبراتا ہے اس لئے فرمایا کہ صحابہ کرام جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ روحانیہ سے استفاضہ حاصل کریں گے ہم اُن کے لئے بظاہر مشکل نظر آنے والے اعمالِ صالحہ کو آسان کر دیں گے اور اُن کی طبائع میں ان اعمال کی طرف خاص رغبت پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ جو شخص علم صحیح اور جذبات صحیح اور عمل صحیح سے کام لیتا ہے اُس کی نظر کی غلطی کو درست کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے اُسے اِن کاموں میں لذت اور سرور محسوس ہونے لگتا ہے جو دوسروں کو مشکل نظر آتے ہیں۔

۵ـ **تفسیر**۔ پہلی آیات کے بالمقابل اِن آیات میں بھی تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ بَخِلَ، اَعْطٰی کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے اور اِسْتَغْنٰی، اِتَّقٰی کے مقابلہ میں۔ کیونکہ اِتَّقٰی کے معنے ہیں خداتعالےٰ سے ڈرنا کہ وہ کسی غلطی کی وجہ سے مجھ سے خفا نہ ہو جائے اور اِسْتَغْنٰی کے معنے ہیں بے پروا ہو جانا یعنی انسان کا یہ کہنا کہ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ خدا مجھ سے خفا ہوتا ہے یا نہیں۔ چونکہ اِس قسم کا استغناء تقویٰ کے خلاف ہوتا ہے اس لئے اِتَّقٰی کے مقابلہ میں اِسْتَغْنٰی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ تیسری بات مسلمانوں کے متعلق یہ بیان کی گئی تھی کہ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی۔ اس کے مقابلہ میں کفار کی نسبت كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی کا ذکر کر دیا کہ وہ اچھی باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ غرض یہ تینوں باتیں پہلی تین چیزوں کے مقابل میں رکھی گئی ہیں۔

تنزل کے اسباب

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ شخص جو بخل کرتا ہے یعنی اللہ تعالےٰ نے اُسے مال دیا ہے، عزت دی ہے، طاقت دی ہے، وقت دیا ہے مگر وہ ان میں سے کسی چیز کو بھی خداتعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا اور پھر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے کسی کی پروا نہیں میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہ الفاظ عام طور پر گندی طبیعت کے لوگ استعمال کیا کرتے ہیں جب اُنہیں کسی بُرائی سے روکا جائے تو وہ کہتے ہیں ہمیں کسی کی پروا نہیں، کوئی شخص ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جو شخص بخل کے ساتھ یہ گند بھی اپنی طبیعت میں رکھتا ہے وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی اور پھر اُس کا فکر بھی غلط ہے وہ دنیا میں کیا ترقی کر سکتا ہے۔ طبیعت میں استغنار کا ہونا بتاتا ہے کہ صحیح جذبات مفقود ہیں کیونکہ جذباتِ صحیحہ محبت پیدا کیا کرتے ہیں استغنار پیدا نہیں کیا کرتے۔ بچہ مرنے لگتا ہے تو ماں نہیں کہتی کہ بے شک مرے مجھے اس کی پروا نہیں لیکن نوکر بعض دفعہ یہ الفاظ کہہ دیتا ہے کیونکہ اُس کے جذبات اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ بہرحال صحیح جذبات کا نہ ہونا استغنار پیدا کرتا ہے، صحیح عمل کا نہ ہونا بخل پیدا کرتا ہے اور صحیح فکر کا نہ ہونا تکذیب پیدا کرتا ہے۔ جس طرح پہلی آیات میں یہ بتایا تھا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں صحیح عمل، صحیح جذبات اور صحیح فکر پایا جاتا ہے اسی طرح اِن آیات میں یہ بتاتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں غلط علم، غلط جذبات اور غلط فکر پایا جاتا ہے اور چونکہ یہ دونوں مثالیں مسلمانوں اور کفار کی ہیں اس لئے اللہ تعالےٰ اِن امور کا ذکر کرتے ہوئے کفار کو

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۝

اور جب وہ ہلاک ہوگا تو اُس کا مال اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا ۵۸

بتاتا ہے کہ تم میں جب یہ یہ نقائص پائے جاتے ہیں اور مسلمانوں میں اس کے مقابلہ میں بہت بڑی خوبیاں پائی جاتی ہیں تو تم اُن کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہو؟ اُن کے کاموں کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ ہم اُن کے لئے یُسریٰ مہیا کر دیں گے مگر تمہارے کاموں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم تمہارے لئے عُسریٰ مہیا کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے سارے کام بگڑتے چلے جائیں گے جس کام کو بھی ہاتھ لگاؤ گے خراب ہو جائے گا۔ اور یا پھر یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان اعمال کے نتیجہ میں تمہارے لئے نیکی کا حصول زیادہ سے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ اصل کام اعمالِ صالحہ ہی ہیں ان اعمال سے انسان جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی نیکی کی طرف لوٹنا اُس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے گویا وہ باتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ نیکی کا حصول مشکل ہو جائیگا دوسرے یہ کہ تم جو کام بھی کرو گے اُس کا نتیجہ اُلٹ ہوگا کیونکہ تمہارے عمل میں خرابی پیدا ہو چکی ہے، تمہارے اندر بے پرائی ہے جو جذبات کے فقدان اور اُن کی خرابی کی دلیل ہے اور پھر تمہارے اندر تکذیب پائی جاتی ہے جو ذہن وفکر کی نادرستی اور غلط علم کا ثبوت ہے۔ یہ ساری باتیں مل کر تمہاری ہلاکت اور بربادی کا موجب بن جائیں گی۔

۵۸ حل لغات۔ تَرَدّٰی فِی الْھُوَّۃِ کے معنے ہیں سَقَطَ فِیْھَا۔ وہ گڑھے میں گر گیا (اقرب) مفردات میں ہے کہ اَلتَّرَدِّیْ کے معنے ہیں اَلتَّعَرُّضُ لِلْھَلَاکِ اپنے آپ کو ہلاکت کے پیش کرنا (مفردات) پس تَرَدّٰی کے معنے ہوں گے۔ گر گیا (۲) ہلاکت کے سامنے ہوا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب مذکورہ بالا صفات والا گروہ ہلاک ہونے کے قریب پہنچیگا یا اپنے مقام سے گر جائے گا تو اُسے اُس کا مال کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ جب تک عزت حاصل ہے وہ بے شک فخر کرے لیکن جب تنزل کے آثار ظاہر ہو گئے اور ہلاکت قریب آگئی اُس وقت کوئی چیز اُس کے کام نہیں آئے گی۔ اُس وقت وہ اچھے کام بھی کرے گا تو اُن کا کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوگا کیونکہ عذاب کی ساعت سر پر کھڑی ہوگی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک خدا تعالےٰ کی طرف سے ہلاکت کا فیصلہ نہ ہو اُس وقت تک مال، دولت اور عزت ہر چیز انسان کے کام آجاتی ہے لیکن جب تباہی کا فیصلہ ہو جائے تو پھر کوئی چیز کام نہیں آتی۔ انسان مال خرچ کرتا ہے تو اُلٹا نتیجہ پیدا ہوتا ہے، رحم کرتا ہے تو اُلٹا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ نہ دولت کام آتی ہے نہ عزت کام آتی ہے نہ نرمی اور محبت کام آتی ہے۔ پہلے اگر وہ صدقہ کرتا ہے تو لوگ اُس کی قدر کرتے ہیں مگر پھر وہ صدقہ کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں اب ہمیں رشوت دے رہا ہے۔ پہلے نرمی کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں حسنِ اخلاق سے کام لے رہا ہے پھر اُس وقت نرمی کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ ہماری منتیں کر رہا ہے۔ گویا سارے حالات اُس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جو اُسکو فائدہ پہنچا سکے۔

غرض فرمایا وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى۔ جب اُس کی ہلاکت کا وقت آئے گا تو اُس وقت وہ وہی کام کرے گا جو ہم اب اُسے کرنے کو کہتے ہیں مگر یہ نہیں کرتا۔ لیکن اُس وقت ان کاموں کا اُلٹا نتیجہ پیدا ہوگا مال دے گا تو لوگ کہیں گے ہمیں رشوت دیتا ہے۔ نرمی سے بولے گا تو لوگ کہیں گے ہماری خوشامد کرتا ہے۔

تَرَدّٰی

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝

ہدایت دینا یقیناً ہمارے ہی ذمہ ہے ۹؎ اور ہر بات کی انتہاء اور ابتداء بھی یقیناً ہمارے ہی اختیار میں ہے ۱۰؎

۹؎ **تفسیر**۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا، تقویٰ اللہ اختیار کرنا اور اچھی باتوں کی تصدیق کرنا یہ اُن اعمال میں سے ہیں جو قوموں کو ترقی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور بخل سے کام لینا، استغنیٰ ظاہر کرنا اور سچی باتوں کی تکذیب میں حصہ لینا یہ اُن اعمال میں سے ہیں جو قوموں کو ہلاکت کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریک رات کے مارے ہوئے لوگوں کو خدا تعالیٰ ہی ہدایت دے سکتا ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا کے معنے ہیں۔ہم پر واجب ہے یا ہمارا ہی یہ کام ہے یعنی بنی نوع انسان سے بوجہ حقیقی شفقت اور مہربانی رکھنے کے یہ ہمارا ہی کام ہے کہ ہم اُن کو ہدایت دیں انسان کا کام نہیں کہ وہ اپنے لئے آپ ہدایت تجویز کرلے کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے نفس کے متعلق آپ فیصلہ کرتا ہے جو غلط ہوتا ہے بخیل اپنے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے اور وہ غلط ہوتا ہے ظالم اپنے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے اور وہ غلط ہوتا ہے۔ جاہل اپنے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے اور وہ غلط ہوتا ہے۔ پس خواہ وہ اپنے متعلق خود ہی کوئی فیصلہ کر لیتے پھر بھی وہ اپنے نفس کے اتنے خیر خواہ نہیں ہو سکتے تھے جتنے ہم اُن کے خیر خواہ ہیں۔ اِس لئے باوجود اس کے کہ وہ انکار کرتے ہیں، مخالفتیں کرتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، مومنوں کو تکالیف پہنچاتے ہیں پھر بھی ہم اُن کو ہدایت دیتے چلے جاتے ہیں کیونکہ ہم انسان کو پیدا کرنے والے ہیں، ہم مشفق اور مہربان ہیں، ہم رحمٰن اور رحیم ہیں، ہم اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور باوجود اُن کے انکار کے انہیں ہدایت دیتے چلے جاتے ہیں۔

کفار کے ایمان نہ لانے کی اصل وجوہات ۲۰۱

۱۰؎ **تفسیر**۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ کفار کو بتاتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری راہ میں وہ کونسی مشکلات ہیں جن کی بناء پر تم سچائی کو قبول نہیں کرتے۔ تمہارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تم دنیا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اپنے مال کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب بھی کوئی قومی اور ملی ضرورت پیش آتی ہے وہ اپنے اموال کو بلا دریغ قربان کر دیتے ہیں مگر تم اپنے اموال کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہو اِسی لئے تم مسلمانوں کے متعلق کہتے ہو کہ وہ پاگل ہیں تباہ اور برباد ہو جائیں گے کیونکہ وہ اپنے اموال کو ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن ہم تباہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم اپنے مال کو حفاظت سے رکھتے ہیں۔ فرماتا ہے یہ خیال ہے جو تمہارے دلوں میں پایا جاتا ہے مگر تمہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ ہمارے پاس ہی آخرت ہے اور ہمارے پاس ہی دنیا ہے۔ تم دنیا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں دنیا بھی نہیں ملے گی اور دین بھی تمہارے ہاتھ سے چلا جائے گا کیونکہ دنیا بھی ہمارے پاس ہے اور آخرت بھی ہمارے پاس ہے اِس کے مقابلہ میں یہ مسلمان دنیا کو چھوڑ رہے ہیں مگر ہم اُنہیں آخرت بھی دیں گے اور دنیا بھی دیں گے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ یہ اپنا نقصان کر رہے ہیں مگر یہ نقصان نہیں کر رہے جب یہ ہمارے پاس پہنچیں گے تو جس چیز کو چھوڑ کر یہ لوگ چلے تھے وہ وہیں کھڑی ہوگی اور یہ اُس کو حاصل کر لیں گے۔ تم جانتے ہو کہ یہ لوگ ہمارے پاس آ رہے ہیں جب یہ ہمارے پاس آ رہے ہیں تو گو اِس نیت اور ارادہ سے آ رہے ہیں کہ ہمیں آخرت ملے گی مگر چونکہ دنیا بھی ہمارے پاس ہوگی اس لئے وہ بھی اِن کو مل جائے گی اور تم لوگ آخرت چھوڑ کر دنیا کے پاس جا رہے ہو اور چونکہ دنیا ہمارے پاس ہے اور تم ہماری طرف نہیں آ رہے اس لئے تمہاری جدّ و جہد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھی تمہارے ہاتھ سے جائے گی اور آخرت کی نعمتوں سے بھی تم محروم ہو جاؤ گے۔ گویا کفار کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں کسی شخص کے پاس بہت سامال و اسباب تھا اور وہ اکیلا سفر کر رہا تھا ایک چور نے اُسے دیکھا تو اُس نے ارادہ کیا کہ میں کسی طرح اس کا مال اڑاؤں آخر سوچنے کے بعد

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝ لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝

پس (یاد رکھو کہ) میں نے (تو) تمکو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ہوشیار کر دیا ہے۔ اس میں سوائے کسی بڑے ہی بدبخت کے کوئی داخل نہ ہوگا۔

الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝

(ایسا بدبخت) جس نے (حق کو) جھٹلایا اور (ہم سے) منہ پھیر لیا ۹ؔ اور جو بڑا متقی ہوگا وہ ضرور اس سے دُور رکھا جائیگا ۱۰ؔ

اُس نے یہ تجویز نکالی کہ ایک نیا اور اعلیٰ جوتا رستہ میں پھینک دیا اور خود ایک طرف چھپ گیا۔ جب وہ شخص جوتے کے پاس پہنچا تو اُسے بڑا پسند آیا اور اُس نے اُسے اُٹھا لیا مگر پھر خیال آیا کہ میں نے ایک جوتا کیا کرنا ہے اگر دوسرا جوتا بھی ساتھ ہوتا تو کام بھی آتا صرف ایک جوتا کیا کام دے سکتا ہے چنانچہ وہ اُسے وہیں چھوڑ کر آگے چل پڑا۔ کچھ دُور آگے جا کر چور نے دوسرا جوتا پھینکا ہُوا تھا جب وہ وہاں پہنچا تو اسے اپنی بیوقوفی پر افسوس آیا اور اُس نے کہا کہ مجھ سے کیسی سخت غلطی ہوئی کہ میں وہ جوتا اسی جگہ چھوڑ آیا اگر میں چھوڑ کر نہ آتا تو اب مکمل جوتا بن جاتا۔ اِس خیال کے آنے پر اُس نے اسباب وہیں رکھا اور جوتا لینے کے لئے واپس چل پڑا۔ چور کو موقع مل گیا اور اُس نے اسباب بھی اُٹھا لیا اور جوتا بھی۔ جب وہ واپس گیا تو دیکھا کہ وہاں جوتا نہیں کیونکہ وہ جُوتا چور اٹھا کر لے آیا تھا۔ اب یہ پھر خالی ہاتھ اپنے اسباب کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہاں اسباب بھی نہیں اور جوتا بھی غائب ہے۔

یہی کافر کی حالت ہوتی ہے وہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی طرف جاتا ہے لیکن آخرت تو اُس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی دنیا بھی اُس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے کیونکہ دنیا خدا تعالےٰ کے پاس ہوتی ہے اور وہ اُس راستہ پر چل رہا ہوتا ہے جو شیطان کی طرف جاتا ہے۔ اِدھر مومن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جاتا ہے اور کہتا ہے مجھے دنیا کی ضرورت نہیں مجھے صرف آخرت کی ضرورت ہے۔ مگر جب خدا تعالےٰ کے پاس پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ دنیا اُس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی اور وہ آخرت کے ساتھ کھڑی ہے۔ اور جب کافر دنیا کے پاس جاتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا نہ آخرت ہوتی ہے نہ دنیا ہوتی ہے پس فرماتا ہے وہ ہمارے پاس آئے تو آخرت کی تلاش میں تھے مگر جب وہ ہمارے پاس پہنچے تو انہوں نے اُولیٰ کو بھی وہیں کھڑے پایا۔

۹ؔ حل لغات۔ تَلَظّٰى اصل میں تَتَلَظّٰى ہے مگر تاء تَلَظّٰى گر گئی ہے اور تَلَظَّتِ النَّارُ کے معنے ہیں تَلَهَّبَتْ۔ آگ بھڑک اُٹھی (اقرب)

تفسیر۔ كَذَّبَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ صحیح اعتقاد نہیں رکھتا تھا اور تَوَلّٰى میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ صحیح جذبات اور صحیح عمل سے کام نہیں لیتا تھا۔ پس چونکہ فکری، جذباتی اور عملی تینوں خرابیاں اُس میں پائی جاتی تھیں اس لئے اُس کا انجام اچھا نہ ہُوا۔ كَذَّبَ کا لفظ اعتقادی خرابیوں کے لئے آیا ہے اور تَوَلّٰى کا لفظ جذبات اور اعمال کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔

۱۰ؔ تفسیر۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى سے یہ مراد نہیں کہ صرف ایسا شخص ہی دوزخ کی آگ سے بچایا جائیگا جو بہت متقی ہو۔ معمولی درجہ کا مومن نہیں بچایا جائے گا۔ کیونکہ یہاں تقویٰ کا تقویٰ سے مقابلہ نہیں بلکہ تقویٰ اور کفر کا مقابلہ ہے۔ پس اِس آیت کے یہ معنے نہیں کہ متقیوں میں سے زیادہ نیک بچایا جائے گا بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ تم بھی اپنے متعلق کہتے ہو کہ ہم میں تقویٰ پایا جاتا ہے اور مومن بھی اپنے متعلق کہتے ہیں کہ ہم میں تقویٰ پایا جاتا ہے اب ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ان کا تقویٰ صحیح ہے لیکن تمہارا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ تم میں تقویٰ پایا جاتا ہے گویا یہاں مومنوں کے تقویٰ کا کفار کے خیالی تقویٰ سے مقابلہ کیا گیا ہے ورنہ

دنیا کے طلب کرنیوالوں کی مثال۔[1]

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ

(ایسا متقی) جو اپنا مال (اس طرح خدا کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اسے) تزکیہ حاصل کرے۔ اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں کہ اس (عطا) سے (اس احسان کا)

نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی ۝

بدلہ اُتارا جاتا ہو۔ ف۱۱ ہاں مگر اپنے عالیشان رب کی خوشنودی حاصل کرنا (اس کا مقصود ہوتا ہے) ف۱۲

وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ۝ ع ۱۷

اور وہ ضرور اس سے راضی ہو جائیگا ف۱۳

یہ معنے نہیں کہ سب سے اعلیٰ متقی تو بہشت میں جائیگا اور ادنیٰ درجہ کے مومن اور متقی بہشت سے محروم رہینگے۔ ایسے معنے کرنے قرآن کریم کی اُن آیات کے بالکل خلاف ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر یہ فرمایا ہے کہ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ (الزلزال ع۱) جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی نیکی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو ضائع نہیں کرتا پس جنت میں تو ہر مومن اور متقی جائیگا خواہ وہ تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر ہو یا تقویٰ کے ادنیٰ مقام پر ہو اور جب قرآن کریم نے یہ مضمون بیان فرما دیا ہے تو اس آیت کے یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ صرف اعلیٰ درجہ کا متقی ہی دوزخ کی آگ سے بچایا جائے گا۔

(حاشیہ: ۲،۱ اَتقٰی کون ہے)

(حاشیہ: ۲ اَلْوَجْہُ)

پس ظاہر ہے کہ یہاں مومنوں کے اتقا کا آپس میں مقابلہ نہیں کیا گیا بلکہ کفار اور مسلمانوں کے تقویٰ کا باہمی مقابلہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو تقویٰ کے دعویدار ہیں کافر بھی کہتا ہے کہ میں متقی ہوں اور مومن بھی کہتا ہے کہ میں متقی ہوں۔ اب اِن میں سے جو اتقٰی ہے یعنی جس کا تقویٰ بھاری ہے اور جس کے کاموں میں رضاء الٰہی حاصل کرنے کی روح زیادہ پائی جاتی ہے وہی دوزخ کی آگ سے بچایا جائیگا چنانچہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسکی تشریح بھی کر دی ہے کہ وہ اَتقٰی کون ہے۔

ف۱۱ تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اَتقٰی کی تشریح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کون ہے فرماتا ہے اَتقٰی وہ ہے جو اپنا مال اِس نیت اور ارادہ سے دیتا ہے کہ میں پاک ہو جاؤں۔ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی اَیْ حَالَ کَوْنِہٖ یَتَزَکّٰی۔ کہ وہ اپنا مال دیتا ہے ایسی حالت میں کہ وہ پاک ہونا چاہتا ہے۔ دوسری بات اُس میں یہ ہوتی ہے کہ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی کسی شخص کا اُس پر کوئی احسان نہیں ہوتا کسی کی نعمت میں سے کوئی نعمت اُسکے پاس نہیں ہوتی یعنی کسی کا سابق احسان اُس پر نہیں ہوتا جس کا وہ بدلہ دے رہا ہو۔ اُس کے اعمال کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ میں کسی کا احسان اُتاروں بلکہ وہ ایسے اعمال کرتا ہے جن سے اُسکا دوسروں پر احسان ہو جاتا ہے گویا وہ یہ تو چاہتا ہے کہ اُس کا کسی نہ کسی رنگ میں دوسروں پر احسان ہو مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس پر کسی کا احسان ہو۔

ف۱۲ حل لغات۔ اَلْوَجْہُ کے معنے ہیں اَلْمَرْضَاۃُ۔ رضامندی (اقرب)

تفسیر۔ مومن کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اموال اس رنگ میں خرچ کرتا ہے کہ اُس پر کسی کا احسان نہیں ہوتا جس کا وہ بدلہ اتار رہا ہو بلکہ بغیر اس کے کہ اُس پر کسی کا سابق احسان ہو وہ اپنے رب کی رضامندی حاصل کرنے کیلئے صدقہ و خیرات کرتا یا بنی نوع انسان کی امداد کیلئے اپنا روپیہ صرف کرتا ہے۔ یہاں رب کی صفت اعلیٰ بیان فرمائی ہے جو سب سے بڑا ہے اِس سے اِس طرف اشارہ کیا ہے کہ بیشک انسانوں پر دوسرے انسانوں کے بھی احسان ہوتے ہیں لیکن چونکہ اصل محسن اللہ تعالیٰ ہے اور سب سے زیادہ وہی مربّی ہے اس لئے مومن اُس کی رضاء کو سب دوسرے محسنوں کی رضاء پر مقدم کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے کام کیا تو چونکہ سب احسانوں کا منبع وہ ہے اِس لئے سارے ہی محسنوں کا بدلہ بھی اُتر گیا۔

ف۱۳ تفسیر۔ فرماتا ہے جب ایک شخص اپنے اموال خرچ کرتا ہے

اور اُس کے مدنظر محض خدا تعالےٰ کی رضامندی ہوتی ہے یہ غرض نہیں ہوتی کہ وہ کسی سابق احسان کا بدلہ اُتارے تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ تو میری رضاء کے لئے اس قدر جد وجہد کرے اور میں اُس سے راضی نہ ہوں۔ جب وہ خدا کی رضاء کے لئے ایسا کر رہا ہے تو یقیناً خدا بھی اُس سے راضی ہو جائے گا۔ جب ایک کمزور اور ناتوان بندہ دنیا سے اپنی توجہات ہٹا کر محض خدا تعالیٰ کی رضاء کے لئے اپنے اموال کو قربان کر رہا ہو تو خدا تعالےٰ کی شان سے یہ بالکل بعید ہوتا ہے کہ وہ اُسے اپنی رضاء کی خلعتِ فاخرہ نہ پہنائے اور اُسے اپنے پیاروں میں شامل نہ کرلے ایسا شخص یقیناً اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا اور خدا تعالیٰ کی رضاء کا ایک دن وارث ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دنیا کے طریق اور اُس کے معمول کے خلاف اپنی قربانی کا لوگوں سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ دنیا میں لوگ قربانیاں کرتے ہیں تو اس لئے کہ انہیں عہدے مل جائیں یا افسرانِ بالا کی خوشنودی اُن کو حاصل ہو جائے یا اُن کی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے یا پبلک میں اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے مگر یہ وہ شخص ہوتا ہے جو ہر قسم کی دنیوی غرض سے اپنے دل کو صاف کر دیتا ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ میری تعریف کریں یا میرے کاموں پر واہ واہ کے نعرے بلند کریں یا مجھے پبلک میں کوئی خاص عزت دی جائے وہ صرف اپنے رب کی رضاء کا بھوکا ہوتا ہے اور اس کے مدنظر محض یہ بات ہوتی ہے کہ جس طرح میں دوسروں کا خیال رکھتا ہوں اسی طرح اللہ تعالیٰ میرا خیال رکھے اور وہ میرے گناہوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے مجھ سے راضی ہو جائے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو چھوڑ کر میرے دروازہ پر آگرا ہے اور ہر قسم کی خوشنودیوں کو اُس نے محض میری خوشنودی کے لئے ترک کر دیا ہے تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ میں اُس کا خیال نہ رکھوں، جس طرح اس نے اِبْتِغَاءَ لِوَجْهِ اللّٰه اپنے اموال کی قربانی کی ہے اسی طرح میں اُس پر راضی ہو جاؤں گا اور اُسے اپنے قرب میں جگہ دونگا۔

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى میں وہی بات بیان کی گئی ہے جو يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً میں بیان کی گئی تھی۔ صرف یہ فرق ہے کہ وہاں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کے الفاظ تھے اور یہاں یہ الفاظ ہیں کہ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى۔ ورنہ مفہوم اور معانی کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بندے کی خواہش یہ تھی کہ میرا خدا مجھ سے راضی ہو جائے گویا بندے کا راضی ہونا اس پر منحصر تھا کہ اُس کا خدا تعالےٰ اُس سے راضی ہو جائے وَلَسَوْفَ يَرْضٰى نے بتا دیا کہ وہ مَرْضِيَّة بن جائے گا یعنی خدا اُس پر راضی ہو جائیگا اور چونکہ یہی بندہ کی خواہش تھی اس لئے خدا تعالیٰ کے راضی ہونیکے بعد یہ بھی راضی ہو جائے گا اور جب یہ مقام اُسے حاصل ہو جائیگا تو پھر یہ بھی یقینی بات ہے کہ وہ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ کا بھی مستحق ہو جائیگا اور جس شخص کو جنّت حاصل ہو جائے وہ ہر قسم کی مکروہات سے امن میں آجاتا ہے۔

غرض اس سورۃ کا اختتام اللہ تعالےٰ نے اس بات پر فرمایا ہے کہ مسلمان دنیا میں کامیاب ہوں گے لیکن کفار باوجود اپنی شدید مخالفت کے کامیابی کا مُنہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ مسلمانوں کی محنت اور اُن کی قربانیاں اور کفار کی سُستی اور اُن کا قربانیوں میں حصہ نہ لینا۔ مسلمانوں کے اندر افاضہ اور استفاضہ دونوں قوتوں کا موجود ہونا اور کفار کے اندر افاضہ کی قوت کا نہ ہونا اور استفاضہ کی قوت سے کام نہ لینا ان دونوں کا ایک نتیجہ نہیں نکل سکتا کیونکہ کفار اور مسلمانوں کے کام بالکل الگ الگ ہیں۔ مسلمانوں کے کاموں سے خدا راضی ہو جائیگا لیکن کفار کے کاموں سے نہیں۔ یہاں گو اُلٹ نتیجہ اللہ تعالےٰ نے بیان نہیں کیا مگر وہ نتیجہ خود بخود نکل آتا ہے کہ کفار کو اُن کے کاموں کے نتیجہ میں خدا تعالےٰ کی رضاء حاصل نہیں ہوگی اور وہ اُس کے غضب کا نشانہ بن کر تباہ و برباد ہو جائیں گے ؎

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ

سورۃ ضحیٰ یہ سورۃ مکی ہے ۔ـ۱ـ

وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اِس کی بسم اللہ کے سوا گیارہ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ ضحیٰ مکی ہے

ـ۱ـ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نَزَلَتْ بِمَكَّةَ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ بعض کہتے ہیں فترۃ الوحی کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی تھی اِس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب یہ سورۃ پڑھتے یا اس کی تلاوت سُنتے تو اُس وقت تکبیر کہنے کا حکم دیتے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپ صرف اتنا کہتے کہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لیکن بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ آپ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ فرمایا کرتے تھے۔

بخاری میں روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بیمار ہوئے اور تہجد کے لئے نہ اُٹھے دو تین راتیں اس طرح گذر گئیں اس پر ایک ہمسایہ مخالف عورت آئی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے کہنے لگی معلوم ہوتا ہے تیرے شیطان نے (نعوذ باللہ) تجھے چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ دو تین رات سے تیرے پاس نہیں آیا۔

۲۱۱ سورۃ کے وجہ نزول کے متعلق بعض بیان کردہ وجوہات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کے وقت آپ بلند آواز سے تلاوت کیا کرتے تھے اور وہ اپنے خیال میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ جو قرآن پڑھ رہے ہیں یہ درحقیقت کوئی سکھانے والا آپ کو سکھا رہا ہے جب بیماری کی وجہ سے آپ نہ اُٹھے اور دو تین راتیں اِسی حالت میں گذر گئیں تو اُس نے قیاس کیا کہ نعوذ باللہ آپ کو جو شخص سکھاتا تھا یا جو روح سکھاتی تھی اُس نے آپکو چھوڑ دیا ہے اِس پر سورۃ الضحیٰ نازل ہوئی۔

جندبؓ سے روایت ہے کہ حضرت جبریل کچھ عرصہ تک وحی لے کر نہ اُترے اِس پر کفار نے کہا قَدْ وُدِّعَ مُحَمَّدٌ (صلعم) محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر جو بھی کلام اُترتا تھا اُس کا اترنا اب بند ہوگیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے چھوڑ دیا گیا ہے فَنَزَلَتْ مَا وَدَّعَكَ اِس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ٥ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔

جندبؓ سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ ایک دفعہ کچھ عرصہ تک وحی رُندہی تو آپ کی ایک چچیری بہن نے کہا مَا اَرٰى صَاحِبَكَ اِلَّا قَدْ قَلَاكَ کہ میرا تو یہ خیال ہے کہ تمہارا صاحب تم سے خفا ہوگیا ہے اُس نے صاحب کا لفظ اِس لئے بولا کہ جو لوگ خدا کو اس کلام کا نازل کرنے والا قرار دیتے ہیں وہ اس سے خدا مراد لے لیں اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیطان آپ پر یہ کلام نازل کیا کرتا ہے وہ اس سے شیطان مراد لے لیں۔ بہرحال اُس نے کہا جو بھی کلام نازل کیا کرتا تھا خواہ وہ خدا تھا یا شیطان معلوم ہوتا ہے وہ اب تم سے خفا ہوگیا ہے اِس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

یہ مختلف روایات ہیں جو اس سورۃ کے نزول کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ ایک میں آتا ہے کہ ایک ہمسائی نے آکر کہا۔ ایک میں آتا ہے کہ لوگوں میں یہ چرچا ہوا اور ایک میں آتا ہے کہ آپکی چچیری بہن نے کہا۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم یہ کہیں کہ یہ ساری روایتیں غلط ہیں اور فیصلہ کر دیں کہ ان روایات کا سورۃ کے نزول سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ اور یا پھر یہ طریق اختیار کریں جو میرے نزدیک صحیح ہے کہ ایک وقت میں ایک واقعہ پر مختلف لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں اور اُن چہ میگوئیوں کو اُس واقعہ سے کسی ملتی جلتی عبارت کے ساتھ چسپاں کر لیا جاتا ہے مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک دفعہ الہام ہوا A WORLD AND TWO GIRLS "اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز" (تذکرہ صـ۵۳۶ـ) حافظ احمد اللہ صاحب اُن دنوں قادیان آرہے تھے راستہ میں انہوں نے کسی دوست سے پوچھا کہ کوئی تازہ وحی سناؤ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی ہو اُس نے کہا ابھی ایک الہام ہوا ہے کہ "اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز"۔ حافظ احمد اللہ صاحب نے جھٹ کاغذ لیا اور

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لکھا مبارک ہو الہام پورا ہو گیا میں اکیلا نہیں آیا بلکہ میرے ساتھ دو لڑکیاں بھی آرہی تھیں اور یہ الہام اسی واقعہ پر چسپاں ہوتا ہے۔ پھر میں نے بعض اور لوگوں کو دیکھا کہ اُن میں سے جس کی بھی دو بیٹیاں اور ایک لڑکا تھا اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ الہام میرے متعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری جماعت میں دو درجن کے قریب ایسے لوگ تھے جنہوں نے مختلف پیرایوں میں یہ الہام اپنے اوپر چسپاں کیا۔ تو بعض دفعہ ایک ملتی جُلتی چیز ہوتی ہے جسے انسان اپنے خیال میں کسی الہام پر چسپاں کر دیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میں نے اس الہام کے شانِ نزول کا پتہ لگا لیا حالانکہ الہامات کے معانی ہمیشہ اُنکی ترتیب سے سمجھے جاتے ہیں اگر اُس ترتیب سے وہ علیحدہ کر لئے جائیں تو ہر ٹکڑہ کے کوئی نہ کوئی معنے ہو جائیں گے مثلاً کوئی شخص کہتا ہے۔ اِدھر آؤ۔ اب یہ الفاظ ایسے ہیں جو ہر شخص استعمال کر سکتا ہے مگر موقعہ کے لحاظ سے پتہ لگ جائے گا کہ اس کا مخاطب کون شخص ہے۔ فرض کرو زید سامنے ہو اور اُس وقت کوئی شخص آواز دے کہ اِدھر آؤ تو ہر شخص سمجھ جائے گا کہ اس سے مراد زید ہے کوئی اور شخص نہیں۔ لیکن اگر اس فقرہ کو موقعہ سے الگ کر لو تو دنیا کے ہر شخص پر یہ چسپاں ہو جائے گا۔ اِسی طرح یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں موقعہ پر نازل ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ قریب زمانہ میں اُس سے کوئی ملتا جُلتا واقعہ لوگوں کو نظر آتا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ یہی واقعہ اِس آیت کے نازل ہونے کا اصل سبب ہے چنانچہ وہ اُس آیت کو اپنی سمجھ کے مطابق اُس واقعہ پر چسپاں کر دیتے ہیں اور اگر ایک سے زیادہ ملتے جلتے واقعات ہوں تو مختلف لوگوں کی قیاس آرائیوں کی وجہ سے اس قسم کی روایات میں بہت کچھ اختلاف واقع ہو جاتا ہے جیسا کہ اِسی سورۃ کے شانِ نزول کے متعلق تین مختلف واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ کوئی ہمسائی عورت کا واقعہ پیش کرتا ہے۔ کوئی کفار کے عام خیالات کو اس سورۃ کے نزول کا اصل باعث قرار دیتا ہے اور کوئی آپ کی ایک چچیری بہن کا واقعہ اس کا موجب قرار دیتا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ابتدائی سورۃ ہے اور اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی ایام میں کچھ دنوں کے لئے وحی رُکی بھی ہے کیونکہ منشاء الٰہی یہ تھا کہ آپ پر نزولِ وحی کی وجہ سے جو ہیبت طاری ہوئی ہے اُس پر کچھ وقت گذر جائے اور وحی آپ میں سموئی جائے۔ پہلے پہلے جب ایک واقعہ ہوتا ہے تو انسان اُس کی اہمیت کو فوراً نہیں سمجھ جاتا بلکہ آہستہ آہستہ اُس کے قلب پر حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک موقعہ پر مدینہ والوں نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ وقت اور تھا جب ہم نے آپ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر دشمن مدینہ پر حملہ آور ہُوا تو ہم آپ کی مدد کریں گے لیکن اگر مدینہ سے باہر جا کر لڑنا پڑا تو ہم مدد کے ذمہ وار نہیں ہوں گے۔ یا رسول اللہ وہ وقت ایسا تھا جب ہمیں آپ کی حقیقت کا علم نہیں تھا اور اِسی وجہ سے ایسا معاہدہ کیا گیا مگر اب ہم پر آپ کی حقیقت کھل چکی ہے، آپکی شان اور عظمت کا ہمیں علم ہو چکا ہے اس لئے اب کسی معاہدے کا سوال نہیں۔ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور آپ کے بائیں بھی لڑیں گے، آپ کے آگے بھی لڑیں گے اور آپ کے پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہُوا نہ گذرے۔ تو اہم واقعات کو فوراً سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اُن کی حقیقت کھلتی ہے اور انسان کو پتہ لگتا ہے کہ الٰہی منشاء کیا ہے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے وحی نازل کی اور پھر ایک وقفہ ڈال دیا۔ اس عرصہ میں آپ نے وحی پر تدبّر کیا، اپنے کام کی اہمیت کو سمجھا اور اس طرح اپنے ایمان اور اپنے عزم اور اپنے استقلال میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ کر لیا۔ جب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ اب فزع کا کوئی سوال نہیں رہا، آپ کام کے لئے تیار ہو چکے ہیں اور وحی و الہام کی اہمیت آپ کے دل میں داخل ہو چکی ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیغام پر پیغام دینے شروع کر دئے۔ غرض پیغام اور پیغام کی تیاری میں کچھ وقفہ چاہیئے وہ وقفہ اس طرح ہُوا کہ پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ والی سورۃ نازل ہوئی۔ پھر سورۃ المدثر وغیرہ نازل ہوئیں یہ سورتیں آپ کی طرف اللہ تعالیٰ کا پیغام لاتی تھیں، آئندہ کے متعلق کئی قسم کی بشارات اپنے اندر رکھتی تھیں اور آپکو یہ کہنے آئی تھیں کہ ایک بہت بڑا

۲
فترۃ وحی کی وجہ

کام تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے اُس کے لئے تیار ہو جاؤ" یہ کام کس رنگ میں ہونا تھا اور کیا کیا محنتیں آپ کو اس غرض کے لئے کرنی تھیں۔ اس کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے دماغ کو تیار ہونا چاہیئے تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اِدھر الہام ہوتا اور اُدھر کہہ دیا جاتا کہ جاؤ اور کام کرو۔ سو درمیان میں بہرحال ایک وقفہ کی ضرورت تھی چنانچہ گذشتہ انبیاء کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک رہا ہے کہ پہلے اُن کو الہام ہوا اور پھر ایک وقفہ پیدا کیا گیا تا کہ اس عرصہ میں اُن کا دماغ آئندہ کے کام کے متعلق پوری طرح تیار ہو جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھو فلسطین سے جاتے ہوئے آپ کو الہام ہوا کہ يَا مُوسَىٰ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ ع) اے موسیٰ میں ہی تیرا رب ہوں پس اپنی جوتیاں اُتار دے کیونکہ تو مقدس وادی طویٰ میں ہے۔ مگر اس کے بعد ایک وقفہ ہوا اور مصر پہنچ کر دوبارہ وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ فلسطین سے اُس زمانہ میں مصر پہنچنا کوئی معمولی بات نہیں تھی کم سے کم دو مہینے صرف ہو جاتے تھے بلکہ بعض دفعہ چھ چھ ماہ بھی صرف ہو جاتے کیونکہ مخدوش راستوں کی وجہ سے قافلوں کے ساتھ سفر کیا جاتا تھا اور بعض دفعہ تو قافلہ جلد مل جاتا اور بعض دفعہ چھ چھ ماہ تک انتظار کرنا پڑتا کہ کب قافلہ تیار ہو اور اس سفر کو طے کیا جائے۔ یہ تیاری کا وقت تھا جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو ملا کہ چند ماہ پہلے ابتدائی وحی نازل ہوئی پھر ایک وقفہ پیدا کیا گیا تا کہ اس عرصہ میں آپ اپنے کام کی اہمیت کے مطابق تیاری کر لیں اور جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ تیاری مکمل ہو چکی ہے تو اس کے بعد تورات کا نزول ہوا۔ ایسا ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا حکم دے کر اللہ تعالےٰ نے کچھ وقفہ پیدا کر دیا۔ آپ اس وقفہ میں ان تمام باتوں کو سوچتے رہے اور غور کرتے رہے کہ الٰہی منشاء کیا ہے۔ جب دنیا کے حالات پر آپ نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ یہ یہ خرابیاں ہیں جن کو میں نے دور کرنا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے آپ کی توجہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی طرف پھیر دیا اور قوم کے حالات کو بھی آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا اور اُس کی اصلاح کے لئے کمر باندھ لی تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ہمت بندھانے کے لئے کچھ بشارتیں نازل ہوئیں۔ اِسی طرح دشمنوں کے متعلق کچھ انذار کی خبریں نازل ہونی شروع ہو گئیں۔ اس دوران میں دشمنوں نے جو جو باتیں کیں لوگوں نے اُن تمام باتوں کو اس سورۃ پر چسپاں کر دیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ سورۃ اُن واقعات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے حالانکہ اس سورۃ کا اُن واقعات کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں۔ ایک عورت نے کوئی بات کہہ دی تو اُس کا وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ کے ساتھ کیا جوڑ ہوا؟ اگر عورت یہ بات نہ کہتی تو کیا خدا تعالےٰ آپ کو تسلی نہ دیتا؟ ہم مان لیتے ہیں کہ مکہ والوں نے یہ باتیں کہیں، یہ بھی مان لیتے ہیں کہ آپ کی کسی چچیری بہن نے کوئی بات کہی اور اُس وقت کہی جب اس سورۃ کے کچھ حصوں سے ان باتوں کا توارد ہو گیا مگر پھر بھی یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سورۃ انہی واقعات کی وجہ سے نازل ہوئی ہے اگر یہ واقعات نہ ہوتے تو یہ سورۃ نازل نہ ہوتی۔

درحقیقت اکثر محل قرآن کریم کی آیات کے نزول کے جو لوگوں کی طرف سے بتائے جاتے ہیں حقیقتاً ایسے نہیں۔ اِسی لئے ان میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جیسے اس جگہ ہوا کہ کوئی کہتا ہے ایک ہمسائی عورت کی ایک بے معنی بات کی وجہ سے یہ سورۃ نازل ہوئی کوئی کہتا ہے کفار میں چونکہ فترۃ الوحی پر عام چرچا ہو گیا تھا اس لئے یہ سورۃ نازل ہوئی۔ کوئی کہتا ہے اس سورۃ کے نزول کا محرک آپ کی چچیری بہن کا واقعہ ہے۔ اِسی طرح اور بھی کئی آیات ہیں جن کے متعلق بعض صحابی کہتے ہیں کہ یہ میرے متعلق نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ میرے متعلق نازل ہوئی جیسے "اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز" کے الہام پر بہت سے احمدیوں کو غلط فہمی ہو گئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ الہام ہمارے متعلق ہے۔

سر میور کے نزدیک یہ سورۃ سورۃ البلد کے بعد کی نازل شدہ ہے لیکن نولڈکے کے نزدیک سورۃ الانشراح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک یہ سورۃ اپنے مضمون سے ظاہر کرتی ہے کہ بہت ہی ابتدائی سورتوں میں سے ہے کیونکہ اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالضُّحٰی ۙ﴿۲﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿۳﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ﴿۴﴾

(مجھے) قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جائے اور رات کی جب وہ قائم ہو جائے۔ کہ نہ تیرے رب نے تجھے ترک کیا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے۔

یعنی یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو رد نہ کرو۔ لیکن پہلی سورتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمان ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس اگر روایات کی تائید میں یہ بات پیش کی جائے کہ اس میں چونکہ حکم دیا گیا ہے کہ ایسا کرو اور عمل ہمیشہ حکم کے بعد ہوتا ہے اس لئے یہ اندرونی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ سورۃ پہلے نازل ہوئی ہے اور دوسری سورتیں جن میں مسلمانوں کے عمل کا ذکر ہے وہ اس کے بعد نازل ہوئی ہیں تو یہ بات قرینِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے لیکن یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہاں ابتدائی حکم نہیں دیا۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس سورۃ کے شروع میں جن انعامات کا وعدہ دیا گیا ہے یا جن انعامات کے ظہور کی خبر دی گئی ہے جب وہ انعامات نازل ہو جائیں تو اُن کے شکریہ کے طور پر جو عمل کرنے کیلئے کہا جائے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اُس وقت نازل ہوا ہے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام کو کہا گیا کہ تُو نے روزے رکھنے ہیں (مریم ع) اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ روزے اُسی وقت فرض ہوئے تھے اس سے پہلے نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ فرض تو پہلے سے تھے مگر اللہ تعالےٰ نے کہا کہ اب بھی تم روزے رکھو۔ اس لئے ضروری نہیں کہ ہم قطعی طور پر ان احکام سے یہ نتیجہ نکال سکیں کہ چونکہ ان میں حکم ہے اور حکم پہلے ہونا چاہیئے اور عمل بعد میں۔ اس لئے یہ سورۃ بہت پہلے نازل ہوئی ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس سورۃ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ گو یہ کام پہلے بھی تم کرتے ہو مگر جب یہ انعامات نازل ہو جائیں تو اُن کے شکریہ کے طور پر اور بھی ان کاموں کی طرف توجہ کرنا۔

ترتیب | پہلی سورتوں اور اس سورۃ کا مضمون اس لحاظ سے ایک ہی ہے کہ ان میں مکہ والوں کی اسی قسم کی بدیوں کا ذکر تھا جو یتامیٰ اور مساکین کی نسبت اُن سے سرزد ہوتی تھیں اور اس میں بھی یتامیٰ اور مساکین کا ہی ذکر ہے اور اموال کی حفاظت اور اُن کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی نصیحت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سورۃ الضحیٰ میں صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ذریعہ آپ کے اتباع کو ایسا کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور پہلی سورتوں میں یہ مقابلہ تھا کہ دوسرے ایسا نہیں کرتے لیکن مسلمان ایسا کرتے ہیں۔

سورۃ ضحیٰ کا تعلق پہلی سورۃ سے

اس سورۃ کا دوسرا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں یہ ذکر تھا کہ بندہ خدا تعالےٰ سے کیا سلوک کرتا ہے۔ اور یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ بندے سے کیا سلوک کرتا ہے۔ مثلاً پہلی سورۃ میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ بندہ خدا تعالےٰ کے لئے صدقہ و خیرات کرتا ہے۔ جیسے فرمایا تھا وَسَیُجَنَّبُہَا الۡاَتۡقَی الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ۚ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی ۙ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی ۚ وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ۔ گویا وہاں نیک اور متقی بندے کے عمل کا ذکر تھا کہ وہ یوں کرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے نیک اور متقی بندے یعنی نفسِ کامل سے کیسا سلوک کرتا ہے۔ گویا پہلی سورتوں کے مضامین بالخصوص سورۃ الیل کے مضمون کا یہ تتمہ ہے۔

۲ ضحیٰ

۲ حل لغات۔ ضحٰے: جب سورج نکل چکے تو اُس وقت ضُحٰی شروع ہوتی ہے اور زوال تک جاتی ہے لیکن بعض کے نزدیک زوال کے قریب جا کر ضُحٰی کا وقت نہیں رہتا بلکہ وہ ضَحَآءُ کہلاتا ہے۔ (اقرب)

۳ سَجٰی

سَجٰی کے معنے ہیں جب اندھیرا ترقی کرتے کرتے اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ چنانچہ مفردات میں لکھا ہے وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی اَیۡ

سَکَنَ - جب رات ٹھہر جاتی ہے اور اُس کا اندھیرا اور نہیں بڑھتا جتنا اُس نے بڑھنا ہوتا ہے وہ بڑھ جاتا ہے۔

وَدَّعَكَ

وَدَّعَكَ : وَدَّعَ الرَّجُلَ کے معنے ہوتے ہیں هَجَرَهُ کسی کو چھوڑ دیا۔ (اقرب)

قَلٰی

قَلٰی :۔ قَلَا فُلَانًا (قِلًى وَ قَلَاءً) کے معنے ہوتے ہیں اَبْغَضَهُ وَکَرِهَهُ غَايَةَ الْكَرَاهَةِ فَتَرَكَهُ۔ کسی پر ناراضگی کا اظہار کیا اور اُس کو انتہائی طور پر ناپسند کیا اور ناپسندیدگی کی بناء پر چھوڑ دیا۔ جب قَلَا الْاِبِلَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں طَرَدَهَا وَسَاقَهَا۔ اُس نے اونٹ کو چلایا اور دھتکارا یعنی اُسے مار کے آگے ہنکایا۔ قَلَا الْاِبِلَ میں قلا واوی ہے یعنی آخر میں اصل واو ہے اور قَلٰی فُلَانًا میں آخر میں یاء ہے (اقرب)

آنحضرت کی زندگی میں ایک رات اور ایک ضحیٰ کا خاص اثر

تفسیر:۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں ایک ضُحٰی اور ایک لَیْل خصوصیت رکھتی ہیں۔ ضُحٰی وہ دوپہر ہے جبکہ آپ مکہ کو فتح کر کے اُس میں داخل ہوئے تھے اور وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰی سے مراد وہ رات ہے جبکہ آپ نے مکہ کو چھوڑا تھا۔ گویا وَالضُّحٰی کے معنے ہوئے ایک خصوصیت رکھنے والا دن۔ اور وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰی کے معنے ہوئے ایک خصوصیت رکھنے والی رات۔ اور درحقیقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے بڑے واقعات اگر کوئی خلاصۃً پوچھے تو یہی دو ہیں۔ دشمنوں نے آپ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا پھر خدا تعالےٰ نے اپنے خاص نشانات سے دشمنوں کو تباہ کر کے آپ کو ایک فاتح کی حیثیت میں مکہ میں داخل فرمایا۔ انہی دو واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہم تیری سچائی کی شہادت کے طور پر یا اگلے مضمون کی سچائی کو واضح کرنے کے لئے ایک ضُحٰی کو پیش کرتے ہیں اور ایک ایسی رات کو پیش کرتے ہیں جو تاریکی سے اپنے اردگرد کی تمام چیزوں کو ڈھانپ لے گی۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ یہاں ضُحٰی پہلے ہے اور رات پیچھے حالانکہ فتح مکہ بعد میں ہوئی ہے اور ہجرت پہلے ہوئی ہے۔ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا (بنی اسرائیل ع ۹) ان آیتوں میں صاف پیشگوئی فتح مکہ کی ہے کیونکہ فتح مکہ کے موقعہ پر ہی آپ بُت توڑتے اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (اور یہی آیات کے بعد آتی ہیں) گویا آپ نے اپنے عمل سے واضح فرما دیا کہ وہ جو پیشگوئی کی گئی تھی کہ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا آج پوری ہوگئی ہے۔ اس آیت میں بھی اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ کو پہلے رکھا گیا ہے جس میں مکہ میں داخل ہونے کی خبر دی گئی تھی اور اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ کو بعد میں بیان کیا گیا ہے جس میں ہجرت کی پیشگوئی تھی حالانکہ ہجرت پہلے ہوئی تھی اور فتح مکہ بعد میں۔ اس کی وجہ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ ہے کہ الٰہی سُنّت یہ ہے کہ وہ اپنے پیاروں سے بات کرتے ہوئے خوشی کی خبر پہلے سُناتا ہے اور تکلیف کا ذکر بعد میں کرتا ہے تاکہ خوشی کی خبر رنج کی کلفت کو کم کرنے کا موجب بن جائے۔ اس طرح دونوں مطلب پورے ہو جاتے ہیں غم کی خبر بھی سُنا دی جاتی ہے اور خوشی کی خبر بھی سُنا دی جاتی ہے مگر چونکہ پہلے خوشی کی خبر آجاتی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نسبتاً کم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بھی ہوشیار پیغامبر کا یہی طریق ہوتا ہے جب کسی کا کوئی رشتہ دار بیمار ہو اور دوسرا شخص پوچھے کہ سُناؤ میرے فلاں رشتہ دار کا کیا حال ہے تو وہ کہتا ہے الحمدللہ وہ اب اچھے ہیں پچھلے دنوں شدید بیمار ہو گئے تھے اس طرح وہ خوشی کی خبر بھی سُنا دیتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ درمیان میں بعض ایسے اوقات بھی آگئے تھے جبکہ ڈاکٹر اُن کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ مگر بجائے یہ کہنے کے کہ اُن کی حالت نہایت نازک ہو گئی تھی وہ پہلے یہ فقرہ کہتا ہے کہ الحمدللہ وہ اب اچھے ہیں اس کے بعد وہ غم کی خبر سُناتا ہے۔ یہی طریق ہر اچھے پیغامبر کا ہوتا ہے کہ وہ بعد کے اچھے انجام کو پہلے بتا دیتا ہے اور تکلیف کا بعد میں ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کے بالکل اُلٹ بعض لوگوں کو ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے خطرہ کی بات کو پہلے بیان کریں گے اور

خوشی کی خبر کو دبا کر بیٹھ جائیں گے اور اُن سے پوچھا جائے کہ بتاؤ خیریت ہے تو وہ یہ نہیں کہیں گے کہ خیریت ہے بلکہ پہلے جبتک گھنٹہ بھر اپنا دُکھڑا انہیں رو لیں گے انہیں چین نہیں آئے گا۔ اسی طرح جب کسی کے سپرد کوئی ضروری کام کیا جائے اور وہ کام کرکے واپس آئے تو آتے ہی ایک لمبی کہانی سُنانی شروع کر دے گا اور بعد میں کہے گا کہ الحمدللہ کام ہوگیا۔ اُس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ آتے ہی کہہ دے الحمدللہ کام ہوگیا بلکہ پہلے اپنی مشکلات کا رونا رونے لگتا ہے اور گھنٹہ بھر کے بعد کہتا ہے الحمدللہ میں کامیاب ہوگیا۔ تو بعض طبائع ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں بات کرنے کا اُس وقت تک مزا نہیں آتا جب تک وہ دوسرے کو اچھی طرح ڈرا نہ لیں مگر الٰہی طریق یہ ہے کہ وہ پہلے خوشی کی خبر سُناتا ہے اور کہتا ہے ہم تمہیں بتا دیتے ہیں کہ نتیجہ اچھا ہوگا اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ درمیان میں کچھ تکلیفیں بھی آئیں گی کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ جب انجام بخیر ہے تو بات کو شروع کرتے ہی بندے کے دل کو دُکھ دینا شروع کر دے۔ یہی طریق رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ میں اختیار کیا گیا ہے کہ فتح مکہ کی خبر کو پہلے رکھا ہے اور ہجرت کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ جب مسلمانوں کو پتہ لگ گیا کہ آخر ہم نے مکہ فتح کرکے اِسی جگہ آنا ہے تو اُن کو تسلی ہوگئی کہ درمیان میں اگر ہجرت بھی کرنی پڑی تو کیا ہوا۔ اِسی بناء پر یہاں بھی وَالضُّحٰی کو پہلے اور وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کو بعد میں رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دو محل اس بات کو ثابت کر دیں گے کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی تیرے رب نے تجھے نہیں چھوڑا اور وہ تجھ سے ناراض نہیں ہوا۔ اور چونکہ وہ غرض جو وَالضُّحٰی کو پہلے رکھنے کی تھی پوری ہوگئی تھی یعنی غرض یہ تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے صدمہ نہ پہنچے کہ تجھے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اِسی بناء پر خدا تعالےٰ نے رات کا ذکر پیچھے کر دیا اور دن کا ذکر پہلے رکھا مگر چونکہ اس آیت سے غرض پوری ہوگئی اِس لئے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ترتیب اصلی کو قائم کر دیا۔ چنانچہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ جواب ہے وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کا اور مَا قَلٰی جواب ہے وَالضُّحٰی کا۔ چونکہ غرض پوری ہو چکی تھی اور اب اِس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ واقعاتی ترتیب کو بدلا جاتا اس لئے اللہ تعالےٰ نے پہلی آیات کی ترتیب کو اُلٹ دیا اور فرمایا اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم! جب وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں بیان کردہ واقعہ ہوگا اور مکہ تجھے چھوڑنا پڑے گا تو اللہ تعالےٰ اُس وقت تجھے چھوڑے گا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غارِ ثور میں جب حضرت ابوبکرؓ گھبرائے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ دشمن اتنا قریب پہنچ گیا ہے کہ اگر وہ ذرا اپنے سر کو جھکائے تو ہمیں اس غار میں سے دیکھ سکتا ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ غم مت کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے کب فرمایا تھا کہ میں ہجرت کی گھڑیوں میں تیرے ساتھ ہوں گا تو اس کا جواب یہ ہے وہ الٰہی وعدہ اسی سورۃ میں تھا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جب وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں بیان شدہ واقعہ کا ظہور ہوگا تو تیرا رب تجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ اِسی وعدہ کی بناء پر آپ نے نہایت دلیری سے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ ابوبکر! کیوں گھبرا رہے ہو خدا ہمارے ساتھ ہے وہ پہلے سے یہ وعدہ سورۃ الضحیٰ میں کر چکا ہے پس ڈرنے کی بات نہیں۔ آخر یہ خدا تعالیٰ کی معیت ہی تھی کہ دونوں طرف قطار باندھے دشمن کھڑا ہے آپ کے مکان کا سنگین پہرہ دے رہا ہے اور آپ نہایت اطمینان کے ساتھ اُس درمیان سے گذر جاتے ہیں اور وہ یہ خیال کر لیتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ کوئی اور جا رہا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تاریخ میں یہ ذکر آتا ہے (گو حوالہ یاد نہیں رہا) کہ بعد میں ایک پہرے دار نے کہا کہ میں نے خود آپ کو مکان میں سے نکلتے اور وہاں سے گذرتے دیکھا مگر میں نے یہ نہیں سمجھا کہ آپ جا رہے ہیں بلکہ خیال کیا کہ کوئی اور جا رہا ہے۔ بہرحال یہ خدا تعالےٰ کی معیت ہی تھی کہ آپ دشمنوں کی نظروں کے سامنے نکل گئے اور وہ آپ کو پکڑ نہ سکا۔ پھر یہ خدا ہی کی معیت تھی کہ جب آپ غارِ ثور میں پہنچے تو باوجود اس کے کہ کفار کے کھوجی نے یہ کہہ دیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا تو یہاں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں کسی کو یہ جرأت تک

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں ہجرت اور فتح مکہ کی طرف اشارہ

نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اُس غار کے اندر جھانک سکیں وہ اپنے کھوجی پر مضحکہ اڑانے لگے کہ آج یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے کیا اس غار میں بھی کوئی چھپ سکتا ہے یا کوئی شخص آسمان پر بھی جا سکتا ہے کہ کہتا ہے کہ اگر وہ یہاں نہیں تو آسمان پر چلے گئے ہیں یہ خدا تعالیٰ کی معیت کا ایسا کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ دشمن سے دشمن انسان بھی اس کو سُن کر انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز فتح مکہ ہے اُس کے لئے مَا قَلٰی کا لفظ خدا تعالیٰ نے استعمال کیا ہے۔ مکہ والوں کا یہ خیال تھا کہ جو شخص مکہ پر حملہ کرے گا خدا کا غضب اُس پر نازل ہو گا۔ وہ ابرہہ کے حملہ کو دیکھ چکے تھے کہ کس طرح وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت حملہ آور ہوا اور پھر کس طرح خدا تعالیٰ نے اُسے اپنے غضب کا نشانہ بنا دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مکہ پر حملہ کرنے والا چونکہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنتا ہے اس لئے وہ تباہ ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیرے معاملہ میں ایسا نہیں ہو گا بلکہ ضحٰی کا وقت اس بات کی شہادت دے گا کہ تیرا خدا تجھ سے ناراض نہیں اگر وہ ناراض ہوتا تو تجھ پر عذاب کیوں نازل نہ کرتا۔ تجھ پر اُس کا عذاب نازل نہ کرنا بلکہ تیری تائید اور نصرت کرنا اور تیرے راستہ سے ہر قسم کی روکوں کو دور کرنا اور تجھے اپنے لشکر سمیت فتح و کامرانی کا جھنڈا اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہونے کا موقع دینا بتا رہا ہے کہ الٰہی منشاء یہی تھا کہ تُو لَڑے اور اس بلد الحرام کو فتح کر کے اس میں داخل ہو جائے۔ پس وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں بیان شدہ واقعہ کے ظہور نے بتا دیا کہ خدا تعالیٰ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں چھوڑا اور وَالضُّحٰی میں بیان شدہ واقعہ نے بتا دیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل سے خدا تعالیٰ ناراض نہیں خواہ وہ صدیوں کے فیصلہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ابراہیمؑ کے وقت سے خدا تعالیٰ کی یہ سُنت چلی آ رہی تھی کہ مکہ پر حملہ کرنا جائز نہیں جو شخص مکہ پر حملہ کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ کو فتح کرنے کے لئے جاتے ہیں رات کو نہیں بلکہ دن دہاڑے مکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ دنیا بھی دیکھ رہی ہے خدا بھی دیکھ رہا ہے خدا تعالیٰ کے فرشتے بھی دیکھ رہے ہیں مگر آپ پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوتا۔ آپ کے لشکر پر کوئی تباہی نہیں آتی بلکہ اگر کچھ ہوتا ہے تو یہ کہ مکہ والوں کی گردنیں پکڑ کر خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کہ ان سے جو چاہو سلوک کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مکہ میں داخلہ بھی خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق تھا ورنہ ۲۵ سو سال سے جو سلوک اللہ تعالیٰ مکہ پر حملہ کرنے والوں کے ساتھ کرتا چلا آیا تھا وہ آپ کے ساتھ کیوں نہ کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیری مکہ سے رات کے وقت ہجرت اس بات کا ثبوت ہو گی کہ خدا تعالیٰ نے تجھے نہیں چھوڑا اور تیرا دن دہاڑے مکہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہونا اس بات کا ثبوت ہو گا کہ خدا تجھ سے خفا نہیں ہے۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے دوسرے معنے

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ضحٰی روشنی اور سَجٰی اندھیرے پر دلالت کرتا ہے اور یہ دونوں حالتیں انسان پر آتی رہتی ہیں یعنی کبھی اُس پر تکالیف آتی ہیں اور کبھی اُس کے لئے خوشی کے سامان پیدا کئے جاتے ہیں، کبھی کامیابیاں اور ترقیات حاصل ہوتی ہیں اور کبھی ناکامیاں اور تکالیف پیش آتی ہیں یہ اتار چڑھاؤ دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہتا ہے کبھی ترقی کا وقت آتا ہے تو کبھی تنزل کا، کبھی خوشی پہنچ جاتی ہے تو کبھی غم، کبھی اولاد پیدا ہوتی ہے کبھی مر جاتی ہے، کبھی بیمار ہو جاتا ہے کبھی تندرست ہو جاتا ہے، کبھی دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے اور کبھی دشمن کے عارضی طور پر جیتنے کا موقعہ آ جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی ایک الہام ہے کہ ؂

" دشمن کا بھی ایک وار نکلا " (تذکرہ ص۵۵۵)

تو دشمن کے وار بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب اُنہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو جیسے قرآن کریم میں ہی کئی جگہ نقشہ کھینچا گیا ہے وہ شور مچانے لگ جاتے ہیں کہ ہائے مارے گئے، ہائے مارے گئے۔ اس کے مقابل میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب اُن کو ترقیات ملتی ہیں تو وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (القصص ع) ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے زور بازو سے ملا ہے ہمارے

اندر قابلیتیں ہی ایسی تھیں کہ ہمیں یہ ترقیات حاصل ہوتیں، ہم نے یُوں کیا ہم نے وُوں کیا اور پھر ہمیں یہ اعزاز حاصل ہُوا گویا جب اُن کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے برکات حاصل ہوتی ہیں یا ترقیات سے اُن کو حصہ ملتا ہے تو اُن میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور جب مشکلات آتی ہیں تو اُس وقت بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے انسان ایسا ہے کہ اگر اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کہتا ہے رَبِّیْٓ اَھَانَنِ (الفجر ع) میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا اور خوشی پہنچتی ہے تو کہتا ہے رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ۔ ہاں جی ہم تو ہیں ہی ایسے کہ خدا ہماری عزت کرتا۔ ایسے لوگوں کے بالمقابل اے محمد رسول اللہ تیری یہ حالت نہیں بلکہ وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ ہم تیری یہ دونوں حالتیں دشمنوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تیرا نفس کامل اتنا اعلیٰ درجے کا ہے کہ تیرا سلوک اپنے رب سے ہمیشہ اس قسم کا ہوگا کہ ہر مایوسی اور تکلیف کے وقت خدا تجھے بھولے گا نہیں بلکہ یاد رہیگا۔ مایوسی کبھی تیرے قریب بھی نہیں آئے گی اور خوشی کے وقت کبھی تکبر تیرے پاس بھی نہیں پھٹکے گا جب تجھ پر انعامات نازل ہونگے تُو یہ نہیں کہے گا کہ میں نے یہ انعام بزور بازو حاصل کیا ہے اور اس طرح خدا تعالےٰ کو ناراض کرلے گا بلکہ تُو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے یہ انعام بخشا ہے اور اس طرح خدا تعالےٰ کی خفگی کو پاس بھی نہیں آنے دے گا۔ اسی طرح جب تجھے تکلیفیں آئیں گی اُس وقت بھی تُو خدا پر کوئی الزام نہیں لائے گا بلکہ اُسی کے کنارِ عاطفت کی طرف تُو ہر وقت جھکا رہے گا اور اس وجہ سے خدا تعالےٰ تیرے پاس آکھڑا ہوگا۔ اب دیکھو یہ دونوں چیزیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کتنی نمایاں نظر آتی ہیں۔

وہ بھی ایک لَیل تھی جب آپ کو مکہ سے ہجرت کے لئے نکلنا پڑا اور غار ثور میں آپ پناہ گزیں ہوئے اور وہ بھی ایک لَیل تھی جو آپ پر اُس وقت آئی جب ابو طالب آپ کے چچا نے ایک دن آپ کو بُلایا اور کہا اے میرے بھتیجے! اب تیری قوم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔ آج بڑے بڑے رؤساء اکٹھے ہوکر میرے پاس آئے تھے اور وہ مجھے کہتے تھے کہ ابو طالب صرف تیری حفاظت کی وجہ سے ہم نے تیرے بھتیجے کو اب تک چھوڑا ہوا ہے۔ ہم نے تیرا بڑا لحاظ کیا کیونکہ تُو شہر کا رئیس ہے مگر آخر یہ ظلم کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمارے بُتوں کی پرستش کرے بلکہ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے بُتوں کو بُرا نہ کہا کرے۔ اگر وہ اتنی معمولی سی بات بھی ماننے کیلئے تیار نہ ہُوا اور اُس نے ہمارے معبودوں کو بُرا کہنا ترک نہ کیا تو ہم تجھے بھی سرداری سے جواب دے دیں گے اور آئندہ تیری کوئی عزت نہیں کریں گے۔ نمبردار کے لئے اپنی نمبرداری چھوڑنی بڑی مشکل ہوتی ہے اور دنیا میں سب سے بڑی مصیبت اگر اُسے نظر آتی ہے تو یہی کہ کہیں مجھے اپنی چودھراہٹ نہ چھوڑنی پڑے۔ وہ اس بات کو برداشت ہی نہیں کرسکتا کہ آج تو وہ اس شان کے ساتھ بیٹھا ہو کہ لوگ آتے ہوں اور کہتے ہوں چودھری صاحب آپ جو کچھ فرمائیں وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہم آپ کا حکم ماننے کے لئے تیار ہیں اور دوسرے دن اُس کی یہ حالت ہو کہ لوگوں نے ڈنڈے اٹھائے ہوئے ہوں اور اُسے کہتے ہوں کہ ہمارے گاؤں میں سے نکل جاؤ۔ ابو طالب چونکہ مسلمان نہیں تھے اس لئے اُن کے لئے یہ بڑی مصیبت تھی۔ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بلایا اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے کہا اے میرے بھتیجے مجھ سے جس قدر ہوسکا میں نے تیری مدد کی ہے مگر آج تیری قوم کے بڑے بڑے سردار مجھے بھی آخری نوٹس دے گئے ہیں کہ یا اپنے بھتیجے کے ساتھ رہو یا ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ تُو اُن کے بُتوں کی پرستش کرے وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تُو اُن کو بُرا کہنا چھوڑ دے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تُو کچھ نرمی اختیار کرلے؟ ورنہ وہ تجھے بھی نوٹس دے گئے ہیں اور مجھے بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر آئندہ تُو نے اپنے بھتیجے کی مدد کی تو تیری سرداری بند۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو بغیر کسی توقف کے آپ نے جواب دیا کہ اے چچا! آپ نے میری بڑی مدد کی ہے مگر یہ معاملہ تو دین کا ہے اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لاکر کھڑا کر دیں اور پھر کہیں کہ میں کوئی تبدیلی کروں تب بھی میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اے چچا! اب اس کا ایک ہی علاج ہے

اگر آپ کو آپ کی قوم میری خاطر چھوڑتی ہے تو پھر آپ مجھے چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے مل جائیں۔ دیکھو یہ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى کا ایک وقت تھا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ طاقت آپ کے پاس نہیں تھی بلکہ ابو طالب کے پاس تھی مگر جس کے پاس طاقت تھی وہ گھبرا جاتا ہے اور جس کے پاس طاقت نہیں تھی وہ کہتا ہے کہ جب باقیوں نے مجھے چھوڑا ہے تو آپ بھی مجھے چھوڑ دیں میں اپنے عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک رات تھی تاریک اور بھیانک رات۔ جس میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں (سوائے اُن کے جو اللہ تعالےٰ سے مؤید ہوں) جو مقاومت کی رُوح اپنے اندر قائم رکھ سکیں لیکن اِس تاریک رات میں بھی آپ نے ثابت کر دیا کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ آپ نے کوئی فعل ایسا نہ کیا جس پر خدا تعالےٰ بندہ کو چھوڑ دیا کرتا ہے آپ نے کوئی فعل ایسا نہ کیا جس پر خدا تعالیٰ خفا ہو جایا کرتا ہے بلکہ آپ نے وہ کچھ کیا جس پر خدا تعالےٰ اَور بھی قریب ہو جاتا ہے، جس پر وہ اَور بھی خوش ہو جاتا ہے۔

کیا تم سمجھ نہیں سکتے کہ جب عرش پر خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہو گا کہ اے چچا آپ بھی مجھے چھوڑ دیں میں خدا تعالےٰ کو نہیں چھوڑ سکتا تو خدا تعالےٰ ایک عاشق کی طرح آپ کی طرف یہ کہتے ہوئے جھکا ہو گا کہ دنیا تجھے چھوڑ دے پر میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔ اللہ تعالےٰ غیر مادی چیز ہے اور اُس کا تعلق اپنے بندوں سے روحانی ہوتا ہے جسمانی نہیں۔ لیکن تمثیلی طور پر اپنے ذہن میں نقشہ جمانے کے لئے اگر تم فرض کر لو کہ اللہ تعالےٰ کی محبت مادی محبت ہوتی یا اُس کی نفرت مادی نفرت ہوتی تو جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کو یہ جواب دیا تھا کہ چچا اگر یہی بات ہے تو پھر آپ مجھے بے شک چھوڑ دیں اُس وقت اگر خدا تعالےٰ دو گز پر کھڑا ہو گا تو یقیناً اس فقرہ کے بعد وہ آپ کے پاس آ کھڑا ہوا ہو گا اور اگر خدا کی خوشنودی پہلے آپ کو دس نمبر کی حاصل تھی تو اِس واقعہ کے بعد وہ بیس نمبر تک پہنچ گئی ہو گی۔ پس اللہ فرماتا ہے وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ اے محمد رسول اللہ! ہر رات جو تیری زندگی میں آئے گی، ہر رات جو تجھ پر گذرے گی وہ اس بات کو ثابت کرنے والی ہو گی کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ کہ نہ تو تیرے خدا نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے بلکہ وہ تجھ سے ہر گھڑی زیادہ قریب ہوتا جائیگا۔

غارِ ثور میں ابو بکر جیسا بہادر آدمی گھبرا جاتا ہے۔ اپنے لئے نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے۔ مگر کیتنی عجیب بات ہے کہ وہ جس کے لئے کوئی آفت نہیں تھی جو اگر پکڑا بھی جاتا تو لوگ اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیتے اور زیادہ سے زیادہ اُسے یہی کہتے کہ تُو اس کے ساتھ کیوں آ گیا تھا کیونکہ ابو بکرؓ کی مکہ والے بہت عزت کیا کرتے تھے وہ تو گھبرا جاتا ہے مگر جس پر آفت آئی ہوئی ہے، جس کے ساتھ اس مصیبت کا براہِ راست تعلق ہے، وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کہتا ہے لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ اُس تاریک گھڑی میں جب آپ نے کہا ہو گا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا تو جتنا آپ کے ساتھ خدا تعالےٰ کا پہلے تعلق ہو گا وہ اور بھی بڑھ گیا ہو گا، وہ اور بھی سمٹ کر آپ کے قریب آ گیا ہو گا اور جتنا خدا تعالیٰ آپ سے پہلے خوش تھا وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہو گیا ہو گا۔ پھر ایک تاریک گھڑی وہ تھی جبکہ اُحد میں آپ زخمی ہوئے اور اس قسم کے واقعات جمع ہو گئے کہ اسلامی لشکر کی فتح شکست کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اِس جنگ میں ایک درہ ایسا تھا جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض آدمی چُن کر کھڑے کئے تھے اور اُنہیں حکم دیا تھا کہ جنگ کی خواہ کوئی حالت ہو تم نے اس درہ کو نہیں چھوڑنا۔ جب کفّار کا لشکر منتشر ہو گیا تو انہوں نے غلطی سے اجتہاد کیا کہ اب یہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ ہے ہم بھی چلیں اور لڑائی میں کچھ حصہ لیں۔ اُن کے سردار نے انہیں کہا بھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ ہم یہ درہ چھوڑ کر نہ جائیں مگر انہوں نے کہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ فتح ہو جائے تب بھی یہیں کھڑے رہو۔ آپ کے ارشاد کا تو یہ مطلب تھا کہ جب تک جنگ ہوتی رہے اس درہ کو نہ چھوڑنا۔ اب چونکہ فتح ہو چکی ہے دشمن بھاگ رہا ہے ہمیں بھی تو کچھ ثواب جہاد کا حاصل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ درہ خالی ہو گیا۔ حضرت خالد بن ولید جو اُس وقت تک ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے نوجوان تھے اور اُن کی نگاہ بہت تیز تھی وہ جب اپنے لشکر سمیت بھاگے جا رہے تھے

انہوں نے اتفاقاً پیچھے کی طرف نظر ڈالی تو درہ کو خالی پایا یہ دیکھتے ہی وہ واپس لوٹے اور مسلمانوں کی پشت پر حملہ کر دیا مسلمانوں کے لئے یہ حملہ چونکہ بالکل غیر متوقع تھا اس لئے اُن پر سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی اور بوجہ بکھرے ہوئے ہونے کے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے۔ میدان پر کفار نے قبضہ کر لیا اور اکثر صحابہ سراسیمگی اور اضطراب کی حالت میں مدینہ کی طرف بھاگ پڑے یہاں تک کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد صرف بارہ صحابہؓ رہ گئے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ بارہ بھی نہیں صرف تین آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد رہ گئے اور کفار نے خاص طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر تیر اندازی شروع کر دی لیکن باوجود ان نازک حالات کے آپ برابر دشمن کے مقابلہ میں کھڑے رہے اور اپنے مقام سے نہیں ہلے۔ آخر دشمن نے یکدم ریلہ کر دیا اور وہ چند آدمی بھی دھکیلے گئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے۔ آپ پر بعض اور صحابہؓ جو آپ کی حفاظت کر رہے تھے شہید ہو کر گر گئے اور اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تھوڑی دیر کے لئے صحابہؓ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ یہ خبر صحابہؓ کے لئے اور بھی پریشان کن ثابت ہوئی اور اُن کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ جو صحابہ اُس وقت آپ کے اردگرد موجود تھے اور زندہ تھے انہوں نے لاشوں کو ہٹا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو گڑھے میں سے نکالا اور حفاظت کے لئے آپ کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت جب دشمن اپنی فتح کے نشہ میں مخمور تھا، جب اسلامی لشکر سخت ضعف اور انتشار کی حالت میں تھا، جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صرف چند صحابہ تھے، باقی سب کے سب میدان سے بھاگ چکے تھے۔ ابوسفیان نے پکار کر کہا کہ بتاؤ کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ صحابہ نے جواب دینا چاہا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خاموش رہو اور کوئی جواب نہ دو۔ پھر اُس نے پوچھا کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہے؟ مراد اُس کی یہ تھی کہ کیا حضرت ابوبکر زندہ ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مت جواب دو۔ پھر اُس نے پوچھا کیا تم میں عمر موجود ہے؟ اس کا جواب دینے سے آپ نے منع فرما دیا۔ تب اُس نے خوش ہو کر کہا اُعْلُ ھُبُلْ اُعْلُ ھُبُلْ۔ ہُبل کی شان بلند ہو ہُبل کی شان بلند ہو یعنی آخر ہُبل دیوتا نے اِن لوگوں کو مار دیا اور اس کی شان بلند ہوئی جب اُس نے یہ الفاظ کہے تو باوجود اس کے کہ ابھی ابھی دشمن صحابہؓ کو نقصان پہنچا کر ہٹا تھا۔ ابھی صحابہ میدان سے بھاگ رہے تھے بلکہ بعض تو ایسے بھاگے تھے کہ انہوں نے مدینہ جا کر دم لیا تھا۔ غرض باوجود اس کے کہ ایک حصہ بھاگا جا رہا تھا اور ایک حصہ پراگندہ اور منتشر تھا اور صرف چند صحابہ جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اردگرد تھے جب اُس نے یہ الفاظ کہے تو آپ برداشت نہ کر سکے اور آپ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم کیا جواب دیں۔ آپ نے فرمایا کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ تمہارا ہُبل کیا چیز ہے اللہ ہی سب سے بلند رتبہ اور شان رکھنے والا ہے۔ کہتے ہیں "ہبل مجھے مار" کئی ہزار کا لشکر سامنے پڑا ہے وہ فتح کے نشہ میں مخمور ہے مسلمانوں کا کثیر حصہ میدان جنگ سے واپس جا چکا ہے اور دشمن دعوے کرتا ہے کہ اُس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔ یہ کتنی تاریک رات تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی مگر اس تاریک رات میں بھی جبکہ صرف چند صحابہ آپ کے اردگرد تھے اور خطرہ تھا کہ دشمن آپ پر پھر حملہ نہ کر دے۔ جب اُس نے ہُبل کی تعریف کی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو صحابہ کو مصلحتاً اب تک جواب دینے سے روکتے چلے آتے تھے بڑے جوش سے فرمانے لگے اُس کو کیوں جواب نہیں دیتے کہ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ صحابہؓ نے یہ جواب دیا اور اس طرح آپ نے اپنے عمل سے دشمن کو چیلنج کیا کہ میں یہاں موجود ہوں اگر تم میں ہمت ہے تو آ جاؤ۔ وہ دشمن جس نے ایک ہزار سپاہی کو بھگا دیا تھا اُس کی زبان سے اُس وقت بھی شرک کا کلمہ سُننا آپ کی طاقتِ برداشت سے باہر ہو گیا جبکہ آپ صرف چند صحابہ سمیت اُس کی زد میں تھے اور زخموں کی وجہ سے کمزور ہو رہے تھے اور

انتہائی نازک حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ نے خدا کا نام اُس وقت بھی بلند کر دیا۔ یہ ایک رات تھی جو آپ پر آئی مگر اس رات سے کیا نتیجہ نکلا؟ یہی کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى آپ کا خدا تعالےٰ سے تعلق اور بھی بڑھ گیا اور آپ نے کوئی ایسا فعل نہ کیا جس سے وہ ناراض ہوتا۔

پھر ایک رات وہ تھی جبکہ غزوۂ خندق کے موقع پر دشمن آیا اُس نے اپنی طرف سے ساری تیاریاں کرلیں کہ وہ مسلمانوں کو زیر کرے گا اور اُن کو شکست دے گا۔ لیکن اس تاریکی کے وقت میں اتفاق کی بات ہے رات ہی تھی جب دشمن کو شکست ہوئی۔ رات کا وقت تھا مسلمان بظاہر مایوس ہو چکے تھے، دشمن پندرہ دن سے اُن کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، خوراک وغیرہ کے سامانوں میں سخت کمی آ چکی تھی، مدد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور مسلمان سخت گھبرا رہے تھے کہ نہ معلوم اب کیا بنیگا۔ سامان اتنے کم تھے کہ مسلمان خود کہتے ہیں ہمارے ہاتھ پاؤں سردی سے سُن ہو رہے تھے مگر ہمارے پاس کپڑے نہیں تھے کہ ہم ان کو اوڑھ کر اپنی سردی کو دُور کر سکیں۔ غرض یہی کیفیت تھی کہ ایک دفعہ آدھی رات کے وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی ہے! ایک صحابی بولے اور کہا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا تم نہیں۔ کوئی اَور۔ جب تھوڑی دیر تک کوئی اور شخص نہ بولا تو آپ نے پھر فرمایا۔ کوئی ہے! اس پر پھر وہی صحابی بولا کہ یا رسول اللہ میں حاضر ہوں آپ نے فرمایا تم نہیں کوئی اَور۔ جب دوسری دفعہ بھی کوئی اور شخص نہ بولا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کوئی ہے! اس پر پھر وہی صحابی بولا اور کہنے لگا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپ ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ اور باہر جا کر دیکھو مجھے اللہ تعالےٰ نے اطلاع دی ہے کہ دشمن بھاگ گیا ہے۔ اب دیکھو رات کو مسلمان سوتے ہیں تو انتہائی مایوسی کی حالت میں مگر ابھی صبح نہیں ہوتی، آدھی رات کا وقت ہوتا ہے، تاریکی چاروں طرف مسلط ہوتی ہے کہ اُس رات کی تاریکی میں اللہ تعالےٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر دیتا ہے کہ دشمن بھاگ گیا ہے۔ گویا تاریکی میں جہاں اور لوگ گھبرا رہے تھے آپ خدا تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے تھے اور اُس سے دعائیں کر رہے تھے۔ وہ صحابی کہتے ہیں میں باہر گیا تو دیکھا کہ تمام جنگل خالی پڑا ہے اور دشمنوں کے خیمے سب غائب ہیں۔ ایک اور صحابی کہتے ہیں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ کوئی ہے! تو میں اُس وقت جاگ رہا تھا مگر شدتِ سردی کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں تو الگ میری زبان بھی سُن ہو چکی تھی اور اس وجہ سے میں جواب نہیں دے سکتا تھا، سنتا تھا مگر بولنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کیونکہ کپڑے کافی نہ تھے اور برف پڑی ہوئی تھی۔ یہ تکالیف آئیں مصائب و آلام کی گھڑیاں آپ پر گذریں مگر ان تمام لیالی میں ہر لیل کے وقت اللہ تعالےٰ نے ثابت کر دیا کہ وہ آپ کے ساتھ ہے۔ پھر ضحٰی کے اوقات بھی آپ پر آئے چنانچہ فتح مکہ کے بعد سارے عرب کی فتح آئی اور کامیابی و کامرانی آپ کے قدموں کو چومنے لگی مگر کامیابیوں کے اوقات نے بھی کیا ثابت کیا؟ یہی کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ترقیات کے وقت اُن میں کبر پیدا ہو جاتا ہے فتح کے وقت نشۂ غرور اُن میں سما جاتا ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قلبی کیفیات کا تم اس سے اندازہ لگاؤ کہ فتح مکہ کے وقت جب لشکر اسلامی مکہ کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا صحابہؓ کے دلوں میں سخت جوش پایا جاتا تھا خصوصاً انصار کے دل میں مکہ والوں کے خلاف بہت زیادہ جوش تھا۔ بے شک مہاجرین بھی اس جوش سے خالی نہیں تھے مگر مہاجرین پر اُن کے مظالم کا اتنا اثر نہیں تھا جتنا انصار کو یہ سُن سُن کر جوش آتا تھا کہ مکہ والے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے رہے ہیں۔ اسی جوش کی حالت میں ایک انصاری جرنیل نے ابوسفیان کو دیکھا تو اُس کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا آج ہم نے تم سے بدلے لینے ہیں، آج اُن مظالم کا ہم نے انتقام لینا ہے جو مکہ والوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر کئے۔ کوئی اور ہوتا تو جرنیل کو بُلا کر اُسے تمغہ لگا دیتا اور کہتا شاباش! وفادار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا مکہ تو خدا تعالےٰ کا متبرک مقام ہے ہمیں اپنی خوشیوں اور کامیابیوں میں اُس کی اس برکت کو نہیں بھول جانا چاہیئے جو خدا تعالےٰ نے اُسے عطا کی ہے۔ تم نے بڑی غلطی کی جو ایسا فقرہ اپنی زبان سے نکالا۔ میں تمہیں جرنیل کے عہدہ سے معزول کرتا ہوں۔ دیکھو ایک ہی موقع آیکی

زندگی میں ایسا آیا جبکہ دشمن جو ایک لمبے عرصہ تک خطرناک سے خطرناک مظالم توڑتا رہا تھا اُس کی گردنیں آپ کے ہاتھ میں تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ خود آپ کے دل میں ہی یہ خیال آ جاتا کہ میں ان لوگوں سے آج خوب بدلہ لوں گا اور خود بھی ایسا فقرہ کہہ دیتے یا اگر خود نہ کہتے تو اور کہنے والوں کی باتیں پسند کرتے یا اگر ظاہر میں پسند نہ کرتے تو دل میں ہی پسند کرتے اور کہتے یہ لوگ میرے بڑے وفادار ہیں، مجھ پر جو مظالم ہوئے اُن کا کس قدر ان میں احساس پایا جاتا ہے، کتنا جوش ہے جو انکی حرکات سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہا ہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے جرنیل کے عہدہ سے ہی معزول کر دیا اور فرمایا ہمارے لئے یہ تکبّر کے اظہار کا موقع نہیں۔

پھر دیکھو وہ ضُحٰی کا ہی وقت تھا جب آپ مکّہ میں داخل ہوئے اور آپ نے فرمایا اے عتبہ شیبہ اور ولید کی اولادو! اور اے عتبہ شیبہ اور ولید کے چچو، بھائیو اور بھانجو! تم نے مجھے انتہائی بےکسی اور بےبسی کی حالت میں مکّہ سے نکال دیا تھا اب تم میرے قابو میں ہو بتاؤ میں تم سے کیا سلوک کروں؟ انہوں نے کہا ہم آپ سے اُسی سلوک کی امید رکھتے ہیں جو آپ کی شان کے شایاں ہو اور وہی سلوک چاہتے ہیں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ جاؤ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ تم آزاد ہو۔ یہ دوسری ضُحٰی تھی جو آپ پر آئی مگر اس ضحٰی نے بھی بتا دیا کہ کبر اور خود پسندی کبھی آپ کے قریب بھی نہیں آئی تھی۔ قومیں آئیں، وفود آئے اور ہر طرف سے آکر انہوں نے آپکی اطاعت کو قبول کیا مگر کبھی بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ آپ نے ان لوگوں میں کبھی اپنی شان کا کوئی خاص اظہار کیا ہو۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جن پر دن چڑھتے ہیں تو وہ اپنے دنوں کو کھیل میں، تماشہ میں، جوئے میں، شراب میں اور اسی قسم کی اور لغویات میں ختم کر دیتے ہیں اور جب رات آتی ہے تو اس کو ناچ گانے اور سونے میں ختم کر دیتے ہیں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مگر اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کے مقابل پر تیرا دن بھی اس قسم کا ہوگا اور تیری راتیں بھی اس قسم کی ہونگی کہ ہر دیکھنے والے کے سامنے تیرے ساتھی ان دنوں اور ان راتوں کو پیش کر سکیں گے اور اُسے کہہ سکیں گے کہ بتاؤ کیا تمہارے دن محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے دنوں کی طرح ہیں اور کیا اس حالت میں دن گذارنے والے کو کبھی خدا تعالےٰ چھوڑ سکتا ہے یا اس سے ناراض ہو سکتا ہے؟ اسی طرح تیری راتیں ایسی گذریں گی کہ تم ہر شخص کے سامنے اپنی ان راتوں کو پیش کر کے کہہ سکوگے کہ میری راتوں کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا ایسی راتوں والے کو خدا تعالےٰ چھوڑ سکتا ہے؟ غرض فرمایا وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم تیرے دنوں کو ایسا کر دیں گے اور تیری راتوں کو بھی ایسا کر دیں گے کہ تیرا دن بھی اس بات کی شہادت دے گا کہ تجھے خدا نے نہیں چھوڑا اور تیری رات بھی اس بات کی شہادت دے گی کہ تیرا خدا تجھ سے ناراض نہیں ہے۔ یہ وہی دعوٰی ہے جو فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع ۲) میں کیا گیا ہے کہ میں تم میں ایک لمبی عمر گذار چکا ہوں کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ میں نے اس عرصہ میں کسی ایک بدی کا بھی ارتکاب کیا ہو۔ اگر تم سب کے سب مل جاؤ تب بھی میری چالیس سالہ ابتدائی زندگی پر کوئی داغ ثابت نہیں کر سکتے۔ مگر یہ دعوٰی تو گذری ہوئی عمر کے متعلق ہے اور وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ میں آئندہ زندگی کے متعلق دعوٰی کر دیا اور فرمایا کہ میرے دن تمہارے سامنے ہیں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا اور چوتھے کے بعد پانچواں دن تمہارے سامنے گذرے گا۔ اسی طرح میری راتیں بھی تمہارے سامنے ہوں گی اور ایک کے بعد دوسری رات گذرتی چلی جائے گی لیکن یاد رکھو میری زندگی کا ہر دن جو گذرے گا وہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ مَا وَدَّعَنِيْ رَبِّيْ وَمَا قَلَانِيْ۔ اسی طرح ہر رات جو مجھ پر گذرے گی وہ ثبوت ہوگی اس بات کا کہ مَا وَدَّعَنِيْ وَمَا قَلَانِيْ۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے تیسرے معنے

غرض خدا تعالیٰ اس آیت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی صداقت کی ایک نئی دلیل سکھاتا ہے اور فرماتا ہے میں یہ پیشگوئی کرتا ہوں کہ تیرا ہر دن میری رضامندی میں گذرے گا اور

تیری ہر رات میری رضامندی میں گذرے گی۔ تیری پہلی زندگی کے متعلق میں چیلنج کر چکا ہوں اب یہ دوسرا چیلنج آئندہ زندگی کے متعلق ہے۔ پچھلی زندگی کے متعلق تم کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اُس وقت سوچا نہیں تھا اگر غور کرتے تو ممکن تھا کوئی نقص نظر آ جاتا۔ فرماتا ہے اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُس زندگی کے متعلق تمہارا یہ عذر ہے تو اب دوسری زندگی پر کوئی اعتراض کر لینا اور دیکھنا کہ اس کی زندگی کی ایک ایک ساعت، ایک ایک رات اور ایک ایک دن اپنے فائدہ اور اپنے آرام کے لئے خرچ ہوتا ہے یا بنی نوع انسان کے فائدہ اور آرام کے لئے خرچ ہوتا ہے۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے چوتھے معنے

چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ قبض و بسط کی دونوں حالتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اچھی ہوں گی۔ اللہ تعالےٰ قابض بھی ہے اور باسط بھی، اور اُس کے اپنے بندوں سے یہ دونوں سلوک ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیوی معاملات میں کوئی آرام کی ساعت ہوتی ہے اور کوئی تکلیف کی۔ اسی طرح روحانی عالم میں کبھی کوئی ساعت ایسی آتی ہے جس میں انسان بہت زیادہ خدا تعالےٰ کے سامنے جھکا ہوا ہوتا ہے اور کبھی اُس پر قبض کی ساعت آ جاتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ ایک صحابی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آ کر رو پڑے۔ اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں تو منافق ہوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تو تم کو مومن سمجھتا ہوں وہ کہنے لگے یا رسول اللہ! مومن نہیں میں تو منافق ہوں جب میں آپکی مجلس میں بیٹھا ہُوا ہوتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف جنت ہے اور ایک طرف دوزخ۔ جو بھی خیال میرے دل میں گذرتا ہے یا جو بھی عمل میں کرتا ہوں جنت اور دوزخ کو دیکھ کر کرتا ہوں۔ مگر جب گھر جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں رہتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو عین ایمان ہے اگر خدا تعالےٰ ہر وقت ایک جیسی حالت رکھے تو تم مر نہ جاؤ۔ تو قبض و بسط کی حالت ہر انسان پر آتی ہے چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مدارج کے اختلاف کی وجہ سے ایک انسان کے قبض کی حالت دوسرے انسان کی قبض کی حالت سے جداگانہ ہو یا ایک انسان کی بسط کی حالت دوسرے انسان کی بسط کی حالت سے مختلف ہو لیکن بہرحال قبض اور بسط کی گھڑیاں ہر انسان پر آتی ہیں۔ ایک وقت وہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے دوسرے وقت وہ اپنے بیوی بچوں سے کھیل رہا ہوتا ہے تیسرے وقت وہ پاخانہ میں بیٹھا ہُوا ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ علیحدہ حالتیں ہیں جن میں سے ہر انسان گذرتا ہے۔ ان میں سے نماز اور روزہ بسط کی حالتیں ہیں اور بیوی بچوں سے کھیلنا یا پاخانہ میں جانا یا دنیا کے کسی اور کام میں مشغول ہو جانا یہ قبض کی حالتیں ہیں۔ بہت لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عبادت گذار بھی ہوتے ہیں، روزہ دار بھی ہوتے ہیں، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوتے ہیں، ذکر الٰہی بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نماز ہی پڑھتے ہیں، جب حج کرتے ہیں تو حج ہی کرتے ہیں، جب زکوٰۃ دیتے ہیں تو زکوٰۃ ہی دیتے ہیں مگر جب وہ روٹی کھاتے ہیں اُس وقت وہ صرف روٹی ہی کھا رہے ہوتے ہیں، جب وہ کپڑے پہنتے ہیں اُس وقت وہ صرف کپڑے ہی پہن رہے ہوتے ہیں، جب وہ بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوتے ہیں اُس وقت وہ صرف بیوی سے ہی باتیں کر رہے ہوتے ہیں، جب وہ بچوں سے تلعب کرتے ہیں اُس وقت بچوں سے ہی تلعب کر رہے ہوتے ہیں۔ اُنکی دنیا دنیا ہوتی ہے اور اُن کا دین دین ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالضُّحٰى ○ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ○ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ○ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تیری تو دنیا ہی نرالی ہے۔ تیری قبض کی حالت بھی خدا کے لئے ہوتی ہے اور تیری بسط کی حالت بھی خدا کے لئے ہوتی ہے۔ جب تو بیوی سے ہنس رہا ہوتا ہے اُس وقت تُو بیوی سے نہیں ہنستا بلکہ ہمارے حکم کی تعمیل کرتا ہے کیونکہ تُو کہتا ہے مَیں اپنی بیوی سے اس لئے ہنس رہا ہوں کہ میرا خدا کہتا ہے میں اپنی بیوی سے اس رنگ میں پیش آؤں جب تُو کھانا کھا رہا ہوتا ہے اُس وقت تُو صرف کھانا نہیں کھاتا بلکہ بسم اللہ سے شروع کرتا اور الحمد للہ پر ختم کرتا ہے اور درمیان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہتا ہے۔ جب تُو پانی پیتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ تُو دنیا دار لوگوں کی طرح صرف پانی پئے بلکہ تُو کہتا ہے میں یہ پانی اس لئے پی رہا ہوں کہ میرے رب نے یہ چیز میری طرف بھیجی ہے۔ بارش آتی ہے تو لوگ اُس سے کیسا لُطف اُٹھاتے ہیں

مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا کیفیت تھی ایک دفعہ بادل آیا آسمان سے ہلکی ہلکی بوندیں برسیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کمرہ سے باہر تشریف لائے زبان نکالی اُس پر بارش کا ایک قطرہ لیا اور فرمایا میرے رب کی طرف سے یہ تازہ نعمت آئی ہے۔ آپ نے لوگوں کو بھی یہی نصیحت کی کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا تم اپنی بیویوں سے حظ نہ اٹھاؤ، میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ کھاؤ نہیں، میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم پہنو نہیں۔ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ تم جو کچھ کرو احتساباً کرو۔ اس نیت اور ارادہ کے ماتحت کرو کہ اللہ تعالےٰ کی رضا تمہیں حاصل ہو جائے۔ اگر تم اپنے تمام کاموں میں اس نیت کو ہمیشہ مدنظر رکھو گے اور اللہ تعالےٰ کی رضاء کا حصول تمہارا اصل مقصد ہوگا تو میں تمہیں کہتا ہوں اس کے بعد اگر تم اپنی بیوی کے مُنہ میں احتساباً ایک لُقمہ بھی ڈالتے ہو تو فَهُوَ صَدَقَةٌ وہ بھی ایک صدقہ ہوگا۔ اب دیکھو وہ شخص لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُسے صدقہ قرار دیتے ہیں حالانکہ جس سے انسان کو محبت ہوتی ہے اُسے بہرحال وہ کھلاتا ہے وہ یہ تو پسند کر سکتا ہے کہ میں خود بھوکا رہوں مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ جس سے مجھے محبت ہے اُسے بھوک کی تکلیف ہو۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ اپنی بیوی کو کھلائے گا خدا تعالےٰ کے حضور یہ نہیں لکھا جائے گا کہ اُس نے اپنی بیوی کے مُنہ میں لقمہ ڈالا بلکہ خدا تعالےٰ کے حضور یہ لکھا جائیگا کہ اس نے ہماری رضا کی خاطر صدقہ کیا۔ اِسی طرح ملازموں سے معاملہ ہے، ہمسایوں سے معاملہ ہے، دوستوں سے معاملہ ہے۔ جب انسان ان تمام معاملات میں خدا تعالےٰ کی رضاء کو مدنظر رکھتا ہے اور اسکی خوشنودی کے حصول کے لئے وہ یہ سب کام کرتا ہے تو بظاہر یہ دنیوی نظر آنے والے کام بھی اُس کے لئے دین بن جاتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے حضور اُس کے یہ کام ایسے ہی سمجھے جاتے ہیں جیسے وہ عبادت میں اپنا وقت گذار رہا ہو۔ پس فرمایا وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیری بسط اور قبض کی حالتیں دونوں ہمارے لئے ہیں تُو بظاہر اپنی بیوی سے ہنس رہا ہوگا مگر دل میں ہمارے ساتھ پیار کر رہا ہوگا۔ تُو بظاہر اپنے بچوں سے پیار کر رہا ہوگا مگر دل میں ہمارے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہوگا۔ تُو بظاہر ہمسایوں کے ساتھ دلجوئی کی باتیں کر رہا ہوگا مگر اصل میں تیری باتیں ہمارے ساتھ ہو رہی ہوں گی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ تُو اُن کے پاس بیٹھا ہے حالانکہ تُو اُن کے پاس نہیں بلکہ ہمارے پاس بیٹھا ہوتا ہے جب تیرا ہر فعل ہمارے لئے ہے، جب تیری ہر حرکت اور ہر سکون ہمارے لئے ہے اور جب تُو دین اور دنیا دونوں راہوں سے خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کر رہا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم لَیل اور نَہار میں تجھے چھوڑ دیں؟ جب ہم نہ تیرے کھانے پر ناراض ہیں، نہ پینے پر ناراض ہیں، نہ معاشرت پر ناراض ہیں، نہ ہمسایوں سے تعلقات پر ناراض ہیں، نہ کسی اور کام پر ناراض ہیں، تو ہم تجھے چھوڑ کس طرح سکتے ہیں؟ یہ تو عبادتیں ہیں جو تُو ہماری خاطر بجالا رہا ہے ان عبادتوں پر ہم نے خفا کیا ہونا ہے ہم تو خوش ہی ہوں گے کہ تُو نے ہماری خاطر دنیا کو بھی دین بنا لیا۔ غرض چوتھے معنے اِس آیت کے یہ ہیں کہ قبض و بسط کی حالتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اچھی ہوں گی یعنی جب آپ عبادت میں مشغول ہونگے تو ہونگے ہی جب آپ دنیوی کام کریں گے جو بمنزلہ لَیل ہوتے ہیں تب بھی آپ خدا تعالےٰ کی خوشنودی ہی مدنظر رکھیں گے اور دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ اللہ تعالےٰ آپ سے رات دن جدا نہیں ہوتا اور نہ آپ کے کسی فعل سے ناراض ہوتا ہے۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے پانچویں معنے

پانچویں معنے اِس آیت کے یہ ہیں کہ دن کام کا وقت ہوتا ہے اور رات انسان کے آرام کا وقت ہوتا ہے فرماتا ہے وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ ہم تیرے دنوں کو پیش کرتے ہیں جب تُو تبلیغ میں مصروف ہوتا ہے اور تیری راتوں کو پیش کرتے ہیں جب تُو مکالمۂ الٰہی میں مشغول ہوتا ہے۔ تیرا دن خدا کے اس فعل کا ثبوت ہے کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ۔ تیرے رب نے تجھے چھوڑا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ ع ۱۰) چنانچہ دیکھ لو دن کے وقت آپ کی تبلیغ اور نشست و برخاست کن لوگوں میں تھی، کفارِ مکہ میں جو ہر وقت آپکو مارنے کی فکر میں رہتے تھے مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تیرا دن اس بات کی شہادت دے گا کہ ہم تیرے ساتھ ہیں ورنہ دشمن جو ہر وقت تیرے پاس رہتا ہے اُسے کونسی چیز تجھے ہلاک کرنے سے روک سکتی ہے۔

اُس کی سب سے بڑی خواہش تو یہی ہے کہ تجھے ہلاک کر دے مگر باوجود اس خواہش اور ارادہ کے اور باوجود اس بات کے کہ دن کو تم انہی لوگوں کے ساتھ رہتے ہو وہ تمہیں قتل نہیں کر سکتے۔ پس تیرا دن اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ خدا تیرے ساتھ ہے اور تیری رات ثبوت ہوتی ہے اس بات کا کہ وَ مَا قَلٰی۔ خدا تجھ سے ناراض نہیں۔ دن کو لوگ تجھ پر اپنے غیظ و غضب اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک آتا ہے تجھے فریبی کہتا ہے، دوسرا آتا ہے تو تجھے دھوکے باز کہہ دیتا ہے، تیسرا آتا ہے تو تجھے عزت کا خواہشمند کہہ کر چلا جاتا ہے۔ غرض ہزاروں قسم کی گالیاں اور ہزاروں قسم کے الزامات ہیں جو تجھے دشمنوں سے سننے پڑتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دن اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہم تیرے ساتھ ہیں۔ دن کو لوگ تجھے اپنی دشمنی کی وجہ سے ہلاک کر سکتے ہیں مگر چونکہ ہم تمہارے ساتھ ہوتے ہیں وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ گالیاں دیتے ہیں، وہ تجھے بُرا بھلا کہتے ہیں، وہ تیرے ہلاک کرنے کے لئے کئی قسم کے منصوبے کرتے ہیں مگر اپنی تمام کوششوں میں ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھتے ہیں اور اس طرح دن کی ایک ایک گھڑی تیری صداقت اور راستبازی کا دنیا میں اعلان کر رہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب سارے دن کی گالیاں سُن کر رات آتی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ میں کیا کروں مجھ سے تو ساری دنیا ناراض ہے اُس وقت ہم تجھے تسلّی دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو تجھ سے ناراض نہیں۔ دنیا اگر ناراض ہے تو بیشک ہو۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ الخ کے چھٹے معنے

میں نے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک نوٹ بک دیکھی۔ آپ کا معمول تھا کہ جب کوئی پاک جذبہ آپ کے دل میں اُٹھتا آپ اُسے لکھ لیتے۔ اس نوٹ بک میں آپ نے ایک جگہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔

"او میرے مولیٰ۔ میرے پیارے مالک۔ میرے محبوب۔ میرے معشوق خدا! دنیا کہتی ہے تُو کافر ہے مگر کیا تجھ سے پیارا مجھے کوئی اور مل سکتا ہے؟ اگر ہو تو اُس کی خاطر تجھے چھوڑ دوں۔ لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ جب لوگ دنیا سے غافل ہو جاتے ہیں جب میرے دوستوں اور دشمنوں کو علم تک نہیں ہوتا کہ میں کس حال میں ہوں اُس وقت تُو مجھے جگاتا ہے اور محبت سے پیار سے فرماتا ہے کہ غم نہ کھا میں تیرے ساتھ ہوں تو پھر اے میرے مولیٰ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس احسان کے ہوتے ہوئے پھر میں تجھے چھوڑ دوں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔" (بدر مورخہ ۱۱ رجنوری ۱۹۱۲ء صفحہ ۶)

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى میں بیان فرمایا ہے کہ دن ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ میں تیرے ساتھ ہوں دشمن تیری طرف اپنا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ اور رات ثبوت ہوتی ہے اس بات کا کہ میں تجھ سے ناراض نہیں۔ تُو دن کے وقت دشمن کے منہ سے کئی قسم کی ناراضگی کی باتیں سُنتا ہے اور تیرا دل سخت غمزدہ ہوتا مگر جب رات آتی ہے تو ہم تجھ سے کہتے ہیں تُو دشمن کی ان گالیوں سے مت گھبرا ہم تجھ سے خوش ہیں۔ پس دن کی حفاظت اور رات کا مکالمہ الٰہی دونوں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔

چھٹے معنے یہ ہیں کہ ایک روحانی قبض و بسط کا وقت بھی ہر انسان پر آیا کرتا ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں میں نے خالص دینی اور جسمانی کاموں کے متعلق قبض و بسط کی کیفیات کا ذکر کیا تھا وہاں ایک وقت انسان کی حالت پر ایسا بھی آتا ہے جب اُس کی رُوحانی حالت پر قبض کی حالت طاری ہو جاتی ہے اس میں بھی چھوٹے اور بڑے سب یکساں ہیں اور سارے انسانوں پر ہی یہ قبض و بسط کا دَور آتا ہے اس دَور کا آنا بھی انسانی ترقیات کیلئے ضروری ہُوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ جیسے بعض روحانی دَور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اس رنگ میں آئے کہ وحی کا نزول کچھ دنوں کے لئے بند ہو گیا جو رُوحانی طور پر ایک وقفہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا۔ اسی طرح فرماتا ہے وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ ہم اُن وقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیرے لئے ضُحٰی کا رنگ رکھتے ہیں اور ہم اُن وقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیرے لئے لَیل کا رنگ رکھتے ہیں۔ یعنی تیری روحانی حالت پر ہمیشہ ضُحٰی کی کیفیت نہیں رہے گی بلکہ کبھی کبھی رات کی تاریکی کی سی حالت بھی آئے گی مثلاً کبھی نزولِ وحی میں روک پیدا ہو جائے گی یا قلب میں وہ بلندی نہیں ہو گی جو دوسرے وقتوں میں تجھے نظر آئے گی۔ مگر تیرے قلب کی یہ کیفیت دوسرے لوگوں

سے بالکل مختلف ہوگی۔ اور لوگوں کے دلوں میں جب قبض آتی ہے تو
وُہ خدا تعالےٰ سے دُور جا پڑتے ہیں مگر فرمایا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ
وَمَا قَلٰى۔ تیری ضحٰی کی حالت بھی خدا کو پیاری ہوگی اور تیری
لیل کی حالت بھی خدا کو پیاری ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر چیزیں پائی جاتی ہیں وُہ سب لہروں میں
چلتی ہیں۔ پہاڑ ہیں تو وہ لہروں میں چلتے ہیں۔ دریا ہیں تو وہ لہروں میں
چلتے ہیں۔ ہوائیں ہیں تو وہ لہروں میں چلتی ہیں۔ بجلیاں ہیں تو وہ لہروں میں
چلتی ہیں، غرض ہر چیز اپنے اندر لہریں رکھتی ہے۔ جس طرح مادیات
میں لہروں کا قانون جاری ہے اسی طرح روحانیات میں بھی مختلف
لہریں چلتی رہتی ہیں لیکن بعض لہریں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن لہروں
کی جو ادنیٰ حالت ہوتی ہے وہ بھی کفر کی ہوتی ہے اور جو اعلیٰ
حالت ہوتی ہے وہ بھی کفر کی ہوتی ہے۔ اگر ان لہروں میں کبھی
انسان پر خشیت بھی طاری ہوتی ہے تو وہ ایسی نہیں ہوتی جو ایمان
کی علامت ہو۔ اس کے مقابل میں بعض لہریں ایسی ہوتی ہیں کہ
اُن کی ادنیٰ حالت کفر کی ہوتی ہے اور اعلیٰ حالت ایمان کی ہوتی
ہے اور بعض ایسی روحانی حالتیں ہوتی ہیں کہ ادنیٰ حالت گو کفر کی
نہیں ہوتی مگر خدا تعالےٰ کی معیت کی بھی نہیں ہوتی۔ یعنی گو وہ ادنیٰ
حالت خدا تعالےٰ کی ناراضگی والی نہ ہو مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ
ایسے شخص کو خدا تعالےٰ کی معیت حاصل ہے۔ ایک حالت عدم
معیت کی ہوتی ہے اور ایک حالت حصولِ معیت کی ہوتی ہے یہ
الگ الگ مقام ہیں جو روحانی درجات کے حصول کے وقت پیش
آتے ہیں۔ ایسے شخص کی ادنیٰ حالت کو دیکھ کر ہم یہ نہیں کہیں گے
کہ اُسے خدا تعالےٰ کی مقبولیت حاصل ہے گو ہم یہ بھی نہیں کہیں گے
کہ خدا تعالےٰ نے اُسے چھوڑا ہوا ہے ہاں اُس کی اعلیٰ حالت بے شک
خدا تعالےٰ کی معیت کا ثبوت ہوتی ہے۔ لیکن ایک مقام وہ ہے
کہ جب انسان نیچے آئے تب بھی اُسے خدا تعالےٰ کی معیت حاصل ہوتی
ہے اور جب اونچا چلا جائے تب بھی اُسے خدا تعالےٰ کی معیت حاصل
ہوتی ہے پس فرماتا ہے وَالضُّحٰى وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰى۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
روحانی لہروں میں تیرے لئے وہ وقت بھی آتا ہے جو ضحٰی کا ہوتا ہے اور
جب تو کلی طور پر خدا کے سامنے ہوتا ہے اور تیرے لئے وہ وقت بھی
آتا ہے جب تجھ پر قبض طاری ہوتی ہے مگر مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ
مَا قَلٰى۔ تیری قبض کی حالت بھی خدا کی معیت کے ماتحت ہوگی اور
تیری بسط کی حالت بھی خدا کی معیت کے ماتحت ہوگی۔ صرف معیت
کے مدارج میں فرق ہوگا یہ نہیں ہوگا کہ خدا تعالےٰ کی معیت کا مقام
جو تجھے حاصل ہے وہ کسی حالت میں جاتا رہے۔ تیری دونوں حالتیں
خواہ وہ قبض کی ہوں یا بسط کی خدا کی معیت اور اُس کی خوشنودی
کا ثبوت ہوں گی۔ صرف کمی بیشی کا فرق ہوگا مگر یہ نہیں ہوگا کہ معیت
جاتی رہے۔ یہ وہی مقام ہے جسے صوفیاء نے اِن الفاظ میں بیان
فرمایا ہے کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ
دراصل اس مقام کو کھول کر بیان کرنا سخت مشکل ہوتا ہے یہی وجہ ہے
کہ صوفیاء نے بجائے کھلے طور پر اس کا ذکر کرنے کے اشاروں اشاروں
میں ہی بیان کر دیا کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ
یعنی وہ مقام جو ابرار کے لئے بسط کا ہوتا ہے اور جسے وہ حصولِ عرفان
کا بلند ترین درجہ سمجھتے ہیں وہ مقربین کے لئے قبض کا مقام ہوتا
ہے۔ انہوں نے بھی اشاروں میں یہ بات بیان کی ہے اور میں بھی
اس بات پر مجبور ہوں کہ اشاروں تک اس بات کو محدود رکھوں۔
حقیقت میں یہ روحانی لہریں ہوتی ہیں جو کبھی اونچی چلی جاتی ہیں اور
کبھی نیچے کی طرف آجاتی ہیں۔ اُن کے لئے اس بات کو بیان کرنا
مشکل تھا اور میرے لئے نسبتاً آسانی ہے کیونکہ لہروں کے علم نے
اس مسئلہ کے سمجھنے میں بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔ بہرحال
اللہ تعالےٰ اس آیت میں یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ محمدی مقام کی
نچلی لہریں بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کا ثبوت ہیں اور
محمدی مقام کی اونچی لہریں بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى
کے ماتحت ہیں۔ دونوں حالتوں میں خدا تعالےٰ کی معیت آپ کے
شاملِ حال رہے گی اور کبھی کوئی مقام خدا تعالےٰ کی ناراضگی یا اُس
کی ناپسندیدگی کا نہیں آئے گا جس طرح پرندہ اُڑتا ہے تو ایک
جھٹکا کھاتا ہے اور بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ نیچے ہوا ہے حالانکہ وہ
اڑان کا ایک حصہ ہے اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے
اللہ تعالےٰ کی صفت قبض اس طرح ظاہر ہوگی کہ ہر قبض کی حالت
بسط کا موجب بنے گی اور اُوپر اٹھانے کا ذریعہ ہوگی۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے ساتویں معنے

ساتویں معنے وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے یہ ہیں کہ ہر نبی کی دو زندگیاں ہوتی ہیں ایک اُس کی فردی زندگی ہوتی ہے اور ایک اُس کے سلسلہ کی زندگی ہوتی ہے۔ فردی زندگی کے لحاظ سے اگر اس آیت کے مضمون کو لیا جائے تو ضُحٰی اور لَیْل دونوں زمانے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حیات کے ساتھ تعلق رکھیں گے لیکن جب اِس آیت کو آپ کی قومی زندگی پر چسپاں کیا جائے گا تو ضحٰی اور لیل سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد کے وہ دَور مراد ہوں گے جو اُمّتِ محمدیہ پر آنیوالے تھے۔ اللہ تعالےٰ اس آیت میں اِسی جماعتی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ ہم اُس وقت کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیری قومی اور جماعتی زندگی کیلئے ضحٰی کی حیثیت رکھتا ہوگا اور ہم اُس وقت کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیری قومی اور جماعتی زندگی کے لئے لَیل کا مصداق ہوگا۔ دنیا میں ہر قوم پر ترقی اور تنزل کے مختلف دَور آتے ہیں کبھی اقبال اور فتحمندی اس کے شاملِ حال ہوتی ہے اور کبھی ادبار اور ناکامی کی گھٹائیں اُس پر چھائی ہوتی ہیں بالعموم قومیں ترقی کر کے جب تنزّل کی طرف جاتی ہیں تو ہمیشہ کے لئے تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا جو زمانۂ نبوت ہے یعنی آپ کے دعویٰ سے لے کر قیامت تک کا زمانہ یہ دَورِ تنزل سے بالکل محفوظ رہے گا۔ ضحٰی کی روشنی یکساں جلوہ گر رہے گی کبھی لوگ خدا سے دُور نہیں ہوں گے اور ادبار یا گمراہی کا زمانہ امتِ محمدیہ پر نہیں آئے گا بلکہ ہم مانتے ہیں کہ ضُحٰی کی حالتیں بھی اُمّتِ محمدیہ پر آئیں گی اور وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کی حالت بھی رُونما ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی قومی حیات کے متعلق ہم ایک وعدہ کرتے ہیں جو دنیا کی اور کسی قوم کے ساتھ ہم نے نہیں کیا کہ اُس کی ضُحٰی بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کے ماتحت ہوگی اور اُس کی لَیل بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کا ثبوت ہوگی۔

جہاں تک ماننے والوں کا تعلق ہے بے شک انکی مختلف حالتوں کے لحاظ سے کبھی اُن پر ضُحٰی کی گھڑیاں آئیں گی اور کبھی لَیل کی تاریکی اُن پر چھا جائے گی مگر جہاں تک شریعتِ محمدیہ کا اور لوگوں کے خدا تعالےٰ سے تعلق کا تسلسل ہے اُس کے لحاظ سے کوئی دَور ایسا نہیں ہوگا جو مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کے ماتحت نہ ہو۔ قوم پر بے شک تنزّل آ جائے گا، لوگ بے شک گر جائینگے کامیابی اور اقبال کی درخشندہ ساعات بے شک لَیل کی شکل میں بدل جائیں گی۔ مگر جتنا حصہ محمدیت کا زندہ رہنا ضروری ہے وہ خدا تعالےٰ کی خوشنودی اور اُس کی معیّت کے ماتحت قائم رہیگا۔ اِس میں درحقیقت اِس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جہاں دوسری اقوام خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر ترقی کر جاتی ہیں وہاں تیری قوم سے ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ تیری قوم پر جب بھی ضُحٰی کا دَور آئے گا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ کے ماتحت آئے گا۔ خدا سے الگ ہو کر دوسری قوموں کی طرح مسلمان کبھی بڑی ترقی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ تمام دوسری اقوام جن میں اللہ تعالےٰ کے انبیاء مبعوث ہوئے تھے جب اُن پر روحانی تنزّل کا زمانہ آیا تو باوجود اس کے کہ انہوں نے خدا تعالےٰ کو چھوڑا ہُوا تھا وہ دنیوی لحاظ سے ترقی کر گئیں مگر فرماتا ہے تیری قوم سے ایسا نہیں ہوگا بلکہ اُس پر جب بھی ضُحٰی کا وقت آئے گا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کے ماتحت آئے گا۔ اور جب کبھی اللہ تعالیٰ اُن کو دنیوی ترقی نصیب کرے گا اُس کے ساتھ ہی اُن کا دین بھی درست ہوگا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اُن پر ضُحٰی کا وقت ایسی حالت میں آ جائے جب خدا تعالےٰ نے اُن کو چھوڑا ہُوا ہو یا اُن کی دینی اور اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو۔ عیسائیوں کو دیکھ لو اُن پر دنیوی ترقی کا دَور بے شک آیا مگر کس وقت؟ جب عملی لحاظ سے عیسائیت بالکل مر چکی تھی۔ تین سو سال کے بعد جب عیسائی روحانی لحاظ سے سخت کمزور ہو چکے تھے اور اُن میں حضرت مسیحؑ کی تعلیم کے خلاف کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں اُس وقت اُن پر دنیوی ضُحٰی کا زمانہ آیا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیری اُمّت کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا مسلمانوں پر ضُحٰی کا دَور اُسی وقت آئیگا جب خدا تعالےٰ سے اُن کا تعلق ہوگا۔ اگر خدا تعالےٰ سے اُن کا تعلق اپنی بداعمالی کی وجہ سے کٹ چکا ہوگا تو ضُحٰی کا دَور بھی اُن پر کبھی نہیں آئے گا۔ ضُحٰی کا دَور اُسی وقت آئے گا جب عملی طور پر وہ خدا سے تعلق رکھ رہے ہونگے چنانچہ دیکھ لو خلافتِ راشدہ کا زمانہ جو اسلام کی ترقی

کا زمانہ تھا اُس وقت یہ دونوں باتیں موجود تھیں ایک طرف روحانیت کا غلبہ موجود تھا اور دوسری طرف دنیوی ضحیٰ کا دور جاری تھا مگر موجودہ زمانہ میں جب تنزّل کا دَور آیا تو باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے ایک ایک کرکے وہ تمام تدابیر اختیار کیں جو مختلف اقوام اپنی ترقی کیلئے اختیار کرتی ہیں پھر بھی وہ ضحیٰ کا دَور واپس نہ لا سکے۔ مسلمانوں نے کہا غیر قومیں سُود کی وجہ سے ترقی کر گئی ہیں آؤ ہم بھی سُود لینا شروع کر دیں تاکہ ہم بھی ترقی کی اس دوڑ میں حصہ لے سکیں۔ انہوں نے سُود لیا مگر جہاں دوسری اقوام سود کی وجہ سے ترقی کر گئیں وہاں مسلمان سود لینے کے باوجود تنزّل اور ادبار میں گرتے چلے گئے۔ پھر مسلمانوں نے کہا دنیا میں تعلیم سے ترقی ہوتی ہے آؤ ہم بھی تعلیم کی طرف توجہ کریں چنانچہ انہوں نے بڑے زور سے اپنی تعلیمی حالت کو درست کرنا شروع کر دیا مگر جہاں دوسری اقوام تعلیم کی طرف توجہ کرنے کے نتیجہ میں ترقی کر گئیں وہاں مسلمان تعلیم میں حصہ لینے کے باوجود گرتے چلے گئے۔ پھر مسلمانوں نے کہا تجارت میں حصہ لینے سے ترقی ہُوا کرتی ہے آؤ ہم تجارتوں کی طرف توجہ کریں تاکہ ہم غیر قوموں کی طرح دنیا پر غالب آ سکیں چنانچہ انہوں نے تجارتوں کی طرف توجہ کی مگر جہاں دوسری اقوام تجارت سے دنیا پر غالب آ گئیں وہاں مسلمان تجارت میں حصہ لینے کے باوجود ذلیل سے ذلیل تر ہوتے چلے گئے۔ غرض مسلمانوں نے اپنا پورا زور اس غرض کے لئے صرف کر دیا کہ وہ کسی طرح ترقی کریں مگر ایک چیز بھی اُن کو آگے بڑھانے کا موجب نہ بن سکی حالانکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے غیر اقوام ترقی کر رہی ہیں۔ پس دنیا میں جس قدر قومیں پائی جاتی ہیں وہ مذہب کو چھوڑنے کے بعد بھی ترقی کر جاتی ہیں مگر مسلمانوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ اُن پر ضحیٰ کا دَور ہمیشہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کے ماتحت آئے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیں اور خدا تعالیٰ اُن کو چھوڑ دے اور پھر بھی غیر قوموں کی طرح ترقی کر جائیں۔ اِس کی ایک مادی وجہ ہے اور ایک روحانی۔ مادی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے مذاہب کی تعلیمات سوائے یہود کے اُس طرح کی تفصیلی نہیں جس طرح اسلام کی تعلیم اپنے اندر تفصیل رکھتی ہے اس لئے اُن کو چھوڑ کر بھی اقوام ترقی کر جاتی ہیں کیونکہ ذہنی کشمکش کوئی نہیں ہوتی وہ جو حالت بھی اختیار کرتی ہیں اُسی کا نام اپنا مذہب رکھ لیتی ہیں۔ جیسے مسیحیت ہے یا ہندومت ہے لیکن اسلام کی تعلیم تفصیلی اور محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی اسے چھوڑ کر جب بھی مسلمان آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے اُن کے دماغ میں ایک ذہنی کشمکش شروع ہو جائے گی جو اطمینانِ قلب کو دُور کر دیتی ہے اور یا تو مذہب سے دست بردار کر دا دیتی ہے یا ترقی سے روک دیتی ہے۔

روحانی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم کو بغیر مذہب کے خدا تعالیٰ ترقی کرنے دے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس قوم کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسا کوڑا نہیں رہتا جو اس قوم کی تنبیہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ قوموں کو مذہب کے بغیر بھی دنیوی ترقی دے دی کیونکہ خدا تعالیٰ اُن قوموں کو چھوڑ چکا تھا۔ مگر فرماتا ہے اے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے چونکہ تجھے کبھی نہیں چھوڑنا اس لئے ہم تیری قوم کو بھی کبھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ بغیر مذہب کی درستی کے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ اگر ہم مذہب کے بغیر ہی اُن کو ترقی دیدیں تو وہ غلطی سے یہ سمجھ لیں گے کہ خدا تعالیٰ ہم سے خوش ہے اور وہ دین سے اَور بھی دُور جا پڑیں گے۔ اس لئے ہم دین سے غفلت کی حالت میں کبھی اُن پر ضحیٰ نہیں لائیں گے۔ بلکہ جب بھی وہ دین سے غافل ہوں گے اور لَیل کی حالت اُن پر وارد ہوگی ہم انہیں سزا دیں گے کیونکہ اگر ہم سزا نہ دیں تو اس میں اُن کی موت ہے۔ پس فرمایا مسلمان جب تک دین پر عمل پیرا رہیں گے ہم اُن کے ساتھ رہیں گے اور انہیں دنیوی ترقیات سے بھی حصہ دیں گے مگر جب وہ ہمیں چھوڑ دیں گے ہم بھی اُن کو چھوڑ دیں گے اور اُن کو اُن کی بداعمالی کی سزا دیں گے۔ مگر اس لئے نہیں کہ اُن پر موت آئے بلکہ اس لئے کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہ پھر تیری طرف واپس آئیں اور تیرے دین کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔ گویا دونوں حالتوں میں ہمارا اُن کے ساتھ معاملہ محض اس لئے ہوگا کہ وہ تیرے دامن سے وابستہ رہیں اور کبھی ایک آن اور ایک لمحہ کیلئے بھی اُسے چھوڑنے کا خیال نہ کریں۔ جب وہ ترقی کرینگے ایسی حالت میں کرینگے کہ تُو اُنکے ساتھ ہوگا۔ اور

جب تو اُن کے ساتھ نہیں ہوگا ہم انہیں سرزنش کریں گے تا کہ روشنی اور ضحیٰ والا دَور پھر واپس آجائے گویا تاریکی اور تنزل کی گھڑیوں میں بھی ہمارا اُن کے ساتھ ایسا سلوک ہوگا جو مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ثبوت ہوگا۔ ہم انہیں سرزنش اور تنبیہ کریں گے تا کہ وہ اپنی حالت کو بدل لیں اور جب اس تنبیہ کے بعد قوم تیری طرف واپس لَوٹے گی پھر تیرے انوار اور برکات کا دنیا میں ظہور شروع ہو جائیگا گویا ضحیٰ کے وقت بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کا ظہور ہوگا اور لَیل کے وقت بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کا ظہور ہوگا۔ ضحیٰ کے وقت اس طرح کہ جب کبھی وہ ترقی کریں گے اسلام کا نور دنیا کو نظر آنے لگ جائے گا اور لیل کے وقت اِس طرح کہ جب اُن میں تنزل واقعہ ہوگا خدا تعالےٰ کوڑے مار مار کر تیری طرف واپس لائے گا یا خدا تعالےٰ کوئی روحانی سلسلہ ایسا پھر قائم کر دے گا جو تیرے جلال اور جمال کو دنیا پر ظاہر کرنیوالا ہوگا۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ الخ کے نویں معنے

غرض روحانی طور پر چونکہ اسلام آخری مذہب ہے اِس لئے اللہ تعالےٰ کی خاص تقدیر مسلمانوں کو بغیر اسلام کے ترقی کرنے نہیں دیتیں تا کہ وہ مطمئن ہو کر دین سے غافل اور بے پروا نہ ہو جائیں۔ اور یہی مضمون وَالضُّحٰى اور مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى میں بیان کیا ہے کہ اسلامی ترقی اور الٰہی قرب ہمیشہ قدم بقدم بڑھیں گے۔ الٰہی قرب اور معیّت اور رضاء کے بغیر اُمّتِ مسلمہ کو ترقی نہیں ہوگی جب بھی مسلمان دین کو چھوڑ دیں گے ترقیاتِ دنیویہ سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ الخ کے آٹھویں معنے

آٹھویں معنے وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے یہ ہیں کہ اسلام پر تنزل کا زمانہ بھی آئے گا مگر وہ دائمی نہ ہوگا اور مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کا ایک ثبوت ہوگا یعنی پھر وہ زمانہ اچھے زمانے سے بدل جائے گا یعنی ہر تاریکی کے بعد روشنی کا زمانہ آتا رہیگا تاریکی کے زمانہ میں معیّت اور رضاء الٰہی کی یہی دلیل ہوتی ہے کہ وہ جاتی رہے پس رات کے زمانہ میں بھی خدا تعالےٰ کے راضی رہنے کے یہی معنے ہیں کہ خدا تعالےٰ پھر اسلام کی تازگی کے سامان پیدا کر دیگا پھر اللہ تعالےٰ اپنا کوئی مامور لوگوں کی اصلاح کے لئے کھڑا کر دیگا۔ مسلمان اپنی کوششوں سے مایوس ہو کر اُس کی طرف آئیں گے اور چونکہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہوگا اِس لئے اُس کی طرف آنا تیری طرف واپس آنا ہوگا۔

نویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ شریعت اسلامیہ ترقی اور تنزل دونوں زمانوں میں محفوظ رہے گی۔ قومیں شریعتوں کو دونوں زمانوں میں بدل دیتی ہیں بعض تنزل کے زمانہ میں اپنی غفلت سے بدلنے دیتی ہیں اور بعض ترقی کے زمانہ میں اپنی اغراض کے لئے بدل دیتی ہیں لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ پہلی جماعتوں کی یہ کیفیت رہی ہے کہ یا تو ضحیٰ اور ترقی کے زمانہ میں جب وہ عیاشی میں مبتلا ہو گئیں انہوں نے شریعت کے اُن احکام کو بدل ڈالا جو اُن کی خواہشات میں حائل تھے۔ جیسے عیسائیت میں جب حکومت آئی اور غالب قوم نے کہا کہ ہفتہ کی بجائے اتوار عبادت کا دن مقرر کر دیا جائے کیونکہ ہمیں اس میں سہولت ہے تو عیسائیوں نے فوراً اس کو بدل دیا اور ہفتہ کی بجائے اتوار کا دن عبادت کے لئے مقرر کر دیا۔ یا اُس قوم کے افراد نے جب کہا کہ کفر کی حالت میں ہم اپنی عید فلاں فلاں دنوں میں منایا کرتے تھے عیسائیت میں بھی وہی دن مقرر ہونے چاہئیں تو عیسائیوں نے اس کو بھی مان لیا اور عیسوی احکام کو بدل ڈالا۔ اور یا پھر شریعت کے احکام تنزل کے زمانہ میں بدلے جاتے ہیں جب قوم میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے اور شرعی احکام کی عظمت اُس کی نگاہ سے زائل ہو جاتی ہے۔ غرض دو اوقات میں ہی شریعتیں بدلی جاتی ہیں کبھی ضحیٰ کے وقت شریعتیں بدلی جاتی ہیں اور کبھی لَیل کے وقت۔ ضحیٰ کے وقت عیاشی کے لئے احکام شرعیہ کو قومیں بدل دیتی ہیں اور لیل کے وقت یا تو دشمن اُن کی کتابوں کو جلا دیتے ہیں اور یا اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ خود ہی اُس کی حفاظت کا فرض سرانجام نہیں دے سکتیں۔ جیسے بخت نصر جب یہود کو جلا وطن کر کے لے گیا تو وہ یہودی قوم کے لئے لیل کا وقت تھا۔ جب وہ واپس اپنے وطن میں آئے تو اُن کی کتاب تورات غائب تھی چنانچہ اُسوقت عزرا نبی نے مع چند احبار کے تورات کو اکٹھا کیا مگر بہر حال وہ ویسی نہیں تھی جیسی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ غرض شرائع دو زمانوں میں بدلی جاتی ہیں یا ترقی کے زمانہ میں یا تنزل کے زمانہ میں۔ ترقی کے

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝

اور (دیکھ تو سہی کہ) تیری ہر پیچھے آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہوتی ہے ۵۳

زمانہ میں قوم شریعت کو اس لئے بدلتی ہے تاکہ وہ عیاشی میں حصہ لے سکے اور تنزل کے زمانہ میں قوم کی غفلت اور کوتاہی سے شرعی احکام بدلے جاتے ہیں یا دشمن شریعت کی کتابوں کو جلا دیتا ہے تاکہ یگانگت اور اتحاد کی روح قوم میں سے مٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ اس امر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ دونوں حالتیں تیری قوم پر نہیں آئیں گی اور ترقی اور تنزل دونوں دَور میں ہم تیرے ساتھ رہیں گے اور تیرے کام کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو آخر ایک دن فوت ہونے والے تھے صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب تھی جو قیامت تک موجود رہنے والی تھی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ خواہ تیری قوم پر ترقی کے اوقات آئیں یا تنزل کی گھڑیاں آئیں ہم اس کلام کو جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے کبھی بدلنے نہیں دیں گے اور ہمیشہ اس کی حفاظت کریں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ محض قومی تنزل کوئی حقیقت نہیں رکھتا وہ تنزل تو افراد کی خرابی پر دلالت کرتا ہے اگر کوئی قوم تنزل کے بعد ترقی کر جائے تو پھر اُس کی گذشتہ ناکامیوں کا داغ دُھل سکتا ہے لیکن اگر شریعت بدل جائے اور قوم ترقی کر جائے تو اُس ترقی کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ پس جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ محض قومی تنزل نہیں یا لوگوں کی حالت کا بدل جانا نہیں بلکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز رسول کا بدل جانا ہے یعنی اس کی تعلیم کا بدل جانا اور اُس کے کلام کا خراب ہو جانا۔ سو اس کی حفاظت کا اللہ تعالےٰ ان آیات میں وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ترقی اور تنزل دونوں دَور میں ہم اس کلام کی حفاظت کریں گے جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے۔

۵۳ تفسیر۔ بہت سے ترقی کرنے والے یکدم بڑھتے ہیں مگر آخر ٹھوکر کھاتے اور گر جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو ہٹلر نپولین۔ تیمور اور سکندر سب ایسے ہیں جو دنیا میں بڑھے اور انہوں نے ترقی کی مگر آخر ناکامی پر اُن کا خاتمہ ہوا۔ اسی طرح اور کئی بڑے بڑے لوگ دنیا میں گذرے ہیں جنہوں نے حیرت انگیز ترقیات کیں مگر آخر وہ گر گئے اور اُن کی تمام شہرت اور ناموری جاتی رہی۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بڑے ذہین ہوتے ہیں مگر آخر میں پاگل ہو جاتے ہیں یا اپنی ذہانت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد لاہور میں رہتے تھے بڑے ذہین اور قابل آدمی تھے بہت بڑی علمیت کے مالک تھے مگر آخر میں اُن کے دماغ میں نقص واقعہ ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ وہ بازار میں سے گذرتے تو لوگ اکٹھے ہو جاتے اور جب اُن سے کوئی بات کرتا تو وہ اُسے گالیاں دینے لگ جاتے۔ عالم ہوتے ہیں مگر آخر میں جاہل ہو جاتے ہیں، اُن کا حافظہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ علم جو انہوں نے سیکھا ہوتا ہے سب بھول جاتا ہے بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبوب ہوتے ہیں مگر آخر وہ متروک ہو جاتے ہیں بلکہ جس قدر جسمانی محبوب ہوتے ہیں اُن سب کا یہی حشر ہوتا ہے۔ جوانی میں ہر شخص اُن کی طرف دیکھتا ہے مگر جب اُن کے دانت گر جاتے ہیں، جب اُن کی کمر جھک جاتی ہے، جب اُن کے چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ تو بدصورت سے بدصورت انسان بھی اُنکو دیکھ کر ہنستا ہے اور کہتا ہے یہ کیسا بدشکل انسان ہے۔

فرانس کا ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک شخص نے فرانس کی ایک بڑھیا عورت کو دیکھا تو اس کی شکل وصورت اور رفتار کو دیکھکر سخت کراہت کا اظہار کیا وہ اُسے اپنے ساتھ لے گئی اور اُسے ایک تصویر دکھا کر کہا کہ جانتے ہو یہ کس کی تصویر ہے؟ وہ کہنے لگا ہاں میں جانتا ہوں یہ فلاں حسین عورت کی تصویر ہے میری ماں اس کی سہیلی تھی اور یہ عورت اتنی حسین اور خوبصورت تھی کہ سارا پیرس اس پر شیدا تھا۔ جب وہ یہ بات کہہ چکا تو عورت کہنے لگی یہ میری ہی تصویر ہے۔ تو کئی محبوب ہوتے ہیں مگر آخر میں مبغوض ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ہمارے رسول! تیرا یہ حال نہیں ہوگا۔ تجھ کو جو ترقیات ملیں گی وہ ہر قدم پر بڑھتی چلی جائینگی۔

پہلے مدینہ کا گرد و نواح صاف ہوا ، پھر مکہ فتح ہوا ، پھر سارا عرب پھر شام اور عراق اور مصر فتح ہوئے۔ غرض ہر قدم آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ مکہ تو آپ کے ہاتھوں پر فتح ہوا تھا مگر عراق اور مصر وغیرہ تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد فتح ہوئے ہیں اِس لئے شاید غلطی سے یہ نام لے لئے گئے ہیں مگر یہ غلطی نہیں کی میں نے دیدہ و دانستہ شام اور عراق اور مصر وغیرہ کا نام لیا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کوئی کہے کہ اگر وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی کے ثبوت میں عراق اور مصر وغیرہ کی فتوحات کو پیش کیا جا سکتا ہے تو پھر اس بات کا کیا جواب ہے کہ ان فتوحات کے بعد اسلام کا تنزل شروع ہو گیا اور آخرۃ اولیٰ سے بہتر نہ رہی۔ میں اِس کو بھی درست سمجھتا ہوں اور اُس کو بھی درست سمجھتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ہمیشہ یہ قانون رہے گا کہ اُنکی آخرت اُولیٰ سے بہتر ہوگی۔ جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود رہے اسلام بڑھتا رہا اور جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگوں نے چھوڑ دیا اسلام کا تنزل شروع ہو گیا۔ عراق اور شام اور مصر مسلمانوں کو اس لئے ملے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن میں موجود تھے۔ بے شک جسمانی اعتبار سے آپ وفات پا چکے تھے مگر روحانی اعتبار سے آپ کا وجود اُمت میں موجود تھا۔ اور گو جسدِ عنصری کے ساتھ آپ دنیا میں زندہ نہیں تھے مگر ابوبکرؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ عمرؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے عثمانؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ علیؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فتوحات پر فتوحات ہوتی چلی گئیں مگر جب وہ لوگ آگئے جن کے دلوں میں محمد رسول اللہ علیہ وسلم زندہ نہ تھے مسلمانوں کا تنزل شروع ہو گیا۔ آخر غور کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ تو نہیں کہا کہ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّیَزِیْدَ۔ یزید کے لئے بھی آخرۃ اُولیٰ سے بہتر ہوگی۔ خدا تعالےٰ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی۔ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیرے لئے آخرۃ اُولیٰ سے بہتر ہوگی چنانچہ جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عملی طور پر دنیا میں موجود رہے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہ وعدہ پورا ہوتا رہا۔ جب وہ لوگ آگئے جن کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں کہا جا سکتا تھا جو آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے نہیں تھے تو خدا تعالیٰ نے بھی اُن کو چھوڑ دیا۔

۲۷۱ آنحضرت صلعم کی ہر دوسری گھڑی پہلی سے بہتر

پھر دیکھو وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی کی صداقت کا یہ کیسا شاندار نظارہ تھا کہ جب آپ بدر کی جنگ پر تشریف لے گئے تو صرف ۳۱۳ صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ اُحد کی جنگ آئی تو ایک ہزار صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ خندق کی جنگ آئی تو تین ہزار صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ فتح مکہ کا وقت آیا تو دس ہزار صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ غرض وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی کے مطابق یہ تعداد بڑھتی چلی گئی۔

پھر آپ کا تقویٰ اور صلاح بھی ترقی کرتے چلے گئے۔ دولت و امارت نے آپ کو جابر اور متشدد نہیں بنایا وہی غرباء پروری وہی انکسار اور وہی عبادت اور وہی استغنا آخر تک رہا۔ فتح مکہ کے بعد آپ کے گلے میں ایک شخص نے پٹکا ڈال دیا مگر آپ خاموش رہے۔ ایک ظالم نے یہ اعتراض کیا کہ تِلْکَ قِسْمَۃٌ لَا یُرَادُ بِھَا وَجْہُ اللّٰہِ۔ آپ نے مال اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس میں خدا تعالےٰ کی خوشنودی مدنظر نہیں۔ مگر قتل کرنے کی خواہش کرنے والے کو منع فرما دیا۔

جسمانی لحاظ سے دیکھو تو وہ شخص جو اکیلا مکہ میں سے نکلا تھا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا۔ روحانی لحاظ سے دیکھو تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم جو مکہ میں چار پانچ لوگوں کو پالنے والا تھا وہ مدینہ میں لاکھوں کو پالنے والا بن جاتا ہے اور اُن کو اُسی طرح پالتا ہے جس طرح مکہ میں وہ چند افراد کو جنہیں انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا تھا پالتا تھا۔

جب فتوحات ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن بازار سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اچھا کوٹ خرید لائے

اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کوٹ مجھے بڑا اچھا لگا تھا میں آپ کے لئے خرید لایا ہوں، اب فتوحات ہوتی ہیں، بڑے بڑے بادشاہ اور وفود آپ سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ جب وہ آئیں آپ یہ کوٹ پہن لیا کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سُنی تو آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا خدا تعالےٰ نے مجھے اِن کاموں کے لئے نہیں بھیجا، میں اِس کوٹ کو نہیں پہن سکتا اِسے واپس لے جاؤ۔ غرض یہ نہیں ہوا کہ فتوحات کے وقت آپ کی حالت میں کوئی فرق پیدا ہو جاتا اور آپ زیادہ اعلیٰ لباس یا زیادہ آسائش کے سامان اپنے لئے پسند فرماتے بلکہ ہمیشہ آپ کے تقویٰ اور بِرّ میں زیادتی ہی ہوتی چلی گئی۔

پھر محبوبیت کا یہ حال تھا کہ روز بروز اس میں کمال پیدا ہوتا گیا۔ مکہ کے لوگ آپ کے بے شک فدائی تھے مگر مکہ سے نکلنے کے بعد انہوں نے اپنی فدائیت کے نظارے دکھلائے۔ مکہ میں صحابہؓ کی فدائیت کا جو نظارہ نظر آتا ہے وہ بہت کم ہے اور اس کی مثالیں زیادہ نہیں۔ ایک حضرت علیؓ کا واقعہ ہے جو فدائیت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے اور یا پھر غار ثور میں حضرت ابوبکرؓ کی فدائیت کا واقعہ ہے جو نظر آتا ہے۔ اِن کو مستثنیٰ کرتے ہوئے مکہ میں فدائیت کے نظارے بہت کم نظر آتے ہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں مکہ والے مظالم سے تنگ آکر حبشہ چلے جاتے ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر مدینہ میں آپکو جو انصار و مہاجرین کی جماعت ملی اُس نے آپ سے جس محبت کا سلوک رکھا ہے اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ جنگِ بدر کے موقعہ پر انصار نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک الگ مقام بنا دیا اور وہاں دو تیز رفتار اونٹنیاں باندھ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو اُس جگہ بٹھا دیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ جنگ ہونے والی ہے ورنہ ہمارے دوسرے بھائی بھی اس سعادت سے محروم نہ رہتے۔ یا رسول اللہ! اگر ہم سب کے سب مارے جائیں تو آپؐ اور ابوبکرؓ ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر مدینہ تشریف لے جائیں وہاں اسلام کی ایک بہادر فوج موجود ہے حضور جو بھی حکم دیں گے ہمارے وہ بھائی اُس کو پوری خوشی کے ساتھ قبول کریں گے اور اپنی جانیں اسلام کے لئے قربان کر دیں گے۔ پھر ہم اُحد کے موقعہ پر دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ نے فدائیت کا کیسا شاندار نمونہ دکھایا۔ ایک مہاجر حضرت طلحہؓ تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑے تھے دشمن کے تیروں کا اصل نشانہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے اس لئے جو بھی تیر آپ کی طرف آتا حضرت طلحہؓ اُس کو اپنے ہاتھ پر لے لیتے۔ یہاں تک کہ تیروں کی بوچھاڑ کی وجہ سے اُن کا ہاتھ شل ہو گیا۔ کسی نے بعد میں اُن سے پوچھا کہ جب آپکو تیر لگتے تھے تو آپ کے مُنہ سے آہ نہیں نکلتی تھی؟ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا آہ نکلنا تو چاہتی تھی مگر میں نکلنے نہیں دیتا تھا تا ایسا نہ ہو میں آہ کروں اور کوئی تیر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جا لگے۔ دوسرا واقعہ مالک انصاری کا ہے۔ پہلی فتح کے بعد وہ الگ جا کر کھجوریں کھانے لگے کیونکہ سخت بھوکے تھے۔ پھرتے ہوئے ایک جگہ آئے تو انہوں نے دیکھا حضرت عمرؓ ایک ٹیلہ پر بیٹھے ہوئے رو رہے تھے انہوں نے حیرت سے کہا عمر کیا ہوا یہ رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا؟ خدا تعالےٰ نے اسلام کو فتح دی ہے اور تم بیٹھے رو رہے ہو! حضرت عمرؓ نے کہا تم کو پتہ نہیں کہ فتح کے بعد کیا ہوا؟ وہ کہنے لگے کیا ہوا؟ حضرت عمرؓ نے کہا فتح کے بعد لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول تھے، لشکر تتر بتر تھا کہ دشمن نے موقعہ پا کر حملہ کر دیا اور اُس نے حملہ ایسا شدید کیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے۔ مالکؓ نے کہا عمرؓ پھر بھی تو بیٹھ کر رونے کا کوئی موقعہ نہیں اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو پھر جہاں ہمارا پیارا گیا وہیں ہم جائیں گے۔ یہاں بیٹھنے کا کونسا موقعہ ہے۔ یہ کہا اور صرف ایک ہی کھجور جو اُن کے ہاتھ میں رہ گئی تھی اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے میرے اور جنت کے درمیان سوائے اس کھجور کے اور کونسی چیز حائل ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے کھجور کو پھینک دیا اور تلوار لیکر دشمن کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ اب بظاہر اُن کے دل میں یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ جس شخص کے لئے ہم قربانی کر رہے تھے جب وہی نہیں رہا تو اب قربانی کرنے کا کیا فائدہ ہے مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ ہم

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے قربانی کر رہے تھے جب وہ
نہیں رہے تو اب قربانی کا کیا فائدہ۔ بلکہ وہ کہتے ہیں جس کام کیلئے
وہ کھڑے ہوئے تھے اس کام کے لئے ہمیں اُسی جوش اور اُسی ولولہ
کے ساتھ قربانی کرنی چاہیئے جس جوش اور ولولہ کے ساتھ ہم آپ کی
زندگی میں قربانی کیا کرتے تھے اگر وہ زندہ نہیں رہے تو پروا نہیں۔
میں اکیلا جاؤں گا اور دشمن سے لڑوں گا۔ چنانچہ وہ اکیلے تلوار لیکر
دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک آدمی تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں کیا
کر سکتا ہے چنانچہ لڑائی کے بعد ان کے جسم کے ستر ٹکڑے ڈھونڈ ڈھونڈ
کر لائے گئے تب اُن کی لاش مکمل ہوئی۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے
کہ وہ کس طرح مجنونانہ طور پر لڑے تھے۔ اوّل تو جب تک زندہ رہے
انتہائی دلیری کے ساتھ لڑتے رہے پھر جب ایک ہاتھ کٹا تو دوسرے
ہاتھ میں تلوار سنبھال لی۔ دوسرا ہاتھ کٹ گیا تو منہ میں تلوار لے لی
اور دشمن کو مارتے چلے گئے یہ دیکھ کر دشمن کو بھی شدید غصہ پیدا ہوا
اور اُس نے اُن کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ لڑائی کے بعد
جب اُن کے جسم کے مختلف ٹکڑے اکٹھے کئے گئے تو تلوار کے زخموں کی
وجہ سے اُن کی لاش پہچانی تک نہیں جاتی تھی۔ آخر اُن کی ایک انگلی
ملی جس پر ایک نشان تھا اُس نشان کو دیکھ کر مالک انصاری کی بہن
نے کہا کہ یہ میرے بھائی کی لاش ہے۔ غرض وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ
مِنَ الْأُولٰى کے مطابق آپ کی محبوبیت میں روز بروز کمال پیدا ہوتا
چلا گیا اور صحابہؓ کرام نے اپنی فدائیت کے وہ نظارے دکھلائے
جو آج تک کسی نبی کے ماننے والے دکھلا نہیں سکے۔

پھر آپ کی وفات پر جو واقعہ ہوا وہ صحابہؓ کرام کی اُس
محبت کا کتنا بڑا ثبوت ہے جو وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے
ساتھ رکھتے تھے۔ وہ صحابہؓ جو دن رات سنتے تھے کہ مُردے زندہ
نہیں ہوتے، وہ صحابہؓ جو روزانہ سنتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر بھی وفات آ سکتی ہے۔ اُن پر اُس وقت ایسی جنون کی کیفیت طاری
ہوگئی کہ باوجود اس مضمون کے جو روزانہ اُن کے سامنے دُہرایا جاتا
تھا اُن کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
فوت نہیں ہوئے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے
کہ اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت
ہو گئے ہیں تو میں اُس کی گردن کاٹ دوں گا۔ حضرت حسانؓ کہتے ہیں
ہمارے دلوں میں مایوسی پیدا ہو چکی تھی مگر جب عمرؓ تلوار لے کر کھڑے
ہو گئے تو ہمارے دلوں میں بھی جھوٹی امید پیدا ہو گئی اور ہم خوش
ہو گئے کہ چلو وہ بات غلط نکلی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو زندہ
موجود ہیں۔ آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے، منبر پر چڑھے اور انہوں
نے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ
مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ کہ تم میں سے جو شخص
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا وہ اچھی
طرح سُن لے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔
وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ۔
لیکن تم میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا اُسے معلوم
ہونا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے اور وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ پھر آپ نے یہ
آیت پڑھی کہ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ
محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو صرف اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اگر وہ
مر جائیں گے تو کیا تم اپنے ایمان سے پھر جاؤ گے۔ جب ابوبکرؓ نے
یہ بات بیان کی تب صحابہؓ کی آنکھیں کھلیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں جب
انہوں نے یہ آیت پڑھی تب مجھے ہوش آیا اور یا تو میری یہ حالت
تھی کہ ابوبکرؓ کے رعب سے میں فوراً تلوار نہیں چلا سکا تھا اس بات کا
انتظار کر رہا تھا کہ یہ بڈھا اپنی بات ختم کرے تو میں اس کی گردن اُڑا دوں
اور یا جب ابوبکرؓ نے اپنی بات ختم کر لی تو میری ٹانگیں کانپ گئیں
اور میں زمین پر گر گیا۔ اُس وقت صحابہؓ کو اپنے محبوب کی جدائی کا
جس قدر غم ہوا اُس کا اندازہ اُس شعر سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت
حسانؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہا۔ جب انہیں
یقین آگیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو چکے ہیں
تو حضرت حسانؓ نے کہا ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِي ✦ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ ✦ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

وہ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کے کھڑے ہونے سے پہلے تو ہم نے سمجھا کہ
شاید یہ بات غلط ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں مگر

جب ابوبکرؓ نے ہماری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر جاری ہو گیا ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ ۔ فَعَمِیَ عَلَیْكَ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْیَمُتْ ۔ فَعَلَیْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تُو تو میری آنکھ کی پُتلی تھا تیرے مرنے سے میری آنکھ کی پتلی جاتی رہی ہے اور میں اندھا ہو گیا ہوں اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تک تُو زندہ رہا مجھے وہ سب کے سب فوائد تجھ سے مل رہے تھے جو کسی کو مل سکتے ہیں۔ مجھے دین بھی مل رہا تھا اور دنیا بھی مل رہی تھی اور مجھے دنیا کی ہر نعمت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھی لیکن آج جبکہ تُو زندہ نہیں رہا میں اندھا ہو گیا ہوں۔ اِس لئے اَے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی مرے۔ باپ مرے بیٹا مرے۔ بیوی مرے بھائی مرے مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے تو تیری جان کا ہی ڈر لگا ہُوا تھا۔ دیکھو یہ کیسی شاندار محبت تھی جس کا صحابہ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر نمونہ دکھلایا اور جو ثبوت تھا اس بات کا کہ وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی۔ لوگ مرتے ہیں تو دنیا اُنہیں بُرا بھلا کہتی ہے۔ کہتے ہیں اچھا ہُوا چھٹکارا ہُوا۔ خس کم جہاں پاک۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہوتے ہیں تو بیویاں کیا اور بچے کیا اور ساتھی کیا ہر شخص کا دل غمگین ہو جاتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھ لو کہ پہلا گھر مکہ تھا جہاں صرف چند رشتہ دار آپ کے پاس تھے یا آپ کے چچا ابوطالب آپ کی مدد کیا کرتے تھے مگر وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی کے مطابق دوسرا گھر خدا تعالےٰ نے آپ کو مدینہ میں دیا جو پہلے سے بہتر ثابت ہُوا مکہ میں صرف دس بیس فدائی تھے اور مدینہ میں شہر کا شہر مرد کیا اور عورتیں کیا۔ بچے کیا اور بوڑھے کیا سب آپ پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

پھر ذہانت آپ کی آخر تک قائم رہی۔ انسان بالعموم آخر عمر میں جا کر کمزور دماغ کے ہو جاتے ہیں اور اُن کا علم سلب ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر آپ کے علم اور ذہانت میں آخر تک کوئی فرق نہ آیا بلکہ ہر دن جو آپ کی زندگی میں آیا پہلے سے بڑھ کر آیا۔ اِسی طرح جو کلام آپ پر نازل ہُوا وہ آخر دم تک نازل ہوتا رہا اور ہر روز نئی سے نئی باتوں کا آپ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے علم دیا جاتا رہا۔ غرض کوئی دن آپ کی زندگی میں ایسا نہ آیا جب لوگوں نے یہ کہا ہو کہ یہ سٹھیا گیا ہے، اِس کا دماغ کمزور ہو گیا ہے، اِس کا علم جاتا رہا ہے بلکہ ہر دن جو آپ پر آیا پہلے سے زیادہ علم لے کر آیا اور پہلے سے زیادہ دنیا کے سکھانے اور سمجھانے اور پڑھانے میں صرف ہُوا اور اس طرح اللہ تعالےٰ نے اِس آیت کی صداقت کو واضح کر دیا کہ وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی۔ تیرے لئے آخرت پہلی حالت سے بہت اچھی ہو گی۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی کے ایک اور معنے بھی ہیں جو قبض و بسط کی روحانی کیفیات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی میں یہ مضمون بیان کیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بسط کی حالت بھی خدا تعالےٰ کی معیّت کا ثبوت ہو گی اور اُن کی قبض کی حالت بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کا ثبوت ہو گی۔ اب اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ ہم ایک بات کی تمہیں تسلّی دلا دیتے ہیں اور وہ یہ کہ تم اِن روحانی لہروں میں یکساں نہیں چلو گے بلکہ ہمیشہ پہلے سے اونچے نکلتے جاؤ گے۔ لہر کی رفتار دراصل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک رفتار تو اس قسم کی ہوتی ہے کہ ایک ہی مقام پر وہ اوپر نیچے ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے لیکن ایک رفتار اس قسم کی ہوتی ہے کہ ہر دفعہ نیچے آ کر وہ پہلے سے اور زیادہ اونچی چلی جاتی ہے۔ یہی مضمون اللہ تعالےٰ نے وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی میں بیان فرمایا ہے کہ بے شک تجھ پر قبض کی حالتیں بھی آئیں گی اور بسط کی حالتیں بھی آئیں گی اور یہ دونوں حالتیں معیّتِ الٰہی اور رضاء باری تعالےٰ کے ساتھ ہوں گی مگر اس کے ساتھ ہی ایک زائد بات یہ بھی ہو گی کہ تیرا نیچے جھکنا ایسا ہی ہو گا جیسے پرندہ نیچے کی طرف اپنا پر مارتا ہے۔ وہ بے شک نیچے جھک کر اپنا پر مارتا ہے مگر اُس کا نیچے جھکنا اُسے اَور زیادہ بلندی پر لے جانے کا موجب بن جاتا ہے اسی طرح ہر دفعہ تیرا نیچے جھکنا ایسا ہی ہو گا جیسے پرندہ پر مارتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے بھی اونچا چلا جاتا ہے۔ گویا بتا دیا کہ تیری پرواز پرندوں والی ہو گی

اور قبض کی ہر حالت جو تجھ پر وارد ہوگی وہ تجھے اور زیادہ بلندی کی طرف لے جائے گی۔

اِس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ جو شخص ماموریت کا مدعی ہو وہ جب لوگوں سے ملتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ وجاہت پسندی کے لئے یا لوگوں میں اپنی مقبولیت اور عظمت قائم کرنے کے لئے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس آیت میں لوگوں کے اس خیال کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے تُو اگر علیحدگی اختیار کرتا ہے تو ہمارے ذکر کے لئے۔ اور اگر لوگوں سے ملتا ہے تو ہمارے حکم کے ماتحت۔ پس تیرے متعلق لوگوں کا یہ خیال کرنا قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے۔ تیری علیحدگی ذکر کے لئے ہوتی ہے اور تیرا پبلک میں آنا محض بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہوتا ہے۔ اپنے نفس کے لئے نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرماتا ہے وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نادان تیری زندگی سے ناواقف ہیں انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ علیحدگی کی حالت تجھے ہمیشہ پیاری رہتی ہے تو اگر لوگوں سے ملتا ہے تو محض خدا کے لئے۔ پس وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى میں یہ بتایا کہ آخرۃ تجھے اُولیٰ سے زیادہ راحت والی معلوم ہوتی ہے۔ خَیْرٌ کے معنے راحت والی یا آرام پہنچانیوالی چیز کے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اِن آیات میں کونسی چیز آخرۃ کہلا سکتی ہے اور کونسی اُولیٰ۔ سو پہلی آیت میں ضحیٰ کو پہلے بیان کیا گیا ہے اور لَیل کو بعد میں۔ پس آخرۃ لَیل ہوئی اور اُولیٰ ضحیٰ ہوئی اور ضحیٰ یعنی دن کے وقت چونکہ انسان لوگوں سے ملتا ہے اس لئے وہ ضحیٰ جلوت کا قائم مقام سمجھی جائے گی۔ اور رات کو چونکہ علیحدہ ہوتا ہے اس لئے لَیل خلوت کا قائم مقام سمجھی جائیگی۔ اِن معنوں کے مطابق آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ اے ہمارے رسول! تجھے خلوت سے جلوت کی نسبت زیادہ راحت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ تجھے جاہ پسند سمجھتے ہیں حالانکہ تُو لوگوں سے محض ہمارے حکم کے ماتحت ملتا ہے ورنہ رات کو ہم سے راز و نیاز کی باتیں کرنا تجھے زیادہ پسند ہیں اور جو برکات تجھے رات کو ہم دیتے ہیں وہ دن کو ملنے والے انسان تجھے کہاں دے سکتے ہیں۔ پس جبکہ تیری تمام ترقیات تیری خلوت کی گھڑیوں سے وابستہ ہیں اور تُو اُسے دل سے جلوت پر ترجیح دیتا ہے تو لوگوں کا یہ کہنا کہ تُو جاہ پسند ہے تیرے دل کو کیوں دُکھ پہنچائے کہ یہ اعتراض حقیقت سے دُور اور سر تا پا جھوٹ ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام نے اپنے متعلق بھی بیان فرمائی ہے کہ "میں پوشیدگی کے حجرہ میں تھا اور کوئی مجھے نہیں جانتا تھا اور نہ مجھے یہ خواہش تھی کہ کوئی مجھے شناخت کرے۔ اُس نے گوشۂ تنہائی سے مجھے جبراً نکالا۔ میں نے چاہا کہ میں پوشیدہ رہوں اور پوشیدہ مروں مگر اُس نے کہا کہ میں تجھے تمام دنیا میں عزت کے ساتھ شہرت دوں گا۔ پس یہ اُس خدا سے پوچھو کہ ایسا تُو نے کیوں کیا۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۹)

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جبراً گوشۂ تنہائی سے باہر نکالا۔ ورنہ اُن کی خواہش یہی تھی کہ وہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہیں۔ چنانچہ دیکھو غارِ حراء میں جب فرشتے نے کہا اِقْرَأْ تو آپ نے یہی جواب دیا کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ میرے سپرد یہ کام کیوں کیا جاتا ہے میں تو اپنے رب کی عبادت پسند کرتا ہوں۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس اعتراض کو رد کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وجاہت پسندی کے لئے لوگوں سے ملتے ہیں اور بتایا ہے کہ اِن نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ ساعت آخرت یعنی لَیل تیرے لئے اچھی ہوتی ہے اور تُو اُس سے بہت زیادہ راحت محسوس کرتا ہے۔ لوگوں کو ملنا تجھے پسند نہیں۔ تُو اگر ملتا ہے تو محض خدا تعالیٰ کے حکم سے۔ تیری ذاتی خواہش کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

وَالضُّحٰى ○ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ○ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کے ایک معنے یہ بھی کئے گئے تھے کہ ترقی اور تنزل دونوں دَور میں ہم تیرے ساتھ رہیں گے اور تیرے کام کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ اِن معنوں کے رُو سے وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہمیشہ رات کے بعد ضحیٰ آتی رہے گی یہ معنے نہیں کہ آخری زمانہ پہلے سے اچھا ہوگا بلکہ تاریکی اور روشنی

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝

اور ضرور تیرا رب تجھے (وہ کچھ) دے کے رہیگا جس پر تو خوش ہو جائیگا ۵ے

کے دَور دو طرح آسکتے ہیں ایک یہ کہ پہلے روشنی اور پھر تاریکی کا دَور آئے اور دوسرے یہ کہ پہلے تاریکی پھر روشنی کا دَور آئے۔ فرمایا ہم تیرے لئے ہمیشہ روشنی کا دَور آخری ہوتا چلا جائے گا بعض لوگ پہلے ترقی کرتے ہیں پھر گر جاتے ہیں اور اُن کی پہلی ترقی کی وجہ سے لوگ اُن پر رشک نہیں کرتے اُن کی آخری تباہی کی وجہ سے اُن کے حالات سے عبرت پکڑتے ہیں۔ پھر قومی طور پر بعض اقوام یک دم بڑھکر گر جاتی ہیں اور بعض گرتی ہیں پھر اونچی نکل جاتی ہیں پھر گرتی ہیں پھر اونچی نکل جاتی ہیں۔ اسی طرف اِس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذاتی معاملہ بھی ایسا ہوگا کہ آپ پہلے تکالیف اُٹھائیں گے مگر پھر ترقی کر جائیں گے اور آپ کی قوم سے بھی یہ معاملہ ہوگا کہ ہر تنزّل کے بعد اللہ تعالےٰ مامورین یا مجدّدین کے ذریعہ سے اُس کے اُبھارنے کے سامان کرتا چلا جائے گا اور اسی طرح بعد میں آنے والا دَور اپنے سے پہلے تنزّل کے دَور سے بہتر ہوگا۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جگہ یہ ذکر نہیں کہ ہر آنے والا روحانی دَور پہلے روحانی زمانہ سے اچھا ہوگا کیونکہ اس طرح تو یہ ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آئندہ روحانی دَور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اچھے ہوں گے اور یہ بالبداہت غلط ہے۔ پس اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر تنزّل کے بعد اس سے بہتر زمانہ اُمّتِ اسلامیہ پر لایا جائیگا جس میں اُس کی روحانی حالت پھر ترقی کر جائے گی۔ پس پہلے رُوحانی دَوروں کا مقابلہ نہیں بلکہ ہر دَور روحانی کا مقابلہ پہلے تنزّل کے دَور سے ہے۔

اور یہ جو حدیثوں میں آتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میری قوم کا پہلا حصہ اچھا ہے یا آخری (مسند احمد عن انس) اس کے یہ معنی نہیں کہ آخری زمانہ پہلے زمانہ سے بلحاظ روحانیت کے بہتر ہوگا بلکہ اس زمانہ کو بہتر اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ اس نے اسلامی تنزّل کے ایک بہت بڑے دَور کے گذرنے کے بعد آنا تھا اور آپ کا صرف یہ مطلب ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام پر جو مشکلات ابتدائی دَور میں آئی ہیں اُن کو زیادہ سخت کہوں یا اُن مشکلات کو زیادہ سخت کہوں جو آخری زمانہ میں آنے والی ہیں اور چونکہ خوشی مشکلات کی نسبت سے ہوتی ہے آپ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ اُن کو اچھا کہوں جو اب ہیں یا اُن کو جو آخری دَور میں پیدا ہونے والے ہیں یعنی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ دور کے لوگ کامیابی کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت ہیں یا آئندہ دَور کے لوگ زیادہ خوش قسمت قرار دئے جانیکے مستحق ہوں گے۔ بہرحال آیت کے یہ معنے نہیں کہ ہر پچھلا زمانہ پہلے زمانہ سے روحانیت کے لحاظ سے بہتر ہوگا بلکہ معنے یہ ہیں کہ قربِ قیامت تک تیرے لئے روشنی کا دَور ہمیشہ آخر میں آئے گا البتہ اس میں ایک استثنٰے ہے اور وہ یہ کہ قیامت صرف اشرار پر آئیگی چنانچہ قرآن کریم سے بھی پتہ لگتا ہے اور حدیثوں سے بھی کہ خرابی کا وہ آخری دَور جو قربِ قیامت کے وقت ہوگا صرف اشرار پر آئیگا ابرار اُس وقت دنیا میں نہیں رہیں گے پس وہ دَور بہرحال وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى سے مستثنٰی ہے لیکن اُسے اس لحاظ سے مستثنٰی بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ نبوت محمدیہ کے ختم ہونے کا زمانہ ہوگا۔ اُس دَور کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دنیا ختم ہو جائے گی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کام اس دنیا میں ختم ہو جائے گا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ میں اسلامی فتوحات کی پیشگوئی

۵ے تفسیر۔ اس آیت کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ گو اس وقت چاروں طرف مخالفت کا ایک شور برپا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے کفار نے اپنی تدابیر کو انتہا تک پہنچایا ہُوا ہے مگر چونکہ ہم پیشگوئی کر چکے ہیں کہ اسلام پر ضحٰی کا دَور آنے والا ہے اِس لئے ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں کہ عنقریب

وہ زمانہ آنے والا ہے جب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے
کفر کو نابود ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے اور وہ کام
جسے دنیا ناممکن سمجھتی ہے الٰہی تائید اور نصرت کے ساتھ اپنی
تکمیل کو پہنچ جائے گا اور نیز رب جلد ہی تجھ کو وہ سب کچھ دے گا
جس سے تُو راضی ہو جائے گا۔

درحقیقت کام ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی شخص کی شان
اور اسکی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کام کیا گیا تھا وہ بظاہر بہت
بڑا وقت چاہتا تھا، بہت بڑی جدوجہد اور بہت بڑی قربانی کا
تقاضا کرتا تھا اور انسان اُس کام کو دیکھ کر یہ خیال کرتا تھا کہ
اس کے لئے تو عمر نوح کی ضرورت ہے تھوڑے سے وقت میں اتنا
عظیم الشان کام کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے
آپ کو اطمینان دلایا کہ بے شک کام بڑا ہے اور بظاہر بہت بڑا
وقت چاہتا ہے مگر ہم یہ کام تجھ سے جلدی کروا دیں گے چنانچہ
ایک قلیل ترین عرصہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو حیرت انگیز
کام کر کے دکھایا اُس کی مثال دنیا میں کہیں نظر نہیں آ سکتی تم
اپنے صوبہ پنجاب کو ہی لے لو، سندھ کو لے لو، سرحد کو لے لو
باوجود اس کے کہ یہ صوبے سو سال سے تعلیم حاصل کرنے میں مشغول
ہیں پھر بھی وہ پوری تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ باوجود اس کے کہ وہ
سو سال سے اپنے تمدن کی ترقی میں مصروف ہیں پھر بھی وہ اپنے
تمدن کو پورے طور پر ترقی نہیں دے سکے۔ باوجود اس کے کہ وہ
سو سال سے لوگوں کے اخلاق کی درستی میں لگے ہوئے ہیں پھر بھی
وہ درستیٔ اخلاق میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ غرض الگ
الگ جماعتیں الگ الگ کاموں کے لئے سو سو سال سے مصروف
ہیں مگر ہنوز روز اول والا معاملہ ہے۔ نہ انہیں تعلیمی ترقی حاصل
ہوئی ہے نہ انہیں تمدنی ترقی حاصل ہوئی ہے نہ انہیں اخلاقی ترقی
حاصل ہوئی ہے۔ اس کے مقابل میں اسلام ایک ایسا منزلِ مقصود
تھا جس سے اونچا اور بلند تر کوئی اور منزلِ مقصود نہیں ہو سکتا۔ پھر
اسلام وہ مذہب تھا جو حاوی تھا تمام اقسام کی اصلاحات پر۔
اُس میں تمدنی اصلاح بھی شامل تھی۔ اُس میں اقتصادی اصلاح بھی
شامل تھی۔ اُس میں عائلی اصلاح بھی شامل تھی۔ اُس میں سیاسی اصلاح بھی
شامل تھی۔ اُس میں فکری اصلاح بھی شامل تھی۔ غرض ایک نہیں ساری
اصلاحیں اُس میں شامل تھیں اور پھر ہر ایک کا آئیڈیل IDEAL
اور منزل مقصود بہت بالا تھا جب یہ عظیم الشان کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے سپرد ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر بھی دے دی
گئی کہ تم اپنی آنکھوں سے فتح بھی دیکھ لوگے تو چونکہ محب اپنے محبوب
سے زیادہ دیر تک جدا نہیں رہ سکتا بلکہ محب اپنے محبوب کے پاس
جانا ہی پسند کرتا ہے اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل
میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ نہ معلوم یہ کام کب ختم ہو۔ آپ کہتے
ہوں گے الٰہی پتہ نہیں یہ کام پچاس سال میں ختم ہو، ساٹھ سال
میں ختم ہو، سو سال میں ختم ہو۔ کیا میں اتنی دیر تجھ سے جدا رہوں گا
اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو اس آیت میں بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ
ہم تیرے اُن کاموں کا ذکر کر رہے ہیں جو دنیا سے متعلق ہیں اور تُو
اپنے دل میں کہہ رہا ہوگا کہ اصل مطلب کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے ہم
کہتے ہیں کہ کام بڑا ہے مگر ہم جلدی کروا دیں گے اور جلد ہی تم کو
وہ دے دیں گے جس سے تُو راضی ہو جائے گا۔ یعنی اس کام کیلئے
بظاہر تو سینکڑوں سال کی عمر چاہیئے مگر تیرے سب دنیوی کام جلد
ہو جائیں گے اور تو اَلرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی کہتا ہوا ہمارے پاس
آ جائے گا اور اس طرح تجھے وہ چیز مل جائے گی جو تُو پسند کرتا ہے
یعنی ہمارا وصال تجھے حاصل ہو جائے گا اور فراق کی یہ کٹھن گھڑیاں
کٹ جائیں گی۔

احادیث میں آتا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر
یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ
النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝
تو آپ نے ایک خطبہ پڑھا اور فرمایا ہر نبی کے زمانہ کا ایک کام ہوتا
ہے جب وہ اس کام کو ختم کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک دوسرا
دَور شروع کر دیتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا خدا کا ایک بندہ تھا
اُس سے خدا تعالیٰ نے کہا کہ تم اگر چاہو تو دنیا میں رہو اور اگر
چاہو تو ہمارے پاس آ جاؤ اُس نے کہا کہ یا اللہ! میں اب دنیا میں

نہیں رہنا چاہتا میری خواہش یہی ہے کہ تُو مجھے اپنے پاس بُلالے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرمایا تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور اس قدر روئے کہ گھگھی بندھ گئی۔ باقی صحابہ کو سخت حیرت ہوئی کہ ابوبکرؓ رو کیوں رہے ہیں حضرت عمرؓ کہتے ہیں مجھے تو ان کے رونے سے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا اسلام کے لئے فتح کا وقت آیا ہے تو یہ بڈھا رونے لگ گیا ہے یہ بدشگونی کیوں کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ نے اپنے کسی بندے کو اختیار دیا کہ وہ اگر چاہے تو دنیا میں رہے اور اگر چاہے تو اللہ تعالےٰ کے پاس چلا جائے۔ اُس نے اللہ تعالےٰ کے پاس جانے کو ترجیح دی اور دنیا میں رہنا پسند نہ کیا۔ اس میں رونے کا کونسا مقام ہے اور پھر ایسی حالت میں جبکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اسلام کی فتح اور اُس کے غلبہ کی پیشگوئی ہوئی ہے مگر ابوبکرؓ تھے کہ اُن کا رونا تھمتا ہی نہیں تھا۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا مِنْ أُمَّتِيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ۔ اگر کسی کو خلیل بنانا جائز ہوتا تو میں ابوبکر کو خلیل بناتا۔ پھر آپ نے فرمایا لَا يَبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ اِلَّا سُدَّ اِلَّا بَابَ اَبِيْ بَكْرٍ۔ مسجد میں جس قدر کھڑکیاں کھلتی ہیں وہ سب کی سب بند کر دو سوائے ابوبکر کی کھڑکی کے۔ (بخاری کتاب الصلوٰة باب الخوخة والممر فی المسجد) اس طرح آپ نے اس امر کا اظہار فرمادیا کہ ابوبکر سمجھ گئے ہیں کہ میرا اس واقعہ کے بیان کرنے سے کیا منشاء تھا مجھے دنیا میں رہنے کی خوشی نہیں بلکہ میری ساری خوشی اور میری ساری راحت اپنے آقا اور محبوب کے پاس جانے میں ہے۔ اب چونکہ میرا کام ختم ہو چکا ہے اس لئے میرا دنیا میں ٹھہرنا عبث ہے میری خواہش اور میری آرزو یہی ہے کہ میرا رب مجھے اپنے پاس بُلالے۔ باقی صحابہؓ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطلب کو نہ سمجھے مگر ابوبکر سمجھ گئے اور ان سے رقت برداشت نہ ہو سکی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو تسلی دے دی کہ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا اگر دنیا میں کسی کو خلیل بنانا جائز ہوتا تو میں ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا۔ پھر اس کے ساتھ ہی آپ نے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ میرے بعد کام کی ذمہ داری ابوبکر پر پڑنے والی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا سب کھڑکیاں بند کر دو سوائے ابوبکر کی کھڑکی کے۔ جس میں حکمت یہ تھی کہ ابوبکرؓ کو نمازیں پڑھانے کے لئے مسجد میں آنا پڑے گا اس لئے اُن کی کھڑکی کا کھلا رہنا ضروری ہے۔

غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خوشی اسی بات میں تھی کہ آپ کو اپنے رب کا وصال حاصل ہو۔ دنیوی کام کو آپ جلد سے جلد سرانجام دیں اور رفیق اعلیٰ کے پاس لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے حاضر ہو جائیں چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت سے بیمار ہوئے تو آخری وقت میں آپ کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے کہ اِلَی الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى یعنی اے میرے رب میری خواہش اب یہی ہے کہ میں تیرے پاس آجاؤں پس وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى کے الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم اپنا کام جو تیرے سپرد کرتے ہیں بظاہر وہ بہت لمبا نظر آتا ہے مگر ہم تجھے ایسی توفیق دے دیں گے کہ تُو اس کام کو جلدی ختم کرلیگا چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال کی قلیل مدت میں اپنے تمام کام کو ختم کرلیا۔ اتنے قلیل عرصہ میں اس قدر عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آسکتی بلکہ اس کام کی مثال تو کجا اس کے ہزارویں بلکہ لاکھویں حصہ کی مثال بھی دنیا کے اور کسی شخص کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ دنیا میں بڑے بڑے لوگ گذرے ہیں مگر اُن کا انجام کتنا تلخ اور حسرتناک ہُوا ہے۔ ہٹلر کو دیکھ لو اُس کا کیا انجام ہُوا۔ نپولین کو دیکھ لو وہ کیسی خراب حالت میں مرا۔ یہ لوگ بڑے بڑے دعووں کے ساتھ اُٹھے تھے اور انہوں نے بظاہر کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر آخر ناکامی کے سوا اُن کو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر یہ بھی ایک غور کرنے والی بات ہے کہ یہ لوگ جن قوموں میں پیدا ہوئے اور جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر ترقی کی طرف بڑھے وہ پہلے ہی قربانی کی رُوح اپنے اندر رکھنے والے تھے۔ پہلے ہی اُن کے اندر یہ جوش پایا جاتا تھا کہ ہم دنیا پر حکومت کریں اور لوگوں پر غلبہ و اقتدار حاصل کریں۔ نپولین نے بے شک ترقی حاصل کی مگر وہ ایک

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝

کیا اس نے تجھے یتیم پا کر (اپنے زیر سایہ) جگہ نہیں دی شہ

ترقی یافتہ قوم کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ اسی طرح ہٹلر نے بے شک فتوحات حاصل کیں مگر ہٹلر ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ جرمن قوم دنیا میں سب سے زیادہ منظم اور سب سے زیادہ قربانی کی رُوح اپنے اندر رکھنے والی سمجھی جاتی تھی لیکن عرب کیا تھا؟ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں گوبر دیا گیا جسے بیس سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے سونا بنا دیا اور خالی سونا نہیں بلکہ صاف اور کھرا سونا۔ اخلاق اُن کے درست ہو گئے، تمدن اُن کا درست ہو گیا، علمی حالت اُن کی درست ہو گئی، رُعب اور دبدبہ اُن کا بڑھ گیا، عزت اُن کی بڑھی، رتبہ اور شان و شوکت اُن کو حاصل ہُوا۔ غرض کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو نامکمل رہ گیا ہو۔ کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اُن کو کمال تک نہ پہنچا دیا گیا ہو۔ ہر قسم کی اصلاح خواہ وہ اخلاقی ہو یا دینی، مذہبی ہو یا عائلی، اقتصادی ہو یا سیاسی، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دی۔ پس فرمایا وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی۔ گھبراؤ نہیں ہم جلدی ہی اس عظیم الشان کام سے تمہیں فارغ کر دیں گے بیشک ہم نے ایک بہت بڑے کام کی تم پر ذمہ واری ڈالی ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ تمہاری اصل خوشی ہمارے پاس آنے میں ہے اِس لئے ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تجھے جلد ہی ان مقاصد میں کامیاب کر دینگے۔ چنانچہ اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنا بڑا کام دنیا میں اَور کسی نے بھی نہیں کیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر وفات کے وقت شمسی لحاظ سے صرف باسٹھ ۶۲ سال تھی اتنی قلیل عمر میں کتنا عظیم الشان کام آپ نے کیا کہ اُسے دیکھکر حیرت آتی ہے۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ الخ میں آنحضرت صلعم کی طرف کامل شریعت نازل کئے جانے کی طرف اشارہ

دوسرے معنے اِس کے یہ ہیں کہ کامل شریعت تجھ پر نازل ہو جائے گی کیونکہ انسان کمال پر راضی ہوتا ہے فرماتا ہے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ہم تجھے اتنا دیں گے کہ تُو آپ ہی آپ کہہ دیگا کہ اب ترقی کی گنجائش نہیں۔ جب آخری شریعت آپ کو دے دی گئی تو اس کے بعد آپ نے اور کیا مانگنا تھا بیشک جہاں تک الٰہی قرب اور اُس کے مدارج کا سوال ہے وہ غیر محدود ہیں اور کبھی کوئی مقام ایسا نہیں آ سکتا جب انسان یہ کہے کہ اب مجھے کسی اور درجۂ قرب کی احتیاج باقی نہیں رہی مگر جہاں تک شریعت کا سوال ہے آخری اور کامل شریعت کے بعد اور کونسی بات باقی رہ سکتی ہے پس فرماتا ہے ہم تجھے وہ کچھ دیں گے کہ تُو بھی یہ کہدیگا کہ اِس سے اُوپر اور کوئی درجہ نہیں۔ چنانچہ جہاں تک انسانی تعلق ہے اس کے لحاظ سے آخری شریعت سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے؟ پس اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ ہم شریعتِ کاملہ تجھے عطا کرینگے۔

اسلام کے بچاؤ کیلئے مستقل نظام قائم کئے جانیکا وعدہ

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ آئندہ اسلام کے بچاؤ کے لئے ایک مستقل نظام قائم کر دیا جائیگا۔ درحقیقت پہلی خواہش انسان کے دل میں یہ ہوتی ہے کہ میں اپنا کام جلد سے جلد پورا کر لوں۔ دوسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو کام میرے سپرد ہو وہ اپنی ذات میں کامل ہو۔ تیسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کام مٹے نہیں۔ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی میں یہ تینوں باتیں اللہ تعالےٰ نے بیان کر دیں کہ ہم تجھے اس کام سے جلد سے جلد فارغ کر دیں گے، ہم کامل شریعت تجھے عطا کریں گے اور پھر ایک زائد وعدہ تجھ سے یہ کرتے ہیں کہ جب بھی اس کام میں کوئی نقص پیدا ہوگا اللہ تعالےٰ تیری روحانی اولاد میں سے کسی کو اصلاحِ خلق کے لئے کھڑا کر دیگا اور اسلام کو تباہ نہ ہونے دیگا۔ اولاد پیدا ہوتی ہے تو لوگ کتنے خوش ہوتے ہیں محض اس لئے کہ وہ انکے نام کو زندہ رکھیگی لوگوں کی یہ خوشی تو بعض دفعہ بالکل بے حقیقت ہوتی ہے اور جس اولاد کی پیدائش پر وہ خوش ہوتے ہیں وہی انکو ذلیل کرنیوالی بن جاتی ہے مگر فرماتا ہے تیرے لئے یہ حقیقی خوشی کی بات ہے کہ جب بھی کسی روحانی بیٹے کی تجھے ضرورت محسوس ہوگی ہم اُسے پیدا کر دیں گے جو تیرے کام کو پھر دنیا میں زندہ کر دیگا۔

شہ تفسیر۔ فرماتا ہے تیرے مستقبل کے متعلق لوگوں کے دلوں میں

شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تو محض باتیں ہوئیں ہم کس طرح مان سکتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا یوں تو ہر شخص دوسروں کو تسلی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یوں ہو جائے گا، وُوں ہو جائے گا۔ اس قسم کی باتوں سے کیا بن سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وہ لوگ جن کے دلوں میں یہ شبہ پایا جاتا ہے وہ تیرا ماضی دیکھ لیں تو بھی دیکھ لو دنیا بھی دیکھے کہ کیا ہم نے تجھے یتیم نہیں پایا تھا اور کیا ہر موقع پر ایسا نہیں ہُوا کہ ہم نے تجھے پناہ دی اور تجھے ہر قسم کے نقصان سے بچا لیا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابھی رحم مادر میں ہی تھے کہ آپ کے والد فوت ہو گئے جب آپ کی پیدائش ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے آپ کے دادا عبد المطلب کے دل میں آپ کی غیر معمولی طور پر محبت پیدا کر دی۔ عام طور پر ایسے حالات میں انسان کی توجہ پوتوں کی بجائے اپنے دوسرے بیٹوں کی طرف ہوتی ہے مگر عبد المطلب کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کو تو ڈانٹ ڈپٹ لیتے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ محبت اور پیار رکھتے حالانکہ اُن کے لڑکے جوان تھے اور وہ اُن کی خدمت بھی کرتے رہتے تھے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت پیدا کر دی کہ آپ اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ آپ کو ہر وقت گودی میں اٹھائے رکھتے تھے۔ آپ کی محبت میں اشعار پڑھتے رہتے تھے اور اپنے بیٹوں کو ڈانٹتے رہتے تھے کہ اس کی قدر کیوں نہیں کرتے پھر عربوں میں رواج تھا کہ وہ بچے پالنے کے لئے دائیاں رکھا کرتے تھے آپ کی والدہ نے چاہا کہ انہیں بھی کوئی دائی مل جائے مگر غربت کی وجہ سے کوئی دائی نہ ملی۔ آخر اللہ تعالےٰ نے حلیمہ کو اس عظیم الشان خدمت کے لئے منتخب فرمایا۔ حلیمہ وہ تھی جسے ہر دروازہ سے محض اس لئے رد کیا گیا تھا کہ وہ ایک غریب عورت تھی اگر اُسے بچہ دیا گیا تو وہ اُسے کھلائے گی کہاں سے؟ گویا وہ جس کے گھر میں اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پرورش کا سامان کرنا تھا اُس کے لئے اللہ تعالےٰ نے مکہ کے تمام بچے حرام کر دئے۔ وہ جس گھر میں بھی گئی اُسے یہی کہا گیا کہ ہم تمہیں اپنا بچہ نہیں دے سکتے، تم بچے لے گئیں تو اُسے کھلاؤ گی کہاں سے۔ گویا سارے مکہ میں اُس روز ایک بچہ ایسا تھا جسے کوئی دایہ نہ ملی اور ایک دایہ ایسی تھی جسے کوئی بچہ نہ ملا۔ جب شام ہو گئی اور اُدھر حلیمہ کسی بچہ کے ملنے سے مایوس ہو گئی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی والدہ کسی دایہ کے ملنے سے مایوس ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے حلیمہ کے دل میں ڈالا کہ گو یہ بچہ غریب گھرانے کا ہے اور اس کا والد فوت شدہ ہے مگر میرا خالی جانا دوسرے لوگوں کی ہنسی کا موجب ہو گا چلو میں اسی کو لے چلوں چنانچہ وہ آئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گئی۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے اس کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت ڈال دی کہ آپ کا دم بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہونا اُس پر سخت گراں گزرتا اور وہ آپ کی محبت میں بے تاب ہو جاتی۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ آپ ذرا بھی اُس کی آنکھ سے اوجھل ہوتے تو وہ اپنے بچوں کو ڈانٹنے لگ جاتی کہ تم اُسے چھوڑ کر کیوں آ گئے ہو اور پھر آپ کو لانے کیلئے دوڑ پڑتی۔

۲۱۱ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی کی صداقت کا ثبوت

غرض باپ کے بعد آپ کو پرورش کے لئے حلیمہ جیسی دائی ملی، عبد المطلب جیسا محبت کرنے والا دادا ملا اور پھر جب عبد المطلب فوت ہو گئے تو اللہ تعالےٰ نے آپ کے چچا ابو طالب کے دل میں آپ کی محبت ڈال دی۔ ابو طالب کو بھی آپ سے بے انتہا محبت تھی ایسی محبت کہ میرے نزدیک دنیا میں بہت کم چچا ہوں گے جنہوں نے اپنے کسی بھتیجے کو اس محبت کے ساتھ پالا ہو۔ جوان ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے ایک مالدار عورت کے دل میں آپ کی محبت پیدا کر دی اور خود اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اِن سے شادی کر لوں کیونکہ یہ بہت ہی بلند اخلاق کے مالک ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے گھر بار کا سامان پیدا کر دیا۔ پھر یتیم کے لئے ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں باپ زندہ ہوتے ہیں تو اُن کی خوشنودی کے لئے لوگ دوستیاں اختیار کرتے ہیں لیکن جب مر جاتے ہیں تو اُن کے تمام تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور دوستی کا خیال تک بھی اُن کے دل میں کبھی نہیں آتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے والدین چونکہ فوت ہو چکے تھے اس لئے طبعی طور پر آپ کو بھی ساتھیوں اور دوستوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے ابو بکرؓ اور حکیم بن حزام جیسے دوست

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝

اور (دیکھ تو کہ جب) اس نے تجھے (اپنی قوم کی اصلاح کی فکر میں) سرگرداں پایا تو (صحیح) راستہ بتا دیا ۝۸

آپ کو عطا فرما دے۔ ابوبکرؓ تو شروع میں ہی اسلام لے آئے مگر حکیم بن حزام مدتوں کافر رہا مگر کفر کی حالت میں بھی جب لوگ آپ کی مخالفت کرتے تو وہ اُن کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ ایک دفعہ وہ باہر تجارت کے لئے گیا تو وہاں اُس کو ایک خاص قسم کا کپڑا ملا وہ کپڑا اُسے بہت پسند آیا اور اُس نے دل میں کہا کہ اِس کپڑے کو پہننے کے قابل میرے دوست محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کوئی اَور نہیں۔ چنانچہ وہ کپڑا لیکر مدینہ پہنچا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے یہ کپڑا بڑا پسند آیا تھا میں آپ کے لئے لے آیا ہوں کیونکہ آپ کے سوا کسی کو نہیں سج سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کافر کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا ہاں اگر چاہو تو مجھ سے قیمت لے لو۔ اُس نے کہا اچھا اگر آپ تحفہ قبول نہیں فرماتے تو قیمت ہی دے دیں کیونکہ میری خواہش یہی ہے کہ آپ اس کپڑے کو پہنیں یہ کتنا عشق ہے جو ایک کافر کے دل میں آپ کے متعلق تھا اُس نے اپنے مذہب کو نہیں چھوڑا مگر کفر کی حالت میں بھی آپ سے اِس قدر پیار تھا کہ سب سے اچھی چیز جو ملی اُس کا مستحق آپ کو قرار دیا اور تیرہ منزلیں مارتا ہُوا مکہ سے مدینہ پہنچا تا آپ کی خدمت میں وہ تحفہ پیش کرے۔ خدا تعالےٰ نے اُس کو کافر رکھا اور دیر تک رکھا۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لئے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی وجہ سے لوگ آپ سے محبت کرتے تھے کسی اور وجہ سے نہیں۔ پھر غلاموں میں سے زیدؓ اور رشتہ داروں میں سے علیؓ۔ غرض اللہ تعالےٰ نے آپ کو ایسے ساتھی دئے جو کسی یتیم کو ملنے ناممکن ہوتے ہیں۔

ضَآلًّا

۵ حل لغات۔ ضَآلًّا: ضَلَّ سے اسم فاعل ہے اور ضَلَّ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں ضِدُّ اِهْتَدٰى اَیْ جَارَ عَنْ دِيْنٍ اَوْ حَقٍّ اَوْ طَرِيْقٍ۔ وہ دین یا سچائی کے راستہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلا گیا یا اصل راستہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا نیز ضَلَّ فُلَانٌ الطَّرِيْقَ وَعَنْ طَرِيْقِهٖ کے معنے ہیں لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ۔ اُسے راستہ کا پتہ نہ لگا وَكَذَا الدَّارُ وَالْمَنْزِلُ وَكُلُّ شَيْءٍ مُقِيْمٍ لَا يُهْتَدٰى لَهٗ اسی طرح ہر وہ چیز جس کا پتہ نہ لگے یا جس کی طرف جانے کا رستہ نہ ملے اُس پر بھی اِس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے (اقرب) ایک ہوتا ہے راستہ بھول جانا اور گمراہ ہو جانا۔ اور ایک ہوتا ہے راستے کا علم نہ ہونا۔ یہ دو الگ الگ مفہوم ہیں اور یہ دونوں معنے ضَلَّ میں پائے جاتے ہیں اور ضَلَّ فُلَانٌ اَلْفَرَسَ اَوِ الْبَعِيْرَ کے معنے ہوتے ہیں ذَهَبَا عَنْهُ گھوڑا یا اونٹ کھویا گیا اور ہاتھ سے جاتا رہا ضَلَّ عَنِّيْ كَذَا کہتے ہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں ضَاعَ۔ وہ چیز ضائع ہو گئی۔ اور ضَلَّ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں مَاتَ وَصَارَ تُرَابًا وَعِظَامًا وہ مر گیا اور مر کے مٹی ہو گیا۔ ضَلَّ الْمَآءُ فِي اللَّبَنِ کے معنے ہوتے ہیں خَفِيَ وَغَابَ۔ دودھ میں پانی غائب ہو گیا (اقرب) ضَلَّ کے معنے کسی کام میں منہمک ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں جیسے قرآن کریم میں آتا ہے ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف ع۱۲) اُن کی تمام تر کوششیں دنیوی زندگی کے کاموں میں ہی صرف ہو گئیں اسی طرح ضَلَال کے ایک معنے محبت شدیدہ کے بھی ہوتے ہیں دراصل یہ معنے بھی ضَلَّ سَعْيُهُمْ والے معنوں سے ملتے جلتے ہیں کیونکہ محبت میں بھی انسان کامل طور پر ایک طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مفردات والے لکھتے ہیں یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت اُن کے بیٹوں نے کہا اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (یوسف ع۱) ہمارا باپ کھلی کھلی ضلال میں مبتلا ہے۔ اس میں ضلال کے معنے گمراہی کے نہیں بلکہ اِشَارَةٌ اِلٰى شَغَفِهٖ بِيُوْسُفَ وَشَوْقِهٖ اِلَيْهِ۔ اِس میں اُن کی اُس محبت اور شوق ملاقات کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنے دل میں رکھتے تھے۔ گویا ضلال کے ایک معنے کمال درجہ کی محبت اور انتہاء درجہ کے شوق کے بھی ہیں اسی طرح قرآن کریم میں جو آتا ہے۔

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (یوسف ع۳) اس میں بھی ضلال کے معنے بلے انتہا محبت کے ہیں غرض ضلال کا لفظ جہاں اور معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے وہاں اس کے ایک معنے انتہا درجہ کی محبت کے بھی ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ حل لغات میں جو مختلف معانی بیان کئے جا چکے ہیں اُن کے لحاظ سے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے بھی مختلف معنے ہو جائیں گے۔

پہلے معنے تو اس آیت کے یہ ہیں کہ تمہیں ہمارا راستہ معلوم نہ تھا، تم شریعت سے بے خبر تھے، تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کے کیا ذرائع ہیں۔ ایسی حالت میں ہم نے اپنی شریعت تم پر نازل کی اور تمہیں اپنی طرف آنے کا راستہ دکھا دیا۔ دنیا کا کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جس میں کوئی شریعت نہیں تھی مگر اس کے باوجود آپ دن رات خدا تعالےٰ کی طرف متوجہ رہتے تھے اور اُسکے قرب اور وصال کے حصول کے متمنی تھے اُس ملک میں عیسائی بھی موجود تھے اور یہودی بھی موجود تھے اور یہ دونوں قومیں وہ ہیں جن کے پاس خدا تعالےٰ کا کلام موجود تھا مگر باوجود اس کے کہ خدا تعالےٰ کا کلام اُن کے پاس تھا انہیں خدا تعالےٰ کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اس سے کلّی بیگانگت کی حالت میں اپنی زندگی کے ایام بسر کر رہے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپکے پاس خدا تعالیٰ کا کوئی کلام نہیں تھا مگر پھر بھی آپ خدا تعالےٰ کیطرف متوجہ تھے پس یہ امر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درجہ کی بلندی اور آپ کی عظمت کا ایک یقینی ثبوت ہے کہ خدا تعالےٰ کا کلام اپنے پاس رکھنے والے تو خدا تعالےٰ سے دُور ہو گئے مگر جس کے پاس خدا تعالےٰ کا کوئی کلام نہیں تھا وہ خدا تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا گیا۔ جب خدا تعالےٰ نے دیکھا کہ یہ وہ شخص ہے جو ہماری طرف آنا چاہتا ہے مگر اسے ہمارے قرب اور وصال کے راستوں کا علم نہیں ہے تو اُس نے آپ پر شریعت نازل کر دی اور اس طرح تمام راستوں کو آپؐ پر منکشف کر دیا۔

آپؐ کا پہلے اِس کو چہ سے ناواقف ہونا ہرگز قابل اعتراض امر نہیں۔ ہر صاحب شریعت نبی پر جب خدا تعالےٰ کی وحی نازل ہوتی ہے تب اُسے شرعی راستہ کا علم ہوتا ہے اس سے پہلے وہ اُس راستہ سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی بات اس جگہ بیان کی گئی ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تجھے ہمارے راستے کا علم نہیں تھا پھر ہم نے اپنے فضل سے تجھے وہ راستہ دکھا دیا جس کی جستجو تیرے دل میں پائی جاتی تھی

ضَلَّ کے ایک معنے خَفِیَ وَ غَابَ کے بھی بتائے جا چکے ہیں اُن معنوں کے لحاظ سے اس آیت میں خدا تعالیٰ اپنی قدرت اور مہربانی کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن ضحیٰ آئے گی۔ بڑی بڑی ترقیات اسلام اور مسلمانوں کو حاصل ہوں گی اور لوگ تیرے متعلق کہیں گے واہ وا کیا خوب آدمی تھا۔ کتنے عمدہ کمالات اپنے اندر رکھتا تھا، کتنے بڑے فضائل اور محاسن کا مالک تھا۔ کس طرح اُس نے دنیا میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا اور بھولی بھٹکی مخلوق کو خدا تعالےٰ کے آستانہ پر لا ڈالا۔ مگر ہم اُن سے کہتے ہیں وہ غور کریں اور سوچیں کہ آخر تجھے کس نے چُنا۔ کس نے دنیا کی ہدایت کے لئے تیرا انتخاب کیا، کون تھا جو تجھے گوشۂ گمنامی سے دنیا کے سامنے نکال کر لایا۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہماری نظر ہی تھی جس نے تجھے منتخب کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک قیمتی موتی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل پڑا ہے لوگ اُس کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کس قدر آب و تاب رکھنے والا ہے۔ ہم نے کان میں سے اُس موتی کو نکالا اور اُسے دنیا کے سامنے لا رکھا۔ ہم نے کفرستان میں ایک ہیرا پڑا ہوا دیکھا ایسا ہیرا جس کا کوئی ثانی نہیں تھا ہم نے کفرستان میں سے اُس ہیرے کو اُٹھایا اور انسانیت کے تاج میں لگا لیا۔ آج تیری چمک کو دیکھ کر دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں۔ وہ تیرے حسن اور تیرے جلال اور تیرے کمال کو دیکھ کر رطب اللسان ہیں مگر وہ نہیں دیکھتے کہ یہ سب کچھ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے۔ تُو لوگوں کی نگاہوں سے بالکل غائب تھا اور دوسروں کا تو کیا ذکر ہے تُو خود بھی نہیں جانتا تھا کہ تیرے اندر

ضلال کے معنے بے انتہا محبت کے

۲۰۱

وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے چار معنے

کون سے کمالات ودیعت کئے گئے ہیں۔ ہم تجھے نکال لائے اور تیری شوکت اور عظمت کو دنیا پر ظاہر کر دیا ورنہ اور کون تھا جو تیری فطرتِ صحیحہ کو پہچان سکتا، ہم ہی تھے جنہوں نے تجھے پہچانا اور گمنامی کے گوشوں سے نکال کر تجھے دنیا میں عزت کے ساتھ مشہور کر دیا۔

وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کے دوسرے معنے

(۲) پھر ضلال کے ایک معنے محبت شدیدہ کے بھی بتلائے جا چکے ہیں اُن کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھ کو شدید محبت میں مبتلا دیکھا۔ تیرے اندر تڑپ تھی اپنے پیدا کرنے والے کے لئے تو زمین کو دیکھتا، تو آسمان کی بناوٹ پر غور کرتا اور تیری فطرت تجھے کہتی کہ اس کارخانۂ عالم کو پیدا کرنے والا ایک خدا ضرور ہے مگر اُدھر تو اُس قوم میں پیدا ہوا تھا جس کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی اور جسے خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ معلوم نہیں تھا ہم نے دیکھا کہ جیسے یوسفؑ کے لئے یعقوبؑ تڑپ رہا تھا اُس سے بھی زیادہ شوق اور محبت کے ساتھ تُو اپنے پیدا کرنیوالے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ تیری فطرت تجھے ہماری طرف توجہ دلاتی تھی مگر تجھے ہمارا راستہ ملتا نہ تھا۔ نیچر کی انگلیاں اُٹھ اُٹھ کر تجھے بتاتی تھیں کہ تیرا کوئی مالک ہے، تیرا کوئی خالق ہے، تیرا کوئی رازق ہے۔ تُو چاروں طرف دیکھتا اور کہتا کہ میرا خالق اور مالک کہاں ہے؟ میں اُس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اور چونکہ کوئی شریعت نہیں تھی جس پر چل کر تُو ہمارے پاس پہنچ جاتا اس لئے جب ہم نے تیری اس تڑپ اور محبت کا مشاہدہ کیا تو فَهَدٰى اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے آواز دے دی کہ ہم یہاں ہیں ہمارے پاس آجاؤ۔

وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کے تیسرے معنے

پھر اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم شاید تُو اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کر دیگا کہ یہ لوگ کیوں تجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ضَلَّ کے ایک معنے مر کھپ جانے کے بھی ہیں پس وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى میں اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے دیکھا کہ تُو اپنی قوم کی تباہی اور گمراہی کو دیکھ کر مر رہا تھا، تو اُن کے کفر کو دیکھتا تھا، تو ان کی بداخلاقیوں کو دیکھتا تھا، تو اُن کی چوریوں کو دیکھتا تھا، تو اُن کے ڈاکوں کو دیکھتا تھا، تُو اُن کے اسراف کو دیکھتا تھا، تُو اُن کی اخلاقی اور عائلی کوتاہیوں کو دیکھتا تھا، تُو انکو علم میں تمام دوسری قوموں سے پیچھے دیکھتا تھا، تو انکو سیاست میں تمام دوسری قوموں کے پیچھے دیکھتا تھا اور ہم دیکھتے تھے کہ جسطرح تُو ہم سے ملنے کیلئے مر رہا تھا اسی طرح تو اپنی قوم کیلئے بھی مر رہا تھا۔ جس طرح تو ہماری محبت کیلئے بیتاب ہو رہا تھا اسی طرح اپنی قوم کے درد میں بھی ہلاک ہو رہا تھا گویا تجھ پر وہی کیفیت تھی جو ہم دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر چکے ہیں کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ جب ہم نے دیکھا کہ تُو اپنی قوم کے لئے مر رہا ہے، اُس کے غم میں ہلاک ہو رہا ہے، اُس کی اصلاح کے فکر میں گھلتا چلا جا رہا ہے اور دن رات تجھے یہی تڑپ اور یہی فکر ہے کہ کسی طرح میری گری ہوئی قوم ترقی کرے تو ہم نے تجھے وہ رستہ دکھا دیا جس پر چل کر تیری قوم اس موت سے بچ جائے یعنی تجھے قرآن دے دیا جس میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو نہ صرف مکہ والوں کی تباہی کو دُور کر سکتی ہیں بلکہ ساری دنیا کی ہلاکت اور بربادی کا واحد علاج ہیں پس وَوَجَدَكَ ضَالًّا میں اُس جذبۂ اصلاح کی طرف اشارہ ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب میں اپنی قوم کی اصلاح اور پھر ساری دنیا کی اصلاح کے متعلق نمایاں طور پر پایا جاتا تھا اور درحقیقت یہ جملہ ترجمہ ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کی آیت کا۔ بَاخِعٌ کے معنے صرف گردن کاٹنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس رنگ میں گردن کاٹنے کے ہوتے ہیں کہ انسان گردن کی پچھلی نسوں تک اسے کاٹتا چلا جائے اور آخری حد تک اسے پہنچا دے۔ اس طرح بتایا کہ تجھے اپنی قوم کے افراد اور اُس کے خدا تعالیٰ سے دُور چلے جانے کا اس قدر غم اور اس قدر صدمہ تھا کہ گویا اس غم میں اپنی ساری گردن کاٹ بیٹھا تھا۔

خدا تعالیٰ کی محبت کے لحاظ سے تو اس آیت کے یہ معنے ہیں

کہ ہم نے تجھ کو اپنی محبت میں بے انتہاء صدمہ رسیدہ دیکھا اور آخر تجھے وہ راستہ بتا دیا جس پر چل کر تو ہمارے پاس پہنچ سکتا اور قوم کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے تجھے اپنی قوم کے غم میں بالکل مردہ کی طرح پایا جب ہم نے یہ حالت دیکھی تو ہم نے تجھے وہ شریعت دے دی جس سے یہ گری ہوئی اور تباہ شدہ قوم بھی ترقی کی طرف دوڑ پڑے۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالےٰ نے اُن احسانات کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کئے۔ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی میں تو یہ بتایا کہ ہم نے تیرے جسمانی یتم میں تجھے جسمانی رشتہ دار عطا کئے۔ تُو اس بات کا محتاج تھا کہ کوئی شخص تیری پرورش کرنے والا ہوتا، تجھے محبت اور پیار سے رکھتا اور تیری ضروریات کو پورا کرتا۔ سو اللہ تعالےٰ نے یکے بعد دیگرے ایسے لوگ کھڑے کر دیئے جو انتہائی توجہ کے ساتھ تیری پرورش کا فرض سرانجام دیتے رہے اور ہر موقع پر جسمانی طور پر تیری مدد کرتے رہے دوسری طرف روحانی یتم کے لئے ہم نے اپنی محبت اور اپنا فیضان تجھ کو عطا کیا اور تجھے ایسی تعلیم عطا کی جو مکّہ والوں کو قعرِ مذلت سے اُٹھا کر ترقی کے بلند ترین مینار پر پہنچانے والی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک دعوےٰ تھا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا جارہا تھا مگر دعوےٰ وہ تھا جسے پرکھا جا سکتا تھا۔ قرآن کریم لوگوں کے سامنے موجود تھا اور انہیں کہا جا سکتا تھا کہ آؤ اور دیکھو کہ اس میں قوموں کو اُبھارنے والی تعلیم موجود ہے یا نہیں اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قرب اور آپ کے تعلق باللہ کو وہ آپ کی دعاؤں اور آپ کے نشانات کے ذریعہ دیکھ سکتے تھے۔ غرض نہ وہ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی کی صداقت کا انکار کر سکتے تھے اور نہ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی کی صداقت کا انکار کر سکتے تھے۔ اللہ تعالےٰ ان دو مثالوں کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جبکہ تیری جسمانی پرورش بھی ہم نے کی اور تیری روحانی پرورش بھی ہم نے کی اور ہر قدم پر تیرے ساتھ اپنی تائید رکھی۔ تُو جسمانی توجہ کا محتاج تھا تو ہم نے تیری جسمانی پرورش کی طرف توجہ کی۔ تُو روحانی توجہ کا محتاج تھا تو ہم نے تیری روح پر شفقت کی نظر ڈالی۔ جب ہماری محبت تیرے دل میں پیدا ہوئی تو ہم نے تجھے اپنا چہرہ دکھا دیا اور جب بنی نوع انسان کی محبت تیرے دل میں پیدا ہوئی اور اُن کی خرابیوں نے تجھے بے چین کر دیا تو اُن کی اصلاح اور حالات کی درستی کے لئے اپنی شریعت تجھ پر نازل کر دی۔ جب ہم اپنی محبت اور اپنے سلوک کا اس قدر نمونہ تیری ذات میں دکھا چکے ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آئندہ ترقیات اور ضحیٰ کے متعلق جو خبر دی گئی ہے وہ بھی پوری ہو کر رہیگی۔ جس خدا نے تجھے پیچھے نہیں چھوڑا وہ آئندہ تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ وجہ کیا ہے کہ ضَلَال کے اور معنے تو لے لئے گئے ہیں مگر ایک معنوں کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ ضَلَال کے ایک معنے گمراہ ہو جانے، خرابی میں مبتلا ہو جانے اور درستہ کو چھوڑ دینے کے بھی ہیں مگر اُن معنوں کو چھوا تک نہیں گیا۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم اس آیت کے یہ معنے کیوں نہ کر لیں کہ اُس نے تجھے گمراہ پایا تھا پھر اُس نے تجھے ہدایت دیدی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنے اِس لئے چھوڑے گئے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے۔ دشمن اس آیت کے یہ معنے کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جادۂ اعتدال کو یا جادۂ شریعت سے اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ یہ معنے خواہ لغتاً صحیح ہوں ہمارے نزدیک اس مقام پر کسی صورت میں بھی چسپاں نہیں ہو سکتے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ہدایت ہمیشہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک ہدایت شرعی اور ایک ہدایت طبعی یا فطری۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ تم یہ معنے کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گمراہ پایا اور پھر انہیں ہدایت دی۔ ہم اُن سے کہتے ہیں کہ دنیا میں ہدایت کی دو ہی قسمیں ہوتی ہیں یا ہدایت شرعی ہو جس سے انسان انحراف اختیار کرے یا ہدایت طبعی اور فطری ہو جس کے خلاف عمل کرنے کے لئے وہ تیار ہو جائے۔ ان دو قسم کی ہدایتوں کے سوا اور کوئی ہدایت نہیں ہو سکتی۔ پس وہ لوگ جو اپنے معنوں پر اصرار کرتے ہیں ہم اُن سے

اس بات کا ثبوت کہ وَجَدَكَ ضَآلًّا میں ضَآل کے معنے گمراہ ہو جانے کے نہیں

دریافت کرتے ہیں کہ اس آیت کے کیا معنے ہوں گے؟ کیا یہ معنے ہوں گے کہ ضَلَّ مُحَمَّدٌ عَنْ شَرِيْعَةِ الْمُسْتَقِلَّةِ الَّتِيْ كَانَتِ الْقَوْمُ عَلَيْهَا۔ کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اُس شریعت سے گمراہ ہو گئے جس پر قوم چل رہی تھی۔ اگر ہم یہ معنے کریں تو بالکل غلط ہوں گے کیونکہ اُس وقت کوئی شریعت تھی ہی نہیں اور کوئی شخص بھی یہ تسلیم نہیں کرتا خواہ وہ اسلام کا کیسا ہی شدید معاند کیوں نہ ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم کسی شریعت پر قائم تھی اور آپ اُس شریعت سے پھر گئے تھے۔ پس جو بات بالبداہت غلط ہے اور جس کی تکذیب کے لئے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں وہ بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کس طرح کی جا سکتی ہے اور کس طرح اس آیت کے یہ معنے کئے جا سکتے ہیں کہ آپ شریعت سے گمراہ ہو چکے تھے مگر خدا تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دے دی۔ جب کوئی شریعت آپ کی قوم میں موجود ہی نہیں تھی اور آپ کسی شریعت کے مخاطب ہی نہیں تھے تو گمراہی اور ضلالت کے کیا معنے ہوئے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے تھے اُس کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی، کوئی آسمانی قانون نہیں تھا جس پر وہ عمل کرتی، کوئی وحی نہیں تھی جس کو وہ اپنے سامنے رکھا کرتی۔ ایسی صورت میں ہم یہ معنے کس طرح کر سکتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شریعت سے پھر گئے تھے۔ شریعت تو اُس وقت کوئی تھی ہی نہیں جس کے آپ مخاطب ہوتے۔

دوسرے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ شریعت تو اُس وقت بیشک کوئی نہیں تھی مگر آپ نعوذ باللہ بداخلاق تھے، جادۂ اعتدال سے منحرف ہو چکے تھے، ہدایتِ طبعی جو اخلاقی اور فطرتی ہدایت ہوتی ہے اُس کے قانون کو آپ نے توڑ رکھا تھا اور خدا تعالےٰ نے اسی کی طرف وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى میں اشارہ کیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا یہ معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں یا نہیں۔ وہمیری کہتا ہے کہ ضَآلًّا کے معنے بداخلاق کے ہیں گویا اُسکے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا داغدار ہونا اس آیت میں بیان کیا گیا ہے مگر وہمیری تو اس آیت کے یہ معنے کرتا ہے اور خدا تعالیٰ دوسری جگہ ان معنوں کو بالکل غلط اور بے ہودہ قرار دیتے ہوئے

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے تُو لوگوں کو چیلنج دے کہ اگر اُن میں ہمت ہے تو وہ تیری چالیس سالہ ابتدائی زندگی کا کوئی ایک عیب ہی ثابت کر دیں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چیلنج دیا اور فرمایا فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع ۲) میں تم میں چالیس سال تک رہا ہوں اور تم میری زندگی کو دیکھتے چلے آئے ہو اگر تم میں ہمت ہے تو تم سب کے سب مل کر میری ابتدائی چالیس سالہ زندگی کا کوئی ایک عیب ہی ثابت کر کے دکھا دو مگر یاد رکھو تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے کیونکہ میری زندگی بالکل بے عیب ہے اور خدا تعالےٰ نے مجھے ہر قسم کے گناہ سے آج تک محفوظ رکھا ہے۔ اب بتاؤ کہ ہم یہ دوسرے معنے بھی کس طرح کر سکتے ہیں؟ شریعت سے انحراف والی بات تو اس لحاظ سے بالبداہت باطل تھی کہ اُس وقت آپ کی قوم کے پاس کوئی شریعت کی کتاب تھی ہی نہیں جس سے انحراف کرنے کا الزام آپ پر عائد ہو سکتا۔ باقی رہا اخلاق میں کسی قسم کے نقص کا ہونا سو اس کے متعلق محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قرآن کریم میں دعوے موجود ہے کہ میں تم میں ایک لمبا عرصہ رہ چکا ہوں تم میری اس زندگی کا کوئی ایک عیب بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ اس چیلنج کے یہ معنے نہیں تھے کہ میں تم میں ایک لمبا عرصہ رہ چکا ہوں بتاؤ میں نے قرآن کے احکام پر اُس زندگی میں عمل کیا تھا یا نہیں؟ کیونکہ قرآن کریم تو اس دعوے کے وقت میں نازل ہونا شروع ہوا۔ پہلے تو قرآن کریم تھا ہی نہیں۔ پس اس آیت میں ہدایتِ طبعی کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ہدایتِ شرعی کی طرف۔ اور اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے کہ تُو لوگوں کو چیلنج دے اور اُن سے کہہ کہ وہ بتائیں کہ کیا میری چالیس سالہ زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا آیا جب میں نے ہدایتِ طبعی یعنی اخلاق کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا ہو جب کوئی ایک بُرائی بھی تم میری طرف منسوب نہیں کر سکتے، جب کوئی ایک بدی بھی تم میرے اندر ثابت نہیں کر سکتے تو اب کس طرح کہتے ہو کہ میں بُرا ہوں۔ غرض یہاں یہ دونوں معنے بھی ایسے نہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہو سکتے ہوں۔ جہاں تک ہدایتِ شرعی کا تعلق ہے عیسائی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نزول قرآن سے قبل اہل مکہ کے پاس

کوئی شرعی قانون نہیں تھا اور جب وہ کسی شریعت کے پابند ہی نہیں تھے تو وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعت سے منحرف ہو گئے تھے۔ دوسرے معنے ہدایت طبعی سے انحراف کے ہو سکتے ہیں مگر وہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ قرآن کریم میں آپ کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی زندگی کے متعلق چیلنج موجود ہے اور لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ آپ نے بے عیب زندگی بسر کی تھی۔ جب دونوں معنے آپ پر چسپاں نہیں ہو سکتے تو دشمنان اسلام کا اس آیت کے یہ معنے کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ گمراہ ہو گئے تھے اس مقام پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا تو خدا تعالےٰ کی گواہی ہے لیکن فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اپنی ذات کے متعلق محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی گواہی ہے ان دونوں گواہیوں میں سے بہرحال خدا تعالےٰ کی گواہی کو مقدم قرار دیا جائے گا۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی گواہی کو مؤخر سمجھا جائے گا۔ اس لحاظ سے بات وہی درست ہو گی جس کی خدا تعالےٰ نے گواہی دی نہ وہ بات جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے پیش کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ گواہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی گواہی ہے۔ چنانچہ قُلْ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے اس گواہی کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ ہم تمہارے متعلق اس گواہی کو پیش کرتے ہیں تم لوگوں کے سامنے اسے پیش کرو اور انہیں چیلنج دو کہ اگر ان میں ہمت ہے تو وہ تمہاری زندگی میں کوئی عیب ثابت کریں۔ چنانچہ اصل آیت یوں ہے۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع۲) اس آیت میں قُلْ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے بھی اپنی گواہی ساتھ شامل کر دی ہے صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اکیلی گواہی نہیں رہی۔ غرض وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اگر خدا تعالےٰ کی گواہی ہوتی اور فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی گواہی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ خدائی گواہی کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات کے متعلق گواہی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن خدا تعالےٰ نے قُلْ کہہ کر اپنی گواہی بھی ساتھ ہی شامل کر دی ہے۔ تا یہ نہ سمجھا جائے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اپنے پاس سے کہی ہے پس ان میں سے کوئی گواہی بھی دوسری گواہی کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

جب دشمن بحث سے تنگ آ جاتے اور دلائل کے میدان میں وہ بالکل بے بس ہو جائے۔ تو بعض دفعہ تنگ آ کر وہ کہہ دیا کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خدا تعالےٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا ایک دعویٰ ہے۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اپنی طرف سے بات کہنا تعلّی اور لاف زنی ہے۔ دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ کیا لوگ بھی آپ کو ایسا ہی بے عیب سمجھتے تھے جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا۔ اگر لوگ آپ کو بے عیب نہیں سمجھتے تھے تو محض تعلّی کے طور پر ایک بات پیش کر دینے سے کیا بن جاتا ہے۔ لوگ تو جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔ اور یہ تعلّی صداقت سے کس قدر دور ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر لوگوں کی گواہی کو لو تب بھی ان کی شہادت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخ سے یہ امر ثابت ہے۔ کہ دعویٰ نبوت سے پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگ صدوق اور امین سمجھتے اور آپ کی راستبازی کے وہ صد درجہ قائل تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جب آپ کو

انذار کا حکم ہُوا تو صفا پہاڑی پر آپ کھڑے ہوئے اور آپ نے نام لے لے کر مختلف قبائل کو بُلانا شروع کیا۔ جب تمام لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپ نے فرمایا۔ اچھا یہ بتاؤ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات کو مان لوگے؟ انھوں نے کہا۔ ہاں۔ کیونکہ ہم نے آپکو ہمیشہ سچ بولنے والا پایا ہے (بخاری جلد سوم ابواب التفسیر تفسیر سورۃ الشعراء زیر آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ) حالانکہ یہ بات ایسی تھی جسے بظاہر کوئی شخص تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا وجہ یہ ہے کہ مکہ کے لوگوں کے جانور وادی میں چرا کرتے تھے اور وہ ایسا علاقہ تھا کہ جس میں کسی لشکر کا چھپ رہنا ممکن تھا۔ کیونکہ وہاں کوئی درختوں کا جنگل نہ تھا بلکہ کھلا میدان تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ ظاہری حالات کے لحاظ سے ایسا بالکل ناممکن تھا کہ کوئی لشکر آئے اور مکہ والوں کو اس کا علم نہ ہو۔ پھر بھی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے (یہ پہاڑ دراصل ایک معمولی ٹیلہ ہے۔ ڈلہوزی شملہ جیسا پہاڑ نہیں) ایک لشکر چھپا ہُوا ہے اور وہ تم پر حملہ کرنیوالا ہے تو کیا تم میری بات کو مان لوگے یا نہیں؟ تو اُن سب نے یہ جواب دیا کہ ہم ضرور مان لیں گے۔ جس کے معنے یہ تھے کہ گو یہ بات بالکل ناممکن ہے مگر چونکہ آپ کہہ رہے ہیں اور آپ وہ ہیں جنہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اِس لئے ہم اس ناممکن بات کو بھی ممکن سمجھ لیں گے اور آپ کی بات کو درست قرار دے دیں گے۔ جب انہوں نے آپ پر اس قدر اعتماد کا اظہار کر دیا تو آپ نے فرمایا۔ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے تم اپنی اصلاح کر لو۔ یہ سنتے ہی سب لوگ آپ کو پاگل کہتے اور ہنسی اڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے دشمن کی یہ گواہی اس صداقت اور راستبازی کا ایک

آنحضرت کے صدوق و امین ہونیکے متعلق آپ کے زمانہ والوں کی گواہی

یقینی ثبوت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر پائی جاتی تھی۔

اسی طرح خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت جب حجرِ اسود کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کے متعلق قبائل قریش میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا یہاں تک کہ وہ آپس میں کٹ مرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ اُس وقت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس جھگڑے کو نپٹایا۔ اور تاریخ میں لکھا ہے کہ جب لوگوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو آتے دیکھا تو سب لوگ یک زبان ہو کر پکار اُٹھے کہ هٰذَا الْاَمِیْنُ رَضِیْنَا هٰذَا مُحَمَّدٌ۔ اَمِیْنٌ۔ اَمِیْنٌ۔ اور سب نے کہا کہ ہم اس کے فیصلہ پر راضی ہیں (ابن ہشام جلد اول) یہ کفار کی دوسری شہادت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے نہایت ہی اعلیٰ ہونے کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ قریب کی گواہ بیوی ہوتی ہے وہ اپنے شوہر کے جن حالات کو جانتی ہے عام لوگ اُن حالات کو نہیں جانتے۔ اس لئے خاوند کے متعلق بیوی کی گواہی اور تمام گواہیوں سے زیادہ معتبر شمار کی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ گواہی بھی حاصل ہوئی چنانچہ جب آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ نے گھبرا کر حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا تو حضرت خدیجہ رضنے ان الفاظ میں آپ کو تسلی دی۔ کہ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری باب بدء الوحی) خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رُسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں آپ لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں۔ آپ معدوم اخلاق کو اپنے اندر رکھتے ہیں۔ آپ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ آپ مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں۔ آپ جیسے انسان کو خدا کس طرح ضائع کر سکتا ہے۔ یہ بیوی کی گواہی ہے جو اس بات کو ثابت کر رہی ہے

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝

اور تجھے کثیر العیال پایا تو غنی کر دیا ؎۶

کہ آپ ان معنوں میں ضالّ نہیں تھے جو دشمن کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔

پھر بیوی نے تو آپ کی چالیس سالہ عمر کے وقت یہ گواہی دی تھی۔ اس سے پہلے آپ کی ۲۴ سالہ عمر میں حضرت خدیجہ کے غلاموں نے آپ کی نیکی اور راستبازی اور دیانت کی گواہی دی۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا مال تجارت دے کر شام میں بھجوایا تو واپسی پر حضرت خدیجہؓ نے ایک ایک غلام کو بلا کر اُس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات دریافت کئے۔ ہر غلام نے آپ کی تعریف کی اور ہر غلام نے کہا کہ ہم نے اس جیسا دیانتدار اور با اخلاق انسان اور کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت خدیجہؓ جانتی تھیں کہ تجارتی قافلوں کے ساتھ جن لوگوں کو بھیجا جاتا ہے وہ خود بہت سا مال کھا جاتے ہیں۔ مگر اُن غلاموں نے بتایا کہ انہوں نے نہ صرف خود کوئی مال نہیں کھایا بلکہ ہمیں بھی ناجائز طور پر کوئی تصرف نہیں کرنے دیا۔ جو رقم ان کے لئے مقرر تھی صرف وہی لیتے تھے اور اسی رقم میں سے کھانا بھی کھاتے تھے اس سے زائد انہوں نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ یہی وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر حضرت خدیجہ اس قدر متأثر ہوئیں کہ انہوں نے آپ کو شادی کا پیغام بھجوا دیا۔ غرض تمام گواہیاں جو بچپن سے لے کر چالیس سالہ عمر تک ملتی ہیں وہ سب کی سب اس بات کا ثبوت ہیں۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اخلاقی لحاظ سے گمراہ نہیں تھے اور جب کہ سب کی سب گواہیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو پاک اور بے عیب ثابت کر رہی ہیں تو وہ لوگ جو ضَالًّا کے معنے گمراہ ہو جانے کے کرتے ہیں وہ خود ہی بتائیں کہ اُن کے معنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کس طرح چسپاں ہو سکتے ہیں۔ شریعت سے گمراہ تو آپ ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ کوئی شریعت اُس وقت تھی ہی نہیں۔ اگر اخلاقی گمراہی مراد لو تو وہ بھی چسپاں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اوّل سے آخر تک تمام گواہیاں ثابت کر رہی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے تھے۔ جب آپ شریعت کے لحاظ سے بھی گمراہ نہیں تھے اور اخلاق کے لحاظ سے بھی گمراہ نہیں تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ تیسری کونسی گمراہی ہے جو آپ کے اندر پائی جاتی تھی۔ اگر کہو کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ کفر سے گمراہ ہو گئے تو ہم بے شک کہتے ہیں کہ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے کفر کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ مگر جو معنے مخالف کرتے ہیں وہ قطعی طور پر غلط ہیں کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک ایک گھڑی اور اُس وقت کے حالات دونوں ان معنوں کو بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔

عَائِلًا

؎۶ حل لغات۔ عَائِلًا: عَالَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور عَالَ عَيَالَهٗ کے معنے ہوتے ہیں كَفَاهُمْ مَعَاشَهُمْ وَمَانَهُمْ۔ اپنے اہل و عیال کے گزارہ کا پوری طرح بندوبست کیا۔ اور عَالَ الْيَتِيْمَ کے معنے ہوتے ہیں كَفَلَهٗ وَقَامَ بِهٖ۔ یتیم کے اخراجات کا ذمہ دار ہو گیا۔ اور عَالَ فُلَانٌ عَوْلًا کے معنے ہوتے ہیں كَثُرَ عِيَالُهٗ۔ اس کا کنبہ زیادہ ہو گیا۔ (اقرب) گویا اس کے دو معنے ہوئے۔ ایک معنے تو یہ ہیں کہ انسان دوسروں کا کفیل ہو جائے۔ اُن کے اخراجات کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لے اور اُن کی خبرگیری رکھے۔ اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ کثیر العیال ہو جائے۔

تفسیر۔ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى کے

دو معنے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم نے تجھ کو کثیر العیال پایا۔ اور تیری ضرورت پوری کر دی۔ دوسرے یہ کہ ہم نے دیکھا کہ تو ہی ایک ایسا شخص ہے جو ہر یتیم اور بے کس کی خبر گیری کرتا ہے اس لئے ہم نے بھی تجھے دولت دیدی تا کہ تو اُن کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ پہلے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ تُو اپنے عیال کی خبر گیری کے قابل نہ تھا مگر ہم نے دولت دے کر تیری غربت کو دُور کر دیا۔ اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ تیرے اندر یہ جذبۂ شوق پایا جاتا تھا کہ تو ہر مسکین اور یتیم کو پناہ دے۔ جو بھی درماندہ اور بیکس انسان تجھے نظر آتا۔ تُو اُسے اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیتا۔ اُس کے سر پر اپنی محبت کا ہاتھ رکھتا اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جب ہم نے تیرے اس جذبۂ محبت اور جذبۂ ہمدردی کو دیکھا۔ تو ہم نے بھی اپنی دولت تیرے سپرد کر دی تا کہ تُو ہمارے بیکس اور نادار بندوں کا کفیل ہو۔ یہاں دولت سے مراد صرف جسمانی دولت نہیں بلکہ روحانی دولت بھی مراد ہے اور یتامیٰ و مساکین سے مراد بھی صرف جسمانی یتامیٰ و مساکین نہیں بلکہ روحانی یتامیٰ و مساکین بھی مراد ہیں۔

جسمانی غرباء اور یتیم جو اُس وقت پائے جاتے تھے۔ اُن کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو تڑپ پائی جاتی تھی اور جس قدر ہمدردی اور محبت آپ کے قلب میں اُن کے متعلق موجود تھی اُس کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آسکتی۔ بے انتہاء تڑپ، بے انتہاء ہمدردی، اور بے انتہاء محبت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل میں قوم کے غرباء اور یتامیٰ کے متعلق پائی جاتی تھی۔ آپ اُن کے حالات کو دیکھتے تو بے تاب ہو جاتے۔ آپ کے دن بے چینی میں اور راتیں اضطراب میں کٹتیں محض اس وجہ سے کہ غرباء کا کوئی سہارا نہ تھا۔ یتامیٰ کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مساکین کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہ تھا۔ اللہ تعالےٰ جو آپ کے دل کے اسرار سے آگاہ تھا۔ اُس نے جب آپ کی اس بے انتہاء اور غیر معمولی تڑپ کو دیکھا تو آپ کی ان پاکیزہ خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اس نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دل میں یہ تحریک پیدا فرما دی کہ میں اپنا سب مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقف کر دوں۔ چنانچہ شادی کے بعد انہوں نے اپنا سب مال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرما دیا۔ اور آپ کو اختیار دے دیا کہ آپ اس روپیہ میں جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیشک خود غریب تھے مگر چونکہ غرباء کو دیکھ دیکھ کر آپ کا دل دُکھتا تھا اور آپ اُن کی غربت کو دور کرنے کا اپنے پاس کوئی سامان نہ پاتے تھے اس لئے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنا سارا مال آپ کے قدموں پر نثار کر دیا تو آپ کو اپنی خواہشات کے برلانے اور آرزوؤں کو پورا کرنے کا موقع میسر آگیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ہزاروں روپیہ رکھنے والی خاتون نہیں تھیں بلکہ لاکھ پتی خاتون تھیں مستقل طور پر اُن کی طرف سے متعدد قافلے تجارت کے لئے شام کی طرف آتے جاتے تھے اور یہ وسیع کاروبار وہی شخص کر سکتا تھا جو اپنے پاس لاکھوں روپیہ رکھتا ہو جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اس عدیم المثال قربانی کے نتیجہ میں دولت کے ڈھیروں ڈھیر مل گئے تو آپ نے وہ تمام مال قوم کے غرباء اور یتامیٰ و مساکین میں تقسیم کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کر لیا۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ بھی ہیں کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تڑپ تھی۔ کہ آپ کو خدا تعالےٰ کا وصال حاصل ہو۔ الٰہی قرب میں آپ کو جگہ ملے اور اس کا الہام آپ پر نازل ہو۔ اسی طرح عرب کی سرزمین میں خدا تعالےٰ کے کچھ اور بندے بھی اپنے رب کی محبت اور اس کے پیار کے لئے تڑپ رہے تھے۔ وہ بھی آرزو رکھتے تھے کہ ہمارا خدا ہم سے مل جائے۔ اُس کا وصال ہمیں میسر آئے۔ اُس کی محبت کی گود میں ہم جا بیٹھیں۔

اور اس کی پیاری اور میٹھی آواز ہمارے کانوں میں آئے۔ مگر وہ بے بس تھے بے کس تھے۔ کوئی راستہ اُن کو نظر نہیں آتا تھا۔ ایک تڑپ تو موجود تھی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اس تڑپ کا کیا علاج ہے۔ یہ لوگ جو اپنی اپنی جگہوں میں خدا کی رضا کے لئے تلملا رہے تھے۔ ان میں سے کوئی ابوبکرؓ تھا کوئی عمرؓ تھا۔ کوئی عثمانؓ تھا۔ کوئی علیؓ تھا۔ کوئی زیدؓ تھا۔ کوئی طلحہؓ تھا۔ کوئی زبیرؓ تھا۔ یہ سب لوگ خدا کی محبت میں گھلے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں گریاں اور اُن کے دل بریاں تھے۔ اس لئے کہ اُن کا محبوب اُن سے ملے۔ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم! ہم نے جب دیکھا کہ تیرے سوا اور لوگ بھی ہیں بلکہ ساری دنیا میں ہیں جو اپنے دلوں میں ہماری محبت رکھتے اور ہماری جستجو کے لئے بیچین ہیں تو ہم نے اُن کی تسلّی کے لئے تجھے وہ روحانی غذا مہیّا فرمادی جس کے بعد اُن کی بے کلی جاتی رہی اور وہ پوری سرعت کے ساتھ ہماری طرف دوڑنا شروع ہو گئے۔

گویا اس آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر فطرت کی تسلّی کی تعلیم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے اور اس طرح روحانی عیال کی خبرگیری کا سامان آپکو پوری طرح دے دیا ہے۔ کوئی فطرت نہیں جس کی آپ خبرگیری نہ کر سکتے ہوں۔ اور کوئی فطرت نہیں جس کے مناسبِ حال تعلیم آپ کی کتاب میں موجود نہ ہو۔ بیشک کفار اسلام کی اس جامع تعلیم کو تسلیم نہیں کر سکتے مگر انہیں اتنا تو دیکھنا چاہیئے کہ جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں اُن کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اور آیا اُن کو سکون اور اطمینان نصیب ہے یا نہیں۔ آخر وجہ کیا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ ایمان سے پہلے تو بے قرار تھے، بے چین اور مضطرب تھے۔ سمجھتے تھے کہ ہمیں منزلِ مقصود کا پتہ نہیں مگر جب ایمان لے آئے تو اُن کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہم جس مقصد کے لئے پیدا کئے گئے تھے وہ مقصد ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔ یہی بات اس زمانہ میں ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کے متعلق لوگوں کے سامنے بار بار پیش کرتے ہیں کہ بیشک تم مخالفت کرتے ہو مگر اسکا کیا جواب ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لائے ہیں ان کے دل مطمئن ہو چکے ہیں تسلّی کی ایک لہر ہے جو اُن کے قلوب میں پائی جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا خدا ہم سے مل گیا ہے۔ کیا کسی کاذب انسان کے ساتھ تعلق رکھنے کے نتیجہ میں بھی یہ ثلجِ خاطر حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ برکت تو اُسی شخص کو مل سکتی ہے جس نے کسی سچے کا دامن پکڑا ہُوا ہو۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ صرف تجھے ہم نے پالا اور تیری پرورش کا سامان کیا بلکہ تیرے ذریعے اور ہزاروں یتامیٰ و مساکین کی پرورش کا بھی ہم نے انتظام کر دیا۔ جسمانی یتیم جسمانی مسکین۔ جسمانی غریب اور جسمانی نادار روٹی کھا کر شہادت دے رہے ہیں۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک راستباز انسان ہیں اور روحانی یتیم ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ تیری تعلیم سے مطمئن ہو کر گواہی دے رہے ہیں کہ ہم بڑے بھوکے تھے اگر سیری حاصل ہوئی تو اِسی خوانِ ہُدیٰ سے جو اس پاک نفس انسان نے پیش کیا یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آئندہ بھی خدا ہمیشہ تیرے ساتھ ہوگا۔ ہمیشہ تیری تائید کرے گا۔ ہمیشہ تجھے اپنی نصرت عطا کرے گا۔ جو خدا آج تک تیرے کام آتا رہا ہے جس نے ایک لمحہ کے لئے بھی تجھے کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ آئندہ تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟

اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ آپ کے روحانی عیال جوں جوں زیادہ ہوتے جائیں گے اللہ تعالیٰ اُنکی خبرگیری کے سامان پیدا کرتا جائے گا۔ چنانچہ جس قدر معلّم مسلّم دین رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملے اور کسی نبی یا بزرگ کو نہیں ملے۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○

پس یتیم کو تو دبا نہیں ؎

بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جس کے پیچھے بھی چلوگے ہدایت پا جاؤگے۔

لَا تَقْهَرْ ؎ **حل لغات**۔ لَا تَقْهَرْ: قَهَرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور قَهَرَهٗ کے معنے ہیں غَلَبَهٗ۔ اُس پر غالب آیا۔ نیز کہتے ہیں اَخَذَهُمْ قَهْرًا۔ اور مراد یہ ہوتی ہے اَیْ مِنْ غَيْرِ رِضَاهُمْ یعنی بغیر اُنکی رضامندی کے اُن کو کام پر لگا لیا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے اَلْقَهْرُ: اَلْغَلَبَةُ وَالتَّذْلِيْلُ مَعًا وَيُسْتَعْمَلُ فِيْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا۔ یعنی قہر کے معنے ایسے غلبہ کے ہیں جس کے ساتھ مغلوب کی تذلیل بھی ہو۔ بعض اوقات قہر کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنے صرف غلبہ کے ہوتے ہیں یا صرف تذلیل کے (مفردات) پس لَا تَقْهَرْ کے معنے ہوئے۔ تو مغلوب کر (۲) ذلیل نہ کر۔

تفسیر۔ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ہم نے تیرے ساتھ غیر معمولی طور پر ہمیشہ اچھا سلوک کیا ہے تو آئندہ یتیم کے متعلق ہماری تعلیم تمہیں یہ ہے کہ تم اس سے وہ معاملہ کیا کرو جو لَا تَقْهَرْ والا ہو۔ تمہیں جن اخلاق سے ہم نے نوازا ہے اُن کو ہمیشہ بڑھاتے چلے جاؤ۔ اور اس بات کو ہمیشہ مدنظر رکھو کہ تم یتیم تھے ہم نے تمہاری پرورش کے سامان پیدا کئے۔ اب اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ہمارے اور بھی بہت سے یتیم بندے ہیں تم اُن سے کبھی ایسا سلوک مت کرو جو اُن کو ذلیل کرنے والا ہو۔ بلکہ ہمیشہ اُن کی فلاح اور بہبودی کا خیال رکھو۔ اُن کا اکرام کرو۔ انکو اُبھارنے اور ترقی دینے کی کوشش کرو اور اُنکی ضروریات کو پورا کرو۔

حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب قیامت کا دن آئے گا تو اللہ تعالےٰ اپنے بعض بندوں سے فرمائے گا۔ اے میرے بندو! میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ میں بیمار تھا تم نے میری بیمار پُرسی نہیں کی۔ وہ لوگ گھبرا جائیں گے اور کہیں گے۔ خدایا تُو یہ کیا کہہ رہا ہے تُو کب بھوکا تھا کہ ہم نے تجھے کھانا نہیں کھلایا۔ کب پیاسا تھا کہ ہم نے تجھے پانی نہیں پلایا۔ کب مریض تھا کہ ہم نے تیری بیمار پُرسی نہیں کی۔ تُو تو خود سارے جہان کو کھانا کھلاتا۔ اُن کو پانی پلاتا اور اُن کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ ہم ناچیز بندے کیا طاقت رکھتے تھے کہ اے ہمارے رب تیری بیمار پُرسی کر سکتے یا تجھے کھانا کھلا سکتے یا تجھے پانی پلا سکتے۔ اللہ تعالےٰ فرمائے گا یہ درست ہے مگر میری مراد یہ ہے کہ دنیا میں میرے بعض بندے بھوکے تھے تم نے انہیں کھانا نہیں کھلایا۔ بعض بندے پیاسے تھے تم نے انہیں پانی نہیں پلایا۔ بعض بندے ننگے تھے تم نے اُنہیں کپڑا نہیں دیا۔ جب تم نے اُن کی ضروریات کا خیال نہیں رکھا تو گویا تم نے اُن کی طرف سے بے پرواہی نہیں کی بلکہ میری طرف سے بے پرواہی کی۔ وہ میرے بندے تھے جو مختلف قسم کی تکالیف میں مبتلا تھے اس لئے اُن کو کھلانا یا پلانا یا پہنانا ایسا ہی تھا جیسے تم مجھے کھلاتے یا مجھے پلاتے یا میری بیمار پُرسی کرتے۔ مگر تم نے اس فرض کو ادا نہیں کیا

انجیل میں یہ واقعہ اِس طرح آتا ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن بعض بندوں کو بلائیگا اور فرمائیگا۔ اے میرے بندو! میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے

وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؕ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ

اور سوالی کو تو جھڑک مت اور تو اپنے رب کی نعمت کا

رَبِّكَ فَحَدِّثْ ؕ

ع ۱ ۱۸

ضرور اظہار کرتا رہ ۵۵

آؤاب میں تمہیں اس کی جزا دوں۔ تب لوگ کہیں گے اے خداوندا! ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا۔ ہم نے کب تجھے پردیسی دیکھ کر گھر میں اُتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا۔ ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟ تب اللہ تعالیٰ بندوں کے جواب میں فرمائے گا۔ کہ اے میرے بندو! جب تم نے اپنے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔ اس لئے اب میں تمہیں اس کی جزا دیتا ہوں اور جنّت میں داخل کرتا ہوں (متی باب ۲۵ آیت ۳۴ تا ۴۰)

اَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو یتیم تھا ہم نے تجھے پالا۔ اب دنیا میں ہمارے اور بھی بہت سے یتیم بندے ہیں اُن کی پرورش تیرے ذمہ ہے اور تیرا فرض ہے کہ تو اُن کی نگرانی رکھے اور اُن کی تکالیف کا ازالہ کرے۔

وہ حدیث جو اُوپر بیان کی جاچکی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یتامیٰ و مساکین کی پرورش کا معاملہ خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے اور خدا تعالیٰ اس پرورش یا عدم پرورش کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ جو شخص یتیم سے حسنِ سلوک کرتا ہے وہ اللہ تعالےٰ کی رضامندی حاصل کرتا ہے اور جو شخص یتیم سے بے اعتنائی کرتا یا اُس سے ظالمانہ سلوک کرتا ہے وہ خدا تعالےٰ کے غضب کو اپنے اوپر بھڑکاتا ہے۔ لَا تَقْهَرْ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یتیم کی پرورش اس رنگ میں نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ خراب ہوجائے۔ یعنی نہ ایسی سختی کرو کہ جس کے نتیجہ میں اُس کے قویٰ دب جائیں اور وہ ترقی سے محروم ہوجائے اور نہ ایسی نرمی کرو کہ جس سے ناجائز فائدہ اٹھاکر وہ اپنے اوقات اور اپنے قویٰ کو برباد کردے۔ قَهْرٌ کے معنے دراصل غلبہ کے ہوتے ہیں۔ پس لَا تَقْهَرْ کے معنے یہ ہوئے کہ اُس سے ایسا معاملہ نہ کرو جس کے نتیجہ میں تم اُس کے قوائے دماغیہ اور جسمانیہ پر غالب آجاؤ اور اس کی ترقی کو نقصان پہنچادو۔ انسانی ترقی کو دو ہی طرح نقصان پہنچتا ہے یا بے جا سختی سے یا بے جا نرمی اور محبت سے۔ پس لَا تَقْهَرْ کہکر اللہ تعالےٰ نے بے جا سختی سے بھی روک دیا اور بے جا نرمی سے بھی منع فرمادیا۔ اور نصیحت کی کہ یتیم سے تم ایسا ہی معاملہ کرو جو اس کی اچھی تربیت کے لئے ضروری ہو۔

۵۵ حل لغات۔ لَا تَنْهَرْ: نَهَرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور نَهَرَ السَّائِلَ کے معنے ہیں زَجَرَهٗ سائل کو ڈانٹ ڈپٹ کی (اقرب) پس لَا تَنْهَرْ کے معنے ہوں گے۔ مت ڈانٹ۔

لَا تَنْهَرْ

تفسیر۔ فرماتا ہے سائل کو تم جھڑکو نہیں کیونکہ تم بھی سائل تھے۔ محبت کی بھیک ہم سے مانگنے کے لئے آتے تھے۔ ہم نے تمہارے سوال کو رد نہ کیا بلکہ تمہارے دامن کو گوہرِ مقصود سے بھر کر لوٹا دیا۔ اب تم سے اور لوگ محبت کی بھیک مانگنے آئیں گے تمہارا فرض ہے کہ تم ان سائلوں کی طرف ہمہ تن متوجہ رہو اور ان کی خواہشات کو پورا کرو۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ تحدیث نعمت دو طرح ہوتی ہے ایک اس طرح کہ انسان علیحدگی میں اللہ تعالےٰ کے احسانات کا

شکرادا کرے اور اُس کے پیہم فضلوں کو دیکھ کر سجدات شکر بجالائے اور زبان کو اس کی حمد سے تر رکھے۔ دوسرا طریق تحدیث نعمت کا یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنا بڑا فضل کیا۔ فرماتا ہے ہم نے جو نعمتیں تجھے عطا کی ہیں اُن کا خود بھی شکر ادا کرو اور اپنے رب کی ان نعمتوں کا لوگوں میں بھی خوب چرچا کرو۔ یا خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں تجھے دی ہیں اُن سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور اپنے جسم پر اُن کے آثار کو ظاہر کرو۔ اور کچھ حصہ صدقہ و خیرات کے طور پر لوگوں میں بھی تقسیم کرو۔

اس سورۃ کے آخر میں جو تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ پہلی بیان کردہ تین باتوں کے مقابل میں ہیں۔ پہلے فرمایا تھا (۱) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (۲) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۳) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى تم یتیم تھے ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تم ہماری محبت اور اپنی قوم کی نجات کے طالب تھے ہم نے تمہیں اپنی محبت بھی عطا کر دی اور قوم کی نجات کا سامان بھی عطا کر دیا۔ اسی طرح تم روحانی اور جسمانی یتامیٰ سے گھرے ہوئے تھے ہم نے دونوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا سامان تجھے دے دیا۔ اب تیرا بھی فرض ہے کہ تُو یتامیٰ سے ایسا سلوک نہ کر جو ان کی طاقتوں کو توڑنے والا ہو۔ تُو ہماری محبت کے سائلوں کو جو تیرے دروازہ پر آئیں کبھی مایوس مت لوٹا بلکہ جس طرح ہم نے تیری مرادیں پوری کی ہیں تُو اُنکی مرادوں کو پورا کر۔ اور پھر یہ بھی دیکھ کہ ہم نے تجھے عائل بنایا تھا پھر تجھے غنی کر دیا۔ اب تمہارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم نے تجھ پر جو احسانات کئے ہیں اُن کا تو شکر ادا کر۔ ہماری نعمتوں سے خود بھی فائدہ اٹھا اور لوگوں میں بھی ان نعماء کو تقسیم کر۔ یہ اسلامی تعلیم نہیں ہے کہ انسان کو اگر کوئی نعمت ملے تو وہ اُسے ردّ کر دے اور اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں روحانیت کا مفہوم نہ سمجھنے کے نتیجہ میں یہ خیال پیدا ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعماء کا استعمال روحانیت کے خلاف ہے۔ اچھا کھانا کھانا یا اچھا کپڑا پہننا یا اعلیٰ درجہ کی اشیاء سے فائدہ اٹھانا روحانی لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ لوگوں کی خود ساختہ روحانیت ہے اسلام اور عرفان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ الٰہی حکم یہی ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی نعمت ملے وہ اس سے خود بھی فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ کاہنوں کی طرح اُن نعمتوں کو ردّ نہ کرے۔ اس آیت کے روحانی لحاظ سے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے جو تعلیم تجھے عطا کی ہے اُس پر خود بھی عمل کرو اور دوسروں سے بھی عمل کراؤ۔ اور جسمانی لحاظ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے جو نعمتیں تجھے دی ہیں اُن سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے جو فضل نازل کئے تھے اُن کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ سے مطالبہ کیا ہے کہ جیسے تم یتیم تھے اور ہم نے تمہاری خبر گیری کی اسی طرح تم ہمارے یتیموں کی خبر گیری کرو۔ جیسے تم سائل تھے اور ہم سے محبت کی بھیک لینے آئے اور ہم نے تمہاری آرزو کو پورا کر دیا اسی طرح اب ہمارے سائل جو تیرے پاس آئیں تیرا فرض ہے کہ تو اُن کی آرزوؤں کو پورا کرے۔ پھر جس طرح ہم نے تجھے عائل پا کر غنی کر دیا تھا اسی طرح دنیا میں بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جن کو اس بات کا کوئی علم نہیں کہ خدا نے اُن کی ہدایت کے لئے آسمان سے کتنا بڑا نور نازل کر دیا ہے۔ وہ جہالت کی تاریکیوں میں اپنی عمر بسر کر رہے ہیں اور آسمانی نور کی شعاعیں اُن تک نہیں پہنچیں۔ اُن کے دل بھی اس شوق میں تڑپ رہے ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کی محبت حاصل ہو۔ اُس کا پیار اُن کی غذا ہو اور اُس کا عشق اُن کے رگ و ریشہ میں ہو۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ وہ شمع کہاں ہے جس کے گرد وُہ پروانہ وار اپنی جانوں کو قربان کر دیں۔ ہم نے تجھے آسمانی دولت سے مالا مال کر کے اس لئے بھیجا ہے کہ تو دُنیا کے سب لوگوں تک خدائے قدوس کی آواز پہنچا دے۔

سوڈھنڈورا دو اور خوب دو۔ تبلیغ کرو اور خوب کرو۔ خدا کا نام دنیا کے کناروں تک پہنچاؤ اور خوب پہنچاؤ۔ سوتی دنیا کو جگاؤ اور خوب جگاؤ۔ اور جو خزانے خدا نے تمہیں عطا کئے ہیں انہیں بلا دریغ لوگوں میں تقسیم کردو کہ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے تمہیں دنیا میں کھڑا کیا گیا ہے۔

یہ تینوں آیتوں کا تقابل بھی بتاتا ہے کہ وَجَدَكَ ضَآلًّا میں گمراہی مراد نہیں۔ کیونکہ یتیم کے مقابل پر یتیم کا ذکر کیا ہے۔ نعمت کے مقابل پر تحدیث بالنعمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے لازماً ضَآلًّا کے مقابل پر جو آیت ہے اس میں پہلی آیت کے متعلق ہی اشارہ چاہیئے۔ اور اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی سوالی کو رد نہ کریں ضَآلًّا کے معنے بھی سوال کے کرنے کے ہونگے اور یہی معنے کئے گئے ہیں۔ یعنی تُو خدا تعالےٰ کی محبت کا سوالی تھا سو ہم نے تیری اس غرض کو پورا کیا اور ہدایت بخشی ؛

سُورَةُ الْاِنْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ الانشراح ۔ یہ سورۃ مکی ہے [۱]

وَهِيَ ثَمَانِي اٰيٰتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝

کیا ہم نے تیرے لئے تیرے سینے کو کھول نہیں دیا [۲]

[۱] یہ سورۃ مکی ہے (بحوالہ فتح البیان) وہیری کے نزدیک اس کے نزول کا وقت مضمون کی مشارکت کی وجہ سے پہلی سورۃ کے زمانہ کا ہی معلوم ہوتا ہے یعنی پہلے یا دوسرے سال کی معلوم ہوتی ہے۔ مغربی مصنفین کا اس امر کو تسلیم کرنا اسلام کی ایک بہت بڑی فتح ہے کیونکہ اس سورۃ میں ایسی زبردست پیشگوئیاں ہیں کہ انہیں تسلیم کرلینے کے بعد اسلام کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا ورنہ اس سورۃ کو مدنی کہہ کر ان پیشگوئیوں پر پردہ ڈالا جاسکتا تھا۔ میرے نزدیک یہ سورۃ تیسرے سال یا اس کے قریب کی ہے۔

اس کی ترتیب کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اس کا تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے انجام کے اچھا ہونے کا ذکر تھا جیسا کہ فرمایا تھا وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ یہ آیت اس سورۃ کے مضمون کا گویا خلاصہ تھی کیونکہ اس میں پہلے دلائل کا ایک نتیجہ نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اب سورۃ الانشراح میں اس دعوے کے متعلق کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انجام اچھا ہوگا مزید روشنی ڈالی گئی ہے اور پچھلی سورۃ کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ انجام کے اچھا ہونے کی کچھ علامتیں ہوتی ہیں اگر وہ علامتیں کسی شخص میں موجود ہوں تو وقت سے پہلے لوگ قیاس کرسکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی مدد اس شخص کو حاصل ہے یعنی انجام تو جب ہوگا سو ہوگا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اچھے انجام کو بعض علامتوں کے ساتھ پہچانا بھی جاسکتا ہے چنانچہ چار اہم علامتیں اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ انسان کو خود اپنے دعوے پر شرح صدر ہو دوم جس مقصد کو لے کر وہ کھڑا ہو اس کو پورا کرنے کے ذرائع اس کو میسر آجائیں اور تیسرے یہ کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف پھر جائے چوتھے یہ کہ یہ سامان الٰہی تقدیر کے ماتحت پیدا ہوں۔ جب یہ چار چیزیں کسی شخص کو حاصل ہوجائیں تو ابتداء ہی سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ شخص غالب آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ چاروں باتیں تجھے حاصل ہیں اس صورت میں تیرے مخالفین کو سمجھ لینا چاہئے کہ تیرے انجام کی بہتری کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

[۲] **حل لغات** ۔ نَشْرَحْ: شَرَحَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور لَمْ نفی کے لئے آیا ہے اور شَرَحَ (يَشْرَحُ شَرْحًا) اللَّحْمَ کے معنے ہوتے ہیں قَطَعَهُ طِوَالًا۔ گوشت کو لمبی طرز پر کاٹا یا اس میں شگاف دیا۔ اور

شَرَحَ الْغَامِضَ کے معنے ہوتے ہیں کَشَفَہٗ کسی پیچیدہ بات کو واضح کر دیا یعنی معمہ کو حل کر دیا۔ فَسَّرَہٗ وَ بَیَّنَہٗ اس کی تفسیر کی اور اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور شَرَحَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں فَتَحَہٗ۔ اُس کو کھول دیا اسی طرح وَسَّعَہٗ۔ اُسے پھیلا دیا اور شَرَحَ الْکَلَامَ کے معنے ہوتے ہیں فَھَّمَہٗ۔ اس کو سمجھا دیا۔ اور شَرَحَ صَدْرَہٗ بِالشَّیْءِ وَلِلشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں سَرَّہٗ بِہٖ وَطَیَّبَ بِہٖ نَفْسَہٗ اُسے اس کے ذریعہ سے خوش کر دیا (اقرب)

مفردات راغب میں لکھا ہے اَصْلُ الشَّرْحِ بَسْطُ اللَّحْمِ وَنَحْوِہٖ یعنی شَرْحٌ کے اصل معنے تو گوشت یا ایسی ہی کسی چیز کو چیر کر کھول دینے کے ہوتے ہیں وَمِنْہُ شَرْحُ الصَّدْرِ۔ اور اسی سے شرح الصدر کا محاورہ نکلا ہے۔ جس کے معنے بَسْطُہٗ بِنُوْرٍ اِلٰھِیٍّ وَ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ جِھَۃِ اللّٰہِ وَرُوْحٍ مِّنْہُ کے ہیں یعنی الٰہی نور اور خدا تعالےٰ کی طرف سے آنے والی تسکین اور اطمینان اور اس کی طرف سے آنے والے کلام یا ملائکہ کے ذریعہ سے سینہ کو کھول دینا۔ ظاہر ہے کہ یہ معنے تفسیری ہیں ورنہ شرح صدر کا فعل صرف خدا تعالےٰ کے لئے نہیں بولا جاتا بلکہ عربی محاورہ کے مطابق بعض دفعہ اپنے ہم کلام کی بات سن کر آدمی کہتا ہے کہ اب میرا شرح صدر ہو گیا اور اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آگئی ہے۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے حق میں شَرَحَ صَدْرَہٗ کے الفاظ استعمال ہوں گے تو اس وقت بوجہ محل استعمال کے نہ کہ وضع لغت کے وہ معنے ہوں گے جو کہ علامہ راغب نے اس جگہ کئے ہیں۔

تاج العروس عربی لغت کی سب سے بڑی کتاب میں لکھا ہے شَرَحَ کَمَنَعَ: کَشَفَ شَرَحَ مَنَعَ کے وزن پر ہے اور اس کے معنے ہیں کھول دیا کہتے ہیں شَرَحَ فُلَانٌ اَمْرَہٗ: اَوْضَحَہٗ۔ فلاں شخص نے اپنا معاملہ خوب کھول کر رکھ دیا۔ شَرَحَ مَسْأَلَۃً مُشْکِلَۃً: بَیَّنَھَا اور جب کہیں کہ اس نے ایک مشکل مسئلہ کی شرح کی تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اسے کھول کر بیان کر دیا اور حل کر دیا پھر لکھا ہے وَھُوَ مَجَازٌ۔ یہ استعمال اس کا مجازاً ہے اس کے آگے اس لفظ کے اصل معنے جو وضع لغت کے مطابق ہیں یہ لکھے ہیں شَرَحَ اللَّحْمَ عَنِ الْعُضْوِ قَطَعَ قَطْعًا یعنی شَرَحَ کے معنے ہیں گوشت کو عضو سے کاٹ کر الگ کر دیا وَقِیْلَ قَطَعَ اللَّحْمَ عَلَی الْعَظْمِ قَطْعًا۔ ہڈی پر چھری مار مار کر گوشت کو الگ کر دیا یعنی جس طرح پسندے بناتے ہیں کہ گوشت ہڈی سے چمٹا ہی رہتا ہے مگر پھول کی پنکھڑیوں کی طرح یا مخمل کے پھندوں کی طرح اوپر سے اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گویا اس لفظ کے یہ بھی معنے ہیں کہ کاٹ کر الگ کر دیا اور یہ بھی کہ ایک جہت سے گوشت آپس میں الگ ہو جائے اور ایک جہت سے ہڈی سے چمٹا رہے پھر لکھا ہے۔ شَرَحَ الشَّیْءَ کے ایک معنے فَتَحَ کے بھی ہیں اور اس کے معنے ہیں بیان کیا۔ کھولا (درحقیقت یہ معنے اوپر کے دو معنوں میں سے آخری معنوں میں سے مجازاً نکالے گئے ہیں یعنی کسی ایک بند چیز کو ایک طرف سے کھول کر اس کے اندر جھانکنے یا اس کے اندر کوئی چیز ڈالنے کے لئے راستہ بنا دیا) پھر لکھا ہے (امام لغت) ابن الاعرابی کے نزدیک شَرَحَ کے معنے بیان اور فہم اور فتح اور حفظ کے ہیں یعنی واضح کرنا سمجھانا۔ کھولنا اور محفوظ کرنا۔ پھر لکھا ہے شَرَحَ کے معنے ازالۂ بکارت کے بھی ہوتے ہیں۔ پھر لکھا ہے مجازی طور پر شَرَحَ الشَّیْءَ کے معنے وَسَّعَہٗ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اُسے پھیلا دیا اور وسیع کر دیا اور شرح صدر اسی قبیل سے ہے۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ قبول حق یا قبول خیر کیلئے سینہ کو وسیع کر دیا۔ (یعنی دل میں حق کے قبول کرنے کے لئے انشراح پیدا ہو گیا اور حق کی طرف اُسے رغبت ہو گئی۔ جہاں کہیں بھی حق ملے اور جسقدر بھی ملے وہ اُسے قبول کرنے کو تیار ہوتا ہے) اسیطرح کہتے ہیں شَرَحَ اِلَی الدُّنْیَا۔ وہ دنیا کی طرف مائل ہوا (تاج العروس)۔

اور صَدْرٌ کے معنے ہوتے ہیں

صَدْرٌ

اَعْلیٰ مُقَدَّمُ کُلِّ شَیْءٍ یعنی ہر چیز کے اگلے حصہ کی جو چوٹی ہو اُسے صَدر کہتے ہیں۔ اور یوں حیوان یا انسان کے متعلق جب یہ لفظ بولا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَا دُوْنَ الْعُنُقِ اِلیٰ فِضَاءِ الْجَوْفِ۔ یعنی گردن سے لے کر پیٹ کے خلا تک جسم کا جو حصہ ہوتا ہے اسکو صدر کہتے ہیں یعنی سینہ۔ اسی طرح ہر چیز کے ابتدائی حصہ کو بھی صدر کہتے ہیں۔ چنانچہ جب صَدْرُ النَّھَارِ یا صَدْرُ الشِّتَاءِ یا صَدْرُ الصَّیْفِ کہتے ہیں تو اس کے معنے دن کے ابتدائی حصہ یا سردی یا گرمی کے ابتدائی ایام کے ہوتے ہیں (اقرب) گویا ایک لحاظ سے یہ لفظ اضداد میں سے ہے ہر چیز کی چوٹی کو بھی صَدر کہتے ہیں اور ہر چیز کے ابتدائی حصہ کو بھی صَدر کہتے ہیں جو بالعموم حقیقت کے لحاظ سے ادنےٰ ہوتا ہے جیسے صبح دوپہر سے کم روشن ہوتی ہے۔ موسموں کے لحاظ سے جب سردی یا گرمی کا موسم شروع ہو یا بہار یا خزاں کے ایام آئیں تو وقت کے لحاظ سے موسم کا جو ابتدائی حصہ ہوتا ہے اُسے بھی صَدر کہتے ہیں لیکن محاورہ میں صَدر اُس کو کہتے ہیں جو قوم کے نزدیک عزت کے قابل ہو یا اعلیٰ رُتبے پر رکھے جانے کا مستحق ہو۔ ہماری زبان میں بھی یہ لفظ اعزاز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں فلاں کو صدر مقام پر بٹھایا گیا۔ یا فلاں کو صدرِ مجلس تجویز کیا گیا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے عزت کے مقام پر کھڑا کیا گیا ہے یا لیڈری کا مقام اُس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اسی طرح صدر سردارِ قوم کو بھی کہتے ہیں اور صدر دل کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ سینہ میں ہوتا ہے اور صدر کسی چیز کے حصّہ کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے اَخَذْتُ صَدْرًا مِنْہُ۔ مَیں نے اُس میں سے ایک حصّہ لے لیا (اقرب) جہاں تک انشراح صدر کا تعلق سینہ سے ہے قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہر ملک اور ہر قوم میں یہ دستور پایا جاتا ہے کہ اُن میں سے جب کسی شخص کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے یا کسی حقیقت پر اس کا دل تسلّی پا جاتا ہے تو ایسے موقع پر ہمیشہ اظہارِ اطمینان کے لئے وہ شرحِ صدر کا

انشراح صَدر کے متعلق ایک اعتراض اور اُس کا جواب

انشراح صدر کا محاورہ اطمینان کو ظاہر کرنے کے لئے

لفظ استعمال کرتا ہے۔ اُردو میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں بات کے لئے میرا سینہ کھل گیا۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی ڈاکٹر کہدے کہ سینہ کا کسی بات کے سمجھنے سے کیا تعلق ہے سینہ تو ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کا نام ہے جس میں دل ہے، پھیپھڑا ہے، معدہ ہے، جگر ہے، گلے کی نالی ہے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا کسی بات کے سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں۔ بے شک طبی طور پر اسی کا نام صدر ہوگا مگر زبان کے لحاظ سے سینہ کھل جانے کے معنے ہوتے ہیں کسی بات پر اطمینان ہو گیا اور سینہ تنگ ہو جانے کے معنے ہوتے ہیں کسی بات پر اطمینان پیدا نہ ہوا یا غم کے سامان پیدا ہو گئے۔ یہ سوال کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے اس کی ذمہ واری زبان بنانے والوں پر ہے مذہب پر نہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ اپنی حماقت کی وجہ سے زبان کی بحث مذہب میں بھی شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔ مثلاً ہماری زبان میں عام طور پر یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ میرے دل میں فلاں بات آئی۔ اس جگہ کوئی عقلمند انسان یہ سوال پیدا نہ کرے گا کہ بات دل میں آتی ہے یا دماغ میں۔ کیونکہ لغت نے اس فقرہ کے مفہوم کے ادا کرنے کے لئے یہی الفاظ وضع کئے ہیں اس لئے ہم ان کے استعمال پر مجبور ہیں۔ لغت یہی کہتی ہے کہ جب کوئی شخص کہے کہ میرے دل میں فلاں بات آئی تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اُسے ایک نیا خیال سوجھا اور جب بھی کسی شخص کو کوئی نئی بات سوجھتی ہے تو وہ یہی فقرہ استعمال کرتا ہے خواہ وہ جاہل ہو یا فلاسفی کا پروفیسر یا علم تشریح الابدان کا ماہر۔ رہا یہ سوال کہ وہ بات دل میں آتی ہے یا سر میں آتی ہے یا پاؤں میں آتی ہے زبان کے لحاظ سے ہمیں اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر بعض لوگ غلطی سے اس قسم کی بحث شروع کر دیتے ہیں کہ تم کہتے ہو دل میں بات آئی۔ دل میں بات کس طرح آسکتی ہے یا تم کہتے ہو سینہ کھل گیا سینہ کس طرح کھل سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ تو سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو معنے کئے جاتے ہیں وہ عربی لغت کے لحاظ سے چسپاں ہوتے ہیں یا نہیں۔ مگر

یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اُن کا استعمال علم ڈاکٹری کے لحاظ سے درست ہے یا نہیں کیونکہ اس کی ذمہ داری قرآن مجید پر نہیں بلکہ زبان بنانے والوں پر ہے اگر زبان میں کوئی فقرہ کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایجاد کر لیا گیا ہے تو ہم پابند ہیں کہ وہی فقرہ بولیں خواہ حقیقت سے وہ تعلق رکھتا ہو یا نہ۔ عام یوروپین ہی نہیں ایک اناٹومی کا پروفیسر اور ایک سائکالوجی کا پروفیسر بھی جب کسی تکلیف دہ امر کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ

IT ACHES MY HEART یہ بات میرے دل کو تکلیف دیتی ہے حالانکہ احساس تکلیف دماغ کے حصۂ امتیاز میں ہوتا ہے نہ کہ دل کے گوشت میں۔ اسی طرح جب وہ کسی تکلیف کا اظہار کرتا ہے تو کہتا ہے کہ

MY HEART SANK میرا دل ڈوبنے لگا۔

کیا اس پروفیسر کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دل دریا یا سمندر میں نہیں پڑا ہُوا کہ ڈوبنے لگا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ سینہ میں کوئی کنوئیں کھدا ہُوا نہیں کوئی ندی نالہ جاری نہیں۔ کوئی سمندر پھیلا ہُوا نہیں۔ مگر وہ ایسا کہنے پر مجبور ہے کیونکہ اس کے بزرگوں نے اس خیال کو ادا کرنے کے لئے جو اُس نے بیان کرنا چاہا ہے یہی الفاظ مقرر کر چھوڑے ہیں۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گذرتا ہے MY HEART SANK

IN MY BOOTS میرا دل ڈوب کر جوتیوں تک چلا گیا۔ اسی طرح ہر اناٹومی اور سائکالوجی کا پروفیسر جب یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے یہ بات محسوس کی۔ تو وہ کہتا ہے

I FELT IN MY HEART میں نے اپنے دل میں فلاں امر محسوس کیا۔ حالانکہ طبی طور پر اور علم النفس کے مطابق وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ محبت کا دل سے تعلق نہیں بلکہ دماغ سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر جب بھی الفاظ استعمال کرے گا یہی کرے گا کہ میں نے اپنے دل میں محبت یا فلاں بات محسوس کی۔ اسی طرح ان علوم کے پروفیسر بھی اپنی منگیتروں یا بیویوں کو جب وہ جدا ہوں یہی لکھیں گے کہ

YOU ALWAYS LIVE IN MY HEART

تم ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو یہ کبھی نہیں لکھے گا کہ

YOU ALWAYS LIVE IN MY HEAD

بلکہ اگر وہ لکھ دے تو شاید منگنی ہی ٹوٹ جائے اور منگیتر اُسے پاگل سمجھنے لگ جائے۔ پس جب ہر شخص روزانہ اپنی زبان میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس پر اعتراض نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ تو یہ کیا حماقت کی بات ہے کہ مذہبی کتب پر زبانوں کے محاوروں کی وضع کی وجہ سے لوگ اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ جنہوں نے وہ محاورے بنائے ہیں جا کر اُن سے سوال کریں۔ مذہبی کتاب تو مجبور ہے کہ ان محاوروں کی اتباع کرے ورنہ اُس کے مخاطبین اس کی بات ہی نہ سمجھیں گے اور وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے گی۔

دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ مثلاً ایک عرب قلب کا لفظ اُن معنوں میں استعمال کرتا ہے یا نہیں جن معنوں میں تشریح الابدان کے ماہرین دماغ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر کرتا ہے تو محض قلب کے لفظ کے استعمال پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کو دماغ کا لفظ بولنا چاہیئے تھا قلب کا لفظ اُس نے کیوں بولا۔ یا مثلاً یہ تو سوال ہو سکتا ہے کہ سینہ کا کھل جانا یا اُس کا تنگ ہو جانا عربی زبان میں محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر ہوتا ہے تو قرآن کریم کے لئے صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری تھا کہ وہ ان محاورات کو استعمال کرتا کیونکہ اگر وہ ان محاورات کو استعمال نہ کرتا تو لوگ سمجھتے کیا خاک؟ آج علمی زمانہ ہے۔ سائنس کی ترقی اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے ماہرین تشریح الابدان بال کی کھال اُتار چکے ہیں مگر آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ میرے دل میں تمہاری محبت ہے۔ اگر کوئی شاعر ان الفاظ کی بجائے یہ کہہ دے کہ میرے دماغ میں تمہاری محبت ہے تو سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں گے کہ پاگل ہو گیا ہے حالانکہ واقعہ یہی ہوتا ہے۔ مگر چونکہ زبان نے اس غرض کے لئے دل کا لفظ وضع کیا ہُوا ہے اس لئے جب وہ محاورۂ زبان کے خلاف دماغ کا لفظ استعمال کرے گا سب لوگ ہنس پڑیں گے کہ

بڑا احمق انسان ہے حالانکہ طبعی طور پر وہ درست کہہ رہا ہوگا۔ پس ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں کہ تشریح الابدان کے ماہرین کیا کہتے ہیں۔ ہم زبان کو دیکھیں گے کہ اُس میں کیا الفاظ رائج ہیں۔ جو کچھ زبان میں الفاظ رائج ہوں گے انہی کا استعمال فصاحت ہوگا۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور الفاظ استعمال کئے جائیں گے تو وُہ معیارِ فصاحت سے بالکل گر جائیں گے۔

تفسیر۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ میں گو الفاظ استفہامی یعنی سوالیہ استعمال کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کیا ہم نے تیرے سینہ کو نہیں کھولا؟ مگر مفہوم یہ ہے کہ تُو جانتا ہے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے۔ ایسے سوال کو عربی لغت والے انکار ابطالی کہتے ہیں۔ ایک عرب کا قول ہے اَلَسْتُمْ خَيْرَ مَنْ رَكِبَ الْمَطَايَا (قرب) کیا تم سواریوں پر چڑھنے والوں میں سے سب سے اچھے نہیں ہو؟ یعنی اچھے ہو۔ درحقیقت یہ وہی حسابی اصول ہے کہ دو منفیاں ایک مُثبت بنا دیتی ہیں۔ جب استفہام انکاری کے بعد نفی کا لفظ آجائے تو وُہ مُثبت کے معنے دینے لگ جائیگا۔ کیونکہ منفی کی نفی مُثبت کا مفہوم دیتی ہے مثلاً اگر طنزاً کہیں کیا تُو عالم ہے؟ تو اس کے معنے ہوں گے کہ تُو عالم نہیں ہے لیکن اگر یُوں کہیں کیا تُو عالم نہیں ہے؟ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تُو عالم ہے مگر باوجود عالم ہونے کے فلاں حرکت کرتا ہے یا یہ کہ تو عالم ہے باوجود اس کے جاہل لوگ تجھ پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اسی طرح اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے یہ معنے نہیں کہ تجھ سے ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا تیرا سینہ کھولا گیا ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ تُو بھی جانتا ہے کہ تیرا سینہ ہم نے کھول دیا ہے اور تیرے دشمن بھی جانتے ہیں کہ تیرا سینہ ہم نے کھول دیا ہے۔ اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیوں نہ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے تو اس سے صرف ایک خبر کا مفہوم نکلتا یعنی اللہ تعالےٰ اطلاع دیتا ہے کہ ہم نے سینہ کو کھول دیا لیکن یہ مفہوم نہ نکلتا کہ اس شرح صدر کا کوئی ظاہر نتیجہ بھی نکلا ہے یا نہیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اس شرح صدر کا کوئی احساس ہُوا ہے یا نہیں اور کفار نے بھی اس کا کوئی ثبوت دیکھا ہے یا نہیں۔ اور یہ مضمون ظاہر ہے کہ بہت ہی نامکمل ہوتا۔ لیکن اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کہہ کر اس امر پر زور دے دیا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے اور یہ امر تُو بھی جانتا ہے اور تیرے دشمن بھی جانتے ہیں۔ یعنی ایک چُھپی ہوئی بات نہیں ایک ظاہر اور کھُلا نشان ہے جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ غرض ایسا فقرہ استعمال کر کے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ حقیقت دوسروں پر مخفی نہیں شرح صدر کی اہمیت کو ایسا واضح کر دیا ہے کہ اَور کوئی مختصر الفاظ اس مضمون کو بیان نہ کر سکتے تھے۔

یہ مضمون اس رنگ میں بھی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم فرض کریں ایک شخص ہمارے پاس آئے اور ہمیں خبر پہنچائے کہ میں نے آپ کے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے اب جہاں تک اس خبر کا تعلق ہے ہمیں اس سے صرف اتنا ہی پتہ لگ سکتا ہے کہ زید کہتا ہے اُس نے ہمارے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے۔ اب واقعہ میں گوشت پہنچا ہے یا نہیں پہنچا اس کا اس فقرہ سے علم نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں زید کبھی یہ نہیں کہیگا کہ کیا میں نے گوشت تمہارے گھر میں نہیں پہنچا دیا۔ بلکہ وہ صرف اتنا کہیگا کہ میں نے تمہارے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے۔ لیکن اگر شخص مخاطب گھر جائے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ گوشت پہنچ گیا ہے تو اس کے بعد زید اُسے بے شک کہہ سکے گا کہ کیا میں نے تمہارے گھر میں گوشت نہیں پہنچایا۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تمہارے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے اور تمہیں خود بھی اس بات کا علم ہے کہ گوشت پہنچ گیا ہے۔ پس کیا ایسا نہیں کیا کے فقرہ سے یہ زائد معنے پیدا ہو جاتے ہیں کہ یہ بات ایسی پختہ ہے کہ مخاطب بھی اس بات کی تصدیق کرے گا اور کہے گا کہ ہاں یہ بات واقعہ میں درست ہے میں خود اس بات کا گواہ ہوں کہ یہ واقعہ ہو گیا ہے۔ پس اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اپنے اندر

تصدیق مخاطب کا مضمون بھی رکھتا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ مخاطب اس علم میں ہمارا شریک ہے وہ اس واقعہ سے انکار نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم نے تیرا سینہ اس طرح نہیں کھولا کہ تو خود بھی اس بات کی گواہی دے گا اور تجھے علم ہے کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے۔

یہ جملہ کہ یہ بات ظاہر ہے اور اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ تیرا سینہ کھل چکا ہے، ہے تو ایک معمولی جملہ مگر اس کے اندر وسیع مطالب پائے جاتے ہیں۔ شَرَحَ کے معنے حل لغات میں بتائے جاچکے ہیں کہ (۱) کھولنے (۲) پھیلانے (۳) سمجھانے (۴) محفوظ کر دینے (۵) اچھی طرح بیان کرنے کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کے ایک تو یہ معنے ہوں گے کہ کیا ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا یعنی اس بات کو تُو بھی جانتا ہے اور دوسری دنیا بھی جانتی ہے کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے۔ سینہ کھولنے کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے مادۂ قبولیت کے پیدا ہو جانے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ محاورہ اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اچھی باتوں کی قبولیت کے لئے دل آمادہ رہتا ہے یا کسی خاص معاملہ کے متعلق دل تسکین پالیتا ہے۔ اُسے اس بات پر یقین کامل ہو جاتا ہے تو اُسے شرح صدر کہتے ہیں۔ جب یقین ایسے کمال کو پہنچ جائے کہ اس میں معجزانہ رنگ پیدا ہو جائے تو اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے شرح صدر کہتے ہیں۔ اور جب ایسے امور کے متعلق یقین ہو جو غیبی ہوں اور جن پر یقین پیدا ہونا الٰہی تصرّف کے نتیجہ میں ہوسکتا ہو تو اسے بھی خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور انکار ابطالی کا استعمال جو درحقیقت اثبات پر دلالت کرتا ہے یہ بتاتا ہے کہ وہ امر پوشیدہ نہیں بلکہ اس کی حقیقت ظاہر و باہر ہو چکی ہے۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صداقتوں اور نیکیوں کو ماننے اور اُن پر عمل کرنے کے لئے بہت بشاشتِ قلب عطا فرمائی تھی۔ اور وہ امور سماویہ جو امور غیبیہ پر مشتمل تھے اُن پر زبردست یقین بخشا تھا اور یہ دونوں امر بار بار اس طرح ظاہر ہو چکے تھے کہ آپ کے مخالفوں کو بھی اُن کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔ اور اگر یہ تینوں باتیں کسی شخص میں پائی جائیں تو اوّل تو یہ اس کی سچائی کا ثبوت ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ وہ شخص ضرور کوئی نیک تغیر دنیا میں پیدا کر کے چھوڑے گا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ کے فقرہ میں تصدیق مخاطب

نیک کاموں کی تعریف تو اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جو ہر عُسر اور یُسر کی حالت میں نیکی پر قائم رہتے ہیں؟ ایسے لوگ تو کم ملتے ہیں جو یہ کہیں کہ سچ بولنا ضروری نہیں لیکن ایسے لوگ بھی بہت کم ہیں جو سو فی صدی سچ بولیں۔ دنیا کے اکثر لوگ امانت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جنکو انکی ساری قوم بلاشک وشبہ امین قرار دیتی ہو؟ آخر ایک امر کو اچھا سمجھ کر اور اچھا قرار دے کر کیوں عمل کے وقت کمزوری دکھائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کہ اس صداقت پر اس شخص کو پورا یقین نہیں ہوتا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں پہلے شخص تھے جنہوں نے جن صداقتوں کو مانا اُن پر عمل کیا آپ نے صرف کہا ہی نہیں کہ سچ اچھا ہے بلکہ آپ نے سچ بولا بھی۔ اور آپ نے صرف کہا ہی نہیں کہ امانت اچھی بات ہے بلکہ آپ نے امین بن کر دکھایا بھی۔ حتیٰ کہ مکہ کے لوگ جو خالص مادی دماغ رکھتے تھے اور اخلاق کی قدر بہت کم جانتے تھے پکار اُٹھے کہ یہ امین وصدوق شخص ہے۔ یہ گواہی معمولی گواہی نہیں۔ سچ بولنا الگ امر ہے اور ساری قوم سے راستباز کا خطاب لے لینا اور امر ہے۔ امانت پر ثابت قدم رہنا اور ہے اور امین کا خطاب ساری قوم سے لے لینا اور بات ہے۔ ہر شخص کے قوم میں دشمن بھی ہوتے ہیں اور دوست بھی۔ نام ایک شخص اُسی وقت پیدا کرتا ہے جب اُس کا کمال اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ دشمن بھی اس کے انکار کی جرأت نہیں پاتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مرتبہ پاتا اس امر کا شاہد تھا کہ آپ کا سینہ نیکیوں کے لئے کھل گیا تھا اور جس کا سینہ نیکیوں کے لئے کھل گیا ہو اسے جھوٹ یا فریب کا الزام لگانا کتنا ظلم ہے اور ایسے آدمی سے

اس کے دشمن ملک والوں کو کب تک دور رکھ سکتے تھے۔

دوسرے معنے سینہ کھلنے کے یقین کامل کے کئے گئے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی صداقت پر جو یقین تھا وہ مخفی امر نہیں۔ جب مکّہ کے لوگوں نے حضرت ابوطالب آپکے چچا کو ڈرایا کہ اگر محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) بتوں کے خلاف کہنے سے باز نہ آئیں گے تو وہ اُن کے اور اُن کے حامیوں کے مٹا دینے کا فیصلہ کر لیں گے اور اگر وہ صرف بتوں کو بُرا کہنے سے باز آجائیں گے تو وہ اپنی قوم کی لیڈری، بادشاہت اُس کا مال، اُس کی خوبصورت لڑکیاں جو کچھ بھی مانگیں قوم اُسے حاضر کرنے کے لئے تیار ہوگی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس شان سے جواب دیا کہ اے میرے چچا! آپ مجھے چھوڑ کر اپنی قوم کیساتھ بیشک مل جائیں پر میں تو اس صداقت کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لاکر کھڑا کر دیں تب بھی خدائے واحد کی توحید کے اقرار سے نہیں رُکوں گا اور اس سچ کے اظہار سے باز نہیں آؤں گا۔ یہ اعلان کیا بغیر ایک ایسے یقین کے ہوسکتا ہے جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہو۔ اسی طرح جب آپ غار ثور میں چھپ گئے، کفار نے آپ کا محاصرہ کر لیا اور بعض نے اندر گھس کر آپ کا پتہ لینا چاہا اور حضرت ابوبکرؓ کو اس بات کی فکر ہوئی کہ کہیں دشمن آپ کو پکڑ نہ لے تو آپ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ غم مت کر یہ لوگ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ جس وقت صرف دو غیر مسلح آدمی مسلح قوم کے نرغہ میں گھرے ہوئے ہوں اُس وقت اپنے صاف بچ کر نکل جانے اور کامیاب ہونے کا اعلان اس شخص کے سوا جو خدا تعالےٰ کی تائیدات کا عینی مشاہدہ کر چکا ہو کون کر سکتا ہے۔ اور یہ وہ امور ہیں جو صرف مسلمان ہی نہیں بیان کرتے تھے بلکہ کفار مکّہ بھی ان امور کی تصدیق کرتے تھے۔ لیکن صادق کا خطاب انہوں نے خود آپ کو دیا تھا۔ غار ثور کا واقعہ انکی آنکھوں کے سامنے ہُوا تھا، ابوطالب کے ساتھ آپکی گفتگو اُن کے اپنے آدمیوں کے سامنے ہوئی تھی، اور ایسے ہی اور واقعات جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نیکی، آپ کے یقین اور آپ کے ایمان کا ثبوت ملتا تھا روزانہ ان لوگوں کے مشاہدہ میں آتے رہتے تھے اور وہ اُن کا مشاہدہ کرتے رہے تھے پس اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کہکر قرآن کریم کا مکّہ والوں پر حجت کرنا بالکل درست اور مطابق حقیقت تھا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نیکی میں جو مقام حاصل تھا خدا تعالےٰ پر جو یقین تھا۔ خدا تعالےٰ کے نشانات پر جو ایمان تھا وہ اس بات کا یقیناً ضامن تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پاگل نہ تھے، آپ غیر ذمہ دار شخص نہ تھے، آپ ارادہ کرکے اس سے ہٹنے والے نہ تھے، آپ کسی وقتی خیال کے مطابق کام نہیں کر رہے تھے بلکہ کوئی زبردست نشان آپ نے دیکھا تھا جس نے آپ کے ایمان کو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط کر دیا تھا۔ ایسے شخص کے متعلق میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا تھا؟ یہ سوال تھا جس کا جواب آپکے مخالفوں کے ذمہ تھا اور یقیناً اس سوال کا جواب دینے سے وہ گھبراتے بھی تھے اور کتراتے بھی تھے۔

انشراح صدر کے معنے یقین کامل کے

یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی کامیابی کا بہت مدار خود اس کے یقین پر ہوتا ہے۔ کوئی انسان دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اُسے اپنے دعویٰ پر یقین نہ ہو۔ بلکہ اگر روحانیات کو جانے دیں اور مادیات کو لے لیں تب بھی کوئی انسان کسی کام کے لئے سنجیدگی سے کوشش نہیں کر سکتا جب تک اُسے اپنے نفس پر یقین نہ ہو۔ جب کسی کو یقین حاصل ہو جائے تو چاہے وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو وہ اُس کو پورا کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ جب کسی امر کے متعلق عارضی یقین انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تب بھی کوشش شروع کر دیتا ہے اور بعض دفعہ تو عارضی یقین ہی نہیں عارضی شک بھی اگر انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ کوشش شروع کر دیتا ہے چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ عرب میں ایک نیم پاگل لڑکا تھا۔ لڑکے اُسے چھیڑتے اور تنگ کرتے رہتے۔ جب وہ بہت ہی تنگ آجاتا اور دیکھتا کہ یہ تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تو چونکہ وہ اپنے ہم عمروں کی فطرت کو خوب سمجھتا تھا جھوٹے طور پر کہدیتا کہ فلاں

انسانی کامیابی کا مدار

شخص کے ہاں آج دعوت ہے تم مجھے بے شک چھیڑتے رہو کھانا تو تمہارا ہی خراب ہوگا۔ اہل عرب میں مہمان نوازی کا مادہ بہت زیادہ پایا جاتا تھا اور اُن میں دستور تھا کہ عام طور پر بڑے بڑے رؤسا اونٹوں کو ذبح کر کے عام لوگوں کو دعوت دیدیتے کہ آؤ اور کھانا کھاؤ۔ اُن دعوتوں کا وہ طریق نہ تھا جو ہمارے ہاں ہے کہ مخصوص طور پر بعض لوگوں کو دعوت کے لئے نامزد کیا جاتا ہے بلکہ اُن کی دعوتوں میں شمولیت کے متعلق کسی قسم کی شرط نہیں ہوتی تھی جو شخص بھی چاہتا شریک ہو جاتا۔ جب کسی ایسی دعوت کی وہاں لڑکوں کو خبر دے دیتا تو یہ سنتے ہی لڑکے اُسے چھوڑ دیتے اور اُس رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتے۔ جب وہ اکیلا رہ جاتا تو اس کے دل میں شبہ پیدا ہوتا کہ شاید واقعہ میں اس کے ہاں دعوت ہو اگر ایسا ہی ہوا تو یہ بڑی بُری بات ہوگی کہ میں نے لڑکوں سے مار بھی کھائی اور دعوت سے بھی محروم رہا۔ چنانچہ اس خیال کے آنے پر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ خود بھی اُسی مکان کی طرف دوڑ پڑتا۔ راستہ میں لڑکے مایوس ہو کر واپس آ رہے ہوتے تھے۔ وہ اُسے پکڑ لیتے اور خوب پیٹتے کہ تُو نے ہمیں بڑا دھوکا دیا۔ یُونہی جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ فلاں رئیس کے ہاں دعوت ہے حالانکہ وہاں کوئی دعوت نہ تھی۔ اس پر اُسے پھر شرارت سوجھتی اور کہتا کہ اس کا نام تو میں نے یونہی لے دیا تھا اصل بات یہ ہے کہ فلاں رئیس کے ہاں دعوت ہے۔ اس دفعہ لڑکوں کو پھر یقین آ جاتا اور وہ دوسرے رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتے۔ جب لڑکے چلے جاتے تو بعد میں پھر اُس کے دل میں خیال آتا کہ اگر اُس کے ہاں واقعہ میں دعوت ہوئی تو میرے ساتھی تو دعوت کھا جائیں گے اور میں محروم رہ جاؤں گا۔ چنانچہ اس خیال کے ماتحت وہ بھی اس رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتا۔ اتنے میں لڑکے غصہ سے بھرے ہوئے واپس آ رہے ہوتے تھے وہ اُسے پکڑ لیتے اور پیٹنا شروع کر دیتے۔ چنانچہ اسی واقعہ کی وجہ سے عربوں میں شدتِ حرص کو بیان کرنے کے لئے اس لڑکے کے نام پر مثال بیان کی جانے لگی۔

اب دیکھو وہ لڑکا جھوٹ بولتا تھا مگر جھوٹ بتا کر بھی اس کے دل میں خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ شاید یہ بات ٹھیک ہی ہو اور وہ خود بھی اُسی طرف دوڑ پڑتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر کوشش یقین کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ آگے جیسا جیسا یقین ہو انسانی کوشش اور جد و جہد بھی مختلف رنگ اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ تھوڑا یقین ہو تو اسکے مطابق کوشش ہوگی اور زیادہ یقین ہو تو اس کے مطابق کوشش ہوگی۔

یقین کے تین مراتب

قرآن کریم نے یقین کے مختلف مدارج بیان کئے ہیں یُوں تو اس کے ہزاروں مدارج ہیں مگر موٹے موٹے تین مدارج ہیں۔ علم الیقین۔ عین الیقین۔ حق الیقین۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں میں جو خاص اصولی مضامین ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی مضمون ہے جو مراتب یقین کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پہلے صوفیاء کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ پہلے صوفیاء کی کتابوں میں بھی بے شک اس کا ذکر ملتا ہے مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون میں جو جدتیں پیدا کی ہیں وہ ان لوگوں کی تشریحات میں نہیں ہیں بعض لوگ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ یہ باتیں تو امام غزالی کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں یا فلاں فلاں مضامین انہوں نے بھی بیان کئے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر اقبال نے کہہ دیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس قسم کے مضامین صوفیاء کی کتابوں سے چرائے تھے۔ حالانکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو دونوں کے تقابل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مضمون میں وہ باریکیاں پیدا نہیں کیں جو ایک ماہر فن پیدا کیا کرتا ہے۔ اور نہ مضمون کی نوک پلک انہوں نے نکالی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جس مضمون کو بھی لیا ہے ایک ماہر فن کے طور پر اس کی باریکیوں اور اس کے خد و خال پر پوری تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور کوئی پہلو بھی تشنۂ تحقیق رہنے نہیں دیا اور یہی ماہر کا کام

ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے نمایاں کام کرکے دکھا دیتا ہے مثلاً تصویر کھینچنا بظاہر ایک عام بات ہے ہر شخص تصویر کھینچ سکتا ہے۔ میں بھی اگر پنسل لے کر کوئی تصویر بنانا چاہوں تو اچھی یا بُری جیسی بھی بن سکے کچھ نہ کچھ شکل بنا دوں گا مگر میری بنائی ہوئی تصویر اور ایک ماہر فن کی بنائی ہوئی تصویر میں کیا فرق ہوگا؟ یہی ہوگا کہ ماہر فن اُس کی نوکیں پلکیں خوب درست کرے گا اور میں صرف بے ڈھنگی سی لکیریں کھینچ دینے پر اکتفا کروں گا پس کسی مضمون کا خالی بیان کر دینا اَور بات ہوتی ہے اور اس کی نوک پلک درست کرکے اسے بیان کرنا اور بات ہوتی ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گو بعض جگہ وہی مضامین لئے ہیں جو پرانے صوفیاء بیان کرتے چلے آتے تھے مگر آپ کے بیان کردہ مضامین اور پہلے صوفیاء کے بیان کردہ مضامین میں وہی فرق ہے جو ایک اناڑی اور ماہر مصور کی بنائی ہوئی تصاویر میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تصویر اس طرح کھینچی ہے جیسے ڈرائنگ کا ایک طالب علم کھینچتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تصویر اس طرح کھینچی ہے جیسے ایک ماہر فن تصویر کھینچ کر اپنے کمالات کا دنیا کے سامنے ثبوت پیش کرتا ہے۔ اور پھر ہر بات پر قرآن کریم سے شواہد پیش کرکے بتایا ہے کہ اس مضمون کا بتانے والا قرآن کریم ہے۔

علم الیقین کے بعد عین الیقین ہوتا ہے کہ انسان ایک بات خود دیکھتا ہے لیکن ایسے طور پر کہ شبہ کی گنجائش نہ ہو جیسے دُور سے دھوئیں دیکھ کر آگ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کا درجہ حق الیقین کا ہے جیسے کہ کوئی شخص آگ میں انگلی ڈال کر اس کے جلانے والے اثرات کو خود دیکھ لیتا ہے

ان تین مدارج میں سے سب سے مکمل درجہ حق الیقین کا ہے جس کے اندر شک و شبہ کا کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اور یہی مقام رسولوں کو حاصل ہوتا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بوجہ سید الانبیاء ہونے کے سب سے زیادہ حاصل تھا۔ اسی درجۂ یقین کی وجہ سے جب بھی کوئی رسول آیا اللہ تعالےٰ نے اُسے پہلے یہی کہا کہ تُو خود اپنے دعوے پر ایمان لا اور پھر اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر۔ گویا الٰہی سُنّت جو سلسلہ انبیاء پر نظر ڈالنے کر معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ پہلے خود نبی کے دل میں یقین پیدا کیا جاتا ہے اور پھر اُسے لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو قرآن کریم میں اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام ع۲۰) کے الفاظ آتے ہیں اُن کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہمارا پہلا کام تیرے دل میں یقین پیدا کرنا ہے۔ اگر تیرے دل میں ذبذبہ اور شک رہیگا تو تُو اس کام کے لئے وہ کوشش نہیں کر سکے گا جس کوشش کے بغیر یہ کام اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ غلطی سے اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (اعراف ع۱۷) یا اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کہنے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور وہ اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ اپنے دعوے پر آپ ایمان لانے کے کیا معنے ہوئے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اس یقین کے بغیر کوئی شخص دوسروں کو شکوک و شبہات سے نجات نہیں دلا سکتا۔ وہی شخص دوسروں کے دل میں یقین پیدا کر سکتا ہے جس کے دل میں خود یقین موجود ہو اور وہی شخص دوسروں کے دل کو منور کر سکتا ہے جس کے دل میں خود نور ایمان موجود ہو۔ اور انشراح صدر سے مراد یہ آخری قسم کا یقین ہی ہوتا ہے جو حق الیقین کہلاتا ہے اور اسی یقین کے پیدا کرنے کے لئے انبیاء کو اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ کہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ درحقیقت بڑے کام بغیر اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ہونے کے ہو ہی نہیں سکتے۔ جو شخص اپنے کام کے متعلق یقین ہی نہیں رکھتا ایسا یقین جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے منزہ ہو وہ دوسروں کو کیا ہدایت دے سکتا ہے۔ پس اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ کہنا کوئی معمولی فقرہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑی دلیل ہے جس کا انبیاء اور خدا تعالےٰ کے مقربین کی زبان سے اظہار ہوتا ہے۔ یہی ایمان ہے جو دوسروں کے شکوک کو مٹاتا اور اُن کو بھی یقین کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

پھر یہ بھی سوچو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو دعا کرتے ہیں کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (طٰہٰ ع۲) اے میرے رب

انبیاء کو ان کے اپنے دعووں پر ایمان لانیکا حکم دینے کی وجہ

میرا سینہ کھول دے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ خدایا مجھے یقین حاصل ہو جائے جس کے بعد میں یہ سمجھوں کہ اگر یہ کام نہ ہُوا تو میرا قصور ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے یہ چیز تجھے دے دی ہے اور نہ صرف تجھے دے دی ہے بلکہ تو بھی جانتا ہے کہ ہم یہ چیز تجھے دے چکے ہیں یعنی ایسے رنگ میں یہ چیز تجھے دی ہے کہ تجھ پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے۔ کیونکہ انکارِ ابطالی اُسی وقت استعمال ہوتا ہے جب مخاطب اس امر سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ ورنہ بعض کمالات انسان میں موجود ہوتے ہیں مگر وہ اُن سے واقف نہیں ہوتا۔ یہ صاف بات ہے کہ ورائے الادراک امور پر یقین کامل بغیر تجلّی کے نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی مادی چیز ہو اور وہ کسی انسان کو مل جائے مثلاً روٹی مل جائے یا روپیہ مل جائے تو اُس پر یقین لانے کیلئے کسی تجلّی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان جانتا ہے کہ فلاں چیز مجھے مل گئی ہے لیکن یہاں جس چیز کے ملنے کا ذکر کیا جارہا ہے وہ مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اور روحانی چیز پر یقین کس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی متواتر تجلیات انسان کو حق الیقین کے مقام پر لاکر کھڑا نہ کر دیں۔ درحقیقت یقین کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ کبھی یقین کسی مادی چیز کے متعلق ہوتا ہے اور کبھی روحانی چیز کے متعلق۔ کبھی غیر معمولی طور پر مضبوط یقین انسان کو حاصل ہوتا ہے اور کبھی یقین تو ہوتا ہے مگر ذرا سی بات پر انسان شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے مجھے یقین ہے مگر یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا یقین غیر متزلزل یقین نہیں۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک لڑکی جس کا نام مہستی تھا۔ وہ ایک دفعہ شدید بیمار ہوئی اور اس کی بیماری روز بروز تشویشناک صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ اُس کی والدہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتی تھی کہ الٰہی اگر ملک الموت نے روح قبض ہی کرنی ہے تو میری روح قبض کرلے میری لڑکی کو کچھ نہ کہے۔ اتفاقاً ایک رات اس کی گائے کھُلی رہ گئی اُس نے صحن میں اِدھر اُدھر پھر کر برتنوں میں مُنہ ڈالنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں اُسے ایک گھڑا نظر آیا جس میں چھان پڑا ہُوا تھا اُس نے گھڑے میں مُنہ ڈال دیا اور جب اس نے دو چار لقمے لینے کے بعد اپنے سر کو باہر نکالنا چاہا تو وہ باہر نہ نکال سکی اس کا سر گھڑے میں پھنس کر رہ گیا۔ اس پر وہ گھبرا کر صحن میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ لڑکی کی ماں نے شور سُنا تو وہ بھی جاگ اٹھی مگر سمجھ نہ سکی کہ یہ چیز کیا ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو یہ ملک الموت ہے جو میری روح قبض کرنے کے لئے آیا ہے کیونکہ میں روزانہ یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ یا اللہ میں مر جاؤں اور مہستی بچ جائے جب اس خیال کے نتیجہ میں اُسے اپنی موت بالکل سامنے نظر آئی تو وہ بے اختیار کہنے لگی ؎

ملک الموت من نہ مہستی ام — من یکے پیرزالِ محنتی ام
گر ترا مہستی است اندر کار — اینک اُو را ببر مرا بگذار

ملک الموت میں مہستی نہیں میں تو ایک بڑھیا مزدور عورت ہوں مہستی تو وہ اندر لیٹی ہوئی ہے تو نے اگر جان نکالنی ہے تو اُس کی نکال لے۔

اب دیکھو وہ اپنے دل میں روزانہ یہ سمجھتی تھی کہ میں مہستی کے لئے جان دے سکتی ہوں مگر وہ یقین اس حد تک نہیں تھا کہ موت کے سامنے آنے پر بھی قائم رہتا۔ جب اُسے اپنی موت سامنے نظر آئی وہ اپنے تمام دعاوی محبت کو بھول گئی۔ اور لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی کہ مہستی تو وہ ہے اس کی جان نکال لے۔ تو بسا اوقات انسان سمجھتا ہے کہ مجھے یقین حاصل ہے مگر دراصل اُسے غیر متزلزل یقین حاصل نہیں ہوتا اور جس چیز کو وہ یقین قرار دے رہا ہوتا ہے وہ اُس کے نفس کا دھوکا ہوتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بے شک یقین حاصل تھا مگر آپ کو کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ میرا یقین اب کسی بڑی سے بڑی مشکل کے آنے پر بھی بدل نہیں سکتا۔ اُسی وقت آپ کو اس حقیقت کا علم ہو سکتا تھا جب امر غیب کو امر ظاہر بنا دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ کی متواتر

آنحضرت صلعم اور حضرت موسیٰ کے رتبہ میں ایک امتیاز

تجلیات آپ کو اس مقام پر کھڑا کر دیتیں جس کے بعد کسی تزلزل یا کسی جنبش قدم کا امکان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پس چونکہ وما ادراک امور پر یقین کامل تجلی کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے یہ آیت قطعی طور پر اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی متواتر تجلیات آپ پر ہو چکی تھیں اور آپ ایسے یقینی شواہد حاصل کر چکے تھے کہ جن کی بناء پر آپ سمجھتے تھے کہ جس طرح مَیں نے سورج کو دیکھا ہے، مَیں نے چاند کو دیکھا ہے، مَیں نے زمین اور آسمان کو دیکھا ہے اسی طرح مَیں نے اپنے رب کی متواتر تجلیات کو مشاہدہ کیا ہے جس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ میرے دل سے اس یقین کو نکالا جا سکے۔ پس اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس وقت تک آپ پر متواتر تجلیات ہو چکی تھیں ورنہ خدا تعالیٰ یہ کس طرح کہہ سکتا تھا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے اور اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود تُو بھی جانتا ہے کہ تیرا شرح صدر ہو چکا ہے۔ پس یہ آیت صرف اس مضمون کی حامل نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا شرح صدر ہوا بلکہ ایک زائد بات اس میں یہ بھی پائی جاتی ہے کہ آپ پر اُس وقت تجلیات الٰہیہ کے ذریعہ اتنا واضح ہو چکا تھا کہ آپ یہ کہنے کے لئے بھی تیار تھے کہ بے شک میں مانتا ہوں کہ مشکلات آئیں گی مگر میں مٹ نہیں سکتا۔ مشکلات میرے پائے ثبات کو جنبش میں نہیں لا سکتیں۔ چنانچہ آنے والے واقعات نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ آپ میں اس قسم کا یقین تھا اور الٰہی تجلیات نے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا تھا کہ کوئی چیز آپ کو ہلا نہ سکی۔ چنانچہ میں اس کے ثبوت میں سات مثالیں پیش کرتا ہوں۔

آنحضرتؐ کے دل میں حق الیقین پیدا ہو چکا سات مثالیں

(۱) پہلی مثال ابو طالب کا واقعہ ہے۔ مکّہ کے بڑے بڑے رؤساء اُن کے پاس آئے اور انہوں نے کہا ہم اس غرض کے لئے آئے ہیں کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہماری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں کہ اگر وہ دولت کا خواہشمند ہے تو ہم اس کو اتنی دولت دینے کے لئے تیار ہیں کہ وہ ہم سب میں سے زیادہ امیر ہو جائے۔ اگر وہ حسین بیوی کا شائق ہے تو ہم عرب کی سب سے زیادہ حسین لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی کرنے کے لئے تیار ہیں اور اگر وہ حکومت اور ریاست کا شوق رکھتا ہے تو ہم اُسے اپنا بادشاہ ماننے کے لئے تیار ہیں۔ غرض اُس کی ہر خواہش اور مطالبہ کو ماننے کے لئے ہم تیار ہیں۔ وہ صرف اتنی بات مان لے کہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ اب اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یقین میں ذرا بھی تذبذب ہوتا یا لالچ کا کوئی ایک محرک بھی آپ کے قلب میں پایا جاتا تو آپ اس پیغام پر خوش ہوتے اور کہتے چلو اچھا ہوا مقصد حاصل ہو گیا۔ مجھے دولت چاہیئے تھی سو اس ذریعہ سے دولت آ رہی ہے۔ مجھے بیوی چاہیئے تھی سو اس ذریعہ سے حسین ترین لڑکی مل رہی ہے۔ مجھے قوم کی سرداری چاہیئے تھی سو وہ بھی حاصل ہو رہی ہے۔ اگر مَیں بتوں کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دوں تو اس میں میرا کیا حرج ہے۔ مگر آپ یہ جواب نہیں دیتے کہ بہت اچھا میں تمہارے مطالبہ کو مان لیتا ہوں تم مجھے دولت دے دو۔ مجھے ریاست دے دو۔ مجھے حسین ترین لڑکی دے دو مَیں بتوں کو بُرا بھلا کہنا ترک کر دیتا ہوں۔ بلکہ آپ اپنے چچا کو یہ جواب دیتے ہیں کہ اے میرے چچا! اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دے تب بھی میں اپنے عقائد پر قائم رہوں گا اور ایک شوشہ بھر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوں گا۔ دیکھو یہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا کتنا بڑا ثبوت ہے کہ آپ کو بڑے سے بڑا لالچ دیا گیا مگر آپ نے پر پشہ کے برابر بھی اُن چیزوں کو کوئی قیمت نہ دی اور فرمایا کہ مجھے جس کام کے لئے خدا نے کھڑا کیا ہے وہ میں مرتے دم تک کرتا چلا جاؤں گا اور مَیں اس سے نہیں ہٹوں گا خواہ مکّہ والے سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں۔

(۲) ہجرت کے وقت گھر سے نکلنے کا واقعہ بھی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ علم ہو چکا تھا کہ

باہر کفار کھڑے ہیں، آپ کو یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ قتل کے ارادہ سے آئے ہیں مگر چونکہ خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ کفار خواہ تیری ہلاکت کے کتنے بڑے منصوبے کریں وہ تجھے قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں ذرا بھی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ آپ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے اور بڑی دلیری سے کفار کے گھیرے میں سے نکل گئے۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو اُس کے اوسان خطا ہو جاتے، اُس کے قدم لڑکھڑا جاتے اور وہ سخت پریشان ہوتا کہ اب میں کیا کروں۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت جرأت کے ساتھ دشمن کی قطار کے سامنے سے گذر گئے میں نے حضرت خلیفۂ اول سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے ایک روایت میں ہے کہ اُن میں سے ایک شخص نے بعد میں بتایا کہ میں نے رات کو آپ کے مکان میں سے ایک شخص کو نکلتے تو دیکھا تھا مگر میں نے خیال کیا کہ یہ کوئی اور شخص ہوگا۔ چنانچہ میں نے اُسے دیکھ کر اپنا مُنہ پرے کر لیا تا ایسا نہ ہو کہ وہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جاکر یہ بتا دے کہ باہر قتل کے ارادہ سے کئی لوگ کھڑے ہیں (مجھے خود اب تک کسی کتاب میں یہ حوالہ نہیں ملا) اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ بغیر کسی گھبراہٹ کے نہایت جرأت کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ آپ کے قدم نہایت مضبوطی سے پڑ رہے تھے۔ آپ کے چہرہ پر بشاشت اور اطمینان کے آثار تھے اور دشمن یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی جرأت کے ساتھ گھر سے نکلنے والا وجود محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو دشمن کو دیکھتے ہی چکرا کر گر پڑتا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کی ذرا بھی پرواہ نہ کی کیونکہ آپ کے دل میں یہ یقین کامل تھا کہ کفار مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ خدا تعالیٰ کی حفاظت میرے ساتھ ہے اور وہ اپنے وعدہ کو بہر حال پورا کرے گا پس ہجرت عن الدار کا واقعہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا ایک اہم ثبوت ہے۔

(۳) تیسرا واقعہ غار ثور کا ہے۔ دشمن سر پر آ پہنچا ہے ابو بکرؓ گھبرا رہے ہیں۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا گھبرانے کی کونسی بات ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے اس کی معیت کے ہوتے ہوئے یہ لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں اور غائب و خاسر چلے جاتے ہیں یہ کمال یقین ہی تھا کہ دشمن سر پر کھڑا ہے اُس کی آوازیں کانوں میں پہنچ رہی ہیں مگر آپ فرما رہے ہیں لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔

(۴) چوتھا واقعہ اُحد کا ہے۔ اس جنگ میں ایک غلطی کی وجہ سے اکثر صحابہؓ میدانِ جنگ سے بھاگ گئے تھے۔ دشمن تین ہزار کی تعداد میں تھا وہ حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھا مگر باوجود اس کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بہت کم صحابہ تھے۔ آپ دشمن کے ریلے کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ آپ بالکل اکیلے رہ گئے اور یہی وہ وقت تھا جب آپ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور خود بھی زخمی ہو کر ایک گڑھے میں جا گرے۔ ایسے موقع پر طبعی طور پر انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ میں کسی پتھر کے پیچھے چھپ جاؤں تاکہ دشمن کے حملہ سے محفوظ رہوں۔ مگر آپ کھڑے رہے اور کھڑے رہے اور کھڑے رہے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میں نے لوگوں کے ہاتھ سے مرنا تو ہے ہی نہیں یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ مجھے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ع ۱۰) خدا تعالیٰ میری حفاظت کرے گا اور وہ مجھے قتل سے محفوظ رکھے گا۔ یہ وعدہ بہر حال پورا ہوگا اور دشمن اپنے ارادہ میں ناکامی کا مُنہ دیکھے گا۔ پس اُحد کا واقعہ بھی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

(۵) پانچواں واقعہ غزوۂ غطفان کا ہے۔ ایک شخص نے ارادہ کیا کہ وہ آپ کو قتل کئے بغیر گھر واپس نہ جائے گا وہ چھپتا چھپتا اسلامی لشکر کے پیچھے چلا آیا تاکہ موقع ملنے پر

آپ پر حملہ کرے مگر اُسے کوئی موقعہ نہ ملا یہاں تک کہ صحابہؓ مدینہ کے قریب جا پہنچے۔ وہ چونکہ مسلمانوں کا اپنا علاقہ تھا صحابہؓ نے احتیاط کا پہلو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت صحابہ دُور دُور پھیل گئے اور مختلف درختوں کے نیچے چادریں تان کر سو گئے۔ اُس نے یہ موقع غنیمت سمجھا آگے بڑھا اور جس درخت کے نیچے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سو رہے تھے وہاں پہنچ کر اُس نے درخت سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار اُتار لی اور پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جگا کر کہا بتاؤ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی تذبذب کے لیٹے لیٹے نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ فرمایا اَللّٰہُ۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے تم خود کسی دشمن کے سامنے اَللّٰہُ کہہ کر دیکھو اس پر کوئی بھی اثر نہیں ہوگا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جس وثوق اور ایمان اور یقین کے ساتھ اَللّٰہ کہا وہ ایسا زبردست تھا کہ دشمن نے صرف آپ کی زبان سے اَللّٰہ کا لفظ نہیں سُنا بلکہ اس نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالےٰ آپ کے ساتھ کھڑا ہے اُس کا ہاتھ کانپ گیا اور تلوار اسکے ہاتھ سے گر گئی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فوراً تلوار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا اب بتاؤ تم کو کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ اُس نے کہا آپ ہی رحم کریں تو کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ افسوس تم نے سُن کر بھی سبق حاصل نہ کیا۔ تم کہہ سکتے تھے کہ اللہ مجھے بچا سکتا ہے مگر تم نے میری زبان سے یہ بات سننے کے باوجود اللہ کا لفظ استعمال نہ کیا۔

اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس پر حجت تمام کر دی اور بتا دیا کہ تم یہ نہ سمجھو میں نے بناوٹ کے ساتھ اللہ کہا تھا۔ اگر میں بناوٹ کے ساتھ کہتا تو تم بھی ایسا کہہ سکتے تھے بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ قریب ترین عرصہ میں تمہارے سامنے میں نے اللہ تعالےٰ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا اور تم نے دیکھ لیا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے میری حفاظت فرمائی اور تمہارے حملہ سے اُس نے مجھے محفوظ رکھا مگر تم پھر بھی اللہ کا لفظ اپنی زبان پر نہ لاسکے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ گھبراہٹ کے موقع پر تصنع اور بناوٹ سے اللہ کا لفظ زبان پر نہیں آسکتا۔ یہ آتا ہے تو اسی حالت میں جب انسان کے رگ و ریشہ میں اللہ تعالےٰ کی محبت جاگزیں ہو چکی ہو اور وہ سورج سے بھی زیادہ یقینی دلائل سے اس یقین پر قائم ہو چکا ہو کہ میرا رب مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ پس یہ واقعہ بھی اُس شرح صدر کا ایک بیّن ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔

(۶) چھٹا واقعہ غزوۂ خندق کا ہے۔ دشمن آیا اور اُس نے مدینہ کا چاروں طرف سے احاطہ کر لیا۔ قرآن کریم نے اس محاصرہ کا سورۂ احزاب میں نہایت ہی اعلیٰ نقشہ کھینچا ہے جب دشمن سمجھتا تھا کہ میں نے مسلمانوں کو مار لیا۔ اُس وقت مومن بندے کہہ رہے تھے کہ دیکھو اللہ تعالےٰ کی باتیں پوری ہو گئیں هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (احزاب ع۳) بجائے گھبرانے کے وہ خوش خوش پھرتے تھے کہ خدا نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔ یہ بھی ثبوت ہے اس شرحِ صدر کا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ کیونکہ اگر آپ کو شرحِ صدر نہ ہوتا تو آپ کے ماننے والوں کے دلوں میں یہ غیر معمولی یقین خدائی دعووں پر کس طرح پیدا ہو جاتا۔ کہ دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہے اور وہ خوش ہو رہے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی باتیں پوری ہو گئیں۔

(۷) ساتواں واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب مسیلمہ کذاب اپنے قبیلہ کے سرکردہ لوگوں کو لے کر آپ کے پاس آیا۔ اُس کی پشت پر اس کی قوم کا ایک لاکھ سپاہی تھا۔ سرداران قوم نے کہا یا رسول اللہ ہم آپ کو مان چکے ہیں اور آپ کی بیعت بھی کر چکے ہیں مگر اب ہماری قوم کا ایک فرد کہتا ہے کہ تم مجھے مانو۔ ہم اسے آپ کے پاس لے آئے ہیں تاکہ آپس میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور فتنہ بڑھنے نہ پائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر مل چکی تھی۔

کہ آپ کی وفات قریب ہے۔ اُدھر عرب میں سے سب سے طاقتور
اور سب سے زیادہ تعداد رکھنے والا قبیلہ آپ کے پاس وفد لایا اور
کہا کہ مسیلمہ کو بھی الہام ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے مجھے مان لو۔ ہم
اسے آپ کے پاس اس لئے لائے ہیں تاکہ آپ کے ساتھ کوئی
سمجھوتہ ہو جائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ سے
فرمایا کہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ اُس نے کہا پہلے آپ بتائیں
کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں یہی چاہتا ہوں کہ
مجھے رسول مانا جائے اور میری اطاعت اختیار کی جائے۔
مسیلمہ نے کہا ہم آپ کو بے شک رسول مانتے ہیں مگر ہم
صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ اپنی وفات کے بعد جب کہ آپ کو
اس معاملہ سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی (کیونکہ آپ کی نرینہ
اولاد نہ تھی) مجھے اپنا خلیفہ مقرر کر دیں۔ اُس نے اپنی طرف
سے سمجھوتہ کے لئے نہایت ہی نرم شرط آپ کے سامنے پیش
کی۔ ایک لاکھ سپاہی اس کی پشت پر تھا اور اس نے صرف
یہ مطالبہ کیا کہ مجھے وفات کے بعد خلیفہ بنا دیا جائے۔ مگر
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یُوں دیا کہ ایک
تنکا اٹھایا اور فرمایا کہ خلافت تو الگ رہی یہ تنکا بھی تمہیں
نہ دیا جائے گا۔ اور میرے معاملہ میں وہی ہوگا جو خدا تعالےٰ
چاہے گا یعنی وہی شخص خلافت کے مقام پر کھڑا ہوگا جس کو
خدا تعالےٰ خود کھڑا کرنا چاہے گا۔ تم ان معاملات میں دخل
دینے والے کون ہو۔ مسیلمہ غصہ اور ناراضگی کی حالت میں
واپس چلا گیا اور اپنی قوم سمیت اسلام سے مرتد ہو گیا۔ جب
رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے تو وہ ایک لاکھ
سپاہی اپنے ساتھ لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا اور اُس نے
ایسا شدید حملہ کیا جس کی پہلے کسی حملہ میں مثال نہیں ملتی۔
صحابہؓ اس جنگ میں اس طرح مارے گئے جس طرح چنے
بھُونے جاتے ہیں اور وہ شکست کھا کر واپس لوٹ گئے۔ حضرت
ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس شکست کا اتنا صدمہ ہُوا کہ آپ نے
سرداران لشکر کو حکم دے دیا کہ اُن میں سے کوئی شخص آئندہ
مدینہ میں میرے سامنے نہ آئے۔ یہ سزا جو اُن سرداران لشکر کو
دی گئی بتاتی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس شکست کا
کیسا صدمہ ہُوا تھا۔ مگر باوجود اس کے خطرہ حقیقی تھا اور
مسیلمہ اور اُس کی قوم کا ارتداد بہت سی مشکلات کا موجب بن
سکتا تھا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی ذرا بھی پروا
نہ کی۔ ایک تنکا اُٹھا کر کہا کہ تم خلافت مانگتے ہو تمہیں تو یہ تنکا
بھی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خدا تعالےٰ کی ایک امانت ہے اور
اُسی شخص کے پاس جائے گی جو اس امانت کا بہترین اہل ہو۔
غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی شروع
سے لے کر آخر تک اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی
صداقت کا ایک بیّن اور واضح ثبوت ہے۔ ہر مقام پر آپ نے
اُس غیر متزلزل یقین کا ثبوت دیا جو آپ کو خدا تعالےٰ کی ذات
پر تھا اور یہی یقین تھا جو مسیلمہ کذّاب والے واقعہ میں کام کر رہا
تھا۔ آپ نے سمجھا جب خدا تعالےٰ کہہ رہا ہے کہ ابو بکر خلیفہ
بنے گا تو مسیلمہ اس کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے۔ آپ
نے اس مطالبہ کو ردّ کر دیا اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ کی
کہ اس کے نتیجہ میں کیا کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے جو مثالیں دی ہیں ان میں سے
بعض اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کی ہیں۔ لیکن میرا منشاء اس
جگہ یہ بتانا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی
اس آیت کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے شروع سے
لے کر آخر تک آپ کی زندگی سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ
نے آپ کا سینہ اسلام اور اس کی تعلیم کے لئے کھول دیا تھا
اور وہ آخر تک کھلا رہا۔

انشراحِ صدر سے مراد حفاظتِ سینہ

دوسرے معنے شَرَحَ کے محفوظ رکھنے کے ہوتے ہیں۔
ان معنوں کے رُو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ کیا ہم نے
تیرے سینہ کو تیرے لئے محفوظ نہیں کر دیا۔ سینہ یا دماغ جو
چاہو کہہ لو (اس کے متعلق بحث اُوپر گذر چکی ہے) انسانی تجارب
کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ ہر کام جو انسان کرتا ہے وہ اس کے
دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں
اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا کَانَتْ نُکْتَةٌ سَوْدَاءُ

فِیْ قَلْبِہٖ فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی یُغْلِفَ قَلْبَہٗ یعنی جب انسان کوئی کام کرتا ہے اگر نیک کام ہو تو اس پر ایک نیک نکتہ لگ جاتا ہے یعنی علاوہ اُس نیک کام کا شرعی نتیجہ نکلنے کے اس کا ایک طبعی نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اُس شخص کے دل پر ایک نورانی نشان ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ نیکیوں پر آئندہ زیادہ قادر ہو جاتا ہے۔ اور جو کوئی بدی کرتا ہے اُسے علاوہ شرعی سزا ملنے کے ایک طبعی نتیجہ اس شکل میں ملتا ہے کہ اس کے دل پر ایک سیاہ داغ ڈال دیا جاتا ہے اور آئندہ اُس کے لئے بدی کا ارتکاب آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں یا دل سارا سفید ہو جاتا ہے یا سارا سیاہ۔ اس نکتہ کی طرف بھی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تیرے فائدہ کے لئے (لَکَ کا لام فائدہ کے معنے دیتا ہے) تیرا سینہ کھول دیا ہے یعنی وہ روحانی امور جو تیرے لئے نفع بخش ہوتے ہیں اُن کے قبول کرنے کے لئے ہم نے تیرا سینہ محفوظ کر دیا ہے یعنی اس کے خلاف بدی کی کوئی تحریک تیرے سینہ میں داخل نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ تیرا سینہ نیکی کے لئے محفوظ رہنا چاہیئے۔ اس آیت کی تشریح خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے اِنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیْ عَلَیْہِ فَاَسْلَمَ فَلَا یَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (مسلم جلد ثانی کتاب صفۃ المنافقین باب تحریش الشیطان وبعثہ سرایاہ) کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے اور میرے دل میں صرف نیک تحریکات ہی ڈالتا ہے اس حدیث کے یہی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کو آپ کے فائدہ والی چیزوں کے لئے محفوظ کر دیا تھا ہر وہ چیز جو آپ کے لئے مضر ہو اس میں داخل نہیں ہو سکتی تھی اور اگر کوئی بُری بات آپ کے کان میں پڑے تو وہ نیک پہلو اختیار کر لیتی تھی جس طرح کہتے ہیں کہ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ یہ کتنا بڑا مقام ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ آپ کے دل میں جو خیال آتا نیک ہی آتا اگر بدی آپ کے سامنے آتی تو وہ بھی نیک شکل اختیار کر لیتی۔ طائف کے لوگوں نے جب آپ پر پتھر مارے۔ کُتے آپ کے پیچھے ڈالدیئے تو اس شرارت نے غم و غصہ آپکے دل میں پیدا نہیں کیا بلکہ آپ نے خدا تعالیٰ سے یہ دعا کرنی شروع کر دی کہ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ میرے اللہ ان کی اس بیہودگی پر ناراض نہ ہونا ان کو معلوم نہیں کہ میں آپ کی طرف سے پیغامبر ہوں۔ کیا ہی نیکی کا یہ نمونہ ہے جو آپ نے دکھایا کیا ایسے موقعہ پر کوئی بھی اپنے جذبات کو دبا کر رکھ سکتا ہے؟ مُنہ سے عفو کہنا الگ امر ہے مگر پتھراؤ ہو رہا ہے، کُتے پیچھے ڈالے جا رہے ہیں اور ساتھ کے ساتھ آپ ان لوگوں کے لئے دعا کرتے جاتے ہیں۔ یہ وہ نمونہ ہے جس کی مثال صرف خدا رسیدہ لوگوں میں ہی مل سکتی ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام سب سے بلند حاصل تھا اور اسی طرف اللہ تعالیٰ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ سے اشارہ فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تیرے سینہ کو ہر شر سے محفوظ کر دیا ہے صرف نیکیاں ہی اس میں جا سکتی ہیں کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ اب دنیا کی اصلاح تیرے ہی ذریعہ سے ہوگی۔ اور جس طرح شیطان کو تیرے سینہ میں دراندازی سے روکا گیا ہے اسی طرح تیرے ذریعہ سے وہ دوسروں کے سینوں میں دراندازی سے روکا جائے گا۔ یہ دلیل کس قدر شاندار اور واضح ہے۔ بینا ہی نابیناؤں کی راہنمائی کر سکتا ہے ایک نابینا کس طرح راہنمائی کر سکتا ہے۔ پس کامل راہنمائی دنیا کی ایسا ہی انسان کر سکتا ہے جس کا سینہ خدا تعالیٰ نے شیطان کے اثر سے محفوظ کر دیا ہو۔ اور جس کا سینہ شیطانی اثرات سے محفوظ ہو اس کی بات کا انکار نیکی کا میلان رکھنے والے کیلئے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ مقناطیس سے لوہا الگ نہیں رہ سکتا اور کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔

تیسرے معنے شَرَحَ کے سمجھانے کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے تیرے دل میں

حقائق اشیاء آثار دئے اور خود تیرا استاد بن کر تجھ کو سمجھایا یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سمجھانے اور حقیقت بتانے والا خود اللہ تعالےٰ تھا۔ اس مضمون کی حقیقت ظاہر ہی ہے جس کا خدا تعالےٰ استاد ہو وہی روحانی دنیا میں اُستاد ہو سکتا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں اُس وقت لوگ حقیقت روحانیہ سے بالکل نابلد ہو چکے تھے اور دنیا محتاج تھی کہ پھر نئے سرے سے اللہ تعالےٰ کسی کا اُستاد بن کر اُسے دنیا کے لئے اُستاد بنائے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور فرمایا گیا ہے کہ کیا اللہ تعالےٰ نے تیرے دل کو خود حقائق روحانیہ سے آگاہ نہیں کیا۔ یعنی ایسا کیا ہے اور جب خدا تعالیٰ نے تیرے دل پر نازل ہو کر اُسے حقائق اشیاء سے آگاہ کیا ہے تو پھر تیرے سوا اور کون ہے جو گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے اور تُو ناکام کس طرح رہ سکتا ہے کیونکہ شاگرد کی ناکامی استاد کی ناکامی ہوتی ہے۔ تُو ناکام رہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا تعالےٰ نے جو تجھے سکھا کر دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا وہ ناکام رہا اور یہ ہو نہیں سکتا پس تو ضرور کامیاب ہو کر رہے گا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے ایک اور معنے بھی ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کی بلندیٔ درجات کا ایک کھلا ثبوت ہیں اور وہ معنے یہ ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے علوم ہوتے ہیں۔ ایک علم خارجی ہوتا ہے اور ایک علم اندرونی ہوتا ہے۔ تکمیل علم کا انحصار انہی دو ٹکڑوں پر ہوتا ہے اور یہ علم النفس کا ایک بہت بڑا نکتہ ہے جس سے بہت سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ علم خارجی ہی اصل علم ہے حالانکہ علم خارجی بہت محدود علم ہوتا ہے اور وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ علم اندرونی بھی شامل نہ ہو مثلاً میں اس وقت درس دے رہا ہوں اب اگر کوئی شخص ایسا ہو جسے اللہ تعالےٰ نے ملکۂ ادراک بخشا ہوا ور علم قرآن کا چشمہ اس کے سینہ میں پھوٹ رہا ہو تو وہ میرے اس درس کو سُنکر نہ صرف دوسروں تک یہ تمام باتیں پہنچا دے گا بلکہ وہ انہی باتوں کے کئی ایسے جدید پہلو بھی بیان کر سکے گا جو قلتِ وقت کی وجہ سے بیان نہیں کئے جا سکے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو درس کو سُن کر صرف اتنی قابلیت رکھتا ہو کہ اُس درس کو من وعن بیان کر دے اُس میں یہ قابلیت نہیں ہوگی کہ وہ جدید پہلو اپنی ذہنی قابلیت سے نکالکر بیان کر سکے۔ پھر کوئی ایسا ہوگا جو پورا درس بیان کرنے کی بھی قابلیت نہیں رکھے گا۔ وہ جو کچھ بیان کرے گا اصل درس کا ¾ حصہ ہوگا۔ اور کوئی ایسا ہوگا جو صرف آدھی باتیں بیان کر سکے گا۔ اور کوئی ایسا ہوگا کہ اُس سے پوچھو کہ درس میں کیا بیان ہُوا تھا تو وہ کہہ دے گا قرآن کی کچھ تفسیر بیان کی گئی تھی مگر یاد نہیں رہی صرف اتنا یاد ہے کہ اچھا دلچسپ تھا۔

انشراح صدر سے مراد حقائق اشیاء کا علم ہے یا دل کا کھل جانا

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ عورتوں میں کچھ مدت تک سلسلۂ تقاریر جاری رکھا۔ ایک دن آپ کو خیال آیا کہ عورتوں کا امتحان لینا چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ہماری باتوں کو سمجھتی ہیں یا نہیں۔ ایک عورت جو بڑی مخلصہ تھیں اور نابھہ کی رہنے والی تھیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا تم ہماری تقریریں سنتی رہی ہو۔ اُس نے کہا جی ہاں روزانہ تقریر سنتی رہی ہوں میں یہاں آئی ہی اس غرض کے لئے ہوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اچھا بتاؤ میں کیا بیان کرتا رہا ہوں۔ اُس نے جواب دیا بس اللہ اور رسول کی باتیں تھیں اور کیا تھا۔ یہ جواب جو اُس عورت نے دیا اس کی وجہ یہی تھی کہ اندرونی علم اُس کے اندر نہیں تھا۔ اُس نے صرف خارجی علم پر انحصار رکھا اور سمجھا کہ میں بہت کچھ سمجھ رہی ہوں حالانکہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں رہی تھی۔ تو اندرونی علم کے بغیر کبھی کوئی شخص کسی بات کو صحیح طور پر دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا جب بھی کوئی بات بیان کی جاتی ہے ہمیشہ اس کے کچھ پہلو چھوڑنے پڑتے ہیں اگر سارے پہلو بیان کئے جائیں تو چند باتوں میں ہی عمر گذر جائے اور علوم کا بہت سا حصہ نامکمل رہے

یہی وجہ ہے کہ آج تک کبھی کسی شخص نے بیان کامل نہیں کیا جو کچھ بیان کیا جاتا ہے ایک بیج کے طور پر ہوتا ہے جس سے ہر شخص اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی قابلیت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا کلام جب آسمان سے نازل ہوتا ہے کسی کے لئے وہ کلام اتنا ہی مفہوم رکھتا ہے جتنے اس کے الفاظ ہوتے ہیں کسی کو آدھے الفاظ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، کسی کو چوتھے حصہ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور کسی شخص کے لئے وہ کلام ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے جیسے درخت کا بیج یا گٹھلی ہوتی ہے کہ اُس میں سے شاخ در شاخ علوم نکلتے چلے آتے ہیں اور نئی سے نئی باتیں اُس میں منکشف ہوتی جاتی ہیں یہی وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کیا ہم نے تیرا سینہ وسیع نہیں کر دیا۔ یعنی اس چیز کے لئے تیرا سینہ بمنزلہ زرخیز زمین ہو گیا تھا۔ قرآن تو ایک گٹھلی تھی مگر تیرے سینہ میں وہ ایک درخت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر سینہ بھی گٹھلی کے برابر ہوتا تو قرآن کے صرف الفاظ ہی الفاظ تیرے پاس رہ جاتے۔ مگر چونکہ خدا نے تجھ کو ایک بہت بڑے کام کیلئے مقرر کیا تھا اور تجھے اس غرض کے لئے دنیا میں بھیجا گیا تھا کہ تو قرآن کی تفسیر کرے، اس کے احکام کی تشریح و توضیح کرے اور اس کے معارف و حقائق دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس لئے تیرے سینہ میں اس کے متعلق گنجائش ہونی چاہیئے تھی تاکہ یہ علم جو ہم نے تجھے بخشا ہے روز بروز بڑھتا رہے نئی نئی باتیں اس میں سے نکلتی رہیں اور نئے نئے نکات لوگوں کے سامنے آتے رہیں پس فرماتا ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیا تو اس بات کا گواہ نہیں کہ ہم نے تیرے اندر یہ مادہ پیدا کیا ہے کہ جب تجھ پر ایک آیت نازل ہوتی ہے تو اس کے تمام مالہٗ اور ماعلیہ تیرے سامنے آجاتے ہیں جو حکم بھی نازل ہوتا ہے اس کی باریکیاں اور وسعتیں سب تیرے ذہن میں مستحضر ہو جاتی ہیں اور تو فوراً سمجھ جاتا ہے کہ کن مواقع پر یہ حکم چسپاں ہوتا ہے اور کن مواقع پر چسپاں نہیں ہوتا۔

آنحضرت صلعم کو علم خارجی کے علاوہ علم اندرونی کی موہبت

غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے علم خارجی کے علاوہ علم اندرونی بھی بخشا تھا اور اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے معنے یہی ہیں کہ کیا علاوہ قرآن شریف کے ہم نے تجھے علم اندرونی نہیں بخشا اور تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا؟ میں بتا چکا ہوں کہ علم خارجی سب شاگردوں کو ایک قسم کا ملتا ہے مگر علم اندرونی ہر طالب علم کا الگ الگ ہوتا ہے اور اپنی الگ الگ استعدادوں کے مطابق وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلام کی وسیع تعلیم کے لئے اس قدر وسیع سینہ کی ضرورت تھی جو ہر قسم کے علم کو سمجھ سکے، سمجھا سکے اور دنیا میں پھیلا سکے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو علم ملا چونکہ وہ جامع و مانع تھا اُس کے لئے بہرحال ایسے سینہ کی ضرورت تھی جو ہر علم کو اخذ کرے اور اُسے پھیلا کر کہیں کا کہیں لے جائے۔ ایک شخص ایسا ہوتا ہے جسے اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنے الفاظ ہوتے ہیں مگر ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو تھوڑے سے الفاظ سے بہت بڑا علم حاصل کر لیتا ہے اور بات کو پھیلا کر کہیں کا کہیں لے جاتا ہے اسی کو تفقّہ کہتے ہیں جو ایک نہایت قیمتی چیز ہے بعض لوگ اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ فلاں حکم تو قرآن کریم میں نہیں ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کہاں سے نکال لیا وہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں تفقّہ کا مادہ تھا مگر تم میں تفقّہ کا مادہ نہیں تمہیں وہ علوم کس طرح حاصل ہوں جو قرآن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئے۔ بے شک جہاں تک حقیقت کا سوال ہے میں چکڑالویوں سے بالکل متفق ہوں مگر جہاں تک تشریح کا سوال ہے میں اُن کو پاگل سمجھتا ہوں۔ یہ تو صحیح ہے کہ قرآن سے باہر کوئی چیز نہیں مگر یہ بکواس ہے کہ عبد اللہ چکڑالوی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دونوں ایک جیسا قرآن سمجھتے تھے۔ ہم اپنے اوپر قیاس کرکے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہزاروں ہزار قرآنی نکات اور باریکیاں ہیں جو اور لوگوں پر نہیں کھلیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر کھول دیں اگر ہم پر قرآن کریم کے ایسے ہزاروں اسرار کھل سکتے ہیں جو کروڑوں

کروڑوں لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہے تو کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہم سے کروڑوں درجے زیادہ قرآن کریم کے معارف نہیں کھل سکتے تھے؟ پھر ہم یہ کیوں فرض کرلیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فلاں حکم دیا تھا وہ قرآن میں موجود نہیں۔ یہ آیت اس امر پر شاہد ہے کہ قرآن کریم کی گٹھلی کیلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ بمنزلہ اعلیٰ زمین کے تھا اس میں وہ گٹھلی لگ کر فوراً اپنے آپ کو پھیلانے اور بلند کرنے لگ گئی تھی اور جو چیز لوگوں کے لئے گٹھلی تھی آپ کے سینہ میں وہ ایک وسیع اور بلند درخت تھی غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے جو دماغ عطا فرمایا تھا وہ بہرحال ہم سے اعلیٰ تھا اس لئے جس رنگ میں آپ قرآن کو سمجھ سکتے تھے اُس رنگ میں دنیا کا اور کوئی شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ دیکھو اس مادی دنیا میں بھی بیج ہمیشہ زمین کی قابلیت کے مطابق اُگتا ہے۔ کھجور ہمارے علاقہ میں نہیں ہوتی لیکن عرب میں ہوتی ہے کیونکہ کھجور کے لئے عرب کی زمین زیادہ مناسب ہے۔ اسی طرح خربوزہ ہے یہ بھی ہر جگہ اچھا نہیں ہوتا بلکہ بعض جگہ اچھا ہوتا ہے اور بعض جگہ ناقص۔ پنجاب میں چھیاری کا خربوزہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے لیکن دوسرے مقامات کا خربوزہ ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ جس طرح مادی پھلوں کے عمدہ یا ناقص ہونے کا دارومدار مختلف زمینوں پر ہوتا ہے اچھی زمین میں بیج ڈالا جائے تو اچھا پھل دیتا ہے اور ناقص زمین میں بیج ڈالا جائے تو ناقص پھل دیتا ہے اور پھر بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں جو بعض پھلوں کو اُگانے کی مخصوص طور پر اپنے اندر قابلیت رکھتی ہیں اسی طرح قرآن کے لئے سب سے بہترین زمین جو الٰہی ہاتھوں سے تیار کی گئی وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سینہ تھا۔ قرآن کا جو درخت وہاں پیدا ہو سکتا تھا وہ اور کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادھر بھی بعض اچھے درخت ہوئے ہیں مگر بہرحال وہ سب کے سب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اظلال ہوں گے۔ کامل تابع ہو یا ادنیٰ سے ادنیٰ تابع، دونوں اپنی اپنی قابلیت اور استعداد کے مطابق قرآن کریم کا پھل دنیا کے سامنے رکھیں گے کامل تابع جس پھل کو لوگوں کے سامنے رکھیگا وُہ اور قسم کا ہوگا اور ادنیٰ تابع جس پھل کو لوگوں کے سامنے رکھے گا وُہ اور قسم کا ہوگا۔ جیسے لنگڑے آم کی گٹھلی جہاں بھی بودو کچھ نہ کچھ اُگ آئے گا مگر اُس کی خوبی زمین کی قابلیت کے مطابق ہوگی۔ اعلیٰ زمین ہوگی تو اعلیٰ درجے کا لنگڑا آم ہوگا اور ادنیٰ زمین ہوگی تو ادنیٰ درجے کا لنگڑا آم ہوگا۔ بہرحال اعلیٰ درجہ کی پیداوار اعلیٰ درجہ کی زمین کی متقاضی ہوتی ہے۔ امریکن کپاس اوّل یورپ میں ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں نہیں ہوتی۔ ایجپشن کاٹن مصر میں اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں اگر یہ کپاس بوئی جائے تو اس میں سفیدی کم آتی ہے سٹیپل STAPLE بہت تھوڑا ہوتا ہے اور بونے والا کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ سفیدی کم ہو تو اعلیٰ درجے کا کپڑا تیار نہیں ہوسکتا اور اگر مضبوطی کم ہو تب بھی لوگ اس کپاس کو نہیں خریدتے کیونکہ اس روئی سے تیار کردہ کپڑا بہت جلد پھٹ جاتا ہے۔ غرض مختلف قسم کی اشیاء کیلئے مختلف قسم کی زمینیں ضروری ہوتی ہیں۔ جس طرح آموں کے لئے ملیح آباد مشہور ہے اور سنگتروں کے لئے ناگپور یا جس طرح زعفران دنیا میں صرف چند محدود علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح اگر قرآن پیدا ہوتا ہے تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ

قرآن مجید کا درخت اُگانے کے لئے آنحضرت صلعم کا سینہ بہترین زمین کی طرح۔

شَرَحَ کے معنے پھاڑنے اور ہل چلانے کے بھی ہوتے ہیں۔ اِن معنوں کے رو سے آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا ہم نے تیرے سینہ میں قرآن اُگانے کے لئے ہل چلائے ہیں یا نہیں؟ جس طرح مادی اشیاء کے لئے مناسب حال زمین کو تلاش کیا جاتا ہے اِسی طرح ہم اپنے قرآن کے لئے اِسی زمین میں ہل چلا سکتے تھے جو قرآن کے مناسب حال ہو۔ سو ہمیں وہ مناسب حال زمین تیرا سینہ دکھائی دیا اور ہم نے اُس میں ہل چلا دیا۔ اب دُنیا دیکھے گی کہ اس میں سے کیسے شاندار پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جب خدا تعالےٰ جیسا بیج بونے والا ہو، خدا تعالےٰ جیسا

۲ اَلَمْ نَشْرَحْ میں شَرَحَ کے معنے ہل چلانے اور پھاڑنے کے

ہل چلانے والا ہو اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ جیسی زمین ہو تو اس کھیتی کی برتری کا کون انکار کر سکتا ہے
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

غرض اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کے نزول کے علاوہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایسا علم لدنی بخشا گیا تھا کہ اُس کے ذریعہ آپ ہر علم کو فوراً قبول کرکے اُس کی وسعتوں کے انتہا تک پہنچ جاتے تھے اور اس سے استنباط اور تفقہ کرکے مسلمانوں کو علم دین سکھاتے۔ یہ وسعت بھی عجیب قسم کی ہے جو کتاب آپکو ملی وہ ایسی عظیم الشان ہے کہ کوئی فن اور کوئی علم نہیں جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔ اُس میں اقتصادیات کے اصول بھی ہیں، اُس میں تمدن کے اصول بھی ہیں، اُس میں سیاست کے اصول بھی ہیں، اُس میں علم العائلہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اُس میں میراث کے مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں، اُس میں علم الاخلاق کی باریکیاں بھی بیان کی گئی ہیں، اُس میں علم العبادات کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے، اُس میں علم المعاملات کو بھی پوری تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھا گیا ہے۔ غرض علم کی کوئی شاخ انسانی ذہن میں ایسی نہیں آسکتی جو مذہب سے براہِ راست تعلق رکھتی ہو اور اس میں تفصیلی احکام موجود نہ ہوں اور جو شاخ براہِ راست تعلق نہ رکھتی ہو اس کے متعلق اجمالی علم اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ ایسی کتاب کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ کا کھول دیا جانا خود ایک غیر معمولی بات ہے۔ اوّل تو جو کتاب آپ کو ملی وہ غیر معمولی ہے اور وہ تمام علوم کی جامع ہے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص ہوشیار اور سمجھدار تھا اقتصادی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اُس نے علم الاقتصاد کی کوئی کتاب پڑھی اور اُس کے سینہ میں اس علم کے چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص سیاسی معلومات کا شوق رکھتا اور بوجہ اس کے کہ سیاسیات سے اُس کی طبعی مناسبت تھی جب اُس نے کسی سیاسی کتاب کو پڑھا تو اُس کے سینہ میں وسعت پیدا ہو گئی اور سیاست کے متعلق نئے سے نئے مضامین اُس کے ذہن میں آنے شروع ہو گئے۔ یہ بھی قیاس میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص قضاء سے دلچسپی رکھتا تھا قضائی امور اُس کے سامنے پیش آگئے اور چونکہ اس کی نفسی مشابہت قضاء کے ساتھ تھی قضائی معاملات میں اُس کا دماغ تیز ہو گیا اور وہ کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ کوئی شخص فوجی طبیعت رکھنے والا تھا اُس نے ملٹری کے قواعد و ضوابط کے متعلق کوئی کتاب پڑھی یا دشمنوں کے ساتھ تعلقات کا وسیع مطالعہ کیا تو اس کے دل میں اور بھی کئی قسم کی نئی باتیں اُس کے متعلق پیدا ہو گئیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص علم العائلہ کا واقف تھا جب اُس نے کوئی ایسی کتاب پڑھی جس میں خاندانوں کے متعلق قوانین بیان کئے گئے تھے جس میں باپ اور بیٹے، خسر اور داماد، میاں اور بیوی دوست اور دوست کے متعلق ہدایات دی گئی تھیں اور پھر خود بھی اس نے ان تعلقات پر غور کیا تو چونکہ اس علم سے اُسے ذاتی مناسبت تھی اس کے متعلق نئے سے نئے علوم اُس کے دماغ میں آنے لگ گئے۔ غرض ہم یہ تمام باتیں اپنے قیاس میں لا سکتے ہیں مگر یہاں دو غیر قیاسی اور بالکل غیر معمولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

وَتَحۡمِیدِ ہر لحاظ کامل ہے۔

اوّل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وہ کتاب نازل ہوئی جس میں ہر علم پر بحث کی گئی تھی اور پھر جو بحث کی گئی وہ ایسی تھی کہ اپنی ذات میں ہر لحاظ سے کامل تھی اور اُس میں کسی نئے پہلو کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پس پہلی بات یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ کتاب ملی جو جامع ہے تمام علوم کی۔ یہ نہیں کہ وہ سیاست کے متعلق کتاب ہے یا انٹرنیشنل لاء کے متعلق کتاب ہے یا اخلاق کے متعلق کتاب ہے یا علم النفس کے متعلق کتاب ہے بلکہ ہر فن کے متعلق ہم اُس میں تعلیم پاتے ہیں۔ اُس میں عبادت پر بھی بحث کی گئی ہے، اُس میں اقتصادیات پر بھی بحث کی گئی ہے، اس میں اُستاد اور شاگرد، باپ اور بیٹا، نوکر اور مالک کے حقوق پر بھی بحثیں ہیں، اُس میں حکومتوں کے تعلقات اور لڑائی اور صلح وغیرہ پر بھی بحث ہے۔ غرض ایک غیر معمولی کتاب ہے جو

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ مگر اس کے مقابلہ میں ایک اور ذمہ داری بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ڈالی گئی کہ اس غیر معمولی کتاب کی تمام جزئیات آپ کے سینہ میں آکر درخت بن جائیں۔ گویا قرآن ایک گٹھلی تھی جس کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں ایک بہت بڑا درخت پیدا ہونا تھا یہ اور بھی غیر معمولی بات ہے اور یہی بات ہے جو اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ میں بیان کی گئی ہے۔ جس چیز کے لئے آپ کا شرح صدر ہوا وہ یہاں محذوف ہے جو سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں۔ گویا اصل آیت یوں ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ لِلْقُرْاٰنِ۔ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا ہم نے تیرا سینہ قرآن کے لئے نہیں کھول دیا؟ اگر خالی اس حد تک انسان چلتا ہے جس حد تک دلالۃ النص کے طور پر مضامین بیان کرنے پڑتے ہیں تب بھی یہ غیر معمولی بات ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف دلالۃ النص کے طور پر قرآن کریم سے مختلف قسم کے علوم اخذ کر کے بیان فرماتے ہیں بلکہ اشارۃ النص میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں اُن کو بھی بیان فرماتے ہیں اور پھر اُن کی ایسی ایسی باریکیاں بیان فرماتے ہیں جہاں عام انسانی عقول نہیں پہنچ سکتیں۔ یہ ایک ایسی غیر معمولی چیز ہے جو سوائے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل اور اس کی خاص برکت کے انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے صرف علم قرأت پر بحث کی ہے اور وہ بڑے بڑے عالم کہلاتے ہیں بعض صرف قرآن کریم کی لغت پر بحث کرتے ہیں اور وہ بڑے بڑے عالم کہلاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنہوں نے صرف قرآن کریم کی قضاء پر بحث کی ہے اور وہ بڑے بڑے عالم کہلائے ہیں بعض ایسے ہیں جنہوں نے صرف قرآن کی اقتصادیات پر بحث کی ہے اور وہ بڑے بڑے عالم کہلائے ہیں۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ تمام جزئیات لیتے ہیں بلکہ اُن کو پھیلاتے ہیں اور اُن کی ایسی تشریحات اور تفصیلات بیان کرتے ہیں جو پہلے کسی انسان نے بیان نہیں کیں۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف حدیثوں میں اس رنگ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا سینہ چاک کیا گیا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ کو چاک کئے جانے کا واقعہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے رضاعی رشتہ داروں کی طرف سے روایت آتی ہے کہ بچپن میں جب آپ کو حلیمہ دائی پرورش کے لئے لے گئی تو ایک دن جبکہ آپ باہر کھیل رہے تھے آپ کا ایک رضاعی بھائی گھبراہٹ کی حالت میں دوڑا ہوا اپنی والدہ اور والد کے پاس آیا اور اُس نے کہا الحقا اخی محمدًا فما تلحقانہ الا میتًا قلت وما قصتہ قال بینا نحن قیام اذا اتاہ رجل فاختطفہ من وسطنا وعلا بہ ذروۃ الجبل ونحن ننظر الیہ حتی شق صدرہ الی عانتہ ولا ادری ما فعل بہ (سیرۃ حلبیہ جلد اول) ہمارے بھائی پر کسی نے حملہ کر کے اُسے مار دیا ہے۔ حلیمہ دوڑتی ہوئی باہر گئی تو اُس نے دیکھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حلیمہ نے آپ سے دریافت کیا کہ بتاؤ کیا ہوا تھا؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ تین آدمی آئے تھے انہوں نے میرا سینہ چیرا اور میرے دل کو دھو کر اندر رکھ دیا اور پھر چلے گئے۔ روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ کے سینہ پر اس کا ایک نشان بھی تھا بعض دوسری روایتوں میں جو واقعہ معراج کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اُن میں بھی ذکر آتا ہے کہ ایک فرشتہ آیا اُس نے آپ کے سینہ کو چیر کر دل نکالا آلائش صاف کی اور پھر دوبارہ اُسے آپ کے سینہ میں رکھ دیا (روض الانف جلد اول) مسلمان اس کو جسمانی معجزہ کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں جس رنگ میں مسلمان اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں اگر وہ زیادہ غور سے دیکھتے تو یہ آپ کی شان کو بڑھانے والے معجزہ کی بجائے آپ کی تنقیص کرنے والا معجزہ بن جاتا ہے اول تو یہ سوال ہے کہ دل پر کونسی مادی آلائشیں ہوتی ہیں جنہیں صاف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ جنوں اور بھوتوں کے قائل ہیں وہ بھی اتنی معقولیت سے کام لیتے ہیں کہ کہتے ہیں فلاں جن نے فلاں کا دیکھتے ہی کلیجہ کھا لیا۔ وہ جنات کی ماہیت

کے لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ اُنہیں چیرنے پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی یونہی دیکھتے اور دوسرے کا کلیجہ نکال کر چبا جاتے ہیں۔ اگر جنات کے متعلق بعض نہایت ضعیف الخیال لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وُہ سمجھتے ہیں جن پیٹ چیرنے کے محتاج نہیں ہوتے تو فرشتوں کے متعلق کیوں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ چیرنے پھاڑنے کے محتاج ہیں اگر دل بنانے کے لئے فرشتے کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر پھیپھڑا بنانے کے لئے وہ کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر جگر اور معدہ بنانے کے لئے وہ کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر تلی بنانے کے لئے وہ کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر دماغ بنانے کے لئے وہ کسی کا سر پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ تو وہ دل کو صاف کرنے کے لئے کسی کا سینہ چاک کرنے کے کیوں محتاج ہو گئے؟ جس طرح وہ پیٹ چیرے بغیر انسان کے اندر گھس گئے تھے اور انہوں نے دل اور دماغ اور معدہ اور جگر وغیرہ بنا دیا اسی طرح وہ سینہ کو چیرے بغیر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دل بھی صاف کر سکتے تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ آیا فرشتوں کو چھریوں کی ضرورت ہوتی ہے؟ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں، پہاڑوں، دریاؤں اور دوسری سب چیزوں کے بنانے میں خدا تعالےٰ کے ملائکہ بھی ایک علت کے طور پر کام کرتے ہیں مگر جب وہ پہاڑ اور دریا وغیرہ بناتے ہیں تو نہ اُنہیں ہتھوڑوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ آری کی ضرورت ہوتی ہے نہ کُدالوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بغیر ان مادی ہتھیاروں کے یہ تمام کام سرانجام دے دیتے ہیں۔ پھر وجہ کیا ہے کہ اور جگہ تو انہیں کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑتی مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کی صفائی کے لئے جب اُن کو آنا پڑا تو وہ چُھری بھی اپنے ساتھ لے آئے جس سے انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا سینہ چاک کیا۔ پس یہ روایت عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کروڑوں کروڑ کام دنیا میں فرشتے کرتے ہیں مگر کبھی اِس رنگ میں انہوں نے اپنے فرائض کو سرانجام نہیں دیا۔ پس اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عملی طور پر ایسا ہُوا تھا تب بھی اس کے لئے پیٹ کو چاک کرنے کی ضرورت تسلیم نہیں کی جا سکتی اور نہ چُھریوں کی حاجت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ فرشتے اگر کسی کے دل کی صفائی کے لئے پیٹ کو چاک کریں تو وہ وزیرآباد یا بھیرو کی بنی ہوئی چھریوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ درحقیقت اس غلطی کی بنا دیہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ فرشتے ان مادی ہتھیاروں کے محتاج ہوتے ہیں حالانکہ یہ بات ایسی ہے جس کو دوسرے مقامات پر خود مسلمان بھی تسلیم نہیں کرتے۔ حدیثوں میں صاف طور پر ذکر آتا ہے کہ جب جنین رحمِ مادر میں ہوتا ہے تو فرشتہ ماں کے پیٹ میں جاتا اور اُس میں زندگی کی رُوح پھونک دیتا ہے مگر کیا کسی نے دیکھا ہے کہ کبھی عورت کا پیٹ فرشتوں نے چاک کیا ہو؟ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ بے شک سب کام فرشتے کرتے ہیں مگر وہ پیٹ چاک کرنے کے محتاج نہیں ہوتے۔ جب وہ وہاں چھریوں کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے تو اس واقعہ کو کیوں ظاہری شکل دی جاتی ہے اور کیوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا سینہ ظاہری طور پر چاک کئے جانے پر زور دیا جاتا ہے؟ ہم مانتے ہیں کہ فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ انہوں نے آپ کے دل کی صفائی کی مگر ہم ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ انہوں نے اسی طرح آپ کا سینہ چاک کیا اور اسی طرح آپ کا دل نکالکر دھویا جس طرح وہ جگر بناتے ہیں، تلی بناتے ہیں، دل اور پھیپھڑہ بناتے ہیں جس طرح وہاں وہ انسان کا دل اور جگر بناتے ہیں اسی طرح یہاں بھی انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل نکالا۔ اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ بات ایسی ہے جسے ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کا سینہ چاک کئے جانیکا واقعہ ایک کشفی واقعہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک کشف دیکھا تھا اور کشفی نظارہ بعض دفعہ دوسرے لوگ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ساری غلطی مسلمانوں کو اس وجہ سے لگی ہے کہ حلیمہ کے بیٹے نے بھی یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں اگر یہ ظاہری واقعہ نہیں تھا تو حلیمہ کے بیٹے نے کس طرح دیکھ لیا؟ حالانکہ اگر صحابہؓ جبریل کو دیکھ سکتے ہیں تو حلیمہ کا بیٹا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس کشفی واقعہ کو کیوں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کے پاس آیا اور اس نے آپ سے مختلف سوالات کئے جن کے آپ نے جوابات دئے جب وہ چلا گیا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا جانتے ہو یہ کون تھا؟ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ہمیں تو معلوم نہیں خدا اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبریل تھا جو تمہیں علم سکھانے کیلئے آیا۔ اب دیکھو جبریل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا مگر صحابہ نے بھی دیکھ لیا۔ پس کئی ایسے کشفی نظارے ہوتے ہیں جن میں ساتھ کے لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ مادی واقعہ ہوتا ہے پھر معلوم نہیں وہ صرف چھری کو مادی کیوں قرار دیتے ہیں فرشتے کو بھی کیوں مادی نہیں سمجھ لیتے۔ مگر وہ فرشتے کو تو روحانی قرار دیتے ہیں اور چھری کو مادی قرار دیتے ہیں اگر آدھی روحانی چیز تھی تو آدھی مادی کیوں ہو گئی۔

وہ کہتے ہیں اس واقعہ کے مادی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر اس کا نشان تھا۔ ہم کہتے ہیں اگر نشان تھا تب بھی یہ اس واقعہ کے مادی ہونے کا ثبوت نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کو خدا تعالےٰ نے ایک نشان دکھایا جس کے نتیجہ میں آپ کے کپڑوں پر سُرخ روشنائی کے بعض نشانات آگئے مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ ظاہری واقعہ تھا۔ تھا تو یہ کشفی واقعہ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کشف کی صداقت کے لئے ظاہر میں بھی روشنائی پیدا کر دی یہ بتانے کے لئے کہ میں قادر مطلق خدا تمہیں یہ نظارہ دکھا رہا ہوں۔ پس گو یہ واقعہ مادی نہیں تھا مگر اللہ تعالےٰ نے ظاہر میں اُس کا نشان پیدا کر دیا۔ اسی طرح اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر نشان تھا تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ یہ ظاہری واقعہ تھا یا ظاہر میں انسانی قلب پر کوئی مَیل ہوتی ہے جسے دھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غرض یہ غلط ہے کہ یہ ایک ظاہری واقعہ تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گذرا۔ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ ایک کشف تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا۔ ہاں اللہ تعالےٰ نے آپ کی عظمت کے اظہار کے لئے اور آپ کے رضاعی خاندان کے دل میں آپ کی محبت پیدا کرنے کے لئے ایسا تصرف کیا کہ حلیمہ کے بیٹے نے بھی اس واقعہ کو دیکھ لیا اور اس کی گواہی سے سب پر یہ اثر ہوا کہ یہ غیر معمولی واقعہ بتا رہا ہے کہ یہ لڑکا ایک دن بہت بڑی عظمت اور شان حاصل کریگا۔ پھر یہ بتانے کے لئے کہ یہ کشف واقعہ میں ہم نے دکھایا تھا اللہ تعالےٰ نے آپ کے سینہ پر بھی نشان پیدا کر دیا۔ تاکہ سب لوگ اللہ تعالےٰ کے اس نشان کے گواہ رہیں۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کے کپڑوں پر سُرخ روشنائی کے قطرات اللہ تعالےٰ نے اس لئے ڈالے تاکہ اور لوگ بھی اس نشان کے گواہ رہیں۔ گو معتبر روایتوں میں یہ ذکر نہیں آتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر نشان تھا مگر ہمیں اس کو تسلیم کرنے سے انکار کی خاص ضرورت نہیں اگر روشنائی کے نشان اللہ تعالےٰ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کپڑوں پر پیدا کر سکتا ہے تو اس کشف کی تصدیق کے لئے اگر اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر کوئی نشان پیدا کر دیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ پس جس حد تک اس واقعہ کو کشفی ماننے کا تعلق ہے ہمیں اس کی صحت سے ہرگز انکار نہیں۔ لیکن جس حد تک اس واقعہ کو مادی قرار دینے کا سوال ہے ہمارے نزدیک یہ بات عقل کے خلاف ہے ورنہ جیسا کہ احادیث میں آتا ہے ماننا پڑے گا کہ جب کوئی شخص بُرا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان پڑ جاتا ہے اور جب اچھا کام کرتا ہے تو اس کا دل اعلیٰ حالت میں رہتا ہے حالانکہ یہ بات واقعات کے خلاف ہے۔ نعشوں کو چیرنے پھاڑنے اور مختلف امراض کے نتیجہ میں انسانی جسم میں جو تغیرات واقعہ ہوتے ہیں اُن کو دیکھنے بھالنے کا کام اس زمانہ میں بہت ترقی پر ہے لاکھوں نعشیں اب تک چیری جا چکی ہیں اور تشریح الابدان کے ماہرین نے اُن تمام تغیرات کا پوری طرح جائزہ لے لیا ہے جو امراض کے نتیجہ میں انسانی جسم میں واقعہ ہوتے ہیں۔ اگر اس نظریہ کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ بُرے کام کے نتیجہ میں قلب پر مادی شکل میں سیاہی چھا جاتی ہے اور اچھے کام کے نتیجہ میں قلب کو

مادی شکل میں نُور آجاتا ہے تو کئی مسلمانوں کو کافر اور کئی کافروں
کو مسلمان قرار دینا پڑے گا۔ وہ مسلمان جو دم گھٹ کر مر جاتے ہیں
اُن کے دل یقیناً کالے ہوں گے اور وہ ہندو اور سکھ جن کے
تنفس پر بیماری کا اثر نہیں ہوتا اُن کے دل یقیناً اچھی حالت
میں ہوں گے۔ ایسی حالت میں ہمیں روزانہ کافروں کو مسلمان
اور مسلمانوں کو کافر قرار دینا پڑے گا اور یہ حقیقت کے خلاف ہے۔

درحقیقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا
وہ ایک کشف تھا۔ کشفی حالت میں فرشتہ آپ کے پاس آیا اور
اُس نے آپ کا سینہ چاک کر کے دل نکالا اور اُسے دھو دھا کر
پھر اندر رکھ دیا۔ بے شک ظاہر میں اس واقعہ کو تسلیم نہیں
کیا جا سکتا مگر خواب یا کشف کی حالت میں اس قسم کے واقعہ کو
تسلیم کرنا ہرگز بعید از قیاس نہیں۔ خواب میں ایک چھوڑ دس دل
بھی سینوں میں سے نکال کر دھوئے جا سکتے ہیں اور اس میں
کسی تعجب کی بات نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ خواب ہمیشہ تعبیر طلب
ہوتا ہے۔ ہم خواب میں زید کے دس سر دیکھ سکتے ہیں حالانکہ
ظاہری لحاظ سے کسی کے دس سر نہیں ہو سکتے۔ خواب چونکہ
تعبیر طلب ہوتا ہے اس لئے اگر ہم کسی کے دس سر دیکھیں تو اُس
کے حالات کے مطابق اس کی دو تعبیریں ہوں گی۔ یا تو اسکی
یہ تعبیر ہوگی کہ اس کے اندر استقلال نہیں پایا جاتا اور یا پھر
یہ تعبیر ہوگی کہ اس کی عقل وسیع ہے۔ اگر اُس کے حالات اُس
کی اخلاقی جرأت کا ثبوت ہوں تو دس سر دیکھنے کی اچھی تعبیر
ہوگی اور اگر اُس کے حالات اس کے خلاف ہوں تو دس سر
دیکھنے کی بُری تعبیر ہوگی۔ بُری تعبیر تو یہ ہوگی کہ اس کے اندر
استقلال کا مادہ نہیں پایا جاتا۔ ایک سر ایک دفعہ بات کرتا
ہے دُوسرا سر دوسری دفعہ بات کرتا ہے۔ ایک دفعہ وہ ایک
رائے قائم کرتا ہے اور دوسری دفعہ دوسری رائے قائم
کرتا ہے۔ اور اچھی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ بڑا عقلمند ہے لوگ ایک
سر سے کام لیتے ہیں اور وہ دس سروں سے کام لیتا ہے پس
کسی کے دس سر دیکھنا یا تو اُس کے تدبر اور اعلیٰ درجہ کے
دماغ کا ثبوت ہوگا اور یا پھر اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ
دس دفعہ اپنی رائے بدلتا ہے اس کے اندر استقلال کا مادہ
نہیں پس ایک ہی خواب کی اچھی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور بُری
بھی۔ اور یہ تعبیر دیکھنے والے کے حالات پر منحصر ہوتی ہے۔
اسی طرح اگر رؤیا یا کشف کی حالت میں کوئی شخص اپنے دس
دل دیکھے تو یہ بھی ہو سکتا ہے جس طرح وہ دیکھ سکتا ہے کہ اُس
کا دل سینہ میں سے نکالا گیا اور اُسے فرشتے نے دھو کر پھر اُس
کی اصل جگہ پر رکھ دیا۔

غرض عام مسلمانوں کو تمام دھوکا کشف کی حقیقت کو
نہ سمجھنے کی وجہ سے لگا ہے ورنہ کشفی حالت میں دل پر سیاہی
بھی دیکھی جا سکتی ہے اور کشفی حالت میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے
کہ دل میں نُور بھر دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اگر جھوٹی
خواب ہو تو گو انسان بہت کچھ دیکھتا ہے مگر اُسے ملتا کچھ نہیں
لیکن اگر خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی خواب دکھایا جائے تو
فوراً انسان کو اُس کے مطابق اللہ تعالےٰ کی طرف سے انعام
بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً اگر خدا تعالےٰ کسی کو دکھائے کہ اُس کا
سر بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا ہے تو
اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے بہت بڑا علم مل جائے گا اور
اُس کی عقل بہت وسیع ہو جائے گی۔ اب اگر یہ خدائی خواب ہے
تو چند دنوں کے بعد ہی اُسے نظر آنے لگے گا کہ اُس کے علم اور اسکی
ذہانت میں ترقی ہو رہی ہے لیکن اگر نفسانی خواب ہے تو کچھ
بھی نہیں ملے گا۔ بعض لوگوں کے کان میں سوتے ہوئے چیونٹی
گھس جاتی ہے تو وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ توپیں چل رہی ہیں،
لڑائیاں ہو رہی ہیں، ڈھول بج رہے ہیں اور دنیا میں ایک شور
برپا ہے یا بعض دفعہ کان میں میل پھنسی ہوئی ہوتی ہے ایسی
حالت میں جب ہوا کان کی میل سے ٹکراتی ہے تو سویا ہوا انسان
دیکھتا ہے کہ بجلیاں چمک رہی ہیں بادل کڑک رہے ہیں اولے
برس رہے ہیں اور دنیا پر بڑی تباہی آئی ہوئی ہے حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ
میل کا ایک ذرہ اس کے کان میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح
سوتے سوتے کسی کو بھڑ کاٹ جائے اور وہ گہری نیند سو رہا
ہو تو وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ میرا سر بڑا ہو گیا۔ اب اس کی

یہ تعبیر نہیں ہوگی کہ وہ بڑا عقلمند ہو جائے گا بلکہ اس خواب کا صرف اتنا مطلب ہوگا کہ سوتے ہوئے اُسے بھڑ نے کاٹ لیا تھا جس کا اُس کے اندرونی شعور نے اُسے اس رنگ میں نظارہ دکھایا۔

قادیان میں ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اُس نے کہا کہ مرزا صاحب کو بھی بے شک الہام ہوتا ہے کہ تجھے ہم نے بڑا درجہ دیا ہے مگر مجھے بھی خدا تعالیٰ روزانہ کہتا ہے کہ تُو موسیٰ ہے تُو عیسیٰ ہے تُو محمد ہے۔ لوگوں نے اُسے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر کسی نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں اس کا ذکر کر دیا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا اُسے ہمارے پاس لاؤ یا آپ نے فرمایا اُس سے سوال کرو (مجھے اس وقت اچھی طرح یاد نہیں) کہ جب خدا تم سے کہتا ہے کہ تم عیسیٰ ہو تو کیا عیسیٰ کی طرح تمہیں خلق طیر کا نشان بھی ملتا ہے یا تمہارے ہاتھ سے بھی اُسی طرح مُردے زندہ ہوتے ہیں جس طرح عیسیٰ کے ہاتھ سے زندہ ہوتے تھے یا جب خدا تمہیں موسیٰ کہتا ہے تو کیا موسیٰ کی طرح ید بیضا کا نشان بھی تمہیں عطا کرتا ہے یا جب محمد کہتا ہے تو کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مقام جو دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی تمہیں ملتا ہے یا تمہیں وہی فصاحت اور وہی بلاغت عطا کی جاتی ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا ہوئی؟ وہ کہنے لگا ملتا تو کچھ نہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تو پھر وُہ خدا نہیں بلکہ شیطان ہے جو تمہیں روزانہ عیسیٰ اور موسیٰ اور محمد کہتا ہے۔ اگر خدا تمہیں یہ مقام عطا کرتا تو تمہیں اس مقام سے تعلق رکھنے والے انعامات بھی دیتا۔ اسی طرح ایک دُوسرا شخص بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس کا سینہ چیرا گیا اور دل دھوکر دوبارہ اُس کے اصل مقام پر رکھ دیا گیا مگر فرق یہ ہوگا کہ اس کا سینہ پھر بھی تنگ ہی رہے گا مگر جس کا خدا دل دھوکر اس کے سینہ میں رکھ دے گا اس کا سینہ پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ وسیع ہو جائیگا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق آپ کے رضاعی بھائی نے جو شہادت دی اگر وہ بات جھوٹی ہوتی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کا شرح صدر کیوں ہو گیا؟ پھر تو چاہیئے تھا آپ کا شرح صدر نہ ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ادھر آپ کا سینہ چاک کر کے دل دھویا گیا اور ادھر دنیا نے دیکھ لیا کہ ہر علم و فن کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیمات دیں جن کی نظیر اور کسی شخص میں نہیں ملتی۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں قرآنی خیالات لے کر آپ نے ریفلیکٹر کے طور پر دنیا میں نہایت اعلیٰ اور بے عیب تعلیمیں پیش نہ کی ہوں۔ جب ہم ان واقعات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کا سینہ چیرنے والا فرشتہ ہی تھا ورنہ خالی دل دھوکر سینہ کے اندر رکھ دینے میں کیا کمال ہو سکتا تھا۔ بات تو وہی رہی پہلے بھی دل میں خون آتا تھا اور اس کے بعد بھی دل میں خون نے ہی آنا تھا۔ جو چیز اس واقعہ کو عظمت دیتی ہے وہ اس کا جسمانی نہیں بلکہ رُوحانی پہلو ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ۔ کیا بچپن میں ہی ہم نے یہ نظارہ تجھے نہیں دکھا دیا تھا اور ہم نے بچپن میں ہی تجھ سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ہم ایک دن تجھ میں بڑے بڑے کمالات پیدا کر دیں گے؟ یہ تعبیر ہے جو اس کشفی واقعہ کی تھی اور جس نے بعد میں آپ کی صداقت کو آفتاب نیم روز کی طرح ظاہر کر دیا ورنہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ نعوذ باللہ آپ کے دل پر سیاہی تھی جسے فرشتوں نے دھو دیا۔ آپ کا دل پہلے بھی پاک تھا اُس کو دھونے کے معنے یہ تھے کہ ہم نے نئی قابلیتیں اور علوم کی نئی وسعتیں تیرے اندر پیدا کر دی ہیں یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کے دل پر نعوذ باللہ کوئی گند لگا ہُوا تھا جسے اُنہوں نے دھو دیا۔

ایک معنے اس آیت کے یہ بھی ہیں کہ ہم نے تیرے اندر قوتِ برداشت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ شرح صدر کے الفاظ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کسی چیز پر آپکو تنگیٔ نفس پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ جو بات آتی آپ اُسکو برداشت کر لیتے اور کہتے

ہر چہ از دوست مے رسد نیکو است

آپ جانتے تھے کہ میرے ساتھ جو معاملہ ہے وہ خاص قانون

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝

اور (ایسا کرکے) ہم نے تیرے (اس) بوجھ کو تجھ پر سے اُتار دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی ۵۳

کے ماتحت ہے میں خدا تعالیٰ کے کامل تصرف کے ماتحت ہوں میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا خواہ وہ بظاہر بُرا ہو میرے لئے انجام کار اچھا ہوگا۔ اسی وجہ سے آپ مصائب اور مشکلات میں گھبراتے نہیں تھے۔ پس اس آیت کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ تیرے اندر قوت برداشت کمال درجہ کی پیدا ہو چکی ہے چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کئی قسم کے مشکلات آئے، کئی قسم کے مصائب سے آپ کو دوچار ہونا پڑا مگر آپ پر کبھی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی۔ ایسے اطمینان سے آپ نے اُن مشکلات کو برداشت کیا۔ جیسے آپ کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ میرے حق میں ہے خدا میرا دوست ہے دشمن نہیں۔ وہ مجھے کامیاب کرے گا اور میرے دشمنوں کو ناکامی کے گڑھے میں گرائے گا لوگ آپ کو گالیاں دیتے، آپ کو بُرا بھلا کہتے، آپ کے خلاف بڑے بڑے منصوبے کرتے مگر آپ اُن کی ذرا بھی پروا نہ کرتے اور کبھی آپ کی زبان سے اُن کے حق میں کوئی بُرا کلمہ نہیں نکلا۔ لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر راہ چلتے ہوئے کوئی شخص اُن کے سامنے آجائے اور انہیں معمولی سی ٹکر لگ جائے تو وہ غیظ و غضب سے بھر جاتے ہیں اور کہتے ہیں تم دیکھتے نہیں تمہاری آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں! مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہم دیکھتے ہیں۔ مکہ فتح ہو چکا ہے، آپ کے غلبہ اور آپ کی شان اور آپ کی عظمت کا تمام عرب قائل ہو چکا ہے کہ اس حالت میں ایک اعرابی آتا ہے اور سختی سے کہتا ہے۔ سارے لوگ اپنا اپنا حصہ لے گئے ہیں مجھے بھی مال غنیمت میں سے حصہ دو۔ صحابہ نے اُسے پکڑ کر ہٹایا کہ یہ کیا بیہودگی ہے جو تم کر رہے ہو مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمایا کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا مگر میرے پاس جو مال تھا وہ میں دے چکا ہوں اب میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ قوت برداشت جو آپ کے اندر نظر آتی ہے یہ ایک ایسی بے مثال چیز ہے جس کا نمونہ کہیں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ بے شک نصیحت بھی کرتے، لوگوں کو اُن کی بُرائیوں سے منع بھی فرماتے اور ناراضگی کے موقع پر ناراضگی کا بھی اظہار فرماتے مگر طبیعت آپ کے قابو سے کبھی باہر نہیں ہوتی تھی۔ پس اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ کیا ہم نے تیرے سینہ کو وسیع نہیں کر دیا کہ تجھے گالیاں ملتی ہیں مگر تو اُن کی پروا نہیں کرتا۔ دُکھ دئے جاتے ہیں مگر تو اُن کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتا تیرے اندر اس قدر قوت برداشت پیدا کر دی گئی ہے کہ دشمنوں کے لمبے مقابلہ اور اُن کے متواتر مظالم پر بھی تیرے پائے استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔

آنحضرت صلعم کی بے مثال قوت برداشت

۵۳ حل لغات۔ اَلْوِزْرُ: اَلثِّقْلُ یعنی وِزْرٌ کے معنے بوجھ کے ہیں (اقرب)

الوزر

تفسیر۔ کامیابی کے لئے دوسری ضروری چیز انسان کو کام کرنے کے ذرائع کا میسر آجانا ہے۔ دل کا حوصلہ اور قوتِ برداشت کا پایا جانا بھی کامیابی کے حصول کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے مگر وہ پہلی چیز ہے دوسری چیز جس کا انسانی کامیابی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان کو کام کرنے کے ذرائع مہیا ہو جائیں۔ اس معاملہ میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ جس طرح پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ کے مقابل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ اسی طرح وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ میں ماضی کے الفاظ استعمال کرکے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آپ کی ایک فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ (طٰہٰ ع ۲)

اے میرے رب میرے اہل میں سے کوئی میرا بوجھ بٹانے والا پیدا کر دے گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ سے ایک ایسا شخص مانگنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی جو ان کا بوجھ بٹانے والا ہو۔ مگر اللہ تعالےٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ہم نے بغیر تیرے مانگنے کے تجھے ایسے ساتھی عطا کر دیئے ہیں جو تیرے بوجھ کو صرف بٹانے والے نہیں بلکہ سارا بوجھ اپنے آپ پر اٹھانے والے ہیں انہوں نے تیرے اوپر سے وہ سب کا سب بوجھ اُٹھا لیا ہے جس نے تیری کمر کو توڑ دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اتنا بڑا بوجھ تھا جس کو کوئی اکیلا شخص اُٹھانے کے قابل نہیں تھا آپ کے سپرد یہ کام تھا کہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کریں۔ ساری دنیا کو اسلام میں داخل کریں۔ ساری دنیا کی بدیوں اور عیوب کا قلع قمع کریں۔ آپ دیکھتے تھے کہ میں اکیلا ہوں نہ میں ہر شخص کے پاس پہنچ سکتا ہوں اور نہ ہر شخص کو منوانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایک ایک آدمی کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے بظاہر کئی کئی سال چاہیئے تھے کیونکہ ان کے عقائد اور اسلام کی پیش کردہ تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا، وہ کئی کئی بُتوں کو مانتے تھے اور قرآن کہتا تھا کہ بُت اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتے وہ جھوٹ اور فریب اور دغا اور خیانت اور ڈاکہ اور قتل اور اسی قسم کے دوسرے افعال کو جائز سمجھتے تھے اور اسلام ان سب کو ناجائز اور حرام قرار دیتا تھا۔ وہ عبادت سے کوسوں دُور بھاگتے تھے اور اسلام انسان کو ہر وقت الہٰی آستانہ پر جھکے رہنے کی تعلیم دیتا تھا۔ غرض تعلیم میں اختلاف تھا، عبادت میں اختلاف تھا، رسم و رواج میں اختلاف تھا، مطمح نظر میں اختلاف تھا۔ پھر مکہ والے الہام کے قائل نہیں تھے مگر قرآن نزول الہام کا قائل تھا۔ اسی طرح وہ خدا تعالےٰ کی خاص قدرتوں کے قائل نہیں تھے مگر قرآن اس بات کا قائل تھا کہ اللہ تعالےٰ اپنی قدرت کے نشانات سے اپنی ذات کا ثبوت دیا کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات پر سدن رات فخر کیا کرتے تھے کہ ہم آزاد ہیں کسی کے ماتحت نہیں۔ مگر قرآن کی تعلیم یہ تھی کہ سب ایک ہاتھ پر جمع ہو جاؤ اور منظم ہو کر اپنی اور دوسری اقوام کی اصلاح کرو۔ غرض اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا ہر اک امر کو اسلام ایک نظام کے ماتحت لاتا تھا اور اس طرح کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس میں غیر مسلم عربوں اور قرآنی تعلیم کے درمیان اتحاد ہو سکتا۔ قرآن کریم اُن کے خیالات میں بھی دخل دیتا تھا، اُن کے اخلاق میں بھی دخل دیتا تھا، اُن کے عقائد میں بھی دخل دیتا تھا، اُن کی سیاسیات میں بھی دخل دیتا تھا، اُن کی اقتصادیات میں بھی دخل دیتا تھا۔ غرض کوئی معاملہ ایسا نہ تھا جس میں اسلام دخل اندازی نہ کرتا ہو۔ اتنی لمبی اور تفصیلی باتیں منوانے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کتنی بڑی مشکلات پیش آ سکتی تھیں مگر یہ الہٰی فعل ہی تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک فضیلت۔

بیوی کو اطلاع دیتے ہیں کہ مجھ پر یوں وحی ہوئی ہے تو بیوی یہ نہیں کہتی کہ یہ کیا پاکھنڈ بنانے لگے ہو بلکہ وہ کہتی ہے كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ آپ گھبرائیں نہیں آپ نے جو کچھ دیکھا ٹھیک دیکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہ کر سکتا تھا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ نادار کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ گم شدہ نیکیوں کو قائم کرتے ہیں۔ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی مدد کرتے ہیں۔ پھر بیوی آپ کو اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہے جو اسرائیلی علوم کے عالم تھے۔ تو وہ سنتے ہی فرماتے ہیں کہ یہ ویسی ہی وحی ہے جیسے موسیٰ پر نازل ہوئی تھی اور ویسے ہی احکام اور فرامین اس وحی میں پائے جاتے ہیں جیسے موسیٰ کی وحی میں پائے جاتے تھے

گھر میں ایک چچیرا بھائی جو جوانی کی عمر کو پہنچنے والا ہے اور نوجوانوں میں تبلیغ کا اچھا ذریعہ بن سکتا ہے جب وہ اپنے بھائی اور بھاوج کو نہایت سنجیدگی سے ایک اہم تغیر کی نسبت باتیں کرتے ہوئے سُنتا ہے تو بڑی متانت سے آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ آپ سچے ہیں اور ضرور خدا تعالےٰ نے

آپ سے یہ باتیں کی ہیں اور آپ کو دنیا کی اصلاح کے لئے امور کیا ہے۔ ایک آزاد کردہ غلام جو آپ کے اخلاق کا شکار ہو کر ماں باپ کو چھوڑ کر آپ کے دروازہ پر بیٹھ گیا تھا جب ان آہستہ آہستہ ہونے والی باتوں کو سُنتا ہے اور اپنے آقا کے چہرہ پر فکر و اندیشہ کے آثار دیکھتا ہے تو آگے بڑھ کر اپنے آقا کے دامن کو تھام لیتا ہے اور کہتا ہے میرے آقا وہی ہوگا جو آپ نے دیکھا۔ آپ جیسے انسان سے قدرت دھوکا بازی نہیں کر سکتی۔ اب وہ وقت آگیا ہو کہ آپ کے ہاتھوں دنیا کی اصلاح ہو مجھے بھی اپنے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے کی اجازت دیجئے۔ ایک ہی گہرا دوست جو گویا ایک ہی صدف میں پلنے والا دوسرا موتی تھا جب سنتا ہے کہ اس کے دوست نے بے پَر کی اڑانی شروع کر دی ہیں اور شاید اُس کے دماغ میں خلل آگیا ہے تو بھاگا ہُوا جاتا ہے اور دروازہ کھلوا کر پوچھتا ہے کہ کیا جو کچھ سُنتا ہوں سچ ہے؟ جب آپ اس کے سامنے تشریح کرنے لگتے ہیں تو کہتا ہے خدا کی قسم دلیلیں نہ دیجئے صرف یہ بتائیے کیا یہ باتیں سچ ہیں اور آپ کے تصدیق کرنے پر کہتا ہے میرے سچے دوست میں آپ کی رسالت پر ایمان لایا۔ آپ تو غضب ہی کرنے لگے تھے کہ دلیلیں دے کر میرے ایمان کو مشتبہ کرنے لگے تھے۔ میرے دوست جس نے تیرے چہرہ کو دیکھا وہ کب تیری بات میں شبہ کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مخالفت ہونی ہی چاہیئے تھی کیونکہ بقول ورقہ بن نوفل کہ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ یعنی جو شخص بھی ایسا پیغام لایا لوگوں کی مخالفت سے نہیں بچا مگر خدا تعالےٰ کی تدبیر دیکھو کہ اس مخالفت کا طوفان آنے سے پہلے اللہ تعالےٰ نے کس طرح آپ کے ساتھی پیدا کر دئے۔ ساکنین مکہ میں سے ایک ہی اسرائیلیات کا عالم ورقہ پہلے حملہ میں ہی آپ کے آگے گھٹنے ٹیک گیا۔ رفیقۂ حیات خدیجہ رضؓ نے وحی سنتے ہی آپ کی بلائیں لیں۔ نو عمر بھائی علی رضؓ جو ہر وقت آپکے عائلی اخلاق کو دیکھتا تھا اپنی خدمات پیش کرنے لگا۔ وہ آزاد غلام زیدؓ جس نے آپ کے لین دین اور غرباء سے سلوک کا گہرا اور لمبا مطالعہ کیا تھا آپ کی صداقت کی قسمیں کھانے لگا۔ بچپن کا دوست، مکہ کا محسن، شرافت کا پُتلا ابوبکر صرف اتنا سُنکر کہ آپ نے وحی کا دعویٰ کیا ہے اپنے گلے میں غلامی کا پٹکہ ڈالکر دروازہ پر آبیٹھا۔ اس عقیدت و اخلاص کے بے نظیر مظاہرہ نے آپ کے دل میں کس قدر خوشی نہ پیدا کر دی ہوگی۔ مکہ والوں کی ہا و ہو، اُن کے طعنہ سُن کر آپ کس طرح مسکرا دیتے ہونگے اور کہتے ہوں گے یہ تمہارا فتویٰ ہے جو مجھے نہیں جانتے اب ذرا اس فتویٰ کو بھی تو سُنو جو مجھے جاننے والوں نے دیا ہے۔ کس طرح جانیں دے کر وہ میرے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ موسٰیؑ نے دعا مانگ کر ایک وزیر بوجھ اٹھانے کے لئے مانگا تھا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے پانچ وزیر بن مانگے ہی دے دئے۔ اور ایسے وزیر جنہوں نے آپ کا بوجھ بٹانے میں کمال کر دکھایا۔ ورقہ بے شک جلدی فوت ہو گئے مگر ایک نہ مٹنے والی شہادت آپ کی صداقت پر دے گئے۔ حضرت خدیجہؓ نے بارہ سال تک اس کے بعد عورت ہو کر وہ کام کر کے دکھایا کہ بہادر سے بہادر مرد کی بھی آنکھیں نیچی ہوتی ہیں۔ زیدؓ نے بیس سال تک اس کے بعد قربانی کا بے مثال نمونہ دکھایا اور آخر تلواروں کی دھاروں کے سامنے اپنا خون بہا کر ثابت کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر کیسے ہونے چاہئیں۔ ابو بکرؓ اور علیؓ تو آپ کی وفات کے بعد بھی رہے اور خلیفہ بن کر وزارت کا ایک نئے رنگ میں ثبوت دے گئے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ میں شیعہ صاحبان کے خیالات کی تردید

شیعہ اصحاب ذرا اس آیت پر غور کریں تو خلافت کے جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اسی مفہوم کی آیت حضرت موسٰیؑ کے بارہ میں آتی ہے وہ دعا کرتے ہیں وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ اور اس کے معنے اختلافی نہیں مسلمہ ہیں کہ موسٰی علیہ السلام دشمنوں کی مخالفت کے خیال سے فوراً ہی ایک مومن کا مطالبہ کرتے ہیں جو آپ کا بوجھ اُٹھائے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالےٰ خود فرما دیتا ہے کہ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ اس خبر کے مطابق وہ کون لوگ تھے جو آپ پر سنتے ہی ایمان لائے یقیناً یہی پانچ جن کا اوپر ذکر

ہُوا ہے پس یہ پانچوں آپ کے وزیر تھے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تین آپ کی زندگی میں فوت ہو گئے کیونکہ حضرت ہارون بھی تو حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ مگر فوت ہونیوالوں کو نکال بھی دو تو بھی فوراً ایمان لانے والوں میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ دونوں ہی ہیں اور دونوں ہی اس آیت کے ماتحت آپ کا بوجھ بٹانے والے ہیں اِن میں سے کسی ایک کو بُرا کہنا قرآن کریم کی تکذیب اور تضحیک ہے۔

ہم کئی مدعیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اِدھر دعویٰ کرتے ہیں اور اُدھر اُن کے اپنے رشتہ دار اُنہیں پاگل کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیوی کہتی ہے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، بیٹا کہتا ہے تُو پاگل ہو گیا ہے، دوست کہتے ہیں تیری عقل ٹھکانے نہیں رہی وہ تلاش کرتے ہیں کہ کوئی اُن کو ساتھی ملے مگر نہیں ملتا۔ بیشک بعض کو اُن کے رشتہ داروں نے مانا بھی ہے مگر شروع میں اکثر ایسا ہی نظارہ نظر آتا ہے کہ اُن کو ساتھی نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو فاتر العقل۔ مگر یہاں پہلے دن ہی یہ پانچوں شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کا شکار ہو گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دعا کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ۔ تو خدا تعالےٰ نے اُن کی اس دعا کو فوراً قبول نہیں کر لیا بلکہ فرمایا تم سفر کرتے چلے جاؤ جب مصر پہنچو گے تو وہاں تمہیں ہارون مل جائیگا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ دعا کرتے ہیں نہ سفر کرتے ہیں نہ محنت اور مشقت برداشت کرتے ہیں اور پہلے دن ہی آپ کو پانچ وزیر مل جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقی پنج تن ہیں جن سے اسلام کا آغاز ہُوا۔ بے شک جسمانی اولاد کے لحاظ سے پنج تن اَور ہیں مگر روحانی لحاظ سے خدا تعالےٰ نے پہلے ہی دن آپ کو پنج تن دے دئے تھے جن میں سے ہر شخص آپ کا جاں نثار اور فدائی تھا۔ پس فرماتا ہے وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ ہم نے تیرا بوجھ اُتار دیا اور تیری مدد کے لئے وہ لوگ کھڑے کر دئے جنہوں نے تیرے بوجھ کے نیچے اپنے کندھے دے دئے اور کہا یا رسول اللہ ہم اس بوجھ کو اٹھانے کیلئے تیار ہیں۔

پھر قریب زمانہ میں طلحہؓ اور زبیرؓ اور عمرؓ اور حمزہؓ اور عثمان بن مظعونؓ اس قسم کے ساتھی آپ کو مل گئے جن میں سے ہر شخص آپ کا فدائی تھا، ہر شخص آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیرہ سال تک مصائب بھی آئے۔ مشکلات بھی آئیں۔ تکالیف بھی آپکو برداشت کرنی پڑیں۔ مگر آپ کو اطمینان تھا کہ ان کے والوں میں سے عقل والے، سمجھ والے، رُتبہ والے، تقویٰ والے، طاقت والے مجھے مان چکے ہیں اور اب مسلمان ایک طاقت سمجھے جاتے ہیں جب کوئی شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا کہ وہ پاگل ہے تو اس کے دوسرے ساتھی ہی اُسے کہتے کہ اگر وہ پاگل ہے تو فلاں شخص جو بڑا سمجھدار اور عقلمند ہے اُسے کیوں مانتا ہے؟ یہ ایک ایسا جواب تھا جس کے مقابلہ میں کوئی شخص بولنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یوروپین مصنف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنا تمام زورِ بیان صرف کر دیتے ہیں اور بسا اوقات آپ پر گند اُچھالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے مگر جہاں ابوبکرؓ کا نام آتا ہے وہ کہتے ہیں ابوبکر بڑا بے نفس تھا۔ اس پر بعض دوسرے یوروپین مصنف لکھتے ہیں کہ جس شخص کو ابوبکر نے مان لیا تھا وہ جھوٹا کس طرح ہو گیا۔ اگر وہ بے نفس تھا تو اُس نے ایسے لالچی کو مانا کیوں؟ اور اگر وہ واقع میں بے نفس تھا تو پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُس کا آقا بھی بے نفس تھا۔ یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے جس کو رد کرنا آسان نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ آپ کو جاہل کہتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کو رد کرنے کے لئے ایسے سامان کر دئے کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ شروع میں ہی آپ پر ایمان لے آئے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی بھی دعوے سے پہلے آپ کی تعریف کرنے والے تھے پھر جب آپ نے دنیا میں اپنی ماموریت کا اعلان کیا تو تعلیمیافتہ لوگوں کی ایک جماعت اللہ تعالےٰ نے ایسی کھڑی کر دی جو فوراً آپ پر ایمان لے آئی۔ یہ تعلیمیافتہ لوگ علماء میں سے بھی تھے، اُمراء میں سے بھی تھے اور انگریزی دان طبقہ میں سے بھی تھے۔

رعب اور دبدبہ تین ہی چیزوں سے ہوتا ہے۔ یا تو ایمان سے
ہوتا ہے یا علم سے ہوتا ہے اور یا روپیہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے تینوں چیزیں آپ کی جماعت میں پیدا کر دیں ایسے لوگ بھی
آپ کو دے دئے جو اپنے اندر صلاحیت اور نورِ ایمان رکھتے اور
چوٹی کے علماء سمجھے جاتے تھے۔ ایسے لوگ بھی آپ کو دے دئے جو
امراء میں سے تھے اور ایسے لوگ بھی آپ کو دیدئے جو انگریزی دان
تھے اور اس طرح نوجوان اور تعلیمیافتہ طبقہ پر اچھا اثر ڈال سکتے تھے
جب لوگ کہتے کہ مرزا صاحب جاہل ہیں تو اُن کے اپنے آدمی اُن
کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاتے اور کہتے اگر وہ جاہل ہے تو کالج
کے سٹوڈنٹ اس کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہیں۔ پھر جب لوگ
کہتے کہ مرزا صاحب کو دین کی واقفیت نہیں تو اُن کے اپنے
بعض آدمی کہتے کہ اگر انہیں دین کی واقفیت نہیں تو علماء اُن کے
پیچھے کیوں بھاگے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب لوگ کہتے ہیں کہ
مرزا صاحب دنیا پرست ہیں تو اُن کے اپنے بعض آدمی کہتے ہیں
کہ اگر وہ دنیا پرست ہے تو وجہ کیا ہے کہ اُمراء اور دُنیا کی
عیاشیوں میں مبتلا انسان اپنی دولت کو قربان کر کے اُس کی
طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ غرض ہر طبقہ کے لوگ علماء
میں سے بھی، اُمراء میں سے بھی اور انگریزی دانوں میں سے بھی
اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو عطا فرمائے اور
اس لئے عطا فرمائے تا اس اعتراض کا ازالہ ہو کہ آپ جاہل ہیں
یا آپ دنیادار ہیں یا آپ علمِ دین سے واقفیت نہیں رکھتے۔
یہی حال ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دیکھتے ہیں کہ ہر طبقہ
کے لوگ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمادئے۔ عثمانؓ۔ طلحہؓ
اور زبیرؓ مکہ کے چوٹی کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر کوئی
کہتا کہ ادنیٰ یا دنی لوگ اس کے ساتھ ہیں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے
والے کسی شخص نے اسکو قبول نہیں کیا تو عثمانؓ۔ طلحہؓ اور زبیرؓ
اُس کا جواب دینے کے لئے موجود تھے اور اگر کوئی کہتا کہ چند
اُمراء کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ غرباء جن کی دنیا میں کثرت
ہے انہوں نے اس مذہب کو قبول نہیں کیا تو زیدؓ اور بلالؓ وغیرہ
اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے موجود تھے۔ اور اگر بعض
لوگ کہتے کہ یہ نوجوانوں کا کھیل ہے تو لوگ اُن کو یہ جواب دے سکتے
تھے کہ ابوبکرؓ تو نوجوان اور ناتجربہ کار نہیں۔ انہوں نے کس بنا پر
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قبول کر لیا ہے؟ غرض وہ کسی
رنگ میں ودبیل پیدا کرنے کی کوشش کرتے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے ساتھیوں میں سے ہر شخص اُن دلائل کو رد کرنے کے لئے ایک
زندہ ثبوت کے طور پر کھڑا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا
فضل تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے شاملِ حال تھا۔ اسی
کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ
الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ اے محمد رسول اللہ! کیا دنیا
کو نظر نہیں آتا کہ جن سامانوں سے دنیا جیتا کرتی ہے وہ سارے
سامان ہم نے تیرے لئے مہیا کر دئے ہیں۔ اگر دنیا قربانی
کرنے والے نوجوانوں سے جیتا کرتی ہے تو وہ تیرے پاس موجود
ہیں۔ اگر دنیا تجربہ کار بڈھوں کی عقل سے ہارا کرتی ہے تو وہ تیرے
پاس موجود ہیں۔ اگر دنیا مالدار اور بارسوخ خاندانوں کے اثر و رسوخ
کی وجہ سے شکست کھاتی ہے تو وہ تیرے پاس موجود ہیں۔ اور
اگر عوام الناس کی قربانی اور فدائیت کی وجہ سے دنیا جیتا کرتی
ہے تو یہ سارے غلام تیرے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ پھر یہ
کس طرح ہو سکتا ہے کہ تو ہار جائے اور یہ کرنے والے تیرے مقابلہ
میں جیت جائیں پس وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ
اَنْقَضَ ظَهْرَكَ کے معنے یہ ہیں کہ وہ بوجھ جس نے تیری
کمر کو توڑ دیا تھا وہ ہم نے خود اُٹھا لیا۔ تُو نے اس کام کی طرف
نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا کہ میں یہ کام کیونکر کروں گا خدا نے
ایک دن میں ہی تجھے پانچ وزیر دے دئے۔ ابوبکرؓ کا ستون
اُس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ خدیجہؓ
کا ستون اُس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔
علیؓ کا ستون اُس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا
کر دیا۔ زیدؓ کا ستون اُس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کیلئے
کھڑا کر دیا۔ ورقہ بن نوفل کا ستون اُس نے اسلام کی چھت
قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور اس طرح وہ بوجھ جو تجھ
اکیلے پر تھا وہ ان سب لوگوں نے اُٹھا لیا۔

اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے تجھے ایسی تعلیم دی ہے جو آپ ہی آپ دلوں کو موہ لیتی ہے۔ بعض تعلیمیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر اچھی ہوتی ہیں مگر وہ ایسی فلسفیانہ باتوں پر مشتمل ہوتی ہیں کہ اُن کا سمجھنا لوگوں کے لئے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ وہی تعلیم ملک میں فوری طور پر مقبولیت حاصل کر سکتی ہے جو سمجھنے میں آسان ہو اور جس میں ہر فطرت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ پس وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ میں ایک یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ تجھے اپنی تعلیم کا پھیلانا بڑا مشکل نظر آتا تھا مگر ہم نے اُسے اس قدر دلکش اور اس قدر جاذبیت رکھنے والی بنایا ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ تیری طرف کھچے چلے آتے ہیں عرب لوگ عورتوں کو اُن کے حقوق نہیں دیتے تھے مگر قرآن کریم نے اُن کے حقوق کو محفوظ کر دیا۔ عرب لوگ غلاموں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا کرتے تھے مگر اسلام نے اُن کو ایسی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا کہ جس کے بعد دنیا میں کوئی غلامی نہیں رہتی۔ عرب لوگ ورثہ کی تقسیم کے وقت جنبہ داری سے کام لینے کے عادی تھے اور وہ اپنے رعب کی وجہ سے لوگوں کے حقوق کو غصب کر لیا کرتے تھے مگر اسلام نے اس نقص کا بھی ازالہ کر دیا اور تمام ورثاء کے حقوق شریعت میں مقرر کر دئے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جو شخص بھی ایسی اچھی تعلیم کو سُنیگا اُس کا دل پکار اُٹھیگا کہ یہ تعلیم درست ہے۔ پس فرماتا ہے اگر تیری تعلیم فلسفیانہ اور پیچیدہ ہوتی تو لوگوں کا تجھے قبول کرنا مشکل ہوتا۔ مگر ہم نے جو تعلیم تجھے دی ہے وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ جو بھی پاکیزہ فطرت رکھنے والا انسان اس تعلیم کو سُنتا ہے فوراً کہہ اُٹھتا ہے آمنا وصدقنا۔ میں ایمان لایا اور میں اس کی صداقت کو قبول کرتا ہوں۔

مجھے ایک لطیفہ ہمیشہ یاد آیا کرتا ہے۔ لدھیانہ کے ایک دوست میاں نظام الدین صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت تعلق رکھا کرتے تھے اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے بھی وہ دوست تھے۔ جب انہوں نے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کی زبان سے سُنا کہ مرزا صاحب کہتے ہیں حضرت مسیح ناصری فوت ہو چکے ہیں تو انہوں نے خیال کیا کہ مرزا صاحب تو بہت نیک آدمی ہیں معلوم ہوتا ہے لوگ اُن پر غلط الزام لگاتے ہیں یا اُن کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ وہ قرآن کے خلاف ایسا دعوے دنیا کے سامنے کیوں پیش کرتے۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ میں خود قادیان جاؤں گا اور مرزا صاحب کو سمجھاؤں گا کہ وہ اس قسم کا دعویٰ ترک کر دیں اور امید ظاہر کی کہ مرزا صاحب میری بات ضرور مان جائیں گے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف کوئی بات اپنی زبان سے نہیں نکال سکتے۔ اس فیصلہ کے بعد وہ قادیان آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا کہ میں نے سُنا ہے آپ کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہاں یہ درست ہے۔ وہ بولے میں نے تو سمجھا تھا لوگ یونہی غلط باتیں مشہور کر رہے ہیں اور آپ کہتے ہیں یہ درست ہے۔ اچھا بتائیے جب قرآن میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو آپ خلاف قرآن ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہیں؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا میاں نظام الدین صاحب! میں تو قرآن کی ہر بات مانتا ہوں اگر قرآن سے حیات مسیح ثابت ہو جائے تو میں آج ہی اپنی بات چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ کہنے لگے بس یہی میں کہتا تھا کہ مرزا صاحب قرآن کے خلاف نہیں جا سکتے ضرور اُنہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اگر اُن پر یہ حقیقت روشن کر دی جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ اپنی بات کو بالکل چھوڑ دیں گے اچھا اب اس بات پر مضبوط رہیئے اگر میں سَو آیات ایسی لے آیا جن سے حیات مسیح ثابت ہوتی ہو تو کیا آپ اپنا دعویٰ چھوڑ دیں گے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا سَو آیات کا کیا ذکر ہے ہم تو قرآن کا ایک ایک لفظ مانتے ہیں اگر آپ ایک آیت بھی لے آئیں تو میں اپنا دعوےٰ چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگے اچھا اگر سَو آیات نہ ہوئیں اور صرف چالیس پچاس آیتیں ہوئیں تب بھی آپ اپنا دعویٰ چھوڑ دیں گے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا میں تو کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک آیت ہی لے آئیں پچاس آیات کے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے اچھا دس آیات تو میں ضرور لے آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ قادیان سے چلے اور سیدھے لاہور پہنچے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ میں قرآن کے دلکش ہونے کی طرف اشارہ۔

لاہور میں اُن دنوں حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ جموں سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی سے مباحثہ کے لئے شرائط کا تصفیہ کر رہے تھے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو فخر کی بہت عادت تھی انہوں نے اشتہار شائع کیا ہوا تھا کہ مرزا صاحب تو میرے مقابلہ میں نہیں نکلتے اب نور الدین آیا ہوا ہے میں دیکھوں گا کہ وہ میرے پنجہ سے کس طرح نکلتا ہے بہت دنوں تک شرائط کا تصفیہ ہوتا رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضؓ فرماتے تھے کہ ہمارے تمام جھگڑوں کیلئے قرآن حَکَم ہے ہمیں اُس سے فیصلہ کرنا چاہئیے مگر مولوی محمد حسین صاحب کہتے تھے کہ حدیثیں بھی مزید شامل کرنی چاہئیں۔ آخر کئی دن کی بحث کے بعد حضرت خلیفہ اوّل رضؓ نے مان لیا کہ اچھا قرآن کے علاوہ بخاری کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب حضرت خلیفہ اول رضؓ نے یہ آخری جواب دیا تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی چینیاں والی مسجد میں بیٹھے بڑے زور سے لاف زنی کر رہے تھے کہ نور الدین نے یوں کہا اور میں نے اُس کی دلیل کو یوں توڑا۔ اُس نے اس طرح کیا اور میں نے اُسے اس طرح رگیدا۔ اور آخر میں نے منوا لیا کہ قرآن کے علاوہ اس موضوع کے لئے بخاری بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میاں نظام الدین صاحب جا پہنچے اور کہنے لگے چھوڑیں بھی آپ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں مجھے دس آیتیں ایسی لکھ دیجئے جن میں حیاتِ مسیحؑ کا ذکر آتا ہو میں قادیان گیا تھا اور مرزا صاحب سے یہ منوا کر آیا ہوں کہ اگر میں دس آیتیں ایسی لے آیا تو وہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو جائیں گے اس لئے ان جھگڑوں کو رہنے دیجئے اور جلدی سے مجھے دس آیتیں ایسی لکھ دیجئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر قرآن سے حیاتِ مسیح ثابت ہو گئی تو پھر آپ کو شاہی مسجد لاہور میں اپنے عقیدہ سے توبہ کرنی پڑے گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہاں مجھے یہ شرط منظور ہے میاں نظام الدین صاحب اس پر بڑے خوش تھے چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب سے بھی انہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا بحث مباحثہ لئے بیٹھے ہیں مجھے دس آیتیں لکھ دیجئے میں ابھی مرزا صاحب کو لاہور لا کر شاہی مسجد میں اُن سے توبہ کرا ہونگا۔ مولوی محمد حسین صاحب جو اُسی وقت اپنے ساتھیوں میں فخر کر رہے تھے کہ میں نے نور الدین کو یوں پکڑا اور میں نے اُسے یوں رگیدا، انہوں نے جب یہ بات سُنی تو اُن کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انہوں نے کہا احمق! تجھے کس نے کہا تھا کہ بیچ میں دخل دیتا۔ میں دو مہینے بحث کر کر کے اس مضمون کو حدیث کی طرف لایا تھا تو پھر قرآن کی طرف لے گیا۔ وہ آدمی تھے نیک۔ جونہی یہ الفاظ اُن کے کان میں پڑے اُن پر سناٹا سا چھا گیا تھوڑی دیر وہ خاموش رہے جیسے انسان کسی نئے صدمہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور پھر ایک آہ کھینچ کر کہنے لگے مولوی صاحب اگر یہی بات ہے تو پھر جدھر قرآن ہے اُدھر ہی ہم ہیں یہ کہہ کر وہ وہاں سے واپس آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت میں شامل ہو گئے۔ تو دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بات چونکہ فطرت کے مطابق تھی میاں نظام الدین صاحب اس کا مقابلہ نہ کر سکے یہی قرآنی تعلیم کا حال ہے کہ اُس نے بنی نوع انسان کو جو بھی حکم دیا ہے اُس میں ہر قسم کی فطرت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کہے کہ قرآن کا فلاں حکم ناقابلِ عمل ہے یا فطرتِ انسانی کے خلاف اُس میں تعلیم دی گئی ہے ہر حکم اپنی ذات میں کامل ہے اور ہر حکم ایسا ہے جس پر آسانی کے ساتھ عمل کیا جا سکتا ہے لیکن باقی مذاہب میں یہ خوبی نہیں پائی جاتی یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف اوقات میں اپنے لئے حکومتوں سے کئی قسم کے قوانین نافذ کرانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اُن خامیوں کا ازالہ ہو سکے جو اُن کے مذہب میں پائی جاتی ہیں۔ ہندو بھی آج کل اسی رَو میں بہہ رہے ہیں اور وہ اپنے لئے ایسا لاء تیار کرنا چاہتے ہیں جو موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق ہو لیکن دراصل وہ جو کچھ کر رہے ہیں قرآن کی نقل ہے اور اگر کسی جگہ وہ اس تعلیم سے انحراف کریں گے تو لازماً ٹھوکر کھائیں گے اور اس کے غلط نتائج انہیں جلد ہی نظر آنے لگ جائیں گے۔ غرض فرماتا ہے وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ اے محمد رسول اللہ کیا ہم نے تجھے

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

اور تیرے ذکر کو ہم نے بلند کر دیا ۵۴

یہ سامان نہیں بخشا کہ ایک طرف تجھے ہم نے ایسے ساتھی دے جنہوں نے تیرا بوجھ اُٹھالیا اور دوسری طرف ہم نے تجھے ایسی تعلیم دی جو خود بخود فطرت کے اندر نفوذ کرتی چلی جاتی ہے کوئی روک اس کی اشاعت میں حائل نہیں ہوتی۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کفار مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کرلیا کہ میں بھی مکہ کو چھوڑ کر کہیں باہر چلا جاؤں۔ ایک دن آپ اسی ارادہ سے باہر جا رہے تھے کہ راستہ میں آپ کو مکہ کا ایک رئیس ملا اور اُس نے دریافت کیا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میں یہاں سے ہجرت کر کے کہیں باہر جا رہا ہوں۔ اُس نے کہا ہجرت ؟ وہ شہر نہ اُجڑ جائے جس میں سے تم سا انسان نکل جائے۔ میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں آئندہ تمہیں کوئی شخص دُکھ نہ دے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس آ گئے اور اُس رئیس نے اعلان کر دیا کہ ابوبکرؓ میری پناہ میں ہیں۔ مکہ والے پناہ کا بڑا لحاظ کیا کرتے تھے چنانچہ اس اعلان کے بعد ایسا ہی ہُوا کہ مکہ والوں نے حضرت ابوبکر کو دکھ دینا ترک کر دیا اور آپ آزادانہ رنگ میں مکہ کے گلی کوچوں میں پھرتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طبیعت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت سے ملتی تھی اور سوز اور گداز کا مادہ آپ میں بہت زیادہ تھا جب صبح کے وقت آپ اُٹھتے تو قرآن کریم کی تلاوت نہایت سوز اور رقت کے ساتھ کرتے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے۔ مکہ کی عورتیں اور بچے جب اس نظارہ کو دیکھتے وہ اکٹھے ہو جاتے اور نہایت توجہ کے ساتھ کان لگا کر سنتے کہ ابوبکر کیا پڑھ رہے ہیں۔ جب ایک طرف وہ ابوبکرؓ کی رقت اور گریہ و زاری کو دیکھتے اور دوسری طرف قرآن کریم کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم اُن کے کانوں میں پڑتی تو وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگ جاتے کہ واہ وا یہ کیسی اچھی باتیں ہیں۔ یہ اثر روز بروز بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مکہ والوں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر ابوبکر اسی طرح قرآن پڑھتے رہے تو ہماری عورتیں اور بچے سب مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اکٹھے ہو کر اُس رئیس کے پاس گئے جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی پناہ میں لیا تھا اور کہا کہ اپنی پناہ واپس لے لو ورنہ ہمارا دین بگڑ جائیگا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح قرآن کریم لوگوں کے دلوں میں دھنستا جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے وُہ نکلے تو اس ارادہ سے تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں مگر جب اُنہیں اپنی بہن سے قرآن سننے کا موقع ملا اور چند آیتیں ہی کان میں پڑیں تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے اور اسی حالت میں کہ تلوار اُن کے ہاتھ میں تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمر کس ارادہ سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں تو غلام بننے کے لئے حاضر ہُوا ہوں۔ قرآن کریم کی اسی معجزانہ تعلیم کی طرف اللہ تعالےٰ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے جس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل پر سے اس بوجھ کو کہ میں لوگوں کو منواؤں گا کس طرح بالکل ہلکا کر دیا تھا۔

رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ میں آنحضرت صلعم کے غلبہ کے آثار کی طرف اشارہ

۵۴ تفسیر ۔ تیسری چیز جو ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف منعطف ہو جائے۔ دراصل دشمن کی توجہ کو کھینچنا سب سے اہم بات ہوتی ہے اور صرف وہی چیز لوگوں کی دشمنی کو کھینچتی ہے جو اپنے اندر غلبہ کے آثار رکھتی ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ مخالفت بُری چیز ہے حالانکہ یہ سب سے اچھی چیز ہے۔ طبائع میں جوش اُسی چیز کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس کا مقابلہ نہ کیا تو ہمیں نقصان پہنچے گی اور ہمارے عقائد اور خیالات کا باطل ہونا ثابت کر دے گی۔ جب تک یہ احساس لوگوں کے اندر پیدا نہ ہو اُس وقت تک اُن کی طرف سے کبھی شدید مخالفت

نہیں ہوتی۔ جب انبیاء علیہم السلام دعویٰ کرتے ہیں تو سارے ملک میں اُن کے خلاف جوش پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں یہ تعلیم جو اُن کی طرف سے پیش کی جارہی ہے ایسی ہے کہ ایک دن ضرور غالب آجائے گی۔ یہی حال سچے دنیوی علوم کا ہوتا ہے کہ جب کوئی نئی تحقیق لوگوں کے سامنے پیش کی جائے تو لوگ اُس کی ضرور مخالفت کرتے ہیں کیونکہ اُن کے دلوں میں یہ ڈر پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ہم نے مخالفت نہ کی تو ہمارا نظریہ اس کے مقابلہ میں باطل ہو جائے گا۔ گلیلیو نے جب پُرانے علم ہیئت کے خلاف دنیا میں یہ اعلان کیا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے تو پادریوں نے اُس کے خلاف فتوے دیدئے یہانتک کہ پوپ نے بھی کہا کہ یہ شخص جان سے مار دینے کے قابل ہے۔ کیونکہ بائبل کی تعلیم کے صریح خلاف ایک نیا نظریہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ آخر اُسے اتنا دُکھ دیا گیا کہ گلیلیو کو اعلان کرنا پڑا کہ معلوم ہوتا ہے میرے اُوپر شیطان سوار تھا جس نے مجھے اس غلط راہ پر ڈال دیا۔ بائبل میں تو لکھا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے مگر مجھ بیوقوف کو یہ دکھائی دیا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے میں اعلان کرتا ہوں کہ نظر تو مجھے اسی طرح آتا ہے کہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے مگر چونکہ بائبل کہتی ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اور شیطان میرے سر پر سوار ہے۔ پادری اس اعلان پر خوش ہو گئے اور انہوں نے سمجھا کہ گلیلیو نے توبہ کرلی ہے حالانکہ یہ اعلان خود بتا رہا تھا کہ اُس نے توبہ نہیں کی۔ محض پادریوں کو خوش کرنے کے لئے اُس نے ایسے الفاظ میں اعلان کر دیا جس پر وہ دھوکا کھا گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ گلیلیو نے اپنے نظریہ کو ترک کر دیا ہے۔ غرض مادی دنیا ہو یا روحانی اُس میں جب بھی کوئی ایسی بات نکلتی ہے جس کے خلاف لوگوں کے عقائد ہوتے ہیں تو لوگ اُس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ بات دنیا میں پھیل گئی تو ہم جس تعلیم کو پیش کرتے ہیں وہ دنیا میں کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعد میں صداقت کو بہرحال تسلیم کر لیا جاتا ہے مگر ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ مخالفت کرتے ہیں اور ہر قسم کی تدابیر سے سچائی کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے اسی مخالفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا ہے یہاں ذکر کا بلند ہونا ماننے کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تیرا ذکر ہو رہا ہے چاہے اچھے رنگ میں ہو یا بُرے رنگ میں۔ تعریف کے رنگ میں ہو یا مذمت کے رنگ میں۔ بہرحال ہر مجلس اور ہر محفل اور ہر گھر اور ہر خاندان میں تیرا نام بلند ہو رہا ہے اور ایک شور ہے جو تیری وجہ سے برپا ہے۔ کوئی کہتا محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ کیا بات کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور بُت کوئی چیز نہیں ہم تو باپ دادا سے ان بُتوں کو مانتے چلے آئے ہیں اُس کے کہنے کی وجہ سے بتوں کی پرستش کو کس طرح ترک کر دیں۔ کوئی کہتا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا تم بے شک اپنے بتوں کو جوتیاں مار کر دیکھ لو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر کوئی اور بول اُٹھتا اور کہتا یہ فتنہ بڑھتا جا رہا ہے آؤ ہم لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیں کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پاگل ہو گیا ہے۔ اس پر ایک چوتھا شخص کہہ اُٹھتا کچھ ہوش کی دوا کرو کیا وہ پاگل ہے؟ اگر پاگل ہوتا تو ایسے ایسے سمجھدار اشخاص اس کی طرف کیوں کھچے چلے جاتے۔ اس پر ایک پانچواں شخص کہتا پاگل تو نہیں مگر شاعر ضرور ہے مگر پھر انہی میں سے کوئی بول اُٹھتا اس کی کتاب تو دیکھو کیا وہ شعروں میں ہے اگر نہیں تو تم اُسے شاعر کس طرح کہہ سکتے ہو کوئی اور کہتا اصل میں وہ نہ پاگل ہے نہ شاعر بلکہ درحقیقت کاہن ہے اور کاہنوں کی طرح غیب کی بعض خبریں دے دیتا ہے۔ اس پر پھر بعض لوگ انہی میں سے کھڑے ہو جاتے اور کہتے وہ کاہن کس طرح ہے وہ تو کاہنوں کو جھوٹا کہتا ہے۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا ایک سلسلہ تھا جو ہر مجلس اور ہر خاندان میں جاری تھا۔ جہاں بھی دیکھو یہی ذکر ہوتا تھا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بہت بڑا فتنہ پیدا کر دیا ہے

اس فتنہ کے سدباب کے لئے اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ مخالفت کا یہ جوش و خروش اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تذلیل کی یہ کوششیں ثبوت تھیں اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم میں ایسی کشش رکھی تھی کہ دنیا سمجھتی تھی اس کا ہمارے ساتھ ٹکراؤ ہماری تباہی اور بربادی کا موجب بننے والا ہے۔ یہی تیسری چیز ہے جو کامیابی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ لوگ شور مچاتے ہیں، مخالفت کے لئے پورے جوش سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کی تدابیر سے اُس کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ ایسا کرتے ہیں سعادت مند طبائع تحقیق کی طرف مائل ہو جاتی ہیں اور آخر اس مخالفت کے نتیجہ میں وہ ایمان لے آتی ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک دوست جو بہت بڑے شاعر تھے۔ نعت کی انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کی دو تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں ریاست رام پور انکو اس کام کے لئے وظیفہ دیا کرتی تھی قادیان آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملے آپنے اُن سے پوچھا آپکو ہمارے سلسلہ کیطرف کیسے توجہ پیدا ہوئی؟ انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے ذریعہ سے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کس طرح؟ انہوں نے عرض کیا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا رسالہ "اشاعۃ السنۃ" ہمارے ہاں آیا کرتا تھا میں یہ تو جانتا ہی تھا کہ مولوی محمد حسین صاحب بہت بڑی شہرت رکھنے والے اور سارے ہندوستان میں مشہور ہیں مگر ان کے رسالہ کو دیکھ کر بار بار میرے دل میں خیال آتا کہ اگر ان کے دل میں اسلام کا واقعی درد تھا تو انہیں چاہیئے تھا کہ مدرسے جاری کرتے، قرآن اور حدیث کے درس کا انتظام کرتے، لوگوں کو اسلامی احکام پر عمل کرنے کی طرف توجہ دلاتے۔ مگر انہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ سارے کام چھوڑ کر بس ایک بات کی طرف ہی متوجہ ہو گئے ہیں اور دن رات احمدیت کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ چنانچہ مجھے اُن کی مخالفت سے تحقیق کا خیال پیدا ہوا اور میں نے کسی شخص سے اپنے اس شوق کا اظہار کیا اُس نے مجھے "دُرِّ ثمین" پڑھنے کے لئے دی۔ میں نے اُس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں جب آپ کا کلام دیکھا تو میں نے کہا لو پہلا جھوٹ تو یہیں نکل آیا کہ کہا جاتا تھا مرزا صاحب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک کرتے ہیں حالانکہ جو عشق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا آپ کے دل میں پایا جاتا ہے اُس کی موجودہ زمانہ میں نظیر ہی نہیں ملتی۔ اس کے بعد میں نے مزید تحقیق کی اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ احمدیت سچی ہے۔ اسی طرح ہر سال مجھے دس بیس خطوط ضرور ایسے آجاتے ہیں جن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ جب ہم نے احمدیت کی مخالفت میں کتابیں پڑھیں تو ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم جماعت احمدیہ کی کتابیں بھی پڑھ کر دیکھیں۔ چنانچہ ہم نے آپ کی کتب کا مطالعہ کیا اور ہمیں معلوم ہوا کہ سچے عقائد وہی ہیں جو آپ کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی طرف سے مخالفت میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے اس لئے ہم آپ کی بیعت میں شامل ہوتے ہیں

مخالفت ہدایت کا موجب۔

اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہمارا تجھ پر کتنا بڑا احسان ہے کہ آج ہر مجلس میں تیرا ذکر ہو رہا ہے۔ سیاست دان کہتے ہیں اب کیا ہو گا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ عالم کہتے ہیں اب کیا ہو گا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ تاجر کہتے ہیں اب کیا ہو گا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ کاہن کہتے ہیں اب کیا ہو گا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ غرض ہر سننے والا کہتا ہے کہ اب کچھ ہونیوالا ہے۔ اب دنیا میں کوئی نہ کوئی انقلاب پیدا ہونے والا ہے پس وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہم نے تیرے ذکر کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ ہر مجلس اور ہر نادیہ میں تیرا ذکر ہونے لگا ہے لوگوں کی طبائع میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تیری طرف توجہ کریں۔ اس کا نتیجہ تیرے حق میں لازماً اچھا ہو گا۔ کیونکہ لوگ جب غور کریں گے

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

پس (یاد رکھو کہ) اس تنگی کے ساتھ ایک بڑی کامیابی (مقدر) ہے (ہاں) یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک اور (بھی) بڑی کامیابی (مقدر) ہے ۵

تو اُن پر تیری صداقت واضح ہو جائے گی۔ اس کی ایک موٹی مثال دیکھ لو۔ ورقہ بن نوفل رسول کریم صلے علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مکہ میں مسیحیت کا پرچار کرتے رہتے تھے مگر مکہ والوں میں کوئی شور نہ تھا۔ وہ ان کی باتوں کو سنتے اور ہنس کر چلے جاتے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی آواز بلند کی عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مخالفت کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر شخص آپ کو کچلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح زید بن عمرو جو حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے وہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوئی نبوت سے قبل توحید کی تبلیغ کیا کرتے تھے مگر کبھی اُن کی مخالفت نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو کھانے کی دعوت دی انہوں نے کہا میں مشرکوں کا کھانا نہیں کھاتا۔ آپ نے فرمایا میں نے تو کبھی شرک نہیں کیا۔ اس زید جیسے کٹر موحد کی لوگوں نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب بُتوں کے خلاف آواز بلند کی تو سارا عرب آپ کا مخالف ہو گیا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ زید کی زبان سے تو ہمارے بُت نہیں ٹوٹے تھے مگر یہ وہ زبان ہے جو ہمارے بُتوں کو توڑ کر رکھ دے گی۔

پس وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہم نے تمام لوگوں کی توجہ تیری طرف پھیر دی ہے ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ دنیا میں کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس آیت کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ ہم نے تیری قبولیت دنیا میں پھیلا دی ہے۔ درحقیقت کامیابی کے ساتھ اس امر کا بھی تعلق ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے دنیا میں قبولیت کے آثار پیدا کر دئے جائیں۔ حدیثوں میں آتا ہے جب خدا تعالےٰ اپنے کسی بندے کو اپنی محبت کے لئے منتخب فرماتا ہے تو اپنے فرشتوں[1] سے کہتا ہے میں نے فلاں شخص کو چُن لیا ہے تم بھی اُس سے محبت

(حاشیہ: ۱ و ۲ — رفعنا لک ذکرک میں آنحضرت صلعم کی شہرت کے پھیل جانے کی پیشگوئی۔)

کرو اور لوگوں کے دلوں میں اس کی قبولیت پیدا کرو۔ چنانچہ آہستہ آہستہ تمام دنیا میں اُس کی قبولیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ معنے بھی اس آیت کے ہیں فرماتا ہے کہ گو یہ لوگ تیری مخالفت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی تیری بڑائی اور عظمت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جب وفات ہوئی تو کئی غیر احمدیوں اور ہندوؤں نے مضامین لکھے جن میں انہوں نے آپکی بڑائی اور عظمت کا ذکر کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ ظاہر میں آپ کی مخالفت کرتے تھے مگر اُن کے دل آپ کی عظمت کے قائل تھے۔ یہ قبولیت اور عظمت کسی مفتری انسان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس فرماتا ہے دنیا میں مخالفتیں کرنے والے مخالفتیں کرتے ہیں مگر اُن کی مخالفت کا پہلو یکطرفہ ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی مخالفت کے ساتھ اُسکی عظمت کے بھی قائل ہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ یہ لوگ تیرے دشمن بھی ہیں اور تیری طاقت اور عظمت کے بھی قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ تُو بڑا جھوٹا ہے مگر ساتھ ہی کہتے ہیں تو بڑا امین ہے سُننے والا سُنتا ہی تو حیران ہوتا ہے کہ یہ کیا متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے وہ شاعر تو ہے مگر شعر نہیں کہتا یا کاہن تو ہے مگر کاہنوں کا دشمن ہے گویا جہاں وہ الزام لگاتے ہیں وہاں ساتھ ہی ایک رنگ میں عظمت اور نیکی کا بھی اقرار کر جاتے ہیں۔ اِسکے علاوہ اِس آیت کا اشارہ اِسطرف بھی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پھیلنا شروع ہو جائیگا۔ چنانچہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد آپکا ذکر سارے عرب میں پھیل گیا تھا اور لوگ ایمان بھی لانے لگے تھے۔ چنانچہ ابو ذر غفاریؓ غفار میں، بعض لوگ یمن میں، بعض مدینہ میں، مکی زندگی میں ہی ایمان لے آئے اور اسطرح آپکا سلسلہ مختلف ممالک میں پھیل گیا۔

۵ تفسیر - عربی قواعد کے رُو سے تنوین ہمیشہ بڑائی اور عظمت کے اظہار کے لئے آتی ہے پس اس آیت کے معنے

یہ ہیں کہ یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک بہت بڑی آسانی ہے ہاں ہاں یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک بہت بڑی آسانی ہے گویا اصل مقصد تنگی کا ذکر کرنا نہیں بلکہ اصل مقصد یُسر کی بڑائی اور اُس کی اہمیت پر زور دینا ہے لیکن بعض نحوی کہتے ہیں کہ آیت میں یُسْرًا کا نکرہ کے طور پر استعمال اور پھر اس کا تکرار بتلاتا ہے کہ یہاں ایک نہیں بلکہ دو یُسر مراد ہیں بے شک عُسر ایک ہی ہے مگر یُسر دو ہیں۔ اُن کے نزدیک اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک بہت بڑی آسانی ہے یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک اور بھی بہت بڑی آسانی ہے گویا نکرہ کا تکرار اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یُسر دو ہیں اور یُسر کی تنوین بتاتی ہے کہ ہر یُسر بہت بڑی شان کا ہے۔ ان دوسرے معنوں کی احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ہنستے ہوئے اپنے گھر سے باہر تشریف لائے اور فرمایا میں نے دیکھا ہے کہ عُسر یُسر کے پیچھے دوڑا چلا جا رہا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا ایک عُسر دو یُسر پر غالب نہیں آ سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشفاً بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کا یہی مفہوم سمجھایا گیا ہے کہ یُسر دو ہیں اور عُسر ایک ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو یُسر کون سے ہیں جن کا اس آیت میں ذکر آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو پورے طور پر اُسی وقت سکون حاصل ہوتا ہے جب ذہنی اور خارجی طور پر دونوں لحاظ سے اُسے اطمینان کے سامان میسر ہوں اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کی باتوں کی لوگ تردید کرتے ہوں تو گو وہ اُسے مار پیٹ نہیں رہے ہوتے اور خارجی طور پر اُسے کوئی دُکھ نہیں ہوتا مگر ذہنی طور پر اس کے اندر ایک خلش اور بے چینی پائی جاتی ہے اور وہ اطمینان جس کا انسان متلاشی ہوتا ہے اُسے پورے طور پر میسر نہیں ہوتا۔ ہم ایسے شخص کو دیکھکر یہی کہیں گے کہ گو اسے خارجی طور پر یُسر میسر ہے مگر ذہنی طور پر عُسر میں مبتلا ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ یوں تو تردید نہیں کرتے لیکن موقعہ ملے تو مار پیٹ لیتے ہیں قصہ مشہور ہے کہ ایک جاٹ کے کھیت کے پاس ایک دفعہ کسی شخص نے آکر ڈیرہ لگا دیا اور اُس نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ میں خدا ہوں۔ کئی مُشٹنڈے اُس نے اکٹھے کر لئے جو ارد گرد کے گاؤں سے بھیک مانگ لاتے اور جو شخص وہاں آتا اُسے کہتے کہ یہی خدا ہیں ان کو سجدہ کرو۔ وہ زمیندار روزانہ یہ نظارہ دیکھتا مگر کچھ کر نہ سکتا کیونکہ وہ اکیلا تھا اور اُس شخص کے ارد گرد ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک دن اتفاقاً سب لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے اور وہ جو اپنے آپ کو خدا کہتا تھا اکیلا رہ گیا۔ زمیندار نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا وہ ہل چھوڑ کر فوراً اُس کے پاس گیا اور دو زانو بیٹھ کر کہنے لگا۔ میں حضور سے یہ دریافت کرنے آیا ہوں کہ کیا حضور ہی خدا ہیں؟ اُس نے کہا ہاں میں ہی خدا ہوں۔ یہ سنتے ہی اُس نے کود کر اُس کی گردن پکڑ لی اور زور سے اُسے ایک گھونسہ مار کر کہا اچھا میرے باپ کی تُو نے ہی جان نکالی تھی۔ پھر ایک اور گھونسہ مار کر کہا اچھا میری ماں کی بھی تُو نے ہی جان نکالی تھی۔ پھر ایک اور گھونسہ مار کر کہا اچھا تُو نے ہی میری بہن کی جان نکالی تھی۔ اس طرح ایک ایک کر کے وہ اپنے مُردہ رشتہ داروں کا نام لیتا گیا اور گھونسے پر گھونسہ مارتا چلا گیا۔ ابھی پانچ دس گھونسے ہی لگے تھے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا مجھے معاف کرو میں خدا نہیں ہوں۔ تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ دلیلیں نہیں دیتے ڈنڈے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کو خارجی لحاظ سے عُسر ہوتا ہے مگر ذہنی لحاظ سے عُسر نہیں ہوتا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو خارجی لحاظ سے تو اطمینان حاصل ہوتا ہے مگر اُس کے ذہن میں سکون نہیں ہوتا۔ وہ ایک تعلیم کو مان رہا ہوتا ہے مگر بار بار اُس کے دل میں یہ خیال بھی اُٹھتا ہے کہ نہ معلوم یہ تعلیم سچی بھی ہے یا نہیں۔ کامل اطمینان اور کامل سکون وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جسے خارجی لحاظ سے بھی اطمینان ہو اور ذہنی لحاظ سے بھی اطمینان ہو۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اے ہمارے رسول! بیشک آج دنیا

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝

پس جب (بھی) تو فارغ ہو تو (دوسرے مقصد کے حصول کے لئے) پھر کوشش میں لگ جا ۝

تیرے ساتھیوں کو سخت سے سخت تکالیف پہنچ رہی ہے مگر ہم عنقریب اُن کو دونوں قسم کے اطمینان دینے والے ہیں۔ پہلا اطمینان جو اُن کو میسر آئے گا وہ ذہنی ہوگا یعنی تیری جماعت کا ہر فرد ذہنی لحاظ سے اس بات پر مطمئن ہوگا کہ اُس نے سچائی کو قبول کیا ہے، راستی کو اختیار کیا ہے، نجات کے طریق کو پسند کیا ہے۔ یہ خلش اور یہ دُبدہ اُس کے اندر نہیں ہوگا کہ یہ معلوم جس راہ پر میں چل رہا ہوں وہ خدا تک انسان کو پہنچاتا ہے یا نہیں پہنچاتا۔ اس کے بعد خارجی لحاظ سے بھی ہم اُن کے اطمینان کے سامان پیدا کر دیں گے یعنی دشمن کی تکالیف کا سلسلہ جاتا رہے گا۔ اُن کو کامیابی حاصل ہو جائے گی اور وہ تنگی جو آج محسوس کی جا رہی ہے بالکل دُور ہو جائے گی گویا وہ دو یُسر جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وُہ ذہنی اور خارجی اطمینان کے سامان ہیں۔ یعنی ہم قوم کو با ایمان بنانے کے لئے اُس کے تمام شکوک و شبہات کو مٹا کر اُسے یقین کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑا کر دیں گے اور خارجی لحاظ سے اُن تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو دُور کر دیں گے جو دشمن کی طرف سے اُنہیں پیش آ رہی ہیں اور وہ غالب اور بادشاہ ہو جائیں گے جس کی وجہ سے کوئی اُنہیں جسمانی عذاب نہ دے سکیگا

آنحضرت صلعم کے صحابہؓ کو ہر طرح اطمینان حاصل ہو جانے کی پیشگوئی

آنحضرت صلعم کی دو دفعہ بعثت کی پیشگوئی

دوسرے معنے دنیوی اور اُخروی انعامات کے ہیں یعنی تمہیں دنیا کے بھی انعامات ملیں گے اور آخرت کے انعامات بھی تمہیں عطا کئے جائیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ اُخروی انعامات کے ملنے کا کیا ثبوت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رؤیاء و کشوف اور الہامات جن سے اللہ تعالےٰ کے مومن بندے اس دنیا میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیتے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہوتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُخروی نعماء کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بالکل درست ہے۔

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا میں امت محمدیہ کو دینی و دنیوی انعام ملنے کی پیشگوئی۔

اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ جب کبھی اسلام پر تنگی اور مصیبت کا زمانہ آئے گا اللہ تعالےٰ اُس کے بعد ترقی کا ایک نیا دَور پیدا کر دیا کرے گا۔ گویا اسلام کے ایک دفعہ قائم ہو جانے اور اُس کے ہلاکت سے بچ جانے کے بعد ہر موقع پر اس کی ترقی کے نئے سے نئے سامان پیدا ہوتے رہیں گے ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ اسلام ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو جائے اور کفر کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ گویا حفاظتِ اسلام کا وعدہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے کہ خدا تعالےٰ کی تائید ہمیشہ اس مذہب کے ساتھ ہوگی اور وہ ہمیشہ تنزل کے بعد اس کی ترقی کے سامان پیدا کرتا رہے گا۔ دو کے لفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں بعثتِ محمدی اور بعثتِ احمدی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں کفر نے خاص جوش مارا ہے مگر ہم اس کفر کو توڑنے کے لئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دو معنٰی بعثتیں کریں گے تا اس کا زور بالکل ٹوٹ جائے۔

۝۶ حل لغات۔ فَرَغْتَ: فَرَغَ سے واحد مخاطب مذکر کا صیغہ ہے اور فَرَغَ کے کئی معنے ہوتے ہیں۔ جب فَرَغَ مِنَ الْعَمَلِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں خَلَا ذَرْعُہٗ۔ وہ کسی کام سے فارغ ہو گیا۔ اور جب فَرَغَ لَہٗ وَ اِلَیْہِ کہیں تو معنے ہوتے ہیں قَصَدَ۔ اُس نے کسی چیز کا ارادہ کیا۔ نیز کہتے ہیں فَرَغَ فُلَانٌ فُرُوْغًا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ مَاتَ فلاں شخص مر گیا۔ اور جب برتن کے لئے فَرَغَ کا لفظ بولیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں خَلَا۔ خالی ہو گیا۔ نیز فَرَغَ کے معنے کسی کام کو پورا کر دینے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں فَرَغَ فُلَانٌ مِنَ الشَّیْءِ: اَتَمَّہٗ کہ فلاں نے کام کو ختم کر دیا (اقرب)

فَانْصَبْ نَصِبَ يَنْصَبُ سے امر کا صیغہ ہے اور نَصِبَ الرَّجُلُ نَصَبًا کے معنے ہوتے ہیں اَعْیَا۔ وہ تھک گیا۔ اور نَصِبَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں جَدَّ وَ اجْتَهَدَ اُس نے محنت اور کوشش کی (اقرب) یہاں فَانْصَبْ کے معنے محنت اور جدوجہد کرنے کے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۔ جب تو فارغ ہو جائے تو پھر جدوجہد میں مشغول ہو جا۔

تفسیر۔ یہاں ایک عجیب بات بیان کی گئی ہے۔ بظاہر فراغت کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ مشکل دُور ہو گئی اور کام ختم ہو گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب تُو فارغ ہو جائے تو پھر محنت میں مشغول ہو جا پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فارغ ہونے کے بعد بھی محنت میں ہی مشغول رہنا ہے تو پھر فراغت کیسی ہوئی؟ درحقیقت اس میں اسلام کی ترقی کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کتنا بلند مقصد ہے جو ہم نے اپنے رسول کے سامنے رکھا ہے۔ بعض دفعہ دنیا میں یکدم کوئی تغیر پیدا ہو جاتا ہے مگر وہ دیرپا نہیں ہوتا بلکہ جلدی ہی رُو بہ زوال ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض تغیرات ایسے ہوتے ہیں جو گو تدریجاً پیدا ہوتے ہیں مگر ایک لمبے عرصہ تک دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ تیری ترقی گو تدریجی ہو گی مگر تیری کوششوں کے نتائج مستقل اور دیرپا ہوں گے۔ پہلے ایک مشکل تمہارے سامنے آئے گی۔ اور جب تم اُس کو دُور کر لوگے اور اپنے پہلے مقام سے اونچے ہو جاؤ گے تو پھر دوسری مشکل پیش آجائے گی اُس وقت تمہارا فرض ہوگا کہ اُس دوسری مشکل کو دُور کرو اور اپنے مقام سے اور اونچے ہو جاؤ۔ جب وہ مشکل بھی حل ہو گئی تو ایک تیسری مہم تمہارے سامنے آجائیگی اُس وقت تمہارا فرض ہوگا کہ اُس تیسری مہم کو سر کرو اور اپنے مقام سے اور اونچے ہو جاؤ گویا ایک دَور ہے جو چلتا چلا جائے گا اور غیر متناہی ترقیات ہیں جو تمہارے سامنے آتی چلی جائینگی کوئی وقت اور کوئی لمحہ تمہاری زندگی میں ایسا نہیں آسکتا جب تم یہ خیال کر لو کہ میں اپنا کام ختم کر چکا یا میں نے جس بلندی پر پہنچنا تھا پہنچ گیا۔ وہ شخص جو صرف پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھنا چاہے جب پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ جائے گا بیٹھ جائیگا اور کہے گا کہ میں جس مقام پر پہنچنا چاہتا تھا پہنچ گیا۔ مگر جس شخص کا یہ مقصد ہو کہ وہ ساری چڑھائیوں پر چڑھتا چلا جائے وہ کسی مقام پر نہیں رُکے گا بلکہ ایک چوٹی کے بعد دوسری چوٹی اور دوسری چوٹی کے بعد تیسری چوٹی پر وہ چڑھتا چلا جائے گا۔ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سپرد اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو علمی اور عملی کام کیا گیا تھا اس کی کوئی انتہا نہیں تھی اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں آپ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ ہم نے تیرے لئے کوئی محدود مقصود مقرر نہیں کیا بلکہ غیر معمولی ترقیات کا دروازہ تیرے لئے کھولا گیا ہے جب تُو کسی ایک مہم کو سر کر لے تو سمجھ لے کہ ابھی اس سے اُوپر کی مہم کو تُو نے سر کرنا ہے اور جب دوسری مہم بھی سر ہو جائے تو تُو سمجھ لے کہ تیسری مہم تیرے سامنے کھڑی ہے اور تیرا فرض ہے کہ تُو اُس کو بھی سر کرے۔ غرض تُو نے بلندیوں کی طرف اپنے پورے زور کے ساتھ بڑھتے چلے جانا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی اپنے قدم کو نہیں روکنا۔ گویا فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غیر متناہی سفر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ اپنے کام میں بڑھتے چلے جائیں گے اور کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا جب یہ کہا جاسکے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے اور اب وہ اپنے کام سے فارغ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ ایک کام سے فارغ ہو جائیں گے تو دوسرا کام شروع کر دیں گے، دوسرے کام سے فارغ ہوں گے تو تیسرا کام شروع کر دیں گے۔ ہم جب بچے تھے اُس وقت ایک کھیل کھیلا کرتے تھے جو اِسی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔ ایک لڑکا بیٹھ جاتا تھا اور باقی سب لڑکے اُس کے سر پر اُوپر نیچے اپنی مٹھیاں

ع ۱
۱۹

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

اور تُو اپنے رب کی طرف متوجہ ہو ۝۵

بند کرکے رکھتے چلے جاتے اور پھر ایک لڑکا کہتا

بھنڈا بھنڈا ریا کتنا کُ بھار

وہ جواب میں کہتا

اِک مُکّی چُک لے دُوجی تیار

یعنی ایک مُٹھی سر پر سے ہٹا لو تو دوسری مٹھی اس کی جگہ لینے کو تیار ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے تمہارے لئے غیر معمولی ترقیات مقدر ہیں جب تم ایک مشکل کو حل کرلوگے تو خدا تعالےٰ دوسری مشکل تمہارے سامنے کھڑی کردے گا تاکہ تم اُس کو حل کرکے اور زیادہ ترقی کرو اور زیادہ قرب اور محبت کے مقامات طے کرو۔ گویا کوئی مقام ایسا نہیں آسکتا جسے تم اپنی ترقی کی آخری منزل قرار دے سکو۔ ہر مقام پر پہنچ کر ایک نیا دروازہ تمہارے لئے کھول دیا جائے گا اور اس طرح غیر متناہی ترقیات کا سلسلہ تمہارے لئے قائم کیا جائے گا۔ بے شک ہم نے تجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم تجھے کامیاب کریں گے اور تیری ہر مشکل کو دُور کریں گے مگر فتح اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ نہ سمجھنا کہ میرا کام ختم ہوگیا ہے بلکہ ہر فتح کے بعد نئی مشکلات سامنے آجائیں گی کیونکہ روحانی ترقی کے اسرار میں سے یہ بات ہے کہ نئی سے نئی مشکلات پیدا ہوتی جائیں اور اُنہیں سَر کیا جائے۔ پس تم یہ خیال نہ کرنا کہ شیطانی حملہ صرف ایک رنگ کا ہوگا اور اُس کا ایک رنگ میں مقابلہ کرنا ہی اُس کو شکست دینے کے لئے کافی ہوگا بلکہ شیطان کے حملے مختلف انواع کے ہوں گے۔ اُس کے حملے علمی بھی ہوں گے، اُس کے حملے عملی بھی ہوں گے، اُس کے حملے فکری بھی ہوں گے، اُس کے حملے سیاسی بھی ہوں گے، اُس کے حملے اقتصادی بھی ہوں گے اور یہ تمام حملے اُس کی طرف سے یکے بعد دیگرے ہوتے چلے جائیں گے۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ ایک دشمن کو مارا اور آگے بڑھے، دوسرے دشمن کو مارا اور آگے بڑھے، تیسرے دشمن کو مارا اور آگے بڑھے۔ اس طرح ایک ایک کرکے دشمن کو ہٹاتے چلے گئے اور خدا تعالےٰ کے قرب کی بلندیوں میں اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتے گئے۔

۝۵ **تفسیر** فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تم اس طرح چوٹیوں پر چڑھتے چلے آؤ گے تو دیکھو گے کہ ہم آگے بیٹھے ہیں، ہم بلندیوں پر رہتے ہیں اور وہی ہمارے پاس آسکتا ہے جو غیر محدود جدّوجہد سے کام لینے والا ہو۔ اس لئے ہماری ملاقات کے راستہ میں کسی مقام پر ٹھہرنا نہیں بلکہ بڑھتے چلے آنا۔ عیسوی مقام آجائے تو ٹھہرنا نہیں بلکہ اوپر چڑھنا موسوی مقام آجائے تو ٹھہرنا نہیں بلکہ اُوپر چڑھنا۔ پہلے آسمان پر پہنچو تو وہاں ٹھہرنا نہیں بلکہ اپنی کمر باندھ لو اور دوسرے آسمان پر پہنچو۔ دوسرا آسمان آئے تو تیسرے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ تیسرا آسمان آئے تو چوتھے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ چوتھا آسمان آئے تو پانچویں آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ پانچواں آسمان آئے تو چھٹے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ چھٹا آسمان آئے تو ساتویں آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ ساتواں آسمان آئے تو اُس سے بھی اوپر پہنچنے کی کوشش کرو۔ اُوپر ہم تمہارا انتظار کررہے ہیں تم اپنے رب کی طرف آؤ اور اپنا انعام پالو ؛

سُوْرَةُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ

سورۂ تین - یہ سورۃ مکّی ہے ۱؎

وَهِیَ ثَمَانِیْ اٰیَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِیْهَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

۱؎ جمہور کے نزدیک یہ سورۃ مکّی ہے۔ قرطبی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ مدنی ہے۔ قتادہ کا بھی قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ مدنی ہے۔ مگر اس کے مقابل میں ابن الضریس۔ نحاس۔ ابن مردویہ اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے ہی روایت کی ہے۔ کہ اُنْزِلَتْ سُوْرَةُ التِّیْنِ بِمَکَّةَ یعنی سورۂ تین مکّہ میں نازل ہوئی تھی۔ یہ دوسری روایت قرطبی کی روایت کو ردّ کرتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ کی طرف سے بھی یہی روایت ہے کہ یہ سورۃ مکّی ہے۔ ابن مردویہ نے عبداللہ بن زبیرؓ سے بھی اس قسم کی روایت نقل کی ہے۔ گویا ابن عباسؓ کے علاوہ عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس سورۃ کو مکّی قرار دیتے ہیں۔ بقیہ علماء نے بھی باوجود اس روایت کے جو قرطبی نے نقل کی ہے اسے مکّی ہی قرار دیا ہے۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں اور اسی طرح بعض اور کتب میں بھی براءؓ بن عازب سے روایت نقل کی گئی ہے کہ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ فَصَلَّی الْعِشَاءَ فَقَرَءَ فِیْ اِحْدَی الرَّکْعَتَیْنِ بِالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ فَمَا سَمِعْتُ اَحَدًا اَحْسَنَ صَوْتًا وَّلَا قِرَاءَةً مِّنْهُ یعنی ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جا رہے تھے کہ آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور اُس کی پہلی دو رکعتوں میں سے ایک میں آپ نے سورۂ تین پڑھی۔ میں نے کسی شخص کو اس سے زیادہ خوبصورت آواز اور اچھی قرأت کے ساتھ قرآن کریم کو پڑھتے نہیں سُنا جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو میں نے پڑھتے سُنا۔ ایک دوسری روایت جو ابھی کی ہے اُس میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر ابن الخطیب میں براءؓ بن عازب کی جو روایت آتی ہے اُس میں عشاء کی بجائے مغرب کا لفظ ہے۔

سورۃ التین مکّی ہے

نولڈکے جرمن مستشرق اسے سورۃ البروج کے ساتھ کی نازل شدہ بتاتا ہے۔ یعنی یہ بھی ابتدائی زمانہ کی مکّی سورۃ ہے۔ ویری بھی اس کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا سٹائل مکّی ہے میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ یہ اُس کی زبردستی ہے۔ وہ عربی بھی اچھی طرح نہیں جانتا سٹائل کو کہاں پہچان سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ اس سورۃ میں هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کے جو الفاظ آتے ہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ سورۃ مکّی ہے۔ کیونکہ اس میں هٰذَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ "یہ شہر مکّہ" جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ سورۃ مکّی ہے۔ ویری کی یہ دلیل وزنی ضرور ہے مگر قطعی نہیں۔ ہم اتنے حصّہ میں اُس سے متفق ہیں کہ یہ مکّی ہے۔ مگر اُس نے اپنے بُغض کی وجہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مسلمان مصنّف ابن حدیثوں کی اندھا دھند تقلید میں جو قرآن کریم کو واضح کرنے کیلئے بنائی گئی ہیں اسے مدنی قرار دیتے ہیں نہایت ناپسندیدہ فعل ہے۔ یہ فقرہ اُس کے بُغض پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ جمہور مسلمان تو اسے مکّی قرار دیتے ہیں اور ہمارا اپنا فائدہ بھی اگر مسلمان فائدہ اُٹھانے کے لئے حدیثیں بناتے ہیں تو اسے مکّی قرار دینے میں ہی ہے پس جبکہ جمہور بھی اسے مکّی قرار دیتے ہیں مسلمان مصنّفوں پر اس قدر رکیک الزام اور خصوصاً احادیث پر نہایت قابلِ شرم امر ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ روائتیں اسے مکّی قرار دے رہی ہیں صرف قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں اسے مدنی قرار دیا ہے مگر ممکن ہے وہاں کتابت کی غلطی کی وجہ سے مکّی کی بجائے مدنی لکھا گیا ہو اور اگر وہ کتابت کی غلطی نہیں تب بھی قرطبی اصل راوی نہیں بلکہ وہ دوسروں کی روائتوں کو نقل کرنے والا ہے

اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اصل راوی سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورۃ مدنی نہیں بلکہ مکی ہے لیکن ویری کا اسے سٹائل کی وجہ سے مکی قرار دینا محض دھینگا مشتی ہے۔ اگر پادری ویری کے سامنے ہی قرآن کریم کھول کر رکھدیا جائے اور اُن سے پوچھا جائے کہ اگر تم سٹائل کو پہچاننے کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہو تو بتاؤ اس میں مکی آیات کونسی ہیں اور مدنی آیات کونسی تو وہ بیسیوں غلطیاں کرجائینگے یہاں چونکہ تمام روایتیں اس سورۃ کو مکی قرار دے رہی تھیں انہوں نے سمجھا کہ مَیں اس کے مکی ہونے کا ثبوت اس سورۃ کے سٹائل کو قرار دے کر ایک جدّت پیدا کر دوں حالانکہ سٹائل کو پہچاننا کوئی آسان کام نہیں ہوتا حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا انسان جو رات اور دن غور کرتا رہا ہو اور جس نے باریک طور پر تدبّر اور دماغی کاوش سے کام لیا ہو اُس کے لئے بھی سٹائل کو الگ طور پر پہچاننا مشکل ہوتا ہے اور باقی لوگوں کے لئے تو اسقدر مشکل مرحلہ ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ لاکھوں میں سے کسی ایک کے لئے یہ بات ممکن ہو تو ہو باقی کسی کے لئے سٹائل کو پہچاننا ممکن نہیں ہے۔ یہی بات دیکھ لو سب مسلمان قرآن جانتے اور اُسے پڑھتے ہیں مگر پھر کئی مقرر مسلمان بعض ضعیف حدیثیں پیش کر کے کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایسا لکھا ہے حالانکہ وہ ویری سے زیادہ قرآن جانتے ہیں۔

مولوی محمد احسن صاحب امروہی میں یہ مرض تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب بھی کوئی بات کرتے وہ درمیان میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیتے تھے اور واہ وا! اور سبحان اللہ کہنے لگ جاتے مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کسی گفتگو میں فرماتے کہ قرآن کریم نے فلاں بات نہایت لطیف طور پر بیان کی ہے تو وہ کہنا شروع کر دیتے تھے کہ سبحان اللہ بڑی لطیف بات ہے کس کی طاقت ہے کہ ایسی بات کہہ سکے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سیر کے لئے جا رہے تھے مَیں بھی ساتھ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مجھے آج ایک الہام ہوا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے کلام اور بندے کے کلام میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات بیان فرمائی تو مولوی محمد احسن صاحب نے جھٹ ہاتھ مارنے شروع کر دیئے اور کہا حضور فرق! خدا کے کلام اور بندہ کے کلام میں زمین اور آسمان کا فرق ہے حضور خدا کا کلام خدا کا کلام اور بندے کا کلام بندے کا کلام! بھلا ممکن ہے بندہ اپنے کلام میں خدا کا مقابلہ کر سکے؟ یہ تو بالکل ناممکن ہے۔ جب وہ ذرا خاموش ہوئے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر بات شروع کی اور فرمایا دیکھو حریری عربی ادب کے لحاظ سے کمال کو پہنچا ہؤا تھا مگر الہام الٰہی میں جو باریکیاں ہوتی ہیں وہ اس کے کلام میں کہاں ہیں؟ مولوی محمد احسن صاحب نے پھر کہنا شروع کر دیا حضور حریری! بھلا حریری میں رکھا ہی کیا ہے! اُس کی کیا طاقت ہے کہ وہ خدا کے کلام کا مقابلہ کر سکے۔ خدا کا کلام جس شان اور عظمت کا حامل ہوتا ہے بھلا حریری کی طاقت ہے کہ اُس جیسا کلام کہہ سکے۔ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مثلاً یہ فقرہ ہے۔ ابھی وہ فقرہ مولوی محمد احسن صاحب نے سُنا ہی تھا کہ انہوں نے جھٹ کہنا شروع کر دیا۔ حضور یہ بھی کوئی فقرہ ہے۔ یہ بھی کوئی عربی ہے حریری کیا جانتا ہے کہ عربی کیا ہوتی ہے؟ حالانکہ وہ الہام تھا حریری کا فقرہ نہیں تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ مولوی صاحب! سُنیئے تو سہی یہ حریری کا فقرہ نہیں یہ تو وہ الہام ہے جو مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہؤا ہے۔ اب دیکھو مولوی محمد احسن صاحب مولوی آدمی تھے رات دن عربی کتابیں پڑھنے میں مشغول رہتے تھے اور اگر سٹائل کو پہچاننا ایسا ہی آسان کام ہوتا تو وہ فوراً پہچان لیتے کہ یہ انسانی کلام ہے یا خدائی کلام مگر پھر بھی وہ غلطی کر گئے اور انہوں نے الہام کو انسانی کلام سمجھ لیا۔

اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ موانست اور مشابہت کی وجہ سے انسان بعض دفعہ اندازہ کر لیتا ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے یا مدنی سورۃ ہے مگر یہ اندازہ دلیل نہیں بن جاتا۔ مثلاً جہاں تک عربی الفاظ کا تعلق ہے جسطرح وہ الفاظ قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں اُسی طرح اور عربی کتب میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں بھی رزق کا لفظ آتا ہے اور دوسری عربی کتب میں بھی رزق کا لفظ آتا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۝ وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۝ وَہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۝

(مجھے) قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور سینین کے پہاڑ کی اور اس امن والے شہر کی ۲؎

قرآن میں بھی جہاد کا لفظ آتا ہے اور دوسری عربی کتب میں بھی جہاد کا لفظ آتا ہے۔ قرآن میں بھی غَدًا کا لفظ آتا ہے اور دوسری عربی کتب میں بھی غَدًا کا لفظ آتا ہے مگر اس کے باوجود جس شان اور عظمت کے حامل قرآن کریم کے الفاظ ہیں اُس شان اور عظمت کے پاسنگ بھی وہ الفاظ نہیں جو دوسری کتب میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ محض الفاظ کا اشتراک کوئی چیز نہیں بلکہ اصل چیز جو الہام الٰہی کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے وہ اُن الفاظ کا ایک ایسے ہار میں پرویا جانا ہے جس کی دنیا میں اور کہیں نظیر نہیں ملتی مگر پھر بھی قطعیت کے ساتھ صرف اجتہاد سے کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ قرآنی اور غیر قرآنی عبارت کو بغیر قرآن کے حفظ کرنے یا کالحفظ کرنے کے قطعاً الگ الگ پہچان سکتا ہے۔ پس ویری کا محض سٹائل کی بنا پر اس سورۃ کو مکّی قرار دینا اُس کی خوش فہمی ہے۔ اگر اُن کے سامنے ہی قرآن کریم کی آیات الگ الگ رکھدی جائیں اور اُن سے پوچھا جائے کہ بتاؤ ان میں سے مکّی کونسی ہیں اور مدنی کونسی تو وہ سینکڑوں غلطیوں کا ارتکاب کر جائینگے وہ اگر سٹائل کو پہچانتے ہیں تو صرف اِس نقطۂ نگاہ سے کہ اگر لمبی آیت ہوئی تو اُس کے متعلق کہدیا یہ مدنی ہے اور اگر چھوٹی آیت ہوئی تو کہدیا یہ مکّی ہے حالانکہ یہ امتیاز تو ایک بچہ بھی کر سکتا ہے۔ پس ویری کا مسلمان مصنفوں اور مسلمانوں کی حدیثوں پر یہ حملہ نہایت ناواجب ہے اور اُس بغض اور کینہ کا ثبوت ہے جو اُس کے دل میں اسلام کے متعلق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ خود مسلمان راوی بھی اِس کو مکّی قرار دیتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان راویوں کے کہنے کی وجہ سے ہی انہوں نے اِس سورۃ کو مکّی قرار دیا ہے ورنہ اگر وہ نہ بتاتے تو یہ خود کچھ بھی نہ کہہ سکتے کہ یہ سورۃ مکّی ہے یا مدنی۔

سورۃ تین کا پہلی سورتوں سے تعلق

ترتیب اِس سورۃ کا سورۃ الانشراح سے یہ تعلق ہے کہ سورۂ انشراح میں بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انجام اچھا ہوگا کیونکہ نیک انجام کے لئے جن امور کی ضرورت ہوتی ہے وہ آپ کو حاصل ہیں۔ اب اِس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ پہلی اقوام کی شہادت اس امر کی تائید میں موجود ہے۔ دنیا میں جب کوئی عقلی دلیل دیتا ہے تو انسان کی پوری تسلّی نہیں ہوتی وہ چاہتا ہے کہ مجھے کوئی نقلی دلیل بھی دی جائے تاکہ میں سمجھ سکوں کہ واقعہ میں اِسکے مطابق کام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ سورۃ الانشراح میں عقلی دلیل دی گئی تھی اب اس سورۃ میں نقلی دلیل دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے بعض پہلی قوموں کو بھی ترقی دی پھر اس سے تم نتیجہ نکال سکتے ہو کہ جسطرح آدمؑ اور نوحؑ اور موسیٰؑ کے وقت میں ہُوا کہ باوجود مخالف حالات کے محض روحانی سلسلوں سے اُن کو فتح حاصل ہوئی اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ اِس کے بعد اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ میں بھی اِسی مضمون کو جاری رکھا گیا ہے۔

۲؎ **تفسیر**۔ فرماتا ہے قسم ہے ہم کو یا ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں انجیر کو بھی۔ زیتون کو بھی۔ طورِ سینا کو بھی اور اِس بلد الامین کو بھی۔ فتح البیان میں لکھا ہے:۔ قَالَ اَکۡثَرُ الۡمُفَسِّرِیۡنَ اَلتِّیۡنُ ھُوَ التِّیۡنُ الَّذِیۡ یَاۡکُلُہُ النَّاسُ وَالزَّیۡتُوۡنُ ھُوَ الَّذِیۡ یَعۡصِرُوۡنَ مِنۡہُ الزَّیۡتَ الَّذِیۡ ھُوَ اِدَامُ غَالِبِ الۡبُلۡدَانِ وَ دُھۡنُھُمۡ وَیَدۡخُلُ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَدۡوِیَۃِ یعنی اکثر مفسرین کے نزدیک تین سے مراد وہی تین ہے جو لوگ کھاتے ہیں۔ یعنی اِس سورۃ میں جو وَالتِّیۡنِ کا لفظ

تین و زیتون کی تشریح بگاڑنے مفسرین کے قلم سے

استعمال کیا گیا ہے اِس سے مراد وہی عام انجیر ہے جسے لوگ کھایا کرتے ہیں اور زیتون سے مراد بھی وہی زیتون ہے جسے لوگ کھاتے ہیں جو اکثر ملکوں میں بطور سالن اور چکنائی کے استعمال ہوتا ہے اور بہت سی دعاؤں میں بھی پڑتا ہے گویا یہاں اِس سورۃ میں جو وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ فرمایا گیا ہے اِس میں کوئی بات استعارۃً یا تمثیلاً بیان نہیں کی گئی بلکہ اس سے وہی انجیر مراد ہے جو کھانے کے کام آتی ہے اور وہی زیتون مراد ہے جس کا تیل لوگ اَچاروں میں ڈالتے یا سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اَچار میں تیل یا سرکہ ڈالتے ہیں مگر مغربی ممالک میں عموماً زیتون کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ وَقَالَ الضَّحَّاكُ اَلْمَسْجِدُ الْاَقْصٰى اور ضحاک کہتے ہیں کہ تین اور زیتون سے مراد مسجد اقصیٰ ہے وَقَالَ ابْنُ زَيْدٍ مَسْجِدُ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ اور ابن زید کہتے ہیں کہ اِس سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے وَقَالَ قَتَادَةُ اَلْجَبَلُ الَّذِيْ عَلَيْهِ بَيْتُ الْمُقَدَّسِ اور قتادہ کہتے ہیں اس سے مراد وہ پہاڑ ہے جس پر بیت المقدس بنایا گیا ہے وَقَالَ عِكْرَمَةُ وَكَعْبُ الْاَحْبَارِ بَيْتُ الْمُقَدَّسِ۔ اور عکرمہ اور کعب الاحبار کہتے ہیں کہ اِس سے مراد بیت المقدس ہے۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِلَادُ فَلَسْطِيْنَ اور ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ اِس سے مراد فلسطین کا علاقہ ہے۔ وَقَالَ اَيْضًا بَيْتُ الْمُقَدَّسِ اِسی طرح اُن سے یہ بھی روایت ہے کہ اِس سے مراد بیت المقدس ہے۔ فتح البیان کے مصنف اِن معانی کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:- "لَيْتَ شِعْرِيْ مَا الْحَامِلُ لِهٰؤُلَاءِ الْاَئِمَّةِ عَنِ الْعُدُوْلِ عَنِ الْمَعْنَى الْحَقِيْقِيِّ فِي اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ وَالْعُدُوْلِ اِلٰى هٰذِهِ التَّفْسِيْرَاتِ الْبَعِيْدَةِ عَنِ الْمَعْنَى الْمَبْنِيَّةِ عَلٰى خَيَالَاتٍ لَا تَرْجِعُ اِلٰى عَقْلٍ وَنَقْلٍ وَاَعْجَبُ مِنْ هٰذَا اِخْتِيَارُ ابْنِ جَرِيْرٍ لِلْاٰخِرِ مِنْهَا مَعَ طُوْلِ بَاعِهٖ فِيْ عِلْمِ الرِّوَايَةِ وَالدِّرَايَةِ۔" یعنی مجھے بڑی حیرت آتی ہے اور میری سمجھ سے یہ بات باہر ہے کہ یہ جو بڑے بڑے ائمہ ہیں اُن کو کس چیز نے اِس بات پر آمادہ کیا ہے کہ لغت عرب میں تین اور زیتون کے جو حقیقی معنی ہیں اُن کو چھوڑ کر انہوں نے اَور اَور معنے کرنے شروع کر دئے اور بعید از قیاس ایسی تفسیریں کرنی شروع کر دیں جو ایسے خیالات پر مبنی ہیں جن کی نہ عقل تصدیق کرتی ہے نہ نقل تائید کرتی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں مجھے سب سے زیادہ تعجب ابن جریر پر آتا ہے (ابن جریر بہت بڑے مفسر اور محدّث ہیں اور اُن کی عقلی رائے بھی نہایت اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے) کہ وہ بھی آخری معنوں کی تصدیق کرتے ہیں کہ تین اور زیتون سے یا تو بیت المقدس مراد ہے یا پھر فلسطین کا علاقہ حالانکہ درایت اور روایت میں اُن کو بڑا دخل حاصل ہے یعنی باوجود اس قدر علم و فضل کے انجیر اور زیتون کے سیدھے سادے معنے کرنے کی بجائے وہ اِدھر اُدھر کی دُور از قیاس باتوں میں چلے گئے ہیں۔

پھر صاحب فتح البیان لکھتے ہیں:- قَالَ الْفَرَّاءُ سَمِعْتُ رَجُلًا يَقُوْلُ اَلتِّيْنُ جِبَالُ حُلْوَانَ اِلٰى هَمْدَانَ وَالزَّيْتُوْنُ جِبَالُ الشَّامِ۔ یعنی فرّاء کہتے ہیں مَیں نے ایک آدمی سے سُنا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تین سے مراد حلوان کے پہاڑ ہیں جن کا ہمدان تک سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے اور زیتون سے مراد شام کے پہاڑ ہیں۔ فرّاء جیسے آدمی کا یہ مضمون بیان کرنا ایک ایسی بات ہے جس پر واقعہ میں ہنسی آتی ہے۔ چنانچہ فتح البیان والوں نے یہاں ایک ایسا مزیدار فقرہ لکھا ہے جسے پڑھتے وقت مجھے ہنسی آ گئی تھی وہ لکھتے ہیں هَلْ اِنَّكَ سَمِعْتَ هٰذَا الرَّجُلَ فَكَانَ مَاذَا فَلَيْسَ بِمِثْلِ هٰذَا تَثْبُتُ اللُّغَةُ وَلَا هُوَ نَقْلٌ عَنِ الشَّارِعِ کہتے ہیں۔ میاں اگر تم نے کسی آدمی سے ایسا سُن بھی لیا تھا تو پھر ہُوا کیا۔ کسی نے گپ ہانک دی تو تم اُس کو لے اڑے۔ یہ بھی کوئی دانائی اور عقلمندی ہے۔ مان لیا کہ تم نے ایک آدمی سے یہ بات سُنی تھی مگر کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ قرآن کریم کی تفسیر ہو گئی۔ یہ ایک ایسا بے ساختہ فقرہ صاحب فتح البیان کی قلم سے نکلا ہے جس کی داد دینی پڑتی ہے واقعہ میں یہ حیرت کی بات ہے کہ فرّاء جیسے آدمی نے اس قسم کی بات نقل کر دی۔ وہ روایت یہ کرتے ہیں کہ مَیں نے ایک آدمی کو یہ کہتے سُنا تھا کہ تین اور زیتون سے یہ مراد ہے۔ حالانکہ وہ کوئی بچہ بھی ہو سکتا ہے۔ پاگل بھی ہو سکتا ہے لغت سے ناواقف بھی ہو سکتا ہے۔ ایک غیر معروف الحال شخص کی ایک

بیہودہ بات پر قرآن کریم کی تفسیر کی بنیاد رکھنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ یا تو وہ کہتے کہ میں لغت کو جانتا ہوں اِس لئے میرے نزدیک اِس کے یہ معنے ہیں یا فلاں ادیب سے میں نے ایسا سُنا ہے یا فلاں قبیلہ میں اِس کے یہ معنے کئے جاتے تھے مگر وہ کہتے یہ ہیں کہ میں نے ایک شخص سے سُنا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تین سے یہ مراد ہے اور زیتون سے وہ مراد ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے غالبؔ اور ذوقؔ کہیں کہ ہم نے ایک گاؤں کے جاہل اور اُجڈ لڑکے کو فلاں شعر کے یہ معنے کرتے سُنا ہے۔ غرض فتح البیان والوں کا یہ فقرہ بڑا لطیف ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اوّل تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے ایسا سُنا ہو۔ لیکن اگر سُن بھی لیا تھا تو اِس پر قرآن کریم کی تفسیر کی بنیاد رکھنا کس طرح درست تھا۔ فتح البیان والے اگر اِس اصول پر قائم رہتے تو بہت اچھا ہوتا مگر وہ خود بھی ایسی بہت سی باتیں کہہ گئے ہیں۔

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ كَعْبٍ اَلزَّيْتُوْنُ مَسْجِدُ اِيْلِيَا۔

محمد بن کعب کہتے ہیں کہ زیتون سے مراد مسجد ایلیا ہے وَقِيْلَ اِنَّهٗ عَلٰى حَذْفِ مُضَافٍ اَیْ مَنَابِتُ التِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ بعض نے کہا ہے کہ یہاں حذفِ مضاف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم تین اور زیتون اُگانے والی جگہوں کو پیش کرتے ہیں۔ قَالَ النَّحَّاسُ لَا دَلِيْلَ عَلٰى هٰذَا مِنْ ظَاهِرِ التَّنْزِيْلِ وَلَا مِنْ قَوْلِ مَنْ لَا يَجُوْزُ خِلَافُهٗ نحاس کہتے ہیں کہ اِس توجیہہ کے متعلق قرآن کریم کی کوئی تصدیقی دلیل نہیں ملتی اور نہ کسی ایسے آدمی کا قول ملتا ہے جس کی بات کو رد کرنے کی جرأت نہ ہو سکے قَالَ الرَّازِی اَمَّا الزَّيْتُوْنُ فَهُوَ فَاكِهَةٌ مِنْ وَجْهٍ وَ دَوَاءٌ مِنْ وَجْهٍ وَيُسْتَصْبَحُ بِهٖ۔ رازی کہتے ہیں کہ زیتون سے مراد وہی شے ہے جو ایک لحاظ سے میوہ ہے کہ لوگ اِسے کھاتے ہیں اور ایک لحاظ سے دوا بھی ہے۔ اور اِس سے دیئے بھی جلائے جاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں وَمَنْ رَاٰی وَرَقَ الزَّيْتُوْنِ فِی الْمَنَامِ اِسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى اگر کوئی شخص خواب میں زیتون کے ورق دیکھ لے تو اُس کے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس نے ایک مضبوط اور نہ ٹوٹنے والا کڑا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اب ہم تفسیر ابن کثیر کو دیکھتے ہیں۔ اُس میں لکھا ہے قَالَ الْقُرْطُبِی هُوَ مَسْجِدُ اَصْحَابِ الْكَهْفِ قرطبی کا بیان ہے کہ اِس سے اصحاب کہف کی مسجد مراد ہے۔ وَرَوَى الْعَوْفِیُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَسْجِدُ نُوْحٍ الَّذِیْ عَلَى الْجُوْدِیِّ عوفی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اِس سے وہ مسجد نوح مراد ہے جو جودی پہاڑ پر ہے جہاں طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھیری تھی وَقَالَ بَعْضُ الْاَئِمَّةِ هٰذِهٖ مَحَالٌّ ثَلَاثَةٌ بَعَثَ اللّٰهُ فِیْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهَا نَبِيًّا مُرْسَلًا مِنْ اُولِی الْعَزْمِ اَصْحَابِ الشَّرَائِعِ الْكِبَارِ بعض ائمہ کہتے ہیں کہ یہ تین اہم مقامات ہیں جن میں سے ہر مقام میں اللہ تعالےٰ نے اپنے اولوالعزم اور صاحبِ شریعت انبیاء کو بھیجا تھا فَالْاَوَّلُ مَحَلَّةُ التِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَهِیَ بَيْتُ الْمَقْدِسِ الَّتِیْ بَعَثَ اللّٰهُ فِيْهَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ پہلے نبی کے اُترنے کا محل تین اور زیتون کا مقام ہے اور اس سے مراد وہ بیت المقدس ہے جہاں اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح ابن مریمؑ کو نازل کیا تھا گویا اُن کے نزدیک تین اور زیتون دونوں سے مراد بیت المقدس ہے گو بعض ائمہ نے صرف تین کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس سے مراد بیت المقدس ہے مگر یہ کہتے ہیں تین اور زیتون دونوں سے بیت المقدس مراد ہے کیونکہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ وَالثَّانِیْ طُوْرُ سِيْنِيْنَ اور دوسرا مقام طورِ سینین ہے وَهُوَ طُوْرُ سِيْنَاءَ الَّذِیْ كَلَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مُوْسَى بْنَ عِمْرَانَ اور اس سے مراد وہ طور ہے جس پر اللہ تعالےٰ نے موسیٰؑ بن عمران سے باتیں کی تھیں۔ وَالثَّالِثُ مَكَّةُ اور بلد الامین جس کا تیسرے مقام پر ذکر آتا ہے اِس سے مراد مکہ ہے۔ وَهٰذَا الْبَلَدُ الْاَمِيْنُ الَّذِیْ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا اور یہ وہی بلد الامین ہے جس میں داخل ہو کر انسان کو امن حاصل ہو جاتا ہے وَهُوَ الَّذِیْ اُرْسِلَ فِيْهِ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہی وہ جگہ ہے جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اس کے بعد ابن کثیر والے لکھتے ہیں کہ وَقَالُوْا وَفِیْ اٰخِرِ التَّوْرَاةِ ذِکْرُ هٰذِهِ الْاَمَاکِنِ الثَّلَاثَةِ یعنی بعض مفسرین نے جو یہ معنے کئے ہیں کہ تین اور زیتون سے مراد تین اور زیتون کے پیدا ہونے کی جگہ ہے خصوصاً تین اور زیتون سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ مقام ہے جہاں آپ نازل ہوئے. طورِ سینین سے مراد وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور بلد الامین سے مراد وہ مکہ ہے جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اِن تینوں مقامات کا تورات کے آخر میں ذکر آتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے :۔ جَاءَ اللّٰهُ مِنْ طُوْرِ سِیْنَاءَ وَ اَشْرَقَ مِنْ سَاعِیْرَ وَ اِسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ یعنی " خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوُا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوُا " (استثنا باب ۳۳ آیت ۲) یہ ایک مشہور حوالہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق بائیبل میں پایا جاتا ہے اور میرے نزدیک یہ پہلا حوالہ ہے جو مفسرین نے صحیح طور پر پیش کیا ہے اور اِس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئی بھی پائی جاتی ہے ورنہ مفسرین بائیبل کے جو حوالجات دیتے ہیں وہ اکثر غلط ہوتے ہیں یا تو وہ حوالے بائیبل میں ملتے ہی نہیں اور اگر ملتے ہیں تو اُس رنگ میں نہیں ہوتے جس رنگ میں مفسرین اُنکا ذکر کرتے ہیں۔ یہ پہلا حوالہ ہے جو انہوں نے صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ جَاءَ اللّٰهُ مِنْ طُوْرِ سِیْنَاءَ کے ساتھ انہوں نے بطور تشریح لکھا ہے یعنی اَلَّذِیْ کَلَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ مُوْسٰی اور اَشْرَقَ مِنْ سَاعِیْرَ کے ساتھ لکھا ہے یعنی جَبَلُ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ مِنْهُ عِیْسٰی اور وَاسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ کے ساتھ لکھا ہے۔ یعنی جِبَالُ مَکَّةَ الَّتِیْ اَرْسَلَ اللّٰهُ مِنْهَا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ پھر اِس کے بعد وہ ایک نوٹ میں لکھتے ہیں فَذَکَرَهُمْ مُخْبِرًا عَنْهُمْ عَلَی التَّرْتِیْبِ الْوَجُوْدِیِّ بِحَسْبِ تَرْتِیْبِهِمْ فِی الزَّمَانِ یعنی اِس پیشگوئی میں جو بائیبل میں بیان کی گئی ہے اِن تینوں انبیاء کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ اِسی ترتیب سے ذکر ہے جس ترتیب کے ساتھ یہ تینوں انبیاء یکے بعد دیگرے آئے۔ پہلے طورِ سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے پھر اَشْرَقَ مِنْ سَاعِیْرَ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور اِسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے کیونکہ اِسی ترتیب سے یہ انبیاء آئے تھے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تھے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے۔ اور آخر میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آگئے گویا جس ترتیب سے اِن انبیاء نے ظاہر ہونا تھا اُسی ترتیب سے اللہ تعالیٰ نے اِس پیشگوئی کا بائیبل میں ذکر کیا ہے۔ وَلِهٰذَا اَقْسَمَ بِالْاَشْرَفِ ثُمَّ الْاَشْرَفِ مِنْهُ ثُمَّ بِالْاَشْرَفِ مِنْهُمَا یہاں معلوم ہوتا ہے کوئی عبارت رہ گئی ہے یا ترتیبِ زمانی چونکہ پہلے بیان ہو چکی تھی اِس لئے انہوں نے خیال کر لیا کہ لوگ خودبخود اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ قرآن کریم نے بائیبل کی ترتیب کے خلاف پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ذکر کیا ہے تو درجہ کی ترتیب کے لحاظ سے کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں قرآن کریم نے زمانی ترتیب کو نہیں لیا بلکہ درجہ کی ترتیب کو لیا ہے اور اِس لئے پہلے تین اور زیتون کا ذکر کیا ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ وہ باقی دو انبیاء سے درجہ میں چھوٹے ہیں۔ اِس کے بعد طورِ سینین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ درجہ میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں۔ آخر میں وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کہہ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا کیونکہ آپ عیسیٰؑ اور موسیٰ دونوں سے افضل ہیں۔ یہ توجیہہ ابن کثیر والوں کی نہایت معقول اور درست ہے مَیں نے دیکھا ہے کہ اکثر مقامات پر اُن کی عقل خوب چلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں بائیبل نے تو اُن کی ترتیبِ وجودی کو مدّنظر رکھا تھا مگر قرآن کریم نے اُن کی ترتیب مقامی کو مدّنظر رکھا ہے۔ وہاں یہ ذکر تھا کہ پہلے کون ہوگا۔

پھر کون ہوگا اور پھر اُس کے بعد کون ہوگا لیکن یہاں یہ ذکر ہے کہ اِن تینوں میں سے چھوٹا درجہ کس کا ہے اور پھر اُس سے بڑا درجہ کس کا ہے اور پھر اِن دونوں سے بڑا درجہ کس کا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو مَیں نے اور کسی تفسیر میں نہیں دیکھی۔ باقی تفاسیر کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں حضرت مسیحؑ کا ذکر آجاتا ہے وہ بوجہ اُن روایتوں کے جو حضرت ابوہریرہؓ کی مہربانی سے احادیث میں آگئی ہیں ڈر جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہم حضرت مسیحؑ سے کسی اور نبی کو افضل قرار دے کر آپ کی ہتک کے مرتکب ہو جائیں مگر ابن کثیر نے جو نہایت اعلےٰ پایہ کے مفسر ہیں قطعی اور حتمی طور پر حضرت مسیحؑ ناصری کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کم درجہ رکھنے والا قرار دیا ہے۔

مولوی محمد علی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ انجیر کا ذکر دوسری جگہ قرآن کریم میں نہیں ہے مگر زیتون کا سورۂ نور میں ذکر ہے جہاں نورِ محمدی کو زیتون سے مشابہت دی ہے۔ دوسری طرف بائیبل میں انجیر کو سلسلہ موسویہ سے مشابہت دی ہے چنانچہ یرمیاہ باب ۲۴ میں لکھا ہے۔ "دو ٹوکریں انجیروں کی خداوند کی ہیکل کے سامنے دھری تھیں۔ ایک ٹوکری میں اچھے سے اچھے انجیر تھے اور دوسری ٹوکری میں بُرے سے بُرے انجیر۔" اور پھر آگے چلکر اچھے انجیروں کو بنی اسرائیل کے اچھے لوگ قرار دیا ہے اور بُرے انجیروں کو بُرے لوگ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور انجیر کے درخت پر لعنت کرنے کے واقعہ میں بھی درحقیقت اسی طرف اشارہ ہے دیکھو متی باب ۲۱۔ "اور جب صبح کو شہر میں جانے لگا اُسے بھوک لگی تب انجیر کا ایک درخت راہ کے کنارے دیکھ کر اُس پاس گیا اور جب پتّوں کے سوا اُس میں کچھ نہ پایا تو کہا اب تجھ میں کبھی پھل نہ لگے وہیں انجیر کا درخت سُوکھ گیا۔" پھر لکھتے ہیں۔ بے موسم پھل نہ لگنے پر درخت پر کیا خفگی ہوسکتی تھی۔ اصل میں یہ ایک تمثیل تھی۔ انجیر کا درخت سلسلۂ بنی اسرائیل کا قائم مقام تھا جسے لفظ پرست انجیل نویسوں نے واقعہ کا رنگ دے دیا۔

مگر یہ بات بھی دیری کی طرح کہی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انجیل کے ماننے والے بھی اِس واقعہ کو ظاہری نہیں مانتے بلکہ وہ اِس کو ایک تمثیلی واقعہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے جب اِس واقعہ سے حضرت مسیحؑ ناصری کے اخلاق کے متعلق استدلال کیا اور لکھا کہ کیا یہی حضرت مسیحؑ کے اخلاق تھے کہ ایک انجیر کے درخت پر محض اِس وجہ سے آپنے لعنت کردی کہ اُس پر پھل نہیں تھا۔ حالانکہ اِس میں درخت کا کوئی قصور نہ تھا تو عیسائیوں نے اِسکے جواب میں یہ لکھا کہ ہم اِس کو ظاہری واقعہ تسلیم نہیں کرتے۔ خود انجیل سے ثابت ہے کہ وہ پھلوں کا موسم نہیں تھا اِس لئے یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ ایک انجیر کے درخت کی طرف اُس کے پھل کی امید میں ایسے موسم میں جاتے جس میں پھل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ درحقیقت انجیر کے درخت سے یہودی لوگ مراد ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے چاہا کہ یہودی قوم اُن پر ایمان لاکر زندہ ہو جائے اور وہ بھی روحانی پھل پیدا کرنے لگے مگر یہودی قوم نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا اِس پر حضرت مسیحؑ نے لعنت کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ آئندہ یہ قوم خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہیگی مولوی محمد علی صاحب نے سمجھا ہوگا کہ مَیں ایک بہت بڑا نکتہ نکال کر پیش کر رہا ہوں حالانکہ عیسائی بھی یہی معنے کرتے ہیں کہ اِس واقعہ میں یہودیوں کی تباہی کی طرف اشارہ تھا اور مراد یہ تھی کہ انجیر کے درخت پر اب پتّے ہی باقی رہ گئے ہیں پھل نہیں یعنی یہودیوں میں صرف ظاہری ظاہر رہ گیا ہے پھل اور روحانیت اُن میں نہیں رہی اسلئے آئندہ یہ درخت سوکھ جائیگا یعنی کوئی نبی اِن میں نہیں آئیگا پس انجیر سلسلۂ اسرائیل کا قائمقام ہے اور زیتون سلسلۂ محمدیہ کا اور انجیر اور زیتون الگ مثال نہیں ہیں بلکہ طور اور بلد الامین ہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں پہلے اُن کے ذریعہ سے مخفی اشارہ موسوی اور محمدی سلسلہ کی طرف کیا گیا پھر طور و بلد الامین کہکر اِس اشارہ کو واضح کر دیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں (خلاصہ میرے الفاظ میں ہے) کہ ان کی قسم اِس لئے کھائی یعنی تین اور زیتون کی کہ علاوہ غذا کے دوا کے طور پر بھی یہ استعمال ہوتی ہیں کبھی طبیب تین تجویز کرتا ہے تو کبھی زیتون۔ مطلب یہ کہ ایک زمانہ میں

تین و زیتون کی تفسیر حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ کی زبانی

خدا تعالےٰ نے طور سینین کا نسخہ استعمال کیا اور اس زمانہ میں بلد الامین کا نسخہ اُس نے تجویز کر دیا گویا وہی لف و نشر کی مثال ہے تین سے مراد بنی اسرائیل اور زیتون سے مراد بلد الامین سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں گویا وہ مضمون جو مولوی محمد علی صاحب نے بیان کیا ہے۔ درحقیقت حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کا بیان کردہ ہے۔ اسی طرح دو ٹوکریوں کی مثال جو مولوی محمد علی صاحب نے پیش کی ہے یہ بھی حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کی زبان سے مَیں نے خود سُنی ہے مگر افسوس ہے کہ آپ کے درس کے چھپے ہوئے نوٹوں میں یہ بات نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی محمد صادق صاحب اور قاضی اکمل صاحب نے یہ نوٹ لکھے ہیں اور وہ مضمون کا بہت سا حصہ چھوڑ کر صرف مختصر نوٹ لینے پر اکتفا کیا کرتے تھے لیکن پھر بھی اُن نوٹوں میں یہ بات موجود ہے کہ "تین اور زیتون ان دو چیزوں کو قسمیہ بطور شہادت کے اسلئے بیان کیا کہ علاوہ غذا کے جسمانی امراض کے لئے بھی بطور دوا کے یہ دونوں چیزیں استعمال کی جاتی ہیں کبھی طبیب تین تجویز کرتا ہے تو کبھی تبدیل نسخہ کے لئے زیتون مفید سمجھتا ہے۔" گویا حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کے مضمون میں ایک زائد بات یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں جسطرح طبیب کبھی تین کو چھوڑ کر زیتون استعمال کراتا ہے اسی طرح خدا نے اگر تین والے نسخے کو بدل کر زیتون والا نسخہ استعمال کرانا شروع کر دیا تو اس میں اعتراض کی کونسی بات ہے خدا حکیم ہے اور وہ ہمیشہ مرض کے مطابق آسمان سے علاج نازل کیا کرتا ہے جب تین کے نسخہ کی ضرورت تھی اُس نے تین نازل کر دی اور جب زیتون کے نسخہ کی ضرورت تھی اُس نے زیتون نازل کر دیا۔ اس تبدیلی سے خدا تعالیٰ پر کوئی اعتراض عائد نہیں ہوتا بلکہ اُس کی حکمت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے بندوں کے فائدہ اور مخلوق کی نفع رسانی کے لئے کرتا ہے۔ یہ مضمون جو نہایت ہی لطیف تھا مولوی محمد علی صاحب نے چھوڑ دیا کیونکہ مضمون ظاہر کر رہا تھا کہ اس نکتہ کو بیان کرنے والا کوئی طبیب ہے۔ انہوں نے وہ حصہ تو لے لیا جس کے بیان کرنے سے حضرت خلیفۂ اولؓ کی طرف اشارہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ حصہ ترک کر دیا جسکو بیان کرنے سے آپ کی طرف اشارہ ہو جاتا تھا۔ بیشک مولوی محمد علی صاحب نے یہ مضمون بیان کر کے لوگوں سے واہ واہ لے لی ہوگی اور وہ ہزاروں غیر احمدی جو اُنکی تفسیر میں اِس نکتہ کو پڑھتے ہونگے خیال کرتے ہونگے کہ مولوی محمد علی صاحب نے نہایت عجیب بات نکالی ہے مگر افسوس ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم کا یہ لطیف نکتہ نکال کر پیش کیا تھا اُسکا ذکر انہوں نے چھوڑ دیا اور اُس کی محنت کو اپنی طرف منسوب کر لیا پھر جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے وہ بھی مکمل مضمون نہیں بلکہ جیسا کہ مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں وہ حضرت خلیفۂ اولؓ کے مضمون کے اِس حصہ کو چھوڑ گئے ہیں کہ جسطرح طبیب حالات کی تبدیلی پر نسخہ تبدیل کر دیتا ہے اِسی طرح خدا تعالیٰ نے تین کی بجائے زیتون کا نسخہ لوگوں کو استعمال کرانا شروع کر دیا۔ یہ نکتہ نہایت ہی شاندار ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نئی شریعت کے نزول سے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسوی شریعت کو کالعدم قرار دے دیا اور اُس کی جگہ محمدی شریعت کو نازل کر دیا۔ اللہ تعالےٰ اِس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ کیا طبیب جب کسی مریض کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے تو ہمیشہ ایک ہی نسخہ رکھتا ہے؟ تم جانتے ہو کہ حالات کے بدلنے پر ہر سمجھدار طبیب نسخہ میں تبدیلی کر دیا کرتا ہے کبھی وہ تین استعمال کراتا ہے اور کبھی زیتون۔ کبھی ایک دوا استعمال کراتا ہے اور کبھی دوسری۔ جب روزانہ دنیا میں یہ نظارہ نظر آتا ہے اور تم جانتے ہو کہ کامل طبیب کی علامت یہی ہوتی ہے کہ وہ حالات کے مطابق نسخہ بدل دے تو تمہیں اللہ تعالےٰ کے اِس فعل سے کیوں تکلیف ہوئی اور کیوں تمہارے دل میں یہ اعتراض پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ اُس نے موسوی شریعت کی بجائے محمدی شریعت کیوں نازل کر دی ہے؟ غرض مولوی محمد علی صاحب نے حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کے معنے اوّل تو ادھورے نقل کئے ہیں۔ اور پھر آپ کا حوالہ دینے سے وہ کترا گئے ہیں حالانکہ دیانتداری کا تقاضا یہ تھا کہ جس شخص نے یہ معنے نکالے تھے اُس کا ذکر بھی کیا جاتا۔ مَیں نے حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ سے یہ بھی سُنا ہوا ہے کہ تین اور زیتون مسیحؑ کے لئے، طور موسیٰؑ کے لئے اور بلد الامین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے گویا ابن کثیر والے

مضمون کو بھی آپ پیش کیا کرتے تھے۔

سابق مفسرین کے بیان کردہ معنوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ علماء کو شروع سے ہی یہ خیال تھا کہ تین و زیتون مثالی رنگ میں استعمال ہوئے ہیں اور اس کی طرف اُن کی طبائع کا شدت سے رجحان پایا جاتا ہے۔ بیشک بعض نے تین اور زیتون سے ظاہری تین اور ظاہری زیتون ہی مراد لیا ہے مگر اکثر نے اِن الفاظ کو استعارہ قرار دیکر نئے معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ کسی نے اِس سے بیت المقدس مراد لیا ہے، کسی نے بلادِ فلسطین کسی نے مسجد اقصیٰ اور کسی نے مسجدِ نوح۔ گو یہ طریق جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے زبردستی کا ہے اور تاویلِ بعیدہ کا ایک وسیع دروازہ کھولدیتا ہے مگر جہاں تک اِن لوگوں کے معنوں کا تعلق ہے جو اس جگہ حذفِ مضاف کہتے ہیں اُن پر غیر معقولیت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اِس میں کوئی بعید بات نہیں کیونکہ یہ عربی کا عام قاعدہ ہے کہ کبھی حذفِ مضاف کرکے صرف مضاف الیہ کو بیان کر دیا جاتا ہے تو اسی رنگ میں اگر یہاں بھی تین اور زیتون کا استعمال ہو گیا ہو تو اِس میں حرج کی کونسی بات ہے۔ قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا وَ سْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (یوسف ع ۱۰) تو ہمارے متعلق گاؤں سے پُوچھ لے یا تو ہمارے متعلق گدھوں سے پُوچھ لے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ نہ گاؤں بولا کرتا ہے اور نہ گدھے کسی سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ دونوں باتیں ناممکن ہیں اور دونوں کو عقلی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا مگر قرآن کریم نے قریہ اور عیر سے ہی سوال کرنے کو کہا ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو یہاں قریہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد اهل القریه سے ہے یعنی بستی والے اور گو عیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد یہ ہے کہ گدھوں کے مالکوں سے پوچھ لو۔ اِسی طرح قرآن کریم میں اور بھی بہت سی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کثرت سے اِس محاورہ کو استعمال فرماتا ہے۔ ہاں ایسے مواقع پر قرائنِ قویہ کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر قرائن قویہ کے بغیر ایسے معنے کئے جائیں تو بیشک معقول و غیر معقول کے درمیان کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے۔ چنانچہ وَ سْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا میں یہ ایک نہایت کھلا قرینہ ہے کہ بستی کلام نہیں کیا کرتی یا گدھے بولا نہیں کرتے اور جب یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں تو اُن سے سوال کرنے کے بجز اس کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے کہ بستی سے تعلق رکھنے والے جو لوگ ہیں اُن سے دریافت کیا جائے یا گدھوں کے جو مالک ہیں اُن سے اصل حقیقت معلوم کی جائے۔ اِسی طرح اگر بعض لوگوں نے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کے یہ معنے لئے کہ اس سے مراد وہ علاقے ہیں جہاں تین اور زیتون دونوں کثرت سے ہوتی ہیں۔ تو اِس میں عجیب بات کونسی ہو گئی قرآن کریم اپنے کلام میں لازماً عربی محاورات اور عربی طریق گفتگو کو مدنظر رکھیگا۔ جب عربی زبان میں یہ عام قاعدہ ہے کہ کبھی حذفِ مضاف کرکے صرف مضاف الیہ بیان کر دیتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن کریم اس محاورہ کو استعمال نہ فرمائے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اِسجگہ قرینہ قویّہ کونسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اِسجگہ قرینہ اگلے دو الفاظ ہیں یعنی طور اور بلد الامین۔ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ طور ایک مقام ہے جو ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوا اور مکّہ بھی ایک مقام ہے جو ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوا پس جبکہ تین اور زیتون کے معطوف دو مقام ہیں جو ایک ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوئے تو عقل ضرور اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ تین و زیتون میں بھی کسی مقام کا نام ہوگا۔ یا کسی نہ کسی نبی سے تعلق رکھنے والی چیز ہوگی جس کی وجہ سے اُسے طور اور مکّہ کی طرح خدا تعالیٰ کی قدرت اور شوکت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے۔ اِسی طرح ابن کثیر والوں نے جو اس سوال کا جواب دیا ہے کہ ترتیب قرآنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے کیوں بیان کیا گیا ہے وہ ایک نہایت لطیف جواب ہے اور اُن کی نگاہ کی باریکی کی قدر کرنی پڑتی ہے مولوی محمد علی صاحب نے جو معنے کئے ہیں اُن کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ وہ درحقیقت حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے معنے ہیں جو انہوں نے چُرا کر اپنی طرف منسوب کرلئے ہیں لیکن بہر حال اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے معنے نہایت

لطیف ہیں کہ ایک قوم کو تین سے مشابہت دی گئی ہے اور دوسری کو زیتون سے اور بتایا گیا ہے کہ ایک وقت ہم نے تین کا نسخہ تجویز کیا تھا اور دوسرے وقت میں زیتون کا کیونکہ ہم کامل طبیب ہیں اور جیسی جیسی بیماری ہوتی ہے ویسا ہی اُس کا علاج کرتے ہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اِس سے زیادہ اِس جگہ یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تین مزے میں تو اچھی ہوتی ہے مگر وہ جلدی سڑ جاتی ہے اِس کے مقابل میں زیتون علاوہ اِس کے کہ پھل کا کام دیتا ہے اُس کا دہن کثرت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے جو اُس کو دیر تک قائم رکھتا ہے۔ گویا تین تو اپنی ذات میں بھی قائم نہیں رہ سکتی اور زیتون کے ساتھ دوسری چیزیں بھی قائم رکھی جاتی ہیں اور اِن دو مثالوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ موسوی تعلیم انجیر کی طرح سڑ جانے والی تھی اب ہم تمہیں وہ تعلیم دیں گے جو نہ صرف سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہے گی بلکہ انسانی ذہنوں میں ایک ایسا نور پیدا کر دیگی کہ اُس کے ذریعہ سے نئے سے نئے معارف اور نئے سے نئے علوم انہیں اس کتاب سے حاصل ہوتے رہیں گے۔ جیسے سورۂ نور میں زیتون کے تیل کی تعریف کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (نور ع۵) یہ تیل ایسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ خواہ آگ اِس کے قریب نہ لائی جائے تب بھی وہ خود بخود بھڑک اٹھتا ہے۔ ایسی اعلیٰ درجہ کی چیز کے ساتھ الٰہی کلام کو مشابہہ قرار دینے کے معنے یہی ہیں کہ وہ کلام جو اَب دنیا میں نازل کیا جائیگا نئے سے نئے علوم اور معارف کو دنیا میں قائم کرنیکا ایک ذریعہ ہوگا۔ اور جہالت اور معصیت کی تاریکیوں کو دُور کر دے گا۔

والتین والزیتون کی نئی تفسیر

اِن دونوں معنوں میں جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ترتیبِ طبعی پائی جاتی ہے ایک میں درجہ کے لحاظ سے اور ایک میں زمانہ کے لحاظ سے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ اِن مثالوں سے پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہایت معتدل القویٰ بنایا ہے۔ کیونکہ جب بھی خدا تعالیٰ کے نبی آئے آخر دنیا اُن کو مان گئی۔ اور وہ پہلے معنی جو مفسرین نے بائیبل کی اِس پیشگوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے کئے ہیں کہ "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہُوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہُوا" (استثناء باب ۳۳ آیت ۲) اور یہ سمجھ لو کہ یہی پیشگوئی اِس جگہ بیان کی گئی ہے۔ تو اس لحاظ سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے یہ معنے ہونگے کہ اِن میں سے جس نبی کو بھی دیکھ لو تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخر وہی فتحیاب ہوا۔ بیشک دنیا نے اُن کی مخالفت کی، اُن کو مٹانے کے لئے اُس نے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کیں مگر آخر اُن کی تعلیم کو ماننے پر مجبور ہو گئی۔ اِس سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ ہم نے انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی تقویم میں پیدا کیا ہے۔ موسیٰؑ آئے تو ہم نے انہیں فتح دی۔ عیسیٰؑ آئے تو ہم نے انہیں فتح دی۔ اَب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے مگر ایک دن تمہیں اس کی تعلیم کے سامنے اپنے سر کو جھکانا پڑے گا اور اس طرح ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم پیدا کیا ہے۔

غرض حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے معنے بھی بڑے لطیف ہیں اور پُرانے مفسرین کے بعض معنے بھی بہت اچھے ہیں مگر میں نے اس سورۃ پر مزید غور کیا کہ کیا ایسے لطیف اور واضح معنوں کے ہوتے ہوئے پھر کوئی اور معنے بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ جب میں نے غور کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اِن آیات کا ایک نیا علم بخشا۔ اُس کے لحاظ سے یہاں نہ دو زمانوں کا ذکر ہے نہ تین کا بلکہ چار زمانوں کی خبر دی گئی ہے اور اس طرح ایک نہایت ہی لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے جو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے ساتھ گہرے طور پر تعلق رکھتا ہے۔ بیشک اگر ہم موسیٰؑ کی مثال لے لیں یا عیسیٰؑ کی مثال لے لیں یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مثال لے لیں تب بھی یہ آیت اپنے معانی کے لحاظ سے پوری طرح چسپاں ہو جاتی ہے مگر اِس صورت میں انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کرنے کی مثال زمانہ کے صرف ایک جزو کے ساتھ تعلق رکھیگی۔ کامل مثال تب ثابت ہوتی ہے جب ساری دنیا پر مجموعی لحاظ سے نظر ڈالنے کے بعد

یہ نتیجہ پیدا ہو کہ انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے اگر ساری دنیا پر مجموعی نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ تو اس صورت میں یقیناً یہ پہلے سے زیادہ زبردست دلیل بن جائیگی اور قرآن کریم کے حسن اور اُس کی شان کو دوبالا کر دیگی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سورۃ سے پہلے کی چند سورتوں میں ہجرت کا ذکر چلا آتا ہے۔ چنانچہ پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ تمہیں ہجرت کرنی پڑیگی پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ہجرت کس طرح ہوگی اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد تمہیں کس طرح غلبہ حاصل ہوگا۔ کفار کیونکر مغلوب ہونگے اور اسلام کو کس طرح شوکت اور عظمت حاصل ہوگی۔ یہ مضمون سورۂ فجر سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد کی ہر سورۃ میں اشارۃً یا وضاحتاً کسی نہ کسی رنگ میں ہجرت کا ذکر چلا آتا ہے۔ ہجرت کا پہلا اثر انسان کی طبیعت پر یہ ہوتا ہے کہ ہار گئے، بھاگ گئے، شکست کھا گئے۔ جب بھی ہجرت کا ذکر کیا جائے گا۔ دشمن تالیاں پیٹنے لگ جائیگا کہ لو اب بھاگنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج تو ہم یہاں سے جا رہے ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر فتح حاصل کرکے واپس آئیں گے۔ تب بھی دشمن حقارت کی ہنسی ہنستا ہے اور کہتا ہے فتح کو تو میں نہیں مانتا مگر اتنا تو تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ اِس وقت تم میرے مقابلہ سے بھاگ رہے ہو۔

غرض ہجرت پر شیطان کو ایک خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بظاہر شیطان جیت جاتا ہے اور نبی ہار جاتا ہے گویا شیطان کی فتح کی ایک ظاہری علامت قائم ہو جاتی ہے اور کمزور دل یہ ڈر جاتے ہیں کہ کیا اِس کے نتیجہ میں اب یہ سلسلہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا مدعی ہے تباہ تو نہ ہو جائے گا۔ اسکا بانی تو کہتا تھا کہ ہم جیت جائیں گے اور دشمن ہار جائیگا مگر ہوا یہ کہ خود ہی دشمن سے ڈر کر بھاگ رہا ہے۔ پس چونکہ ہجرت پر شیطان کو ایک ظاہری فتح حاصل ہوتی ہے اور کمزور ایمان والوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ہجرت کی چار مثالیں بیان فرمائی ہیں اور بتایا کہ اس سے پہلے شیطان نے تین دفعہ بظاہر خدا تعالیٰ کے نبیوں کو شکست دی تھی اور اُن کو دق کرکے اُن کے وطن سے نکال دیا تھا مگر آخر نتیجہ کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی پردہ پوشی فرمائی اور اُن کی شکست کو فتح میں بدل دیا۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ تم ہمارے رسول کو اسقدر تکالیف پہنچاؤگے کہ آخر وہ مکّہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جائیگا اور تم خوش ہوگے کہ تم نے اسے شکست دے دی اور اسے اپنے شہر میں سے نکال دیا۔ مگر یاد رکھو آخر تم کو ہی ذلیل ہونا پڑیگا۔ چنانچہ ہم تمہارے سامنے تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ تینوں دفعہ شیطان نے خدا تعالیٰ کے نبیوں کو نکالا مگر تینوں دفعہ شیطان نے مونہہ کی کھائی۔ اور اُن انبیاء کا اپنے وطن سے نکلنا ہی دشمن کی تباہی کا موجب بنگیا۔

آنحضرت صلعم کی فتح کے یقینی ہونے کی پہلی دلیل۔

پہلی مثال آدمؑ کی ہے۔ آدم کو بظاہر شیطان سے شکست ہوئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک درخت کے پاس جانے سے انہیں منع کیا تھا جس کے پاس وہ شیطان کے بہکانے کے نتیجہ میں چلے گئے اور انہیں کئی قسم کی تکالیف میں مبتلا ہونا پڑا اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوْجِکَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّۃِ فَتَشْقٰی اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی فَوَسْوَسَ اِلَیْہِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ ھَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الْخُلْدِ وَمُلْکٍ لَّا یَبْلٰی فَاَکَلَا مِنْھَا فَبَدَتْ لَھُمَا سَوْاٰتُھُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ وَھَدٰی (طٰہٰ ع ۷) یعنی ہم نے آدم کو جنت میں رکھا تو شیطان اُن کا مدمقابل بن کر کھڑا ہو گیا۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا۔ اے آدم یہ تیرا دشمن ہے اور تیری بیوی یا تیرے ساتھیوں کا بھی دشمن ہے۔ ایسا نہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکال دے اور تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔ تیرے لئے خدا کا فیصلہ یہی ہے کہ تو اِس جنت میں نہ بھوکا رہے نہ ننگا نہ پیاسا رہے اور نہ گرمی کی تکلیف تجھے ستائے۔ جب

شیطان کا حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ دینا۔ [109]

خدانے یہ کہا تو شیطان کو اور غصہ چڑھا کہ اچھا میرے مقابلہ میں اب اِس کے غلبہ اور کامیابی کی خبریں دی جا رہی ہیں۔ چنانچہ شیطان نے اپنا بھیس بدلا اور اُس نے آدم کے پاس آکر کہا۔ کیا مَیں آپ کو ایک ایسے درخت کا پتہ دوں جس کا پھل کھانے سے آپ کو دائمی حیات حاصل ہو سکتی ہے اور ایسی حکومت کا آپکو پتہ دوں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ جب اِس طرح کی چکنی چپڑی باتیں اُس نے کیں تو دھوکہ کھا جانے کی وجہ سے آدم اور اُسکی جماعت نے یا آدم اور اُس کی بیوی نے اُس درخت کا پھل کھا لیا اور چونکہ آدم کا یہ فعل خدائی منشاء کے خلاف تھا اسلئے یکدم اُس فعل کے بُرے نتائج ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور آدم کی آنکھیں کھل گئیں کہ اُس نے خدائی منشاء کی خلاف ورزی کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اُس نے سمجھا تھا کہ یہ کامیابی حاصل کرنے کا طریق ہے۔ مگر ہُوا یہ کہ دشمن کی بات مان کر اُسکی مشکلات اور بھی بڑھ گئیں اور وہ فتوحات جو اُسے پہلے حاصل ہو رہی تھیں اُن میں یکدم روک پیدا ہو گئی

شیطان نے آدم کو ورغلانے کا یہی ڈھنگ نکالا تھا کہ آپس کے تعلقات سے بہت فائدہ ہوگا۔ رشتہ داری کے تعلقات بڑھ جائیں گے۔ دوستانہ تعلقات بڑھ جائیں گے۔ محبت اور پیار کے تعلقات بڑھ جائیں گے اور اس طرح بہت جلد ترقی حاصل ہو جائیگی پھر اُس نے کہا آخر خدا کا بھی تو یہی منشاء ہے کہ تمہیں ترقی حاصل ہو اگر ایک دوسرے سے مل کر اور آپس کی مغائرت کو دُور کر کے یہ ترقی حاصل ہو جائے تو خدا کو کب ناپسند ہوگی۔ اُس کو تو بہرحال یہ بات اچھی لگے گی۔ آدم اُس کے دھوکہ میں آ گئے اور انہوں نے دشمن سے صلح کر لی۔ صلح کرنے کی دیر تھی کہ یکدم اُن کی فتوحات رُک گئیں کامیابیاں جاتی رہیں اور اِس باہمی میل جول کے بد نتائج ظاہر ہونے شروع ہو گئے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا کہ درخت کا پھل کھانے سے اُن کا ننگ ظاہر ہونا شروع ہو گیا اور اس فعل کے بُرے نتائج اُن پر روشن ہو گئے۔ جب آدم کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور انہیں معلوم ہُوا کہ شیطان کی طرف صلح اور محبت کا ہاتھ بڑھا کر

انجیر بمعہ پتوں سے مراد صلحاء کی جماعت [2]

انہوں نے خطرناک غلطی کی ہے تو اِس غلطی کے ازالہ کے لئے طَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ انہوں نے جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى اور آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی تھی جس سے وہ تکلیف میں مبتلا ہُوا۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ مگر پھر خدا نے اُسے بزرگی دے دی اور اُس نے ورق الجنۃ سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا اور خدا تعالیٰ نے اُسے وہ راستہ دکھا دیا جو اُسے اور اُس کی جماعت کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانیوالا تھا۔ اَب دیکھو یہاں شیطان نے آدم کو دھوکا دیکر بظاہر اُسے شکست دے دی تھی مگر آدم نے فوراً ورق الجنۃ سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا اُس کی شکست فتح سے بدل گئی اور آخر آدم ہی کامیاب رہا۔ ورق کے معنے زینت کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ لغت میں لکھا ہے۔ اَلْوَرَقُ: جَمَالُ الدُّنْيَا وَبَهْجَتُهَا کہ دنیا کی خوبصورتی اور اُس کے حسن کو ورق کہتے ہیں۔ اِسی طرح ورق کے معنے نسل کے بھی ہیں۔ چنانچہ عربی زبان کا محاورہ ہے اَنْتَ طَيِّبُ الْوَرَقِ اور اِس محاورہ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تُو طَيِّبُ النَّسْلِ ہے اِن دونوں محاوروں کے لحاظ سے طَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ کے معنے یہ ہوئے کہ آدم نے جنت کی زینت اور جمال سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا اور جنت کا جمال اُس کے مومن ساکنین ہوتے ہیں۔ اِسی طرح دوسرے معنوں کی رُو سے اِس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ آدم نے پاکیزہ نسل کے ذریعہ سے شیطانی فریب کا ازالہ کرنا شروع کیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اَب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَرَقِ الْجَنَّةِ کا تعلق انجیر سے کیا ہُوا۔ ہر ایک درخت کے پتے ورق الجنۃ کہلا سکتے ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اوّل ہم علم تعبیر الرؤیا کو دیکھتے ہیں تو اُس میں لکھا ہے کہ اَلتِّيْنُ فِي الْمَنَامِ يُفَسَّرُ بِالصُّلَحَاءِ وَ خِيَارِ النَّاسِ یعنی جب کوئی شخص رؤیا یا کشف کی حالت میں انجیر کا درخت دیکھے تو اُس کے معنے صالح اور نیک لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یہی ورق الجنۃ کے معنے تھے کیونکہ ورق پاکیزہ نسل کو کہتے ہیں۔ اور ورق الجنۃ کے معنے تھے جنت کی پاکیزہ نسل۔

اور جنتی نسل صُلحاء اور مومن لوگ ہی ہوتے ہیں پس وَرَقِ الْجَنَّۃ کا ترجمہ تعبیر الرؤیا کے مطابق انجیر کے پتے ہُوا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا آدم کے واقعہ کے ساتھ خصوصیت سے انجیر کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اِس غرض کے لئے جب ہم بائیبل کو دیکھتے ہیں تو اُس میں یہ لکھا ہُوا پاتے ہیں:-

"اور سانپ میدان کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند خدا نے بنایا تھا ہوشیار تھا۔ اور اُس نے عورت سے کہا کیا یہ سچ ہے کہ خدا نے کہا کہ باغ کے ہر درخت سے نہ کھانا۔ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل ہم تو کھاتے ہیں مگر اُس درخت کے پھل کو جو باغ کے بیچوں بیچ ہے خدا نے کہا کہ تم اُس سے نہ کھانا اور نہ اُسے چھونا ایسا نہ ہو کہ مر جاؤ۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن اُس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے ہو گے۔ اور عورت نے جوں دیکھا کہ وہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے، تو اُس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا اور اُس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں معلوم ہُوا کہ ہم ننگے ہیں۔ اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کے اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔" (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۷)

یعنی جب شیطان نے آدم کو جنت میں سے نکالنے کا سامان کیا تو آدم نے وَرَقِ الْجَنَّۃ کو اپنے ساتھ لپیٹ لیا اور اِس طرح وہ ننگ جو ظاہر ہو گیا تھا اُس کو ڈھانک لیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ وَرَقِ الْجَنَّۃ تعبیر رؤیا کے مطابق انجیر کے پتوں کو کہتے ہیں اور جیسا کہ انجیر کے معنے صلحاء اور پاک طینت لوگوں کے ہیں اِسی طرح ورق الجنّۃ کے معنے بھی جنتی نسل کے ہیں اور جنتی نسل وہی ہوتی ہے جو صلحاء اور پاک لوگوں پر مشتمل ہو۔ بہر حال قرآن اور بائیبل دونوں اِس امر پر متفق ہیں کہ شیطان جب آدم کو دھوکا دینے میں کامیاب ہُوا تو آدم نے انجیر کے پتوں کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ یعنی جب شیطان نے اُن کو دھوکا دیا اور صلح کے نام پر آدم کو اپنے ساتھ ملا کر خدائی سکیم کو ناکام کرنا چاہا تو آدم کو یکدم اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے مومنوں کی جماعت کو اپنے ساتھ ملا کر شیطانی تدابیر کو ناکام کر دیا۔ شیطان نے تو چاہا تھا کہ اِس ذریعہ سے وہ آدم کو شکست دیدے مگر بجائے اِس کے کہ آدم کا یہ فعل اُن کیلئے کسی نقصان یا خرابی کا موجب ہوتا اُن کے اندر ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی اور وہ ترقی کے میدان میں اور بھی آگے نکل گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف رجوع برحمت فرمایا اور انہیں پہلے سے بھی زیادہ ترقی دیدی۔ جیسے احرار نے ۱۹۳۴ء میں جماعت احمدیہ کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ اٹھایا اور اِس لئے اٹھایا کہ وہ جماعت احمدیہ کو کچل کر رکھدیں مگر یہی فتنہ ایسی بیداری اور حرکت پیدا کرنیکا موجب بن گیا کہ ہماری جماعت پہلے سے کئی گنا ترقی کر گئی۔ اِسی طرح شیطان نے آدم اور اُس کی جماعت کی تباہی کے لئے جو تدبیر اختیار کی تھی اللہ تعالیٰ نے اُس کی خرابیاں اتنی جلدی آدم پر ظاہر کر دیں کہ اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے یکدم ورق الجنّۃ کو سمیٹ لیا اور دشمن کے سامنے اعلان کر دیا کہ ہمارا تمہارے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تم صلح اور آشتی کے نام پر ہمیں اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے ہمارا راستہ خدا نے اَور مقرر کیا ہے اور تمہارا راستہ اَور ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہماری جماعت مداہنت سے کام لے اور تمہاری ہاں میں ہاں ملاتی چلی جائے۔ چنانچہ اِس واقعہ کے بعد خدا نے ہمیشہ کے لئے یہ قانون مقرر کر دیا کہ مومنوں کی جماعت کفار سے ہمیشہ علیحدہ رہے گی جب تک شیطان نے یہ فعل نہیں کیا تھا اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اتنی ہدایت تھی کہ شیطان کے دھوکہ میں نہ آنا مگر آدمؑ کے اِس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے یہ رسم قائم کر دی کہ انبیاء کی جماعتوں کو شیطانی لوگوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ بعض احکام ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر نئے دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ نئے نہیں ہوتے۔ مثلاً ہماری جماعت کے افراد کو یہ حکم ہے کہ وہ

غیروں کے پیچھے نمازیں نہ پڑھیں۔ اُن کو رشتے نہ دیں۔ اُن کے جنازے نہ پڑھیں۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسے سخت احکام جماعت کو کیوں دئے جاتے ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ احکام نئے نہیں بلکہ وہی ہیں جن کا آدم کے وقت سے آغاز ہو چکا ہے جب تک شیطان نے آدم کو دھوکا نہیں دیا اُس وقت تک اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ احکام نازل نہیں ہوئے۔ مگر جب شیطان ایک دفعہ آدم کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ کے لئے یہ قانون مقرر کر دیا کہ الٰہی جماعتوں کو اپنے مخالفوں سے علیحدہ رہنا چاہئیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی جو دنیا میں آیا اُس نے اپنی جماعت کو دوسروں سے علیحدہ رکھا ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی نبی آیا ہو اور اُس نے اپنی جماعت کو یہ اجازت دیدی ہو کہ وہ غیروں سے مل جل کر رہے۔ غرض شیطان نے آدم کو جنت سے نکالنے کا سامان کیا اور آدم کو جنت سے ہجرت کرنی پڑی مگر اُس کے بعد خدا نے جو اُسے تین نصیب کی وہ اُسے اِسقدر کامیاب کرنیوالی ثابت ہوئی کہ آج دنیا میں ابلیس کو ماننے والا تو کوئی نظر نہیں آسکتا مگر آدم کو ماننے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

۱۰۴ حضرت آدم علیہ السلام کی شیطان کے مقابل پر فتح۔

اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ آدم کا ننگ انجیر کے پتوں سے ڈھانکا گیا تھا جو درحقیقت تمثیلی زبان میں ایک الہام تھا جسے یہود نے سمجھا نہیں اور فی الواقعہ ننگا ہونا اور انجیر کے پتوں سے ڈھانکنا سمجھ لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک درخت سے یعنی اُسی سانپ سے اور اُس کے ساتھیوں سے تعلق رکھنے سے منع فرمایا جو جنات میں سے تھا (سانپ زیرِ زمین رہتا ہے اور یہ شخص بھی کیونکہ CAVEMAN تھا یعنی زیرِ زمین رہنے والا) اُس نے آکر دھوکا دیا کہ ہمارا پھل کھانے سے یعنی ہمارے ساتھ تعلقات پیدا کرنے سے فائدہ ہی ہے اور خدا تعالےٰ کا بھی تو اصل منشاء تم کو فائدہ پہنچانا ہے اب ہم جو صلح کر کے ملتے ہیں تو وہ مقصد بدرجۂ اتم پورا ہو جائیگا۔ آدم اُس کے فریب میں آگئے۔ اُن لوگوں سے تعلقات پیدا کئے اور نقصان اُٹھایا۔ تب اللہ تعالےٰ سے ہدایت پاکر آپ نے انجیر کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا یعنی مومنوں کو اپنے گرد جمع کرنے لگے اور کفار سے قطع تعلق کر لیا۔ اِس طرح جنت سے نکلنے کی جو تکلیف پہنچی تھی یعنی آپ کو جو ہجرت کرنی پڑی تھی اُس کا ازالہ ہو گیا۔ بظاہر شیطان کی فتح ہوئی مگر دراصل آدم کی ہوئی۔ کیونکہ اُس کو قومی تنظیم کا خاص خیال پیدا ہو گیا اور بجائے گرنے کے ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى کے سامان پیدا ہو گئے۔ پس فرمایا کہ ایک تو تین کے واقعہ کو لو کہ شیطان نے آدم کو دھوکا دیا۔ اور اُس کے نتیجہ میں آدم کو ہجرت کرنی پڑی اور جس ارضی جنت میں وہ رہتے تھے اُسے چھوڑنا پڑا مگر اسی ہجرت کے نتیجہ میں ایک مومنوں کی جماعت آدم کے گرد جمع ہو گئی اور اُن کی مدد سے آدم نے شیطان کی تدبیر کو پاش پاش کر کے رکھدیا۔ اے مکّہ والو اب تم بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی کرنے والے ہو مگر یاد رکھو اب بھی وہی ہوگا جو آدم کے وقت میں ہوا تھا۔ تین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقص کو ڈھانپ دیگی اور ہجرت ہی کے نتیجہ میں ایک صلحاء کی جماعت آپ کے گرد جمع ہو جائے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالےٰ نے خود فرمایا کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ اِسی طرح آدم کے متعلق تو اللہ تعالےٰ نے یہ فرمایا ہے کہ آدم نے تین کے پتوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کیا اور اِس طرح اپنے ننگ کو ڈھانکا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت تین کے پتے خود بخود آپ کی طرف بڑھے اور جنگ بدر کے وقت انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم موسیٰ کے اُن ساتھیوں کی طرح نہیں جنہوں نے یہ کہدیا تھا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمن سے لڑتے پھرو۔ بلکہ یا رسول اللہ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑینگے آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گذرے۔ یہ کتنا بڑا فرق ہے جو آدمِ اوّل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں پایا جاتا ہے۔ آدم کو تو خود اپنی

جلد جلد سے تین کے پتے اپنے اردگرد لپٹانے پڑے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا درجہ چونکہ آدمؑ سے بہت بلند تھا اسلئے آپ سے تین کے پتے خود بخود چمٹنے لگ گئے۔ پس فرمایا کیا تم سمجھتے ہو کہ ہجرت کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شکست کھا جائیں گے اور تم فتح حاصل کر لوگے۔ پہلے بھی ایسا کئی بار ہو چکا ہے کہ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو شکست دینی چاہی مگر ہمیشہ اُس نے مونہہ کی کھائی۔ چنانچہ آدم کی مثال تمہارے سامنے ہے شیطان نے اُسے جنّت سے نکالا اور وہ چلا گیا مگر آخر کیا ہُوا۔ وہی ہجرت اُس کی کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔ اور اُس نے تین کے پتے اپنے اردگرد لپٹا کر دشمن کو اُس کی تدابیر میں ناکام کر دیا۔ اِسی طرح اب بھی تم سمجھو گے کہ ہم کامیاب ہو گئے ہم نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مکّہ میں سے نکال دیا۔ مگر آخر یہی ہجرت تمہاری تباہی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا ذریعہ ہوگی اور اِسطرح ثابت ہو جائیگا کہ خدا نے انسان کو چھوڑنے کے لئے نہیں بنایا بلکہ ترقی کرنے کیلئے بنایا ہے

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالزَّیْتُوْنِ دوسری مثال ہم زیتون کی دیتے ہیں۔ زیتون کی مثال نوحؑ کا واقعہ ہے نوحؑ کو اس کی قوم نے سخت تنگ کیا اور آخر ایک عذابِ عظیم آیا جس کی وجہ سے نوحؑ کی قوم تباہ ہوئی اور نوحؑ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّھُمْ مُّغْرَقُوْنَ۔ وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ۔ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ وَهِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰی نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ۔ قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ۔ وَقِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (ھود ع۴) یعنی نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو پہلے ایمان لا چکے ہیں اُن کے سوا اور کوئی لوگ ایمان نہیں لائیں گے پس تو اُن کے فعل پر غمگین مت ہو اور اِس بات کا کچھ خیال نہ کر کہ وہ تجھ پر کیوں ایمان نہیں لاتے۔ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے حکم اور وحی سے ایک کشتی بنا اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے خطاب کرنا چھوڑ دے کیونکہ اُنکے متعلق الٰہی فیصلہ یہ ہے کہ وہ غرق کئے جائینگے۔ نوحؑ نے ہمارے اس حکم کے مطابق کشتی بنانی شروع کر دی۔ لوگ وہاں سے گذرتے تو ہنسی اور مذاق کرتے کہ دیکھو خشکی میں کشتی چلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ حضرت نوحؑ اُن کو جواب میں کہتے کہ تم بیشک ہنسی کر لو ایک دن آئیگا جب اللہ تعالےٰ تم کو تباہ کر دیگا اور تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ کس پر رسوا کرنیوالا اور قائم رہنے والا عذاب نازل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا حکم نازل ہو گیا اور تنور جوش میں آگیا ہم نے نوحؑ سے کہا کہ ہر قسم کے جوڑے اپنی اِس کشتی میں رکھ لے اِسی طرح اپنے اہل کو بھی بٹھا لے سوائے اُن کے جن کے متعلق عذاب کی خبر دی جا چکی ہے اور مومن بندوں کو بھی سوار کر لے۔ اور اُس پر ایمان نہیں لائے تھے مگر بہت تھوڑے لوگ۔ اُس نے سب سے کہا کہ اِس کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ اللہ کے نام سے ہے اِس کا چلنا بھی اور اِس کا ٹھیرنا بھی۔ میرا رب یقیناً بخشنے والا اور مہربان ہے۔ جب طوفان آیا اور پہاڑوں جیسی لہروں میں کشتی چلنے لگی اُس وقت نوحؑ نے اپنے بیٹے سے جو علیحدہ تھا کہا کہ اِسے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ

زیتون کی شہادت سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت کا واقعہ ہے

اور کافروں سے مت ملو۔

دیکھو یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ اُس وقت ہجرت کرکے اپنے وطن کو چھوڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی تحریک کی کہ ہمارے ساتھ آجاؤ اور اپنے وطن کو چھوڑ دو۔ مگر اُس نے جواب دیا کہ مجھے اپنا وطن چھوڑنے کی ضرورت نہیں آپ بیشک چلے جائیں میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ یعنی تُو اگر وطن چھوڑنا چاہتا ہے تو بے شک چھوڑ دے مَیں اپنا وطن چھوڑنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ حضرت نوحؑ نے کہا آج خدا کے عذاب سے وہی بچ سکتا ہے جس پر وہ خود رحم کرے اور کوئی شخص اپنی تدبیر کے زور سے اِس ہلاکت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اتنے میں ایک لہر اٹھی اور اُن کا لڑکا غرق ہوگیا۔ پھر خدا نے کہا۔ اے زمین تو اپنا پانی پی لے اور اے آسمان تو بھی اپنا پانی روک لے چنانچہ پانی تھم گیا اور نوحؑ کی کشتی جودی مقام پر ٹھیر گئی۔ اُس وقت کہا گیا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ظالموں کی قوم دُور ہوگئی۔ یا اب تمہارے اور اُن کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہوگیا ہے۔

ہجرت کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا جودی پہاڑ پر ٹھیرنا اور دشمنوں کے مقابل پر کامیاب ہونا

اب دیکھو یہ بھی ایک ہجرت تھی جو نوحؑ نے کی۔ نوحؑ اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر اُن کے بیٹے نے اُن کا ساتھ نہ دیا بلکہ اُن کی تحریک پر جب اُس نے کہا کہ مَیں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا تو اُسکے معنے بھی یہی تھے کہ نوحؑ کی قوم سمجھتی تھی کہ ہم تباہ نہیں ہونگے۔ یہ چلا جائیگا اور ہم پہاڑوں میں امن سے رہیں گے اور شکر کریں گے کہ ہمارے سر سے یہ بلا ٹلی۔ مگر ہُوا یہ کہ نوحؑ بچ گیا اور وہ قوم جو نوحؑ کی ہجرت میں اپنی کامیابی سمجھتی تھی تباہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ اِس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زیتون کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے آدم کا واقعہ تو تم نے سُن لیا۔ اب تم نوحؑ کے واقعہ پر غور کرو۔ یہاں بھی نوحؑ کو دشمنوں کی وجہ سے ملک چھوڑنا پڑا مگر اس ہجرت کے نتیجہ میں بھی کفار ہی تباہ ہوئے اور نوحؑ اور اُن کی قوم کو زیتون کی شاخ ملی یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے صلح کا پیغام اور ایک ایسی جماعت جو عُرْوَةِ الْوُثْقٰى کو پکڑنیوالی تھی یعنی ایمان میں مضبوط اور قربانی میں کامل۔ چنانچہ پیدائش باب ۸ میں نوحؑ کے واقعہ کے ساتھ زیتون کا بھی ذکر ہے۔ بائیبل میں لکھا ہے:

"پھر خدا نے نوح کو اور سب جانداروں اور سب مواشیوں کو جو اُس کے ساتھ کشتی میں تھے یاد کیا اور خدا نے زمین پر ایک ہوا چلائی اور پانی ٹھیر گیا اور گہراؤ کے سوتے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہوئیں۔ اور آسمان سے مینہہ تھم گیا اور پانی زمین پر سے رفتہ رفتہ گھٹتا جاتا تھا اور ڈیڑھ سو دن کے بعد کم ہُوا اور ساتویں مہینہ کی سترھویں تاریخ کو اراراط کے پہاڑوں پر کشتی ٹک گئی اور پانی دسویں مہینہ تک گھٹتا جاتا تھا اور دسویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں اور چالیس دن کے بعد یوں ہُوا کہ نوح نے کشتی کی کھڑکی جو اُس نے بنائی تھی کھول دی اور اُس نے ایک کوّے کو اڑا دیا۔ سو وہ نکلا اور جب تک کہ زمین پر سے پانی سُوکھ نہ گیا آیا جایا کرتا تھا۔ پھر اُس نے ایک کبوتری اپنے پاس سے اُڑا دی کہ دیکھے کہ زمین پر پانی گھٹا یا نہیں۔ پر کبوتری نے پنجہ ٹیکنے کی جگہ نہ پائی اور اُس کے پاس کشتی میں پھر آئی کیونکہ تمام روئے زمین پر پانی تھا۔ تب اُس نے ہاتھ بڑھا کے اُسے لے لیا اور اپنے پاس کشتی میں رکھا پھر اُس نے اور سات دن صبر کیا تب اُس کبوتری کو پھر کشتی سے اُڑا دیا اور وہ کبوتری شام کے وقت اُس کے پاس پھر آئی اور دیکھو زیتون کی ایک تازہ پتی اُس کے مونہہ میں تھی۔ تب نوح نے معلوم کیا کہ اب پانی زمین پر کم ہُوا اور وہ اور بھی سات دن ٹھیرا بعد اس کے پھر اس کبوتری کو اڑا دیا وہ اُس کے پاس پھر کبھی نہ آئی۔"

غرض نوحؑ کو جس چیز نے یہ بشارت دی تھی کہ تیری ہجرت کامیاب ہوگئی ہے تو جیت گیا اور تیرے دشمن ہمیشہ کے لئے مغلوب ہوگئے ہیں وہ زیتون کی پتّی تھی اور آدم کو جس چیز نے یہ بتایا کہ تُو کامیاب ہوگیا ہے وہ انجیر کے پتّے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے

انہی دو واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ۔ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ کہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ آدم ہمارا پہلا نبی تھا جس کو شیطان نے جنت سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا مگر وہ ہجرت آدم کو نقصان پہنچانے کا موجب نہیں ہوئی، وہ ہجرت مومنوں کو ناکام کرنے کا موجب نہیں ہوئی۔ بیشک آدم نے ہجرت کی مگر آخر آدم ہی جیتا اور شیطان ناکام ہوا۔ اسی طرح اے مکہ والو! آج تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں سے نکالنا چاہتے ہو۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر تم اپنے افعال میں اُس شیطان کے مثیل ہو جس نے آدم کو جنت میں سے نکالا تھا تو ہمارا یہ رسول آدم ہے جسے ہم نے ایک نئی روحانی مخلوق پیدا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے تم اُسے آدم کی طرح ہجرت کرنے پر مجبور کردگے۔ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے آدم کی طرح اِسے بھی تین کے پتے مل جائیں گے یعنی علمی اور پاک طینت لوگوں کی ایک جماعت اِسے عطا کی جائے گی جو اِس کی قدر و منزلت کو سمجھتے ہوئے ہر قسم کی قربانیاں اِس کے لئے کریگی۔ اور اگر تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح ہو تب بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بیشک نوحؑ نے ہجرت کی مگر خدا نے اس کے دشمنوں کو غرق کر دیا اور اُسے زیتون کے پتے کے ذریعہ نجات کی بشارت دی اِسی طرح بیشک تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں سے نکال دو تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح غرق کئے جاؤگے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھیرے گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے زیتون کی شاخ عطا کی جائیگی۔ مدینہ کیا تھا؟ وہ جودی تھی جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کشتی ٹھیری۔ اور مدینہ کے انصار کیا تھے؟ وہ زیتون کے پتے تھے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے چنانچہ تعطیر الانام میں لکھا ہے۔ مَنْ رَاٰی وَرَقَ الزَّیْتُوْنَ فِی الْمَنَامِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی اگر کوئی شخص خواب میں زیتون کے پتے دیکھے تو اُس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اُس نے ایک نہ ٹوٹنے والا کڑا مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ پس زیتون کا عطا کیا جانا یہ معنے رکھتا تھا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے آپ کو ایک ایسی جماعت دی جائیگی جو عروۃ الوثقیٰ کو پکڑنے والی ہوگی وہ ایمان میں مضبوط ہوگی وہ قربانی میں کامل ہوگی وہ اطاعت میں حدِ کمال تک پہنچی ہوئی ہوگی اور کسی قسم کی تکلیف اُس کے پائے ثبات میں جنبش پیدا نہ کرے گی۔ درحقیقت عروۂ وثقیٰ کو مضبوطی سے پکڑ لینا ایمان باللہ کا ایک طبعی نتیجہ ہوتا ہے وہ شخص جس کے دل میں سچے طور پر ایمان پایا جاتا ہے وہ الٰہی تعلیم کو ایسی مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے طوفان اور زلازل بھی اُس کو اِدھر اُدھر نہیں کر سکتے۔ وہ میدان کا بہادر اور جرأت و استقلال کا پیکر ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کی موت کو اختیار کرنا لذیذ ترین نعمت سمجھتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تین کا واقعہ بھی تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اور زیتون کا واقعہ بھی تمہیں یاد دلاتے ہیں دونوں جگہ ہجرت ہوئی مگر دونوں جگہ شیطان کو ناکامی ہوئی آدمؑ نے ہجرت کی مگر آخر آدمؑ ہی دشمن پر کامیاب ہوا۔ نوحؑ نے ہجرت کی مگر آخر نوحؑ ہی دشمن پر کامیاب ہوا۔ نوحؑ کے بعد وہ ملک جس میں آپ رہتے تھے پھر بسا نہیں بلکہ تباہ ہوگیا۔ اسیطرح محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد تم تباہ کر دئے جاؤگے تمہارے لئے شیطان کی طرح ہر طرف لعنت اور پھٹکار ہوگی اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تین کے پتے ہونگے جو اُسے عطا کئے جائیں گے۔ تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح غرق کئے جاؤگے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مدینہ کے لوگ اپنے ہاتھوں میں زیتون کی پتیاں لئے آگے بڑھیں گے اور کہیں گے یا رسول اللہ ہمارے ہاں تشریف لائیے ہم آپ کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے اور آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کیلئے تیار ہیں۔

غرض اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ زیتون کی ٹہنی تمہیں یاد ہے جو نوحؑ کو ہجرت کے بعد ملی تھی؟ کچھ خبر بھی ہے؟ وہی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تیار ہو رہی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ جب ہم نے انسان کی فطرت کو نیک بنایا ہے تو وہ دیر تک نیکی سے محروم نہیں رہ سکتا۔

زیتون کے بعد طُوْرِ سِیْنِیْنَ کی قسم کھائی گئی ہے یعنی

طورِ سینین سے مراد

اِسے بھی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سِیْنِیْن کیا چیز ہے؟ اِس کے متعلق یاد رکھنا چاہئیے کہ سینین ایک علاقہ ہے جو دشتِ سینا کہلاتا ہے اِس سے مسلمانوں کو بھی دلچسپی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اِس کا ذکر آتا ہے اور یورپین مصنّفین کو بھی دلچسپی ہے کیونکہ بائیبل میں اِس کا ذکر آتا ہے لیکن یہ سوال کہ سینا اور طورِ سینا کہاں ہے؟ اِس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں بعض مؤرخین کے نزدیک دشتِ سینا مصر کے شمال مشرقی حصّہ میں ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ موسیٰؑ کے سمندر پار ہونیکا واقعہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ سمندر مصر و فلسطین کے درمیان خاکنائے کے جنوب کی طرف ہے اور اِس طرف حضرت موسیٰؑ آئے ہی نہیں بلکہ آپ شمال کی طرف نکل گئے تھے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ فلسطین سے درے اور مصر اور فلسطین کے درمیان جو خاکنائے ہے جس میں سے اب آبنائے سویز بن گئی ہے اُس میں خلیج عقبہ کے اوپر جو حصّہ ہے وہ دشتِ سینا کہلاتا ہے گویا وہ دشتِ سینا کو خلیج عقبہ سے کچھ اوپر قرار دیتے ہیں لیکن بعض کے نزدیک دشتِ سینا کا علاقہ فلسطین کی طرف جھکا ہوا ہے۔ بعض نے سینا اور طور کا کُلّی طور پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ محض ایک روایت ہے جس کے اندر کوئی حقیقت نہیں پائی جاتی بہرحال قرآن کریم نے طور کا لفظ استعمال کیا ہے اور طور کے معنے پہاڑ کے بھی ہوتے ہیں۔ پس طورِ سینین کے یہ معنے ہیں کہ سینا کا ایک پہاڑ۔ قرآن کریم سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے طور کو اُس پہاڑ کا نام قرار نہیں دیا بلکہ طور بمعنے پہاڑ استعمال کیا ہے۔ یورپین مؤرخ بھی اِسی طرف گئے ہیں کہ طور کسی پہاڑ کا نام نہیں۔ سورۂ طور میں وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ کہہ کر طور پر الف لام لایا گیا ہے لیکن اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے الف لام چھوڑ دیا ہے اِس سے صاف ظاہر ہے کہ سورۂ طور میں جو الف لام لایا گیا تھا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں طور کی کسی اور چیز کی طرف اضافت کرکے اُس کی تعین نہیں کی گئی تھی اِس لئے اَلطُّوْر کہکر اِس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ ہماری مراد موسیٰؑ والے طور یا سینا والے طور سے ہے جس کو تم جانتے ہی ہو لیکن یہاں چونکہ سینین کی طرف طور کی اضافت موجود ہے اِس لئے الف لام کو چھوڑ دیا گیا۔ بہرحال اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ طور ایک نکرہ ہے جو اضافت سے ہی خاص معنے پاتا ہے بغیر اضافت کے اس کے کوئی خاص معنے نہیں سمجھے جا سکتے۔ جیسے پہاڑ کا لفظ اگر ہم اپنی گفتگو میں استعمال کریں تو اس کے معنے ہمالیہ پہاڑ کے نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہم کہیں ہمالیہ کا پہاڑ تو اس کے معنے ہونگے وہ پہاڑ جسے ہمالیہ کہتے ہیں یا اگر ہم کہتے ہیں کشمیر کا پہاڑ یا ہزارہ کا پہاڑ یا افغانستان کا پہاڑ یا درّۂ خیبر کا پہاڑ تو اس کے بھی مخصوص معنے ہونگے پس طُوْرِ سِيْنِيْن کے یہ معنے ہوئے کہ سینا کا وہ پہاڑ جس پر موسیٰ علیہ السلام کا کوئی خاص واقعہ ہوا تھا۔ وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ میں انہی معنوں کو الف لام کی زیادتی سے ظاہر کیا گیا ہے

بعض مفسرین نے جو یہ سمجھا ہے کہ طور کسی پہاڑ کا نام ہے یہ درست نہیں۔ طور کے معنے محض ایک پہاڑ کے ہیں اور انہی معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے البتہ عرفِ عام میں بوجہ ایک خاص مناسبت کے اِس نے مخصوص معنے پیدا کر لئے ہیں جیسے بعض دفعہ ایک چیز تو عام ہوتی ہے لیکن کسی خاص چیز کی طرف منسوب ہوتے ہوتے آخر اُس کا ایک نام بن جاتی ہے۔ مثلاً کتاب ایک عام لفظ ہے جو ہر کتاب کے متعلق استعمال ہوتا ہے لیکن "اَلْكِتَابُ" ایک مخصوص لفظ ہے جو بائیبل کے متعلق استعمال ہوتا ہے اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اَلْکِتَاب کے معنے بائیبل کے ہیں بلکہ بائیبل کی طرف یہ لفظ منسوب ہوتے ہوتے اتنا عرصہ گذر چکا ہے اور اسقدر زبان زدِ خلائق ہو چکا ہے کہ اب الکتاب کا لفظ جب بھی استعمال ہو گا یہی سمجھا جائیگا کہ اِس سے بائیبل مراد ہے۔ یا مثلاً انجیل کے لفظی معنے بشارات کے ہیں۔ اور شروع میں انہی معنوں میں انجیل کا لفظ استعمال ہوا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ بشارات جو آپ نے اپنی قوم کو دیں مگر اب انجیل کا لفظ بولو تو اس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ زید کی بشارتیں یا بکر کی بشارتیں بلکہ ہر شخص کے ذہن میں فوراً یہ بات آ جائیگی کہ اِس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے

حالانکہ لفظی معنے اِس کے صرف بشارات کے ہیں۔ اِسی طرح طورِسینین کے معنے ہیں سینا کا ایک پہاڑ مگر چونکہ سینا کے پہاڑ کا ذکر لوگوں کی زبان پر آتا ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اس لئے رفتہ رفتہ طور سے مخصوص طور پر وہی پہاڑ سمجھا جانے لگا جس پر یہ واقعہ ہؤا تھا۔ حالانکہ معنوں کے لحاظ سے طور ہر پہاڑ کو کہا جاسکتا ہے۔

سینا کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ اُس کی تعیین میں مؤرخین کو بہت کچھ اختلاف ہے بعض تو سینا نام کا کوئی علاقہ تسلیم ہی نہیں کرتے مگر بعض اِس علاقہ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں مگر اِن لوگوں میں بھی بہت کچھ اختلاف ہے بعض کسی جگہ کو سینا قرار دیتے ہیں اور بعض کسی جگہ کو۔ میرے خیال میں اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شوق ہوتا ہے کہ ہم کوئی جدید چیز پیدا کریں اور اس شوق کی وجہ سے وہ واقعات اور حقائق کو نظر انداز کرکے محض اپنی کسی تھیوری اور قیاس پر بنیاد رکھکر ایک نئی بات لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اِسطرح ہم بھی موجد قرار پا جائیں گے۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ جب سنتے ہیں کہ فلاں نے یہ چیز ایجاد کی ہے اور فلاں نے وہ چیز ایجاد کی ہے تو اُن کے دلوں میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی کوئی نئی چیز ایجاد کریں۔ اِس پر بعض خیالات اُن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ فوراً اخبارات میں اعلان کرا دیتے ہیں کہ ہم نے اِس قسم کی چیز ایجاد کرلی ہے مگر جب زیادہ کُرید کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایجاد کوئی نہیں صرف ایک نئی تھیوری انہوں نے پیدا کی ہے۔ اِسی طرح بعض مؤرخوں نے سمجھا کہ اگر ہم یہ کہدینگے کہ حضرت موسیٰؑ شمال کی طرف گئے تھے اور سینا بھی شمال میں ہی تھا تو تاریخ میں ہم بھی موجد سمجھے جائینگے۔ چنانچہ وہ معمولی معمولی شبہات کی بناء پر دوسروں کی باتوں کو ردّ کر دیتے ہیں اور ایک نئی تھیوری اور نیا خیال پیدا کرکے خوش ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آئندہ جب بھی اس واقعہ کی تحقیق کی جائے گی لوگ کہینگے کہ ایک تھیوری فلاں شخص کی بھی تھی اس پر بھی غور کر لیا جائے۔ ایسے لوگوں کو تاریخ کی صحت مدّنظر نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات کی شہرت اُن کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔ بجائے اِس کے کہ وہ حقائق پر غور کریں اُن کو ہر وقت یہی شوق رہتا ہے کہ کسی طرح ہمارا نام نکل جائے۔ ایسے ہی لوگ بعض دفعہ یہاں تک کہدیتے ہیں کہ موسیٰؑ کوئی تھا ہی نہیں۔ بعض کہہ دیتے ہیں کہ عیسیٰؑ کوئی شخص نہیں تھا۔ بعض کہدیتے ہیں کہ سینا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اِسی طرح زرتشتؑ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی حال کرشنؑ اور رامچندرؑ کا ہے کہ اُن کے وجود کا بعض لوگوں کی طرف سے انکار کیا جاتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں اِس میں بھی اسلام کا معجزہ ہے کہ اگر کسی شخص کے وجود کا انکار نہیں ہؤا تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ورنہ بعض عیسائی ایسے ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ محض ایک تمثیلی ذکر ہے۔ اِسی طرح پروفیسر فرائیڈ جو خود یہودی ہے اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وجود کا انکار کیا ہے۔ بعض ہندو ایسے ہیں جو یورپین مشککین کی اتباع میں کرشنؑ اور رامچندرؑ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور بعض پارسی ہیں جو زرتشتؑ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور اُس کو محض ایک تمثیلی وجود قرار دیتے ہیں لیکن اگر کسی عظیم الشان نبی کے وجود کا انکار نہیں کیا گیا تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے۔ میرے نزدیک اِس میں بھی ایک بہت بڑی الٰہی حکمت کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذریعہ سے دنیا کو بتایا ہے کہ اگر کوئی قابلِ اعتناء ذات ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے باقی سب انبیاء کا اگر تم انکار بھی کردو تو اِس میں کوئی ہرج نہیں۔

غرض طور کے وجود کا بھی بعض لوگوں نے انکار کیا ہے اور سینا کے وجود کا بھی بعض لوگوں نے انکار کیا ہے لیکن جو لوگ طور کو مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ سینا کے نیچے جنوب میں خلیج عقبہ کے اوپر تیس چالیس میل لمبا ایک پہاڑ ہے جس کو طور کہتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں کہ اُس پہاڑ کا نام طور تھا۔ طُور کے معنے پہاڑ کے ہیں اور طُور کے لفظ سے اُس پہاڑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر حضرت موسیٰ سے کلام ہؤا اور اس واقعہ کو چونکہ ہزاروں لوگوں نے بار بار بیان کیا آہستہ آہستہ طور کا لفظ ہی

بجائے پہاڑ کے ایک خاص پہاڑ کا عَلَم یعنی مخصوص نام سمجھا جانے لگا۔ بہرحال خلیج عقبہ کے اوپر ایک پہاڑی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ یہودی ہمیشہ اُس پہاڑی کی زیارت کیلئے جایا کرتے تھے۔ میرے نزدیک قرآن کریم اور بائیبل سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اُس کے لحاظ سے خلیج عقبہ کے اوپر والا علاقہ ہی سینا کا ہے اور اُسی علاقہ میں وہ پہاڑ ہے جسے عرفِ عام میں طُور کہا جاتا ہے۔

مجھے تعجب آتا ہے کہ جب قرآن کریم اور بائیبل دونوں سے اِس علاقہ کا وجود ثابت ہے اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ یہودی ہمیشہ اِس پہاڑ کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے تو پھر کسی مؤرخ کا کیا حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ طُور کوئی پہاڑ ہی نہیں تھا یا سینا کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔

طُورِ سِیْنِیْن میں سینین لفظ جمع استعمال کرنے کی وجہ۔

اِس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں سینین کا لفظ کیوں استعمال کیا جبکہ سورۂ مومنون میں وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (ع۱) کہکر اُس کا نام سینا بتایا گیا ہے نہ کہ سینین۔ اِسکا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ سینا اور سینین دونوں عَلَم ہیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ سینا کی بجائے سینین کا لفظ وقف کی وجہ سے بدل دیا گیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ یَاسِیْنَ (ع۴) حالانکہ وہاں صرف ایک الیاس مراد ہیں آخر میں یا اور ن کا اضافہ قافیہ بندی کے لئے کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ یَاسِیْنَ میں صرف وقف کیلئے یا اور ن کا اضافہ کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ ہماری جماعت کا اعتقاد ہے الیاس کی بجائے الیاسین کا لفظ اللہ تعالیٰ نے اِس لئے استعمال کیا ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ الیاس مراد ہیں۔ ایک تو وہ الیاس ہیں جو اسرائیلی انبیاء کے وسط میں گذر چکے ہیں۔ دوسرے الیاس یوحنا ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معاً پہلے آئے اور تیسرے الیاس حضرت سید احمد صاحب بریلوی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے آئے۔ چونکہ نزولِ قرآن سے پہلے دو الیاس دنیا میں آچکے تھے اور ایک الیاس نے ابھی آنا تھا اِس لئے اللہ تعالیٰ نے سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْیَاس کی بجائے سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ یَاسِیْنَ کہکر اُن سب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اِسی طرح ممکن ہے سینا کے متعلق لوگوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ سینین میں اُس کی طرف اشارہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف قوموں میں مختلف علاقوں کو سینا کہتے ہوں۔ مثلاً عرب لوگ پنجاب اور اُس کے اردگرد کے علاقہ کا نام ہند رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ عربی کتابوں میں بعض جگہ لکھا ہوتا ہے کہ ہند اور بنگال میں فلاں فلاں بات پائی جاتی ہے حالانکہ اِن دنوں بنگال ہندوستان کا حصہ ہے مگر وہ چونکہ صرف پنجاب اور اُس کے اردگرد کے علاقہ کا نام ہند رکھدیتے ہیں اسلئے بنگال کو وہ علیحدہ شمار کرتے ہیں۔ اِسی طرح بعض لوگ افغانستان صرف قندھار تک کے علاقہ کو کہتے ہیں۔ بعض افغانستان کی حدود پشاور تک سمجھتے ہیں اور بعض دریائے سندھ تک کے علاقہ کو افغانستان قرار دیتے ہیں اِس لحاظ سے طُوْرِ سِیْنِیْنَ کے الفاظ میں اِسطرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اس علاقہ میں سینا کے نام سے کئی دشت مشہور ہیں مگر وہ پہاڑ جس پر موسیٰؑ سے کلام ہوا ایک ہی ہے ہم اِن سیناؤں کے طُور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مَیں بتا چکا ہوں کہ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ میں آدمؑ اور نوحؑ کی ہجرتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ باوجود اِس کے کہ اِن ہجرتوں سے دشمن کو ایک جھوٹی خوشی حاصل ہوئی اور اُس نے سمجھا کہ مَیں کامیاب ہوگیا ہوں پھر بھی خدا نے اپنے نبیوں کو کامیاب کیا اور دشمن کو اُن کے مقابلہ میں ذلیل اور رُسوا ہونا پڑا۔ اِسی طرح اَب مکّہ والوں کا یہ خیال کرنا صریح نادانی ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ سے نکال کر کامیاب ہو جائیں گے جسطرح سابق انبیاء کے دشمنوں کا یہ خیال کہ ہم جیت جائیں گے اور نبی ہار جائیگا باطل ثابت ہوا تھا اِسی طرح اب بھی مکّہ والوں کا خیال باطل ثابت ہوگا اور اللہ تعالیٰ اِن کی جھوٹی خوشی کو ایک دن ہمیشہ کی ذلت اور رسوائی میں بدل دیگا اب اِسی مضمون کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے

موسیٰ کی ہجرت کا واقعہ بطور مثال پیش کرتا ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ طور کا واقعہ ہجرت کے بعد ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم کے ابتداء میں ہی جہاں بنی اسرائیل کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آتا ہے وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ـ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ـ (البقرۃ ع ۶) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے بنی اسرائیل یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا تھا ہم نے تمہیں نجات دی اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے پھر اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ سے ہم نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا (جب آپ سینا کے پہاڑ پر تشریف لے گئے تھے) اور تم نے اپنے بچھڑے کو معبود بنا کر شرک کا ارتکاب شروع کر دیا اور خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ظالم بن گئے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت پہلے ہوئی ہے اور طور کا واقعہ بعد میں ہوا ہے۔ پہلے آپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر کو چھوڑا پھر خدا تعالیٰ آپ کو طور پر لے گیا۔ جہاں اس نے وہ کلام آپ پر نازل کیا جس میں یہودی قوم کو دس ایسے احکام دئے گئے تھے جو تمام تورات کا مغز سمجھے جاتے ہیں بائیبل سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ طور کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے نکل آنے کے بعد ہوا ہے۔ چنانچہ خروج میں پہلے ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے پھر دشتِ سینا میں بنی اسرائیل کے پہنچنے کا ذکر آتا ہے اور پھر آخر میں طور کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یہ ترتیب ظاہر کر رہی ہے کہ ہجرت پہلے ہوئی ہے اور واقعہ طور بعد میں ہوا ہے۔ ہجرت کا ذکر خروج باب ۱۴ میں آتا ہے۔ دشتِ سینا میں پہنچنے کا ذکر خروج باب ۱۶ میں آتا ہے اور واقعہ طور کا ذکر خروج باب ۱۹ میں آتا ہے۔ خروج باب ۱۴ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُسکا خلاصہ پُرانی بائیبل میں اِس طرح درج ہے:۔

"اس بیان میں کہ خدا بنی اسرائیل کو اُن کی راہ بتاتا فرعون اُن کا پیچھا کرتا۔ بنی اسرائیل گڑگڑاتے۔ موسیٰ اُن کو دلاسا دیتا۔ خدا موسیٰ کو سکھلاتا۔ بدلی کا ستون لشکر کی پُشت پر جا ٹھیرتا۔ بنی اسرائیل دریائے قلزم کے بیچ سے ہو کے جاتے اُسی میں اہلِ مصر غرق ہوتے۔"

یہ تو ہجرت کا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد خروج باب ۱۶ کا خلاصہ یوں لکھا ہے:۔

"اس بیان میں کہ بنی اسرائیل سین میں جا پہنچے۔ خوراک کے نہ ہونے کے باعث سب گڑگڑاتے۔ خدا آسمان سے روٹی بھیجنے کا وعدہ کرتا۔ اُن کے لئے بٹیریں بھیجی جاتیں۔ من بھی بھیجا جاتا۔ ہر ایک کو من کے جمع کرنے کا حکم ہوتا۔ سبت کے دن وہ نہ مل سکیگا۔ من کا اُدمر بھر قرنوں کو دکھانے کیلئے حفاظت سے رکھتے۔"

اس کے بعد خروج باب ۱۹ کا خلاصہ ان الفاظ میں درج ہے:

"اس بیان میں کہ بنی اسرائیل سینا کے بیابان میں آتے اُن کے لئے خدا کا پیغام پہاڑ پر سے موسیٰ کی معرفت آتا۔ وے لوگ اُس کا جواب دیتے تیسرے دن کے لئے تیار ہو جاتے۔ پہاڑ کا چھونا منع ہوتا۔ پہاڑ کے اوپر یہوواہ ہیبت ناک وضع سے ظاہر ہوتا۔"

غرض بائیبل اور قرآن دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ ہجرت کا واقعہ پہلے ہوا ہے اور طور کا واقعہ بعد میں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور نوحؑ کی مثالیں پیش کرنے کے بعد فرماتا ہے ہم تیسری مثال تمہارے سامنے موسیٰؑ کی پیش کرتے ہیں۔ موسیٰؑ کو دشمن کے مظالم کی وجہ سے ہجرت کرنی پڑی تھی اور وہ اپنی قوم کو ساتھ لے کر مصر سے باہر نکل آیا تھا۔ موسیٰؑ کے دشمنوں نے سمجھا ہوگا کہ چلو چھٹی ہوئی ہمیں اس کے فتنہ سے نجات ملی مگر خدا نے اس ہجرت کو دشمنوں کی تباہی اور بنی اسرائیل کی ترقی کا موجب بنا دیا۔ اگر یہ لوگ مصر میں ہی رہتے تو خواہ فرعون کے مظالم سے آزاد ہو جاتے مگر پھر بھی وہ محکوم ہی رہتے۔ لیکن طورِ سینین کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسی برکات نازل کیں کہ نہ صرف بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ بادشاہت کا وعدہ دیکر یہودی قوم کی حکومت کی بنیاد رکھدی جو ایک ہزار سال تک نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ مضمون بیان کر رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تمہاری تدبیروں سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ تین اور زیتون اور طورِ سینین کے واقعات

تمہارے سامنے ہیں۔ آدمؑ کو شیطان نے دھوکا دیا تو تین نے اُسکا ننگ ڈھانک لیا۔ نوحؑ کے زمانہ میں طوفان آیا تو زیتون کی شاخ سے اُس کو خوشخبری ملی۔ مصر سے موسیٰؑ کو بھاگنا پڑا تو طورِ سینین پر اُس کو پناہ مل گئی۔ چونکہ یہاں غلبہ اور ترقی کا مضمون ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دشمن کی تکالیف والے حصّہ کو بیان نہیں کیا۔ ورنہ دراصل وَالتِّیْن کے معنے ہیں شیطان کا آدمؑ کو دھوکا دینا اور تین سے اُسکا کامیاب ہونا۔ وَالزَّیْتُوْن کے معنے ہیں نوحؑ کے لئے عرصۂ حیات کا تنگ کیا جانا طوفان آنا اور پھر زیتون سے نوحؑ کو اپنی کامیابی کی بشارت ملنا۔ طُوْرِ سِیْنِیْن کے معنے ہیں مصر سے موسیٰؑ کا بھاگنا اور طورِ سینین پر اُس کو اپنی کامیابیوں کی بشارت ملنا۔ اور هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کے معنے ہیں مکہ سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھاگنا اور پھر آپ کا فاتح اور حکمران ہونے کی حیثیت سے مکہ میں واپس آنا۔ مگر تکالیف اور ہجرت وغیرہ کا ذکر چونکہ مضمون سے خود بخود نکل آتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کا ذکر محض اشارۃً کیا ہے۔ اصل ذکر غلبہ اور کامیابی کا کیا ہے تاکہ دشمن اپنی عارضی کامیابی پر خوش نہ ہو اور وہ یہ خیال نہ کرے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو شکست دیدی ہے۔

غرض طورِ سینین میں اِس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو جب مصر سے نکالا گیا تو فرعون تو سمندر کی تہ میں ڈوبا مگر موسیٰؑ کو ہم نے پہاڑ پر تجلّی دکھائی۔ گویا ایک نیچے کی طرف چلا گیا اور دوسرا اوپر کی طرف نکل گیا۔ تجلّی دونوں نے ہی دیکھی مگر ایک نے سمندر کی تہ میں دیکھی اور دوسرے نے طورِ سینین پر تجلّی دیکھی۔ اے مکہ والو! تمہارے ساتھ بھی یہی ہونے والا ہے۔ بظاہر موسیٰؑ فرعون اور اُسکی قوم کے مظالم سے تنگ آکر مصر سے بھاگ گئے تھے وہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے انہوں نے اپنے مکانوں اور اپنی جائیدادوں کو چھوڑ دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے طورِ سینین پر موسیٰؑ کو تجلّی دکھا دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے اپنی قوم کے غلبہ کا وعدہ مل گیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی طورِ سینا تیار ہو رہا ہے۔ یہ طورِ سینا مدینہ تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ فرماتا ہے کہ تم خود سمجھ لو کہ تمہارے لئے کیا مقدّر ہے؟ محمد رسول اللہ کو نکال کر دیکھ لو میں فرعون کی طرح تم کو غرق کر دونگا اور محمد رسول اللہ کو طورِ سینا پر بلند جگہ دونگا اور ثابت کر دونگا کہ انسانی فطرت پاک ہے پاک فطرت لوگ اُس کی طرف دوڑیں گے اور اِس بات کے شاہد ہونگے جسطرح موسیٰؑ کے وقت ہوئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ میں پیدا کیا ہے

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کہ ہم اِس بلد الامین کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اَمِیْن کے معنے یا تو اٰمِنٌ کے ہوتے ہیں اور یا مَامُوْنٌ کے ہوتے ہیں یعنی یا تو اِس کے یہ معنے ہیں کہ وہ بلد جو دنیا کو امن دیتا ہے اور یا پھر اِس کے یہ معنے ہیں کہ وہ بلد جس کو خدا نے مامون کر دیا ہے۔ میرے نزدیک بلد الامین کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ وہ شہر جو امن دینے والا ہے اور یہ بھی کہ وہ شہر جسے امن دیا گیا ہے امین کا لفظ جو اِس آیت میں استعمال کیا گیا ہے اِس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اُسوقت کے مکہ کی حالت کا اِس میں ذکر نہیں کیونکہ اُس وقت تو جو کچھ کیفیت تھی اُس کا ذکر اللہ تعالیٰ اِن الفاظ میں کر چکا ہے کہ اَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ تجھے اِس بلد میں حلال سمجھا جا رہا ہے کوئی تکلیف نہیں جو تجھے نہ پہنچائی جاتی ہو اور کوئی ظلم نہیں جو تجھ پر توڑا نہ جاتا ہو۔ ہر قسم کے تیروں کا نشانہ انہوں نے تجھ کو بنایا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایک جائز فعل کا ارتکاب کر رہے ہیں جس شہر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے امن پسند انسان پر ظلم کیا جاتا تھا وہ بلد الامین کسطرح کہلا سکتا تھا پس بلد الامین سے درحقیقت مکہ کی وہ حالت مراد ہے جو فتح مکہ کے بعد پیدا ہوئی جب ہر قسم کے مظالم کا سلسلہ جاتا رہا تھا اور مسلمانوں کو کفار پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ ورنہ فتح مکہ سے پہلے وہ بلد الامین کہاں تھا۔ نہ اُس میں روحانی لحاظ سے امن تھا نہ جسمانی لحاظ سے۔ دینی امن لو تو مکہ وہ شہر تھا جہاں لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا تھا اور انہیں خدائے واحد کی پرستش کی بجائے بتوں کی پرستش کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور اگر جسمانی لحاظ سے دیکھو تو مکہ والوں کی طرف سے خطرناک سے خطرناک ظلم ایک ایسی قوم پر ہو رہا تھا جو انصاف پسند اور مخلوق کی خیر خواہ تھی جو اس مقصد کو لے کر کھڑی ہوئی تھی کہ دنیا میں امن قائم ہونا چاہیئے ایکدوسرے کے

حقوق کو ادا کرنا چاہیئے اور انہی فرائض کو پوری دیانت داری کے
ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مقصد
بھی ایسا ہے جس پر مکّہ والوں کو غصّہ آنا چاہیئے تھا اور جس کی بنا
پر انہیں اپنی ترکش کا ہر تیر مسلمانوں کے سینہ کی طرف پھینکنا چاہیئے
تھا مگر ہُوا یہی کہ مسلمانوں کو دُکھ دیا گیا۔ اُن کو ستایا گیا۔ اُن کو
مارا گیا۔ اُن کے ننگ و ناموس پر حملہ کیا گیا اور انہیں شدید سے شدید
عذاب میں ایک لمبے عرصہ تک مبتلا کیا گیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ اُنکے
محبوب آقا پر جس کی غلامی وہ اپنے لئے فخر کا موجب سمجھتے تھے
اور جس کے اشارہ پر وہ اپنی ہر چیز قربان کرنے کیلئے تیار رہتے تھے متواتر
اور مسلسل مظالم کئے گئے حالانکہ قوم کا آپ کے متعلق فتویٰ یہ تھا کہ آپ صدوق
اور امین ہیں۔ گویا مکّہ میں ایک کافر کو امن حاصل تھا ایک بُت پرست
کو امن حاصل تھا۔ ایک جھوٹے اور دغا باز کو امن حاصل تھا۔ ایک ظالم
اور غاصب کو امن حاصل تھا لیکن اگر کسی شخص کو مکّہ میں امن حاصل
نہیں تھا تو صرف اُس کو جو قوم میں صدوق اور امین مشہور تھا۔ غرض
روحانی طور پر دیکھو یا جسمانی طور پر مکّہ کو اُس وقت کی حالت کے
لحاظ سے قطعی طور پر بلد الامین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ روحانی طور پر
یہ کیفیت تھی کہ مکّہ میں لوگوں کے ایمانوں کو لوٹا جاتا تھا کبھی کہا
جاتا لات پر چڑھاوا چڑھاؤ۔ کبھی کہا جاتا عزّیٰ پر چڑھاوا چڑھاؤ
کبھی منات اور ھُبل اور دوسرے بتوں کی پرستش پر مجبور کیا جاتا
یہ بُت پرستی مکّہ میں اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بیت اللہ جو خدائے واحد کی
عبادت کیلئے بنایا گیا تھا خود اُس میں تین سو ساٹھ بُت رکھے گئے تھے
اور ہر روز ایک نئے بُت کے سامنے اپنے سر جھکائے جاتے تھے پس
بلد الامین میں مکّہ کی اس حالت کا ذکر نہیں جو اس سورۃ کے نازل
ہونے کے وقت تھی بلکہ ان الفاظ میں اُس آخری ترقی کا ذکر ہے جو
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد حاصل ہونے والی تھی
تین بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جب آدمؑ شیطان پر کامیاب
ہوئے۔ زیتون بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جب نوحؑ طوفان سے
بچے۔ طُورِ سینین بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جب موسیٰؑ
کو آئندہ ترقیات کی خوشخبری ملی۔ اسی طرح بلد الامین بھی
ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جس کی ابتدائی مکّی زندگی میں پیشگوئی
کر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ گو آج مسلمانوں پر مظالم ڈھائے
جاتے ہیں مگر ایک دن آنے والا ہے جب مکّہ تمہارے لئے اور سب
دنیا کے لئے بلد الامین ہوگا۔ ہر قسم کے مظالم کا سلسلہ مٹ جائیگا
اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو
امن حاصل ہو جائیگا۔ گویا ہجرت بجائے مضر ہونے کے اسلام
اور مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوگی تم سمجھو گے کہ ہم نے
اسلام کو تباہ کر دیا مگر خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو پھر اس شہر میں واپس لائیگا۔ آپ کو فتح اور کامرانی عطا کریگا
آپ کے ہاتھ سے مکّہ کے ایک ایک بُت کو تڑوائیگا۔ شرک کا
قلع قمع کر دیا جائیگا اور خدائے واحد کا نام مکّہ کی گلی کوچوں
میں گونجنا شروع ہو جائیگا اور اسطرح روحانی امن قائم ہو جائیگا
اس کے علاوہ اُس وقت تم میں یہ طاقت نہ رہیگی کہ محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی طرف نظرِ بد سے دیکھ سکو
یا غریبوں پر ظلم کر سکو اور اسطرح جسمانی طور پر مکّہ بلد الامین ہو جائیگا
اور اگر امین کے معنے مامون کے لو تو اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ گو مکّہ
ہمیشہ سے محفوظ چلا آتا ہے مگر ایک موقع ایسا آنے والا ہے جب
اس کو قسراً فتح کیا جائیگا۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ مَکَّۃَ وَلَمْ یَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ
وَلَا لِاَحَدٍ بَعْدِیْ وَاِنَّمَا حَلَّتْ لِیْ سَاعَۃً (بخاری کتاب البیوع
باب ماقیل فی الصواغ) کہ مکّہ بلد الحرام ہے اور قیامت تک حرام
ہی رہیگا کسی شخص کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکّہ پر حملہ کرے یا اُسکی
حرمت کو کسی اور رنگ میں توڑنے کی کوشش کرے۔ صرف مجھے اللہ تعالیٰ
نے اجازت دی ہے کہ میں قسراً مکّہ کو فتح کروں مگر میرے لئے بھی
یہ اجازت صرف چند گھڑیوں کیلئے تھی ہمیشہ کیلئے نہیں تھی۔

یہ ایک طبعی بات ہے کہ لمبے عرصہ میں عارضی طور پر اگر کوئی
واقعہ ہو جائے تو انسان اُس کو نظر انداز کر دیا کرتا ہے۔ وہ شخص
جو دس پندرہ سال تک تندرست رہے اگر ایک دن اُسے
بخار ہو جائے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ بیمار آدمی ہے کیونکہ یہ
بیماری ایک لمبے عرصہ میں صرف تھوڑی سی دیر کے لئے اُس پر آئی
تھی۔ اسی طرح بلد الامین میں اسطرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝

یقیناً ہم نے انسان کو موزوں سے موزوں حالت میں پیدا کیا ہے ۵۳

کہ بیشک مکّہ پر ایک ایسا حملہ مقدّر ہے جو اُس کی حلّت کو توڑ دے اور بیشک ایک دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسے قسراً فتح کرینگے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ مکّہ بلد الامین نہیں۔ اُسے خدا ہی کی طرف سے امن دیا گیا ہے اُس کی حرمت کو خدا تعالےٰ نے اپنے حکم سے قائم کیا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِس میں قسراً داخلہ ایک وقتی چیز ہوگا جس کی اللہ تعالےٰ بعض پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لئے اجازت دیگا ورنہ مکّہ بلد الامین تھا بلد الامین ہے اور بلد الامین رہیگا۔ کوئی شخص اِس کی حرمت کو توڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مکّہ فتح کر لیا تو اُس کے بعد آپ نے اعلان فرمایا کہ یہ حملہ صرف میرے لئے مقدّر تھا۔ آج کے بعد کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکّہ کی حرمت کو توڑنے کی جرأت کرے۔

پس چونکہ ایک زمانہ ابھی ایسا آنا تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکّہ کی حرمت کو توڑا جانا مقدّر تھا اور خود خدا نے یہ کہنا تھا کہ تمہارے لئے مکّہ پر حملہ کرنا جائز ہے اِس لئے جب تک وہ موقعہ آکر گذر نہ جاتا مکّہ کامل طور پر بلد الامین نہیں کہلا سکتا تھا۔ بیشک وہ پہلے بھی بلد الامین تھا اور بعد میں بھی وہ بلد الامین رہا مگر چونکہ درمیان میں ایک وقفہ ایسا آنا تھا جس میں اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت مکّہ کو قسراً فتح کیا جانا مقدّر تھا اسلئے کامل طور پر مکّہ اگر بلد الامین کہلا سکتا تھا تو فتح مکّہ کے بعد ہی نہ کہ اُس سے پہلے۔ چنانچہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کر لیا تو اُس کے بعد آپ نے ہمیشہ کیلئے مکّہ کی حرمت کو قائم فرما دیا۔ بہرحال جب تک مکّہ فتح نہیں ہوا تھا وہ کُلّی طور پر بلد الامین نہیں کہلا سکتا تھا کیونکہ ایک سانحہ موجود تھا جس میں اُس کی حرمت کو ظاہری نگاہوں میں توڑا جانا تھا کُلّی طور پر اگر وہ بلد الامین قرار پایا تو فتح مکّہ کے بعد۔ غرض یہ تینوں واقعات فتح مکّہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایمان کے لحاظ سے مکّہ کے امن کو لو تو فتح مکّہ کے بعد اُس میں سے شرک نکلا اور اگر جسمانی لحاظ سے مکّہ کے امن کو لو تو فتح مکّہ کے بعد کفار کے جور و ستم کا سلسلہ بند ہوا۔ اور اگر مکّہ کا مامون ہونا لو تب بھی فتح مکّہ کے بعد اُسے امن حاصل ہوا۔ جبتک مکّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح نہیں ہوا وہ کامل طور پر بلد الامین نہیں کہلا سکتا تھا کیونکہ ایک سانحہ ابھی آنیوالا تھا جس میں مکّہ کی حرمت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑنا اور اپنے لشکر سمیت اُسکو فتح کرنا تھا۔ غرض مکّہ کا بلد الامین ہونا خواہ روحانی اور جسمانی لحاظ سے امن ہونے کی صورت میں لو خواہ مکّہ کے مامون ہونے کی صورت میں لو ہر طرح مکّہ اگر بلد الامین بنا ہے تو فتح مکّہ کے بعد۔ اِس سے پہلے نہ دینی لحاظ سے اُس میں امن تھا نہ جسمانی لحاظ سے اُس میں امن تھا اور نہ وہ خود کامل طور پر مامون سمجھا جا سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم یہ چاروں واقعات تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اِن میں سے تین واقعات تو ہو چکے ہیں اور چوتھا ابھی ہونے والا ہے۔ تم گذشتہ تین واقعات سے قیاس کر سکتے ہو کہ یہ چوتھا واقعہ بھی ہونے والا ہے اور یہ شہر جو آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کے لئے آگ ہے ہجرت کے بعد بلد الامین ہونے والا اور دنیا کو اِس بات کی چوتھی شہادت مہیّا کر کے دینے والا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔

اَلتَّقْوِیْمُ

۵۳ حل لغات۔ اَلتَّقْوِیْمُ: اَلتَّعْدِیْلُ (اقرب) تقویم کے معنے تعدیل کے ہیں یعنی کسی چیز کو صحیح القویٰ بنانا اور ہر قسم کی کجی اور خرابی سے اُس کو محفوظ رکھنا۔ پس اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے معنے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ اور نقص سے پاک اور بے عیب بنانا۔ یہ الفاظ انسان کے لئے بطور حال استعمال ہوئے ہیں یعنی حَالَ کَوْنِہٖ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی انسان کو ایسا بنایا ہے۔ کہ تعدیل و اصلاح کرنے میں بے نظیر ہے۔ یہاں مفسّرین کو

دِقّت پیش آئی ہے کہ اعتدال اور تقویم پیدا کرنے والا تو خدا تعالیٰ ہے انسان ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ اِس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ یہاں تقویم سے مراد قوام ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہاں حذفِ مضاف ہے اور تقدیر یہ ہے کہ فِیْٓ اَحْسَنِ قِوَامِ التَّقْوِیْمِ یعنی تقویم کے نتیجہ میں جو قوام پیدا ہوتا ہے اُس کا احسن انسان کو حاصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق انسان ہے اور اِسے دوسروں سے زیادہ قوام حاصل ہے اِس لحاظ سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے معنے یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدائش کی صفت کا بہترین نمونہ انسان کو بنایا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اِس آیت میں فِیْ زائدہ ہے اور اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ اللہ تعالیٰ کے لئے حال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی احسن تقویم سے پیدا کیا ہے گویا اُن کے نزدیک لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی خدا نے اپنی تعدیل کی صفت کامل طور پر انسان کی پیدائش میں ظاہر کی ہے۔ اِس کے بھی یہی معنے بن جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اعلیٰ درجہ کی اعتدالی طاقتوں کے ساتھ بنایا ہے لیکن ساتھ ہی ایک زائد معنے یہ بھی نکل آتے ہیں کہ انسان باقی تمام مخلوق سے افضل ہے۔ جب خدا نے انسان کو احسن تقویم میں بنایا ہے اور اُس نے اپنی صفتِ تقویم کامل طور پر انسانی پیدائش میں ہی ظاہر کی ہے تو اِس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکل آیا کہ دوسری کوئی مخلوق انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو صوفیاء میں زیرِ بحث چلا آیا ہے۔ اور انہوں نے اپنی کتابوں میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ انسان افضل ہیں یا ملائکہ۔ اِس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ ملائکہ افضل ہیں کیونکہ اُن سے کسی قسم کی بدی سرزد نہیں ہوتی لیکن بعض نے کہا ہے کہ انسان بحیثیت انسان یا بحیثیت جماعت ملائکہ سے افضل ہے اِسلئے کہ خدا نے اُس کو ایسی طاقتیں دیکر بھیجا ہے کہ اگر وہ اُنکا صحیح طور پر استعمال کرے تو ملائکہ سے بڑھ جاتا ہے میرے نزدیک لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ملائکہ سے افضل ہے اِس لئے کہ اگر اِس کے یہ معنے ہوں کہ خدا نے اپنی تقویم کی صفت کو اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر انسان پر ظاہر کیا ہے تب بھی اِس کے یہی معنے ہیں کہ خدا نے انسان کو تمام مخلوق میں سے اعلیٰ مقام پر پیدا کیا ہے اور اگر اِس کا دوسرا مفہوم لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہتر سے بہتر طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے اندر کمال درجہ کا اعتدال رکھا ہے تب بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ملائکہ سے افضل ہے کیونکہ انسان ہی وہ مخلوق ہے جس کے اندر کمال درجہ کا اعتدال پیدا کیا گیا ہے اور جسے بہتر سے بہتر طاقتوں کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ بہرحال اِس آیت سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بحیثیت فرد نہیں بلکہ بحیثیت انسان دوسری تمام مخلوق پر اپنی بالقوّہ طاقتوں کے ذریعہ فضیلت بخشی ہے خواہ وہ ملائکہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ہم عقلی طور پر غور کریں تب بھی ہم اِسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ملائکہ انسان سے افضل نہیں ہو سکتے اسلئے کہ ملائکہ کے اندر جو نیکی یا اطاعت پائی جاتی ہے وہ جبری ہے اور اُس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے دنیا میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے کر دئے ہیں۔ بیشک وہ اونچے ہیں لیکن اِس اونچائی میں پہاڑوں کی کوئی خوبی نہیں۔ ہمالیہ پہاڑ یہ فخر نہیں کر سکتا کہ دیکھو میں کتنا اونچا نکل گیا ہوں کیونکہ اُس کی اونچائی اور بلندی جبری ہے۔ خدا نے اُسے اونچا بنایا اور وہ بن گیا۔ اِس میں اُس کے کسی ذاتی کمال یا خوبی کا دخل نہیں ہے لیکن اگر کوئی انسان اپنی کوشش اور محنت اور ورزش سے اپنے جسم کو فربہ بنا لیتا ہے تو یہ یقیناً اس کی خوبی سمجھی جائیگی چونکہ انسان کے اندر نیکی کی قوت بھی رکھی گئی ہے اور بدی کی بھی اور وہ دونوں طرف جا سکتا ہے یعنی نیکی میں حصہ لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل کر سکتا ہے اور بدی کا ارتکاب کرکے خدا تعالیٰ کو ناراض بھی کر سکتا ہے۔ اِس لئے وہ شخص جو نیکی کرتا ہے خواہ بظاہر معمولی درجہ کا مومن ہو وہ عام ملائکہ پر ضرور فضیلت رکھیگا کیونکہ ملائکہ کا کمال ذاتی نہیں بلکہ انہیں یہ کمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنا بنایا

حل گیا ہے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا فردِ کامل ملائکہ کے فردِ کامل سے بڑا ہے یا نہیں؟ مگر میرے نزدیک اس سوال کا جواب اسی آیت سے نکل آتا ہے۔ جب خدا نے انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کیا ہے اور ملائکہ سے اُسے زیادہ قوتیں عطا فرمائی ہیں تو لازماً انسان کا فردِ کامل ملائکہ کے فردِ کامل سے افضل ہوگا چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف باقی انسانوں سے بلکہ تمام ملائکہ سے بھی افضل تھے۔ بیشک ایک عام مومن جو گناہوں اور غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے اُس سے ملک افضل ہوتا ہے کیونکہ گو اُسے بالقوہ طاقتوں کے لحاظ سے فضیلت دی گئی تھی مگر اُن قوتوں کے بالفعل ظہور میں وہ بہت پیچھے رہ گیا لیکن جو شخص اپنی بالقوہ طاقتوں کا نہایت اعلیٰ طریق پر اظہار کرتا ہے اُس کی ملائکہ پر فضیلت سے کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جو طاقتیں اُسے ملائکہ سے زیادہ دی گئی تھیں وہ عملی طور پر بھی اُس کی طرف سے ظہور میں آگئیں۔ اِس لحاظ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء یقیناً ملائکہ کے فردِ کامل سے افضل ہیں گو مسلمانوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ افضل نہیں ہیں مگر میرے نزدیک بغیر اس توجیہہ کے کہ فِیْ کو زائد قرار دیا جائے یہ جملہ اپنی اصل شکل میں بھی درست ہے اور اَحْسَنِ تَقْوِیْم انسان کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے بعض مفسرین کو شبہ یہ پڑا ہے کہ چونکہ خدا معتدل ہے اس لئے انسان کو معتدل نہیں کہا جا سکتا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے لئے رؤوف کی صفت بھی آتی ہے رحیم کی صفت بھی آتی ہے رازق کی صفت بھی آتی ہے خالق کی صفت بھی آتی ہے بصیر کی صفت بھی آتی ہے سمیع کی صفت بھی آتی ہے۔ اگر یہ تمام صفات انسان میں پائی جا سکتی ہیں تو اَحْسَنِ تَقْوِیْم کی صفت اُس میں کیوں نہیں پائی جا سکتی؟ جس طرح انسان رؤوف اور رحیم اور رازق اور خالق اور بصیر اور سمیع ہو سکتا ہے وہ احسن تقویم بھی ہو سکتا ہے مگر بہرحال اُسی حد تک یہ صفات اُس میں پائی جائیں گی جس حد تک انسان اِن صفات کو اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے یہ نہیں سمجھا جائیگا کہ اِن صفات میں انسان خدا تعالیٰ کے مقابل میں کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ ہر شخص کا کام اُس کی طاقتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ یہاں انسان کا خدا کے ساتھ مقابلہ نہیں بلکہ مخلوق کا مخلوق کے ساتھ مقابلہ ہے اور مضمون یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی تمام مخلوق میں سے انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو احسن تقویم کا نظارہ دکھا سکتا ہے ملائکہ اُس کی مخلوق ہیں مگر وہ اِس صفت میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اِسی طرح اور جسقدر مخلوق پائی جاتی ہے اُس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو احسن تقویم ہونے کے لحاظ سے انسان کا مقابلہ کر سکے۔ مثلاً وہی کام جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا جبریل نہیں کر سکتا تھا یا وہ کام جو اَور انبیاء کے سپرد ہوا خدا تعالےٰ کے دوسرے ملائکہ سرانجام نہیں دے سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے دنیا کی اصلاح کے لئے موسیٰؑ کو بھیجا عیسیٰؑ کو بھیجا۔ داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا مگر ملائکہ کو نہیں بھیجا کیونکہ انسان میں خدا نے اَحْسَنِ تَقْوِیْم کی صفت رکھی تھی جو ملائکہ میں نہیں رکھی یعنی تربیت اور تعلیم اور اصلاح کا کام جو انسان کر سکتا ہے وہ ملائکہ یا خدا تعالیٰ کی کوئی اور مخلوق نہیں کر سکتی اور یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ اللہ تعالےٰ کی تمام مخلوقات میں سے انسان بہ حیثیت جماعت افضل ہے اور انسانِ کامل ملائکہ کے فردِ کامل سے افضل ہے۔

غرض میرے نزدیک اِس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو اِس حالت میں پیدا کیا ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تقویم کرتا ہے یعنی دوسرے انسانوں اور دوسری مادی اشیاء کی تعلیم و تربیت اور تقدیر اور تصویر اور تخلیق نہایت اعلیٰ درجہ کی کرتا ہے گویا خدا نے انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی معلّم بنایا ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی خالق بنایا ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی مربّی بنایا ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی صنّاع بنایا ہے اور یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن میں دوسری مخلوق پر اُسے بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ یہ معنے ایسے ہیں جن سے قطعاً کوئی شرک لازم نہیں آتا۔ جب یہ ایک حقیقت ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں کہ انسان

انسان کی فضیلت ملائکہ پر۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے معنے۔

بصیر بھی ہے سمیع بھی ہے۔ رؤف بھی ہے۔ رحیم بھی ہے تو احسن تقویم کی صفت بھی اس میں ہو سکتی ہے اور یہی بات اللہ تعالےٰ نے اِس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ ہم نے احسن تقویم کی صفت بھی انسان کو بخشی ہے اور اُسے روحانی اور جسمانی خالق بنایا ہے کہ اُس کی تربیت سے کامل انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اِسی طرح دنیا میں وہ صنعت و حرفت کے بڑے بڑے کمالات دکھاتا ہے چنانچہ دنیا کے چار دَور اِس کے مصدّق ہیں اگر تم اِن چاروں دَوروں کو دیکھو تو تمہیں ماننا پڑیگا کہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے تربیت اور تعلیم اور تعدیل کی بہت بڑی قوت بخشی ہے۔ آدمؑ آئے اور انہوں نے وہ اصلاح کی کہ سینکڑوں سال تک چلتی چلی گئی نوحؑ آئے اور وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پاکباز جماعت قائم کرکے دنیا پر اپنی اِصلاح کے اَن مِٹ نقوش قائم کر گئے۔ موسیٰؑ آئے انہوں نے تعدیل القویٰ کیا اور ایسی اعلیٰ درجہ کی جماعت قائم کی کہ خدا کا جلال اور اُس کا جمال اُس جماعت کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں اِنکے ذریعہ بھی انسان کی یہ صفت ایک دن ظاہر ہو گی اور اِس طرح دنیا پر ثابت ہو جائیگا کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم کی قوت دے کر بھیجا ہے۔ آدمؑ احسن تقویم کا ثبوت ہے۔ نوحؑ احسن تقویم کا ثبوت ہے۔ موسیٰؑ احسن تقویم کا ثبوت ہے اِسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم احسن تقویم کا ثبوت ہیں۔ تم دیکھوگے کہ اِنکی تعلیم اور تربیت کے نتیجہ میں انسان کیسی کیسی قوتیں ظاہر کرتا ہے۔

یہ چاروں دَور جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے درحقیقت انسانی تکمیل کے چار دَور ہیں۔ آدمؑ دَورِ تمدّن کا بانی ہے۔ نوحؑ دَورِ شریعت کا مُوسّس HERO ہے۔ موسیٰؑ دورِ تفصیل کی بنیاد رکھنے والے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دَورِ تکمیل کے بانی ہیں۔ انسانیت کی تشکیل آدمؑ نے کی۔ شریعت کی بنیاد نوحؑ نے رکھی لیکن شریعت کی تفاصیل موسیٰؑ نے بیان کیں اِس کے بعد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شریعت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کئے گئے۔ آپ آئے اور آپ نے انسانیت اور تمدّن کو بھی مکمل کیا۔ آپ نے شریعت کو بھی مکمل کیا اور آپ نے تفصیل شریعت کو بھی تکمیل تک پہنچایا۔ گویا وہ تینوں دَور جو نامکمل تھے اُن کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمال تک پہنچا دیا۔ آپ نے دَورِ تمدّن کو نقائص سے پاک کرکے ایک کامل اور بے عیب تمدّن دنیا کے سامنے رکھا۔ آپ نے دَورِ شریعت کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کرکے ایک کامل اور بے عیب شریعت کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور آپ نے دورِ تفصیل کو ہر قسم کے نقائص سے منزہ کرکے ایک ایسا کامل اور بے عیب مجموعہ قانون دنیا کو دیا جس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی اور بے ضرورت کوئی چیز نہ تھی۔ وہ کامل اور بے عیب تھی اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے اور کامل اور بے عیب تھی اپنی گہرائی کے لحاظ سے۔ گویا وہ شریعت آپ نے دنیا کے سامنے پیش کی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے بھی کامل تھی اور اپنے عمق کے لحاظ سے بھی کامل تھی۔ نوحؑ نے بیشک دنیا کے سامنے سب سے پہلے شریعت پیش کی مگر اُس میں وسعت نہیں تھی صرف عمق تھا اور وہ بھی چند موٹے موٹے مسائل کے متعلق۔ اِس کے بعد موسیٰؑ نے جو شریعت پیش کی اُس میں وسعت تو تھی مگر تمام امور میں عمق نہیں تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کی گہرائیوں کو بھی مکمل کیا اور اُس کی وسعت کو بھی مکمل کیا۔ کوئی اخلاقی گہرائی نہیں تھی جس پر آپ پر نازل شدہ کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو اور کوئی اخلاقی وسعت نہیں تھی جو آپ کی لائی ہوئی کتاب میں بیان نہ ہوئی ہو۔ موسیٰؑ سے شریعت کی کئی گہرائیاں رہ گئی تھیں۔ نوحؑ سے شریعت کی کئی وسعتیں رہ گئی تھیں اور آدمؑ سے تمدّن کی کئی اہم باتیں رہ گئی تھیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن سب کو مکمل کیا اور اِس طرح ثابت ہو گیا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ہم نے انسان کو اعلیٰ درجہ کی تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ہر دَور نے بنی نوع انسان کی ایک تکمیل کی اور یہ عمارت بڑھتے بڑھتے کہیں کی کہیں جا نکلی۔

تفسیر - اوپر بتایا جا چکا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے مختلف معانی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو بہترین وجود بنایا ہے۔ یہ معنی بھی

ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو بہترین طاقتیں دے کر پیدا کیا ہے اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان کو ہم نے بڑا صناع بنایا ہے اِس کے اندر تقویم کی طاقت رکھی ہے اور وہ اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی اور جسمانی پیدائش کر سکتا ہے۔ یہ دعویٰ جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اِس کے متعلق مختلف مذاہب میں چھ بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اِن چھ اختلافات میں سے ایک عقیدہ تو وہ ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور پانچ عقائد وہ ہیں جو اَور مذاہب دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ذیل میں اُن تمام عقائد کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے

انسان کے متعلق چھ مختلف نظریے

پہلا نظریہ

پہلا عقیدہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان بُرائی کا میلان لے کر دنیا میں پیدا ہُوا ہے ہاں سُدھارنے سے وہ سُدھر بھی جاتا ہے گویا انسان کا فطرتی میلان بُرائی کی طرف ہے۔ اور پیدائش کے دن سے ہی ایک کمزوری اُس کے اندر رکھ دی گئی ہے گو اصلاح کے لئے بھی اُسے طاقتیں دی گئی ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان پھلدار تو ضرور ہے مگر اُس کی بُنیاد گند پر ہے جیسے وہ درخت جو دلدل میں اُگتا ہے پھلدار تو ہوتا ہے اور اگر ہم اُسے کھینچ کر خشکی کی طرف لائیں تو لا سکتے ہیں لیکن بہر حال اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس کی جڑیں ایک گندی زمین میں ہیں۔

دوسرا نظریہ

دوسرا دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ انسان بھلائی کو لیکر پیدا ہوا تھا مگر پہلے انسان سے ہی بدی کا ارتکاب ہو گیا اور اُس نے بدی کا ارتکاب کر لیا اور چونکہ انسان ایسی طرز پر دنیا میں آیا ہے کہ وہ ماں باپ سے ضرور ورثہ کا اثر لیتا ہے اسلئے بوجہ اِس کے کہ پہلے ماں باپ یعنی آدمؑ اور حوّا نے گناہ کیا تھا اب اُن کی اولاد باوجود اپنی فطرت میں نیکی رکھنے کے گناہ کرنے پر مجبور ہے۔ بیشک اُن کی فطرت انہیں نیکی کی طرف مائل کرتی ہے مگر چونکہ باپ نے انہیں ورثہ میں گناہ دیا ہے۔ اِس لئے گناہ کی طرف میلان اُن کی فطرت میں چپتا چلا جاتا ہے کیونکہ یہ ورثہ کا اثر ہے جو اُن کے اندر آ گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں انسان میں دو قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں ایک ذاتی اور ایک اکتسابی۔ ذاتی قوت انسان کے اندر بے شک نیکی کی ہے مگر چونکہ گناہ اُسے ورثہ میں مل گیا ہے اِس لئے ورثہ کے گناہ نے اُس کی فطرتی نیکی میں آمیزش کر دی ہے جس سے وہ بلا کسی اور امداد کے آزاد نہیں ہو سکتا اِس کے بعد وہ کہتے ہیں جب خدا نے دیکھا کہ انسان کسی صورت میں بھی اِس گناہ سے بچ نہیں سکتا تو اُس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اگر لوگوں کی خاطر قربانی کر دو اور بے گناہ ہو کر لوگوں کے گناہوں کے بدلے قربان ہو جاؤ تو دنیا اِس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ بیٹے نے اِس تجویز کو مان لیا اور خدا نے اُس کو کہا کہ اَب تم انسان کی صورت میں دنیا میں جاؤ۔ لوگوں کو یہ مقدرت حاصل ہو گی کہ وہ تمہیں ماریں پیٹیں۔ سزائیں دیں اور بالآخر پھانسی پر لٹکا دیں۔ بیشک انسان بن کر لوگوں کے ہاتھوں سے تم یہ سب دکھ برداشت کرو گے مگر چونکہ بے گناہ ہونے کی حالت میں تم کو یہ دُکھ ملیگا اِس لئے خدا تعالیٰ اِس کے بدلہ میں ساری دنیا کے گناہ بخش دیگا۔ پس دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت تو نیک ہے مگر چونکہ پہلے انسان سے ہی گناہ ہو گیا اِس لئے فطرت کی نیکی کے باوجود ورثہ میں ہر انسان کے اندر گناہ کا مادہ آ گیا اِس گناہ سے وہ کفّارۂ مسیح پر ایمان لائے بغیر نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

تیسرا نظریہ

تیسرا نظریہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان کسی خاص ملکہ کو لے کر پیدا نہیں ہوا۔ یہ کہنا کہ اُس کی فطرت میں نیکی ہے یا یہ کہنا کہ اس کی فطرت میں بدی ہے یہ دونوں خیال غلط ہیں۔ انسان بعض تقاضے لے کر دنیا میں آتا ہے جو نہ نیک ہوتے ہیں نہ بد۔ مثلاً شجاعت۔ تہوّر۔ محبّت۔ سخاوت۔ رفق۔ اور غضب وغیرہ کئی قسم کے مادے ہیں جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں اِس کے بعد وہ اپنی تعلیم و تربیت سے متأثر ہوتا اور اُس کے مطابق بن جاتا ہے گویا ہر انسان حالات سے مجبور ہے یعنی یُوں تو اُس کی فطرت آزاد ہے مگر ماحول میں وہ آزاد نہیں رہتا جس قسم کا ماحول اُسے میسّر آتا ہے اُسی قسم کا رنگ اُس پر چڑھ جاتا ہے مثلاً اگر اُس کے ماں باپ ہندو ہیں تو وہ ہندو بن جائیگا۔ یا اپنے محلّہ کے لڑکوں سے کھیلتا ہے تو جس قسم کے اخلاق اُنکے ہوتے ہیں

اُسی قسم کے اخلاق اُس میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہرحال حالات اُسے مجبور کر کے نیکی یا بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر حالات اچھے ہوں تو وہ اچھا بن جاتا ہے اور اگر بُرے ہوں تو وہ بُرا بن جاتا ہے گویا اُس کی زندگی کا تمام دارومدار اُس کے ماحول پر ہی اور وہ نیک یا بد حالات کی مجبوری کی وجہ سے ہوتا ہے اِس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اُس کے اندر نیکی یا بدی کا کوئی مادہ پایا جاتا ہو بلکہ اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ اُس کا ماحول اُسے مجبور کر کے کبھی نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور کبھی بدی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ فرائیڈ کی تھیوری ہے جو آجکل کے فلسفیوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

چوتھا خیال لوگوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ گویا وہ مجبور ہے قانون الٰہی سے۔ یہ آجکل کے بگڑے ہوئے صوفیوں کا خیال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان وہی کچھ کرتا ہے جو اُس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اور اگر انہیں کسی اصلاح کی طرف توجہ بھی دلائی جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ جب ہماری تقدیر میں گناہ لکھا ہے تو ہم اُس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں!۔

پانچواں خیال لوگوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے نتائج بھگتنے کے لئے اِس دنیا میں آتا ہے۔ اور اُس کی زندگی سابق کرم کا نتیجہ ہوتی ہے۔

چھٹا خیال جس کا اسلام مؤید ہے وہ یہ ہے کہ انسان بھلائی کے میلان کو لے کر پیدا ہوا ہے ہاں بگاڑنے سے وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔

پہلا عقیدہ کہ انسان بُرائی کے میلان کو لیکر پیدا ہوا ہے ہاں سُدھارنے سے وہ سُدھر بھی سکتا ہے بُدھوں چینیوں اور وام مارگیوں وغیرہ کا ہے۔ دوسرا عقیدہ کہ انسان بھلائی کو لے کر پیدا ہوا ہے مگر بوجہ اِس کے کہ آدمؑ نے گناہ کیا۔ اب ورثہ کا گناہ اُس کے اندر آگیا ہے اور وہ اُس سے بلا کسی اور امداد کے آزاد نہیں ہو سکتا عیسائیوں کا ہے۔ تیسرا عقیدہ کہ انسان کسی خاص ملکہ کو لے کر پیدا نہیں ہوا وہ اپنی تعلیم و تربیت سے متأثر ہوتا اور اُس کے مطابق ہو جاتا ہے گویا وہ مجبور ہے حالات زمانۂ حال کے فلسفی فرائیڈ کا ہے۔ چوتھا عقیدہ کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے گویا وہ مجبور ہے قانون الٰہی سے۔ یہ آخری زمانہ کے صوفیاء اور بعض عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ پانچواں عقیدہ کہ انسان اپنی پیدائش کے نتائج بھگتنے کے لئے اِس دنیا میں آتا ہے اور اُس کی زندگی سابق کرم کا نتیجہ ہوتی ہے یہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ چھٹا عقیدہ کہ انسان دنیا میں بھلائی کے میلان کو لیکر پیدا ہوا ہے اور اُس کے لئے بے انتہاء ترقی کے راستے کھُلے ہیں۔ ہاں بگاڑنے سے وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ یہ اسلام کا عقیدہ ہے۔

یہ چھ فلسفی نظریے ہیں۔ اِن میں سے چار جو فلسفیانہ کہلاتے ہیں جبر کی تائید میں ہیں۔ ایک کفارہ کا عقیدہ ہے کہ وہ جبر کی وجہ اپنے دادا (یعنی آدمؑ) کے عمل کو کہتا ہے اور سب دُنیا کے لوگوں کو فطرتاً بُرا قرار دیتا ہے۔ دوسرا تناسخ کا عقیدہ ہے کہ وہ جبر کی وجہ اپنی سابقہ جُونوں کے عمل کو قرار دیتا ہے۔ اور گو اِس عقیدہ کے ماتحت بعض کو اچھا اور بعض کو بُرا کہا جاتا ہو مگر بہرحال تناسخ جُونوں کے چکّر کو بُرائی کا نتیجہ قرار دیتا ہے یعنی جو اچھا ہے تناسخ ماننے والوں کے نزدیک ابھی وہ پورا اچھا نہیں تبھی وہ مختلف جُونوں میں جاتا ہے گویا بُرائی ہر انسان میں ہے صرف فرق یہ ہے کہ کسی میں کم ہے اور کسی میں زیادہ۔ جو بظاہر اچھا نظر آتا ہے اُس میں بھی درحقیقت بُرائی پائی جاتی ہے اِسی لئے مختلف جُونوں کے چکّر میں اُسے جانا پڑتا ہے۔ تیسرا مسلمانوں کا غلط العام عقیدہ ہے کہ وہ جبر کی وجہ خدا تعالےٰ کے فعل کو کہتا ہے یعنی کچھ انسان اچھے بنائے گئے ہیں اور کچھ بُرے۔ جن کو اچھا بنایا گیا ہے اُن کو اچھی فطرت دیدی گئی ہے اور جن کو بُرا بنایا گیا ہے اُن کو بُری فطرت دیدی گئی ہے۔ چوتھا فلاسفۂ جدید کا عقیدہ ہے کہ وہ انسان کو آزاد نہیں کہتے گو وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کے یا انسان کے اپنے یا اُس کے کسی دادا کے فعل کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ورثۂ طبعی یا ماحول کے نتیجہ میں وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ جن کے اندر ورثۂ طبعی

چوتھا نظریہ

پانچواں نظریہ

چھٹا نظریہ

کے طور پر بعض طاقتیں آجاتی ہیں یا جو اچھے کام کرنے والوں کے ماحول میں رہتے ہیں وہ اچھے کام کرنے لگ جاتے ہیں اور کچھ لوگ جن کے اندر ورثۂ طبعی کے طور پر بعض کمزوریاں آجاتی ہیں یا جو بُرے کام کرنے والوں کے ماحول میں رہتے ہیں وہ بُرے کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اِس میں اُن کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا ماحول اُنکی فطرت کو بدل دیتا ہے۔

یہ عقیدہ کہ انسان بُری فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کا عقیدہ ہے چنانچہ وہ عقائد جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے قریباً ہر عقیدہ میں یہ بات پائی جاتی ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ گناہ اصل ہے جس کو مٹانا ہمارا فرض ہے۔ عوام الناس تو اس بات کے اِس طرح قائل ہیں کہ وہ کہتے ہیں غلطی کرنا بشر کا کام ہے۔ بُدھوں کے نزدیک ہر انسان بُری فطرت لے کر آیا ہے اور باقی عقائد بھی ایسے ہیں کہ اگر اُن میں انسان کی کوئی خوبی تسلیم بھی کی جاتی ہے تو بُرے معنوں میں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ انسان حالات سے مجبور ہوتا ہے اگر اُس کے لئے اچھا ماحول میسر آجائے تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور اگر بُرا ماحول میسر آجائے تو وہ بُرا ہو جاتا ہے اِس عقیدہ میں گو انسان کی نیکی کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی نیکی نہیں اگر کوئی شخص جبراً نیکی کرتا ہے تو اُس کی نیکی حقیقی نیکی نہیں کہلا سکتی۔ حقیقی نیکی وہی ہوتی ہے جس میں جبر اور اکراہ کا کوئی پہلو نہ ہو۔ بہرحال قریباً سب مذاہب سوائے اسلام کے اِس بات کے قائل ہیں کہ انسان بُری فطرت لے کر آیا ہے مگر یہ سب عقائد باطل اور ناقابلِ قبول ہیں۔ پہلا عقیدہ کہ سب انسان بُری فطرت لیکر پیدا ہوئے ہیں ایک تو عوام الناس میں پایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں بندہ بشر ہے اور اِس بات پر مجبور ہے کہ غلطی کرے مگر جب ہم بچہ کی فطرت پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے بُری فطرت آخر بُرے اعمال سے ہی پہچانی جا سکتی ہے لیکن ہم جب بچوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ جھوٹ خود نہیں بولتے بلکہ دوسروں کو جھوٹ بولتے دیکھکر اِس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح کسی بچے میں ذاتی طور پر چوری کا مادہ یا خیانت کا مادہ یا اِسی قسم کی اور بُرائیوں کا مادہ نہیں پایا جاتا۔ بعض باتیں جو بچہ کرتا ہے اور جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بُری ہیں وہ بُری باتیں نہیں ہوتیں اِس لئے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کا مال نہیں اٹھانا چاہیئے یہ ایک خوبی ہے جو ہر شخص میں ہونی چاہیئے اور اگر کسی شخص میں یہ بات نہ پائی جائے تو ہم یقیناً اِس کو بُرا کہیں گے لیکن اِس کے ساتھ ہی اِس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اُسی کو بُرا کہیں گے جو دوسرے کی ملک کا مفہوم سمجھتا ہو۔ اور جانتا ہو کہ مال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک انسان کا اپنا مال ہوتا ہے اور ایک مال دوسرے کا ہوتا ہے جو چیز کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو وہ اٹھانی نہیں چاہیئے جب تک یہ مفہوم کوئی شخص پوری طرح نہ سمجھتا ہو ہم اُسے مجرم قرار دیکر اُسکے فعل کو بُرا نہیں کہہ سکتے۔ اِس نکتۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بچہ بیشک بعض دفعہ دوسروں کی چیز اٹھا لیتا ہے مگر ہم اِس سے اُس کی فطرت کی بُرائی کا استدلال نہیں کر سکتے یہ نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو اگر بچہ کی فطرت میں نیکی تھی تو اُس نے دوسرے کا مال کیوں اٹھایا؟ اِس لئے کہ اُسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ملکیت کا کیا مفہوم ہے یا یہ کہ دوسرے کا کونسا مال ہوتا ہے؟ نہ وہ ملکیت کے معنے جانتا ہے نہ دوسرے کے مال کی حقیقت کو جانتا ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جو اُس کے دائرۂ عمل سے باہر ہوتی ہیں اور جو چیزیں بچہ کے دائرۂ عمل سے باہر ہوں اُن کو بُرا یا بھلا نہیں کہا جا سکتا۔

فلسفیانہ طور پر یہ عقیدہ کہ انسان بُرائی کے میلان کو لیکر پیدا ہُوا ہے بُدھوں کا ہے۔ اُن کے نزدیک انسان کی فطرت بُری ہے اور جب بُری ہے تو انسان کے اندر جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے وہ بُری ہے اِس لئے اُن کا عقیدہ ہے کہ نجات کامل حاصل کرنے کے لئے خواہش کو مارنا چاہیئے۔ جب تک ہم اپنی خواہشات کو مارتے نہیں اُسوقت تک کامل نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بات عقلاً باطل ہے اِس لئے کہ خواہشات کس چیز کا نام ہے؟ خواہشات نام ہے کھانے پینے کا، شادی

کرنے کا۔ ایک دوسرے سے ملنے جُلنے اور تعلقات قائم کرنے کا روزی کمانے کا۔علم پڑھنے کا۔عبادت وغیرہ کرنے کا۔ یہی خواہشات ہیں جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔لیکن جب ہم بُدھ مذہب کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی سے صرف بھکشو کو روکتا ہے حالانکہ نجات تو وہ سب دنیا کو دینا چاہتا ہے۔اب اگر نجات خواہش مٹانے کا نام ہے تو جو بدھ مذہب والا ارادہ کریگا کہ مَیں نکاح کروں اُس کی نجات کس طرح ہوگی آخر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جسطرح ناک انسان کو بغیر کسی ارادہ کے مِل گیا ہے جسطرح کان انسان کو بغیر کسی ارادہ کے مِل گئے ہیں جس طرح زبان انسان کو بغیر ارادہ کے مِل گئی ہے اُسی طرح بیوی بھی بغیر کسی ارادہ کے مِل جائے۔ نہ ماں باپ کو علم ہو کہ فلاں ہماری بہو بننے والی ہے نہ خاوند کو علم ہو کہ فلاں میری بیوی بننے والی ہے اور بغیر ارادہ اور خواہش کے ہی ماں باپ کو بہو اور خاوند کو بیوی مِل جائے۔لازماً انسان کو بیوی کے لئے خواہش کرنی پڑے گی۔ اور جب وہ خواہش کریگا تو بدھ مذہب کے رو سے وہ نجات سے محروم ہو جائیگا کیونکہ اُس کے نزدیک خواہشات کو مارنا ہی انسانی نجات کا ذریعہ ہے اگر یہ کہا جاتا کہ کوئی مرد اور عورت شادی نہ کرے تب تو یہ بات ایک حد تک تسلیم بھی کی جاسکتی تھی مگر بدھ مذہب شادی سے صرف بھکشو کو روکتا ہے ہر شخص کو نہیں روکتا حالانکہ وہ دوسروں کے لئے بھی نجات کو جائز قرار دیتا ہے۔اگر نجات کا حصول اُن کے لئے جائز قرار نہ دیتا تو بھکشوؤں کے سوا وہ اوروں کو اپنے مذہب میں داخل کیوں کرتا؟ اُس کا بھکشوؤں کے سوا اور لوگوں کو بھی اپنے مذہب میں داخل کرنا صاف طور پر بتا رہا ہے کہ بدھ مذہب ہر شخص کی نجات کا قائل ہے اور جب بھکشوؤں کے سوا وہ دوسروں کو شادی کی اجازت دیتا ہے تو اِس کے معنے یہ ہیں کہ بدھ مذہب کے رُو سے شادی کا ارادہ انسان کو نجات سے محروم نہیں کرتا۔ اب اِس عقیدہ کے ماتحت کہ خواہش انسان کو نجات سے محروم کردیتی ہے ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ شادی کے معاملہ میں بُدھ مذہب کیا تعلیم دے سکتا ہے کیا یہ کہیگا کہ شادی نہ کرو؟ یہ تو وہ کرتا نہیں۔ کیونکہ بھکشوؤں کے سوا اور کسی کو وہ شادی سے نہیں روکتا۔ پھر خواہش کو کس طرح مارا جائیگا۔ انسان خواہش کرتا ہے کہ شادی کرے اِس سے بُدھ مذہب نے نہیں روکا۔اب کیا ہم یہ سمجھیں کہ شادی کے بارہ میں محض شادی کی خواہش کو تو وہ خواہش قرار نہیں دیتا لیکن اور کسی خواہش کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر یہ بات ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی کے ساتھ محض شادی کی خواہش کا ہی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اور بھی کئی قسم کی خواہشات شادی سے وابستہ ہوتی ہیں اُن کا بُدھ مذہب نے کیا علاج کیا ہے۔ مثلاً انسان چاہتا ہے کہ نیک عورت سے شادی کرے۔کیا بُدھ مذہب یہ کہیگا کہ ایسی خواہش مت کرو۔کیا اِس خواہش کو مارا جائیگا؟ اور اُسے حکم دیا جائیگا کہ بد اور شریر عورت سے شادی کرو؟ انسان خوبصورت عورت چاہتا ہے کیا اُسے کہا جائیگا کہ خوبصورت عورت کی خواہش نہ کرو بدصورت عورت سے شادی کرو؟ انسان تعلیم یافتہ عورت چاہتا ہے بُدھ مذہب کہتا ہے کہ تم اپنی خواہشات کو مٹا دو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بُدھ مذہب اُسے یہ کہیگا کہ جاہل عورت سے نکاح کرو؟ انسان چاہتا ہے کہ بچے جننے والی عورت مجھے حاصل ہو۔کیا بُدھ مذہب کے ماتحت اُسے یہ تعلیم دی جائیگی کہ بچے جننے والی عورت سے شادی نہ کرو بلکہ بانجھ سے کرو؟ انسان چاہتا ہے کہ اُس کے بچے پڑھیں لکھیں۔ کیا بُدھ مذہب اُسے کہیگا کہ چونکہ خواہش بُری چیز ہے اسلئے تم یہ خواہش نہ کرو کہ تمہارے بچے پڑھیں لکھیں بلکہ انہیں جاہل رہنے دو؟ انسان چاہتا ہے کہ اُس کے ہاں نیک اولاد ہو کیا اُسے کہا جائیگا کہ بد اولاد چاہو؟ انسان چاہتا ہے کہ اُسے کوئی اچھا کام مِل جائے اچھی ملازمت میسّر آجائے یا اچھی تجارت شروع کردے بُدھ مذہب اُسے کیا کہیگا؟ کیا یہ کہیگا کہ اچھی تجارت کی خواہش نہ کرو بلکہ گھاٹے والی تجارت کی خواہش کرو یا اچھی ملازمت تلاش نہ کرو بلکہ بُری ملازمت تلاش کرو؟ یا اچھی فصل کی خواہش نہ کرو بلکہ تباہ ہونے والی فصل چاہو؟ انسان صحت چاہتا ہے۔ بُدھ مذہب کہتا ہے خواہش بُری چیز ہے۔ایسی حالت میں جب انسان کہیگا کہ مجھے صحت کی خواہش ہے

انسان کے متعلق بدھ کے غلط نظریہ کا بطلان۔

توبُدھ مذہب کہیگا صحت کی خواہش کرکے تم گنہگار بن گئے ہو تمہیں تو چاہیئے کہ بیماری کی خواہش کرو۔ انسان اپنے ہمسایہ سے صلح چاہتا ہے، اپنے ملک میں امن چاہتا ہے کیا بُدھ مذہب کی طرف سے اُسے کہا جائیگا کہ اپنے ہمسایہ سے ہمیشہ لڑائی رکھو اور ملک میں فساد برپا کرتے رہو؟ انسان اچھی حکومت کا تقاضا کرتا ہے۔ کیا اُسے کہا جائیگا کہ بُری حکومت چاہو؟ انسان چاہتا ہے اُسے خدا کی رضا حاصل ہو جب بُدھ مذہب خواہش کو بُرا قرار دیتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ انسان کو ہمیشہ یہ خواہش رکھنی چاہیئے کہ خدا مجھ سے ناراض رہے۔ ایک بُدھ مذہب والا چاہتا ہے کہ اُس کا مذہب پھیل جائے مگر جونہی اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی وہ نجات سے محروم ہو جائیگا۔ جب ایک شخص بھکشو بننے کے لئے آتا ہے تو آخر اِسی لئے کہ وہ چاہتا ہے مجھے نجات مل جائے حالانکہ بھکشو بنتے ہی اُس کی نجات ماری جاتی ہے کیونکہ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ مَیں اور لوگوں کو بھی اِس مذہب میں داخل کروں بلکہ اِس سے بڑھ کر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو بھکشو بنانے کا ارادہ کرکے خود بُدھ کی نجات بھی ماری گئی کیونکہ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ مَیں لوگوں کو بھکشو بناؤں پھر اگر بُدھ مذہب کے لوگ اپنے ملک کی آزادی چاہتے ہیں تو اِس تعلیم کے ماتحت انہیں کیا کہا جائیگا؟ کیا یہ کہا جائیگا کہ آزادی کی خواہش نہ کرو۔ اگر تمہارے ملک پر کوئی قبضہ کرنا چاہتا ہے تو اُسے بے شک کرنے دو۔ ورنہ نجات سے محروم ہو جاؤ گے۔

اگر بُدھ مذہب والے کہیں کہ یہ تو جائز اور اچھی خواہشات ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ تم بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہو کہ خواہشات اچھی بھی ہوتی ہیں اور بُری بھی انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اچھی خواہشات کے پیچھے چلے اور بُری خواہشات کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش نہ کرے۔ بس تمہارا یہ کہنا کہ چونکہ انسان میں خواہشات پائی جاتی ہیں اِس لئے وہ پیدائشی طور پر بُرا ہے بالکل غلط ہُوا۔ تم نے خود تسلیم کر لیا کہ خواہشات اچھی بھی ہوتی ہیں اور بُری بھی۔ بُری خواہشات کو مٹانا اور اچھی خواہشات کو قائم کرنا ہمارا فرض ہے اور یہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ پس ہمارا اور تمہارا اتحاد ہوگیا۔

ایک بُدھ مذہب والا ہماری اِس تنقید پر یہ کہہ سکتا ہے کہ تم ہمارے مذہب کو غلط طور پر پیش کرتے ہو۔ جب تم کہتے ہو کہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ آزادی کی خواہش نہ کی جائے بلکہ غلامی کی خواہش کی جائے صحت کی خواہش نہ کی جائے بلکہ بیماری کی خواہش کی جائے۔ خوبصورت بیوی کی خواہش نہ کی جائے بلکہ بدصورت بیوی کی خواہش کی جائے۔ علم کی خواہش نہ کی جائے بلکہ جہالت کی خواہش کی جائے تو تم بالمقابل کی خواہشات ہماری طرف منسوب کر دیتے ہو حالانکہ ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ خواہشات ہر حالت میں بُری ہیں خواہ وہ اچھی چیزوں کی ہوں یا بُری چیزوں کی ہوں ہم خواہش کو مٹانا چاہتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ اچھی خواہش نہ کرو بُری خواہش کرو بلکہ ہم اِس بات کے قائل ہیں کہ نہ اچھی خواہش کی جائے نہ بُری کیونکہ اِسی میں انسان کی نجات ہے۔ اِسکا جواب یہ ہے کہ اچھا ہم مان لیتے ہیں تمہارا یہی مقصد ہے تم یہی کہتے ہو کہ نہ یہ چاہو نہ وہ چاہو مگر سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں انسان کام کِس طرح کریگا؟ باپ اُس سے شادی کے متعلق پوچھیگا تو وہ کہیگا نہ مَیں شادی کرنا چاہتا ہوں نہ کنوارہ رہنا چاہتا ہوں۔ ایک شادی شدہ بُدھ اپنے گھر میں جاتا ہے بیوی اُس سے کہتی ہے کہ کھانا تیار ہے آؤ اور کھالو۔ وہ جواب دیگا نہ مَیں کھانا چاہتا ہوں نہ بھوکا رہنا چاہتا ہوں۔ غرض یہ عقیدہ اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو بُدھوں کو قدم قدم پر نہایت سخت مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ فرض کرو کسی مجلس میں بدھ مذہب کا کوئی پیرو آجائے تو وہ حیران ہوگا کہ مَیں اِس مجلس میں بیٹھوں یا چلا جاؤں اگر وہ بیٹھیگا تو یہ بھی خواہش کا نتیجہ ہوگا اور اگر چلا جائیگا تو یہ بھی خواہش کا نتیجہ ہوگا۔ غرض ایک بُدھ ایسے چکر میں پھنس جاتا ہے کہ اُس کے لئے اُٹھک بیٹھک کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔

حکومت کے بارہ میں اُس سے سوال کیا جائیگا کہ کیسی حکومت چاہتے ہو تو وہ جواب دے گا کہ نہ مَیں اچھی حکومت

چاہتا ہوں نہ بُری حکومت چاہتا ہوں۔ اگر سوال کیا جائیگا۔ کہ میاں منظم حکومت چاہتے ہو یا انارکی؟ تو وہ کہیگا کہ نہ مَیں منظم حکومت چاہتا ہوں نہ انارکی۔ ووٹ کے متعلق حاضر ہوگا اور اُس سے پوچھا جائیگا کہ اِس ممبر کو ووٹ دینا چاہتے ہو یا اُس کو؟ تو وہ کہیگا کہ نہ مَیں اِس کو ووٹ دینا چاہتا ہوں اور نہ اُس کو۔ پولنگ افسر کہیگا تو پھر جاؤ تم آئے کس لئے تھے وہ کہیگا نہ مَیں جانا چاہتا ہوں نہ کھڑا رہنا چاہتا ہوں۔

غرض یہ عقیدہ ایسا غلط اور بے بنیاد ہے کہ اِس کی جسقدر بھی تشریح کی جائے سوائے ہنسی اور مذاق کے اِس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اگر کہا جائے کہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان نیک خواہش کرے تو معلوم ہُوا کہ نیکی کا مادہ اُس میں موجود ہے اور یہی ہم کہتے ہیں کہ انسان میں نیک خواہشات بھی پائی جاتی ہیں اور بُری بھی۔ جب کوئی شخص اپنے فطرتی تقاضوں کو عقل اور مصلحت کے ماتحت استعمال کرتا ہے تو وہ نیک کہلاتا ہے اور جب فطری تقاضوں کو عقل اور مصلحت کے خلاف استعمال کرتا ہے تو بُرا کہلاتا ہے ایسی صورت میں صحیح طریق یہ ہوتا ہے کہ فطرت کو ابھارا جائے اور طبعی تقاضوں کے غلط استعمال سے انسان کو بچایا جائے نہ یہ کہ انسانی فطرت کو ہی گندا اور ناپاک قرار دے دیا جائے۔ بہرحال اگر بُدھوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہمارا مدّعا یہ ہے کہ انسان نیک خواہش کرے تو معلوم ہُوا کہ نیکی کا مادہ اُس میں موجود ہے اور اُس کی خواہش اُسے کرنی چاہیئے اور جب خواہش کرنی ثابت ہوئی تو پھر ہم سوال کریں گے کہ وہ کونسی بات فطرت میں ہے جسے بُرا کہا جا سکتا ہے۔ فطرت میں تو جسقدر تقاضے پائے جاتے ہیں سب کے سب اچھے ہیں صرف اُن کا غلط استعمال انسان کو بُرا بنا دیتا ہے۔ مثلاً فطرت یہ کہتی ہے کہ کھانا کھاؤ۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ زید کا کھانا اٹھا کر کھا جاؤ اگر تم زید کا کھانا اٹھا کر کھا جاتے ہو تو یہ تمہارا اپنا قصور ہے فطرت نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ تم زید کا کھانا کھاؤ۔ اُس نے صرف اتنا کہا تھا کہ کھانا کھاؤ۔ دوسرے کی روٹی اٹھا کر کھا جانے کا خیال تمہارے دل میں اُسوقت آتا ہے جب تم کہتے ہو کہ روٹی میرے پاس موجود نہیں ہے اور بھوک لگی ہوئی ہے اُس وقت تم فطرت کے اِس تقاضا کا غلط استعمال کرکے کسی اور شخص کا کھانا چُرا کر کھا جاتے ہو۔ ورنہ فطرت نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ نہیں کہا تھا کہ زید یا بکر کا کھانا کھا جاؤ۔ یا مثلاً جب شادی کی خواہش انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے تو فطرت اُسے اِتنا ہی کہتی ہے کہ شادی کرو۔ یہ نہیں کہتی کہ کسی دوسرے کی بیوی کو اڑا لو۔ یا مثلاً فطرت یہ تو کہتی ہے کہ مال خرچ کرو مگر یہ نہیں کہتی کہ بے موقعہ اور بے محل اپنا مال خرچ کرتے چلے جاؤ۔ یہ بگاڑ جو بعد میں پیدا ہوتے ہیں انسانی ماحول اور اُس کے مختلف حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ورنہ فطرت اِن امور کی طرف انسان کی راہنمائی نہیں کرتی۔ اِسی طرح مثلاً شجاعت کا مادہ ہے جو فطرت میں پایا جاتا ہے۔ بسا اوقات انسان اپنی جان یا اپنے مال کی قربانی کرکے دوسروں کو بڑے بڑے نقصانات سے بچا لیتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب ظلم کوئی الگ خاصہ نہیں بلکہ شجاعت کے ایک فطری مادے کا غلط استعمال ہے۔ خدا نے یہ مادہ انسان میں اِس لئے رکھا تھا کہ وہ دوسروں کے لئے قربانی کرے۔ مگر بعض دفعہ یہ اِس تقاضے کا غلط استعمال کرکے دوسروں کے حقوق کو غصب کر لیتا ہے۔ یا مثلاً ترقی کا جذبہ ہر انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ مگر جب اِس جذبہ کو بُرے طور پر استعمال کیا جائے تو اِس سے حسد پیدا ہوتا ہے یعنی انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف مَیں ہی آگے بڑھوں اور کوئی نہ بڑھے۔ بہرحال جب فطرت میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی گئی جسے بُرا کہا جا سکتا ہو۔ صرف فطری جذبات اور تقاضوں کا غلط استعمال بُرا ہوتا ہے تو سوال صرف اتنا رہ جائیگا کہ کیا خدا تعالےٰ نے شجاعت، سخاوت اور محبّت وغیرہ اچھے کاموں کے لئے پیدا کی ہے یا بُرے کاموں کے لئے۔ اگر کہو کہ بُرے کاموں کیلئے تو بُرا کام ہی نیکی ہُوا کہ خدا تعالےٰ کی رضامندی اُس میں ہے ورنہ خدا تعالےٰ پر اعتراض آئیگا کہ اُس نے اِن قوتوں کو پیدا تو اِس لئے کیا تھا کہ بُرے کام کئے جائیں مگر جب بُرے کام

کئے جاتے ہیں تو وہ نامامن ہوتا ہے۔ اور اگر کہو کہ اچھے استعمال کے لئے خدا تعالےٰ نے اِن چیزوں کو پیدا کیا ہے تو فطرت نیک ہوئی بدکسطرح ہوئی؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اِس سے ہرگز انکار نہیں کہ وہ حالات جن میں سے انسان گذرتا ہے اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ کبھی اُن حالات کی وجہ سے وہ نیکی کی طرف چلا جاتا ہے اور کبھی بدی کی طرف جُھک جاتا ہے لیکن بہر حال فطرت جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے وہ بُری نہیں ہیں۔

اِسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دامؔ مارگی پیدا ہوئے ہیں انہوں نے اِس نظریّہ کا ایک اور پہلو لیا ہے۔ دامؔ مارگ کے معنے ہیں خواہش کا مذہب اور بُدھ مذہب کے معنے ہیں خواہش مارنے کا مذہب۔ بُدھ مذہب تو اِس بات پر زور دیتا ہے کہ چونکہ خواہشات بُری چیز ہیں۔ اِس لئے اُن کو مٹانا انسان کا اوّلین فرض ہے۔ جب تک وہ اپنی خواہشات کو کُلّی طور پر فنا نہیں کر دیتا اُسوقت تک نجات اُسے حاصل نہیں ہو سکتی لیکن دام مارگی یہ کہتے ہیں کہ انسانی پیدائش کی غرض اُسوقت پوری ہوتی ہے جب وہ اپنی خواہشات کا جائزہ لیتے ہوئے ہر خواہش کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرے۔ اُن کا مذہب یہ ہے کہ فطرت چونکہ خدا کی پیدا کردہ ہے اِس لئے انسان کے دل میں جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے وہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہوتی ہے۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ بے شک فطرت کو خدا تعالےٰ نے پیدا کیا ہے مگر فطرت کا ظہور تو اپنے ماحول سے متأثر ہوتا ہے۔ بچّہ کی شکل خدا تعالےٰ نے کامل بنائی ہے لیکن کیا وہ ماں کے پیٹ میں رہائش کے وقت کئی بیماریوں اور چوٹوں سے بُری شکل اختیار نہیں کر سکتا؟ اِسی طرح انسانی فطرت کو حالات بد بھی بنا دیتے ہیں۔ اِسلئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو خواہش بھی انسان کے دل میں پیدا ہو وہ ضرور اچھی ہوتی ہے اگر حالات نے اُسے بُرا بنا دیا ہوگا تو لازماً اُس کے دل میں بُری خواہشات پیدا ہونگی جن پر عمل اُس کے جسم اور روح دونوں کے لئے مہلک ہوگا۔ بہر حال دام مارگی یہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت نیک ہے تو اُس کی ہر خواہش نیک ہے

انسان کے متعلق دوسرے غلط نظریّے کا بطلان

اور اگر فطرت بُری ہے تو پھر جن امور کو تُم بُرا کہتے ہو وہی نیکی کا معیار ہیں۔ چنانچہ اِسی بناء پر یہ لوگ پیشاب۔ پاخانہ۔ مُردہ کا گوشت اور اِسی طرح کی دوسری چیزوں کو بھی جائز سمجھتے اور گندگی اور غلاظت کو صفائی وغیرہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ دامؔ مارگیوں نے بھی وہ چیز جو ماحول سے پیدا ہوتی ہے اُسکا نام فطرت رکھدیا ہے حالانکہ اُس کا نام فطرت نہیں۔ ہم صرف اُن تقاضائے بشری کے متعلق جو غیر معیّن ہوں یہ دعوے کرتے ہیں کہ انہیں نیکی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے یہ نہیں کہتے کہ مخصوص حالات کے ماتحت جو خواہشات انسانی قلب میں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی نیک ہوتی ہیں۔ جو تقاضے مخصوص حالات کے ماتحت انسانی قلب میں پیدا ہوں ہم اُس کا نام فطرت نہیں رکھتے اور نہ قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ضرور نیک ہونگے مگر افسوس کہ وہ اِس ٹھوکر میں مبتلا ہو گئے کہ اگر فطرت نیک ہے تو پھر جن چیزوں کو تم بُرا کہتے ہو وہ بُری نہیں بلکہ اچھی ہیں اور اگر فطرت بُری ہے تو پھر جن امور کو تم بُرا کہتے ہو وہی نیکی کا معیار ہیں مگر خود انسانی فطرت اِن امور کا انکار کرتی ہے چنانچہ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو چھپاتے ہیں اور ظاہر ہونے سے ڈرتے ہیں جس سے ہمارے قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ انسان بھلائی کو لے کر پیدا ہوا مگر آدم اوّل نے گناہ کیا اِس لئے سب انسان گناہ پر مجبور ہیں۔ اگر یہ لوگ دہریہ ہوتے تو ہم اُن سے اَور رنگ میں گفتگو کرتے لیکن یہ لوگ ایک مذہب کو ماننے والے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ خود اُن کا اپنا مذہب اِس عقیدہ کو ردّ کرتا ہے۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ درست ہے کہ آدم اوّل نے گناہ کیا جس کے نتیجہ میں اب ورثہ کا گناہ انسان کے اندر آگیا ہے اور وہ اِس سے بلا کسی اور امداد کے آزاد نہیں ہو سکتا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کی تمام مخلوق نجات سے محروم ہونی چاہیئے۔ کیونکہ کفّارہ تو مسیحؑ نے پیش کیا ہے مسیحؑ کے کفّارہ پر ایمان لانے والے تو نجات پا سکتے ہیں مگر پہلے لوگوں کی نجات اِس عقیدہ کی رُو سے قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اَب سوال یہ ہے

کہ گیا فطرت کی اِس اصلاح یعنی کفّارۂ مسیحؑ سے پہلے سب لوگ گنہگار اور غیر ناجی تھے؟ اِس کا جواب خود بائیبل دیتی ہے کہ وہ آدم کو لعنتی قرار نہیں دیتی بلکہ شیطان سے دھوکا کھانے کے بعد بھی خدا اُس پر راضی رہتا ہے۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے کہ جب آدم نے گناہ کیا اور اُس کے نتیجہ میں وہ ننگا ہو گیا تو خداوند خدا نے آدم اور اُس کی جورو کے واسطے چمڑے کے کُرتے بنا کے اُن کو پہنائے" (پیدائش باب ۳ آیت ۲۱) اگر آدم سے خدا ناراض ہو چکا تھا اور اُسے اپنی روحانی اولاد سے وہ خارج کر چکا تھا۔ تو چاہیئے تھا کہ اِس واقعہ کے بعد آدم پر ناراضگی کا اظہار ہوتا۔ نہ یہ کہ اُسے اور اُس کی بیوی کو چمڑے کے کپڑے بنا کر دیتا اور اُن کے ننگ کو ڈھانکتا۔ اللہ تعالیٰ کا آدم اور اُس کی بیوی کو اِس واقعہ کے بعد چمڑے کے کپڑے بنوا کر دینا بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ اِس واقعہ کے بعد بھی آدم سے راضی رہا۔ پھر لکھا ہے۔ فرشتوں سے خدا نے کہا" دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا" (پیدائش باب ۳ آیت ۲۲) یعنی نیکی اور بدی کی پہچان میں آدم خدا اور اُس کے فرشتوں جیسا ہو گیا ہے جو شخص نیکی اور بدی کی پہچان میں خدا اور اُس کے فرشتوں جیسا ہو جائے وہ لعنتی کس طرح ہو سکتا ہے یہ تو ایک اعلیٰ درجے کا مقام ہے جو آدم کو حاصل ہوا۔

آدمؑ کے بعد حنوک آئے جو حضرت نوحؑ کے پردادا تھے اُن کے بارہ میں لکھا ہے" حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا اس لئے کہ خدا نے اُسے لے لیا" (پیدائش باب ۵ آیت ۲۴) اِس آیت کا خلاصہ بائیبل میں اِس طرح درج کیا گیا ہے:-
" حنوک کی دینداری اور اُس کے جیتے جی خدا کے حضور چلے جانے کی خبر"۔ یہ حوالہ ظاہر کر رہا ہے کہ حنوک اللہ تعالیٰ کا اِس قدر پیارا تھا کہ خدا نے اُسے اور لوگوں کی طرح موت جسمانی نہیں دی بلکہ جیتے جی اُسے آسمان پر اُٹھا لے گیا۔ حالانکہ عیسائی عقیدہ کی رو سے آدم کو گناہ کی جو سزا دی گئی تھی اُس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ وہ دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک دن موت کا شکار ہو جائیگا۔ چنانچہ پیدائش باب ۳ آیت ۱۹ میں اِس سزا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے" تو خاک ہے اور پھر خاک میں جائیگا۔" گویا عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آدم کے گناہ کے نتیجہ میں انسان کو موت کی سزا دی گئی ہے اِسی طرح اُسے زمین پر رہنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اگر آدم گناہ نہ کرتا تو انسان ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا اور زمین پر رہنے پر مجبور نہ ہوتا۔ مگر اوپر کے حوالہ میں بتایا گیا ہے کہ حنوک کو خدا نے موت نہیں دی بلکہ اُسے زندہ ہونے کی حالت میں آسمان پر اٹھا لیا۔ اگر اِس حوالہ میں صرف حنوک کی دینداری کا ذکر ہوتا۔ یہ بات بیان نہ کی جاتی کہ خدا نے اُسے موت سے بچایا اور جیتے جی آسمان پر اُٹھا لیا تب بھی یہ اِس بات کا ثبوت ہوتا کہ مسیحؑ کی آمد یا اُس کے کفارہ پر ایمان لانے کے بغیر بھی لوگ نیک ہو سکتے ہیں۔ مگر اس حوالہ سے یہ زائد بات بھی نکلتی ہے کہ حنوک موت سے بچ گیا اور آسمان پر زندہ اُٹھا لیا گیا۔ حالانکہ موت اور زمین پر رہنا ایک سزا تھا آدم کے گناہ کی۔ پس جسے موت نہیں آئی اور آسمان پر چلا گیا اُس کے متعلق بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُس نے ورثہ کے گناہ سے کوئی حصہ نہیں پایا۔ اگر پایا ہوتا تو عیسائی عقیدہ کی رو سے وہ ضرور مرتا۔ مگر چونکہ وہ زندہ رہا اور جیتے جی آسمان پر اُٹھا لیا گیا اِس لئے یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ اُس نے ورثہ کے گناہ سے حصہ نہیں لیا۔ پھر ساتھ ہی لکھا ہے" حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا" خدا کے ساتھ ساتھ چلنے کے یہ معنے ہیں کہ اُس کی زندگی صرف خدا کے کام میں مصروف تھی کسی اور طرف اُس کی توجہ نہیں تھی۔ اور جس شخص کی زندگی صرف خدا کے کام میں صرف ہو رہی ہو اور دن اور رات اُسے یہی فکر ہو کہ میں اُن فرائض کو بجا لاؤں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر عائد کئے گئے ہیں وہ اُس رنگ میں اپنی معاش کا سامان نہیں کر سکتا جس رنگ میں دوسرے لوگ جد و جہد کرتے اور اپنی روزی کا فکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر خدا کے ساتھ ساتھ چلنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اُسے رزق بلا محنت ملتا تھا۔ گویا وہ دوسری سزا بھی اُسے نہیں ملی جو آدم کے گناہ کی وجہ سے مقرر ہوئی تھی

اور جس کا ذکر بائیبل میں اِن الفاظ میں پایا جاتا ہے کہ "تُو اپنے مونہہ کے پسینہ کی روٹی کھائیگا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جاؤ کہ تو اُس سے نکالا گیا ہے کہ تُو خاک ہے اور پھر خاک میں جائیگا" (پیدائش باب ۳ آیت ۱۹) اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ آدم کو دُو سزائیں دی گئی تھیں ایک یہ کہ وہ ہمیشہ اپنے ماتھے کے پسینہ روٹی کھائیگا اور دوسرے یہ کہ وہ اِس دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہیگا بلکہ ایک دن آئیگا جب اُسے موت کا تلخ گھونٹ پینا پڑے گا۔ مگر حنوک کو نہ موت کا تلخ گھونٹ پینا پڑا اور نہ ماتھے کے پسینہ سے اپنے لئے روزی کا سامان مہیا کرنا پڑا وہ جیتے جی بغیر مرنے کے آسمان میں غائب ہو گیا اور پھر وہ ہمیشہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گویا اُسے رزق بلا محنت ملتا رہا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ عیسائی مذہب کے رُو سے حنوک ورثہ کے گناہ اور اُس کے اثرات سے قطعی طور پر محفوظ تھا۔ اگر ورثہ کا گناہ حنوک میں بھی آتا تو ضروری تھا کہ وہ مر کر زمین میں دفن ہوتا اور ضروری تھا کہ وہ ماتھے کے پسینہ سے اپنے لئے روٹی مہیا کرتا۔ مگر اُس کا نہ مرنا اور نہ ماتھے کے پسینہ سے روٹی کھانا بتا رہا ہے کہ حنوک عیسائی مذہب کے رُو سے بالکل پاک تھا۔

اِس کے بعد نوحؑ آئے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ لمک نے اپنے بیٹے کا نام نوحؑ رکھا اور کہا کہ "یہ ہمارے ہاتھوں کی محنت اور مشقت سے جو زمین کے سبب سے ہیں جس پر خدا نے لعنت کی ہے ہمیں آرام دیگا" (پیدائش باب ۵ آیت ۲۹) یعنی آدم کے گناہ کی وجہ سے جو زمین پر لعنت ڈالی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ انسان ہمیشہ محنت اور مشقت سے اپنے لئے روزی کمائیگا وہ لعنت نوحؑ کی وجہ سے دُور ہو جائیگی۔

یہ امر بتایا جا چکا ہے کہ آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دُو سزائیں ملی تھیں۔ ایک یہ کہ انسان محنت و مشقت سے روزی کمائیگا اور دوسری یہ کہ وہ ایک دن مر کر زمین میں دفن ہوگا۔ لمک نے اپنے بیٹے کا نام نوحؑ رکھا اور اِسلئے رکھا کہ "یہ ہمارے ہاتھوں کی محنت اور مشقت سے جو زمین کے سبب سے ہیں جس پر خدا نے لعنت کی ہے ہمیں آرام دیگا"۔ گویا انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ نوحؑ کی وجہ سے وہ محنت اور مشقت سے آزاد ہو جائیں گے اور انہیں آرام میسر آ جائیگا جس کے معنے یہ ہیں کہ نوحؑ نے اِس لعنت کو آکر دُور کر دیا۔ اگر کہا جائے کہ انہوں نے یونہی بلا وجہ ایک امید ظاہر کر دی تھی تو سوال یہ ہے کہ بائیبل نے اِس کو نقل کیوں کیا ہے؟ بائیبل کا اِسے نقل کرنا بتا رہا ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم کے ماتحت یہ اُمید ظاہر کی تھی اور یہ توقع وہ تھی جسے نوحؑ نے اپنی زندگی میں پورا کرنا تھا اور اِس طرح انہوں نے اُس لعنت کو دُور کر دینا تھا جو آدم کے گناہ کی وجہ سے زمین پر مسلط تھی

پھر نوحؑ کے بارہ میں لکھا ہے:- "نوحؑ اپنے قرنوں میں صادق اور کامل تھا اور نوحؑ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا" (پیدائش باب ۶ آیت ۹) جو شخص صادق اور کامل تھا وہ گنہگار کس طرح ہو گیا؟ پھر نوحؑ وہ شخص تھا جو خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ اب بتاؤ جو شخص صادق بھی ہو اور کامل بھی اور پھر خدا کی مرضی کے خلاف کبھی کوئی فعل بھی نہ کرتا ہو اُسے گنہگار کسطرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر نوحؑ سے خدا تعالیٰ نے کہا:- "مَیں تجھ سے اپنا عہد قائم کرونگا" (پیدائش باب ۶ آیت ۱۸) جس شخص کو خدا اپنے عہد کے لئے منتخب فرمائے اُسے غیر نجات یافتہ کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

پھر لکھا ہے نوحؑ نے خدا کے لئے ایک مذبح بنایا اور اُس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ جب نوحؑ نے عبادت کی تو "خداوند نے خوشنودی کی بُو سونگھی اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے لئے مَیں زمین کو پھر کبھی لعنت نہ کرونگا" (پیدائش باب ۸ آیت ۲۱) گویا نوحؑ کی عبادت اللہ تعالیٰ کو اِسقدر پسند آئی کہ اُس نے کہا۔ مَیں زمین پر پھر کبھی لعنت نہیں کرونگا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب پہلی لعنت نوحؑ نے دُور کر دی تھی تو آئندہ کونسی نئی لعنت پیدا ہوئی تھی جس سے فطرتِ انسانی مسخ ہو گئی اور جو مسیح نے آکر دُور کی؟

پھر اُن کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اُنکے متعلق

بائیبل میں لکھا ہے کہ خدا نے اُن کو فرمایا:۔ "مَیں تجھے ایک بڑی قوم بناؤنگا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کرونگا۔ اور تو ایک برکت ہوگا اور اُنکو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دونگا اور اُسکو جو تجھ پر لعنت کرتا، ملعون کرونگا اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پاوینگے" (پیدائش باب ۱۲ آیت ۲ و ۳) اب دیکھو اِس میں کتنی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ مَیں تجھ کو مبارک کرونگا۔ یہ صاف بات ہے کہ خدا کا مبارک کیا ہوُا انسان لعنتی نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ تُو ایک برکت ہوگا یعنی تُو مجسّم برکت ہوگا۔ اور تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ نہ صرف تُو مبارک ہوگا اور تیری وجہ سے دنیا برکت پائے گی بلکہ جو تجھے برکت دینگے میں اُن کو بھی برکت دونگا۔ یہی وہ فقرہ ہے جس کے جواب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ دعا سکھائی کہ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ یعنی اَے خدا: تُو نے جو ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ مَیں تجھے برکت دونگا اور تجھے برکت دینیوالوں کو بھی برکت دونگا ہم تیرے اِس وعدہ کے مطابق ابراہیمؑ کو برکت دے رہے ہیں تُو ہمارے گھروں کو بھی اپنی برکتوں سے بھر دے اور اپنے فضلوں سے ہمیں حصہ دے۔ گویا ابراہیمؑ کو برکت دینے والے لعنتی نہیں ہوسکتے اور ابراہیمؑ پر لعنت کرنے والے کبھی اللہ تعالےٰ کی برکت سے حصہ نہیں لے سکتے۔ عیسائی کہتے ہیں آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے خدا نے دنیا پر لعنت کی اور یہاں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ابراہیمؑ اور اُس سے تعلق رکھنے والے کبھی لعنتی نہیں ہوسکتے ہاں ابراہیمؑ کو لعنت کرنیوالے ضرور لعنتی ہیں۔ پس وہ عقیدہ جو آجکل عیسائیوں میں پایا جاتا ہے اِس حوالہ کی موجودگی میں بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔

پھر ابراہیمؑ کے زمانہ میں ایک اور شخص تھے جنکا نام ملک صدق سالیم تھا۔ اُن کے متعلق خود انجیل میں لکھا ہے کہ " وہ پہلے اپنے نام کے معنوں کے موافق راستی کا بادشاہ ہے اور پھر شاہ سالیم یعنی سلامتی کا بادشاہ" (عبرانیوں باب ۷ آیت ۲) مطلب یہ ہے کہ جیسا اُس کا نام تھا ویسے ہی اوصاف اُس کے اندر پائے جاتے تھے۔ اُس کا نام بھی ملک صدق تھا اور واقعہ میں بھی راستی کا بادشاہ تھا اور پھر جسطرح وہ ظاہر میں شاہ سالیم تھا اِسی طرح معنوی لحاظ سے بھی وہ سلامتی کا بادشاہ تھا۔ آگے لکھا ہے۔" یہ بے باپ۔ بے ماں۔ بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا آخر مگر خدا کے بیٹے کے مشابہ ٹھیر کے ہمیشہ کاہن رہتا ہے۔" (عبرانیوں باب ۷ آیت ۳) گویا ملک صدق سالیم جو راستی اور سلامتی کا بادشاہ تھا وہ بے باپ بھی تھا اور بے ماں بھی۔ نہ اُس کی زندگی کا آغاز تھا اور نہ اُسکا کوئی انتہاء اور وہ خدا کے بیٹے کے مشابہ تھا۔ ایسا شخص تو یقیناً سب سزاؤں سے بچا ہوُا تھا۔ یہاں کوئی عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ملک صدق سالیم نے اِس لئے نجات پائی تھی کہ وہ بے باپ اور بے ماں تھا ورنہ کا گناہ اُسے حاصل نہ ہوُا تھا مگر سوال یہ ہے کہ اگر بے باپ اور بے ماں مصلین پہلے سے دنیا کو مل چکے تھے تو پھر مسیح کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا مسیح کی معصومیت اور اُس کی قربانی پر زور دینا اِسی لئے ہے کہ تم سمجھتے ہو دنیا کے لئے کوئی ایسا مصلح چاہیئے تھا جو بے گناہ ہو اور چونکہ آدمؑ سے لیکر مسیحؑ تک کوئی بے گناہ مصلح نہیں آیا بلکہ ہر شخص جو پیدا ہوُا وہ ورثہ کا گناہ لے کر آیا اِس لئے ضروری تھا کہ خدا کا بیٹا جو بے گناہ تھا آتا اور لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا مگر عبرانیوں کا وہ فقرہ جسے اوپر درج کیا گیا ہے بتا رہا ہے کہ مسیح سے پہلے ملک صدق سالیم آیا اور وہ ایسا شخص تھا جو قطعی طور پر بیگناہ تھا نہ اُس کی ماں تھی نہ باپ اور اِس طرح ورثہ کے گناہ کا اُسمیں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اِسی طرح اسحاقؑ۔ یعقوبؑ۔ یوسفؑ۔ موسیٰؑ داؤدؑ سب کی نیکی اور پاکبازی کا اقرار بائیبل میں موجود ہے۔ اَب سوال یہ ہے کہ مسیحؑ سے پہلے اگر اتنے لوگ کفارہ مسیحؑ پر ایمان لائے بغیر نجات پا گئے ہیں تو آئندہ کیوں نجات نہیں پا سکتے جس ذریعہ سے پہلوں نے نجات پائی ہے اُسی ذریعہ سے بعد کے لوگ بھی نجات پا سکتے ہیں مسیحؑ کی قربانی یا اُس کے کفارہ کی کیا ضرورت ہے؟ بہرحال پہلے لوگوں کا نجات پا جانا ثبوت ہے

اِس بات کا فطرت انسانی کو کوئی گناہ ورثہ میں نہیں پہنچا۔ اگر پہنچا ہوتا تو یہ لوگ خدا تعالیٰ کے محبوب اور اُس کے مقرب نہ بن سکتے!

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح کی آمد نے کوئی ایسا تغیر پیدا کیا ہے جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ انسان فطرت گناہ سے بچ گیا ہے؛ ظاہر ہے کہ مسیح کے بعد گناہ نے ترقی کی ہے۔ شرک نے ترقی کی، ظلم نے ترقی کی، جھوٹ فریب اور دغابازی نے ترقی کی۔ اور تو اور عیسائی لوگ ایک دوسرے کے ظلموں کے شاکی ہو رہے ہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ اگر مسیح کے کفارہ سے واقعہ میں ورثہ کا گناہ معاف ہو گیا تھا تو مسیح کے آنے کے بعد گناہ میں زیادتی کیوں ہوئی؟ عیسائی اِس سوال کا ایک فلسفیانہ جواب دیتے ہیں جو ہماری جماعت کے دوستوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے وہ کہتے ہیں ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ محض مسیح پر ایمان لانے کی وجہ سے گناہ جاتا رہتا ہے۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر جو نیک بننے کی خواہش پائی جاتی ہے اگر کفارۂ مسیح پر ایمان لانے کے بعد یہ خواہش انسان کے دل میں پیدا ہو تو وہ اپنے اِس مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر تم ہمیں کروڑوں عیسائی بھی گنہگار دکھا دو تو اِس میں کوئی ہرج کی بات نہیں تم بھی تو یہ نہیں کہتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ہر شخص کے اندر نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ تم یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر اِس ایمان کی وجہ سے ایک مقدرت پیدا کر دی جاتی ہے جس سے کام لیکر وہ اگر نیک بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ اِسی طرح ہم کہتے ہیں مسیح کے کفارہ سے پہلے کوئی شخص نجات نہیں پا سکتا تھا کیونکہ اُس میں ورثہ کے گناہ کا اثر تھا جو اُسے ترقی سے روک رہا تھا۔ لیکن مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے کے بعد اُس کی نجات کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ ہم امکان نجات کے مدعی ہیں اِس بات کے مدعی نہیں کہ ہر شخص جو کفارہ مسیح پر ایمان لائیگا وہ خواہ اپنی نیک قوتوں کو استعمال نہ کرے تب بھی نجات پا جائے گا جس طرح آدمؑ نے گناہ کیا تھا اِسی طرح اَب بھی لوگ گناہ کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر وہ اِس سے بچنا چاہیں تو بچ بھی سکتے ہیں۔ کیونکہ پچھلا بوجھ اُتر گیا ہے اور آئندہ کے لئے ایمان نے اُنکے اندر نیکی کی مقدرت پیدا کر دی ہے۔ یہ جواب ہے جو عیسائی لوگ دیا کرتے ہیں۔ اِس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بائیبل اِس بات پر گواہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد سے پہلے بھی کئی لوگ گناہ سے بچا کرتے تھے۔ جب پہلے لوگ گناہ سے بچا کرتے تھے تو اب بغیر کفارۂ مسیح پر ایمان لانے کے وہ گناہوں سے کیوں بچ نہیں سکتے اور جبکہ پہلے لوگ بغیر اِس کفارہ کے نجات پا گئے اور خدا کے ساتھ ساتھ چلنے والے بنے بلکہ بقول بائیبل بعض موت سے بھی بچے رہے جیسا کہ ایلیاہ کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ " وہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا" (۲ سلاطین باب۲ آیت ۱۱) تو پھر ورثہ کا گناہ کہاں گیا اور جب بعد کے لوگ بھی گناہ میں مبتلا رہے تو پھر کفارہ کا فائدہ کیا ہوا! اِس کا جواب عیسائی لوگ یہ دیتے ہیں کہ مسیح کی آمد سے پہلے جو لوگ گناہوں سے بچتے تھے وہ اِس لئے بچتے تھے کہ مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئے تھے۔ خدا تعالیٰ سے اُن کو خبر مل جاتی تھی کہ آئندہ زمانہ میں خدا کا ایک بیٹا آئے گا لوگ اُسے صلیب پر لٹکائیں گے اور وہ دنیا کے گناہوں کے بدلے اپنے آپ کو قربان کر دیگا۔ وہ یہ خبر سنتے اور کہتے اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا چنانچہ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ مَیں آنے والے مسیح پر ایمان لاتا ہوں تو وہ گناہ سے بچ گیا۔ اِس پر وہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی بعض پیشگوئیاں بھی بیان کرتے ہیں جو اُن کے نزدیک حضرت مسیحؑ پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اِس کا جواب یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اوّل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئیاں خود زیر بحث ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مان لینے سے یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ نوحؑ اور حنوک بھی یہ جانتے تھے کہ آئندہ زمانہ میں خدا کا ایک بیٹا ظاہر ہونے والا ہے؛ یا تو بائیبل میں یہ مسئلہ اِن الفاظ میں بیان ہوتا کہ آنے والے خدا کے بیٹے پر ہر نبی ایمان لایا تھا پھر چاہے یہ ذکر نہ ہوتا کہ حنوک مسیح پر ایمان لایا تھا یا نہیں یا نوحؑ مسیح پر ایمان لایا تھا یا نہیں ہم کہتے کہ جب بائیبل نے

کہہ دیا ہے کہ ہر نبی خدا کے بیٹے پر ایمان لاتا رہا ہے تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ نام بنام ہر نبی کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ وہ خدا کے بیٹے پر ایمان لاتا تھا۔ مگر بائیبل نے ایک طرف تو ایسا کوئی اصل پیش نہیں کیا اور دوسری طرف اُس نے حنوک کا واقعہ تو بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ مگر اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ حنوک خدا کے بیٹے پر بھی ایمان لایا تھا۔ اِسی طرح آدمؑ کے متعلق یہ تو ذکر ہے کہ وہ خدا کا مقبول رہا مگر بائیبل میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ آدم کو خدا نے یہ اطلاع دی تھی کہ میرا بیٹا دنیا میں آنے والا ہے۔ جو لوگوں کے گناہوں کے بدلے پھانسی پائیگا تم اُس پر ایمان لے آؤ۔ اِسی طرح یسعیاہ اور حزقیل وغیرہ انبیاء میں جنکی پاکبازی کا تو بائیبل میں ذکر آتا ہے مگر مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے کا اُن کے متعلق کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ اَور تو اَور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی بائیبل میں یہ کہیں نہیں بیان کیا گیا کہ وہ کفارۂ مسیح پر ایمان لائے تھے۔ اگر اُن کی کوئی پیشگوئی نکل بھی آئے تو اُس سے صرف اِتنا ثابت ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خبر دی تھی کہ میرے بعد مسیح آئیگا۔ یہ کہیں سے ثابت نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے یہ کہا ہو کہ مسیح لوگوں کو گناہوں کی سزا سے بچانے کیلئے اپنے آپ کو قربان کرے گا اور مَیں اس کفارہ پر ایمان لاتا ہوں۔ پس بفرضِ محال اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی پیشگوئی ثابت بھی ہو جائے تو اِس سے صرف اتنا پتہ لگیگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آمدِ مسیح کی خبر دی تھی۔ اِس سے اُن کی نجات کس طرح ہو گئی؟ اور وہ گناہ سے بچ کس طرح گئے؟ کفارہ کا مسئلہ جو عیسائیوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اُس کی بنیاد اِس امر پر نہیں کہ خدا کے بیٹے پر ایمان لایا جائے بلکہ اُس کی بنیاد اِس امر پر ہے کہ خدا کے بیٹے کے مصلوب ہونے اور اُس کے کفارہ ہونے پر ایمان لایا جائے مگر کفارۂ مسیح پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان لانے کا بائیبل سے کہیں ثبوت نہیں ملتا

پھر اگر حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیوں کو لو تو وہ بھی حضرت مسیح پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ مجھ سے ایک دفعہ ایک پادری کی گفتگو ہوئی۔ مَیں نے اُس سے کہا۔ پہلے لوگ کس طرح نجات پا گئے تھے؟ کہنے لگا وہ مسیح پر ایمان لاتے تھے۔ مَیں نے کہا کیا ابراہیمؑ بھی ایمان لائے تھے؟ اُس نے کہا ہاں! حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ "تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی" (پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷ و ۱۸) یہ پیشگوئی حضرت مسیح کے متعلق تھی اور انہی کے ذریعہ پوری ہوئی ہے اِس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت مسیح پر ایمان لے آئے تھے۔ مَیں نے کہا اِس پیشگوئی میں یہ ذکر ہے کہ آنیوالا ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہوگا اور تم جانتے ہو کہ اولاد ہمیشہ مرد کے نطفے سے ہوتی ہے اِس لئے وہی شخص اس پیشگوئی کا مصداق سمجھا جا سکتا ہے جو مرد کے نطفہ سے ہو۔ اِس وقت دنیا میں دو مدعی کھڑے ہیں اور دونوں اِس امر کے دعویدار ہیں کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کا مصداق ہیں ایک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جن کا باپ تھا۔ اور ایک مسیح ہیں جن کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اب تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ بائیبل کی یہ پیشگوئی اِن دونوں میں سے کس پر چسپاں ہوگی آیا اُس پر چسپاں ہوگی جسکا کوئی باپ ہی نہیں تھا یا اُس پر چسپاں ہوگی جسکا باپ تھا اور جو واقعہ میں ابراہیمؑ کی نسل میں سے تھا۔ بائیبل بتا رہی ہے کہ آنیوالا ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہوگا یعنی وہ مرد کے نطفہ سے پیدا ہوگا جو شخص مرد کے نطفہ سے ہی نہیں وہ ابراہیمؑ کی اولاد میں سے کس طرح ہو گیا؟

عیسائیوں کو یہاں سخت مشکل پیش آئی ہے۔ وہ ایک طرف یہ بھی چاہتے تھے کہ اِس پیشگوئی کو حضرت مسیح پر چسپاں کریں۔ اور دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے کہ حضرت مسیح کا کوئی باپ نہیں تھا جس کی بنا پر وہ انہیں ابراہیمی نسل میں سے قرار دیں۔ آخر اسکا حل انہوں نے یہ نکالا کہ انجیل میں لکھ دیا یوسف نجار مسیح کا باپ تھا اور پھر اُس کا نسب نامہ انہوں نے داؤد سے ملا دیا حالانکہ وہ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسیح کنواری کے بطن سے پیدا ہوا۔ بہر حال اوّل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اِس پیشگوئی میں کفارۂ مسیح کا کوئی ذکر نہیں نہ اِس امر کا کوئی ذکر ہے کہ وہ اِس کفارہ پر ایمان لائے تھے صرف ابراہیمؑ

کی اولاد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ میں اُسے برکت دونگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس پیشگوئی کو جب ہم کسی شخص پر چسپاں کریں گے تو اُس شخص پر کریں گے جس کا کوئی باپ ہی نہیں یا اُس شخص پر چسپاں کرینگے جس کا باپ موجود ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہودی عقیدہ کے ماتحت ماں کی طرف سے نسل نہیں چلتی بلکہ باپ کی طرف سے نسل چلتی ہے اِس لئے جس شخص کا باپ موجود ہے وہی اِس پیشگوئی کا مصداق ہو سکتا ہے نہ وہ جسکا کوئی باپ ہی نہیں اور جو ابراہیمی نسل میں سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

تیسرا اعتراض ان لوگوں پر یہ ہے کہ مسیحؑ کس طرح پاک ہُوا؟ وہ اِس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مسیحؑ چونکہ بے باپ پیدا ہُوا اِس لئے وہ گناہ سے پاک تھا۔ اِس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بے باپ کے پیدا ہونے سے انسان گناہ سے نجات پا جاتا ہے تو ملک صدق سالیم بھی تو بے باپ پیدا ہُوا تھا بلکہ اُس کی تو ماں بھی نہ تھی۔ اُس کے متعلق کیوں نہیں کہا جاتا کہ وہ گناہ سے پاک تھا؟ پھر سوال یہ ہے کہ اگر بے باپ پیدا ہونے سے انسان گناہ سے نجات پاتا ہے تو آدمؑ نے گناہ کس طرح کیا جبکہ آدمؑ کا بھی نہ باپ تھا نہ ماں۔ بن باپ پیدائش اگر انسان کو پاکیزہ بناتی ہے تو آدمؑ بھی بیگناہ ہونا چاہئے تھا پھر یہ ورثہ کا گناہ کہاں سے آگیا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایک جسم میں سے نکلنے کی وجہ سے انسان گنہگار بن جاتا ہے تو جیسے باپ کے اندر سے اُسے گناہ پہنچتا ہے ویسے ہی اُسے ماں سے گناہ پہنچ سکتا ہے؟ اور بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اصل میں حوّا سے ظاہر ہُوا تھا۔ چنانچہ پیدائش باب ۳ کا بائبل کے چھاپنے والوں نے اِن الفاظ میں خلاصہ درج کیا ہے۔ " اِس بیان میں کہ سانپ حوّا کو فریب دیتا۔ انسان گناہ سے شکستہ حال ہو جاتا۔ خدا مرد و عورت دونوں کو اپنے حضور میں بلاتا۔ سانپ پر لعنت بھیجی جاتی۔ عورت کو خاص نسل کا وعدہ۔ انسان کی سزا کا احوال۔ اُن کی پہلی پوشاک۔ اُن دونوں کا باغ عدن سے نکالا جانا۔"

پھر خود اِس باب میں یُوں لکھا ہے:۔ " اور سانپ میدان کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند خدا نے بنایا تھا ہوشیار تھا۔ اور اُس نے عورت سے کہا کیا یہ سچ ہے کہ خدا نے کہا کہ باغ کے ہر درخت سے نہ کھانا۔ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں مگر اُس درخت کے پھل کو جو باغ کے بیچوں بیچ ہے خداوند نے کہا کہ تم اِس کو نہ کھانا اور نہ اُسے چھُونا ایسا نہ ہو کہ مر جاؤ۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مروگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن اس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے ہوؤگے اور عورت نے جوں دیکھا کہ وہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اُس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا اور اُس نے کھایا" (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۶) اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ شیطان نے پہلے حوّا کو ورغلایا اور حوّا کے کہنے سے آدم بھی اِس غلطی میں شریک ہو گیا چنانچہ جب خدا نے آدم سے کہا کہ " کیا تُو نے اُس درخت سے کھایا جس کی بابت مَیں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اُس سے نہ کھانا" تو آدم نے جواب دیا حضور اِس میں میرا کیا قصور ہے آپ نے جو عورت مجھے دی تھی اور جس کے متعلق کہا تھا کہ یہ تیری ساتھی ہوگی اُس نے جب مجھے درخت کا پھل دیا تو مَیں نے سمجھا کہ یہ خدا کا عطا کیا ہُوا ساتھی ہے اِس کی دی ہوئی چیز کو مَیں ردّ نہ کروں ایسا نہ ہو کہ مَیں گنہگار بن جاؤں چنانچہ مَیں نے پھل لیا اور کھا لیا۔ بائبل میں لکھا ہے " آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تُو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور مَیں نے کھایا تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تُو نے یہ کیا کیا۔ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو مَیں نے کھایا۔" (پیدائش باب ۳ آیت ۱۱ تا ۱۳) اِن حوالجات سے صاف پتہ لگتا ہے کہ شیطان پہلے حوّا کے پاس گیا اور اُسے ورغلایا۔ اِس کے بعد حوّا نے آدمؑ کو ورغلایا۔ گویا زیادہ گنہگار آدم نہیں بلکہ حوّا تھی۔ اور اس کی تحریک پر آدم بھی اِس گناہ میں ملوّث ہُوا۔

اُس پادری سے گفتگو کے دوران میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے میں نے اُس سے پوچھا کہ بتاؤ شیطان نے پہلے آدم کو ورغلایا تھا یا حوّا کو؟ کہنے لگا حوّا کو۔ میں نے کہا حوّا کو ورغلانے سے شیطان کی کیا غرض تھی؟ اُس نے پہلے ہی آدم کو کیوں نہ ورغلا لیا۔ وہ آدم کو چھوڑ کر حوّا کے پاس کیوں گیا تھا؟ پادری نے کہا اِس لئے کہ حوّا جلدی قابو میں آسکتی تھی میں نے کہا تو پھر معلوم ہُوا کہ حوّا میں گناہ کا مادہ زیادہ تھا اِسی وجہ سے وہ پہلے آدمؑ کے پاس نہیں گیا کیونکہ اُس نے سمجھا کہ آدم میرے دھوکا میں جلدی نہیں آسکتا وہ حوّا کے پاس گیا اور کامیاب ہوگیا۔ اِس کے بعد میں نے کہا اب بتاؤ مسیحؑ حوّا کا بیٹا تھا یا آدم کا؟ کہنے لگا اِس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کچھ مطلب ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ مسیحؑ آدم کا بیٹا تھا یا حوّا کا؟ کہنے لگا مریم کا بیٹا تھا۔ میں نے کہا اچھا اگر گرم پانی میں سرد پانی ملا دیا جائے تو اُس کی گرمی بڑھ جائیگی یا کم ہوگی؟ کہنے لگا کچھ گرم پانی کی گرمی کم ہوگی اور کچھ سرد پانی کی سردی کم ہو جائیگی میں نے کہا تو اب مسئلہ صاف ہوگیا۔ اگر مسیحؑ بن باپ نہ ہوتا تو اُسے باپ کی طرف سے اُس روحانی طاقت میں سے حصّہ ملتا جو آدم میں تھی اور ماں کی طرف سے اُس کمزوری میں سے حصّہ ملتا جو حوّا میں تھی۔ آدم کی طاقت اور حوّا کی کمزوری مل کر ورثہ کے گناہ کا اثر کچھ نہ کچھ کم کر دیتی مگر مسیحؑ بن باپ تھا جس کے معنے یہ ہیں کہ اُس نے آدم کی طاقت سے حصّہ نہیں لیا صرف حوّا کی کمزوری سے حصّہ لیا ہے اب بتاؤ وہ مسیحؑ جو خالص حوّا کی نسل میں سے تھا جس کے متعلق تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ آدم کی نسبت زیادہ گنہگار تھی وہ گناہوں سے پاک کس طرح ہوگیا وہ تو اور لوگوں کی نسبت زیادہ گنہگار ہُوا کیونکہ اُس نے خالص حوّا کا اثر ورثہ میں لیا ہے؛ کہنے لگا یہ کوئی اصول نہیں کیا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا؟ میں نے کہا اگر مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو بات حل ہوگئی جس طرح مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے اِسی طرح آدمؑ کے بیٹے نیک بھی ہوسکتے ہیں۔ کہنے لگا نہیں نہیں سونا تو سونے میں سے نکلتا ہے میں نے کہا تو پھر مسیحؑ ایک عورت کے بطن سے پیدا ہو کر پاک کس طرح ہوگیا؟ سونا تو سونے میں سے نکلتا ہے مٹی میں سے نہیں نکلتا۔ اور اگر سونا مٹی میں سے بھی نہیں نکلتا اور سونے میں سے بھی نہیں نکلتا تو وہ نکلتا کس چیز میں سے ہے؟ غرض اگر یہ درست ہے کہ مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو گنہگار آدم کی اولاد بھی نیک ہو سکتی ہے اور اگر مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا بلکہ سونے میں سے سونا نکلتا ہے تو مسیحؑ ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہو کر پاک نہیں ہو سکتا۔ پس اِن دونوں میں سے کوئی صورت لے لو عیسائی مذہب قائم نہیں رہ سکتا۔

تیسرے ہم خود مسیحؑ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو نیک کہتے ہیں یا نہیں۔ جب اِس نکتہ نگاہ سے ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اُس میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ " اور دیکھو ایک نے آکے اُس سے کہا۔ اے نیک اُستاد! میں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟ اُس نے اُس سے کہا تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ پر اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہے تو حکموں پر عمل کر" (متی باب ۱۹ آیت ۱۶ و ۱۷) گویا مسیحؑ خود کہتے ہیں کہ میں نیک نہیں۔ اب بتاؤ جس نے دنیا کو نیکی دینی تھی جب وہ اپنی نیکی کا آپ منکر ہے تو ہم یہ کس طرح تسلیم کریں کہ وہ بے گناہ تھا اور دنیا کو گناہوں سے پاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ یہ تو وہی مثال بن جاتی ہے کہ مدعی سُست اور گواہ چست۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعہ میں مسیح نیک تھا اور اگر واقعہ میں اُس کے کفارہ کے ذریعہ دنیا گناہ سے بچ گئی تھی اور اُس میں یہ قابلیت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ نیکی کو اختیار کرے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ مسیحؑ پیدائش عالم کا آخری نقطہ تھا۔ کیونکہ انسانی پیدائش کی غرض اُس کے آنے سے پوری ہوگئی لیکن جب ہم بائیبل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھا۔ بلکہ اگر مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا تو اُس کی اپنی پیشگوئی کے مطابق خود خدا بھی دنیا میں آنے والا تھا چنانچہ

مرقس باب ۱۲ میں وہ اِس پیشگوئی کو تمثیلی رنگ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ "ایک شخص نے انگور کا باغ لگایا اور اُسکے چاروں طرف گھیرا اور کولھو کی جگہ کھودی اور ایک بُرج بنایا اور اُسے باغبانوں کے سپرد کرکے پردیس چلا گیا۔ پھر موسم میں اُس نے ایک نوکر کو باغبانوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ باغبانوں سے انگور کے باغ کے پھل میں سے کچھ لے۔ انہوں نے اُسے پکڑ کے مارا اور خالی ہاتھ بھیجا۔ اُس نے دوبارہ ایک اور نوکر کو اُن کے پاس بھیجا۔ انہوں نے اُس پر پتھر پھینک کے اُس کا سر پھوڑا اور بے حرمت کرکے پھیر بھیجا۔ پھر اُس نے ایک اور کو بھیجا۔ انہوں نے اُسے قتل کیا۔ پھر اور بہتیروں کو۔ اُن میں سے بعضوں کو پیٹا اور بعضوں کو مار ڈالا۔ اب اُس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اُس کا پیارا تھا۔ آخر کو اُس نے اُسے بھی اُن پاس یہ کہہ کے بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے۔ لیکن اُن باغبانوں نے آپس میں کہا یہ وارث ہے آؤ ہم اسے مار ڈالیں تو میراث ہماری ہو جائیگی اور انہوں نے اُسے پکڑ کے قتل کیا اور انگور کے باغ کے باہر پھینک دیا۔ پس باغ کا مالک کیا کریگا؟ وہ آویگا اور اُن باغبانوں کو ہلاک کرکے انگور کا باغ اَوروں کو دیگا" (مرقس باب ۱۲ آیت ۱ تا ۹)

اِس تمثیل میں باغ سے مراد وہ سلسلۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی اصلاح کیلئے قائم کیا۔ باغ بنانیوالا موسیٰؑ تھا جو الٰہی جلال کے اظہار کیلئے آیا۔ اور باغبانوں سے مراد بنی اسرائیل تھے جن کے سپرد اُس باغ کی حفاظت کا کام کیا گیا۔ نوکر جو میوہ کا حصہ لینے کے لئے باغ کے مالک کی طرف سے یکے بعد دیگرے بھیجے گئے اللہ تعالیٰ کے وہ انبیاء تھے جو موسیٰؑ کے بعد پے بہ پے آتے رہے مگر لوگوں کا سلوک اُن کے ساتھ یہ رہا کہ انہوں نے کسی نبی کو مارا، کسی کو دُکھ دیا اور کسی کو بے عزت کیا۔ آخر خدا نے اپنا بیٹا بھیجا جس سے مراد حضرت مسیحؑ خود تھے۔ جو موسیٰؑ کے بعد آنیوالے نبیوں میں سے سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کے مقرب اور محبوب تھے مگر لوگوں نے اُن کی بھی پروا نہ کی اور انہیں صلیب پر چڑھا دیا۔ حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں تم جانتے ہو اب کیا ہوگا۔ باغ کا مالک آئیگا اور اُن باغبانوں کو ہلاک کرکے انگور کا باغ اوروں کو دیگا۔ یعنی اب وہ نبی دنیا میں ظاہر ہوگا جس کا آنا خود خدا کا آنا ہوگا۔ جس کا ظہور خدا تعالیٰ کا ظہور ہوگا۔ اور وہ گذشتہ سنّت کے خلاف بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوگا بلکہ اُن کے بھائیوں بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔

یہ تمثیل واضح کر رہی ہے کہ حضرت مسیحؑ پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھے اگر آخری نقطہ ہوتے تو وہ اپنے بعد ایک ایسے نبی کی بعثت کی خبر نہ دیتے جس کا آنا خود خدا کا آنا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ بیٹا باپ نہیں ہو سکتا۔ پس اِس تمثیل میں جس کو باپ کہا گیا ہے وہ یقیناً بیٹے کے علاوہ کوئی اور شخص ہی ہو سکتا ہے اور جب مسیحؑ کے علاوہ ہدایت عالم کے لئے کسی اور شخص کا آنا خود مسیحؑ کی اپنی پیشگوئی کے ماتحت ثابت ہوگیا اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ مسیحؑ کے متعلق یہ خیال درست نہیں کہ وہ پیدائش عالم کا آخری نقطہ تھا۔ اگر مسیحؑ سے نیکی قائم ہو چکی تھی تو پھر مسیحؑ کے سوا کسی اور کے آنے کی کوئی غرض ہی نہیں ہو سکتی تھی مگر جیسا کہ انجیل کے مذکورہ بالا حوالہ سے ظاہر ہے مسیحؑ اگر خدا کا بیٹا تھا تو خود خدا بھی آنے والا تھا۔ اِسی طرح حضرت مسیحؑ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:۔ "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہیں بتا دیگی۔ اِس لئے کہ وہ اپنی نہ کہیگی لیکن جو کچھ وہ سُنیگی سو کہیگی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگی۔ وہ میری بزرگی کریگی اِس لئے کہ وہ میری چیزوں سے پاویگی اور تمہیں دکھاوے گی۔" (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲ و ۱۳) یہاں حضرت مسیحؑ اقرار کرتے ہیں کہ میرے بعد ایک اور شخص آئیگا جو رُوح حق کہلائیگا اور وہ ایسی تعلیمیں دیگا جو میں نے بھی نہیں دیں۔ یعنی مجھ سے بڑھ کر سچائی کی راہیں دنیا پر روشن کریگا اور میری تعلیم سے زیادہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کریگا۔ اور پھر ایک مزید بات یہ ہوگی کہ اُس کو ایسی کتاب ملے گی جس میں اُسکے اپنے الفاظ نہیں ہونگے بلکہ صرف وہی الفاظ ہونگے جو خدا نے کہے ہونگے۔" وہ اپنی نہ کہیگی لیکن جو کچھ وہ سُنیگی سو کہیگی۔"

اِن الفاظ کا مفہوم یہی ہے کہ اُس کو جو کتاب ملیگی اُس کی یہ ممتاز خوبی ہوگی کہ شروع سے لیکر آخر تک وہ اللہ تعالیٰ کے کلام پر مشتمل ہوگی۔ کوئی بات اُس میں ایسی نہیں ہوگی جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ یہ انسان کا کلام ہے خدا کا کلام نہیں گویا اوّل حضرت مسیحؑ اپنے بعد ایک آنیوالے کی خبر دیتے ہیں۔ دوم حضرت مسیحؑ یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ وہ آنے والا اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لائیگا۔ سوم اُس کتاب کی یہ خوبی بتاتے ہیں کہ اُس میں انسانی کلام نہیں ہوگا بلکہ ابتداء سے انتہا تک اُس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف خدائی کلام پر مشتمل ہوگا۔ اِس پیشگوئی کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے اور آپ نے وہ شریعت لوگوں کے سامنے پیش کی جو اپنی شان اور عظمت کے لحاظ سے تمام الہامی کتب میں یگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ بائیبل کو دیکھا جائے تو جہاں اُس میں خدائی کلام نظر آتا ہے وہاں بہت سی انسانی باتیں بھی اُس میں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ایک طرف اُس میں اُن پیشگوئیوں کا ذکر پایا جاتا ہے جو موسیٰؑ نے کیں تو دوسری طرف ہم اُس میں یہ بھی لکھا پاتے ہیں کہ "خداوند کا بندہ موسیٰؑ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا اور اُس نے اُسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اُس کی قبر کو نہیں جانتا۔" (استثناء باب ۳۴ آیت ۵) اب بتاؤ کیا یہ خدا کا کلام ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا کہ موسیٰ مرگیا اور فلاں جگہ گاڑا گیا مگر آج کے دن تک کوئی اُس کی قبر کو نہیں جانتا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ الفاظ بعد میں لوگوں نے بڑھا دیئے تھے۔ جب موسیٰؑ مرچکے تھے اور اُن کی موت پر اسقدر عرصہ گذر چکا تھا کہ اُن کی قبر کا بھی لوگوں کو علم نہیں رہا تھا کہ وہ کس جگہ تھی۔ اسی طرح متی۔ مرقس اور لوقا وغیرہ میں جہاں خدا کی باتیں ہیں وہاں بندوں کی باتیں بھی ہیں اُن میں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ خود لوقا کہتا ہے "چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ اُن کاموں کا جو فی الواقعہ ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں۔ جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کی خدمت گزار تھے ہم سے روایت کی میں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کرکے تیرے لئے اے بزرگ تھیوفلس بہ ترتیب لکھوں تاکہ تو ان باتوں کی حقیقت کو جن کی تُو نے تعلیم پائی جانے"۔ (لوقا باب ۱ آیت ۱ تا ۴) گویا موجودہ اناجیل کیا ہیں؟ وہ کتب ہیں جو حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد مختلف لوگوں نے مرتب کیں اور انہوں نے مختلف روایات کو ایک ترتیب سے اِن میں جمع کر دیا۔ اِس لئے اِن کتب میں جہاں کہیں وہ کلام نظر آتا ہے جو خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے وہاں ایسا کلام بھی اُن میں پایا جاتا ہے اور اُسی کی کثرت ہے جو کہ بندوں نے اپنی طرف سے شامل کر دیا ہے۔

غرض دنیا میں کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جو شروع سے آخر تک صرف وہی باتیں بیان کرتی ہو جو خدا نے کہی ہوں۔ تورات لے لو۔ انجیل لے لو۔ ژند اور اوستا لے لو۔ وید لے لو ہر کتاب انسانی دست بُرد کا شکار نظر آئیگی۔ ہر کتاب میں خدائی الہامات کے ساتھ ساتھ بندوں کی اپنی تشریحات کو بھی شامل دیکھوگے۔ مگر قرآن وہ کتاب ہے جو ابتداء سے انتہاء تک ہر قسم کے انسانی الفاظ سے منزّہ ہے۔ ابتداء سے انتہاء تک اُس کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف اور ایک ایک شعشہ الہام ہے جو خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ پس قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس پر حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں کہ "وہ اپنی نہ کہیگی لیکن جو کچھ وہ سنیگی سو کہیگی"۔ پھر اس کے ساتھ ہی حضرت مسیحؑ نے یہ بھی خبر دی تھی کہ وہ کتاب "تمہیں آئندہ کی خبریں دیگی" یعنی اُس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا بلکہ قیامت تک چلتا چلا جائیگا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آئیگا جس میں لوگ اِس کتاب کی ضرورت سے مستغنی ہو جائیں۔ اور پھر یہ کہ "وہ میری بزرگی کریگی" یعنی لوگ مجھے جھوٹا اور لعنتی قرار دیں گے وہ میری بزرگی کا اظہار کریگا۔ یہودی کہیںگے کہ یہ صلیب پر مرکر لعنتی ہوگیا۔ عیسائی کہیں گے کہ یہ صلیب پر لٹک کر لوگوں کے گناہوں کے بدلے دوزخ میں چلا گیا۔ مگر وہ کہیگا مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (النساء ع ۲۲)

یہ بات غلط ہے کہ لوگوں نے اُسے قتل کر دیا تھا یا صلیب پر لٹکا کر اُسے لعنتی ثابت کر دیا تھا۔ وہ قتل سے بھی محفوظ رہا تھا اور صلیب سے بھی محفوظ رہا تھا۔ بیشک دوست دشمن نے اُسے لعنتی ثابت کرنا چاہا مگر خدا نے اُسے عزت دی اور دشمن کو اُسکے ارادوں میں ناکام کر دیا۔

آخر میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوگا۔ کہ " وہ میری چیزوں سے پا دے گی۔ اور تمہیں دکھا دیگی "میری چیزوں سے پانے کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ مسیحؑ کا متبع ہوگا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُسے وہ تعلیم ملے گی جس میں تمام انبیاء کی تعلیمیں شامل ہونگی۔ نوحؑ کی تعلیم بھی اُس میں موجود ہوگی ابراہیمؑ کی تعلیم بھی اُس میں موجود ہوگی۔ موسیٰؑ کی تعلیم بھی اُس میں موجود ہوگی اور میری یعنی عیسیٰؑ کی تعلیم بھی اُس میں موجود ہوگی' اور اس طرح اُس کی تعلیم جامع ہوگی تمام سابق انبیاء کی تعلیمات کی اور پھر وہ کتاب ایسی ہوگی جو" تمہیں دکھا دیگی " یعنی اُس میں صرف زبانی باتیں نہیں ہونگی بلکہ عملی طور پر وہ تمام سچائیوں کو روشن کرکے دنیا پر اُن کو واضح کر دیگی۔ یہ پیشگوئیاں صاف طور پر بتاتی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد ایک ایسے وجود نے ابھی آنا تھا جو مسیحؑ سے زیادہ کامل ہوتا۔ اور پھر مقدر یہ تھا کہ وہ ایک ایسی جامع اور بے مثل کتاب اپنے ساتھ لاتا جس میں تمام سچائیاں جمع ہوتیں۔ جس میں شروع سے لیکر آخر تک اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا اور پھر عملی طور پر وہ کتاب تمام سچائیوں کو روشن کرنے والی ہوتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ نے واقعہ میں ساری دنیا کے گناہ اُٹھا لئے تھے اگر دنیا کی نجات کے لئے اُن پر ایمان لانا کافی تھا اور اگر انسانی نجات کا آخری نقطہ وہی تھے تو ساری سچائیاں انہیں بتانی چاہئیں تھیں مگر وہ تو کہتے ہیں میں سب سچائیاں نہیں بتا سکتا اُن کو میرے بعد آنے والا بتائیگا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیح ناصری کے نزدیک اُن کا اپنا وجود پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھا بلکہ بعد میں آنیوالا ایک اور وجود اس شرف اور عظمت کا مستحق تھا۔

پانچویں اگر حضرت مسیح کفارہ ہوئے ہیں تو اُن کا کفارہ ہونا اُسی صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ خوشی اور انتہائی بشاشت کے ساتھ کفارہ ہوئے ہوں جس شخص کو جبراً صلیب پر لٹکا دیا جائے اُس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی خوشی سے لوگوں کے لئے قربان ہوا ہے۔ اگر حضرت مسیحؑ واقعہ میں کفارہ ہونے کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے تو چاہیئے تھا کہ وہ دوڑ کر صلیب پر چڑھتے اور خوش ہوتے کہ جس غرض کے لئے میں آیا تھا وہ آج پوری ہو رہی ہے۔ مگر بائیبل میں لکھا ہے جب انہیں پتہ لگا کہ صبح مجھے صلیب پر لٹکایا جانے والا ہے تو انہوں نے ساری رات دعائیں کرتے ہوئے گذار دی اور اپنے حواریوں سے بھی بار بار کہا کہ " جاگو اور دعا مانگو تاکہ امتحان میں نہ پڑو۔" حضرت مسیحؑ ایک پہاڑی پر دعائیں کر رہے تھے اور اُن کے حواری نیچے تھے وہ گھبراہٹ کی حالت میں بار بار نیچے آتے اور دیکھتے کہ حواری دعائیں کر رہے ہیں یا نہیں۔ مگر جب بھی آتے، دیکھتے کہ وہ سو رہے ہیں حضرت مسیحؑ پھر اُن کو جگاتے اور چلے جاتے۔ پھر نیچے آتے اور دیکھتے کہ حواریوں کی کیا حالت ہے مگر پھر اُن کو سوتا پاتے۔ آخر حضرت مسیحؑ اُن پر ناراض ہوئے اور کہا کہ " کیا تم میرے ساتھ ایک گھنٹہ نہیں جاگ سکے " مگر شاگردوں پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اس دوران میں حضرت مسیحؑ نے جس بیقراری اور اضطراب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کیں اُن کا ذکر انجیل میں اس طرح آتا ہے:۔

> " پھر یسوع اُن کے ساتھ گتسمنی نامی ایک مقام میں آیا اور شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھو جب تک میں وہاں جا کر دعا مانگوں۔ تب اُس نے پطرس اور زبدی کے دو بیٹے ساتھ لئے اور غمگین اور نہایت دلگیر ہونے لگا۔ تب اُس نے اُن سے کہا کہ میرا دل نہایت غمگین ہے بلکہ میری موت کی سی حالت ہے تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو اور کچھ آگے بڑھ کے مونہہ کے بل گرا اور دُعا مانگتے ہوئے کہا کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے

تو یہ پیالہ مجھ سے گذر جائے تو بھی میری خواہش نہیں بلکہ تیری خواہش کے مطابق ہو۔ تب شاگردوں کے پاس آیا اور انہیں سوتے پاکر پطرس سے کہا۔ کیا تم میرے ساتھ ایک گھنٹہ نہیں جاگ سکے۔ جاگو اور دعا مانگو تاکہ امتحان میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد پر جسم سست ہے پھر اُس نے دوبارہ جاکر دعا مانگی اور کہا اَے میرے باپ! اگر میرے پینے کے بغیر یہ پیالہ مجھ سے نہیں گذر سکتا تو تیری مرضی ہو۔ اُس نے آکے پھر انہیں سوتے پایا۔ کیونکہ اُن کی آنکھیں نیند سے بھاری تھیں اور انہیں چھوڑ کے پھر گیا اور وہی بات کہکر تیسری بار دعا مانگی۔ تب اپنے شاگردوں کے پاس آکر اُن سے کہا۔ اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وہ گھڑی آپہنچی کہ ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ حوالے کیا جاتا ہے"۔

(متی باب ۲۶ آیت ۳۶ تا ۴۵)

اگر واقعہ میں حضرت مسیحؑ اِس لئے آئے تھے کہ وہ لوگوں کے گناہ اٹھائیں اور اُن کی خاطر اپنی جان قربان کردیں تو کیا یہ ہوسکتا تھا کہ وہ صلیب کے وقت گڑگڑا گڑگڑا کر یہ دُعا مانگتے کہ "اے میرے باپ اگر ہوسکے تو یہ پیالہ مجھ سے گذر جاے"۔ (متی باب ۲۶ آیت ۳۹) پھر تو چاہیئے تھا کہ وہ روزانہ یہ دُعا مانگتے کہ اَے خدا یہ پیالہ مجھے جلد پلا تاکہ بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ہو۔ مگر بجائے اِس کے کہ وہ یہ دعا کرتے کہ الٰہی موت کا پیالہ مجھے جلد پلا تاکہ میں لوگوں کے گناہ اُٹھا کر اُن کی نجات کا باعث بنوں وہ ساری رات گڑگڑا گڑگڑا کر یہ دُعا کرتے رہے کہ الٰہی مجھے صلیب سے بچا اور نہ صرف آپ یہ دُعا کرتے رہے بلکہ حواریوں کو بھی بار بار دعا کرنے کی تاکید کرتے رہے اور بار بار آکر دیکھتے رہے کہ وہ سو رہے ہیں یا اُٹھ کر دعائیں کر رہے ہیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ حواری سُستی سے کام لے رہے ہیں۔ اور دُعا کی طرف اُن کی توجہ نہیں تو انہوں نے اُن کو ڈانٹا اور کہا کیا تم سے اِتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک گھنٹہ جاگ سکو اور خدا سے دعائیں کرو۔ یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ حضرت مسیحؑ کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی کفارہ کا وہ مسئلہ نہ تھا جو آجکل عیسائیوں نے ایجاد کیا ہُوا ہے اور نہ کفارہ کے لئے وہ دنیا میں تشریف لائے تھے ورنہ صلیب کی رات نہ آپ خود یہ دعا کرتے اور نہ اپنے حواریوں سے کہتے کہ دعا کرو کہ یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ کفارہ کی بنیاد اِس امر پر ہے کہ حضرت مسیحؑ نے صلیب پر جان دی۔ مگر جب اناجیل پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ حضرت مسیحؑ صلیب پر لٹک کر فوت ہوئے۔ چنانچہ اُس کا ثبوت یہ ہے کہ انجیل میں لکھا ہے "تب بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں کہا کہ اے اُستاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں"۔ یعنی حضرت مسیحؑ نے اپنی صداقت کے متعلق جب مختلف دلائل اُنکے سامنے پیش کئے تھے تو اُن کو سُننے کے بعد فقیہوں اور فریسیوں نے کہا یہ تو زبانی باتیں ہوئیں آپ ہمیں کوئی ایسا نشان دکھائیں جس سے آپ کی صداقت کے ہم بھی قائل ہو جائیں۔ اِسپر "اُس نے انہیں جواب دیا اور کہا کہ اِس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائیگا۔ کیونکہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہیگا"۔ (متی باب ۱۲ آیت ۳۸ تا ۴۰) اِن الفاظ میں حضرت مسیح علیہ السلام نے واقعہ صلیب کی خبر دی ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ہمارا اور عیسائیوں کا اتفاق ہے۔ عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ مسیحؑ کی یہ پیشگوئی واقعہ صلیب پر چسپاں ہوتی ہے اور ہم بھی کہتے ہیں کہ اِس پیشگوئی کا اطلاق صلیب کے واقعات پر ہوتا ہے۔ فریقین کے اِس اتحاد کے بعد جب ہم نفس پیشگوئی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اِس میں بعض عظیم الشان خبریں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں کہ یہود کو یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان نہ دکھایا جائیگا۔ دوم وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ اِن الفاظ میں

خاص طور پر یونس نبی کی مماثلت پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ گویا تین دن کی مشابہت پر زور نہیں بلکہ اصل زور یونس نبی کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے اور ابن آدم کے زمین میں رہنے پر ہے۔ یعنی جس رنگ میں یونس نبی تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا اسی رنگ میں ابن آدم بھی تین رات دن زمین کے اندر رہیگا۔ جیسا اور ویسا کے الفاظ جو اس پیشگوئی میں استعمال کئے گئے ہیں بالصراحت بتلاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اپنی صداقت کی ایک قطعی اور حتمی دلیل یہ بیان فرماتے ہیں کہ جسطرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں گیا اور تین رات دن اُس میں رہا اسی طرح ابن آدم کے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آئیگا اور اُسے بھی اُسی طرح تین رات دن زمین کے پیٹ میں رہنا پڑے گا۔

اَب ہم دیکھتے ہیں کہ یونس نبی کا کیا واقعہ ہے؟ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یونہ نبی کو خدا تعالےٰ نے حکم دیا کہ وہ نینوہ والوں کے پاس جائیں اور انہیں خدا تعالےٰ کے عذاب کی خبر دیں۔ (بائیبل میں آپ کا نام یونہ ہے لیکن انجیل میں آپکا نام یونس آتا ہے) وہ لوگوں کی مخالفت سے ڈر کر بھاگے اور کسی اَور علاقہ میں جانے کے لئے جہاز پر سوار ہوگئے۔ جہاز پر طوفان آیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ خدا تعالےٰ کے غضب سے یہ عذاب نازل ہوا ہے۔ اِس پر انہوں نے قرعہ ڈالا کہ کس کے سبب سے یہ عذاب آیا ہے اور نام یونہ کا نکلا۔ انہوں نے یونہ سے پوچھا کہ قرعہ میں تمہارا نام نکلا ہے بتاؤ کیا بات ہے؟ انہوں نے سارا حال سنایا کہ مجھے اِس اِس طرح اللہ تعالےٰ کی طرف سے الہام ہوا تھا مگر مَیں نے سمجھا کہ اگر لوگوں کو مَیں نے عذاب کی خبر دی تو وہ میری مخالفت کریں گے اِس لئے مَیں وہاں سے بھاگا اور جہاز میں آکر سوار ہوگیا۔ انہوں نے کہا اَب آپ ہی بتائیں کہ اِس مصیبت کا ہم کیا علاج کریں۔ یونہ نے کہا تم مجھے سمندر میں پھینک دو۔ یہ عذاب ٹل جائیگا۔ پہلے تو وہ لوگ اِس پر آمادہ نہ ہوئے اور انہوں نے پورا زور لگایا کہ کسی طرح طوفان سے جہاز کو سلامتی کے ساتھ نکال کر لیجائیں مگر جب وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوئے اور طوفان بھی کسی طرح تھمنے میں نہ آیا تو انہوں نے یہ دعا کرتے ہوئے کہ الٰہی اِس شخص کا سمندر میں پھینکنا ہمارے لئے کسی عذاب کا موجب نہ ہو۔ یونہ کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔

اِس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد بائیبل میں لکھا ہے "پر خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھّی تھی کہ یونہ کو نگل جائے اور یونہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔" (یونہ باب ۱ آیت ۱۷) اَب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونہ نبی مچھلی کے پیٹ میں کسطرح رہا؟ اِس کے متعلق یونہ باب ۲ میں لکھا ہے کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا "تب یونہ نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے دُعا مانگی اور کہا کہ مَیں نے اپنی مصیبت میں خداوند کو پکارا اور اُس نے میری سُنی۔" (یونہ باب ۲ آیت ۲) اِس دُعا سے جو مچھلی کے پیٹ میں یونہ نے کی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ زندہ ہونے کی حالت میں مچھلی کے پیٹ میں گئے اور پھر اُس کے پیٹ میں بھی زندہ رہے اور اللہ تعالےٰ سے دُعائیں کرتے رہے۔ چنانچہ یونہ باب ۲ میں ایک لمبی دُعا درج ہے جو مچھلی کے پیٹ میں انہوں نے مانگی اور جس میں انہوں نے اللہ تعالےٰ سے عرض کیا کہ الٰہی مجھ پر اب تک کئی مصیبتیں آئی ہیں جن سے تو نے مجھے بچایا۔ اب اِس مصیبت سے بھی مجھے بچا اور نجات بخش۔ آخر خدا نے اُن کی دُعا کو سُنا۔" اور خداوند نے مچھلی سے کہا اور اُس نے یونہ کو خشکی پر اُگل دیا" (یونہ باب ۲ آیت ۱۰) اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یونہ نبی کا معجزہ یہ تھا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات زندہ رہا نہ یہ کہ مرنے کے بعد جی اُٹھا یعنی بائیبل اِس امر کو پیش نہیں کرتی کہ دیکھو یونہ خدا کا سچا نبی تھا کیونکہ وہ مر کر زندہ ہوگیا بلکہ بائیبل یونہ نبی کا معجزہ یہ پیش کرتی ہے کہ وہ زندہ ہونے کی حالت میں مچھلی کے پیٹ میں گیا اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی اُسکے پیٹ میں رہا۔ حالانکہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا ہے ہوسکتا تھا کہ مچھلی اُسے چبانے کی کوشش کرتی اور وہ مر جاتے۔ اگر مچھلی

اُسوقت یونہ کو چبا لیتی تو وہ زندہ کس طرح رہتا؟ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ بغیر چبانے کے وہ آپ کو نگل گئی۔ پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ گو وہ زندہ اُس کے پیٹ میں چلے جاتے مگر اندر جا کر ہلاک ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ میں بھی اُن کے لئے ہوا کا ایسا ذخیرہ رکھا کہ باوجود تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے وہ زندہ رہے اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی مچھلی کے پیٹ سے باہر آ گئے۔ حالانکہ مچھلی کے اُگلتے وقت بھی یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ اُس کے گلے کے دباؤ سے آپ مر جاتے مگر خدا تعالیٰ نے ہر مرحلہ پر آپ کی حفاظت کی، اور جب مچھلی نے آپکو اُگلا اُسوقت بھی خدا نے آپکی حفاظت کی نہ نگلتے وقت اُس نے آپ کو چبایا۔ نہ اُگلتے وقت اُس نے آپکو چبایا نہ پیٹ میں رہتے وقت ہوا کا ذخیرہ کم ہوا۔ پس یُونہ نبی کا معجزہ کیا ہے؟ اُسکا یہ معجزہ نہیں کہ وہ مر کر زندہ ہو گیا بلکہ اُسکا معجزہ یہ ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں جانے سے پہلے جو خطرناک حادثہ ہو سکتا تھا اُس سے بچے رہے پھر پیٹ میں جا کر یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ آپکو ہوا نہ پہنچتی اور دم گھٹ جانے کی وجہ سے آپ ہلاک ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی ایسا سامان کیا کہ آپ بچے رہے اس کے بعد جب مچھلی نے آپ کو اُگلا اُس وقت بھی یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ آپ ہلاک ہو جاتے۔ اُگلتے وقت بھی خدا تعالیٰ نے آپ کو اس حادثہ سے بچا لیا۔ پس مر کر زندہ ہونا یونہ نبی کا معجزہ نہیں بلکہ ان تین مقامات پر یونہ نبی کا زندہ رہنا اُس کی صداقت کا عظیم الشان نشان تھا۔ پس مسیحؑ اگر یہی معجزہ اپنی قوم کو دکھانا چاہتا تھا تو اُس کے معنے یہ تھے کہ وہ یونہ کی طرح زندہ ہی قبر میں جائیگا۔ زندہ ہی وہاں رہیگا اور زندہ ہی قبر سے نکلیگا۔ بہرحال اُس کی صداقت اِس بات سے وابستہ تھی کہ وہ اِن تین مقامات پر موت سے محفوظ رہتا اور یہی وہ نشان تھا جس کے دکھائے جانے کا آپ نے یہود کے سامنے اعلان کیا اور بتایا کہ جس چیز کے ذریعہ میں قبر میں جاؤنگا وہ ہمیشہ موت کا موجب ہوتی ہے مگر میرے لئے وہ موت کا موجب نہیں ہوگی۔ پھر قبر میں رکھا جانا موت کا موجب ہوتا ہے، مگر باوجود اِس کے کہ مجھے قبر میں رکھا جائیگا پھر بھی مَیں نہیں مرونگا۔ بلکہ جسطرح یونہ مچھلی کے پیٹ میں تین رات دن رہنے کے باوجود بچ گیا اِسی طرح مَیں بھی قبر میں تین رات دن رہنے کے باوجود زندہ رہونگا۔ پھر تیسرا نشان یہ ہوگا کہ مَیں اُس قبر میں سے زندہ نکل آؤنگا۔ حالانکہ کسی سرکاری مجرم کا جسے پھانسی کا حکم دیا جا چکا ہو زندہ نکل کر بھاگ جانا اُس کے لئے بہت بڑے خطرات کا موجب ہو سکتا ہے اور گورنمنٹ اُسے پھر گرفتار کرکے سزا دے سکتی ہے مگر آپ فرماتے ہیں جسطرح یونہ نبی کو مچھلی نے زندہ اُگلا اِسی طرح میں بھی قبر میں سے زندہ نکل آؤنگا۔ یونہ نبی کے متعلق بھی یہ خطرہ تھا کہ اُگلتے وقت مچھلی اُسے ہلاک کر دے مگر خدا تعالیٰ نے اُسے محفوظ رکھا اور وہ سلامتی کے ساتھ اُسکے پیٹ میں سے نکل آیا۔ اِسی طرح میرے متعلق بظاہر یہ خطرہ ہوگا کہ گورنمنٹ مجھے گرفتار کرے مگر یونہ نبی کی طرح خدا میرے لئے ایسے سامان پیدا کر دیگا کہ میں بغیر کسی خطرہ کے زندہ نکل آؤنگا اور کوئی شخص مجھے پکڑ کر مار نہیں سکیگا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مسیحؑ کے قبر میں جانیکا راستہ اس کا صلیب پر کھینچا جانا تھا۔ پس اگر مسیحؑ کی یہ پیشگوئی صحیح تھی تو اِس کے معنے صرف یہ تھے کہ مسیحؑ یہ پیشگوئی کرتا ہے کہ صلیب جو موت کا ذریعہ ہے اُس پر لٹک کر بھی میں زندہ بچ رہونگا۔ اور جس طرح مچھلی نے یونہ کو چبا کر مارا نہیں بلکہ اُسے زندہ پیٹ میں اتار دیا اِسی طرح صلیب مجھے مارے گی نہیں بلکہ زندہ ہی مجھے قبر میں بھجوا دیگی۔ دوسرا ذریعہ موت کا قبر ہوتی ہے۔ اِس کے متعلق مسیح یہ پیشگوئی کرتا ہے کہ جس طرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا مَیں زمین کے پیٹ میں زندہ رہونگا اور پھر تیسری پیشگوئی مسیح یہ کرتا ہے کہ جسطرح یونہ نبی مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا اور خدا نے آخری مرتبہ بھی اُسے موت سے محفوظ رکھا۔ اِسی طرح میرے ساتھ واقعہ ہوگا مَیں بھی زمین کے پیٹ میں سے زندہ نکلونگا اور کوئی شخص مجھے گرفتار کرکے ہلاک نہیں کر سکتا۔

چونکہ یہ مضمون مسیحؑ کی وفات کا نہیں مَیں تفصیل میں نہیں جاتا مگر اِسقدر کہنا چاہتا ہوں کہ مسیحی روایات کے مطابق

مسیحؑ کو صرف دو تین گھنٹے صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ چنانچہ انجیل سے ثابت ہے کہ چھٹے پہر سے نویں پہر تک اُن کو صلیب پر رکھا گیا اور یہ صرف تین گھنٹے بنتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ اندازہ بھی پورے طور پر صحیح نہیں کہلا سکتا اِسلئے کہ آپ کو صلیب پر لٹکانے کے بعد بڑے زور سے آندھی آگئی تھی اور چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی تھی اِس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ آندھی اور تاریکی کی وجہ سے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر سے اتارنے کا وقت لوگوں پر پوشیدہ رہا ہو اور انہوں نے قیاس سے کام لے کر وقت کی تعیین نویں پہر تک کر دی ہو لیکن بہر حال اگر اِس کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ صرف تین گھنٹے بنتے ہیں حالانکہ صلیب پر تین دن سے سات دن تک لٹکانے سے بھی لوگ نہیں مرتے تھے۔

ہمارے ملک میں عام طور پر لوگ صلیب کے یہ معنے سمجھتے ہیں کہ سینہ کی ہڈیوں اور ہاتھوں اور پاؤں کی ہڈیوں میں میخیں گاڑ دی جاتی تھیں اور انسان فوری طور پر ہلاک ہو جاتا تھا لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ صلیب جس پر انسان کو لٹکایا جاتا تھا اِس شکل کی ہُوا کرتی تھی

✝

جب کسی شخص کو صلیب پر لٹکانا ہوتا تھا تو اُسے کھڑا کر کے اُس کے بازوں کو دائیں بائیں دو ڈنڈوں کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور پھر اُس کے بازوؤں کے نرم عضلات میں کیل گاڑ دئے جاتے تھے۔ اِسی طرح ٹانگوں کی ہڈیوں میں نہیں بلکہ اُن کے گوشت میں میخیں گاڑ دیتے تھے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹانگوں ہاتھوں اور سینہ کی ہڈیوں میں کیل گاڑے جاتے تھے اور چونکہ ہڈیوں میں کیل گاڑنا واقعہ میں ایسا خطرناک امر ہے کہ انسان اِس کے بعد زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا اِس لئے وہ خیال کرتے ہیں کہ جو شخص صلیب پر لٹکایا جاتا ہوگا وہ جلدی ہی ہلاک ہو جاتا ہوگا مگر یہ درست نہیں جسم کی ہڈیوں میں نہیں بلکہ بازوؤں کے نرم عضلات میں کیل گاڑے جاتے تھے اِسی طرح ٹانگوں کی ہڈیوں کے نیچے جو گوشت ہوتا ہے اُس میں کیل گاڑے جاتے تھے۔ بیشک یہ ایک تکلیف دہ چیز تھی مگر فوری طور پر موت کا موجب نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ جو لوگ قوی اور مضبوط ہوتے تھے وہ بعض دفعہ سات سات دن تک بھی نہیں مرتے تھے اور جو لوگ مرتے تھے اُن میں سے اکثر فاقہ کی وجہ سے مرا کرتے تھے یا اِس وجہ سے کہ زخموں میں کیڑے پڑ جاتے اور اُن کا زہر ہلاکت کا موجب بن جاتا۔ وہ ڈاکو یا باغی وغیرہ جو ساتویں دن تک بھی زندہ رہتے تھے اُن کے متعلق دستور یہ تھا کہ ہتھوڑے سے مار مار کر اُن کی ہڈیاں توڑی جاتی تھیں۔ اور اِسطرح اُن کو ہلاک کیا جاتا۔ دراصل صلیب کے معنے بھی یہی ہیں کہ ہڈی توڑ کر گودا باہر نکال دینا۔ اور یہ نام اِسلئے رکھا گیا تھا کہ اکثر لوگ صلیب پر مرتے نہیں تھے بلکہ بعد میں اُن کی ہڈیاں توڑ کر گودا نکالا جاتا تھا۔ یہ لفظ خود اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ صلیب پر جلدی موت واقعہ ہو جاتی تھی۔

پھر مسیحؑ کی صلیب کے وقت اور بھی کئی غیر معمولی واقعات ہوئے۔ اوّل جب مسیحؑ پر مقدمہ ہُوا تو پیلاطوس جس کے پاس فیصلہ کے لئے یہ مقدمہ تھا اُس کی بیوی نے ایک منذر رؤیا دیکھا جس کی بنا پر اُس نے پیلاطوس کو کہلا بھیجا کہ "تُو اِس راستباز سے کچھ کام نہ رکھ کیونکہ مَیں نے آج خواب میں اِس کے سبب بہت دُکھ اٹھایا ہے۔" (متی باب ۲۷ آیت ۱۹)
پیلاطوس نے حضرت مسیحؑ کو چھوڑنے کی بہت کوشش کی مگر یہودیوں نے اصرار کیا کہ ہم اِسے ضرور سزا دلوائیں گے اور چونکہ حضرت مسیحؑ پر باغی ہونیکا الزام تھا۔ یہودیوں نے اُسے دھمکی دی کہ اگر تم نے اِسے چھوڑ دیا تو ہم تم پر یہ الزام لگائیں گے کہ تم نے ایک باغی کا ساتھ دیا ہے۔ جب اُسے سخت مجبور کیا گیا تو اُس نے "پانی لے کر بھیڑ کے آگے اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا مَیں اِس راستباز کے خون سے پاک ہوں تم جانو۔ تب سب لوگوں نے جواب میں کہا۔ اِس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر ہو" (متی باب ۲۷ آیت ۲۴ و ۲۵)
دوسرے پیلاطوس نے مسیحؑ کو ایسے وقت میں پھانسی کا

حکم دیا جبکہ دوسرے دن سبت تھا۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ جس شخص کو صلیب پر لٹکایا جاتا تھا وہ جلدی نہیں مرتا تھا بلکہ تین سے سات دن تک زندہ رہتا تھا اور بعض لوگ سات دن کے بعد بھی زندہ رہتے تھے ایسے لوگوں کی ہڈیاں توڑ کر اُن کو ہلاک کیا جاتا تھا بہرحال ایک دو دن تک صلیب پر لٹکنے کی وجہ سے کوئی شخص مرتا نہیں تھا۔ بیشک زخموں کی وجہ سے انہیں تکلیف ہوتی تھی مگر یہ تکلیف اُن کی موت کا موجب نہ بنتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چوروں اور ڈاکوؤں سے بعض دفعہ مقابلہ ہوتا ہے تو کئی لوگوں کے سر پھٹ جاتے ہیں مگر پھر بھی وہ پانچ پانچ سات سات دن تک زیرِ علاج رہتے ہیں اور پھر اُن میں سے بھی کئی بچ جاتے ہیں بہرحال اِس قسم کے زخم فوری ہلاکت کا موجب نہیں ہوتے حضرت مسیحؑ اُسی صورت میں صلیب پر فوت ہو سکتے تھے جب انہیں سات دن تک صلیب پر لٹکا رہنے دیا جاتا اور پھر اُن کی ہڈیاں بھی توڑی جاتیں۔ مگر پیلاطوس چونکہ مسیحؑ کے ساتھ تھا اِس لئے اُس نے مسیحؑ کی صلیب کیلئے ایسا وقت مقرر کیا جبکہ دوسرے دن سبت تھا اور یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر سبت کے دن کوئی شخص پھانسی پر لٹکا رہے تو ساری قوم لعنتی ہو جاتی ہے۔ بہرحال پیلاطوس سے جب اصرار کیا گیا کہ مسیحؑ کو ضروری پھانسی دی جائے۔ تو اُس نے حکم دیدیا کہ اِس کو ابھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور ظہر کے قریب کا وقت تھا۔ بلکہ ظہر کا وقت بھی ڈھل چکا تھا جب حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ عصر کے قریب تیز آندھی آگئی۔ وہ اتنی تیز تھی کہ اُس نے تمام جوّ کو اندھیرا کر دیا۔ اُس وقت بعض نے کہا کہ اگر اسی حالت میں شام ہو گئی اور ہمیں وقت کا علم نہ ہو سکا تو چونکہ شام سے سبت کا آغاز ہو جائیگا اِس لئے ساری قوم لعنتی ہو جائیگی۔ بہتر یہ ہے کہ انکو جلدی صلیب سے اُتار لیا جائے ایسا نہ ہو کہ شام کا وقت ہو جائے یسوع صلیب پر لٹکا رہے اور ساری قوم پر لعنت پڑ جائے اِس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہودیوں نے کیوں یہ اعتراض نہ کیا کہ مسیحؑ کو جمعہ کے دن صلیب پر لٹکایا نہ جائے بلکہ کسی اور دن اِسے صلیب دیا جائے؟ اِسکا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہود کا پہلو کمزور تھا اگر وہ کہتے کہ جمعہ کے دن مسیحؑ کو صلیب نہ دی جائے تو چونکہ مسیحؑ پر بغاوت کا الزام تھا پیلاطوس اُن کو کہہ سکتا تھا کہ اگر اِس دوران میں یہ شخص بھاگ گیا یا اِس کو ماننے والے اِس کو چھڑا کر لے گئے تو اِس کا کون ذمہ دار ہوگا اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کا یہود کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔ دوسرے چونکہ قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص صلیب پر نہ مرتا تو اُس کی ہڈیاں توڑ کر اُس کو مار دیا جاتا تھا۔ اِس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ صلیب پر زندہ رہا تب بھی اس کی ہڈیاں توڑی جائیں گی ہمیں اِس وقت یہ سوال نہیں اٹھانا چاہیئے کہ جمعہ کو اِسے صلیب پر نہ لٹکایا جائے کیونکہ ہم نے اِس پر الزام یہ لگایا ہے کہ یہ حکومت کا باغی ہے اگر ہم نے سزا کی التواء کے متعلق کوئی سوال اٹھایا تو پیلاطوس کہیگا کہ حکومت کے باغی کو تو فوراً مارنا چاہیئے تم یہ سوال کیوں اٹھاتے ہو کہ اِسے ابھی زندہ رہنے دیا جائے اور ایک دو دن گذرنے کے بعد اسے صلیب پر لٹکایا جائے۔ بہرحال یہود نے کوئی مزاحمت نہ کی اور حضرت مسیحؑ کو جمعہ کے دن پچھلے پہر صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ مگر چونکہ پیلاطوس دل سے مسیحؑ کا خیرخواہ تھا اور اپنی بیوی کے خواب کی وجہ سے وہ ڈر بھی چکا تھا اِس لئے اُس نے مسیحؑ کو صلیب دیتے وقت فوج کا ایک ایسا دستہ مقرر کیا جس کا افسر خود مسیحؑ کا مُرید تھا۔ اِسی طرح پہرہ داروں اور پولیس کے حاضر الوقت سپاہیوں میں سے بھی بعض حضرت مسیحؑ کے مرید تھے۔ چنانچہ اِس کا ظاہری ثبوت اِس امر سے ملتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ درد کی شدت کی وجہ سے چلائے تو پہرہ داروں میں سے ایک نے جلدی سے اسفنج کا ایک ٹکڑا لیا اور اُسے شراب اور مُر سے بھگو کر حضرت مسیحؑ کو چُوسنے کے لئے دیا۔ پادری لوگ دانستہ یا ناواقفیت سے جب واقعہ صلیب کے متعلق تقریر کرتے ہیں تو جسطرح شیعہ لوگ واقعاتِ کربلا کو زیادہ سے زیادہ دردناک رنگ میں پیش کرتے ہیں اور معمولی باتوں کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کر دیتے ہیں اِسی طرح وہ بھی بعض دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں دیکھو خدا کے بیٹے سے کسقدر دشمنی کی گئی کہ جب وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور شدتِ درد

کی وجہ سے کراہ رہا تھا تو اُسوقت کمبخت ظالموں نے شراب اور مُر میں اسفنج بھگو کر اُس کے مونہہ میں ڈالا اور اِسطرح آخری وقت میں اُسے اور زیادہ تکلیف اور دُکھ میں ڈالا۔ حالانکہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ صلیب پر لٹکائے جانے والوں میں سے جب کسی کی رعایت منظور ہوتی اور اُس کی تکلیف کو کم کرنا مناسب سمجھا جاتا تو اُسے شراب اور مُر کا مرکب پلایا جاتا تھا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ اناجیل میں شراب اور مُر کا ذکر نہیں آتا بلکہ اتنا ذکر آتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ شدّتِ درد کی وجہ سے چلّائے تو "ایک نے دوڑ کر اسفنج کو سرکے میں بھگو کر اور ایک نرکٹ پر رکھ کے اُسے چُسایا" (مرقس باب ۱۵ آیت ۳۶) مگر سرکہ میں بھگو کر اسفنج منہ میں دینا اُس زمانہ کے دستوروں میں کہیں ثابت نہیں پھر وجہ کیا ہے کہ وہاں سرکہ اور اسفنج رکھا تھا کیا لوگ بلا وجہ سرکہ اور اسفنج ساتھ رکھا کرتے ہیں؟ کیا کسی مجلس میں سرکہ اور اسفنج طلب کیا جائے تو فوراً مل جائیگا؟ پس یہ روایت دیدہ دانستہ یا حقیقت سے ناواقفی کی وجہ سے بیان کی گئی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ اِس زمانہ کے خیال کے مطابق کہ زخموں کی تکلیف دُور کرنے کے لئے مُر اور شراب دینی چاہیئے حضرت مسیحؑ کے مریدوں نے اُنکے شراب اور مُر رکھے ہوئے تھے۔ جب وہ شدّتِ درد سے چلّائے تو انہوں نے دوڑ کر اسفنج اُس میں بھگو کر چُسا دیا (دیکھو جیوش اِن سائیکلو پیڈیا جلد ۴ زیر لفظ صلیب) اِس حوالہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

The details given in the New Testament accounts (Matt. xxvii) of the crucifixion of Jesus agree on the whole with the procedure in vogue under Roman Law. Two modifications are worthy of note:

(1) In order to make him insensible to pain a drink (Matt. xxvii) was given him. This was in accordance with the humane Jewish provision (Maimonides, "Vad, Senb xiii, Sanb 43 a).

(2) The beverage was a mixture of myrrh and wine, "given so that the delinquent might lose clean consciousness through the ensuing intoxication".

یعنی انجیل میں یسوع کے صلیب پر لٹکائے جانے کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ عام طور پر اُس رومن قانون کے مطابق معلوم ہوتی ہے جو اُن دنوں رائج تھا۔ صرف دو فرق ایسے ہیں جو خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ یسوع مسیحؑ کو درد کی طرف سے بے حس کرنے کے لئے ایک دوائی دی گئی جس کا پلایا جانا یہودیوں کے ایک ہمدردانہ قانون کے مطابق تھا۔

یہ دَوا جو پلائی جاتی تھی مُر اور شراب کا ایک مرکب ہوتی تھی اور اس لئے دی جاتی تھی تاکہ سزا پانے والے مجرم میں احساسِ درد باقی نہ رہے اور نشہ کی وجہ سے اُسے تکلیف محسوس نہ ہو۔ پس گو انجیل میں یہ لکھا ہے کہ اسفنج کو سرکہ میں بھگو کر حضرت مسیحؑ کو چُوسنے کیلئے دیا گیا مگر دراصل یہ سرکہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک دوا تھی جو شراب اور مُر کو ملا کر تیار کی جاتی تھی اور یہ مرکب خاص اور اہم لوگوں کو زخموں کی تکلیف کم کرنے کے لئے دیا جاتا تھا۔ حضرت مسیحؑ کو بھی پہرہ دار نے یہ مرکب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہرہ دار جو کہ اُس موقعہ پر پیلاطوس کی طرف سے مقرر کئے گئے تھے حضرت مسیحؑ کے مُرید تھے اور وہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کی تکلیف کو جس قدر ہو سکے کم کیا جائے۔ اِسی طرح پیلاطوس کا حضرت مسیحؑ کو جمعہ کے دن کے آخری حصہ میں صلیب پر لٹکانا اِس بات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ پیلاطوس دل سے چاہتا تھا کہ حضرت مسیحؑ صلیب سے بچ جائیں اِس لئے اُس نے سبت کے قریب کے دن کے آخری حصہ میں آپ کو صلیب دینے کا

حکم دیا تاکہ تھوڑے سے قلیل عرصہ آپ صلیب پر رہیں اور اسطرح آپ ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا نے بھی اس بات کو لیا ہے کہ یہ بالکل غیر معمولی اور خلاف قاعدہ فعل تھا جسکا پیلاطوس نے ارتکاب کیا۔ لکھا ہے:-

The greatest difficulty from the point of view of the Jewish penal procedure is presented by the day and time of the execultion. according to the Gospels, Jesus died on Friday the eve of Sabbath. Yet on the day in view of the approach of the Sabbath (or holiday), execution lasting until late in the afternoon were almost impossible. (Sifre, ii-221; Sanb. 35b; Mekitte to Wayakhel).

یعنی سب سے بڑی مشکل جو یہودی قانونِ تعزیر کے سلسلہ میں ہمارے سامنے پیش آتی ہے وہ اُس وقت اور دن کی تعیین سے تعلق رکھتی ہے جس میں یسوع مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا انجیل کے رو سے یسوع جمعہ کے دن سبت کی شام کو مرا حالانکہ یہودی قانون کے مطابق اُس دن کوئی شخص صلیب پر لٹکایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ سبت کے قرب کی وجہ سے بعد دوپہر مجرموں کو کافی دیر تک صلیب پر لٹکائے رکھنا قریباً ناممکن تھا۔

گویا جیوش انسائیکلوپیڈیا والا نہ صرف جمعہ کے دن حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکانا ایک عجیب بات سمجھتا ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ صلیب پر اُس دن زیادہ دیر تک کوئی شخص لٹکایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس بنا پر ہمارا حق ہے کہ اگر انجیل یہ کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کو تین گھنٹے صلیب پر لٹکایا گیا تو ہم یہ کہیں کہ آپ کو صرف ڈیڑھ دو گھنٹے لٹکایا گیا تھا۔ کیونکہ سبت کے قرب کی وجہ سے زیادہ دیر تک کسی شخص کو صلیب پر لٹکایا نہیں جا سکتا تھا بہرحال اگر دو یا تین گھنٹے آپ کو لٹکایا گیا۔ تب بھی اس سے آپکی موت واقع نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ صلیب پر بعض دفعہ سات سات دن تک بھی لوگ زندہ رہتے تھے اور وہ اُسوقت تک نہیں مرتے تھے جب تک ہتھوڑے مار مار کر اُنکی ہڈیوں کا گودا نہ نکالا جاتا۔

دوسرا ثبوت اِس امر کا کہ پیلاطوس نے حضرت مسیحؑ کو بچانے کے لئے صلیب کے وقت بعض ایسے افسروں کی وہاں ڈیوٹیاں مقرر کر دی تھیں جو حضرت مسیحؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ ہے کہ انجیل میں لکھا ہے جب حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا تو "وے جو اُدھر سے جاتے تھے سر ہلاتے تھے اور یہ کہہ کے اُسے ملامت کرتے تھے کہ واہ تُو جو ہیکل کو ڈھاتا اور تین دن میں بناتا تھا اپنے تئیں بچا اور صلیب پر سے اُتر آ اِسی طرح سردار کاہنوں نے بھی آپس میں فقیہوں کے ساتھ ٹھٹھے کرتے ہوئے کہا اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں بچا نہیں سکتا۔ بنی اسرائیل کا بادشاہ مسیحؑ اب صلیب پر سے اُتر آوے تاکہ ہم دیکھیں اور ایمان لاویں۔" (مرقس باب ۱۵ آیت ۲۹ تا ۳۲)

غرض بقول انجیل اُسوقت لوگ آپ پر مذاق کر رہے تھے اِسی دوران میں حضرت مسیحؑ شدت درد کی وجہ سے چلّائے اور بقول بائیبل انہوں نے "دم توڑ دیا" اُس وقت کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے انجیل میں لکھا ہے۔ "اُس صوبہ دار نے جو اُس کے سامنے کھڑا تھا اُسے یُوں چلّاتے اور دَم چھوڑتے دیکھ کے کہا کہ یہ شخص سچ مچ خدا کا بیٹا تھا" (مرقس باب ۱۵ آیت ۳۹) اب بتاؤ کیا یہ الفاظ کوئی ایسا شخص کہہ سکتا تھا جو حضرت مسیحؑ کا مخالف ہوتا۔ اگر وہ آپ کو فقیہوں اور فریسیوں کی طرح جھوٹا سمجھتا تو اُسے کہنا چاہیئے تھا کہ دیکھو آج ثابت ہو گیا ہے کہ یہ شخص خدا کا بیٹا نہیں تھا ہم نے اِسے صلیب پر لٹکایا اور اس کی جان لے لی۔ مگر وہ یہ نہیں کہتا وہ آپ پر ہنسی نہیں اڑاتا وہ آپ کے دعویٰ کی تکذیب نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ "یہ شخص سچ مچ خدا کا بیٹا تھا" یہ اِس امر کا ایک واضح اور کھلا ثبوت ہے کہ صلیب کے وقت پیلاطوس نے

اولاً ایسے افسر اور سپاہی مقرر کئے تھے جو حضرت مسیحؑ پر ایمان لا چکے تھے تاکہ آپ کی تکلیف کو وہ زیادہ سے زیادہ کم کر سکیں اور صلیب سے اتارنے کے بعد آپ کی حفاظت اور علاج میں وہ حصہ لے سکیں۔ بہر حال مسیحؑ بوجہ نازک بدن ہونے کے بے ہوش ہو گئے۔ اتنے میں آندھی آئی تو مسیحؑ کو اتار لیا گیا تاکہ کہیں سبت نہ آ جائے۔ جب آپ کو اور اُن چوروں کو بھی اتار لیا گیا جن کو آپ کے ساتھ ہی صلیب پر لٹکایا گیا تھا تو قاعدہ کے مطابق ساتھ کے چوروں کی ہڈیاں توڑ دی گئیں مگر افسر پولیس چونکہ حضرت مسیحؑ کا مرید تھا جیسا کہ مرقس باب ۱۵ آیت ۳۹ اور متی باب ۲۷ آیت ۵۴ سے ظاہر ہے۔ اُس نے یہ چالاکی کی کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق کہدیا یہ تو مر گیا ہے اس کی ہڈیاں توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ "سپاہیوں میں سے ایک نے بھالے سے اُس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اُس سے لہو اور پانی نکلا"۔ (یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴) لہو اور پانی کا نکلنا بتا رہا ہے کہ آپ زندہ تھے اگر فوت ہو چکے ہوتے تو آپ کا خون جم جانا چاہیئے تھا۔ لیکن لہو اور پانی نکلنے کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ درحقیقت اُن کے جسم میں سے بہتا ہوا خون نکلا۔ مگر حضرت مسیحؑ چونکہ اُس وقت بے ہوش تھے اُس سپاہی نے لوگوں کو دھوکا میں مبتلا رکھنے کے لئے کہدیا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔

اِس کے فوراً بعد یوسف آرمیتا جو حضرت مسیحؑ کے مرید تھے پیلاطوس کے پاس گئے اور اُس سے اجازت لی کہ لاش میرے حوالے کی جائے چنانچہ پیلاطوس نے حکم دیدیا کہ لاش یوسف آرمیتہ کو دے دی جائے (متی باب ۲۷ آیت ۵۸) لاش پر قبضہ کرنے کے بعد یوسف آرمیتہ نے ایک کھلی کوٹھڑی جیسی قبر میں اُن کو بند رکھا جو زمین میں کھودی ہوئی نہ تھی بلکہ کوٹھری کی طرح چٹان میں کھدی ہوئی تھی انہیں اُنکے جسم کو رکھکر اُس کے سامنے پتھر رکھدیا گیا جس کے معنے یہ ہیں کہ ہوا کا راستہ کھلا رکھا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے:- "یوسف نے لاش لے کر سوتی صاف چادر میں لپیٹی اور اپنی نئی قبر میں جو چٹان میں کھودی تھی رکھی اور ایک بھاری پتھر قبر کے مونہہ پر ڈھلکا کے چلا گیا" (متی باب ۲۷ آیت ۵۹ و ۶۰) جیوش انسائیکلوپیڈیا نے بھی اِس سوال کو خاص طور پر اٹھایا ہے۔ چنانچہ اُس میں لکھا ہے:-

Bodies of delinquents were not buried in private graves (Sanb. vi. 5), While that of Jesus was buried in a sepulchro belonging to Joseph of Arimathea. (Jewish Encyclopaedia vol. 4, p. 373.)

یعنی مجرموں کی لاشیں خاص قبروں میں نہیں دفنائی جاتی تھیں لیکن یسوع مسیحؑ کے ساتھ یہ امتیازی سلوک روا رکھا گیا کہ اُس کی نعش یوسف آرمیتا کی مملوکہ ایک کھلی کوٹھڑی میں رکھی گئی۔ یہود کو اِس پر شبہ ہُوا اور انہوں نے پیلاطوس سے شکایت کی کہ تیسرے دن تک قبر کی نگرانی کی جائے چنانچہ لکھا ہے:-

"دوسرے روز جو تیاری کے دن کے بعد ہے سردار کاہنوں اور فریسیوں نے مل کر پیلاطوس کے پاس جمع ہو کے کہا کہ اے خداوند ہمیں یاد ہے کہ وہ دغاباز اپنے جیتے جی کہتا تھا کہ مَیں تین دن بعد جی اٹھونگا۔ اِس لئے حکم کر کہ تیسرے دن تک قبر کی نگہبانی کریں" (متی باب ۲۷ آیت ۶۲ و ۶۳) اِس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی یہ پیشگوئی کہ یہود کو وہی نشان دکھایا جائیگا جو یونس نبی کے ذریعہ ظاہر ہُوا لوگوں میں خوب مشہور ہو چکی تھی اور حواری اِس پیشگوئی کے مطابق ہر ایک سے یہ کہتے پھرتے تھے کہ جس طرح یونس تین رات دن کے بعد مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکل آیا اِسی طرح مسیحؑ بھی تین رات اور دن کے بعد زندہ ہو جائیگا۔ اِس پیشگوئی کی بناء پر یہود سمجھتے تھے کہ تین دن اور رات گذرنے کے بعد حواریوں نے کہدینا ہے کہ دیکھو مسیحؑ زندہ ہو گیا۔ اِس لئے بہتر یہی ہے کہ پیلاطوس کو ابھی سے کہدیا جائے کہ جس کوٹھڑی میں مسیحؑ کی لاش کو

رکھا گیا ہے اُس پر تین دن تک پہرہ لگا دیا جائے تاکہ مسیحؑ کی یہ بات پوری نہ ہو سکے کہ مَیں یونس نبی کی طرح تین رات اور دن گذرنے کے بعد زندہ نکل آؤنگا۔ مگر پیلاطوس چونکہ اندر سے مسیحؑ کے ساتھ تھا۔ اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ مَیں سرکاری پہرے دار مقرر نہیں کر سکتا۔ "تمہارے پاس پہرے والے ہیں جا کے مقدور بھر اُس کی نگہبانی کرو۔" (متی باب ۲۷ آیت ۶۵) یعنی تم خود پہرہ دیتے رہو مَیں سرکاری طور پر اِس بارہ میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ پیلاطوس کی اِس انکار سے غرض یہ تھی کہ اگر حکومت کی طرف سے وہاں پہرے دار مقرر کئے گئے تو اُس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکل نہیں سکیں گے اور اگر پہرے داروں کا مقابلہ کر کے نکلے تو چونکہ وہ حکومت کی طرف سے مقرر ہونگے اُن کا مقابلہ حکومت کا مقابلہ سمجھا جائیگا اور انہیں اور زیادہ مشکلات پیش آجائیں گی لیکن اگر عام لوگ پہرہ پر ہوئے تو انکا مقابلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ مسیحؑ کے حواری اُن سے لڑ لیں گے اور مسیحؑ کو نکال کر لے جائیں گے۔ اِس حکمت کے ماتحت اُس نے سرکاری پہرہ لگانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مَیں پولیس مقرر نہیں کر سکتا۔ اگر تم اُس کی نگرانی کرنا ضروری سمجھتے ہو تو خود پہرہ لگا لو۔ جب اتوار کی صبح کو پو پھٹتے وقت کچھ عورتیں وہاں گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں مسیحؑ نہیں ہیں اور ایک فرشتہ چٹان پر بیٹھا ہُوا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ "سبت کے بعد جب ہفتہ کے پہلے دن پو پھٹنے لگی مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر کو دیکھنے آئیں اور دیکھو کہ ایک بڑا بھونچال آیا تھا کیونکہ خداوند کا فرشتہ آسمان سے اُتر کے آیا اور اُس پتھر کو قبر سے ڈھلکا کے اُس پر بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ بجلی کا سا اور اُس کی پوشاک سفید برف کی سی تھی۔" (متی باب ۲۸ آیت ۱ تا ۳) مَیں سمجھتا ہوں فرشتہ کوئی نہ تھا یہ حضرت مسیحؑ تھے جو باہر نکل کر چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے کفن پہنا ہُوا تھا۔ بہرحال انجیل کے بیان کے مطابق فرشتہ نے اُن عورتوں سے کہا کہ مسیحؑ جسے تم دیکھنے کے لیے آئی ہو وہ یہاں نہیں ہے بلکہ اپنے حواریوں کے پاس جلیل کو گیا ہے تم جاؤ اور دوسرے حواریوں کو بھی اِس امر کی اِطلاع دے دو۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے "فرشتے نے مخاطب ہو کر اُن عورتوں سے کہا تم مت ڈرو مَیں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو جو صلیب پر کھینچا گیا ڈھونڈتی ہو۔ وہ یہاں نہیں ہے کیونکہ جیسا اُس نے کہا تھا وہ جی اُٹھا ہے آؤ یہ جگہ جہاں خداوند پڑا تھا دیکھو اور جلد جا کے اُس کے شاگردوں سے کہو کہ وہ مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے اور دیکھو وہ تمہارے آگے جلیل کو جاتا ہے وہاں تم اُسے دیکھو گے دیکھو مَیں نے تمہیں جتا دیا" (متی باب ۲۸ آیت ۵ تا ۸) یہ بھی لکھا ہے کہ یہود میں یہ مشہور تھا کہ پہرہ داروں کو رشوت دے کر یہ مشہور کیا گیا کہ وہ زندہ ہو کر چلا گیا ہے (متی باب ۲۸ آیت ۱۱ تا ۱۵) اِس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ پہرہ داروں نے یہی خبر دی تھی کہ مسیحؑ کے شاگرد زبردستی مسیحؑ کو کوٹھڑی میں سے نکال کر لے گئے ہیں مگر چونکہ یہود حضرت مسیحؑ کو لعنتی ثابت کرنا چاہتے تھے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پہرہ دار ٹھیک نہیں کہتے اُنکو رشوت دے کر اِس بات پر آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ مسیحؑ زندہ ہو کر چلا گیا ہے۔

پھر لکھا ہے مسیحؑ حواریوں پر ظاہر ہُوا اور انہیں کہا کہ "میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھو کہ مَیں ہی ہوں اور مجھے چھوؤ۔ اور دیکھو کیونکہ رُوح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کے انہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے" (لوقا باب ۲۴ آیت ۳۹ و ۴۰) اِسی طرح لکھا ہے۔ "جب وے مارے خوشی کے اعتبار نہ کرتے اور متعجب تھے اُس نے اُن سے کہا کہ کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے تب انہوں نے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتہ اُس کو دیا اُس نے لے کے اُن کے سامنے کھایا" (لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱ تا ۴۳)

یوحنا میں لکھا ہے کہ تھوما حواری نے جب یہ بات سُنی کہ حضرت مسیحؑ صلیب سے بچ گئے ہیں تو اُسے یقین نہ آیا اور اُس نے کہا۔ "جب تک کہ مَیں اُس کے ہاتھوں میں کیلوں کے نشان نہ دیکھوں اور کیلوں کے نشانوں میں اپنی انگلی نہ ڈالوں اور اپنے ہاتھ کو اُس کے پہلو میں بھی نہ ڈالوں ہرگز یقین

نہ کرونگا" (باب ۲۰ آیت ۲۵) حضرت مسیحؑ نے یہ بات سُنی تو انہوں نے تھوما کو کہا۔ اپنی انگلی پاس لا اور میرے ہاتھوں کو دیکھ اور اپنا ہاتھ پاس لا اور اُسے میرے پہلو میں ڈال اور بے ایمان مت ہو بلکہ ایمان لا" (یوحنا باب ۲۰ آیت ۲۷)

اِن دلائل سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ خیال کہ وہ صلیب پر لٹک کر مر گئے تھے بالکل باطل اور بے بنیاد ہے۔ بیشک حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ مگر خدا نے انکو بچا لیا اور اِسطرح وہ نشان ظاہر ہُوا جس کا انہوں نے قبل از وقت اعلان کر دیا تھا کہ جسطرح یونہ نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا۔ زندہ رہا اور زندہ ہی باہر نکلا۔ اِسی طرح مَیں بھی صلیب پر سے زندہ اُتروں گا۔ زندگی کی حالت میں قبر میں جاؤنگا اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی قبر سے باہر نکلونگا۔

پھر کفّارہ کے خلاف ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ جب صلیب سے بچ گئے تو اُس کے بعد وہ ہمیشہ اِس کوشش میں رہے کہ کہیں دوبارہ دشمن اُن کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے حالانکہ اگر وہ سچ مچ خدا کے بیٹے تھے یا حواریوں پر حضرت مسیحؑ کی رُوح ظاہر ہوئی تھی تو رُوح کو چھپنے کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ ہر ایک کے سامنے آتی اور کہتی کہ اگر تم میں طاقت ہے تو مجھے اب مار کر دکھاؤ۔ مگر انجیل اِس بات پر گواہ ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد وہ دشمن سے چھپتے پھرے۔ پس حضرت مسیحؑ کے متعلق عیسائیوں کا یہ خیال کہ وہ بنی نوع انسان کے گناہوں کیلئے کفّارہ ہو گئے تھے شروع سے لیکر آخر تک باطل ہے۔

انسانی پیدائش کے متعلق تیسرے نظریے کا ردّ

انسانی پیدائش کے متعلق تیسرا خیال دنیا میں یہ پایا جاتا ہے کہ انسان کسی خاص ملکہ کو لیکر پیدا نہیں ہُوا۔ وہ اپنی تعلیم و تربیت سے متأثر ہوتا اور اُس کے مطابق ہو جاتا ہے گویا وہ حالات سے مجبور ہے۔ یہ فرائیڈ اور دوسرے یورپین فلسفیوں کا خیال ہے اُن کے نزدیک پیدائشی لحاظ سے انسان جانوروں کی سی حالت رکھتا ہے۔ نہ اُس میں نیکی کا ملکہ ہوتا ہے اور نہ بدی کا ملکہ ہوتا ہے ہاں جب وہ پیدا ہو جاتا ہے تو اپنے گرد و پیش کے حالات سے متأثر ہوتا ہے اگر وہ حالات نیک ہوں تو نیک ہو جاتا ہے اور اگر بد ہوں تو بد ہو جاتا ہے۔ بہرحال حالات سے مجبور ہو کر اُس میں نیکی اور بدی کی مختلف کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں ہم کہتے ہیں اگر تو اِس کا یہ مفہوم ہے کہ ہر بچہ اپنی ذات میں بغیر کسی گناہ کے اثر کے پیدا ہوتا ہے لیکن بعد میں حالات اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ اُن کے نتیجہ میں گندہ اور خراب ہو جاتا ہے تو اسلام کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ حَتّٰی یُعْرِبَ عَنْہُ لِسَانُہٗ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ (الطبرانی فی الجامع الکبیر بحوالہ جامع الصغیر) ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے بعد ماں باپ اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس اگر فرائیڈ اور دوسرے یورپین فلسفیوں کی تھیوری یہ ہے کہ ہر بچہ فطرت صحیحہ لے کر دنیا میں آتا ہے لیکن اُس کے بعد وہ حالات سے مجبور ہو کر بعض دفعہ گندہ اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ تو اِس نتیجہ کے ہم بھی قائل ہیں اور یہ عین قرآن اور حدیث کے مطابق عقیدہ ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا اس کی اِصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر اصلاح نہیں ہو سکتی تو احسن تقویم بیکار ہو گئی لیکن اگر اصلاح ہو سکتی ہے تو پھر خواہ خراب حالات کے اثر سے انسان بگڑ جائے اُس کی پیدائش کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اُس میں نیکی کا کوئی ملکہ ودیعت نہیں کیا گیا۔ اِس نقطۂ نگاہ کے ماتحت جب ہم اِس تھیوری پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرائیڈ اور دوسرے یورپین فلسفی خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سائیکو انیلیسس (تجزیۂ شہوات) اُن کا ایک خاص مسئلہ ہے جس کے ماتحت یہ اُن لوگوں کا علاج کرنے کے بھی دعویدار ہیں جو مختلف قسم کے گندے خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

درحقیقت فرائیڈ کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کی خرابی اُسوقت سے شروع نہیں ہوتی جب وہ کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے بلکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اُسی وقت سے اُس کی فطرت کے اندر بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی مختلف

حرکات اور سکنات اُس کے دل میں غلط یا صحیح جذبات پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً شہوت کا مادہ جو انسان میں پایا جاتا ہے اُس کے متعلق فرائیڈ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ اُس وقت سے پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے جب بچہ ماں کے پستانوں سے دودھ چُوستا ہے۔ وہ کہتا ہے ماں کا دودھ چُوسنے اور جسم کی باہمی رگڑ سے اُسے خاص قسم کا حظ محسوس ہوتا ہے اور شہوانی مادہ اُس میں پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے پیشاب پاخانہ کرنے کے بعد جب اعضاء کی صفائی کی جاتی ہے تو ہاتھوں کی رگڑ سے اُس کے قلب میں شہوانی خیالات کا احساس بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ پس یہ صحیح نہیں کہ پندرھویں یا سولھویں سال میں بچے کے اندر شہوانی مادہ پیدا ہوتا ہے بلکہ بقول اُس کے بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی یہ احساس مختلف حرکات و سکنات کے نتیجہ میں اُس کے قلب میں پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے جو جوانی کے قریب زیادہ مکمل صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اِس نتیجہ میں بھی ہم فرائیڈ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اسلام بھی یہی نظریہ پیش کرتا ہے کہ بدی اور نیکی کا احساس بچپن میں ہی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہدایت دی ہے کہ جب بچہ پیدا ہو اُسی وقت اُس کے کان میں اذان دو کیونکہ اُس کی تعلیم اور تربیت کا زمانہ پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ پس اگر فرائیڈ کی اتنی ہی تھیوری ہو تو ہم کہیں گے میاں فرائیڈ اِس تھیوری کے تم موجد نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم موجد ہیں۔ لیکن اِن نتائج کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود ہمارا سوال اِس تھیوری کے ماننے والوں سے یہ ہے کہ خواہ تمام خرابیاں بچپن سے ہی انسانی قلب میں پیدا ہو جاتی ہوں سوال یہ ہے کہ جب کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اُس کی اصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یا فطرت کا وہ بگاڑ جو ماحول کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے کسی اور طریق سے دُور ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر دُور ہو سکتا ہے تو یہ خیال بالکل باطل ہو گیا کہ فطرت نیکی لے کر پیدا نہیں ہوئی۔ بالخصوص سائیکو اینیلیسس (تجزیۂ شہوات) کے ذریعہ اِس تھیوری کے ماننے والوں نے جو طریقِ علاج تجویز کیا ہے وہ خود اپنی ذات میں اِس عقیدہ کو باطل ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ یہ تھیوری جس کا فرائیڈ کو موجد قرار دیا جاتا ہے اِس رنگ میں بیان کی جاتی ہے کہ بچے کو پہلا عشق اپنی ماں سے ہوتا ہے لیکن بڑے ہو کر گردوپیش کے حالات کی وجہ سے یا مذہبی لوگوں کی باتیں سُن سُن کر اُس کا یہ خیال دب جاتا ہے اور اُس کی بجائے بیوی کی محبت اُس کے سامنے آجاتی ہے لیکن بعض لوگوں کے اندر یہ جذبہ اتنی طاقت پکڑ جاتا ہے کہ بعد میں کوئی اور محبت اُن کے جذبۂ محبت پر غالب نہیں آسکتی۔ اُدھر وہ مذہبی لوگوں سے باتیں سُنتے ہیں تو انہیں یہ کہتا ہُوا پاتے ہیں کہ ماں بیوی نہیں بن سکتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ماں بیوی نہیں بن سکتی اور اُدھر وہ محبت جو دودھ چُوستے وقت بچہ کے دل میں اپنی ماں کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے اُسے ماں کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اِن متضاد خیالات کا اُس کی طبیعت مقابلہ نہیں کر سکتی اور وہ کئی قسم کی دماغی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے بیشک بعض دفعہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اُس کی بیماری کی کیا وجہ ہے۔ لیکن سائیکو اینیلیسس (تجزیۂ شہوات) کے ذریعہ اگر اُس کا علاج کیا جائے تو اُس کی مخفی مرض کا پتہ چل جاتا ہے اور اُس کی بیماری کو آسانی کے ساتھ دُور کیا جا سکتا ہے۔ اِس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ غور کرتے ہوئے انہوں نے سو کے قریب ایسی باتیں جمع کی ہیں جو اُن کے نزدیک بچے پر اثر ڈال کر اُسے مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار بنا دیتی ہیں جب کوئی مریض اِس طریقِ علاج کے ماہر کے پاس آتا ہے تو وہ اُسے لِٹا کر اور اُس کے جسم کو ڈھیلا کر کے اُس کی نبض پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک ایک کر کے مختلف باتیں اُس کے سامنے بیان کرتا چلا جاتا ہے کبھی ماں کی محبت کا ذکر کرتا ہے کبھی باپ کی محبت کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی ماں کی محبت کا ذکر کرتا ہے کبھی کسی امر کا اور کبھی کسی امر کا ذکر کرتا ہے اور نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس بات پر اُس کی نبض میں

غیرمعمولی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صاف بات ہے کہ جب کسی ایسی بات کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے انسان کو خاص طور پر دلچسپی ہوتی ہے تو اُس کے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے اور بعض بھی زیادہ بلند جلدی حرکت کرنے لگتی ہے۔ اِس طرح ڈاکٹر معلوم کر لیتا ہے کہ مریض کی بیماری کا اصل باعث کیا ہے اور وہ کیوں بیمار چلا آرہا ہے۔ اِس کے بعد اگر وہ خیال جائز ہو تو وہ اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرے اور اگر ناجائز ہو تو اُس خواہش کی قباحت پر اُس کے سامنے متواتر لیکچر دیتے ہیں یہاں تک کہ اُس کے دل اور دماغ سے وہ خواہش بالکل نکل جاتی ہے اور چونکہ بیماری کا اصل سبب دُور ہو جاتا ہے اُس کی بیماری جاتی رہتی ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ اِس طریقِ علاج کے ماتحت کئی قسم کے تجارب کئے گئے ہیں اور قطعی طور پر ایسے کئی کیس پیش کئے جاتے ہیں جو اور کسی ذریعہ سے اچھے نہ ہوئے لیکن سائیکو اینیلیسس (تجزیۂ شہوات) کے ماتحت جب اُن کا علاج کیا گیا اور اُن کی مخفی خواہشات کا علم حاصل کر کے اُن کو پورا کرنے یا اُن کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بالکل اچھے ہو گئے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد ہزاروں لوگ ایسے تھے جو گولہ باری کے صدمات کے نتیجہ میں پاگل ہو گئے تھے۔ اُن میں سے بعض تو اور علاجوں سے اچھے ہو گئے مگر بعض ایسے تھے جو کسی علاج کے بھی اچھے نہ ہوئے۔ آخر گورنمنٹ کو خیال پیدا ہوا کہ اِن مریضوں کا سائیکو اینیلیسس (تجزیۂ شہوات) کے ذریعہ کیوں نہ علاج کرایا جائے۔ چنانچہ اِس طرح اُن کی تشخیص کروائی گئی تو کئی بیماروں کی نسبت معلوم ہوا کہ بظاہر وہ گولہ باری کے صدمہ کے نتیجہ میں پاگل ہوئے تھے لیکن دراصل اُن کی بیماری کی وجہ بعض جذباتِ شدیدہ کا پورا نہ ہونا تھا جب اُن کی بیماری کی اصل وجہ کا پتہ چل گیا تو اُس کے مطابق علاج کرنے پر وہ بالکل اچھے ہو گئے حالانکہ اِس سے پیشتر اُن کے علاج کے لئے ہر قسم کی دوائیں استعمال کی جا چکی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو اِس طریقِ علاج سے تندرست ہوئے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ بیشک یورپ میں ایسے ہزاروں لوگ ہوں مگر ہمارے ملک میں تو اِس قسم کا کوئی مریض نظر نہیں آتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی بیماری نہیں بلکہ ایک مقامی بیماری ہے جو یورپ میں پیدا ہو چکی ہے۔ اگر انسانی بیماری ہوتی تو ہندوستان میں بھی ہوتی۔ مصر میں بھی ہوتی۔ شام میں بھی ہوتی فلسطین میں بھی ہوتی۔ چین اور جاپان میں بھی ہوتی مگر ہمیں دنیا کے اور کسی ملک میں یہ بیماری نظر نہیں آتی اگر آتی ہے تو صرف یورپ میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یورپ کا مخصوص مرض ہے۔ تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ اِس کا کوئی تعلق نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یورپ میں عام طور پر چونکہ گند اور خرابی میں لوگ مبتلا رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے خیالات بھی ناپاک ہوتے ہیں اِس لئے وہ اِس قسم کے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور خواہشات کے پورا ہو جانے پر وہ اچھے ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں چونکہ عام طور پر خیالات میں پاکیزگی پائی جاتی ہے اور وہ گند یہاں نہیں جو یورپ میں نظر آتا ہے اِس لئے یہاں کسی کو سائیکو اینیلیسس کے ذریعہ اپنا علاج کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پس اگر یورپین فلسفیوں کی یہ تھیوری درست ہے تب بھی ہم انہیں کہیں گے کہ یہ تمہاری مقامی بیماری ہے بنی نوعِ انسان کی بیماری نہیں لیکن بفرضِ محال اگر اسے بنی نوعِ انسان کی مرض سمجھ لیا جائے۔ تب بھی ہم کہتے ہیں کہ تم نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ خرابی کی اصلاح ہو سکتی ہے جب تم نے یہ تسلیم کر لیا تو قرآن کی اِس آیت کی صداقت ثابت ہو گئی کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی ہماری سُنت یہ ہے کہ ہم انسانی رُوح کے بیمار ہونے پر اُس کو اچھا کرنے کے سامان مہیا کیا کرتے ہیں اور یہی فطرتِ انسانی کے پاک ہونے کے معنے ہیں کہ خدا نے اُس کی ہدایت اور اِصلاح کے سامان پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اگر انسان اُن سے فائدہ اُٹھا لے تو وہ پاکیزگی کا جامہ پہن لیتا ہے اور اگر فائدہ نہ اُٹھائے تو حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسلام یہ کہتا ہے کہ فطرتِ انسانی کو مستقل طور پر خراب قرار دینا اور اُس کیلئے خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ دائمی طور پر مسدود قرار دینا قطعی طور پر

غلط اور بے بنیاد امر ہے۔ خدا نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ خواہ اُس میں کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو جائیں کتنی کمزوریاں اُس میں رونما ہو جائیں پھر بھی اُس کے دل کو صیقل کیا جا سکتا ہے۔ اُس کی خرابیوں کو دُور کیا جا سکتا ہے اور اُسے خدا تعالےٰ کے آستانہ پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ آخر اسلام یہ تو نہیں کہتا کہ فطرتِ انسانی کے نیک ہونے کے یہ معنے ہیں کہ انسان ہمیشہ نیک رہتا ہے اسلام خود حالات کی خرابی کی وجہ سے فطرت کا مسخ ہو جانا تسلیم کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اصلاح کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی شخص اپنی حالت کو بدلنا چاہے۔ برائیوں کو ترک کرنا چاہے۔ نیکیوں کو حاصل کرنا چاہے، وہ ایسا کر سکتا ہے کیونکہ خدا نے اُس کی فطرت میں نیکی کی استعدادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اگر وہ اُن سے کام نہیں لیتا تو یہ اُس کا اپنا قصور ہے۔ لیکن اگر وہ کام لیگا تو فطرت کی نیکی بہرحال ظاہر ہو کر رہیگی۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوشش کے باوجود اُسے ہدایت حاصل نہ ہو یا قربِ الٰہی کے مقام سے وہ دُور رہے۔

غرض اسلام ماحول کے اثرات کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ بچپن سے ہی نیک اور بد اثرات بچّہ پر شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ ہر شخص کی اصلاح ممکن ہے۔ فرائیڈ نے جس تھیوری کو پیش کیا ہے اُس کے ماننے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے اور جب وہ اِس نکتہ کو تسلیم کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہو گیا کہ فطرت میں خدا نے نیکی کا ملکہ رکھا ہوا ہے اگر نیکی کا ملکہ اُس میں نہ ہوتا تو اُس کی اصلاح کس طرح ہوتی؟ اِسی طرح ہمارا مشاہدہ ہے کہ اکثر لوگ وعظ کا اثر قبول کرتے ہیں اور بڑی بڑی برائیوں کو چھوڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان میں نیکی کا ملکہ نہ ہوتا تو وعظ سے اُس پر کیوں اثر ہوتا اور کیوں وہ اپنی برائیوں کو ترک کر کے نیکیوں کے حصول میں مشغول ہو جاتا، یہی حال دُعا کا ہے کہ اُس کے ذریعہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو خدا کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتے جو ہر قسم کی برائیوں میں لذّت محسوس کرتے ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد محض دنیوی لذائذ سے لطف اندوز ہونا قرار دیتے ہیں وہ انبیاء پر ایمان لانے اور اُن کی دعاؤں اور قوتِ قدسیہ کی برکات سے ایسے بدل جاتے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ یہ دونوں راستے جو روحانی اور جسمانی جد وجہد پر مشتمل ہیں دنیا میں ہمیشہ سے کھلے ہیں اور کھلے رہیں گے اور یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ خدا نے انسانی فطرت کو پاکیزہ بنایا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ جن کو نیکی میں ترقی کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا اُن کا کیا حال ہوگا، تو یاد رکھنا چاہیئے کہ شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی فطرت کو خارجی اثرات سے پنپنے کا موقعہ نہیں ملیگا تو اُسے پھر موقعہ دیا جائیگا۔ بہرحال اِس سے فطرت کی خرابی نہیں بلکہ حالات کی خرابی ثابت ہوتی ہے اور یہ آیت اِسی خیال کو پیش کرتی ہے کہ انسان کی پیدائش احسن تقویم میں ہے یہ نہیں کہتی کہ وہ بدحالات کے ماتحت بھی بد نہیں ہوتا۔

غرض یہ آیات بتاتی ہیں کہ آدمؑ کا آنا۔ نوحؑ کا آنا۔ موسیٰؑ کا آنا، اور اُن کا اپنی اصلاحی کوششوں میں کامیاب ہو جانا اور دنیا کا ایک نئے رنگ میں بدل جانا ثبوت ہے اِس بات کا کہ خدا تعالےٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے یعنی انسانی پیدائش ایسے اصول پر ہوئی ہے کہ وہ اعتدال کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتا ہے جیسا کہ اوپر کے واقعات سے ثابت ہے۔ آدمؑ۔ نوحؑ۔ موسٰیؑ اور اُن کے متبع اِس امر کا ثبوت ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آئندہ اِس بات کا ثبوت بننے والے ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔

چوتھا عقیدہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ گویا وہ قانونِ الٰہی کی وجہ سے بُرے افعال کرنے پر مجبور ہے اِس میں انسان کا کوئی قصور نہیں۔ اِسلام اِس عقیدہ کو کلّی طور پر ردّ کرتا ہے اور چونکہ اِس کو مذہبی لوگ پیش کرتے ہیں خصوصاً مسلمانوں کی طرف یہ عقیدہ منسوب ہے اِس لئے قرآن کریم سے ہی اِس کا ردّ پیش کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:- وَهُوَ الَّذِیْ

جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَۃً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا (الفرقان ع ۶) یعنی وہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنیوالا بنایا ہے۔ مگر اِس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اِس بات کا ارادہ کریں کہ وہ نصیحت حاصل کریں گے یا اُن کے اندر شکر گذاری کا مادہ پایا جاتا ہو۔ اِس آیت میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی نیکی کا پہلو اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ شیطانی راہوں پر چلتے چلے جاتے ہیں اور اِس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں انتباہ کیا جائے اور انہیں بُرے افعال سے بچنے کی نصیحت کی جائے۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو گو اُس روشنی اور نُور سے محروم ہوتے ہیں جو مذہب کی اتباع میں انسان کو حاصل ہوتا ہے مگر اُن کے اندر جذبۂ شکر گذاری پایا جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی نعماء اور اُس کی عطا کردہ قوتوں کا غلط استعمال نہیں کرتے بلکہ اُن سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی اور اخلاق سے حصہ رکھتے ہیں۔ فرماتا ہے ہم نے دنیا میں لیل اور نہار کا جو چکر رکھا ہوا ہے یعنی کبھی خدا کے نبی اور رسول دنیا کی اصلاح کے لئے آتے ہیں اور کبھی تاریکی اور ظلمت کا دَور دورہ ہوتا ہے تم جانتے ہو اِس روحانی رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں کیا حکمت ہے؟ ہم کیوں رات کے بعد دن لاتے ہیں پھر کیوں تاریکی کے بعد آفتاب ہدایت کا طلوع کرتے ہیں۔ ہماری غرض اِس سے یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں جو لوگ بد اور گنہگار ہوں اور جو ہدایت اور وعظ و تذکیر کے محتاج ہوں اُن کو اِس سلسلۂ رسالت کے نتیجہ میں نیک بنایا جائے اور جو لوگ فطری نیکی کے مقام پر کھڑے ہیں انہیں خدا کا کلام اور الہام اُس سے بھی اعلیٰ مقام یعنی شکر کی طرف لے جائے۔ غرض قرآن اِس بات کو پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کی اصلاح ہو سکتی ہے اگر اُس نے انسان کو خرابی کے لئے ہی پیدا کیا ہوتا تو لیل و نہار کا یہ چکر جو تمہیں دنیا میں نظر آتا ہے نہ ہوتا۔ اِس کی بڑی اہم غرض یہی ہے کہ بدوں کو نیکی کی طرف لایا جائے اور نیکوں کو اعلیٰ درجہ کے روحانی مقام کی طرف کھینچا جائے۔

اِسی طرح فرماتا ہے۔ وَھُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْھَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ کُنَّا نَعْمَلُ اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَکَّرَ وَجَآءَکُمُ النَّذِیْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ (فاطر ع ۴) یعنی قیامت کے دن جب دوزخیوں کو دوزخ میں ڈالا جائیگا تو وہ چیختے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے خدا ہمیں اِس جہنم میں سے نکال نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ کُنَّا نَعْمَلُ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اب اپنے سابق اعمال کے خلاف نہایت اعلیٰ درجہ کے کام کریں گے اور نیکی اور تقوٰی میں پوری طرح حصہ لیں گے۔ پہلے ہم چوری کیا کرتے تھے مگر اب ہم چوری نہیں کریں گے۔ پہلے ہم ڈاکہ ڈالا کرتے تھے مگر اب ہم ڈاکہ نہیں ڈالیں گے۔ پہلے ہم جھوٹ بولا کرتے تھے مگر اب ہم جھوٹ نہیں بولیں گے۔ پہلے ہم نبیوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے مگر اب ہم اُنکا مقابلہ نہیں کریں گے۔ اگر یہ صحیح ہوتا کہ انسان پیدائشی طور پر گندہ اور ناپاک ہے تو اللہ تعالیٰ کو جواب یہ دینا چاہیئے تھا کہ کمبختو تم یہ کیا کہہ رہے ہو کہ ہم آئندہ نیک اعمال بجا لائیں گے میں نے تو تمہیں پیدا ہی اِس لئے کیا تھا کہ تم چوری کرتے تم ڈاکہ ڈالتے تم جھوٹ اور فریب سے کام لیتے۔ تم نبیوں کا مقابلہ کرتے یا یہ جواب دینا چاہیئے تھا کہ تم نیکی کر ہی کسطرح سکتے ہو جبکہ میں نے تو تمہاری فطرت میں خرابی رکھدی ہے اور تم اِس بات پر مجبور ہو کہ گناہوں اور بدیوں کا ارتکاب کرو مگر اللہ تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب یہ دیتا ہے۔ کہ اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَکَّرَ کیا ہم نے تم کو اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ جس میں انسان اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو آسانی سے نصیحت حاصل کر سکتا تھا۔ ہم نے تمہیں مہلت بھی دی تمہیں کافی عمر بھی عطا کی مگر تم نے اِس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی عادات کی اصلاح کی طرف

تم نے کوئی توجہ نہ کی۔ اب تمہارا یہ کہنا کیا حقیقت رکھتا ہے کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس لوٹا دیا جائے تو ہم ہمیشہ نیک عمل کریں گے۔ تمہیں ہماری طرف سے ایک بہت بڑا موقعہ دیا جا چکا ہے مگر تم نے اُس کو ضائع کر دیا۔

اب دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ نے جرم کو اُن کی طرف منسوب کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم کو اتنی عمر دی گئی تھی کہ اگر تم نصیحت حاصل کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے مگر تم نے نصیحت حاصل نہ کی۔ حالانکہ اگر یہ درست ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی فطرت میں خرابی رکھی گئی ہے اور وہ قانونِ الٰہی کی وجہ سے بُرے افعال کرنے پر مجبور ہے تو یہ جواب بالکل غلط تھا۔ خدا تعالیٰ کو تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میاں تم تو نیک ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ میں نے تمہیں پیدا ہی اِس غرض کے لئے کیا تھا کہ تمہیں دوزخ میں ڈالا جائے۔ دوسرا عذر یہ ہو سکتا تھا کہ ہم تو نصیحت حاصل کر لیتے مگر چونکہ خدا نے ہماری ہدایت کا کوئی سامان نہ کیا اِس لئے ہم نیکی سے محروم رہے!

اللہ تعالیٰ اِس عذر کو بھی توڑتا ہے اور فرماتا ہے وَجَآءَکُمُ النَّذِیْرُ تم یہ عذر بھی نہیں کر سکتے کہ ہم نے تمہاری ہدایت کا کوئی سامان نہیں کیا کیونکہ ہماری طرف سے متواتر تمہارے پاس نذیر آئے اور وہ تمہیں خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور اُسکی ناراضگی کے بُرے نتائج سے ڈراتے رہے مگر تم نے پھر بھی کوئی توجہ نہ کی۔ یہ دونوں جواب جبر کے عقیدہ کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا ورنہ جب کفار نے کہا تھا کہ ہمیں واپس کیا جائے ہم اعلےٰ درجہ کے اعمال بجا لانے کا وعدہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نہیں کہتا تم کس طرح نیک اعمال کر سکتے ہو میں نے تو تم کو مجبور پیدا کیا تھا اور خود تمہاری فطرت میں ایسا بگاڑ رکھ دیا تھا کہ تم نیک اعمال پر مقدرت ہی نہیں رکھ سکتے تھے مگر وہ یہ جواب نہیں دیتا بلکہ جواب دیتا ہے تو یہ کہ میں نے تمہیں اتنی عمر دی تھی کہ جس میں اگر تم فائدہ اٹھانا چاہتے اور نصیحت حاصل کر کے اپنے اعمال میں اصلاح کرنا چاہتے تو آسانی سے کر سکتے تھے جس کے معنے یہ ہیں کہ تم مجبور نہیں تھے بلکہ تمہارا اختیار تھا کہ تم جو رنگ چاہو اپنے اوپر چڑھا لو اور تمہیں اُس کا موقعہ بھی دے دیا گیا تھا۔

دوسرا سوال یہ ہو سکتا تھا کہ ہم نصیحت تو حاصل کر لیتے مگر ذرائع بھی تو مہیا ہوتے۔ ہم اپنی عقلوں کی کوتاہی اور باپ دادا کی جہالت کی وجہ سے اگر ہدایت کو اختیار نہیں کر سکے تو اِس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اِس عذر کو بھی ردّ کرتا ہے اور فرماتا ہے تم یہ بات بھی ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتے کیونکہ ہم نے تمہارے پاس نذیر بھجوا دیئے تھے اور اسطرح ہدایت اور ضلالت کی راہیں تم پر پوری طرح واضح کر دی تھیں۔ اِسکے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ تم ہمارے عذاب کو چکھو اور اِس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ یہ تیسرا جواب ہے جو جبر کے عقیدہ کو ردّ کر رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے جبری طور پر لوگوں کو بُرے افعال کے لئے پیدا کیا ہے تو ظالم نعوذ باللہ خدا قرار پاتا ہے وہ شخص ظالم نہیں کہلا سکتا جس سے جبری طور پر کوئی کام لیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں لوگوں کو ظالم قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم ظالم نہیں تھے بلکہ ظالم تم تھے کہ ہدایت کے سامانوں اور مواقع کے حصول کے باوجود تم نے خدا کی طرف توجہ نہ کی اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑے رہے۔

یہ آیات اِس امر کا قطعی ثبوت ہیں کہ بعض مسلمانوں کا یہ خیال کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ انسان کو خدا نے اختیار دیا ہے کہ وہ اگر چاہے تو نیک بن جائے اور اگر چاہے تو شیطان کے پیچھے چل پڑے۔

فطرتِ انسانی کے متعلق پانچویں نظریہ اور اُس کی تردید

پانچواں خیال انسانی فطرت کے متعلق یہ پایا جاتا ہے کہ انسان اِس دنیا میں اپنے کرموں کا پھل بھگتنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ بعض کرم بُرے ہوتے ہیں اِس لئے اُن کے کرنے والے بد اخلاق اور غریب کمزور اور بُرے بنائے گئے ہیں مگر جو لوگ اچھے اور تندرست اور امیر ہیں وہ بھی درحقیقت بدی سے پوری طرح آزاد نہیں ہیں کیونکہ اُن کا ایک دوسری جون میں آنا بتاتا ہے کہ گناہ کے اثر سے وہ پوری طرح آزاد نہیں ورنہ

عقیدۂ تناسخ اور اُس کی تردید

وہ جونوں کے چکر سے آزاد کر دئے جاتے۔

یہ خیال جسے تناسخ کہتے ہیں اس پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس خیال کی بنیاد ظن اور تخمین پر ہے۔ تناسخ کے ماننے والے کہتے ہیں دنیا میں ایک شخص اندھا کیوں پیدا ہوتا ہے۔ لنگڑا لولا کیوں پیدا ہوتا ہے۔ غریب اور نادار کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یا ایک بچہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں جاتا ہے؟ اور کیوں دنیا میں ہمیں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ ایک شخص امیر ہے تو دوسرا غریب ایک شخص صحیح سلامت ہے تو دوسرا لنگڑا لولا۔ ایک شخص عقلمند ہے تو دوسرا بیوقوف۔ ایک شخص طاقتور ہے تو دوسرا کمزور۔ یہ اعتراض اٹھا کر تناسخ کے معتقد کہتے ہیں کہ چونکہ خدا کی طرف یہ ظلم منسوب نہیں ہو سکتا اس لئے معلوم ہوا کہ پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے انسان اس دنیا میں آتا ہے چونکہ گذشتہ جنم میں بعض نے اچھے اعمال کئے تھے اور بعض نے برے اس لئے اس جہان میں بعض لوگ دکھوں میں مبتلا نظر آتے ہیں اور بعض لوگ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ وہ بنیاد ہے جس پر تناسخ کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ سوال کہ دنیا میں بعض لوگ اندھے کیوں پیدا ہوتے ہیں بعض لولے لنگڑے کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ بعض غریب اور مفلس اور نادار کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ فرض کرو ایک شخص خدا کے انصاف کا قائل نہیں وہ اس اعتراض کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ خدا ظالم ہے۔ ایک دوسرا شخص یہ جواب دے سکتا ہے کہ کسی کا اندھا یا لولا لنگڑا ہونا قانون شریعت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ قانون نیچر سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک شخص چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے تو اُس وقت یہ نہیں کہا جائیگا کہ اُسے اپنے کسی سابق کرم کی سزا ملی ہے بلکہ یہ نتیجہ ہوگا کسی طبعی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اندھا پیدا ہوتا ہے یا لنگڑا پیدا ہوتا ہے یا بیمار پیدا ہوتا ہے تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ اُسے اپنی کسی سابق بدعملی کی سزا مل رہی ہے بلکہ درحقیقت یہ کسی طبعی قانون کے وہ اثرات ہونگے جو مختلف حالات کے نتیجہ میں اُس کے جسم پر ظاہر ہوئے۔ بہرحال جس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہوں اُن میں سے کسی ایک جواب کو بلاوجہ ترجیح دے دینا عقل کے بالکل خلاف ہے کوئی وجہ ہونی چاہیئے جس کی بنا پر اس جواب کو ترجیح دی جا سکتی ہو۔ مگر ایسی کوئی وجہ آج تک قائلین تناسخ کی طرف سے پیش نہیں کی جا سکی۔

دوسرے ہم قائلین تناسخ سے کہتے ہیں کہ تم جس سوال کو تناسخ کی تائید میں پیش کرتے ہو ہم اُسی سوال کو تناسخ کی تردید میں پیش کر دیتے ہیں۔ اصل سوال یہ تھا کہ دنیا میں اختلاف کیوں ہے؟ تم نے اس کا یہ جواب دیا کہ انسان کے سابق کرموں کا یہ نتیجہ ہے۔ ہم کہتے ہیں اگر اس دنیا کی زندگی کسی سابق جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے اور انسان اپنے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آیا ہے تو یہ کیا بات ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے اُسے کونسی سزا ملی جس کے لئے اُسے دنیا میں بھیجا گیا تھا؟ اگر ایک بچہ پیدا ہونے کے بعد بڑا ہو تکلیفیں اٹھائے مصیبتیں جھیلے مختلف قسم کے دکھ برداشت کرے تب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیکھو اُسے اپنے پچھلے اعمال کی سزا مل رہی ہے لیکن ہم تو دیکھتے ہیں دنیا میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اِدھر بچہ پیدا ہوتا ہے اور اُدھر مر جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوتا کہ اسقاط ہو جاتا ہے اگر انسان اپنے کرموں کی سزا کے لئے پیدا ہوتا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ بچہ جو پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے یا وقت پورا ہونے سے پہلے جو ماں کے پیٹ سے گر جاتا ہے اُسے کونسی سزا ملی؟ اُس نے تو دنیا میں آکر کوئی تکلیف ہی نہیں اٹھائی۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گورنمنٹ کسی کو قید خانہ میں بھیجے مگر قید خانہ کی ڈیوڑھی سے ہی اُسے گھسیٹ کر واپس لے آئے۔ ایسا فعل یقیناً عقل کے خلاف ہوگا۔ پس جہاں اس قسم کے حوادثات تناسخ کے خیال کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں وہاں یہ حوادث تناسخ کے خلاف بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ کا عقیدہ درست ہے

تو کیوں انسان کے موجودہ اعمال اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اگر دنیا میں وہ سزا بھگتنے کے لئے آیا ہے تو یقیناً دنیا سے اُسے کسی طرح چھٹکارا نہیں ہونا چاہیئے۔ فرض کرو ایک شخص کو اُس کے سابق جنم کے بُرے اعمال کے نتیجہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ سزا ملی ہے کہ وہ ۲۵ سال تک شدائد و مصائب میں مبتلا رہے تو اُس کے بعد ضروری ہے کہ ۲۵ سال تک وہ اِس سزا کو برداشت کرے مگر ہم دیکھتے ہیں دنیا میں بعض دفعہ جب ایک شخص تکالیف کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا تو وہ زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے حالانکہ اگر تناسخ درست تھا اور اگر وہ ایک معیّن عرصہ کی قید بھگتنے کے لئے دنیا میں آیا تھا تو زہر کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیئے تھا خواہ وہ لاکھ دفعہ زہر کھاتا اُس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا کیونکہ خدا نے اُسے ایک معیّن سزا کے لئے دنیا میں بھیجا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں زہر کھا کر وہ اپنی تکالیف کا فوراً خاتمہ کر لیتا ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص اپنے گلے میں پتھر باندھ کر دریا میں غرق ہونا چاہے تو اِس عقیدہ کے مطابق اُسے غرق نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ خدا نے اُسے چالیس یا پچاس سال تک سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے اگر ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جب کوئی شخص خودکشی کے ارادہ سے دریا میں غرق ہونا چاہے تو تناسخ کا عقیدہ اُسے غرق ہونے سے نہیں بچاتا وہ خواہ چالیس سال کی قید لے کر دنیا میں آیا ہو زہر کھا کر یا دریا میں غرق ہو کر کئی سال پہلے اِس عذاب سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اِسی طرح وہ شخص جو ایک غریب گھر میں پیدا ہوا ہے اگر اُسے اپنے سابق اعمال کی سزا میں ایک غریب شخص کے گھر پیدا کیا گیا ہے تو پھر اُسے کبھی امیر نہیں ہونا چاہیئے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کئی غریب دنیا میں ترقی کرتے کرتے کروڑپتی بن جاتے ہیں۔ پنجاب ہندوستان اور ولایت میں ایسے کئی لوگ موجود ہیں جنہوں نے نہایت غربت کی حالت سے ترقی کرتے کرتے اعلیٰ درجہ کی امارت حاصل کر لی۔ وہ ادنیٰ حالت سے اُٹھے اور ترقی کے اعلیٰ معیار پر جا پہنچے پس اگر پچھلے جنم کے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے انسان اِس دنیا میں آیا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ زہر سے کیوں مرتا ہے؟ وہ تو ایک خاص مدت کی قید کے لئے آیا تھا۔ محنت سے کیوں مالدار ہو جاتا ہے وہ تو سزا کے طور پر ایک غریب شخص کے گھر میں پیدا کیا گیا تھا، پھر تو چاہیئے تھا کہ کوئی عمل اُس کی حالت کو تبدیل نہ کر سکتا۔ آخر یہ کسطرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ایک شخص کو قیدی بنا کر بھیجے اور وہ اِس دنیا میں آکر بادشاہ بن جائے۔ دنیوی حکومتوں کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی تو خدائی گورنمنٹ کے احکام کو بدلنے کی کوئی شخص کسطرح طاقت رکھتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ خدا تو ایک شخص کو سزا کے طور پر بیمار کرے اور وہ علاج سے اچھا ہو جائے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائیگا کہ خدا نے سزا کے طور پر کسی شخص کو بیمار بنایا ہے تو بہرحال یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ وہ علاج سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ مگر دنیا کے نظارے جو ہمیں روزانہ دکھائی دیتے ہیں اِس حقیقت کو باطل ثابت کر رہے ہیں۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں اور علاج سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ غریب ہوتے ہیں اور محنت سے امیر ہو جاتے ہیں۔ زہر کھاتے ہیں اور اُس کے اثر سے مر جاتے ہیں حالانکہ اگر ہم گذشتہ جنم کو مانیں تو پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نہ بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے نہ کوئی غریب سے امیر ہو سکتا ہے نہ زہر سے ہلاک ہو سکتا ہے اور نہ دنیا کا کوئی اور عمل اِس پر اثر کر سکتا ہے۔ سابق جنم کے کرم ماننے کے نتیجہ میں صرف ایک ہی زندگی آزاد رہ سکتی ہے اور وہ انسان کی سب سے پہلی زندگی ہے۔ باقی ساری زندگیاں اِس سزا کے ماتحت جبری طور پر لانی پڑیں گی جو پہلے جنم کے اعمال کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو وباؤں سے لوگ یا جانور کیوں مرتے ہیں؟ آخر یہ کیا ہوتا ہے کہ یکدم ایک وبا پھیلتی ہے اور اُس سے لاکھوں انسان اور جانور ہلاک ہو جاتے ہیں وہ کونسا جرم ہے جس کے نتیجہ میں سب کو اکٹھی سزا ملتی ہے۔ سزا تو الگ الگ وقت کی ہوتی ہے مگر وباؤں کے نتیجہ میں ایک ہی وقت میں ملکوں کا صفایا ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر تناسخ درست ہے تو جنگوں اور زلزلوں سے کیوں لاکھوں کا

صفایا ہو جاتا ہے اور یہ آزادی کس خوشی کی تقریب پر دی جاتی ہے؟ دنیا میں تو کہا جاتا ہے آج بادشاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اس خوشی میں سو قیدی چھوڑے جاتے ہیں۔ آج شاہی خاندان میں فلاں شادی ہوئی ہے اس خوشی کی تقریب میں اتنے لوگوں کو رہا کیا جاتا ہے۔ کیا اسی قسم کی خوشی کی تقاریب اللہ تعالےٰ کے ہاں بھی ہوتی ہیں؟ کہ وہ ایک وبا بھیج دیتا ہے جس کی وجہ سے لاکھوں انسان مرکر دنیا کی تکالیف سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ زلزلہ بھیج دیتا ہے اور اُس سے لاکھوں انسان ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی طاعون کبھی ہیضہ کبھی انفلوئنزا اور کبھی ملیریا بھیج دیتا ہے۔ گویا یہ وبائیں کیا ہیں انسپکٹر جنرل آف پرزنز ہیں جو قیدیوں کو رہائی کی خوشخبری دیتی ہیں۔ بہرحال اگر تناسخ درست ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزادی کس خوشی کی تقریب پر دی جاتی ہے؟ اور کیوں دنیا میں وباؤں سے کبھی کم آدمی ہلاک ہوتے ہیں اور کبھی زیادہ آدمی ہلاک ہوتے ہیں! کیا اس کے یہ معنے سمجھے جائیں کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں کبھی خوشی کی کوئی معمولی تقریب پیدا ہوتی ہے اور کبھی بڑی۔ معمولی تقریب میں صرف چند قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا جاتا ہے مگر جب خوشی کی کوئی بہت بڑی تقریب پیدا ہو جائے تو زلزلہ بھیج دیا جاتا ہے یا طاعون نازل کر دی جاتی ہے یا ہیضہ اور ملیریا پیدا کر دیا جاتا ہے اور اس خوشی میں لاکھوں انسانوں کو رہا کر دیا جاتا ہے آخر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہیئے جس طرح انہوں نے دنیا کے اختلاف کو دیکھ کر ایک توجیہہ پیدا کر لی تھی اسی طرح ہمارا حق ہے کہ ہم ان سے پوچھیں کہ طاعون اور ہیضہ اور زلزلہ اور لڑائیوں وغیرہ سے یکدم لاکھوں لوگوں کا صفایا کس بنا پر ہوتا ہے؟ اور کونسی خوشی کی تقریب پر ارواح کی آزادی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو ہندو لوگ وباؤں اور زلزلوں سے بچنے کی تدابیر کیوں کرتے ہیں اور کیوں طاعون اور ہیضہ کے ٹیکے کراتے ہیں؟ کیونکہ اُنکے نزدیک تو یہ جون ایک سزا ہے پس طاعون اور ہیضہ تو معافی کا پیغام ہے؛ اس سے بچنے کے تو کوئی معنے ہی نہیں۔ کیا کوئی قیدی آزادی کے پروانے سے بچنے کی کوشش کیا کرتا ہے؟ اگر تناسخ ماننے والوں کے پاس کوئی شخص آئے اور اُن سے سوال کرے کہ طاعون یا ہیضہ کا ٹیکہ مجھے کروانا چاہیئے یا نہیں تو وہ اسکا کیا جواب دیتے ہیں؟ کیا یہ کہتے ہیں کہ تم ٹیکہ مت کرواؤ۔ یہ زندگی تو قید خانہ ہے۔ یہ وبائیں تو پرمیشور کی طرف سے آزادی کا پروانہ ہیں ان کے آنے پر تو تم کو خوش ہونا چاہیئے۔ یا وہ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ بیشک ٹیکہ کراؤ یہ ایک کامیاب علاج ہے اس سے تم اپنی زندگی کو بچا لو گے۔

غرض ہندوؤں کا یہ عمل کہ وہ وباؤں اور زلزلوں سے بچنے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ اُن کے نزدیک یہ زندگی ایک قید نہیں جس سے آزاد ہونے کی کوشش ہونی چاہئے بلکہ یہ نیکی کمانے کا ذریعہ ہے جسے لمبا کرنا نیک کام ہے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ برسات میں بعض دفعہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر کروڑوں کیڑے مکوڑے کیوں پیدا ہو جاتے ہیں اور اُس وقت کونسے گناہ خاص طور پر زائد ہو جاتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں ایک ایک گاؤں اور ایک ایک شہر میں برسات کے موسم میں اربوں ارب کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ یہ اربوں ارب کیڑا کس جرم کے نتیجہ میں ایک گھنٹہ بھر میں پیدا کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ سزا کیا ہوئی کہ ابھی اُن کی زندگی پر ایک گھنٹہ بھی نہیں گذرتا کہ اُن میں سے بہت سے کیڑے مرجاتے ہیں گویا اربوں ارب ارواح کو قید میں ڈالا جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی اُن سب کو آزاد کر دیا جاتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ اِن کیڑوں کا آناً فاناً کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں پیدا ہو جانا کس گناہ کا نتیجہ ہوتا ہے؟ جو خاص طور پر موسم برسات میں زیادہ ہو جاتا ہے اور پھر اُن کی تھوڑی دیر کے بعد ہی رہائی کس خوشی کی تقریب میں ہوتی ہے کیا اللہ تعالےٰ کے ہاں کوئی شادی کی تقریب پیدا ہو جاتی ہے؟ کہ اربوں ارب ارواح کو یکدم قید خانہ سے رہا کر دیا جاتا ہے۔

ساتواں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ کو درست مانا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تمام کارخانۂ عالم نعوذ باللہ گناہ پر چل رہا ہے کیونکہ تناسخ کے قائلین کہتے ہیں کہ دنیا میں جانوروں کی پیدائش گناہ کی وجہ سے ہے۔ کسی گناہ کی وجہ سے انسان بھینس کی جون میں جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے انسان گائے کی جون میں جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے انسان گھوڑے کی جون میں جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے انسان گدھے کی جون میں جاتا ہے۔ اسی طرح سبزیاں اور ترکاریاں وغیرہ جو نظر آتی ہیں چونکہ ان میں بھی جیو ہے اس لئے سبزیوں اور ترکاریوں کی جون میں بھی انسان کسی گناہ کی وجہ سے جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ گناہ کی پیدائش ہے تو معلوم ہوا کہ دنیا کا کارخانہ محض گناہوں کے سہارے قائم ہے اگر گناہ کا وجود مٹ جائے تو وہ گائے اور بھینسیں جن کا انسان دودھ پیتا ہے وہ گھوڑے جن پر انسان سواری کرتا ہے وہ سبزیاں اور ترکاریاں جن کو انسان کھانے کے کام میں لاتا ہے سب کی سب معدوم ہو جائیں اور کارخانۂ عالم بالکل باطل ہو جائے پھر یہ چیزیں ایسی نہیں جن کو صرف بد لوگ استعمال کرتے ہوں بلکہ نیک لوگ بھی جانوروں کے بغیر گذارہ نہیں کر سکتے وہ بھی اس بات پر مجبور ہیں کہ دودھ پئیں۔ گھوڑوں کی سواری کریں فصل کیلئے ہل چلائیں اور اس طرح گائیوں اور بھینسوں اور گھوڑوں اور بیلوں کی احتیاج کو تسلیم کریں گویا اس عقیدہ کے ماتحت نیک لوگ بھی اس دنیا میں گناہ کے بغیر گذارہ اوقات نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ارواح جو مختلف جونوں کی شکل میں اس دنیا میں آئی ہوئی ہیں عقیدہ تناسخ کے ماتحت انہیں سے دنیا چل رہی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو انسان پہلی دفعہ پیدا ہوئے تھے وہ کیا کھاتے تھے اور پینے کے لئے کیا چیز استعمال کرتے تھے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ علم نباتات کے متعلق موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ گیہوں اور سبزیاں وغیرہ اپنے اندر حس رکھتی ہیں جس کے دوسرے معنے ہیں کہ قائلین تناسخ کے نزدیک ان میں بھی جیو ہے اور جب تمام جیو والی اشیاء کی پیدائش قائلین تناسخ کے نزدیک گناہوں کی وجہ سے ہے تو طبعی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے انسان کیا کھاتے تھے؟ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سوال تو یہ ہے کہ پانی کو پانی اور ہوا کو ہوا خدا تعالیٰ نے کیوں بنایا ہے؟ یہ فرق کرنا اس کے لئے کس طرح جائز ہو گیا ہے پس پانی بھی درحقیقت کسی سزا میں پانی بنا ہے اور ہوا بھی کسی سزا میں ہوا بنی ہے اور اگر یہ امر درست ہے تو سوال یہ ہے کہ جب پہلی دفعہ انسان پیدا ہوا تھا اور ابھی کرموں کے نتائج ظاہر نہیں ہوئے تھے اس وقت انسان کیا پیتے تھے اور کس چیز کی مدد سے سانس لیتے تھے؟ یہ بھی ایک ایسا سوال ہے جس کا قائلین تناسخ کے پاس کوئی جواب نہیں۔

آٹھواں سوال یہ ہے کہ اگر گائیں بھینسیں گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں تو علم الحیوانات کے ماہرین کی تجاویز جانوروں کی ترقی کی نسبت کیوں کامیاب ہوتی ہیں؟ کیا گائیں بھینسیں اگر اس محکمہ کی نگرانی میں رہیں تو لوگ اس قسم کے گناہ زیادہ کرنے لگ جاتے ہیں جن سے یہ جانور زیادہ پیدا ہوں!

تھوڑا ہی عرصہ ہوا گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ گذشتہ چھبیس[۲۶] سال میں ہندوستان کی گائیں بھینسیں آدھی رہ گئی ہیں ان کی تعداد بڑھانے کے لئے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جانور پالنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ اس کمی کا ازالہ ہو۔ اس اعلان پر ہندوؤں کو چاہیئے تھا کہ گورنمنٹ کو نوٹس دیدیتے کہ جانور بڑھانے کا یہ طریق بالکل غلط ہے۔ گائیں بھینسیں فلاں فلاں گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر گورنمنٹ ان کی تعداد کو بڑھانا چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ ملک میں ان گناہوں کو رائج کر دے گائیں بھینسیں خود بخود زیادہ ہو جائیں گی۔ مگر نہ ہندوؤں نے گورنمنٹ کو اس وقت کوئی ایسا نوٹس دیا اور نہ وہ آئندہ دینے کے لئے کبھی تیار ہو سکتے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علم حیوانات کی تجویز پر اگر عمل کیا جائے تو جانوروں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے اور جب محض بعض مادی تدابیر پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ان کی

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ

پھر ہم نے اُس کو ادنیٰ درجوں سے (بھی) بدتر درجہ کی طرف لوٹا دیا ؎

تعداد بڑھ سکتی ہے تو یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ وہ کسی گناہ کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوتے۔

نویں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو حکومتیں شکار کی حفاظت کی تدابیر کیوں کرتی ہیں؟ انہیں تو چاہیئے تھا کہ بجائے اِسکے کہ شکار کی حفاظت کے ذرائع اختیار کریں لوگوں کو خاص خاص گناہوں کا حکم دے دیتیں۔ مثلاً کہا جاتا کہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ آجکل فلاں فلاں گناہ کریں کیونکہ بٹیر کم ہوگئے ہیں یا فلاں فلاں گناہ کریں کیونکہ تیتر کم ہوگئے ہیں کیونکہ تناسخ کے ماتحت بعض خاص قسم کے گناہ ہی اِن کی پیدائش کا باعث بن سکتے ہیں کسی اور ذریعہ سے اُن میں زیادتی نہیں ہوسکتی۔

دسویں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو اوّل تو قتل ہو ہی نہیں سکتا جس شخص کے متعلق خدا نے یہ کہا ہے کہ اُسے چالیس سال تک دنیا میں رکھا جائے کوئی شخص اُسے تیس۳۰ یا پینتیس۳۵ سال کی عمر میں ہلاک کس طرح کرسکتا ہے؟ بیشک وہ اپنی طرف سے اُسکی گردن پر تلوار کا وار کرے پھر بھی جب خدا نے اُسے چالیس سال کے لئے دنیا میں بھیجا ہے وہ اِس سے قبل دنیا کے قیدخانہ سے رہا نہیں ہوسکتا، اور اگر کوئی شخص دوسرے کو قتل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اُس کے متعلق یہی کہا جائیگا کہ اُس نے خدا تعالےٰ کے منشا اور اُس کے حکم کے ماتحت دوسرے کو قید سے آزاد کیا ہے۔ اِس صورت میں اُسے قتل کی سزا دینا بالکل غیر معقول بات ہے۔ اُسے تو پھولوں کے ہار پہنانے چاہئیں کہ اُس نے اللہ تعالےٰ کا حکم پورا کردیا۔ جیسے جلاد جب کسی کو پھانسی دیتا ہے تو وہ زیر الزام نہیں آتا کیونکہ وہ افسر کے حکم کے مطابق پھانسی دیتا ہے اپنی مرضی سے نہیں دیتا۔ اِسی طرح جس کو خدا نے قید کیا ہے اوّل تو اُسے آزاد کرنے کی کسی میں طاقت نہیں ہوسکتی اور اگر کسی نے آزاد کردیا ہے تو یقیناً اُس نے خدا تعالےٰ کے منشا کو پورا کیا ہے ایسی صورت میں اُسے سزا کیوں ملے پھر تو قاتل کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے چاہئیں کہ اُس نے ایک شخص کو قیدخانہ سے الٰہی مشیئت کے ماتحت رہا کردیا۔ غرض یہ عقیدہ بھی بدھوں کے عقیدہ کی طرح عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اصل حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے بتائی ہے کہ انسان کو معتدل القویٰ پیدا کیا گیا ہے اُس میں کوئی خاصیت ایسی نہیں جسے خالص طور پر بُرا کہا جاسکے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ وہ خاص طور پر نیکی کے لئے ہی استعمال ہوسکتی ہے۔ معتدل القویٰ ہونیکے معنے درحقیقت یہی ہیں کہ بعض حالات میں وہ بدی کی طرف چلا جاتا ہے اور بعض حالات میں نیکی کی طرف چلا جاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ جب انسان بدی کی طرف بھی جاسکتا ہے تو انسان کو احسن تقویم میں پیدا کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اِسی غرض کے لئے تو اللہ تعالےٰ اپنے انبیاء بھیجتا اور لوگوں کی ہدایت کیلئے شریعت کا نزول کرتا ہے۔ جیسے آدمؑ اور نوحؑ اور موسیٰؑ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب اِسی لئے آئے کہ گرے ہوئے لوگوں کو اُٹھا کر آستانۂ الوہیت پر پہنچا دیں بیشک بنی نوع انسان اپنی قوتوں کا غلط استعمال کرکے بعض دفعہ خدا تعالیٰ سے دُور جا پڑتے ہیں اور وہ ہوا و ہوس کی اتباع کرکے شیطان کے غلام بن جاتے ہیں مگر انبیاء اُنکی تربیت کرکے پھر اُن کو خدا تک پہنچاتے ہیں۔ پھر اُن کے قلوب کو صیقل کرتے ہیں اور پھر اُن کی استعدادوں کو اُبھار کر انہیں صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بنا دیتے ہیں۔

؎ **تفسیر۔** رَدَدْنٰهُ میں ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف پھرتی ہے اور یہ اس امر کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ بدکار کو بطور سزا کے اُس کے مقام سے گرا دیتا ہے یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ اُس سے بدی کرواتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے دوسری جگہ فرماتا ہے کہ آدم کو جنت میں سے ہم نے نکالا۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ

آدمؑ کو جنت میں سے شیطان نے نکالا۔ چنانچہ فرماتا ہے یَابَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ (اعراف ع۲) یہ ظاہر ہے کہ آدمؑ کو جنت میں سے شیطان کا نکالنا اور آدمؑ کو جنت میں سے اللہ تعالےٰ کا نکالنا ایک معنوں میں نہیں آسکتا۔ بہرحال تسلیم کرنا پڑیگا کہ اللہ تعالےٰ کا نکالنا اور رنگ رکھتا ہے اور شیطان کا نکالنا اور رنگ رکھتا ہے اور اِن دونوں میں کوئی نہ کوئی فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہی ہے کہ شیطان چونکہ اُس غلطی کا باعث بنا تھا جس کے نتیجہ میں آدمؑ کو جنت میں سے نکلنا پڑا اِس لئے شیطان کے متعلق یہ کہا گیا کہ اُس نے آدمؑ کو جنت میں سے نکالا تھا۔ لیکن چونکہ نتیجہ خدا نے پیدا کیا تھا اِس لئے دوسرے مقام پر یہ کہہ دیا گیا کہ آدمؑ کو خدا تعالےٰ نے جنت میں سے نکالا تھا۔ گویا شیطان کا نکالنا بلحاظ فعل بد کے ہے اور اللہ تعالیٰ کا نکالنا بلحاظ اُس سزا کے ہے جو اِس فعل کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئی اِسی طرح رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کے یہ معنے نہیں کہ اللہ تعالےٰ انسان کو بگاڑتا ہے۔ بلکہ اِس کے معنے یہ ہیں کہ جب انسان بگڑتا ہے تو اللہ تعالےٰ اُسے سزا کے طور پر اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ میں بھیج دیتا ہے اِسی لئے اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ سَارِقًا یا ثُمَّ رَدَدْنٰہُ قَاتِلًا یا ثُمَّ رَدَدْنٰہُ مُذْنِبًا بلکہ فرمایا ہے ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ پھر ہم اُس کو ادنیٰ ترین جگہ کی طرف لے جاتے ہیں وہ ایک جرم کرتا ہے ہم اُسے اُس کی سزا دیتے ہیں وہ پھر جرم کرتا ہے ہم اُسے پھر سزا دیتے ہیں اور اِس طرح اُسے ذلیل اور ادنیٰ حالت کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِس آیت میں اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ہٗ ضمیر کا حال واقع ہُوا ہو یعنی ذوالحال فاعل نہ ہو بلکہ مفعول ذوالحال ہو۔ اِس صورت میں آیت کے یہ معنے ہونگے کہ پھر انسان کو ہم نے اپنے دروازہ کو لوٹایا اِس حال میں کہ وہ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ تھا۔ اِن معنوں کے لحاظ سے وہ اعتراض واقع نہیں ہو سکتا جو پہلے معنوں پر عائد ہوتا ہے اور ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہم انسان کو اُس کے مقام سے ہٹا دیتے ہیں ایسے حال میں کہ وہ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ہوتا ہے یعنی جب وہ گنہگار ہو کر ہماری نظروں سے گر جاتا ہے تو ہم اُسے اپنے دربار سے واپس کر دیتے ہیں

ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کے معنے فردی اور اجتماعی لحاظ سے

اِس آیت کے ایک معنے فردی لحاظ سے ہیں اور ایک معنے اجتماعی لحاظ سے۔ اجتماعی لحاظ سے اِس کے یہ معنے ہیں کہ ہدایت پہلے ہے اور ضلالت بعد میں آتی ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ پہلے ہم انسان کے لئے اُس کی ہدایت کے سامان مہیا کرتے ہیں بعد میں بگڑ کر وہ ضلالت اور گمراہی کی راہیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہی اسلام اور ارتقائیوں کا مابہ الاختلاف ہے۔ ارتقائی لوگ ضلالت کو پہلے بتا کر پھر ارتقائی طور پر مذہب کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان نے عقل کامل حاصل کی تو اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو بھجوایا۔ پھر بگڑ گئے تو نوحؑ کو بھجوایا۔ پھر بگڑے تو موسیٰؑ کو اب پھر بگڑے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ گویا ابتداء میں احسن تقویم کا نمونہ ہوتا ہے اور بگاڑ ہمیشہ بعد میں آتا ہے پس جن معنوں میں ارتقاء کو فلسفی پیش کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ پہلے مظاہرہ تین پھر زیتون پھر طور اور پھر بلد الامین ہُوا اور اِس طرح ہر مظاہرہ نیکی کا پہلے سے بڑا تھا۔ یہ ارتقاء درست ہے مگر یہ کہ پہلے ضلالت تھی پھر ترقی کر کے ہدایت آئی یہ غلط اور سراسر غلط ہے۔

یوروپین فلسفی مسئلہ ارتقاء کو اِس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا خیال قوموں میں آہستہ آہستہ پیدا ہُوا ہے سب سے پہلے مختلف اقوام میں اُن اشیاء کی پرستش شروع ہوئی ہے جن سے انسان خائف ہُوا جس طرح ایک بچہ ڈر کر لجاجت اور گریہ زاری شروع کر دیتا ہے اِسی طرح جب انسان بعض چیزوں سے مرعوب ہُوا تو اُس نے اُنکی پرستش شروع کر دی۔ اُس نے دیکھا کہ آسمان سے بجلی گری ہے اور اُس سے چند آدمی ہلاک ہو گئے ہیں وہ ڈرا اور اُس نے

إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

باستثناء اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے مناسب حال عمل کئے۔ سو اُن کیلئے ایک نہ ختم ہونے والا (نیک) بدلہ ہوگا ؎

سمجھا کہ یہ ڈرنے کی چیز ہے اور اُس کی عبادت شروع کر دی۔ پھر اُس نے سانپ کو دیکھا کہ اُس کے ڈسنے سے فلاں شخص مر گیا ہے تو اُسے خیال پیدا ہوا کہ یہ ڈرنے کی چیز ہے اور اُسکی عبادت شروع کر دی۔ پھر اُس نے دریا میں کسی کو ڈوبتے دیکھا تو خیال کر لیا کہ یہ ڈرنے کی چیز ہے اور اُس کی عبادت شروع کر دی۔ پھر پہاڑ کی کھڈ میں کسی کو گر کر ہلاک ہوتے دیکھا تو خیال کرنا شروع کر دیا کہ پہاڑ بھی ڈرنے کی چیز ہے اور اُسکی عبادت شروع کر دی۔ غرض جس جس چیز سے ڈرا اُس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔ مگر پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسان نے ادنیٰ چیزوں سے نظر اُٹھا کر بالا ہستیوں کو پوجنا شروع کر دیا پھر کچھ اور عرصہ کے بعد یہ بالا ہستیاں غیر مادی قرار پا گئیں اور آخر ایک واحد ہستی جو سب پر فائق تھی تجویز ہوئی۔ پس اُنکے نزدیک ارتقاء اِس رنگ میں ہوا ہے کہ مادیات سے نظر اٹھاتے ہوئے انسان آخر ایک غیر مرئی خدا کی پرستش میں مصروف ہو گیا۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے یہ غلط ہے کہ پہلے ضلالت تھی اور ہدایت بعد میں آئی بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نیکی پہلے تھی اور بدی بعد میں آئی۔ پہلے آدمؑ آئے اور انہوں نے تمدن کی بنیاد رکھی پھر خرابی پیدا ہوئی تو نوحؑ آئے۔ پھر خرابی پیدا ہوئی تو موسیٰؑ آئے۔ پھر خرابی پیدا ہوئی تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آئے۔ غرض نیکی کا دور پہلے ہے اور بدی کا بعد میں۔ یہی فلسفی ارتقاء اور قرآنی ارتقاء میں فرق ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک دورِ حسنات پہلے ہے اور دورِ سیّئات بعد میں لیکن فلسفی اصول کے ماتحت دورِ سیّئات پہلے ہے اور دورِ حسنات بعد میں۔

فرد کے لحاظ سے اِس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کو ہم نے ہدایت دی اور اعلیٰ درجہ کی طاقتیں نیکی میں ترقی کرنے کے لئے بخشیں۔ لیکن جب اُس نے اُن کا غلط استعمال کیا تو وہ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ میں گر گیا یعنی انسان کی دونوں حالتیں دوسری مخلوق سے بڑی ہیں۔ جب نیکی کی طرف آتا ہے تو سب مخلوق سے بڑھ جاتا ہے اور جب بدی کی طرف گرتا ہے تو ساری مخلوق سے گر جاتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالےٰ نے اضداد کا مالک بنایا ہے۔ نیکی میں حصہ لیتا ہے تو ساری مخلوق سے بڑھ جاتا ہے اور بدی میں حصہ لیتا ہے تو کتّوں اور سؤروں سے بھی گر جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ ترقی کرتا ہے تو فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے اور گرتا ہے تو شیطانوں سے بھی نیچے چلا جاتا ہے گویا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ میں بالقوہ قویٰ کا ذکر ہے اور ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اور اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں بالظہور قویٰ کا ذکر ہے۔ یعنی بالقوہ تو سب کو اچھے قویٰ ملے ہیں مگر جب اُن کا ظہور ہوتا ہے تو دو طرح ہوتا ہے یا تو انسان مومن بن جاتا ہے اور یا کافر بن جاتا ہے۔ مومن بنکر اوپر کو نکل جاتا ہے اور کافر بنکر نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔

۵ تفسیر۔ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ بعض لوگوں کا استثنیٰ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لاتے اور اعمال صالحہ کی بجا آوری میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں اُن کو ہم اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ میں نہیں لوٹاتے کیونکہ وہ فطرت کو صحیح راستہ پر چلاتے اور اپنی قوتوں کا جائز اور بر محل استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم کے ذکر میں ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ کو پہلے کیوں رکھا ہے اور اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا ذکر پیچھے کیوں کیا ہے؟ اور اِس تقدیم و تاخیر میں کیا حکمت ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ چونکہ طبعی اور فطری قویٰ کے صحیح استعمال کا نام ہے اور جو شخص احکامِ الٰہیہ پر ایمان لاتا ہے اور پھر اُن کے مطابق اعمال صالحہ بھی بجا لاتا ہے وہ درحقیقت اُس راستہ پر چلتا چلا جاتا ہے جو فطرت کا راستہ

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝

پس اس (حقیقت کے کھل جانے) کے بعد کونسی چیز تجھ کو جزاء سزا کے معاملے میں جھٹلاتی ہے ؎۹

اور اس کے نتیجہ میں اُسے مذہب جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ ایمان اور اعمال کی برکات سے متمتع ہوتا ہے اس لئے ضروری تھا کہ اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کا اِلَّا کہہ کر علیحدہ طور پر ذکر فرماتا اور اس طرح اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ میں جانے والوں اور فطری استعدادوں سے صحیح طور پر کام لینے والوں میں ایک مابہ الامتیاز قائم ہوجاتا۔ رہا یہ سوال کہ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ میں گرنے والوں کا پہلے کیوں ذکر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ لوگ اپنی پیدائش کے مقصد کو فراموش کرنے والے تھے اس لئے ضروری تھا کہ جب یہ ذکر کیا گیا تھا کہ ہم نے انسان کو معتدل القویٰ پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی اور بھلائی کی قوتیں رکھدی ہیں وہاں ساتھ ہی اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیا جاتا کہ اگر ایسا ہے تو بعض لوگ بد کیوں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ گو ہم نے انسان کو اسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے مگر پھر بھی بعض لوگ چونکہ اپنی فطرت کو مسخ کر دیتے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں کا ناجائز استعمال کرتے ہیں وہ مقام رفعت سے گر کر ذلت اور ادبار کے گڑھے میں جا پڑتے ہیں اور انسانیت کے لئے اُن کا وجود ننگ وعار کا باعث بن جاتا ہے یہ اُن کا اپنا قصور ہوتا ہے خدا تعالیٰ اس کا ذمہ دار نہیں۔ اس کے بعد اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کہہ کر ایمان لانیوالوں اور عمل صالح کی بجا آوری میں مشغول رہنے والوں کا استثنیٰ کر دیا اور بتا دیا کہ جو لوگ احسن تقویم پر قائم رہتے اور اس راستہ پر چلتے چلے جاتے ہیں جو فطرت صحیحہ کا ہو اللہ تعالیٰ اُن کو دولت ایمان سے مشرف کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کی بھی توفیق عطا فرما دیتا ہے کہ وہ اعمال صالحہ بجا لائیں۔ گویا ایمان اور عمل صالح کا راستہ فطرتِ صحیحہ کی راہ اُن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جو لوگ فطرت کو بگاڑ لیتے ہیں اور اپنے قوائے استعدادیہ سے صحیح رنگ میں کام نہیں لیتے وہ تو اسفل سافلین میں جا گرتے ہیں لیکن وہ لوگ جو فطری اور طبعی راستہ پر چلتے چلے جاتے ہیں اپنی قوتوں کو برمحل استعمال کرتے ہیں اور فطرت کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرتے اُن کو ایمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور اُن میں اعمال صالحہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اسفل سافلین میں نہیں لوٹائے جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو غیر ممنون یعنی جزائے غیر مقطوع حاصل ہوتی ہے اور اس طرح صحیح علم اور اس کے صحیح استعمال کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے اعلیٰ انعامات کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اٰمَنُوْا میں صحیح علم کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ علم جو مناسب حال ہو اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں اس علم کے صحیح استعمال یعنی صحیح عمل کی طرف اشارہ ہے اور یہی دو چیزیں ہیں جو روحانی ترقی میں کام آیا کرتی ہیں۔

كَذَّبَهٗ

؎۹ حل لغات۔ كَذَّبَهٗ کے معنے ہوتے ہیں۔ نَسَبَهٗ اِلَى الْكِذْبِ اُس کی طرف کذب کا ارتکاب منسوب کیا۔ قَالَ لَهٗ اَنْتَ كَاذِبٌ یعنی اُس کی نسبت کہا کہ تو جھوٹا ہے وَجَعَلَهٗ كَاذِبًا یا اُس کو کاذب قرار دیا (اقرب)

اَلدِّيْنُ

اَلدِّیْنُ :- کے معنے ہیں اَلْجَزَاءُ وَالْمُكَافَاةُ - جزا سزا اَلطَّاعَةُ۔ اطاعت۔ اَلْحِسَابُ حساب۔ اَلْقَهْرُ وَالْغَلَبَةُ وَالْاِسْتِعْلَاءُ غلبہ۔ اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْكُ وَالْحُكْمُ بادشاہت اَلتَّدْبِیْرُ تدبیر۔ اَلْاِسْمُ لِجَمِیْعِ مَا یُعْبَدُ بِهِ اللّٰهُ مختلف مذاہب کا عبادت کا طریق۔ اَلْوَرَعُ پاکیزگی۔ اَلْمَعْصِیَةُ گناہ۔ اَلْاِكْرَاهُ جبر۔ اَلْمِلَّةُ مذہب۔ اَلْعَادَةُ عادت اَلْقَضَاءُ قضاء۔ اَلْحَالُ حال۔ اَلشَّاْنُ شان (اقرب)

تفسیر۔ کشاف کے نزدیک فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ سے مراد یہ ہے کہ کونسی چیز تجھے ان دلائل کے بعد اس بات پر اُبھارتی ہے کہ جزا سزا کا انکار کرکے تُو کاذب ہوجائے۔ گویا اُن کے نزدیک یُكَذِّبُكَ کا خطاب کفار سے ہے

اور اس کے معنے جھٹلانے کے نہیں بلکہ اپنے آپ کو جھوٹا اور کاذب بنانے کے ہیں. عام طور پر ان معنوں کو قبول کیا گیا ہے - مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتے - یہاں خطاب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے اور قاضی اور فراء کا یہی قول ہے اور مراد یہ ہے کہ جزا سزا کے متعلق اب تیری کون تکذیب کر سکتا ہے -

فَمَا یُکَذِّبُکَ میں مَآ کے معنے

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ مَآ اپنے معروف معنوں کے سوا کبھی مصدریہ ہوتا ہے اور کبھی مَنْ کے معنے بھی دیتا ہے یہاں مصدری معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یا تو اپنے معروف معنوں میں یعنی غیر ذوی الارواح کے لئے استعمال ہوا ہے یا مَنْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - اگر یہاں مَآ کا استعمال غیر ذی روح کے لئے سمجھا جائے تو فَمَا یُکَذِّبُکَ کے معنے ہونگے وہ کونسی چیز ہے جو تجھے جھٹلاتی ہے اور اگر مَآ کو مَنْ کے معنوں میں سمجھا جائے تو فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ کے معنے ہونگے وہ کونسا شخص ہے جو تجھے جھٹلاتا ہے اس دلیل کے بعد اور بِالدِّیْنِ کے معنے ہونگے دین یا جزا سزا کے متعلق (دیآ کے معنے اُس صورت میں بَیْ کے کئے جائیں گے) یا دین کے ذریعے

فَمَا یُکَذِّبُکَ کے چھ معنے

یعنی یہ تین مثالیں جو اوپر پیش کی جا چکی ہیں کہ آدمؑ آئے شیطان نے اُن کا مقابلہ کیا اور اُس نے سمجھا کہ میں آدمؑ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤنگا مگر آخر شیطان نے ہی شکست کھائی اور آدمؑ کامیاب و بامراد ہوا - پھر نوحؑ آئے دشمن نے اُنکا مقابلہ کیا اُن کو ناکام کرنے کے لئے اُس نے پورا زور لگایا اور سمجھا کہ میں نوحؑ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر آخر نوحؑ ہی کامیاب ہوئے اور اُن کا دشمن ناکامی کی حالت میں تباہ ہو گیا - اس کے بعد موسیٰؑ آئے اُن کے مقابل میں بھی دشمن اپنے لشکر سمیت اُٹھا اور اُس نے موسیٰ کو ناکام کرنے کے لئے پورا زور لگایا مگر آخر موسیٰؑ ہی کامیاب ہوئے اور دشمن ناکام ہوا - ان تین مثالوں کے بعد تیرے دشمن کس دلیل کی بنا پر تجھے جھٹلا سکتے ہیں اور کونسی بات ہے جو وہ تیرے خلاف پیش کر سکتے ہیں - وہ کہیں گے کہ تو کمزور اور ناتواں ہے تو ہمارے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا مگر کیا وہ نہیں دیکھتے کہ آدمؑ بھی کمزور تھا - نوحؑ بھی کمزور تھا - موسیٰ بھی کمزور تھا. اور اُن کے متعلق بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہونگے پھر اگر وہ اپنی کمزوری کے باوجود کامیاب ہو گئے تو تُو کمزور ہونے کے باوجود اُن پر کیوں غالب نہیں آ سکتا - وہ کہینگے تو نہتہ ہے اس لئے ہمارے مقابلہ میں تو جیت نہیں سکتا - مگر وہ اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آدمؑ بھی نہتہ تھا - نوحؑ بھی نہتہ تھا - موسیٰؑ بھی نہتہ تھا پس وہ اگر نہتے ہو کر دنیا پر غالب آ گئے تو تُو نہتہ ہو کر کیوں دنیا پر غالب نہیں آ سکتا؛ غرض فرماتا ہے فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان مثالوں کے بعد یہ لوگ تیرے انعام پانے اور اپنے ہلاک ہونے میں دین حقّہ کی بنا پر کس طرح شک کر سکتے ہیں - ان مثالوں کے بعد کونسی دلیل ہے جو ان کو شبہ میں مبتلا رکھ سکتی ہے یا کونسا انسان ہے جو دین کی بناء پر تیری تکذیب کر سکتا ہے - گذشتہ انبیاء کے واقعات تیری صداقت کو روز روشن کی طرح واضح کر رہے ہیں اور ہر شخص جو تعصّب سے خالی ہو کر ان پر غور کرے وہ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوگا کہ فطرتِ صحیحہ آخر بنی نوع انسان کی مدد کے لئے اُبھر آتی ہے اور بنی نوع انسان دیر تک صداقت کا انکار نہیں کر سکتے - پس جس فطرت کے ہتھیار سے سابق انبیاء اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اسی طرح تو بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا - دنیا بیشک مخالفت کرے وہ جسقدر منصوبے سوچنا چاہتی ہے سوچ لے - آخر وہی ہو گا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ فطرتِ صحیحہ خدا کے رسول کی مدد کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور وہ غالب آ گیا. اور اُس کے دشمن ذلت اور ناکامی کی موت مرے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ان پہلی تین مثالوں کی موجودگی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے دین یعنی الہامی دین کا یہ لوگ کس طرح انکار کر سکتے ہیں - ان معنوں کے رو سے یہاں دین کے معنے جزا سزا کے نہیں ہونگے بلکہ دین کے معنے شریعت کے ہونگے اور آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ان دلائل کے بعد دین کے معاملہ میں کون شخص تیرا انکار

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ع

ع ۲۰

کیا (اب بھی کوئی خیال کرسکتا ہے کہ) اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟ ؎

کرسکتا ہے جب وہ مانتے ہیں کہ آدمؑ کو بھی الہام ہوا۔ نوحؑ کو بھی الہام ہوا۔ موسیٰؑ کو بھی الہام ہوا اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لئے دین لائے تو اب یہ کسطرح کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام نہیں ہوسکتا یا اُس کی طرف سے کوئی نیا دین لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل نہیں ہوسکتا۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ان دلائل کے بعد آیا کوئی بھی مذہبی دلیل تیرے خلاف پیش کی جاسکتی ہے۔ یقیناً اگر وہ غور کریں تو انہیں تیری تکذیب کے لئے کسی مذہبی دلیل کا سہارا نہیں مل سکتا کیونکہ آدمؑ۔ نوحؑ اور ابراہیمؑ کی سنت تجھ سے پہلے موجود ہے جس معیار پر ان نبیوں کو پرکھا گیا اگر انہی دلائل پر تجھے پرکھا جائے تو تیری صداقت یقیناً ثابت ہوگی تکذیب کا موجب وہی دلیل ہوسکتی ہے جس کی زد اُن کے مسلّمہ نبیوں پر نہ پڑتی ہو اور یہ ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتے۔ ان کے نقلی ڈھکوسلے تیرے ہی خلاف نہیں پڑتے بلکہ سب سابقہ انبیاء کے خلاف بھی پڑتے ہیں۔

چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ کیا اس کے بعد کوئی شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں تدبیر کرکے تجھے جھوٹا ثابت کر دونگا۔ یہ بتایا جاچکا ہے کہ دین کے ایک معنے تدبیر کے بھی ہوتے ہیں۔ پس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ کیا اتنے بڑے نشانوں کے بعد جو ہم نے تیری صداقت میں ظاہر کئے ہیں کوئی شخص یہ خیال بھی کرسکتا ہے کہ تو ہار جائیگا اور دشمن جیت جائیگا۔ آدمؑ آیا تو دشمن نے اس کے خلاف کتنی تدابیر کی تھیں۔ نوحؑ آیا تو اسکو ناکام بنانے کیلئے دشمن نے کیسی کیسی تدابیر اختیار کی تھیں موسیٰؑ آیا تو اُس کی شکست کیلئے فرعون اور اُس کے ساتھیوں نے کیسی کیسی کوششوں سے کام لیا تھا۔ پھر اگر پہلے انبیاء کے دشمن ناکام ہوگئے اور انکی تدابیر کسی کام نہ آئیں تو یہ لوگ کسطرح خیال کرسکتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی تدابیر سے غالب آجائیں گے۔

پانچویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ تقویٰ قائم رکھتے ہوئے کون شخص تیری مخالفت کریگا۔ کیونکہ دین کے ایک معنے ورع یعنی تقویٰ اور روحانیت کے بھی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت اور اُسکی سزا کا خوف اپنے دل میں رکھتے ہوئے اور تقویٰ اور روحانیت کی راہوں پر چلتے ہوئے کوئی شخص تیری مخالفت نہیں کرسکتا۔ صرف وہی گندے اور ناپاک طبع دشمن تیری مخالفت میں کھڑے ہوسکتے ہیں جن کے اندر تقویٰ کا ایک شائبہ بھی نہ ہو اور جو نیکی اور روحانیت کے مقام سے ایسے ہی دُور ہوں جیسے مشرق سے مغرب دُور ہوتا ہے۔

چھٹے معنے یہ ہیں کہ اب اس کے بعد کون اکراہ کیساتھ تیری تکذیب کریگا یعنی سابق دشمنوں کا انجام دیکھکر پھر کون بدنیت ہوگا جو جبر کے ہتھیار سے تیرا مقابلہ کرنا چاہے اور یہ خیال کرے کہ میں مار پیٹ کر سیدھا کردونگا پہلے نبیوں کو بھی ملنے جلنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں مگر کیا انکے دشمن کامیاب ہوگئے دشمن کا اکراہ اُنکے کسی کام نہ آیا اور اُسکا جبر خدا تعالیٰ کے دین کی اشاعت کو روک نہ سکا۔ ان مثالوں کے بعد اب ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال کسطرح آسکتا ہے کہ ہم نے اگر جبر و تشدد سے کام لیا تو ہم کامیاب ہوجائینگے اللہ تعالیٰ کا دین بہرحال پھیل کر رہیگا۔ اسلام دنیا پر غالب آئے گا اور کسی قسم کی روک اُس کی ترقی میں حائل نہیں ہوسکیگی۔

؎ تفسیر۔ فرماتا ہے کیا ان سارے دلائل اور نصیحتوں کو سنکر بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کرنیوالا اور کوئی نہیں جس بات کا وہ فیصلہ کردے اُس کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی روک نہیں سکتی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ آدمؑ کامیاب ہو سو وہ کامیاب ہوگیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ نوحؑ کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو سو اُسے غلبہ حاصل ہوگیا اُس نے فیصلہ کیا کہ موسیٰؑ کو ترقی حاصل ہو سو اُسے ترقی حاصل ہوگئی اب اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ترقی دے سو اُسے ترقی حاصل ہوجائیگی۔ اور مکہ والوں کی ہوائی باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مقابلہ میں ٹھیر نہیں سکینگی اور دنیا دیکھ لیگی کہ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

سورۃ العلق - یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی بسم اللہ کے سوا انیس (۱۹) آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

سورۃ العلق کی سورت ہے [1]

سلہ [1] یہ سورۃ بلا اختلاف مکی ہے۔ امام احمد اپنی مسند میں عن عروہ عن عائشہؓ یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ قَالَتْ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ۔ اَلرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَأْتِي حِرَاءَ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْوَحْيُ وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءَ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فِيْهِ فَقَالَ اقْرَأْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ حَتّٰى بَلَغَ مَا لَمْ يَعْلَمْ قَالَ فَرَجَعَ بِهَا تَرْجُفُ بَوَادِرُهٗ حَتّٰى دَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ۔ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ يَا خَدِيْجَةُ مَا لِيْ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ وَقَالَ قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ فَقَالَتْ لَهٗ كَلَّا اَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ثُمَّ انْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيْجَةُ حَتّٰى اَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ قُصَيٍّ وَهُوَ ابْنُ عَمِّ خَدِيْجَةَ اَخِيْ اَبِيْهَا وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ وَكَتَبَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مِنَ الْاِنْجِيْلِ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكْتُبَ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ اَيِ ابْنَ عَمِّ اِسْمَعْ مِنِ ابْنِ اَخِيْكَ فَقَالَ وَرَقَةُ ابْنَ اَخِيْ مَا تَرٰى فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا رَاٰى فَقَالَ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ اُنْزِلَ عَلٰى عِيْسٰى لَيْتَنِيْ فِيْهِ جَذَعًا لَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا حِيْنَ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ فَقَالَ وَرَقَةُ نَعَمْ لَمْ يَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ وَاِنْ يُدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ اَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ فَتْرَةً حَتّٰى حَزِنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا بَلَغَنَا حُزْنًا غَدَا مِنْهُ مِرَارًا كَيْ يَتَرَدّٰى مِنْ رُءُوْسِ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ فَكُلَّمَا اَوْفٰى بِذُرْوَةِ جَبَلٍ لِكَيْ يُلْقِيَ نَفْسَهٗ مِنْهُ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا فَيَسْكُنُ بِذٰلِكَ جَاشُهٗ وَتَقَرُّ بِهٖ نَفْسُهٗ

فَيَرْجِعُ فَإِذَا اَطَالَتْ عَلَيْهِ فَتْرَةُ الْوَحْيِ غَدَا بِمِثْلِ ذَالِكَ فَإِذَا اَوْ فٰى بِذَرْوَةِ الْجَبَلِ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ لَهٗ مِثْلَ ذَالِكَ وَ هٰذَا الْحَدِيْثُ مُخْرَجٌ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ الزُّهْرِيِّ ۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ابتداء میں جو وحی نازل ہوئی وہ رؤیا صادقہ کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ ایسے واضح رنگ میں پوری ہو جاتی جیسے فجر کا طلوع ہوتا ہے اس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ رغبت پیدا ہوئی کہ آپ خلوت میں اللہ تعالےٰ کی عبادت کریں۔ بعض دوسری حدیثوں میں آتا ہے کہ اُن دنوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خلوت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے زیادہ اور کوئی چیز پیاری نہیں تھی۔ چنانچہ آپ غارِ حراء میں جاتے اور اللہ تعالےٰ کی عبادت کرتے۔ عبادت کا یہ طریق تھا کہ آپ کئی کئی راتیں غارِ حراء میں بسر کر دیتے اور دن رات اللہ تعالےٰ کے ذکر اور اُس کی عبادت میں مشغول رہتے۔ جتنا عرصہ آپ نے عبادت کا ارادہ کیا ہوتا تھا اُتنے عرصہ کے لئے آپ حراء میں ہی اپنا زاد لے جاتے تھے اور جب وُہ ختم ہو جاتا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے وہ اتنا ہی اور زاد تیار کر کے دے دیتیں اور آپ پھر اُس کو ساتھ لیکر عبادت کے لئے غارِ حراء میں چلے جاتے۔ ایک دن آپ اسی طرح غارِ حراء میں اللہ تعالےٰ کی عبادت کر رہے تھے کہ آپؐ پر وحیٔ الٰہی کا آغاز ہو گیا۔ ایک فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اُس نے کہا اِقْرَأْ یعنی پڑھ! رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھنا نہیں جانتا قَالَ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب میں نے یہ جواب دیا تو اُس نے مجھے پکڑا اور بھینچنا شروع کر دیا۔ غَطٌّ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو پانی میں ڈبو دینا۔ لیکن محاورہ میں غَطٌّ بھینچنے کو کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں اُس نے مجھے بھینچا اور اتنا بھینچا کہ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجُهْدُ میری مقابلہ کی طاقت ختم ہو گئی یعنی میں نے سمجھا کہ اگر اُس نے اب مجھے زیادہ بھینچا تو میں مر جاؤں گا۔ اس کے بعد اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور پھر کہا پڑھ! میں نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ اُس نے پھر مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری مقابلہ کی طاقت ختم ہو گئی۔ اِس پر اُس نے پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَأْ۔ پڑھ! میں نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ اُس نے تیسری دفعہ پھر مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری مقابلہ کی طاقت ختم ہو گئی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور (اس سورۃ کی یہ آیات پڑھنے کو) کہا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔

اس کے بعد راوی کے اپنے الفاظ میں حدیث آتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے فوراً بعد اپنے گھر واپس آئے اور آپ کی حالت یہ تھی کہ اُس وقت آپ کے کندھے خوف سے کانپ رہے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر پہنچے تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا۔ زَمِّلُوْنِیْ۔ زَمِّلُوْنِیْ۔ مجھے کپڑا اوڑھا دو۔ مجھے کپڑا اوڑھا دو۔ اُنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سے ڈھانک دیا یہاں تک کہ آپ کا خوف دُور ہو گیا۔ اس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدیجہ! مجھے کیا ہو گیا ہے؟ پھر آپ نے ساری بات سُنائی اور فرمایا کہ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا ایسا خیال مت کیجئے بلکہ آپ خوش ہو جائیے۔ مجھے اللہ ہی کی قسم وہ آپ کو کبھی نہیں چھوڑے گا کیونکہ آپ اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ہر سچی بات کی آپ تصدیق کرتے ہیں، خدا تعالےٰ کی کسی بات کا انکار نہیں کرتے، جو لوگ اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اُن کے بوجھ آپ خود اُٹھاتے ہیں، ہر آنے جانے والے کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور جو لوگ ایسی مصائب میں مبتلا ہوں کہ اس میں اُن کی شرارت کا دخل نہ ہو۔ بلکہ حوادثِ زمانہ کی وجہ سے اُنہیں تکلیف پہنچی ہو آپ اُن کا بوجھ

بتلاتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لیا اور آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو حضرت خدیجہؓ کے ابنِ عم یعنی چچا زاد بھائی تھے ۔ یہ ورقہ بن نوفل اُن لوگوں میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ وہ تورات کو عربی زبان میں لکھوایا کرتے تھے (یا اندھا ہونے سے پہلے لکھا کرتے تھے) اور جتنی خدا توفیق دیتا تھا عبرانی زبان سے انجیل بھی لکھوایا کرتے تھے (یعنی اس کا عربی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے تھے) وَكَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ اور وہ ایک بوڑھے آدمی تھے جو بڑھاپے میں آکر نابینا ہو گئے تھے ۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے مختصراً سب حال کہا اور کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے! اپنے بھائی کے بیٹے کے مُنہ سے سب بات سُن لو۔ ورقہ نے کہا اے میرے بھائی کے بیٹے تُو نے کیا دیکھا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ تفصیلاً بتایا۔ ورقہ نے تمام باتیں سُن کر کہا یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ کاش! میں اُس وقت جوان ہوتا۔ کاش! میں اُس وقت زندہ ہوتا جب تیری قوم تجھے نکال دے گی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا ہاں ہاں تیری قوم تجھے نکال دے گی کیونکہ آج تک کوئی شخص اُس تعلیم کو لے کر نہیں آیا جس تعلیم کو تُو لے کر کھڑا ہوا ہے مگر اُس کی قوم نے اُس سے ضرور دشمنی کی ہے۔ اگر مجھے بھی وہ دن دیکھنا نصیب ہوا جب تُو اپنی قوم کے سامنے اس تعلیم کا اعلان کرے گا اور قوم تیری شدید مخالفت کرے گی یہاں تک کہ وہ تجھے اس شہر میں سے نکال دے گی تو میں کمر باندھ کر تیری مدد کروں گا۔ مگر اس واقعہ کے تھوڑے دنوں کے بعد ورقہ بن نوفل فوت ہو گئے اور وحی میں وقفہ پڑ گیا۔ بعض لوگوں کی طرف سے جو خبریں پہنچی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ فترۃِ وحی سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی غم ہوا کئی دفعہ آپ باہر جاتے اور ارادہ کرتے کہ کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیں مگر جب کبھی آپ پہاڑ کی کسی چوٹی پر اس ارادہ کے ساتھ جاتے کہ اپنے آپ کو نیچے پھینک دیں تو جبریل آتے اور کہتے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اللہ تعالےٰ کے سچے رسول ہیں اِس سے آپ کا جوش تھم جاتا آپ کا نفس ٹھنڈا ہو جاتا اور آپ واپس لَوٹ آتے۔ مگر جب فترۃِ وحی کا زمانہ لمبا ہو گیا تو ایک دفعہ پھر آپ اِسی ارادہ سے نکلے اور پہاڑ کی چوٹی پر گئے مگر وہاں آپ کو پھر جبریل نظر آئے اور انہوں نے پھر اِسی قسم کی بات کی۔

یہ روایت ابتداءِ وحی کے متعلق مسند احمد بن حنبل میں آتی ہے۔ امام بخاری نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب کے ابتدائی باب یعنی بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میں درج کیا ہے۔ اسی طرح بخاری جلد ۴ باب التعبیر میں بھی یہ حدیث آتی ہے مگر مسند احمد بن حنبل اور بخاری کی اس روایت میں کسی قدر فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اس حدیث میں آتا ہے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا تَصْدُقُ الْحَدِيْثَ مگر بخاری بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ میں جو حدیث درج ہے اُس میں تَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی وہ خوبیاں جو دنیا سے معدوم ہو چکی ہیں وہ آپ کما رہے ہیں مطلب یہ کہ وہ اخلاقِ فاضلہ جن پر دنیا عمل نہیں کرتی اُن پر آپ کا عمل پایا جاتا ہے۔

دوسرے بخاری کی ابتدائی حدیث میں ورقہ بن نوفل کے متعلق یہ ذکر نہیں آتا کہ كَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ وہ تورات کو عربی زبان میں لکھوایا کرتے تھے (اصل الفاظ يَكْتُبُ کے ہیں جس کے معنے لکھنے کے ہیں لیکن چونکہ وہ اندھے ہو گئے تھے اس لئے اس کے معنے یہاں لکھوانے کے ہیں اِن معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے یا پھر اس کے یہ معنے ہیں کہ اندھا ہونے سے پہلے ایسا کیا کرتے تھے)

تیسرے اِس حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ پہاڑ سے اپنے آپ کو

نیچے گرا دینے کا ارادہ کیا لیکن بخاری کی وہ حدیث جو بابُ کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ میں آتی ہے اُس میں اس واقعہ کا ذکر نہیں آتا۔ لیکن بخاری جلد ۴ باب التعبیر میں جو حدیث آتی ہے اُس میں تَصْدُقُ الْحَدِیْثَ کے بھی الفاظ ہیں۔ کَانَ یَکْتُبُ الْکِتَابَ الْعَرَبِیَّ کے بھی الفاظ ہیں اور اس واقعہ کا بھی ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو گرانے کا ارادہ کیا۔

چوتھے اس حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ ورقہ بن نوفل نے کہا یہ وُہی ناموس ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوا لیکن بخاری میں یہ ذکر آتا ہے کہ اُس نے کہا ھٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ اُنْزِلَ عَلٰی مُوْسٰی یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسٰی علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔

بہرحال اس معمولی فرق کے باوجود نفسِ مضمون دونوں حدیثوں کا ایک ہی ہے چنانچہ اِسی حدیث کی بناء پر شُرّاح اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پہلی وحی ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

ابن کثیر کہتے ہیں فَاَوَّلُ شَیْءٍ نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ھٰذِہِ الْاٰیَاتُ الْکَرِیْمَاتُ الْمُبَارَکَاتُ وَھُنَّ اَوَّلُ رَحْمَۃٍ رَحِمَ اللّٰہُ بِھَا الْعِبَادَ وَاَوَّلُ نِعْمَۃٍ اَنْعَمَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْھِمْ۔ یعنی یہ قرآن کریم کی پہلی بزرگ اور مبارک آیات ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ یہ پہلی رحمت ہیں جس کے ذریعہ اللہ تعالٰے نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا اور پہلی نعمت ہیں جس کے ذریعہ اُس نے اپنے فضل سے اُنہیں سرفراز فرمایا۔

اس جگہ ضمنی طور پر مَیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی بعض آیات میں بعض انبیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ خوبیاں اُن میں ساری دنیا کے مقابلہ میں ممتاز طور پر پائی جاتی تھیں حالانکہ یہ درست نہیں ہوتا۔ زبان کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کی خاص طور پر کوئی خوبی بیان کی جاتی ہے تو اِس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اُسے ساری دنیا کے مقابلہ میں اُس خوبی کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہے بلکہ مراد محض اُس زمانہ یا اس کی قوم یا خاندان کے لوگ ہوتے ہیں مثلاً اسی جگہ ابن کثیر یہ نہیں کہتے کہ ھُنَّ اَوَّلُ رَحْمَۃٍ رَحِمَ اللّٰہُ بِھَا عَلٰی اُمَّۃِ الْمُحَمَّدِیَّۃِ یہ وہ پہلی رحمت ہے جو اُمتِ محمدیہ پر نازل ہوئی بلکہ کہتے ہیں ھُنَّ اَوَّلُ رَحْمَۃٍ رَحِمَ اللّٰہُ بِھَا الْعِبَادَ۔ یہ آیات وہ پہلی رحمت ہیں جن سے اللہ تعالٰے نے اپنے بندوں پر رحم و کرم کی بارش کا آغاز فرمایا۔ پھر وہ کہتے ہیں وَاَوَّلُ نِعْمَۃٍ اَنْعَمَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْھِمْ۔ یہ پہلی نعمت ہے جو خدا تعالٰی کی طرف سے آئی اور جس کے ذریعہ اُس نے اپنے بندوں پر بہت بڑا انعام نازل فرمایا۔ حالانکہ عیسٰیؑ کا کلام اس سے پہلے آچکا تھا موسٰیؑ کی کتاب اس سے پہلے آچکی تھی ابراہیمؑ کے صُحف اللہ تعالٰے کی طرف سے نازل ہو چکے تھے۔ درحقیقت یہ ایک محاورہ ہے جو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ سننے والا پاگل نہیں جب ہم کہیں گے کہ فلاں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے تو لازماً وہ اُسے ایک زمانہ کے لوگوں تک محدود رکھے گا یہ نہیں سمجھے گا کہ شروع سے لے کر قیامت تک کے لوگوں پر اُسے فضیلت حاصل ہو گئی ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم میں بعض انبیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہ بھی اِسی طرح اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے ہیں نہ کہ ساری دنیا کے لحاظ سے۔ جس طرح اس جگہ ابنِ کثیر نے قرآن کریم کی اِن آیات کو پہلی رحمت اور پہلی نعمت قرار دیا ہے حالانکہ عیسٰیؑ اور موسٰیؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ سب اللہ تعالٰے کا کلام لا چکے تھے بہرحال چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر یہ پہلی رحمت تھی جو اللہ تعالٰے کی طرف سے نازل ہوئی اِس لئے اُنہوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے اُسے پہلی رحمت قرار دے دیا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں ھِیَ اَوَّلُ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (فتح البیان) یہ قرآن میں سے پہلا حصہ ہے جو نازل ہوا۔ ابو موسٰی اشعری کہتے ہیں ھٰذِہٖ اَوَّلُ سُوْرَۃٍ اُنْزِلَتْ

فترۂ وحی کا زمانہ

عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (فتح البیان) یہ پہلی سورۃ ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی روایت ہے پھر لکھا ہے وَقَدْ ذَهَبَ الْجَمْهُوْرُ اِلٰی اَنَّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ اَوَّلُ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ بَعْدَهٗ نٓ وَالْقَلَمِ ثُمَّ الْمُزَّمِّلُ ثُمَّ الْمُدَّثِّرُ (فتح البیان) کہ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ یہ پہلی سورۃ ہے جو قرآن کریم میں سے نازل ہوئی۔ اس کے بعد نٓون وَالقلم نازل ہوئی پھر مزمل نازل ہوئی. اور پھر مدثر نازل ہوئی۔

اسی سلسلہ میں بخاری میں کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ کے باب کے ماتحت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ایک دفعہ گھر سے باہر جا رہا تھا کہ میں نے آسمان پر اسی فرشتہ کو دیکھا جو غار حرا میں آیا تھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے اِس سے میں بہت مرعوب ہُوا۔ میں گھر آیا اور کہا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ۔ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ فَحَمِیَ الْوَحْیُ وَتَتَابَعَ یعنی جب میں گھر آیا اور مجھ پر کپڑا اوڑھا دیا گیا تو اللہ تعالے نے سورہ مدثر کی یہ آیات نازل کیں کہ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ اس کے بعد وحی جلد جلد نازل ہونی شروع ہوگئی۔ ان دونوں اقوال میں بظاہر کچھ اختلاف نظر آتا ہے یعنی خازن نے دوسری روایت کو نقل کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اِقْرَاْ کے بعد سورہ نون والقلم نازل ہوئی پھر سورہ مزمل نازل ہوئی اور پھر سورہ مدثر نازل ہوئی۔ اور بخاری کی روایت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِقْرَاْ کے بعد مدثر نازل ہوئی۔ لیکن یہ اختلاف حقیقی نہیں درحقیقت ایک امر کے نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ اختلاف پیدا ہُوا ہے۔ لوگ عام طور پر خیال کرتے ہیں کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کے بعد فترۃ وحی ہوئی ہے حالانکہ جو حدیث بخاری میں بیان ہوئی ہے اُس سے یہ پتہ نہیں لگتا۔ اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اس کے کچھ عرصہ بعد ورقہ بن نوفل فوت ہوئے اور پھر فترۃ کا زمانہ آگیا۔ درمیانی عرصہ کا اس حدیث میں ذکر نہیں کیا گیا۔ فترۃ وحی چونکہ ایک اہم مسئلہ تھا اس لئے اُس کا ذکر کر دیا گیا مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اِقْرَاْ کے بعد فترۃ ہوئی ہے بلکہ اِقْرَاْ کے بعد کچھ اور کلام نازل ہُوا تھا اور اس کے بعد فترۃ ہوئی ہے اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالے نے یہ کہا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ تو اس میں تو کوئی حکم بیان نہیں ہُوا پھر کیا حکم دیا تھا جس کے متعلق اِقْرَاْ کہا گیا تھا اِقْرَاْ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ کوئی باتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہنی ہیں۔ وہ کہنے والی باتیں بہرحال اِقْرَاْ کے بعد نازل ہونی چاہئے تھیں۔ چنانچہ اِقْرَاْ کے بعد نون والقلم نازل ہوئی اس کے بعد سورۃ مزمل نازل ہوئی اور پھر فترۃ کا زمانہ آگیا۔ پس میرے نزدیک اصل واقعہ یہ ہے کہ اِقْرَاْ کی ابتدائی آیات اور اسی طرح نون والقلم اور سورۃ المزمل کی کچھ آیات پہلے نازل ہوئیں پھر فترۃ وحی ہوئی اور اُسکے ختم ہونے پر سورۃ المدثر نازل ہوئی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِئٍ اس کا یہ مفہوم نہیں تھا کہ میں کتاب نہیں پڑھ سکتا کیونکہ کتاب تو اُس جگہ کوئی پیش ہی نہیں تھی۔ ایک حدیث میں بیشک آتا ہے کہ جبریل کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جس پر کچھ لکھا ہُوا تھا مگر اُس حدیث میں یہ ذکر نہیں آتا کہ جبریل نے وہ کپڑا دکھا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا ہو کہ اس پر جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھو کیونکہ اسی حدیث میں یہ ذکر بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کیا پڑھوں۔ اگر اس نے

کپڑا دکھا کر کچھ پڑھانا ہوتا تو آپ یہ نہ کہہ سکتے کہ میں کیا پڑھوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ کے الفاظ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انکسار کے طور پر استعمال فرمائے تھے اور آپ ڈرتے تھے کہ میں عہدۂ نبوت کی اہم ذمہ داریوں کو پوری خوش اسلوبی سے ادا بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ یہی حال ہر نبی کا ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انہیں فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اللہ تعالےٰ سے عرض کیا کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصاحت رکھتا ہے اُسے بھی میرے ساتھ بھجوا دیجئے ایسا نہ ہو کہ میں اپنے مافی الضمیر کو وضاحت سے بیان نہ کر سکوں اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر جاؤں۔ یہ تو قرآن کریم کا بیان ہے تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون کا نام نہیں لیا بلکہ جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے نبوت کا کام ان کے سپرد کیا گیا تو انہوں نے کہا

"اے میرے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں۔
جس کو چاہے تُو اس کے وسیلہ سے بھیج"
(خروج باب ۴ آیت ۱۳)

یعنی میں اس خدمت کا اہل نہیں کسی اور شخص کو اس عہدہ پر کھڑا کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر اللہ تعالےٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی یہ کام سپرد کر دیا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس دن کے لئے پہاڑ پر گئے تو بعد میں حضرت ہارونؑ بنی اسرائیل کو سنبھال نہ سکے۔ باوجود اُن کے منع کرنے کے وہ شرک میں مبتلا ہو گئے اور بچھڑے کی پرستش کرنے لگ گئے۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ دیکھ لو انتخاب وُہی صحیح تھا جو ہم نے کیا تم نے اپنے لئے ہارونؑ کا انتخاب کیا تھا مگر ہارون قوم کی نگرانی نہ کر سکا۔

بہرحال اللہ تعالےٰ کی طرف سے جب نبوت کا کام کسی عظیم الشان انسان کے سپرد کیا جاتا ہے تو طبعی طور پر وُہ گھبراتا اور ہچکچاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں میں اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں حجاب بھی تھا۔ انکسار بھی تھا۔ اپنے اہم فرائض کو دیکھتے ہوئے خوف بھی تھا۔ اللہ تعالےٰ کی عظمت اور اُس کے استغناء کا بھی آپ کو احساس تھا اور ادب کی وجہ سے آپ یہ کہنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ میری جگہ کسی اور کو مقرر کر دیں میں اس کام کے قابل نہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر جیسے تجاہل عارفانہ کے طور پر کوئی بات کہہ دی جاتی ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا۔ حالانکہ اُس وقت آپ کو پڑھنے کے لئے نہیں کہا گیا تھا۔ درحقیقت یہ ایک ادب کا طریق تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اختیار فرمایا۔ آپ نے سمجھا کہ براہِ راست انکار کرنا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہوگی اور اگر میں نے کہا کہ میں اس کام کے قابل نہیں تو یہ بھی ادب کے خلاف ہوگا اس لئے میں کوئی اور رنگ اختیار کروں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ رنگ اختیار کیا کہ آپ نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ؛ مَیں تو پڑھے لکھے آدمیوں میں سے نہیں ہوں مَیں نے کیا کام کرنا ہے اصل بات یہ ہے کہ خود فرشتہ نے بھی آخر میں ظاہر کر دیا تھا کہ اُس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ پڑھو بلکہ مطلب یہ تھا کہ جو کچھ میں کہتا جاؤں اُسے ساتھ ساتھ دُہراتے جاؤ۔ قَرَأَ کے دونوں معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو دُہرانا یا لکھے ہوئے کو پڑھنا۔ پس جب فرشتے نے کہا اِقْرَأْ تو درحقیقت اس کے یہ معنے نہ تھے کہ لکھے ہوئے کو پڑھو کیونکہ لکھا ہوا پڑھنا اُس وقت مدنظر ہی نہیں تھا۔ فرشتے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسے زبانی دُہراتے جاؤ چنانچہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن الفاظ کو دُہرا دیا تو چونکہ اُس کا مقصد حاصل ہو گیا اس لئے وہ واپس چلا گیا۔

ابتداء وحی ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جیسا کہ ابن کثیر

نے کہا ہے یہ پہلی رحمت ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو نوازا اور پہلی نعمت ہے جس سے اُس نے اپنے فضل سے اُنہیں حصہ عطا فرمایا۔ پس اس سورۃ کی ابتدائی آیات اس لحاظ سے خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں کہ یہ قرآن کریم کے لئے بمنزلہ بیج اور گٹھلی کے ہیں اور ان آیات کے نزول کے بعد باقی قرآن نازل ہوا ہے۔ یوں تو سارا قرآن ہی اہمیت رکھتا ہے مگر جذباتی طور پر اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ایسی اہمیت رکھنے والی آیات ہیں کہ جب انسان اِن کو پڑھتا ہے اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے یہ وہ آیات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنے قرآن سے روشناس کرایا۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے دوست آپس میں ملتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے بعض دفعہ خاص طور پر اس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ اُن کی دوستی کا آغاز کس طرح ہوا یا میاں بیوی آپس میں مذاکرہ کرتے ہیں تو وہ بھی بعض دفعہ بڑے شوق سے یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہمارا نکاح کس طرح ہوا۔ اگر معمولی دنیوی واقعات ایسی اہمیت رکھتے ہیں کہ انسان اُن کا ذکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ کا وہ آخری کلام جس کے ذریعہ دنیا قیامت تک ہدایت پاتی رہے گی، جس کے ذریعہ انسانی پیدائش کا مقصد پورا ہوا، جس کے ذریعہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل ہوا، جس کے ذریعہ خالق اور مخلوق کا تعلق آپس میں قائم کیا گیا، اُس کی بنیاد جن آیات پر ہے اُن کی اہمیت اور عظمت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے۔ جس طرح میاں بیوی شوق سے باہم ذکر کرتے ہیں کہ ہمارا نکاح کس طرح ہوا یا دوست شوق سے یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہماری دوستی کا آغاز کس طرح ہوا اسی طرح اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ وہ الفاظ ہیں جن کو پڑھتے ہی انسان کا دل فرطِ محبت سے اُچھلنے لگتا ہے، اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے، اُس کے خوابیدہ جذبات میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے یہ وہ آیات ہیں جن کے

جذباتی کیفیت پر دشمنوں کے اعتراض

ذریعہ مجھے اپنے رب کا وصال حاصل ہوا۔ جن کے ذریعہ انسان اور خدا کا باہمی رشتہ جوڑا گیا اور دوستی کا وہ آخری مرحلہ قائم کیا گیا جو خدا اور بندے کے درمیان ہونا چاہیئے۔ پس ابتداءِ وحی ایک نہایت ہی اہمیت رکھنے اور جذباتِ میں ہیجان پیدا کرنے والی چیز ہے۔ اِسی وجہ سے دشمنوں کی بھی اس پر خاص طور پر نظر پڑی ہے اور اُنہوں نے اِن آیات اور ابتداءِ وحی سے تعلق رکھنے والے واقعات سے قسم قسم کے استدلال کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وحی کی تنقیص کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی کہتا ہے وحی ایک ڈھکوسلا ہے۔ کوئی کہتا ہے وحی ایک بیماری کا نتیجہ تھی چنانچہ آپ کا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہنا اس پر شاہد ہے کئی کہتے ہیں یہ بیماری اور جھوٹ دونوں کا اجتماع تھا۔ پھر واقعہ پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ آپکے گھبرانے پر بھی اعتراض ہے کہ آپ کو وحی پر شک تھا یا یہ اعتراض ہے کہ اپنی قابلیت پر شک تھا یا یہ کہ آپ نے خدا تعالےٰ کا حکم ماننے سے پہلوتہی کی۔ یہ بھی اعتراض ہے کہ اس وحی کی نوعیت کیا تھی۔ آیا یہ مادی نظارہ یا خواب تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نظر آئی۔ غرض مختلف دشمنوں نے اپنے اپنے رنگ میں استدلال کیا ہے۔ غیر مسلم مصنفین کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات اُٹھائیں جس سے قرآن کریم پر حملہ ہو سکے۔ چنانچہ بعض نے یہ طریق اختیار کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں یہ وحی ایک نظارہ تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور چونکہ انسانی دماغ اس قسم کا نظارہ دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا اس لئے یہ غیر معمولی اور مافوق الطبیعات نظارہ درحقیقت علامت تھی اس بات کی کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں خشکی پیدا ہو کر جنون رُونما ہو گیا تھا۔ لیکن بعض دوسرے مخالفین کا دماغ اس طرف گیا ہے کہ ممکن ہے کچھ لوگ جنون کی تھیوری کو تسلیم نہ کریں اور وہ اس بات کو مان لیں کہ سچ مچ اس قسم کا واقعہ ہو سکتا ہے اور اگر انہوں نے مان لیا تو فرشتے دیکھنے یا اللہ تعالےٰ سے ہمکلام ہونے میں وہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بنی اسرائیل کے نبیوں سے مشابہ قرار دے دیں گے اور یہ بڑی تکلیف دہ بات ہوگی پس انہوں نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ یہ کوئی نظارہ نہیں تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا بلکہ ایک خواب تھی جو آپ کو آئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بات ہماری روایات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں حَتّٰی اِذَا کَانَتِ اللَّیْلَۃُ الَّتِیْ اَکْرَمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْھَا بِرِسَالَتِہٖ وَرَحِمَ الْعِبَادَ بِھَا جَآءَہٗ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ بِاَمْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی یعنی جب وہ رات آگئی جس میں اللہ تعالےٰ نے آپ کو اپنی رسالت سے مفتخر فرمایا اور اپنے بندوں پر رحم کیا تو جبریل اللہ تعالےٰ کا حکم لے کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آگے لکھا ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَآءَنِیْ جِبْرِیْلُ وَاَنَا نَائِمٌ بِنَمَطٍ مِّنْ دِیْبَاجٍ فِیْہِ کِتَابٌ فَقَالَ اقْرَاْ۔ قَالَ قُلْتُ مَا اَقْرَاُ۔ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میرے پاس جبریل آیا وَاَنَا نَائِمٌ اور اُس وقت میں سو رہا تھا ایک ریشمی کپڑا اُن کے پاس تھا جس میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا پڑھو! میں نے کہا مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔ قَالَ فَغَطَّنِیْ بِہٖ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتُ انہوں نے مجھے خوب بھینچا یہاں تک کہ میں نے سمجھا میں مرنے لگا ہوں ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اقْرَاْ قَالَ قُلْتُ مَا اَقْرَاُ۔ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ فَغَطَّنِیْ بِہٖ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتُ۔ اُنہوں نے پھر مجھے ڈھانپ لیا یہاں تک کہ میں نے سمجھا میں اب مرنے لگا ہوں۔ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اقْرَاْ قُلْتُ مَاذَا اَقْرَاُ۔ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو: میں نے کہا میں کیا پڑھوں؟ مَا اَقُوْلُ ذٰلِکَ اِلَّا افْتِدَاءً مِّنْہُ اَنْ یَّعُوْدَ لِیْ بِمِثْلِ مَا صَنَعَ بِیْ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے یہ فقرہ کہ میں کیا پڑھوں اِس لئے کہا تھا تا اس ذریعہ سے میں اُس صدمہ سے بچ جاؤں جو اُن کے بھینچنے سے مجھے پہنچا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ قَالَ فَقَرَاْتُھَا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس پر میں نے یہ فقرے دُہرائے ثُمَّ انْتَھٰی فَانْصَرَفَ عَنِّیْ وَھَبَبْتُ مِنْ نَّوْمِیْ۔ پھر انہوں نے بس کر دیا اور مجھ سے لوٹ کر چلے گئے اور میں اپنی نیند سے بیدار ہوگیا۔ فَکَاَنَّمَا کُتِبَتْ فِیْ قَلْبِیْ کِتَابًا۔ اُس وقت مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرے دل پر یہ تمام الفاظ نقش کر دئے گئے ہیں۔

اس حوالہ میں صاف طور پر نیند کا لفظ آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم اس روایت پر بنیاد رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ درحقیقت یہ ایک خواب تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھی۔ اس تاویل سے اُن کا منشاء یہ ہے کہ بائبل کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے انسان کو بالمشافہ نظر آتے ہیں اور وہ اُسے اللہ تعالےٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اگر ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ نظر نہیں آیا بلکہ ایک خواب تھی جو آپ نے دیکھی تو بائبل کے نبیوں سے آپ کی مشابہت ثابت نہیں ہو سکے گی۔ گو بخاری اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جو حدیث آتی ہے اُس میں صاف طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں کے سامنے جبریل کو دیکھا۔ مگر چونکہ یہ حدیث اُن کے منشاء کے خلاف ہے اس لئے وہ بخاری یا مسند احمد بن حنبل کی حدیث کی بجائے ابن ہشام کی اس روایت پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی فرشتہ اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آیا صرف ایک خواب تھی جو حرا میں آپ کو آئی۔ اگر اس خواب کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی انبیاء بنی اسرائیل

۲۰۱
بدء الوحی پر مخالفین کا اعتراض کہ یہ خواب کا واقعہ تھا

سے آپ کی مشابہت ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ اُن کو خدا تعالےٰ کے فرشتے آمنے سامنے نظر آتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک خواب تھی۔

جن لوگوں نے اِس بات پر زور دینا چاہا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نعوذ باللہ کوئی نقص واقعہ ہو گیا تھا انہوں نے ابن ہشام کی روایت کو نظر انداز کرکے بخاری اور مسند احمد بن حنبل کی وہ حدیث لے لی ہے جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرشتہ کو دیکھا۔ وہ کہتے ہیں چونکہ انسانی دماغ اس قسم کا نظارہ نہیں دیکھ سکتا اس لئے یہ نظارہ علامت تھی اس بات کی کہ آپ کا دماغ نعوذ باللہ خراب ہو گیا تھا۔

بدء الوحی پر یورپین مصنفین کے اعتراض کی اصل وجہ

میرے نزدیک یوروپین مصنفین کی نیت خواہ کچھ ہو اس بارہ میں اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نظارۂ کشف کی حقیقت کو سمجھتے ہی نہیں۔ وہ اِس قدر مذہب سے دُور جا پڑے ہیں کہ کشفی نظارے اُن کو بہت ہی کم نظر آتے ہیں بلکہ خوابیں بھی اُن کو بہت کم آتی ہیں۔ گو خدائی سُنّت یہ ہے کہ ہر قسم کے طبقہ کو خوابیں دکھائی جاتی ہیں مگر پھر بھی یوروپین لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کو ساری عمر میں بھی کبھی کوئی خواب نہیں آئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور رات کو ناچتے ہیں پھر شراب پی کر یا نیند کی دوائیں کھا کر سو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے انہیں ایسی خوابیں بھی نہیں آتیں جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے کہ وہ کنچنیوں کو بھی آجاتی ہیں۔ کیونکہ شراب کا نشہ اُن کے دماغ کو بالکل معطّل کر دیتا ہے۔ پس میرے نزدیک اس بارہ میں اختلاف نظارۂ کشف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہُوا ہے اور مغربی لوگ اس علم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

کشف کی حقیقت

بات یہ ہے کہ جب کشف کی حالت انسان پر طاری ہوتی ہے تو جیسا کہ صاحب تجربہ لوگ جانتے ہیں اُس وقت انسان اپنے آپ پر ایک ربودیت کی حالت محسوس کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس دنیا سے کھینچ کر کسی اَور دنیا میں لے جایا گیا ہے۔ اُسے اپنے ارد گرد کی سب چیزیں نظر آتی ہیں مکان کی دیواریں نظر آتی ہیں۔ گھر کا سامان نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اور حالت اُس پر طاری ہو گئی ہے جو اُسے اس دنیا سے الگ لے گئی ہے۔ اسی طرح اس حالت کے جاتے وقت بھی انسان یُوں معلوم کرتا ہے کہ وہ گویا ایک غیر معمولی حالت سے پھر واپس آگیا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ریڈیو کو ایک میٹر سے دوسرے میٹر پر تبدیل کر دیا جاتا ہے پہلے وہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے اِس دُنیا سے کھینچ کر کسی اور دنیا میں لے جایا گیا ہے اور جب وہ حالت جاتی ہے تو وہ یکدم محسوس کرتا ہے کہ اُسے کسی اور دنیا سے اس دنیا میں واپس لَوٹا دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کو یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے یا اُس کے نفس کا خیال ہے۔ پس بوجہ اس کے کہ وہ حالت کامل نیند کی نہیں ہوتی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں نے جاگتے ہوئے ایسا دیکھا اور بوجہ اس کے کہ جاگنے کی حالت پر ایک خاص تصرّف کیا جاتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند طاری ہوئی اور اُس میں یہ دیکھا۔ اور میں نے خود اس کا تجربہ کیا ہے اس لئے مجھے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نظر نہیں آتی۔

پس یہ مادی نظارہ نہیں تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔ مگر بوجہ اس کے کہ آپ کے حواس ظاہری کام کر رہے تھے۔ ہم اِسے یقظہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت کشف ایک مابین النوم والیقظہ کیفیت کا نام ہے چونکہ وہ حالت کامل نیند کی نہیں ہوتی اس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاگتے ہوئے فلاں نظارہ دیکھا گیا اور چونکہ جاگنے کی حالت پر خاص تصرّف کیا جاتا ہے اِس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند کی حالت میں ہم نے ایسا نظارہ دیکھا۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی موقع پر یہ فرما دیا کہ میں نے جاگتے ہوئے ایسا نظارہ دیکھا تھا اور کسی موقع پر آپ نے یہ فرما دیا ہوگا کہ میں نے نیند کی حالت

میں ایسا نظارہ دیکھا۔ جو لوگ صاحب کشوف ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں کبھی کہتے ہیں مَیں یہ نظارہ دیکھ کر جاگ پڑا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میں ربودگی کی کیفیت سے عام حالت میں آگیا اور کبھی کہتے ہیں مَیں نے جاگتے ہوئے فلاں نظارہ دیکھا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میرے حواس ظاہری بھی اُس وقت کام کر رہے تھے۔ پس یہ دونوں باتیں آپس میں کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ محض کشف کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یورو پین مصنفین کو یہ غلطی لگی ہے۔

مسند احمد بن حنبل اور بخاری کی حدیث کو یوں بھی حل کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ خواب کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں قرآن کریم حضرت یوسف علیہ السلام کی رویار کی نسبت فرماتا ہے کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف ع) کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ یہاں خواب کا کوئی لفظ نہیں صرف اتنا ذکر ہے کہ میں نے دیکھا۔ مگر اگلی آیت میں ہی حضرت یعقوب علیہ السلام یہ بات سُن کر فرماتے ہیں۔ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰٓی اِخْوَتِکَ (یوسف ع) اے میرے بیٹے تُو اس رویار کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کیجیو۔ اب دیکھو ایک آیت میں اُسے ظاہری نظارہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں اُسے رویا قرار دیا گیا ہے پس یہ ایک طریق بیان ہے جو عربی زبان میں رائج ہے اِس سے کسی اختلاف کا ثبوت نہیں نکل سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں الگ الگ محاورات رائج ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں ایسے نظاروں کے لئے رویار کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنے دیکھنے کے ہیں۔ گو محاورہ میں ایسے نظارہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نیند کی حالت میں دیکھا جائے۔ لیکن فارسی نے اس کے لئے خواب کا لفظ تجویز کیا ہے جس کے معنے نیند کے ہیں۔ یہ بھی ایک فرق ہے جو عربی زبان کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے قرآن کریم نے ہر جگہ رویار کا لفظ ہی خواب کے معنوں میں استعمال کیا ہے جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ درحقیقت وہی حالت اصل بیداری کی ہوتی ہے جس میں انسان خدا تعالےٰ سے ہمکلام ہو گو ظاہری طور پر اُس پر نیند یا ربودگی کی کیفیت طاری ہو۔ لیکن ایرانی لوگ چونکہ ماہر نہیں تھے انہوں نے خواب کا لفظ ایجاد کر لیا حالانکہ خواب کے معنے محض نیند کے ہیں پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر کسی جگہ یہ فرمایا ہے کہ میں نیند سے بیدار ہو گیا اور دوسری جگہ آپ نے صرف اتنا فرمایا ہے کہ میں نے ایسا نظارہ دیکھا تو اس میں اختلاف کی کوئی بات نہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ ذکر کیا کہ مَیں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے دیکھا ہے تو اس میں خواب کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسی نظارہ کے متعلق رویار کا لفظ استعمال کر دیا جو محاورہ میں نیند کی حالت میں دیکھے ہوئے نظارہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان معنوں میں رویار کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ فرماتی ہیں اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْیِ الرُّؤْیَا الصَّادِقَةُ فِی النَّوْمِ فَکَانَ لَا یَرٰی رُؤْیَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ۔ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کا آغاز رویار صالحہ سے ہوا۔ یہاں رویار کا لفظ صرف انہی نظاروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو انسان سوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پس یورو پین مصنفین کی طرف سے جو اختلاف پیش کیا جاتا ہے وہ درحقیقت اختلاف نہیں بلکہ محاورہ زبان کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ رویار ہی تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھی تو بہرحال جیسا کہ ہمیں یقین اور وثوق ہے یہ رویار اُس قسم کی نہیں تھی جس میں انسان پر کامل نیند طاری ہوتی ہے

بدء الوحی کا واقعہ خواب کا واقعہ نہیں تھا۔

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی فرق کرتی ہیں۔ آپ ایک طرف تو یہ فرماتی ہیں کہ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء رؤیاء صادقہ سے ہوئی جو آپ سوتے ہوئے دیکھتے مگر اس دوسری وحی کے متعلق جس میں جبریلؑ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ فرماتی ہیں فَجَآءَهُ الْمَلَكُ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتہ آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نظاروں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرق کر رہی ہیں جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ غارِ حرا میں آپ کو جو نظارہ دکھایا گیا وہ گہری نیند والا نہ تھا بلکہ کشفی نیند والا تھا۔ اور ابن ہشام والی روایت کے معنے گہری نیند کے نہیں بلکہ کشفی نیند کے ہیں اور آپ کے ان الفاظ کا کہ پھر میں جاگ اُٹھا صرف اتنا مفہوم ہے کہ پھر میری کشفی حالت جاتی رہی۔ پس ابن ہشام کی روایت اور بخاری و مسند احمد بن حنبل کی حدیث میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

بدء الوحی پر آنحضرتؐ کے گھبرانے کی وجہ

معترضین کا بدء الوحی پر دوسرا اعتراض

دوسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی رؤیا پر شک تھا۔ اس سوال کی بنیاد اس امر پر رکھی جاتی ہے کہ

الف۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھبرائے ہوئے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔

ب۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ۔ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔

ج۔ فترۃ وحی پر آپ نے اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہا جیسا کہ بخاری اور مسند احمد بن حنبل دونوں میں اس واقعہ کا ذکر آتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گھبرانا اور خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ کہنا تو اس وجہ سے تھا کہ ہر انسانِ کامل کے اندر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے فرض کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ جو شخص چھچھورا ہوتا ہے یا ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے اُس کے سپرد جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو بغیر اس کے کہ وہ موقع پر نگاہ دوڑائے اور اپنے کام کی اہمیت کو سمجھے کہہ دیتا ہے کہ اس کام کی کیا حقیقت ہے میں اسے فوراً کر لوں گا۔ لیکن عقلمند انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُس کے دل میں فوراً گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم میں اپنے فرض کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ قابل اور ناقابل میں یہی فرق ہوتا ہے کہ قابل کو فوراً اپنے کام کا فکر پڑ جاتا ہے مگر ناقابل کو کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ کام بالکل آسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں موجودہ جنگ میں وہی جو کام جنرل الیگزنڈر یا جنرل منٹگمری یا لارڈ مونٹ بیٹن کے سپرد کیا گیا ہے اگر یہی کام کسی ہندوستانی صوبیدار کے سپرد کیا جاتا اور اُس سے پوچھا جاتا کہ کیا تم فوجوں کی کمان کر سکو گے؟ تو بغیر سوچے سمجھے وہ فوراً جواب دے دیتا کہ میں اس کام کو اچھی طرح سرانجام دے سکوں گا۔ مگر یہ وہ لوگ تھے جن کے سپرد جب کام ہوا تو ذمہ داری کا احساس رکھنے کی وجہ سے اُن کے دلوں میں خوف پیدا ہوا کہ نہ معلوم ہم اپنے فرائض کو کماحقہٗ ادا کر سکیں گے یا نہیں۔ پس کسی کام کے سپرد ہونے پر دل میں گھبراہٹ پیدا ہونا علم کامل کی علامت ہوتی ہے نہ اس بات کی علامت کہ وہ کام کی اہلیت نہیں رکھتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی نزولِ وحی پر گھبرانا اور آپ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنی گھبراہٹ اور اضطراب کا اظہار کرنا در حقیقت یہی معنے رکھتا ہے کہ آپ اپنے کام کی اہمیت کو سمجھتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کا کام آپ کے سپرد کیا تو فوراً آپ کو فکر شروع ہو گیا کہ اتنا بڑا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے نہ معلوم میں اس کو الٰہی منشاء کے مطابق سرانجام دے سکوں گا یا نہیں۔ آپ کے سپرد جو کام کیا گیا اور جس کا پہلی وحی میں ہی بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں قلمیں ہیں جو بڑے بڑے علوم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جن کو

اپنے تجربہ اور اپنی علمی نگاہ کی وسعت پر ناز ہے۔ تُو اُن کو وہ علم سکھا جو اُن کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں۔ اور اُن علوم اور معارف سے انہیں بہرہ ور فرما جو آج دنیا کی کسی کتاب میں بھی نہیں ملتے۔ یہ سیدھی بات ہے کہ جب ایک اُمّی کو یہ کہا جائے گا کہ دنیا نے کتابیں لکھیں مگر بے کار ثابت ہوئیں اور وہ دنیا کی ہدایت کا موجب نہ بن سکیں۔ اب اے شخص ہم تیرے سپرد یہ کام کرتے ہیں کہ جو علوم آج تک بڑی بڑی کتابیں لوگوں کو سکھا نہیں سکیں وہ علوم تُو ہمارے حکم سے لوگوں کو سکھا تو لازماً اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جائے گی کہ اتنا بڑا کام میں کس طرح کر سکوں گا بے شک ایک پاگل کو جب یہ کہا جائے گا تو وہ خوش ہو جائے گا اور کہے گا یہ کونسا بڑا کام ہے مگر عقلمند کا دل خوف سے بھر جائیگا اور وہ کہے گا اتنا بڑا کام میں کس طرح کر سکوں گا۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ قَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي آپ کے علم کامل پر ایک زبردست گواہ ہے۔ وہ لوگ جو اس واقعہ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نقص واقعہ ہو گیا تھا انہیں غور کرنا چاہیئے کہ کیا پاگل بھی کبھی گھبراتا ہے؟ اُسے تو اگر کہا جائے کہ کیا تم ساری دنیا فتح کر سکتے ہو تو وہ فوراً کہہ دے گا یہ کونسی مشکل بات ہے۔ مگر وہ جسے اپنی ذمہ واری کا احساس ہوتا ہے، جو کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے، جو فرائض کی بجا آوری کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے وہ کام کے سپرد ہونے پر لرز جاتا ہے۔ اُس کا جسم کانپ اُٹھتا ہے اور اُس کے دل میں بار بار یہ خیال آنا شروع ہو جاتا ہے کہ ایسا نہ ہو میں اپنی کسی غفلت کی وجہ سے ناکام ہو جاؤں اور جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اُس کو سرانجام دینے سے قاصر رہوں۔

تاریخ اسلام میں اس کی ایک موٹی مثال موجود ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آٹھ سالہ عرصہ میں دنیا کی کایا پلٹ دیتے ہیں، روم اور ایران کو شکست دیدیتے ہیں، عرب کی سرحدوں پر اسلامی فوجیں بھجوا کر اُسے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کر دیتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے وہ کام کرتے ہیں جو قیامت تک ایک زندہ یادگار کی حیثیت میں قائم رہنے والا ہے۔ مگر جب آپ روم کو شکست دے دیتے ہیں، جب ایران کو شکست دے دیتے ہیں، جب یہ دو زبردست ایمپائر اسلامی فوجوں کے متواتر حملوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں، جب عمرؓ کا نام ساری دنیا میں گونجنے لگتا ہے، جب دشمن سے دشمن بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ عمرؓ نے بہت بڑا کام کیا اُس وقت خود عمرؓ کی کیا حالت تھی۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جب آپ وفات پانے لگے تو اُس وقت آپ کی زبان پر بار بار یہ الفاظ آتے تھے کہ رَبِّ لَا عَلَيَّ وَلَا لِي اے میرے رب! میں سخت کمزور اور خطاکار ہوں میں نہیں جانتا مجھ سے اپنے کام کے دوران میں کیا کیا غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں۔ الٰہی میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں۔ میں اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہوں اور میں اپنے آپ کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا۔ صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ تُو اپنے عذاب سے مجھے محفوظ رکھ۔

غور کرو اور سوچو کہ ان الفاظ سے حضرت عمر رضؓ کی کتنی بلند شان ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کے سپرد اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک کام کیا گیا اور آپ نے اُس کو ایسی عمدگی سے سرانجام دیا کہ یورپ کے شدید سے شدید دشمن بھی اس کام کی اہمیت کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مگر چونکہ آپ کے دل پر خدا کا خوف طاری تھا آپ نے سمجھا کہ بے شک میں نے کام کیا ہے مگر ممکن ہے اللہ تعالےٰ اس سے بھی زیادہ کام چاہتا ہو اور میں جس کام کو اپنی خوبی سمجھتا ہوں وہ اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں خوبی نہ ہو۔ اس لئے باوجود اتنا بڑا کام کرنے کے وفات کے وقت آپ تڑپتے تھے اور بار بار آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوتے تھے کہ رَبِّ لَا عَلَيَّ وَلَا لِي۔ خدایا میں تجھ سے کسی انعام کا طالب نہیں صرف اتنی درخواست کرتا ہوں کہ تُو مجھے اپنی سزا سے محفوظ رکھ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ مجھے خدمت کا حق جس رنگ میں ادا کرنا چاہیئے تھا اُس رنگ میں ادا نہیں کیا اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پر نزولِ وحی کے بعد جو گھبراہٹ طاری ہوئی اُس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ آپ کے دل میں خوف پیدا ہُوا کہ میرے سپرد اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو عظیم الشان کام کیا گیا ہے نہ معلوم مَیں اُسکو ادا کرسکتا ہوں یا نہیں پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل وحی الٰہی پر شک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ خدا تعالےٰ کی شان کے انسانی دماغوں سے بالاتر ہونے پر یقین کامل کے نتیجہ میں تھا اور آپکو یہ فکر لگ گئی تھا کہ میں اس کام کیلئے خواہ کتنی بھی قربانی کروں نہ معلوم اللہ تعالےٰ کے ارادوں کے مطابق میں بلند ہو سکوں گا یا نہیں۔ اور اللہ تعالےٰ کی بلند شان سے خوف کرنا جُرم نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے اور خدا تعالےٰ کے عُلُوّ مرتبت کو مدنظر رکھتے ہوئے بُرا نہیں بلکہ اُس بے نظیر خشیت الٰہی کا ایک بیّن ثبوت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلب مطہّر میں پائی جاتی تھی۔

فترۃ وحی کے وقت آنحضرت صلعم کا اپنے آپ کو پہاڑ سے گرانا ایک کشفی واقعہ ہے۔

باقی رہا یہ کہ آپ نے خودکُشی کا ارادہ کیا سو اوّل تو دوسری احادیث سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ نے جو فعل کیا وہ وحی الٰہی کے رُکنے کے بعد کیا۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ نعوذ باللہ مجھ پر شیطان نے اپنا کلام نازل کیا ہے یا کلام الٰہی کے بارہ میں آپ کو کوئی شبہ ہوتا تو چاہیئے تھا کہ اس وحی کے نزول کے وقت آپ خودکُشی کا ارادہ فرماتے۔ مگر حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ آپ نے فترت کے بعد خودکُشی کا ارادہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گھبراہٹ یہ تھی کہ کیا میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالےٰ ناراض ہوکر مجھ سے بولنا چھوڑ بیٹھا ہے۔ اتنا عرصہ گذر گیا اور مجھ پر اُس کا کلام نازل نہیں ہُوا۔ اگر وحی کے متعلق آپ کو شبہ ہوتا تو چاہیئے تھا کہ جب کچھ عرصہ کے لئے وحی کا نزول رُک گیا تھا آپ خوش ہوتے اور کہتے الحمد للہ میں ایک بلا سے بچ گیا۔ مگر تمام حدیثیں متفقہ طور پر یہ واقعہ بیان کرتی ہیں کہ وحی کے رُک جانے پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی یا الہامات کی صداقت میں شبہ نہیں تھا آپ کو صرف یہ خوف تھا کہ میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالےٰ مجھ سے ناراض نہ ہوگیا ہو۔ پس یہ واقعہ بھی وحی الٰہی کے متعلق آپ کے کسی شبہ کو ظاہر نہیں کرتا۔

میں اس جگہ یہ بھی ذکر کردینا چاہتا ہوں کہ گو اس واقعہ کی مَیں نے ایک توجیہ کی ہے اور اُس اعتراض کو ردّ کیا ہے جو یوروپین مصنفین کی طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک چونکہ صحیح احادیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹیوں سے اپنے آپ کو گرانا چاہا اس لئے ہم اس واقعہ سے کلیّۃً انکار نہیں کرسکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو اس واقعہ کے سمجھنے میں سخت غلطی لگی ہے وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک ظاہری واقعہ ہے جس کا احادیث میں ذکر آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ خودکُشی کے ارادہ سے پہاڑ پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو نیچے گرانا چاہتے مگر معاً جبریل آپ کو آواز دیتا کہ آپ ایسا نہ کریں آپ واقعہ میں خدا کے رسول ہیں۔ اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم رُک جاتے اور اپنے گھر میں واپس آجاتے۔ لوگ اس واقعہ کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر موجب بنتے ہیں حالانکہ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ کشفی واقعہ ہے کشف میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ دیکھتے تھے کہ میں پہاڑوں پر پھر رہا ہوں اور اپنے آپ کو گرانا چاہتا ہوں مگر فرشتہ مجھے آواز دیتا ہے کہ ایسا مت کریں آپ واقعہ میں خدا تعالےٰ کے رسول ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں بار بار یہ خیالات اُٹھتے تھے کہ میں اتنا بڑا کام کس طرح کرسکوں گا ایسا نہ ہو کہ مَیں خدا تعالےٰ کی ناراضگی کا مورد بن جاؤں اس لئے اللہ تعالےٰ نے آپ کے ان خیالات کو کشفی صورت میں اس رنگ میں ظاہر کیا کہ آپ پہاڑ کی چوٹیوں سے

اپنے آپ کو نیچے گرانا چاہتے ہیں مگر فرشتہ آواز دیتا ہے یَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اللہ تعالےٰ کے سچے رسول ہیں۔ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ آپ کو اللہ تعالےٰ نے اس مقصد کے لئے کھڑا کیا ہے۔ پس میرے نزدیک یہ کوئی ظاہری واقعہ نہیں بلکہ ایک کشف ہے جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ درحقیقت رویاء میں اگر کوئی شخص دیکھے کہ وہ پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا رہا ہے تو اگر وہ دیکھے کہ وہ پہاڑ سے گر گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ کوئی بُری بات ظاہر ہوگی اور وہ تباہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ رویاء میں پہاڑ سے گرا تو ہے مگر مرا نہیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اُس سے کوئی بڑی بھاری غلطی ہوگی یا کوئی بڑا بھاری کام کرے گا جس کے نتیجہ میں اُسے صدمہ پہنچیگا مگر اس کے باوجود وُہ ہلاک نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص دیکھے کہ وہ پہاڑ سے گرنے لگا تھا مگر فرشتہ نے اُسے کہا کہ گھبراتے کیوں ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والا ہے جس میں بظاہر تباہی ہوگی مگر وہ تباہ نہیں ہوگا بلکہ کامیاب و بامراد ہوگا۔

اگر ہم اس واقعہ کو ظاہری قرار دیں تب بھی یہ اُس خشیت الٰہی کا ثبوت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں پائی جاتی تھی کیونکہ آپ نے ایسا فعل نزول وحی پر نہیں کیا بلکہ وحی کے رُکنے پر کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ گھبراہٹ تھی کہ کیا میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے ناراض ہو کر مجھ سے بولنا تو ترک نہیں کر دیا لیکن میرے نزدیک یہ ظاہری واقعہ نہیں جس کا ایک ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ہر دفعہ فرشتہ ظاہر ہو جاتا اور وُہ آپ کو آپ کی کامیابی کی بشارت دیتا۔ فرشتہ کا آنا خود اپنی ذات میں اس بات کی ایک دلیل ہے کہ ہم اسے ظاہری واقعہ قرار نہیں دے سکتے۔ دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس واقعہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔

اب رہا وحی کا سوال۔ دشمن کہتا ہے کہ آپ کا اُس وقت زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک بیماری کا حملہ تھا۔ ہسٹیریا کا دورہ آپ کو ہُوا اور آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جلدی مجھ پر کپڑا ڈال دو۔ مگر یہ سوال بھی وحی الٰہی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ اصحابِ وحی جانتے ہیں وحی الٰہی کے نزول کے وقت اس قدر خشیت کا نزول ہوتا ہے کہ جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مقامِ قرب ہے۔ دربار کی شمولیت کا حال تو درباری ہی جانتا ہے دوسرے کو کیا خبر ہو سکتی ہے۔ پس یہ حالت اُس قرب کی وجہ سے تھی جو اللہ تعالےٰ کے حضور آپ کو حاصل تھا مگر اس حقیقت کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو روحانیت کے اس کوچہ سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے قرب سے ویسے ہی دُور ہیں جیسے مشرق سے مغرب دُور ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو جنون ہوتا ہے کیا اُن کا حال صرف کپڑا اوڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کیا یہ بھی کوئی طبی مسئلہ ہے کہ جو شخص کپڑا اوڑھ لے وہ پاگل ہوتا ہے؟ یا کیا ڈاکٹر یہ پوچھا کرتا ہے کہ فلاں نظارہ کے وقت تم کپڑا اوڑھتے ہو یا نہیں؟ پس محض زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کے الفاظ سے مخالفینِ اسلام کا یہ استدلال کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نعوذ باللہ نقص واقعہ ہو گیا تھا بالکل احمقانہ استدلال ہے۔ بے شک اُس وقت آپ پر گھبراہٹ طاری ہوئی مگر گھبراہٹ کا طاری ہونا ہرگز آپ کے اندر روحانی دماغی یا جسمانی نقص کے پائے جانے کا ثبوت نہیں۔ بلکہ اُس خشیتِ الٰہی کا ثبوت ہے جو آپ کے دل میں پائی جاتی تھی۔ ہم نے تو دیکھا ہے معمولی دنیوی واقعات پر بعض لوگ دوسروں سے اس قدر مرعوب ہوتے ہیں کہ اُن کا پسینہ بہنے لگ جاتا ہے افسر کسی غلطی پر تنبیہ کرے یا کسی معاملہ کے متعلق اُن سے بازپُرس کی جائے تو اس قدر اُن پر رُعب طاری ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں کانپنے لگ جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو پسینہ جاری ہو جاتا ہے۔ جب معمولی افسروں کے رُعب کی وجہ سے انسان کی

یہ حالت ہو جاتی ہے تو سوچنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کی عظمت اور اُس کے جلال اور اُس کی جبروت کا آپ پر کس قدر اثر ہو سکتا تھا۔ پس آپ نے اگر زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہا تو اس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ آپ پر الٰہی کلام کا رعب طاری ہو گیا۔ آپ نے چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ لیٹ جائیں تاکہ آپکے قویٰ کو سکون حاصل ہو جائے۔ وہ لوگ جو اس کو جنون کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اُن سے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کپڑا اوڑھنا جنون کی علامت ہوتی ہے؟ ہم نے تو کبھی نہیں سُنا کہ کوئی ڈاکٹر کسی ایسے مریض کے پاس گیا ہو جس میں جنون کے آثار پائے جاتے ہوں تو اُس نے مریض کے لواحقین سے یہ سوال کیا ہو کہ کیا یہ مریض کبھی کپڑا بھی اوڑھتا ہے یا نہیں؟ اگر کپڑا اوڑھتا ہے تو ضرور پاگل ہے اور اگر کپڑا نہیں اوڑھتا تو پاگل نہیں۔ ایسا سوال آج تک کبھی کسی ڈاکٹر نے نہیں کیا۔ پس محض کپڑا اوڑھنے سے مخالفین اسلام کا یہ نتیجہ نکالنا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا تھا خود اُن کے مجنون ہونے کی علامت ہے۔ دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی باقی حالتیں بھی مجنونانہ تھیں یا نہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہر غیر معمولی قابلیت والے شخص کی حالت دوسروں سے الگ ہوتی ہے ایک شخص جو غیر معمولی طور پر حساب کی قابلیت رکھتا ہے وُہ اُن دوسرے لوگوں سے جو معمولی حساب جانتے ہیں بالکل ممتاز طور پر نظر آتا ہے۔ ایک شخص جو غیر معمولی طور پر تاریخ کی واقفیت رکھتا ہے وُہ اُن دوسرے لوگوں سے جو معمولی تاریخ جانتے ہیں بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ ایک شخص جو غیر معمولی طور پر طب کی واقفیت رکھتا ہے وُہ اُن دوسرے لوگوں سے جو معمولی طب جانتے ہیں اپنے فن میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ بعض دفعہ مرض معمولی معلوم ہوتا ہے عام ڈاکٹر اُس کا عام علاج کرتا ہے مگر ماہر فن ڈاکٹر اُس مرض کی شدت کو سمجھ کر فوراً اُس کا دوسرا علاج بتاتا ہے یا عام ڈاکٹر مرض کو شدید بتاتا ہے مگر ماہر فن اس کے معمولی مرض ہونے کو فوراً بھانپ جاتا ہے۔

نزولِ وحی کے بعد آنحضرت صلعم کے کپڑا اوڑھنے کی وجہ

یہی حال سائنس کے مسائل کا ہے۔ ایک شخص معمولی مسائل جانتا ہے مگر دوسرا شخص سائنس کی بڑی بڑی باریکیوں تک پہنچ جاتا اور دنیا میں کئی اہم ایجادات کا موجب بن جاتا ہے۔ غرض الگ الگ قابلیتیں ہیں جو الگ الگ لوگوں میں پائی جاتی ہیں کسی شخص کی قابلیت بہت معمولی ہوتی ہے اور کسی شخص کی قابلیت بالکل غیر معمولی ہوتی ہے اور وہ دوسروں سے اپنے کام میں بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ مگر بہرحال کسی شخص میں غیر معمولی قابلیت کا پایا جانا یہ معنے نہیں رکھتا کہ اُسے جنون ہو گیا ہے۔ اِسی طرح غیر معمولی صحت والے کی حالت بھی دوسروں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ پس محض غیر معمولی قابلیت کے نتیجہ میں کسی کی الگ حالت ہونے سے اُس پر مجنون ہونیکا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا اور جو ایسا کرتا ہے وہ اِس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کی تمام ترقی مجنونوں سے وابستہ ہے کیا ایسا شخص خود پاگل نہیں!

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان میں عقل کس لئے رکھی ہے اگر عقل کی غرض کوئی عقلی کام کرنا ہے تو پھر اعلیٰ علم کرنا تو عقل کی علامت ہوا نہ کہ جنون کی علامت! اگر کسی شخص کی حالت دوسروں سے غیر ہے تو دیکھا یہ جائے گا کہ اُس شخص کے حالات بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب ہیں یا تنزل کا اگر اُس کا اپنی قابلیت میں غیر معمولی ہونا بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب ہو تو ماننا پڑے گا کہ اُس کے حالات کا تغیّر عقل کی زیادتی کی وجہ سے ہے اور اگر اُس کے حالات بنی نوع انسان کی تباہی اور خرابی کا موجب نظر آئیں تو ماننا پڑے گا کہ اُس کا تغیّر جنون کی وجہ سے ہے۔ بہرحال محض کسی کے حالات کا تغیّر یا کسی میں غیر معمولی قابلیت کا پایا جانا اُس کے جنون کی علامت نہیں ہو سکتا

پھر یہ بھی دیکھو کہ دشمن نے تو آج یہ اعتراض کیا ہے کہ نزول وحی کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نعوذ باللہ نقص واقعہ ہو گیا تھا مگر قرآن کریم نے اپنی ابتدائی آیات میں ہی اس سوال کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ دے دیا تھا اور

دنیا کو بتا دیا تھا کہ اُس کا یہ اعتراض سراسر حماقت پر مبنی ہے چنانچہ سورۂ نون والقلم میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے یہ بتایا جا چکا ہے کہ مفسرین اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے معاً بعد سورۂ نون والقلم کی آیات رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئیں اور یہ آیات اسی مضمون کی حامل ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اُن کے دماغ میں کوئی نقص واقعہ ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس پر غیر مسلم اگر دیانتداری کے ساتھ غور کریں تو اُنہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کلام کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کا نازل کردہ کلام ہے۔ دیکھو ابھی دنیا نے یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ نزولِ وحی کے واقعات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جنون کی علامت ہیں مگر اللہ تعالےٰ نے عرش سے دیکھ لیا کہ ایک دن آنے والا ہے جب دشمن نزولِ وحی کی کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کریگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ مجنون تھے۔ چنانچہ دوسری ہی وحی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اُس میں اللہ تعالےٰ نے اس شبہ کا ازالہ کیا اور فرمایا نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ. مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ (سورۃ القلم ع۱) ہم قسم کھا کر پیش کرتے ہیں دوات اور قلم کو اور اُن تمام تحریروں کو جو قلم اور دوات سے لکھی گئی ہیں کہ اگر دنیا کی تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو اُن سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ تُو اپنے رب کی نعمت سے پاگل نہیں ہے۔ یہ دوسری سورۃ ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور جس کے ابتداء میں ہی اُس اعتراض کا اللہ تعالےٰ نے جواب دے دیا ہے جو پہلی وحی سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتا تھا اور وہ جواب یہ ہے کہ قلم اور دوات نے جس قدر علوم لکھے ہیں وہ سب اس امر کے شاہد ہیں کہ تُو مجنون نہیں یعنی اگر علوم عالموں کے لکھے ہوئے ہیں تو تُو اُن سے بڑھ کر علم بیان کرتا ہے۔ اگر وہ ادنیٰ علوم سے عالم کہلاتے ہیں تو تُو اعلیٰ علم سے مجنون کیوں کہلانے لگا بہرحال اُن سے بڑا عالم کہلائے گا اور تیرا اُن سے اختلاف علم کی زیادتی کی وجہ سے کہلائے گا نہ کہ علم کی کمی کی وجہ سے۔

تیرے مجنون نہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر روحانی ترقیات یا دین سے تعلق رکھنے والے علوم پائے جاتے ہیں اُن سب کے مقابلہ میں تُو دنیا کو وہ کچھ سکھائیگا جو اُس نے پہلے نہیں سیکھا اور یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ تُو پاگل نہیں۔ تیرے دماغ میں کوئی نقص نہیں۔ اور اگر تجھے پاگل قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر اُن سب لوگوں کو پاگل قرار دینا پڑے گا جنہوں نے دنیا میں علوم کو پھیلایا اور بنی نوع انسان پر علمی اور روحانی رنگ میں احسانِ عظیم کیا۔ لیکن اگر وہ اُن کو پاگل قرار نہیں دیتے تو تجھے کس مُنہ سے پاگل کہہ سکتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا میں جب کوئی شخص کسی علم پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو لوگ اُس کو پاگل قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں وہ بڑا قابل ہے۔ بڑا عالم اور سمجھدار ہے اُس نے اس علم کی باریکیوں پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے مگر تُو وہ ہے جو ہر علم کے ایسے نکات کو بیان کرتا ہے جن کی طرف اُس علم کے بڑے بڑے ماہرین کی بھی آج تک نظر نہیں گئی پھر اگر وہ ایک علم پر معمولی روشنی ڈال کر عالم سمجھے جا سکتے ہیں تو تُو تمام رُوحانی، اخلاقی، اقتصادی، قضائی، سیاسی، عائلی علوم کے متعلق اُن کے ماہرین سے زیادہ روشنی ڈال کر مجنون کیونکر سمجھا جانے لگا۔ آخر مجنون کہنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے اگر تُو کام وہ کر رہا ہے جو بڑے بڑے عالموں نے بھی نہیں کیا تو تجھے مجنون کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ اور لوگوں کی کیسی حماقت ہے کہ وہ اتنی موٹی بات کو بھی نہیں سمجھتے کہ عقل اور جنون میں اور علم اور جہالت میں بُعد المشرقین ہے۔ جب دنیا میں تُو علوم کے وہ خزانے تقسیم کر رہا ہے جو بڑے بڑے عالموں کے واہمہ میں بھی کبھی نہیں آئے تو بہرحال اُسے یہی کہنا پڑے گا کہ تُو بڑا عالم ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تُو مجنون ہے یا تیرے دماغ میں فتور واقعہ ہو گیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ اے لوگو آج تک قلم اور دوات سے جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اُس کے مجنون نہ ہونے کے ثبوت کے طور پر تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ جب دنیا میں علم الاخلاق پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم العقائد پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم سیاست میں کوئی شخص نئی راہ پیدا کرتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے جب علم الاقتصاد میں کوئی شخص نیا مسئلہ نکالتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم العائلہ پر کوئی شخص نئے رنگ میں روشنی ڈالتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو وہ شخص ہیں کہ آج تک جس علم میں بھی کوئی کتاب لکھی گئی ہے وہ اُن کے علم کے مقابل میں بالکل ہیچ ہے۔ قلمیں اُن کے مقابلہ میں ٹوٹ چکی ہیں۔ عالم اُن کے مقابلہ میں گُنگ ہو چکے ہیں۔ معارف کا ایک سمندر ہے جو انہوں نے دنیا میں بہا دیا ہے اور علوم کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے جو انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تم تعصب سے کام نہ لو تو بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی قابلیت اُن کے غیر معمولی علم اور آسمانی تائید اور ہدایت کے نتیجہ میں ہے نہ کہ نعوذ باللہ غیر معمولی جہالت کے نتیجہ میں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاگل اور غیر معمولی عقلمند اور بڑے عالم اور بڑے جاہل میں یہ اشتراک ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنے اندر غیر معمولی طاقت رکھتا ہے اور وہ بھی اپنے اندر غیر معمولی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرق ہوتا ہے کہ ایک شخص نیچے کی طرف غیر معمولی طور پر گرتا ہے اور دوسرا شخص اوپر کی طرف غیر معمولی طور پر جاتا ہے۔ غیر معمولی علم رکھنے والا وہ باتیں بتاتا ہے جو بڑے بڑے عالموں کو بھی نہیں سوجھتیں اور غیر معمولی جہالت رکھنے والا وہ باتیں بتاتا ہے جو بڑے بڑے بے وقوفوں اور جاہلوں سے بھی صادر نہیں ہوتیں بہرحال محض کسی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دوسروں سے الگ ہونا اُس کے جنون کی علامت نہیں ہوتا بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ اُس کے حالات کا تغیر بنی نوع انسان کے فائدہ کا موجب ہوا ہے یا نقصان کا موجب ہوا ہے۔ اگر فائدہ کا موجب ہو تو کوئی شخص اُس تغیر کو جنون کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتا۔

یہ کتنی سچی اور پختہ دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کی گئی اور پیش بھی ایسے موقع پر کی گئی جب ابھی وحی کے نزول کا ابتداء ہی ہوا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی قرآن کریم کا ایک زبردست معجزہ ہے کہ اُس نے ابتداء وحی میں ہی اُس اعتراض کا جواب دے دیا جو دشمنانِ اسلام نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی کے متعلق کرنا تھا اور ایسی حالت میں دے دیا جبکہ خود مکہ والوں کے سامنے بھی ابھی آپ نے اپنا دعویٰ پیش نہیں کیا تھا۔ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد مکہ والوں کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا ہے مگر نٓ والقلم کی ابتدائی آیات وہ ہیں جو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کے معاً بعد نازل ہوئیں گویا ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنی نبوت کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت یہ خبر دے دی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر مجنون ہونے کا اعتراض کیا جائے گا۔ اور اگر پہلی وحی کے بعد کسی نے یہ اعتراض کیا بھی تھا تب بھی قرآن کریم نے پہلی وحی کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دشمنوں کے اس اعتراض کا جواب دے دیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا ہے اور جواب بھی ایسا زبردست دیا کہ جس کا انکار نہیں ہو سکتا

آج کل کے سائیکالوجسٹ کہتے ہیں کہ غیر معمولی قابلیت جنون کی علامت ہوتی ہے۔ میں اس کا جواب اوپر دے چکا ہوں لیکن اگر اُس جواب سے کسی کی تسلی نہ ہو تو میں کہتا ہوں اگر غیر معمولی قابلیت جنون سے حاصل ہوتی ہے تو پھر ہم بھی خواہش کرتے ہیں کہ خدا کرے ہم بھی ایسے پاگل بن جائیں کیونکہ

جب دنیا کی ترقی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ ہو اور غیر معمولی قابلیت جنون کی علامت ہے تو پھر دنیا کی ترقی عقلمندوں سے نہیں بلکہ پاگلوں سے وابستہ ہے اور وہی لوگ اس قابل ہیں کہ اُن کا نمونہ بننے کی کوشش کی جائے۔

میّور نے اس موقعہ پر اعتراض کیا ہے کہ جب اس سورۃ میں اِقْرَاْ کہا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محادثہ بالنفس والی سورتیں اِس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ اُس کا استدلال یہ ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہا گیا کہ اِقْرَاْ یعنی پڑھ۔ تو ضروری ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ اس سے پہلے کچھ سورتیں نازل ہو چکی تھیں جن کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ انہیں لوگوں کو پڑھ کر سُنا دیں۔ وُہ محادثہ بالنفس والی سورتیں سورۃ الّیل اور سورۃ الضحیٰ کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ قوم کے حالات پر غور کرتے کرتے جب ان سورتوں میں آپ نے اپنی قوم کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تو اس کے بعد آپ کو یہ خیال ہُوا کہ یہ سورتیں درحقیقت الہامی ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں یہ سورتیں لوگوں کو پڑھ کر سُناؤں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی سوال ہے اس کا قیاس سے تعلق نہیں۔ تاریخی امور میں ہمیشہ تاریخ کا حوالہ چاہیئے نہ کہ قیاس کا۔ اگر تاریخ سورۃ الّیل اور سورۃ الضحیٰ کو بعد کی نازل شدہ قرار دیتی ہے تو قیاس کا اس میں کیا دخل ہے۔ بے شک کچھ لوگ اِقْرَاْ کے بعد سورۃ ن والقلم پھر مزمّل اور پھر مدثّر کا نزول بتاتے ہیں اور کچھ لوگ اِقْرَاْ کے بعد سورۃ مدثّر کی ابتدائی آیات کا نازل ہونا بتلاتے ہیں مگر وہ سورتیں جنکو سر میور محادثہ بالنفس والی سورتیں قرار دیتے ہیں اُن کا نزول کسی ایک شخص نے بھی اِقْرَاْ سے پہلے قرار نہیں دیا۔

دوسرے خود ان سورتوں میں کوئی ایسی بات نہیں کہ انکو پہلے کی قرار دیا جائے۔ کیا وہ خیالات جو ان سورتوں میں مذکور ہیں بعد میں ظاہر نہیں کئے جا سکتے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے خلاف قیاس اُسی مقام پر پیش کیا جا سکتا ہے جہاں تاریخی واقعہ ناممکن نظر آئے۔ مگر جہاں تاریخی واقعہ چسپاں ہو سکتا ہو وہاں قیاس سے کام لینا محض ایک زبردستی ہے اور اس زبردستی کی علم اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گو سر میور کہتے ہیں کہ یہ سورۃ بعد کی ہے اور محادثہ بالنفس والی سورتیں پہلے کی ہیں اور بعض نے گو محادثہ بالنفس والی (بقول سر میور) سورتوں کو مخصوص نہیں کیا صرف اتنا کہا ہے کہ یہ سورۃ بعد کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں اِقْرَاْ کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بعض سورتیں نازل ہو چکی تھیں لیکن نولڈکے وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ یہ سورۃ سب سے پہلے نازل ہوئی ہے وُہ کہتے ہیں جب تاریخ سے ثابت ہے کہ سب سے پہلے اس سورۃ کی آیات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں تو ہم تاریخ کے مقابلہ میں قیاس سے کس طرح کام لے سکتے ہیں۔

میّور کا منشا اعتراض کہ بعض پہلے پڑھی جانیوالی چیز ہونی چاہیئے۔

میں اس موقعہ پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مستشرقین یورپ کو زیادہ تر دھوکا اس بات سے لگا ہے کہ بعض جگہ کفّار کی مخالفت کی جو خبریں آجاتی ہیں اُن سے وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ الہام واقعہ کے بعد ہونا چاہیئے اِس لئے جس زمانہ میں مخالفت نہیں تھی اُس زمانہ میں کسی سورۃ کے کسی حصہ کا نزول تسلیم نہیں کیا جا سکتا جس میں مخالفت کی خبر دی گئی ہو۔ گویا اُن کے نزدیک جن سورتوں میں مخالفت کا ذکر ہو وہ ہمیشہ مخالفت کے بعد کی ہوتی ہیں۔ اس خیال پر بنیاد رکھتے ہوئے وہ بعض دفعہ مکّی سورتوں کو مدنی قرار دے دیتے ہیں یا ابتداء میں نازل ہونیوالی آیات کو بعد کے زمانہ میں نازل ہونے والی آیات قرار دیدیتے ہیں جب اسلام اور مسلمانوں کی پُر زور مخالفت شروع ہو گئی تھی مگر اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود نے اس خیال کا بُطلان خوب اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اُس وقت تو نہ صحابہ کے دل میں یہ خیال آسکتا تھا اور نہ کسی اور مسلمان کے دل میں۔ کہ کل دشمن قرآن کریم کے متعلق کیا کیا اعتراض کرے گا۔ اکثر اعتراضات موجودہ زمانہ میں ہوئے ہیں جن کے ہم جواب دیتے ہیں ہاں میں سے بعض باتیں ایسی ہیں جو صحابہؓ کے زمانہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں

میّور کے اعتراض کا جواب۔

مثلاً سورتوں کے نزول کی ترتیب معلوم کرنے میں اُس وقت کوئی دقت پیش نہیں آسکتی تھی۔ صحابہؓ زندہ موجود تھے اور اگر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تو اُسے کہا جاسکتا تھا کہ زیدؔ سے پوچھ لو۔ بکرؔ سے دریافت کر لو۔ عمروؔ اور خالدؔ سے اپنی اپنی تسلّی کرالو۔ مگر جب جواب دینے والے فوت ہوگئے تو اُس وقت قدرتی طور پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہُوا کہ فلاں سورۃ کب اُتری تھی یا فلاں سورۃ کا فلاں حصہ کب نازل ہُوا تھا۔ اُس وقت دشمن نے اس قسم کے خیالات سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ جہاں کسی پیشگوئی کا ذکر آتا وہ کہہ دیتا کہ یہ حصہ تو وقوعہ کے بعد کا ہے حالانکہ وہ حصہ وقوعہ سے مدتوں پہلے نازل ہوچکا تھا اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے بطور پیشگوئی اُن میں یہ خبریں موجود ہوتی تھیں کہ کفارِ مکہ میں سے کوئی فرعون کا مثیل ہوگا۔ کوئی ہامان کا قائم مقام ہوگا اور نبی کریمؐ کی مثال یوسفؑ کی سی ہوگی جس طرح یوسفؑ کو اُس کے اپنے بھائیوں نے نکال دیا تھا اسی طرح آپ کے بھائی آپ کو اپنے شہر میں سے نکال دیں گے۔ غرض کئی قسم کی پیشگوئیاں تھیں جو اللہ تعالےٰ کے اُس کلام میں موجود تھیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا اور جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ مگر چونکہ صحابہؓ کا زمانہ گذر چکا تھا اور وہ لوگ فوت ہوچکے تھے جن کے سامنے قرآن کریم کا نزول ہُوا۔ اِس لئے دشمن نے اس رنگ میں فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ جہاں کہیں کوئی امر بطور پیشگوئی ہوتا وہ جھٹ کہہ دیتا کہ یہ حصہ وقوعہ کے بعد کا ہے جب واقعات اس رنگ میں ظاہر ہوچکے تھے۔ یہی طریق یورپین مصنفین نے اختیار کیا ہے وہ قرآن کریم کی ہر پیشگوئی کو واقعہ کے بعد نازل شدہ بتاتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ دیکھو لوگ کہتے ہیں یہ آیت مکّی ہے حالانکہ اس میں فلاں واقعہ کی خبر ہے جو مدینہ میں ہُوا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ آیت مکّی نہیں مدنی ہے۔ اس سے اُن کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے جو کہا جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی پیشگوئیاں کیں اور وہ وقت پر پوری ہوئیں یہ دعویٰ بالکل غلط ہے آپ نے کوئی پیشگوئی نہیں کی بلکہ واقعہ کے بعد آپ نے اُس رنگ کی آیات ڈھال کر قرآن کریم میں شامل کر دی تھیں۔

اِس اعتراض کا جواب صحابہؓ تو دے نہیں سکتے کیونکہ وہ فوت ہوچکے ہیں اور صحابہؓ کے زمانہ میں یہ سوال نہیں اُٹھا کہ وہ اس پر کوئی روشنی ڈال جاتے۔ مگر چونکہ اس اعتراض کا جواب ضروری تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے جہاں اسلام کے اور بہت سے مسائل کو حل کیا وہاں اس ترتیب کے سوال کو بھی اللہ تعالےٰ نے بالکل حل کر دیا ہے۔

جب قرآن کریم نازل ہُوا ہے اُس وقت ساتھ ہی ساتھ اس رنگ میں کتابت نہیں ہوتی تھی کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ فلاں آیت کس سال میں نازل ہوئی ہے اور فلاں آیت کس سال میں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالےٰ ایک ایسے زمانہ میں پیدا کیا جب کتابت کا زور تھا، پریس جاری تھے اور ہر چیز شائع ہوکر فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ چونکہ الہام میں فلاں واقعہ کا ذکر ہے جو اتنے سال بعد پورا ہُوا اِس لئے یہ الہام اُس واقعہ کے بعد کا ہے پہلے کا نہیں۔ غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وجود اس اعتراض کے باطل ہونے پر ایک زبردست گواہ ہے۔ چنانچہ میں اس کے ثبوت میں "براہین احمدیہؑ" کے بعض الہامات پیش کرتا ہوں۔

براہین احمدیہ انگریزی مطبع میں چھپی ہے ۱۸۸۰ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور ۱۸۸۴ء میں چوتھی جلد چھپنے کے بعد اس کتاب کی دو دو جلدیں قانون کے مطابق گورنمنٹ کو بھجوا دی گئی تھیں بلکہ لنڈن میوزم میں بھی اس کی کاپیاں محفوظ ہیں اس لئے دشمن یہ نہیں کہہ سکتا کہ براہین احمدیہ میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ ۱۸۸۴ء کے بعد کی ہیں۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی ہے اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام بے شک لوگوں میں معروف تھے مگر صرف بطور مباحث کے

ہزار دو ہزار آدمی آپ کو جانتے تھے مگر اس لئے کہ آپ عیسائیوں یا ہندوؤں وغیرہ کے اُن مضامین کا جواب دیتے رہتے تھے جو وہ اسلام کے خلاف لکھتے تھے۔ یا ایسے لوگ جانتے تھے جو آپ کے تقویٰ کے قائل تھے اور آپ سے محبت اور اخلاص رکھتے تھے۔ مثلاً لالہ بھیم سین صاحب سیالکوٹ کے ایک وکیل تھے۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس قدر تعلق رکھتے تھے کہ جب آپ پر کرم دین والا مقدمہ ہوا تو اُس وقت اُن کے بیٹے لالہ کنور سین صاحب ایم۔اے جو لاء کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے ہیں اور بعد میں جموں ہائیکورٹ کے جج بن گئے تھے ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے آئے تھے۔ لالہ بھیم سین صاحب کو جب کرم دین والے مقدمہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ تمہاری پڑھائی کا کوئی فائدہ ہونا چاہیئے مرزا صاحب بڑے مہاتما ہیں اُن پر اس وقت ایک مقدمہ دائر ہے تم جاؤ اور اس مقدمہ کی مفت پیروی کرو تاکہ مرزا صاحب کی برکت سے تمہاری زندگی سنور جائے۔ اب دیکھو ایک شخص ہندو ہو کر وہ یہ جانتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے ہمیشہ مباحثات کرتے رہتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ آپ سے محبت رکھتا ہے آپ سے عقیدت اور اخلاص رکھتا ہے اور اپنے بیٹے کو آپ کے مقدمہ کی مفت پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو مرزا صاحب کی برکت سے تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ اسی طرح گو عیسائیوں سے آپ مباحثے کرتے رہتے تھے مگر اُن میں بھی ہم یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ باوجود بحث مباحثہ کے وہ آپ سے محبت اور اخلاص رکھتے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جن دنوں آپ سیالکوٹ میں ملازم تھے ایک بہت بڑے انگریز پادری سے جس کا نام پادری بٹلر تھا آپ اکثر مباحثات کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ پادری کچہری میں آیا اور چونکہ اُس زمانہ میں پادریوں کا خاص طور پر احترام کیا جاتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے سمجھا کہ پادری صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں چنانچہ وہ اُٹھا، بڑے احترام سے اُس کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر کہا کہ فرمایئے میرے لائق کونسی خدمت ہے۔ پادری صاحب نے کہا میں آپ سے ملنے نہیں آیا میں تو مرزا غلام احمد صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ میں اب ولایت جا رہا ہوں۔ اور چونکہ میرے ساتھ اُن کے اکثر مباحثات ہوتے رہے ہیں میرے دل میں اُن کی بڑی عقیدت ہے میں نے چاہا کہ ولایت جانے سے پہلے اُن سے آخری ملاقات کر لوں۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں تشریف رکھتے تھے پادری وہیں چلا گیا، فرش پر بیٹھ گیا اور دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اب دیکھو ایک انگریز پادری جس سے ملنے میں ڈپٹی کمشنر تک اپنی عزت محسوس کرتا تھا ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے رخصت ہونے کے لئے کچہری گیا جبکہ آپ ایک معمولی کلرک کا کام کرتے تھے اور جبکہ آپ کی عمر اس پادری کے پوتوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

پھر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی مسلمانوں کے چوٹی کے علماء میں سے تھے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ لکھی تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اُس پر ریویو لکھا:-

"ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں۔ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا۔ اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی۔ جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت کم پائی گئی ہے۔"

لوگ جب کسی کتاب کے متعلق تعریفی ریویو لکھتے ہیں تو کہتے ہیں اس سال کی یہ عظیم الشان کتاب ہے اور وہ کتاب بڑی بھاری سمجھی جاتی ہے۔ اگر کہہ دیا جائے کہ دس سال میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تو اس کی شہرت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اگر کہا جائے کہ ایک صدی کے اندر اندر ایسی عظیم الشان کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی تو یہ اُس کتاب کی انتہائی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ مگر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی یہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی گویا

یک صدی کا سوال نہیں دو صدیوں کا سوال نہیں تیرہ سو سال میں مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے فضائل کے متعلق ایسی شاندار کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی۔

غرض مسلمان کیا اور ہندو کیا اور عیسائی کیا سب براہین احمدیہ کی اشاعت کے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعریف کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد ہندوؤں میں مخالفت کا کچھ چرچا شروع ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے ہندوؤں میں بھی آپ کی کوئی مخالفت نہیں تھی۔ بلکہ اُن میں سے کئی آپ سے بہت اخلاص رکھتے تھے جیسے لالہ بھیم سین صاحب۔ اسی طرح اور بہت سے ہندو تھے جو آپ سے خط و کتابت رکھتے تھے اور آپ کی نیکی اور تقوٰے کو تسلیم کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ احتمال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص آپ کی مخالفت کرے گا کیونکہ سب کے سب لوگ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں آپ کے مدّاح تھے اور جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دعوئ نبوت سے پہلے لوگ امین اور صدیق کہا کرتے تھے اسی طرح لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی راستبازی کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ غرض مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں تینوں میں سے جو لوگ آپ کے واقف تھے وہ آپ کا ادب اور احترام کرتے تھے اور جو لوگ واقف نہیں تھے وہ نہ دوستی کا اظہار کرتے تھے نہ دشمنی کا۔ ایسی حالت میں براہین احمدیہ شائع ہوئی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے زمانہ میں جب نہ آپ کی مخالفت کا کوئی سوال تھا نہ موافقت کا۔ نہ آپ پر ایمان لانے والے دنیا میں موجود تھے اور نہ مخالفت کرنے والے۔ براہین احمدیہ میں اللہ تعالےٰ کے کیا الہامات شائع ہوئے اور وہ کس قسم کی اخبار غیبیہ پر مشتمل تھے۔ اس غرض کے لئے جب ہم براہین احمدیہ کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اُس میں ایک الہام یہ نظر آتا ہے کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (براہین احمدیہ ص۵۰۵) یعنی تو اپنے مومنوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ پاکیزگی کے لحاظ سے اُن کے لئے بہت بہتر ہوگا۔ اگر یہ کتاب چھپی ہوئی نہ ہوتی یا اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہ ہوتی اور یہ سوال اُٹھتا کہ یہ الہام کب کا ہے تو پادری و ہیری کا کوئی بھائی کہتا کہ یہ الہام ۱۸۸۰ء کا معلوم ہوتا ہے جب ایک جماعت آپ پر ایمان لا چکی تھی۔ حالانکہ یہ ۱۸۸۲ء کی کتاب ہے اور گورنمنٹ کے پاس بھی اس کی کاپی موجود ہے۔ پھر اُس زمانہ میں جب دنیا میں آپ کی نہ کوئی مخالفت تھی اور نہ مخالفت کا کوئی امکان تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآن کریم کی یہ آیت بہ تغیر قلیل الہام ہوئی کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ وَكَانَ كَيْدُهُمْ عَظِيْمًا (ص۵۰۵) یعنی اے شخص لوگ تیری مخالفت کریں گے اور اس مخالفت میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں شریک ہوں گے یعنی یہودی بھی تیری مخالفت کریں گے، عیسائی بھی تیری مخالفت کریں گے، مسلمان بھی تیری مخالفت کریں گے، ہندو بھی تیری مخالفت کریں گے اور وہ اس مخالفت سے کبھی باز نہیں آئیں گے جب تک کہ ہماری طرف سے نشان پر نشان ظاہر نہ ہوں۔ اِن نشانوں کے ظاہر ہونے کے بعد اُن کو معلوم ہو گا کہ تو ہماری طرف سے کھڑا کیا گیا ہے۔ وَكَانَ كَيْدُهُمْ عَظِيْمًا اور جن مکروں اور فریبوں سے وہ تجھے مغلوب کرنا چاہیں گے وہ بڑے عظیم الشان ہوں گے مگر ہم اُن کے تمام منصوبوں کو باطل کر دیں گے اور تجھے غلبہ اور کامیابی عطا کریں گے۔

اس الہام میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے کیسی زبردست مخالفت کی خبر دی گئی ہے حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ اُس وقت ہندو آپ کی عزت کرتے تھے، عیسائی آپ کی عزت کرتے تھے، مسلمان آپ کی عزت کرتے تھے مگر اللہ تعالےٰ نے قبل از وقت فرما دیا کہ یہودی اور عیسائی اور مسلمان اور ہندو اور سکھ سب کے سب تیری مخالفت کریں گے اور تیرے خلاف بڑے بڑے منصوبے کریں گے وہ چاہیں گے کہ تجھے مٹا دیں تیرے نام کو دنیا سے ناپید کر دیں مگر ہم تیری تائید میں اپنے عظیم الشان نشان دکھائیں گے اور

آخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو غالب آجائے گا اور تیرے مخالف مغلوب ہوجائیں گے حالانکہ یہود اور دوسرے غیر ملکی مذاہب کے لوگوں کو آپ کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا پھر فرمایا وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۲، ملک، ۳ و ۴) یہ مدنی آیات ہیں اور منافقوں کے متعلق قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور منافق اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک طرف جماعت کے غلبہ کے آثار ہوں اور دوسری طرف دشمن بھی ابھی طاقتور ہو۔ اس حالت کے نتیجہ میں جو پیدائش ہوتی ہے اُس کا منافق نام ہوتا ہے جس طرح ہر زمین کی پیداوار الگ الگ ہوتی ہے اسی طرح دینی منافقت کی پیداوار اُس موسم میں ہوتی ہے جب دین دنیا کے ایک حصہ پر غالب آجاتا ہے مگر کفر ابھی پوری طرح مغلوب نہیں ہوتا۔ انہیں کفر کا بھی ڈر ہوتا ہے اور دین کا بھی ڈر ہوتا ہے . . . . . . اور چونکہ اُس وقت دو کشتیاں تیار ہوجاتی ہیں منافق چاہتا ہے کہ دونوں کشتیوں میں سوار ہوکر سفر کرتا چلا جائے نہ وہ پوری طرح دین کی طرف آتا ہے اور نہ وہ پوری طرح کفر کی طرف جاتا ہے۔ یہ بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرے کیونکہ ڈرتا ہے کہ وہ جیت نہ جائیں اور یہ بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ کفار کا مقابلہ کرے کیونکہ اُن کے متعلق بھی اُسے خوف ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو وہ جیت جائیں۔ پس فرماتا ہے ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب تیری جماعت ترقی کرتے کرتے کفار کے مقابلہ میں ایک ترازو پر آجائے گی جیسے اس وقت قادیان میں حالت ہے اُس وقت تیری جماعت میں منافقوں کا ایک گروہ پیدا ہوجائے گا جو اِدھر تجھ سے تعلق رکھے گا اور اُدھر کفار سے تعلق رکھیگا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں نفاق کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ قادیان میں وہی شخص آتا تھا جو لوگوں سے ماریں کھانے کے لئے تیار ہوتا تھا مگر اب چونکہ جماعت ترقی کرکے دشمن کے مقابلہ میں ترازو کے تول کی مانند کھڑی ہوگئی ہے اس لئے منافقین کا بھی ایک عنصر پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب احرار نے شورش برپا کی اور گورنمنٹ کے بعض افسروں نے بھی اُن کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کردی تو اُس وقت ہماری جماعت میں سے بعض منافق احرار سے جاکر ملتے تھے اور ہمیں اُن کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اور ابھی تو یہ پیشگوئی صرف قادیان میں پوری ہوئی ہے جب بیرونی مقامات پر بھی جماعت نے ترقی کی اور کفر کے مقابلہ میں اُس نے طاقت پکڑنی شروع کردی تو اُس وقت وہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہوجائیں گے۔ پھر اَور ترقی ہوگی تو بیرونی ممالک میں اس پیشگوئی کا ظہور شروع ہوجائے گا۔ کبھی یورپ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی، کبھی امریکہ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی، کبھی چین اور جاپان میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی اور کبھی مصر اور شام اور فلسطین وغیرہ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی۔ غرض ۱۸۸۳ء میں جب نہ لوگوں کی مخالفت کا کوئی خیال تھا نہ یہ خیال تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ کسی دن دنیا میں ایک بہت بڑی جماعت قائم ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ تیرے ذریعہ جماعت قائم ہوگی، وہ جماعت ترقی کرے گی اور جب وہ کفار کے مقابل میں ایک ترازو کے تول پر آجائے گی تو اُس وقت بعض منافق پیدا ہوجائیں گے حالانکہ یہ باتیں اُس وقت کسی کے وہم اور گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔

پھر فرماتا ہے تَلَطَّفْ بِالنَّاسِ وَتَرَحَّمْ عَلَیْھِمْ اَنْتَ فِیْھِمْ بِمَنْزِلَۃِ مُوْسٰی وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۲، ملک ۳) تو لوگوں کے ساتھ رفق اور نرمی سے پیش آ اور تو اُن پر رحم کر۔ تو اُن میں ایسا ہی ہے جیسے موسیٰؑ اپنی قوم میں تھا اور جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اُس پر صبر کر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جو حالات موسیٰ کے ساتھ پیش آئے تھے وہی تیرے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔ تیری مخالفت میں بھی لوگوں کی طرف سے بہت کچھ کہا جائے گا تیرا فرض ہے کہ تو صبر سے کام لے اب سوال یہ ہے کہ اگر الہامات واقعہ کے بعد

بنا لئے جاتے ہیں تو براہین احمدیہ میں یہ بات کس طرح چھپ گئی۔

پھر الہام ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۲۹ : ۳) کیا تیرے ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض اتنی بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور وہ آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے۔ اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔ اُن پر بڑے بڑے مظالم کئے جائیں گے، بڑے بڑے مصائب اُن کو برداشت کرنے پڑیں گے اور جب وہ ان امتحانات میں پورے اُتریں گے تب اُنہیں خدا تعالیٰ کے حضور مومن سمجھا جائے گا۔

یہ تمام الہامات جن کو اُوپر پیش کیا گیا ہے ان میں سے کوئی ایک الہام بھی ایسا نہیں جو ۱۹۰۸ء کے واقعات پر چسپاں ہو سکتا ہو بلکہ یہ تمام الہامات وہ ہیں جن میں آئندہ رُونما ہونے والے واقعات کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی الہامات ہیں جو آئندہ واقعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۹۰۳ء میں رویاء میں دیکھا کہ

"زارِ روس کا سونٹا میرے ہاتھ میں ہے" (تذکرہ ص۴۶۳)

اب اگر یورپین مستشرقین کی یہ بات صحیح ہے کہ الہامات ہمیشہ واقعات کے بعد گھڑ لئے جاتے ہیں تو اس الہام کی بناء کن واقعات پر ہے؟ ۱۹۰۳ء میں کونسے ایسے حالات تھے جن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ روس کی حکومت ہمارے قبضہ میں آجائے گی۔ اُس وقت تو ظاہری حالات کی بناء پر یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ گورداسپور کے ضلع میں ہمیں غلبہ حاصل ہو جائیگا کُجا یہ کہ روس کی حکومت ملنے کا دعویٰ کیا جاتا۔ اور یہ وہ پیشگوئی ہے کہ اب تک بھی اس کا خفیف سے خفیف اثر نہیں ظاہر ہُوا لیکن جب یہ پوری ہوگی دشمن ہزاروں بہانے یہ ثابت کرنے کے لئے بنائے گا کہ یہ بعد میں بنائی گئی

غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب براہین احمدیہ ان تمام اعتراضات کا جواب ہے جو مستشرقین یورپ قرآن کریم کے متعلق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ آیات جن میں پیشگوئیوں کا ذکر پایا جاتا ہے اُس زمانہ کی ہیں جب وہ واقعات دنیا میں ظاہر ہو چکے تھے۔ ہم کہتے ہیں اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے تو تم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ثابت کرو کہ آپ نے جو پیشگوئیاں کی ہیں وہ واقعات کے ظہور کے بعد کی ہیں اور اگر تم یہ ثابت نہیں کر سکتے تو تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ اگر ایک شخص جو اپنے آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام کہتا ہے اللہ تعالیٰ سے الہام پا کر قبل از وقت غیب کی خبروں سے دنیا کو اطلاع دے سکتا ہے تو اُس کا آقا کیوں ایسی خبریں نہیں دے سکتا تھا۔ اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات میں دنیا کی تمام مخالفتوں، منصوبوں اور شرارتوں کا ایسی حالت میں ذکر کر دیا گیا ہے جب سب دنیا آپ کی تائید میں تھی تو قرآن کریم میں کیوں ایسے مضامین قبل از وقت نہیں آ سکتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود سے ان تمام حملوں کا ایسا جواب دے دیا ہے کہ اب دشمن کو منہ کھولنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بدء وحی اور پہلے انبیاء کی بدء وحی میں کیا فرق ہے۔ مستشرقین یورپ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابتدائی وحی پر تو اعتراض کر دیا مگر انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جن انبیاء کو وہ خود تسلیم کرتے ہیں اُن کی کیفیت وحی الٰہی کے نزول کے وقت کیا ہوئی۔ بنی اسرائیل میں سب سے بڑے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوئے ہیں اُن کے متعلق بائبل میں لکھا ہے کہ وہ اپنے خُسر یترو کے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے کہ انہوں نے حورب پہاڑ پر ایک درخت آگ میں روشن دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حیران ہوئے کہ یہ عجیب بات ہے کہ درخت کے اردگرد آگ بھی ہے اور وہ جلتا بھی نہیں۔ چنانچہ وہ اس نظارہ کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھے تب:-

خدا نے اسی بُوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ

اے موسیٰ اے موسیٰ! وہ بولا میں یہاں ہوں۔
تب اُس نے کہا یہاں نزدیک مت آ۔ اپنے پاؤں
سے جوتا اُتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تُو کھڑا ہے مقدس
زمین ہے۔ پھر اُس نے کہا میں تیرے باپ کا خدا
اور ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا
خدا ہوں۔ موسیٰ نے اپنا مُنہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر
نظر ڈالنے سے ڈرتا تھا۔" (خروج باب ۳ آیت ۴ تا ۶)

اب دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بدءِ وحی میں کتنا بڑا فرق ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جب انہوں نے خدا تعالےٰ کو دیکھا تو دَنَا فَتَدَلّٰی (النجم ع۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف دوڑے اور خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑا اور یہی عشق کامل کی علامت ہوتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

بعدقت کے گلے ملتے ہوئے آتی ہے شرم
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تُو بڑھے

محبتِ صادق میں یہی ہوتا ہے کہ کچھ وہ بڑھتا ہے اور کچھ یہ بڑھتا ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے کہ جب انہیں اللہ تعالےٰ کی رؤیت ہوئی تو آپ اللہ تعالےٰ کی طرف دوڑے اور اللہ تعالےٰ آپ کی طرف دوڑا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا واقعہ ہوا جب انہوں نے اللہ تعالےٰ کو دیکھا تو خدا تعالےٰ نے اُن سے کہا

"یہاں نزدیک مت آ"

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ موسیٰ کی تجلّی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلّی میں کتنا بڑا فرق تھا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو اللہ تعالےٰ نے یہ بتایا ہے کہ وہ میری طرف بڑھے اور میں اُن کی طرف بڑھا تاکہ ہم دونوں آپس میں جلدی مل جائیں مگر موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا۔

"یہاں نزدیک مت آ"

اور پھر ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا کہ

"اپنے پاؤں سے جوتا اُتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تُو کھڑا
ہے مقدس زمین ہے۔"

مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جوتا اُتارنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے راجاؤں سے کوئی بڑا آدمی ملنے کے لئے جاتا ہے تو وہ جوتا پہنے رہتا ہے لیکن اگر کوئی زمیندار اُن سے ملنے کیلئے جائے تو اُسے دروازہ میں ہی جوتا اُتار دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ چونکہ موسیٰ کا مقام وہ نہیں تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تھا۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں کہا گیا کہ تو اپنا جوتا اُتار۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کو جیسے معمولی زمینداروں کو ڈانٹ کر جوتا اُتارنے کا حکم دیا جاتا ہے اللہ تعالےٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ

"اپنے پاؤں سے جوتا اُتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا
ہے مقدس زمین ہے۔"

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اُس وقت جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے کہ

"میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور
اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔"

اس میں کونسا معرفت کا نکتہ بیان ہے یا کونسا کمال ہے جو اس کلام میں پایا جاتا ہے؟ ایک موٹی بات ہے جو ہر شخص جانتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہا گیا اُس کے متعلق آگے چل کر بتلایا جائے گا کہ وہ کلام اپنے اندر کس قدر خوبیاں رکھتا تھا۔

پھر دہریہ اور اُس کے ساتھی یہ تو اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو وہ ڈر گئے اور اُن کے کندھے کانپنے لگ گئے۔ مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہاں صاف لکھا ہے کہ

"موسیٰ نے اپنا مُنہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر ڈالنے سے
ڈرتا تھا۔"

اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر آپ کے ڈرنے کی وجہ سے اعتراض

کیا جا سکتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے بلکہ موسیٰ علیہ السلام پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ زیادہ سخت ہے کیونکہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ڈر کر اپنا مُنہ چھپا لیا۔ لیکن رسول کریم کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ کے کندھے کانپنے لگ گئے اور یہ امر ظاہر ہے کہ بڑا آدمی اگر کسی بات سے گھبراتا ہے تو اس کے کندھے کانپنے لگ جاتے ہیں لیکن بچے جب کسی بات سے ڈرتے ہیں تو اپنا مُنہ چھپا لیتے ہیں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی بڑا آدمی ڈرے تو وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لے لیکن بچوں کو تم روزانہ دیکھو گے کہ جب وہ ڈرتے ہیں فوراً اپنا مُنہ چھپا لیتے ہیں۔ یہی بچوں والی حرکت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی کہ خدا تعالیٰ کو دیکھا تو ڈر کر اپنا مُنہ چھپا لیا۔ یا کبوتر والی حرکت کی جو بلّی سے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ روحانی لحاظ سے ایک جوان اور مضبوط آدمی کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے آپ نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں صرف گھبراہٹ سے آپ کے کندھے ہلنے شروع ہو گئے پس جو اعتراض مستشرقین یورپ کی طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا ہے۔ وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اور وارد بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک شکل میں ہوتا ہے۔

پھر لکھا ہے :-

"موسیٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں"

(خروج باب ۳ آیت ۱۱)

عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی وحی پر شک کیا اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کیا حال تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیتا ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں۔ اُس کی نصرت اور تائید پر بھروسہ رکھیں اور سمجھیں کہ جب اللہ تعالیٰ مجھے اس کام کے لئے بھیج رہا ہے تو وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا اس قدر شک کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ میری حیثیت ہی کیا ہے کہ میں فرعون کے پاس جاؤں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور فرعون بڑا بادشاہ ہے میں تو اُس کے پاس نہیں جا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حکم کا اس قدر انکار کرنے کے باوجود بھی پادریوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے مقرب ہی رہتے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ۔ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے تو عیسائی یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی الٰہی پر یقین نہیں تھا۔

پھر لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ جا اور اپنی قوم کو مصر سے نکال کر اس پہاڑ پر عبادت کرنے کے لئے لا مگر موسیٰ نے اس کا بھی انکار کیا چنانچہ لکھا ہے

"تب موسیٰ نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھ وے مجھ پر ایمان نہ لائیں گے نہ میری بات سنیں گے وہ کہیں گے کہ خداوند تجھے دکھائی نہیں دیا" (خروج باب ۴ آیت ۱)

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا واقعہ جو بالکل عقل کے مطابق ہے اُس کے متعلق تو عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شک کا اظہار کیا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کے متعلق نہیں دیکھتے کہ انہوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ اپنی قوم کو یہاں عبادت کرنے کے لئے لا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اس حکم کی فوری طور پر تعمیل کرتے اللہ تعالیٰ سے یہ کہنے لگ گئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائیں گے نہ میری بات سنیں گے وہ کہیں گے کہ خداوند تجھے دکھائی نہیں دیا اس لئے میں اُنکے پاس کس طرح جا سکتا ہوں۔

"تب خدا نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے وہ بولا عصا۔ پھر اُس نے کہا اسے زمین پر پھینک دے۔ اُس نے زمین پر پھینک دیا اور وہ سانپ بن گیا اور موسیٰ اس کے آگے سے بھاگا"

(خروج باب ۴ آیت ۲ و ۳)

کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو

دیکھا تو ڈر کر بھاگنے لگ گئے حالانکہ سانپ کو ہر شخص مار سکتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ کوئی سمجھدار طاقتور انسان سانپ دیکھے تو ڈر کر بھاگنا شروع کردے وہ فوراً لاٹھی اٹھاتا اور اُسے مار ڈالتا ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو دیکھا تو ڈر کر بھاگنا شروع کردیا۔ عیسائی اس واقعہ کو پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود اُن کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں کوئی نقص واقعہ نہیں ہوتا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھاگتے نہیں وحی الٰہی کے نازل ہونے پر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ نہ معلوم میں اس اہم ذمہ داری کو ادا کرسکوں گا یا نہیں تو عیسائی کہتے ہیں آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شک اور تردد کا اظہار کردیا پھر لکھا ہے :-

"تب موسیٰ نے خداوند سے کہا کہ اے میرے خداوند میں فصاحت نہیں رکھتا نہ تو آگے سے اور نہ جب کہ تُو نے اپنے بندے سے کلام کیا او میری زبان اور باتوں میں لُکنت ہے۔" (خروج باب ۴ آیت ۱۰)

دیکھو کتنا بڑا نشان تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ اُن کا عصا سانپ بن گیا اور جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سانپ کو پکڑا تو وہ پھر عصا بن گیا۔ اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی اڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں میری زبان میں فصاحت نہیں۔ نہ پہلے فصاحت تھی اور نہ اب تجھے دیکھنے کے بعد میری زبان میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے یعنی پہلے تو میں بے شک ایک معمولی آدمی تھا مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیرے جلال کو دیکھنے کے بعد بھی میری زبان ویسی کی ویسی ہے جس طرح پہلے میری زبان میں لُکنت تھی اسی طرح اب ہے جس طرح پہلے غیر فصیح تھا اُسی طرح اب غیر فصیح ہوں۔

"تب خدا نے اُسے کہا کہ آدمی کو زبان کس نے دی اور کون گونگا یا بہرا یا بینا یا اندھا کرتا ہے کیا میں نہیں کرتا جو خداوند ہوں پس اب تُو جا اور میں تیری بات کے ساتھ ہوں اور تجھ کو سکھاؤں گا جو کچھ تُو کہے گو۔" (خروج باب ۴ آیت ۱۱ و ۱۲)

اس حکم اور نصیحت کو سُن کر بھی موسیٰ علیہ السلام کے طریق میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی چنانچہ آگے لکھا ہے :-

"تب اُس نے کہا کہ اے میرے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں جس کو چاہے تُو اس کے وسیلہ سے بھیج۔" (خروج باب ۴۔ آیت ۱۳)

یعنی میں جانے کے لئے تیار نہیں میری جگہ کسی اور کو بھیج دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے حکم کا بار بار انکار کیا پھر بھی مسیحی علماء کے نزدیک اُن کے عظیم الشان نبی ہونے میں کوئی شک پیدا نہیں ہوا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صرف اتنا کہنے پر کہ نہ معلوم میں اس ذمہ داری کو ادا کرسکوں گا یا نہیں انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایمان میں یا عقل میں شبہ نظر آنے لگا حالانکہ موسیٰ کا واقعہ اُن کی الہامی کتاب میں مذکور ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فقرہ قرآن کریم میں نہیں بلکہ صرف حدیث میں بیان ہے جو کلام اللہ کے برابر شہادت نہیں ہوسکتا۔

تورات میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار خدا تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کیا۔

"تب خداوند کا غصہ موسیٰ پر بھڑکا۔" (خروج باب ۴ آیت ۱۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر کہ وہ انکار پر اصرار ہی کئے جاتے ہیں انہیں ڈانٹا۔ پھر لکھا ہے۔

"کیا نہیں ہے لاویوں میں سے ہارون تیرا بھائی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ فصیح ہے اور دیکھ کہ وہ بھی تیری ملاقات کو آتا ہے اور تجھے دیکھ کے دل میں خوش ہوگا اور تُو اُسے کہیگا اور اُسے باتیں بتائیگا اور میں تیری اور اُس کی بات کے ساتھ ہونگا اور تم جو کچھ کرو گے تم کو بتلاؤنگا۔" (خروج باب ۴ آیت ۱۴ و ۱۵)

غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بدء وحی پر عیسائیوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام اعتراضات اُس وحی پر بھی واقعہ ہوتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ ہم تو عیسائیوں کے اعتراضات کو

درست تسلیم نہیں کرتے اور اُن کے جوابات بھی اوپر درج کئے جا چکے ہیں لیکن پھر بھی الزامی رنگ میں ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں اگر تمہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اعتراض ہو کہ وحی کے متعلق آپؐ نے تردد کا اظہار فرمایا تو یہ اعتراض بدرجۂ اتم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اور وارد بھی ایسی صورت میں ہوتا ہے کہ اسکی کوئی تاویل نہیں کیجا سکتی۔

بدء
حضرت عیسیٰؑ کی بدء الوحی کا مقابلہ آنحضرت صلعم کی بدء [illegible] سے

اس کے بعد ہم حضرت مسیح علیہ السلام کی بدء وحی کے واقعات کو دیکھتے ہیں۔ متی باب ۳ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام یوحنا کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ مجھے بپتسمہ دو۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا مگر آخر مان لیا اور حضرت مسیحؑ نے یوحنا سے بپتسمہ پایا۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا اس کے متعلق انجیل کہتی ہے :

"اور یسوع بپتسمہ پاکے وہیں پانی سے نکل کے اُوپر آیا اور دیکھو کہ اُس کے لئے آسمان کھل گیا اور اُس نے خدا کی رُوح کو کبوتر کی مانند اُترتے دیکھا۔ اور دیکھو کہ آسمان سے ایک آواز یہ کہتی آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں" (متی باب ۳ آیت ۱۶ و ۱۷)

اس نظارہ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بدء وحی کے مقابلہ میں رکھو اور پھر سوچو کہ کیا ان دونوں واقعات میں کوئی بھی نسبت ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام فرشتہ کے ذریعہ بھیجا اور مسیحؑ پر ایک کبوتر کی شکل میں روح القدس نازل ہُوا۔ کبوتر سے انہوں نے کیا ڈرنا تھا کبوتر تو وہ جانور ہے جس کی ہڈیاں بھی انسان چبا جاتا ہے یہی عیسوی اور محمدی تجلّی کا فرق ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآنی تعلیم کو شرک سے محفوظ رکھا لیکن عیسائیت پر شیطان غالب آ گیا کیونکہ عیسائی مذہب کے پیشوا پر روح القدس ایک نہایت ہی کمزور شکل میں نازل ہُوا تھا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر جو روح القدس کی تجلّی ہوئی تھی وہ ہر ایک تجلّی سے بڑھ کر ہے روح القدس کبھی کسی نبی پر کبوتر کی شکل پر ظاہر ہُوا اور کبھی کسی نبی یا اوتار پر گائے کی شکل پر ظاہر ہُوا اور کسی پر کچھوا یا مچھ کی شکل پر ظاہر ہُوا اور انسان کی شکل کا وقت نہ آیا جب تک انسان کامل یعنی ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہُوا جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مبعوث ہو گئے تو روح القدس بھی آپ پر بوجہ آپ کے کامل انسان ہونے کے انسان کی شکل پر ہی ظاہر ہُوا اور چونکہ روح القدس کی قوی تجلّی تھی جس نے زمین سے لے کر آسمان کا افق بھر دیا اس لئے قرآنی تعلیم شرک سے محفوظ رہی۔ لیکن چونکہ عیسائی مذہب کے پیشوا پر روح القدس نہایت کمزور شکل میں ظاہر ہُوا یعنی کبوتر کی شکل پر۔ اس لئے ناپاک روح یعنی شیطان اس مذہب پر فتحیاب ہو گیا" (کشتی نوح)

اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ جن کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجتا ہے وہ اُس کے رسول کہلاتے ہیں اور رسول دنیا میں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا کام صرف خط دیدینا ہوتا ہے اس سے زیادہ ان کا کام کچھ نہیں ہوتا۔ اور ایک وہ جن کا کام ان احکام کو نافذ کرنا بھی ہوتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام پر تجلّی الٰہی کا کبوتر کی صورت میں نازل ہونا بتاتا ہے کہ مسیحؑ کی حیثیت صرف اس پیغامبر کی تھی جو پیغام سُنا دیتا ہے اور اس کا کام ختم ہو جاتا ہے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر تجلّی الٰہی کا نزول ایک مرد کامل کی شکل میں ظاہر ہُوا جس سے اس طرف اشارہ تھا کہ آپ صرف پیغامبر نہ ہوں گے بلکہ ایک کامل نمونہ بھی اپنے مخاطبین کے لئے ہوں گے۔

انجیل میں یہ بھی بتایا گیا ہے :-

"تب یسوع روح کے وسیلے بیابان میں لایا گیا تاکہ شیطان اُسے آزمائے اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہُوا تب آزمائش کرنے والے نے اس پاس آکے کہا اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ یہ پتھر

روٹی بن جائیں اُس نے جواب میں کہا لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی ہے جیتا ہے۔ تب شیطان اُسے مقدس شہر میں لے گیا اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کر کے اُس سے کہا کہ اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو فرمائیگا اور وے تجھے ہاتھوں پر اٹھا لینگے ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے۔ یسوع نے اُس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو مت آزما۔ پھر شیطان اُسے ایک بڑے اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اور اُن کی شان و شوکت اُسے دکھائیں اور اُس سے کہا اگر تُو گر کے مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دوں گا۔ تب یسوع نے اُسے کہا اے شیطان دُور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُس اکیلے کی بندگی کر۔" (متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۰)

دیکھو عیسائیوں کو تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض تھا کہ آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شبہ کا اظہار کیا مگر یہاں یہ لکھا ہے کہ شیطان حضرت مسیحؑ کو اپنے ساتھ لئے پھرا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ واقعہ میں ایسا ہُوا ہے ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالےٰ پر کامل یقین تھا تو انجیل کے بیان کے مطابق وہ شیطان کے پیچھے پیچھے کیوں بھاگے پھرتے تھے اور کیا وجہ ہے کہ جس طرف شیطان اُن کی انگلی پکڑ کر لیجاتا اُسی طرف وہ نہایت اطمینان کے ساتھ چلنا شروع کر دیتے؟ بیت المقدس میں لے جاتا ہے تو وہاں چلے جاتے ہیں۔ ہیکل کے کنگورے پہ کھڑا کرتا ہے تو وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں گویا جس طرح کوئی بے بس ہوتا ہے۔ شیطان کی ہر بات مانتے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال عیسائیوں کو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی۔ یا تو اُن کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک ظاہری واقعہ ہے اور یا اُن کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ خواب ہے۔ اگر اسے ظاہری واقعہ تسلیم کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان حضرت مسیحؑ کے پاس آیا کیوں؟ کیا وہ خدا تعالےٰ کے بیٹے کو دھوکا دے سکتا تھا؟ اگر نہیں تو اُس کا ظاہری صورت میں حضرت مسیحؑ کے پاس آنا بالکل بے معنی بات تھی جس کی کوئی بھی توجیہ نہیں ہوسکتی ہاں اگر اس واقعہ کو حضرت مسیحؑ کی خواب قرار دے دیا جائے تو ایسا ہوسکتا ہے مگر اس صورت میں بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے دل میں یہ خیالات آنے شروع ہو گئے تھے کہ کیا مجھے شیطان کی طرف سے تو الہام نہیں ہُوا۔ حضرت مسیحؑ کا رویا کی حالت میں شیطان کے پیچھے چلنا اور اُسے نہ دُھتکارنا اُن کے قلب کی اس حالت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اُس کے شیطان ہونے پر یقین نہ رکھتے تھے اور اس وقت تک شیطانی اور رحمانی رویاء میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

غرض انجیل کی آیات سے یہ امر ظاہر ہے کہ یسوع کو ایک کبوتری کے نظارہ میں پہلا جلوہ ہُوا جبکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک کامل القویٰ انسان کی شکل میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ کی صورت میں۔ پھر موسیٰ کا شک اور خوف بھی ثابت ہے اور مسیحؑ کا بھی۔ کیونکہ شیطان کا ملنا اور مسیحؑ کا اُس کے پیچھے جانا تردد اور شک پر ہی دلالت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُن کے دل میں اُس وقت تک الٰہی کلام پر وہ یقین اور وثوق پیدا نہیں ہُوا تھا جو بعد میں جا کر پیدا ہُوا۔

پھر سوال یہ ہے کہ جب کبوتر کی شکل میں روح القدس نازل ہُوا تو اس کا نتیجہ کیا ہُوا؟ انجیل میں صرف اتنا لکھا ہے

"آسمان سے ایک آواز یہ کہتی آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے مَیں خوش ہوں"

ان الفاظ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو کونسا نیا علم بخشا گیا ہے یا کونسا معرفت کا نیا نکتہ تھا جو آپ پر نازل کیا گیا۔ محض کسی آواز کا آجانا تو کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ آواز تو ایک غل کو بھی آجاتی ہے یا جب موسیٰؑ کو اللہ تعالےٰ نے یہ کہا کہ "میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اسحاق کا خدا اور

یعقوب کا خدا ہوں" تو موسیٰ کو اس سے کیا لطف آیا ہوگا یا کونسا عرفان ان کو حاصل ہوا ہوگا۔ کیا اس کلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ سکتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی بات بتائی گئی ہے جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی یا عرفان کا ایک نیا باب میرے لئے کھول دیا گیا ہے یقیناً وہ ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ پر اگر ایک کبوتری کی شکل میں روح القدس نازل ہوگیا اور آسمانی سے یہ آواز آگئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے تو کیا ہوگیا۔ یہ محض ایک بیان ہے اس سے زیادہ ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ ان میں عرفان کی کوئی بات ہے نہ علم و حکمت کا کوئی نکتہ ہے۔ نہ تعلق باللہ کا کوئی راز ان میں منکشف کیا گیا ہے اور نہ کوئی اور ایسی بات بیان کی گئی ہے جو علم اور معرفت کی زیادتی کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ پھر یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کبوتر کی شکل میں روح القدس کے نازل ہونے کا جو نظارہ دیکھا اس کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی حقیقی نظارہ نہیں تھا بلکہ دماغ کی خرابی کا ایک کرشمہ تھا کیونکہ جن لوگوں کو وہم ہو جاتا ہے وہ بعض دفعہ معمولی معمولی باتوں سے ایسے نتائج اخذ کر لیتے ہیں جو کسی اور انسان کے ذہن میں بھی نہیں آتے۔ مولوی یار محمد صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی تھے ان کے دماغ میں نقص تھا بعض دفعہ باتیں کرتے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے تو مولوی یار محمد صاحب جھٹ کود کر آگے آجاتے اور سمجھتے کہ یہ اشارہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے میرے لئے کیا تھا۔ اسی طرح جن میں وہم کا مرض پیدا ہو جاتا ہے وہ بعض دفعہ پرندوں کی پرواز سے فال لینا شروع کر دیتے ہیں۔ دائیں طرف سے کوئی پرندہ گذر جائے تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں کام میں کامیابی ہو جائے گی اور اگر بائیں طرف سے گذر جائے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں نحوست کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی رنگ میں ہو سکتا ہے کہ جب یوحنا سے بپتسمہ پانے کے بعد حضرت مسیحؑ پانی سے باہر آئے ہوں تو کوئی کبوتر اڑ کر ان کے پاس آ بیٹھا ہو اور انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ یہ آسمان سے میرے پاس آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بدء وحی کا واقعہ بے شک ایک حقیقی نظارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ سے ہمکلام ہوا۔ مگر اس کلام میں کوئی ایسی بات نہیں جس میں علم و عرفان کا کوئی خاص راز منکشف کیا گیا ہو یا کوئی ایسی بات بتائی گئی ہو جو دنیا کے لئے ایک نرالے پیغام کی حیثیت رکھتی ہو۔ صرف موسیٰؑ کو یہ کہا گیا کہ تو فرعون کے پاس جا اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نکال۔ یہ محض ایک دنیوی بات ہے زیادہ سے زیادہ اسے سیاسی لحاظ سے اہمیت دی جا سکتی ہے مگر مذہبی اور روحانی نقطۂ نگاہ سے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو دنیا کے لئے جدید پیغام ہو یا اس پر کوئی نئی حقیقت روشن کرنے والا ہو۔ بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور سابق انبیاء کی بدء وحی کے واقعات کا جب آپس میں مقابلہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی باقی تمام انبیاء کی وحیوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی محبت اور پیار کا سلوک آپ سے کیا ہے اس قسم کی محبت اور پیار کا سلوک اس نے اور کسی نبی سے نہیں کیا۔

سورۃ علق کا پہلی سورتوں سے تعلق

ترتیب یہ سورۃ بھی پہلی سورۃ کے مضمون کے مطابق ہے یعنی وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ میں جو مضمون تھا اسی کو ایک نئے پیرایہ میں اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کا ایک تسلسل بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ تسلسل ابتدائے عالم سے جاری ہے۔ پہلے آدمؑ کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا۔ پھر نوحؑ کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا۔ پھر موسیٰؑ کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا۔ اب قرآن کریم کے ذریعہ اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ یہی مضمون اس جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ یعنی انسانی پیدائش کو تم دیکھ لو جس طرح ایک فرد علقہ سے مضغہ بنتا اور مضغہ کے بعد درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے آخر جاندار بن کر رحم مادر سے باہر آتا ہے اسی طرح جماعتی طور پر انسان کی ترقی ہوئی ہے۔ پہلے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ

اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے (سب اشیاء کو) پیدا کیا [۲]

روحانی لحاظ سے انسان علقہ کی طرح تھا پھر ترقی کر کے مضغہ بنا پھر اُس نے اَور ترقی کی، پھر اَور ترقی کی یہاں تک کہ وہ انسانِ کامل کے مقام تک آ پہنچا اور یہ پیدائش محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ہوئی ہے پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ میں اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جو وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ میں بیان کیا گیا تھا اور بتایا گیا ہے کہ ابتدائے عالم سے یہ سکیم ہمارے مدنظر تھی اور ہم چاہتے تھے کہ روحانی لحاظ سے انسان کو درجہ بدرجہ ترقی دیتے دیتے آخر دنیا میں ایک انسانِ کامل پیدا کریں۔ جب یہ سکیم ابتدائے عالم سے ہمارے مدنظر تھی تو ضروری تھا کہ انسان کو اُس کا مقصود حاصل ہوتا۔ ورنہ خلقِ انسانی عبث ٹھہرتی ہے اور اللہ تعالےٰ زیر الزام آتا ہے کہ جس سکیم کے ماتحت بنی نوع انسان کی پیدائش کی گئی تھی وہ نعوذ باللہ کامیاب نہ ہوئی۔ پس یہ سورت گذشتہ سورت کے مضمون کے تسلسل میں ہے اور اُسی مضمون کو ایک نئے انداز میں اس جگہ بیان کیا گیا ہے۔

اس جگہ شائد کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب سورۂ علق ابتدائی سورۃ ہے تو سورۂ تین سے اس کا تعلق ثابت کرنا کیا معنے؟ تین بعد میں نازل ہوئی اور علق پہلے۔ سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی دو ترتیبیں ہیں ایک نزول کے لحاظ سے۔ سو اس لحاظ سے تین بعد میں ہے اور علق پہلے۔ لیکن اسکی جو ترتیب تمام زمانوں کو مدنظر رکھ کر ہے اسی کے مطابق قرآن کریم میں سورتیں رکھی گئی ہیں۔ لہٰذا اسی کے لحاظ سے بعض بعد میں نازل ہونے والی سورتیں پہلے آگئی ہیں۔ اور پہلے نازل ہونے والی بعد میں آگئی ہیں۔

اب میں قرآنی آیات کی تشریح کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام ملا وہ اپنے اندر کس قدر علوم رکھتا تھا اور کتنے عظیم الشان معارف تھے جو اُس میں اللہ تعالےٰ نے بیان فرمائے۔

اِقْرَأْ

[۲] تفسیر۔ اِقْرَاْ وہ پہلا لفظ ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا اور جس میں اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی بعض عظیم الشان پیشگوئیوں کا اعلان کر دیا گیا۔ اِقْرَاْ کے اصل معنے گو کسی لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کے ہیں مگر اس کے ایک معنی اعلان کرنے کے بھی ہیں اور یہ دونوں معنے ایسے ہیں جو اس مقام پر نہایت عمدگی کے ساتھ چسپاں ہوتے ہیں۔ اگر اِقْرَاْ کے معنے اعلان کرنے کے لئے جائیں تو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کے یہ معنے ہونگے کہ تو اس کتاب کا اعلان اپنے اُس رب کے نام کے ساتھ کر جس نے تجھے پیدا کیا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس میں پہلے دن ہی یہ خبر دے دی گئی ہے کہ یہ کلام محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی ساری قوموں اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ہے۔

اِقْرَأْ کے معنے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلا الہام

دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پہلے دن جو الہام ہوا وہ صرف اس قدر تھا کہ

”میں تجھے فرعون پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال“ (خروج باب ۳ آیت ۱۰)

حالانکہ انبیاء کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ قلوب کی صفائی کریں۔ شیطان کی غلامی سے لوگوں کو چھڑائیں اور تقویٰ اور پاکیزگی کی راہیں اُن پر روشن کریں۔ مگر وہاں ایسا کوئی پیغام نہیں دیا گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو پیغام ملا اُس میں بھی اس بنیادی چیز کا کوئی ذکر نہیں صرف اتنا بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کبوتری اُتری اور آسمان سے یہ آواز آئی کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر

پہلا فقرہ یہی نازل ہوتا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ - اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو دنیا کے سامنے اعلان کر اور اُسے بتا کہ اُسے اُس کا خالق رب اپنی طرف بلاتا ہے اس طرح پہلے لفظ کے ذریعہ ہی اس حقیقت کو روشن کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے - اسود اور احمر اس پیغام کے مخاطب ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرض ہے کہ وہ تمام لوگوں تک اس پیغام کو پہنچائیں اور وہ لوگ جو آستانۂ الٰہی سے بھٹک چکے ہیں اُن کو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف واپس لائیں۔

اِقْرَاْ میں پیشگوئی کہ قرآن مجید لکھا جائیگا

اِقْرَاْ کے دوسرے معنے کسی لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے ہوتے ہیں - اِن معنوں کے لحاظ سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو لکھی جائے گی اور پھر یہ لکھی ہوئی کتاب بار بار پڑھی جائے گی - چنانچہ اگر واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن دنیا میں وہ پہلی کتاب ہے جو ابتدائے نزول کے ساتھ ہی لکھی گئی ہے - اس کے علاوہ دنیا میں اور جس قدر الہامی کتابیں پائی جاتی ہیں اُن میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو نازل ہونے کے وقت ہی لکھوا لی گئی ہو - صرف قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس کے متعلق یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ اُسے لکھا جائے گا اور اس طرح شروع سے ہی اُس کی حفاظت کا سامان کیا جائے گا اور وہ پیشگوئی حرف بحرف پوری بھی ہو گئی - چنانچہ نولڈکے - وہیری اور میور تک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سوائے قرآن کریم کے اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو ابتدائے ایام میں لکھی گئی ہو - انجیلیں بے شک آج دنیا میں موجود ہیں مگر کوئی عیسائی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتابیں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں لکھی گئی ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ متی - مرقس - لوقا اور یوحنا نے حضرت مسیح کی وفات کے ایک لمبے عرصہ بعد ان باتوں کو جمع کیا چنانچہ "لوقا" خود اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ اُن کاموں کا جو فی الواقع ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کی خدمت کرنے والے تھے ہم سے روایت کی - میں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کر کے تیرے لئے اے بزرگ تھیوفلس بترتیب لکھوں تاکہ تو اُن باتوں کی حقیقت کو جن کی تو نے تعلیم پائی جانے" (لوقا باب آیت ۱ تا ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اناجیل حواریوں نے نہیں بلکہ اُن سے ملنے والوں اور شاید ملنے والوں کے ملنے والوں نے لکھی ہیں۔

غرض دنیا میں سوائے قرآن کریم کے اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو شروع سے ہی لکھوائی گئی ہو اور جس کو بار بار پڑھنا لوگوں کا فرض قرار دیا گیا ہو - پس اِقْرَاْ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ یہ کتاب دنیا میں لکھی جائے گی اور لوگوں سے کہا جائیگا کہ اسے پڑھو اور بار بار پڑھو۔

پھر فرمایا بِاسْمِ رَبِّكَ - اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ یہاں رَبِّكَ کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک نئے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے - درحقیقت رب ایک ایسی ذات ہے جس کو مشرک بھی مانتے تھے اور یہودی اور عیسائی بھی اُس کے متعلق اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے مگر وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے تھے مثلاً مشرکین یہ تو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لاتے ہیں مگر وہ اس کے ساتھ ہی لات اور عزیٰ کی بھی پرستش کرتے تھے یا عیسائی یہ تو کہتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے - یہی حال یہود کا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر تو ایمان رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی اُن کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہود کے سوا اللہ تعالیٰ اور کسی پر الہام نازل نہیں کر سکتا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی فطرت ان تمام امور کا نہایت سختی کے ساتھ انکار کرتی تھی وہ یہودیت کے نظریہ کو بھی تسلیم نہ کرتی تھی عیسائیت کے فلسفہ کو بھی رد کرتی تھی اور مشرکین مکہ کے خیالات

کو بھی ناقابل قبول قرار دیتی تھی ۔ آپ غار حرا کی تاریکیوں میں جب اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اُس کو سوز اور گداز کے ساتھ پکارتے تو یہ تمام خیالات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے آپ دیکھتے کہ یہود گو اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہ کیسا گھناؤنا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اُس نے اپنی محبت یہود کے ساتھ وابستہ کر دی ہے ۔ دنیا کا اور کوئی انسان اُس کے کلام اور الہام کا مورد نہیں ہو سکتا ۔ آپ عیسائیت کی تعلیم پر غور کرتے اور سوچتے کہ بے شک عیسائیت بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی کو تسلیم کرتی ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر مقام اُلوہیت کی خطرناک توہین کر رہی ہے آپ مشرکین مکہ کے عقائد پر نگاہ دوڑاتے تو آپ کی فطرتِ صحیحہ اُن کے عقائد کو بھی باطل قرار دیتی اور کہتی کہ ایک خدا کو چھوڑ کر لات اور منات اور عزّیٰ کی پرستش کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتی غرض آپ یہودیوں کے عقیدہ کا بھی انکار کرتے تھے عیسائیت کے عقیدہ کا بھی انکار کرتے تھے اور مشرکین کے عقیدہ کا بھی انکار کرتے تھے یہودیت آپ کے سامنے پیش ہوتی تو آپ کی فطرت کہتی کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُس خدا کو مان لوں جو یہود کے سوا اور کسی کو اپنا پیارا بنانے کے لئے تیار نہیں عیسائیت آپ کے سامنے پیش ہوتی تو آپ کی فطرت اُس کا انکار کرتی اور کہتی وہ مذہب کس طرح سچا تسلیم کیا جا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بیٹے کا محتاج قرار دیتا ہے ۔ مشرکین مکہ کے خیالات آپ کے سامنے پیش ہوتے تو آپ کی فطرت اُنکو ناقابل تسلیم قرار دے دیتی اور کہتی کہ لات اور منات اور عزّیٰ کو قابلِ پرستش نہیں سمجھا جا سکتا غرض آپ کسی شرک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے آپ چاروں طرف سے ایسے لوگوں میں گھرے ہونے کے باوجود جو مشرکانہ خیالات میں ملوث تھے اپنی فطرتِ صحیحہ کی بناء پر اُس خدا کو مانتے تھے جو ایک ہے جو قادر اور قیّوم ہے ۔ جو اپنی صفات میں ازلی ابدی اور غیر متغیر ہے ۔ جو نہ کسی کا بیٹا ہے نہ کوئی اُس کا بیٹا ۔ جو خالق اکل ہے ۔ جو دکھ اٹھانے اور صلیب پر چڑھنے سے پاک ہے اور جو اپنے کلام کے لئے کسی خاص گروہ کو مخصوص نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر ایسے فرد کو اپنے قرب میں جگہ عطا کرتا ہے جو اُس کی محبت کا متلاشی ہوتا ہے ۔ پس فرمایا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ جا اور دنیا میں اپنے ربّ کے نام کا اعلان کر یعنی کفار کے ارباب نہیں بلکہ تیرا رب یعنی تو نے جس رب کو سمجھا ہے وہی سچا رب ہے اور اُسی کے نام سے برکات ملتی ہیں تو دنیا میں اُس کا بار بار اعلان کر اور لوگوں کو اُس رب کی طرف بُلا جس کو تو تسلیم کرتا ہے اِس طرح پہلے الہام میں ہی اللہ تعالیٰ نے شرک کا ردّ کر دیا اور بتا دیا کہ گو اور لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں مگر اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا عقیدہ ہر قسم کے مشرکانہ خیالات سے منزّہ ہو صرف وہ خدا جس کی حقیقت کو تو نے سمجھا ہے جس پر غار حرا کی دن رات کی عبادت میں تجھے یقین حاصل ہوا ہے وہی دنیا کا حقیقی رب ہے اور ہم تجھے اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ تو دنیا کے سامنے اپنے رب کا اعلان کر اور لوگوں کو بتا کہ جس طرح میں نے اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو سمجھا ہے مجھے میرے رب نے بتلایا ہے کہ وہی درست ہے باقی تمام اعتقادات باطل اور اُلوہیت کی شان سے بہت بعید ہیں غرض رَبِّكَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اعتقاد کی درستی کے متعلق الٰہی تصدیق کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسیحی جو یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ خدا کا بیٹا ہے بالکل غلط ہے تو نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کے متعلق سمجھا ہے وہ ٹھیک ہے اسی طرح مشرکین مکہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ لات اور منات اور عزّیٰ بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے صحیح عقیدہ وہی ہے جو تو نے سمجھا ہے یا مثلاً یہود جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف یہود سے کلام کرتا ہے اور کسی سے نہیں یہ بالکل غلط ہے تو جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بولتا ہے یہ بالکل صحیح اور درست عقیدہ ہے پس تو جا اور دنیا میں اپنے ربّ کا اعلان کر گویا تو غار حرا میں غور و فکر کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے ہم اُس کی تصدیق کرتے ہیں اور تجھے ہدایت دیتے ہیں کہ اب تو لوگوں میں کھڑا ہو اور انہیں اپنے رب کی طرف بُلا غرض اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ میں ایک طرف تو شرک کا ردّ

۱ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں شرک کا ردّ ۔

کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عقائد کی درستی کا اعلان کر دیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ صحیح عقائد اور صحیح خیالات وہی ہیں جو اَے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو ہمارے متعلق رکھتا ہے لوگوں کے خیالات درست نہیں ہیں۔

آیت اِقْرَاْ سے اس بات کی تردید کہ آنحضرت صلعم گمراہ نہیں تھے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ پہلے گمراہ تھے بعد میں اللہ تعالےٰ نے اُن کو ہدایت دی اِن معنوں کا غلط ہونا تو آیت مذکورہ کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے لیکن اس کی ایک تردید آیت اِقْرَاْ سے بھی نکلتی ہے اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گمراہ ہوتے تو خدا تعالےٰ کو پہلی وحی میں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ جو کچھ تو میرے متعلق سمجھ رہا تھا وہ غلط ہے اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ صحیح عقیدہ کونسا ہے مگر اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی خیال کی تردید نہیں فرمائی۔ آپ کے کسی عقیدہ کو باطل قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ جو کچھ تُو نے ہمارے متعلق سمجھا ہے وہ درست ہے اور جو کچھ لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط ہے پس اس آیت نے بھی بتا دیا کہ وَجَدَكَ ضَآلًّا کے وہ معنے بالکل غلط ہیں جو دشمنانِ اسلام کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں پس یہاں رَبِّكَ کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالےٰ نے دونوں باتیں بیان کر دیں۔ شرک کا بھی رد کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ جو اللہ تعالےٰ کی وحدانیت اور نزولِ الہام کے متعلق تھا وہی درست تھا تبھی فرمایا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ جا اور اپنے رب "کے نام کا دنیا میں اعلان کر۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اسم کے ساتھ باء ہونے کی وجہ۔

بعض لوگوں نے یہ اعتراض اُٹھایا ہے کہ اس جگہ اِقْرَاْ اِسْمَ رَبِّكَ کہنا چاہیئے تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کیوں کہا گیا ہے اس کا جواب نحوی یہ دیتے ہیں کہ باء یہاں زائدہ ہے یعنی تاکید کی باء ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان میں باء بعض دفعہ زائد بھی آجاتی ہے اور اگر ہم اس کو زائدہ قرار دیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ جب کسی فقرہ میں باء زائدہ آجاتی ہے تو اُس کے معنوں میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے اس لحاظ سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کے یہ معنے ہوں گے کہ تُو اپنے رب کا نام خوب اچھی طرح لے اور خوب اچھی طرح دنیا میں اِس کا اعلان کر۔ مگر میرے نزدیک یہاں باء زائدہ نہیں بلکہ استعانت کے لئے استعمال ہوئی ہے یعنی تو اپنے رب کے نام کی مدد کے ساتھ جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے ایسا کر۔

پولیس جب کسی کی خانہ تلاشی کے لئے آتی ہے تو کہتی ہے حاکم کے نام پر دروازہ کھولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ حاکمِ وقت نے ہم کو اتھارٹی AUTHORITY دی ہے جس کے ماتحت ہم یہ کام کر رہے ہیں۔ اگر تم ہمارے اِس کام میں روک بنوگے تو حکومت کے مجرم قرار پاؤگے۔ چنانچہ پولیس اگر کسی چوری کی تفتیش کے سلسلہ میں کسی کے مکان کی تلاشی لینا چاہے اور مالک مکان انکار کر دے تو اُس پر مقدمہ دائر ہو جاتا ہے کہ اس نے سرکاری افسروں کے کام میں رکاوٹ ڈالی اور حاکمِ وقت کی اتھارٹی کے باوجود اپنے گھر کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا جس طرح دنیا میں پولیس حاکمِ وقت کی طرف سے اختیارات حاصل کر کے کسی کے مکان پر جاتی ہے اسی طرح خدا فرماتا ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ تُو اپنے رب کے نام کے ساتھ دنیا میں کھڑا ہو اور اُن سے کہہ کہ مجھے اِن باتوں کے پہنچانے کا اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے اگر تم انکار کروگے تو تم میرا انکار نہیں کروگے بلکہ اُس خدا کا انکار کروگے جس نے مجھے بھیجا ہے اور جس کے نام کے ساتھ تمہارے سامنے میں اپنی رسالت کا اعلان کر رہا ہوں۔ گو رَبِّكَ کا لفظ استعمال کر کے جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عقائد کی صحت کا اعلان کیا گیا وہاں بِاسْمِ رَبِّكَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ رسول ہی کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے کھڑا کیا گیا ہے اور میں اُسی کے نام کے ساتھ اپنے دعاوی تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں

غرض پہلی وحی میں ہی باسم ربک کہہ کر ایک طرف تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عقائد کی درستی کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی اعلان کر دیا اور بتلا دیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ ہماری طرف سے کہتا ہے۔ اس تشریح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کے یہ معنے ہونگے کہ تو اپنے اُس رب کے نام کا جس کو صرف تو ہی اس زمانہ میں صحیح طور پر سمجھتا ہے دنیا میں اعلان کر اور لوگوں کو بتا کہ باقی تمام تشریحات رب کی اُس کے مقابل میں باطل ہیں۔ اسی طرح تو دنیا میں اُس تعلیم کا اعلان کر جو ہم تجھ پر نازل کر رہے ہیں کیونکہ یہ تعلیم صرف تیرے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ یہ تعلیم لکھی جائے گی، پڑھی جائے گی اور بار بار پڑھی جائیگی پس تو ایک فرد کی حیثیت سے اس کو نہ پڑھ بلکہ اس حیثیت سے پڑھ کہ خدا نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں یہ تعلیم ساری دنیا کے سامنے پیش کروں۔ ہم تیرے ساتھ ہیں اور ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ تو ہمارا سچا رسول ہے۔ گویا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں وہ تمام مفہوم آگیا جو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ میں بیان کیا گیا ہے جب اللہ تعالےٰ نے کہا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تو دوسرے الفاظ میں اس کلمۂ شہادت کا اعلان کر دیا گیا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ یعنی میں اُس خدائے واحد کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں جس کا علم مجھے حاصل ہے اور جو صحیح اور سچا علم ہے۔ میں اس کے نام پر تمہیں اُس کی وحدانیت پر ایمان لانے کا پیغام دیتا ہوں اگر تم میری اس بات کو نہیں مانو گے تو اللہ تعالیٰ کے حضور مجرم اور گنہگار قرار پاؤ گے کیونکہ میں اُس کا رسول ہوں اور میں اُس کے نام پر کھڑا ہوا ہوں مجھے کہا گیا ہے کہ میں اس تعلیم کو چھپا کر نہ رکھوں بلکہ دنیا میں پھیلاؤں اور ہر فرد کے کان تک اللہ تعالیٰ کی اس آواز کو پہنچاؤں۔ غرض پہلے دن ہی اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں کلمۂ شہادت کو پوشیدہ رکھ دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ تو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا ہے دنیا میں یہ اعلان کر کہ تو خدا تعالےٰ کا رسول ہے تیرا نظریۂ ربوبیت الٰہی ہی سچا نظریہ ہے اور اس کلام کو دنیا تک پہنچانا تیرا فرض ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کے بعد اَلَّذِيْ خَلَقَ کے لانے میں حکمت

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کے بعد اَلَّذِيْ خَلَقَ کے الفاظ کا اضافہ اللہ تعالےٰ نے کیوں کیا ہے؟ اگر خالی اتنا ہی کہا جاتا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تب بھی رب کے مفہوم میں خَلَقَ کے معنے آجاتے کیونکہ عربی زبان میں رب کے معنے اس ذات کے ہیں جو انسان کو پیدا کر کے اُسے ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جاتی ہے۔ پس چونکہ یہ مفہوم رب کے لفظ نے ادا کر دیا تھا اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اَلَّذِيْ خَلَقَ کے الفاظ کا اضافہ اپنے اندر کیا حکمت رکھتا ہے؟

عربی زبان میں لفظ رب کا استعمال

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گو ربوبیت کے معنے انسان کو پیدا کر کے اُسے ادنی حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جانے کے ہیں مگر یہ بھی ہر زبان میں قاعدہ ہے کہ کبھی الفاظ اپنے پورے معنوں میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ جزوی معنوں میں بھی استعمال ہو جاتے ہیں چنانچہ باوجود ان معنوں کے عرب دوسروں کو بھی رَبّ کہہ دیا کرتے تھے۔ مثلاً عربی زبان میں سردار کو بھی رَبّ کہہ دیتے ہیں اس لئے کہ جزوی طور پر وہ قوم کی ربوبیت کرتا ہے یا مثلاً رِبِّیْ کا لفظ عبرانی زبان میں عالمِ دین کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ماں باپ اور اُستاد وغیرہ بھی ایک قسم کے رَبّ ہوتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی جسمانی یا علمی تربیت کا موجب بنتے ہیں پس اگر صرف اتنا ہی کہا جاتا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تو انسانی ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ ممکن ہے رَبّ کا لفظ یہاں جزوی معنوں میں استعمال ہوا ہو اور اگر اس طرف ذہن نہ جاتا تو بہر حال ایک شبہ سا رہتا کہ نہ معلوم رَبّ کا لفظ یہاں جزوی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا اصل معنوں میں۔ کیونکہ ماں باپ بھی رب ہوتے ہیں، اُستاد بھی

ربّ ہوتا ہے، بادشاہ بھی ربّ ہوتا ہے، پھر پیر بھی ایک قسم کا ربّ ہوتا ہے اور عربی زبان میں ان سب کے لئے رَبّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پس چونکہ یہ شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ نہ معلوم یہاں رَبّ کا لفظ جزوی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا اپنے وسیع معنوں میں۔ اس لئے خَلَقَ کا لفظ بڑھا کر بتا دیا کہ ہم ربوبیت کو اس کے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو اُس رَبّ کا نام لے جس نے خلق کے مقام سے مخلوق کو اُٹھا کر ترقی دینی شروع کی ہے۔

رَبّ کے معنے پیدا کرکے آہستہ آہستہ ترقی تک پہنچانے والے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جزوی معنوں میں جب رَبّ کا لفظ بولا جائے تو طبیعت میں ایک خلجان سا رہتا ہے کہ اس میں ربوبیت کی کس سٹیج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ابتدائی سٹیج کی طرف یا درمیانی یا آخری سٹیج کی طرف۔ مثلاً جب ایک یہودی کسی عالم دین کو رِبِّیْ کہے گا تو اُس کے معنے یہ ہونگے کہ جس دن سے مجھے دین کی سمجھ آئی ہے اُس دن سے یہ شخص مجھے دین کی باتیں بتا رہا اور میری روحانی رنگ میں پرورش کرنے والا ہے۔ اگر دایہ کو کوئی رَبَّتِیْ کہہ دے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اس وقت سے ربوبیت کرنے والی جبکہ میں پیدا ہوچکا تھا اور اُس وقت تک اُس کی ربوبیت رہی جب تک میں چلنے پھرنے لگا۔ پس چونکہ ربوبیتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے یہاں اَلَّذِیْ خَلَقَ کا اضافہ کیا گیا۔ باپ کی ربوبیت اغذیہ کے وقت سے ہوتی ہے باپ گوشت اور سبزی ترکاری استعمال کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کا جسم ایک چیز تیار کرتا ہے جسے نطفہ کہتے ہیں پس باپ کی ربوبیت غذا کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد ماں کی ربوبیت نطفہ کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور وہ بچے کو اپنے پیٹ میں پالنا شروع کر دیتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ اسے دودھ پلاتی ہے اور اگر کسی بیماری کی وجہ سے وہ دودھ نہیں پلا سکتی یا اُس کا دودھ نہیں ہوتا تو دایہ کی ربوبیت شروع ہوجاتی ہے۔ پھر ہوش سنبھالنے کے بعد اُستاد کی ربوبیت کا وقت آجاتا ہے اور جب کچھ اور بڑا ہوتا ہے تو کوئی بڑا عالم اُس کی تربیت شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد جوان ہونے پر پیر کی ربوبیت کا وقت آجاتا ہے۔ پھر بادشاہ انسان کی ربوبیت کرتا ہے غرض ربوبیت کی مختلف سٹیجز ہیں۔ کوئی چھوٹی سٹیج ہے اور کوئی بڑی مگر بہرحال اِن میں سے کسی ایک سٹیج کے لئے بھی ربّ کا لفظ بول لیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اَلَّذِیْ خَلَقَ کا اضافہ کیا اور فرمایا کہ ہماری مراد اس سے وہ رب نہیں جن کی ربوبیت غذا کے وقت سے شروع ہوتی ہے، وہ رب بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت نطفہ کے وقت سے شروع ہوتی ہے، وہ رب بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت پیدائش کے وقت سے شروع ہوتی ہے، وہ رب بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت ہوش سنبھالنے کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور وہ رب بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت بلوغ اور جوان ہونے کے وقت سے شروع ہوتی ہے بلکہ وہ رب مراد ہے جس کی ربوبیت خَلَقَ کے وقت سے شروع ہوتی ہے یعنی جب سے کہ مخلوق کا وجود ظاہر ہوا ہے شرک مختلف لوگوں کے لئے مختلف نسبتوں کی بناء پر رَبّ کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے مگر ہم تجھے کہتے ہیں تو اُس ربّ کے نام سے شروع کر جس کی ربوبیت خلق کے وقت سے شروع ہوتی ہے کہ جہاں سے وہ تیرا ساتھ دے رہا ہے۔ کوئی تیرا عزیز اور ساتھی وہاں سے تیرا ساتھ نہیں دے رہا۔ اُس کی ربوبیت کے مقابلہ میں باقی تمام ربوبیتیں باطل اور ہیچ ہیں اور کسی کو اُس کی ربوبیت میں شریک ہونے کا دعوےٰ نہیں ہوسکتا (ان مسلمان مولویوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ امر منسوب کر دیا ہے کہ وہ پرندے پیدا کیا کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے اپنی کم فہمی سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شریک بنا دیا ہے)

اس آیت میں ایک اور عجیب بات بھی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے صرف رَبّ کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا بلکہ رَبِّكَ کا لفظ استعمال کیا تھا مگر آگے خَلَقَكَ کہنے کی بجائے صرف خَلَقَ کہہ دیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ رَبِّكَ میں كَ ضمیر کے بڑھانے سے چونکہ شرک کی تردید اور اُس عقیدہ کی تائید ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے متعلق

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم رکھتے تھے اس لئے وہاں تو نے ضمیر کو بڑھا دیا۔ لیکن اگر یہاں بھی خَلَقَ کی بجائے خَلَقَكَ کہہ دیا جاتا تو ایک وسیع مضمون محدود ہو کر رہ جاتا۔ اَلَّذِی خَلَقَكَ کے معنے صرف اتنے ہوتے کہ وہ خدا جس نے تجھ کو پیدا کیا مگر اَلَّذِی خَلَقَ کے یہ معنے بن گئے کہ وہ خدا جس نے تجھ کو بھی پیدا کیا اور باقی تمام مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے۔ گویا اَلَّذِی خَلَقَ کے معنے یہ ہیں کہ اَلَّذِی خَلَقَكَ وَ خَلَقَ اٰبَآءَكَ وَجَدَّكَ وَاٰبَآءَ جَدِّكَ اس طرح یہ سلسلہ چلتے چلتے حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچ جاتا ہے اور ان سے اوپر عناصر اور پھر اجزائے عناصر تک چلا جاتا ہے پس اَلَّذِی خَلَقَ کو بغیر کسی قید کے مطلق بیان کر کے اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کی غیر محدود وسعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ تو اُس خدا کو پیش کر جس نے خالق اور مخلوق کا رشتہ آپس میں جوڑا اور جس کی صفتِ خلق کا آغاز تجھ سے نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے دنیا اُس کی صفتِ خلق کا نظارہ دیکھتی چلی آئی ہے۔ دیکھو یہ قرآن کریم کا کتنا کمال ہے کہ ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کو مقید کر کے اس کے معنوں میں وسعت پیدا کر دی ہے اور دوسری صفت کو مطلق رکھ کر اُس کے معنوں میں وسعت پیدا کر دی ہے ایسی بالغ نظری انسانی کلام میں کہاں ہوتی ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ میں علاوہ اور مضامین کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ کاملہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ تو اُس رب کے نام کے ساتھ اس تعلیم کا دنیا میں اعلان کر جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ نکلا کہ پیدائشِ عالم کے زمانہ سے اللہ تعالیٰ نے تیرے اس کلام کی بنیاد رکھی تھی اس لئے وہ خدا جس نے اس مقصدِ عظیم کے لئے ساری دنیا کو پیدا کیا تھا اُس کی مدد اور تائید و نصرت کے ساتھ تو دنیا میں اپنی نبوت کا اعلان کر۔ کیونکہ پیدائشِ عالم کی غرض صرف تیرے وجود کو دنیا میں ظاہر کرنا تھا پس جس طرح بِاسْمِ رَبِّكَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اظہار کیا گیا تھا اسی طرح اَلَّذِی خَلَقَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ کاملہ کا اعلان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس دن سے مخلوق پیدا ہوئی ہے اُس دن سے صرف تو ہمارا مقصود تھا اور جب سے ہم نے پہلا انسان دنیا میں پیدا کیا ہے اُسی دن سے وہ کلام ہمارے مدِّ نظر تھا جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اب جبکہ تو جو دنیا کا حقیقی مقصود ہے پیدا ہو چکا ہے ہم تجھے کہتے ہیں کہ تو دنیا کے پاس جا اور اُسے کہہ کہ مجھ پر جو کلام نازل ہوا ہے وہ اتنی بڑی عظمت اور شان رکھتا ہے کہ جب سے اس دنیا کا پہلا ذرہ بنا ہے اُسی وقت سے یہ کلام اللہ تعالیٰ کے مدِّ نظر تھا۔ اگر آج کا پیغام ہوتا تب بھی تم اسے ٹھکرا کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے تھے لیکن یہ تو وہ پیغام ہے جس کے لئے اُس نے دنیا کی بنیاد رکھی اور یہی وہ پیغام ہے جو پیدائشِ عالم کا موجب ہوا۔ اتنے بڑے پیغام کو ٹھکرا کر تم خدا تعالیٰ کے عذاب سے کہاں بچ سکتے ہو۔ پس فرمایا تو اس کلام کو میرا نام لے کر پیش کر یعنی بحیثیت رسول ہونے کے اسے دنیا کے سامنے رکھ۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ سرکاری حیثیت سے تو ہماری طرف سے جا اور لوگوں سے کہہ کہ جس خدا نے شروع سے لے کر اب تک تمام مخلوق پیدا کی ہے اُس نے مجھے بھیجا ہے یعنی پیدائشِ عالم کی جو غرض تھی وہ آج میرے ذریعہ سے پوری ہوئی ہے۔ اس لئے اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو دنیا کی پیدائش کو لغو قرار دیتے ہو۔ اسی امر کی طرف اس حدیث قدسی میں اشارہ ہے کہ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تو نہ ہوتا تو میں زمین اور آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔ اَلَّذِی خَلَقَ میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ تو اُس خدا کا نام لے کر دنیا میں اپنی نبوت کا اعلان کر جس نے پیدائشِ عالم کے زمانہ سے تیرے اس کام کی بنیاد رکھی تھی۔ گویا وہ مضمون جو حدیث قدسی میں آتا ہے درحقیقت نہایت لطیف پیرایہ میں قرآن کریم میں بھی بیان کیا جا چکا ہے اور وہ حدیث اس آیت کی تشریح کر

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ تو اس خدا کا نام لے کر پڑھ جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے یعنی اُس کی اس صفت کو جو پیدائشِ عالم کا موجب ہے اپنی مدد کے لئے بلا اور اُس سے کہہ کہ یَا رَبِّ الَّذِيْ خَلَقْتَ الْخَلْقَ۔ اے میرے رب اگر تُو نے مخلوق کو اُس کمال کے لئے پیدا کیا ہے جس کے ظہور کا مجھے واسطہ ہے تو پھر اُس مقصد کو پورا کر جس کے لئے تُو نے مجھے دنیا میں کھڑا کیا ہے۔ گویا علاوہ پبلک میں اپنی رسالت کا طرکا اعلان کرنے کے اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ جب تُو ہم سے اپنی ترقی کے لئے دعا مانگنے لگے تو ہمیشہ اس طرح مانگ کہ اے خدا جس نے تمام مخلوق کو اس دن کے لئے پیدا کیا تھا میں تجھے تیری اِس صفتِ خلق کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ جب اس دن کیلئے تُو نے ساری دنیا کو پیدا کیا تھا اور اس قدر دیر سے تیرا یہ ارادہ تھا جو اب پورا ہونے لگا ہے تو اب اس وقت میری خاص مدد فرما اور میرے اعلانِ نبوت میں برکت ڈال۔ غرض اِدھر پبلک میں یہ اعلان کر کہ جس مقصد کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے وہ معمولی نہیں بلکہ جس دن سے دنیا پیدا ہوئی ہے اُسی دن سے یہ مقصد اللہ تعالیٰ کے مدِ نظر تھا۔ اُدھر خدا سے یہ دعا مانگ کہ جس مقصد کے لئے تُو نے مجھے کھڑا کیا ہے اس میں مجھے کامیابی عطا فرما کیونکہ اگر مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو سلسلۂ مخلوق کا مقصدِ تخلیق باطل ہو جائے گا۔ اِس لئے میں تجھے اسی صفت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں جو مخلوق کی پیدائش کا باعث ہوئی کہ تُو مجھے کامیاب کر۔ مجھے ناکامی سے بچا۔ کیونکہ میری ناکامی میں تمام مخلوق کی ناکامی ہے۔ اِس طرح ایک طرف اللہ تعالیٰ نے اُس پیغام کی عظمت کو ظاہر کر دیا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوا تھا اور دوسری طرف دعا کی قبولیت کا ایک لطیف طریق اُس نے آپ کو سکھا دیا۔

پیدائشِ انسانی کا مقصود کونسا ہے!

مَیں اُوپر مضمون میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اَلَّذِيْ خَلَقَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کو ایک مقصدِ عظیم کے لئے پیدا کیا گیا تھا مگر وہ مقصد اب تک پورا نہیں ہوا تھا اب اُس مقصد کو تیرے ذریعہ سے پورا کیا جا رہا ہے۔ اِس کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص جو کسی مذہب کا قائل ہے وہ تسلیم کرتا ہے کہ پیدائش انسانی کسی خاص مقصد کیلئے ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبث پیدا نہیں کیا بہرحال کوئی نہ کوئی مقصد تھا جس کے ماتحت انسانی پیدائش عمل میں آئی۔ پس جہاں تک مقصد کا سوال ہے مذہبیات سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ اس سے متفق ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ مقصد کس رنگ میں پورا ہوا اس کے متعلق دنیا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مقصد ابتدائے عالم میں ہی پورا ہو گیا تھا وہ کہتے ہیں ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے جو وحی نازل کی وہ تمام ضروریات کیلئے کافی تھی۔ یہ عقیدہ آریہ ہندوؤں کا ہے یہ لوگ ویدوں کو اپنی الہامی کتاب کہتے ہیں۔ اِن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کامل تعلیم ابتدائے زمانہ میں ہی نازل ہو جانی چاہیئے۔ اِس کے مقابل میں بعض اور لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ بے شک انسان کو اُس کا مقصد حاصل ہوا مگر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مقصد انبیاء کے ذریعہ بتدریج انسان کو حاصل ہوا ہے۔ جیسے یہودی کہ وہ کہتے ہیں پہلے آدمؑ آئے پھر نوحؑ آئے پھر ابراہیمؑ آئے پھر اسحاقؑ آئے پھر اسمٰعیلؑ آئے پھر یعقوبؑ آئے پھر یوسفؑ آئے پھر موسیٰؑ آئے پھر اَور انبیاء آئے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وحی الٰہی کا یہ سلسلہ ملاکی نبی تک پہنچا اور اس کے بعد وحی الٰہی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ یہود کے اس عقیدہ پر اگر غور کیا جائے تو کسی چیز کا جو انتہائی نقطہ ہوتا ہے وہ نہ موسیٰؑ میں نظر آتا ہے اور نہ ملاکی نبی میں۔ کیونکہ موسیٰؑ خود اپنے کسی مقام کو آخری مقام قرار نہیں دیتے جیسا کہ آگے بتایا جائیگا اور ملاکی کو تو یہود بھی موسیٰؑ سے بڑا قرار نہیں دیتے۔ پھر سوال یہ ہے کہ پیدائش انسانی کا جو آخری نقطہ تھا وہ کہاں گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اُس مقصد کو بھول گیا جس کے ماتحت

اُس نے بنی نوعِ انسان کو پیدا کیا تھا۔

عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدائش انسانی کا آخری نقطہ ہیں لیکن یہ بات بھی دو طرح بالبداہت باطل ہے اوّل تو اس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ انسان کے بیٹے نہیں تھے بلکہ خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ جب وہ آدم کے بیٹے ہی نہیں تھے تو پیدائش انسانی کا آخری نقطہ کس طرح ہو گئے؟ یہاں سوال تو آدم کے بیٹوں کے متعلق ہے کہ اُن میں سے کون پیدائش انسانی کا اصل مقصود ہے اللہ تعالےٰ کے بیٹے کا تو یہاں کوئی سوال ہی نہیں پس جبکہ یہاں نسل آدمؑ کی پیدائش کا سوال ہے تو ہمیں بہرحال آدمؑ کی نسل میں سے ہی کسی ایسے شخص کا پتہ لگانا پڑیگا جو پیدائش انسانی کا مقصود ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی چیز کا انتہائی نقطہ اُس کے آخری سرے کا نام ہوتا ہے مثلاً ایک لکیر کھینچی گئی ہو تو اُس لکیر کا جو آخری سرا ہو گا وہ اُس کا آخری نقطہ قرار دیا جائیگا لیکن جب ہم مسیحؑ کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخری نقطہ کسی صورت میں بھی قرار نہیں دئے جا سکتے کیونکہ وُہ اُس خط کا آخری سرا ثابت نہیں ہوتے جو آدمؑ سے شروع ہُوا تھا۔ آدمؑ نے شریعت کی بنیاد رکھی تھی نوحؑ نے اس میں اضافہ کیا۔ ابراہیمؑ آئے تو انہوں نے اَور زیادتی کی، موسیٰؑ آئے تو انہوں نے اور زیادہ شریعت کو مکمل طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ غرض شریعت کا ایک دَور ہے جو آدمؑ سے شروع ہُوا اور اُس میں زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پس پیدائش انسانی کا آخری نقطہ وہی ہو سکتا ہے جو پہلی شریعت پر زیادتی کرے۔ وہ کس طرح ہو سکتا ہے جو شریعت کو لعنت قرار دے کر اُس سے دُور بھاگ جائے۔ مثلاً لکڑی کا آخری سرا لکڑی کا ہی ہوگا اگر کوئی کہے کہ لکڑی کا آخری سرا پانی یا ہوا ہے تو یہ بالکل بے جوڑ بات ہوگی۔ بہرحال آخری سرا اپنے پہلے سرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ سونے کا آخری سرا سونے کا ہوگا۔ چاندی کا آخری سرا چاندی کا ہوگا۔ لوہے کا آخری سرا لوہے کا ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ سونے یا چاندی یا لوہے کا آخری سرا لکڑی کا ہے تو سب لوگ ہنسنے لگ جائیں گے کہ کیسی بے وقوفی کی بات کر رہا ہے۔ اسی طرح جب آدمؑ سے شریعت کا ایک تسلسل چل رہا تھا آدمؑ سے بہتر شریعت نوحؑ نے پیش کی، نوحؑ سے بہتر شریعت موسیٰؑ نے پیش کی تو بہرحال آخری نقطہ وہ ہوگا جو موسیٰؑ سے بھی بہتر شریعت پیش کرے۔ وہ نہیں ہو سکتا جو شریعت کو لعنت قرار دے۔ پس عیسائیوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل باطل ہے کہ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ حضرت مسیحؑ ہیں۔

پیدائش انسانی کا مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں۔

ہندوجن کا یہ دعویٰ ہے کہ ابتدائے عالم میں ہی کامل شریعت نازل ہو گئی تھی اُن کے اس دعویٰ کو قرآن کریم نے عقلی دلائل سے اسی سورۃ میں رد کر دیا ہے چنانچہ فرماتا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اپنی پیدائش کی طرف تم دیکھو کہ وہ کس طرح ہوئی ہے۔ کیا پہلے دن ہی تم عاقل بالغ اور سمجھدار بن جاتے ہو یا آہستہ آہستہ اور بتدریج ترقی کرتے کرتے اپنے انتہائی مقام تک پہنچتے ہو؟ اگر فرد کی پیدائش میں ترتیب اور تدریج کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پہلے دن ہی ایک کامل انسان پیدا ہو جائے تو روحانی امور میں تم تدریج کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جس طرح جسمانیات میں تدریج کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح روحانیات میں بھی ارتقاء کئی تدریجی منازل کو طے کرنے کے بعد ہوتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ارتقائی منازل کو طے کئے بغیر پہلے دن ہی کوئی چیز کامل بن جائے۔ ارتقاء کا یہ قانون نہ صرف پیدائش انسانی میں نظر آتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی ہر پیدا کردہ چیز میں ہے۔ یہاں تک کہ مادیات میں بھی ارتقاء کا قانون جاری ہے۔ سورج اور چاند بھی ایک دن میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ جیسا کہ علم ہیئت نے ثابت کیا ہے پہلے یہ دُخانی ذرّات کی شکل میں تھے پھر ان میں دَوری حرکت پیدا ہوئی پھر یہ ذرّات ایک دوسرے سے ملنے شروع ہوئے پھر انہوں نے ایک ٹھوس وجود کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد پھر ایک لمبا دَور اُن پر گذرا یہاں تک کہ لاکھوں سال کے بعد

ابتدائے عالم میں کامل شریعت نازل نہیں ہو سکتی تھی۔

انہوں نے سورج یا چاند کی شکل اختیار کی۔ یہی حال لوہے اور چاندی کا ہے کہ وہ بھی ایک لمبے ارتقاء کے بعد ظاہر ہوئے۔ کوئلہ کتنی معمولی چیز ہے مگر یہ بھی ایک دن میں نہیں بنا بلکہ ہزاروں سال کے بعد بنا ہے۔ اسی طرح ہیرا لاکھوں سال کے تغیرات کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ہیرے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کوئلہ میں سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا پہلے درختوں سے جو مدتوں تک زمین میں دبے رہتے ہیں کوئلہ تیار ہوتا ہے اور پھر کوئلہ سے ہیرا بنتا ہے۔

غرض کوئی چیز لے لو ارتقائی تغیرات میں سے گذرے بغیر وہ عالم وجود میں نہیں آئی۔ جب اللہ تعالیٰ کا جسمانیات میں تمہیں یہ قانون نظر آتا ہے تو تم الہام کے متعلق یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ پیدائش عالم کے ساتھ ہی کامل الہام نازل ہوگیا جس طرح اللہ تعالیٰ کی ظاہری پیدائش میں ارتقاء کا قانون جاری ہے اسی طرح وحی اور الہام بھی اس قانون سے وابستہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اور چیزوں میں تو ارتقاء ہو اور الہام میں ارتقاء نہ ہو۔ پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ نے ہندوؤں کے اس خیال کو رد کر دیا کہ شریعت پہلے دن ہی مکمل طور پر نازل ہوگئی تھی۔ فرماتا ہے تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے انسان نے بہرحال ترقی کرتے کرتے کامل شریعت کے مقام تک پہنچنا تھا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ پہلے دن ہی اُسے کامل شریعت عطا کر دی جاتی۔

(حاشیہ: نشست پیدائش انسانی مقصد نہیں۔)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عیسائیوں کی تھیوری بھی باطل ہے، یہودیوں کا خیال بھی غلط ہے اور ہندوؤں کا نظریہ بھی ناقابل قبول ہے تو پیدائش انسانی کا مقصد کس رنگ میں پورا ہوا؟ تم کہتے ہو کہ یہودیوں کا خیال اس لئے صحیح نہیں کہ وہ ملاکی نبی پر وحی الٰہی کے سلسلہ کو بند قرار دے رہے ہیں جو ایک معمولی حیثیت کے نبی تھے حالانکہ آخری نقطہ وہ ہونا چاہیئے تھا جو موسیٰؑ سے بڑھ کر ہوتا۔ عیسائیوں کا خیال اس لئے صحیح نہیں کہ وہ شریعت سے بھاگ رہے ہیں اور ہندوؤں کا خیال اس لئے صحیح نہیں کہ وہ ابتدائے عالم میں ہی کامل شریعت کا نزول تسلیم کرتے ہیں حالانکہ یہ ابتدائی نہیں بلکہ آخری نقطہ ہونا چاہیئے۔ جب یہ تمام خیالات باطل ہیں تو پھر تم خود ہی بتاؤ کہ پیدائش انسانی کا مقصد کس نبی کے ذریعہ پورا ہوا؟

اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ گو آج تک اللہ تعالیٰ کے ہزاروں انبیاء دنیا میں آچکے ہیں مگر بہت سے نبی ایسے گذرے ہیں جن کے ناموں کا بھی ہمیں علم نہیں کجا یہ کہ ہم کہہ سکیں کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا کلام نازل ہوا تھا۔ مثلاً ہندو گو ابتدائے عالم میں ویدوں کا نزول تسلیم کرتے ہیں مگر یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ وید کن رشیوں پر نازل ہوئے تھے۔ جب اتنی معمولی بات کا بھی انہیں علم نہیں تو اُن کے متعلق یہ بحث کس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ پیدائش انسانی کا مقصود تھے یا نہیں۔ زرتشتی بیشک حضرت زرتشتؑ کو اللہ تعالیٰ کا نبی مانتے ہیں مگر اُن کی کتاب میں صاف طور پر آئندہ آنے والے ایک نبی کی پیشگوئی پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زرتشتؑ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ نہیں تھے ورنہ وہ اپنے بعد کسی اور صاحب شریعت نبی کی خبر نہ دیتے۔ ہندوؤں اور زرتشتیوں کے انبیاء کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہ ان میں سے حضرت زرتشت نے خود اپنے آپ کو آخری نقطہ قرار نہیں دیا اور ویدوں کے متعلق ہندوؤں میں اختلاف ہے کہ وہ کن رشیوں پر نازل ہوتے تھے ہم انبیاءِ بنی اسرائیل کے متعلق غور کرتے ہیں کہ آیا پیدائش انسانی کا وہ مقصود تھے یا نہیں۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سے وہ نبی جن کی تعلیم سب سے زیادہ واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کسی قدر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم بھی موجود ہے جو بائبل نے پیش کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام مخلوق کے نقطۂ مرکزی تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

"تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاویں گی۔" (پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷ و ۱۸)

یعنی تیرے ذریعہ سے نہیں بلکہ تیری نسل کے ذریعہ سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی تُو محدود زمانہ کے لئے اور محدود لوگوں کی ہدایت کے لئے نبی بنایا گیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ زمین کی ساری قومیں برکت پائیں ہمارا یہ مدعا تیرے ذریعہ سے پورا نہیں ہوگا بلکہ تیری نسل کے ذریعہ سے پورا ہوگا۔ اس سوال کو جانے دو کہ وہ کونسی نسل ہے جس کے ذریعہ یہ وعدہ پورا ہُوا۔ بہرحال ان الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدائشِ عالم کا آخری نقطہ نہیں تھے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اُن سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ تُو نہیں بلکہ تیری نسل کے ذریعہ سے میں ایسا سامان کروں گا کہ زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔ اِس سے پتہ لگتا ہے کہ آخری نقطہ نے عالمگیر مذہب کا بانی ہونا تھا کیونکہ اُس کے متعلق مقدر یہ تھا کہ زمین کی ساری قومیں اُس سے برکت حاصل کریں اور زمین کی ساری قومیں اُسی سے برکت حاصل کر سکتی تھیں جو عالمگیر مذہب کا بانی ہوتا پس ابراہیمؑ پیدائش انسانی کے ارتقاء کا آخری نقطہ نہیں تھے۔ اُن کی اپنی پیشگوئی یہ ہے کہ میری نسل میں سے ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جس کے ذریعہ دنیا کی ساری قوموں کو دعوت دی جائے گی، دنیا کی ساری قوموں کو برکت دی جائے گی اور دنیا کی ساری قوموں کو ہدایت اور قرب کی راہیں بتائی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر یہ پیشگوئی ایک عالمگیر مذہب کے بارہ میں تھی اور وہ شخص جس سے دنیا کی ساری قوموں نے برکت حاصل کرنی تھی وہی انبیاء کا منتہائے نظر تھا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ مقصد حاصل نہیں ہُوا تھا۔

اگر کہا جائے کہ یہ پیشگوئی موسیٰؑ کے ذریعہ پوری ہو چکی ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ یہودی مذہب مختص القوم تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے صرف یہود کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو کچھ کہا گیا وہ یہ تھا کہ تیری نسل سے ساری قومیں برکت پائیں گی۔ موسیٰ سے صرف بنی اسرائیل نے برکت حاصل کی تھی لیکن ابراہیم کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا وعدہ یہ تھا کہ میں تیری نسل کو بڑھاؤں گا اور بڑھاتا چلا جاؤں گا یہاں تک کہ ارتقاء کی منازل طے کرتے کرتے ایک دن آئے گا کہ ساری دنیا کو دعوتِ حقّہ دی جائے گی اور ساری دنیا کو خدائی آواز پہنچائی جائے گی۔ پس موسوی مذہب نے چونکہ ساری دنیا کو دعوت نہیں دی بلکہ موسیٰ کا پیغام مخصوص تھا بنی اسرائیل سے۔ اس لئے یہودی مذہب کو اس پیشگوئی کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوم حضرت موسیٰؑ خود ایک اور نبی کی خبر دیتے ہیں جو اُن کے بعد آنے والا تھا چنانچہ فرماتے ہیں اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنے الہام کے ذریعہ یہ خبر دی ہے کہ

> "مَیں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اُس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا۔ یا اَور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدائش انسانی کا آخری نقطہ نہیں۔

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ پیشگوئی فرما رہے ہیں کہ میرے بعد ایک اور نبی آنے والا ہے جو اپنے ساتھ نئی شریعت لائیگا۔ کیونکہ الفاظ یہ ہیں "میں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" "تجھ سا نبی" کے معنے یہی ہیں کہ جس طرح تُو صاحبِ شریعت ہے اسی طرح وُہ صاحبِ شریعت ہوگا۔ اگر صرف اتنے الفاظ ہوتے کہ مَیں اُن کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا تو اس کے معنے یہ ہو سکتے تھے کہ جس طرح بنی اسرائیل میں اور کئی غیر شرعی انبیاء آتے اسی طرح ایک غیر شرعی نبی کی آپ نے اس جگہ خاص طور پر خبر دی ہے مگر "تجھ سا" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہاں وہ دوسرے نبی مراد نہیں ہو سکتے جو بنی اسرائیل میں آئے کیونکہ وہ موسیٰ جیسے نہیں تھے۔ موسیٰ صاحب شریعت نبی تھے اور وہ صاحب شریعت نبی نہیں تھے۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو پیشگوئی فرمائی ہے اُس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ نبی موسیٰ کی طرح صاحبِ شریعت ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالے گا گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق ایک اور صاحبِ شریعت نبی ابھی دنیا میں آنے والا تھا پس موسیٰؑ ارتقاءِ روحانی کا آخری نقطہ نہیں ہو سکتے۔

پیدائش انسانی کے آخری نقطہ کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی۔ [۱و۲]

پھر کہتے ہیں:-

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی۔" (استثناء باب ۳۳ آیت ۲)

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تین جلوہ گریوں کا ذکر فرماتے ہیں "خداوند سینا سے آیا"۔ اس سے مراد موسوی ظہور ہے "شعیر سے اُن پر طلوع ہوا"۔ اس سے مراد عیسوی ظہور ہے۔ اِن دونوں ظہوروں کے بعد ایک تیسرے ظہور کی بھی اس پیشگوئی میں خبر دی گئی ہے وہ ظہور فاران سے ظاہر ہوگا اور آتشی شریعت اُس کے ساتھ ہی ہوگی۔ اس پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰؑ دورِ نبوت کے آخری نقطے نہ تھے بلکہ سینا اور شعیر کے ظہوروں کے بعد ایک اَور ظہور ہونے والا تھا جو اپنے ساتھ شریعت بھی رکھے گا۔ فاران سے جلوہ گر ہونے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ فاران اُن پہاڑیوں کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہیں۔ بائبل سے بھی اِس کا ثبوت اس رنگ میں ملتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے بائبل میں لکھا ہے " وہ فاران کے بیابان میں رہا"۔ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۱) اور اہلِ مکہ بھی وہ قوم ہیں جو اپنے آپ کو نسلِ ابراہیم سے قرار دیتے ہیں پس فاران کی چوٹیوں سے ظاہر ہونے والا وجود محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اَور آپ کے ذریعہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

پیدائش انسانی کے آخری نقطہ کے متعلق حضرت داؤد علیہ السلام کی پیشگوئی۔ [۳]

پھر اس پیشگوئی میں یہ ذکر ہے کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئیگا۔ یہ پیشگوئی بھی ایسی ہے جو سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پر چسپاں نہیں ہوتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو صرف بارہ[۱۲] حواری ملے تھے جن میں سے ایک نے تیس روپوں کے بدلے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا اور باقی صلیب کے وقت اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ دنیا میں صرف ایک ہی انسان ہے جس کے متعلق تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے لئے آئے تو اُس وقت آپ کے لشکر کی تعداد دس ہزار ہی تھی اور آپؐ انہی پہاڑیوں سے چڑھ کر آئے تھے جو فاران کی پہاڑیاں ہیں اور جن کے متعلق بائبل میں پیشگوئی پائی جاتی تھی۔ بہرحال اس سے اتنا پتہ لگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو آخری نقطہ قرار نہیں دیا۔ پھر اس پیشگوئی میں صاف لکھا ہے کہ ایک آتشی شریعت اُس کے ہاتھ میں ہوگی جس کے معنے یہ ہیں کہ ابھی ایک اور شریعت آنے والی ہے۔ اور جب آخری شریعت ابھی باقی تھی تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعد کی شریعت پہلی شریعت سے بہتر ہوگی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے آپ کو ارتقائے روحانی کا آخری نقطہ قرار نہیں دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے اُن میں ایک اہم نبی حضرت داؤد علیہ السلام ہیں جن کو بہت بڑی عظمت دی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ آیا انہوں نے اس مقصد کو پورا کیا۔ اس کا جواب بھی ہمیں نفی میں ملتا ہے۔ کیونکہ وہ خود کہتے ہیں۔

"اُس کا مُنہ شیرینی ہے ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو! یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے۔" (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۶)

اُردو بائبل میں تو "سراپا عشق انگیز" کے الفاظ آتے ہیں مگر عبرانی بائبل میں یہاں لفظ "محمدیم" لکھا ہوا ہے یعنی محمدؐ۔ کئی مترجموں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نام پر پردہ ڈالنے کے لئے اُس کا ترجمہ "عشق انگیز" کر دیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص کہے محمدؐ نے یوں کہا تو اس کا ذکر ان الفاظ میں کر دیا جائے کہ ایک صاحب تعریف آدمی نے یوں کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام پر پردہ ڈالنے اور دوسرے کو دھوکا دینے والی بات

ہوگی۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی بائبل کا اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے "محمدیم" کا ترجمہ "عشق انگیز" کر دیا حالانکہ عبرانی بائبلیں دنیا میں اب تک موجود ہیں اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہاں "محمدیم" لکھا ہوا ہے یعنی وہ محمدؐ ہے۔ (اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد کے بعد یم کے حروف بھی ہیں جو جمع کے لئے آتے ہیں مگر ساری عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں ایک شخص کا ذکر ہے پس جمع کا صیغہ ادب اور احترام کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے نہ کہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کسی جماعت کی خبر دی جا رہی ہے) پھر اُس کی علامت حضرت داؤدؑ نے یہ بھی بتائی ہے کہ "دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے"۔ (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰) یہ وہی علامت ہے جس کا موسیٰ کی پیشگوئی میں ذکر آتا ہے اور جو فتح مکہ کے وقت پوری ہوئی۔

غرض حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ تک ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ تمام انبیاء یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ ایک اور نبی ابھی آنیوالا ہے جو کامل شریعت اپنے ساتھ لائے گا اور جو تمام نبیوں کا محبوب اور پیارا ہوگا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے اُن میں سے ایک بڑے نبی حضرت یسعیاہ ہیں۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یسعیاہ نبی کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یسعیاہ نبی پیدائش انسانی کا آخری نقطہ تھے؟ اور کیا اُن کے آنے سے وہ مقصد پورا ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں:۔

"اور ایک نام جو بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے بہتر ہے بخشوں گا۔ میں ہر ایک کو ابدی نام دُوں گا جو مٹایا نہ جائے گا اور بیگانے کی اولاد جنہوں نے اپنے تئیں خداوند سے پیوستہ کیا ہے کہ اُس کی بندگی کریں اور خداوند کے نام کو عزیز رکھیں اور اُس کے بندے ہوویں۔ وہ سب جو سبت کو حفظ کر کے اُسے ناپاک نہ کریں اور میرے عہد کو لئے رہیں میں اُن کو بھی اس مقدس پہاڑ پر لاؤں گا اور اپنی عبادت گاہ میں انہیں شادمان کرونگا"۔ (یسعیاہ باب ۵۶ آیت ۵ تا ۷)

یسعیاہ نبی یہ پیشگوئی کرتے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الٰہی قوم کو ایک نیا نام دیا جائے گا اور وہ اتنا پیارا ہوگا کہ لوگ اُسے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے بھی زیادہ پسند کریں گے۔ یہ تو پسند کر لیں گے کہ اُن کا بیٹا مر جائے یا اُن کی بیٹی مر جائے مگر وہ اس نام کو چھوڑنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ اسلام کا نام ہے جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا اور جس کے متعلق یسعیاہ نبی یہ خبر دے رہے ہیں کہ وہ نام اتنا پیارا ہوگا کہ لوگ اپنے بیٹوں اور اپنی بیٹیوں کو چھوڑنا اور اُن کا اپنی آنکھوں کے سامنے مارا جانا گوارا کر لیں گے مگر یہ برداشت نہیں کریں گے کہ اسلام چھوٹ جائے اور یہ پیارا نام اُن کے ساتھ نہ رہے۔

پھر یہ کہ وہ مذہب ایسا ہوگا جس میں غیر قومیں بھی شامل ہوں گی اور "اپنے تئیں خداوند سے پیوستہ" کریں گی۔ یہ وہی بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی بتائی گئی تھی کہ زمین کی ساری قومیں تیری نسل سے برکت پائیں گی۔ یسعیاہ نبی بھی یہی کہتے ہیں کہ غیر قومیں اُس مذہب میں داخل ہوں گی اور خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق پیدا کر کے اُس کا قُرب حاصل کریں گی۔

پھر فرمایا کہ وہ لوگ سبت کی بے حُرمتی نہ کریں گے۔

اسی طرح فرمایا۔ "میں اُن کو بھی اس مقدس پہاڑ پر لاؤں گا اور اپنی عبادت گاہ میں اُنہیں شادمان کروں گا"۔ یعنی وہ لوگ اس ملک پر آ کر قابض ہو جائیں گے۔

یسعیاہ نبی کے کلام میں آخری نقطہ انسانی کی پیشگوئی۔

یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی پر اگر غور کیا جائے تو اس میں پانچ باتیں نظر آتی ہیں۔

اوّل۔ اُن کو ایک نیا نام ملے گا

دوم۔ وہ نام ابدی ہوگا جو کبھی مٹایا نہیں جائیگا۔

سوم۔ غیر اقوام کے لوگ بھی اُن کے مذہب میں شامل ہوں گے۔

چہارم۔ وہ سبت کی حفاظت کریں گے۔

پنجم۔ اُن کو بھی بنی اسرائیل کے علاقہ میں لا کر قابض کر دیا جائے گا۔

یہ پانچ چیزیں جس مذہب میں پائی جائینگی وہی اس پیشگوئی کا

مصداق قرار دیا جاسکے گا۔ یسعیاہ کے بعد بنی اسرائیل میں سب سے
بڑے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام گذرے ہیں مگر سوائے فلسطین پر
قابض ہونے کے اور کوئی بات بھی اُن کے ذریعہ پوری نہیں ہوئی۔
مثلاً یسعیاہ نبی کو یہ بتایا گیا تھا کہ میں اُن کو ایک نیا نام بخشوں گا
جو بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے بہتر ہوگا۔ یہ نام صرف مسلمانوں
کو ملا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ سَمّٰكُمُ
الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج ع۱۰) کہ پُرانے
زمانہ سے تمہارا نام مسلم رکھا گیا ہے لیکن عیسائیوں کا کوئی نام ہی
نہیں وُہ کبھی نصاریٰ کہلاتے ہیں کبھی مسیحی اور کبھی عیسائی یعنی
عیسیٰ کی طرف نسبت پانے والے۔ انگریز اپنے آپ کو کرسچن کہتے
ہیں مگر یہ بھی کوئی نام نہیں۔ بلکہ اس کے معنے صرف مسیح کی طرف منسوب
ہونے والوں کے ہیں غرض عیسائیوں کا کوئی نام ہی نہیں پہلے زمانہ
میں وہ کچھ کہلاتے تھے پھر کچھ اور کہلانے لگ گئے اور اسی طرح
اُن کے نام میں تبدیلی ہوتی چلی گئی۔ وُہ قوم جس کا ایک نام رکھا
گیا ہے اور جس کا نام کسی انسان نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے
رکھا ہے وہ صرف مسلمان ہیں اور اسی نام کے متعلق یسعیاہ نبی
نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ

"ایک نام جو بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے بہتر ہے
بخشوں گا۔"

اگر عیسائی اپنے آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق قرار دیتے ہیں تو
کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا عیسائی نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے
رکھا گیا ہے اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو یہ بالکل بے بنیاد ہوگا کیونکہ
بائبل سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کا نام
عیسائی رکھا ہے۔

پھر یہ خبر دی گئی تھی کہ اُن کو ابدی نام دیا جائیگا جو کبھی
مٹایا نہیں جائے گا۔ یعنی زمانہ کے تغیرات اور ملکوں اور علاقوں
کے اختلاف کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا جو نام رکھا
جائے گا وہ ہمیشہ قائم رہے گا اُس میں کبھی کوئی تبدیلی عمل میں نہیں
آئے گی۔ پیشگوئی کا یہ حصہ بھی ایسا ہے جو عیسائیوں پر چسپاں
نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اوّل تو اُن کا کوئی نام ہی نہیں اور پھر جو کچھ وُہ
اپنے آپ کو کہتے ہیں اُس میں بھی تبدیلی ہوتی چلی آئی ہے۔

تیسری خبر یہ دی گئی تھی کہ بیگانے کی اولاد اُس مذہب میں
داخل ہوگی۔ لیکن حضرت مسیحؑ اپنے حواریوں سے کہتے ہیں کہ تمہیں
غیر قوموں کو تبلیغ کرنے اور انہیں اپنے مذہب میں داخل کرنے کی
اجازت ہی نہیں۔

چوتھی خبر یہ دی گئی تھی کہ وہ سبت کی حفاظت کریں گے
لیکن عیسائی وہ ہیں جنہوں نے سبت کی حفاظت کرنے کی بجائے
روم کے بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے ہفتہ کو اتوار سے بدل دیا اور
اس طرح سبت کی بےحرمتی کا ارتکاب کیا۔ یہ چار شرطیں جس قوم میں
پائی جائیں گی اُسی کا فلسطین پر قبضہ اس بات کی علامت سمجھا جاسکتا
ہے کہ یسعیاہ کی پیشگوئی اُس کے ذریعہ پوری ہوئی ورنہ محض فلسطین
پر قبضہ کوئی چیز نہیں اُس پر قبضہ تو رومیوں نے بھی کر لیا تھا۔

یہ چار شرطیں اگر کسی قوم میں پائی جاتی ہیں تو وہ صرف
مسلمان ہیں۔ چنانچہ

اوّل مسلمانوں کا خود اللہ تعالیٰ نے نام رکھا وہ فرماتا ہے
هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج ع۱۰)
تمہارا مسلم نام اللہ تعالیٰ نے آپ رکھا ہے

دوم۔ یہ نام ایسا ہے جو ابدی ہے کوئی شخص اس کو بدلنے
کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان ہر وقت مسلمان ہی کہلائے گا۔
خواہ وہ دنیا کے کسی خطہ میں رہتا ہو۔

سوم۔ بیگانے کی اولاد یعنی غیر اقوام کا داخلہ صرف اسلام میں
جائز ہے اور یہی وہ مذہب ہے جس نے اپنی دعوت کو کسی ایک قوم
سے مخصوص نہیں کیا بلکہ دنیا کی ہر قوم تک خدائے واحد کا پیغام
پہنچایا ہے۔

چہارم۔ سبت کے محافظ بھی مسلمان ہی ہیں کیونکہ انہوں
نے جمعہ کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور کبھی اس کو بدلنے کا
خیال تک بھی اُن کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔

پنجم۔ فلسطین پر بھی مسلمان قابض ہوتے یہاں تک کہ
تیرہ سو سال اُن کے قبضہ پر گذر گئے اور اب تک وہ فلسطین پر قابض
ہیں۔

بہرحال یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی نے بتادیا کہ دنیا کے روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ یسعیاہ نہیں تھے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کی پیدائش کا مقصود اُن کے ذریعہ پُورا ہُوا کیونکہ وہ خود اپنے بعد ایک اور عظیم الشان نبی کی بعثت کی خبر دے چکے ہیں

پھر حضرت مسیحؑ آئے۔ کیا پیدائش انسانی کا وہ مقصود تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیونکہ

اوّل۔ مسیحی مذہب نسل ابراہیمؑ سے نہ تھا بلکہ عیسائی تو الگ رہے خود مسیحؑ ہی نسل ابراہیمؑ سے نہ تھے کیونکہ وہ عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے جب وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے تھے تو ابراہیمؑ کی نسل میں سے کس طرح ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت ابراہیمؑ سے یہ کہا تھا کہ ”تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاویں گی“۔ پس اگر کسی شخص کے ذریعہ پیشگوئی پوری ہو سکتی ہے تو وہ وہی ہو سکتا ہے جو ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہو نہ وہ جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہتا ہو۔ اگر عیسائی کہدیں کہ حضرت مسیحؑ سے زمین کی ساری قوموں نے برکت حاصل کرلی ہے تب بھی ہم کہیں گے کہ یہ پیشگوئی ابھی پوری ہونی باقی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خبر یہ دی ہے کہ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہوگا اور اُس کا نشان یہ ہوگا کہ وہ ایک عالمگیر مذہب کا بانی ہوگا اور دنیا کی ساری قوموں کو دعوت حقہ دے گا۔ پس مسیحؑ نے اگر ساری قوموں کو دعوت دے بھی دی ہے تب بھی ابراہیمی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی کیونکہ ابراہیمی پیشگوئی کا تعلق اس شخص سے ہے جو ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہو۔ لیکن اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ گو حضرت مسیحؑ کا کوئی باپ نہیں تھا مگر تھے وہ ابراہیمؑ ہی کی نسل سے۔ تب بھی ہم کہتے ہیں کہ یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ مسیحی مذہب عالمگیر نہیں۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ خود اپنی نسبت فرماتے ہیں۔

”ابن آدم آیا ہے کہ کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈ کے بچائے“ (متی ۱۸/۱۱)

یعنی مسیحؑ کی آمد کی غرض صرف اتنی تھی کہ بنی اسرائیل جو بخت نصر کے زمانہ میں منتشر ہو کر افغانستان اور کشمیر وغیرہ علاقوں میں پھیل گئے تھے اُن کو اکٹھا کریں۔ پس اُن کا پیغام کسی اَور کے لئے نہیں تھا صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے تھا۔ دوسرے تورات خود مسیحیوں کے نزدیک یہود کے لئے ہے اور عیسائی اس بات پر متفق ہیں کہ تورات غیر قوموں کے لئے نہیں تھی صرف یہود کے لئے تھی۔ دوسری طرف انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے نزدیک تورات منسوخ نہیں تھی چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

”یہ خیال مت کرو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتاب کو منسوخ کرنے کو آیا۔ میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو“

(متی باب ۵ آیت ۱۷ و ۱۸)

اس جگہ حضرت مسیحؑ صاف طور پر فرماتے ہیں کہ میں تورات کو منسوخ کرنے کے لئے نہیں آیا۔ جب وہ منسوخ کرنے کے نہیں آئے تو معلوم ہُوا کہ زمانہ مسیحؑ میں تورات قائم رہی تھی اور جب وہ قائم رہی جیسا کہ عیسائی بھی مانتے ہیں تو چونکہ تورات ساری دنیا کے لئے نہیں تھی بلکہ صرف یہود کے لئے تھی اس لئے معلوم ہُوا کہ حضرت مسیحؑ پیدائش انسانی کا آخر نقطہ نہیں تھے۔

پھر حضرت مسیحؑ نے جب اپنے بارہ حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو انہیں یہ ہدایت دی کہ

”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی“ (متی باب ۱۰ آیت ۵ تا ۷)

ان الفاظ میں حضرت مسیحؑ نے نہ صرف غیر قوموں کو تبلیغ کرنے کی ممانعت کی ہے بلکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ سامری وہ لوگ تھے جو بنی اسرائیل سے مخلوط تھے اور آدھے بنی اسرائیل کہلاتے تھے مگر حضرت مسیحؑ اُن کو بھی تبلیغ کرنا جائز نہیں سمجھتے کجا یہ کہ غیر قوموں کو اپنے مذہب میں داخل کرنا آپ جائز سمجھتے۔ پس وہ پیشگوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

فرمائی تھی۔ مسیحی مذہب کے ذریعہ بھی پوری نہیں ہوئی سو ہاں یہ خبر تھی کہ ابراہیمی نسل سے ساری قومیں برکت پائیں گی اور مسیحی مذہب کے بانی نے اپنے بارہ حواریوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ غیر قوموں کو تبلیغ نہ کریں اور صرف یہود کو تبلیغ کریں۔ پس مسیحی مذہب کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سب قوموں کو برکت دینے کیلئے آیا تھا۔

مذکورہ بالا حوالہ میں "پہلے" کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ بعض عیسائی کہہ دیا کرتے ہیں کہ پہلے بنی اسرائیل کو تبلیغ کرنے کا حکم تھا۔ یہ حکم نہیں تھا کہ بنی اسرائیل کے علاوہ اور کسی قوم کو تبلیغ ہی نہ کی جائے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اوّل تو یہ واضح ہے کہ جب تک سب بنی اسرائیل ایمان نہ لائیں دوسروں کو تبلیغ کرنا منع ہے اور چونکہ یہودی ابھی تک موجود ہیں اِس لئے عیسائیوں کو غیر قوموں میں تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ دوسرے خود حضرت مسیحؑ نے اپنے اس حکم کی تشریح کر دی ہے آپ فرماتے ہیں۔

"مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم بنی اسرائیل کے سب
شہروں میں نہ پھر چکو گے جب تک کہ ابن آدم
نہ آئے۔" (متی باب۱۰ آیت ۲۳)

اِن الفاظ میں حضرت مسیحؑ کی طرف سے یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک میں دوبارہ واپس نہ آجاؤں تم بنی اسرائیل کی تبلیغ کو ختم نہیں کر سکو گے۔ گویا مسیح کے دوبارہ آنے تک اُن کی قوم کے لئے صرف بنی اسرائیل میں تبلیغ مقدر ہے کسی اور قوم کو تبلیغ کرنا اُن کے لئے جائز نہیں۔ ہاں بعثت ثانیہ میں سب دنیا کو تبلیغ ہوگی پس اس جگہ "پہلے" کے وہی معنے لئے جائیں گے جو حضرت مسیحؑ کے دوسرے کلام سے ثابت ہیں اور وہ معنے یہی ہیں کہ مسیحؑ کی بعثتِ ثانیہ سے پہلے عیسائیوں کو یہود کے علاوہ اور کسی کو تبلیغ کی اجازت نہیں۔ حضرت مسیحؑ صاف طور پر فرماتے ہیں کہ جب تک میں دوبارہ نہ آجاؤں تم یہود کی تبلیغ سے فارغ نہیں ہو سکو گے جس کے معنے یہ ہیں کہ میرے دوبارہ آنے تک تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنی تبلیغ صرف یہود تک محدود رکھو۔ جب میں دوبارہ آجاؤں گا تو پھر تمہیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ تم ساری دنیا کو تبلیغ کرو۔

پھر مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں

"میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی
پاس نہیں بھیجا گیا۔" (متی باب۱۵ آیت ۲۴)

اس میں اَور زیادہ وضاحت سے اُنہوں نے قوموں کی نسبت سے اپنے حلقہ کی تعیین کر دی اور بتا دیا کہ میرا تعلق بنی اسرائیل کے علاوہ اور کسی قوم سے نہیں۔

جب حضرت مسیحؑ کی بعثت صرف اسرائیلی قبائل کے لئے مخصوص تھی تو وہ حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئی کے مصداق ثابت نہ ہوئے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کہا گیا تھا کہ تیری نسل کے ذریعہ زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی اور حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ میں ساری دنیا کو برکت دینے کیلئے نہیں بلکہ صرف بنی اسرائیل کو برکت دینے کے لئے آیا ہوں۔

دوم۔ وہ شریعت نہیں لائے۔ حالانکہ تمام پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا شریعت لائے گا۔ پس چونکہ وہ شریعت نہیں لائے اس لئے اُنہیں دنیا کا مقصود قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سوم۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ "وہ نبی" اُن کی پہلی بعثت کے بعد اور دوسری بعثت سے پہلے آئیگا چنانچہ لکھا ہے۔

"ضرور ہے کہ آسمان اُسے لئے رہے (یعنی مسیح کو)
اُس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے
نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آ دیں۔
کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا
خدا ہے تمہارے بھائیوں سے تمہارے لئے ایک نبی
میری مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اُس کی سب
سُنو۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اُس نبی کی نہ سُنے
وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا۔ بلکہ سب نبیوں
نے سموئیل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام
کیا اِن دنوں کی خبر دی ہے۔" (اعمال باب۳ آیت ۲۱تا۲۴)

اِن الفاظ میں حواری حضرت مسیحؑ سے خبر پاکر بتاتے ہیں کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ نبی آجائے جس کی تمام انبیاء خبر دیتے

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ

(اور جس نے) انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ۵۳

چلے آئے ہیں وہ صاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ پیشگوئیوں میں ایک شریعت لانے والے نبی کے متعلق جو خبر دی گئی تھی مسیحؑ کی دوبارہ بعثت اُس کے بعد ہوگی جس کے معنے یہ ہیں کہ مسیحؑ اس پیشگوئی کا مصداق نہیں بلکہ آنے والا نبی جو اپنے ساتھ شریعت رکھتا ہوگا جو مسیحؑ کی بعثت اوّل اور بعثتِ ثانیہ کے درمیان آئیگا وہ اس کا مصداق ہوگا۔ اس موقعہ پر عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیدائشِ عالم کا نقطۂ مرکزی قرار دینا غلط ہے۔ نقطۂ مرکزی بہرحال مسیحؑ ہے جس نے صاحبِ شریعت نبی کے بعد آنا ہے مگر یہ سوال بھی حل ہو چکا ہے کیونکہ مسیح ثانی جس نے مبعوث ہونا تھا وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے مبعوث ہو چکا ہے اور اُس نے صاف اور کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے آپؐ سے ہی حاصل کیا ہے۔ پس یہ سوال جاتا رہا کہ نقطۂ مرکزی ابھی باقی ہے۔ کیونکہ جسے سب سے آخر میں نقطۂ مرکزی قرار دیا جا سکتا تھا اُس نے خود آکر کہہ دیا ہے کہ میں نقطۂ مرکزی نہیں بلکہ نقطۂ مرکزی وہ ہے جو مجھ سے پہلے آچکا ہے۔ بہرحال اعمال باب ۳ کی تصریحات سے جو حضرت مسیحؑ کی پیشگوئیوں پر مبنی ہیں یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ مقصود جہان حضرت مسیحؑ کی بعثت اوّل کے بعد اور بعثتِ ثانیہ سے پہلے آنا تھا اور وہ ہمارے پیارے سردار محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تھا اُسے یاد کرتے ہوئے کھڑا ہو اور تبلیغ کر کہ تُو اس غرض کو پُورا کرنے والا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ تُو پڑھ یعنی دنیا کے سامنے میرا نام لے کر اعلان کر کہ میں اللہ تعالےٰ کے حکم سے یہ بات کہتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی کہہ کہ اس رب سے مسیحیوں کا رب مراد نہیں جو بیٹے کا محتاج ہے، یہودیوں کا رب مراد نہیں جو ایک قوم سے وابستہ ہے، مشرکوں کا رب مراد نہیں جو کسی چیز کو پیدا کرنے سے قاصر ہے بلکہ اَلَّذِیْ خَلَقَ تُو اُس خدا کا نام لے کر اعلان کر جس نے مخلوق کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا مگر ابھی تک وہ مقصد پورا نہیں ہُوا تھا اب تیرے ذریعہ وہ مقصد پورا ہُوا ہے۔

۵۳ حل لغات۔ عَلَقٌ کے معنے خون کے ہوتے ہیں خصوصاً اُس خون کے جو گاڑھا اور جما ہُوا ہو۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو لٹکی ہوئی ہو اُسے بھی عَلَقٌ کہتے ہیں اور عَلَقٌ اُس مٹی کو بھی کہتے ہیں جو بعض دفعہ کام کرنے کے بعد ہاتھ کے ساتھ لگی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح عَلَقٌ دشمنی اور محبت کو بھی کہتے ہیں (اقرب) کیونکہ یہ چیزیں بھی دل میں جم جاتی ہیں۔ نفرت پیدا ہو جائے تو وہ بھی دیر تک رہتی ہے اور محبت پیدا ہو جائے تو وہ بھی عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ عَلَقٌ عَلَقَۃٌ کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور عَلَقَۃٌ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَۃُ مِنَ الْعَلَقِ لِلدَّمِ۔ خون کا لوتھڑا (اقرب) اگر عَلَقٌ کو جمع قرار دیا جائے تو اُس کے جمع لانے میں یہ حکمت ہوگی کہ اَلْاِنْسَانُ سے مراد بھی جنس انسانی ہے کوئی ایک فرد مراد نہیں یعنی خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے یہ معنے نہیں کہ ہم نے ایک انسان کو علقہ سے پیدا کیا ہے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے ہر انسان کو ایک ایک علقہ سے پیدا کیا ہے۔

تفسیر۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ خُلِقَ مِنْ کَذَا عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ امر فلاں شخص کی طبیعت میں داخل ہے۔ قرآن کریم نے بعض اور مقامات پر اس محاورہ کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر فرماتا ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (الروم ع۶) اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ضُعف سے پیدا کیا ہے۔ اب اِس کا یہ

مطلب نہیں کہ ضُعف کوئی مادہ ہے جس سے انسان پیدا کیا گیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت میں ضعف پایا جاتا ہے یا مثلاً آتا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء ع) انسان عجلت سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ جلد بازی کوئی مادہ ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جلد بازی کا مادہ بھی ہے۔ اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے علق سے پیدا کیا ہے یعنی انسان کو فطرتاً اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اُس میں علق پایا جاتا ہے۔ علق کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے محبت کے بھی ہوتے ہیں اور دشمنی اور عداوت کے بھی ہوتے ہیں پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے معنے یہ ہوئے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جذبات کا ایک طوفان پیدا کیا ہے اُس کے اندر محبت بھی پیدا کی ہے اور اُس کے اندر نفرت بھی پیدا کی ہے۔ اِنہی دو فطری مادوں کو پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم انسانی فطرت کو دیکھو تو تم پر یہ حقیقت روشن ہو گی کہ ہم نے جذباتِ محبت اور جذباتِ نفرت دونوں اُس میں پیدا کئے ہیں اور جب ہم نے اُس میں جذباتِ محبت بھی پیدا کئے ہیں اور جذباتِ نفرت بھی۔ تو ضروری تھا کہ یہ جذبات ایک دن اپنی تکمیل کو پہنچتے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ انسان جذبات کے ادھورے ظہور پر قانع نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے اندر جو جذبات بھی پائے جاتے ہیں اُن کا مکمل ظہور ہو۔ وہ فطرت کی پیاس بجھانے اور اپنے جذبات کی سیری کے لئے ایک تکمیل کی احتیاج محسوس کرتا ہے اور اس بات کے لئے بے تاب رہتا ہے کہ اُس کا ہر فطری جذبہ اپنی کامل صورت میں رونما ہو اور صانعِ فطرت نے جس غرض کیلئے انسان کو مختلف جذبات میں ڈھالا ہے وُہ غرض اُسے حاصل ہو۔ انسان کی اس طبعی اور فطری خواہش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غور کرو جب اللہ تعالیٰ نے پیدائشِ انسانی کے ساتھ ہی اُس کی فطرت میں جذبۂ محبت بھی رکھ دیا تھا اور جذبۂ نفرت بھی تو جب تک اِن دونوں جذبات کی تکمیل نہ ہو جاتی، جب تک ایسا انسان دنیا میں پیدا نہ ہوتا جو اللہ تعالیٰ سے اتنی محبت کرتا کہ اس سے بڑھ کر اور کسی سے محبت نہ کرتا اور شیطان سے اتنی نفرت کرتا کہ اس سے بڑھ کر اور کسی سے نفرت نہ کرتا اُس وقت تک یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ انسان اپنے ارتقاء کو پہنچ گیا ہے۔ تم اگر یہ کہتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی دنیا اپنے ارتقائی نقطہ کو حاصل کر چکی تھی تو یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ابھی تک نہ تعلیم ایسی آئی تھی جو خدا تعالےٰ سے کامل محبت اور شیطان سے کامل نفرت کا سبق دیتی اور نہ کوئی انسان ایسا مبعوث ہُوا تھا جس نے ان جذبات کو اپنے کمال تک پہنچا دیا ہو اور جس نے خدا تعالےٰ سے ایسی محبت کی ہو جو اپنی ذات میں بے مثال ہو اور شیطان سے ایسی نفرت کی ہو جو اپنی ذات میں بے مثال ہو۔ اس لئے تم نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کا مقصود پورا ہو چکا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جس خدا نے انسان کو ان دو طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس نے کامل درجہ کی محبت اور کامل درجہ کی نفرت کا مادہ اُس کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اے محمد رسول اللہ اُس کا نام لے کر پڑھ یعنی دنیا میں اعلان کر کہ آج میرے ذریعہ خدا تعالےٰ سے کامل محبت اور شیطان سے کامل نفرت کا ظہور ہونے والا ہے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا گیا ہے یعنی ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر بڑھایا گیا ہے جس طرح انسانی فرد کو ہم نے اس رنگ میں بنایا ہے کہ وہ ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے کمال تک پہنچتا ہے اِسی طرح ہم نے تمام مخلوق کو بنایا ہے اور وہ اپنے کمال کے ظہور کے لئے ایک تدریج کی محتاج ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو اگر کسی عورت کے پیٹ میں بچہ ہو اور اُس کا پانچویں یا چھٹے مہینے اسقاط ہو جائے تو تم ایسی عورت کو بچہ والی عورت نہیں کہتے۔ بچے والی عورت تم اُسی کو کہو گے جس کا بچہ پورے دنوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی طرح اگر مخلوق تدریجی رنگ میں ترقی کرتے کرتے اپنے ارتقاء کے آخری نقطہ تک نہ پہنچتی تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے کسی بچے کا پانچویں یا چھٹے ماہ اسقاط ہو جاتا ہے۔ اگر موسیٰ کے بعد دنیا ختم ہو جاتی تو کہا جاتا کہ وہ مخلوق جو اللہ تعالےٰ نے پیدا کرنی چاہی تھی اُس کا

۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ سے یہ مراد کہ انسان کے اندر جذباتِ محبت رکھے گئے ہیں۔

۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے دوسرے معنے کہ انسان نے تدریجاً ترقی کی۔

استقاط ہوگیا۔ اگر عیسیٰ پر دنیا ختم ہو جاتی تو کہا جاتا کہ وہ مخلوق
جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی چاہی تھی اُس کا اسقاط ہو گیا۔
اگر پیدائش عالم کے نتیجہ میں ایک کامل وجود پیدا نہ ہوتا اور
اُس سے پہلے ہی یہ سب دنیا فنا ہو جاتی تو کہا جاتا کہ وہ مخلوق
جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی چاہی تھی اُس کا اسقاط ہوگیا۔ جیسے
حمل کے پانچویں یا چھٹے مہینہ میں بعض دفعہ بچہ گر جاتا ہے اور
عورت کو کوئی شخص صاحب اولاد نہیں کہتا۔ یہی حال دنیا کا ہوتا
اگر نویں مہینہ کا کامل وجود اس دنیا میں پیدا نہ ہوتا تو بنی نوع
انسان کی پیدائش بالکل اکارت چلی جاتی۔ دنیا بانجھ تو کہلا سکتی
تھی مگر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جس مقصد کے لئے اس دنیا کو
پیدا کیا گیا تھا وہ حاصل ہو گیا ہے۔ بے شک اس سے پہلے
عیسیٰ بھی آئے اور موسیٰ بھی آئے اور ابراہیم بھی آئے اور نوحؑ
بھی آئے مگر موسیٰ اور عیسیٰ اور ابراہیم اور نوح کی مثال پانچویں
یا چھٹے ماہ کے بچہ کی سی ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کی مثال اُس نویں ماہ کے بچہ کی سی ہے جو تندرستی کی حالت میں
پیدا ہوا تم پانچویں ماہ کے بچہ کو بچہ نہیں کہتے کیونکہ وہ کامل نہیں
ہوتا۔ تم چھٹے ماہ کے بچہ کو بچہ نہیں کہتے کیونکہ وہ کامل نہیں ہوتا
تم صرف نویں ماہ کے بچہ کو بچہ کہتے ہو کیونکہ وہ کامل ہوتا ہے۔ اسی
طرح موسیٰ اور عیسیٰ کے ساتھ تمہاری تکمیل نہیں ہو سکتی تمہاری تکمیل
وابستہ ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات سے۔ ان
کے بغیر دنیا اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر سکتی۔

غرض یہاں دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ خَلَقَ
الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ سے مراد خون کا لوتھڑا ہے اور آیت کے یہ
معنے ہیں کہ انسان کو ادنیٰ حالت سے ترقی دی ہے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے
محبت اور نفرت کے جذبات دے کر پیدا کیا ہے جب تک محبت
اور نفرت کے جذبات اُس میں کامل طور پر ظاہر نہ ہو جائیں اُس
وقت تک پیدائش انسانی کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا پس
ایسی شریعت کا آنا ضروری تھا جو ایک طرف خدا تعالیٰ سے
کامل محبت کی تعلیم دیتی اور دوسری طرف شیطان سے کامل نفرت
کی تعلیم دیتی یا ایسا انسان ظاہر ہوتا جو ایک طرف اللہ تعالیٰ سے
کامل اتصال رکھتا اور دوسری طرف شیطان سے کامل بُعد اُس
کی طبیعت میں پایا جاتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ
دونوں دعوے قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى
(النجم ع۱) یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خدا تعالیٰ
سے محبت کا تعلق اس قدر بڑھا کہ آپ خدا تعالیٰ کی طرف تیزی
سے بڑھے اور خدا تعالیٰ آپ کی طرف تیزی سے بڑھا۔ یہ اُس
کامل اتصال کا ثبوت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ
سے تھا۔ دوسری طرف آپ کو شیطان سے اس قدر بُعد تھا کہ آپ
فرماتے ہیں وَلٰكِنَّهٗ اَعَانَنِیْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ (مسلم)
کہ میرے شیطان کو مسلمان بنا دیا گیا ہے یعنی اگر شیطان بھی میرے
پاس آئے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ مجھے
کوئی بُری تحریک کرے میرا رنگ اُس پر چڑھ جاتا ہے اور مجھے
بُرائی میں ملوث کرنے کی بجائے خود نیکی سے حصہ لینے لگ جاتا ہے۔
یہ اُس انتہاء درجہ کی محبت کا ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے دل میں اللہ تعالیٰ کے متعلق پائی جاتی تھی کہ آپ کے پاس جو
جو چیز آتی وہ اپنی خاصیت کو بدل کر اُسی رنگ میں رنگین ہو جاتی
جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا تھا۔ جیسے کہتے ہیں

ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں خدا تعالیٰ
کی اتنی شدید محبت تھی اور شیطان کی اتنی شدید نفرت آپ کے قلب
میں پائی جاتی تھی کہ آپ فرماتے ہیں کہ اگر شیطان بھی میرے پاس
آئے تو مجھ پر شیطان کا رنگ نہیں چڑھے گا بلکہ میرا رنگ اُس پر
چڑھ جائے گا۔ یہ کمال درجہ کی نفرت ہے کہ شیطان کا آپ سے
ٹکراؤ ہوتا ہے تو شیطان آپ پر غالب نہیں آ سکتا بلکہ آپ شیطان
پر غالب آجاتے ہیں اور نہ صرف اس رنگ میں غالب آتے ہیں کہ
اُس کے بُرے اثر کو قبول نہیں کرتے بلکہ خود اُس پر اپنا رنگ
چڑھا کر اُسے مسلمان بنا دیتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ پر غور کر کے دیکھ لو صرف ایک ہی وجود ایسا نظر آئے گا جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا تعالیٰ سے ایسا کامل تعلق رکھتا ہوں کہ مجھ میں اور اُس میں کوئی دُوئی نہیں رہی اور شیطان سے مجھے اتنی کامل نفرت ہے کہ وہ کسی رنگ میں بھی مجھ پر غالب نہیں آسکتا۔ اگر وہ میرے پاس آئے تو میں ہی اُس پر غالب آؤں گا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مجھے مغلوب کرے یا مجھے برائیوں میں ملوث کرسکے پس تعلق کا کمال دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے اور تعلق پیدا کرنے والی تعلیم کا کمال قرآن کریم نے پیش کیا ہے کہ اُس کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کا عشق پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہا ہے۔ دشمن سے دشمن عیسائیوں کی کتابیں جب ہم پڑھتے ہیں تو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی محبت پر جتنا زور قرآن کریم نے دیا ہے اتنا زور دنیا کی اور کسی کتاب میں نظر نہیں آتا۔ کوئی صفحہ اُٹھا کر دیکھ لو اُس میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کا ذکر آئے گا اور بات بات میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ کیا جائیگا اور یہ کیفیت کسی ایک سورۃ یا ایک پارہ سے مخصوص نہیں۔ بسم اللہ سے لیکر والناس تک قرآن کریم پڑھ جاؤ اُس کا کوئی صفحہ ایسا نظر نہیں آئیگا جس میں بار بار اللہ تعالیٰ کا نام نہ آتا ہو اور بار بار اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور نہ دیا گیا ہو۔ باقی کتابوں کی یہ حالت ہے کہ اُن میں کہیں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں شخص پہاڑ پر گیا اور لوگوں نے اُسے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑہ اور شہد کا چھتہ کھانے کو دیا۔ کہیں لکھا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں پر جن بھوت سوار تھے وہ حضرت مسیح کے پاس آئے انہوں نے ان جنات کو نکال کر سؤروں کے غول میں ڈال دیا اور وہ سؤر سب کے سب پانی میں ڈوب کر مر گئے۔ غرض ایسی ایسی باتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر قرآن کریم کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے نام سے خالی ہو۔ تورات کے صفحوں کے صفحے۔ بقیہ بائبل کے صفحوں کے صفحے اور انجیل کے صفحوں کے صفحے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی ہیں لیکن قرآن وہ کتاب ہے جس کا کوئی ایک صفحہ بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی نہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ الگ مضمون بھی ہوسکتا ہے اور پہلے خَلَقَ یعنی اَلَّذِیْ خَلَقَ کا یہ بدل بھی ہوسکتا ہے۔ اگر اس خَلَقَ کو پہلے خَلَقَ کا بدل سمجھا جائے تو اس صورت میں اس کے وہی معنے ہوں گے جو اوپر بیان کئے جاچکے ہیں یعنی خلق سے عام پیدائش مراد نہیں بلکہ انسان کی پیدائش مراد ہے۔ لیکن اگر اس کو علیحدہ مضمون قرار دیا جائے تو ترجمہ یُوں ہوگا کہ تُو پیدا کرنے والے رب کے نام سے پڑھ خصوصاً اُس رب کے نام سے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ تمام پیدائش ہی انسان کی پیدائش کے تابع ہے گویا انسانی پیدائش ہی اصل مقصود تھی۔ پھر اس پیدائش میں سے پیدائش محمدی ہی مقصود تھی۔ پس اے محمد رسول اللہ تُو اللہ تعالیٰ کو اُس کا یہ مقصد یاد دلا کر کام شروع کر۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ خود ہی اس کام کو شروع کرنے والا ہے اور اُس نے پیدائش عالم کے وقت سے ایک مقصد اپنے سامنے رکھا تھا اور وہ مقصد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی تو پھر بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کہنے کا کیا فائدہ تھا۔ کیا خدا تعالیٰ کو اپنا مقصد نعوذ باللہ بھول گیا تھا کہ اس ذریعہ سے اُسے یاد دلانا ضروری سمجھا گیا؟ اس کا ایک جواب تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تُو رسول ہونے کی حیثیت سے اس کام کو شروع کر ہماری تائید تیرے ساتھ ہوگی اور ہماری نصرت تیرے شامل حال ہوگی پس باوجود اس حقیقت کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام جہان کا مقصود تھے اور پیدائش عالم کے روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ صرف آپکی ذات تھی پھر بھی ان الفاظ کی زیادتی بلا وجہ نہیں کی گئی بلکہ اس میں بہت بڑی حکمت ہے اور وہ یہ کہ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کہہ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان کیا گیا ہے اور آپ کو کہا گیا ہے کہ تو ہمارے نام کے ساتھ دنیا کو یہ پیغام سُنا۔ جو لوگ تجھ پر ایمان لائیں گے اُنہیں میری رضا

حاصل ہوگی اور جو انکار کریں گے وہ میرے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور جواب بھی ہے اور وہ یہ کہ دعا کے بھی کئی طریق ہوتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کی اُسی صفت سے دعا مانگنی جو مقصد کے ساتھ متعلق ہو زیادہ بابرکت ہوتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ دعا کا صحیح طریق یہ ہے کہ جس صفت سے دعا کا تعلق ہو اُس کا نام لے کر دعا کی جائے۔ اگر کسی شخص کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ یہ دعا کرے کہ اے خالق مجھے بچہ دے تو یہ دعا کا ایک صحیح طریق ہوگا۔ لیکن اگر وہ یہ دعا کرے کہ اے جبار مجھے بچہ دے یا اے قہار مجھے بچہ دے یا اے مُمیت مجھے اولاد عطا کر۔ تو گو ممکن ہے اللہ تعالےٰ پھر بھی اُس کے تضرع کو دیکھ کر اُسے اولاد عطا کر دے مگر ہر سننے والا شخص یہی کہے گا کہ یہ بڑی ردّی قسم کی دعا ہے۔ وہ دُعا تو یہ مانگتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُس کے ہاں اولاد پیدا کرے اور وہ اپنی مدد کے لئے اُس صفت کو پکار رہا ہے جس کا تعلق پیدا کرنے سے نہیں بلکہ مارنے کے ساتھ ہے یا قہر اور غضب کے ساتھ ہے یا مثلاً ایک شخص اگر اس رنگ میں دعا کرتا ہے کہ اے مُمیت خدا میرے دشمن نے مجھے سخت تنگ کر رکھا ہے تو میرے دشمن کو ہلاک کر اور مجھے اُس کے شر سے محفوظ رکھ تو یہ بالکل صحیح دعا ہوگی۔ لیکن اگر وُہ اس طرح دعا کرے کہ اے مُحی خدا۔ اے خالق خدا میرے دشمن کو ہلاک کر دے تو یہ کیسی بیوقوفی والی بات ہوگی۔ پس اگر اُس صفت کو ملحوظ رکھ کر دعا کی جائے جو دعا کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو تو انسان کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ اِسی حکمت کے ماتحت اللہ تعالےٰ نے یہاں بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا اضافہ کیا اور فرمایا جب تُو دعا مانگنے لگے تو اس رنگ میں دعا مانگ کہ اے خدا جس نے پیدائش عالم سے میری بعثت کو اپنی دنیا کا مقصد قرار دیا ہُوا ہے میں تجھ سے اسی ارادہ کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ تُو مجھے کامیاب کر۔ اگر تُو اس رنگ میں دعا مانگے گا تو تیری دعا بہت جلد قبول ہوگی اور تو قلیل سے قلیل عرصہ میں اپنے مقاصد کو حاصل کر لے گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جب متعلقہ صفت کو ملحوظ رکھ کر دُعا مانگی جائے تو خود انسان کی امید بڑھ جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ مثلاً جب یہ دعا کی جائے کہ اے خدا تُو نے کہا تھا کہ مَیں ساری دنیا کو ایک ہاتھ پر جمع کروں گا اور تُو نے اِسی مقصد کے لئے ساری دنیا کو پیدا کیا تھا اب میں تجھ کو تیری اسی صفت کا واسطہ دے کر جو تمام پیدائش عالم کا موجب ہوئی التجا اور دعا کرتا ہوں کہ دنیا کو ایک ہاتھ پر جمع کر دے اور اُس مقصد کو پورا کر جو پیدائش عالم کا موجب تھا۔ تو ایک طرف اللہ تعالےٰ کا فضل زیادہ زور کے ساتھ نازل ہونا شروع ہو جائے گا اور دوسری طرف خود دعا مانگنے والے کی اپنی امید بڑھ جائیگی اور اس کے سامنے یہ امر رہے گا کہ میری کامیابی میں کوئی شبہ نہیں جس کام کے لئے میں کھڑا ہوا ہوں وہ ضرور ہو جائے گا کیونکہ وہ مقصود ہے اللہ تعالیٰ کا۔ بلکہ اگر مجھ سے کوئی کمزوری بھی ہوئی تب بھی ہو جائیگا۔ پس دوسرا فائدہ دعا کے مطابق اللہ تعالےٰ کی صفات کو اپنے سامنے رکھنے کا یہ ہوتا ہے کہ خود انسان کے اندر امید پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا کام اب ضرور ہو جائے گا۔

تیسری حکمت اس طریق میں یہ تھی کہ اُس سلسلہ پر نظر کر کے جو ایک لمبے عرصہ سے چلا آتا تھا آپ کا ایمان بھی اور جوشِ عمل بھی ترقی کرتا جائے گا۔ جب آپ یہ کہیں گے کہ اے خدا جس نے آدمؑ کو دنیا کی ترقی کے لئے بھیجا پھر اُسے اَور ترقی دینے کے لئے نُوحؑ کو بھیجا پھر اَور ترقی دینے کیلئے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھیجا اور پھر اور ترقی دینے کے لئے مجھے بھیجا تو اسلام کو فتح دے تو آپ کے دل میں اسلام کے غلبہ اور اُس کی کامیابی کے متعلق جو یقین پیدا ہوگا ظاہر ہے۔ اس طرح ہر وقت آپ کے سامنے یہ امر رکھا گیا کہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالےٰ اس سلسلہ کو باطل کر دے اور اُس غرض کو پورا نہ کرے جس کی بنیاد اُس نے آدمؑ کے وقت سے رکھ دی تھی۔ غرض ایک طرف اس ذریعہ سے آپ کے دل میں یقین کامل پیدا کیا گیا۔ دوسری طرف ایمان اور جوشِ عمل میں ترقی بخشی گئی اور تیسری طرف خدائی فضل کو خود اُس کے مقصد کا واسطہ دیکر جوش دلایا گیا۔ پس بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ

(پھر ہم کہتے ہیں کہ) پڑھ۔ (اور تیرا یہ کہنا غلط تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) صدقہ تھا لیکہ تیرا رب (اتنا) بڑا کریم (ہونا ظاہر کر رہا) ہے۔ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا (ہے اور آئندہ بھی سکھائیگا) ۵

مضافہ بے فائدہ نہیں بلکہ اپنے اندر بہت بڑے فوائد اور حکمتیں رکھتا ہے۔

۴ حل لغات - اَکْرَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور کَرِیْمٌ کے معنے سخی کے بھی ہوتے ہیں اور کَرِیْمٌ اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جس سے زیادہ نفع پہنچے۔ اسی طرح ہر چیز میں سے جو زیادہ اچھی ہو اُسے بھی کَرِیْمٌ کہتے ہیں (اقرب) گویا ہر چیز کے آخری نقطہ کو عربی زبان میں کَرِیْمٌ کہا جاتا ہے۔ جب کَرِیْمٌ کے معنے اَحْسَن کے ہوتے تو اَکْرَم کے معنے ہوئے احسنوں کا احسن۔ پس رَبُّكَ الْاَکْرَمُ کے یہ معنے ہیں کہ تیرا رب وہ ہے جو اچھی سے اچھی چیزوں سے بھی احسن ہے۔

تفسیر - رَبُّكَ الْاَکْرَمُ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا تعالےٰ کے اَکْرَم ہونے کا حق دنیا نے تلف کر رکھا ہے۔ اللہ تعالےٰ اَکْرَم ہے مگر دنیا میں اُس کے اَکْرَم ہونے کا حق ادنیٰ معبودوں کو دے دیا گیا ہے۔ کوئی بُتوں کو پُوجتا ہے۔ کوئی عیسیٰؑ کی پرستش کرتا ہے اور کوئی کسی اور کے آگے اپنے سر کو جھکا رہا ہے۔ تو اُٹھ اور خدا تعالےٰ کا حق اُسے واپس دلا۔ دنیا نے اللہ تعالےٰ کی شان کو نہیں پہچانا۔ اُس نے خدائی کا حق کچھ بُتوں کو دے دیا ہے اور کچھ انسانوں کو۔ اب تیرا کام یہ ہے کہ تو دنیا پر خدا تعالےٰ کے اَکْرَم ہونے کی شان کو ظاہر کرتا آستانۂ اُلوہیت سے بُھولی بھٹکی مخلوق پھر اُس کی طرف واپس آئے اور پھر اُس کے اَکْرَم ہونے کی شان دنیا میں تسلیم ہونے لگے۔

دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تُو اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھ جس خدا نے تجھے کھڑا کیا ہے وُہ اَکْرَم ہے۔ وہ احسنوں کا بھی احسن ہے تجھے اپنی تعلیم کے متعلق یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اس وقت خدا تعالےٰ کے اَکْرَم ہونے کا جلوہ ظاہر ہونے والا ہے۔ بے شک موسیٰؑ کے وقت بھی خدا تعالےٰ کا جلوہ ظاہر ہُوا مگر وہ جلوہ اُس کے اَکْرَم ہونے کا نہیں تھا۔ اسی طرح داؤدؑ اور سلیمانؑ اور عیسیٰؑ وغیرہ کے زمانہ میں بھی خدا تعالےٰ کا جلوہ ظاہر ہُوا مگر وہ جلوہ خدا تعالیٰ کے اَکْرَم ہونے کا نہیں تھا۔ اب تیرے ذریعہ اللہ تعالےٰ اپنے اَکْرَم ہونے کا جلوہ ظاہر کرنے والا ہے اور اُس کی صفات کا ایسا ظہور ہوگا جس کی مثال دنیا میں اس سے پہلے نہیں مل سکتی۔ اس لئے تیرے لئے مایوسی اور گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔

۵ تفسیر - اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ نے قلم سے بندہ کو سکھایا ہے کیونکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ کب قلم لیکر اللہ تعالےٰ نے اپنے کسی بندے کو الف اور با سکھلائی ہے جب ایسا کبھی ہُوا ہی نہیں تو یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے قلم سے بندے کو سکھایا۔ اسی طرح اس سے یہ مراد بھی نہیں ہو سکتی کہ بندہ جو کچھ قلم سے سکھاتا ہے وہ سب خدا تعالےٰ کا سکھایا ہُوا ہوتا ہے کیونکہ بندے دوسروں کو جھوٹ بھی سکھاتے ہیں۔ دغا اور فریب بھی سکھاتے ہیں۔ اخلاق اور روحانیت سے گری ہوئی باتیں بھی سکھاتے ہیں۔ گندے اور ناپاک اشعار بھی سکھاتے ہیں۔ الف لیلہ کے قصے بھی سکھاتے ہیں۔ ہزاروں افراد دنیا میں ایسے پائے جاتے ہیں جو لغویات لکھتے اور لغویات شائع کرتے رہتے ہیں۔ پھر قلم کو کام لینے والے وہ لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو اللہ تعالےٰ کے منکر ہیں۔ وہ لوگ بھی موجود ہیں جو خلاق کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے۔ وہ لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کے خلاف ہیں۔ غرض ہر سچی تعلیم کا منکر دنیا میں موجود ہے اس لئے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ بندہ جو کچھ قلم سے سکھاتا ہے وہ سب خدا تعالےٰ کا سکھایا ہُوا ہوتا ہے کیونکہ اُس میں ہزاروں افتراء ہوتے ہیں۔

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں گو ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد مستقبل ہے۔ یہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ کبھی ماضی کا

صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور مراد استقبال ہوتا ہے قرآن کریم میں یہ محاورہ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح الہامات میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ درحقیقت ماضی کو استقبال کے معنوں میں اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ ماضی سب سے زیادہ قطعی اور یقینی ہوتی ہے۔ جب انسان کوئی کام کر رہا ہو تو ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ اُس کام کو پوری طرح کر بھی سکے گا یا نہیں۔ مثلاً زید پڑھ رہا ہو تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسی طرح پڑھتا چلا جائے گا یا مر جائے گا۔ لیکن جب ہم کہیں زید پڑھ چکا ہے تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ واقعہ ماضی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے الہامات میں جب قطعی اور یقینی طور پر کسی بات کو بیان کرنا ہو تو وہ ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تم اس بات کو ایسا سمجھو کہ گویا ہو چکی ہے اور اس کا وقوع بالکل قطعی اور یقینی ہے ایسا ہی قطعی اور یقینی جیسے ماضی ہوتی ہے۔ اسی طرح گو اس جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علوم کو قطعی اور یقینی اور غیر متبدل طور پر قلم کے ذریعہ سکھانے گا یعنی یہ قرآن لکھا جائے گا لکھ کر قائم کیا جائے گا اور اس کی تائید میں لوگوں کی قلمیں چلا کریں گی۔ اب دیکھو قرآن کریم کی یہ پیشگوئی کیسے یقینی طریق پر پوری ہوئی ہے۔ دنیا میں صرف یہی ایک کتاب ہے جو قلم سے محفوظ کی گئی ہے اس کے علاوہ اور کوئی کتاب قلم سے محفوظ نہیں ہوئی۔ موسیٰؑ کی کتاب اُس وقت نہیں لکھی گئی جب وہ موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ ابراہیمؑ کے صحف اُس وقت نہیں لکھے گئے جب وہ ابراہیمؑ پر نازل ہوئے تھے۔ وید اُس وقت نہیں لکھے گئے جب وہ رشیوں پر نازل ہوئے تھے۔ ژند اور اوستا اُس وقت نہیں لکھی گئیں جب وہ زرتشت پر نازل ہوئی تھیں انجیل اُس وقت نہیں لکھی گئی تھی جب حضرت مسیحؑ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ بتازہ الہامات ہوتے تھے۔ غرض دنیا میں کوئی ایک الہامی کتاب بھی ایسی نہیں جو ابتداء میں لکھی گئی ہو۔ صرف قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو شروع سے لکھی گئی ہے۔

ماضی کے صیغہ کا استعمال قطعی معنوں میں

اور آج تک انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن الفاظ میں یہ کتاب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اور یہ بات ایسی پختہ اور یقینی ہے کہ دشمنانِ اسلام تک یہ لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ دنیا میں اگر کوئی کتاب ایسی ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شروع سے لے کر اب تک ایک حرف اور ایک زبر اور ایک زیر کے تغیر کے بغیر اُسی رنگ میں محفوظ ہے جس رنگ میں وہ دنیا کے سامنے پیش ہوئی تو وہ صرف قرآن کریم ہے۔ میور۔ نولڈکے اور سپرنگر جو مشہور یورپین مستشرق ہیں اور جنہوں نے اسلام کی مخالفت میں اپنی تمام عمر بسر کی ہے انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی فرق نہیں پڑا یہ شروع سے لیکر اب تک ہر قسم کے تغیر اور انسانی دست برد سے محفوظ چلا آرہا ہے۔

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں اس بات کی پیشگوئی کہ قرآن کے ذریعہ علوم پھیلیں گے

پھر عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ قرآن کریم کے ذریعہ آئندہ سارے علوم دنیا میں پھیلیں گے۔ چنانچہ آج جس قدر علوم نظر آتے ہیں یہ سب قرآن کریم کے طفیل معرضِ وجود میں آئے ہیں۔

قرآن کریم عربوں میں نازل ہوا اور عرب بالکل جاہل تھے۔ اُنہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ تاریخ کس علم کا نام ہے یا صرف اور نحو کون سے علوم ہیں یا فقہ اور اصولِ فقہ کس چیز کا نام ہے۔ مگر جب قرآن کریم پر ایمان لانے کی سعادت اُن کو حاصل ہوگئی تو قرآن کریم کی وجہ سے اُنہیں اِن تمام علوم کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً جب انہوں نے قرآن کریم میں پڑھا کہ پہلے زمانوں میں فلاں فلاں انبیاء آئے ہیں اور اُن کے ساتھ یہ یہ واقعات پیش آئے تھے تو قرآن کریم کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اُنہیں گذشتہ واقعات کی چھان بین کرنی پڑی اور اس طرح علم تاریخ کی ایجاد عمل میں آئی۔ پھر بے شک قرآن کریم عربی زبان میں تھا اور اہل عرب کے لئے اُس کا سمجھنا یا اس کی صحیح تلاوت کرنا کوئی مشکل امر نہیں تھا مگر جب اسلام نے عرب کی سرزمین سے باہر قدم رکھا تو غیر اقوام کے میل جول کی وجہ سے عربوں میں بھی اعراب کی غلطیاں شروع ہوگئیں جس پر انہیں اس زبان کے

قواعد جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح علم صرف اور نحو کی ایجاد ہوگئی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ابوالاسود اپنے گھر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اُن کی بیٹی قرآن کریم کی آیت اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ کو اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلِهٖ پڑھ رہی ہے۔ آیت کے معنے تو یہ ہیں کہ اللہ اور اُس کا رسول دونوں ہی مشرکوں سے بیزار ہیں مگر رَسُوْلُهٗ کی بجائے رَسُوْلِهٖ پڑھنے سے آیت کے یہ معنے بن جاتے ہیں کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اپنے رسول سے بھی گویا پیش کی جگہ زیر پڑھنے سے آیت کے کچھ کے کچھ معنے ہوگئے۔ وہ گھبرائے ہوئے حضرت علیؓ کے پاس گئے اور اُن سے کہا ہمارے ملک میں اب بہت سے عجمی لوگ آگئے ہیں اور ہماری بیٹیاں بھی اُن سے بیاہی گئی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری زبان خراب ہوگئی ہے۔ میں ابھی اپنے گھر گیا تھا تو میں نے اپنی بیٹی کو اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ کی بجائے اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلِهٖ پڑھتے سُنا۔ اگر اسی طرح غلطیاں شروع ہوگئیں تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ اس کے انسداد کے لئے ہمیں عربی زبان کے متعلق قواعد مدوّن کرنے چاہئیں تاکہ لوگ اس قسم کی غلطیوں کے مرتکب نہ ہوں۔ حضرت علیؓ اُس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں باہر تشریف لے جا رہے تھے آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ چنانچہ اسی وقت آپ نے بعض قواعد بتلائے اور پھر فرمایا اُنْحُ نَحْوَهٗ وَنَحْوَهٗ اس بنیاد پر اَور بھی قواعد بناؤ۔ چنانچہ اسی بناء پر اس کو علم نحو کہا جاتا ہے۔ پس قرآن کریم کی صحت کے لئے علم صرف اور نحو ایجاد ہوئے پھر قرآن کریم کے معانی کے لئے لُغت لکھی گئی۔ کیونکہ عربوں کو خیال آیا کہ جب عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوتے تو وہ قرآن کریم کے معنے کس طرح سمجھیں گے۔ پس لغت بھی قرآن کریم کی خدمت کے لئے لکھی گئی۔ اس کے بعد قرآن کریم کی تشریح کیلئے علم فقہ اور اصول فقہ کی ایجاد عمل میں آئی۔ اسی طرح علم معانی اور علم بیان محض قرآن کریم کے طفیل ایجاد ہوئے۔ پھر قرآن کریم کے محاورات اور اُس کے استعارات کی حقیقت واضح کرنے کے لئے بلاغت کی بنیاد پڑی کیونکہ اس کے بغیر قرآنی محاورات کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

اس فن کے متعلق لُغت کی کتب میں ایک لطیفہ بیان ہُوا ہے لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی شخص نے مجلس میں اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کریم میں بعض ایسی باتیں آتی ہیں جو عقل کے بالکل خلاف ہیں۔ مثلاً لکھا ہے یُرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ (کہف ع۱۱) کہ دیوار یہ ارادہ کر رہی تھی کہ گر جائے۔ بھلا دیوار بھی کبھی گرنے کا ارادہ کیا کرتی ہے یہ کیسی جاہلوں والی بات ہے جو قرآن کریم نے کہی ہے۔ ایک اور عالم شخص وہاں موجود تھے مگر انہیں اس اعتراض کا جواب نہ آیا وہ حیران تھے کہ میں کیا کہوں کہ تھوڑی دیر کے بعد ہی اُس شخص نے اپنے نوکر کو جو کسی اچھے قبیلہ میں سے تھا بلایا اور اُسے کہا میرا فلاں دوست بیمار ہے جاؤ اور اس کا حال دریافت کرکے آؤ۔ وہ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی آکر کہنے لگا حضور میں کیا عرض کروں یُرِیْدُ اَنْ یَّمُوْتَ وہ تو مرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ یہ سُنتے ہی اُس پر گھڑوں پانی پھر گیا کہ میں جو کچھ اعتراض کر رہا تھا اُس کا جواب مجھے اپنے نوکر کے ذریعہ مل گیا۔ اُس کا اعتراض یہ تھا کہ دیوار بھی کبھی ارادہ کیا کرتی ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس رنگ میں دیا کہ اُس کے اپنے نوکر نے اُسے آکر کہدیا کہ یُرِیْدُ اَنْ یَّمُوْتَ۔ وہ مرنے کا ارادہ کر رہا ہے حالانکہ مرنے کا کوئی شخص ارادہ نہیں کیا کرتا۔ دراصل یہ ایک استعارہ تھا اور اس کے معنے یہ تھے کہ وہ مرنے پر تیار ہے۔ اسی طرح یُرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ کے معنے یہ ہیں کہ وہ دیوار گرنے پر تیار تھی نہ یہ کہ دیوار کوئی جاندار چیز ہے جو گرنے کا ارادہ کیا کرتی ہے۔

غرض یہ علوم جو دنیا میں یکے بعد دیگرے دنیا میں ظاہر ہوئے محض قرآن کریم کے طفیل اور اُس کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمائے ہیں۔ اگر یہ علوم پیدا نہ ہوتے تو قرآن کریم کی حقیقت اور اس کی اعلیٰ درجہ کی شان کو لوگ پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتے۔ یہی حال علم اقتصادیات کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے

قرآنی اقتصادیات کی توضیح کے لئے دنیا میں قائم کیا غرض صرف کیا اور نحو کیا اور تاریخ کیا اور ادب کیا اور کلام کیا اور فقہ کیا سب علوم قرآن کریم کی خدمت کے لئے نکلے ورنہ عرب تو محض جاہل تھے۔ انہیں ان علوم کی طرف توجہ ہی کس طرح پیدا ہو سکتی تھی۔ ان کو توجہ محض اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے قرآن کو مانا اور پھر قرآن کریم سے دنیا کو روشناس کرانے کے لئے انہیں ان علوم کی ایجاد یا ان کے پھیلانے کیطرف متوجہ ہونا پڑا اب رہی باقی دنیا سو اس نے بھی قرآن کریم سے ہی ان تمام علوم کو سیکھا ہے کیونکہ یہ علوم وہ ہیں جو عربوں نے ایجاد کئے یا زندہ کئے اور پھر عربوں سے باقی دنیا نے لئے۔ یورپ نے ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں کے اس احسان کو چھپانے کی کوشش کی ہے مگر اب خود یورپ میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی کتابوں میں بڑے زور سے لکھتے ہیں کہ یہ کیسی بے شرمی اور بے حیائی ہے کہ علم تو مسلمانوں سے سیکھا جائے مگر اپنی کتابوں میں ان کا ذکر تک نہ کیا جائے اور اس رنگ میں اپنے آپ کو پیش کیا جائے کہ گویا ان علوم کے موجد ہم ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ احسان فراموشی کی بدترین مثال ہے کہ جنہوں نے ہم کو علم سکھایا ہے ہم ان کا ذکر تک نہیں کرتے اور اپنی طرف تمام علوم کو منسوب کرتے چلے جاتے ہیں۔ میرے پاس اس قسم کی کئی کتابیں ہیں اور میں نے دیکھا ہے ان کتابوں کے مصنف اتنی شدت کے بحث کرتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے اپنی قوم کے اس فعل کے خلاف ان کے قلوب غیظ و غضب سے بھرے پڑے ہیں جب ایک طرف وہ مسلمانوں کے احسانات کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی قوم کی ڈھٹائی کو دیکھتے ہیں کہ ایک ایک چیز مسلمانوں سے حاصل کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کا نام تک نہیں لیتی تو ان کے دلوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ سخت تکبر امی ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایک چیز کو اپنا لیا جائے مگر ان کے علم و فضل اور احسان کا اشارۃً بھی ذکر نہ کیا جائے۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں موسیقی پر بحث کی گئی تھی۔ موسیقی کا آغاز بھی مسلمانوں سے ہی ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ترتیل کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کا حکم دیا تھا اسی سے ان کو موسیقی کی طرف توجہ ہوئی جس نے رفتہ رفتہ ایک بہت بڑے علم کی صورت اختیار کر لی۔ یورپ دعویٰ کرتا ہے کہ موجودہ موسیقی کا علم اس نے ایجاد کیا ہے مگر جس کتاب کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کے مصنف نے بڑے زور سے یہ بات پیش کی ہے کہ یورپ کا یہ ادّعا محض دھوکہ اور فریب ہے۔ موسیقی کا علم یورپ نے مسلمانوں سے سیکھا ہے اور پھر وہ اس کا ثبوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ برٹش میوزیم میں فلاں نمبر پر فلاں کتاب موجود ہے اس میں فلاں پادری کے نام کا ایک خط درج ہے جو کسی عیسائی نے اسے لکھا۔ اور اس خط کا مضمون یہ ہے کہ میں سپین گیا تھا وہاں مسلمانوں کی موسیقی کا کمال دیکھ کر میں حیران رہ گیا مسلمانوں کی موسیقی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور ان کے مقابلہ میں ہماری موسیقی بہت ادنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں اور یہ امر دین نصرانیت کے خلاف نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ ان کی موسیقی کا ترجمہ یورپین لوگوں کے لئے کر دوں تاکہ ہمارے گرجاؤں میں بھی یہ اعلیٰ درجہ کی موسیقی رائج ہو جائے اور عیسائیت زیادہ محبوب ہو جائے۔ وہ کہتا ہے اس خط کا پادری صاحب نے جو جواب دیا وہ بھی آج تک برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ پادری صاحب نے جواب یہ دیا کہ کوئی حرج نہیں آپ سپین کی موسیقی کا بے شک ترجمہ کریں مگر دیکھنا مسلمانوں کا نام نہ لینا اگر تم نے نیچے حوالہ دے دیا اور یہ ذکر کر دیا کہ یہ موسیقی مسلمانوں سے لی گئی ہے تو ان کی عظمت قائم ہو جائے گی۔ اس لئے نقل تو بے شک کرو مگر مسلمانوں کا نام نہ لو تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ تم یہ علم اپنی طرف سے بیان کر رہے ہو۔

غرض یورپ نے چاہا کہ یہ بات پوشیدہ رہے کہ اس نے مسلمانوں سے تمام علوم حاصل کئے ہیں مگر یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ آج خود عیسائیوں میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو بڑے زور سے اپنی قوم کی اس احسان فراموشی کا کتابوں میں اعلان کرتے ہیں۔ اسی طرح فن تعمیر، قالین بافی اور عمارتوں پر رنگدار بیل بوٹے بنانے یہ تمام علوم وہ ہیں جو یورپ نے مسلمانوں سے سیکھے

یورپ مسلمانوں کا شاگرد ہے۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

اُس نے انسان کو (وہ کچھ) سکھایا ہے جو وہ (پہلے) نہیں جانتا تھا ۶ ؎

چنانچہ اس کا ایک ثبوت میں خود ولایت میں دیکھ کر آیا ہوں۔ برامٹن میں ایک پرانا شاہی قلعہ ہے اُس کی دیواروں پر بیل بوٹے بنانے کے لئے عیسائیوں کو سارے یورپ میں کوئی آدمی نہ ملا آخر انہوں نے مسلمان ماہرین کو بلایا اور وہ وہاں بیل بوٹوں کی بجائے جگہ جگہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھ کر آگئے۔ یہی اُن کا عمارت کو سجانا تھا اور یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اِس فن کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں کے سر پر ہے۔

غرض یورپ کے پاس کوئی ایک چیز بھی نہیں تھی اُس نے جو کچھ سیکھا سپین کے مسلمانوں سے سیکھا اور سپین نے جو کچھ سیکھا شام سے سیکھا اور شام والوں نے جو کچھ سیکھا قرآن سے سیکھا پس دنیا کے تمام علوم قرآن سے ہی ظاہر ہوئے ہیں اور اب قیامت تک جس قدر قلمیں چلیں گی قرآن کریم کی خدمت اور اُس کے بیان کردہ علوم کی ترویج کے لئے ہی چلیں گی آج یورپ میں جتنی کتابیں نکل رہی ہیں وہ سب کی سب عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی تصدیق کر رہی اور اللہ تعالیٰ کی اس پیشگوئی کو سچا ثابت کر رہی ہیں کہ قلم کے ذریعہ قرآن کریم کو پھیلایا جائیگا۔ عرب ہر قسم کے علوم سے نابلد تھے لیکن قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد وہ تمام دنیا کے اُستاد بن گئے اور فلسفہ جس پر یورپ کو آج بہت بڑا ناز ہے اُس کے بھی وہی موجد قرار پائے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلسفہ یورپ کی ایجاد ہے لیکن ایک یوروپین فلاسفر نے اس کو بالکل غلط قرار دیا ہے وہ لکھتا ہے فلسفہ ہم نے شروع سے لے کر آخر تک اشعری سے لیا ہے اگر ہمارے فلسفہ میں کسی کو کوئی اچھی بات نظر آتی ہے تو اس تعریف کے مستحق ہم نہیں بلکہ اشعری اس تعریف کا مستحق ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علوم میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کوشش کرتی ہے کہ اس کا علمی مقام پہلے سے بلند ہو جائے لیکن اس کے باوجود بیج اپنی ذات میں جو قیمت رکھتا ہے اُس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ درخت کا پھیلاؤ خواہ کس قدر بڑھ جائے بیج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح علوم خواہ کس قدر ترقی کر جائیں سہرا مسلمانوں کے سر ہی رہے گا اور مسلمانوں کا سر قرآن کریم کے آگے جھکا رہے گا کیونکہ یہی وہ کتاب ہے جس نے اعلان کیا کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ اب دنیا کو قلم کے ذریعہ علوم سکھانے کا وقت آگیا ہے۔

پس حقیقت یہی ہے کہ دنیا کو تمام علوم قرآن کریم نے ہی سکھائے ہیں اگر قرآن نہ آیا ہوتا تو دنیا ایک ظلمت کدہ ہوتی جہالت اور بربریت کا نظارہ پیش کر رہی ہوتی۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اُس نے دنیا کو تاریکی سے نکالا اور علم کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔

۶ ؎ **تفسیر**۔ پیدائشِ انسانی کے متعلق اوپر کی آیات میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اُس کی مزید وضاحت اور تائید اِس آیت سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسان کو وہ باتیں سکھائیں گے جو اس سے پہلے اُس کے علم میں نہیں تھیں چنانچہ قرآن ایسے علوم سے بھرا پڑا ہے جو اسلام سے قبل نہ فلسفہ کی مدد سے حل ہو سکتے تھے اور نہ عیسائیت اور یہودیت نے اُن کو حل کیا تھا۔ مثلاً توحید کے متعلق اسلام نے جو تعلیم پیش کی ہے وہ ایسی شاندار ہے کہ آج تک دنیا کا کوئی مذہب توحید کے متعلق ایسی جامع اور مکمل تعلیم پیش نہیں کرسکا۔ اسی طرح نبوت کے متعلق قرآن کریم نے اس تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ جس کی نظیر دنیا کا اور کوئی مذہب پیش نہیں کرسکتا۔ باوجود اس بات کے کہ قرآن اُس قوم میں نازل ہوا تھا جس میں ایک لمبے عرصہ سے کوئی نبی نہیں آیا تھا اور باوجود اس بات کے کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم بھی اُس قوم میں محفوظ نہیں تھی اور وہ قطعی طور پر نبوت اور اُس کی تفصیلات سے ناواقف تھے پھر بھی نبوت کے متعلق اسلام نے جس قدر سیر کُن بحث کی ہے اُس کی مثال نہ عیسائیت پیش کر سکتی ہے اور نہ یہودیت پیش کر سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس میں آپ سے قبل درجنوں نہیں سینکڑوں انبیاء آچکے تھے اور نبوت کے متعلق اپنے اپنے رنگ میں روشنی ڈال چکے تھے پھر بھی عیسائی آج انجیل سے یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ نبی کی کیا تعریف ہوتی ہے۔

جن دنوں غیر مبایعین سے ہمارا مقابلہ زوروں پر تھا۔ میں نے بڑے بڑے بشپوں، سکھ گیانیوں، پنڈتوں اور یہودیوں کے فقیہوں سے خط لکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے مذہب میں نبی کی کیا تعریف ہے؟ اس کا جواب بعض نے تو دیا ہی نہ اور بعض نے صاف طور پر اعتراف کیا کہ ہمارا مذہب اس بارہ میں بالکل خاموش ہے۔ چنانچہ ایک بڑے بشپ کی طرف سے بھی یہی جواب آیا کہ اس مضمون کے متعلق ہماری کتب میں کوئی تفصیل نظر نہیں آتی۔ مگر اسلام نے اِن امور پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ نبی کی کیا تعریف ہے۔ نبی کب آتے ہیں۔ لوگ نبیوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ نبیوں کی صداقت کے کیا معیار ہیں یہ اور اسی قسم کے اور تمام مسائل اسلام میں پوری وضاحت کے ساتھ پائے جاتے ہیں پس فرماتا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ اللہ تعالیٰ تمام علوم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعہ کرے گا۔ بے شک توحید کا عقیدہ دنیا میں موجود ہے مگر ابھی اُس کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اسی طرح بے شک ملائکہ کو لوگ مانتے ہیں، کتب پر ایمان رکھتے ہیں، رسولوں کو تسلیم کرتے ہیں مگر ملائکہ۔ کتب الٰہیہ اور ایمان بالرسل کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں۔ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ خدا کے ایک ہونے کا کیا مفہوم ہے تو وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہیں گے لیکن قرآن دنیا کو بتلائے گا کہ توحید کا کیا مفہوم ہے اور کون کون سی باتیں انسان کو شرک میں مبتلا کرنے والی ہیں یا مثلاً اگر کوئی شخص سوال کرے کہ ملائکہ کیا چیز ہیں، وہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں، کیا کیا کام اُن کے ذمہ ہیں، اگر ملائکہ نہ ہوتے تو کیا نقص واقعہ ہوتا؟ تو ان سوالات کا تمام بائبل میں جواب نظر نہیں آئے گا۔ بائبل یہ تو بتا دے گی کہ خدا تعالیٰ نے فرشتے پیدا کئے ہیں اور وہ انبیاء کی طرف اس کا کلام لاتے ہیں مگر ملائکہ کی حقیقت یا اُن پر ایمان لانے کے فوائد بیان نہیں کرے گی لیکن قرآن صرف یہی نہیں بتائے گا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں بلکہ یہ بھی بتائے گا کہ اُس نے ملائکہ کو کیوں پیدا کیا۔ ملائکہ کے کیا کام ہیں۔ انسان ملائکہ سے اپنا تعلق کس طرح بڑھا سکتا ہے۔ کن امور کے نتیجہ میں ملائکہ سے انسانی تعلق کم ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص سوال کرے کہ مرنے کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے تو اسلام کے سوا اور کوئی مذہب اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈال سکیگا۔ نہ یہودیت مرنے کے بعد کے حالات بتاتی ہے نہ عیسائیت مرنے کے بعد کے حالات بتاتی ہے اور نہ کوئی اور مذہب مرنے کے بعد کے حالات بتاتا ہے صرف اسلام دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو اس پر ایسی سیر کُن بحث کرتا ہے کہ انسانی قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کی رُوح اپنے اندر سکینت محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ سوال ہو کہ اخلاق فاضلہ کیا چیز ہیں۔ کس بناء پر بعض اخلاق کو اچھا کہا جاتا ہے اور بعض کو بُرا۔ اخلاق کی تعریف کیا ہے۔ اخلاق اور روحانیت میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟ تو اُس کو ان تمام امور کا جواب صرف قرآن سے ہی مل سکتا ہے اور کتب کی ورق گردانی یا اور مذاہب کی کاسہ لیسی انسانی قلب کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ یعنی قرآن اور اسلام کے ذریعہ دنیا کو وہ وہ علوم سکھائے جائیں گے جو اس سے پہلے اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے چنانچہ اس کا عملی ثبوت موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جلسہ اعظم مذاہب لاہور کے ذریعہ ظاہر کر دیا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں متکلمین کی طرف سے

كَلَّآ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝

(ان شبہات کے مطابق) نہیں - انسان یقیناً حد سے گذر رہا ہے ۵۵

پانچ اہم سوالات پیش کئے گئے تھے اور مختلف مذاہب کے نمائندگان کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے رُو سے ان سوالات کا جواب دیں۔ اس جلسہ کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مضمون لکھا اور جو "اسلامی اصول کی فلاسفی" کے نام سے چھپا ہُوا موجود ہے اُس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان تمام سوالات کا قرآن کریم سے جواب دیا اور ایسی سیر کن بحث کی کہ جب وہ مضمون جلسہ میں پڑھا گیا تو متفقہ طور پر لوگوں نے اس مضمون کو باقی تمام مضامین سے بالا قرار دیا اور اخبارات نے اعتراف کیا کہ اس جلسہ میں سب سے بالا مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا مضمون رہا ہے جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ سب سے بالا قرآن کا مضمون رہا کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو کچھ لکھا تھا قرآنی آیات کے حوالہ اور اُن کی روشنی میں لکھا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی بات پیش نہیں کی تھی۔ یہ عملی ثبوت اس بات کا تھا کہ دنیا قرآنی علوم کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہے۔ باوجود اس بات کے کہ یہ قید حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے مضمون کے لئے خود ہی بڑھا لی تھی کہ میں جو کچھ بیان کروں گا قرآن کریم کی روشنی میں بیان کروں گا۔ اور باوجود اس کے کہ دوسرے لوگ آزاد تھے اور وہ اختیار رکھتے تھے کہ عقلی دلائل اپنی تائید میں پیش کر دیں یا فلسفہ کے رُو سے اپنے مذہب کو غالب ثابت کر دیں پھر بھی وہ اس مقابلہ میں ناکام رہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک زائد قید اپنے اوپر لگا کر قرآن کریم میں سے وہ علوم نکال کر رکھ دیئے جن کا عشر عشیر بھی اور کسی مذہب کے نمائندہ نے بیان نہ کیا۔

۵۵ تفسیر۔ تفسیر کبیر جلد ششم جزء چہارم نصف اوّل میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں كَلَّا اس غرض کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ کوئی مضمون جو پہلے گذر چکا ہے یا کوئی مفہوم جو پہلے مضمون سے پیدا ہوتا ہے اُس کو تسلیم کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے اُس کی تردید کی جائے اور اُسے بتایا جائے کہ تمہارا خیال درست نہیں۔ گویا كَلَّا کے معنے ہیں۔ اے مخاطب یوں نہیں۔ یوں نہیں "جیسا تم سمجھتے ہو۔ ہمارے ملک میں بھی رواج ہے کہ جب کسی بات کو رد کرنا مقصود ہو تو کہتے ہیں "نہیں نہیں۔ نہیں نہیں" پس كَلَّا کیا ہی حقیقت "نہیں نہیں" کا ایک مترادف لفظ ہے جو عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھتے ہو وہ درست نہیں بات دراصل کچھ اور ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے مضمون میں وہ کونسی بات تھی جس پر دشمن اعتراض کر سکتا تھا اور جس کی یہاں نفی کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ اللہ تعالیٰ انسان کو وہ کچھ سکھائے گا جسے وہ اب تک نہیں جانتا یعنی اللہ تعالیٰ اپنے الہام کے ذریعہ دنیا کی راہنمائی فرمائے گا اور خود اپنے پاس سے وہ تعلیم نازل کرے گا جو اُسے روحانیت کے بلند ترین مقامات پر پہنچانے والی ہو۔ اس پر اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہیں انسان خود اپنی عقل سے کام لے کر ترقی کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال ایسا ہے جو موجودہ زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کا سامان کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے ہم خود اپنی عقل اور فہم سے کام لے سکتے اور اپنی ترقی کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تدابیر اختیار کر سکتے ہیں۔ یہی اعتراض ہے جو عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا تھا اور انسان کہہ سکتا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ كَلَّا نے اس خیال کی تردید کی ہے اور

بتایا ہے کہ یہ قطعی طور پر غلط بات ہے کہ انسان اپنی ہدایت اور بچاؤ کا سامان اپنے لئے خود بخود تجویز کر سکتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نازل نہ ہو تو دنیا کبھی ترقی کی طرف ایک قدم بھی بڑھا نہیں سکتی اُس کی ترقی وابستہ ہے اللہ تعالیٰ کے الہام اور اُس کے کلام سے۔ اُس کی ہدایت کے بغیر نہ انسان نے پہلے کبھی روحانی اصلاح کی اور نہ آئندہ کر سکتا ہے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ اِس خیال کی بنیاد پر روشنی ڈالتا ہوا بتاتا ہے کہ یہ خیال انسان کے دل میں کیسے پیدا ہوتا ہے فرماتا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى یہ خیال کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں ہم اپنی ہدایت کا سامان خود بخود کرلیں گے یہ بغاوت اور سرکشی کا خیال ہے طَغٰی کے معنے جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ کے ہوتے ہیں یعنی فلاں شخص حد سے گذر گیا۔ پس اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى کے یہ معنے ہوئے کہ یقیناً انسان حد سے باہر نکل جانے والا ہے۔ ہم نے بیشک انسان کو قوتیں دی ہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی ہدایت کا آپ سامان کر سکتا ہے الٰہی مدد کا محتاج نہیں۔

پہلی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان کر چکا ہے کہ اُس نے انسان کو بہت بڑی طاقتیں دے کر بھیجا ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے اسی طرح اور بھی کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان کیا ہے کہ ہم نے انسان میں بڑی بڑی طاقتیں اور قوتیں رکھی ہیں اور اُنہی قوتوں کی بناء پر یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایسی اعلیٰ درجہ کی قوتیں دینے کے بعد ہم انسان کو چھوڑ دیں اور اُسے تاریکی اور ضلالت کے گڑھوں میں گرنے دیں۔ جب ہم نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا ہے اور اُسے اعلیٰ درجہ کی روحانی طاقتیں دے کر بھیجا ہے تو ضروری ہے کہ ہم اعلیٰ درجہ کی منزل مقصود بھی اُس کے سامنے رکھیں اور اُسے اکیلا نہ چھوڑیں۔ یہ مضمون ہے جو پہلی سورتوں میں بیان ہو چکا ہے مگر یہاں یہ فرماتا ہے کہ انسان ہماری مدد کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں اختلاف نظر آتا ہے۔ پہلے تو یہ فرمایا تھا کہ انسان میں بڑی بڑی طاقتیں رکھی گئی ہیں اور یہاں آ کر کہہ دیا ہے کہ بغیر ہماری مدد کے بنی نوع انسان ہدایت پا ہی نہیں سکتے۔ پس سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ بات کیا ہے کہ خود ہی پہلے ایک بات کہی اور خود ہی بعد میں آ کر اُس کی تردید کر دی۔

اِس کا جواب اللہ تعالیٰ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى میں دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ بے شک ہم نے انسان میں بڑی طاقتیں رکھی ہیں مگر طاقت رکھنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنے دائرۂ عمل سے بھی باہر نکل سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو انسان بڑی طاقت رکھتا ہے لیکن اگر بدپرہیزی کرتا ہے تو بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان میں اللہ تعالیٰ نے برداشت کی بڑی طاقت رکھی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتا چنانچہ اگر کوئی شخص سترہ اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھ جائے تو ہوا کے دباؤ کی کمی کی وجہ سے اُس میں جنون کا سا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوست کو دشمن سمجھنے لگ جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے متعلق ثابت ہے کہ اُن میں تیس تیس چالیس چالیس سال سے دوستیاں چلی آتی تھیں اور بڑے بڑے نازک حالات میں بھی اُن کی دوستیاں نہ ٹوٹیں مگر جب وہ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لئے گئے تو وہ ایسی حالت میں واپس آئے جب ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے۔ چنانچہ وہ مختلف وفود جو ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لئے جاتے رہے ہیں اُن کے متعلق یہ امر ثابت ہے کہ اُن میں سے کثیر طبقہ ایسا تھا جو دوست بن کر گیا اور دشمن بن کر واپس آیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ساڑھے سترہ ہزار فٹ سے اوپر جا کر انسان کی دماغی کیفیت متزلزل ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ آپس میں محبت اور پیار سے نہیں رہ سکتے بلکہ بات بات پر لڑائی کرنے لگتے ہیں۔

انگلستان میں ایک دفعہ ایک پائلٹ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ جب وہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر گیا تو یکدم اُس نے دیکھا کہ اُس کے ساتھی نے زور سے اس کی گردن پکڑ لی ہے اور وہ اُس کے گلے کو دبا کر اُسے ہلاک کرنا چاہتا ہے

اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰیؕ

اِس طرح کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے ۵ؔ

اُس نے چونکہ ہمالیہ پہاڑ کے واقعات اکثر سُنے ہوئے تھے اور وہ جانتا تھا کہ اوپر پہنچ کر ہوا کے ہلکا ہونے کی وجہ سے انسان اپنے دماغی توازن کو قائم نہیں رکھ سکتا اس لئے وہ جھٹ اپنے جہاز کو نیچے کی طرف لے آیا جب وہ سات آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر آ پہنچا تو اُس کا دوست ہوش میں آگیا اور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔

غرض ہر چیز کا ایک دائرۂ عمل ہوتا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی۔ یہی حال انسان کا ہے بیشک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے خاص طور پر اعلیٰ درجہ کی طاقتیں دیکر بھیجا گیا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی لائن کے علاوہ دوسری لائن میں بھی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ گھوڑا ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو میل تک بعض دفعہ ایک سانس میں دوڑ سکتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ عقلی کاموں میں بھی انسان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بے شک دوڑنے کے کام میں ایک گھوڑا بہتر سے بہتر تیز رفتار انسان سے بھی زیادہ تیز دوڑیگا مگر جہاں عقل کا سوال آئے گا وہاں ایک گھوڑا ادنیٰ سے ادنیٰ اور بے وقوف سے بے وقوف انسان جتنا کام بھی نہیں کر سکے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تو درست ہے کہ ہم نے انسان کو طاقتیں دی ہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی حد سے آگے نکل سکتا ہے۔ جو کام اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے وہاں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی وہ کام اگر کرے گا تو اللہ تعالیٰ ہی کرے گا انسان اپنی عقل سے اُسے سرانجام نہیں دے سکتا پس کَلَّآ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ وسوسہ جو بعض قلوب میں پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کوئی تعلیم بھیجنے کی کیا ضرورت ہے ہم اپنے لئے آپ ہی ایک مذہب بنالیں گے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ایسے خیالات اُسی شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنی حد سے آگے نکل جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا کام بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے بندے کا کام نہیں کہ وہ اُس میں دخل دے سکے۔ بے شک اُس نے تمہیں طاقتیں دی ہیں مگر وہ غیر محدود نہیں بلکہ ایک حد کے اندر ہیں۔ اسی طرح بے شک اُس نے تمہیں عقل دی ہے مگر وہ بھی تمہاری ذاتی طاقتوں تک محدود ہے۔ تم میں یہ طاقت نہیں کہ اپنے لئے خود بخود کوئی مذہب بنالو یا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے وسائل اپنی عقل سے تجویز کر سکو۔

۵ؔ حل لغات۔ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی جملہ مفعول لہٗ واقعہ ہوا ہے یعنی طغیٰ اس وجہ سے ہے کہ انسان اپنے نفس کو مستغنی سمجھتا ہے رَاٰی کے معنے دیکھنے کے بھی ہوتے ہیں اور سمجھنے اور پانے کے بھی۔ اس جگہ رَاٰی رؤیتِ قلبی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کیونکہ دو ضمیریں اس کی طرف جاتی ہیں اور رویتِ قلبی کے ہمیشہ دو مفعول ہوا کرتے ہیں۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ ہم انسان کو حد سے گذرنے والا کیوں کہتے ہیں اور کیوں وہ ہمارے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرتا ہے۔ فرماتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ اور عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ کا جو فاعل ہے یعنی خدا جس نے انسان کو قلم سے سکھایا اور جو انسان کو وہ کچھ سکھانے والا ہے جو وہ نہیں جانتا اُس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میں اپنے اخلاق کو بھی درست کر لونگا، اپنے عقائد کو بھی درست کر لوں گا، اپنی روحانیت کو بھی درست کر لوں گا، اپنے تمدن اور سیاست کو بھی درست کر لوں گا، اپنی عائلی زندگی کو بھی درست کر لوں گا، اپنے اقتصادی معاملات کو بھی درست کر لوں گا، اللہ تعالیٰ کو میرے کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا ہے کالجوں کے لڑکوں سے

رَاٰی

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ؎۱۸

تیرے رب ہی کی طرف یقیناً لوٹ کر جانا ہے ؎۹

جب بھی مذہبی معاملات پر گفتگو کی جائے تھوڑی دیر کے بعد ہی اُن کی زبان سے اِس قسم کے فقرے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں کہ اوّل تو ہم مانتے ہی نہیں کہ دنیا کا کوئی خدا ہے اور اگر ہے تو اُسے انسانی کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے یہ ہمارا اختیار ہے کہ ہم اپنے لئے جو طریق پسند کریں اُسے اختیار کر لیں پس فرمایا اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى طغیان اور سرکشی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے آپکو اللہ تعالیٰ کی مدد سے بے نیاز قرار دے دیتا ہے اس لئے وہ اُس روحانی کوچہ میں داخل نہیں ہو سکتا جس کا دروازہ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے بغیر کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش سے نہیں کھول سکتا۔

؎۹ تفسیر۔ یہاں مفسرین نے بالعموم رَبِّكَ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ضمیر انسان کی طرف پھیری گئی ہے مگر میرے نزدیک یہاں رَبِّكَ سے وہی رب مراد ہے جس کا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں ذکر آتا ہے اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ فرماتا ہے یہ انسان اپنے آپ کو مستغنی کس طرح سمجھ سکتا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے آخر تیرے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ہی جانا ہے تو پھر وہی بتا سکتا ہے کہ وہاں کن اعمال کی ضرورت ہے، یہ لوگ اپنی عقل سے وہاں کے حالات کس طرح معلوم کر سکتے ہیں؟ آخر یہ ایک موٹی بات ہے، کہ اگر ایک شخص انگلستان جانا چاہتا ہے تو اُسی شخص سے وہاں کے حالات دریافت کریگا جو انگلینڈ سے واپس آچکا ہوگا۔ وہ اُسکے پاس جائیگا اور کہیگا کہ میں انگلینڈ جانا چاہتا ہوں مگر مجھے علم نہیں کہ وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے، وہاں مجھے کیسے کپڑوں کی ضرورت ہے، کتنا روپیہ مجھے ساتھ لے جانا چاہیئے کیا کیا باتیں مجھے سفر میں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ آپ چونکہ انگلینڈ میں رہ چکے ہیں اور وہاں کے حالات سے آپ کو ذاتی طور پر واقفیت ہے اس لئے آپ مجھے بتائیں کہ وہاں کی آب و ہوا کے لحاظ سے مجھے کیسے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ آیا سوتی کپڑے میں اپنے ساتھ لے جاؤں یا گرم۔ اور اگر گرم لے جاؤں تو وہ کس قدر گرم ہونے چاہئیں کیونکہ محض ٹھنڈک یا سردی کے ذکر سے پتہ نہیں لگ سکتا کہ وہاں کس قسم کی سردی پڑتی ہے خفیف پڑتی ہے یا شدید۔ میں ۱۹۲۴ء میں جب انگلستان سے واپس آیا ہوں اُس وقت نومبر کا مہینہ تھا اور نومبر کے دنوں میں یہاں بہت معمولی سردی ہوتی ہے مگر انگلستان میں جس قدر سردی پڑتی ہے اُس کی شدت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن اکتوبر کے مہینہ میں رات کے گیارہ بجے میں موٹر میں سفر کر رہا تھا اور میری حالت یہ تھی کہ میں نے گرم بنیان پہنی ہوئی تھی اُس پر گرم کُرتہ تھا اُس پر گرم صدری تھی اُس کے اوپر گرم کوٹ تھا پھر اُس کے اوپر اوورکوٹ تھا اور اوورکوٹ بھی ہندوستان کا نہیں بلکہ وہ جو انگلستان کے لئے بنوایا گیا تھا۔ اور جو ہندوستانی اوورکوٹ سے دوگنا تگنا موٹا ہوتا ہے مگر اتنے گرم کپڑوں کے باوجود اور پھر بند موٹر میں سفر کرنے کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی کپڑا نہیں۔ یہ تو انگلستان کی سردی کا حال ہے۔ اس کے بعد آرکٹک میں چلے جاؤ تو وہاں انگلستان سے بھی زیادہ ٹھنڈ ہوگی۔ اس کے مقابل میں امریکہ کے بعض حصے ایسے ہیں جہاں منٹ منٹ کے بعد موسم بدلتا رہتا ہے۔ ابھی گرمی ہوتی ہے اور ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہی سردی شروع ہو جاتی ہے۔ سردی ہوتی ہے تو معاً گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں یہی حالت رہتی ہے کہ جرسی پہنی اور اُتار دی۔ پھر پہنی اور اُتار دی۔ غرض دنیا میں یہ طریق ہے کہ جب کوئی شخص انگلستان جانا چاہے گا تو وہ پہلے واقف حال لوگوں سے پوچھے گا کہ مجھے وہاں کیسے کپڑوں کی ضرورت ہے یا امریکہ جانا چاہے گا تو وہاں سے آنے والے لوگوں سے پوچھے گا کہ مجھے امریکہ میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی مثلاً ہندوستانیوں کو

عام طور پر مرچیں کھانے کی علات ہوتی ہے اب اگر کوئی ایسا شخص امریکہ جانا چاہے گا جسے مرچیں کھانے کی علات ہوگی تو وہ یہ ضرور دریافت کرے گا کہ مجھے وہاں مرچیں مل سکتی ہیں یا نہیں۔ اور جب نفی میں جواب ملے گا اور اُسے مرچیں کھانے کا زیادہ شوق ہوگا تو وہ اپنے ساتھ مرچیں لے جائے گا تاکہ وہاں اُسے تکلیف نہ ہو۔ یا مثلاً عرب میں کوئی ہندوستانی جسے پان کا شوق ہو جانا چاہے گا تو وہ پہلے واقفِ حال لوگوں سے پتہ لگائے گا کہ وہاں پان ملتا ہے یا نہیں۔ تاکہ اُسے حالات کا صحیح علم ہو جائے اور وہ اُن کے مطابق اپنی تیاری کو مکمل کرے غرض یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب انسان نے کہیں جانا ہوتا ہے وہ پہلے واقف لوگوں سے مشورہ لیتا اور اُس جگہ کے حالات کو معلوم کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ واقف لوگوں سے تو نہ پوچھے اور اپنے عقلی ڈھکوسلوں پر تیاری کی بنیاد رکھ دے۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ اس جگہ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰى ان لوگوں کی عقل ماری ہوئی ہے انہوں نے جانا خدا کے پاس ہے لیکن کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے قرب کے راستے بتلائے۔ ان نادانوں سے کوئی کہے کہ تم معمولی معمولی سفر اختیار کرتے ہو تو پہلے تمام حالات دریافت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہو۔ تم پوچھتے ہو کہ جہاں میں جا رہا ہوں وہاں گرمی ہے یا سردی۔ کپڑے اپنے ساتھ کیسے لے جاؤں۔ کون کون سی ضروریات کا خیال رکھوں۔ بُوٹ اپنے ساتھ لے جاؤں تو وہ کیسے ہوں۔ بعض ملکوں میں اس کثرت سے بارشیں ہوتی ہیں کہ معمولی بُوٹ اگر انسان نے پہنا ہوا ہو تو شام تک وہ ڈھیلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح بعض ملک ایسے ہیں جن میں اتنا مچھر ہوتا ہے کہ انسان بغیر مچھر دانی کے ایک رات بھی گذار نہیں سکتا۔ غرض مختلف ملکوں کے مختلف حالات ہوتے ہیں اور انسان کو اُس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا جب تک وہ اُن تمام حالات کو دریافت نہ کر لے۔ غرض اس محدود دنیا میں جو صرف ۲۵ ہزار میل میں پھیلی ہوئی ہے ایسے زمانہ میں جبکہ ریل اور تار اور ڈاک کے وسائل موجود ہیں ایک ملک سے دوسرے ملک جانے میں کئی قسم کی دقتیں

حائل ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے واقفِ حال لوگوں سے حالات دریافت کرتا ہے اور اگر کوئی واقف نہیں ملتا تو کسی کمپنی کو لکھتا ہے کہ میں فلاں ملک میں جانا چاہتا ہوں مہربانی فرما کر مجھے بتایا جائے کہ میں کہاں کا ٹکٹ لوں، کتنا روپیہ اپنے پاس رکھوں اور کیا کیا چیزیں ساتھ لے جاؤں۔ ہندوستان میں کسی سفر کے لئے گھر سے نکلو اور بستر ساتھ نہ ہو تو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہوٹلوں میں اوّل تو بستر ملتا ہی نہیں اور اگر ملے گا تو ایسا گندہ اور غلیظ اور ناپاک اور بدبودار کہ کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی خیال کے ماتحت اگر کوئی انگلستان جاتے ہوئے بستر اپنے ساتھ لے جائے تو ہر مرد عورت اور بچہ اُسے دیکھ کر ہنسنے لگ جائے گا کہ یہ کیسا انسان ہے سفر میں اپنے ساتھ بستر لئے پھرتا ہے۔ انگلستان میں یہ دستور ہے کہ انسان جس جگہ ٹھہرے وہاں سونے کے لئے اُسے مالکِ مکان کی طرف سے بستر دیا جاتا ہے۔ ہر ہوٹل میں روزانہ بستر تبدیل کئے جاتے ہیں اور چادر پر ایک معمولی داغ بھی رہنے نہیں دیا جاتا۔ وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہوٹل کا بستر اگر استعمال کیا گیا تو وہ گندہ ہوگا کیونکہ ہر اچھے ہوٹل میں ایسا انتظام ہوتا ہے کہ روزانہ اُوپر نیچے کی چادریں بدل جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک مریض کا کمبل دوسرے کو دے دیا جائے اور دوسرے کی میلی کچیلی چادر تیسرے کے نیچے بچھا دی جائے وہاں روزانہ دھوبی کے دھلی دھلائی چادریں آتی ہیں اور بستروں پر بچھا دی جاتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک کا کپڑا دوسرے کو دے دیں۔ یہی رواج ہزارہ میں بھی ہے وہاں غریب سے غریب آدمی بھی دس پندرہ بستر ضرور رکھ لیتا ہے تاکہ مہمانوں کو تکلیف نہ ہو اگر وہاں کوئی شخص بستر اپنے ساتھ لائے تو میزبان سخت بُرا مناتا ہے کہ تم نے مجھ پر بے اعتباری کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزارہ کے لوگ ہمارے سالانہ جلسہ پر آتے ہیں تو اپنے بستر ساتھ نہیں لاتے وہ سمجھتے ہیں بستر ساتھ لے جانا بڑی کمینگی ہے مگر یہاں آکر انہیں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ یہاں یہ رواج ہے کہ ہر شخص بستر اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اسی طرح ہزارہ میں یہ رواج ہے کہ لوگ روپیہ اپنے ساتھ نہیں رکھتے

أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۝ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۝

(اے مخاطب) تو (مجھے اُس (شخص) کی حالت کی) خبر دے جو روکتا ہے۔ ایک (عبادت گذار) بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہو ۝۱۰

جس کسی کے ہاں ٹھہرتے ہیں اُس کا فرض ہوتا ہے کہ کرایہ ادا کرے۔ چنانچہ چلتے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہیں کہ اب کرایہ لاؤ، ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔ اب دیکھو ہزارہ کوئی زیادہ دُور نہیں۔ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد انسان وہاں پہنچ جاتا ہے مگر عادات اور رسوم و رواج میں کس قدر فرق ہے کہ دیکھکر حیرت آتی ہے۔ اگر ان حالات کو معلوم کئے بغیر کوئی شخص دوسرے مقام پر چلا جائے تو یہ لازمی بات ہے کہ اُسے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کیا ان لوگوں کو اتنی بھی سمجھ نہیں آتی کہ مذہب اور دین کا اصل تعلق موت کے بعد کی زندگی سے ہے اور یہ زندگی وہ ہے جس کے حالات سے یہ لوگ محض بے خبر ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اُس زندگی کو دیکھکر آیا ہوں اس لئے مجھے کسی اور کی راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ جب ان لوگوں کو اُس زندگی کے حالات کا جو مرنے کے بعد حاصل ہونے والی ہے کچھ بھی علم نہیں اور انہوں نے لوٹ کر آخر اللہ تعالےٰ کی طرف ہی جانا ہے تو اگر اللہ تعالےٰ اُن کو اُس زندگی میں کام آنے والی باتیں نہیں بتائے گا تو اُن کو پتہ کس طرح لگیگا کہ وہاں کون سے اخلاق کام آسکتے ہیں، کون سے اعمال اُن کی اُخروی حیات کو سنوار سکتے ہیں، کون سے عقائد اختیار کر کے وہ اللہ تعالےٰ کے محبوب بن سکتے ہیں۔ یہ باتیں تو اللہ تعالےٰ ہی بتا سکتا ہے خود اپنی عقل سے یہ لوگ وہاں کے حالات معلوم نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کی سرکشی اور اپنے آپ کو ہدایت کے متعلق خدا تعالےٰ کی مدد سے مستغنی سمجھنا حماقت کی بات ہے۔ بغیر الٰہی امداد کے اس بارہ میں نہ انسان نے پہلے کامیابی حاصل کی ہے اور نہ اب کر سکتا ہے۔

۱۰ تفسیر - اس آیت میں اللہ تعالےٰ ایک مثال کے ذریعہ کفار کو ملزم کرتا ہے فرماتا ہے مجھے اُس شخص کا حال تو بتاؤ یعنی ذرا اُس شخص کی معقولیت تو مجھ پر ظاہر کرو۔ أَرَءَيْتَ کے لفظی معنے ہوتے ہیں "کیا دیکھا تُو نے" لیکن محاورہ میں اس کے معنے ہوتے ہیں أَخْبِرْنِي مجھے بتاؤ تو سہی۔ چونکہ یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں اس لئے أَرَءَيْتَ کے معنے ہوں گے اے محمد رسول اللہ مجھے بتا تو سہی۔ دراصل یہ زجر کا ایک طریق ہے کہ بات تو ہم دوسرے کی کرتے ہیں لیکن ہم اُس کو مخاطب کرنا نہیں چاہتے۔ وہ سُنیگا تو آپ ہی دل میں شرمندہ ہوگا کہ میں کیسی لغو حرکت کر رہا ہوں۔ ہم اس کی بجائے تجھے مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا اُس شخص کا حال تو بتاؤ يَنْهَىٰ جو روکتا ہے مگر کس کو؟ کسی جھگڑالو کو نہیں، کسی لڑاکے کو نہیں، کسی فریبی کو نہیں، کسی ڈاکو کو نہیں بلکہ عَبْدًا ہمارے ایک مسکین اور عاجز بندے کو۔ اور روکتا کس بات پر ہے۔ اس پر نہیں کہ اُس نے فلاں قانون کو پورا نہ کیا یا فلاں سیاسی مسئلہ میں اُس نے ہم سے اختلاف رکھا بلکہ إِذَا صَلَّىٰ۔ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور یہ دوڑ کر اُس کا گلا پکڑ لیتا ہے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی معقول انسان اس امر کو جائز اور درست قرار دے سکتا ہے؟ کوئی سیاسی اختلاف نہیں، کوئی اقتصادی اختلاف نہیں، کوئی تمدنی اختلاف نہیں، کوئی حاکم اور محکوم کا اختلاف نہیں۔ ایک شخص اپنے گھر میں خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور دوسرا شخص اُسے پکڑ کے عبادت سے روکنا شروع کر دیتا ہے کیا اس میں کوئی بھی معقولیت پائی جاتی ہے۔ کیا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ خدا تعالےٰ کا بندہ خدا تعالےٰ کے سامنے عبادت کر رہا ہے اور ابوجہل اپنے گھر پر بیٹھے یونہی ابوجہل کو دورہ ہے نہ لینا نہ دینا۔ نہ تعلق نہ واسطہ۔ اور وہ یونہی بیچ پا ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہ نماز پڑھتے وقت کوئی ابوجہل کا گھوڑا کھول کر لے جاتا ہے یا اس کا اسباب اٹھا کر لے جاتا ہو

اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡھُدٰۤیۙ

(اے مخاطب) تو (مجھے) بتا تو سہی کہ اگر وہ (نماز پڑھنے والا بندہ) ہدایت پر ہو؟ ۱۱

جس کی بناء پر اُسے غصہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے اور ابو جہل صفت شور مچاتا ہے۔ منع کر دیتا ہے کہ مار دیا۔ مار دیا۔ کیا اتنی غیر معقول حرکتیں کرنے والا انسان بھی یہ سمجھتا ہے کہ اُسے اللہ تعالےٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔

چونکہ پہلی آیات میں اس امر کا ذکر تھا کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں دینی معاملات میں الٰہی راہنمائی کی ضرورت نہیں وہ اپنی عقل سے اپنے لئے خود بخود ایک راہ تجویز کر سکتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اُن کو ملزم کرنے کے لئے یہ مثال پیش کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم جو دن رات یہ رٹ لگا رہے ہو کہ ہمیں دینی معاملات میں اللہ تعالےٰ کی مدد کی ضرورت نہیں تم اپنے حالات پر غور کرو اور دیکھو کہ تمہارا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے۔ تم اگر کسی اور کی طرف نہیں دیکھ سکتے تو ابو جہل یا دوسرے لیڈروں کو ہی دیکھ لو وہ قوم کے سردار ہیں، دنیوی معاملات میں لوگوں کو مشورے دیتے ہیں، نوجوان کی کمان کرتے ہیں اور لوگوں پر اُن کی دانائی کا سکہ بیٹھا ہوا ہے مگر دین کے معاملہ میں اُن کی عقل اس قدر ماری ہوئی ہے کہ ایک بندہ اکیلا اپنے گھر میں اللہ تعالےٰ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اپھلنے کودنے لگ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کی نابینائی اس قدر بڑھ چکی ہو اور جو دینی معاملات میں اس قدر حماقت اور جہالت کے کاموں پر اُتر آئے ہوں اُنکے متعلق تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ اس روحانی میدان میں اللہ تعالےٰ کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

۱۱ تفسیر۔ اس موقعہ پر ابو جہل صفات والوں کی طرف سے کہا جا سکتا تھا کہ تم جو اعتراض کرتے ہو کہ ہم نے عبادت میں کیوں دخل دیا یہ درست نہیں بے شک اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں تھا۔ ہماری قوم کا کوئی نقصان نہیں تھا حکومت اور نظام کا کوئی نقصان نہیں تھا مگر چونکہ اس میں عبادت کرنے والے کا اپنا نقصان تھا اور ہم نے دیکھا کہ وہ ایک بُرا کام کر رہا ہے ہم نے ہمدردی اور محبت کے پیش نظر اُسے روک دیا تاکہ اس کام کے بُرے نتائج سے وہ محفوظ رہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡھُدٰۤی۔ مجھے بتاؤ تو سہی اگر ہمارا وہ بندہ ہدایت پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے۔ یہ بھی گفتگو کا ایک طریق ہوتا ہے کہ الفاظ شک کے استعمال کئے جاتے ہیں مگر مراد اُلٹ ہوتی ہے۔ ہر زبان کا یہ طریقہ ہے مثلاً اُردو میں بھی بولتے ہیں شاید میں نے اسی طرح کرنا ہو اور مراد ہوتی ہے اسی طرح کرنا ہے۔ اسیطرح فرماتا ہے اِنۡ کَانَ عَلَی الۡھُدٰۤی یعنی اِنۡ کَانَ مُحَمَّدٌ اَوۡ اِنۡ کَانَ الۡعَبۡدُ الۡمُصَلِّیۡ عَلَی الۡھُدٰۤی۔ اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم یا ہمارا وہ بندہ جو ہماری عبادت کر رہا ہے سچا ہوا تو پھر اس کو روکنے والے کا کیا حال ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے فعل کے جواز میں یہ کہہ رہے ہو کہ ہم اسے عبادت سے اس لئے روک رہے ہیں کہ یہ کہیں دوزخ میں نہ جا پڑے۔ کہیں اللہ تعالےٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا مورد نہ بن جائے۔ حالانکہ جب یہ معاملہ اگلے جہان سے تعلق رکھتا ہے اور اگلا جہان وہ ہے جو نہ تم نے دیکھا اور نہ تمہارے باپ دادا نے تو تمہیں کیونکر پتہ لگا کہ اس فعل کا نتیجہ ضرور خراب نکلے گا۔ اگر ذاتی طور پر تم سمجھتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سچائی پر قائم نہیں تب بھی تمہیں عبادت سے روکنے کا کوئی حق نہیں تھا کیونکہ تم کسی یقین کی بناء پر ایسا نہیں کہہ رہے۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کہ شاید یہ حق پر نہ ہو۔ اس لئے ہم اسے روکنا چاہتے ہیں حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حق پر ہو اور تم اسے روک کر ظالم بن رہے ہو بہر حال جب یہ معاملہ اگلے جہان سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق تمہارا علم کسی قطعی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ ایک ڈھکوسلہ ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ شاید یہ جھوٹا ہو۔ شاید یہ بُرا کام کر رہا ہو تو محض ایک ظن کی بناء پر تمہیں اسکو روکنے کا حق کہاں سے پیدا ہو گیا جبکہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہدایت پر موجود

اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰىؕ

یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو (تو پھر اس روکنے والے کا کیا بنے گا) ؂۱۲

تم جو اُسے روک رہے ہو گمراہی اور ضلالت میں پڑے ہوئے ہو
دوسرے کو انسان اُسی وقت کسی کام سے روک سکتا ہے
جب اُس کے علم کی بنیاد یقین پر ہو۔ مثلاً اگر کوئی بچہ کنوئیں میں
گرنے لگے اور ماں باپ پاس نہ ہوں تو ہر شخص حق رکھتا ہے کہ
اُسے روکے کیونکہ اس کا نتیجہ یقیناً ہلاکت ہے۔ لیکن اگر ایک شخص
تجارت کرنے لگے، زید کا خیال ہو کہ مجھے نفع ہوگا اور بکر کا خیال
ہو کہ نفع نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں اگر بکر زید سے لڑ پڑے
اور اُسے تجارت سے روک دے۔ تو ہر شخص بکر کو ملزم قرار دے گا
اور اگر مجسٹریٹ کے پاس مقدمہ جائے گا تو وہ یقیناً بکر کو سزا
دے گا اور کہے گا کہ یہ کونسی بدیہی بات تھی جس کی بناء پر تم نے
دوسرے کو تجارت کرنے سے روک دیا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اگر
کوئی شخص زہر کی پڑیہ کھانے لگے تو ہم اسے روک دیں کیونکہ
یہ بدیہی بات ہے کہ زہر کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا
کہ ہم کسی کو کھانے سے اس لئے روک دیں کہ ممکن ہے کہ اس کے
نتیجہ میں تمہیں ہیضہ ہو جائے یا پیچش شروع ہو جائے۔
بہرحال جہاں قطعی اور یقینی نقصان ہو وہاں ہر دوست اور ہمسایہ حق
رکھتا ہے کہ دوسرے کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرے۔ مگر
جس امر کے متعلق یقین نہ ہو اُس معاملہ میں کسی دوسرے کا دخل دینا
اول درجہ کی حماقت ہوتی ہے۔ چونکہ یہاں عبادت کا معاملہ تھا جس
کے متعلق کفار کسی یقین پر قائم نہیں تھے اس لئے اللہ تعالےٰ
فرماتا ہے کہ تمہاری یہ دلیل قطعی طور پر غلط ہے کہ ہم
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نقصان سے بچانے کے
لئے عبادت سے روک رہے ہیں۔ تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے
ہو کہ شاید یہ ہدایت پر نہ ہو۔ شاید یہ گمراہی میں مبتلا ہو حالانکہ
اس کے مقابلہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہدایت پر ہو اور تم گمراہی
میں مبتلا ہو جب یہ معاملہ ایسا ہے جس میں تمہیں صرف شبہ ہی
شبہ ہے اور دوسری طرف ایک جوان اور بالغ انسان اپنی
مرضی سے ایک قدم اٹھا رہا ہے تو تم اُس کو روکنے والے کون ہو
دنیا میں یہی طریق رائج ہے کہ جب کوئی بالغ، جوان اور سمجھدار شخص
کوئی ایسا کام شروع کرتا ہے جس کے دونوں پہلو ہو سکتے ہوں
مفید بھی اور مضر بھی۔ تو کوئی شخص اُس کو روکا نہیں کرتا۔ ایک
شخص سفر پر جاتا ہے تو وہ نقصان بھی اٹھا سکتا ہے اور فائدہ
بھی اٹھا سکتا ہے۔ ایک شخص تجارت کرتا ہے تو وہ نقصان بھی
اٹھا سکتا ہے اور فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے مگر کسی دوسرے کو
یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ سفر یا تجارت سے کسی کو اس لئے روک
دے کہ میرا خیال ہے تمہیں نقصان ہوگا۔ یا چونکہ میں سمجھتا ہوں
کہ تمہارا بمبئی جانا مفید نہیں اس لئے میں تمہیں گھر سے نکلنے نہیں
دیتا۔ ہر شخص ایسے انسان کو پاگل قرار دے گا اور کہیگا کہ تمہیں
کیا پتہ کہ اس سفر یا تجارت کا نتیجہ اچھا ہے یا بُرا، تم زیادہ سے
زیادہ ایک قیاس کر رہے ہو حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ بھی
قیاس ہو سکتا ہے کہ اُسے فائدہ ہو۔ اس لئے تمہارا روکنا جنون
کی علامت ہے۔ یہی بات اللہ تعالےٰ اس جگہ بیان کرتا ہے
کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جوان، عاقل اور سمجھدار انسان
ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی عبادت میں ہی انسان کا
فائدہ ہے۔ اگر وہ عبادت کرتے ہیں تو تمہارا کوئی حق نہیں کہ تم
اُنہیں عبادت سے روکو۔ ہم مانتے ہیں کہ تم عبادت کی اہمیت تسلیم
نہیں کرتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تم جو کچھ
کہہ رہے ہو اُس کی بنیاد محض شک پر ہے اس لئے خواہ تم عبادت
کو اچھا نہیں سمجھتے تب بھی عقلی طور پر تمہیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں
تھا کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکتے اگر
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل کا صحیح نتیجہ مشکوک ہے
تو تمہارے اس فعل بد کا اچھا نتیجہ کیونکر نکلے گا۔

؂۱۲ **تفسیر** یہاں ایک زائد بات بیان کرکے پہلے
استدلال کو مضبوط کر دیا گیا ہے اِنْ کَانَ عَلَى الْهُدٰىٓ تک تو

شبہ کے انداز میں یہ بات بیان کی تھی کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر تمہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شبہ ہے تو تم خود بھی کسی یقین پر قائم نہیں۔ جب تمہارا دعوےٰ بھی شک والا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے متعلق بھی تم شک کر رہے ہو تو محض شک کی بناء پر تمہارا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکنا کسی صورت میں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب ایک اور بات بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے ہدایت تو دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ہم نہیں جانتے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہدایت پر ہیں یا نہیں۔ لیکن کیا تم اس کے تقویٰ کو نہیں دیکھتے۔ تقویٰ تو عمل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے جس کے متعلق یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نہیں جانتے فلاں شخص میں تقویٰ پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اگر دل کی بات کو پہچاننا تمہارے لئے مشکل تھا اور تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہدایت یافتہ ہونا پہچان نہیں سکتے تھے تو کیا تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل کو بھی دیکھنے سے قاصر ہو اور کیا تم اس کو دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ تم غلطی پر ہو یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غلطی پر ہیں۔ تم یہ تو کہہ سکتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ بتوں کی بجائے اللہ تعالےٰ کی پرستش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک غلطی ہے اس لئے ہم انہیں اس غلطی سے بچانے کیلئے عبادت سے روکتے ہیں۔ لیکن کیا تم اُس تعلیم کی طرف نہیں دیکھتے جو یہ اپنی زبان سے بیان کر رہا ہے اور اُس عمل کو نہیں دیکھتے جو یہ اپنے جوارح سے ظاہر کر رہا ہے۔ اور کیا اس کی تعلیم اور اپنی تعلیم اور اس کے عمل اور اپنے عمل کو دیکھنے کے بعد تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کون ہدایت پر ہے؟ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ٹھگّی کرتے ہو، فریب کرتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، قسم قسم کی بداخلاقیوں میں ملوّث ہو اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہ ہیں جو خدا تعالےٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، سچائی سے کام لیتے ہیں، غرباء کی مدد کرتے ہیں، ظلم سے روکتے ہیں، نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں، اکرام ضیف کی عادت رکھتے ہیں، امانت اور دیانت میں نہایت اعلیٰ درجہ کا نمونہ دکھاتے ہیں اور دوسروں کو اپنی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم جو دن رات ٹھگّی میں مشغول رہتے ہو، جو جھوٹ اور فریب کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ تم تو سچے ہو اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو تقویٰ کے پیکر ہیں اور دوسروں کو بھی تقویٰ کی راہوں پر چلنے کا حکم دیتے ہیں وہ جھوٹے ہوں۔

انحضرت صلعم اور آپ کے مخالفین کے عمل میں فرق

غرض یہ ایک زائد دلیل اللہ تعالےٰ نے پیش کی ہے اور اس طرح پہلی دلیل کو مضبوط کر دیا ہے۔ فرماتا ہے اگر تم یہ کہو کہ ہمیں چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شبہ ہے اس لئے ہم اُسے عبادت سے روک رہے ہیں تب بھی تمہارا کوئی حق نہیں کہ ایسا کرو۔ کیونکہ اگر تمہیں یہ شبہ ہو کہ شاید محمد رسول اللہ صلعم سچا نہ ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور تم اس کو جھٹلانے میں ناراستی سے کام لے رہے ہو۔ لیکن اگر یہ زائد بات بھی اُس میں پائی جاتی ہے کہ وہ نیک اعمال اور تقویٰ و عبادت کی باتوں کا دوسروں کو حکم دیتا ہے اور تم بداعمالی میں مستغرق رہتے ہو تو یہ ایک پختہ دلیل اس امر کی ہے کہ تم صداقت سے بہت دُور جا رہے ہو۔

سورۃ العلق چونکہ بالکل ابتدائی سورۃ ہے اِس لئے اللہ تعالےٰ نے یہاں نتائج کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ ہر جگہ اُن کو چھوڑتا چلا گیا ہے کیونکہ ابھی مکہ والوں کی طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھلی مخالفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ابتدائی ایام تھے اور کفار کو خواہ مخواہ بھڑکانا مقصود نہیں تھا اس لئے اللہ تعالےٰ نے صرف اَرَءَيْتَ اَرَءَيْتَ کہہ کر اشاروں اشاروں میں ہی حقیقت حال کو بیان کر دیا ہے یعنی صرف اتنا ہی کہا ہے کہ مجھے اُس شخص کا حال تو بتاؤ لیکن آگے اُس شخص کا نام نہیں لیا ؎

~~~~~~~~
~~~~~~~~

أَرَءَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝ أَلَمْ يَعْلَمْ

پھر (یہ بھی) بتا کہ اگر یہ روکنے والا جھٹلاتا ہے اور (سچائی سے) منہ پھیر لیتا ہے تو کیا وہ (یہ) نہیں جانتا

بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ۝

کہ اللہ سب کچھ دیکھتا ہے ۲۱۱ء

۲۱۱ء تفسیر۔ جس طرح أَرَءَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ میں گو روئے سخن کفار کی طرف تھا مگر مخاطب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا گیا تھا۔ اسی طرح اس جگہ گو خطاب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مراد کفار پر اتمام حجت کرنا ہے۔ فرماتا ہے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ تو بتاؤ جس طرح کفار کو ہماری عبادت کرنے والے بندے کے متعلق یہ احتمال تھا کہ وہ غلط عبادت نہ کر رہا ہو کیونکہ وہ اپنی قوم اور اپنے رشتہ داروں کے خلاف بتوں کی پرستش ترک کرکے اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہو رہا ہے اس طرح یہ بھی تو احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ عبادت سے روکنے والا شخص ہی سچائی کو جھٹلانے والا اور ہدایت سے منہ موڑنے والا ہو اور جس کو عبادت سے روکا جاتا ہو وہ ہدایت پر ہو اور یہ اُس کی تکذیب کر رہا ہو۔ وہ امر بالتقویٰ کر رہا ہو اور یہ تولّی اختیار کر رہا ہو۔ وہ کہہ رہا ہو کہ سچائی اختیار کرو نیکی اور تقدّس کا جامہ پہنو اور یہ اُس سے پیٹھ پھیر رہا ہو۔ جب یہ بھی احتمال ہے تو أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ۔ کیا اس قسم کے افعال کرنے والے کو یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ تو مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ میرے اعمال کے مطابق نتیجہ نکالنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہاں نہایت لطیف بات کہی ہے فرماتا ہے وہ ہمارے بندے کو عبادت سے روکتا ہے اور پھر کہتا ہے میں کیوں نہ روکوں یہ میرا دوست تھا، میرا ہموطن تھا اور میرا حق تھا کہ میں اُسے غلط راستہ پر چلنے سے روکوں جبکہ ہو سکتا تھا کہ وہ خود غلطی کر رہا ہو۔ اگر احتمال اور شبہ پر قائم ہوتے ہوئے اُسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے بندے کو روک دے تو کیا اُسے یہ خیال نہیں آتا کہ آسمان پر ایک خدا اس نظارہ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر میں اپنی طاقت اور قوت کے گھمنڈ میں دوسرے کو روک رہا ہوں تو زمین و آسمان کا طاقتور بادشاہ جو میرے اس ظلم کو دیکھ رہا ہے وہ بھی طاقت رکھتا ہے کہ مجھے اس ظلم کی سزا دے۔ اگر ابوجہل اور اُس کے ساتھیوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت میں دخل دیں اور کہیں ہم نے اس لئے دخل دیا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں یہ غلطی کر رہا ہے تو اگر اس کے مقابلہ میں تم غلطی کر رہے ہو تو یقیناً اس اصول کے مطابق خدا تعالےٰ کو بھی حق حاصل ہوگا کہ وہ تمہیں پکڑے۔ آج تم ہمارے بندے کو عبادت سے روک رہے ہو اور کہتے ہو کہ ہم سمجھتے ہیں یہ غلطی کر رہا ہے اگر تم ایک فرضی قیاس سے کام لینے کے بعد ہمارے بندے کو روکنے کا حق رکھتے ہو تو پھر یاد رکھو اگر تمہاری تکذیب اور تولّی پر اللہ تعالےٰ نے بھی تم کو پکڑ لیا تو شکوہ نہ کرنا۔ اگر تمہیں جہالت اور قیاس سے دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل ہے تو یقیناً اللہ تعالےٰ کو علم اور حقیقت حال سے واقف ہونے کے نتیجہ میں تمہارے معاملات میں دخل دینے کا بدرجۂ اولیٰ حق حاصل ہے۔ پھر یہ شکوہ نہ کرنا کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔ پس أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ میں کفار کے انجام کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک دن یہ لوگ خدائی گرفت میں آنے والے ہیں۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ

یوں نہیں (ہوگا جیسے وہ چاہتا ہے بلکہ) اگر وہ (ان کاموں سے) باز نہ آیا تو ہم اُس کی پیشانی کے بال پکڑ کے گھسیٹیں گے

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ

ایک جھوٹی پیشانی (اور) خطا کار پیشانی (کے) ۱۳؎

نَسْفَعُ

۱۳؎ حل لغات۔ نَسْفَعُ: سَفَعَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَفَعَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو پکڑ کر سختی سے گھسیٹنا اور نَاصِيَة سر کے اگلے حصہ یا سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے كَلَّا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں تم جو یہ خیال کرتے ہو کہ ہمارے اس بندے کو کمزور اور ناتوان سمجھ کر اور بے یار و مددگار خیال کرکے عبادت سے روک دوگے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تمہارے سارے خیالات باطل ثابت ہونگے اور تمہاری اپنی طاقت اور قوت کے متعلق گھمنڈ سب جاتا رہیگا چنانچہ آج ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ جو ملک کا بادشاہ کہلاتا ہے جو لیڈر اور سردار قوم کہلاتا ہے اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے گا تو ہم اُسے سختی سے گھسیٹ کر اس کا انتقام لیں گے۔ سَفَعَ کے معنے عربی زبان میں کسی چیز کو پکڑ کر زور سے گھسیٹتے لئے جانے کے ہوتے ہیں۔ کفار میں بھی یہ عادت تھی کہ جب مسلمان غلام نماز کے لئے جاتے یا اپنے کسی اور کام کے لئے باہر نکلتے تو وہ اُنہیں کبھی ٹانگوں سے پکڑ کر اور کبھی سر کے بالوں سے پکڑ کر نہایت سختی کے ساتھ گھسیٹنا شروع کر دیتے اور کہتے کہ تم بتوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیوں کرتے ہو۔

۲۔ غلاموں پر کفار مکہ کی سختی۔

ایک غلام صحابی نے جو لمبے عرصہ تک کفار کے مظالم کا تختہ مشق بنے رہے تھے ایک دفعہ اسلام کی فتوحات کے زمانہ میں اپنی قمیص اُتاری تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کی پیٹھ کا چمڑا ایسا ہے جیسے بھینسے کا چمڑا ہوتا ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ غالباً یہ کوئی مرض ہے چنانچہ انہوں نے اس صحابی سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیا بیماری ہے کہ آپ کی پیٹھ کا چمڑا بالکل ایسا ہے جیسے کسی جانور کا چمڑا ہوتا ہے۔ وہ صحابی ہنس پڑے اور کہا تم کیا جانو کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ بیماری نہیں بلکہ اُن مظالم کا نشان ہے جو کفار مکہ کی طرف سے ہم پر ڈھائے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے سُنایا کہ جب ہم نے اسلام قبول کیا تو چونکہ ہم غلام تھے اور مالک کو اس ملک کے قانون کے مطابق ہم پر ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ جب وہ دیکھتے کہ ہم شرک نہیں کرتے تو بعض دفعہ وہ ہمارے پاؤں میں رسیاں باندھ کر ہمیں گلیوں میں گھسیٹنا شروع کر دیتے اور بعض دفعہ رسیاں باندھنے کی بجائے سر کے بالوں کو پکڑ کر گھسیٹنے لگ جاتے۔ گلیوں میں پتھر پڑے ہوئے ہوتے تھے مگر وہ اس بات کی کوئی پرواہ نہ کرتے اور ہمیں بے دردی کے ساتھ اُن پتھروں پر گھسیٹتے چلے جاتے یہاں تک کہ ہمارے چمڑے چھل جاتے۔ اور چونکہ یہ مظالم اُن کی طرف سے متواتر ہوئے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے چمڑے اپنی شکل کھو بیٹھے اور اُس شکل میں آگئے جس شکل میں آج تم دیکھ رہے ہو۔ انہی واقعات کی طرف جو مکہ میں پیش آنے والے تھے اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ ابھی تو یہ لوگ صرف عبادت سے روک رہے ہیں پھر وہ بھی وقت آنے والا ہے جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مکہ کی گلیوں میں گھسیٹے جائیں گے اور اُن کی کمریں چھیلی جائیں گی اور چونکہ مسلمانوں کے ساتھ یہ واقعات پیش آنے والے ہیں اور کفار مکہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اُن کو قسم قسم کے مصائب میں مبتلا کرنے والے ہیں اس لئے ہم کہتے ہیں کہ تم آج اس شخص کو جو ان میں خاص اثر رکھتا ہے اور جو اپنی طاقت اور قوت کا دعویدار ہے یہ سنا دو

کہ اگر اُن کو گھسیٹنا آتا ہے تو ہم کو بھی گھسیٹنا آتا ہے ہم اُنکے سر کے بالوں سے نہایت سختی کے ساتھ گھسیٹیں گے۔ اگر یہ اُس ناصیہ کو گھسیٹا کرتے تھے جو خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتی تھی تو ہم اُس ناصیہ کو کیوں نہیں گھسیٹیں گے جو جھوٹی اور خطا کار ہے اگر خدائے واحد کے آگے عبادت کرنے والی ناصیہ گھسیٹی جا سکتی ہے تو وہ ناصیہ جو بتوں کے آگے جھکتی ہے وہ گھسیٹے جانے کی کیوں مستحق نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوجہل سے ایسا ہی سلوک کیا۔ چنانچہ بدر کی جنگ جب ختم ہوئی اور دشمن مارا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اِسی حکم کے مطابق کہ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ابوجہل کو سر کے بالوں سے گھسیٹ کر اُس گڑھے میں گرا دیا گیا جو اُس کے لئے قبر کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ کہنے والا کہیگا یہ وحشت تھی کہ مُردہ کو بالوں سے گھسیٹا گیا۔ مگر یہ وحشت نہیں تھی بلکہ بدلہ تھا اُن مظالم کا جو مسلمانوں پر ڈھائے جاتے تھے اور بدلہ بھی نہایت معمولی۔ کیونکہ اُس نے تو زندوں کو گھسیٹا تھا جب اُنہیں تکلیف ہوتی تھی۔ مگر ابوجہل کو مُردہ ہونے کی حالت میں گھسیٹا گیا جبکہ اُسے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک دفعہ رویاء میں دیکھا کہ ایک انگریز جرنیل میرے پاس آیا ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے کہ آپ کا کیا فتویٰ ہے آیا قتل کے بدلہ میں قتل ہی ہے یا قاتل کو کوئی اور سزا بھی دی جا سکتی ہے؟ پھر اُس نے کہا ہمارے بعض آدمیوں کو جب سرحد پر مارا جاتا ہے تو اُن کی لاشوں کو چُونہ میں ڈالکر جلا دیا جاتا ہے یا اُن کو مختلف قسم کے عذاب دے دیکر مارا جاتا ہے ایسی صورت میں قاتل کو صرف قتل کی سزا ہی دی جائے گی یا تعذیب کی سزا بھی اُسے ملے گی؟ میں نے اُسے جواب میں کہا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ ع ۴) یعنی بدی کی سزا بُرے فعل کے مطابق دی جانی چاہیئے۔ پس میرا فتویٰ یہی ہے کہ قتل کے بدلہ میں قتل اور تعذیب کے بدلہ میں تعذیب۔ گو عام حالات میں قتل کے بدلہ میں قتل ہی کیا جائیگا لیکن اگر کسی وقت مصلحت کے ماتحت لوگوں کو تعذیب اور شرارت سے روکنے کے لئے یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ قتل کے بدلہ میں قتل ہوگا اور تعذیب کے بدلہ میں تعذیب تو یہ بالکل جائز ہوگا۔

بے شک وہ لوگ جنہوں نے اُس زمانہ کے حالات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ بڑی سختی کی گئی کہ ایک مردہ کو بالوں سے گھسیٹ کر گڑھے میں پھینکا گیا۔ مگر انہیں بھول جاتا ہے کہ یہاں تو کسی مردہ کو صرف ایک دفعہ گھسیٹا گیا ہے اور وہ لوگ سالہا سال زندوں کو پتھروں پر گھسیٹا کرتے تھے اور ابھی اُن کے زخم تازہ ہی ہوتے تھے کہ دوسرے دن پھر اُن کو پتھروں پر گھسیٹنا شروع کر دیا جاتا۔ اور پھر وہ صرف پتھروں پر گھسیٹتے ہی نہیں تھے بلکہ بسا اوقات اُن کے سینہ پر بڑے بڑے وزنی پتھر رکھ دیتے، اُن پر کھڑے ہو کر خود ناچنا کودنا شروع کر دیتے اور کہتے کہو کہ ہم لات اور عزّیٰ کو اپنا معبود مانتے ہیں۔ یہی وہ چیز تھی جس کی بناء پر ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کی خاص طور پر تعریف کی اور لوگوں سے فرمایا کہ بلال جب اذان دیتا ہے اور اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی بجائے اَسْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بلال کے اِس سین پر خاص طور پر خوش ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ میں آئے اور بلالؓ نے اذان دی تو چونکہ مدینہ کے لوگ بلالؓ سے ناواقف تھے جب انہوں نے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی بجائے اَسْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا تو لوگ ہنسنے لگ گئے۔ بلالؓ حبشی تھے اور اِس وجہ سے وہ تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے مجلس میں فرمایا لوگ بلال کے سین پر ہنستے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر اِس سین کو سُن کر خوش ہوتا ہے۔ اِس کی وجہ در اصل یہی ہے کہ مکہ میں بلال کے سینہ پر جب بڑے بڑے پتھر رکھ کر کہا جاتا کہ کہو لات اور مناۃ اور عزّیٰ سچے معبود ہیں تو بلال خاموش نہ رہتے بلکہ پتھروں کے

۲۰۱ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ کی پیشگوئی کا وقوع

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝

پس (کافر کو) چاہیئے کہ وہ اپنی مجلس کو بلائے ؎۱۴

نیچے سخت تکلیف کی حالت میں بھی یہی کہتے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ چونکہ اُس وقت وہ سین کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھا کرتے تھے اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بلال اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو اللہ تعالےٰ عرش پر خوش ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے بلال سے وہ سین سُنا ہوا تھا جو پتھروں کے نیچے اور مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے ہوئے اس کی زبان سے نکلا کرتا تھا۔ پس خالی بلالؓ کی اذان کی وجہ سے اللہ تعالےٰ خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ اللہ تعالےٰ کو بلالؓ کا وہ واقعہ یاد تھا جب اُسے پتھروں کے نیچے کچلا جاتا مگر وہ پھر بھی یہی کہتا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں تو آج کا سین نظر آتا ہے مگر اللہ تعالےٰ کو وہ سین یاد ہے جو پتھروں کے نیچے بلالؓ کی زبان سے نکلا کرتا تھا۔ اس لئے بلالؓ جب اذان دیتا اور اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو اللہ تعالےٰ اِس آواز کو سُن کر عرش پر خوش ہو جاتا ہے۔

اِن حالات کو اگر مدنظر رکھا جائے تو پھر کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ابوجہل کے سر کے بالوں کو گھسیٹ کر گڑھے میں ڈالنا ظلم تھا۔ میں سمجھتا ہوں وہ مؤرخ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے نعوذ باللہ وحشت سے کام لیا وہ کبھی حقیقتِ حال پر غور نہیں کرتے اگر وہ مسلمانوں کی جگہ اپنے باپ یا اپنی بیوی یا اپنے بچہ کو رکھیں اور عالمِ تصوّر میں اُن مظالم کا نقشہ اپنے ذہنوں میں لائیں جو مسلمانوں پر ڈھائے جاتے تھے تو اس کے بعد یقیناً وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ظلم قرار نہ دیں بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ نہایت ہی نرم سلوک کیا ہے۔ موجودہ جنگ یورپ کو ہی دیکھ لو کیا کیا مظالم ہیں جو ایک دوسرے پر ڈھائے گئے ہیں اور کس طرح دشمن سے انتقام لینے کے لئے بربریت کے نظارے پیش کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اس زمانہ کے لوگ اپنے آپ کو تہذیب و تمدّن کے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے تصوّر کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے تو کوئی ظلم بھی نہیں کیا۔ صرف بدر کے موقعہ پر چند ایسے مُردوں کو گھسیٹ کر گڑھے میں ڈالدیا جو مسلمانوں کو سالہا سال تک تپتی ریت اور سخت پتھروں پر گھسیٹتے اور گھسٹواتے رہے تھے۔ پس فرمایا جس طرح یہ لوگ ہمارے بندوں کو اُن کے بال پکڑ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں اسی طرح ہم بھی اُن کے بالوں سے اُن کو گھسیٹیں گے مگر یہ خیال نہ کرنا کہ ہم ظلماً ایسا کریں گے۔ کیونکہ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ایسی ناصیہ گھسیٹی جائے گی جو کَاذِبَۃٍ جھوٹی تھی خَاطِئَۃٍ خطاکار تھی۔ اور مجرم کو سزا دینا ظلم نہیں کہ تم یہ کہہ سکو کہ اُنہیں کیوں گھسیٹا جائے گا۔ گھسیٹا اس لئے جائے گا کہ وہ مجرم اور خطاکار ہیں اور دنیا کا کوئی قانون مجرم کو سزا دینا ظلم قرار نہیں دیتا۔

؎۱۴ **حل لغات**۔ اَلنَّادِیْ عربی زبان میں اُس مجلس کو کہتے ہیں جس میں دن کے وقت لوگ بیٹھ کر مختلف امور کے متعلق باہم مشورہ کرتے ہیں (اقرب) جس طرح مائدہ اُس دسترخوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اسی طرح اَلنَّادِیْ مجلس کو کہا جاتا ہے مگر اُس مجلس کو جس میں آدمی بیٹھے ہوئے ہوں خالی کمرہ کو نہیں کہتے۔ (اقرب)

تفسیر۔ کفارِ مکہ آپس میں کہا کرتے تھے آج بڑا مشورہ ہوا۔ آج محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ آج اُن کو مارنے پیٹنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آج اُن کے قتل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے لوگ جس مجلس کے حوالے دیا کریں گے اور کہیں گے کہ آج یہ فیصلہ ہوا کل وہ فیصلہ ہوا۔ ہم اسی مجلس کے متعلق اُس دن کفار سے کہیں گے کہ اب کیوں کسی کو اپنی مدد کے لئے نہیں بلاتے۔ جاؤ

اَلنَّادِیْ

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝

ہم بھی اپنی پولیس کو بلائیں گے ۵۱۵

اور اپنے اُن ساتھیوں کو بلاؤ جن کے ساتھ ملکر تم مسلمانوں کے خلاف دن رات منصوبے کیا کرتے تھے اور دیکھو کہ اس موقعہ پر وہ تمہارے کام آتے ہیں یا نہیں۔ تم نے مسلمانوں کے خلاف تو منصوبے کر لئے اب تم ہماری گرفت میں آچکے ہو۔ اگر تم میں طاقت ہے تو اب اپنے مشیروں کو بلاؤ اور اُن کو کہو کہ وہ تمہاری مدد کریں۔

۵۱۵ حل لغات۔ اَلزَّبَانِيَةُ: زَبَنَ سے ہے اور (زَبَنَ يَزْبِنُ زَبْنًا) کے معنے ہوتے ہیں دَفَعَهٗ اُس کو دُور کر دیا۔ صَدَمَهٗ۔ اُس سے ٹکرایا (اقرب) اِسی طرح لکھا ہے اَلزَّبَانِيَةُ عِنْدَ الْعَرَبِ اَلشُّرَطُ یعنی زَبَانِيَة کے معنے عربی زبان میں پولیس کے ہوتے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے وہ بھی اپنے ساتھیوں کو بلاتے اور مسلمانوں کے خلاف مجالس منعقد کیا کرتے تھے اس کے مقابل میں ہم بھی اپنی پولیس کو بلانے والے ہیں۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ زبانیہ سے مراد دوزخ کے فرشتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ دوزخ کے نہیں بلکہ جنّت کے فرشتے ہیں اور اس سے مراد وہ صحابہؓ ہیں جنہوں نے بدر کی جنگ میں کفّار کو اُن کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور انہیں اُن کے کیفر کردار تک پہنچایا انہی صحابہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مظلوم، کمزور اور بے بس مسلمان جنہیں تم نے اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنایا ہوا ہے ہماری پولیس کے سپاہی ہیں۔ پولیس والا کبھی اکیلا پکڑا جاتا تو چوروں اور ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو وہ اُسے خوب مارتے پیٹتے ہیں مگر جب گارد آتی ہے تو اُس کا مقابلہ کرنے کی اُس میں طاقت نہیں رہتی۔ اسی طرح تم آج ایک ایک دو دو مسلمانوں کو پکڑتے اور اُن کو مصائب و آلام میں مبتلا رکھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ ہمارا ان لوگوں نے کیا بگاڑ لینا ہے۔ ہم طاقتور ہیں اور یہ کمزور۔ ہم جتھے والے اور یہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد۔ لیکن تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ یہ کمزور اور اکیلے نظر آنے والے ہماری پولیس کے آدمی ہیں۔ جب تمہارے مظالم کا انتقام لینے کے لئے ہماری گارد آئی تو اُس وقت دنیا دیکھے گی کہ تمہارا کیسا عبرتناک انجام ہوتا ہے۔ جب ہماری گارد آئی تو اُس وقت تم میں سے کسی ایک میں بھی یہ طاقت نہیں ہوگی کہ اپنی اُنگلی تک مقابلہ میں اُٹھا سکے۔ چنانچہ دیکھ لو مکہ کے کتنے بڑے بڑے سردار تھے مگر مسلمانوں کی شوکت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو کیسا ذلیل کر دیا۔

اَلزَّبَانِيَة

حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک دفعہ مکہ میں آئے تو وہی غلام جن کو سر کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر لوگ گھسیٹا کرتے تھے ایک ایک کر کے حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لئے آنے شروع ہوئے۔ وہ عید کا دن تھا اور اُن غلاموں کے آنے سے پہلے مکہ کے بڑے بڑے رؤساء کے بیٹے آپ کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہو چکے تھے۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ بلالؓ آئے۔ وہی بلال جو غلام رہ چکے تھے، جن کو لوگ مارا پیٹا کرتے تھے، جن کو کھردرے اور نوکیلے پتھروں پر ننگے جسم سے گھسیٹا کرتے تھے، جن کے سینہ پر بڑے بڑے وزنی پتھر رکھ کر کہا کرتے تھے کہ کہو میں لات اور عزّےٰ کی پرستش کروں گا مگر وہ یہی کہتے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ حضرت عمرؓ نے جب بلال کو دیکھا تو اُن رؤساء سے فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور بلال کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ ایک اور غلام صحابی آ گئے۔ حضرت عمرؓ نے پھر اُن رؤساء سے فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کو بیٹھنے دو۔ تھوڑی دیر گذری تو ایک اور غلام صحابی آ گئے۔ حضرت عمرؓ نے حسب معمول اُن رؤساء سے پھر فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور

۲۱۱ زَبَانِيَة سے مراد صحابہ کرام

اُن کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ اتفاق کی بات ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ذلیل کرنا تھا اِس لئے یکے بعد دیگرے آٹھ دس غلام آگئے اور ہر دفعہ حضرت عمرؓ اُن رؤساء سے یہی کہتے چلے گئے کہ پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ اُن دنوں بڑے بڑے ہال نہیں بنائے جاتے تھے بلکہ معمولی کوٹھڑیاں ہوتی تھیں جن میں زیادہ آدمی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ جب تمام غلام صحابہؓ کمرے میں بھر گئے تو مجبوراً اُن رؤساء کو جوتیوں والی جگہ میں بیٹھنا پڑا۔ یہ ذلت اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی وہ اُسی وقت اُٹھے اور باہر آکر ایک دوسرے سے کہنے لگے دیکھا آج ہمیں کیسا ذلیل کیا گیا ہے یہ غلام جو ہماری خدمتیں کیا کرتے تھے اِن کو تو اُوپر بٹھایا گیا ہے مگر ہمیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا گیا یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے ہم جوتیوں والی جگہ پر جا پہنچے اور سب لوگوں کی نگاہ میں ذلیل اور رُسوا ہوئے۔ ایک شخص جو اُن میں سے زیادہ سمجھدار تھا جب اُس نے یہ باتیں سُنیں تو کہا یہ تو ٹھیک ہے کہ ہماری رسوائی ہوئی لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کس کی کرتوتوں سے ہُوا؟ ہمارے باپ بھائی جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو مارا پیٹا کرتے تھے اُس وقت یہ غلام آپ پر اپنی جانیں فدا کیا کرتے تھے۔ آج چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت ہے اِس لئے تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ اُن کو ماننے والے کن لوگوں کو عزت دیں گے آیا تم کو جو مارا کرتے تھے یا اُن غلاموں کو جو اپنی جانیں اسلام کے لئے قربان کیا کرتے تھے۔ اگر انہی کو عزت ملنی چاہیئے تو پھر تمہیں آج کے سلوک پر شکوہ کیوں پیدا ہُوا؟ تمہارے اپنے باپ دادا کے اعمال کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں ہو رہا جو غلاموں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں آگئی اور کہنے لگے ہم حقیقت تو سمجھ گئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا اِس رسوائی کا کوئی علاج نہیں؟ بے شک ہمارے باپ دادا سے بڑا قصور ہُوا مگر آخر اِس قصور کا کوئی علاج بھی ہونا چاہیئے جس سے یہ ذلت کا داغ ہماری پیشانی پر سے دُھل سکے۔

اس پر سب نے فیصلہ کیا کہ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی چلو حضرت عمرؓ سے ہی پوچھیں کہ اس رُسوائی کا کیا علاج ہے؟ جب وہ دوبارہ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اُس وقت تک مجلس برخاست ہو چکی تھی اور صحابہؓ سب جا چکے تھے انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آج ہمیں اس مجلس میں آکر جو دُکھ پہنچا ہے اُس کے متعلق ہم آپ سے مشورہ کرنے آئے ہیں حضرت عمرؓ نے کہا دیکھو بُرا نہ منانا۔ یہ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہمیشہ آگے بیٹھا کرتے تھے اِس لئے میں بھی مجبور تھا کہ انہیں آگے بٹھاتا۔ بے شک تمہیں میرے اس فعل سے تکلیف ہوئی ہوگی مگر میں مجبور تھا۔ انہوں نے کہا ہم آپ کی اس مجبوری کو سمجھتے ہیں ہم صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اِس ذلت کا کوئی علاج ہے؟ اور کیا کوئی پانی ایسا ہے جس سے یہ داغ دھویا جا سکے؟ حضرت عمرؓ جو اُن نوجوانوں کے باپ دادا کی شان و شوکت اور اُن کے رُعب اور دبدبہ کو دیکھ چکے تھے جب انہوں نے یہ بات سُنی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے کہاں سے کہاں آگرے ہیں اور آپ پر رقت اِس قدر غالب آئی کہ آپ اُن کی بات کا جواب تک نہ دے سکے صرف ہاتھ اٹھا کر شام کی طرف جہاں اُن دنوں قیصر کی فوجوں سے لڑائی ہو رہی تھی اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اب ذلت کا یہ داغ اِسی طرح دُھل سکتا ہے کہ اِس لڑائی میں شامل ہو کر اپنی جان دے دو۔ چنانچہ وہ اُسی وقت باہر نکلے اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اور شام کی طرف روانہ ہو گئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اُن میں سے ایک شخص بھی زندہ واپس نہیں آیا۔ اِس طرح انہوں نے اپنے خون کے ساتھ اُس ذلت کے داغ کو مٹایا جو اُن کی پیشانی پر اپنے باپ دادا کے افعال کی وجہ سے لگ گیا تھا۔ پس فرماتا ہے وہ بے شک اپنی مجلس کے آدمیوں کو بلالیں ہم بھی اپنی پولیس کے آدمیوں کو بلائیں گے اور اُن سے چوروں اور ڈاکوؤں والا سلوک کریں گے۔

كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝

یوں نہیں (ہو گا جس طرح دشمن چاہتا ہے) (اے نبی اور اس کے متبع) تو اس (کافر) کی اطاعت نہ کر اور اپنے رب کے حضور میں (ضرور) سجدہ کر اور اس سجدہ کے نتیجہ میں اپنے رب کے قریب ہو جا۔

۱۶ تفسیر - كَلَّا لَا تُطِعْهُ - یعنی خبردار جس طرح تو خیال کرتا ہے اُس طرح نہیں ہو گا۔ اے محمد رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے تو دشمن کی بات نہ مانیو اور اللہ تعالےٰ کی عبادت سے کبھی نہ رکیو بلکہ وَاسْجُدْ یہ لوگ تجھے جتنا زیادہ روکیں تو اُتنے ہی زیادہ زور کے ساتھ ہمارے حضور سجدہ میں گر جا۔ نتیجہ کیا ہو گا تو سجدہ میں جائے گا تو یہ تجھے ماریں گے مگر اس کے نتیجہ میں تو خدا تعالےٰ کے اور بھی زیادہ قریب ہو جائیگا۔

ایک سجدہ وہ ہوتا ہے جو امن کی حالت میں کیا جاتا ہے اور ایک سجدہ وہ ہوتا ہے جو لڑائی اور بدامنی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ وہ سجدہ جو ایسی حالت میں کیا جائے جب انسان کو عبادت سے روکا جاتا ہو اور اُسے اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہونے کی وجہ سے قسم قسم کے مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہو وہ سجدہ انسان کو آناً فاناً کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ ایک سجدہ وہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھا ہوتا ہے اُٹھتا ہے وضو کرتا ہے اور مصلے پر کھڑا ہو کر اللہ تعالےٰ کے حضور سجدہ میں گر جاتا ہے۔ لیکن ایک سجدہ وہ ہوتا ہے جب محض سجدہ کی وجہ سے انسان کو مارا اور پیٹا جاتا ہے یہ سجدہ اللہ تعالےٰ کے حضور جو قدر و قیمت رکھتا ہے وہ سجدہ نہیں رکھتا جو امن کی حالت میں کیا جاتا ہے۔

آج سے سو سال پہلے بھی اسلام کی تبلیغ کرنیوالے مسلمان دنیا میں موجود تھے۔ آج سے سو سال پہلے بھی اسلام کے لئے روپیہ خرچ کرنے والے لوگ دنیا میں موجود تھے۔ آج سے سو سال پہلے بھی اسلام کے ہمدرد دنیا میں موجود تھے مگر اُن کی تو تعریف کی جاتی تھی اور ہماری مذمت کی جاتی ہے۔ اُن کے متعلق تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اسلام کے بڑے ہمدرد ہیں مگر ہمارے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہم اسلام کے بہت بڑے دشمن ہیں حالانکہ ہمارا جرم کیا ہے؟ ہماری جماعت کے لوگ وہ ہیں جو اشاعتِ اسلام کے لئے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر روپیہ بھجواتے ہیں۔ خدائے واحد کا نام بلند کرنے کے لئے آٹھ آٹھ دس دس سال تک ممالکِ غیر میں اپنے بیوی بچوں سے جدا رہتے ہیں۔ جہاں بھی اسلام اور کفر کا ٹکراؤ ہو وہاں ایک بہادر پہلوان کی طرح پہنچ کر کفر کے مقابلہ میں اپنا سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ کلمۂ طیبہ پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اسلام کے ہر حکم پر بدل و جان عمل کرنا جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ مگر ہمیں تو گالیاں دی جاتی ہیں اور پہلے لوگوں کی تعریفیں کی جاتی ہیں حالانکہ اُن کا کام ہمارے کام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔

غرض جس قسم کی قربانی پر پہلے تعریفیں ہوتی تھیں اُسی قسم کی قربانی پر آج ہمیں ماریں پڑتی ہیں۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے سجدے اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے سجدے میں فرق ہے۔ بعد میں سجدہ کرنے والے وہ تھے جن کی چاروں طرف سے تعریفیں ہوتی تھیں اور کہا جاتا۔ کہ دیکھو فلاں شخص کتنا بزرگ ہے وہ اللہ تعالےٰ کی کتنے سوز و گداز کے ساتھ عبادت کرتا ہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس سجدہ کی کیا قیمت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کا تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے ہوئے تھے کہ کفارِ مکہ اونٹ کی ایک بڑی سی اوجھری اُٹھا لائے اور آپ کے سر پر پھینک کر ہنسنے لگ گئے۔ اُس کا بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ آپ سجدہ میں سے

اپنا سر نہ اُٹھا سکتے تھے۔ آخر حضرت فاطمہؓ کو کسی طرح اِس بات کا علم ہوگیا وہ اُس وقت چھوٹی بچی تھیں دوڑتی ہوئی آئیں اور انہوں نے وہ غلاظت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جسم پر سے اُٹھائی یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں جو قدر و قیمت رکھتا ہے وہ دوسرے سجدے کہاں رکھ سکتے ہیں۔ ایسا ایک سجدہ بھی خدا تعالیٰ کے قرب کی انتہائی منازل انسان کو اک آن میں طے کرا دیتا ہے جبکہ امن کے زمانہ کے ہزاروں ہزار سجدے بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے قرب کے دروازہ تک نہیں پہنچاتے۔ پس فرمایا لَا تُطِعْهُ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی! تُو اِن لوگوں کی بات مت مان۔ یہ تجھے عبادت سے جتنا زیادہ روکیں تُو اُتنے ہی زور کے ساتھ ہمارے حضور سجدہ میں گر جا کیونکہ اس روک کے باوجود تیری طرف سے جو سجدہ ہوگا وہ تجھے سیدھا اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے گا ؛

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ

سورۂ قدر - یہ سورۃ مکی ہے سلہ

وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا پانچ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سلہ سورۃ القدر مکی سورۃ ہے لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مدنی ہے چنانچہ واحدی کا قول ہے کہ ھِیَ اَوَّلُ سُوْرَۃٍ نَزَلَتْ بِالْمَدِیْنَۃِ۔ یہ پہلی سورۃ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔

اس سورۃ پر بحث کرتے ہوئے مفسرین نے جمہور کی عجیب تعریف کی ہے بعض کہتے ہیں عِنْدَ الْجَمْھُوْرِ مَکِّیَّۃٌ اور بعض کہتے ہیں عِنْدَ الْجَمْھُوْرِ مَدَنِیَّۃٌ معلوم نہیں وہ کون سے جمہور ہیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ مکی بھی ہے اور جمہور کے نزدیک یہ مدنی بھی ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ مفسرین یہ تو کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ سورۃ مدنی ہے مگر کسی صحابی کا نام نہیں لیتے کہ فلاں فلاں نے اس سورۃ کو مدنی قرار دیا ہے آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہی تھے جو اس کو مکی یا مدنی قرار دے سکتے تھے پس جب ان کے نزدیک جمہور نے اسے مدنی قرار دیا ہے تو چاہیئے تھا کہ وہ کچھ صحابہ کا ذکر کرتے اور کہتے کہ فلاں فلاں صحابی نے اسے مدنی قرار دیا ہے مگر باوجود یہ لکھنے کے کہ عِنْدَ الْجَمْھُوْرِ مَدَنِیَّۃٌ پھر اس قسم کی روایتوں کا بھی تفاسیر میں ذکر آتا ہے۔ کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ مکی ہے۔ جب صحابہؓ اسے مکی قرار دیتے ہیں تو پھر یہ لکھنے کے کیا معنے ہوئے کہ عِنْدَ الْجَمْھُوْرِ مَدَنِیَّۃٌ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جمہور کا محاورہ جو ہماری کتب میں استعمال کیا جاتا ہے کیسا خلاف اصول ہے کہ ہر لکھنے والا جب اپنی رائے کے مطابق دو چار لوگوں کی آراء دیکھ لیتا ہے تو فوراً کہنا شروع کر دیتا ہے کہ جمہور کے نزدیک فلاں بات یوں ہے حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ ہر صحابی اس امر کا ذکر نہیں کیا کرتا کہ فلاں سورۃ مکی ہے یا مدنی۔ صرف چند صحابہ ایسے امور کا ذکر کیا کرتے ہیں اور جب انہوں نے کھلے لفظوں میں اسے مکی قرار دیا ہے اور مفسرین خود بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر نہ معلوم ان کو کیا خیال آ گیا کہ صحابہؓ کی اس قطعی رائے کے باوجود انہوں نے اسے مدنی قرار دیدیا مستشرقین جن میں سے بعض تو دیانتدارانہ طور پر حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض پادری یا پادری نما جان بوجھ کر یا تعصب سے واقعات کو بدل دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی اسے مکی ہی قرار دیا ہے۔ نولڈکے مشہور مستشرق بھی اسے سورۂ عبس کے مشابہ مکی قرار دیتا ہے۔

سورۃ القدر مکی ہے

بعض احادیث میں اس کے نزول کی عجیب وجہ بیان کی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ چار نبیوں کے متعلق یہود میں یہ خیال تھا کہ انہوں نے اسّی سال بلا ناغہ بغیر گناہ کے ارتکاب کے خدا تعالےٰ کی عبادت کی ہے اور وہ چار نبی یہ ہیں ایوب۔ ذکریا۔ حزقیل یوشع۔ جب یہودیوں کا یہ قول صحابہؓ نے سنا تو ان کو رشک پیدا ہوا کہ چار آدمی ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اسّی سال تک بغیر کسی غلطی کے ارتکاب کے اللہ تعالےٰ کی عبادت کی ہے اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ یعنی تم تو اسّی سال کی عبادت پر رشک کرتے ہو اور اسلام کی یہ کیفیت ہے کہ اگر کسی کو لیلۃ القدر میں اللہ تعالےٰ کی عبادت نصیب ہو جائے تو اس ایک رات کی عبادت ہی ہزار مہینوں یعنی تراسی سال کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ روایت قابل قبول نہیں اور اسے تسلیم کرنا عقلی طور پر ناممکن ہے کیونکہ اگر واقعہ میں کسی کو اسّی سال

مفسرین کے نزدیک لفظ جمہور کا خلاف اصول استعمال

عبادت کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو اُس پر کسی شخص کو محض ایک رات میں عبادت کرنے کی وجہ سے کس طرح فضیلت دی جا سکتی ہے۔ اگر کہو کہ ایک رات کی عبادت اتنے سوز و گداز سے لبریز ہوگی اور اتنی محبت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے اتنے عشق کو ظاہر کرنیوالی ہوگی کہ باوجود ایک رات کی عبادت ہونے کے اپنی شان اور عظمت میں اسّی سال کی عبادتوں سے بڑھ جائے گی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے خاص طور پر بیان کیا جاتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک رات کا بھی سوال نہیں اگر ایک گھنٹہ میں بھی کوئی شخص اپنے اخلاص اور اپنی محبت کا کوئی ایسا ثبوت دیدیتا ہے جو دوسرے کی اسّی سالہ زندگی میں بھی نہیں ملتا تو یقیناً اُس کے ایک گھنٹے کا اخلاص دوسرے کی اسّی سالہ کوششوں کے نتائج سے بڑھ جائے گا بلکہ میں کہتا ہوں ایک گھنٹے کا بھی سوال نہیں اگر کسی پر ایک منٹ بھی ایسا آجائے تو اُس کا وہ ایک منٹ دوسرے شخص کی اسّی یا سَو سالہ عبادت سے بڑھ جائے گا۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک وقت آیا جبکہ اسّی سال کی عمر کے بعد اُن کے ہاں ایک بچہ پیدا ہُوا اور پھر جیسا کہ بائبل اور قرآن کریم دونوں سے ثابت ہے جب وہ بڑا ہُوا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ اپنے اِس بیٹے کو خدا کی راہ میں ذبح کر دو۔ گو میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ تھی کہ اپنے بیٹے کو اُس وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ جہاں نہ کھانے کو کچھ ملتا ہے نہ پینے کو۔ اور اسطرح ظاہری رنگ میں اپنی طرف سے اُس پر موت وارد کر دو۔ مگر چونکہ اُس وقت تک انسانی قربانی کا بھی رواج تھا اللہ تعالیٰ نے اِس رنگ میں اُن کو یہ نظارہ دکھا دیا تاکہ ساتھ ہی اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے دستور کو دیکھتے ہوئے سمجھا کہ یہ میرا امتحان ہے اور غالباً اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے کہ اسّی سال کے بعد میرے ہاں جو بیٹا پیدا ہُوا ہے مَیں اُسے عملاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کر دُوں انہوں نے اپنے بیٹے سے ذکر کیا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے (کہ ہمارے نزدیک وہی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا اُس اچھی تربیت کے ماتحت جو اپنے ماں باپ سے اُنہیں حاصل ہو رہی تھی) اس بات پر آمادگی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ مجھے ذبح کر دیا جائے تو پھر مجھے اس حکم کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے جنگل میں لے گئے اور انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ماتھے کے بل گرا دیا وہ چھری پھیرنے کے لئے تیار ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہُوا يَا اِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا (صافات ع۳) اے ابراہیم تم نے اِس رویاء کو اپنی طرف سے پورا کر دیا ہے لیکن ہمارا منشاء یہ نہ تھا تم اِس واقعہ کی یادگار میں ایک بکرا ذبح کر دو۔ یہ خواب کسی اَور صورت میں پورا ہونے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ گھڑی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے یقیناً کئی لوگوں کی اسّی اسّی بلکہ سو سو سال کی عبادت سے بھی بڑھکر تھی۔ آخر دنیا میں ایسے کئی لوگ موجود ہوتے رہیں جو اسّی سال کی عمر پاتے ہیں بلکہ سو سو سال تک زندہ رہنے والے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے ایک سو بیس۔ ایک سو تیس۔ ایک سو چالیس یا ایک سو پچاس سال کی عمر پائی۔ میں نے خود ایک شخص کو دیکھا ہے جنہوں نے ایک سو چالیس سال سے اوپر عمر پائی تھی۔ وہ جب میری بیعت کے لئے آئے تو لاہور سے پیدل چل کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب ایک دفعہ میرے اُستاد کے پاس کسی کام کے متعلق دعا کرانے کیلئے آئے تھے اور انہوں نے ایک بھینس اُنکو تحفہ کے طور پر دی تھی میں اُس وقت اتنا جوان تھا کہ وہ بھینس جو مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب نے میرے اُستاد کو دی اُس کے متعلق میرے اُستاد نے مجھے کہا کہ جاؤ اور اِس کو نہلا لاؤ۔ یہ روایت انہوں نے آج سے بیس سال پہلے بیان کی تھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اُس وقت وہ صاحب بیس پچیس سال کے تھے جب یہ واقعہ ہُوا تو چونکہ بیعت کے وقت تک اندازاً سو سال کا عرصہ اس واقعہ پر گذر چکا تھا اس لئے

جب وہ میری بیعت کیلئے آئے اُس وقت وہ ایک سو بیس سال کے تھے اور مجھے دوستوں نے بتایا کہ اس کے بعد بھی وہ پندرہ بیس سال زندہ رہے تھے گویا ایک سو چالیس سال سے اُوپر عمر اُنھوں نے پائی اور ایک سو بیس سال کی عمر میں وہ اتنے مضبوط تھے کہ لاہور سے پیدل چل کر قادیان آئے۔ اب اگر وہ ساری عمر دین کی طرف متوجہ رہے ہوں اور انھوں نے ایک سو بیس سال تک اللہ تعالےٰ کی عبادت کی ہو تب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ ایک گھڑی کی عبادت اُن کی ایک سو بیس سالہ عبادت سے بڑھ گئی اور خدا تعالےٰ کے فعل نے بھی نتیجہ ظاہر کر دیا کیونکہ جو سلوک اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا ہے وہ اُن سے نہیں کیا۔ اللہ تعالےٰ تو کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا وُہ خود فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ (الزلزال ع) جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کرتا ہو وُہ اُس کے اچھے نتیجہ کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ جب اللہ تعالےٰ کسی کی ایک ذرہ کے برابر نیکی بھی ضائع نہیں کرتا تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اُس کی ایک سو بیس سال کی عبادت کو ضائع کر دے اور یہ کہنا کہ سوز و گداز اور اخلاص کی وجہ سے بعض دفعہ ایک رات کی عبادت اَسی سال کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ جواب بھی اس موقعہ پر چسپاں نہیں ہو سکتا کیونکہ روایت میں ہو کہ پہلے نبیوں نے اَسی سال عبادت کی تھی جس کی خبر سُن کر صحابہ کو افسوس ہُوا کہ ہم اس کے مقابل پر کیا پیش کریں گے۔ اگر یہ روایت اس جگہ چسپاں کی جائے تو پھر اس کے یہ معنے ہونگے کہ نبیوں کی اسی سالہ عبادت سے غیر نبی کی ایک رات کی عبادت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اُس میں زیادہ سوز و گداز ہوتا ہے اور یہ دعوٰی بالبداہت باطل ہے۔ بفرضِ محال یہ درست بھی ہو تو پھر اس مضمون کو ان الفاظ میں بیان کرنا تو بلاغت کے خلاف ہے۔ اس صورت میں تو یُوں کہنا چاہیئے تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے دل اس قدر پاک ہیں کہ اُن کے ایک لمحہ کی عبادت یا انکی ایک رات کی عبادت ان لوگوں کی اَسی سال کی عبادت سے بہتر ہے مگر اس کی بجائے فرمایا یہ گیا ہے کہ ایک خاص رات کی عبادت دوسرے اَسّی سال کی عبادت سے اچھی ہے اور یہ بات یقیناً اس بیہودہ روایت کا جواب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ صرف ایک رات کو بغیر اور کسی خصوصیت کے دوسرے سالوں پر ترجیح دے دینا عقل کے خلاف ہے اور صرف زبردستی اور دھینگا مشتی ہے جو اللہ تعالےٰ کی شان کے خلاف ہے۔

یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ایک معمولی مومن اور متقی انسان اگر ایک رات عبادت میں گذار دے تو وہ پہلے انبیاء کی اَسی سالہ عبادتوں سے بھی بڑھ جاتا ہو تو اس سے بڑھکر ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اُن انبیاء کو اَسی سال عبادت کرنے کے بعد بھی اتنا انعام نہ ملے جتنا انعام ایک معمولی مسلمان کو محض ایک رات عبادت کرنے کی وجہ سے دیدیا جائے۔ پس اس حدیث کا یہ مفہوم قرآنی تعلیم اور عقل کے بالکل خلاف ہو۔

ترتیب | اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق ظاہر ہے وہاں فرمایا تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا ہے اور مطلب یہ تھا کہ قرآن پڑھ۔ اب اِس سورۃ میں قرآن کریم کی فضیلت اور اُس کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہو کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ یہ قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا ہے یعنی یہ وہ کتاب ہے جو دنیا کی ترقی اور اُس کے تنزل کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام فیصلوں پر حاوی ہے یا یوں کہہ لو کہ قرآن کریم دنیا کی ترقی اور اُس کے تنزل کے تمام سامانوں کی تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ آئندہ دنیا کن اصول کے مطابق چل کر ترقی کر سکتی ہے اور کن امور کی پیروی کر کے تباہ ہو سکتی ہے۔ جو چیز ایسی اہم ہو کہ اُس کو قبول کرنے میں دنیا کی نجات اور اس کو رد کرنے میں دنیا کی تباہی ہو اُس کا پڑھنا اور بار بار لوگوں کو سُنانا جس قدر ضروری ہو سکتا ہو وہ ایک ظاہر امر ہے ہم تو دیکھتے ہیں دنیا میں لوگ معمولی معمولی باتوں پر ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں عید کا چاند دیکھتے ہیں تو ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ کل عید ہوگی۔ نیا مال آتا ہو تو تاجر اور دوکاندار لوگوں میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مال ہمارے پاس آیا ہو آؤ اور اسے لے جاؤ۔

سورۃ القدر کا سورۃ العلق سے تعلق

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ۝

ہم نے یقیناً اس (قرآن یا محمد رسول اللہ) کو (ایک عظیم الشان) تقدیر والی رات میں اُتارا ہے۔ ۵۲

لَیْلَۃٌ کسی بادشاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو اعلانات کے ذریعہ اس خبر کی خوب تشہیر کی جاتی ہے حالانکہ بعض دفعہ وہ چند دنوں کے بعد ہی مر جاتا ہے اور بعض دفعہ بڑے ہو کر وہ ایسا نالائق ثابت ہوتا ہے کہ باپ دادا کی ساری سلطنت کو کھو دیتا ہے۔ اسی طرح ٹڈی سے ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو گورنمنٹ اخبارں میں اعلانات کراتی ہے کہ ٹڈی دَل آیا ہُوا ہے اُس سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر فوری طور پر عمل کرنا چاہیئے یا مثلاً گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ اس دفعہ غلہ کی اچھی قیمت ہوگی یا کپاس کا نرخ بڑھ جائے گا یا بارشیں زیادہ ہوں گی تو گورنمنٹ بار بار ان باتوں کا اعلان کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ ہر شخص کے قَدْرٌ کانوں تک یہ باتیں پہنچ جائیں جب معمولی معمولی چیزوں کے متعلق ڈھنڈورے پیٹے جاتے اور بڑے زور سے اعلان کئے جاتے ہیں تو وہ چیز جو بنی نوع انسان کی تقدیر کو لے کر آئی ہو اور جو اپنے اندر دنیا کی ترقی اور اُس کے تنزّل کے سامانوں کی تفصیل رکھتی ہو، جس پر عمل لوگوں کو نجات دلانے والا اور جس سے انحراف اُن کو تباہی کے گڑھے میں گرانے والا ہے اُس کا زور و شور سے اعلان کرنا کیوں ضروری نہیں؟

پس اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ میں جو یہ کہا گیا تھا کہ قرآن کریم کا دنیا میں خوب ڈھنڈورا پیٹو اور اس کی تعلیم کا بار بار اعلان کرو۔ اِس سُورۃ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ قرآن کریم کا دنیا میں شائع کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہم نے اِس کو ایک اندازہ والے زمانہ میں اُتارا ہے یعنی یہ کتاب دنیا کی ترقی اور اُس کے تنزّل کے متعلق تمام اندازے اپنے اندر رکھتی ہے۔

۵۲ حل لغات۔ لَیْلَۃٌ:۔ اَللَّیْلُ: مِنْ مَغْرِبِ الشَّمْسِ اِلٰی طُلُوْعِ الْفَجْرِ الصَّادِقِ اَوْ اِلٰی طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَھُوَ خِلَافُ النَّھَارِ یعنی سورج کے غروب ہونے کے وقت سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے کے وقت کو لَیْل کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک سورج کے نکلنے تک کے وقت کو۔ اور لَیْل کا لفظ نَھَار یعنی دن کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔ بعض علماء لُغت کا خیال ہے کہ لَیْلٌ اور لَیْلَۃٌ ایک ہی چیز ہے۔ جیسے عربی میں عَشِیٌّ اور عَشِیَّۃٌ ہم معنے ہیں۔ لیکن مرزوقی عالِم لُغت کہتے ہیں کہ لَیْل کا لفظ نَھَار کے مقابل پر بولا جاتا ہے اور لَیْلَۃ کا یَوْم کے مقابل پر (اقرب)

قَدْرٌ کے معنے مَبْلَغُ الشَّیْءِ کے ہوتے ہیں یعنی کسی چیز کی جو قیمت ہوتی ہے اُس کو قَدْرٌ کہتے ہیں۔ اسی طرح قَدْرٌ کہ ایک چیز کے دوسری چیز سے مساوی ہونے کو بھی کہتے ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں ھٰذَا قَدْرُ ھٰذَا اَیْ مُمَاثِلُہٗ وَمُسَاوٍ لَہٗ یعنی فلاں چیز فلاں کے مساوی ہے اسی طرح طاقت کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور قَدْرٌ کے معنے حُرمت کے بھی ہوتے ہیں اور وقار کے بھی ہوتے ہیں اور غِنَاءٌ کے بھی ہوتے ہیں اور قوت کے بھی ہوتے ہیں۔ اور قَدْرٌ کے معنے اَلْوَقْتُ الَّذِیْ یَلْزِمُ لِلْفِعْلِ کے بھی ہوتے ہیں یعنی جتنے وقت میں کوئی کام ہو سکتا ہو اُس کو بھی قَدْرٌ کہتے ہیں اور چونکہ یہ مصدر ہے اس لئے سارے مصدری معنے بھی اس میں پائے جائیں گے۔ اس لحاظ سے اس کے معنے تنگی کے بھی ہیں اور حُکم کے بھی اور اقتدار کے بھی اور تعظیم کے بھی اور تدبیر کے بھی۔ اور لیلۃ القدر وہ رات بھی ہے جو رمضان کے

آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں آتی ہے (اقرب) قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر بھی اس رات کا ذکر آیا ہے مگر وہاں الفاظ اس آیت سے مختلف ہیں۔ ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان ع ۱) یعنی ہم نے اُسے ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ پس لَیْلَةُ الْقَدْرِ لیلۃ المبارکہ بھی ہے ایک دوسری جگہ فرماتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرۃ ع ۲۳) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے قرآن اُتارا گیا۔ ان دونوں آیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی کسی رات میں قرآن کریم کا نزول ہُوا۔ اور اس وجہ سے اس رات کو خاص طور پر مبارک قرار دیا گیا۔

تفسیر۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے۔ چونکہ پہلی سورۃ میں قرآن کریم کا ذکر آچکا تھا اس لئے یہاں بجائے یہ کہنے کے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنَا الْقُرْاٰنَ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ اللہ تعالےٰ نے صرف اُس کی طرف ضمیر پھیر دی اور کہہ دیا کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ کیونکہ یہ بات ہر شخص پہلی سورۃ پر نظر ڈالکر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا تھا اور اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ قرآن کریم کا خاص طور پر نام لیا جاتا۔

لَیْلَة اور لَیْل کے معنے رات کے ہوتے ہیں۔ مرزوقی عالم لُغت کا قول ہے کہ لَیْل کا لفظ نَھَار کے مقابل استعمال ہوتا ہے اور لَیْلَة کا لفظ یَوْم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے (اقرب) قرآن کریم میں لَیْل اور لَیْلَة دونوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن لَیْل کا لفظ زیادہ استعمال ہُوا ہے اور لَیْلَة کا کم میری گنتی کے مطابق لَیْل کا لفظ ۹۷ دفعہ قرآن کریم میں استعمال ہُوا ہے اور لَیْلَة کا لفظ صرف آٹھ دفعہ۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ لفظ لَیْلَة کا استعمال نزول کلام الٰہی یا اُس کے متعلقات کے ساتھ استعمال ہُوا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ رمضان کی رات کے لئے یہ لفظ استعمال ہُوا ہے فرماتا ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (بقرہ ع ۲۳) یعنی تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے بے تکلف ہونا جائز ہے اور روزوں کے مہینہ یعنی رمضان کے متعلق آتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ یعنی رمضان میں قرآن اُترنا شروع ہُوا تھا پس رمضان کی راتوں کو لَیْلَة کے لفظ سے یاد کرنا لَیْلَة کا تعلق کلام الٰہی والے مہینہ سے ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح تین جگہ لَیْلَة کا لفظ حضرت موسیٰؑ کی موعود چالیس راتوں کے متعلق استعمال ہُوا ہے۔ اور یہ وہ عرصہ ہے جس میں تورات کے اہم احکام نازل کئے گئے تھے اور جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً (بقرہ ع ۶) اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔ پھر سورۃ اعراف میں آتا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً (ع ۱۷ آیت ۱۴۳) یعنی اللہ تعالےٰ نے پہلے موسیٰ کو تیس راتیں کلام کرنے کا وعدہ کیا مگر بعد میں دس راتیں اور بڑھا دیں اور اس طرح اپنے وعدہ کو مکمل کر دیا۔ اِن تینوں آیتوں میں بھی لَیْلَة کا لفظ کلام الٰہی کے نزول کے لئے استعمال ہُوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ میں ہٗ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم

اِن کے علاوہ چار اور مقام پر لَیْلَة کا لفظ استعمال ہُوا ہے اور چاروں مقامات میں ہی نزولِ قرآن کے متعلق نازل ہُوا ہے۔ سورۃ دُخان میں آتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (ع ۱ آیت ۴) ہم نے اس قرآن کو مبارک رات میں اُتارا ہے اور دوسرے اسی سورۃ زیر تفسیر میں ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے قرآن کریم کو بڑے اندازہ والی رات میں اُتارا ہے۔ پھر اسی سورۃ میں اس سے اگلی آیت میں فرماتا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ۔ اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ لیلۃ القدر کیا ہے۔ پھر اس آیت سے اگلی آیت میں فرماتا ہے لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ لیلۃ القدر ہزار راتوں سے بھی اچھی ہے۔ گویا آٹھ مقامات پر لَیْلَة کا لفظ استعمال ہُوا ہے اور ہر جگہ نزول کلام الٰہی یا اس کے متعلقات کے متعلق استعمال ہُوا ہے۔ یہ امر اتفاقی نہیں کہلا سکتا ضرور اس میں کوئی حکمت ہے اور لَیْل اور لَیْلَة کے استعمال کا یہ فرق بے معنی نہیں ہے۔

۳۱۱
لفظ لَیْل اور لَیْلَة کے استعمال میں ایک فرق

میرے نزدیک کلام الٰہی والی راتوں کے متعلق لَیۡلَۃ کا استعمال اور دوسری راتوں کے متعلق لَیۡلٌ کا استعمال عربی زبان کے اس قاعدہ کی وجہ سے ہے کہ حروف کی زیادتی یا بعد میں آنیوالے حروف کی تبدیلی ہمیشہ معنوں میں زور اور قوت پیدا کرنے کیلئے ہوتی ہے مثلاً دَبَسَ اور دَبَعَصَ کے ملتے جلتے معنے ہیں لیکن دَبَسَ سے دَبَعَصَ میں زیادہ زور ہے۔ دَبَسَ کے معنے مارنے کے ہوتے ہیں اور دَبَعَصَ کے معنے ہیں شیر کا اپنے شکار کو دبوچ کر دبا لینا۔ یہ ظاہر ہے کہ صرف مارنے سے شیر کا اس طرح جھپٹا مار کر دبوچ لینا اور اپنے نیچے دبا لینا زیادہ سخت ہے۔ اسی طرح قَصَمَ اور قَضَمَ دونوں کے معنے توڑنے کے ہیں مگر قصم کے معنے خالی توڑنے کے ہیں اور قضم کے معنے توڑ کر کھا جانیکے ہیں اس لئے کہ ص سے ض بعد میں آتا ہے۔ پس ض کا حرف جس لفظ میں آئیگا اُسی مفہوم کے اُس لفظ کے معنے زیادہ زوردار ہوں گے جس میں ص کی جگہ ض آجائے گا۔ اِسی طرح مَسَّ اور مَصَّ کے الفاظ ہیں مَسَّ کے معنے چھونے کے ہیں اور مَصَّ کے معنے اُوپر مُنہ رکھکر چوسنے کے ہیں یعنی خالی چھونا نہیں بلکہ اُسے اپنی طرف کھینچنا اِسی طرح نَسَّ النَّاقَۃَ کے معنے ہیں کہ اُسے چلایا اور ڈانٹا اور نَصَّ النَّاقَۃَ کے معنے ہیں اُسے چلنے پر خوب انگیخت کیا اور اُسے اتنا مجبور کیا کہ وہ اپنی انتہائی طاقت کے مطابق دوڑنے لگی۔ اِسی طرح فَسَلَ اور فَصَلَ دونوں لفظ جدائی پر دلالت کرتے ہیں لیکن فصل کی جدائی فسل سے زیادہ ہے کیونکہ ص س کے بعد آتا ہے۔ اِسی طرح حروف کی زیادتی سے بھی معنوں میں فرق پڑ جاتا ہے مثلاً لَبِبٌ کے معنے ہیں کھلے سینہ والا۔ لیکن لَبَلَبٌ جس میں ایک کی جگہ دو لام آجاتے ہیں اس کے معنے ہیں اَلْبَرُّ بِاَهْلِهٖ وَالْمُحْسِنُ لِجِيْرَانِهٖ۔ اپنے اہل سے حد سے زیادہ نیک سلوک کرنے والا اور اپنے ہمسائیوں پر احسان کرنے والا۔ گویا خالی سینہ کی وسعت کے معنے ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا سلوک عملاً کرنے والا لَبَلَبٌ کہلاتا ہے اس لئے کہ لَبِبٌ میں تین حرف ہیں اور لَبَلَبٌ میں چار ہیں۔

عربی قواعد میں یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض دفعہ تاء اسم فاعل کے آخر میں مبالغہ کے لئے لگا دی جاتی ہے اور بطور قاعدہ صفت مشبہ کے آخر میں لگائی جاتی ہے اور اس میں مبالغہ کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً راوی عام روایت کرنے والے کو کہتے ہیں لیکن شعراء کے شعر بیان کرنے والے کو رَاوِیَۃ کہتے ہیں کیونکہ وہ بالعموم ہزاروں لاکھوں شعروں کی روایت کرتے تھے۔ اسی طرح نَسَّاب نسب بیان کرنے والے کو کہتے ہیں اور نَسَّابَۃ مبالغہ کیلئے آتا ہے یعنی خوب اچھی طرح نسب بیان کرنے والا۔ پس لَیۡل اور لَیۡلَۃ میں چونکہ لَیۡلَۃ کے حروف لَیۡل سے زیادہ ہیں اس لئے اِس کے معنوں میں لَیۡل سے زیادہ وسعت ہے اور یہی وجہ ہے کہ لَیۡلَۃ۔ یَوۡم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنے نَھَار سے زیادہ وسیع ہیں اور لَیۡل۔ نَھَار کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنے یَوۡم سے محدود ہیں۔ پس لَیۡلَۃ کا لفظ اُن راتوں یا اُس زمانہ کی نسبت استعمال کر کے جن میں کلام الٰہی نازل ہوتا ہے اُن راتوں کی بزرگی اور عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چونکہ الٰہی کلام میں اعلیٰ ادب کے قواعد کے مطابق کبھی الفاظ اپنے لُغوی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی مجازی معنوں میں۔ اِس آیت کے متعلق بھی یہ سوال ہے کہ آیا اس میں لَیۡلَۃ کا لفظ محض رات کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے یا ایک لمبے تاریک زمانہ کے متعلق۔ تمام گزشتہ مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ اس آیت میں لَیۡلَۃ کے معنے محض رات کے ہیں اور لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ کے معنے ہیں اندازہ کی رات۔ مفسرین کے نزدیک سورۂ دخان میں جو اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ آیا ہے اس سے بھی یہی رات مراد ہے اور یہ رات رمضان کے مہینہ کی رات ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آتا ہے شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ پس لیلۃ القدر سے مراد رمضان کی وہ رات ہے جس میں قرآن کریم نازل ہُوا تھا وہ رات مبارک تھی اور اندازہ کی رات تھی یعنی آئندہ خیر و شر کا اندازہ اللہ تعالےٰ نے اس میں کیا۔ قرآن شریف کے نازل ہونے کے متعلق اختلاف ہے بعض کے نزدیک سارا قرآن اُسی رات کو لوحِ محفوظ سے اُتر کر بیت العزۃ نامی مقام پر آگیا اس کے بعد آہستہ آہستہ تیئیس سال تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر

نازل ہوا (سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ بحوالہ ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد اوّل صفحہ ۳۷۵) اسی طرح ابن عباس سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے کہ اُن سے مقسم نے سوال کیا کہ میرے دل میں ایک شک پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن کریم میں تو آتا ہے کہ قرآن رمضان کے مہینہ میں نازل ہوا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک لمبے عرصہ میں کچھ کسی مہینہ میں کچھ کسی مہینہ میں اور کچھ کسی مہینہ میں اُترا ہے۔ اس پر ابن عباس نے جواب دیا کہ اِنَّهٗ اُنْزِلَ فِيْ رَمَضَانَ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَفِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ثُمَّ اُنْزِلَ عَلٰى مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ تَرْتِيْلًا فِي الشُّهُوْرِ وَالْاَيَّامِ۔ یعنی قرآن کریم سب کا سب ایک ہی بار رمضان کے مہینہ اور لیلۃ القدر کی رات میں جو لیلہ مبارکہ بھی کہلاتی ہے اُترا تھا۔ مگر زمین پر مختلف مہینوں اور دنوں میں آہستہ آہستہ نازل ہوا۔ گویا اُن لوگوں کے نزدیک قرآن کریم کے لیلۃ القدر میں اُترنے کے معنے یہ ہیں کہ اس رات کو لوح محفوظ سے (یعنی اُس مقام سے جہاں اُن کے نزدیک ازل سے قرآن کریم لکھا پڑا تھا) قرآن کریم اُترا تھا۔

بعض کے نزدیک شہر رمضان میں قرآن کریم اُترنے سے مراد اُس کے نزول کی ابتداء ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حیان لکھتے ہیں ذٰلِكَ الْاِنْزَالُ هُنَا هُوَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَكُوْنُ الْقُرْاٰنُ مُتَاَخِّرًا بِكُلِّهٖ عَنْ بَعْضِهٖ وَالْمَعْنٰى بُدِئَ بِاِنْزَالِهٖ فِيْهِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (تفسیر بحر محیط جلد ۲ صفحہ ۳۹) یعنی بعض علماء اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ قرآن کے اُترنے سے مراد اس کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اُترنا ہے نہ کہ بیت العزت پر۔ اور قرآن کریم اُترنے سے مراد اس کے کچھ حصہ کا اُترنا ہے۔ پس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اس مہینہ میں قرآن کریم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اُترنا شروع ہوا تھا۔

بعض نے اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے یہ معنے کئے ہیں کہ رمضان کے بارہ میں قرآن اُترا ہے نہ یہ کہ رمضان کے مہینہ میں قرآن اُترا ہے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے وَقِيْلَ فِيْ مَعْنَى الْاٰيَةِ الَّذِيْ نَزَلَ بِفَرْضِ صِيَامِهِ الْقُرْاٰنُ كَمَا تَقُوْلُ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِي الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَنَحْوَ ذٰلِكَ (جلد اول صفحہ ۲۳۳) یعنی بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم کی وحی روزوں کی فرضیت کے بارہ میں نازل ہوئی ہو۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جیسے کہتے ہیں یہ آیت فی الصلوٰۃ ہے یعنی یہ آیت نماز کے بارہ میں ہے۔

عربی لغت سے ثابت ہے کہ فی کے معنے بارہ کے بھی ہوتے ہیں اور اسے فیِ تعلیلیہ کہتے ہیں یعنی فی کے بعد میں آنیوالی چیز فی سے پہلے کے مضمون کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (یوسف ع ۴) یہ وہ یوسف ہے جس کے بارہ میں یا جس کے سبب سے تم مجھ پر الزام دھرتی تھیں۔ اسی طرح حدیث میں ہے عُذِّبَتِ امْرَاَةٌ فِيْ هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا (بخاری جلد دوم کتاب المساقاۃ باب فضل سقی الماء) یعنی ایک عورت ایک بلی کو نہ کھلاتے پلانے باندھ دینے کی وجہ سے دوزخ میں ڈالی گئی۔ انہی معنوں میں فی کا حرف آیت اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ میں استعمال ہوا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ رمضان ایسا عظیم الشان مہینہ ہے کہ اس کے بارہ میں قرآنی حکم نازل ہوا ہے یعنی قرآن میں جو احکام نازل ہوئے ہیں یہ وہ اہم اور ضروری احکام ہیں۔ جس بارہ میں قرآن میں حکم آیا ہو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اہم حکم ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رمضان کی ایک خاص رات میں سارا قرآن لوح محفوظ سے سماء الدنیا کے بیت العزۃ میں اُترا یا جن کے نزدیک اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رمضان کی ایک خاص رات کو قرآن کریم کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ اُن میں اس خاص رات کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کے متعلق مختلف احادیث بھی بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ مسند احمد حنبل میں ابو الاسقع سے روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اُنْزِلَتْ صُحُفُ اِبْرَاهِيْمَ فِيْ اَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَاُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ لِسِتٍّ مَّضَيْنَ مِنْ رَمَضَانَ وَالْاِنْجِيْلُ لِثَلَاثَ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ لِاَرْبَعٍ وَّعِشْرِيْنَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ۔ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ابراہیمؑ کے صحیفے تو رمضان کی پہلی رات میں اُترے تھے اور موسیٰؑ کی کتاب تورات رمضان کے چھ دن گذرنے کے بعد یعنی ساتویں تاریخ کو اور انجیل تیرھویں کے گذرنے پر یعنی چودھویں رمضان کو اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم رمضان کی چوبیس راتیں گذرنے پر نازل کیا۔ بعض لوگوں نے اس سے مراد چھٹی تیرھویں اور چوبیسویں لی ہیں مگر میرے نزدیک چونکہ گذرنے کے بعد کے الفاظ ہیں اس لئے ساتویں، چودھویں اور پچیسویں راتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔

ح۱،۲ صحف ابراہیم۔ توراۃ انجیل کے رمضان میں اترنے کے متعلق ایک روایت اور اس کا صحیح مطلب

بہرحال اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ نہ صرف قرآن کریم بلکہ پہلی کتب بھی رمضان کی خاص خاص راتوں میں اُتری تھیں ایک روایت جابر بن عبداللہ سے ابن مردویہ میں بھی مروی ہے اس میں یہ زائد بات بھی بیان ہے کہ زبور رمضان کی بارہ تاریخوں کے گذرنے پر نازل ہوئی اور انجیل کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اٹھارہ دن گذرنے پر نازل ہوئی۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) قرآن کریم ہی نہیں دوسری کتب بھی رمضان میں ہی اُتری ہیں (۲) ان کے نزول میں ایک ترتیب مدنظر رکھی گئی ہے پہلے شروع رمضان میں کتاب اُتری پھر ہفتہ بعد پھر ہفتہ بعد پھر کچھ دنوں بعد آخری چوبیسویں یا پچیسویں کو قرآن کریم نازل ہوا مگر ان احادیث کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو ان کا مفہوم قرآن کریم، عقل اور نقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے خلاف اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (بقرۃ ع) یعنی رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ جس میں قرآن کریم اُترا ہے۔ اگر پہلے انبیاء کا کلام بھی رمضان میں ہی اُترا تھا تو رمضان کی فضیلت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور چاہیئے تھا کہ قرآن کریم فرماتا کہ رمضان کا مہینہ تو وہ ہے جس میں ہم نے سب کتب سماویہ اتاری ہیں لیکن قرآن کریم ان کا ذکر تک نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی امر کا ذکر نہ کرنے سے اس کا انکار واجب نہیں آتا لیکن چونکہ ان معنوں کے رُو سے ماننا پڑتا ہے کہ رمضان کے مہینہ کی فضیلت بتانی مقصود ہے اور پہلی کتب کا بھی رمضان میں اُترنا اس کی فضیلت کو بڑھا دیتا ہے اس لئے اس امر کا اس جگہ بیان کرنا نہایت ضروری تھا لیکن قرآن کریم نے یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا اور نہ کسی اور جگہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ حدیث درست ہے تو اس کے معنے ظاہری الفاظ کے مطابق نہیں ہیں۔

دوسرا اعتراض ان روایات پر عقلی طور پر پڑتا ہے اور وہ یہ کہ رمضان قرآن کریم کے نزول کی وجہ سے مبارک ہو گیا۔ یہ امر تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن یہ امر کہ جو کلام بھی اُترے وہ رمضان میں اُترے اس کی کوئی وجہ عقل سے معلوم نہیں ہوتی۔ دوسرا عقلی اعتراض اس پر یہ پڑتا ہے کہ رمضان قمری مہینہ ہے اور اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے اگر ایک خاص وقت کو کلام الٰہی سے کوئی خاص تعلق ہو تو یہ امر بھی سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن جبکہ یہ مہینہ یہود میں رائج نہ تھا وہ یہ سمجھ بھی نہ سکتے تھے کہ ابراہیمؑ یا موسیٰؑ یا داؤدؑ یا مسیحؑ کے الہامات کب نازل ہوئے ہیں اور اگر کوئی خاص فائدہ اس نزول میں تھا تو اس سے نفع نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ انہیں اس امر کا نہ علم تھا اور نہ علم ہو سکتا تھا۔ پھر اس بات کی تعیین سے کیا فائدہ کہ کلام الٰہی ضرور رمضان میں اُترے۔ الٰہی فعل کسی حکمت سے خالی کس طرح ہو سکتا ہے؟

تیسرا عقلی اعتراض ان روایات پر یہ پڑتا ہے کہ ان میں حضرت ابراہیم۔ موسیٰ۔ داؤد اور عیسیٰ کا ذکر تو آتا ہے لیکن اور نبیوں کا ذکر نہیں آتا۔ روایات بتاتی ہیں کہ پہلی رمضان کو حضرت ابراہیمؑ پر کتاب اُتری۔ ساتویں کو حضرت موسےؑ پر۔ بارھویں کو حضرت داؤدؑ پر اور اٹھارھویں کو حضرت مسیحؑ پر۔ اس سے ظاہر ہے پہلے نبی پر رمضان کی پہلی تاریخ میں۔ دوسرے نبی پر اس کے بعد کی تاریخ میں۔ تیسرے نبی پر اس کے بعد کی تاریخ میں۔ چوتھے نبی پر اس کے بعد کی تاریخ میں کتاب نازل ہوئی گویا صرف رمضان ہی کتب کا اترنا ہی مقدر نہ کیا گیا تھا بلکہ رمضان کی تاریخوں کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا کہ جو نبی پہلے تھے اُن پر رمضان کی پہلی تاریخوں میں کلام اتارا جائے اور بعد میں آنے والوں پر بعد میں اُتارا جائے۔ اگر یہ بات ہے تو حضرت نوحؑ اور دیگر انبیاء جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گذرے ہیں اُن پر کس ماہ اور کس تاریخ میں کلام اُترا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ پر پہلی رمضان کو کلام اُترا تھا پس حضرت نوحؑ کیلئے کوئی رات رمضان میں کلام اُترنے کی باقی نہیں رہتی۔ اگر تو آگے پیچھے

کلام اُتر سکتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اُن پر پہلی کے بعد کی کسی تاریخ میں
کلام اُترا ہوگا لیکن حدیث بتاتی ہے کہ تقدم زمانی کے مطابق رمضان
کی تاریخوں میں کلام اُتارا گیا ہے پس حضرت نوحؑ چونکہ حضرت
ابراہیمؑ سے پہلے گذرے ہیں اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام
پر جس رات کو کلام اُترا اس سے پہلے کسی رات میں ان پر کلام
اُترنا چاہیئے تھا مگر پہلی رات سے پہلے تو اور کوئی رات ہوتی نہیں
پس اگر رمضان ہی میں کلام اُترنا چاہیئے تو حضرت نوحؑ کے لئے
کوئی جگہ انبیاء کی صف میں باقی نہیں رہتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس جگہ شارع نبیوں کا ذکر ہے اور
حضرت نوحؑ شارع نبی نہ تھے۔ مگر یہ جواب نقل و کلام الٰہی دونوں
کے خلاف ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ داؤد اور نہ حضرت
عیسیٰؑ شریعت لانے والے تھے۔ اُن کی کتب جیسی بھی بُری بھلی موجود
ہیں اُن میں دیکھ لو شریعت کا نام و نشان نہیں۔ حضرت داؤدؑ
کی زبور میں تو صرف عشق الٰہی کا اظہار اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی پیشگوئیاں ہیں اور کچھ اپنے اور اپنے متعلقین کیلئے دعائیں
ہیں شریعت سے اُن کو دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کی انجیل کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں صرف حضرت عیسیٰ کی زندگی
کے حالات ہیں اور کچھ معجزات کا ذکر ہے باقی اس امر پر زور ہے
کہ موسیٰؑ کی شریعت پر عمل کرو۔ اگر داؤدؑ کوئی نئی شریعت لائے
تھے یا حضرت عیسیٰؑ کوئی نئی شریعت لائے تھے تو موسیٰؑ کی کتاب کو
منسوخ قرار دینا پڑیگا اس صورت میں اگر عیسیٰ علیہ السلام صاحبِ شریعت
نہ تھے تو انہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ داؤد کی کتاب پر عمل کرو اور اگر
وہ صاحبِ شریعت تھے تو انہیں یُوں کہنا چاہیئے تھا کہ میری شریعت
پر عمل کرو مگر انجیل تو شریعت سے اس قدر خالی تھی اور ہے کہ
یہود کے اعتراض سے بچنے کے لئے حضرت مسیحؑ کے حواریوں کو یہ
اعلان کئے بغیر چارہ نہ ہوا کہ شریعت لعنت ہے کیونکہ اگر وہ
اسے رحمت قرار دیتے تو یہود کے اس سوال کا کیا جواب دیتے کہ مسیحؑ
کی شریعت کہاں ہے کیونکہ وہ نصارٰی کے زعم میں پہلے نبیوں سے
بڑا تھا اور اس وجہ سے اُسے دوسروں کی شریعت کا ناسخ بھی
ہونا چاہیئے تھا۔

قرآن کریم کے رُو سے اس دعویٰ پر یہ اعتراض آتا ہے کہ
قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام نبیوں
کی نسبت فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا
مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ ع ۱۱ پ ۱)
یعنی ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اُس کے پیچھے اور رسول اُس کی
پیروی کرنے والے بھیجتے رہے آخر میں عیسیٰ بن مریم آئے انہیں بھی
کوئی شریعت کی کتاب نہیں ملی صرف نشانات اور تائید روح القدس
انہیں حاصل تھی۔

اس آیت اور اس مضمون کی دوسری آیات کے ہوتے ہوئے
اور خود ان نبیوں کی کتابوں کو دیکھتے ہوئے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں
کہ اس روایت میں صرف صاحبِ کتاب نبیوں کا ذکر ہے اس وجہ
سے حضرت نوحؑ کا ذکر نہیں۔

قرآن کریم کی ایک اور آیت بھی اس مفہوم کو ردّ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ
حضرت نوح اور ابراہیم کی نسبت فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ
لَاِبْرٰهِيْمَ (صافات ع ۳ پ ۲۳) نوح ہی کی جماعت میں سے ابراہیم
بھی تھا یعنی حضرت ابراہیمؑ شارع نبی نہ تھے شارع نبی حضرت نوحؑ
تھے اور حضرت ابراہیم اُن کی شریعت کے اسی طرح تابع تھے جس طرح
اسرائیلی نبی حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے تابع تھے۔ اس حقیقت پر آگاہ
ہو کر کوئی شخص کس طرح کہہ سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا ذکر اس لئے
آیا ہے کہ وہ شارع نبی تھے اور حضرت نوح کا اس لئے ذکر نہیں آیا
کہ وہ شارع نبی نہ تھے۔

علاوہ ازیں یہ اعتراض بھی اسی توجیہہ پر پڑتا ہے کہ اس حدیث
میں جس قدر نبیوں کا ذکر ہے وہ اسرائیلی ہیں یہ سوچنے والی بات ہے
کہ اسرائیلی نبیوں کا خاص طور پر رمضان سے کیا تعلق تھا۔ بظاہر کوئی
نہیں اور اگر اسرائیلی نبیوں کو رمضان سے کوئی خصوصیت نہ تھی تو سوال
پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے رُو سے تو اور اقوام میں بھی نبی گذرے
ہیں ان کے لئے رمضان میں کونسی جگہ ہوگی؟ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے
نبی تو حضرت نوحؑ کی طرح اس لئے محروم ہو جائیں گے کہ حضرت
ابراہیمؑ پر پہلی رمضان کو کلام نازل ہوا تھا اس سے پہلے رمضان کی

اور کوئی تاریخ نہیں اور بعد کے اس لئے کہ نبی تو کثیر تعداد میں گزرے ہیں اور رمضان کے دن صرف تیئیس ہیں بلکہ انتیس۔ کیونکہ چوبیسویں یا پچیسویں کو قرآن کریم نازل ہُوا تو باقی صحف کو اس تاریخ سے پہلے کی کوئی تاریخ ملنی چاہیئے۔

غرض اگر اس روایت کے معنے ظاہری الفاظ کے مطابق لئے جائیں تو عقلاً بھی اس کے معنے قابل قبول نہیں ہیں۔

اس روایت کی تردید جس میں بتایا گیا ہے کہ سب کتب ایک ہی وقت نازل ہوئیں

اب میں نقل کو لیتا ہوں۔ اس روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ سب کتب ایک ہی تاریخ میں یکدم نازل ہوئی ہیں۔ یہ امر دونوں سروں سے باطل ہوتا ہے۔ آخری نقطہ اس روایت کا قرآن کریم ہے قرآن کریم کی نسبت واضح طور پر معلوم ہے کہ یہ ایک دن میں نازل نہیں ہُوا بلکہ تیئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہُوا ہے حتیٰ کہ کفار نے اعتراض کیا کہ لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (فرقان ع ۳) یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن اس پر یکدم کیوں نازل نہ ہُوا جو اعتراض وہ کرتے ہیں درست ہے واقعہ میں وہ یکدم نازل نہیں ہُوا لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اتار کر تیرے دل کو مضبوط کرنا چاہتے تھے (تا پہلے حصہ کی پیشگوئیاں پوری ہو کر دوسرے حصہ میں اُسکی طرف اشارہ ہو اور ایمان کی تقویت کی ایک دائمی بنیاد رکھدی جائے) اور ہم نے اُسکی ترتیب نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے یعنی نزول قرآن اس رنگ میں ہُوا ہے کہ موجودہ وقت کے مومنوں کے ذہن نشین قرآن ہو جائے اور موجودہ وقت کے کافروں کیلئے بہترین طریقہ تبلیغ کا پیدا ہو اور بعد کی دائمی ترتیب ہم نے اور طرح رکھی ہے تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کی ضرورت کے مطابق ہو۔ غرض نزول و ترتیب قرآن نہایت اہم حکمتوں پر مبنی ہے اور اسوجہ سے اُس کا ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اُترنا نہایت اہم حکمتوں پر مبنی تھا اب اس آیت کی موجودگی اور تاریخ کی گواہی کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سارا قرآن ایک رات میں اُتر آیا تھا۔

پہلے نبیوں کے متعلق بھی یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ایک رات میں اُن پر کلام اُترا تھا حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ تو ہمارے سامنے نہیں اس لئے اُن کے بارہ میں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے حضرت موسیٰؑ داؤد اور حضرت مسیحؑ کی تاریخ تو ہمارے سامنے ہے انکی کتب کو دیکھکر کوئی شخص شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ایک وقت میں نازل ہوئی تھیں حضرت موسیٰؑ کی کتب چالیس پچاس سال میں جا کر مدوّن ہوئی ہیں۔ اُن میں راستوں سفروں، مقاموں اور لڑائیوں کا بالترتیب ذکر ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ذکر ہے کہ کس طرح موسیٰؑ نے اپنی قوم کی تنظیم کی اور کس طرح وہ جوانی سے ادھیڑ عمر کے ہوئے اور کس طرح بوڑھے ہوئے اور کمزور ہو کر کام کرنے کے ناقابل ہو گئے۔ کیا اس مضمون کو ایک رات کا اُترا ہُوا مضمون کہا جا سکتا ہے؟ بالکل اسی طرح اناجیل کا مضمون ہے اس میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے دوروں، لیکچروں، نشانوں، خدا کی ہدایتوں کا ترتیب وار ذکر ہے اور کوئی شخص اُنہیں ایک دن کی اُتری ہوئی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ حضرت داؤدؑ کی زبور بھی اسی طرح ہے کہیں اس میں دشمن فوج کے نرغہ میں گھر جانے کا ذکر ہے اور پھر اُس سے نجات پانیکا۔ کبھی بیمار پڑ جانیکا اور پھر اُس سے صحت پانیکا کبھی دشمنوں کی شرارتوں کا ذکر آتا ہے اور پھر اُن کے غم سے نجات پانیکا غرض داؤد کی زبور اُسکی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی ایک تاریخ ہے اور اُسکی زندگی کے حالات اُس سے منعکس ہوتے ہیں پھر اُسے ایک دن کا کلام کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ نبی کی زندگی اُس کے کلام سے الگ نہیں کیجا سکتی بغیر ایک نبی کی زندگی کے حالات معلوم ہونے کے ہم اسکی تعلیم کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ نبی اپنے الہام کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہے اور اُس کا الہام اُس کی زندگی کے لئے بطور ایک آئینہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو روشن کرتے ہیں اور اس دوہری روشنی ہی سے دنیا ہدایت پاتی ہے اِس لئے ہر نبی کا کلام اُسکی زندگی کے مختلف حالات پر روشنی ڈالتا ہُوا ایک لمبے عرصہ میں ختم ہوتا ہے ایک طرف وہ خدا تعالےٰ کی صفات کے تازہ ظہور پر روشنی ڈالتا ہے دوسری طرف اُس کی حالت جو اُس کے دشمنوں کی نسبت سے ہوتی ہے اُس کے تغیرات پر روشنی ڈال کر خدا تعالےٰ کی تائید اور نصرت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ تیسری طرف وہ ان مختلف حالات میں نبی کے ایمان اور اُس کے یقین کے مختلف اظہاروں کو پیش کر کے اُس کی دیانتداری، اُس کے ایثار اور اُس کے روحانی کمالات کو پیش کرتا ہے۔ اگر شروع میں ہی ایک ہی رات میں کلام نازل ہو جائے

تو اس میں یہ باتیں کب جمع ہو سکتی ہیں اور اگر یہ باتیں کسی کلام میں جمع نہ ہوں تو وہ دنیا کی ہدایت اور رُشد کا سامان پیدا ہی کب کر سکتا ہے پس ضروری ہے کہ سب نبیوں پر آہستہ آہستہ کلام نازل ہو جس میں اس تمام روحانی رفعت کی جھلک ملتی ہو جو وہ نبی اپنے نبوت کے راستہ پر چلتے ہوئے حاصل کرتا گیا۔ تا دنیا کے سامنے اُس کی ابتداء بھی ہو اور درمیانی زمانہ بھی اور اُس کی انتہاء بھی۔

یہ خیال کہ پہلے سب نبیوں پر یکدم کلام الٰہی نازل ہوا تھا سورۂ فرقان کی آیت لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً سے پیدا ہوا ہے۔ مسلمان مفسروں نے اِس سے یہ استدلال کیا کہ شاید سب نبیوں پر پہلے جُمْلَةً وَّاحِدَةً کلام نازل ہوتا تھا جبھی دشمنوں نے یہ اعتراض کیا۔ حالانکہ اُنہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کریم میں یہ اعتراض کفارِ مکہ کی طرف سے نقل کیا گیا ہے اور کفارِ مکہ تو کسی کتاب کے قائل ہی نہ تھے کجا یہ کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ سب پہلے کلام الٰہی یکدم نازل ہوتے تھے اگر یہود و نصاریٰ کی طرف سے یہ اعتراض نقل کیا جاتا تب تو یہ شبہ پیدا بھی ہو سکتا تھا لیکن انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا اس لئے اس اعتراض کی وجہ سے یہ قیاس کرنا کہ پہلے چونکہ یکدم کلام نازل ہوتا تھا اس لئے قرآن کریم پر اعتراض کیا گیا کہ کیوں یہ ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا بالکل درست نہیں اور قیاس مع الفارق ہے کفارِ مکہ کے اعتراض کا یہ باعث نہ تھا کہ پہلے نبیوں پر تو ایک دن ہی سب کلام نازل ہو جاتا تھا اور آپ پر آہستہ آہستہ کلام اُتر رہا ہے کیونکہ وہ تو نہ نبوت کے قائل تھے نہ کلام الٰہی کے۔ اُن کے اعتراض کی بناء تو محض عقلی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خدا تعالیٰ نے کلام نازل کیا ہوتا تو یکدم کر دیتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ کلام کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کے تو یہ معنے ہیں کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ من ذالک) نئے اور بدلنے والے حالات کے مطابق اور نئی ضرورتوں کے پیش آنے پر ایک نیا کلام بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ چونکہ اُن کے اعتراض کی بنیاد عقلی تھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلے نبیوں پر کلام اکٹھا نازل ہو جاتا تھا اور فرض کرو کہ کفارِ مکہ ایسا کہتے بھی تھے تو کیا اُن کے خیال کو ہم کوئی بھی اہمیت اور قیمت دے سکتے ہیں۔ کیا وہ علوم آسمانی کے ماہر تھے یا مذہبی تاریخ کا علم اُن کو حاصل تھا کہ ہم اُن کے اعتراض کو تاریخ مذہب کے لئے کوئی قیمت دیں؟

اس غلطی کے پیدا ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آتا ہے کہ اُنہیں چالیس راتوں کے وعدہ میں الواح ملی تھیں۔ مسلمان مفسرین چونکہ اسرائیلی کتب سے واقف نہ تھے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ الواح اور تورات ایک شئے ہیں۔ حالانکہ الواح صرف دس احکام کا نام ہے اور تورات ان احکام سے سینکڑوں گُنے زیادہ امور پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ طُور پر موسیٰ کو مکمل تورات ملی تھی۔ صرف الواح کا ذکر آتا ہے اور تورات بھی اِسی کی مصدق ہے۔ سو اوّل تو طُور پر جو کچھ نازل ہوا یکدم نازل نہیں ہوا چالیس راتوں میں نازل ہوا دوسرے وہاں جو کچھ نازل ہوا اُس اندازہ کے مطابق وحی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی کئی راتوں میں ہو گئی ہے کئی کئی رکوع کا ٹکڑا آپ پر یکدم نازل ہو جایا کرتا تھا چنانچہ سورۂ یوسف کی نسبت آتا ہے کہ ساری سورۃ ایک ہی وقت میں نازل ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ پر جو کلام طور پہاڑ پر چالیس دن میں نازل ہوا اُس کو تو سورۂ یوسف یقیناً بڑی ہے۔ حضرت موسیٰ کی وحی کے علاوہ دوسرے نبیوں کی وحی کی نسبت تو کوئی قوی یا ضعیف روایت بھی نہیں جس سے معلوم ہو کہ پہلے نبیوں پر کلام الٰہی یکدم نازل ہو جاتا تھا۔ اور اگر ایسا لکھا بھی ہوتا تو ہم اُسے خلاف عقل کہہ کر رد کر دیتے کیونکہ کلام الٰہی تو نبی اور خدا کے تعلق کو روشن کرتا رہتا ہے۔ کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ کسی نبی پر ایک رات میں سب کلام نازل کر کے خدا تعالیٰ خاموش ہو جائے گا کلام الٰہی تو الٰہی تعلق پر شہادت ہوتا ہے کیا اس شہادت کے پیدا ہو جانے سے نبی کی قلبی کیفیت اطمینان والی رہ سکتی ہے؟ کیا وہ اس محجوب اور محبوب سی دُور زندگی کو راحت سے گذار سکتا ہے؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا چند دن کے وحی کے وقفہ سے کیا حال ہوا تھا۔ اگر ایک دن کلام کر کے خدا تعالیٰ دوسرے نبیوں سے بقیہ ساری عمر خاموش رہتا تو میں سمجھتا ہوں دشمن تو اُن کو مارنے میں ناکام رہتے لیکن یہ خدائی فعل انکو مارنے میں

ضرور کامیاب ہو جاتا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ کا یا دوسری آیات جو اوپر لکھی گئی ہیں اُن کا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ قرآن کسی ایک رات میں سب کا سب اُتار دیا گیا تھا یا یہ کہ الٰہی کلام اکٹھا اترا کرتا ہے۔ کلام الٰہی کسی نبی پر یکدم نہیں اُترا بلکہ آہستہ آہستہ نبوت کے زمانہ سے اس کی موت تک اترتا رہتا ہے تا نبی کے دل کو بھی زیادہ سے زیادہ روشنی ملتی جائے اور اُس کے اتباع کا نور ایمان بھی بڑھتا رہے اور اُس کے منکروں پر بھی نت نئی حجت تمام ہوتی رہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اکٹھا کلام نازل نہیں ہوتا تو پھر کیا احادیث مذکورہ بالا کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اجمالاً اور پہلے انبیاء پر تفصیلاً کلام الٰہی رمضان کی مختلف راتوں میں نازل ہُوا درست نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ احادیث صحاح ستہ کی نہیں مسند احمد بن حنبل سعید بن جبیر اور ابن مردویہ کی ہیں اور ان کو وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا جو بخاری مسلم کی احادیث کو دیا جا سکتا ہے۔ مسند احمد بن حنبل بےشک ایک مستند کتاب ہے لیکن اس کے متعلق یہ امر محقق ہے کہ اس کی روایات مختلف قسم کی ہیں اور اس کے ان راویوں کی وجہ سے جو امام احمد بن حنبل کے بعد اس کی کتاب کو نقل کرتے ہیں اس میں ایسی بہت سی روایات شامل ہو گئی ہیں جو خود امام احمد بن حنبل کی بنائی ہوئی نہیں ہیں۔ اور بعض ایسی بھی ہیں جنکو امام احمد بن حنبل نے خود مستند قرار نہیں دیا۔ لیکن اگر امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ حدیث مستند بھی ہو تب بھی حدیث قرآن کریم کے مقام پر رکھی نہیں جا سکتی۔ جو حدیث قرآن کریم، واقعات یا عقل کے خلاف ہو بہرحال یا اُسے غلط قرار دینا پڑے گا یا پھر اس کے معنے مجاز کے اصول پر کرنے ہوں گے۔ چونکہ میں اُوپر ثابت کر چکا ہوں کہ ان احادیث کے ظاہری معنے قرآن کریم، کتب سابقہ اور عقل کے خلاف ہیں اس لئے لازماً یا تو ان احادیث کو غلط کہنا ہوگا یا ان کے معنے مجاز و استعارہ کے اصول پر کرنے پڑیں گے۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ کیا مجاز و استعارہ کے رُو سے ان احادیث کے کوئی معنے ہو سکتے ہیں؟ میرے نزدیک ایک بات ان روایتوں میں ایسی ہے جو ہماری توجہ کو مجاز و استعارہ کی طرف پھیرتی ہے اور وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ نوح علیہ السلام کو قرآن کریم نے ایک بہت بڑا نبی قرار دیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کو اُن کا تابع نبی قرار دیا ہے اور باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے ہر قوم میں نبی ہونے کی خبر دی ہے اس روایت میں حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت داؤدؑ۔ حضرت مسیحؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور پھر باوجود اس کے کہ مسلمانوں میں عام طور پر گو غلط طور پر یہ عقیدہ مشہور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے چار کتابیں اُتاری ہیں (درحقیقت نہ یہ درست ہے کہ اللہ تعالےٰ نے صرف چار کتابیں اُتاری ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ ان چار کتابوں میں سے داؤدؑ اور حضرت مسیحؑ کی کتب شریعت کی کتب ہیں۔ یقیناً چار سے بہت زیادہ کتب مختلف اقوام کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہیں اور ان بہت سی کتب میں زبور اور انجیل شامل نہیں کیونکہ یہ شریعت کی کتب نہیں ہیں محض اصلاحی اور روحانی ترقی کے متعلق الہامات پر مشتمل ہیں یا چند پیشگوئیاں اِن میں مذکور ہیں) ان روایتوں میں پانچ کتابوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے کہ غلط العام عقیدہ سے متاثر ہوئے بغیر یہ روایات نقل کی گئی ہیں اس لئے غالب احتمال یہ ہے کہ یہ احادیث درست ہیں ہاں ظاہر معنوں میں نہیں ہیں بلکہ مجاز و استعارہ کا استعمال ان میں کیا گیا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ حضرت مسیحؑ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ابراہیمی خاندان کے درخشندہ ستارے ہیں اور گو ابراہیمؑ موسوی سلسلہ سے پہلے اور حضرت نوحؑ کے تابع نبیوں میں سے تھے۔ موسےٰؑ، داؤدؑ، اور مسیحؑ اسرائیلی سلسلہ کے نبی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محمدی سلسلہ کے بانی تھے اور نبوت کے سلسلے کے لحاظ سے یہ پانچوں نبی تین مختلف سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے مگر خاندان کے لحاظ سے یہ پانچوں نبی ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پس ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں کلام الٰہی کے سلسلہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ ابراہیمی خاندان کے لحاظ سے ایک حکمت بیان کی گئی ہو۔ اگر یہ درست ہے

تو نہ حضرت نوحؑ کے ذکر کی اس حدیث میں ضرورت تھی اور نہ دوسری اقوام کے نبیوں کے ذکر کی ضرورت تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان پانچ نبیوں کو رمضان میں الہام ہُوا خواہ جزءً خواہ کُلاًّ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس خیال کو اوپر تفصیل سے رد کر آیا ہوں۔ پس رمضان سے رمضان کا مہینہ مراد نہیں بلکہ مجازاً سلسلۂ الہام کا نام رمضان رکھ دیا گیا ہے۔

رمضان رَمَضَ سے نکلا ہے اور رَمَضَ کے معنے عربی زبان میں شدید گرمی یا سورج کی شدید تپش کے ہوتے ہیں اور رَمْضَاء کے معنے اُس میدان کے ہوتے ہیں جو گرمی کے موسم میں سورج کی براہ راست شعاعوں کی وجہ سے تپ اُٹھا ہو چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

اَلْمُسْتَجِيْرُ بِعَمْرٍو عِنْدَ كُرْبَتِهٖ
كَالْمُسْتَجِيْرِ مِنَ الرَّمْضَاءِ بِالنَّارِ

یعنی عمرو (اس کا مخالف) سے مصیبت کے وقت مدد مانگنا ایسا ہی ہے جیسا کہ شدید گرم میدان سے بچنے کے لئے کوئی آگ کی پناہ ڈھونڈے یعنی رَمْضَاء کی گرمی آگ کے قریب قریب ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جب رمضان نام اس مہینہ کا رکھا گیا ہے اُس وقت یہ مہینہ سخت گرمی کے موسم میں آیا ہوگا بہرحال رمضان کے روزے تو اسلام میں فرض ہوئے اور اس مہینہ کا نام رمضان بہت پہلے رکھا گیا ہے پس رکھنے والے نے یہ نام شدتِ گرما کی وجہ سے ہی رکھا ہوگا اور کلام الٰہی ہمیشہ اُسی وقت آتا ہے جبکہ دنیا میں گناہ اور فسق و فجور کی وجہ سے لوگ غضب الٰہی کی آگ میں جل رہے ہوتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیمی نسل پر جب ابتدائی زمانہ روحانی گرمی کا آیا اس میں ابراہیم علیہ السلام پر کلام نازل ہوا اور جب دوسرا زمانہ روحانی تپش اور گرمی کا آیا تو اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بھیجدیا اور جب تیسرا زمانہ آیا تو داؤد علیہ السلام کو بھیجدیا اور جب چوتھا زمانہ آیا تو حضرت مسیحؑ کو بھیجدیا اور جب پانچواں زمانہ آیا تو مجھے بھیجدیا۔ اس صورت میں یہ ایک نصیحت ہے اور زمانہ کے حالات سے ایک سبق دیا گیا ہے اور اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ رمضان میں ان لوگوں پر کلام نازل ہُوا سوائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے بارہ میں قوی تاریخی شہادت ملتی ہے کہ آپ پر رمضان میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہُوا تھا۔

ان مجازی معنوں کے رُو سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں متواتر تاریخوں میں نزول کلام کا ذکر نہیں بلکہ یوں ہے کہ پہلی رمضان کو ابراہیمؑ پر کلام نازل ہُوا۔ چھٹی کو موسیٰؑ پر اور بارھویں کو داؤدؑ پر اور اٹھارھویں کو مسیحؑ پر اور چوبیسویں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو تاریخ سے ابراہیمی نسل کے انبیاء کا ظہور جن صدیوں میں معلوم ہوتا ہے یہ تاریخیں اُس سے ملتی ہیں حضرت ابراہیم ابراہیمی نسل کے انبیاء کے سب سے پہلے نبی تھے اس لئے لازماً کہنا ہوگا کہ اُن پر وحی ابراہیمی سلسلہ کی تاریخ کی پہلی صدی میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے متعلق اختلاف ہے مروجہ بائبل میں اسے ۴۲۰ سال کے قریب بتایا گیا ہے مگر بعض اسرائیلی روایتوں میں حضرت موسیٰؑ کا ظہور چھٹی صدی میں بھی بتایا گیا ہے۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو موسیٰؑ پر چھٹی رمضان کو کلام نازل ہونا درست آتا ہے اس کے بعد حضرت داؤدؑ کا ذکر ہے کہ اُن پر بارھویں رمضان کو کلام نازل ہُوا حضرت داؤدؑ کا وجود اس کڑی کے لحاظ سے خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل اہم وجود اس کڑی میں حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہ ابراہیم باپ ہیں اور موسیٰ عیسیٰ ایک بیٹے کے سلسلہ کی کڑی ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح موعود دوسرے بیٹے کے سلسلہ کی کڑی ہیں مسند احمد بن حنبل کی روایت میں حضرت داؤد کا ذکر بھی نہیں۔ بہرحال یہ جو دوسری روایت میں ہے کہ داؤدؑ پر بارھویں تاریخ کو کلام نازل ہُوا یہ مروجہ تاریخوں کے مطابق صحیح نہیں اُترتا کیونکہ مروجہ تاریخوں میں حضرت داؤد کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ کے نو سو سال بعد ہوا ہے مگر پرانی تاریخوں کا کوئی ایسا اعتبار بھی نہیں ہو سکتا کہ اس میں کوئی غلطی ہو اور حضرت داؤدؑ گیارہ سو سال بعد بارھویں صدی

صحف ابراہیم، تورات، انجیل کے رمضان میں نازل ہونے کی ایک لطیف تشریح

میں ہی ہوئے ہوں۔ اس کے بعد حضرت مسیح کا ذکر آتا ہے بائبل کے رُو سے واقعہ صلیب حضرت ابراہیم کی بعثت کے ۱۹۲۰ سال بعد ہُوا ہے اور اُن کی وفات کے لحاظ سے ۱۸۰۰ کچھ سال بعد۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ اٹھارھویں رمضان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ پر کلام نازل ہُوا۔ گویا ایک سو سے ڈیڑھ سو سال کا فرق ہے مگر یہ فرق اس طرح نکل جاتا ہے کہ اسرائیلی تاریخ کے رُو سے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے درمیان کا فاصلہ تیرہ سو سال کا بھی ثابت ہے۔ اگر اس عرصہ کو تسلیم کیا جائے اور قرائن بھی یہی بتلاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیرہ سو سال بعد ہوئے ہیں (مگر اس جگہ اس مضمون پر بحث کا موقعہ نہیں) تو حضرت ابراہیم اور حضرت مسیحؑ کا فاصلہ اٹھارہ صد اور کچھ سال کا بن جاتا ہے اور حدیث کے بتلائے ہوئے وقت کے عین مطابق حضرت مسیحؑ کی بعثت بنتی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر چوبیسویں رمضان کو کلام نازل ہوا۔ حضرت عیسیٰ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا فاصلہ چھ سو آٹھ سال کا ہے۔ اٹھارہ سو کچھ سال میں ۶۰۸ سال جمع کریں تو چوبیس سو کچھ سال ہوتے ہیں گویا حضرت ابراہیمؑ کے بعد چوبیسویں صدی کے ختم ہونے پر اور پچیسویں صدی کے شروع میں آپ مبعوث ہوئے اور یہ زمانہ حدیث کے عین مطابق ہے۔

لیلۃ القدر سے مراد مفسرین کے نزدیک قرآن مجید کے نزول کی ابتدائی رات

خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں رمضان سے مراد وُہ تاریک زمانے ہیں جو نسل ابراہیم پر آنے والے تھے اور دنوں سے مراد وہ صدیاں ہیں جن میں حدیث میں مذکور انبیاء کا ظہور ہُوا۔ اور ان احادیث میں استعارہ کی زبان میں بات کی گئی ہے ظاہر مفہوم لینا ان کا نقل اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

لیلۃ سے مراد

لیلۃ القدر سے مراد

اب سوال یہ ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد اس آیت میں کیا ہے کیا حقیقی لَیْلَۃ یا مجازی؟ اس بارہ میں پہلے مفسرین کا رجحان اسی طرف ہے کہ اس سے مراد حقیقی رات ہے جس میں اُن کے نزدیک سارا قرآن لوح محفوظ سے بیت العزّۃ پر اُترا یا یہ کہ اس رات کو نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ قرآن کریم رمضان میں اُترنا شروع ہُوا یہ تو تاریخی شہادتوں سے یقینی امر معلوم ہوتا ہے اس لئے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے ایک یہ معنے ضرور ہیں کہ قرآن کریم رمضان میں اُترنا شروع ہُوا۔ باقی رہا کہ وہ کس رات کو اُترا اس کے بارہ میں تاریخ میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ قرآن کریم نصف رمضان میں نازل ہُوا۔ گویا پندرہ یا سولہ کو اس کا نزول ہُوا۔ جو روایات اُوپر بیان کی گئی ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چوبیس رمضان کو نازل ہُوا۔ بعض کا خیال ہے کہ بدر کی جنگ سترہ رمضان کو ہوئی تھی اس لئے یہی رات قرآن کریم کے نزول کی بھی ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن کریم کی آیت يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ يَوْمَ الْفُرْقَانِ (سورۃ الانفال ع) اسی طرف اشارہ کرتی ہے غرض اس رات کے متعلق جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے اختلاف ہے اور اس کی اہمیت تاریخی تحقیق سے زیادہ ہے بھی نہیں۔ کیونکہ جس تاریخ کو قرآن کریم نازل ہُوا اس کے معلوم ہونے سے روحانیت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ محدثین عام طور پر چوبیس تاریخ کی روایت کو مقدم بتلاتے ہیں چنانچہ ابن حجر عسقلانی بخاری کی مشہور شرح کے مصنف اور علامہ زرقانی مواہب اللدنیہ سیرۃ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شارح جنھوں نے شرح مواہب اللدنیہ آٹھ جلدوں میں لکھی ہے دونوں نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ قرآن کریم رمضان کی چوبیسویں تاریخ کو اترنا شروع ہُوا۔ اس کے برخلاف مؤرخ زیادہ تر سترھویں رمضان کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے اور اس کی یاد میں رمضان کے آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کا مقرر کیا جانا یہ دونوں باتیں مل کر اس امر کو ثابت کردیتی ہیں کہ قرآن کریم کا نزول بہرحال رمضان میں شروع ہُوا۔ پس اگر اس آیت کے یہ معنے کئے جائیں کہ قرآن کریم کے نازل ہونیوالی مخصوص رات لیلۃ القدر تھی تو اس لحاظ سے محدثین کے فیصلہ کے مطابق یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ لیلۃ القدر سے مراد اس جگہ

چوبیسویں رمضان ہے اور آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے چوبیسویں رمضان کو قرآن کریم نازل کیا ہے جو نزول قرآن کی وجہ سے لیلۃ القدر کہلانی چاہیئے۔ لیکن تاریخی تحقیق کے مطابق صرف اتنا معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کے نزول کا زمانہ رمضان کی کسی تاریخ کو تھا۔

اس رات کو جس میں قرآن کریم نازل ہوا لیلۃ القدر کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ خود لفظ قَدر سے ظاہر ہے۔ حل لغات میں قَدر کے معنے لکھے جا چکے ہیں لیکن یاد کو تازہ کرنے کے لئے دو لغات کی کتابوں میں سے کہ ایک قرآن کریم کی لغت کی خاص تفسیر ہے اور ایک عام عربی زبان کی لغت کی اہم کتاب ہے قَدر کے معنے دوبارہ یہاں لکھ دئے جاتے ہیں۔

مفردات راغب میں جو قرآن کریم کی لغت کی ایک معتبر کتاب ہے لکھا ہے اَلْقَدْرُ وَالتَّقْدِيْرُ تَبْيِيْنُ كَمِيَّةِ الشَّيْءِ۔ قَدر اور تَقدیر کے معنے کسی چیز کے اندازہ کا ظاہر کرنا ہوتے ہیں۔ پھر لکھا ہے تَقْدِيْرُ اللّٰهِ الْاَشْيَاءَ عَلٰى وَجْهَيْنِ اَحَدُهُمَا بِاِعْطَاءِ الْقُدْرَةِ وَالثَّانِيْ بِاَنْ يَجْعَلَهَا عَلٰى مِقْدَارٍ مَخْصُوْصٍ وَوَجْهٍ مَخْصُوْصٍ حَسْبَمَا اقْتَضَتِ الْحِكْمَةُ وَذٰلِكَ اَنَّ فِعْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى ضَرْبَانِ ضَرْبٌ اَوْجَدَهُ بِالْفِعْلِ وَمَعْنٰى اِيْجَادِهِ بِالْفِعْلِ اَنْ اَبْدَعَهُ كَامِلًا دَفْعَةً وَّاحِدَةً لَا تَعْتَرِيْهِ الزِّيَادَةُ وَالنُّقْصَانُ اِلٰى اَنْ يَّشَاءَ اَنْ يُّفْنِيَهُ اَوْ يُبَدِّلَهُ كَالسَّمٰوٰتِ وَمَا فِيْهَا وَمِنْهَا مَا جَعَلَ اُصُوْلَهُ مَوْجُوْدَةً بِالْفِعْلِ وَاَجْزَاءَهُ بِالْقُوَّةِ وَقَدَّرَهُ عَلٰى وَجْهٍ لَا يَتَاَتّٰى مِنْهُ غَيْرُ مَا قَدَّرَهُ فِيْهِ كَتَقْدِيْرِهِ فِي النَّوَاةِ اَنْ يَّنْبُتَ مِنْهُ النَّخْلُ دُوْنَ التُّفَّاحِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ فَتَقْدِيْرُ اللّٰهِ عَلٰى وَجْهَيْنِ اَحَدُهُمَا بِالْحُكْمِ مِنْهُ اَنْ يَّكُوْنَ كَذَا اَوْ لَا يَكُوْنَ كَذَا اِمَّا عَلٰى سَبِيْلِ الْوُجُوْبِ وَاِمَّا عَلٰى سَبِيْلِ الْاِمْكَانِ وَعَلٰى ذٰلِكَ قَوْلُهٗ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق ع ۱) وَالثَّانِيْ بِاِعْطَاءِ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِ ...... وَقَوْلُهٗ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اَيْ لَيْلَةٍ قَيَّضْنَاهَا لِاُمُوْرٍ مَّخْصُوْصَةٍ۔

یعنی اللہ تعالےٰ کی تقدیر دو طرح ظاہر ہوتی ہے (۱) کسی کو قدرت دے کر (۲) دوسرے اس طرح کہ کسی چیز کو حکمت کے تقاضی کے مطابق مخصوص اندازہ پر بناتا ہے اور مخصوص طریق پر اس کی ساخت کی بناوٹ رکھتا ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کے افعال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی چیز کو ایک بار مکمل طور پر پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی جب تک کہ اسے خدا تعالےٰ فنا نہ کر دے یا بدل نہ ڈالے جیسے کہ زمین و آسمان کی پیدائش ہے اور ایک تقدیر اُس کی اس طرح ہوتی ہے کہ ایک چیز کو اس طرح پیدا کرتا ہے کہ اصولی طور پر تو وہ موجود ہوتی ہے مگر اُس کے تفصیلی خواص پوشیدہ ہوتے ہیں مگر ہوتے موجود ہیں۔ ان کے خلاف اس چیز سے کچھ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کھجور کی گٹھلی ہے اس گٹھلی میں اصولی طور پر کھجور کی خاصیتیں موجود ہیں مگر کھجور کی تفصیلات اس سے گٹھلی ہونے کی حالت میں ظاہر نہیں مگر جب بھی اسے بوؤ اس میں سے کھجور ہی نکلے گی سیب یا زیتون نہیں نکلے گا۔ پس اس کی تقدیر اجمالی ہے مگر وہ اجمال ایک تفصیل کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے جب وہ اجمال کھلنا شروع ہوگا اُس سے وہی تفصیل پیدا ہوگی جو اللہ تعالےٰ نے اُس میں مخفی رکھی ہے اس کے خلاف اور کوئی تفصیل پیدا نہ ہوگی۔ غرض تقدیر الٰہی دو طرح ظاہر ہوتی ہے یا تو حکم سے کہ وہ فرما دیتا ہے کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو۔ پس جسے کہتا ہے ہو جا وہ ضرور ہوتا ہے اور جس کی نسبت کہتا ہے ایسا نہ ہو اُس کے لئے ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی معنوں میں قرآن کریم میں آتا ہے قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (سورۃ طلاق ع ۱) کہ اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے جو قسمت خواص اس میں رکھے ہیں اُن کے سوا اس سے ظاہر نہیں ہوتے اور جن باتوں کی اس سے

تقدیر کے لغوی معنے

نفی کی ہے وہ اس سے ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ زبان ضرور میٹھے کھٹے کے فرق کو محسوس کرتی ہے مگر سُن نہیں سکتی۔ کان کو کتنا کہو وہ سُن وہ ضرور سنتا ہے مگر اس سے کہو کہ چکھ تو کبھی نہیں چکھتا۔ دوسرے خدا تعالیٰ کی قدرت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے قدرت بعض اشیاء میں پیدا کر دی ہے مگر وہ فوراً ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتی رہتی ہے گویا یوں کہہ لو کہ اُس کی قدرت کے کچھ درخت ہیں اور کچھ گٹھلیاں۔ قدرت کے درخت تو اپنی کامل شان سے شروع سے ہی مقررہ پھل دیتے ہیں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ قدرت کی گٹھلیاں اپنے اندر مخفی مادہ رکھتی ہیں جب گٹھلی لگاؤ گے وہی ظاہر ہوگا جو خدا تعالیٰ نے اُس میں طاقت رکھی ہے مگر گٹھلی نہ لگاؤ تو خدا تعالیٰ کی تقدیر اس گٹھلی کے ساتھ ہی غائب ہو جائے گی گویا یہ قدرت ضرور نہیں کہ ظاہر ہو مگر جب ظاہر ہوگی تو اسی طرح ظاہر ہوگی جس طرح خدا تعالیٰ نے اُس کے لئے ظاہر ہونا مقدر کیا ہے۔ انسان کے نطفہ میں انسان بننے کی قدرت ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر نطفہ بچہ بن جائے کئی نطفے منی کے ساتھ ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ کئی ماں کے پیٹ سے قبل از وقت نکل جاتے ہیں۔ کئی مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ کئی ناقص پیدا ہوتے ہیں ہاں جو بچہ بھی پیدا ہوگا، ہوگا انہی خواص سے جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھے ہیں غیر انسانی خواص لے کر پیدا نہ ہوگا۔ گویا اس تقدیر کے لئے ایک نقطہ مقرر نہیں ایک دائرہ مقرر ہے اُس کے اندر یہ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ پھر لکھا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ سے یہ مراد ہے کہ ہم نے قرآن اُسی رات میں اتارا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خاص امور کے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔

معترض کی اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے کہ قَدْرٌ کے معنے اظہارِ قدرت کے ہیں جو دو طرح ہوتی ہے۔ اوّل اسی تقدیر کر جو ایک مخصوص شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی صاحب معترض نے آسمان و زمین کی مثال دی ہے مگر یہ مثال کامل نہیں بہرحال اس سے اس قسم کی تقدیر کا ایک موٹا اندازہ ہو جاتا ہے ورنہ اصل مثال اس کی وہ تقدیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق ظاہر ہوتی ہے جسے قانونِ قدرت کہتے ہیں یعنی وہ قانون جو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے ظہور کیلئے مقرر فرمایا ہے۔ مثلاً یہ کہ مردے اس دنیا میں جسمانی طور پر زندہ ہو کر نہیں آتے۔ یا غیب کامل کا علم خدا تعالیٰ کے بتائے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ جمک بندی ٹھیک ہو جائے تو یہ اور بات ہے علم کی بناء پر کوئی شخص غیب کامل کو اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر نہیں جان سکتا وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے ایسی تقدیر ہے جو بالاجمال ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ہی وقت میں ساری تقدیر کا اظہار نہیں ہو جاتا آہستہ آہستہ وہ تقدیر ظاہر ہوتی ہے اور ایک مقرر قانون کے مطابق ظاہر ہوتی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد وہ رات ہے جسے خاص امور کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص کر چھوڑا تھا۔

ان معنوں کے بتانے کے بعد میں باری باری دونوں معنوں کے رُو سے اس آیت کے معنے کرتا ہوں۔ پہلے معنے یہ تھے کہ قَدْر سے خدا تعالیٰ کی دو قسم کی قدرتوں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قَدْر کا لفظ خدا تعالیٰ کی دونوں قدرتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ضرور دونوں قدرتوں میں سے ایک ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک نہ ایک قسم کی قدرت کی طرف اس سے ضرور اشارہ ہوتا ہے مگر ایک ہی وقت میں دونوں قدرتوں کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ قدیر آتا ہے یعنی قدرت والا تو اس کے یہ معنے تو نہیں ہوتے کہ اس سے نمبر اوّل قسم کی قدرت ظاہر ہوتی ہے یا نمبر ۲ قسم کی قدرت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس سے دونوں قسم کی قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اِسی طرح اگر کسی جگہ قَدْر کا لفظ آئے تو گو کبھی اس سے قسم اوّل کی قدرت مراد ہوگی اور کبھی قسم دوم کی۔ یا کبھی اور کسی تیسری قسم کی قَدر مراد ہوگی لیکن کبھی وہ سب قسم کی قدرتوں کی طرف ایک ہی وقت میں اشارہ کرتا ہوگا۔ اس جگہ بھی یہی معنے ہیں اور اَلْقَدْر میں آلْ جنسی استغراقی ہے یعنی

جتنی قسم کی قدریں ہیں وہ سب اس رات میں جمع تھیں۔ مفردات راغب نے دو قدریں لکھی ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ دو قسمیں پھر آگے دو قدروں میں تقسیم ہوتی ہیں یعنی اول قسم کی روحانی قدر اور اول قسم کی جسمانی قدر۔ اور دوم قسم کی روحانی قدر اور دوم قسم کی جسمانی قدر۔ اسی طرح اور کئی قسم کی قدریں اُن سے نکلتی چلی آئیں گی۔ پس قدر کے لفظ پر اَلْ استعمال کرکے اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس رات میں قرآن کریم نازل ہُوا اُس میں سب قسم کی قدریں جمع ہو گئی تھیں اور وہ رات تمام قدروں کا مجموعہ تھی۔

جیسا کہ مفردات راغب والوں نے بتایا ہے پہلی تقسیم قدر کی یہ ہے کہ وہ دفعۃً پیدائش کاملہ والی قدر اور آہستہ آہستہ ظاہر ہونے والی اجمالی قدر کی دو قسموں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ان معنوں کے رُو سے اِس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یہ دونوں قدریں اس رات میں جمع کر دی تھیں۔ پھر یہ دونوں قدریں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں آگے جسمانی اور روحانی قدروں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اِس لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم جس رات میں نازل ہُوا تھا اُس میں یہ چاروں قسم کی قدریں جمع تھیں۔ دفعۃً کامل ظہور والی جسمانی قدر بھی اور روحانی قدر بھی اور آہستہ آہستہ مناسب موقعہ اپنے وجود کو ظاہر کرنے والی جسمانی قدر بھی اور روحانی قدر بھی۔ اب ہم اِن قدروں میں سے ایک ایک کو لے کر دیکھتے ہیں کہ کیا نزولِ قرآن کی رات میں اس کا وجود پایا جاتا تھا۔ پہلی قدر یکدم ظاہر ہونے والی جسمانی قدر ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ سورج یا چاند کہ پیدائش کے شروع دن سے ایک مقصد کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں اور جب تک مقدر ہے اپنے کام کو ایک ہی شان سے کرتے جائیں گے۔ اس قدر کے مشابہ قدر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود تھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب ع۶ آیت ۴۶ و ۴۷) یعنی اے نبی ہم نے تجھے گواہ اور بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اُس کے حکم سے بلانے والا اور روشن سورج بنا کر بھیجا ہے۔ اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ سورج کی طرح ہیں یعنی آپ کے بعض وصف شروع دن سے کامل بنائے گئے تھے اور اُن کا ظہور آپ کی روحانی پیدائش کے ساتھ ہی مکمل ہو گیا تھا۔ وہ وصف کیا تھے؟ اِنکی طرف اشارہ لفظ سورج سے کر دیا گیا ہے۔ سورج کے ابتدائی پیدائش کے لحاظ سے دو خاص وصف ہیں (۱) اوّل یہ کہ سب اجرام اُس کے گرد چکر لگاتے ہیں (۲) دوم یہ کہ وہ اپنے گرد کی اشیاء کو روشن کرتا ہے۔ جہاں تک اس کے گرد چکر لگانے کا سوال ہے تمام اجرام بغیر استثناء اس کے گرد چکر لگاتے ہیں اور جہانتک روشنی دینے کا سوال ہے وہ چیزیں جو اُس کے سامنے آ جاتی ہیں اُنہیں وہ روشنی دیتا ہے اس کی پہلی صفت کو جسمانی کہنا چاہئیے اور دوسری کو روحانی۔ کیونکہ روحانی صفت کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس کا ظہور تعلق کی بناء پر ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی مادی نصرتیں تو ہر شخص کو خواہ مومن ہو خواہ کافر ملتی ہیں لیکن روحانی نصرتیں صرف اُنہی کو ملتی ہیں جو اُس کے نُور کے سامنے اپنی رُوح اور اپنے دل کو کر دیتے ہیں۔

دو قسم کی قدریں

جس دن قرآن کریم نازل ہُوا اُسی کے مشابہ جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی قدریں ظاہر ہوئیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جونہی پہلا کلام نازل ہُوا آپ دنیا کے لئے سورج قرار دیئے گئے اور دنیا کے لئے یہ مقرر کر دیا گیا کہ وہ آپ کے گرد چکر لگائے بےشک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا روحانی ارتقاء ہوتا چلا گیا اور اب تک ہو رہا ہے مگر جہاں تک آپ کے گرد تمام دینی اجرام کے چکر لگانے کا سوال ہے اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس رات کو آپ پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہُوا اس رات کو بھی آپ پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری تھا جتنا کہ آپ کی زندگی کی آخری گھڑی میں ضروری تھا گویا جو شخص بھی خدا تعالیٰ کے فضل کو حاصل کرنا چاہے اُس کے لئے ضروری تھا کہ آپ کے گرد گھومے۔ کیونکہ آپ اپنی بعثت کی گھڑی سے دنیا کے لئے سورج کی طرح ہو گئے تھے۔ تاہم

نظامِ عالم کا مدار آپ پر رکھدیا گیا تھا اس کا ظاہری نشان خدا تم نے یہ مقرر فرمایا کہ جس طرح سورج کو خدا تعالےٰ کے سوا کوئی توڑ نہیں سکتا اسی طرح آپ کی ذات کو بھی پہلے کلام کے نزول کیوقت سے دنیا کی دستبرد سے محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ شروع سے لیکر آخر تک آپ کے دشمنوں نے آپ کو قتل کرنے کے لئے بے حد زور لگایا، سینکڑوں منصوبے کئے مگر آپ کی ذات پر آنچ نہ آئی کیونکہ آپ کا وجود سورج تھا اور سورج کو فنا کرنے پر کوئی انسان قادر نہیں ہو سکتا۔

پہلی قدرت کی دوسری قسم روحانی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ سورج کا روشنی دینا روحانی ظہور کے مشابہ ہے کیونکہ روشنی سے وہی فائدہ اٹھاتا ہے جو اُس کی طرف مُنہ کرتا ہے اور روحانی امور کی یہی خصوصیت ہے کہ ہر شخص اُن سے فائدہ نہیں اُٹھاتا بلکہ وہی فائدہ اٹھاتا ہے جو اُن کی طرف رغبت کرتا ہے۔ یہ قدرت بھی کامل طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پائی جاتی تھی کلامِ الٰہی کے نازل ہونے کے ساتھ ہی آپ کو فیض روحانی پہنچانے کی قدرت اُسی رنگ میں عطا کی گئی جس رنگ میں کہ سورج کو روشنی دینے کی قدرت حاصل ہے۔ جب سے سورج بنا ہے وہ روشنی دیتا ہے اور یکساں روشنی دیتا ہے لیکن اُسی کو دیتا ہے جو اُس کے لئے اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے روحانیت کا نور بخشنے کی طاقت بخشی ہے اور اُسی دن سے بخشی ہے جب سے کہ آپ نبی ہوئے ہیں اور یہ طاقت گھٹتی بڑھتی نہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے دن آپ کا فیض کم تھا اور بعد میں زیادہ ہو گیا جس طرح سورج کی روشنی پہلے دن سے ایک سی ہے اسی طرح آپ کا فیضان نبوت کی پہلی گھڑی سے یکساں ہے نہ اُس وقت زیادہ اور اب کم نہ اُس وقت کم تھا اور اب زیادہ ہے۔ صرف روشنی لینے والے کے ظرف کا فرق ہے جس طرح زیادہ کھلے دروازوں والے مکان میں روشنی زیادہ پڑتی ہے اور تنگ دروازوں والے مکان میں کم روشنی پڑتی ہے اسی طرح جو اپنے دل کو وسیع کرتا ہے آپکے فیض مبارک سے زیادہ حصہ پا لیتا ہے اور جو اپنے دل کو تنگ کرتا ہے وہ کم حصہ پاتا ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کے فیضان کا تعلق ہے وہ شروع سے اِس وقت تک یکساں رہا ہے اور قیامت تک یکساں رہیگا۔

غرض جس رات قرآن کریم نازل ہوا اُسی رات یکدم کامل طور پر ظاہر ہونے والی جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی قدرتیں ظاہر ہوئیں اور ایسے کامل طور پر ظاہر ہوئیں کہ اس سے پہلے کبھی ظاہر نہ ہوئی تھیں۔

دوسری قسم قدرت کی وہ ہے جو بیج کی طرح پیدا ہو کر آہستہ آہستہ پھیلتی ہے۔ اِس قدرت کی جسمانی اور روحانی دونوں قسموں کا ظہور اس رات میں ہُوا۔ چنانچہ انہی آیات میں جو اُس دن آپ پر نازل ہوئیں یہ آیت ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ جس کے ایک یہ معنے ہیں کہ انسان کی پیدائش یکدم نہیں ہوئی بلکہ وہ پہلے خون کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ ترقی کرکے کمال کو پہنچتا ہے اِسی طرح اسلام کی جسمانی اور روحانی ترقی ہوگی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے دن اسلام کی گٹھلی جو سورۂ علق کے ذریعہ سے رکھی گئی بڑھتے بڑھتے قرآن کریم کے درخت کی شکل اختیار کر گئی جو اس کا جسمانی ارتقاء تھا۔ درحقیقت سارا قرآن اِن چند آیتوں کی تفسیر ہے جو پہلے دن نازل ہوئیں کیا ہی لطیف خلاصہ قرآنی تعلیم کا یہ آیات ہیں اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ اپنے رب کے نام سے پڑھ۔ یعنی اُن صفاتِ الٰہیہ کا اظہار کر جو اِس وقت تک تجھ پر روشن ہو چکی ہیں کیونکہ وہ انکشاف جو تجھ پر صفاتِ الٰہیہ کا ہُوا ہے وہی درست ہے اور اس کے سوا سب تشریحیں صفاتِ الٰہیہ کی غلط ہیں۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ یعنی جس نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے اِس لئے سب مخلوق پر اُس کا تصرّف ہے اور وہ اُس کے قبضہ میں ہے توحید باری کا اعلان کرنے کے بعد دنیا تیری مخالفت کرے گی مگر گھبرانے کی بات نہیں آخر مخلوق اللہ تعالےٰ سے وابستہ ہے جب تُو خالق کی فرمانبرداری میں لگا ہوگا تو مخلوق تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اور یاد رکھ کہ گو تیری باتیں اس وقت تیرے مخاطبوں کو کتنی بُری لگیں کتنی عجیب لگیں لیکن انسان کے اندر خدا تعالےٰ کو ملنے اور بنی نوع انسان سے

نیکی کرنے کی خواہش مخفی طور پر رکھی گئی ہے۔ پہلے لوگ تیرے دشمن ہوں گے، خدا تعالیٰ سے مُنہ موڑنے والے ہوں گے، بنی نوع انسان پر ظلم توڑنے والے ہوں گے لیکن آہستہ آہستہ اُن کی اصلاح ہوتی جائے گی اور وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی صلح کر لیں گے اور بنی نوع انسان سے بھی اُن کے تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ پھر فرماتا ہے اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ ہاں ہاں پڑھ اپنے معزز ترین رب کی مدد سے یعنی ایسی تعلیم کے پیش کرنے پر ضرور مخالفت ہوتی ہے اور خصوصاً روحانی اور جسمانی لیڈر شرارت پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن خواہ دنیاوی لیڈر ہوں یا مذہبی، تو اُن کی پروا نہ کیجیو کیونکہ ان سب معززوں سے زیادہ معزز خدا تعالیٰ کی ذات ہے وہ تیرے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب انسان کو ارتقاء کی آخری منازل تک پہنچا دے اور آئندہ علوم زبان کی بجائے قلم کے ذریعہ سے سکھائے جائیں یعنی علوم کی حفاظت کے لئے قلم کا استعمال اب بڑھ جائے گا۔ پھر فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ اب ایسے مادی اور روحانی علوم دنیا کو سکھائیگا کہ اس سے پہلے انسان اُن سے آگاہ نہ تھا۔

غور کرو جو کچھ قرآن کریم میں نازل ہوا ہے سب انہی آیات کی تشریح ہے۔ آخر قرآن کیا ہے؟ خدا تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان صحیح تعلقات کی تعلیم۔ یہ دونوں باتیں اجمالاً ان آیات میں آگئی ہیں اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ آیات تو ایسی ہیں جیسے کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ کی ابتدائی حالت ہوتی ہے یہ ان آیات میں بتائی ہوئی تفسیر ترقی کرے گی اور بڑھتے بڑھتے جاندار بچہ اور پھر عالم و فاضل مرد کی طرح ہو جائے گی جو قلم سے کام لیتا ہے اور علوم و فنون کا مخزن ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کی یہ آیات بڑھ کر ایک مکمل کتاب ہو جائیں گی اور دوسرے یہ کہ اس کتاب کی رو سے انسان علقہ کی حالت سے ترقی کر کے مردِ کامل ہو جایا کریں گے قرآن کی تکمیل جسمانی قدرت کا ظہور ہے اور انسانوں کی روحانیت کی تکمیل روحانی قدرت کے ظہور کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ دونوں قدرتیں ایسی نہیں کہ یکدم ظاہر ہوئی ہوں یا ہوتی ہوں۔ قرآن کریم جب نازل ہوا تو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اب بھی جو اُسے پڑھتے ہیں آہستہ آہستہ ہی پڑھتے ہیں۔ نہ پہلے یکدم نازل ہوا نہ اب کوئی یکدم اس سے واقف ہوتا ہے۔ اِسی طرح روحانی ترقیات جو اسلام کے ذریعہ سے ملتی ہیں وہ بھی گو جنی تو اسی پیغام پر ہیں جو پہلی رات کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا مگر ایمان کے مطابق آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں اور اس طرح دوسری قسم کی قدرت کے روحانی ظہور کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

دوسرے معنے قدر کے مفردات راغب نے یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اس رات میں اُتارا ہے جسے اُس نے اپنی خاص قدرتوں کے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔ یہ معنے بھی درست ہیں کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی خبریں پہلی کتب میں بکثرت موجود تھیں اور آپ کے زمانہ کے نشانات اور اُس کی علامات نبیوں کے مُنہ سے خدا تعالیٰ بیان کروا چکا تھا۔ عین اُس بیان کے مطابق قرآن کریم نازل ہُوا۔ پس اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہم نے اِس قرآن کو اُسی زمانہ میں اُتارا ہے جس میں اس کے اُترنے کی پہلے انبیاء خبر دے چکے ہیں۔ پھر اس کے ماننے میں تم کو کیا تردّد ہو سکتا ہے۔ جب زمانہ وہی ہے جس میں اس موعود نبی اور موعود شریعت نے آنا تھا۔ اور یہ مدعی تمہارے نزدیک جھوٹا ہے اور اس کی کتاب خدا تعالیٰ پر نعوذ باللہ افترا ہے تو پھر تم بتاؤ کہ سچا موعود اور سچی شریعت ہے کہاں؟ اگر کہو کہ کہیں بھی نہیں تو پھر تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے نہ ہوگے بلکہ ساتھ ہی اپنے نبیوں کا انکار کرنے والے بھی ہوگے۔ کیونکہ اُنہوں نے اس زمانہ میں ایک نبی اور ایک شریعت کے آنے کی خبر دی ہے۔ اگر یہ جھوٹا ہے اور دوسرا کوئی سچا موعود موجود نہیں تو پھر تمہاری کتابیں بھی جھوٹی ہیں اور تمہارے انبیاء بھی جھوٹے ہیں۔

اقرب الموارد نے قدر کے مندرجہ ذیل معنے کئے ہیں:-

(۱) برابر کی چیز کہتے ہیں ھٰذَا قَدْرُ ھٰذَا۔ یہ چیز اس کے برابر کی ہے (۲) حُرمت (۳) وقار (۴) غناء (۵) قوت (۶) سہولت۔ اِن معنوں کے رُو سے اِس آیت کے معنے یُوں بنیں گے۔

۱۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اُتارا ہے جو قیمت میں برابر کی ہے۔

لیلۃ القدر کے لغات کے لحاظ سے چھ معنی

۲۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو حُرمت والی ہے۔

۳۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو وقار والی رات ہے۔

۴۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو غناء والی رات ہے۔

۵۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو قوت والی رات ہے۔

۶۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو سہولت والی رات ہے۔

اب ہم ان چھٹوں معنوں کے متعلق دیکھتے ہیں کہ آیا یہ قرآن کریم پر صادق آتے ہیں یا نہیں۔

پہلے معنے

پہلے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ برابر قیمت والی رات میں ہم نے قرآن کریم کو اُتارا ہے چونکہ جس چیز کے وہ برابر ہے اُس کا یہاں ذکر نہیں۔ اس لئے ہم مقابل والی چیز کو محدود نہیں قرار دے سکتے اور ہمیں اس کے یہی معنے کرنے پڑیں گے کہ ہم نے قرآن کریم کو اُس رات میں اُتارا ہے جو قیمت میں باقی ساری راتوں کے برابر ہے یعنی یہ رات باقی تمام دنیا کی عمر کے برابر قیمت رکھتی ہے یہ معنے قرآن کریم پر چسپاں ہوتے ہیں قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں اور قرآن کریم خاتم الکتب ہے۔ قرآن کریم میں انسان کی ترقیات کے لئے سب تعلیمات آگئی ہیں اور قرآن کریم ہی روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ ہے پس جب قرآن کریم آخری تعلیم ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آخری شارع نبی ہیں تو

دوسرے معنے

یہ ثابت ہُوا کہ باقی تمام انبیاء اور باقی تمام کتب مقصود نہیں بلکہ صرف ذریعہ ہیں اور ذرائع خواہ کتنے بھی زیادہ ہوں وہ مقصود سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔ پس یہ کہنا کہ ہم نے اس قرآن کریم کو برابر والی رات میں اُتارا ہے درحقیقت اس کے یہی معنے ہیں کہ یہ قرآن آخری کتاب ہے اور یہ اکیلی اُن تمام شریعتوں کے مقابلہ میں ہے جو اس وقت تک اُتر چکی ہیں اور قرآن کریم کے نزول کا زمانہ اپنی برکات کے لحاظ سے اُن تمام انبیاء کے زمانوں کے برابر ہے جو کبھی بھی خدا تعالےٰ کی طرف سے آئے تھے۔ پس اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ میں درحقیقت قرآن کریم کے آخری اور سب سے مکمل کتاب ہونے کا دعویٰ بیان کیا گیا ہے اور اِن چھوٹے سے الفاظ میں قرآن کریم کی اُن ہزارہا خوبیوں کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے جو خدا تعالےٰ نے اُس کے الفاظ میں مخفی رکھی ہیں۔ اس مضمون کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو اس کے لئے کئی ہزار صفحات کی ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ اس لئے میں تفصیل میں نہیں جاتا۔ اسی قدر مضمون کا بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

دوسرے معنے اس آیت کے لغت کے لحاظ سے یہ بتلائے گئے تھے کہ قرآن کریم حُرمت والی رات میں اترا ہے یعنی قرآن کریم کا نزول ایک ایسی رات میں ہُوا ہے یا ایسے تاریک زمانہ میں ہُوا ہے جس کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو چیز عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے وہ کبھی ضائع نہیں جاتی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (سورۂ رعد ع۲) جو چیز نفع رساں ہوتی ہے وہ ہمیشہ کے لئے قائم رکھی جاتی ہے۔ بیت اللہ کو بھی بیت الحرام کہا جاتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اُس کی حفاظت کی جاتی ہے اور اُس کے اعزاز کو ہمیشہ قائم رکھا جاتا ہے پس حُرمت والی رات کے معنے یہ ہیں کہ جس کے حقوق کو ہمیشہ قائم رکھا جائے گا۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ قرآن کریم اُس زمانہ میں اُترا ہے جو آخری زمانہ ہے اور جس زمانہ کو کوئی اور زمانہ بدلے گا نہیں اور ہمیشہ اس زمانہ کی عزت کو قائم اور اُس کی حکومت کو اُستوار

رکھا جائے گا۔ یہ معنے بھی قرآن کریم پر چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی راہنمائی کا زمانہ قرار دیا گیا ہے۔ جب بھی کوئی شخص ہدایت اور راہنمائی حاصل کرنا چاہے اُس کو اِسی رات کی طرف نظر اٹھانی پڑتی ہے اور اسی رات کی برکتیں انسان کو ہدایت اور راستی پر لا سکتی ہیں اور کبھی بھی اس رات سے نکلی ہوئی ہدایت اور راستی کی راہیں مسدود نہیں ہوتیں۔ وہ چلی آتی ہیں اور چلی جائیں گی اور قیامت تک اُن کا سلسلہ ممتد رہے گا۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ تھے کہ قرآن کریم وقار کی رات میں اتارا گیا ہے۔ وقار کے معنے بوجھ۔ سمجھ اور عقل کے ہوتے ہیں۔ پس اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ قرآن کریم ایک ایسی رات میں اتارا گیا ہے جو عقل اور سمجھ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور بوجھل ہے یعنی جس کی تعلیمات دشمن کے حملہ اور اُس کی تنقید سے اپنی جگہ سے ہل نہیں جاتیں۔ یہ معنے بھی قرآن شریف پر پوری طرح چسپاں ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی حکمتوں پر مبنی ہے اور ہر ایک حکم جو دیا جاتا ہے اس کی وجہ بھی بتائی جاتی ہے۔ کیوں اُس حکم پر عمل کرنا چاہیئے، اس کے کیا فوائد ہیں، اس کو چھوڑا جائے تو اس کے کیا نقصانات ہوں گے اور اس طرح وزنی دلائل سے اُسے ثابت کیا جاتا ہے کہ کسی فلسفہ کی تنقید بھی اُس کے دلائل کو رد نہیں کر سکتی۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ ایسی وزنی چیز ہوتی ہے کہ دشمن خواہ اُس کو کتنا بھی دھکیلنے کی کوشش کرے آخر اُسے شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کریم ایک ایسی رات میں نازل ہوا ہے جو غناء والی رات ہے۔ غناء کے معنے عربی زبان میں ضرورت کے پورا ہونے اور سہولت کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم اُس رات میں نازل ہوا ہے یا اُس تاریک زمانہ میں نازل ہوا ہے جو ضرورتوں کو پورا کرنے والا تھا۔ یہ معنے بھی قرآن کریم پر صادق آتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کی روحانی اور دینی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (سورۂ عنکبوت ع ۵) کیا اِن لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ مکمل کتاب اُتاری ہے جو سُنائی جاتی ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ تفصیل الکتاب ہے (سورۂ یونس ع ۴) یعنی شریعت کی تمام تفصیلات کو بیان کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (سورۂ یوسف ع ۱۲) یعنی قرآن کریم تمام ضروری دینی اُمور کی تفصیل بیان کرتا ہے اور ہر قسم کے مومنوں کے لئے اِس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ خود اِسی آیت زیر تفسیر میں بھی اِس مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ہر قسم کی باتیں اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ملائکہ . . . . لیلۃ القدر کی رات میں لے کر نازل ہوتے ہیں پس قرآن کریم وہ کتاب ہے جو تمام دوسری مذہبی کتب سے انسان کو مستغنی بنا دیتی ہے اور تمام ضروری امور اس میں بیان ہوئے ہیں پس اس کا نزول غناء والے زمانہ میں ہُوا ہے۔

تیسرے معنے

پانچویں معنے اس لفظ کے قوت کے ہیں جس کے رُو سے اس آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ قرآن کریم قوت والی رات میں نازل ہُوا ہے یعنی اس رات کے ساتھ خدا تعالیٰ کی قوت اور اُس کی طاقت وابستہ ہے۔ چنانچہ یہ معنے بھی قرآن کریم پر صادق آتے ہیں اور یہ معنے مفردات امام راغب کے معنوں کے سلسلہ میں اُوپر بیان ہو چکے ہیں اِس لئے اِس جگہ اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

پانچویں معنے

چوتھے معنے

چھٹے معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم سہولت والی رات میں نازل ہُوا ہے۔ یہ معنے بھی قرآن کریم اور اُس کے زمانہ پر صادق آتے ہیں۔ پہلی کتابوں کو دیکھو اُن کے اندر مذہب کو بھول بھلیاں بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ نہ عقائد سمجھ میں آ سکتے ہیں نہ اعمال قابل اتباع ہیں۔ یہودیوں اور ہندوؤں کی تعلیم عبادت کے متعلق اگر لی جائے تو اتنی اتنی شرطیں بلا وجہ عبادت کے ساتھ لگا دی گئی ہیں کہ اوّل تو سارے آدمی اس طرح عبادت کر ہی نہیں سکتے اور اگر کریں تو

چھٹے معنے

تکلیف مالایطاق میں پڑتے ہیں۔ دوسرے ایسے وہموں میں مبتلا ہوتے ہیں جن کو تسلیم کرنا انسانی دماغ کے لئے بڑا دوبھر اور مشکل ہوتا ہے۔ قرآن کریم ہی ایک ایسی تعلیم ہے جس کا ماننا انسان کے لئے آسان اور جس پر عمل کرنا بھی انسان کے لئے آسان ہے چنانچہ قرآن کریم خود یہ دعویٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (سورۃ قمر ع۱) ہم نے قرآن کریم کو کیا بلحاظ دماغ کے اور کیا بلحاظ عمل کے آسان کر دیا ہے۔ پس کیا کوئی شخص ایسا ہے جو نصیحت حاصل کرے یا عمل کرے۔ اس جگہ پر لفظ ذکر استعمال کر کے دونوں معنے لے لئے گئے ہیں۔ ذکر کے معنے یاد کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور عمل کرنے کے بھی ہوتے ہیں پس اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیمات کا دماغ سے گذرنا بھی انسان پر آسان رہتا ہے یعنی اُن کا ماننا انسان کو دوبھر معلوم نہیں ہوتا اور قرآن کریم کی تعلیموں پر عمل کرنا بھی انسان کے لئے آسان ہوتا ہے کیونکہ اُس میں ہر طاقت اور قوت اور ضعف اور کمزوری کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً نماز کا حکم ہے اس کے لئے ارشاد ہے کہ نماز مسجدوں میں پڑھنی چاہیئے لیکن ساتھ ہی یہ ارشاد ہے کہ ساری زمین ہی خدا تعالےٰ کی مسجد ہے گویا نہ کسی خاص قسم کے مکان کی ضرورت ہے نہ خاص قسم کے سامان کی ضرورت ہے نہ نماز پڑھانے کے لئے کسی خاص قسم کے پادری یا پنڈت کی ضرورت ہے۔ جس زمین کو چاہو صاف کر لو اور مومنوں میں سے جس کو چاہو آگے کھڑا کر کے نماز پڑھ لو۔ لیکن اگر کوئی شخص بیمار ہے یا سفر پر ہے تو جماعت کے بغیر بھی نماز ہو سکتی ہے۔ نماز کے لئے وضو کی شرط ہے لیکن اگر انسان بیمار ہو یا پانی نہ ملے تو وہ بغیر وضو کے تیمم سے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر اتنا بیمار ہے کہ کھڑا نہیں ہو سکتا تو گھر میں بیٹھ کر بھی نماز پڑھ سکتا ہے اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو لیٹے ہوئے سر کے اشارہ سے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر اس حالت سے بھی گیا گذرا مریض ہے تو وہ انگلی یا آنکھ کے اشارہ سے بھی نماز ادا کر سکتا ہے اور جو اس کی بھی طاقت نہ رکھے وہ صرف دل میں ہی نماز کے مضمون کو دہرا کر اپنی نماز ادا کر سکتا ہے۔ بیہوش ہو جائے تو وہی نماز دوسرے وقت میں ادا کر سکتا ہے۔ اور یہ ایک ہی مثال نہیں بلکہ ہر حکم کے متعلق اسی طرح ضرورت اور طاقت کے مطابق تبدیلی پیدا کی گئی ہے۔ پس قرآن کریم کی تعلیم سہولت والی تعلیم ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہاں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اس رات میں قرآن کریم نازل ہوا ہے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ قرآن ایسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ پر خالی قرآن کا مضمون بیان نہیں بلکہ اس سے زیادہ مضامین کی طرف اشارہ کرنا مدنظر ہے۔ جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا۔ یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تابع اظلال کا بھی ذکر ہے۔ اگر آیت کے یہ الفاظ ہوتے کہ قرآن کریم ایسی ایسی شان کا ہے تو یہ مضمون باہر رہ جاتے۔ پس زمانہ کی طرف وہ صفات منسوب کر دی گئی ہیں تا کہ یہ مضمون یکساں طور پر کتاب پر بھی چسپاں ہو اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی چسپاں ہو اور دوسرے ماموروں پر بھی چسپاں ہو۔

لیلۃ القدر سے مراد خاص رات یا تاریک زمانہ

جیسا کہ اُوپر کے مضمون سے ظاہر ہے میں نے لیلۃ القدر کے دونوں معنے لئے ہیں (۱) یہ بھی کہ وہ معیّن رات جس میں قرآن کریم نازل ہُوا قرآن کریم کے نزول کی وجہ سے ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اُسے لیلۃ القدر کہنا چاہیئے (۲) اور یہ معنے بھی میں نے لئے ہیں کہ لیلۃ سے مراد وہ رات نہیں جس میں قرآن کریم نازل ہُوا بلکہ وہ تاریک زمانہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہُوا۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے تاریک زمانوں میں ہی خدا تعالیٰ کی غیرت جوش میں آکر آئندہ نیکی اور تقویٰ کی بنیاد رکھا کرتی ہے اور جب تاریکی بڑھتے بڑھتے خدا تعالےٰ کے فضل کو کھینچتی ہے تو اُس وقت وہ تاریکی کا زمانہ بظاہر تاریک ہوتا ہے لیکن بالقوۃ اُس کے اندر قدرتِ خداوندی پائی جاتی ہے گویا لیلۃ القدر ایک جہت سے رات ہے اور ایک جہت سے دن سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ وہ اظہارِ قدرت کا وقت بھی ہے اور وہ تاریک وقت بھی ہے۔ دنیا کی نگاہوں میں وہ تاریکی کی انتہاء کو ظاہر کرنے والا وقت ہے

اور خدا تعالیٰ کی نظر میں وہ آئندہ آنے والی عظیم الشان روشنی کے لئے ایک بیج کا کام دے رہی ہو گویا اُس رات کی مشابہت رحم مادر کے ساتھ ہے جبکہ اُس کے اندر نطفہ پڑ چکا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (سورۂ زمر ع) یعنی خدا تمہاری ماؤں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ تین قسم کی ظلمتوں میں سے گذارتے ہوئے تمہیں پیدا کرتا ہے جس کے بعد تم ایک مکمل انسان بن جاتے ہو۔ تمہارا رب ایسا ہے سب اختیار اُسی کے قبضہ میں ہے۔ پس جس طرح رحم مادر جس کے اندر نطفہ ٹھہر گیا ہو گو ایک تاریک کوٹھڑی کی طرح ہوتا ہے اُس میں انسانی پیدائش کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسی طرح لیلۃ القدر رحم مادر کی طرح بظاہر تاریک ہے لیکن قوم اور نسل کی پیدائش کی بنیاد اُس میں رکھی جاتی ہے۔

۳۔ تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا ہے یعنی اُس زمانہ میں پیدا کیا گیا ہے جس میں لوگ اللہ تعالیٰ سے دور چلے جاتے ہیں اور آسمانی نور بالکل کھینچ لیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں سے انسان محروم رہ جاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص بندہ نازل ہوتا ہے جو دوبارہ دنیا کو روشنی اور ہدایت کی طرف لاتا ہے۔ یہی رات نبی کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔ اگر دنیا پر تاریک روحانی رات نہ آئی ہو تو اللہ کی طرف سے اصلاحی نبی نہیں آیا کرتا۔

انبیاء کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تعمیری اور ایک اصلاحی۔ تعمیری انبیاء وہ ہوتے ہیں جو عقائد یا مسائل مہمہ میں خرابی کے وقت نازل ہوتے ہیں اور ایک نئے دین کی تعمیر کرتے ہیں یا ایک نئی تشریح کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اور اصلاحی وہ جو بغیر خرابی کے وقوع کے نبی کے کام کو جاری رکھنے کیلئے آتے ہیں۔ تعمیری نبی ایسے ہیں جیسے حضرت موسیٰؑ، حضرت مسیحؑ اور آنحضرت صلعم کہ یہ اُس وقت آئے جب شرائع مٹ چکی تھیں یا اُن کے معنے لوگوں کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ اور اصلاحی نبی ایسے ہیں جیسے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد اسحاقؑ اُن کے بعد یعقوبؑ اُن کے بعد یوسفؑ۔ ان نبیوں کے وقت میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی تھی جسے مٹانے اور پھر شریعت کو قائم کرنے کے لئے وہ آئے ہوں بلکہ اُن کی بعثت کی غرض صرف یہ تھی کہ تعلیم الٰہی جو آ چکی تھی اسے اپنے عمل اور نگرانی سے وہ مزید راسخ کریں یا جو اب تک نہیں پھیلی اُن میں پھیلائیں۔ اصل میں تو یہ دونوں قسم کے نبی ایک نسبتی رات کے وقت میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن تعمیری نبیوں کے زمانہ کی تاریکی ظاہر و باہر ہوتی ہے اور اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (سورۂ روم ع آیت ۴۲) یعنی یقیناً خشکی اور تری میں یعنی نبیوں کو ماننے والی اور نہ ماننے والی قوموں میں فساد ظاہر ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ انسانوں کے اعمال سے ہوا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا کلام چھوڑ دینے کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے بعض اعمال کی سزا جن کی سزا اس دنیا میں مقدر ہے اُن کو یہاں دے گا تا اس سزا کی وجہ سے اُن کے دل میں توبہ کی طرف توجہ پیدا ہو اور وہ دوبارہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔

اللہ تعالیٰ اسی تاریکی کی حالت کی طرف اشارہ کر کے اس آیت میں فرماتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یقیناً لیلۃ القدر میں مبعوث فرمایا یعنی ایسی روحانی رات میں جو تقاضا کرتی ہے کہ اس میں کوئی رسول نازل کیا جائے جو لوگوں کی اصلاح کرے اور انہیں تاریکی سے نکالے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۥ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ

انبیاء کی دو قسمیں تعمیری و اصلاحی

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (مائدہ ع ۳ آیت ۱۶) یعنی اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس اس لئے آیا ہے کہ بہت سے انوار بائبل کے جو تمہاری بدعملیوں کی وجہ سے ظاہر نہ ہو سکتے تھے تم پر دوبارہ ظاہر کرے اور تمہاری کمزوریوں سے درگذر کرے سُنو! تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی رسول) اور سب باتیں کھول کر بیان کرنے والی ایک کتاب آئی ہے ان میں سے ہر ایک کے ذریعہ اللہ تعالےٰ انہیں جو اس کی بات پر چلتے ہیں سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت بخشتا ہے اور اللہ کا رسول اللہ کے حکم سے اُنہیں جو اُس کی بات مانتے ہیں موجودہ ظلمت سے نکال کر خاص نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اُنہیں صراط مستقیم کی طرف لے جاتا ہے۔ اِس آیت سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریکی کا زمانہ تھا یعنی ایک روحانی رات تھی اور ایسے زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو نازل کرکے بنی نوع انسان کو پھر سے سلامتی کی راہیں دکھائیں اور ترقیات کے راستے اُن کے لئے کھولے پس اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ میں ہٗ کی ضمیر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اس کا قرینہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ جس طرح سورۃ العلق میں جو اِس سے پہلی سورۃ ہے اِقْرَاْ کے الفاظ کہ قرآن کریم کو پیش کیا گیا تھا اسی طرح اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر تھا۔ چنانچہ اس سورۃ کی مندرجہ ذیل آیات میں آپ ہی کا ذکر ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى یعنی تُو مجھے اُس شخص کا حال تو بتا جو ایک 'عظیم الشان بندہ' کو جب وہ نماز پڑھتا ہے نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ پس جس طرح اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ میں قرآن کریم کی طرف ضمیر جا سکتی ہے جیسا کہ پہلے بیان کردہ معنوں میں مَیں نے اِس طرف ضمیر پھیری ہے اِسی طرح اَنْزَلْنَاهُ کی ضمیر اَرَءَيْتَ کی تاء کی طرف اور عَبْدًا کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ پس اس آیت کے دوسرے معنے یہ بھی ہیں کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو لیلۃ القدر میں اُتارا ہے۔

(حاشیہ: انبیاء کی بعثت کے دنیا میں تاریکی کے اوقات)

(حاشیہ: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ میں ضمیر کا مرجع محمد ﷺ)

جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں تمام انبیاء کبار اسی زمانہ میں نازل ہوتے ہیں جب دنیا میں تاریکی اور ظلمت کلی دور دورہ ہوتا ہے اور ایسے وقت میں اگر خدا تعالےٰ کی طرف سے نبی نہ آئے تو یقیناً لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی ہستی کے بارہ میں شبہ پیدا ہوگا قرآن کریم بار بار اس دلیل کو پیش کرتا ہے کہ ضرورت کے موقعہ پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے کلام نازل ہوتا ہے چنانچہ سورۂ یٰسٓ میں آتا ہے وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (یٰس ع ۳ آیت ۳۴) یعنی تمہارے لئے مردہ زمین میں ایک نشان ہے خدا تعالےٰ اُسے زندہ کرتا ہے اور پھر اُس میں سے دانے نکالتا ہے جس میں سے تم کھاتے ہو۔ یعنی جب بھی زمین مردہ ہو جاتی ہے ذخائر کو ختم ہونے سے بچانے کے لئے خدا تعالیٰ ہمیشہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے یعنی کیا کفار یہ خیال نہیں کرتے کہ جو خدا اُن کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے وہ اُن کی روحانی ضرورتوں کو پورا نہ کرے گا اور بوقت ضرورت نبی نہ بھیجیگا۔ اِسی سورۃ میں آگے چل کر فرماتا ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۚ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (روم ع ۶ آیت ۴۹ تا ۵۱) یعنی اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو اُٹھاتی ہیں پھر اُن بادلوں کو جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے (یعنی ہر ملک کے لئے ہواؤں کے الگ الگ رُخ مقرر ہیں جن کے مطابق بادل پھیل جاتے ہیں) پھر جب وہ بادلوں کو اپنے جن بندوں تک چاہتا ہے پہنچاتا ہے تو وہ اچانک (بعد مایوسی کے) خوش ہو جاتے ہیں اور گو وہ بہت عرصہ سے اس

بارش کے نزول سے ناامید ہوچکے تھے پس تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار کو دیکھ کس طرح وہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے یہی خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہاں تو مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر ہے کیونکہ گمراہوں کو ہدایت بخشنا یا دینی علوم سے ناواقفوں کو علوم الٰہی کی خبر دینا بھی مردہ زندہ کرنا کہلاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (الانفال ع۳ آیت۲۵) یعنی اے مومنو! جب خدا اور اُس کا رسول تم کو بلائیں تو اُن کی بات مانا کرو کیونکہ تم مردہ ہو وہ تم کو زندہ کرنے کے لئے بلاتے ہیں اور تمہارا اپنا فائدہ اسی میں ہے کہ تم اُن کی آواز سنو۔ انہی مُردوں کی نسبت یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں یعنی اُن پر رات طاری ہے چنانچہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَ مَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (انعام ع۴ آیت۴۰) یعنی وہ لوگ جو ہمارے نشانوں کا انکار کرتے ہیں بہرے اور گونگے ہیں اور اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں خدا تعالیٰ جس کی نسبت چاہتا ہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے اور جس کی نسبت چاہتا ہے اُسے سیدھے راستہ پر ڈالدیتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (مائدہ ع۳ آیت۱۷) یعنی یہ رسول لوگوں کو تاریکیوں میں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے ظاہر و ثابت ہے کہ جب بھی دنیا پر روحانی تاریکی چھا جاتی ہے اور لوگ روحانی طور پر مر جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رسول ضرور مبعوث ہوتا ہے پس ان معنوں کی رُو سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو شدید ترین تاریکیوں کا زمانہ تھا ایک نبی کا مبعوث ہونا ضروری تھا اور آپ کا دعویٰ بالکل مناسب وقت پر تھا۔ دنیا پیاسی ہو رہی تھی اسے آسمانی پانی کی ضرورت تھی اس پر موت طاری تھی اُسے ایک زندہ کرنے والی ہستی کی احتیاج تھی۔ دنیا پر ایک تاریک رات طاری تھی اُسے ایک روحانی سورج کی ضرورت تھی جو رات کی ظلمت کو دُور کرے اور اُسے ایمان کی روشنی بخشے۔ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایک دوسری آیت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِیْرًا (سورۂ احزاب ع۶) قرار دیا ہے۔ غرض یہ فرما کر کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے آپ کی صداقت کی ایک ایسی زبردست دلیل دی گئی ہے جس کا کوئی مذہب انکار نہیں کر سکتا۔ کونسا مذہب ہے جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا پر جب جب بھی ظلمت اور تاریکی کا دَور آتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک مامور اسے روشنی بخشنے کیلئے ضرور اس زمانہ میں مبعوث ہوتا ہے۔ بائبل بھی اس پر متفق ہے۔ مسیح کیوں آیا؟ اسی لئے کہ بنی اسرائیل پر ایک رات طاری ہو گئی تھی۔ ہندو مذہب کرشن جی کی دوبارہ بعثت کا کیوں امیدوار ہے؟ اس لئے کہ وہ زمانہ کلجگ کا ہوگا۔ بدھ مت اور زرد شت مذہب بھی اسی امر کے مدعی ہیں کہ جب جب تاریکی کا زمانہ دنیا میں آئیگا خدا تعالیٰ کے مامور بھی ظاہر ہوتے رہیں گے۔ پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ سب سے زیادہ تاریک زمانہ جس میں سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا گذر رہی تھی اس میں کوئی مامور مبعوث نہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سب مذاہب جھوٹے ثابت ہو جاتے۔ خدا تعالیٰ کا وجود ایک واہمہ بن کر رہ جاتا۔ پس اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ کی آیت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ اس تاریک رات کو روشن کرنے کے لئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سوا اور کون آیا؟ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ نعوذ باللہ جھوٹا تھا تو پھر سب مذاہب ہی جھوٹے ہوئے کہ جو اس امر پر متفق ہیں کہ تاریکی اور ظلمت کے وقت کے لمبا ہو جانے کی صورت میں ضرور خدا تعالیٰ کا روحانی سورج چڑھتا ہے جس طرح جسمانی رات کے بعد خدا تعالیٰ کا جسمانی سورج چڑھتا ہے۔

۲۱۱ آنحضرت صلعم کا بروقت دعوی نبوت

اِس جگہ ایک لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ

مسیحی مصنف جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کی کامیابی کی یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسے زمانہ میں آئے تھے جب سارے مذاہب بگڑ چکے تھے اِس لئے آپ کی تعلیم کامیاب ہوگئی۔ انہیں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ ہم اس دلیل سے خود محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ اگر اُس زمانہ میں سارے مذاہب بگڑ چکے تھے اور اس وجہ سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف عیسائیوں اور دوسری طرف ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہوگیا تو سوال یہ ہے کہ ایسے ہی زمانہ میں تو خدا تعالیٰ کے رسول آیا کرتے ہیں۔ اگر وہ زمانہ واقعہ میں ایسا تھا کہ دنیا کے مذاہب بگڑ چکے تھے اور لوگ اپنے مذاہب کی تعلیمات سے دُور جا چکے تھے تو اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے یا تکذیب؟ کیا نبی دنیا میں ایسے زمانہ میں بھی آیا کرتا ہے جب سارے لوگ راستی اور صداقت پر قائم ہوں اور وہ نیک اور بااخلاق ہوں۔ کیا مسیحؑ کی کامیابی کی وجہ یہ نہ تھی کہ لوگ بگڑ چکے تھے اور وہ نیکی اور تقویٰ کو ترک کر چکے تھے اس لئے صداقت جھوٹ پر غالب آگئی؟ کیا موسیٰؑ کی کامیابی کی یہی وجہ نہیں تھی؟ کیا کرشنؑ اور رام چندرؑ اور زرتشتؑ اور بُدھ کی کامیابی کی یہی وجہ نہیں تھی بلکہ اُن کے نزول کی یہی وجہ تھی۔ اگر اس وجہ سے کسی نبی کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے تو پھر تمام نبیوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ کوئی نبی بھی ایسے زمانہ میں نہیں آیا جب لوگ درست حالت میں ہوں۔ ہمیشہ ہی بداخلاقی، بے ایمانی اور گندگی کے پھیل جانے کی صورت میں ہی نبی آیا کرتے ہیں۔

۲۵۱ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ میں محمد صلی اللہ کے بار بار دنیا میں آنے کی پیشگوئی

چوتھے معنے اِس آیت کے یہ ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں اُتارتے رہتے ہیں یعنی نہ صرف قرآن کا پہلا نزول ایک تاریک زمانہ میں ہُوا ہے بلکہ آئندہ بھی جب دنیا میں تاریکی کا زمانہ آئے گا قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دوبارہ دنیا میں اتریں گے اور پھر بنی نوع انسان کی راہنمائی اور ہدایت کا موجب ہوں گے۔ یعنی ایسا زمانہ کوئی نہ آئیگا کہ دنیا میں خرابی ہو اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم اُس کی ہدایت کا موجب نہ ہو سکیں اور کسی نئی شریعت کی ضرورت پیش آجائے بلکہ جب کبھی قرآن کا نور دنیا سے مٹنے لگے گا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روشنی پہ پردہ پڑ جائیگا خدا تعالیٰ دوبارہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مثیل روحانی وجودوں کو دنیا میں مبعوث فرمائے گا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نور کو بھی ظاہر کریں گے اور قرآن کریم کی تعلیم کو بھی دوبارہ روشن کر دیں گے اور ثابت کر دیں گے کہ خرابی نہ قرآن میں تھی نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں تھی بلکہ بنی نوع انسان کے فہموں میں خرابی تھی کہ وہ قرآن کریم کے معانی کے سمجھنے سے قاصر ہوگئے تھے یا اُن کے دلوں میں خرابی تھی کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نور اپنے اندر لینے سے محروم ہو گئے تھے۔

دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (سورۃ جمعہ ع) اِن آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُس زمانہ میں بھی نازل فرمایا تھا جس زمانہ میں کہ آپ کی جسمانی بعثت ہوئی تھی اور آئندہ پھر اُس زمانہ میں بھی نازل فرمائے گا جبکہ ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ آپ کا ایک مثیل ظاہر فرمائے گا جو آپ کی نیابت میں دنیا کو پھر اسلام کی طرف واپس لائے گا اور اسلام کی شوکت کو دنیا میں قائم کریگا۔ اسی زمانہ کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اُس زمانہ میں قرآن کریم بھی آسمان پر اُٹھ جائے گا اور وہ موعود پھر قرآن کو واپس لائے گا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ کتاب العلم ص۳۸) قرآن کریم کا صرف نام اور اُس کے الفاظ باقی رہ جائیں گے اُس کے معانی سے لوگ ناواقف ہو جائیں گے پس وہ موعود پھر قرآن کو

آسمان سے واپس لائے گا اور قرآن اپنے کامل علوم اور معرفت سمیت پھر دنیا میں آجائے گا اور یہی نہ ہوگا کہ دنیا کے پاس فقط اُس کا نام اور نشان باقی ہو۔ خود اس سورۃ میں بھی اِس طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر بیان فرمایا گیا ہے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا جو ایک استمرار کا صیغہ ہے یعنی ایسی لیلۃ القدر کی راتیں کئی آنے والی ہیں اور اُن میں خدا تعالےٰ کے ملائکہ اور رُوح اُترا کریں گے۔ پس جب لیلۃ القدر کئی آنیوالی ہیں اور اُن میں ملائکہ اور رُوح اترنیوالے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آیتِ زیرِ تفسیر میں اَنْزَلْنَا کے معنے صرف ماضی کے نہیں بلکہ مستقبل کے بھی ہیں اور قرآن کریم میں ماضی بمعنے مستقبل کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل بروزوں کی طرف اشارہ ہے لیکن چونکہ ناقص بروز بھی بروز ہی ہوتا ہے اِس لئے یہ آیت ناقص بروزوں کے متعلق بھی اشارہ کرتی ہے یعنی ایسے زمانہ کے مصلحین کی نسبت بھی جبکہ کامل تاریکی تو نہیں آئے گی لیکن ایک نئی زندگی کی ضرورت انسان کو محسوس ہوگی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ ہر صدی کے سر پر دنیا کو ایک ہوشیار کرنے والے کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور اسلام میں اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ ہر صدی کے سر پر مجدّد بھیجتا رہے گا۔ اِن مجدّدوں کے متعلق بھی اِس آیت میں پیشگوئی موجود ہے کیونکہ وہ بھی جزوی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہوتے ہیں اور ایک جزوی تاریک رات میں اُن کا ظہور ہوتا ہے۔

پانچویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم لیلۃ القدر کی بزرگی میں نازل فرمایا ہے۔ اِن معنوں کے رُو سے فی کے معنے متعلق کے ہوں گے۔ یعنی یہ معنے نہیں ہوں گے کہ لیلۃ القدر میں قرآن نازل ہوا ہے بلکہ یہ معنے ہوں گے کہ لیلۃ القدر کے بارہ میں قرآن کریم نازل ہوا ہو۔ بالعموم مفسرین نے یہی معنے لئے ہیں اور وہ اِس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ قرآن کریم اُس لیلۃ القدر کی جو رمضان کے آخر میں آتی ہے۔ بڑائی اور بزرگی بیان کرتا ہے۔ اگر آیت کے یہ معنے کئے جائیں تو سوال پیدا ہوگا کہ وہ لیلۃ القدر جس کی طرف اس سورۃ میں توجہ دلائی گئی ہے کیا چیز ہے؟ مفسرین کا خیال ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد اس جگہ پر رمضان کی راتوں میں سے وہ رات ہے جس کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں متعدد جگہ پر ذکر آتا ہے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لَمَّا حَضَرَ رَمَضَانُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَآءَكُمْ شَهْرُ رَمَضَانَ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ اِفْتَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهُ تُفْتَحُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَتُغْلَقُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَحِيْمِ وَتُغَلُّ فِيْهِ الشَّيَاطِيْنُ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ یعنی اے لوگو رمضان کا مہینہ آگیا ہے یہ مبارک مہینہ ہے اللہ تعالےٰ نے تم پر اس مہینہ کے روزے فرض کئے ہیں۔ اس مہینہ میں جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں (یعنی نیکیوں کی زیادتی ہو جاتی ہے اور مومن روزوں کے اثر کی وجہ سے گناہوں سے بہت اجتناب کرنے لگتے ہیں) اور شیطانوں کو اس مہینہ میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں (یعنی جو مسلمان بدیوں کے ارتکاب کے عادی ہو جاتے ہیں وہ بھی اپنے بھائیوں کی قربانیوں کو دیکھ کر احتیاط کرنے لگ جاتے ہیں) اس مہینہ میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے جو رمضان میں بھی اس رات کی برکات سے محروم رہے وہ بڑا محروم آدمی ہے۔ نسائی نے بھی ابوایوب انصاریؓ سے اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے بخاری اور مسلم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ یعنی جو شخص لیلۃ القدر کو خوب جاگے اور عبادت کرے اور یہ اُس کی عبادت دکھاوے یا ریا کے طور پر نہ ہو بلکہ ایمان اور خدا تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے ہو تو اُس کے وہ سب گناہ جو وہ پہلے کر چکا ہے

۲۱۱ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ کے معنے کہ قرآن کریم لیلۃ القدر کے بارہ میں نازل ہوا ہے

معاف ہو جاتے ہیں۔

اِن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی ایک رات کا نام لیلۃ القدر رکھا ہے اور اس کی نسبت ایسی صفات بیان فرمائی ہیں جو قرآن کریم کی بیان کردہ لیلۃ القدر سے ملتی ہیں۔ مثلاً اس کا ہزار مہینوں سے اچھا ہونا یا گناہوں کی بخشش کی صورت میں سلامتی لانا۔ یہ تشابہ ضرور اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس سورۃ میں جس لیلۃ القدر کا ذکر ہے اسی کا ذکر احادیث میں ہے یا کم سے کم یہ کہ اس لیلۃ القدر کی طرف بھی اس سورۃ میں اشارہ ہے۔

اِس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عقل اور انصاف کے مطابق ہے کہ ایک رات کو جو دوسری راتوں کی طرح کی ایک رات ہے ایسی برکات کا موجب سمجھ لیا جائے اور کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ اس ایک رات میں عبادت کرنے والا سب گزشتہ گناہوں سے نجات پا جائے۔ کیا اس سے نیک اعمال سے استغناء پیدا نہیں ہوتا؟

مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کا ایک عہد اور اس عہد کی یاد میں لیلۃ القدر کا قیام

اس شبہ کا یہ جواب ہے کہ اگر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں رات میں عبادت کر لو تمام گناہ بخشے جائیں گے تو یہ بات ضرور خلاف عقل اور قوم میں وہم پیدا کرنے والی ہے۔ لیکن لیلۃ القدر کے ساتھ جو شرائط اور جو امور وابستہ ہیں اُن کے ہوتے ہوئے یہ شبہ درست نہیں رہتا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے بلکہ انسانی دماغ کی اہم خصوصیتوں میں سے ہے کہ خیالات کا انتقال ASSOCIATION OF IDEAS انسانی اعمال پر ایک نہایت ہی گہرا اثر رکھتا ہے۔ ایک انسان اپنے عزیز کی قبر پر جاتا ہے تو گو اُس کے سامنے صرف ایک مٹی کا ڈھیر ہوتا ہے مگر اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ قبر اُسے اپنے عزیز کی یاد دلاتی ہے اور اس یاد کے ساتھ ہی حافظہ اُن تعلقات کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے جو اس مرحوم کی زندگی میں اُس کے اور اس عزیز کے درمیان تھے ایک ایک کر کے واقعات اُس کے حافظہ میں تازہ ہونے شروع ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ احساس مل کر کہ اب وہ باتیں پھر نہیں ہو سکتیں اس کے دل کی کیفیت عجیب قسم کی ہو جاتی ہے حالانکہ اُس عزیز کی موت کوئی نیا واقعہ نہیں ہوتا اور نہ گزشتہ واقعات کوئی نیا علم پیدا کرتے ہیں مگر وہی پُرانی قبر اور پرانے واقعات قبر کو دیکھ کر مردہ جذبات کو زندہ کر دیتے ہیں اور سوئے ہوئے احساسات کو جگا دیتے ہیں۔ اسیطرح لوگ پیدائش کے دن مناتے ہیں، شادی کے دن مناتے ہیں اس لئے کہ گو شادی اور پیدائش کا علم تو ہر روز ہی ہوتا ہے خاص دنوں میں ان کا علم نیا نہیں پیدا ہوتا لیکن انتقال خیالات کا بہترین موقعہ وہی دن پیدا کرتا ہے جس دن کوئی پیدا ہوا ہوتا ہے یا جس دن ایک جوڑے کی شادی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی حکمت کو مدنظر رکھتے ہوئے رمضان کے مہینہ میں جسمیں قرآن کریم جیسی اہم اور ہدایت دینے والی کتاب نازل ہونی شروع ہوئی تھی۔ اگر ایک رات اس کی یاد تازہ کرنے کیلئے مقرر ہو جائے اور اللہ تعالےٰ فیصلہ فرمائے کہ چونکہ اس مہینہ میں ہم نے بنی نوع انسان سے ایک نیا عہد باندھا تھا دائمی اور نہ فراموش ہونے والا عہد۔ اس لئے مومنوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اور اس بات کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے کہ ہم اب تک اس عہد پر قائم ہیں ہم اس مہینہ کی ایک رات کو دعاؤں کی قبولیت کے لحاظ سے خاص فضیلت اور برتری بخشتے ہیں تو اس میں کیا حرج کی بات ہے یہ تو عین صواب ہے۔

خدا تعالےٰ نے ابراہیمؑ سے ایک عہد باندھا اور اُس کی ظاہری علامت کے طور پر ختنہ مقرر فرمایا صرف ایک جسمانی علامت جس سے روحانیت کا کوئی بھی تعلق نہیں۔ ایک حفظان صحت کا اصول یک بدنی صفائی کا نشان۔ یہود نے اِسے قائم رکھا مگر مسیحیوں نے اسے بُھلا دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر نسل ابراہیم اس عہد کو ختنہ کے ذریعے دُہراتی چلی آئی ہے تو خدا تعالیٰ نے اپنے عہد کو کس طرح دُہرایا؟ تورات اس پر بالکل خاموش ہے۔ فرض کر لو کہ خدا تعالےٰ کا عہد یہ تھا کہ کنعان کا ملک ہمیشہ بنو ابراہیم کے پاس رہے گا تو یہ بھی تو نہ ہوا۔ کیونکہ بائبل کے ماننے والوں کے نزدیک ابراہیمی وعدوں کے حقدار صرف بنو اسحٰق تھے مگر بنو اسحاق تو تیرہ سو سال سے اس ملک کی حکومت سے محروم ہیں۔ آخر

خدا تعالےٰ نے اپنا عہد کیوں بھلا دیا۔ مسیحیوں نے بے شک ختنہ چھوڑ دیا لیکن یہود نے تو ختنہ نہیں چھوڑا تھا انکو کیوں اللہ تعالیٰ نے بھلا دیا۔ عہد کے زندہ اور قائم ہونے کی تو یہی علامت ہو سکتی ہے کہ دونوں طرف سے اس کے قائم ہونے کا اعلان ہوتا رہے مگر بائبل کے عہد کا تو یہ حال ہے کہ یہود اب تک ختنہ کرتے چلے آتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کا بھی عہد کے اپنے حصہ کو ادا کرنیکا نام نہیں لیتا۔

خدا تعالےٰ نے مسلمانوں سے بھی ایک نیا عہد باندھا اور اس کی علامت رمضان کے روزے مقرر فرمائے۔ اس عہد کے مقابل پر مسلمانوں سے بھی ایک عہد اللہ تعالےٰ نے باندھا اور اس عہد کا اعلان رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ اس عہد کی علامت ختنہ کو نہیں مقرر کیا گیا کیونکہ ختنہ تو عرب پہلے ہی ابراہیم کی یاد میں کرتے چلے آتے تھے بلکہ اس عہد کی علامت مومنوں کے لئے یہ مقرر کی گئی کہ وہ اس سارے مہینہ کے روزے رکھیں جس میں خدا تعالےٰ نے ان سے عہد باندھا تھا اس کے مقابل پر اللہ تعالےٰ نے بھی اس عہد کے نباہنے کی ایک علامت اپنے لئے مقرر فرمائی اور وہ یہ کہ جب تم رمضان کا مہینہ اس عہد کی یاد میں روزوں میں گذارو گے تو میں اس کے جواب میں رمضان کی آخری راتوں میں سے ایک رات تمہارے لئے آسمان سے اتروں گا اور اعلان کروں گا کہ اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (بقرہ ع ۲۳) یعنی بندوں کی طرف سے جب اس عہد کی یادگار رمضان کی صورت میں منائی جائے گی تو میں بھی اس عہد کی یادگار لیلۃ القدر کی صورت میں مناؤں گا۔ آسمان سے اپنے بندوں کے لئے اتروں گا اور اعلان کروں گا کہ مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ایمان لاؤ تو تمہیں ہدایت بخشی جائے گی کیونکہ تم میرے معاہد ہو۔ تم نے اپنے عہد کی رمضان سے یاد تازہ کی میں اپنے عہد کی لیلۃ القدر سے یاد تازہ کرتا ہوں۔ یہ کیسی مبارک علامت ہے۔ ختنہ بھی اچھی چیز ہے لیکن ایک مہینہ بھر خدا تعالےٰ کے لئے روزے رکھنے یہ اس علامت کی نسبت کس قدر زیادہ شاندار اور کس قدر زیادہ روحانیت کو زندہ کرنے والی علامت ہے۔ اس کے مقابل پر خدا تعالیٰ کا جواب بھی کیسا شاندار ہے۔ روپیہ نہیں، چاندی نہیں، ملک نہیں، دولت نہیں، وہ اپنے عہد کی یادگار کے طور پر مسلمانوں سے لیلۃ القدر جیسی چیز کا وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب تم میرے آخری کلام کے نازل ہونے کی خوشی میں ہمیشہ رمضان کے مہینہ کے روزے رکھا کرو گے اور اس طرح اپنے عہد کو تازہ کرتے رہو گے تو میں بھی تم سے لیلۃ القدر کے ذریعہ سے اپنا عہد تازہ کرتا رہونگا یعنی اس دن تم پر خاص فضل کیا کروں گا اور تمہاری دعائیں سنا کروں گا تم کو نیا اور زندہ ایمان بخشا کروں گا تا تم کو معلوم ہوتا رہے کہ میں زندہ خدا ہوں اور اپنے عہد کی نگہداشت میں تم سے پیچھے نہیں بلکہ تم سے زیادہ اپنے عہد کی نگہداشت کرنے والا ہوں۔

یہ دونوں نشان باہمی عہد کے تازہ رکھنے کے کیسے شاندار ہیں خدا تعالےٰ نے مسلمانوں کے لئے عہد کا نشان روحانی مقرر کیا جبکہ بنو اسحاق کے لئے عہد کا نشان جسمانی یعنی ختنہ تھا۔ اور خدا تعالےٰ نے اپنے لئے بھی مسلمانوں سے کئے ہوئے عہد کا نشان روحانی مقرر کیا یعنی لیلۃ القدر۔ جبکہ بنو اسحٰق کے عہد کے مقابل میں خدا تعالےٰ نے اپنے عہد کی نشانی جسمانی مقرر کی تھی یعنی فلسطین کا یہود کے قبضہ میں رہنا۔ ساری عمر ایک ماہ کے روزے رکھنے کے مقابلہ میں ختنہ کا فعل کتنا چھوٹا ہے (پھر وہ فعل بھی مسلمان ابراہیم علیہ السلام کی یادگار کے طور پر کرتے چلے آتے ہیں) اور کنعان کی زمین لیلۃ القدر کے مقابلہ پر کتنی حقیر ہے بلکہ وہ تو لیلۃ القدر کے ایک ایک سیکنڈ کے مقابل پر حقیر ہے (اور پھر لطف یہ کہ وہ زمین بھی اب پیشگوئیوں کے مطابق مسلمانوں ہی کو مل گئی ہے)

خلاصہ یہ کہ رمضان اور لیلۃ القدر محمدی عہد کی علامات ہیں اسی طرح جس طرح ختنہ اور فلسطین کی بادشاہت ابراہیمی عہد کی علامات ہیں۔ رمضان بندہ کی طرف سے عہد کو تازہ رکھنے کا نشان ہے اور لیلۃ القدر خدا تعالےٰ کی طرف سے عہد کو تازہ رکھنے کا نشان ہے۔ اور ہر عقلمند انسان ادنیٰ تدبر سے معلوم کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کے

جو عہد خدا تعالیٰ نے باندھا ہے اُس کے نشان بہت خاندار ہیں اور روحانی ہیں اور زندہ خدا کی قدرتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ کئی قومیں اپنے ملکوں میں ہزاروں سال سے بیٹھی ہیں اور یہ اس بات کی لازمی علامت نہیں کہ خدا تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے مگر کسی قوم کو اگر لیلۃ القدر مل جائے ایسی رات جس میں خدا تعالیٰ قریب آجائے جس میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سُنے جس میں اللہ تعالیٰ قدر مراتب اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر کرے تو یہ یقیناً اس بات کا روشن ثبوت ہوگا کہ خدا تعالیٰ اس قوم سے خوش ہے اور اس سے اپنے عہد کو اُس نے بھلایا نہیں۔

ایک اور بات بھی اسی سلسلہ میں یاد رکھنے والی ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے اُن کے دونوں بیٹوں کی نسبت عہد کیا تھا اور دونوں کو ختنہ کا پابند کیا تھا۔ بائبل کہتی ہے کہ اسحٰق کی اولاد کی نسبت اُس نے کہا کہ میں کنعان کا ملک ہمیشہ کے لئے اُنہیں دُوں گا۔ چنانچہ لکھا ہے۔ ”تب خدا تعالیٰ نے کہا کہ بیشک تیری جورو سَرہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسحاق رکھنا اور مَیں اُس سے اور بعد اُس کے اُس کی اولاد سے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے قائم کروں گا۔“ (پیدائش باب ۱۷۔ آیت ۹)

حضرت اسحٰق کی اولاد کے عہد کے مقابل حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے اسی قسم کا عہد

اس جگہ عہد کے قیام سے مراد کنعان کے ملک پر دائمی قبضہ لیا جاتا ہے اور بائبل کے کئی مقامات سے اسکی تصدیق ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عہد بنو اسمٰعیل کے بارہ میں بھی تھا کیونکہ ختنہ کا حکم انہیں بھی دیا گیا تھا اور برکت کا وعدہ اُن سے بھی تھا۔ چنانچہ لکھا ہے ”جب اُس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہُوا وہ تیرہ برس کا تھا“ (پیدائش ۱۷ آیت ۲۵) نیز لکھا ہے ابراہیم نے دعا کی ”اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے“ (پیدائش ۱۷ آیت ۱۸) اس کے بعد لکھا ہے ”اور اسمٰعیل کے حق میں مَیں نے تیری سُنی دیکھ میں اُسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا اور اُسے بہت بڑھاؤں گا“ (پیدائش ۱۷ آیت ۲۰) پھر پیدائش ۲۱ میں لکھا ہے ”میں اس (اسمٰعیل) کو ایک بڑی قوم بناؤں گا“ (آیت ۱۸) اِن حوالوں سے ظاہر ہے کہ اسمٰعیل بھی دعا میں شامل تھا گو وہ اُس وعدہ میں شامل نہ تھا جو کنعان کے قبضہ کے متعلق تھا کیونکہ وہ عہد اسحٰق کی نسل کے ساتھ پورا ہونا تھا۔

یہود و نصاریٰ کو یہ غلطی لگی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ عہد صرف اسحٰق کی اولاد سے تھا۔ اوپر کی عبارتوں سے ظاہر ہے کہ عہد اسمٰعیل اور اسحٰق دونوں سے تھا۔ پھر یہ غلطی بنو اسرائیل کو کس طرح لگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیمی عہد کی دو شکلیں ہیں ایک مجمل اور ایک مفصل۔ مجمل عہد یہ تھا کہ میں تیری نسل کو برکت دوں گا اور نسل سے مراد اسمٰعیل اور اسحٰق دونوں ہیں جیسا کہ اُوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے۔ مفصل عہد آگے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اسحٰق کی نسبت عہد یہ تھا کہ کنعان کی حکومت اُسے نسلاً بعد نسل حاصل ہوگی۔ بائبل نے جو بنو اسحٰق کی کتاب ہے لازماً اسی عہد کو یاد رکھنا تھا اس کتاب میں بنو اسمٰعیل کے عہد کا ذکر نہ ہونے کے یہ معنے نہیں کہ بنو اسمٰعیل سے کوئی عہد تھا ہی نہیں۔ کیونکہ بائبل مجمل عہد میں دونوں بیٹوں کو شریک کرتی ہے۔ اسحٰق کی نسبت بھی ہے کہ میں اُسے برکت دونگا اور اس برکت کی تشریح یوں کی ہے کہ کنعان کا ملک نسلاً بعد نسل اُسے ملے گا اور اسمٰعیل کی نسبت بھی کہا ہے کہ میں اُسے برکت دوں گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اُسے کس رنگ میں برکت دی جائے گی؟ اس سوال کا جواب بائبل میں تلاش کرنا عبث ہے کیونکہ وہ تو اسرائیلی نسل کی تاریخ ہے اِس کا جواب تو اسمٰعیلی نسل کی روایات سے معلوم کرنا چاہیئے یا اسمٰعیلی نسل کے انبیاء کے الہام سے کیونکہ اسمٰعیل کی نسبت تفصیلی عہد انہی سے ہمیں معلوم ہوسکتا ہے۔ سو ہم اسمٰعیل کی نسل کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں یہ روایت چلی آتی تھی کہ اسمٰعیل کو خدا تعالیٰ نے مکہ مکرمہ مرکز کے طور پر دیا اور عرب رہائش کے لئے دیا جس پر وہ اسمٰعیل کے وقت سے اِس وقت تک قابض ہیں چنانچہ قرآن کریم میں جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا جو حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے اس تفصیلی عہد کا یوں ذکر ہے وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۞ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (بقرہ ع آیت ۱۲۶، ۱۲۷) یعنی یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع بنایا اور امن کا موجب بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ جیسا خلوص اپنی نمازوں اور عبادتوں میں پیدا کرو اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو تاکید کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو اور جب ابراہیم نے بھی ہم سے دعا کی کہ میرے رب جس طرح تُو نے اس مکان کو امن والا بنانے کا وعدہ کیا ہے میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تُو اس مکان کو امن دینے والا بھی بنا (اس طرح کہ یہ خود ہی پُرامن نہ ہو بلکہ دوسرے شہروں اور ملکوں کو بھی امن دینے والا ہو) اور اُس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرۃ پر ایمان لانے والے ہوں اُن کے ایمان کو تازہ کرنے کے لئے اس وادی غیر ذی زرع میں ہر قسم کے تازہ بتازہ پھل بھی مہیا کرتا رہ۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا تمہاری دعا قبول کی گئی مگر اس اصلاح کے ساتھ کہ جو کافر ہوں گے انہیں بھی ہم دنیوی انعامات سے محروم نہیں کریں گے (ہاں بوجہ کفر کے انہیں اُخروی عذاب ملے گا۔

یہ عہد کیسا لطیف عہد ہے اسمٰعیل سے اللہ تعالےٰ نے ختنہ کے علاوہ یہ عہد لیا کہ وہ اور اُس کی اولاد خانہ کعبہ کی خدمت کرے اور خدائے واحد کی عبادت کے لئے ایک ایسی پاک عبادتگاہ تیار رکھے جس میں اللہ تعالےٰ کے بندے جمع ہو کر خدائے واحد کی تسبیح و تحمید کریں۔

ختنہ کا عہد تو اسمٰعیل کے ساتھ بھی تھا مگر اس کے ساتھ کیا لطیف روحانی عہد بھی شامل کر دیا گیا اور اس کے جواب میں اپنی طرف سے عہد کا نشان یہ مقرر کیا کہ میں خانہ کعبہ اور اُس کے گرد کا علاقہ اُن کو دوں گا اور وہ ہمیشہ کے لئے امن میں رہیگا کوئی دشمن اُسے فتح نہ کر سکے گا اور لوگ حج کے لئے سارے ملک سے (اور آخری زمانہ میں سب دنیا سے) وہاں آتے رہینگے۔

یہ عہد کا نشان جو اسمٰعیلؑ اور اس کی نسل سے ہوا کیسا شاندار ہے۔ اسحٰق سے صرف دنیوی وعدہ تھا کہ کنعان کا ملک اُسے اور اُس کی اولاد کو ملے گا جو محض ایک سیاسی وعدہ تھا اور پھر اس ملک کو امن میں رکھنے کا کوئی وعدہ نہ تھا۔ چنانچہ کئی دفعہ یوروشلم اسرائیلی دین کے منکروں کے ہاتھوں تباہ ہُوا لیکن اسمٰعیل سے یہ وعدہ کیا کہ اُسے اور اُس کی اولاد کو مکہ اور اُس کے گرد و نواح پر تلوار کے ذریعہ سے نہیں بلکہ محبت اور حُسنِ عقیدت کے ذریعہ سے حکومت بخشی جائے گی اور خدا تعالےٰ اُن کے مرکز کو ہمیشہ دشمن کے ہاتھ سے بچائے گا اور تمام علاقہ پر اُن کی روحانی اور ظاہری حکومت ہوگی۔ روحانی اس طرح کہ لوگ مکہ سے عقیدت رکھیں گے اور وہاں حج کے لئے آئیں گے اور ظاہری اس طرح کہ وہ ملک کے لئے مرکز امن بنا دیا جائے گا اور مکّہ کے لوگوں کو سیاسی تصرّف بھی اپنے گرد کے علاقہ پر دیا جائے گا۔

ادنیٰ غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسمٰعیل کا عہد اسحٰق کے عہد سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔ اسحٰق اور اُس کی اولاد نے جو عہد کا نشان اپنے لئے مقرر کیا وہ اسمٰعیل اور اس کی اولاد نے بھی اپنے لئے مقرر کیا یعنی ختنہ۔ لیکن اس کے علاوہ یہ نشان بھی اپنے عہد کا خدا تعالےٰ کے حکم سے مقرر کیا کہ اسمٰعیل اور اس کی نسل خدائے واحد کی پرستش کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرتی رہیگی اور دنیا سے الگ ہو کر وادی غیر ذی زرع میں ذکر الٰہی کی شمع کو جلائے رکھنے کی ذمہ داری اپنے اُوپر اُٹھائے گی۔ اس کے مقابل پر اللہ تعالےٰ نے جو اپنے لئے عہد کا نشان مقرر کیا وہ بھی بنو اسحٰق کے مقابل کتنا شاندار ہے۔ وہاں تو صرف یہ وعدہ تھا کہ کنعان پر انہیں حکومت ملے گی مگر یہاں یہ عہد بھی ہے کہ (۱) بنو اسمٰعیل کے مرکز کو ہمیشہ دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھا جائیگا (۲) بنو اسمٰعیل کو بھی مکہ کے گرد و پیش پر حکومت ملے گی مگر وہ صرف سیاسی نہ ہوگی بلکہ روحانی بھی ہوگی۔ گویا بنو اسحٰق سے صرف ایک وعدہ تھا کہ کنعان پر انہیں حکومت ملے گی مگر بنو اسمٰعیل سے تین وعدے تھے یعنی مکہ کی حفاظت کا، عرب پر حکومت کا، عرب پر روحانی اقتدار ہمیشہ قائم رہنے کا۔ چونکہ یہ عہد بنو اسمٰعیل سے مخصوص تھا اس لئے لازماً انہوں نے ہی اسے محفوظ رکھا جس طرح بنو اسحٰق نے اپنے عہد کو بائبل میں محفوظ رکھا۔ یہ وہ لطیف نکتہ ہے جو خدا تعالیٰ

۲۱۱ بنو اسمٰعیل کے لئے عرب کا ملک ملنے کا وعدہ

نے خاص طور پر مجھے سمجھایا ہے اور جس سے عہد ابراہیم کی نسبت وہ سب کشمکش جو بنو اسحٰق اور بنو اسمٰعیل میں چلی آتی ہے دور ہو جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کنعان کا ملک خدا تعالیٰ نے عہد ابراہیم کے مطابق بنو اسحٰق کو دیا تھا مگر یہ بھی درست ہے کہ ویسا ہی بلکہ اس سے شاندار برکت بڑھ کر عہد بنو اسمٰعیل سے کیا گیا تھا اور وہ بنو اسحٰق کے عہد سے بھی زیادہ شاندار طور پر پورا ہوا۔ جیسا کہ آگے سورۃ قریش اور سورۂ فیل میں ان امور کی تفصیل آئے گی۔

۲۱۱
مسلمانوں کو کنعان کا ملک ملنے کی پیشگوئی داؤد کے کلام میں

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابراہیمی عہد میں بنو اسحٰق سے ہی کنعان کا وعدہ تھا تو پھر بنو اسمٰعیل کو یہ ملک کیوں ملا اور سورۂ انبیاء میں یہ پیشگوئی کیوں کی گئی ہے کہ یہ ملک مسلمانوں کو ملے گا جیسا کہ فرماتا ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ۝ (الانبیاء ع۷ آیت ۱۰۶، ۱۰۷) یعنی ہم زبور میں ذکر کے بعد لکھ چکے ہیں کہ کنعان کا ملک میرے نیک بندوں کو ملیگا۔ یہ بات ہم عبادت گزار قوم (یعنی مسلمانوں) کو توجہ دلانے کے لئے بیان کر رہے ہیں اور اُن کا حق انہیں پہنچاتے ہیں یعنی جب جائز موقعہ آئے تم فلسطین پر حملہ کر دینا اللہ تعالیٰ تم کو فتح دے گا کیونکہ داؤدؑ نے یہ خبر دے رکھی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس اشارہ کو سمجھ لیا اور باوجود اس کے کہ قیصر کی حکومت دنیا کی سب سے طاقتور حکومت تھی چند مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ مسلمان جرنیل اس سے جا بھڑے اور اُسے بُری طرح شکست دیکر ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کنعان کے متعلق دو الگ الگ وعدے تھے ایک ابراہیم سے کہ یہ ملک بنو اسحٰق کو ملے گا اور ایک داؤدؑ سے کہ یہ اُس قوم کو ملے گا جو راستباز اور خدا تعالیٰ کی عبادتگذار ہوگی۔ حضرت داؤد حضرت ابراہیمؑ کے ہزار بارہ سو سال بعد مبعوث ہوئے تھے اُن کے زمانہ میں وہ وقت قریب آرہا تھا کہ بنو اسحٰق کا عہد ختم کیا جائے اس قوم کی قیامت قریب تھی اور اس کی ہلاکت کے راستے کھلنے والے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور پیشگوئی حضرت داؤد سے کروا دی جس میں یہ بتایا گیا کہ عہد ابراہیمی جو حضرت اسحٰق کی نسل سے پورا ہونا تھا اب ختم ہو رہا ہے اب اسے نیا رنگ دے دیا جائے گا اور اب کنعان اسحٰق کی اولاد کی بجائے سچے دین کے متبعوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ سو مسلمانوں کا قبضہ فلسطین پر حضرت ابراہیم کی پیشگوئی کے ماتحت نہیں بلکہ حضرت داؤدؑ کی پیشگوئی کے مطابق ہے۔ حضرت ابراہیم کے عہد کے مطابق تو اُن کا قبضہ مکہ اور حجاز پر ہے اور داؤد کی پیشگوئی کے مطابق ان کا قبضہ کنعان یعنی فلسطین پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ کنعان پر مسلمانوں کے قبضہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم نے حضرت ابراہیم کی پیشگوئی کا حوالہ نہیں دیا بلکہ حضرت داؤد کی پیشگوئی کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اگر حضرت داؤد کی پیشگوئی حضرت ابراہیم ہی کی پیشگوئی کی تکرار ہوتی تو جو مقدم پیشگوئی تھی اُس کا ذکر کرنا چاہیئے تھا۔ اس سلسلہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم اور احادیث کی بعض دوسری پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ عارضی طور پر یہود کا غلبہ اس زمین میں پھر مقدر ہے جس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔

۳
کیا لیلۃ القدر کوئی معین رات ہے؟

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ کیا لیلۃ القدر کوئی معین رات ہے اور کیا یہ وہی رات ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔

یہ امر تو ثابت شدہ ہے کہ قرآن کریم رمضان میں نازل ہونا شروع ہوا لیکن یہ امر واقعی طور پر ثابت نہیں کہ رمضان کی کس رات میں قرآن کریم کے نزول کی ابتداء ہوئی۔ بعض سترہ[۱۷] رمضان کی بتاتے ہیں اور بعض انیس[۱۹] رمضان کی اور بعض چوبیسویں رمضان کی قرار دیتے ہیں۔ غرض اس بارہ میں اس کے سوا کہ آخری پندرہ تاریخوں میں سے کسی تاریخ قرآن کریم اُترا تھا اور کوئی یقینی بات ثابت نہیں لیکن ہر رمضان میں جو لیلۃ القدر آتی ہے اس کے بارہ میں احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ آخری عشرہ میں سے کسی رات میں آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد معین طور پر وہ رات نہیں جس میں قرآن کریم اُترا بلکہ صرف ایک ایسی رات مراد ہے جو نزول قرآن کی یاد میں خدا تعالیٰ نے بطور علامت مقرر فرمائی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ جو رات بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے

نزول کی علامت کے طور پر مقدر کی ہے کیا وہ ایک معین رات ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں وہ بھی کوئی معین رات نہیں بلکہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس رات کی نسبت مختلف احادیث سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ابو داؤد طیالسی کی روایت ہے عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ اِنَّهَا لَیْلَةُ سَابِعَةٍ اَوْ تَاسِعَةٍ وَعِشْرِیْنَ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے متعلق فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات کو ہوتی ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں عبادۃ الصامتؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَیْلَةُ الْقَدْرِ فِی الْعَشْرِ الْبَوَاقِیْ مَنْ قَامَهُنَّ اِبْتِغَاءَ حِسْبَتِهِنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ وَهِیَ لَیْلَةُ وِتْرٍ تِسْعٍ اَوْ سَبْعٍ اَوْ خَامِسَةٍ اَوْ ثَالِثَةٍ اَوْ اٰخِرِ لَیْلَةٍ یعنی لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہوتی ہے انتیسویں یا ستائیسویں یا پچیسویں یا تیئیسویں یا رمضان کی آخری رات میں۔

امام احمد بن حنبل نے ابو ذرؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے لیلۃ القدر کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اَفِیْ رَمَضَانَ هِیَ اَوْ فِیْ غَیْرِهٖ یا رسول اللہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے یا اس کے سوا کسی اور مہینہ میں؟ اس پر آپؐ نے فرمایا هِیَ فِیْ رَمَضَانَ۔ وہ رمضان میں ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا صرف انبیاء کے زمانہ میں ہوتی ہے جب وہ فوت ہو جائیں تو پھر نہیں ہوتی یا قیامت کے دن تک قائم رہے گی قَالَ بَلْ هِیَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ۔ فرمایا نہیں وہ قیامت تک ہے۔ میں نے پوچھا رمضان کے کس حصہ میں ہوتی ہے؟ اس پر فرمایا اِلْتَمِسُوْهَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَّلِ وَالْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ لَا تَسْاَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ بَعْدَهَا۔ یعنی یا تو پہلے دہاکہ میں اس کی تلاش کیا کرو یا آخری دہاکہ میں۔ اس کے بعد مجھ سے اس بارہ کوئی سوال نہ کرنا۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر باتیں کرتے رہے میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ میرا جو آپ پر حق ہے اُسی کی قسم دیتے ہوئے کہتا ہوں کہ رمضان کے کون سے دہاکہ میں لیلۃ القدر ہوتی ہے؟ اس پر آپ ناراض ہوئے اور فرمایا اِلْتَمِسُوْهَا فِی السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ لَا تَسْاَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ بَعْدَهَا یعنی آخری سات راتوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو اور دیکھنا اس کے بعد اس بارہ میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی آخری سات راتوں میں سے کسی رات میں وہ ہوتی ہے۔

۲۶۱
لیلۃ القدر کے متعلق مختلف احادیث اور اقوال۔

ابو داؤد نے اپنی سُنن میں عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے لیلۃ القدر کے بارہ میں سوال کیا گیا اور میں بھی سُن رہا تھا۔ اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ لیلۃ القدر ہر رمضان میں آتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور آپ کے شاگردوں کا خیال تھا کہ لیلۃ القدر سارے سال میں آ سکتی ہے رمضان سے اس کی خصوصیت نہیں (ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۲)

ابی رزین کا قول ہے کہ لیلۃ القدر ہر رمضان کے مہینہ کی پہلی رات میں ہوتی ہے (ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۲)

بعض نے کہا ہے کہ سترہ تاریخ کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور ابو داؤد نے ابن مسعودؓ سے بھی ایک موقوف روایت اس بارہ میں نقل کی ہے اور کچھ صحابہ و تابعین اور امام شافعی سے بھی یہ روایت منقول ہے (ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۲)

حسن بصری کا قول ہے کہ قرآن کریم لیلۃ القدر میں نازل ہوا تھا۔ اور قرآن کریم میں لکھا ہے کہ بدر کا دن اور قرآن کریم کے نزول کا دن ایک ہی ہے اور بدر کا دن سترہ رمضان جمعہ کے دن تھا اس لئے لیلۃ القدر بھی سترہ رمضان کو ہونی چاہیئے (ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۲)

بعض نے کہا ہے کہ اُنیس رمضان کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور یہ قول حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ سے روایت کیا جاتا ہے۔ (ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۳)

بخاری اور مسلم نے ابو سعید خدری سے روایت نقل کی ہے

اِعْتَكَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ وَاعْتَكَفْنَا مَعَهٗ فَاَتَاهُ جِبْرِيْلُ فَقَالَ الَّذِيْ تَطْلُبُ اَمَامَكَ فَاعْتَكَفَ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ وَاعْتَكَفْنَا مَعَهٗ فَاَتَاهُ جِبْرِيْلُ وَقَالَ الَّذِيْ تَطْلُبُ اَمَامَكَ ثُمَّ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْبًا صَبِيْحَةَ عِشْرِيْنَ مِنْ رَمَضَانَ فَقَالَ مَنِ اعْتَكَفَ مَعِيَ فَلْيَرْجِعْ فَاِنِّيْ رَاَيْتُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ وَاِنِّيْ اُنْسِيْتُهَا وَاِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ فِيْ وِتْرٍ وَاِنِّيْ رَاَيْتُ كَاَنِّيْ اَسْجُدُ فِيْ طِيْنٍ وَمَاءٍ وَكَانَ سَقْفُ الْمَسْجِدِ جَرِيْدًا مِنَ النَّخْلِ وَمَا نَرٰى فِي السَّمَاءِ شَيْئًا فَجَاءَتْ قَزَعَةٌ فَمُطِرْنَا فَصَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى رَاَيْتُ اَثَرَ الطِّيْنِ وَالْمَاءِ عَلٰى جَبْهَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصْدِيْقُ رُؤْيَاهُ وَفِيْ لَفْظٍ فِيْ صُبْحِ اِحْدٰى وَعِشْرِيْنَ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَهٰذَا الْحَدِيْثُ اَصَحُّ الرِّوَايَاتِ

یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اور ہم نے بھی رمضان کی پہلی دس تاریخوں میں اعتکاف کیا اس کے خاتمہ پر حضرت جبریل آئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ جس چیز (لیلۃ القدر) کی آپ کو تلاش ہے وہ آگے ہے اس پر آپ نے اور ہم سب نے درمیانی دس دنوں کا اعتکاف کیا اس کے خاتمہ پر پھر حضرت جبریل نے ظاہر ہوکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جس چیز کی آپ کو تلاش ہے وہ آگے ہے اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسویں رمضان کی صبح کو تقریر فرمائی اور فرمایا کہ مجھے لیلۃ القدر کی خبر دی گئی تھی مگر میں اسے بھول گیا ہوں اس لئے اب تم آخری دس راتوں میں سے وتر راتوں میں اس کی تلاش کرو۔ میں نے دیکھا ہے کہ لیلۃ القدر آئی ہے اور میں مٹی اور پانی میں سجدہ کر رہا ہوں اس وقت مسجد نبوی کی چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی ہوئی تھی۔ اور جس دن آپ نے یہ تقریر فرمائی بادل کا نشان تک نہ تھا۔ پھر اچانک بادل کا ایک ٹکڑا آسمان پر ظاہر ہوا اور بارش شروع ہوگئی پھر جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی تو میں نے دیکھا کہ آپ کی پیشانی پر مٹی اور پانی کے نشانات ہیں۔ ایسا خواب کی تصدیق کے لئے ہوا۔ اور ابو سعید کی ایک روایت میں یہ واقعہ اکیس رمضان کو ہوا تھا۔ امام شافعی کہتے ہیں اس بارہ میں یہ سب سے پختہ روایت ہے۔

عبداللہ بن انیس سے مسلم نے روایت کی ہے کہ تئیس رمضان لیلۃ القدر ہے اور ابو داؤد طیالسی نے ابو سعید خدری کی روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو ہوتی ہے۔ مسند احمد بن حنبل نے بھی حضرت بلالؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو ہوتی ہے۔ امام بخاری نے بلالؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آخری سات راتوں میں سے پہلی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے یعنی یا تئیسویں یا چوبیسویں۔

مسند احمد کی یہ روایت پہلے درج ہو چکی ہے کہ قرآن چوبیسویں رمضان میں نازل ہونا شروع ہوا تھا۔

بخاری نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں تلاش کرو۔ جب نو باقی ہوں یا سات باقی ہوں یا پانچ باقی ہوں۔ گویا اکیسویں تیئسویں اور پچیسویں رمضان میں لیلۃ القدر ظاہر ہوتی ہے۔

مسلم نے اُبَیّ ابن کعب سے روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر ستائیسویں رمضان کو ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ اور معاویہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ لیلۃ القدر ستائیسویں رمضان کو ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کو جمع کیا تو سب نے اتفاق کیا کہ وہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کسی میں ہوتی ہے۔

عبادہ ابن الصامت کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں سے کسی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے یا رمضان کی آخری رات میں ہوتی ہے۔

بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ تَحَرَّوْا

لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ
یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے وتر راتوں میں لیلۃ القدر کی تلاش کرو۔

بخاری نے عبادۃ الصامت سے روایت کی ہے کہ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُخْبِرَنَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ خَرَجْتُ لِاُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرًا لَّكُمْ فَالْتَمِسُوْهَا فِي التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہمیں لیلۃ القدر کی خبر دینے باہر نکلے۔ باہر دو آدمی لڑ رہے تھے آپ نے تقریر کی اور فرمایا میں تو لیلۃ القدر کی خبر دینے نکلا تھا مگر فلاں فلاں کی لڑائی کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے حافظہ سے اس کا علم اٹھا لیا اور شاید اسی میں بہتری ہو۔ اب تم اُسے انتیسویں یا ستائیسویں یا پچیسویں رات میں تلاش کرو۔

ان روایات میں جن میں سے اکثر صحاح کی ہیں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ رمضان کی پہلی تاریخ سترھویں انیسویں اکیسویں تیئیسویں چوبیسویں پچیسویں ستائیسویں انتیسویں اور تیسویں ساری ہی تاریخوں کو لیلۃ القدر قرار دیا گیا ہے اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے ایک قول کے مطابق تو سارے سال میں کوئی سی رات بھی لیلۃ القدر ہو سکتی ہے۔ لیکن حدیثوں پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے صحیح قول یہی ہے کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی رات اور خصوصاً طاق راتوں میں سے کوئی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے۔

ان روایتوں کو ملا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے اُترنے کی خواہ کوئی رات ہو لیلۃ القدر اس رات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ بدلتی رہتی ہے اور رمضان کی آخری راتوں میں سے کسی رات کو اس کا ظہور ہو سکتا ہے کیونکہ اگر قرآن کریم کے اُترنے کی رات ہی لازماً لیلۃ القدر قرار دی جاتی۔ تو اوّل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ مجھے لیلۃ القدر کا علم دیا گیا تھا مگر فلاں فلاں کی لڑائی کی وجہ سے بھول گیا ہے آخر قرآن کریم آپ پر اُترا تھا آپ کو وہ رات یاد ہوگی اور اگر یاد نہ بھی ہوگی تو آپ کو اس آیت سے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ لیلۃ القدر صرف قرآن کریم کے نازل ہونے کی رات ہے اور یہ راتیں کئی نہیں ہو سکتیں ایک ہی رات ایسی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں آپ یہ کیوں فرمایا کرتے کہ فلاں راتوں میں اس کی تلاش کرو۔

دوسرے یہ کہ ایک دفعہ آپ کو لیلۃ القدر بتائی گئی اور وہ اکیسویں رات کو ظاہر ہوئی باوجود اس کے آپ لوگوں کو یہی کہتے رہے کہ آخری عشرہ میں اس کی تلاش کرو۔ حالانکہ اگر وہ ایک معین رات ہوتی تو اس کے بعد آپ ہمیشہ رمضان کی اکیسویں رات بتاتے رہتے۔ پس معلوم ہوا کہ (۱) آپ قرآن کریم کے نزول کی رات کو لازماً ہمیشہ کے لئے لیلۃ القدر نہیں قرار دیتے تھے (۲) آپ اس کے سوا دوسری راتوں میں سے بھی کسی کو ہمیشہ کیلئے معین لیلۃ القدر نہیں قرار دیتے تھے بلکہ آپ کے نزدیک تو یہ رات قرآن کریم کے نزول کی یاد میں مقرر کی گئی تھی اور گو اس یادگار کو رمضان کے آخری عشرہ سے مخصوص کر دیا گیا تھا مگر نزول کی رات سے مخصوص نہیں کیا گیا تھا۔

لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گو یہ رات نزول قرآن کی یاد میں ہے مگر قرآنی طریق کے مطابق اس سے مزید فائدہ بھی اُٹھا لیا گیا ہے کسی واقعہ کی یاد کے لئے کسی آس پاس کے دن کو مقرر کر دیا جائے تو وہ دن وہی فائدہ دیتا ہے جو فائدہ نزول کے دن اس یادگار کو منانا۔ لیکن اگر ایک ہی رات ہمیشہ کے لئے مخصوص کر دی جائے تو عبادت کی وہ کثرت نہیں ہو سکتی جو غیر مخصوص صورت میں ہو سکتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یاد کو آخری عشرہ میں کسی رات میں مقرر کر کے یہ فائدہ مسلمانوں کے لئے پیدا کر دیا کہ بجائے ایک دن کے وہ دس دن جوش و خروش سے عبادت کریں۔ اگر وہ ایک دن کو لیلۃ القدر مقرر کر دیتا تو کمزور آدمی صرف ایک رات عبادت کر کے خوش ہو جاتا لیکن اس صورت میں کم سے کم دس راتیں تو وہ عبادت کی

لگا رہے گا کیونکہ اُسے خیال ہو گا کہ شاید یہ رات لیلۃ القدر ہو یا شاید وہ ہو۔ اور اس طرح ایک رات کی جگہ دس راتیں متواتر قرآن کریم کے نزول کی نسبت اور اس کی برکات کی نسبت سے غور کرنے کا موقعہ ملتا رہے گا اور ان راتوں میں سے ہر رات کو لیلۃ القدر کا خیال آتا رہے گا اور لیلۃ القدر کا خیال آتے ہی قرآن کریم کے نزول اور اُس کی برکات کی طرف اُس کا ذہن چلا جائے گا اور یہ ایک بہت بڑی برکت اور روحانی فائدہ والی بات ہے

آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کو مقرر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ خدمت کے ایام کا آخری وقت ہی انعام کا وقت ہوتا ہے۔

اس وقت تک میں نے یہ بتایا ہے کہ احادیث میں مذکورہ لیلۃ القدر بھی ایک جہت سے اُسی لیلۃ القدر سے تعلق رکھتی ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اور یہ کہ ان معنوں کے رُو سے اصل لیلۃ القدر وہی رات ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اور صرف اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اور اس عہد کو تازہ کرنے کے لئے جو نزولِ قرآن کریم کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے اس اُمت سے باندھا تھا اُس نے لیلۃ القدر مقرر کی ہے اور اس فائدہ کو مدنظر رکھ کر کہ اُمت کے کمزور لوگ بھی کم سے کم دس راتیں تو خوب عبادت کر لیں اُس نے رمضان کی آخری دس راتوں میں اسے چھپا دیا ہے اور معین رات مقرر نہیں کی۔ تاکہ اس کا قیام صرف ایک رسم ہو کر نہ رہ جائے جسے اسلام بہت ناپسند کرتا ہے۔ اب جو چاہے رمضان کی آخری راتوں میں اسے تلاش کر سکتا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جو اللہ تعالےٰ کے فضل کو دس راتوں میں تلاش کرے گا اُسے دین کے ساتھ پہلے سے زیادہ لگاؤ ہو جائے گا اور اُس کے دل میں دین کی محبت پیدا ہو جائے گی اور اُس سے یہ اُمید کی جا سکے گی کہ پہلی غلطیوں کو چھوڑ کر پورے طور پر خدا تعالےٰ کی طرف جھک جائے اور کسی وقت اس کی ہر رات ہی لیلۃ القدر ہو جائے گی۔

انفرادی لیلۃ القدر

عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے بزرگانِ دین سے جو یہ روایت ثابت ہے کہ لیلۃ القدر سال میں سے کسی رات کو ظاہر ہو سکتی ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ انفرادی لیلۃ القدر سال میں کسی وقت آ سکتی ہے ورنہ اُن کا یہ منشاء نہیں کہ رمضان میں یہ لیلۃ القدر نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود اُن کی دوسری روایات میں رمضان کے آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کے ظاہر ہونے کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ وہ روایات اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔ ہم یہ تو خیال بھی نہیں کر سکتے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کو رد کر دیا صحابہؓ سے اس بات کی ہرگز امید نہیں کی جا سکتی ہے۔ پس اُن کے اس قول کے کہ سال کے کسی حصہ میں بھی لیلۃ القدر آ سکتی ہے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ فردی لیلۃ القدر سال کی کسی رات کو آ سکتی ہے نہ یہ کہ جماعتی لیلۃ القدر جسے وہ خود بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت سے رمضان کی آخری راتوں میں قرار دے چکے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر مومن پر روحانیت کی بلوغت کا زمانہ آتا ہے آخر ہر شخص پیدائش کے وقت سے تو روحانیت میں کامل نہیں ہوتا۔ اکثر لوگوں پر جسمانی بلوغت کے بعد ہی کسی وقت روحانی بلوغت کا زمانہ آتا ہے۔ بعض کو جوانی میں بعض کو ادھیڑ عمر میں اور بعض کو بڑھاپے میں اور بعض کو بڑھاپے کے آخر میں۔ جس رات بھی کسی مومن کی نسبت اللہ تعالےٰ کا یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اب سے یہ ہمارا قطعی جنتی بندہ ہے وہی اس کی لیلۃ القدر ہے اور اُس کے لئے رمضان کی کوئی شرط نہیں سارے سال میں کسی وقت کسی کی لیلۃ القدر آ سکتی ہے۔ اللہ تعالےٰ رحمٰن رحیم ہے اور اُس کی یہ دونوں صفات ہر وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں پس ضروری تھا کہ اللہ تعالےٰ کے خاص فضلوں کے معین اوقات کے علاوہ کوئی اور سلسلہ بھی اُس کے فضلوں کا ہوتا جو ہر وقت اور ہر لحظہ ظاہر ہوتا رہتا اور یہ انفرادی فضلوں کا ہی سلسلہ ہے کسی مومن بندہ کی لیلۃ القدر کسی دن آ جاتی ہے کسی کی کسی دن اور اس طرح روزانہ سارے سال میں اللہ تعالیٰ کے فضل اُس کے نیک بندوں پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر سال میں ایک دفعہ قرآن کریم کے نزول کی یاد میں ساری اُمت پر ایک ہی رات رمضان کے آخری عشرہ میں اجتماعی طور پر اللہ تعالےٰ کا فضل نازل ہوتا ہے اور وہ لیلۃ القدر کبریٰ ہوتی ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بیشک آخری عشرہ رمضان

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ

اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ (یہ عظیم الشان) تقدیر والی رات کیا شئے ہے ۵۳ (یہ عظیم الشان) تقدیر والی رات تو

خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝

ہزار مہینے سے بھی بہتر ہے ۵۴

میں لیلۃ القدر کا مقرر کرنا ایک احسن طریقہ مومنوں کو انعام دینے اور اُن کی عبادت کی روح کے قائم رکھنے کا تھا لیکن پھر یہ کیوں ہُوا کہ کبھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری عشرہ میں اس کی تلاش کرو اور کبھی فرمایا کہ ۲۱ کو ہوتی ہے کبھی ۲۳ کو اور کبھی کئی طاق راتوں کا ذکر کر دیا۔ آپ نے تعیین کرنے کی کیوں کوشش کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل قانون تو لیلۃ القدر کے بارہ میں یہی ہے کہ آخری عشرہ میں بدل بدل کر آتی ہے لیکن مومن کو اللہ تعالےٰ نے اس کا خاص علم دے دیتا ہے چنانچہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ علم دیا گیا کہ لیلۃ القدر کی رات کو بارش ہوگی اور آپ کی مسجد ٹپک پڑے گی چنانچہ رمضان کی ۲۱ کو ایسا ہوگیا۔ جن صحابہ کو اس کا علم ہُوا انہوں نے سمجھا کہ شاید لیلۃ القدر ہوتی ہی ۲۱ کو ہے۔ حالانکہ اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ اس رمضان میں لیلۃ القدر ۲۱ کو تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر آپ کو لیلۃ القدر بتائی گئی اور بھول گئی تو آپ نے آخری طاق راتوں میں سے کوئی اور خصوصاً ۲۷ کو لیلۃ القدر قرار دیا۔ پس جہاں تک آخری عشرہ میں لیلۃ القدر ہونے کا سوال ہے یہ ایک قانون ہے اور جہاں تک اس عشرہ کی کسی خاص رات کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا صحابہ یا دوسرے ائمۂ اُمّت کا اشارہ ہے وہ خاص خاص رمضانوں میں اُن کے آسمانی یا وجدانی علم کا نتیجہ ہے یہ قانون نہیں بتایا گیا کہ ہمیشہ اسی رات کو لیلۃ القدر ہُوا کرے گی۔

ایسے موقعہ پر طبعاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسی علامت ہے جس سے معلوم ہوسکے کہ فلاں رات اس رمضان میں لیلۃ القدر تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض احادیث میں یہ آتا ہے کہ کچھ بجلی چمکتی ہے ہوا ہوتی ہے اور ترشح ہوتا ہے ایک نور آسمان کی طرف جاتا یا آتا نظر آتا ہے مگر اوّل الذکر علامات ضروری نہیں گو اکثر ایسا تجربہ کیا گیا ہے کہ ایسا ہوتا ہے اور آخری علامت نور دیکھنے کی صلحاء کے تجربہ میں آئی ہے یہ ایک کشفی نظارہ ہے ظاہری علامت نہیں جسے ہر ایک شخص دیکھ سکے۔ خود میں نے بھی اس کا تجربہ کیا ہے لیکن جو کچھ میں نے دیکھا ہے دوسروں نے نہیں دیکھا۔

لیلۃ القدر کی ایک علامت

اصل طریقہ یہی ہے کہ مومن اللہ تعالےٰ سے سارے رمضان میں دعائیں کرتا رہے اور اخلاص سے روزے رکھے پھر اللہ تعالےٰ کسی نہ کسی رنگ میں اس پر لیلۃ القدر کا اظہار کر دیتا ہے۔

۵۳ تفسیر۔ تجھے کس نے بتایا ہے کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہاں جو منشاء ہے اور جس بات کی طرف اشارہ کرنا ہمارے مدنظر ہے عقلی طور پر تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے یعنی انسانی ذہن تو لیلۃ سے زیادہ سے زیادہ تاریکی کی طرف جاتا ہے مگر ہماری مراد اس لیلۃ القدر سے ہے جو بے انتہاء برکتوں پر مشتمل ہے اور جس کی عظمت کی طرف عام طور پر انسانی ذہن جا ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ کہہ کر معنوں کو بہت وسعت دے دی کیونکہ اس کے معنے میں حدِ قیاس و فہم سے بالا۔

۵۴ حل لغات۔ شَهْرٌ کے معنے عربی زبان میں اظہار کے بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ شَهَرَ کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔ نیز شَهْر قمر کو بھی کہتے ہیں جب وہ اپنے کمال کے قریب ہو۔ اسی طرح شَهْر مہینہ کو بھی کہتے ہیں اور شَهْر کے معنے عالم کے بھی ہیں کیونکہ وہ مشہور ہوتا ہے۔

شَهْرٌ کے معنے

تفسیر۔ فرماتا ہے ہم جس لیلۃ القدر کا ذکر کر رہے ہیں

گو اُس کا نام لَیل ہے مگر درحقیقت وہ خَیْرٌ ہزار شہر سے بھی زیادہ اچھی ہے

شَھْر کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے اظہار کے بھی ہوتے ہیں اور شَھْر قمر کو بھی کہتے ہیں جب وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے اور شَھْر مہینہ کو بھی کہتے ہیں اور اس کے معنے مشہور عالِم عالِم کے بھی ہیں۔ پس خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ کے ایک یہ معنے ہوئے کہ یہ لیلۃ القدر ہزار اظہار سے بھی بہتر ہے۔ لَیل کے متعلق یہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ تاریکی پیدا کر دیتی اور اشیاء کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا دیتی ہے مگر فرماتا ہے کہ جس رات کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ ایک لحاظ سے تو رات ہے کہ اس میں ہزاروں قسم کے

خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ کے پہلے معنے

فتنے پائے جاتے ہیں اور بے دینی اور الحاد کا زور ہے لیکن اس کے ساتھ اس رات اللہ تعالیٰ کے جلال کے اظہار اور انسانی فطرۃ کی پوشیدہ نیکیوں کے نمود کے بھی اتنے سامان پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ اپنے وقت پر دنیا کو محو حیرت کر دیں گے اس لئے اس رات کی مخفی طاقتوں پر ہزار اظہار او رنمود قربان ہے کیونکہ جس اظہار اور جس نمود کی بنیاد اس میں رکھی جا رہی ہے اس کے مقابلہ پر کوئی اور اظہار اور نمود نہیں ٹھہر سکتا۔ پس گو یہ رات ہے مگر نیکی کی عظیم الشان بنیاد رکھے جانے کی وجہ سے ہزاروں ترقیوں کا زمانہ اس پر قربان ہے۔

دوسرے معنے

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ یہ مومنوں کے لئے رات کا زمانہ ہے کہ اُنہیں ہر قسم کی تکالیف دی جاتی ہیں۔ مارا جاتا ہے، پیٹا جاتا ہے، قتل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رات چونکہ قدر کی رات ہے اس لئے اس زمانہ کی تکالیف اور دُکھ آئندہ کے آرام اور سُکھ سے زیادہ قیمتی ہیں۔ آج وہ زمانہ ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے وہ اپنی تمام عزتوں کو کھو بیٹھتا ہے، ہر قسم کے طعن و تشنیع کا ہدف بن جاتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس جیسا بُرا شخص اور کوئی نہیں۔ مگر اس ذلت میں جو مزا ہے۔

اِن قربانیوں میں جو راحت ہے اور اِن تکالیف میں جو سرور ہے وہ اُن ہزار عزتوں میں نہیں جو اسلام کی ترقی کے زمانہ میں لوگوں کو حاصل ہوں گی۔ چنانچہ دیکھ لو ابوبکرؓ اپنی قوم میں بڑا نیک نام تھا سارا عرب اُس کی عزت کرتا تھا، اُس کا ادب اور احترام کرتا تھا مگر جب وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مُرید بن گیا تو وہی لوگ جو اُس کی عزت کرتے تھے اُسے گالیاں دینے لگ گئے، اُسے بُرا بھلا کہنے لگے، اُسے مارنے پیٹنے لگے اور کہنے لگے کہ ابوبکرؓ اچھا تھا مگر اب خراب ہو گیا ہے۔ علیؓ بڑا نیک بچہ تھا اُسکا باپ عرب کے سرداروں میں سے تھا مگر جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تو لوگ کہنے لگے وہ واجب القتل ہے۔ اُسکا مقاطعہ کیا گیا اُس کے منہ پر گالیاں دی جاتیں۔ اُسے ذلیل اور رسوا کیا جاتا ہے اور لوگ خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا اچھا کام کیا۔ عمرؓ اپنی مجالس میں بڑی عزت رکھتا، اہلِ عرب کے نسب نامہ کے لئے وہ بہترین مؤرخ سمجھا جاتا، نوجوانی کی حالت میں بڑے بڑے سرداروں کی مجلس میں جاتا تو لوگ اُسے ادب کے مقام پر بٹھاتے، اُس کے ساتھ عزت سے پیش آتے مگر جب وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تو سب لوگ اُسے بُرا بھلا کہنے لگ گئے۔ اُس کی مدح سرائی کی بجائے عیب چینی کی جاتی اور اُس کو دُکھ دیکر خوشی محسوس کی جاتی۔ عبد اللہ بن سلامؓ ایمان لائے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہود کا امتحان لینے کے لئے اُن کو جمع کیا اور فرمایا بتاؤ عبد اللہ بن سلام کیسا ہے؟ انہوں نے کہا عبد اللہ بن سلام کا کیا کہنا ہے۔ نیکوں کا بیٹا، اچھوں کی اولاد، خود بھی شریف اور باپ دادا بھی شریف اسکی نیکی کی کوئی حد ہے! رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اچھا سُنو! وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی کہنے لگے بڑا خبیث ہے، خبیثوں کا بیٹا تھا اِسی لئے خبیث نکلا۔

غرض فرمایا ہم نے قرآن کریم کو ایک قدر والی رات میں نازل کیا ہے۔ یہ رات لوگوں کی ظاہری عزتوں کو بالکل چھپا دیگی لوگ نیک ہوں گے، معزز ہوں گے، اچھی شہرت رکھنے والے ہوں گے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد اُن کی عزت اور شہرت اور نیک نامی پر رات چھا جائیگی وہ لوگوں کے مطاعن کا ہدف بن جائیں گے اور لوگ کہیں گے

کہ وہ بہت بُرے ہیں مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ تاریک زمانہ اُن کیلئے ذلّت کا موجب ہو گا بلکہ نبی کی خاطر اور اُس کی معیت میں تکالیف اُٹھانا شہرتوں سے اچھا اور زیادہ مبارک ہے۔

اس زمانہ کے بعد شہرتوں کا زمانہ آئے گا۔ لوگ اسلام کی وجہ سے بڑی بڑی شہرتیں پائیں گے، بڑی عزتوں سے دیکھے جائیں گے، بے انتہا دنیا کمائیں گے مگر اُن کی ظاہری عزتیں اور شہرتیں اِن مار کھانے والوں کے مقابل ہیچ ہوں گی چنانچہ دیکھ لو اسلام کے طفیل اور اُس کے حلقۂ اثر میں لوگوں نے کتنی کتنی عزت پائی، کتنا رتبہ پایا دینداروں نے بھی اور دنیاداروں نے بھی۔ مگر وہ اس رات میں پیدا ہونیوالے لوگوں کا بھلا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دین میں امام ابوحنیفہ امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل حضرات سید عبد القادر جیلانی معین الدین چشتی۔ شہاب الدین سہروردی۔ محی الدین ابن عربی نقشبندی۔ امام غزالی نے اپنے زمانہ میں کتنی عزت پائی۔ بادشاہ جوتیاں سامنے رکھنے میں اپنی عزت خیال کرتے تھے یہ عزت اُن کی اسلام ہی کی وجہ سے تھی۔ اس کے مقابل پر ابوبکر عمر۔ عثمان۔ علی بلکہ اُنکے اور ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے زمانے میں ماریں کھائیں گالیاں سُنیں مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اِن بعد کے بزرگوں کی ترقی کا زمانہ سابق بزرگوں کے تاریک زمانہ سے بہتر تھا۔ خدا گواہ ہے کہ اگر ان بزرگوں سے کہا جاتا کہ تمہاری عمر بھر کی شہرت چھین کر ایک گھنٹہ کیلئے تم کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر مار کھانے کے لئے کھڑا کیا جا سکتا ہے تو اُن پر شادی مرگ کی حالت طاری ہو جاتی اور وہ کہتے کہ بخدا اس سے بہتر اور کوئی سودا نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں پر کیا بُرا زمانہ آیا ہے مگر اے سننے والے سُن! کہ یہ بُرا زمانہ تو ضرور ہے تاریکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے مگر یہ تاریک رات لیلۃ القدر ہے۔ جو عزت اس رات میں پیدا ہونے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ عزت ہزار شہرتوں اور عزتوں سے بالا ہے اور آئندہ زمانہ میں بڑی بڑی عزتوں والے لوگ اس تنگی اور دکھ کی رات کے ایک گھنٹہ کو اپنی باعزت زندگیوں کے سو سال پر ترجیح دیں گے۔ اور دیکھ لو ایسا ہی ہُوا قرآن کریم کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ ہم میں سے کس کا دل نہیں کرتا کہ کاش وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر اسلام کی خاطر کفار کی ماریں کھا رہا ہوتا۔ کاش وہ اُنکی سخت سے سخت گالیاں سُنکر مزے لے رہا ہوتا۔ اصدق الصادقین خدا کا یہ فقرہ کیسا سچا ہے کہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔

یہی حال دنیوی لوگوں کا ہوتا ہے۔ نبی کے زمانہ کے لوگ تو تکالیف اور مصائب برداشت کرتے ہیں اور بعد میں آنیوالے اُن کے بوئے ہوئے بیجوں کے پھل کھاتے ہیں۔ بنو عباس اور بنو امیہ اپنے تختوں پر بیٹھ کر کیا کیا بڑائیاں کرتے ہوں گے۔ کس طرح فخر سے کہتے ہوں گے۔ تم جانتے ہو ہم کون ہیں ہم عرب کے سردار ہیں۔ ہمارے فلاں فلاں حقوق ہیں۔ ہمارے مقابلہ میں تم کیا حیثیت رکھتے ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ بنو عباس اور بنو امیہ کو بادشاہت کہاں سے ملی؟ اُن بیجوں سے ملی جو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے بوئے۔ اِن لوگوں نے بیشک اپنی قربانیوں کے پھل نہیں کھائے مگر خدا تعالےٰ کے نزدیک کون بڑا ہے کیا عبد الملک بڑا ہے یا ہارون الرشید بڑا ہے؟ خدا تعالےٰ کے نزدیک یہ لوگ بڑے نہیں بلکہ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہؓ اور زبیرؓ بڑے ہیں بلکہ یہ تو الگ رہے اللہ تعالےٰ کے نزدیک ابوہریرہؓ بڑا ہے جسے بعض دفعہ سات سات وقت تک کا کھانا بھی میسر نہیں آتا تھا بلکہ ابوہریرہؓ تو کیا اُن سے بلالؓ بھی بڑا ہے وہ خواہ غلام تھا مگر اسلام سے پہلے اُس کی پھر بھی کچھ عزت تھی جب وہ اسلام لایا تو اُس کے اعمال اور اُس کی نیکی اور اُس کی خصلتوں پر بھی ایک پردہ پڑ گیا اور لوگوں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا مگر انہی تکالیف نے اُسے وہ رتبہ بخش دیا کہ ہارون الرشید اور عبد الملک کو اگر اُس کے دروازے کی

جاروب کشی کی خدمت دی جاتی تو یہ بادشاہت سے زیادہ اعزاز ہوتا۔

یہ سیدھی بات ہے کہ جو لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے یا کسی اور نبی پر اُن کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی آخر اُن میں کوئی نہ کوئی خوبی پائی جاتی تھی ورنہ جب تک انسان کی فطرت میں نیکی نہ ہو قربانی پر کون تیار ہو سکتا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جب بھی کسی نبی پر لوگ ایمان لاتے ہیں اُن کی نیکیاں لوگوں کو بھول جاتی ہیں اور انکے اخلاق سب نظر انداز کر دئے جاتے ہیں اور وہ دنیا کی نگاہ میں بالکل ذلیل ہو جاتے ہیں۔

ہمارے سلسلہ میں بھی جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے ایک زمانہ میں بادشاہ بھی شامل ہوں گے اور جماعت احمدیہ ترقی کرتے کرتے وہ تمام حاصل کرلے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب اس کے مقابلہ میں بالکل بے حقیقت رہ جائیں گے۔ اُس وقت جماعت احمدیہ کے علماء کو خواہ کتنی بڑی عزت حاصل ہو اگر اُن کے دلوں میں ایمان کا ایک ذرہ بھی پایا جاتا ہو گا تو وہ اپنی ساری عزت اُس ذلت کے مقابلہ میں ہیچ سمجھیں گے جو موجودہ زمانہ میں احمدیت کو قبول کرنے کی وجہ سے ہماری جماعت کو دیکھنی پڑتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر امام ابوحنیفہ۔ امام احمد بن حنبل۔ امام شافعی اور امام مالک وغیرہ سے اُس زمانہ میں جب دنیا میں چاروں طرف اُن کا نام گونج رہا تھا یہ کہا جاتا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم سے یہ ساری عزت لے لی جائے اور تمہیں ابوہریرہؓ کی جگہ کھڑا کر دیا جائے تو وہ بلا توقف یہی جواب دیتے کہ ہمیں منظور ہے حالانکہ ابوہریرہؓ جو بسا اوقات فاقہ کی وجہ سے بیہوش ہو جایا کرتے تھے اور لوگ یہ سمجھ کر کہ انہیں مرگی کا دورہ ہو گیا ہے اُن کے سر پر جوتیاں مارا کرتے۔ غرض فرماتا ہے لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔ ہزار عزتیں جو لوگوں کو آئندہ زمانہ میں حاصل ہوں گی اس ایک لیلۃ پر قربان ہیں۔ ہم بے شک گمنامی کے لحاظ سے اس زمانہ کو لیلۃ قرار دے رہے ہیں مگر یہ لیلہ وہ ہے کہ ہزار ظہور اس ایک گمنامی پر قربان ہوگا۔

(۲) شَهْر کے معنے عالم کے بھی ہیں ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اس لیلۃ القدر میں جو معارف اور علوم کھلے ہیں وہ ہزار عالم سے بہتر ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ زمانہ نبوی میں جو تاریکی اور بے دینی میں ہمارے زمانوں سے بڑھا ہوا تھا قرآن کریم کے ذریعہ سے جو علوم ظاہر ہوئے اور خدا تعالےٰ نے عرفان کے جو دریا اُس وقت بہا دئے اُن کے مقابل پر ہزار عالم بھی تو کچھ بیان نہیں کر سکتا۔ مسیحی لوگ کہا کرتے ہیں کہ قرآن پہلی کتب کی نقل ہے اور میں انہیں جواب میں کہا کرتا ہوں کہ وہ کتب جن کی قرآن نے نقل کی ہے اور خود قرآن بھی جو اُن کی نقل ہے تم سب مسیحی علماء مل کر اس نقل اور جن کتابوں کی وہ نقل ہے ان سب سے استنباط کرکے اب ایک اور مکمل کتاب کیوں نہیں بنا دیتے۔ آخر وہ کتب بھی موجود ہیں قرآن کریم بھی موجود ہے اور اس کے بعد جو علوم لوگوں کے نزدیک نئے نکلے ہیں وہ بھی موجود ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ان لوگوں کے لئے زیادہ موقعہ ہے وہ کیوں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک اور کتاب امور دینیہ اور احکام شرعیہ کے بارہ میں ایسی نہیں بنا دیتے جو قرآن کریم سے افضل ہو۔ اگر وہ ایسا کر دیں تو بغیر کسی اور دلیل کے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر مُنہ سے رطب و یابس باتیں کرتے جانا اور امر ہے اور کچھ کرکے دکھانا اور بات ہے حقیقت یہی ہے کہ اس لیلۃ القدر میں جو علوم اللہ تعالےٰ نے ظاہر کئے اس کے مقابل پر دنیا کے علماء مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتے اور قرآن کریم نے جو یہ کہا کہ ہزار عالم سے بھی وہ لیلۃ القدر اچھی ہے تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ڈیڑھ ہزار اس سے اچھا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ عربوں میں ہزار سے اوپر کوئی ہندسہ نہ ہوتا تھا۔ جب انہوں نے انتہاء کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تھا تو وہ ہزار کا ہندسہ بولتے تھے۔ اس عربی محاورہ کے مطابق قرآن کریم نے ہزار کا لفظ بولا ہے ہو مطلب یہ ہے کہ دنیا کے زیادہ سے زیادہ عالم مل کر بھی وہ علوم بیان نہیں کر سکتے جو اس لیلۃ القدر میں نازل ہونے والے کلام یا نازل ہونے والے نبی نے بیان کئے ہیں یا آئندہ ایسے ہی تاریک زمانوں میں خدا تعالیٰ کے ظہور بیان کرینگے۔

اس مضمون سے مسلمانوں کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جب جب بھی اسلام پر کوئی مصیبت کا زمانہ آئے انہیں علماء ظاہری کی امداد پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ انہیں چاہیئے کہ ایسے تاریک زمانوں میں خدا تعالےٰ کی طرف سے اُترنے والی امداد کی طرف نظر رکھا کریں کہ جو کچھ آسمانی امداد اور ہدایت سے انہیں حاصل ہوگا وہ ظاہری علماء کی مجموعی کوششوں سے حاصل نہ ہو سکے گا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہ زمانہ اسلام کے گذشتہ زمانوں سے زیادہ تاریک ہے بعد زمانہ نبوی ایسا سخت زمانہ اسلام پر کبھی نہیں آیا لیکن مسلمان اس بلاء کے دور کرنے کے لئے انسانوں پر زیادہ نظر رکھتے ہیں بہ نسبت خدا کے۔ خدا تعالےٰ نے ان دنوں میں بھی حسب بشارات قرآنیہ اور حسب وعدہ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ اپنا ایک مامور بھیجا ہے لیکن لوگوں کی اس طرف توجہ نہیں بلکہ خود ساختہ علاجوں کی طرف مائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اُن کی حالت پر رحم فرمائے۔

(۳) تیسرے معنے تیسرے معنے تَشَهَّرَ کے مہینہ کے بھی ہیں۔ ان کے رُو سے لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ زمانہ جس میں قرآن کریم نازل ہوا یا جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نازل ہوئے یا وہ زمانہ جس میں آپ کے بروز کامل نازل ہوں گے ہزار مہینوں سے اچھا ہے۔ یعنی تمام زمانوں سے اچھا ہے کیونکہ میں اُوپر بتا آیا ہوں۔ کہ عربوں میں ہزار کے معنے اَن گنت کے ہوتے تھے کیونکہ اُن کے اندر ہزار سے بڑھ کر کسی گنتی کا رواج نہ تھا۔ جب انہوں نے یہ بتانا ہوتا کہ فلاں چیز تو اَن گنت ہے تو وہ کہتے تھے کہ وہ تو ہزار ہے۔ پس اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم نے کہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یا قرآن کریم کا زمانہ یا اُن کے بروز کا زمانہ ہزار مہینہ سے اچھا ہے یعنی اَن گنت مہینوں سے اچھا ہے کوئی دوسرا زمانہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکیگا خواہ آئندہ کا زمانہ ہو یا گزشتہ زمانہ ہو۔

عربوں کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے جس سے اَلْفِ شَهْرٍ کے معنے خوب روشن ہو جاتے ہیں کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ نے ایک بدوی سے پوچھا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اُس نے کہا۔ ہزار دینار دے دیں۔ بادشاہ نے کہا بس اس سے زیادہ مانگو۔ اس پر وہ بدوی حیرت سے بولا کیا ہزار سے اوپر بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟

چوتھے معنے

(۴) چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہزار سے مراد ہزار ہی کے لئے جائیں۔ یہ معنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ناقص اظلال کے متعلق صحیح اُترتے ہیں کیونکہ آپ نے اپنے ناقص اظلال یا مجدّدوں کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ ہر صدی کے سر پر آئیں گے۔ اور ہزار مہینے کا عرصہ تراسی سال اور چار مہینہ کا ہوتا ہے اور اتنی مدت صدی سے گذر جائے تو صدی کا سر آجاتا ہے پس ہزار کے مہینے لفظاً ہزار کے لے کر اس آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ ہم قرآن اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجدّدوں اور آپ کی تعلیمات کے وجود میں ہر صدی کے سر پر نازل کرتے رہیں گے اور ان مجدّدوں کا زمانہ باقی تراسی سال سے بہتر ہوگا۔ یعنی اُمت اُن کی نگرانی میں جو برکات حاصل کریگی اُن کی عدم موجودگی میں وہ برکات حاصل نہ کر سکے گی۔

پانچویں معنے

(۵) پانچویں معنے اس کے یہ ہیں کہ اسلام کی تعلیم جس زمانہ میں رائج ہو وہ زمانہ دوسرے سب زمانوں سے مقدم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کے تنزّل اور اُن کے ادبار کو دیکھ کر بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تم جس اسلامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور کہتے ہو کہ اسلامی حکومت دنیا میں مساوات قائم کرتی ہے۔ اسلامی حکومت غرباء کو اُن کے حقوق دلاتی ہے۔ اسلامی حکومت ہر قسم کے جھگڑوں اور مناقشات کا سدّباب کرتی ہے۔ اسلامی حکومت دنیا میں بین الاقوامی صلح کی داغ بیل ڈالتی ہے۔ اسلامی حکومت دولت کو چند محدود ہاتھوں میں نہیں رہنے دیتی۔ اسلامی حکومت غرباء کو آگے بڑھنے کے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ وہ حکومت گئی کہاں؟ اگر تیس سال تک وہ دنیا میں رہی اور پھر اُس کا خاتمہ ہو گیا تو اُس اسلامی حکومت کا فائدہ کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیس سال نہیں اگر وہ ایک رات کے لئے بھی قائم ہو تب بھی وہ

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴿۵﴾

(ہر قسم کے) فرشتے اور (اخلاص کی) رُوح اس (رات) میں اپنے رب کے حکم سے تمام (دینی و دُنیوی) امور کی خرابی کو درست کرنے کیلئے اُترتے ہیں ۵

خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ہے کیونکہ وہ دنیا میں اگر ایک بیج تو بو گئی ہے، ایک نمونہ تو قائم کر گئی ہے اگر اُس کی شکل اب قائم نہیں رہی تو کیا ہُوا۔ جب دنیا میں بیداری پیدا ہوگی وہ مجبور ہوگی کہ حکومت کو اُن بنیادوں پر قائم کرے جو اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے کھڑی کی تھیں۔ اگر یہ نمونہ دنیا میں قائم نہ ہو چکا ہوتا تو دنیا اپنی ترقی کے لئے کیا کر سکتی تھی۔ وہ اندھیروں میں بھٹکتی پھرتی اور اپنی مشکلات کے حل کے لئے کوئی راستہ نہ پاتی۔ اب بے شک دنیا میں اسلامی حکومت نہیں مگر اسلامی حکومت کا ایک نقشہ تو اُس کے سامنے ہے جب کبھی دنیا کو اپنی حالت بدلنے کا فکر ہوگا۔ جب کبھی تبدیلی کا احساس رونما ہوگا لوگوں کے سامنے ایک نمونہ موجود ہوگا۔ وہ کہیں گے آؤ ہم اُس اسلامی حکومت کی نقل کریں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے قائم کی گئی تھی۔ اس طرح پھر اس نمونہ کے ذریعہ دنیا میں روشنی نمودار ہوگی اور اُس کی مشکلات کا خاتمہ ہوگا۔ پس اللہ فرماتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد مسلمانوں میں خرابی پیدا ہو جانے سے اس رات کی قدر کم نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ ہزار مہینوں میں چونکہ تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں اس لئے لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کے یہ معنے ہوئے کہ تم اس زمانہ کا کیا ذکر کرتے ہو یہ زمانہ تو تیس ہزار زمانوں سے بڑھ کر ہے۔ اگر بعد میں تاریکی کے تیس ہزار دور بھی آجائیں تب بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بے قیمت قرار نہیں دیا جا سکتا تب بھی یہی کہا جائے گا کہ وہ زمانہ آئندہ آنے والے سب زمانوں سے بڑھ کر تھا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں اسلامی حکومت کا وہ ڈھانچہ قائم کر دیا گیا تھا جو قیامت تک آنے والے لوگوں کی صحیح راہنمائی کرنے والا اور اُن کی مشکلات کو پورے طور پر دُور کرنے والا ہے

جو معنے اوپر کئے گئے ہیں اُن کے رُو سے لیلۃ القدر سے زمانۂ نبوت کی تو تشریح ہو جاتی ہے مگر یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر لیلۃ القدر سے اشارہ معروف لیلۃ القدر سے ہے تو پھر اس آیت کے کیا معنے ہوئے کہ لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے اچھی ہے کیونکہ ہزار مہینوں میں تو تراسی ۸۳ اَور لیلۃ القدریں آجائیں گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لیلۃ القدر آتی تو ہر سال ہے مگر ہر شخص کو وہ رات میسر تو نہیں آجاتی۔ جو لوگ سچے تقویٰ اور سچی نیکی سے خدا تعالےٰ کی عبادت کرتے ہیں اُنہیں خاص توجہ اور خاص خشوع و خضوع کی حالت میں وہ میسر آتی ہے۔ یعنی گو اس کی عام برکات تو عام مسلمانوں کو ہر سال ہی مل جاتی ہیں لیکن اس کا کامل ظہور جبکہ انسان کو یہ معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ آج لیلۃ القدر ہے خاص خاص آدمیوں کو اور کبھی کبھی ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ تجربہ درمیانہ درجہ کے مومنوں کو اپنی عمر میں کبھی ایک دفعہ یا دو دفعہ نصیب ہوتا ہے پس اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس شخص کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں لیلۃ القدر مل جائے اُسے سمجھنا چاہیئے کہ اُس کی ساری عمر کامیاب ہو گئی۔ اور عمر کا اندازہ تراسی سال لگا کر بتایا ہے کہ ایسے شخص کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ رات اُس کی باقی عمر سے افضل ہے اور اِسی رات کی خاطر اُس کی زندگی گذری ہے اور یہ رات اُس کی زندگی کا نچوڑ ہے۔

۵ تفسیر۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا میں اللہ تعالےٰ ایک زائد بات یہ بتاتا ہے کہ اُس کی طرف سے صرف کلام نہیں اُترتا بلکہ ملائکہ اور روح دونوں کا اس کے ساتھ نزول ہوتا ہے۔ روح کے معنے کلام کے بھی ہوتے ہیں اور روح کلام الٰہی لانے والے فرشتے کو بھی کہتے ہیں۔ گویا ملائکہ سے مراد عام فرشتے ہیں اور روح سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کلام الٰہی لانے والے ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ پہلے الٰہی کلام اور اُس کے نازل ہونے کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے یہاں روح سے کلام الٰہی

لانے والے فرشتے مراد نہیں ہوسکتے بلکہ اس سے کچھ اور مراد ہے جیساکہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا.

فرماتا ہے ہماری سُنّت یہ ہے کہ جب کسی مامور پر ہم اپنا کلام نازل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اپنے ملائکہ کو بھی زمین پر نازل کر دیتے ہیں۔ یہاں ملائکہ سے وہی فرشتے مراد ہیں جن کو آدم کے وقت سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اللہ تعالےٰ بتاتا ہے کہ ہم نے صرف اپنا کلام محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں کیا بلکہ ملائکہ کی فوج بھی اُس کی تائید کے لئے زمین پر نازل کر دی ہے یا آئندہ زمانہ میں قرآن کریم کی خدمت اور اسلام کے احیاء کے لئے جو مامورین آئیں گے . . . . وہ اکیلے نہیں آئیں گے بلکہ اللہ تعالےٰ کے فرشتے اُن کی تائید اور نصرت کے لئے اور اُن کے کام کو چلانے کے لئے ہمیشہ آسمان سے اُترتے رہیں گے پس مت سمجھو کہ اپنی تدابیر سے تم ہمارے مامورین کو مغلوب کر لوگے تم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ایسا کر سکو کیونکہ ملائکہ اُن کے ساتھ ہوتے ہیں اور اُن کا مقابلہ کرنے کی کسی انسان میں طاقت نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو بھیجا تو ساتھ ہی فرشتوں کو حکم دے دیا کہ جاؤ اور اس کو سجدہ کرو جس کے معنے یہ ہیں کہ فرشتوں کے ماتحت جس قدر چیزیں تھیں وہ آدمؑ کے تابع کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح جب بھی خدا تعالےٰ کسی مامور کو مبعوث فرماتا ہے فرشتوں کا لشکر اُس کی تائید میں اُتار دیتا ہے اور اُنہیں حکم دیتا ہے کہ جاؤ اور زمین میں ایسے تغیرات پیدا کر دو جو ہمارے مامور کی ترقی کے لئے ممد ہوں پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہم اپنے مامور کی تائید کے لئے صرف فرشتے ہی آسمان سے نازل نہیں کرتے بلکہ روح بھی نازل کرتے ہیں یہاں رُوح سے مراد وہ روحانیت اور نئی زندگی ہے جو اہلِ عالم کے قلوب میں پھونکی جاتی ہے فرماتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے لوگوں میں روح نہیں تھی وہ بظاہر زندہ نظر آتے تھے مگر مُردوں سے بدتر تھے۔ نہ اُن میں قوتِ فاعلی تھی نہ اُن میں ترقی کا احساس تھا نہ اُن میں شرافت اور انسانیت کا کوئی جذبہ پایا جاتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ملائکہ کی تحریک کے ذریعہ سے انسان کی خوابیدہ فطرت کو بیدار کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف مردہ انسانوں میں زندگی کی رُوح پھونکنی شروع کر دی آخر نتیجہ یہ ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مردہ زندہ ہوگئے، بے جان لاشے چلنے پھرنے لگے۔ صدیوں سے محکوم اور مغلوب قوم کے افراد دنیا کے فاتح اور حکمران بن گئے۔ عرب جس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں تھی، جسے متمدن اور مہذب ممالک کی نگاہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں تھی اُس نے جس رنگ میں اسلام پر ایمان لانے کے بعد ترقی کی ہے اُسے دیکھکر حیرت آتی ہے۔ چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے اُن میں بیداری پیدا ہوگئی تھی اور اُن کی مردہ رگوں میں بھی زندگی کا خون دوڑنے لگا تھا اس لئے وہ دنیا میں ایسے عظیم الشان تغیرات پیدا کرنے کا موجب بن گئے جنہوں نے اُکی کایا پلٹ دی۔ اسی طرح فرماتا ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جب کلام الٰہی نازل ہوگا ہمیشہ اُس کے ساتھ ملائکہ اُترتے رہیں گے جو قلوب میں ایسی روحانیت، ایسی بیداری، ایسی قربانی اور ایسا اخلاص پیدا کریں گے کہ دنیا اُسے دیکھکر محوِ حیرت رہ جائے گی۔ زندگی کی ایک نئی روح لوگوں میں پیدا ہوجائے گی اور وہ اپنے ایمان کے نہایت اعلیٰ نمونے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اس زمانہ میں بھی جیساکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے ایسا ہی ہوگا یہاں تک کہ وہ مسلمان جو کثیر ہونے کے باوجود قلیل ہیں، عالم ہونے کے باوجود جاہل ہیں، زندہ ہونے کے باوجود مُردہ ہیں اُن میں بھی ایک نئی رُوح ڈال دی جائے گی۔ یہی رُوح ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح ناصری مُردوں میں پھونکا کرتے تھے اور یہی روح ہے جس کی طرف قرآن کریم میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال ع) اے ایمان لو! تم خدا اور اُس کے رسول کے احکام پر عمل کیا کرو جب وہ تمہیں اس غرض کے لئے بلاتا ہے کہ تمہیں زندہ کرے یعنی تم میں زندگی کی ایک نئی روح پیدا کر دے۔ غرض فرماتا ہے اِس زمانہ میں ایک طرف

۲۱۱ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ میں رُوح سے مراد روحانیت

ملائکہ اُتریں گے تاکہ وہ دنیا میں ایسے تغیرات پیدا کریں جو
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تائید میں ہوں۔ اور
دوسری طرف اُن تغیرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے
ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں
روح ڈالیں گے تاکہ اِدھر دنیا میں تغیرات ہوں اور اُدھر وہ
دنیا پر قبضہ کر لیں۔ یہی حال آئندہ بھی ہوگا یعنی ملائکہ بھی
اُتریں گے اور تقدیر خاص بھی نازل ہوگی اور اس طرح مومنوں
کے اندر ایک نئی بیداری اور نئی زندگی، نیا جوش اور نیا
عزم پیدا کر دیا جائے گا۔

مَیں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میرے اردگرد
ایک بہت بڑا ہجوم ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مَیں
اُس کے سامنے تقریر کرتا ہوں اور لوگوں سے مخاطب ہو کر
کہتا ہوں اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی نہیں
ہیں تو مجھے کوئی ایک ہی غیر نبی ایسا بتا دو جو اپنے بعد علماء
کی اس قسم کی جماعت پیدا کر گیا ہو جن کو خدا تعالیٰ کی طرف
سے علم لدنی حاصل ہوتا ہو اور جو اُس کے کلام کو سمجھانے
والے ہوں۔ مَیں رؤیا کی حالت میں اس خصوصیت پر زور دیتا
ہوں اور کہتا ہوں یہ نبی ہی کی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنے بعد
ایسی جماعت قائم کر دیتا ہے جس میں نئی زندگی اور نئی روئیدگی
کی طاقت ہوتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھ کر اور اُس
کے کلام کے علوم کو سیکھ کر دنیا میں پھیلاتی اور انکی اشاعت
کرتی ہے (الفضل ۹ مارچ ۱۹۴۵ء) یہی بات اللہ تعالیٰ نے
اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ جب کوئی نبی دنیا میں آتا ہے
وہ اپنی جماعت میں ایک ایسی روح پیدا کر دیتا ہے جس کی
مثال دوسروں میں نہیں ملتی۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے دو معنے

حضرت مسیح موعودؑ کی نبوت کے متعلق ایک دلیل

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کے دو معنے

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کے دو معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ وہ
باذنِ الٰہی کو لے کر اُترتے ہیں اور یہ بھی کہ اُن کا اُترنا اذنِ الٰہی
سے ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں باء کا تعلق تَنَزَّلُ کے ساتھ ہوگا
یعنی تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
اور معنے یہ ہوں گے کہ وہ اذنِ الٰہی کو لے کر اُترتے ہیں یعنی
کلامِ الٰہی کی تائید کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے لوگوں کی طرف
خدا تعالیٰ کا حکم لاتے ہیں۔ دوسری صورت میں یہ جملہ حال ہوگا
اور مراد یہ ہوگی کہ اُن کا نزول اذنِ الٰہی سے ہوتا ہے یعنی اس
قسم کا تغیر بغیر اذنِ الٰہی کے نہیں ہوتا جب خدا تعالیٰ چاہتا
ہے تب پیدا ہوتا ہے۔ علماء کا یہ کام نہیں کہ جب قوم بے جان
ہو جائے اور اُس میں سے زندگی کی رُوح بالکل نکل جائے تو وہ
دوبارہ اُس کو زندہ کر سکیں۔ ملائکہ بھی اور روح بھی ہمیشہ
خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اُس کے حکم سے آتے ہیں
اس لئے جب بھی مذہبی قومی احیاء ہوگا خدا تعالیٰ کی طرف
سے ہوگا انسانی تدبیروں سے مذہب کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے معنے ہیں مِنْ اَجْلِ كُلِّ اَمْرٍ
اَوْ لِكُلِّ اَمْرٍ۔ یعنی ہر امر کی خاطر۔ یا اس کے معنے ہیں
بِكُلِّ اَمْرٍ ہر امر کو ساتھ لے کر اُترتے ہیں

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ ہر امر جو اسلام
کی ترقی کے لئے ضروری ہوگا اُس کو پورا کرنے اور ہر ایک روک
جو اسلام کی ترقی میں حائل ہوگی اُس کو دُور کرنے کے لئے آسمان
سے فرشتے نازل ہوں گے اور وہ کام جو بظاہر ناممکن نظر آتا
ہوگا اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُسے سرانجام دے دیگا لیکن
اس آیت کے ایک اور بھی معنے ہیں اور وہ یہ کہ وہ زمانہ گذر گیا
جب ناقص اور جزوی شریعتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا
کرتی تھیں۔ اب وہ زمانہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان
کی ہدایت کے لئے وہ کامل شریعت نازل کر دی ہے جو تمام ضروری
امور پر حاوی ہے۔ اس طرح ابتدائے زمانہ میں ہی قرآن کریم سے
کامل ہونے کا دعویٰ کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ وہ تمام ضروری
علوم جو انسان کی ترقی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے
اُن کو پوری تفصیل کے ساتھ قرآن کریم میں بیان کر دیا ہے۔ تم
اس شریعت کے بعد یہ نہیں کہہ سکو گے کہ بنی نوع انسان کی فلاں
ضرورت پوری ہونے سے رہ گئی یا فلاں مسئلہ جس کا حل ضروری
تھا اُس کو اللہ تعالیٰ نے حل نہیں کیا۔ شریعت اپنے کمال پر
پہنچ گئی ہے اور ہر ضروری امر جس کا انسان کی اصلاح اور

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

ع ۵ ۲۲

(پھر فرشتوں کے اُترنے کے بعد تو) سلامتی (ہی سلامتی ہوتی) ہے (اور) یہ (حال) صبح کے طلوع ہونے تک (رہتا) ہے ۝

روحانی ترقی کے ساتھ تعلق تھا اُسے اس کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

اگر مجدّدین پر اس پیشگوئی کو چسپاں کیا جائے تو پھر مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کا استعمال ایسا ہی ہوگا جیسے ملکۂ سبا کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (النمل ع۲) کہ اُس کو سب ایسی چیزیں دی گئی تھیں جنکی اُسکو ضرورت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ مجدّدین کے کام کا حلقہ محدود ہوتا ہے اور وہ محض اپنے علاقہ یا اپنی قوم یا اپنے ملک کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لئے آتے ہیں اور اُس وقت آتے ہیں جب خرابی وسیع اور شدید نہیں ہوتی۔ پس اُن کا دائرۂ عمل ایسا وسیع نہیں ہوتا کہ ساری دنیا کی اصلاح اُن کے ذمہ ہو یا ہر قسم کی اصلاح اُن کے ذمہ ہو۔ پس مجدّدین پر جب اس پیشگوئی کو چسپاں کیا جائیگا تو مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے معنے سب اُمور کے نہیں ہونگے بلکہ سب وقتی ضرورت کے اُمور کے ہوں گے یعنی جس جس خرابی کی اصلاح کے لئے انہیں ملائکہ کی مدد کی ضرورت ہو گی اُن خرابیوں کی اصلاح کے لئے ملائکہ نازل کر دئے جائیں گے یا اسلام کی ترقی کیلئے جن امور کی اُنہیں ضرورت ہوگی اُن اُمور میں انہیں ملائکہ کی مدد حاصل ہوگی گویا مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے معنے ہوں گے کُل ضروری اُمور۔ لیکن وہ موعود جو بروز کامل کے طور پر ظاہر ہونے تھے چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل بروز ہوں گے اس لئے جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اِس آیت کے یہ معنے تھے کہ قرآنی شریعت کو ہر لحاظ سے کامل کیا جائے گا اِسی طرح اُن کے متعلق اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اُس زمانہ میں قرآن کریم کی ساری خوبیاں مخفی ہو جائینگی تب اللہ تعالےٰ آسمان سے اپنے ملائکہ کو نازل فرمائے گا اور قرآن کریم کی تمام خوبیوں کو دنیا پر دوبارہ ظاہر کریگا اسی صورت میں مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے معنے صرف ضروری امور کے نہیں ہوں گے بلکہ تمام اُمور کے ہوں گے یعنی کوئی امر ایسا نہیں ہوگا جس کے لئے آسمان سے فرشتوں کا نزول نہ ہو۔

۶ حل لغات۔ علماء لُغت لکھتے ہیں کہ یہاں سَلَامٌ۔ مُسَلِّمَةٌ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی سلام بھیجنے والے۔ اُن کے نزدیک اِس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے مومنوں کو یا مومن آپس میں سلام کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سَلَامٌ کا لفظ یہاں سلامتی کے معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ پھر آگے چل کر اور اختلاف ہو جاتا ہے بعض لوگ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ پر پہلی آیت کو ختم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں سَلَامٌ ایک علیحدہ لفظ ہے۔ بعض کے نزدیک سَلَامٌ کو ھِیَ کے ساتھ لگانا چاہیئے یعنی سَلَامٌ ھِیَ۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ سَلَامٌ کا مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سے تعلق ہے یعنی آیت یُوں ہے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلَامٌ۔ اور ھِیَ۔ حَتّٰى کے ساتھ لگے گا اور معنے یہ ہوں گے کہ یہ حالت مطلع الفجر تک رہے گی۔ وہ لوگ جو سَلَامٌ کو بالکل علیحدہ لفظ قرار دیتے ہیں اُن کے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ سَلَامٌ سَلَامٌ یعنی یہ زمانہ سلامتی ہی سلامتی کا ہوتا ہے یا لیلۃ القدر میں خدا تعالےٰ کی طرف سے سلامتی ہی سلامتی نازل ہوتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے ساتھ اس کا تعلق بتاتے ہیں اُن کے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ ہر امر جو اس رات میں فرشتے لاتے ہیں سلامتی کا موجب ہوتا ہے۔ اور جو لوگ ھِیَ کا سَلَامٌ کے ساتھ تعلق بتلاتے ہیں اُن کے نزدیک معنے یہ ہیں کہ فرشتوں کا نزول سلامتی ہی سلامتی ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ کا یہی آخری قول ہے اور درحقیقت یہ سب ہی معنے اس آیت پر چسپاں ہوتے ہیں۔

(حاشیہ: سَلَامٌ ۔ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کے معنے اس لحاظ سے کہ لیلۃ القدر سے مراد مجدّدین کا زمانہ ہے)

تفسیر۔ دیکھو ابھی اسلام شروع ہی ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں یہ اعلان فرما دیا کہ قرآن کریم میں ہماری طرف سے جو تعلیم پیش کی جا رہی ہے اپنے اندر محض سلامتی رکھتی ہے کوئی تمدّنی یا

مائی یا اخلاقی یا روحانی ضرر نہیں جو اس تعلیم پر عمل کرنے والے کو پہنچ سکتا ہو۔ ان معنوں کے رُو سے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ پر جملہ ختم ہوگا اور مفہوم یہ ہوگا کہ اِس وقت ہماری طرف سے فرشتے جو تعلیم لے کر نازل ہو رہے ہیں وہ نہ صرف تمام امور پر مشتمل ہے بلکہ اپنے اندر کامل سلامتی رکھتی ہے۔ ہر قسم کے ضرر سے پاک، ہر قسم کے نقصان سے محفوظ اور ہر قسم کے عیب سے منزّہ ہے اور دنیا یہ طاقت نہیں رکھتی کہ اس تعلیم میں کوئی نقص ثابت کر سکے۔ اور اس صورت میں کہ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ کو الگ جملہ سمجھا جائے آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر نازل ہوتے ہیں اور ادھر دنیا کی ہر تدبیر اور ہر سعی سے اُنہیں سلامتی کا پیام دیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ دو تغیّرات اس وقت دنیا میں پیدا کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ فرشتے اور روحانیت آسمان سے اُترتے ہیں اور ایک یہ کہ قانونِ طبعی اس تحریک کی تائید میں لگ جاتا ہے آسمان سے زمین کا پانی مل جاتا ہے اور نبی کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ اور اگر پہلی آیت کو مِنْ كُلِّ اَمْرٍ تک ختم سمجھا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ملائکہ اور رُوح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر قسم کی شریعت لے کر آتے ہیں اور اس زمانہ میں طلوعِ فجر تک سلامتی ہی سلامتی رہتی ہے یعنی یہ ایام خاص نصرتوں اور فضلوں کے ہوتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے کامل طور پر سلامتی والا ہونے کا دعویٰ

مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے مراد اسلام کا غلبہ

نبی کا زمانہ ایک لحاظ سے دن اور ایک لحاظ سے رات

اور اگر سَلٰمٌ کو دوسرا جملہ اور هِيَ حَتّٰى کو ایک مستقل تیسرا جملہ قرار دیا جائے تو اِن آیات کے یہ معنے ہوں گے کہ ملائکہ اور رُوح ہر قسم کے احکام لے کر اس رات میں اُترتے ہیں اے لوگو یہ زمانہ سلامتی ہی سلامتی کا ہے اور یہ تمام فرشتوں کا اُترنا اور روح کا آنا اور سلامتی کا پھیل جانا طلوعِ فجر تک رہے گا۔ غرض نحوی طور پر جس قدر معنے اِس آیت کے بنتے ہیں وہ سب کے سب اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے کیا مراد ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے مراد وہ وقت ہے جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے اور یہ غلبہ ہمیشہ نبی کی وفات کے وقت ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "الوصیت" میں تحریر فرمایا ہے کہ "اے عزیزو! خدا تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت چلی آئی ہے کہ وہ اپنی دو قدرتیں دکھلاتا ہے تاکہ دشمنوں کی دو جھوٹی خوشیوں کو پامال کرے۔ ایک قدرت تو وہ ہوتی ہے جس کا نبی کے ذریعہ اظہار ہوتا ہے جب وہ اُس راستبازی کا بیج بو دیتا ہے جس کو وہ دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ اور دوسری قدرت وہ ہوتی ہے جس کا اُس کے خلفاء کے ذریعہ تکمیل کے رنگ میں اظہار ہوتا ہے"۔ پس یہاں مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے نبی کی وفات کا زمانہ مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہاری تمام سلامتی اِس بات میں ہے کہ تم اس رات کی عظمت کو پہچانو اور وہ قربانیاں کرو جن کا اس وقت تم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے جب فجر کا طلوع ہو گیا اور نبوت کا زمانہ ختم ہو گیا اُس وقت آسمان کی نعمتیں آسمان پر رہ جائیں گی اور زمین اُن برکات کا حصہ نہیں لے سکے گی جن سے اِس وقت حصہ لے رہی ہے۔

اِس جگہ یہ نکتہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کے زمانہ کو بار بار دن بھی کہا گیا ہے اور نبی کو سورج۔ پھر اُس کے زمانہ کو لیلۃ القدر یعنی رات بھی کہا گیا ہے وہی دن اور وہی رات کس طرح ہُوا۔ سو یاد رہے کہ دو الگ الگ نسبتوں کی بناء پر ایک ہی زمانہ کو دن بھی کہا گیا ہے اور رات بھی۔ نبی کا زمانہ رات ہوتا ہے بوجہ اُس سے پہلی ظلمت کے۔ اور نبی کا زمانہ رات ہوتا ہے بوجہ اس کے کہ جب وہ اُس ظلمت کو دُور کر دیتا ہے تو اُس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے کہا جاتا ہے کہ اب تمہارے جانے کا وقت آگیا۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں کو دور کر دیا تو اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا کے ذریعہ آپ کو وفات کی خبر دی گئی اور بتایا گیا کہ اب

ہم نہیں اپنے پاس بُلانے والے ہیں پس چونکہ نبی اُس زمانہ میں آتا ہے جب چاروں طرف ظلمت چھائی ہوئی ہوتی ہے اور جب وہ اُس ظلمت کو دور کر دیتا اور امن اور ترقی اور کامیابی کا زمانہ آجاتا ہے تو وہ فوت ہو جاتا ہے اس لئے اُس کے زمانہ کو رات قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اُس کا سارا کام رات میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ مشکلات کے زمانہ میں آتا اور مشکلات کا دَور ختم ہوتے ہی اللہ تعالےٰ کے پاس چلا جاتا ہے پس چونکہ ظاہری بڑی ترقی نبی کی وفات کے بعد آتی ہے اور کامیابیوں کا سورج ہمیشہ مطلع الفجر کے بعد نکلتا ہے اس لئے نبی کے زمانہ کو رات کہا جاتا ہے اگلا زمانہ جو مطلع الفجر سے شروع ہوتا ہے اور جس میں الٰہی سلسلہ کو دنیا میں غیر معمولی عروج حاصل ہوتا ہے وہ اُسی وقت آتا ہے جب فجر کا طلوع ہو جاتا ہے یعنی نبی اپنے رب کے پاس جا چکا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک روحانی ترقیات کا سوال ہے نبی کا زمانہ روشنی کا زمانہ ہوتا ہے اور نبی کی وفات کے بعد کا زمانہ تاریکی کا زمانہ ہوتا ہے جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے اُس زمانہ میں آسمان سے نزول وحی کا ایک عجیب سلسلہ شروع ہوتا ہے، برکات و انوار کی بارش ہوتی ہے، معجزات و نشانات کا ظہور ہوتا ہے، روحانیت کی منازل سالوں اور مہینوں کی بجائے دنوں میں طے ہونے لگتی ہیں اور ایمان و اخلاص اور محبت باللہ میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے اس بنا پر اُس زمانہ کو دن کہا جاتا ہے سے روشنی اور نور کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے اور اُس زمانہ کو رات قرار دیا جاتا ہے جس میں نبی موجود نہیں ہوتا۔

غرض زمانہ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر نسبتوں کے فرق کی وجہ سے اُسے رات بھی کہا جاتا ہے اور دن بھی۔ وہ رات ہوتا ہے بوجہ اپنی پہلی ظلمت کے اور بوجہ اس کے کہ نبی کے زمانہ میں دُنیوی ترقیات پوری طرح نہیں ہوتیں۔ کامیابیوں اور ترقیات کا زمانہ نبی کی وفات کے بعد آتا ہے مگر بلحاظ خاص افضالِ الٰہی کے یعنی نزولِ وحی اور نزولِ برکات اور تکمیلِ روحانیت کے اُس کا زمانہ دن کا زمانہ ہوتا ہے اور اُس کے بعد کا زمانہ رات کا زمانہ۔ کیونکہ اُس زمانہ میں دنیا ان برکات سے محروم ہو جاتی ہے جن سے وہ پہلے متمتع ہوا کرتی تھی پس رُوحانی برکات کے لحاظ سے نبی کا زمانہ دن ہوتا ہے اور بعد کا زمانہ رات اور اس وجہ سے کہ اس کی تعلیم کی دنیوی شوکت ابھی پورے طور پر نہیں ظاہر ہوئی ہوتی۔ کہ نبی اٹھا لیا جاتا ہے اُس کا زمانہ رات کا ہوتا ہے کیونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ مطلع الفجر تک نبی اپنی قوم میں رہتا ہے۔ چونکہ کوئی بھی نبی دنیوی انعامات حاصل کرنے کے لئے نہیں آتا اس لئے جب اُس کی قربانیوں کے مادی نتائج نکلنے کا وقت آتا ہے اور وہ بیج اپنا پھل دینے لگتا ہے جو اُس نے بویا ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اُسے فرماتا ہے تم ہمارے پاس آجاؤ اور یہ انعام اُن دوسروں کے لئے رہنے دو جن کی نگاہ سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہے۔ اِسی امر کو مدنظر رکھ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو نجوم قرار دیا ہے کیونکہ نجوم ہمیشہ رات کو ظاہر ہوتے ہیں آپ فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ (تشییدالمبانی) یعنی میرے زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے جو برکات نازل کی ہیں اُن سے حصہ لے کر میرے صحابہ نجوم بن گئے ہیں اب تو دن کا وقت ہے اور سورج اپنی شعاعوں سے دنیا کو منوّر کر رہا ہے لیکن میرے بعد دنیا پر رات کا زمانہ آ جائیگا اُس وقت میرے صحابہ ستارے بن کر لوگوں کی رہنمائی کرینگے اس لئے میرے بعد وہی لوگ کامیاب ہونگے جو رات کی تاریکیوں میں میرے صحابہ کی روشنی حاصل کرینگے۔ اس حدیث میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کو دن قرار دیا ہے اور بعد میں آنیوالے زمانہ کو رات کہا ہے۔ لیکن دوسری طرف جہاں تک ظاہری کامیابیوں اور فتوحات کا تعلق ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ رات سے مشابہت رکھتا تھا اور بعد میں آنے والا زمانہ دن سے مشابہت رکھتا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے اللہ تعالےٰ نے اسلام کو ظاہری رنگ میں غلبہ دینا شروع کر دیا یہاں تک کہ اسلام کو ایسی طاقت حاصل ہو گئی کہ ابوبکرؓ کی آواز جب قیصر سنتا تو وہ اُس کو ردّ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ میں یہ حالت تھی کہ آپؐ کا خط جب اُس کے پاس گیا تو گو اُس پر اثر بھی ہُوا مگر پھر اپنی قوم سے ڈر گیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہُوا۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ کو ابوبکرؓ سے بھی زیادہ رُعب حاصل ہُوا۔ قیصر صرف اُن کی بات کو سُنتا نہیں تھا بلکہ ساتھ ہی وہ ڈرتا بھی تھا کہ اگر میں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو میرے لئے اچھا نہیں ہوگا اور کسرےٰ تو اُس وقت تک بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ عثمانؓ کا زمانہ آیا تو اُنکو بھی ایسا دبدبہ اور رعب حاصل ہُوا کہ چاروں طرف اُن کا نام گونجتا تھا اور ہر شخص سمجھتا تھا کہ مجھے امیرالمومنین کے حکم کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اب جہاں تک دنیوی اعزاز کا سوال ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ عزت حاصل نہیں ہوئی جو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کو حاصل ہوئی مگر پھر بھی یہ لوگ روحانی دنیا کے نجوم تھے شمس محمد رسول صلے اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔

احمدیت کی ترقی حضرت مسیح موعودؑ کی وفات کے بعد

غرض نبی کی وفات کے معاً بعد سے روحانی لحاظ سے رات کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے لیکن جسمانی لحاظ سے نبی کی وفات طلوعِ فجر پر دلالت کرتی ہے اور معاً بعد ہی طلوعِ آفتاب یعنی ظاہری کامیابیوں کا نظارہ نظر آنا شروع ہو جاتا ہے ایسا ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہُوا۔ ایسا ہی مسیح ناصریؑ اور موسٰیؑ کے زمانہ میں ہُوا اور ایسا ہی اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ہُوا۔ آپ کے زمانہ میں جو آخری جلسہ ہُوا اُس میں سات سو آدمی جمع ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے آپ سیر کے لئے باہر تشریف لے گئے تو ریتی چھلہ میں جہاں بڑ کا درخت ہے وہاں لوگوں کی کثرت اور اُن کے اژدحام کو دیکھ کر آپ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے ہمارا کام ختم ہو چکا ہے کیونکہ اب غلبہ اور کامیابی کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں پھر آپ بار بار احمدیت کی ترقی کا ذکر کرتے اور فرماتے اللہ تعالےٰ نے احمدیت کو کس قدر ترقی بخشی ہے اب تو ہمارے جلسہ میں سات سو آدمی شامل ہونے کے لئے آ گئے ہیں یہ اتنی بڑی کامیابی ہے کہ میں سمجھتا ہوں جس کام کے لئے اللہ تعالےٰ نے مجھے بھیجا تھا وہ پورا ہو چکا ہے اب احمدیت کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔

غرض سات سو آدمیوں کے آنے پر آپ اسقدر خوش ہوئے کہ آپ نے سمجھا جس کام کے لئے مجھے کھڑا کیا گیا تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے مگر اب خدا تعالےٰ کے فضل سے یہ حالت ہے کہ صرف درس میں ہی آٹھ آٹھ سو آدمی جمع ہو جاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہیں باہر سے نہیں آتے بلکہ قادیان میں رہنے والے ہیں اور جلسہ سالانہ پر تو خدا تعالےٰ کے فضل سے پچیس تیس ہزار آدمی باہر سے اکٹھا ہو جاتا ہے۔ غرض ہمارا سلسلہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے ترقی پر ترقی کر رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس میں کوئی نہ کوئی شخص بیعت میں شامل نہ ہو۔ ترقی اور عروج اور طاقت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر اس غلبہ کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زمانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے بہتر ہے بے شک ہمیں کامیابیاں زیادہ حاصل ہو رہی ہیں، ترقیات زیادہ حاصل ہو رہی ہیں، غلبہ زیادہ حاصل ہو رہا ہے مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کو یاد کر کے دل تڑپ اُٹھتا ہے اور یہ ساری کامیابیاں بالکل حقیر نظر آنے لگتی ہیں۔

سَلَامٌ کے لفظ پر ایک پرانا نوٹ

میرے قرآن پر ایک چھوٹا سا پرانا نوٹ ہے جو اُن قلبی کیفیات کو خوب ظاہر کرتا ہے جو نبی کا زمانہ دیکھنے والوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ میں نے سَلَامٌ پر نوٹ لکھا ہے:۔

"یعنی اُس رات میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔
آہ مسیح موعود کا وقت ! اُس وقت تھوڑے تھے
مگر امن تھا"

بعد میں اللہ تعالےٰ نے ہمیں بڑی بڑی ترقیات دی ہیں مگر یہ ترقیات اُس زمانہ کا کہاں مقابلہ کر سکتی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تھا۔ بیشک آج دنیوی لحاظ سے جو رتبہ ہم کو حاصل ہے وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل نہیں تھا۔ جتنے لوگ ہماری باتیں ماننے والے موجود ہیں اتنے لوگ تیری ماننے والے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں موجود نہیں تھے جتنا خزانہ ہمارے ہاتھ میں ہے اتنا خزانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اب بعض دفعہ خدا تعالیٰ ایک ایک دن میں پچیس پچیس تیس تیس ہزار روپیہ چندے کا بھجوا دیتا ہے حالانکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں اتنا چندہ سارے سال میں بھی جمع نہیں ہوتا تھا مگر اس تمام ترقی کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زمانہ اُس زمانہ سے بہتر ہے۔

مجھے یاد ہے جب لنگر خانہ کا خرچ بڑھا اور کثرت سے قادیان میں مہمان آنے شروع ہو گئے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خاص طور پر یہ فکر پیدا ہو گیا کہ اب اِن اخراجات کے پورا ہونے کی کیا صورت ہوگی مگر اب یہ حالت ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک ایک احمدی لنگر خانہ کا سارا خرچ دے سکتا ہے۔

جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زلزلہ کے متعلق اپنی پیشگوئیوں کی اشاعت فرمائی تو قادیان میں کثرت سے احمدی دوست آ گئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی دوستوں سمیت باغ میں تشریف لے گئے اور وہاں خیموں میں رہائش شروع کر دی۔ چونکہ اُن دنوں قادیان میں زیادہ کثرت سے مہمان آنے لگ گئے تھے ایک دن آپ نے ہماری والدہ سے فرمایا کہ اب تو روپیہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی میرا خیال ہے کہ کسی سے قرض لے لیا جائے کیونکہ اب اخراجات کیلئے کوئی روپیہ پاس نہیں رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ ظہر کی نماز کیلئے تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو اُس وقت آپ مسکرا رہے تھے۔ واپس آنیکے بعد پہلے آپ کمرہ میں تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلے اور والدہ سے فرمایا کہ انسان باوجود خدا تعالیٰ کے متواتر نشانات دیکھنے کے بعض دفعہ بدظنی سے کام لے لیتا ہے میں نے خیال کیا تھا کہ لنگر کے لئے روپیہ نہیں اب کہیں سے قرض لینا پڑیگا مگر جب میں نماز کیلئے گیا تو ایک شخص جس نے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ آگے بڑھا اور اُس نے ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں دیدی۔ میں نے اُسکی حالت کو دیکھکر سمجھا کہ اِس میں کچھ پیسے ہونگے۔ مگر جب گھر آ کر اُسے کھولا تو اُس میں سے کئی سو روپیہ نکل آیا۔

اب دیکھو وہ روپیہ آج کل کے چندوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ آج اگر کسی کو کہا جائے کہ تمہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کا ایک دن نصیب کیا جاتا ہے بشرطیکہ تم لنگر کا ایک دن کا خرچ دے دو تو وہ کہے گا ایک دن کا خرچ نہیں تم مجھ سے سارے سال کا خرچ لے لو لیکن خدا کیلئے مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کا ایک دن دیکھنے دو۔ مگر آج کسی کو وہ بات کہاں نصیب ہو سکتی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں قربانی کرنے والوں کو نصیب ہوئی۔

افسوس کہ لوگوں کے سامنے قربانی کے مواقع آتے ہیں تو وُہ اُن سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور جب وقت گذر جاتا ہے تو حسرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کاش! ہم نے فائدہ اُٹھایا ہوتا۔ کاش! ہم نے وقت کو ضائع نہ کیا ہوتا۔ اب بھی خدا تعالیٰ نے اُن کے لئے ایک بڑا موقعہ پیدا کیا ہُوا ہے۔

جماعت احمدیہ کا فرض

خدا تعالیٰ کا موعود اُن میں موجود ہے اگر وہ چاہیں تو صحابہ کی سی خدمات کر کے صحابہ کے سے انعامات حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو اس نعمت کی قدر کرتے ہیں۔ ہاں بہت لوگ اسوقت روئیں گے اور آہیں بھریں گے جب وہ زمانہ انکے ہاتھ سے نکل جائیگا۔

غرض انبیاء دنیا میں ایک بیج بونے کیلئے آتے ہیں وہ بیج بظاہر ایسے حالات میں بویا جاتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں وہ ضائع چلا جائیگا مگر اللہ تعالیٰ اپنی قدیم اور ازلی سُنّت کے مطابق اُس بیج کو بڑھاتا اور اپنے سلسلہ کو مُمتد کرتا چلا جاتا ہے۔ اِس دوران میں الٰہی سُنّت کے مطابق قربانی کے کچھ اور مواقع پیدا ہو جاتے ہیں تب وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی محبت رکھتے ہیں اپنی حسرتوں کو پورا کرنے کیلئے آگے بڑھتے اور قربانیوں میں ایک دوسرے سے بڑھکر حصہ لیتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پھر بھی سوئے رہتے ہیں یہانتک کہ وہ زمانہ بھی گذر جاتا ہے اور وہ کفِ افسوس ملنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہ کیا۔ آج لوگ حسرتیں کرتے ہیں کہ ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نہ ملا مگر اس حسرت کے باوجود وہ موجودہ قربانیوں میں پوری طرح حصہ نہیں لے رہے۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی کہ وہ اس زمانہ کو بھی کھو دینگے اور حسرت کرینگے کہ کاش! انہیں مصلح موعود کے زمانہ میں خدمت کا کوئی موقعہ مل جاتا حالانکہ اُن حسرت کرنیوالوں میں بہت لوگ ایسے ہونگے جنہوں نے اس زمانہ کو پایا مگر انکی آنکھیں بند رہیں انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی اور حسرت اور افسوس کے سوا اُن کو اور کچھ حاصل نہ ہُوا ؛

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ

سورۃ بیّنہ ۔ یہ سورۃ مدنی ہے [1]

وَهِيَ ثَمَانِي آيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سُورۃ البینہ مدنی ہے

[1] جمہور مفسرین کے نزدیک یہ سورۃ مدنی ہے ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ مدنی ہے اور ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی ہے کہ یہ سورۃ مکّی ہے۔ ابو حبّہ بدری سے روایت ہے کہ جب سورۃ لَمْ یَکُنْ سب کی سب نازل ہوئی ہے (یعنی یہ اکٹھی نازل ہوئی ہے) تو جبریل نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اللہ تعالٰے نے آپ کو حکم دیا ہے کہ یہ سورۃ ابی بن کعبؓ کو یاد کرا دیں۔ اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابّی بن کعبؓ سے کہا کہ جبریل نے مجھے حکم دیا ہے یعنی خدا تعالٰے کا یہ حکم مجھے پہنچایا ہے کہ میں یہ سورۃ تم کو یاد کرا دوں۔ ابّی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بھی خدا تعالٰی کے حضور میں ذکر آیا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس پر ابّی بن کعبؓ خوشی کے مارے رو پڑے۔ یہ روایت مسند احمد میں اور طبرانی اور ابن مردویہ میں مروی ہے۔ بخاری اور مسلم نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے لیکن بخاری اور مسلم کی روایت میں الفاظ نہیں کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی اُس وقت آپ نے یہ فرمایا۔ دوسرے بخاری اور مسلم کی روایت میں جبریل کا بھی ذکر نہیں۔ صرف اتنا ذکر آتا ہے کہ مجھے اللہ تعالٰی نے حکم دیا ہے کہ میں یہ سورۃ تم کو پڑھا دوں۔ گو بخاری اور مسلم کی روایت میں یہ ذکر نہیں آتا کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی اُس وقت آپ نے ابّی بن کعبؓ سے یہ فرمایا کہ مجھے اللہ تعالٰے نے یہ سورۃ تمہیں یاد کرانے کا حکم دیا ہے مگر چونکہ دوسری روایت میں یہ ذکر آ گیا ہے جو مسند احمد بن حنبل جیسی مستند کتاب نے بھی نقل کی ہے اِس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صحیح روایات کی بناء پر یہ سورۃ مدنی ہی ہے کیونکہ ابی ابن کعبؓ انصاری تھے اور مدینہ میں مسلمان ہوئے پس جو سورۃ اُن کے زمانہ میں نازل ہوئی وہ مدنی ہی ہو سکتی ہے مسیحی مستشرق بھی مانتے ہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے ......

.... چنانچہ ریورنڈ وہیری اس سورۃ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ مدنی ہے اور جرمن مستشرق نولڈکے نے اِسے سورہ بقرہ کے معًا بعد کے زمانہ میں نازل شدہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ ایک لطیفہ بھی بیان کرنے کے قابل ہے۔ ریورنڈ ویری اس سورۃ کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس سورۃ کو مکّی قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر روایت بیان ہو چکی ہے بعض لوگوں سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں کیونکہ اُنہی کی نسبت روایت ہے کہ انہوں نے اسے مکّی قرار دیا۔ ریورنڈ ویری کہتے ہیں کہ ایسا کرنے کی یعنی اُسے مکّی قرار دینے کی اُن کے پاس سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں کہ یہ سورۃ مکّی سورتوں میں شامل کی گئی ہے۔ تعجب ہے ایک طرف تو عیسائی مورخ شیعوں کی ہمنوائی میں قرآن کریم کو بیاضِ عثمانی قرار دیتے ہیں کم سے کم ترتیبِ سُوَر کو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور دوسری طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کو کہ یہ سورۃ مکّی ہے اس بات کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے کہ یہ سورۃ مکّی سورتوں میں رکھی ہوئی ہے حالانکہ اگر یہ قول دوسری یا تیسری صدی کے کسی شخص کا ہوتا تو پھر اُن کے قول کے مطابق یہ کہا جا سکتا تھا کہ اُس نے اس سورۃ کو مکّی سورتوں میں رکھا ہوا دیکھ کر اُسے مکّی قرار دے دیا۔ لیکن یہ قول تو اُس کا ہے جو خلافتِ عثمان سے بہت پہلے سے مسلمان تھیں۔ پس اگر یہ اعتراض

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے - یعنی اہل کتاب اور مشرک (دونوں ہی) کبھی (اپنے کفر سے)

مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۝

باز رہنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس واضح دلیل نہ آ جاتی۔ ۵۲

درست ہے تو اُن کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ ترتیب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی ہے تبھی اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دھوکا کھایا ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی عمر گذاری تھی وہ عثمانؓ کی ترتیب پر دھوکا کھا جاتیں۔ قرآن کریم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نظریے یقیناً عثمانی جمع قرآن سے پہلے قائم ہو چکے تھے پس اگر حضرت عائشہؓ نے اس کے مکی ہونے کا عقیدہ اس لئے قائم کیا کہ یہ مکی سورتوں میں رکھی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ کے ہوش سنبھالنے سے پہلے یہ سورۃ مکی سورتوں میں رکھی جا چکی تھی پس ترتیب قرآن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ثابت ہوئی نہ کہ عیسائی مؤرخین کے مطابق عثمانؓ کی؟

پھر ایک اور لطیفہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ریورنڈ ویری نے آخری سب سورتوں کو مکی قرار دیا ہے اور حضرت عائشہؓ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اس سورۃ کو محض اس لئے مکی کہہ دیا ہے کہ یہ مکی سورتوں میں رکھی ہوئی ہے حالانکہ ریورنڈ ویری کی یہ لاعلمی ہے کہ انہوں نے آخری سب سورتوں کو مکی قرار دیا ہے۔ اس سورۃ کو تو خیر صرف حضرت عائشہ رضؓ نے مکی قرار دیا ہے لیکن اس سورۃ سے اگلی سورۃ کو یعنی سورۂ زلزال کو اکثر لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے اور قرآن کریم کے مروّج مطبوعہ نسخوں میں اس کے اُوپر مدنی ہی لکھا ہوا ہے۔ پھر اس آخری مجموعۂ سُور میں سورۂ والنصر بھی ہے جو نہ صرف بالاتفاق مدنی ہے بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام کی نازل شدہ ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسے غزوۂ خیبر سے واپسی کے وقت کی نازل شدہ قرار دیا ہے اور بعض نے اسے حجۃ الوداع میں منیٰ کے مقام پر نازل شدہ قرار دیا ہے جس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صرف اسّی دن زندہ رہے۔ پس جب اس مجموعہ میں یقیناً مدنی سورتیں موجود ہیں تو سوائے ایک جاہل انسان کے کون شخص حضرت عائشہؓ پر یہ الزام لگا سکتا ہے کہ انہوں نے اس سورۃ کو آخری سورتوں میں رکھے جانے کی وجہ سے مکی قرار دے دیا۔ ہاں اصل واقعہ کا ہمیں انکار نہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ جیسا کہ اکثر صحابہؓ اور تابعین کی روایات سے ثابت ہے اور جمہور مفسرین کا عقیدہ ہے ہمیں صرف اس بات پر اعتراض ہے کہ مسیحی مصنف بغیر دلیل کے تعصب کی بناء پر اسلامی تاریخ پر حملہ کر دیتے ہیں۔

ترتیب اس کا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ پہلی دو سورتوں میں قرآن کریم کے نزول کا ذکر تھا اور اس کی ذاتی خوبیاں بیان کی گئی تھیں اب اس سورۃ میں قرآن کریم کے اُس اثر کو بیان کیا گیا ہے جو غیر اقوام سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ فرمایا کہ اگر یہ قرآن نہ آتا تو اہل کتاب اور غیر اہل کتاب اپنے غلط رویہ سے باز نہ آ سکتے تھے۔ اس سورۃ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام بَیِّنَہ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ آپ قرآن کریم لائے اور اصلاح عالم کے لئے آپ نے قرآن کریم کے نزول کو ضروری قرار دیا۔

۵۲ حل لغات۔ مُنۡفَکِّیۡنَ - اِنۡفَکَّ سے مُنۡفَکِّیۡنَ

اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور اِنۡفَکَّ فَکَّ سے باب انفعال کا صیغہ ہے فَکَّ کے اصل معنے کھولنے یا جدا کرنے کے ہوتے ہیں۔ پس اِنۡفَکَّ کے معنے ہوئے کھل گیا یا جُدا ہو گیا۔

علاوہ ازیں عربی زبان میں اِنْفَکَّ کے مندرجہ ذیل معانی استعمال ہوتے ہیں (۱) کہتے ہیں اِنْفَکَّتْ قَدَمُہٗ : زَالَتْ اُس کا قدم اپنی جگہ سے ہٹ گیا (۲) اِنْفَکَّتْ اِصْبَعُہٗ : اِنْفَرَجَتْ۔ انگلی کھل گئی (۳) اِنْفَکَّ وَرْکُہٗ : زَاغَ عَنْ مَوْضِعِہٖ۔ جوڑ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ (۴) اِنْفَکَّ الشَّیْءُ الْمُشْتَبِکُ : اِنْفَصَلَ۔ جُڑی ہوئی چیز الگ ہوگئی (۵) اِنْفَکَّتِ الْعُقْدَۃُ : اِنْحَلَّتْ۔ گرہ کھل گئی (۶) اِنْفَکَّتِ الرَّقَبَۃُ مِنَ الرِّقِّ: اُعْتِقَتْ گردن کھل گئی یعنی غلام آزاد کر دیا گیا (اقرب) اور جب محاورہ میں مَا انْفَکَّ یَفْعَلُ کَذَا۔ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَا زَالَ وہ کوئی کام کرتا چلا گیا۔ ان معنوں میں مَا انْفَکَّ کَانَ کے اخوات میں شمار ہوتا ہے چونکہ اِنْفَکَّ کے معنے الگ ہو جانے کے ہیں اس لئے جب اس سے پہلے نفی آجائے تو اس کے معنے اثبات کے بن جاتے ہیں اور اس صورت میں وہ کسی چیز کے تسلسل کے ساتھ ہونیکے معنے دیتا ہے (اقرب)

بَیِّنَۃٌ

بَیِّنَۃٌ : بَیِّنٌ کی مؤنث ہے اور ان معنوں کے رُو سے یہ لفظ کسی واضح اور جلی چیز کے معنے دیتا ہے لیکن علاوہ اس کے کہ یہ بَیِّنٌ کی مؤنث ہے اس کے مستقل معنے بھی ہیں اور وہ دلیل اور حجت کے ہیں (اقرب)

قرآنی اصطلاح میں دو قسم کے لوگ اہلِ کتاب اور مشرک

تفسیر۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے تمام بنی نوع انسان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصے کا نام اُس نے اہلِ کتاب رکھا ہے اور دوسرے حصے کا نام اُس نے مشرک رکھا ہے۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق دنیا کا کوئی حصہ ان دو قسموں سے باہر نہیں یا تو بنی نوع انسان اہلِ کتاب میں سے ہوں گے یا بنی نوع انسان مشرکین میں سے ہوں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بظاہر بعض لوگ ایسے بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں جنہیں نہ تو اہلِ کتاب میں سے کہا جا سکتا ہے نہ مشرکوں میں سے۔ جیسے دہریہ ہیں۔ دہریہ بظاہر نہ اہلِ کتاب میں سے نظر آتے ہیں نہ مشرکوں میں سے۔ لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں وہ دونوں میں سے ایک گروہ میں ضرور شامل ہیں اور قرآنی اصطلاح سے نتیجہ نکالتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مشرکوں میں شامل ہیں۔ درحقیقت اس اصطلاح میں ایک لطیف اشارہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم اس بات کا مدعی ہے کہ توحید بغیر الہام کے نہیں آسکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اہلِ کتاب میں سے ہو اور مشرک ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اہلِ کتاب میں سے نہ ہو اور موحّد ہو۔ پس جو اہلِ کتاب میں سے نہیں وہ ضرور مشرک ہے اور جو اہلِ کتاب میں سے ہے وہ یا موحّد ہے یا مشرک ہے۔ کیونکہ توحید نام ہے صفاتِ الٰہیہ کو خدا تعالیٰ کی طرف صحیح طور پر منسوب کرنے کا۔ اور یہ مقام سوائے اہلِ کتاب کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ کی صفات کو صحیح طور پر وہی شخص خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر سکتا ہے جس کی الہامِ الٰہی نے راہنمائی کی ہو یا جسے ایسے الہامِ الٰہی کا علم حاصل ہو۔ ایک دہریہ بظاہر خدا تعالیٰ کا منکر ہے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ وہ صفتِ خلق کو یا قانونِ قدرت کی طرف منسوب کرتا ہے یا اتفاق کی طرف منسوب کرتا ہے اور گو وہ خدا تعالیٰ کا قائل نہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کے ماننے والے کے نزدیک تو اُس نے شرک ہی کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت کسی اور کی طرف منسوب کر دی پس خود دہریہ کے نقطۂ نگاہ سے وہ منکر ہے مگر مذہبی آدمی کے نقطۂ نگاہ سے وہ مشرک ہے کیونکہ اُس نے خدائی صفات کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیا۔ بہرحال قرآن کریم نے دنیا کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک اہلِ کتاب اور دوسرے مشرک۔ جب قرآن کریم اہلِ کتاب اور مشرک کے الفاظ اکٹھے استعمال کرے تو اُس کی اصطلاح کے رُو سے اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ سب غیر مسلم دنیا۔ یہ تمہید میں نے اس لئے اٹھائی ہے کہ اگلا مضمون اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس سورۃ میں ایک بہت بڑے مسئلہ کا حل کیا گیا ہے اور یہ آیت اُس مسئلہ کے بارے میں بطور نص واقعہ ہوئی ہے۔ مسیحی مصنفین ہمیشہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم کا دعویٰ (جہاں تک ایمان کا سوال ہے)

صرف غیر اہل کتاب سے متعلق ہے اور وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہود کی نسبت آتا ہے وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (مائدہ ع۷) جو شخص اُس کلام کے مطابق حکم نہیں دیتا جو خدا تعالیٰ نے اُتارا ہے وہ کافر ہے۔ اور مسیحیوں کی نسبت فرماتا ہے وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ ع۷) ان آیات سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک تورات اور انجیل ابتک قابل عمل ہیں اور جب تورات اور انجیل اب تک قابل عمل ہیں تو معلوم ہوا کہ کم سے کم اہل کتاب کے لئے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ پس وہ کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن کریم کے دعوٰی پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹا ہی ہے اور اگر سچا ہے تو ہمیں ماننے کا پابند نہیں کرتا اور جب ہم اس کو ماننے کے پابند نہیں تو ہمیں اس پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت کیا؟ اس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے یہ آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

اوّل۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (اعراف ع۲۰) یعنی اے نبی تو لوگوں سے کہہ دے میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں

(۲) مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (سبا ع۳) ہم نے تجھے سب لوگوں کے لئے بشیر و نذیر کی حیثیت سے بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

پھر قرآن مجید میں آتا ہے وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام ع۲) یہ قرآن میرے اُوپر اس لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تم کو بھی اور جس شخص تک یہ کلام پہنچے اُس کو بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤں۔

ان آیتوں کا جواب مسیحیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اَلنَّاس سے مراد قرآن کریم میں ہر جگہ مشرکین مکہ ہوتے ہیں اس لئے سب لوگوں سے مراد سب مکہ والے ہیں نہ کہ اہل کتاب۔

۳۱۱ مسیحی مصنفین کا قرآن مجید کو غیر اہل کتاب کے لئے مخصوص کرنا اور اس کی تردید

یہ خیال کہ اَلنَّاس جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے اس سے مراد مکہ کے مشرکین ہوتے ہیں گو غلط ہے لیکن خود بعض مسلمان مفسرین نے ہی پیدا کیا ہے اور یہ خیال عیسائی مصنفین کے دل میں اس قدر گھر کر گیا ہے کہ سورۂ بقرہ ع۳ کی آیت یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ کا ترجمہ سیل نے یُوں کیا ہے۔

"اے مکے والو! اپنے رب کی عبادت کرو"

پس اس خیال کی موجودگی میں جس کو خود بعض مسلمان مفسرین نے قوی کر دیا ہے ہمارے لئے صرف یہ لمبا طریق باقی رہ جاتا ہے کہ ہم پہلے اُن کی یہ غلطی دُور کریں اور یہ ثابت کریں کہ اَلنَّاس میں اہل کتاب بھی شامل ہیں۔

تیسری آیت میں گو مَنْۢ بَلَغَ کے الفاظ ہیں مگر عیسائی پہلی دو آیتوں کے تابع اس کے بھی یہی معنے کر لیتے ہیں کہ موجودہ مکہ والے اور آئندہ زمانہ کے مکہ والے۔

باقی آیات جو اہل کتاب کو ایمان لانے کی طرف بلاتی ہیں مثلاً

(۱) وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (آل عمران ع۱۲) یعنی اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یہ اُن کے لئے بہتر تھا اُن میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر فاسق۔ اسی طرح

(۲) وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُہٗ (ھود ع۲) کہ مختلف گروہوں میں سے جو لوگ اس قرآن کا انکار کرتے ہیں اُن کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اور پھر (۳) قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران ع۲) تو اہل کتاب اور اُمیوں سے کہہ دے کہ کیا تم اسلام لاتے ہو یا نہیں۔ اگر وہ اسلام لے آئیں تو سمجھ لو کہ وہ ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں

تو تیرا کام صرف ہدایت پہنچانا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو خوب دیکھنے والا ہے۔ (۴) قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ (الانعام ع۱۰) تو کہہ دے کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا یہ تو جہانوں کے لئے ایک نصیحت ہے یہ اور اسی قسم کی دوسری آیات جن میں جہانوں کے الفاظ قرآن کریم کیلئے یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اُن کے متعلق مسیحی مبلّغ یہ کہہ دیتے ہیں کہ احزاب کا لفظ خود تمہارے قرآن میں عرب کے قبائل کے متعلق آتا ہے اس لئے احزاب سے کُل دنیا کس طرح مراد لی جا سکتی ہے اور عَالَمِیْن کا لفظ جب حضرت مریمؑ اور بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں کے متعلق آتا ہے تو تم اس کے معنے صرف بنی اسرائیل کے کرتے ہو اگر وہاں عَالَمِیْن کے معنے صرف بنی اسرائیل کے ہو سکتے ہیں تو یہاں عَالَمِیْن کے معنے صرف عرب کے قبائل کے کیوں نہیں ہو سکتے؟ اور جو باقی آیتیں ہیں اُن میں صرف ایمان کے لئے بُلایا گیا ہے ایمان لانا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ اِن آیتوں کے یہ معنے لئے جا سکتے ہیں کہ اگر اہل کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مان لیں تو زیادہ اچھا ہے مگر اہل کتاب کو نہ ماننے کی وجہ سے مجرم تو نہیں قرار دیا گیا۔ گو یہ استدلال مسیحیوں کا کچا بلکہ غلط ہے لیکن ایک لمبا راستہ ہمیں اُن کو منوانے کے لئے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی وہ آیات جو اس بات کی تائید میں ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب دنیا کی طرف رسول ہیں اور قرآن کریم سب دنیا کیلئے کتاب ہے اس کے متعلق بعض شبہات (جو گو غلط ہیں) پیدا کرنے اور مسیحیوں کو اس ٹھوکر میں مبتلا کرنے کے سامان خود مسلمان مفسرین نے کئے ہیں اور بعض شبہات ایسے ہیں جو اپنی نافہمی اور پورا تدبر نہ کرنے کی وجہ سے غیر مسلموں کو اپنے طور پر پیدا ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کو ایمان لانے کی جو دعوت قرآن کریم میں دی گئی ہے اُس کو وہ صرف ایک زائد خیر قرار دیتے ہیں لازمی اور قطعی قرار نہیں دیتے حالانکہ قرآن کریم نے نہ صرف اُن آیات میں جن کو اُوپر درج کیا گیا ہے اہل کتاب کا ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے بلکہ جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا جائے گا صاف اور کھلے الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اہل کتاب کفر میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اب اُن کی نجات کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں اور آپ کی غلامی اختیار کریں۔

قرآن کریم کے بعد جب ہم کتب احادیث کو دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ایسی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں جن سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سب جہان کی طرف مبعوث ہوئے ہیں چنانچہ مسند احمد میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ۔ میں گورے اور کالے سب لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اسی طرح مسند احمد میں عَنْ عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ روایت ہے کہ اَمَّا اَنَا فَاُرْسِلْتُ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ عَامَّةً وَكَانَ مَنْ قَبْلِيْ اِنَّمَا يُرْسَلُ اِلٰى قَوْمِهٖ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری یہ خصوصیت ہے کہ میں تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں اور مجھ سے پہلے جو رسول تھے صرف اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اس حدیث میں بھی بے شک اَلنَّاس کا لفظ ہے اور میں نے اوپر کی آیات پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ عیسائی کہتے ہیں قرآن کریم اَلنَّاس سے مراد ہمیشہ مکہ کے لوگ ہوتے ہیں یہودی اور عیسائی نہیں ہوتے مگر ایک تو یہاں دلیل موجود ہے کہ آپ نے اپنی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ كَانَ مَنْ قَبْلِيْ اِنَّمَا يُرْسَلُ اِلٰى قَوْمِهٖ۔ مجھ سے پہلے جو رسول گذرے ہیں وہ صرف اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے۔ چونکہ یہاں قوم کے مقابلہ میں اَلنَّاس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے اَلنَّاس

کے معنے ساری . . . . دنیا کے ہوں گے ورنہ مکّہ کے لوگ تو آپ کے ہم قوم ہی تھے اور اگر اَلنَّاسُ سے مراد یہاں صرف اہلِ مکّہ ہوتے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہتی کیونکہ جس طرح پہلے انبیاء اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے اسی طرح اگر آپ بھی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہو گئے تو اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہی ہے کہ یہاں اپنا اور سابق انبیاء کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ پہلے انبیاء تو اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے مگر میں اَلنَّاس کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی غرض یہ ہے کہ میں صرف اپنی قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا بلکہ قوم سے زائد لوگوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہوں۔ پس اُرْسِلْتُ اِلَی النَّاسِ كُلِّهِمْ عَامَّةً سے مراد یہاں ساری دنیا ہے محض قوم مراد نہیں۔

دوسرے حدیثوں میں صراحتاً اَلنَّاسُ کا لفظ غیر مشرکوں کیلئے بھی بولا گیا ہے گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے محاورہ سے ثابت ہے کہ اَلنَّاسُ کا لفظ بولا جاتا ہے اور اُس سے مراد مکّہ کے مشرک نہیں ہوتے بلکہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں چنانچہ حدیث بدر میں آتا ہے کہ جنگ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مشورہ طلب فرمایا اور مہاجرین یکے بعد دیگرے اُٹھ اُٹھ کر مشورہ دینے لگے تو ہر مہاجر جب مشورہ دے کر بیٹھ جاتا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے اَشِيْرُوْا عَلَيَّ اَيُّهَا النَّاسُ اے لوگو مجھے مشورہ دو۔ اب دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نَاسُ کا لفظ استعمال کیا مگر اس سے مکّے کے مشرک مراد نہیں تھے بلکہ انصار مراد تھے چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار یہ فرمایا کہ اے لوگو مجھے مشورہ دو تو سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور انہوں عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کی مراد ہم سے ہے کہ اس موقعہ پر ہم بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی شہادت اس امر کی تائید میں موجود ہے کہ اَلنَّاس کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اُس سے مراد مشرکین مکّہ کے علاوہ اور لوگ بھی ہوتے ہیں یہاں تک کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اَلنَّاسُ کا لفظ استعمال کیا اور آپ کی مراد اس سے انصار تھے۔ پھر اس حدیث میں تو وضاحت موجود ہے کہ قوم کے مقابلہ میں نَاس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہاں اَلنَّاس سے قوم مراد نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مراد ہیں خواہ وہ دنیا کی کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے مَنْ سَمِعَ بِيْ مِنْ اُمَّتِيْ اَوْ يَهُوْدِيٌّ اَوْ نَصْرَانِيٌّ فَلَمْ يُؤْمِنْ بِيْ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ (مسند احمد عن ابی سعید بن جبیر عن ابی موسیٰ اشعری)

اس حدیث کے الفاظ میں کچھ غلطی ہے جس کو آگے ظاہر کیا جائے گا موجودہ صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے میری اُمّت میں سے میرے متعلق بات سُنی یا کسی یہودی یا نصرانی نے میرا ذکر سُنا اور پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لایا وہ جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔ اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُمّت اور ہے اور یہودی اور نصرانی اور ہیں مگر درحقیقت یہ راوی کی غلطی ہے کہ اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور یہودی اور نصرانی کے ساتھ "اَوْ" کا لفظ بڑھا دیا۔ اس کی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ عام طور پر لوگ اُمّت کے معنے ایمان لانے والے لوگوں کے سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اُمّت کے لفظ کا اطلاق انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو کسی نبی پر ایمان رکھتے ہوں اس محاورہ کی وجہ سے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہوتا ہے راوی نے سمجھا کہ شاید مجھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ صحیح طور پر یاد نہیں رہے ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ آپ اپنی اُمّت میں کسی یہودی یا نصرانی کو بھی شامل سمجھتے اس لئے اُس نے حدیث بیان کرتے وقت "اَوْ" "اَوْ" کا لفظ بڑھا دیا

اور سمجھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہوگا کہ مَنْ سَمِعَ بِیْ مِنْ اُمَّتِیْ اَوْ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ مگر یہ ہے غلط۔ خود مسند احمد کی بعض اور روایات ہیں جو اس غلطی کو واضح کرتی ہیں سو درحقیقت حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ مَنْ سَمِعَ بِیْ مِنْ اُمَّتِیْ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ فَلَمْ یُؤْمِنْ بِیْ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ۔ جس شخص نے میری اُمت سے میری بابت سُنا۔ یہ صاف بات ہے کہ اگر اُمَّتِیْ سے مراد ماننے والے لوگ ہیں تو کیا کوئی ماننے والا ایسا بھی ہو سکتا ہے جس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ سُنا ہو؟ یہ بات عقل کے بالکل خلاف ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے تو ہو مگر اُس نے آپ کا ذکر نہ سُنا ہو۔ پس خود اُمت کا لفظ جو اس حدیث میں استعمال کیا گیا ہے بتا رہا ہے کہ یہاں اُمت سے مراد صرف ماننے والے نہیں بلکہ ہر وہ شخص ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا مخاطب ہے۔

چنانچہ مسلم کی ایک روایت جو ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے اس غلطی کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اصل ارشاد کیا تھا۔ مسلم نے ابوموسیٰ اشعری سے یہ روایت اس طرح نقل کی ہے وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ رَجُلٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ لَا یُؤْمِنُ بِیْ اِلَّا دَخَلَ النَّارَ۔ یعنی ابوموسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میری اُمت میں سے کوئی شخص میرا ذکر نہیں سُنیگا خواہ یہودی ہو یا نصرانی ثُمَّ لَا یُؤْمِنُ بِیْ پھر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا اِلَّا دَخَلَ النَّارَ تو وہ ضرور آگ میں داخل کیا جائے گا۔

یہ روایت صحتِ الفاظ کے لحاظ سے زیادہ درست ہے کیونکہ اِس میں اُمت اور یہود و نصاریٰ کو الگ الگ بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہود و نصاریٰ کو اُمت کا ایک حصہ بتایا گیا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وضاحتًا یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر آپ پر ایمان لائیں تو یقیناً کہ اُن کا ایمان لانا صرف ایک زائد خیر کا رنگ رکھے گا بلکہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اللہ تعالیٰ اُنکو دوزخ میں ڈالیگا۔

اس حدیث سے یہ وضاحت ہوگئی کہ پہلی روایت میں بھی درحقیقت یہودی اور نصرانی کے الفاظ اُمت کے بدل کے طور پر استعمال کئے گئے تھے مگر راوی نے غلطی سے "اَوْ" "اَوْ" بڑھا کر فقرہ اس طرح بنا دیا کہ مَنْ سَمِعَ مِنْ اُمَّتِیْ اَوْ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ۔

امام احمد بن حنبل کی ایک دوسری روایت بھی انہی الفاظ کی تصدیق کرتی ہے چنانچہ اُس روایت کے الفاظ یہ ہیں عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَا یُؤْمِنُ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ یعنی حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا مجھے اُسی ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ و تصرف میں میری جان ہے کہ اس اُمت میں سے کوئی شخص میرا ذکر نہیں سنے گا خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی اور پھر وہ ایسی حالت میں مرجائے کہ اُس پیغام پر ایمان نہ لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے دیا گیا ہے اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ مگر وہ یقیناً دوزخی ہوگا یہ حدیث بالصراحت اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو اپنی اُمت میں شامل کیا ہے۔ پس اُوپر کی احادیث میں بھی اُمت سے مراد صرف ماننے والے نہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کے مخاطب ہیں۔ درحقیقت اُمت کے دو مفہوم ہوا کرتے ہیں۔ ایک مفہوم کے لحاظ سے اُمت میں صرف وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو نبی پر ایمان لاتے اور اُس کے حلقۂ غلامی میں اپنے آپ کو شامل کر لیتے ہیں اور دوسرے مفہوم کے لحاظ سے اُمت سے مراد وہ تمام لوگ ہوتے

ہیں جو کسی نبی کے مخاطب ہوتے ہیں جن کے لئے نبی پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے خواہ اپنی عملی حالت کے لحاظ سے وہ منکروں میں ہی شامل ہوں۔ اس جگہ اُمّت سے مراد یہی دوسرا مفہوم ہے یعنی اُمّت سے ایمان لانے والے مراد نہیں بلکہ وہ لوگ جن کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے وہ سب کے سب اُمّت کے دائرہ میں شامل ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صاف طور پر فرماتے ہیں کہ اس اُمّت میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو میرا ذکر سُنے خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی (گویا یہودی بھی آپ کی اُمّت میں شامل ہیں اور نصاریٰ بھی آپ کی اُمّت میں شامل ہیں) مگر وہ ایسی حالت میں مرجائے کہ اُسے مجھ پر ایمان لانا نصیب نہ ہو تو وہ دوزخ میں داخل کیا جائیگا

ان احادیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ماننا صرف مستحب و مرجّح ہی نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ پر واجب اور فرض ہے اور اس کی تعمیل نہ کرنا اُنہیں دوزخی بنا دیتا ہے۔ لیکن چکڑالویوں، معتزلیوں اور حنفیوں نے احادیث کا انکار اور تخفیف کر کے سیحیوں کے لئے اس میں شک پیدا کرنے کا راستہ کھول دیا ہے۔

گو مومنوں کے لئے اوپر کی آیات اور احادیث واضح الدلالۃ ہیں لیکن چونکہ ہمیں ایسے دشمن سے واسطہ پڑنا تھا جو مسلمانوں کے اختلافات کے متعلق وسیع معلومات رکھنے والا تھا اور اُن قوموں سے اسلام کا مقابلہ ہونے والا تھا جو اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کی منقد بتاتی ہیں اس لئے ضروری تھا کہ قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی نصِ صریح آجاتی تاکہ دشمن کو اس بارہ میں اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ نہ آتا۔

اب پیشتر اس کے کہ میں آیت زیر تفسیر کے مضمون کی طرف آؤں اُن احادیث کے متعلق جو اوپر بیان ہوئی ہیں دوؔ باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اوّل اِن احادیث میں جو مَنْ سَمِعَ بِیْ کے الفاظ آتے ہیں اِن سے مراد محض سماع نہیں بلکہ سماعِ حجت ہے کیونکہ سزا بغیر حُجّتِ قاطعہ کے نہیں ہوتی۔ یعنی یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حدیث میں جو مَنْ سَمِعَ بِیْ یا لَا یَسْتَمِعُ بِیْ کے الفاظ آتے ہیں اُن کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی کو محض اتنا علم ہو جائے کہ بانیٔ اسلام نبوت کے مدعی ہیں اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے تو وہ دوزخی ہو جائے گا کیونکہ خود احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو کوئی سزا نہیں ملے گی مثلاً پاگل کے متعلق آتا ہے کہ اُسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اب جہاں تک سننے کا تعلق ہے اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ سنتا ایک پاگل بھی ہے مگر اس کے باوجود اُسے سزا نہیں ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی سماع کافی نہیں اگر خالی سماع کافی ہوتا تو ایک مجنون اور فاتر العقل کو بھی سزا ملنی چاہیئے مگر احادیث بالصراحت بتاتی ہیں کہ پاگل مرفوع القلم ہوتا ہے اور اُسے اپنے مجنونانہ افعال کی اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی سزا نہیں ملے گی۔ یہ امتیاز اسی لئے رکھا گیا ہے کہ پاگل سنتا تو ہے مگر سمجھتا نہیں۔ اسی طرح جس شخص نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا صرف ذکر سُنا ہے اُس پر حُجّت تمام نہیں ہوئی وہ بھی سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ سزا اتمامِ حُجّت یا حقیقت کو پورے طور پر سمجھ لینے کے بعد وارد ہوتی ہے اور جب اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کو سمجھا ہی نہیں تو وہ سزا کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے؟

دوسرے اِن احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کفر اور سزا کو الگ الگ امور قرار دیا ہے یہ ایک اہم مسئلہ ہے جو ہمارے اور پیغامیوں کے درمیان ایک مدت سے مابہ النزاع چلا آرہا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ شخص جس نے مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا کافر ہے؟ اور ہم جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں جس نے مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا وہ کافر ہے تو وہ شور مچانے لگ جاتے ہیں کہ دیکھو یہ کتنے بڑے ظلم کی بات ہے کہ جس شخص نے مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا اُسے جہنمی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ کافر اور جہنمی میں فرق ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اس حدیث میں صاف طور پر بیان فرما دیا ہے کہ کفر اور سزا یہ دو الگ الگ امور ہیں یہ تو ہر مسلمان تسلیم کریگا کہ جس شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

نام بھی نہیں سُنا وہ کافر ہے۔ مَیں سمجھتا ہُوں مسلمانوں میں سے کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں جو اس بارہ میں اختلاف رکھتا ہو اور اُن لوگوں کو جنہوں نے رسُول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام بھی نہیں سُنا مومن قرار دیتا ہو۔ مثلاً وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب کو کافر قرار نہیں دیا اور جو تنا قلیل طبقہ ہے کہ کسی اعتبار کے قابل نہیں اُن کو مستثنیٰ کرتے ہُوئے جمہور مسلمانوں کا قطعی طور پر فیصلہ ہے کہ دُنیا میں دو ہی گروہ ہیں یا مسلمان یا کافر۔ اب جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں دو ہی گروہ سمجھے جا سکتے ہیں یا مسلمان یا کافر۔ وہ اُن مسیحیوں یا اُن یہودیوں یا اُن ہندوؤں یا اُن زرتشتیوں یا اُن شنٹوازم کے ماننے والے جاپانیوں یا کنفیوشس کے ماننے والے چینیوں کو جنہوں نے رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی نہیں سُنا کیا قرار دیں گے؟ کیا یہ کہیں گے کہ وہ مسلمان ہیں؟ یہ تو صاف بات ہے کہ مسلمان کیے نام سے وہی بلائے جاتے ہیں جنہوں نے کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھا اور جنہیں رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حقیقی طور پر یا ظاہر میں ایمان لانا نصیب ہُوا جب مسلمان کی ظاہری تعریف یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ظاہر کرتا ہو تو یہ بات واضح ہوگئی کہ جنہوں نے کلمہ طیبہ نہیں پڑھا اور جنہیں رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا نصیب نہیں ہُوا اُنہیں بہرحال ہم کافر ہی کہیں گے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اُن کے کفر کے باوجود اُن کو سزا نہیں ملے گی۔ سزا صرف اُن لوگوں کو ہوگی جنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر سُنا یعنی اُن کے کانوں تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا اُن پر حجت تمام ہوئی اور پھر بھی وہ اپنے کفر پر قائم رہے اسلام میں داخل ہونے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اور انبیاء تو الگ رہے اپنی ذات کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ مجھے نہ ماننا (بشرطیکہ کسی پر حُجت تمام نہ ہوئی ہو) انسان کو دوزخی نہیں بناتا ہاں اُسے کافر ضرور بنا دیتا ہے چاہے دنیا کے وہ کسی کونہ میں بسنے والا ہو اور چاہے اُس نے سات پشت سے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ سُنا ہو وہ کافر ہوگا اور ضرور ہوگا مگر سزا اتمام حُجت کے بعد ہوتی ہے اس سے پہلے نہیں۔ گویا یہ قاعدہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے سزا کے متعلق ہے کفر کے متعلق نہیں۔ چنانچہ صریح طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دو الگ الگ تقسیمیں کر دی ہیں کفر کو الگ قرار دیا ہے اور سزا کو الگ قرار دیا ہے۔ یہی عقیدہ ہمارا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق ہے کہ جس شخص نے حضرت مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا وہ کافر ہے مگر ہم اسے دوزخی قرار نہیں دے سکتے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص نے حضرت مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا وہ جہنمی ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالےٰ اگلے جہان میں اُس کا دوبارہ امتحان لے اور ممکن ہے فطرتی ایمان پر ہی اُس کو بخش دے۔ بہرحال ہم اُس کی سزا کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے مگر ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اُسے کافر قرار دیں کیونکہ اسلام میں دو ہی اصطلاحیں ہیں۔ ایک اصطلاح مومن کی ہے اور ایک اصطلاح کافر کی ہے۔ جس نے کسی نبی کو مان لیا وہ مومن ہے اور جس نے کسی نبی کو نہیں مانا وہ کافر ہے۔ چاہے اُس کا نہ ماننا عدمِ علم کی بناء پر ہو اور چاہے اُس کا نہ ماننا کسی شرارت کی بناء پر ہو۔ اگر اُس نے عدمِ علم کی وجہ سے کسی نبی کو نہیں مانا تو وہ کافر یعنی نہ ماننے والا تو ہے مگر دوزخی نہیں اور اگر کسی نے شرارت سے نہیں مانا تو وہ کافر یعنی نہ ماننے والا بھی ہے اور دوزخی بھی ہے۔

افسوس کہ اس نکتہ کو نہ سمجھ کر آج کل پیغامی گمراہ ہو رہے ہیں اور جب وہ مجھ پر حملہ کرتے ہیں تو درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ کفر و سزا کا یہ فرق خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور متعدد احادیث میں کفر اور جہنمی ہونے کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیغامیوں کے لئے دو ہی راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ یہ کہیں کہ جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں سُنا وہ کافر نہیں مسلمان ہے۔ اگر وہ یہ کہیں تو ہمارا اور اُن کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے ہم بھی اُن کی اصطلاح میں کہہ دیں گے کہ جس شخص نے حضرت مرزا صاحب کا نام نہیں سُنا وہ کافر نہیں مسلمان ہے۔ اس صورت میں وہ ایک نئی اصطلاح قائم کر دیں گے اور ہمارا اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا کہ ہم اُن سے خطاب کے وقت

شر کو دُور کرنے کے لئے اس اصطلاح کو اُن کے مقابلہ میں تسلیم کرلیں اور یا پھر دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ یہ کہیں کہ کافر وقابلِ سزا لازم وملزوم نہیں ایک گروہ کو کافر تو کہا جائیگا مگر قابلِ سزا نہیں۔ اس صورت میں بھی ہمارا اور اُن کا جھگڑا ختم ہوجاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں بتاتا ہوں کہ آیت زیرِ تفسیر میں اُن لوگوں کا جو اہلِ کتاب کو کافر قرار نہیں دیتے یا جو سمجھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا قرآن کریم کے رُو سے اہلِ کتاب کے لئے ضروری نہ تھا، ردّ ہے۔ اور صاف بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ماننا اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کے لئے ضروری تھا کیونکہ اللہ تعالےٰ اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کو کافر قرار دیتا ہے اور اسلام (یعنی دینِ حق قبول کرنا) صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے پر موقوف ظاہر کرتا ہے۔

یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ردّ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا قرآن کریم کے رُو سے اہلِ کتاب کے لئے ضروری نہ تھا۔ اس فقرہ میں ان لوگوں سے میری مراد عیسائی مؤرخ ہیں۔ اس اعتراض سے اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی عدمِ ضرورت کو واضح کریں اور ثابت کریں کہ قرآن کریم ایسی کتاب نہیں ہے جس پر ایمان لانا اہلِ کتاب کے لئے بھی ضروری ہو اُن کے لئے تورات اور انجیل پر ایمان رکھنا ہی کافی ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا بھی ردّ ہے جو اہلِ کتاب کو کافر قرار نہیں دیتے یہ بعض معتزلیوں کا خیال ہے جو اہلِ کتاب کو ایک تیسرا گروہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح یوروپین مستشرقین کے اعتراضات سے ڈر کر نیچری خیالات رکھنے والے مسلمان بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ اہلِ کتاب کو قرآن کریم نے کہیں کافر نہیں کہا۔ اس سے انکی غرض یہ ہوتی ہے کہ کہیں عیسائی چڑ نہ جائیں اور وہ اسلام پر اَور زیادہ اعتراضات نہ کرنے لگیں۔ بہرحال اس آیت میں ان دونوں خیالات کا ردّ کیا گیا ہے اور واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ماننا اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ فرماتا ہے لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ۔ کافروں کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرک کہ وہ اپنے کفر سے الگ ہوسکتے تاوقتیکہ اُن کے پاس بیّنہ نہ آجاتی۔ اس آیت میں لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کافروں اور مشرک کافروں کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے کفر کو چھوڑ سکتے۔

اِنْفَکَّ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے جُدا ہونے کے ہیں۔ پس مُنْفَکِّیْنَ کے معنے ہوئے جُدا ہونیوالے یا الگ ہونیوالے۔ سوال یہ ہے کہ اُن کیلئے کس چیز سے انفکاک ناممکن تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُسی کفر سے جس کا اس آیت میں ذکر آتا ہے یعنی اہلِ کتاب کافر اور مشرک کافر کفر کو چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے اور کوئی صورت ایسی نہیں تھی کہ وہ کفر سے آزاد ہوسکتے سوائے اس کے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آتے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بغیر نہ اہلِ کتاب کفر سے نکل سکتے تھے نہ مشرک کفر سے نکل سکتے تھے۔ گویا اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کے متعلق صراحتًا، وضاحتًا اور دلالتًا بتا دیا کہ وہ کافر ہیں اور یہ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہی شخص خدا تعالےٰ کا مقبول ہوسکتا ہے یا وہی شخص سچے دین پر قائم سمجھا جاسکتا ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔

اس آیت میں مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ کے الفاظ آتے ہیں اور مِنْ کے اصل معنے ابتدائے غایت کے سمجھے جاتے ہیں لیکن چونکہ کثرت سے مِنْ بعضیہ بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے یہ شبہ کسی شخص کے دل میں پیدا ہو کہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ میں بھی مِنْ بعضیہ ہی استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے کافروں کا گروہ۔ گویا ہر اہلِ کتاب کے متعلق یہ بیان نہیں کیا گیا کہ وہ

کافر ہے بلکہ یہ آیت صرف بعض اہل کتاب کی نسبت ہے جو کافر تھے ہر ایک اہل کتاب کافر نہیں تھا۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ اہل کتاب میں سے جنہوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا یا مشرکوں میں سے جنہوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تو یہ درست ہے ہم بھی اس قسم کے بعض کو ماننے کے لئے تیار ہیں یعنی جو اب تک اہل کتاب ایمان نہیں لائے وہ کافر ہیں یا جو اب تک مشرک ایمان نہیں لائے وہ کافر ہیں۔ لیکن اگر مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے یہ معنے لئے جائیں کہ جو اہل کتاب مسلمان نہیں ہوئے اُن میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ نہیں تو یہ اس لئے بالبداہت باطل ہیں کہ اہل کتاب پر وَالْمُشْرِكِيْنَ کا عطف ہے۔ اگر تو یہ ہوتا کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكُوْنَ تو پھر سمجھا جا سکتا تھا کہ مِنْ صرف اہل کتاب کے ساتھ لگتا ہے مشرکوں کے ساتھ نہیں لگتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وَالْمُشْرِكُوْنَ کی بجائے وَالْمُشْرِكِيْنَ فرمایا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ جو حکم اہل کتاب کے لئے ہے وہی حکم مشرکوں کے لئے بھی ہے پس اگر اس آیت کے یہ معنے لئے جائیں کہ اہل کتاب میں سے جو ایمان نہیں لائے اُن میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر تو پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی معنے کرنے پڑیں گے کہ مشرک جو اب تک ایمان نہیں لائے اُن میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر۔ اور آیت کو یُوں سمجھنا پڑے گا کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُشْتَمِلِيْنَ عَلٰى بَعْضِ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَبَعْضِ الْمُشْرِكِيْنَ اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ عیسائی بھی باوجود شدید دشمنِ اسلام ہونے کے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے رُو سے سب غیر اہل کتاب مشرک کافر ہیں اور اس میں کوئی استثنیٰ نہیں۔ بہرحال اگر اس آیت میں مِنْ کو بعضیہ قرار دیا جائے تو چونکہ وَالْمُشْرِكِيْنَ کا عطف اہل کتاب پر ہے اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کچھ مشرک مومن ہیں اور کچھ مشرک کافر حالانکہ یہ بالبداہت باطل ہے۔ پس یہ غلط ہے کہ اس آیت میں مِنْ بعضیہ استعمال ہُوا ہے۔ یہاں مِنْ بعضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے اور اس آیت کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُشْتَمِلِيْنَ عَلٰى اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ۔ چونکہ مشرکین مجرور ہے اس لئے مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے سوا کسی اور پر اس کا عطف نہیں ہو سکتا اگر اَلَّذِيْنَ پر عطف ہوتا تو یہ مرفوع ہوتا۔ پس کسی صورت میں بھی یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ بعض اہل کتاب کافر ہیں اور بعض نہیں۔ بلکہ لازماً اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک سب کے سب کافر ہیں اور اس کفر سے بچ نہیں سکتے تھے جب تک کہ رسول اُن کے پاس نہ آتا۔

غرض كَفَرُوْا سے مراد اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآن کریم کا یہ محاورہ ہے کہ جب وہ اہل کتاب اور مشرکین کا ذکر کرتا ہے تو اُس سے مراد ساری غیر مسلم دنیا ہوتی ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے مسلمانوں کے سوا دنیا میں دو ہی گروہ ہو سکتے ہیں یا اہل کتاب ہوں گے یا مشرک ہوں گے۔ پس اہل کتاب اور مشرکین کی مراد قرآنی محاورہ کے مطابق تمام غیر مسلم دنیا ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ کفار میں سے یعنی غیر مسلموں میں سے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک (اس میں کوئی استثنیٰ نہیں) اپنے کفر سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتے تھے جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہ ہوتی۔

قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر بھی مِنْ بیانیہ استعمال ہُوا ہے مثلاً ایک جگہ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج ع ۴) اس کے یہ معنے نہیں کہ کچھ بُت پاکیزہ ہوتے ہیں اور کچھ گندے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ اَيِ الْاَوْثَانَ تم گندگی یعنی بتوں کی پرستش اور اُن کی عبادت سے بچو۔ یہاں بھی مِنْ بیانیہ ہی استعمال ہوا ہے اور چونکہ یہ حال ہے اس لئے اگر ہم عربی میں اس آیت کا ترجمہ کریں تو یوں ہوگا کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حَالَ كَوْنِهِمْ مُشْتَمِلِيْنَ عَلٰى جَمِيْعِ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَجَمِيْعِ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ۔

چنانچہ دوسری قرأت ان معنوں کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے اور وہ قرأت عبداللہ بن مسعود کی ہے اُن کی قرأت یہ ہے لَمْ یَکُنْ اَھْلُ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکُوْنَ مُنْفَکِّیْنَ (فتح البیان) پس علاوہ اس کے کہ خود فقرہ کی بناوٹ اور وَالْمُشْرِکِیْنَ کے الفاظ جن کا عطف اہل کتاب پر ہے۔ اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ یہاں مِنْ بعضیہ نہیں ہو سکتا ابن مسعودؓ کی قرأت نے مزید تصدیق کر دی کہ یہاں کسی صورت میں بھی مِنْ کو بعضیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری بات جو نہایت اہم اور موجودہ زمانہ کے جھگڑوں میں بہت کام آنے والی ہے اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ کفر پہلے ہوتا ہے اور نبی بعد میں آتا ہے۔ یہ بات ایسی واضح ہے کہ اس آیت پر ذرا سا غور بھی انسان پر اس حقیقت کو روشن کر دیتا ہے کہ نبی پیچھے آتا ہے اور کفر پہلے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک کبھی بھی اپنے کفر کو چھوڑ نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ نہ آجاتی۔ مِنْ کو بیانیہ تسلیم کرنے کی صورت میں "خواہ" کا لفظ گو اُس کے معنوں کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا مگر چونکہ اُردو میں 'خواہ' کا لفظ اُس مضمون کو قریب الفہم کر دیتا ہے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس لئے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ کفار خواہ اہل کتاب میں سے ہوں اور خواہ مشرکوں میں سے، کبھی بھی اپنے کفر کو چھوڑ نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ نہ آتی۔ "جب تک" کے الفاظ جب کسی فقرہ میں استعمال کئے جائیں تو اُس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جب تک سے پہلے بیان شدہ چیز 'جب تک' کے بعد بیان ہونے والی شئے سے پہلے ہے یا اُس کا اس سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ وہ شخص اپنے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا جب تک میرا پیغام اُس کے پاس نہ پہنچ جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغام پیچھے جائے گا اور وہ گھر میں پہلے بیٹھا ہوا ہوگا۔ اسی طرح لَمْ یَکُنْ اور حَتّٰی کے الفاظ جب کسی فقرہ میں استعمال ہوں گے تو اُس کے معنے یہ ہوں گے کہ لَمْ یَکُنْ میں بیان شدہ بات حَتّٰی سے پہلے واقع ہو چکی ہے۔ اس سے صاف پتہ لگا کہ بَیِّنَۃ کے آنے سے پہلے وہ لوگ کافر ہو چکے تھے۔ بیّنہ یعنی رسول نے اُنکو کافر نہیں بنایا بلکہ بیّنہ کے آنے سے پہلے ہی وہ کافر بن چکے تھے۔ غرض کفر پہلے ہوتا ہے اور نبی بعد میں آتا ہے۔ نبی کافر گر نہیں ہوتا بلکہ کفر کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی نبی دنیا میں آتا ہے اُس کا انکار کرنے کے بعد لوگ کافر نہیں بنتے بلکہ پہلے ہی وہ کافر بن چکے ہوتے ہیں نبی صرف اُن کے کفر کا اظہار کرتا ہے۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ نبی کا انکار کر کے لوگ کافر بنتے ہیں۔ یہ ایک غیر محتاط کام ہے جسے ہم بھی زبان کے عام محاورہ کے مطابق بعض دفعہ استعمال کر لیتے ہیں۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی عام رواج کے مطابق اس کو استعمال کیا ہے۔ مگر حقیقتہً نہ ہمارا یہ مفہوم ہوتا ہے نہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ مفہوم تھا کہ نبی کافر بناتا ہے بلکہ ہمارا مفہوم بھی یہ ہوتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی مفہوم یہی ہوتا ہے کہ نبی لوگوں کے کفر کا اظہار کرتا ہے گو عُرف عام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ نبی کا انکار کر کے لوگ کافر بنتے ہیں۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ نبی کافر نہیں بناتا۔ نبی کا انکار کر کے لوگ کافر نہیں ہوتے بلکہ نبی کے انکار سے اُن کا کفر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک شخص جس نے کبھی خربوزہ نہیں دیکھا یہ کہے کہ میں نے خربوزہ کھایا ہے۔ اب جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یہ ایک واضح امر ہوگا کہ اُس نے جھوٹ سے کام لیا ہے مگر اُس کا یہ جھوٹ اُس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک ہم خربوزہ اُس کے سامنے لا کر نہ رکھ دیں اور پھر اُس سے پوچھ نہ لیں کہ بتاؤ یہ کیا چیز ہے؟ اگر ہم ایک خربوزہ اُس کے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں اور پھر اُس سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ یہ کیا چیز ہے اور وہ جواب میں کہتا ہے کہ مجھے علم نہیں تو یہ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہوگا کہ جب اُس نے کہا تھا کہ میں نے خربوزہ کھایا ہے تو

(حاشیہ: نبی کافر گر نہیں ہوتا بلکہ کفر کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔)

اُس نے جھوٹ اور کذب بیانی سے کام لیا تھا مگر اُس کے جھوٹ بولنے کے باوجود اور پھر خربوزہ کے آنے پر اُس کا جھوٹ ظاہر ہونے کے باوجود دنیا میں یہ کبھی نہیں کہا جائے گا کہ خربوزے نے اُس کو جھوٹا بنایا ہے۔ خربوزے نے اُس کو جھوٹا نہیں بنایا بلکہ خربوزے نے اُس کے جھوٹ کو آ کر ظاہر کیا ہے ورنہ جھوٹا تو وہ پہلے ہی تھا۔ اِسی طرح لوگ کہتے ہیں ہم موسیٰؑ کو مانتے ہیں لوگ کہتے ہیں عیسیٰؑ کو مانتے ہیں۔ اور جب وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہم موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں تو اس سے اُن کی کیا مراد ہوتی ہے؟ یہ مراد تو نہیں ہوتی کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ آدمی تھے یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ آدمی تھے۔ پس اُن کا یہ کہنا کہ ہم موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں اِس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ہم مانتے ہیں کہ موسیٰؑ ایک آدمی تھا یا ہم مانتے ہیں کہ عیسیٰؑ ایک آدمی تھا بلکہ اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ موسیٰؑ نبی کی نبوت کو ہم شناخت کرتے ہیں۔ عیسیٰؑ نبی کی نبوت کو ہم شناخت کرتے ہیں اور جب وہ انبیاء کی نبوت کو شناخت کرنے کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ جب بھی کوئی نبی دنیا میں ظاہر ہوگا وہ اُس کو فوراً پہچان لیں گے۔ کیونکہ جو شخص ایک جنس کی کسی چیز کو شناخت کرنے کا ملکہ رکھتا ہے وہ اُسی جنس کی دوسری چیز کو بھی شناخت کر سکتا ہے جو شخص آم کو پہچانتا ہے اُس کے سامنے جب بھی آم رکھا جائے گا فوراً کہہ اُٹھے گا کہ یہ آم ہے یا جو شخص خربوزہ پہچانتا ہے اُس کے سامنے جب بھی خربوزہ لایا جائے گا اُسے شناخت میں کوئی دقّت واقعہ نہیں ہوگی وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ خربوزہ ہے۔ اسی طرح وہ شخص جس نے نبوت کو شناخت کر لیا ہے اُس کو کسی نبی کے پہچاننے میں کوئی دقّت پیش نہیں آ سکتی۔ نوحؑ آئے گا تو اُس کے متعلق وہ کہیگا کہ میں نے اسے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے۔ ابراہیمؑ آئے گا تو اس کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے اُسے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے۔ موسیٰؑ آئے گا تو اس کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے۔ عیسیٰؑ آئے گا تو اُس کے متعلق وہ کہے گا میں نے اسے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے تو اُن کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے انہیں پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ لیکن اگر اُس نے واقعہ میں نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شناخت نہیں کیا۔ اُن کی نبوت کو اُس نے نہیں پہچانا اور صرف جھوٹے طور پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو پہچانا ہُوا ہے تو گو وہ مُنہ سے اس امر کا دعویدار ہوگا کہ میں نوحؑ کو بھی مانتا ہوں، ابراہیمؑ کو بھی مانتا ہوں، موسیٰؑ کو بھی مانتا ہوں، عیسیٰؑ کو بھی مانتا ہوں مگر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا جامہ پہن کر اُس کے سامنے آئیں گے تو کہہ دے گا کہ آپ نعوذ باللہ جھوٹے ہیں۔ اِس سے صاف پتہ لگ جائے گا کہ اس کا یہ کہنا کہ میں نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو پہچانتا ہوں محض جھوٹا دعا تھا ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہی جُبّہ جو نوحؑ نے پہنا، وہی جُبّہ جو ابراہیمؑ نے پہنا، وہی جُبّہ جو موسیٰؑ نے پہنا، وہی جُبّہ جو عیسیٰؑ نے پہنا، وہی جُبّہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہن کر آتے تو وہ آپ کی شناخت سے محروم رہتا؟ اُس کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت سے محروم رہنا اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ پہلے بھی نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھتا تھا اور اُس کا یہ کہنا بالکل دھوکا اور فریب تھا کہ مَیں نوحؑ کو مانتا ہوں، مَیں ابراہیم کو مانتا ہوں مَیں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتا ہوں کیونکہ جب ویسی ہی نبوت اُس کے سامنے آئی تو وہ اُس کو پہچان نہ سکا جس سے پتہ لگ گیا کہ اُس نے نہ موسیٰؑ کو پہچانا تھا نہ عیسیٰؑ کو پہچانا تھا اور نہ دنیا کے کسی اور نبی کو پہچانا تھا۔ پس اس آیت نے بتا دیا کہ دنیا میں جب بھی کوئی نبی ظاہر ہوتا ہے وہ لوگوں کو کافر نہیں بناتا بلکہ اُن کے کفر کا صرف اظہار کرتا ہے ورنہ کافر وہ اس سے پہلے ہی بن چکے ہوتے ہیں۔ اِس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ کتنی فضول بحث بن جاتی ہے کہ فلاں نبی کا انکار کفر ہوتا ہے اور فلاں نبی کا انکار کفر نہیں ہوتا حالانکہ کفر کسی نبی کے انکار کے بعد پیدا نہیں ہوتا بلکہ پہلے ہی لوگوں کے اندر پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔

کفر نوحؑ کے انکار کا نام نہیں۔ کفر ابراہیمؑ کے انکار کا نام نہیں کفر موسیٰؑ کے انکار کا نام نہیں۔ کفر عیسیٰؑ کے انکار کا نام نہیں۔ بلکہ اصل کفر نام ہے نبوت کے انکار کا۔ یہ جو ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ یا کسی اور نبی کا انکار کفر ہے یہ صرف اصطلاحی طور پر ہم کہا کرتے ہیں۔ چونکہ موسیٰؑ نبی ہے اور اُس کا انکار نبوت کے انکار کے مترادف ہے اس لئے موسیٰؑ کا انکار کفر ہے ورنہ موسیٰ آدمی کا انکار کفر نہیں یا عیسیٰ آدمی کا انکار کفر نہیں یا محمد عربیؐ کا انکار کفر نہیں۔ بلکہ موسیٰؑ نبی کا انکار کفر ہے یا عیسیٰؑ نبی کا انکار کفر ہے یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کفر ہے اور یہ کفر بھی ان معنوں میں نہیں کہ اُس نے کسی شخص کا انکار کیا ہے بلکہ ان معنوں میں ہے کہ اُس نے تمام انبیاء کی نبوت سے انکار کیا ہے ورنہ اگر وہ کسی ایک نبی کی نبوت کو بھی صحیح معنوں میں پہچاننے والا ہوتا تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اُس کے سامنے ایک دوسرا شخص وہی نبوت کا جامہ پہن کر آتا تو وہ اس کا انکار کر دیتا اور کہہ دیتا کہ وہ کافر ہے۔ جو شخص نبوت کو پہچانتا ہے اُس کے سامنے تو جو شخص بھی نبوت کا جامہ پہن کر آئے گا وہ فوراً اس کو پہچان لے گا لیکن جو شخص نبوت کے متعلق جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے اُس کے سامنے جب کوئی شخص نبوت کا جامہ پہن کر آئے گا تو بجائے اس کے کہ وہ اُس پر ایمان لانے اُسے کافر اور بے دین قرار دینے لگ جائے گا اور اس طرح اس بات کا ثبوت مہیا کر دیگا کہ اُس کا پہلے انبیاء کی نبوت پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی محض ایک دھوکا تھا۔ اگر وہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن یہی جامہ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر دیکھتا ہے تو آپ کو کافر کہنے لگ جاتا ہے تو یہ صاف اور واضح ثبوت اس بات کا ہے کہ اُس نے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی نبوت کو بھی نہیں پہچانا مگر چونکہ اُس کے ماں باپ کہتے تھے کہ موسیٰؑ نبی ہے اس لئے اُس نے بھی موسیٰؑ کو مان لیا یا چونکہ اُس کے ماں باپ کہتے تھے عیسیٰؑ نبی ہے اس لئے اُس نے عیسیٰؑ کو بھی مان لیا ورنہ درحقیقت نہ وہ موسیٰؑ پر ایمان رکھتا تھا نہ عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا تھا اور نہ کسی اور نبی پر ایمان رکھتا تھا۔

پس حقیقت یہ ہے کہ نبوت کا انکار کفر ہے نہ کہ زید یا بکر یا خالد کا انکار۔ چونکہ آنے والا اُسی قسم کا جامہ پہن کر آتا ہے جس قسم کا جامہ پہلے انبیاء پہن کر آئے اس لئے جب لوگ اُس کا انکار کر دیتے ہیں تو اُن کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا کہ انہوں نے کسی ایک شخص کا انکار کیا بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے نبوت کا انکار کیا ہے۔ اب یہ سیدھی بات ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا کوئی نام رکھ لو جو باتیں انہوں نے لوگوں کے سامنے پیش کی ہیں وہ وہی ہیں جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیں اور جو سلوک لوگوں نے آپ سے کیا وہ ویسا ہی ہے جیسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا اَور انبیاء سے دنیا نے کیا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا پیغامی بھی انکار نہیں کر سکتے۔ پھر تو اور خود مولوی محمد علی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت مرزا صاحب کی صداقت پر منہاج نبوت کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کرنا چاہیئے جس کے معنے یہ ہیں کہ آپ نے ویسی ہی باتیں پیش کی تھیں جیسی باتیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کیں یا جیسی باتیں موسیٰؑ نے پیش کی تھیں یا جیسی باتیں عیسیٰؑ نے پیش کی تھیں۔ اور جو سلوک دنیا نے آپ سے کیا ویسا ہی سلوک اُس نے پہلے انبیاء سے بھی کیا تھا۔ اور اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر ویسی ہی باتوں پر جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیں یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے پیش کیں جو شخص آپ کو کافر کہتا ہے وہ نعوذ باللہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی کافر کہتا ہے، موسیٰؑ کو بھی کافر کہتا ہے، عیسیٰؑ کو بھی کافر کہتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ فلاں نبی کا انکار انسان کو کافر بناتا ہے اور فلاں کا نہیں ایک بے تعلق بحث ہے۔ نبی تو صرف کفر کو ظاہر کرتا ہے اُس کا کسی کو کافر بنانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ یہ بحث کی جائے کہ فلاں قسم کے نبی کا انکار کفر ہوتا ہے اور فلاں قسم کے نبی کا انکار کفر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بحث ہو سکتی ہے تو یہ کہ فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب دنیا مومن ہوتی ہے اور فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب دنیا کافر ہوتی ہے اور یہ بات بالبداہت

باطل ہے۔ پس درحقیقت اس آیت کو سمجھ لینے کے بعد کہ لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ حَتّٰى تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ کفر و اسلام کے متعلق کوئی بحث ہی نہیں رہتی کیونکہ اس آیت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ لوگ پہلے کافر ہوتے ہیں اور ماموریت پیچھے آتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو ہمارا پیغامیوں سے یہ مطالبہ ہے کہ تم ثابت کر دو کہ فلاں قسم کے نبی اُس وقت آتے ہیں جب لوگ مومن ہوتے ہیں اور فلاں قسم کے نبی اُس وقت آتے ہیں جب لوگ کافر ہوتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں وہ اِس طرف کبھی بھی آنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ پس جو لوگ یہ شور مچاتے ہیں کہ مرزا صاحب نے کروڑوں کو کافر بنا دیا محض قرآن کریم کی تعلیم سے ناواقفیت اور جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے اہل کتاب اور مشرک اپنے کفر سے باز نہیں آ سکتے تھے جب تک کہ اُن کے پاس رسول نہ آتا جس سے معلوم ہُوا کہ نبی کافر نہیں بناتا بلکہ نبی تب آتا ہے جب لوگ کافر ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ فلاں نبی کافر بناتا ہے اور فلاں نہیں ایک بے تعلق بحث ہے۔ نبی تو کفر کو ظاہر کرتا ہے اُس کا کافر بنانے سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ ہم کہیں اِس نے کافر بنایا ہے اور اُس نے نہیں۔ اگر کوئی بحث ہو گی تو یہ ہو گی کہ فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب لوگ مومن ہوتے ہیں اور فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب لوگ کافر ہوتے ہیں اور یہ بحث جیسا کہ میں بتا چکا ہوں بالبداہت باطل ہے۔

نبی کے آنے کی غرض

لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ کے مفہوم پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ حَتّٰى تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ۔ اہل کتاب اور مشرک کبھی اپنے کفر کو چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ یعنی اللہ تعالیٰ کا رسول نہ آ جاتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بیّنہ کے آنے سے اہل کتاب و مشرکین نے کفر چھوڑ دیا؟ یا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کریم کے آنے کی وجہ سے اہل کتاب اور مشرک بچ گئے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ اِس فقرہ کی بناوٹ اِس قسم کی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ سب کے سب اہل کتاب یا سب کے سب مشرک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کوئی ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہو سکتا تھا جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے۔ پس اِس آیت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اہل کتاب اور مشرک اُس وقت تک سَو فی صدی مسلمان نہیں ہو سکتے تھے جب تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ آتے بلکہ معنے یہ ہیں کہ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے ایک فی صدی بھی صداقت پر قائم نہیں ہو سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ یعنی اللہ تعالیٰ کا رسول نہ آ جاتا۔ پس یہ کہنا کہ یہودی اب تک موجود ہیں یا عیسائی ابتک موجود ہیں یا مشرک ابتک موجود ہیں اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے ویسا ہی اعتراض ہے جیسے مولوی ثناء اللہ صاحب کہہ دیا کرتے ہیں کہ مرزا صاحب کے آنے کا فائدہ کیا ہُوا جبکہ عیسائی بھی موجود ہیں، یہودی بھی موجود ہیں، ہندو بھی موجود ہیں، سکھ بھی موجود ہیں اور غیر احمدی بھی موجود ہیں۔ حالانکہ نبی آنے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ سب لوگ اُس پر ایمان لے آتے ہیں اور کوئی ایک شخص بھی ایسا باقی نہیں رہتا جو کفر و شرک میں مبتلا رہے۔ نبی آنے کے صرف اتنے معنے ہوتے ہیں کہ وہ الٰہی قرب کا ایک راستہ کھول دیتا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے شیطان سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کی رضاء حاصل کرنے کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں اس کے بعد خواہ ایک شخص نبی پر ایمان لائے یا دس آدمی ایمان لانیوالوں میں شامل ہوں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب ہزاروں یا لاکھوں آدمی بھی کفر و شرک میں مبتلا ہیں تو نبی کے آنے کا فائدہ کیا ہُوا۔ نبی کے آنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا دروازہ بنی نوع انسان کے لئے کھول دیتا ہے اگر وہ دروازہ نہ کھولے تو کوئی ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ کوئی ایک شخص بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب اور اُسکا پیارا نہیں بن سکتا پس یہ کہنا کہ باوجود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے کفر کیوں موجود ہے حقیقت سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہے اور

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور سُنتوں کو نہ جاننے سے پیدا ہوتا ہے اور درحقیقت یہ اعتراض ہر نبی پر ہی کیا گیا ہے اور جب تک دنیا میں مصلح آتے رہیں گے ہوتا رہے گا کیونکہ ایک مصلح ربانی بھی دنیا میں نہیں آیا جسے سب دنیا نے قبول کر لیا ہو یا جس کے نہ ماننے والے شروع میں غالب نہ رہے ہوں ہمیشہ کچھ مدت تک (جو موقع کے مطابق بدلتی رہتی ہے کبھی لمبی ہو جاتی ہے اور کبھی چھوٹی) ہر نبی کے دشمن اُس کے اتباع پر غالب رہتے ہیں اس کے بعد نبی کے لئے غلبہ کا زمانہ آتا ہے اور اُسے غلبہ نصیب ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے نہ ماننے والے دنیا سے مٹ جائیں بلکہ بسا اوقات ماننے والے ہی نہ ماننے والے بن جاتے ہیں یعنی جب نبی کا دورِ افاضہ ختم ہو جاتا ہے یا تجدید کا مستحق ہوتا ہے تو اُس کے ماننے والے اس کی طرف منسوب تو ہوتے ہیں مگر ایماناً اور عقیدۃً اُس کے دشمنوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہوتے ہیں۔ گویا اِس دور میں شیطان اور فرشتے ایک ہی وقت میں اُس کے اتباع پر حکومت کر رہے ہوتے ہیں فرشتوں کی حکومت زبان پر ہوتی ہے اور شیطان کی دل پر۔ تب خدا تعالیٰ کی غیرت پھر جوش میں آتی ہے اور وہ پھر کوئی شریعت والا نبی یا اگر شریعت محفوظ ہو تو احیاءِ روحِ شریعت کے لئے بغیر شریعت کے نبی مبعوث فرما کر پھر اپنے بندوں کے لئے روحانی ترقی کا راستہ کھول دیتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ رحمٰن اور رحیم خدا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ الٰہی سلسلوں کو سَو فی صدی لوگ تو مانا نہیں کرتے لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایمان کا یہ راستہ ایسے شاندار طریق پر کھولا کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کروڑوں کروڑ لوگ آپ پر ایمان لائے اور اس طرح انہوں نے اپنے کفر سے نجات پائی۔ چنانچہ اہل کتاب میں سے مصر قریباً سارا مسلمان ہو گیا، فلسطین قریباً سارا مسلمان ہو گیا، شام قریباً سارا مسلمان ہو گیا، عرب کے نصاریٰ قریباً سارے مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح دوسرے اہل کتاب مجوس تھے وہ قریباً سب مان گئے اور ایران کو ۹۵ یا ۹۶ فی صدی حصہ مسلمان ہو گیا۔ ہندوستان اور چین کے اہل کتاب میں سے بھی کروڑوں مسلمان ہو گئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے اگر ان میں سے ایک کروڑ بھی باہر سے آئے ہوئے سمجھ لئے جائیں تب بھی نو کروڑ ایسے لوگ رہ جاتے ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے۔ اسی طرح چین میں قریباً آٹھ کروڑ مسلمان ہیں اِن میں سے شاید دو چار یا دس لاکھ مسلمان عرب سے آیا ہوا ہو باقی سب وہ لوگ ہیں جو کنفیوشس کے پیرو تھے بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ غرض اہل کتاب میں سے ایک بڑی تعداد جو کروڑوں تک پہنچتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اور اُس نے کفر سے نجات حاصل کی۔ پس یہ کہنا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے کا فائدہ کیا ہوا کیا سب اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئے؟ تاریخی لحاظ سے نہایت بودا اعتراض ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک کے لئے نہیں، دو کے لئے نہیں، کروڑوں کروڑ لوگوں کے لئے یہ راستہ کھولا اور کروڑوں کروڑ اہل کتاب کو آپ پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اسی طرح مشرکوں میں سے عرب کے مشرک تو سَو فی صدی مسلمان ہو گئے اور باقی ممالک پر بھی اسلام کی توحید کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے شرک کو خود بخود ترک کر دیا چنانچہ اب حقیقی معنوں میں مشرک صرف ہندوستان یا افریقہ کے قبائل ہی رہ گئے ہیں باقی سب مشرکین میں سے نکل کر اہل کتاب میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس سورۃ کی اولین مخاطب عرب کی قوم ہو سکتی تھی مگر وہ جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں وہ ساری کی ساری مسلمان ہو گئی تھی۔ ایسا تغیر اِس سے پہلے دنیا کی کسی الہامی کتاب نے پیدا نہیں کیا۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لانے سے اِس وقت تک محروم ہیں اُن کے متعلق اسی سلسلہ میں ایک اور خبر دی گئی ہے مگر اس سورۃ میں نہیں بلکہ اگلی سورۃ میں۔

آیت لَمْ يَكُنْ کا ترجمہ سیل اور ویری کے نزدیک اور اس کی تغلیط

اس جگہ اس امر کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ میں لَمْ يَكُنْ کا ترجمہ سیل اور ویری، دونوں نے غلط کیا ہے۔ انہوں نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ "وہ ہٹے نہیں"۔ اور مجھے

یہ کئے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ جو ایک آنے والے رسول کی امید لگائے بیٹھے تھے وہ اس امید پر قائم رہے جب تک کہ رسول نہ آگیا یعنی جب وہ رسول آگیا جس کی وہ امید کیا کرتے تھے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہمیں تو کسی رسول کی امید نہیں تھی حالانکہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی کے معنے سوائے اس کے ہو ہی نہیں سکتے کہ پہلا مضمون دوسرے سے معلق ہے جب تک دوسری حالت نہ ظاہر ہو جائے پہلی حالت بدل ہی نہ سکتی تھی۔ پس رسول کے آنے تک رُکے نہ تھے اِس آیت کے معنے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اِن معنوں میں تعلیق مشروط نہیں پائی جاتی بلکہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے جو اِس قسم کی عبارت کے منافی ہے۔

تعجب ہے کہ پُرانے مفسرین میں سے بھی بعض نے یہی معنے کئے ہیں حالانکہ وہ عربی زبان کے بڑے ماہر تھے اُن کا اس عربی عبارت میں سے یہ معنے نکال لینا ایک حیرت کی بات ہے۔

آیت لَمْ یَکُنِ الخ کا ترجمہ کرنے میں بعض مفسرین کو ٹھوکر

مگر پھر خود ہی اُن کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ اگر اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ آنے والے نبی کے اظہار سے یعنی اس عقیدہ کے اظہار سے کہ ایک موعود رسول آنے والا ہے وہ نہیں رُکے جب تک کہ نبی نہیں آگیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں تو اہل کتاب کے ساتھ مشرکین کا بھی ذکر آتا ہے کیا مشرک بھی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ایک رسول دنیا میں آنے والا ہے۔ پھر اس کا خود ہی انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ کچھ مشرک لوگ اہل کتاب کے اثر کے ماتحت یہ امیدیں رکھتے تھے کہ ایک رسول آنے والا ہے۔ حالانکہ یہ عبارت ایسی ہے کہ اس سے "کچھ" کا استنباط ہو ہی نہیں سکتا۔ تمام مشرکوں کو اہلِ کتاب کے ساتھ شریک کیا گیا ہے اس لئے یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہاں بعض مشرکوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ سب اہل کتاب اور مشرک رُکنے والے نہیں تھے۔ پس اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اس اعلان سے نہیں رُکے کہ ایک موعود آنے والا ہے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ ہر مشرک یہ امید رکھتا تھا کہ ایک رسول آئے گا حالانکہ یہ امر بالبداہت باطل ہے۔ مشرکوں میں تو ایسے لوگ بھی تھے جو نزولِ الہام کے بھی قائل نہیں تھے کجا یہ کہ وہ کسی

۲۱۱
آیت لَمْ یَکُنِ الخ کا صحیح ترجمہ

مامور کی بعثت کا انتظار کر رہے ہوتے۔ پھر اگر یہی معنے کئے جائیں کہ وہ ایک مامور کی اُمید سے نہیں رُکے جب تک کہ رسول اُن کے پاس نہیں آگیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں لَمْ یَکُنْ مُنْفَکِّیْنَ کے کیا معنے ہوئے؟ اس فقرہ کے تو یہ معنے ہیں کہ وہ رسول کے آنے کے بغیر اپنے مقام سے اِدھر اُدھر ہل نہیں سکتے تھے اور رسول کے آنے پر یہ کہنا کہ ہم کسی رسول کے منتظر نہیں تھے یا ہمیں کسی مامور کی امید نہیں تھی۔ اس میں ہٹ نہ سکنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رسول کی آمد کا انکار تو جو چاہے اپنے ارادہ سے کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امر اول کا بدلنا منشاءِ الٰہی کے ماتحت ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے کیونکہ لَمْ یَکُنْ فَاعِلًا حَتّٰی کے معنے عربی زبان میں فاعل کی اس خواہش کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بہتر ہے کہ ایسا تغیر ہو جائے۔ لیکن جو معنے اُن مفسروں نے کئے ہیں اُن سے خدا تعالیٰ کی خواہش نہیں بلکہ عدم خواہش ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا تعالیٰ چاہتا تھا کہ یہ لوگ رسول کی آمد کا انتظار چھوڑ دیں کیونکہ ایسا کرنا گمراہی ہے اور خدا تعالیٰ کسی کے گمراہ ہو جانے کو پسند نہیں کرتا۔ اُردو زبان میں بھی اس قسم کی عبارات کے معنوں پر غور کرو تو حقیقت کھل جائے گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جب تک اُستاد نہ رکھا اس لڑکے نے پڑھا ہی نہیں۔ اس کے بے شک یہ معنے ہیں کہ اُستاد رکھنے سے اُس نے پڑھا لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ظاہر ہے کہ کہنے والے کی خواہش بھی اس میں مخفی ہے کہ لڑکے کے پڑھ جانے کو وہ پسند کرتا تھا یہ نہیں کہ وہ پسند نہیں کرتا تھا اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ان مفسرین کے معنوں کو دیکھو تو اس آیت کا ترجمہ اُن کے خیال کے مطابق یہ ہوگا کہ رسول آیا تب کہیں جا کر ان لوگوں نے رسول کی آمد کا انتظار چھوڑا اور ظاہر ہے کہ اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ کہنے والا چاہتا تھا کہ یہ رسول کی آمد کا انتظار چھوڑ دیں اور ایسا خیال اللہ تعالیٰ

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا

یعنی اللہ (کی طرف) سے آنے والا ایک رسول جو (انہیں ایسے) پاکیزہ

مُّطَهَّرَةً ۝

صحیفے پڑھ کر سناتا ۳ـــ۵

کی نسبت سخت گستاخانہ خیال ہے۔

علامہ واحدی کہتے ہیں کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آکر ضلالت وکفر کو ظاہر نہیں کیا اہل کتاب اور مشرک اپنے کفر سے باز نہ آئے اور چونکہ اس مقام پر اُن کے دل میں بھی یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ یہاں تو سب اہل کتاب اور مشرکین کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ایمان لانے والے اہل کتاب اور مشرکوں کے بارہ میں ہے یعنی اہل کتاب میں سے کافر اور مشرکوں میں سے کافر نہ رُکے یعنی ایمان حالانکہ یہاں صاف طور پر کَفَرُوْا کا لفظ آتا ہے اگر اُن کا خیال درست ہو تو یُوں کہنا چاہیئے تھا اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر لکھتے ہیں وَھٰذِہِ الْاٰیَۃُ مِنْ اَصْعَبِ مَا فِی الْقُرْاٰنِ نَظْمًا وَّ تَفْسِیْرًا وَقَدْ تَخَبَّطَ فِیْہِ الْکِبَارُ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَسَلَکُوْا فِیْ تَفْسِیْرِھَا طُرُقًا لَا تُفْضِیْ بِھِمْ اِلَی الصَّوَابِ (فتح البیان) یعنی یہ آیت عبارت اور تفسیر کے لحاظ سے قرآن کریم کی مشکل ترین آیتوں میں سے ہے اور بڑے بڑے علماء اس میں ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں اور انہوں نے اس کے معنے کرتے ہوئے ایسے طریق اختیار کئے ہیں جو انہیں صحیح نتیجہ پر پہنچانے سے قاصر رہے۔

جہاں یہ بات درست ہے کہ بعض علماء نے اس کے معنوں میں ادبی غلطیاں کی ہیں یعنی جو معنے نہیں ہو سکتے تھے وہ کر دئے ہیں مثلاً یہ کہ یہود نے انتظار نبی نہ چھوڑا جب تک نبی نہ آ گیا وہاں علامہ واحدی کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے صحیح مطلب سمجھا ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ اُن کے معنے بھی درست نہیں۔ لَمْ یَکُنْ مُنْفَکِّیْنَ کے معنے "وہ نہیں رُکے" کسی صورت میں بھی درست نہیں اس کے معنے ہمیشہ "وہ رُکنے والے نہ تھے" کے ہوتے ہیں۔ بہرحال اس آیت کے معنے سمجھنے میں دقتیں ضرور پیش آئی ہیں مگر یہ دقتیں خود پیدا کردہ ہیں کیونکہ مُنْفَکِّیْنَ کے حقیقی معنوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اگر سیاقِ عبارت سے اس کا مفہوم نکال لیا جاتا تو بات آسان ہو جاتی۔ کَفَرُوْا کا لفظ پہلے گذر چکا تھا۔ اس لئے مُنْفَکِّیْنَ کے معنے یہی ہو سکتے تھے کہ مُنْفَکِّیْنَ عَنْ کُفْرِھِمْ۔ اگر عَنْ کُفْرِھِمْ کو محذوف نکال لیا جاتا تو معنوں کی دقتیں پیش نہ آتیں اور مضمون بالکل ظاہر ہو جاتا ؛

۳ـــ۵ حل لغات۔ مُطَهَّرَۃٌ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَہٗ طَاھِرًا۔ اُس کو پاک کر دیا (اقرب) اس لحاظ سے مُطَهَّرَۃٌ کے معنے ہوئے۔ ایسے صحیفے جو پاک کئے گئے ہیں اور چونکہ عربی زبان میں تَطْھِیْر کا لفظ ختان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس ذریعہ سے زائد چیزیں نکال دیتے ہیں اس لئے مُطَهَّرَۃٌ کے یہ بھی معنے ہوئے کہ ایسی چیز جس میں سے زوائد نکال دئے گئے ہوں۔ پس مُطَهَّرَۃٌ کے دو معنے ہوئے ایک یہ کہ جس میں سے گند نکال دیا گیا ہو اور دوسرے یہ کہ جس میں سے زوائد نکال دئے گئے ہوں۔ اسی طرح طَھَّرَ الشَّیْءَ بِالْمَاءِ کے معنے ہوتے ہیں غَسَلَہٗ اس کو پانی سے دھو دیا (اقرب) اس لحاظ سے مُطَهَّرَۃٌ کے معنے ہوں گے دُھلے دُھلائے۔

مفردات راغب میں لکھا ہے اَلطَّھَارَۃُ ضَرْبَانِ۔ طہارت دو قسم کی ہوتی ہے طَھَارَۃُ جِسْمٍ وَّطَھَارَۃُ نَفْسٍ ایک جسم کی طہارت اور ایک نفس کی طہارت۔ وَحُمِلَ عَلَیْھِمَا

مُطَهَّرَۃٌ

مُطَهَّرَۃٌ کے معنے امام راغب کے نزدیک

عَامَّةُ الْاٰیَاتِ اور قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن میں طہارت کا
لفظ آیا ہے وہاں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جو قَوْلُہٗ
فِیْ صِفَۃِ الْقُرْاٰنِ مَرْفُوْعَۃٍ مُّطَهَّرَةٍ وَ قَوْلُہٗ وَ
ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ یعنی قرآن کریم میں دوسری جگہ سورۂ عبس میں
جو مَرْفُوْعَۃٍ مُّطَهَّرَةٍ کے الفاظ آتے ہیں یا سورۂ مدثر
میں وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ کے الفاظ آتے ہیں قِیْلَ مَعْنَاہُ
نَفْسَکَ۔ فَنَقِّهَا مِنَ الْمَعَایِبِ۔ ان دونوں کے معنے
یہ ہیں کہ معائب سے اپنے نفس کو پاک کر۔ مفردات والے چونکہ اختصار
سے کام لیتے ہیں اس لئے انہوں نے دونوں آیتوں کے یکجا معنے
کر دیئے ہیں اور اُن کی مراد یہ ہے کہ یہی معنے مَرْفُوْعَۃٍ مُّطَهَّرَةٍ
کے بھی ہیں یعنی بلند شان والا اور عیبوں سے پاک۔ وَقَوْلُہٗ
وَطَهِّرْ بَیْتِیَ وَ قَوْلُہٗ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ
اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ فَحَثٌّ عَلٰی تَطْهِیْرِ الْکَعْبَۃِ مِنْ
نَجَاسَۃِ الْاَوْثَانِ یعنی قرآن میں جو آتا ہے کہ طَهِّرْ بَیْتِیَ
لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (الحج ع)
یا دوسری جگہ فرمایا ہے وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ
اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ
السُّجُوْدِ (البقرۃ ع) ان ہر دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ
اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کو ترغیب دلائی ہے کہ وہ کعبہ کو بتوں
کی نجاست سے پاک کر دیں۔ پس تطہیر کے ایک معنے شرک سے
پاک کرنے کے ہوئے۔ گویا لغت کی ان دونوں کتابوں کی رُو سے
نجاست ظاہری اور نجاست باطنی دونوں کو دور کرنے کے لئے تطہیر
کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ان معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مُطَهَّرَةً
کے پانچ معنے ہوئے۔

عربی زبان میں پاکیزگی کے معنے ادا کرنے کے لئے سات الفاظ اور ان کے استعمال میں فرق

مُطَهَّرَة کے پانچ معنے

اوّل۔ نجاست ظاہری سے پاک
دوم۔ زوائد سے پاک
سوم۔ دُھلے دُھلائے
چہارم۔ طہارت باطنی رکھنے والے
پنجم۔ شرک سے پاک۔

عربی زبان میں پاکیزگی کے مفہوم کے لئے جو الفاظ استعمال
ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :-
نَظَافَۃٌ۔ طَهَارَۃٌ۔ طِیْبَۃٌ۔ نَقَاءٌ۔ زَکَاءٌ۔ صَفَاءٌ
نَزَاهَۃٌ۔

ان میں سے طہارت جسمی اور نفسی ہوتی ہے یعنی نجس کے مقابل پر
یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں پانی کو طہور کہا گیا ہے
لیکن اس کے مقابل میں مٹی کو طیّب کہا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (الفرقان ع) لیکن
مٹی کے متعلق فرماتا ہے فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا (المائدہ ع)
اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ تو فرمایا ہے کہ طَهِّرْ بَیْتِیَ
(الحج ع) لیکن عربی محاورہ کے مطابق یہ نہیں کہا جائے گا کہ
طَیِّبْ بَیْتِیَ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) طہارت میں خارجی
نجاست کے دور کرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تطہیر
کے معنے خارجی نجاست خواہ جسمانی ہو یا روحانی اُس کو دور کرنے
کے بھی ہوتے ہیں لیکن طِیْبَۃٌ کا لفظ ذاتی جوہر کی طرف اشارہ
کرتا ہے خارجی نجاست کی طرف نہیں۔ چنانچہ طَهَّرَ کے معنے تو
صاف کر دینے کے ہوتے ہیں لیکن طَیَّبَ کا لفظ جب ایک عرب بولیگا
تو خارجی نجاست کو دور کرنے کے معنوں میں وہ اسے کبھی استعمال
نہیں کرے گا بلکہ اس کے معنے مزیدار یا اچھا بنانے یا مزیدار یا
اچھا پانے کے ہوتے ہیں چنانچہ طَیَّبَ الشَّیْءَ کے یہ معنے نہیں
ہوں گے کہ اُس نے نجاست ظاہری دور کر دی بلکہ طیّب ہمیشہ
مزیدار یا اچھا بنانے یا مزیدار یا اچھا پانے کے معنوں میں استعمال
ہوتا ہے مثلاً طَیَّبَ اللَّحْمَ کے معنے ہوتے ہیں اُس نے گوشت
اچھا پکایا اور اُسے مزیدار بنایا یا اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اُس
نے گوشت کو اچھا پایا۔ کھانا کھایا تو کہا کہ کھانا بڑا اچھا پکایا گیا تھا
یا خوب مزیدار تھا۔ اگر زمین پر بوٹی گر جائے تو ہم یہ تو کہیں گے
کہ طَهِّرْ اس بوٹی کو صاف کر دو لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ طَیِّبْ۔
لیکن اچھا پکانے یا اچھا پانے کے مفہوم کو جب ہم ادا کرنا چاہیں گے
تو اُس کے لئے طَهِّرْ کا لفظ استعمال نہیں کریں گے۔ اسی طرح
طیّب کے معنے امن یا سکون دینے کے بھی ہوتے ہیں یعنی
اصلاحِ نفس کے۔

پس طَهَارَةٌ اور طِيبَةٌ میں یہ فرق ہے کہ طہارت نجاست خارجی سے حفاظت پر دلالت کرتی ہے مگر طیبہ صرف ذاتی خوبی پر دلالت کرتی ہے۔ جیسے مزا۔ خوبصورتی۔ مٹھاس یا کسی چیز کا فائدہ بخش ہونا۔ ایک میٹھی اور مزیدار شے کو ہم طیّب کہیں گے طاہر نہیں کہیں گے یا مثلاً کوئی چیز خوبصورت ہو یا مفید ہو تو ہم اس کو طیّب تو کہیں گے مگر طاہر نہیں کہیں گے۔ اسی طرح کسی چیز کو نجاست لگ جائے تو اُس کو صاف کرنے کے لئے طَهِّرْ کہیں گے طَيِّبْ نہیں۔ بہرحال طاہر تب کہیں گے جب نجاست ظاہری سے کسی چیز کو بچایا جائے خواہ یہ نجاست جسمانی ہو یا روحانی۔ مثلاً ایک طاہر القلب انسان ہو یعنی وساوس شیطانی سے پاک ہو تو اسے بھی ہم طاہر کہہ دیں گے اور اگر کوئی شخص نہا دھوکر نکلا ہو تو اُسے بھی طاہر کہا جائے گا۔

نظافت بھی خارجی نجاست سے پاکیزگی کا نام ہے جیسے میل وغیرہ سے۔ یا حُسن و خوبصورتی کا مالک ہونے پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ کہتے ہیں تَنَظَّفَ الشَّيْءُ میل کچیل سے پاک تھی یا خوبصورت تھی۔ لیکن کبھی یہ لفظ باطنی نجاست سے پاک ہونے کے لئے بھی بول لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں فُلَانٌ نَظِيفُ الْأَخْلَاقِ یعنی فلاں شخص مہذب ہے مگر یہ لفظ اخلاق کے لئے بولا جائے گا یا میل کچیل کے لئے۔ مزید او یا لطیف کے لئے نہیں بولا جائیگا اور صفائی کے لئے زیادہ تر ظاہر قسم کی صفائی کے لئے بولا جائیگا نہ کہ باطنی صفائی پر۔ اسی طرح اخلاق کے لئے تو بولا جائیگا روحانی صفائی کے لئے نہیں۔ اس وجہ سے اس کے معنے طاہر سے مختلف ہیں کہ وہ روحانی پاکیزگی اور نفسیاتی پاکیزگی پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ کو طیّب سے اس امر میں مشارکت ہے کہ حسن و بہاؤ کے لئے بھی نظافت کا لفظ آتا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا مگر احادیث میں اصل معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور استعارۃً بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نَظِّفُوْا اَفْوَاهَكُمْ اپنے مونہوں کو پاک کیا کرو۔ اس جگہ پاک کرنے کے معنے یہ ہیں کہ جھوٹ فریب اور دغا وغیرہ سے اپنے آپ کو بچاؤ اور کہیں کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نہ نکالو جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو یہاں نظافت کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا ہے نہ کہ اصل ظاہری معنوں میں۔

نِقَاء کا لفظ بھی قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا حدیث میں ہوا ہے۔ اس کے اصل معنے مغز نکالنے کے ہوتے ہیں اور ان معنوں کے رُو سے استعارۃً صفائی کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگ گیا ہے۔ جیسے چھلکے کو دُور کرکے مغز نکالتے ہیں یا ہڈی کو توڑ کر گُودہ نکالتے ہیں۔ انہی معنوں سے استدلال کرکے محاورہ میں نظیف۔ حسین اور خالص کے معنے دیے لگ گیا ہے

زَكٰوةٌ کے اصل معنے اندرونی نجاست کے دُور کرنے کے ہوتے ہیں لیکن کبھی ظاہری صفائی کے معنوں میں بھی استعارۃً استعمال ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

صَفَاءٌ کے معنے ملاوٹ سے نجات پانے کے ہوتے ہیں یا منتخب ہونے کے ہوتے ہیں استعارۃً ظاہری صفائی کیلئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

نَزَاهَةٌ کے معنے اصل میں تو دُور ہونے کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ میں جو چیز گندگی اور فساد سے دُور ہو اُس کے لئے بھی یہ لفظ بولا جانے لگا ہے۔

ان سب لفظوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہر سب سے اعلیٰ اور کامل لفظ ہے جو صفائی کے مفہوم کے لئے عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنے وسیع ہیں اور یہ ظاہر و باطن دونوں حالتوں کی صفائی پر بیک وقت دلالت کرتا ہے اور طیّب کی نسبت جو معنوں میں اس کے بہت زیادہ قریب ہے یہ زیادہ مضبوط ہے کیونکہ قرآن کریم نے اصل کے لئے طہارت اور نائب کے لئے طیّب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسے پانی کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ مَآءً طَهُوْرًا (الفرقان ع۵) لیکن مٹی کی نسبت فرمایا ہے صَعِيْدًا طَيِّبًا (المائدہ ع۲)

تفسیر: اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اہل کتاب اور مشرک کفر کو کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ نہ آجاتی۔ بیّنہ کے معنے جیسا کہ بتائے جا چکے ہیں واضح اور

جلی کے ہوتے ہیں پس حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ کے معنے یہ تھے کہ جب تک ایک واضح اور روشن چیز اُن کے پاس نہ آجاتی وہ کفر سے نکل نہیں سکتے تھے اور چونکہ بیّنہ کے ایک معنے دلیل اور حجت کے بھی ہوتے ہیں اس لئے اِس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ جب تک اُن کے پاس دلیل اور حجت نہ آجاتی وہ اپنے کفر سے باز رہنے والے نہیں تھے۔ اب اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ بیّنہ سے مراد ہر دلیل نہیں کہ تم یہ خیال کر لو کہ دلائل اور براہین سے وہ اپنے کفر کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔ اِسی حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے حَتّٰی تَاْتِیَهُمْ بَیِّنَةٌ نہیں فرمایا بلکہ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ فرمایا ہے یعنی بیّنہ پر الف لام داخل کیا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے کفر و شرک کے زمانہ میں جب چاروں طرف معصیت کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوں ہر دلیل کام نہیں آیا کرتی۔ جیسے اِس زمانہ میں بھی بعض لوگوں کے سامنے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دعویٰ پیش کیا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں آپ پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے لئے قرآن کریم کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بالکل غلط ہے ایسے زمانہ میں اَلْبَیِّنَةُ کی ضرورت ہوتی ہے اور اَلْبَیِّنَةُ سے ہماری مراد رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ ہے یعنی ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کا رسول ہی دنیا کی اصلاح کر سکتا ہے کوئی کتاب لوگوں کی ہدایت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی جب چاروں طرف کفر پھیل جائے، جب لوگ خدا تعالیٰ سے غافل ہو جائیں، جب اُس سے محبت اور پیار کے تعلقات منقطع کر لیں تو خواہ وہ اہل کتاب ہی ہوں اُس وقت کوئی الہامی کتاب بھی اُن کے کام نہیں آتی صرف رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کام آتا ہے۔ ایسا شخص ہی لوگوں کی نجات کا باعث بن سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت و رسالت کے مقام پر کھڑا ہو اور اپنی قوت قدسیہ سے نفوس کو پاکیزہ کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ اگر یہاں صرف بیّنہ کا لفظ ہوتا تو لوگ کہتے کہ بیّنہ سے مراد کتاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ کتاب لوگوں کی اصلاح کے لئے کافی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا ذکر کرنے کے بعد بیّنہ کا ذکر کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے پاس کتاب موجود تھی مگر وہ اُن کو کفر سے نہ بچا سکی۔ باوجود اہل کتاب ہونے کے ایسے گرے کہ کفار میں شامل ہو گئے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لئے کافی ہوتی ہے بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسے موقعہ پر وہی دلیل کام آتی ہے جو رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کی شکل میں ہو دوسری کوئی دلیل کام نہیں آیا کرتی خواہ کتاب موجود ہو، تحریف و الحاق سے مبرّا ہو پھر بھی ضرورت اِس بات کی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر تازہ ایمان پیدا ہو، اُس سے تازہ تعلق ہو، اُس کی محبت اور پیار کے تازہ کرشمے ظاہر ہوں اور یہ بات بغیر نمونہ اور بغیر اللہ تعالیٰ کے تازہ نشانات کے حاصل نہیں ہو سکتی بے شک اُس وقت کتاب تو ہوتی ہے مگر وہ بولتی نہیں۔ لوگوں کے لئے اُس کا وجود اور عدم وجود بالکل یکساں حیثیت رکھتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو اُس کے ذریعہ وہ کتاب پھر بولنے لگتی ہے، پھر اُس کے انوار لوگوں کے قلوب کو گرماتے اور اُن کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مخمور کرتے ہیں اور پھر اُن کے ایمانوں میں ایک نئی تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

بیّنۃ کے معنے

حضرت مسیح موعودؑ کی بعثت کی ضرورت

آیت لَمْ یَکُنْ میں چکڑالویوں اور پیغامیوں کا رد

اِس آیت نے چکڑالویوں کا بھی رد کر دیا جو کہتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن کافی ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اسی طرح پیغامیوں کا بھی رد کر دیا جو کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب قرآن لے آئے ہیں تو اس کے بعد کسی رسول کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارے یہ خیالات بالکل غلط ہیں وسیع فساد کے وقت میں وہی دلیل کام آیا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے رسول کی شکل میں ظاہر ہو۔ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اُس وقت وہ بیّنہ کام آتی ہے جو رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کی شکل میں ظاہر ہو کیونکہ یہ وقت محتاج ہوتا ہے کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک زندہ وجود ظاہر ہو جو خدا تعالیٰ کے تازہ نشانات کو ظاہر کرنے والا ہو۔ اُس کی طرف سے نئے نئے نشانات دکھانے والا ہو۔ اُس کی محبت اور پیار کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے والا اور قلوب میں عشق الٰہی کی آگ کو بھڑکانے والا ہو اور وہ دنیا پر

یہ ظاہر کرسکتا ہو کہ ہمارا خدا آج بھی ویسا ہی زندہ ہے جیسے
پہلے زندہ تھا۔ اب بھی ویسا ہی کلام کرتا ہے جیسے پہلے کلام کیا
کرتا تھا اور اب بھی اپنے پیاروں کی تائید میں ویسے ہی نشانات
دکھاتا ہے جیسے پہلے دکھایا کرتا تھا۔ تب لوگوں کے دلوں کے تالے
کھلتے اور اُن کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوتے
ہیں۔ اِس کے بغیر اُن کی روحانی زندگی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔
يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ مُطَهَّرَة کے معنے حل لغات
میں آچکے ہیں جو یہ ہیں:۔

اوّل۔ عیبوں سے پاک
دوم۔ زوائد سے پاک
سوم۔ دُھلا دُھلایا
چہارم۔ ظاہری نقص سے پاک
پنجم۔ شرک سے پاک

پس يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً کے یہ معنے ہوئے کہ وہ
ایسے صحیفے پڑھ کر سناتا ہے جو عیبوں سے پاک کئے ہوئے
ہیں۔ اِن معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ (۱) پہلی
کتابوں میں بعض باتیں غلط اور اللہ تعالیٰ کے الہام کے خلاف
مل گئی تھیں اور وہ کتب اُس صورت میں باقی نہیں رہی تھیں جس
صورت میں کہ وہ نبی پر اُتاری گئی تھیں اب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم
کے ذریعہ اُن تعلیمات کو جو درحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے
نازل نہ ہوئی تھیں بلکہ بعد میں لوگوں نے اُن کتابوں میں ملا دی
تھیں دُور کر دیا اور اتنا حصہ تعلیم کا قرآن کریم میں نازل فرما دیا
جو واقعہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ گویا عیب سے
پاک کیا ہوا کے معنے یہ ہیں کہ جو نقائص پہلی کتب میں پیدا ہو گئے
تھے اُنہیں اس کتاب میں دُور کر دیا گیا ہے یا جو باتیں مل گئی
تھیں اُن کی اصلاح کی گئی ہے۔

ایک معنے اِس لحاظ سے یہ بھی بنیں گے کہ گو بعض حصے
پہلی کتابوں کے واقعہ میں الہامی ہیں لیکن موجودہ زمانہ کے لحاظ سے
وہ قابلِ عمل نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو
بھی چھوڑ دیا۔ کیونکہ گو منبع کے لحاظ سے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے
ہیں مگر حالات کے لحاظ سے اب خدا تعالیٰ نے انہیں منسوخ قرار
دے دیا ہے پس کامل کتاب میں اب اُن کا کوئی مقام نہیں ہے۔

دوسرے معنے مُطَهَّرَة کے زوائد سے پاک کے تھے
اِن کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ایسی باتیں جنہیں
گو خراب تو نہیں کہا جا سکتا مگر وہ زوائد میں سے ہیں اُنہیں
بھی قرآن کریم نے ترک کر دیا ہے۔ پہلی چیز کی مثال ایسی ہے
جیسے پہلے زمانہ میں شراب حرام نہ تھی اسلام نے شراب کو
حرام قرار دے دیا۔ یا پہلے زمانہ میں سود کلیۃً حرام نہ تھا لیکن
قرآن کریم میں سُود کو کلیۃً حرام قرار دے دیا گیا۔ اور زوائد کی
مثال ایسی ہے جیسے پہلے زمانہ میں عبادت کے لئے یہ شرط رکھی
گئی تھی کہ خاص طور پر پاک کئے گئے مقام پر ہی عبادت ہو سکتی
ہے اور اس قسم کی شرطیں بھی تھیں کہ ایسے پردے ہوں۔ ایسا مکان
ہو۔ یہ باتیں اپنی ذات میں بُری تو نہیں لیکن عبادت کے لحاظ سے
زوائد ہیں۔ ان سب قیود کو اسلام نے اڑا دیا۔ بے شک اسلام
نے بھی ایک سیدھی سادی مسجد عبادت کے لئے مقرر فرمائی ہے
لیکن اُس کو عبادت کے لئے ضروری قرار نہیں دیا۔ اگر مسجد نہ ہو تب بھی
مسلمان کی عبادت ہو جاتی ہے مگر یہود و نصاریٰ کی عبادت کیلئے
ایک خاص مقام اور ایک خاص قسم کی تیاری کی قید تھی جو اسلام
میں نہیں کیونکہ قرآنی تعلیم مختون ہے یعنی اس میں سے زوائد کاٹ
دیئے گئے ہیں صرف ضروری امور کو لے لیا گیا ہے۔

۲۱۱ صحف کے مطہرہ ہونے کا مطلب

تیسرے معنے مطہّرة کے دُھلے ہوئے کے ہیں۔ دُھلی ہوئی
چیز اصل چیز سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ صرف اصل چیز پر جو خارجی
اثرات ہوتے ہیں اُن میں تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے۔ ان معنوں
کے لحاظ سے مُطَهَّرَة کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ فقہی پیچیدگیاں
جو یہودیوں یا عیسائیوں نے پیدا کر دی تھیں اُن سے قرآن کریم
نے نجات دلائی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب بھی کسی مذہب
پر لمبا زمانہ گذر جاتا ہے اُس کے ساتھ فقہی پیچیدگیاں شامل
ہو جاتی ہیں۔ فقہ کی اصل غرض تو یہ ہوتی ہے کہ جو مسائل الٰہی کتاب
میں نص کے طور پر نہیں آتے اُن کا استخراج کیا جائے لیکن آہستہ
آہستہ جب فقہ میں ضُعف آتا ہے خود اصل مسائل میں بھی تصرّف

شروع ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے نقائص کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اباحت کی طرف لے جاتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو ظاہر کی طرف انتہاء درجہ کی شدت کے ساتھ بلاتے ہیں۔ یہی حال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کا تھا اگر یہودیوں نے سزا کی تعلیم پر بے انتہاء زور دیا تھا تو عیسائیت نے نرمی کی تعلیم پر بے انتہاء زور دے دیا۔ اب یہ دونوں مسائل ہی ضروری تھے لیکن یہودی فقہ اور عیسائی فقہ نے ان دونوں کو الگ الگ احکام کی شکل میں بدل دیا۔ جب اسلام آیا تو اُس نے اس پیچیدگی کو بالکل دُور کر دیا اور غلط فقہ کا تعلیم پر جو اثر تھا اُس کو دھو دیا۔ مثلاً اسلام نے بھی کہا ہے کہ دانت کے بدلے دانت آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان۔ مگر اسلام نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ عفو بڑی اچھی چیز ہے تمہیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اسی طرح اسلام نے بھی یہی کہا کہ نرمی اور عفو بڑی اچھی چیز ہے مگر ساتھ ہی کہا کہ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ ع ۴) اُسی وقت عفو جائز ہے جب عفو کے نتیجہ میں مجرم کی اصلاح کی اُمید ہو۔ اگر یہ خیال ہو کہ عفو مجرم کو اَور بھی بگاڑ دے گا اور اُسے بُرے اعمال پر اَور زیادہ جرأت دلا دے گا تو اُس وقت عفو سے کام لینا تمہارے لئے جائز نہیں۔ غرض یہودی تعلیم میں یہ زور کہ ضرور دانت کے بدلہ میں دانت توڑو۔ آنکھ کے بدلہ میں آنکھ پھوڑو اور کان کے بدلہ میں کان کاٹو فقہ کا ہی نتیجہ تھا ورنہ موسیٰ کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی۔ اسی طرح عیسائیت کی تعلیم میں یہ بات کہ تم ضرور معاف کرو اور اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو فقہ کی وجہ سے ہی تھی ورنہ حضرت مسیحؑ تو صاف کہتے ہیں کہ میں تورات کو بدلنے کے لئے نہیں آیا۔ جب وہ تورات کو بدلنے کے لئے نہیں آئے تو اُس کے قانونِ سزا کو وہ کلیتہً کس طرح مٹا سکتے تھے۔

غرض وہ فقہی پیچیدگیاں جو یہودیوں اور عیسائیوں نے پیدا کر دی تھیں اور غلط فقہ کی وجہ سے جو نقائص رُونما ہو گئے تھے قرآن کریم نے اُن سب کو دُور کر دیا ہے اور یہی قرآن کریم کا مطہر یعنی دُھلا دُھلایا ہونا ہے کہ اُس نے ایسی تعلیم دی جو ہر قسم کی پیچیدگیوں سے پاک ہے۔

چوتھے معنے مُطَهَّرَةً کے ہیں ظاہری نقصوں سے پاک۔ ظاہری نقائص میں سے سب سے بڑا نقص زبان کا ہوتا ہے کیونکہ کتاب کا ظاہر اُس کی زبان ہی ہوتی ہے۔ اِس لحاظ سے مُطَهَّرَةً کے معنے یہ بنیں گے کہ قرآن کریم زبان کے نقصوں سے پاک ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا انکار دشمنانِ اسلام نے بھی نہیں کیا۔ شاذ و نادر کے طور پر کوئی غبی دشمن یا ایسا دشمن جو انصاف کو بالکل نظر انداز کر چکا ہو قرآن کریم کی زبان پر اعتراض کر دے تو اور بات ہے ورنہ بالعموم اُن عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی جو عرب کے رہنے والے تھے قرآن کریم کی زبان کی تعریف کی ہے اور یورپین مصنّف جو غیر متعصب ہیں انہوں نے بھی اس کی زبان کی داد دینے سے گریز نہیں کیا۔ پس مُطَهَّرَةً میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم زبان کے نقصوں سے پاک ہے۔ نہایت لطیف اور فصیح زبان میں نازل ہوا ہے اور پڑھنے والے کو حسنِ کلام سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ظاہری نقصوں سے پاک کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ زبان میٹھی اور دلکش ہو یعنی ظاہری نقص سے پاک ہونا ایک تو یہ ہے کہ زبان میں کوئی نقص نہ ہو۔ ثقیل الفاظ نہ ہوں۔ غیر طبعی محاورات نہ ہوں۔ دوسرے یہ بھی ظاہری نقص سے پاک ہونے کی علامت ہے کہ زبان شیریں اور دلکش ہو۔ یہ خوبی بھی قرآن کریم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اُس کی عبارت ایسی لطیف ہے کہ پڑھنے والا یہ نہیں سمجھتا کہ میں نثر پڑھ رہا ہوں یا نظم پڑھ رہا ہوں۔ ایک عیسائی مصنّف نے قرآن کریم کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ایک بڑی لطیف بات لکھی ہے وہ کہتا ہے قرآن کریم کا ترجمہ جب ہماری زبان میں کیا جاتا ہے تو عام طور پر لوگ اس کے متعلق کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کہتا ہے قرآن کریم کا ترجمہ سمجھ میں آ کس طرح سکتا ہے اس کا سٹائل ایسا ہے کہ نہ اُسے نثر کہا جا سکتا ہے نہ نظم۔ جب تک اس کے سٹائل کو مدنظر نہ رکھا جائے اُسوقت تک اُس کے معانی کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

پھر ایک ظاہری نقص فحش کلامی کا ہوتا ہے مگر قرآن کریم اس نقص سے بھی کلّیۃً پاک ہے۔ اُسے مضامین وہ ادا کرنے پڑتے ہیں کہ بعض دفعہ بغیر الفاظ کے ننگا ہونے کے اُن کو ادا نہیں کیا جا سکتا مگر قرآن کریم ان تمام مقامات پر سے ایسی عمدگی سے گذر جاتا ہے کہ مطلب بھی ادا ہو جاتا ہے اور طبعِ نازک پر گراں بھی نہیں گذرتا۔ اس کے مقابلہ میں ویدوں اور بائیبل وغیرہ میں بعض دفعہ ایسی باتیں آجاتی ہیں کہ اُن کا پڑھنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے ویدوں میں ایک منتر آتا ہے کہ فلاں بزرگ پیدا ہونے لگا تو چونکہ گندی جگہ سے گذرنے سے اُس نے انکار کر دیا پیٹ پھاڑ کر اُسے نکالا گیا۔ اس قسم کے الفاظ انسان کی طبیعت پر سخت گراں گذرتے ہیں مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویدوں میں ایسے منتر موجود ہیں جن میں فحش کلامی پائی جاتی ہے۔ اِسی طرح بائبل کے متعلق خود عیسائیوں نے اعتراف کیا ہے کہ اُس کے بعض حصے ایسے گندے ہیں کہ اُن کا پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو تو وہ حصے پڑھا ہی نہیں سکتے مگر قرآن کریم میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے حسِّ لطیف کو کوئی صدمہ پہنچتا ہو۔

پھر ایک ظاہری نقص کلام میں دل آزاری کا پایا جانا ہوتا ہے۔ پڑھنے والا جب کسی ایسی کتاب کو پڑھتا ہے جس میں دوسروں کی دل آزاری سے کام لیا گیا ہو تو وہ بُرا مناتا اور اُس کا قلب سخت اذیت محسوس کرتا ہے مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس میں کسی قوم کی دل آزاری نہیں کی گئی اور اگر کسی جگہ مجبوراً قرآن کریم کو بعض سخت الفاظ استعمال بھی کرنے پڑے ہیں تو وہاں اُس نے کسی کا نام نہیں لیا صرف اصولاً ذکر کر دیا ہے کہ بعض انسان ایسے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ مکہ والے ایسے ہیں یا یہودی ایسے ہیں یا عیسائی ایسے ہیں۔ اس کے مقابل پر جب دوسری الہامی کتب کو دیکھا جاتا ہے تو اُن میں یہ نقص نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ہی انجیل میں آتا ہے کہ انہوں نے فریسیوں اور فقیہوں سے جب انہوں نے نشان کا مطالبہ کیا تو کہا کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ مجھ سے نشان مانگتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یونس نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہیں دکھایا جائے گا۔ اِن الفاظ کو آج بھی یہودی پڑھتے ہوں گے تو سمجھتے ہوں گے کہ بدکار اور حرامکار وغیرہ الفاظ ہمارے باپ دادوں کے متعلق ہی استعمال کئے گئے ہیں یا مثلاً حضرت مسیحؑ نے اپنے دشمنوں کو سانپ اور سانپوں کے بچے قرار دیا ہے اور انجیل میں یہ الفاظ آج تک موجود ہیں۔ یہودی جب بھی یہ الفاظ پڑھتے ہوں گے اُن کے دل دُکھتے ہوں گے کہ یہ سخت الفاظ ہمارے آباء کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے جہاں مجبوراً بعض سخت الفاظ استعمال کئے ہیں وہاں کسی کا نام نہیں لیا بلکہ اشارۃً ذکر کر دیا ہے کہ بعض لوگوں میں یا بعض قوموں میں یہ یہ نقائص پائے جاتے ہیں یا فلاں فلاں اخلاقی خرابیاں اُن میں موجود ہیں۔ دشمن اِن الفاظ کو پڑھتا ہے تو اُس کے دل پر چوٹ نہیں لگتی وہ فوراً کہہ دیتا ہے کہ میں تو ایسا نہیں یہ اور لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پس قرآن کریم کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اُس میں دل آزاری کی کوئی بات نہیں۔

مُطَهَّرَةً کے لفظ سے باطنی خوبی کی طرف بھی اشارہ ہے ایک کتاب کی بڑی باطنی خوبی یہی ہو سکتی ہے کہ جن مطالب کا بیان کرنا ضروری ہو اُس میں اُن کو پوری طرح بیان کر دیا جائے کسی قسم کا نقص اُن کے بیان کرنے میں نہ رہ جائے۔ یہ خوبی بھی قرآن کریم میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ اُس نے جس مضمون کو بھی لیا ہے ایسی عمدگی سے ادا کیا ہے کہ اُس میں کسی قسم کا نقص ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

غرض قرآن کریم مطالب مقصودہ کے بیان کرنے سے قاصر نہیں۔ جو مطلب اُس نے لیا ہے اُس پر سیر کن بحث ایسی زبان میں کر دی ہے کہ ہر پڑھنے والا اسے سمجھتا ہے اور ہر مضمون کو ایسا کھول دیا ہے کہ حد ہی کر دی ہے۔ یہ خوبیاں بظاہر معمولی ہیں لیکن قوموں کی اصلاح اور اُن کی بیداری کے لئے اتنی اہم ہیں کہ ان کے بغیر مقصد میں کامیابی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے زیادہ دنیا کی اصلاح کی ہے۔

باطنی طور سے پاکیزگی کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اس کی تعلیم پاک ہو۔ کوئی خلافِ فطرت بات اس میں شامل نہ ہو۔

یہ امر بھی قرآن کریم میں انتہا درجہ تک پایا جاتا ہے اور ہر شخص جو قرآنی تعلیم پر ادنیٰ سا بھی تدبّر کرے اُسے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں جو خلافِ فطرت ہو۔ دوسری کتابوں کو پڑھو تو اُن میں کئی ایسی باتیں آجاتی ہیں جو خلافِ فطرت ہوتی ہیں۔

پھر قرآن کریم کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ اُس میں ہر فطرت کے مطابق تعلیم پائی جاتی ہے کسی قسم کا انسان ہو جب بھی قرآنی تعلیم اُس کے سامنے پیش کی جائے وہ اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسانی فطرت میں اللہ تعالےٰ نے کئی قسم کے مادّے رکھے ہیں کہیں غصّے کا مادّہ اُس میں پایا جاتا ہے کہیں رحم کا مادّہ اُس میں پایا جاتا ہے اور یہ دونوں مادے اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ضروری ہیں پس کامل کتاب وہی ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی فطرت کو ملحوظ رکھ کر تعلیم دے۔ اگر وہ ہر فطرت کو ملحوظ نہیں رکھتی تو یہ لازمی بات ہے کہ سب انسانوں کی پیاس اُس کتاب سے نہیں بُجھے گی اور جس فطرت کے خلاف اُس کتاب میں کوئی تعلیم پائی جائے گی وہ فطرت اُس سے بغاوت کرے گی۔ مثلاً وہ شخص جس کی طبیعت میں غصّے کا مادہ زیادہ ہے جب وُہ انجیل میں پڑھتا ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتا ہے یہ بھی کوئی کتاب ہے یہ تو زنخوں کی کتاب ہے اِس پر کون عمل کر سکتا ہے۔ اس کے مقابل میں جب ایک رحم دل انسان بائیبل کی یہ تعلیم پڑھتا ہے کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان تو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے یہ خدا کی کتاب نہیں ہو سکتی جس میں اس قدر سخت دلی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس میں ہر فطرت کے تقاضا کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سخاوت کا مضمون آتا ہے تو ایک سخی کا دل اُس سے تسلّی پا کر اُٹھتا ہے۔ اگر اقتصادیات سے دلچسپی رکھنے والا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اپنے مال کو اس طرح نہیں لٹانا چاہیئے کہ قوم کمزور ہو جائے تو وہ جب قرآن کریم میں پڑھتا ہے کہ مال بھی خدا تعالےٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیئے تو اقتصادی آدمی بھی تسلّی پا کر اُٹھتا ہے اور وہ کہتا ہے ضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کی تعلیم کے متعلق فرمایا ہے کہ وُہ کتابِ مکنون میں ہے یعنی گو اس کی ایک کاپی ظاہری کاغذوں پر لکھی جاتی ہے لیکن اس کی ایک نقل آسمانی کاتبوں نے انسانی دماغوں پر بھی لکھ دی ہے۔ فطرتِ انسانی جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے وہ سب قرآن میں ہیں اور قرآن جن چیزوں کا حکم دیتا ہے وہ سب انسانی فطرت میں موجود ہیں گویا اِس کی ایک کاپی انسانی دماغ پر لکھی ہوئی ہے اور ایک کاپی قرآن کریم کے اوراق پر لکھی ہوئی ہے۔ اِسی لئے جب کوئی شخص سمجھ کر اور عقل سے کام لے کر قرآن کریم پڑھتا ہے تو اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہیں باہر سے حکم نہیں مل رہے بلکہ اُس کے دل کی آواز کو خوبصورت لفظوں میں پیش کیا جا رہا ہے گویا قرآن کریم کوئی نئی شریعت بیان نہیں کرتا بلکہ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ گراموفون کی سُوئی انسان کے دماغ پر رکھ دی گئی ہے اور وہ انسانی فطرت کی تحریروں کو لفظوں کی زبان میں بدل کر رکھتی جاتی ہے۔ کوئی حکم گراں نہیں گذرتا، کوئی تعلیم نامناسب معلوم نہیں ہوتی، کوئی لفظ طبیعت میں خلجان پیدا نہیں کرتا بلکہ ہر لفظ اور ہر حرف ایک حکیم ہستی کی طرف سے نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر مُطَهَّرَةً کے دونوں معنوں کے لحاظ سے یعنی صفائی کے لحاظ سے اور شرک سے پاک ہونے کے لحاظ سے ایک اَور بھی لطیف مناسبت اِس آیت میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اِس سورۃ میں دو قوموں کا ذکر ہے ایک اہلِ کتاب کا اور دوسرے مشرکین کا۔ اہلِ کتاب کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں اہلِ کتاب کی کتابوں کے نقائص دُور کئے گئے ہیں اور مشرکوں کے لحاظ سے اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس کتاب میں شرک کی بیخکنی کر دی گئی ہے گویا ظاہری صفائی کے معنے اہلِ کتاب کے لحاظ سے ہیں اور باطنی صفائی کے معنے مشرکوں کے لحاظ سے ہیں۔ پس دوسرے معنے اس کے اہلِ کتاب اور مشرکین کی نسبت سے ہیں اور وہ یہ کہ جس طرح اہلِ کتاب اور

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

جن میں قائم رہنے والے احکام ہوں گے

مشرکوں کی اصلاح کے لئے یہ کتاب آئی ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کے لئے اس میں اُن کی کتب کو پاک وصاف کرکے بیان کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم جس طرح شرک سے پاک ہے اُس کی مثال دنیا کی اور کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی اور یہی اصلاح کا صحیح طریق ہے حقیقی اصلاح کبھی بھی دو ٹوک اعلان کے بغیر نہیں ہُوا کرتی۔ یہ ایک عام فلسفیانہ مسئلہ ہے کہ جب کبھی نقص بڑھ جاتا ہے اس کیلئے ریڈیکل چینجز RADICAL CHANGES یعنی غیر معمولی انقلاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شرک کے خلاف غیر مصالحانہ رنگ جیسا قرآن کریم نے اختیار کیا ہے اور کسی کتاب نے اختیار نہیں کیا۔ وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے دوسری سب اقوام شرک کے ازالہ میں ناکام رہی ہیں صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے ماننے والے ہی شرک سے نہیں بچے بلکہ اُس کی تعلیم کے زور کی وجہ سے اُس کی ہمسایہ قومیں بھی شرک سے نفرت کا اظہار کرنے لگی ہیں۔ عیسائیت کیسا مشرکانہ مذہب ہے لیکن اسلامی تعلیم کے اثر کے نیچے مشرک سے مشرک عیسائی بھی کہتا ہے کہ ہمارے مذہب میں کوئی شرک نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے مذہب کو تو نہیں چھوڑتا مگر کم سے کم شرک کا لفظ اُسے بھیانک نظر آنے لگ گیا ہے اور وہ اتنا کہنے پر ضرور مجبور ہو گیا ہے کہ ہم مشرک نہیں ہیں۔ اسلام ہندوستان میں آیا تو اس نے بتیس کروڑ دیوتا ماننے والے لوگوں کو برہمو سماج اور آریہ سماج کی شکل میں تبدیل کرکے ایک خدا کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا۔ پس حق یہی ہے کہ صحفِ مطہرہ ہی اہل کتاب اور مشرکوں کی اصلاح کر سکتے تھے اور یہ انہی کا کام تھا کہ ایک طرف سابق نبیوں کی اُمتوں کو اُن کی پاک شدہ تعلیم دے کر پاک کریں اور دوسری طرف غیر مصالحانہ انداز میں توحید کی تعلیم پیش کرکے شرک کو دُور کریں۔ پس قرآن کریم کا یہ دعویٰ بالکل سچ ہے کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین اپنے کفر سے باز آتے یہاں تک کہ انکے پاس ایک روشن دلیل آجاتی۔ کیسی روشن دلیل؟ اللہ کی طرف سے آنے والا ایک رسول جو ایک طرف تو اپنے عمل سے خدا تعالےٰ پر ایمان پیدا کرتا اور دوسری طرف ایسے صحیفے پڑھتا جو یہودیوں اور عیسائیوں اور دوسرے اہل کتاب کے سامنے اُن کی مسخ شدہ تعلیموں کو پاک کرکے رکھ دیتے اور تیسری طرف مشرکوں کے مشرکانہ عقیدوں کو سخت حملوں کے ساتھ کچل ڈالتا۔

قَيِّمَةٌ

کے حل لغات۔ قَيِّمَةٌ۔ قَيِّمٌ کے معنے متولی کے ہوتے ہیں چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْقَيِّمُ عَلَى الْاَمْرِ مُتَوَلِّيْهِ یعنی جب یہ کہا جائے کہ فلاں کام پر فلاں شخص قیّم ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اُس کا متولی ہے وَهِيَ قَيِّمَةٌ اور اگر کوئی عورت متولیہ ہو تو اُسے قَيِّمَةٌ کہا جائے گا۔

وَالْقَيِّمَةُ: اَلدِّيَانَةُ الْمُسْتَقِيْمَةُ۔ اور قیّمہ کے ایک معنے ایسے مذہب کے بھی ہوتے ہیں جس میں کوئی کجی نہ پائی جاتی ہو (اقرب)

قَيِّمَةٌ کے معنے امام راغب کے نزدیک

مفردات میں لکھا ہے دِيْنًا قِيَمًا اَیْ ثَابِتًا مُقَوِّمًا لِاُمُوْرِ مَعَاشِهِمْ وَمَعَادِهِمْ یعنی دینِ قیّم کے معنے ہیں ثابت رہنے والا دین۔ غیر متزلزل دین جو لوگوں کی معاش اور اُن کی معاد کو ٹھیک کر دینے والا ہو۔ پھر کہتے ہیں یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ فَقَدْ اَشَارَ بِقَوْلِهٖ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اِلَى الْقُرْاٰنِ وَبِقَوْلِهٖ كُتُبٌ قَيِّمَةٌ اِلٰى مَا فِيْهِ مِنْ مَعَانِيْ كُتُبِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ مَجْمَعُ ثَمَرَةِ كُتُبِ اللّٰهِ تَعَالَى الْمُتَقَدِّمَةِ یعنی یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ اِن الفاظ سے اللہ تعالےٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْۢ

اور (عجیب بات یہ ہے کہ) جن لوگوں کو (قرآن مجید جیسی مکمل) کتاب دی گئی ہے[ے] وہ اس واضح دلیل

بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

(یعنی رسول) کے آنے کے بعد ہی (مختلف گروہوں میں) تقسیم ہوئے ہیں[شہ]

سابق الہامی کتب کے جس قدر مطالب ہیں وہ اس میں آگئے ہیں کیونکہ قرآن کریم گذشتہ تمام الہٰی کتب کی تعلیمات کا مجموعہ ہے گویا فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ سب تعلیمیں جو گذشتہ انبیاء کے زمانہ میں نازل ہوئی تھیں اُن میں سے ایسی تعلیمیں جو قائم رہنے کی مستحق تھیں اور بنی نوع انسان کی معاش اور اُن کے معاد کو درست کرنے والی تھیں وہ ساری کی ساری تعلیمیں قرآن کریم میں آگئی ہیں۔

تفسیر۔ قَيِّمَةٌ کے معنے متولی اور مستقیم کے بیان کئے جا چکے ہیں اُن معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے

قرآن مجید میں کُتُبٌ قَيِّمَةٌ ہونے سے مراد

اوّل اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم میں ایسے احکام ہیں جو انسان کے متولی ہیں۔ متولی اُس کو کہا کرتے ہیں جو دوسرے کی اصلاح کرتا ہے، اُس کی نگرانی کا فرض ادا کرتا ہے، اُس کی حفاظت کرتا ہے اور اُس کی قوتوں کو صحیح کاموں پر صرف کرتا ہے۔ پس فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جن سے بنی نوع انسان کو ہر قسم کی ذلت اور خرابی اور نقص سے بچایا جاتا ہے۔ اُنکی صحیح تربیت کی جاتی ہے اور اُنہیں اپنے قویٰ کو بہتر سے بہتر طور پر استعمال کرنے کا طریق بتایا جاتا ہے گویا فطرتِ انسانی کو ہر قسم کے نقص سے بچانے اور اپنی طاقتوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر ظاہر کرنے کا کام وہ سکھاتا ہے۔

(۲) اسی طرح فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے یہ معنے ہونگے کہ وہ ایسا مذہب پیش کرتا ہے جو ہر قسم کی کجرویوں اور خرابیوں سے پاک اور سیدھے راستے پر لے جانے والا ہے۔

(۳) اور فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے یہ بھی معنے ہونگے کہ وہ انسان کی تمام ضرورتوں کو خواہ اِس دنیا سے تعلق رکھنے والی ہوں خواہ مرنے کے بعد کی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہوں پورا کرتا ہے اور اس میں ایسی تعلیم پائی جاتی ہے جو بدلنے والی نہیں قائم رہنے والی اور ثابت رہنے والی تعلیم ہے۔ گویا صحفِ مطہرہ میں تو زیادہ زور پچھلی تعلیموں کی خرابیوں کو دور کرنے اور شرک سے بچانے پر تھا اور فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ اس میں ایسی تعلیم ہے جو آئندہ دائمی طور پر انسان کے لئے ضروری ہوگی اور غیر متزلزل اور غیر متبدّل ہوگی۔

مفردات راغب کے معنوں کے لحاظ سے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے ایک یہ بھی معنے ہوں گے کہ اس میں وہ تمام تعلیمات آگئی ہیں جو مستقل اور ہر زمانہ کے لئے تھیں اور پہلی کتب میں بیان ہو چکی ہیں۔ گویا گذشتہ تعلیموں میں سے جس قدر اچھی تعلیمیں تھیں وہ سب کی سب اس میں آگئی ہیں۔

۵ تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی متفرق نہیں ہوئے مگر اُس وقت جب اُن کے پاس بیّنہ آئی یعنی جب وہ رسول آگیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تب اُنہوں نے تفرقہ کیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے مخاطب اہل کتاب کی یعنی قرآن کریم کے نازل ہونے کے وقت جو اہل کتاب دنیا میں موجود تھے اُن کی ایک عجیب حقیقت بیان کی ہے فرماتا ہے قرآن کریم آیا تو اس لئے تھا کہ اُن کو غلط رستوں اور غلط تعلیموں سے بچا کر ایک نقطہ پر لا کر جمع کر دے مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے، اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرتے، اپنی کتابوں میں شامل ہو جانے والی غلط تعلیموں سے

نوٹ:۔ ۵ تفسیر میں اس آیت کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے علاوہ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ اس سورۃ کی پہلی آیت میں جو یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ کہ اہل کتاب اور مشرک کبھی اپنے کفر کو چھوڑ کر توحید پر قائم نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ اُن کے پاس آنحضرت صلعم مبعوث ہو کر نہ آجاتے۔ اس دعویٰ کی دلیل میں اس آیت کو پیش کیا گیا ہے۔ یعنی بتایا گیا ہے کہ دیکھو آنحضرت صلعم کی بعثت کے موقع پر ہی اہل کتاب میں سے دو فریق ہو گئے۔ ایک گروہ تو اپنے کفر اور شرک کو چھوڑ کر توحید پر قائم ہو گیا اور ایک مخالف راہ اختیار کر کے چلی جاتی

متنبہ ہو جاتے اُلٹا قرآن کریم کی مخالفت شروع کردی اور صداقت سے اَور بھی زیادہ بھٹکنے لگ گئے یعنی جب تک یہ تعلیم نہیں آئی اُس وقت تک اگر یہ غلطی میں مبتلا رہے تو خیر معذور بھی سمجھے جا سکتے تھے۔ جب انہیں سچائی مل گئی تھی تب تو انہیں صحیح راستے پر چل پڑنا چاہیئے تھا مگر تعلیم آنے کے بعد یہ اور زیادہ سچائی کے مخالف ہو گئے۔ قرآن کریم سے پہلے تو یہ لوگ کہہ دیا کرتے تھے کہ الہام بھی ہو سکتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا مقرب بھی ہو سکتا ہے۔ نبی اور رسول بھی ہو سکتا ہے مگر جب قرآن آیا تو اس بات پر زور دینے لگ گئے کہ موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا حالانکہ پہلے یہودی خود زور دیا کرتے تھے کہ موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق ابھی ایک ایسا وجود آنے والا ہے جو آتشی شریعت اپنے ساتھ رکھتا ہو گا۔ یہی حال عیسائیوں کا تھا عیسائی بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی اور دوسری بعثت کے درمیانی عرصہ میں فارقلیط آئے گا۔ مگر جب وہ موعود آگیا جس کی موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی پیشگوئیوں میں خبر دی گئی تھی تو انہوں نے کہہ دیا کہ کوئی فارقلیط نہیں آئے گا۔ بجائے اِس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اِس انعام پر کہ اُس نے گذشتہ انبیاء کی پیشگوئیوں کو پورا کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا صداقت اور ہدایت کے قریب آتے، جو صداقتیں پہلے مانتے تھے اُن کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا۔

ایسا ہی نقشہ موجودہ زمانہ میں نظر آرہا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے قریب زمانہ میں مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی جو مدرسۂ دیوبند کے بانی تھے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے لکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد غیر تشریعی نبی آسکتا ہے مگر جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہی بات پیش کرتے ہیں تو مولوی محمد قاسم صاحب کے شاگرد دیوبندی علماء کہتے ہیں کوئی نبی نہیں آسکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کے بعد دروازۂ نبوت کلیۃً مسدود ہو چکا ہے اب نہ شرعی نبی آسکتا ہے نہ غیر شرعی نبی آسکتا ہے۔ غرض اُنہی کے شاگرد اور اُنہی کے مدرسہ میں پڑھے ہوئے اُن باتوں کا انکار کرنے لگ جاتے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمائیں اور جن کی تصدیق خود اُن کی اپنی کتب سے ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعویٰ سے پہلے بڑے بڑے مولوی منبروں پر کھڑے ہو کر ایسے اشعار پڑھا کرتے تھے جن میں یہ ذکر ہوتا تھا کہ عیسیٰؑ بھی مر چکا اور موسیٰؑ بھی۔ مگر جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وفاتِ مسیحؑ کا مسئلہ پیش کیا تو تمام علماء کو اپنی باتیں بھول گئیں اور وہ یہ شور مچانے لگ گئے کہ عیسیٰ زندہ ہے عیسیٰ زندہ ہے۔

۲۱۱
بیّنہ آنیکے بعد اہل کتب کے متفرق ہونے کا مطلب

اسی طرح یا تو ایک زمانہ میں سارے مسلمانوں کی غفلت اور اُن کی سُستی کا اصل باعث یہ تھا کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور تمام کفار کے اموال لُوٹ کر ہمارے سپرد کر دیں گے اور ہم بڑے آرام سے زندگی بسر کریں گے اور اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی مسیح موعود ہوں اور میں ہی وہ مامور ہوں جس کی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی تو مسلمانوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ کسی عیسیٰ اور مسیح نے نہیں آنا قرآن میں تو اِس قسم کی کوئی خبر ہی نہیں اور اگر حدیثیں کہتی ہیں تو وہ غلط ہیں۔ غرض یا تو پہلے تمام قوم کی بنیاد ہی اس امر پر تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور ہمارے گھروں کو زر و جواہر سے بھر دیں گے اور یا آج یہ حالت ہے کہ وہ اُن تمام پیشگوئیوں سے منکر ہو گئے ہیں جو مسیح موعود کے متعلق پائی جاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں کسی مسیح کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ چاہیئے تھا کہ قرآن کریم کے نازل ہونے پر وہ اُن تعلیموں پر غور کرتے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کے سامنے پیش کر رہے ہیں مگر ہُوا یہ کہ جتنا حق وہ پہلے مانتے تھے اُس کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا اور صداقت سے اَور بھی دُور چلے گئے ؎

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ

حالانکہ (یہ لوگ ایمان نہیں لائے، انہیں (اس رسول کے ذریعہ بس) یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ

الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا

اطاعت صرف اُسی کے لئے رہ جائے (اس حال میں کہ) وہ اپنے نیک میلانوں میں ثابت قدم رہنے والے ہوں اور (یہ بھی کہ اسلامی سیاست کا حکم دیا گیا تھا کہ)

الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ[1] ۝

نماز باجماعت ادا کرتے رہیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی ہمیشہ صداقت پر قائم رہنے والی جماعت کا دین ہے ۝۵

مُخْلِصِيْنَ ۝۶ حل لغات۔ مُخْلِصِيْنَ: اَخْلَصَ سے اسم فاعل کا جمع کا صیغہ ہے اور اَخْلَصَ خَلَصَ سے باب اِفعال ہے۔ خَلَصَ الشَّیْءُ خُلُوْصًا وَخَلَاصًا کے معنے ہیں صَارَ خَالِصًا کوئی شئے خالص ہوگئی۔ خالص کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جس میں کوئی غیر چیز ملی ہوئی نہ ہو اور جب خَلَصَ مِنَ التَّلَفِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں نَجَا بچ گیا وَسَلِمَ اور سلامت رہا۔ اور خَلَصَ الْمَآءُ مِنَ الْكَدَرِ کے معنے ہوتے ہیں صَفَا پانی گدلے پن سے بچ گیا مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں صَفَا کے جو معنے ہیں وہ حقیقی نہیں یعنے جب خَلَصَ الْمَآءُ مِنَ الْكَدَرِ کہتے ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ کدر کو اس سے دور کر دیا گیا بلکہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ پانی میں کدر تھا ہی نہیں۔ اور خَلَصَ اِلَيْهِ وَبِهِ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں وَصَلَ وہ چیز اس تک پہنچ گئی یعنی جب یہ کہیں کہ خَلَصَ فُلَانٌ اِلَيْهِ یا خَلَصَ فُلَانٌ بِهِ تو دونوں کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ پہنچ گیا۔ انہی معنوں میں عربی زبان کا یہ فقرہ ہے کہ خَلَصْتُ بِمُشْتَرًى مِنَ الْاَرْضِ میں صاف میدان میں پہنچ گیا (اقرب) اسی طرح اَخْلَصَ السَّمْنَ کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَ خُلَاصَتَهٗ گھی کا خالص حصہ الگ کیا اور اَخْلَصَ فِی الطَّاعَةِ کے معنے ہوتے ہیں تَرَكَ الرِّيَاءَ اُس نے ریاء چھوڑ دیا۔ اور اَخْلَصَ لَهُ النَّصِيْحَةَ وَالْحُبَّ کے معنے ہوتے ہیں خَلَصَهُمَا عَنِ الْغِشِّ اس نے نصیحت اور محبت میں کسی قسم کا فریب یا کھوٹ نہیں رکھا۔ اور اَخْلَصَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اِخْتَارَهٗ اس کو چن لیا (اقرب)

مفردات والے لکھتے ہیں اَلْخَالِصُ كَالصَّافِیْ۔ خالص کے معنے بھی وہی ہوتے ہیں جو صافی کے ہوتے ہیں اِلَّا اَنَّ الْخَالِصَ هُوَ مَا زَالَ عَنْهُ شَوْبُهٗ بَعْدَ اَنْ كَانَ فِيْهِ ہاں خالص اور صافی میں یہ فرق ہے کہ خالص اُس کو کہتے ہیں جس میں سے ملاوٹ کو الگ کر دیا گیا ہو بَعْدَ اَنْ كَانَ فِيْهِ ایسی حالت میں جبکہ اُس کے اندر پہلے ملاوٹ موجود ہو۔ وَالصَّافِیْ قَدْ يُقَالُ لِمَا لَا شَوْبَ فِيْهِ اور صافی دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اُس کے لئے بھی جس میں پہلے ملاوٹ تھی اور پھر اُسے نکال دیا گیا اور اُس کے لئے بھی جس میں ملاوٹ کبھی ہوئی ہی نہیں پھر لکھتے ہیں کہ یہ جو قرآن مجید میں آتا ہے وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ اس کا مطلب ہے اِخْلَاصُ الْمُسْلِمِيْنَ اَنَّهُمْ قَدْ تَبَرَّؤُا مِمَّا يَدَّعِيْهِ الْيَهُوْدُ مِنَ التَّشْبِيْهِ وَالنَّصَارٰى مِنَ التَّثْلِيْثِ۔ ہم ہر شرک اور تشبیہ سے بچے ہوئے ہیں نہ شرکِ جلی کرتے ہیں اور نہ شرک خفی۔ اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اس کے معنے بھی یہی ہیں جو نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ کے ہیں۔ اور آیت اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا میں اِخلاص کا مطلب ہے اَلتَّبَرِّیْ عَنْ كُلِّ مَا دُوْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى یعنی کامل توحید کے سوا ہر چیز سے

[1] ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ میں القیمہ کا موصوف محذوف ہے یعنی الملۃ القیمہ یعنی قائم رہنے والی ملت۔ چونکہ محذوف کو ظاہر کئے بغیر ترجمہ درست نہ ہوتا تھا اس لئے محذوف کو ظاہر کر دیا گیا۔

جب انسان تبرّی کرے اور کہے کہ میں اُس سے کوئی تعلق نہیں
رکھنا چاہتا تو وہ مخلص کہلاتا ہے

اَلدِّیْنُ: دَانَ کا مصدر ہے اور دَانَ (یَدِیْنُ
دِیْنًا وَ دِیَانَةً) اَلرَّجُلُ کے معنے ہیں عَزَّ۔ وہ عزّت
پا گیا۔ اور دَانَ الرَّجُلُ کے یہ بھی معنے ہیں کہ ذَلَّ وہ ذلیل
ہو گیا یا ماتحت ہو گیا۔ اور دَانَ کے معنے اَطَاعَ کے بھی ہیں
اور عَصٰی کے بھی ہیں گویا یہ حروفِ اضداد میں سے ہے یعنی
اُلٹ معنے بھی اس میں پائے جاتے ہیں اس کے معنے اطاعت
کے بھی ہیں اور اس کے معنے نافرمانی کے بھی ہیں۔ جس طرح اس
کے معنے عزت کے بھی ہیں اور ذلّت کے بھی یا بڑے کے بھی ہیں
اور چھوٹے کے بھی۔ اسی طرح اس کے معنے اطاعت کے بھی
ہیں اور نافرمانی کے بھی۔ اور دَانَ کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں
کہ اِعْتَادَ وہ عادی ہو گیا۔ یہاں بھی اس کے معنے اپنے اندر
اضداد کا رنگ رکھتے ہیں یعنی اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ اِعْتَادَ
خَیْرًا وہ خیر کا عادی ہو گیا اور اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ
اِعْتَادَ شَرًّا وہ شر کا عادی ہو گیا۔ اور دَانَ کے معنے بیمار
ہو جانے کے بھی ہیں چنانچہ لُغت میں اس کے ایک معنے یہ لکھے
ہیں کہ اَصَابَهُ الدَّاءُ اُسے بیماری لگ گئی اور دَانَ فُلَانٌ
فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں خَدَمَهٗ اُس کی خدمت کی یعنی
دوسرے کا خادم بن گیا اور دَانَ فُلَانٌ کے معنے اَحْسَنَ اِلَیْهِ
کے بھی ہوتے ہیں یعنی اُس پر احسان کیا اور دَانَ فُلَانٌ کے
کے معنے مَلَكَهٗ کے بھی ہیں یعنی اُس کا مالک ہو گیا اور دَانَ
کے معنے حَمَلَهٗ عَلٰی مَا یَكْرَهُ کے بھی ہوتے ہیں یعنی جس
چیز کو وہ پسند نہیں کرتا اُس پر اُسے مجبور کیا اور دَانَ فُلَانٌ
کے معنے اِسْتَعْبَدَهٗ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کو غلام بنالیا
اور یہ بھی معنے ہیں کہ حَكَمَ عَلَیْهِ اُس پر حکم چلایا۔ اور دَانَ
فُلَانٌ کے معنے اَذَلَّهٗ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کو اپنے
ماتحت کر لیا چنانچہ حدیث میں آتا ہے اَلْكَیِّسُ مَنْ دَانَ
نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔ ہوشیار وہ ہے جس
نے اپنے نفس کو تابع کر لیا اور موت کے بعد کے زمانہ کے لئے
عمل کیا (مفردات)

الدِّیْن

ان معنوں کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ دِیْنٌ جو مصدر
ہے اس کے اُوپر کے مصدری معنوں کے علاوہ اور کیا معنے ہیں
لُغت میں دِیْنٌ کے کئی معنے لکھے ہیں جو نیچے درج کئے جاتے ہیں۔
(۱) اَلْجَزَاءُ وَالْمُكَافَاةُ۔ بدلہ (۲) اَلطَّاعَةُ۔ اطاعت
اور فرمانبرداری (۳) اَلْحِسَابُ۔ محاسبہ کرنا (۴) اَلْقَهْرُ
وَالْغَلَبَةُ وَالْاِسْتِعْلَاءُ۔ یہ تینوں الفاظ عربی زبان میں غلبہ
کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان تینوں
میں بہت تھوڑا تھوڑا فرق ہے (۵) اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْكُ وَ
الْحُكْمُ۔ بادشاہت اور حکومت (۶) اَلسِّیْرَةُ۔ طبیعت۔
(۷) اَلتَّدْبِیْرُ۔ تدبیر کرنا (۸) اِسْمٌ لِجَمِیْعِ مَا یُعْبَدُ
بِهِ اللّٰهُ۔ دین نام ہے اُن تمام طریقوں کا جن کے ذریعہ
خدا تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے مثلاً مسلمانوں میں نماز پڑھنا۔
یا حج بیت اللہ کے لئے جانا اللہ تعالیٰ کی عبادت سمجھا جاتا ہے
یہ طریقِ عبادت عربی زبان کے لحاظ سے دین کہلائے گا اسی طرح
ہندوؤں کے طریقِ عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائے گی۔
عیسائیوں کے طریقِ عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائے گی
یہودیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کے طریقِ عبادت کی جو بھی شکل ہو
وہ دین کہلائے گی۔ گویا عبادتِ الٰہی خواہ کسی طریق سے کی جائے
اُس کا نام دین ہوتا ہے (۹) اَلْمِلَّةُ۔ طریقہ (۱۰) اَلْوَرَعُ
بزرگانہ اعمال جن سے روحانیت کو ترقی حاصل ہوتی ہے (۱۱)
اَلْحَالُ۔ حال (۱۲) اَلْقَضَاءُ۔ فیصلہ (۱۳) اَلْعَادَةُ۔
عادت (۱۴) اَلشَّانُ۔ اس کے معنے بھی حالت کے ہی ہوتے
ہیں مگر اچھی حالت کے۔ قرآن کریم میں بھی شان کا لفظ استعمال
ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ
شَاْنٍ (الرحمٰن ع ۲) کہ ہر روز اللہ تعالیٰ ایک نئی شان میں
ہوتا ہے۔

حُنَفَآءَ

حُنَفَآءَ: حَنِیْفٌ کی جمع ہے جو حَنَفَ سے صفت مشبہ
ہے اور حَنَفَ الشَّیْءُ حُنُوْفًا کے معنے ہوتے ہیں مَالَ
کوئی چیز اپنی جگہ سے جھک گئی۔ اور حَنِیْفٌ کے معنے ہیں

اَلصَّحِیْحُ الْمَیْلِ اِلَی الْاِسْلَامِ الثَّابِتُ عَلَیْہِ خدا تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی طرف سچا ذوق اور اُس پر ثابت قدمی۔ گویا اس کے صرف اتنے معنے نہیں کہ انسان کے اندر نیکی کی طرف میلان پایا جاتے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُسے نیکی پر ثبات حاصل ہو اور اُس کے اندر استقلال کا مادہ پایا جاتا ہو۔ محاورہ میں کُلُّ مَنْ کَانَ عَلٰی دِیْنِ اِبْرَاھِیْمَ کے معنوں میں حنیف کا لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی ہر وہ شخص جو دینِ ابراہیم پر ہو محاورہ میں اُسے حنیف کہا جاتا ہے۔ اور جماسی کا قول ہے کہ اَلْحَنِیْفُ اَلْمَائِلُ مِنْ دِیْنٍ اِلٰی دِیْنٍ یعنی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف جو شخص مائل ہو اُسے حنیف کہتے ہیں وَاَصْلُہٗ مِنَ الْحَنَفِ فِی الرِّجْلِ اور اصل میں وہ کجی جو کسی بیماری یا چوٹ کے نتیجہ میں بعض دفعہ انسانی پاؤں میں واقعہ ہو جاتی ہے اُس پر یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر پھر اسی بنا پر جو شخص اپنے جدّی دین کو بدلنے کی طرف مائل ہو جائے اُسے بھی حنیف کہہ دیا جاتا ہے وَفِی الْکُلِّیَّاتِ فِیْ کُلِّ مَوْضِعٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَلْحَنِیْفُ مَعَ الْمُسْلِمِ فَھُوَ الْحَاجُّ نَحْوَ وَلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا۔ کلیاتِ ابوالبقاء میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی حنیف کا لفظ مسلم کے لفظ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے وہاں اس کے معنے حاجی کے ہوتے ہیں جیسے کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا کے یہ معنے ہیں کہ کَانَ حَاجًّا مُّسْلِمًا وہ حج کرنے والا مسلم تھا۔ وَفِیْ کُلِّ مَوْضِعٍ ذُکِرَ وَحْدَہٗ فَھُوَ الْمُسْلِمُ نَحْوَ حَنِیْفًا لِّلّٰہِ اور ہر موقع پر جہاں اکیلا یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے وہاں اس کے معنے مسلم کے ہوتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے حَنِیْفًا لِّلّٰہِ یعنی مُسْلِمًا لِّلّٰہِ۔ پھر لکھا ہے وَالْحَنِیْفُ اَیْضًا: اَلْمُسْتَقِیْمُ یعنی حنیف کے ایک معنے سیدھے راستہ پر چلنے والے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)

حنیف کے معنے ابوالبقاء کے نزدیک

کلیات نے جو یہ معنے کئے ہیں کہ جہاں حنیف کا لفظ مسلم کے ساتھ استعمال ہو وہاں اس کے معنے حاجی کے ہوتے ہیں یہ محض زبردستی ہے۔ جہاں تک میں نے آیاتِ قرآنیہ پر غور کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ قرآنی محاورہ کے مطابق حنیف اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو سارے نبیوں کو ماننے والا ہو اور شرک کا کسی رنگ میں بھی ارتکاب کرنے والا نہ ہو۔ قرآن کریم کے الفاظ پر غور کرنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِن دو معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی اُس شخص کو بھی حنیف کہا گیا ہے جو سب انبیاء پر ایمان رکھتا ہو اور اُس شخص کو بھی حنیف کہا گیا ہے جو شرک سے کامل طور پر مجتنب ہو۔ گویا حُنَفَاءَ وہ ہیں جو سارے نبیوں کو ماننے والے اور کسی سچائی کا انکار کرنیوالے نہ ہوں اور مشرک نہ ہوں۔ اِن میں سے ایک معنے مثبت کے لحاظ سے ہیں اور ایک معنے منفی کے لحاظ سے۔ سارے نبیوں کو ماننا مثبت پہلو ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانا یہ منفی پہلو ہے۔ غرض میرے نزدیک قرآن کریم میں جہاں کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں حنیف کا لفظ حاجی کے معنوں میں نہیں بلکہ تمام انبیاء پر ایمان رکھنے والے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مسلم کا لفظ اعمالِ صحیحہ کو بجا لانے والے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ درحقیقت قرآن کریم پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں اسلام کا لفظ دو معنوں کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ اسلام بمعنے ایمان ظاہر بھی اور اسلام بمعنے اعمالِ صحیحہ بھی۔ پس قرآن کریم میں جہاں حنیف اور مسلم کے الفاظ اکٹھے استعمال ہوئے ہیں وہاں میرے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ عقیدہ میں بھی راسخ اور عمل میں بھی کامل۔ گویا ساری صداقتوں کو ماننے والا اور پھر تمام نیک باتوں پر عمل کرنے والا۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ۔ اور اُن کو کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا سوائے اِس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ۔ دین کو اُسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ دین کے ایک معنے جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے اطاعت کے ہوتے ہیں اور یہاں علاوہ دوسرے معنوں کے جن کی تفصیل آگے بیان کی جائیگی ایک یہ معنے بھی چسپاں ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اطاعت کو

اللہ تعالےٰ کے لئے ہی خالص کردیں یعنی اُن کے پیر۔ اُن کے پنڈت۔ اُن کے پادری۔ اُن کے کاہن۔ اُن کے راہب اور اُن کے بڑے بڑے عالم اُن سے اپنی غلامی کرا رہے تھے اور اس طــرح دنیا میں انسانیت کی انتہائی تذلیل ہو رہی تھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آکر یہ نہیں کہا کہ انہیں اپنی غلامی کی طرف بلایا ہو یا یہ کہا ہو کہ اپنے پنڈتوں اور پادریوں اور مولویوں کو چھوڑ کر تم میرے غلام بن جاؤ بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صرف اتنا کہا کہ تم اِن غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر خالص اللہ تعالےٰ کے غلام بن جاؤ۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر اُن کو غصہ آتا یا اُن کی طبائع میں اشتعال پیدا ہو جاتا۔ اُنہی کی بہبودی کے لئے محبت اور پیار کے ساتھ اُنکے سامنے ایک بات پیش کی گئی تھی مگر بجائے اِس کے کہ وہ اُس پر غور کرتے اور اپنے اندر نیک تغیّر پیدا کرتے اُنہیں غصہ آگیا اور وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی تدابیر سے کام لینے لگ گئے۔ دنیا میں جب کوئی شخص کسی کے فائدہ کی بات کہتا ہے تو دوسرا ممنونِ احسان ہوتا ہے کہ میں غلطی میں مبتلا تھا مگر فلاں نے مجھے آگاہ کر کے ہلاکت سے بچا لیا مگر اِن نادانوں کی یہ حالت ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب آکر کہا کہ آؤ میں تمہیں اُس غلامی سے نجات دُوں جس کا تم مدتوں سے شکار ہو چکے ہو وہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ جو تم نے بنائے ہوئے ہیں اُن سے تمہارے جسموں اور رُوحوں کو آزاد کراؤں۔ تم اپنے پیروں کو سجدہ کرتے ہو، تم اُن کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہو، تم اُن کو اپنی حاجات کا پورا کرنے والا سمجھتے ہو اور اس طرح نہ صرف انسانیت کے شرف اور اُس کی عظمت کو بٹہ لگاتے ہو بلکہ اُس خدا کی بھی توہین کرتے ہو جو تمہارا خالق اور مالک ہے۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے اس لئے مبعوث فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس غلامی سے نجات دُوں اور تمہیں خالص اللہ تعالیٰ کا غلام بنا دُوں تو بجائے اس کے کہ وہ اس نصیحت سے فائدہ اُٹھاتے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ڈنڈے لے کر کھڑے ہو گئے کہ تم ہمارے دین کو خراب کرتے ہو۔

وَمَا اُمِرُوْٓا کے معنے بعض نے یہ کئے ہیں کہ ان لوگوں کی کتب میں ہی حکم دیا گیا تھا مگر اس جگہ یہ معنے چسپاں نہیں ہوتے اِن الفاظ سے اِس جگہ یہ مراد ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی اُس میں سوائے اس کے کیا حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور خالص اُسی کی اطاعت کرو اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی غلامی کو ترک کر دو۔ کیا یہ حکم ایسا تھا کہ وہ بُرا مناتے یا ایسا تھا کہ وہ اُس پر خوش ہوتے اور دوڑتے ہوئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو جاتے؟ اِس حکم کے ذریعہ عیسائیوں کو اپنے پادریوں سے آزادی حاصل ہو رہی تھی یہودیوں کو اپنے رہبانوں سے آزادی حاصل ہو رہی تھی اور مشرکین کو اپنے کاہنوں سے آزادی حاصل ہو رہی تھی مگر بجائے اِس کے کہ وہ خوش ہوتے اُلٹا ناراض ہو گئے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو کچلنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

نبوت کی ضرورت

درحقیقت اِس آیت میں اللہ تعالےٰ نے نبوت کی ضرورت بتائی ہے کہ جب تمہارے عقلی اور ذہنی قویٰ میں اس درجہ انحطاط رُونما ہو چکا ہے کہ تم یہ بھی سمجھ نہیں سکتے کہ تمہارا اپنا فائدہ کس بات میں ہے تو اگر ایسی گری ہوئی حالت میں بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے تمہاری اصلاح کے لئے کوئی نبی نہیں آئے گا تو کب آئے گا؟ نبی آنے کا وہی وقت ہوتا ہے جب قومی تنزّل اِس قدر بڑھ چکا ہوتا ہے کہ لوگوں کو بُرے بھلے کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم ع۵) کی کیفیت دنیا میں پورے طور پر رُونما ہو جاتی ہے اور رُوحانی اور اخلاقی قوتیں بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ مگر باوجود اِس قدر تنزّل اور ادبار کے وہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہمیں کسی مصلح کی ضرورت نہیں۔ پس فرماتا ہے جب تمہاری حالت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر تمہارے فائدہ کی بھی کوئی بات کہتے ہیں تو تم اُن سے لڑنے لگ جاتے ہو۔ تو یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک نبی کے آنے کی اشد ضرورت ہے اگر اب بھی نبی نہ آتا تو تم لوگ بالکل تباہ ہو جاتے۔ پس وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے ایک معنے یہ ہیں

کہ اُنہیں سوائے اِس کے کیا حکم دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے دین کو خالص کرو یعنی اس سے پہلے یہ اقوام رہبان اور کہّان اور اساقف کی غلامی کر رہی تھیں، امراء کی فرمانبرداری میں جانیں گنوا رہی تھیں۔ اسلام نے آکر انہیں نجات دی مگر بجائے شکر گزار ہونے کے اَور دُور چلے گئے اور اپنے محسن سے لڑنا شروع کر دیا۔

اب میں تفصیل کے ساتھ اُن معنوں کے لحاظ سے جن کو اُوپر بیان کیا گیا ہے اِس آیت کا الگ الگ مفہوم بیان کرتا ہوں۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا مطلب مختلف معانی کے مطابق جو لُغت میں بتائے گئے ہیں یہ ہوا کہ اُنہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ

اوّل اطاعت اللہ تعالیٰ کی کریں (کیونکہ دِین کے ایک معنے اطاعت کے بھی ہیں) دوسروں کی اطاعت کا اِس میں کوئی شائبہ نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی اطاعت جائز نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

(الف) خدا تعالیٰ کی اطاعت بندوں کی خاطر نہ کریں بلکہ خدا تعالیٰ کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کر دیں یعنی وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت خدا ہی کی خاطر کریں بندوں کی خاطر نہ کریں۔ دُنیا میں بہت لوگ ایسے ہیں جن کی اطاعتِ الٰہی محض لوگوں کے ڈر سے ہوتی ہے سو وہ احکامِ الٰہی پر اس لئے عمل نہیں کرتے کہ خدا یُوں فرماتا ہے بلکہ اس لئے اُن پر عمل کرتے ہیں کہ اُن کی قوم یا رسم و رواج اس کا مطالبہ کرتا ہے مثلاً عیسائی گرجے جاتا ہے اِس لئے نہیں کہ خدا نے حکم دیا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر وہ گرجے میں نہ جائے تو اُس کی قوم بُرا مناتی ہے یا اگر یہودی اپنی عبادتگاہ میں جاتا ہے یا ہندو مندر میں جاتا ہے یا مسلمان مسجد میں جاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُس کا عبادت گاہ میں جانا یا مندر میں جانا یا مسجد میں جانا اس لئے نہیں ہوتا کہ خدا کا حکم ہے عبادت کرو بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اُس کی قوم اُس سے یہ امید رکھتی ہے۔ اِسی طرح بہت سے احکام پر انسان رواجاً عمل کرتا ہے یا اپنی نفسانی خواہش کے مطابق عمل کرتا ہے مثلاً خدا نے کہا ہے کمزور پر رحم کرو اور اپنے ساتھ تعاون کرنے والے کو نیک بدلہ دو۔ یہ دونوں حکم ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں اور ان دونوں حکموں کے ماتحت بچوں سے نیک سلوک

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے پہلے معنے خدا تعالیٰ کی اطاعت خدا تعالیٰ کی خاطر کرنا

اور بیویوں سے حُسنِ معاملت یا دوستوں کے ساتھ نیک معاملہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو اس لئے اپنی دوست کے ساتھ نیک معاملہ کرتے ہیں یا بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔ یا عورتوں سے حسنِ معاملہ کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے یُوں فرمایا ہے اکثر لوگ یا تو طبعی جذبات کے ماتحت ایسا کرتے ہیں یا دوسرے لوگوں کی نیک رائے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح غریبوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے یا یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے یہ ہر مذہب میں ہے مگر کتنے عیسائی یا یہودی یا ہندو یا آج کل کے مسلمان ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اکثر ایسے ہی ہیں جو لوگوں میں نیک نامی حاصل کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں جبتک انسان اس مرض میں مبتلا ہوتا اور جتنا جتنا حصہ اس مرض میں مبتلا رہتا ہے اُس وقت تک اور اُسی حد تک اُس کا دین ناقص ہوتا ہے کیونکہ اُس کا دل روزمرہ کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی طرف جھکا رہتا ہے اور وہ حقیقی محبت جو انابت الی اللہ سے پیدا ہوتی ہے اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ اور پھر وہ سمجھے نہ سمجھے، مانے نہ مانے مشرک بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کا حصہ لوگوں کو دیتا ہے۔ اِسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے مُنہ میں بھی ایک لُقمہ اِيْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا ڈالتا ہے تو وہ لقمہ ڈالنا خدا تعالیٰ کی کتاب میں اُس کے لئے صدقہ کے طور پر لکھا جاتا ہے۔ بیوی الگ خوش ہو گئی، اُس کی محبت کا جذبہ الگ پورا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کے رجسٹر میں اُس کا نام نیک اعمال بجا لانے والوں میں الگ لکھا گیا۔ یہی اصل تمام دوسرے کاموں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ اسلام دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا حکم دیتا ہے خدا ہی کا ہو جانے کی تعلیم دیتا ہے لیکن اکثر لوگ دنیوی کام کرنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں پھر یہ حکم کس طرح پورا ہو سکتا تھا؟ اُسی طریق سے جس کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُوپر کے حکم میں اشارہ فرمایا ہے یعنی اپنے دنیوی کاموں کو بھی خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق اور اُس کی خوشنودی کے لئے کرے۔ اِس طرح اُس کا ہر کام عبادت

بن جائے گا اور جبکہ وہ ظاہر میں دنیا کا کام کرتا ہُوا نظر آئے گا اس کا ہر کام عبادت ہو جائے گا۔ یہی نکتہ تصوّف کی جان ہے اور تصوّف کی بنیاد کلّی طور پر اسی نکتہ پر کھڑی ہے اس پر عمل کرکے انسان روحانیت کی اعلیٰ منازل کو آسانی سے طے کر سکتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ خدا تعالیٰ کے قرب میں ترقی کر سکتا ہے۔

(ب اور) دوسرا مفہوم اِن معنوں کے رُو سے اس کا یہ ہے کہ بندوں کی اطاعت خدا تعالیٰ کے لئے کریں۔ پہلا مفہوم تو یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت بندوں کی خاطر نہ کریں اور دوسرا مفہوم یہ بنے گا کہ بندوں کی اطاعت خدا تعالیٰ کے لئے کریں پہلے معنوں کے لحاظ سے اِس آیت کا مفہوم یہ تھا کہ مُخْلِصِيْنَ لِلّٰهِ اِطَاعَةَ اللّٰهِ۔ اور دوسرے پہلو کے لحاظ سے اِس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ مُخْلِصِيْنَ لِلّٰهِ اِطَاعَةَ الْعِبَادِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کی اطاعت ہر صورت میں نا جائز نہیں کی بلکہ بعض دفعہ خود حکم دیا ہے کہ اُن کی اطاعت کرو جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء ع) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور اُولی الامر کی اطاعت کرو پس معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا رسول اور اولی الامر کی اطاعت بھی ضروری قرار دی گئی ہے لیکن شرط یہ رکھی ہے کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ جب تم بندوں کی اطاعت کرو تو خدا کی وجہ سے کرو یعنی مومنوں کے لئے ضروری ہے کہ اُسی حد تک اور اُسی شخص یا اُسی قوم کی اطاعت کریں جس حد تک اور جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے جب لوگوں نے ٹیکس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا قیصر کی چیز قیصر کو دو اور خدا تعالیٰ کی چیز خدا تعالیٰ کو دو۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ خدا تعالیٰ کی خالص اطاعت کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے کسی کی اطاعت جائز نہیں بلکہ جس حد تک اور جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اُس حد تک اور اُس شخص کی اطاعت کرنا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایسا کیا جائے تو خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت کہلاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت کو خالص کرنے کے معنے یہ ہیں کہ انسان جب خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے تو بندوں کی خاطر نہ کرے اور جب بندوں کی اطاعت کرے تو خدا تعالیٰ کی خاطر کرے۔

بندوں کی اطاعت خدا تعالیٰ کی خاطر کرنا[1]

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ انگریزوں کے مطیع تھے حالانکہ آپ جس حد تک بھی انگریزی حکومت کی اطاعت کرتے تھے اسلام کی اور خدا تعالیٰ کی تعلیم کے ماتحت کرتے تھے اس لئے انگریز کی اطاعت میں آپ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حاکم وقت کی اطاعت کا حکم دیا ہے یا اُس کے ملک سے نکل جانے کا۔ اس لئے اگر آپ ایسا نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکلنے والے قرار پاتے۔ مگر جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ انگریز کی اطاعت جائز نہیں پھر انگریزوں کے ملک میں رہتے ہیں اور اُن کے قانون کی پابندی کرتے ہیں اُن کا ایک ایک منٹ گناہ میں گذر رہا ہے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ انگریز کی اطاعت جائز نہیں پھر انگریز کی اطاعت کرتے ہیں حالانکہ اگر اُن کا عقیدہ صحیح ہے تو اُنہیں انگریزوں کی حکومت سے فوراً باہر نکل جانا چاہیئے تھا۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے دوسرے معنے کہ غلبہ اور استعلاء ملنے کے بعد اس کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیں۔[2]

(۲) دوسرے معنے دِین کے جو اس جگہ لگتے ہیں قہر اور غلبہ اور استعلاء کے ہیں اِن معنوں کے رُو سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مخاطبین رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صرف اتنا مطالبہ کیا گیا تھا کہ جب غلبہ اور استعلاء تم کو ملے تو اس غلبہ اور استعلاء کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے وقف کر دیا کرو کیونکہ غلبہ اور استعلاء اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران ع) یعنی جب غلبہ اور استعلاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خرچ کرنا چاہیئے نہ کہ اپنے نفس کی بڑائی اور تکبّر اور ظلم اور دوسروں کو اپنی غلامی میں لانے کے لئے۔ اِسی حکم کے

نہ سمجھنے اور نہ ملنے کی وجہ سے تمام سیاسی نظام تباہ ہوتے ہیں۔ لوگ غلبہ کے وقت خدا تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور غلبہ دینے کی غرض کو بھول کر بندوں کو بھی بھول جاتے ہیں اور اُن پر ظلم کرنے لگ جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی قوم دنیا پر غالب ہوئی اُس نے خدا تعالیٰ کو بھلا دیا اور اُس کے بندوں کے حقوق کو بھی جنہیں ادا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اُسے غلبہ دیا تھا بھلا دیا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ بادشاہت کے بعد بھی کبھی اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھا اور کسی کو بادشاہ نہیں کہنے دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا بندہ اپنے آپ کو غلبہ سے پہلے سمجھتے تھے اسی طرح غلبہ کے ملنے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہی سمجھتے رہے۔ وہی نمازیں رہیں، وہی روزے رہے، وہی ذکر الٰہی رہا بلکہ اگر کوئی فرق پڑا تو یہی کہ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ جب دنیوی جنگوں اور لڑائیوں میں کمی آئے تو خدا تعالیٰ کی عبادت میں اور زیادہ بڑھ جاؤ۔ اسی طرح غلبہ ملنے سے پہلے جس طرح آپ اپنے آپ کو بندوں کا خادم سمجھتے رہے اسی طرح غلبہ ملنے کے بعد بھی آپ اپنے آپ کو خادم سمجھتے رہے اور جوانی کی عمر میں مکہ میں جب آپ کے پاس کچھ نہ تھا تب بھی غربیوں، یتیموں اور مسکینوں کی مدد اپنے ہاتھ سے کرتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بدولت عطا فرمادی یعنی شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ نے اپنا سارا مال آپ کے سپرد کر دیا تو آپ نے یہ نہیں کیا کہ اُس مال کو اپنی ذات پر استعمال کرلیں۔ آپ نے یہ نہیں سمجھا کہ میری بیوی نے یہ مال مجھے دیا ہے تو اب میں یہ مال اُس کے آرام اور آسائش کے لئے خرچ کروں بلکہ اس مال کو غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ جب آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکومت عطا فرمائی اور عرب اور اُس کی تمام اقوام کو آپ کے تابع کر دیا اور عرب کا تمام ٹیکس اور جزیہ آپکے ہاتھوں میں آنے لگا تب بھی آپ نے اُس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اُٹھایا اور وفات کے وقت جبکہ لوگ اپنے اہل وعیال کی نسبت لوگوں کو ہدایتیں دیتے ہیں آپ نے آخری وصیت اپنی قوم کو یہی فرمائی کہ میں تمہیں عورتوں اور کمزوروں سے نیک سلوک کے بارہ میں آخری نصیحت کرتا ہوں اور وفات کے وقت سخت کرب اور تکلیف کی حالت میں آپ بار بار فرماتے تھے کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔ یہ سخت الفاظ اتنے یہود و نصاریٰ کی نسبت نہیں تھے جتنا ان میں اس طرف اشارہ تھا کہ اگر میری قوم نے بھی میری قبر کو عبادت گاہ بنایا تو صرف خدا تعالیٰ کی لعنت اُن پر نہیں پڑے گی بلکہ میری لعنت بھی اُس کے ساتھ شامل ہوگی۔

غرض غلبہ کے وقت بھی آپ نے نہ خدا تعالیٰ کے حق کو تلف کیا اور نہ بندوں کے حقوق کو تلف ہونے دیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

آپ کے صحابہؓ نے بھی اس تعلیم پر اعلیٰ سے اعلیٰ عمل کر کے دکھایا۔ خلفاء اربعہ حقوق العباد کے ادا کرنے کی ایک بےنظیر مثال گذرے ہیں۔ ایک طرف خدا تعالیٰ کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑے رکھا اور دوسری طرف بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کئے ایسے کہ اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ وہ بادشاہ نہ تھے پریذیڈنٹ تھے مگر پہلا سوال تو یہ ہے کہ اُنہیں پریذیڈنٹ بننے پر مجبور کس نے کیا؟ آخر یہ عہدہ اُن کو اسلام نے ہی دیا اور اس عہدہ کی حیثیت کو انہوں نے اسلامی احکام کے ماتحت ہی قائم رکھا مگر یہ بات بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ خواہ اُنہیں پریذیڈنٹ ہی قرار دیا جائے مگر اُن کا انتخاب ساری عمر کے لئے ہوتا تھا نہ کہ تین یا چار سال کے لئے۔ جیسا کہ ڈیما کریسی کے پریذیڈنٹوں کا آج کل انتخاب ہوتا ہے یقیناً اگر انکو صرف صدر جمہوریت کا ہی عہدہ دیا جائے تو بھی یہ بات علم النفس کے ماتحت اور سیاسی اصول کے ماتحت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تین چار سال کے لئے چُنے جانیوالے صدر اور ساری عمر کے لئے چُنے جانے والے صدر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ تین چار سال کے لئے چُنے جانے والے صدر کے سامنے وہ دن ہوتے ہیں جب وہ اس عہدہ سے الگ کر دیا جائے گا اور پھر ایک معمولی حیثیت کا انسان بن جائے گا لیکن

ساری عمر کے لئے چُنا جانے والا صدر جانتا ہے کہ اب اس مقام سے اُترنے کا کوئی امکان نہیں اور اُس کے اہلِ ملک بھی جانتے ہیں کہ اس حیثیت کے سوا اور کسی حیثیت میں اب وہ اُن کے سامنے نہیں آئے گا۔ پس جس شان و شوکت کا وہ مستحق سمجھا جاتا ہے اُس شان و شوکت کا مستحق تین سالہ یا چار سالہ صدر نہیں سمجھا جا سکتا مگر اس ڈیماکریسی اور جمہوریت کے زمانہ میں سہ سالہ اور چار سالہ میعاد کے لئے چُنے جانے والے صدروں کی زندگیوں کو دیکھ لو ملک کا کتنا روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے۔ صدر جمہوریت امریکہ پر ہر سال جو روپیہ خرچ ہوتا ہے انگلستان کے بادشاہ پر بھی اتنا خرچ نہیں ہوتا۔ مگر اس کے مقابل میں خلفاء اربعہ کس طرح پبلک کے روپیہ کی حفاظت کرتے تھے وہ ایک ایسا تاریخی امر ہے کہ اپنے اور بیگانے اُس سے واقف ہیں صرف نہایت ہی قلیل رقوم انہیں گذارے کے لئے ملتی تھیں اور خود اپنی جائیدادوں کو بھی وہ بنی نوع انسان کے لئے خرچ کرتے رہتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُن خلفاء میں سے ہیں جن پر اپنوں اور بیگانوں نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں جب اُن کی عمر کے آخری حصہ میں کچھ لوگوں نے بغاوت کی اور اُن کے خلاف کئی قسم کے اعتراضات کئے تو اُن میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انہوں نے بہت سے روپے فلاں فلاں اشخاص کو دئے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ اسلام کے خزانہ پر سب ہی مسلمانوں کا حق ہے اگر میں قومی خزانہ سے ان لوگوں کو دیتا تو بھی کوئی اعتراض کی بات نہ تھی مگر تم قومی رجسٹروں کو دیکھ لو میں نے اُن کو قومی خزانہ سے روپیہ نہیں دیا بلکہ اپنی ذاتی جائیداد میں سے دیا ہے گویا اُن کی ذاتی جائیداد قومی خزانہ کے لئے ایک منبعِ آمد تھی۔ پس ان لوگوں نے اپنے غلبہ اور استعلاء کو محض خدا تعالیٰ کے لئے خرچ کیا نہ کہ اپنی شان بڑھانے کے لئے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو قوموں کو دوام بخشتی ہے اگر مسلمان اس تعلیم پر عمل کرتے تو کبھی زوال کا مُنہ نہ دیکھتے۔

(۳) تیسرے معنے دِین کے جو یہاں لگتے ہیں ملک و حکم کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہم نے یہی حکم دیا تھا کہ حکم اللہ تعالیٰ کے لئے رہے۔ جو وہ کہتا ہے اُسے جاری کیا جائے جس سے وہ روکتا ہے اُس سے رُکا جائے اپنی نفسانی خواہشات اور ارادوں کو شریعت میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اسلام جس وقت نازل ہوا ہے اس موٹی صداقت کا بڑی طرح سے انکار کیا جا رہا تھا۔ ہر شخص جو اس بات کو مانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی کلام اُس کی اور اُس کی قوم کی ہدایت کے لئے آیا ہے اُسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ایسے کلام کو کلّی طور پر انسانی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس وقت نازل ہوا ہے ہر قوم نے اپنی شریعت کی چادر کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور خدا تعالیٰ کے دین کا ایک تولہ اُن کے خیالات کے منوں میں باقی رہ گیا تھا آجتک جو بُرا حال ان شریعتوں کا ہو رہا ہے وہ عبرت کے لئے کافی ہے۔ مسیحؑ جن کی ساری عمر کی کمائی صرف اتنا فقرہ ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے اس تعلیم کی مسیحیوں نے کتنی مٹی پلید کی ہے۔ اگر مسیحی حکومتوں کے دشمنوں نے ڈائنامیٹ کے بم اُن کے علاقوں پر پھینکے ہیں تو انہوں نے صبر نہیں کیا جب تک اٹومک بم ایجاد نہیں کر لیا۔ پھر یہ سب امور شریعت کے مطابق بتائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں انگلستان کے گرجوں کے سب سے بڑے پادری نے اپنے ایک ماتحت پادری کے مُنہ پر یہ کہہ کر تھپڑ مارا ہے کہ اٹومک بم بھی خدائی نشانوں میں سے ایک نشان ہے کیونکہ ایک ماتحت پادری نے یہ کہا تھا کہ میری فطرت اس بم کے استعمال سے حاصل کی ہوئی فتح پر گرجے میں خوشی منانے پر تیار نہیں مسیحؑ نے کہا تھا میں موسیٰ کی شریعت کو پورا کرنے آیا ہوں۔ مگر مسیحیت نے موسوی شریعت کو سرتاپا لعنت بنا کر چھوڑا۔ یہی حال دوسری کتابوں کا ہے کہ اُن کے اندر بھی اس قدر تحریف اور تبدیلی کر دی گئی ہے اور اس قدر انسانی خیالات اُن میں ملا دئے گئے ہیں کہ اُن کی شکل مسخ ہو گئی ہے۔ آج ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر موسیٰ عیسیٰ۔ کرشن اور زرتشت دنیا میں آئیں تو وہ قرآن کریم کی طرف دوڑیں گے کہ یہ ہماری ہی تعلیم ہے جسے زیادہ جلا دیا گیا ہے

مُخلِصِینَ لَہُ الدِّینَ کے تیسرے معنے

اور جو تعلیمات اُن کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ اُن کے پاس سے مُنہ موڑ کر گذر جائیں گے کہ یہ گندی تعلیمیں معلوم نہیں کس نے دنیا میں پھیلا دیں۔

اسلام زیرِ تفسیر آیت کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے پُرزور احتجاج کرتا ہے کہ شریعتوں کے بارہ میں انسانی دست اندازی کے سلسلہ کو بند کیا جائے وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور خدا تعالےٰ کے کلام میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان بھی بعد کے زمانہ میں بگڑے اور بہت بگڑے مگر انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی مدد اور اُس کے منشاء کے ماتحت آج بھی محفوظ ہے۔ بے شک فقہ میں مسلمانوں نے بھی خوب کتر بیونت کی مگر خدا کا کلام چونکہ محفوظ ہے اِس لئے اِس کتر بیونت سے مستقل نقصان اسلام کو نہ پہنچا ہے اور نہ پہنچ سکتا ہے۔

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْن کے پانچویں معنے

(۴) چوتھے معنے دِیْن کے جو یہاں لگ سکتے ہیں سیرۃ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اُنہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اپنی سیرۃ کو اُس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ یعنی اپنی سیرت کے بنانے میں کسی اور کو شریک نہ کرو بلکہ اپنے اخلاق کلّی طور پر اللہ تعالےٰ کی صفات کے مطابق بناؤ۔ گو یاوہ حدیث جو رواۃ کے لحاظ سے ایسی مضبوط نہیں سمجھی جاتی جیسی دوسری حدیثیں ہیں یعنی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، اِس آیت کے رُو سے بالکل درست ثابت ہوتی ہے اور مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے معنے یہ بنتے ہیں کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ السِّيْرَةَ۔ اپنی سیرت خالص اللہ تعالےٰ کے لئے کردو یعنی جب تک الٰہی صفات کے مطابق دنیا اپنے اخلاق کو نہ بنائے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ فرماتا ہے اپنی سیرت کو ایسا بناؤ کہ سوائے اللہ تعالےٰ کی صفات کے اور کسی کا عکس اُس پر نہ پڑے۔ جس طرح خدا تعالےٰ ربّ ہے تم بھی رب ہو۔ جس طرح وہ رحمان ہے تم بھی رحمان ہو۔ جس طرح وہ رحیم ہے تم بھی رحیم ہو۔ جس طرح وہ مالک یوم الدین ہے تم بھی اندھے قاضی نہ ہو

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْن کے چوتھے معنے

بلکہ مالک یوم الدین ہو۔ اصلاح اور درستی اصل غرض تمہارے سامنے رہے۔ خدا تعالےٰ کی طرح رازق ہو۔ غفّار ہو۔ ستّار ہو۔ نیک باتوں اور قوموں اور مُردوں کے لئے مُحیی ہو اور بُری باتوں اور بُرے افراد کے لئے مُمیت ہو۔ اسی طرح حفیظ ہو باسط ہو۔ قیوم ہو وغیرہ وغیرہ۔

(۵) پانچویں معنے دِیْن کے جو یہاں چسپاں ہوتے ہیں تدبیر کے ہیں۔ ہر فرد دنیا میں کچھ نہ کچھ جدوجہد کرتا ہے اور ہر فرد سے میری مراد ہر معقل فرد ہے ورنہ دنیا میں ایسے احمق بھی ہوتے ہیں جو سونے اور کھانے پینے میں ہی اپنی عمریں گذار دیتے ہیں وہ درحقیقت انسان نہیں حیوان ہیں۔ اُن کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہ وہ درحقیقت انسانیت کے دائرہ میں ہی شمار نہیں کئے جا سکتے ہر شریف انسان کچھ جدوجہد کرتا ہے اور ہر زندہ دل انسان کسی نہ کسی فن کی رغبت رکھتا ہے کسی کو سائنس سے دلچسپی ہوتی ہے، کوئی حساب میں شغف رکھتا ہے، کوئی سیاست کی طرف مائل ہوتا ہے، کوئی تجارت میں انہماک رکھتا ہے کوئی زراعت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان سب امور کا حصول کئی وجوہ سے ہوتا ہے۔ بہرحال دنیا میں جو یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ کوئی سائنس کی طرف توجہ کر رہا ہے کوئی حساب کی طرف توجہ کر رہا ہے، کوئی تجارت کی طرف مائل ہے کوئی زراعت سے دلچسپی رکھتا ہے، کوئی سیاسیات میں اپنی عمر بسر کر رہا ہے۔ اس پر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگوں کی تدابیر یا اپنے نفس کے فائدہ کے لئے ہوتی ہیں یا اپنی قوم کے غلبہ اور نفوذ کے لئے۔ یعنی دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو محض اپنے نفس کے فائدہ کے لئے ان امور کی طرف توجہ کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے سائنس میں ترقی کر لی تو کئی قسم کی ایجادیں کریں گے۔ کارخانے جاری کریں گے اور مالی لحاظ سے بہت کچھ نفع اُٹھائیں گے۔ یا حساب میں شغف رکھتے ہیں تو اس لئے کہ ترقی کر کے ہم انجنیئر بن جائیں گے اور دنیا میں اعزاز حاصل کریں گے۔ یا تجارت کرتے ہیں تو اس لئے کہ اپنے لئے اور اپنے خاندان کے افراد کیلئے ہمارے پاس بہت سا روپیہ اکٹھا ہو جائیگا

یازراعت کریں گے تو اس فن میں بھی اُن کے مدنظر محض اپنا فائدہ ہوگا۔ اسی طرح سیاسیات میں اُن کی دلچسپی کسی قومی مفاد کیلئے نہیں ہوتی بلکہ ذاتی اعزاز کا حصول اس تمام جدوجہد کا بنیادی نقطہ ہوتاہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ذاتیات سے بہت بالا ہوتے ہیں۔ اُن کے مدِنظر اپنے ذاتی مفاد اُس قدر نہیں ہوتے جس قدر قومی مفاد اُن کے مدنظر ہوتے ہیں۔ اُن میں سے اگر ایک سائنس دان سائنس میں شغف رکھتا ہے تو اُس کا مقصد یہ ہوتاہے کہ میری قوم کو اس ذریعہ سے طاقت حاصل ہوجائے اگر کوئی حساب کی طرف توجہ کرتاہے تو اُس کی غرض بھی اِس علم سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا ہوتاہے۔ اگر کوئی تجارت کرتاہے تب بھی اُس کا مقصد یہ ہوتاہے کہ تجارت سے میری قوم مضبوط ہوجائے۔ غرض یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اگر زراعت کی طرف توجہ کرتے ہیں تو اُن کے مدنظر محض یہ غرض نہیں ہوتی کہ ہم ہل چلائیں گے کھیتی باڑی کریں گے اور نفع کمائیں گے بلکہ وہ فنِ زراعت اس لئے سیکھتے ہیں تاکہ اُن کی قوم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اسی طرح جب اُن میں سے بعض لوگ سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ اُن کو ذاتی طور پر غلبہ اور نفوذ حاصل ہوجائے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ سیاسیات میں حصہ لینے کے نتیجہ میں اُن کی قوم کو غلبہ حاصل ہو۔ غرض دنیا میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن کی تمام جدّوجہد کا مرکزی نقطہ یہ ہوتاہے کہ اُن کو ذاتی طور پر کوئی فائدہ حاصل ہوجائے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محض قومی مفاد کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اُن کا علوم کی طرف توجہ کرنا۔ مختلف فنون میں مہارت حاصل کرنا اور مختلف قسم کے شعبوں میں کام کرنا اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں یا عزت کے متلاشی ہوتے ہیں یا مال و دولت کے شائق ہوتے ہیں بلکہ وہ اِس لئے اپنی عمریں اِن کاموں میں صرف کردیتے ہیں کہ اُن کی قوم سربلند ہو اور اُسے دنیا میں عزت کا مقام حاصل ہو۔ اللہ تعالےٰ اِس آیت میں یہ فرماتاہے کہ

جب بھی دنیا میں ایسا طریق عمل جاری ہوگا غلط قسم کی رقابت پیدا ہوگی اور تباہی اور بربادی اس کے نتیجہ میں آئے گی۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنی سب جدوجہد اللہ تعالےٰ کے لئے کردے۔ اگر اُسے حساب کا شوق ہے اور وہ اس علم میں ترقی کرنا چاہتا ہے تو بے شک کرے اور خوب کرے۔ اگر اُسے سائنس کا شوق ہے اور وہ نئی نئی ایجادات کرنا چاہتاہے تو بے شک سائنس کی طرف توجہ کرے اور دنیا میں نئی سے نئی ایجادیں کرے۔ اگر اُسے تجارت کا شوق ہے تو بے شک وہ تجارت کرے اور خوب مال و دولت کمائے۔ اگر اُسے زراعت کا شوق ہے اور وہ اس علم پر غور کرتے ہوئے نئے نئے امور دریافت کرنا چاہتاہے تو بے شک ایسا کرے کیونکہ خود خدا نے یہ فطرت پیدا کی ہے اور اللہ تعالےٰ چاہتاہے کہ انسان کام کرے بے کار نہ بیٹھے مگر چاہیئے کہ اُس کی سب تدبیریں اللہ تعالےٰ کے لئے ہوں یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ تعالےٰ کے لئے جدوجہد کرے گا وہ اللہ تعالےٰ کے بعض بندوں کو اپنی جدّوجہد کے ثمرات سے محروم نہیں کریگا۔ جب وہ خدا کے لئے ایسا کرے گا تو اُس کی یہ غرض نہیں ہوگی کہ انگلستان کو کچل دے، نہ انگلستان کی یہ غرض ہوگی کہ فرانس کو کچل دے، نہ امریکہ کی یہ غرض ہوگی کہ رُوس کو کچل دے۔ جب ہر شخص اللہ تعالےٰ کے لئے کوشش کریگا تو اُسکی کوششیں تمام بنی نوع انسان کے لئے مفید ہوں گی اور غلط قسم کی رقابت اور عداوت دنیا میں پیدا نہیں ہوگی۔ تمام تباہی اسی وجہ سے واقعہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے ذاتی یا قومی مفاد کے لئے دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا شروع کردیتاہے اور اس امر کو کلی طور پر نظرانداز کردیتاہے کہ اُسے اپنی جدوجہد کے ثمرات میں تمام بنی نوع انسان کو شریک کرنا چاہیئے۔ یہ تو علمی زمانہ ہے مگر پھر بھی دیکھا جاتاہے کہ باپ دادا کی دولت سے ذرا بھی حصہ مل جائے تو لوگ غافل ہوجاتے ہیں۔ ہر قسم کے کاموں کو چھوڑ کر اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں اب ہمیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے باپ دادا سے ہمیں بہت بڑی جائیداد مل گئی ہے اور اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں اور سورہیں یہ نفعًا

خیال نہیں کیا جاتا کہ انسان کی پیدائش اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ کھائے پئے اور سورہے بلکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ ع۴) سے ظاہر ہے اور جب انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو اسے غور کرنا چاہیئے کہ اُس کے لئے نکما پن کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ نکما بیٹھا ہُوا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کوئی کام نہیں کرتا اس لئے اگر انسان بھی کوئی کام نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نکما نہیں بیٹھا بلکہ وہ اپنی تمام صفات سے کام لے رہا ہے کہیں بنی نوع انسان کو رزق دے رہا ہے، کہیں اُن کو زندہ کر رہا ہے، کہیں ان کو مار رہا ہے، کہیں اُن کی مغفرت کے سامان کر رہا ہے، کہیں اُن پر رحمت نازل کر رہا ہے، کہیں اُن پر عذاب بھیج رہا ہے، کہیں اُن کو ترقی دے رہا ہے، کہیں تنزّل کے سامان کر رہا ہے۔ غرض دن رات وہ کام میں لگا ہُوا ہے اور یہی وہ انسانوں سے چاہتا ہے کہ جس طرح میں کام میں لگا ہُوا ہوں اسی طرح تم بھی کام میں لگ جاؤ اور کبھی غفلت اور سُستی کو اپنے قریب بھی نہ آنے دو۔ مگر افسوس کہ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انکو ذرا بھی سہولت کے سامان میسر آجائیں تو وہ سُست ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہمیں کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ملک میں تو عام محاورہ ہے کہ جب کسی آسودہ حال سے پوچھا جائے کہ سُنا ؤ کیا حال ہے تو وہ کہتا ہے اللہ کا بڑا فضل ہے کھانے پینے کو بہت کچھ ہے اب کام کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ کام تو سامانوں کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کے پاس کم سامان ہوں وہ کم کام کرتا ہے اور جس کے پاس زیادہ سامان ہوں وہ زیادہ کام کرتا ہے۔ پس اگر انہیں زیادہ سامان میسر آگئے تھے تو اُن کا فرض تھا کہ وہ کام بھی دوسروں سے زیادہ کرتے نہ یہ کہ سامانوں کے میسر آجانے کی وجہ سے اپنی کمرِ ہمّت کو بالکل توڑ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ اب ہمیں کام کی ضرورت نہیں۔ کھانے پینے کا سامان خدا تعالےٰ نے بہت کچھ دے دیا ہے اب ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ کھائیں پئیں، عیش و آرام میں اپنا وقت گذاریں اور سو جائیں۔ یہ ایک لعنت ہے جو ہندوستانیوں کے سروں پر مسلّط ہے اور جس نے اُن کو ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے کر دیا ہے۔ وہ جدوجہد اور عمل صرف اس بات کا نام سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچ جائے یا اپنے خاندان کو فائدہ پہنچ جائے بنی نوع انسان کو اپنی جدوجہد کے ثمرات میں شریک کرنے کیلئے وہ تیار نہیں ہوتے۔ اِس کے مقابل میں یورپ کے لوگوں میں جہاں اور کئی قسم کے نقائص ہیں وہاں اِس نقص کو انہوں نے قومی طور پر بالکل دور کر دیا ہے۔ وہاں امیر اور غریب سب کام کرتے ہیں اور باوجود بڑے بڑے اُمراء کی موجودگی کے اُن میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو کام نہ کر رہا ہو اِلّا ماشاء اللہ۔ ہر قوم میں کچھ نہ کچھ گندے اور خراب افراد بھی ہوتے ہیں اُن کو مستثنیٰ کرتے ہوتے اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نظر آتی ہے جو کروڑوں اور اربوں روپیہ کے مالک ہیں مگر خود بھی کام کرتے ہیں اُن کی بیویاں بھی کام کرتی ہیں اُن کے بچے بھی کام کرتے ہیں۔ اسی طرح اُن کے خاندان کے دوسرے افراد بھی کام کرتے ہیں اور وہ کبھی کام کرنا اپنے لئے ننگ اور عار کا موجب نہیں سمجھتے مگر اس کے باوجود وہ یا تو اپنے نفس کے لئے سب کچھ کرتے ہیں یا اپنے ملک کی ترقی اور اُس کی خوشحالی کے لئے کام کرتے ہیں یا قومی برتری کا احساس اُن کے مدِ نظر ہوتا ہے یا نفسانی خواہشات اُن کے پیشِ نظر ہوتی ہیں اسی لئے باوجود کام کرنے کے خرابیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں بھی باپ دادا کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے بعض لوگ کام نہیں کرتے تھے مگر خرابیاں کم ہوتی تھیں کیونکہ قومی برتری کا احساس اُن کے دلوں میں نہیں ہوتا تھا وہ صرف اپنے ذاتی مفاد کو مدِ نظر رکھا کرتے تھے مگر اب چونکہ ذاتی مفاد کی بجائے قومی مفاد کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے اور دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے تمام اعمال اس لئے بجا لاتا ہے کہ اُس کی قوم کو دوسروں پر تفوق حاصل ہو، اُس کی قوم کو دوسروں پر غیر معمولی اقتدار اور غلبہ میسر ہو، اُس کی قوم کو بہت بڑی طاقت حاصل ہو۔ اس لئے کام کرنے کے باوجود اس زمانہ میں

خرابیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تم تدبیریں کرو اور ضرور کرو کیونکہ ہم نے تم کو پیدا ہی اسی لئے کیا ہے کہ تم کام کرو مگر دیکھو ہماری نصیحت یہ ہے کہ مُخلِصِینَ لَهُ الدِّینَ۔ اپنی ساری تدبیریں خدا تعالےٰ کے لئے وقف کر دو۔ ذاتی آرام یا قومی مفاد تمہارے مدنظر نہ ہو بلکہ تمہاری تمام جدوجہد محض اللہ تعالےٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہو۔ غور کرو یہ کیسا سنہری اصل ہے اور کس طرح اس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں دنیا میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ اس ذریعہ سے ایک طرف اللہ تعالےٰ نے نکما پن دُور فرما دیا اور بنی نوع انسان سے کہہ دیا کہ دیکھو ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ تم بیکار رہو اور دنیا میں آکر کوئی کام نہ کرو اور دوسری طرف کہہ دیا کہ ہم یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ تم جھوٹی رقابتیں پیدا کرنی شروع کر دو۔ تم کام کرو اور خوب کرو مگر جھوٹی رقابتیں پیدا نہ کرو۔ دوسرے ملکوں یا قوموں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ ہر کام اللہ تعالےٰ کی خاطر کرو۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے لئے ہر کام کرے گا ذاتی یا قومی برتری کا احساس اس کے دل میں نہیں ہو گا وہ دوسروں کے حقوق کو کچلنے کے لئے بھی کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے زمانہ میں (یعنی جب جب اور جہاں اسلامی اصول پر حکومت کی گئی) کبھی غیر قوموں کو کچلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے اور یہ ایک بہت بڑا عرصہ ہے۔ اِس قدر لمبے عہدِ حکومت کے باوجود کسی مسلمان حکومت نے ہمسایہ ممالک کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ اُن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس بہت کچھ طاقت تھی اور وہ اگر چاہتے تو آسانی سے اُن کی اقتصادی حالتوں کو تباہ کر سکتے تھے۔ مگر باوجود طاقتور ہونے کے، باوجود بادشاہ ہونے کے، باوجود آٹھ سو سال تک برسرِ اقتدار رہنے کے، باوجود ہمسایہ ممالک کی کمزوری کے کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہُوا کہ اُن کو کچلنے کے لئے مسلمانوں نے کوئی اقدام کیا ہو۔ ایبے سینیا کی واضح مثال ہے تیرہ سو سال وہ مسلمانوں کی ہمسائیگی میں رہا مگر اُس کی آزادی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اِس کے ڈاکہ نہ ڈالا جائے۔ مگر عیسائیوں نے کسی بات کی پروا نہ کی۔ نہ انصاف کو مدنظر رکھا نہ دیانت اور رواداری کی پروا کی اور اپنے غلبہ کے گھمنڈ میں کمزور ممالک پر حملہ کر کے اُن کو اپنا ماتحت بنا لیا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ مسلمان قرآنی احکام کے مطابق اپنی تمام کوششیں محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل میں لاتے تھے۔ چونکہ ایبے سینیا۔ یوگنڈا اور ایسٹ افریقہ وغیرہ نے مسلمانوں کو چھیڑا نہیں اس لئے باوجود زبردست مسلمان حکومتوں کے پہلو میں بیٹھے ہونے کے کسی نے اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا اور یہ حالت برابر چلتی چلی گئی یہاں تک کہ انتہائی مُردہ اور گری ہوئی حالت میں بھی اُن کے اندر یہ خوبی قائم رہی اور انہوں نے غیر اقوام کو کچلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ لیکن یوروپین قوموں نے جہاں بھی سر نکالا انہوں نے غیر ممالک کو کچل ڈالا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ یوروپین قوموں کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے بچوں کو کھیلتے ہوئے جب کوئی چیز مل جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں "لبھی چیز خدا دی نہ دھیلے دی نہ پا دی"۔ یہ بھی غیر ملکوں پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں یہ تو ایک گری پڑی چیز تھی جو ہمیں مل گئی۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ اخلاق کے بھی دعویدار بنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے یہ قبضہ امن قائم کرنے اور لوگوں کو تہذیب و شائستگی کے اصول سکھانے کے لئے کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یہ دعویٰ بالکل غلط ہے اگر واقعہ میں تمہارے اندر اخلاق پائے جاتے تھے اور تمہارے مدنظر ذاتی یا قومی مفاد نہیں تھا تو تمہارا فرض یہ تھا کہ تم بجائے غیر ممالک پر قبضہ کرنے اور اُس کی دولت سے فائدہ اُٹھانے کے اُن ممالک میں جاتے، لوگوں کی تربیت کرتے، انکو علم سکھاتے اور پھر واپس آجاتے۔ گویا جو کچھ کرتے اللہ تعالےٰ کی رضاء کے لئے کرتے نفسانیت کا اُس میں کوئی شائبہ نہ ہوتا۔ مگر تم نے تو جو کچھ کیا اپنے نفس کے لئے کیا اور یہ وہ چیز ہے جو دنیا میں امن قائم نہیں کرتی بلکہ بدامنی اور ظلم کے دَور دَورہ کا موجب بن جاتی ہے اگر انگریز افریقہ میں جاتے اور بجائے اُس پر قبضہ کرنے کے لوگوں سے کہتے کہ ہم تمہاری ترقی کے لئے آئے ہیں۔ پھر انکو تعلیم دلاتے، اُن کو کاشت کے اصول سکھاتے۔ مدرسے اور دوا خانے

قائم کرتے، مال و دولت کو ترقی دینے کے ذرائع بتاتے، تہذیب اور شائستگی کے اُصول سکھاتے اور جب وہ یہ سب کچھ سیکھ جاتے تو کہتے لو اب ہم واپس جاتے ہیں۔ یہ ملک تمہارا ہے ہم تو محض تمہاری خدمت کرنے کے لئے آئے تھے تو یقیناً وہ اپنے دعوے میں سچے سمجھے جا سکتے تھے اور کہا جا سکتا تھا کہ اُن کی کوششیں اپنے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تھیں۔ مگر یہ کیا طریق ہے کہ افریقن لوگوں کو الگ بٹھا دیا۔ اُن کی زمینوں اور جائیدادوں پر قبضہ کر لیا اور پھر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ہم نے تو یہ قبضہ افریقن لوگوں کی ترقی اور اُن کے فائدہ کے لئے کیا ہے۔ اور یہی ہمدردی کا جذبہ اِس کا محرک ہُوا ہے۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے چھٹے معنے

(۶) چھٹے معنے اس کے عبادت کے ہیں۔ یہ معنے بھی یہاں لگتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ شرک نہ کرو سب قسم کی عبادات اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے ساتویں معنے

(۷) ساتویں مناسب معنے اس کے وَرَع کے ہیں یعنی نیکی اور نیک اعمال۔ ان معنوں کے رُو سے اِس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ریاء اور سُمْعَۃ کو بالکل ترک کر دو اور سب زہد و تعبّد صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے ہو۔ یہ نہ ہو کہ تمہارے جُبّے اور دستاریں اور کمالات اور پارساری کا عہدہ لوگوں میں عزت حاصل کرنے اور اُن سے اطاعت کرانے کے لئے ہو بلکہ تمہارا زہد و تعبّد محض خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے ہو۔ یہ بات ایسی ہے جس کی طرف غیر قومیں تو الگ رہیں خود مسلمانوں کو بھی بہت کم توجہ ہے۔ اور وہ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے اور زکوٰۃ دینے اور حج کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رضاء مدِ نظر نہیں رکھتے بلکہ اُن کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگوں میں کاری عزت قائم ہو جائے اور وہ ہمیں بڑا نمازی یا بڑا عابد کہنے لگ جائیں۔ اِسی طرح حج بھی زُہد کی علامت ہوتی ہے مگر ہمارے ملک میں عام طور پر حج کو بھی اپنی شہرت کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص جو حج کر آئے وہ اپنے نام کے ساتھ حاجی لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میں جب حج کے لئے گیا تو ایک اور مسلمان نوجوان بھی میرے ساتھ جہاز میں سوار تھا۔ وہ اپنے آپ کو دین کے متعلق اس قدر غیرت مند سمجھتا تھا کہ جب اُسے معلوم ہُوا کہ میں احمدی ہوں تو وہ بار بار اپنا ہاتھ مار کر کہتا کہ وہ جہاز بھی نہیں ڈوبتا جس میں ایسا شخص سفر کر رہا ہے۔ حالانکہ اسی جہاز میں خود بھی سفر کر رہا تھا اور اگر جہاز ڈوبتا تو اُس کا ڈوبنا بھی یقینی تھا۔ بہرحال ایک طرف تو دین کے متعلق وہ اس قدر غیرت کا اظہار کرتا تھا اور دوسری طرف اُس کی حالت یہ تھی کہ میں نے اُسے مکّہ سے منیٰ جاتے ہوئے جو عین حج کا وقت ہوتا ہے اُردو کے نہایت گندے عشقیہ اشعار پڑھتے سُنا۔ ایک دن باوجود اُس کے بُغض اور کینہ کے میں اُس کے قریب چلا ہی گیا اور میں نے اُسے کہا کہ آپ کو دین کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے مگر یہ کیا بات ہے کہ منیٰ میں مَیں نے آپ کو بہت گندے اشعار پڑھتے سُنا ہے۔ کہنے لگا بات اصل میں یہ ہے کہ ہم سورت کے تاجر ہیں اور ہمارے علاقہ میں حاجیوں کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہماری ہول سیل دوکان ہے اور ارد گرد کے علاقوں سے اکثر لوگ ہماری دوکان سے ہی مال خرید کر لے جاتے ہیں مگر گذشتہ سال ہمارے پاس کی دوکان والا حج کر آیا اور اُس نے اپنے نام کے ساتھ حاجی کا ٹائٹل لگا کر دوکان پر بورڈ آویزاں کر دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ہمارے گاہک بھی اُدھر جانے شروع ہو گئے کیونکہ لوگوں نے خیال کیا کہ حاجی صاحب سے سودا خریدنا چاہیئے اس میں ثواب بھی ہوگا۔ یہ دیکھ کر میرے باپ نے مجھے کہا کہ کمبخت تو بھی حج کر آ ورنہ اگر یہی حالت رہی تو ہماری دوکان بالکل تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ میں اسی لئے حج کے لئے آیا ہوں اب یہاں سے جانے کے بعد میں بھی اپنے نام کے ساتھ حاجی لکھ کر بورڈ لٹکا دوں گا اور ہمیں تجارت میں جو گھاٹا ہوا ہے وہ جاتا رہے گا۔ اُس وقت اُسے تو میں نے کچھ نہ کہا مگر دل میں مجھے اُس کی حالت پر سخت افسوس آیا کہ کجا اُس کی غیرت کی یہ کیفیت تھی کہ وہ بار بار اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہتا تھا کہ وہ جہاز بھی غرق نہیں ہو جاتا جس میں ایسا شخص سوار ہے اور کجا یہ حال ہے کہ وہ حج کرنے کے لئے آیا ہے مگر اُسے ذرا بھی یہ احساس نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر حج کرے بلکہ

اُس کے مدِنظر محض اتنی بات ہے کہ میں حاجی کہلاؤں۔ لوگ میری عزت کریں اور وہ دوکان پر کثرت کے ساتھ سودا خریدنے کے لئے آنے لگیں۔ تو دنیا میں بہت لوگ ایسے ہیں جو زُہد و تعبّد میں لوگوں کی خوشنودی اور اُن کی واہ واہ حاصل کرنے کے لئے حصّہ لیتے ہیں اللہ تعالےٰ کی محبت سے اُن کا دل بالکل خالی ہوتا ہے مثلاً عیسائیوں میں پادریوں کی بہت بڑی عزت سمجھی جاتی ہے اور جتنے یوروپین اُمراء خاندان ہیں وہ ایک ایک لڑکا ضرور چرچ کی خدمت میں لگا دیتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ ان کے دل میں عیسائیت کی کوئی عظمت ہے یا وہ سمجھتے ہیں کہ پادری بن کر ہمارا لڑکا اللہ تعالےٰ کی رضاء حاصل کرے گا بلکہ صرف اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں اس کے بغیر ہمارے خاندانوں کا سیاسی لحاظ سے کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اُنہوں نے علماء کی عزت نہیں کی جس کی وجہ سے امراء کی توجہ علمِ دین کی طرف سے بالکل ہٹ گئی مگر یوروپین قومیں اپنے پادریوں کی بڑی عزت کرتی ہیں اس وجہ سے امراء کو ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ہمیں سیاسی رنگ میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ورنہ عوام میں ہمارے خلاف جوش پیدا ہو جائے گا اور وہ رسوخ جو ہمیں حاصل ہے جاتا رہے گا۔ پس چونکہ زُہد و تعبّد کے اعمال بسا اوقات لوگ اس لئے بجالاتے ہیں کہ اُن کو قوم میں عزت اور رسوخ حاصل ہو۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے مومنوں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تم ریاء اور سمعت کے خیالات کو اپنے دل کے کسی گوشہ میں بھی داخل نہ ہونے دو اور جس قدر نیک اعمال بجالاؤ ان کی تہ میں صرف یہی جذبہ کارفرما ہو کہ تمہیں اللہ تعالےٰ کی رضاء حاصل ہو جائے۔ مخلوق سے توجہ ہٹا کر صرف خالق پر ہی نظر رکھو اور اپنے اعمالِ صالحہ کو اللہ تعالےٰ کے لئے وقف کر دو کہ وہی اعمال اُس کی درگاہ میں مقبول ہوتے ہیں جو اس کی رضا کے لئے کئے جائیں۔ جن اعمال پر ریاء کا داغ لگ جاتا ہے وہ انسان کے مُنہ پر مارے جاتے ہیں اور ثواب کی بجائے اللہ تعالےٰ کے عذاب کا موجب بن جاتے ہیں۔

(۸) آٹھویں مناسب معنے جو یہاں لگ سکتے ہیں عادت کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اِس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ تم اللہ تعالےٰ کے ایسے فرمانبردار ہو کہ تمہاری عادات بھی اللہ تعالےٰ کے تابع ہو جائیں۔ بظاہر عادت کی عبادت بُری ہوتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص صرف عادت کی نماز پڑھتا ہے یعنی اُسے ماں باپ نے نماز پر لگا دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے نماز کی عادت ہو گئی یا اُس کے ماں باپ نے اُسے روزے رکھنے پر مجبور کیا تھا جس کی وجہ سے اُسے روزوں کی عادت ہو گئی یا کسی اَور نیک کام پر اُس کے ماں باپ نے اُسے مجبور کیا اور رفتہ رفتہ اُس نیک کام کی اُسے عادت ہو گئی تو یہ عادت بُری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ عادتیں دو قسم کی ہوتی ہیں وہ عادت کی عبادت بُری ہوتی ہے جس کی ابتداء بھی عادت سے ہو یعنی جب کسی نے کوئی کام بغیر سمجھے بُوجھے کیا ہو اور رفتہ رفتہ وہ کام اُس کی طبیعت میں داخل ہو گیا ہو تو یہ عادت اچھی نہیں سمجھی جا سکتی۔ مثلاً کسی شخص نے زید کو کوئی بات کہی اور اُس نے بغیر سوچے سمجھے اُس کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اُس بات کی اُسے عادت ہو گئی یا کسی اَور کے کہنے کی بجائے اُس نے خود ہی کسی کام کی آہستہ آہستہ عادت اختیار کر لی تو یہ عادت قطعاً کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے لئے اور اُس کی محبت اور اُس کے عشق سے عبادات اور نیک اعمال میں حصہ لینا شروع کرتا ہے اور عمل کرتے کرتے وہ اُس کا جُزوِ بدن ہو جاتے ہیں اور آپ ہی آپ بغیر کسی ارادہ کے وہ افعال اس سے ظاہر ہوتے لگتے ہیں ایسے شخص کی عادت کی عبادت رسمی عبادت نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اُس نے خلوص کے ساتھ، محبت کے ساتھ، اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا اور متواتر کرتا چلا گیا یہاں تک کہ عبادت اُس کا جزوِ بدن بن گئی۔ اب جو فعل اس عادت کے نتیجہ میں ظاہر ہوگا وہ یقیناً خوبی کہلائے گا کیونکہ اُس نے دیدہ و دانستہ اپنے نفس پر جبر کرکے خدا تعالےٰ کی رضاء کے حصول کے لئے ایک فعل تنی بار کیا کہ وہ اُس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا یہ جبری عادت نہیں ہوتی کہ اُسے بُرا قرار دیا جا سکے نہ بے دھیان کی عادت ہوتی ہے

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْن کے آٹھویں معنے

کہ اُسے لغو کہا جاسکے۔ یہ ایک نیک عادت ہوتی ہے جو جانتے بُوجھتے ہوئے محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے اختیار کی جاتی ہے اور چونکہ خدائی قانون یہ ہے کہ جب ایک شخص لذّت اور شوق سے متواتر کوئی فعل کرے تو وہ کام اُس سے آپ ہی آپ سرزد ہوتا جاتا ہے اس لئے ایسے شخص کی عادت کی عبادت رسمی عبادت نہیں کہلاتی بلکہ وہ اطاعت کا منتہیٰ کہلاتی ہے۔

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ انسان کو کئی قسم کی عادات خاص خاندانوں یا قوموں میں رہنے کی وجہ سے پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً چائے نوشوں میں چائے کی عادت ہوتی ہے، اچھے خوش خور لوگوں میں اچھا کھانا کھانے کی عادت ہوتی ہے خوش لباسوں میں رہنے کی وجہ سے انسان کو خوش لباسی کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایک معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو اس طرح اللہ تعالیٰ کا بناؤ کہ اگر تم کو کوئی عادت پڑے تو وہ اللہ کی ہو نہ کہ اپنے گردوپیش کے لوگوں کے اثر سے تم نے وہ عادت اختیار کی ہو۔ گویا اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ تمام لغو عادات سے مومن کو بچنا چاہیئے۔ یُوں تو عادتیں انسان کو ضرور پڑ جاتی ہیں کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں ہوتا جسے کچھ نہ کچھ عادت نہ ہو مگر کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے گردوپیش کے لوگوں سے صرف اتنا اثر لیتے ہیں کہ اُنہیں اچھا کھانا کھاتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اچھا کھانا کھانے لگ جاتے ہیں۔ اُنہیں اچھا لباس پہنتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اچھا لباس پہننے لگ جاتے ہیں۔ اُنہیں آرام کی زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں تو خود بھی آرام کی زندگی بسر کرنے لگ جاتے ہیں لیکن ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو لوگوں سے صرف نیکی اور تقویٰ اور عبادت کا اثر قبول کرتا ہے۔ اب جہاں تک دوسروں سے اثر قبول کرنے کا سوال ہے دونوں نے اثر قبول کیا ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے نفس کے آرام کیلئے گردوپیش کا اثر قبول کیا اور دوسرے نے خدا تعالیٰ کی رضاء کے لئے صرف وہ اثر قبول کیا جس کا نیکی اور تقویٰ کے ساتھ تعلق تھا۔ گویا وہ شخص جس نے اچھا کھانے یا اچھا پینے یا اچھا پہننے کا اثر قبول کیا تھا اُس نے اپنے دل کے آئینے کو غیروں کے سامنے کیا اور وہ شخص جس نے اپنے اندر نماز اور روزہ اور صدقہ وخیرات کی عادتیں پیدا کیں اُس نے اپنا آئینہ خدا کے سامنے کر دیا پس فرماتا ہے تمہیں دنیا میں رہ کر عادتیں تو ضرور پڑتی ہیں مگر تم ایسی کوشش کرو کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے اعمال کا تواتر ہو۔ بنی نوع انسان کے اعمال کا تواتر نہ ہو جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی نظریں نیچی رکھو اگر اتفاقیہ طور پر کسی غیر عورت پر تمہاری نگاہ پڑ جاتی ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر تم دوسری نگاہ اُس پر ڈالو گے تو گنہگار بن جاؤ گے۔ اس ممانعت میں بھی یہی حکمت ہے کہ اگر انسان دوسری بار نگاہ ڈالے گا تو اُس کا یہ نگاہ ڈالنا بالارادہ ہوگا۔ اور جب وہ ایک کام بالارادہ کرے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ کام آہستہ آہستہ عادت میں داخل ہونا شروع ہو جائے گا پس مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ تو بُرے افعال کا تکرار نہ کر بلکہ اُن اعمال کا تکرار کر جو تجھے خدا تعالیٰ تک پہنچانے والے ہوں یعنی جن کاموں کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے اُن کا تکرار کرو اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اُن کے گردوپیش کے اثرات کی وجہ سے عادت پیدا نہ کرو۔ گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو گردوپیش کے بُرے اثرات سے بالکل آزاد کر لو حتیٰ کہ تم کو دوسروں کے بد اثرات سے کوئی عادت نہ پڑے بلکہ صرف نیک اثرات کو قبول کرو۔

عادات بھی ایک بہت بڑی ظلمت ہوتی ہیں بعض دفعہ یہ انسان کو دوسرے کا خوشامدی بنا دیتی ہیں۔ بعض دفعہ ڈرپوک بنا دیتی ہیں۔ بعض دفعہ سُست بنا دیتی ہیں اور انسان بڑے بڑے کاموں میں حصہ لینے سے محروم ہو جاتا ہے۔ مثلاً حُقّہ کی عادت ہے، افیون کی عادت ہے یا چائے یا نسوار کی عادت ہے ایسے لوگوں کو اگر جہاد کے لئے جانا پڑے تو اُن کے قدم ڈگمگا جائیں گے کیونکہ جہاد میں یہ چیزیں میسر نہیں آسکتیں۔ لڑائی میں بسا اوقات انسان کو کئی کئی دن کا فاقہ کرنا پڑتا ہے۔

بسا اوقات جنگلوں میں راتیں گذارنی پڑتی ہیں، بسا اوقات نہایت معمولی اور ردّی غذا کھا کر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ شخص جسے شراب کی عادت ہو یا افیون کی عادت ہو یا حقہ اور نسوار کی عادت ہو کبھی دلیری سے آگے نہیں آ سکتا کیونکہ اُس کی عادات اِس قربانی میں دیوار بن کر حائل ہو جائیں گی اور وہ سمجھیگا کہ اگر میں اِس جنگ میں شامل ہُوا تو مجھے سخت تکلیف اُٹھانی پڑیگی۔

موجودہ جنگ میں سپاہیوں کی سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ ہمیں شراب نہیں ملتی، ہمیں سگرٹ نہیں ملتے اور یہ شکایت اس قدر بڑھ گئی کہ انگریز افسروں کے لئے اس کا ازالہ کرنا بالکل ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے موجودہ انتخابات میں مسٹر چرچل کی شکست کی وجہ بھی یہی ہوئی کہ فوجیوں کے ووٹ سب اُن کے خلاف تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ایسی گورنمنٹ ہرگز قائم رہنے کی مستحق نہیں جس نے لڑائی میں ہمارے لئے شراب مہیا نہیں کی، جس نے کثرت سے ہمیں سگرٹ نہیں پہنچائے اور اس طرح وہ ہماری تکلیف کا موجب ہوئی ہے۔ حالانکہ انگریز افسر بھی سچے تھے وہ لڑائی کا سامان جمع کرتے یا شرابیں اور سگرٹ تیار کر کرکے فوجیوں کو بھجواتے؟ پس اس آیت میں مومنوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ سوائے ذکر الٰہی اور نیکی کے کاموں کے جو خدا تعالےٰ کی رضاء کا موجب ہیں اور کسی چیز کی عادت نہ پڑنے دو تاکہ تم کو کبھی غیر کے آگے جھکنے یا قومی خدمات میں سُستی کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔

حُنَفَآءَ۔ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے جو معنے اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن میں چونکہ حَنِیْف کے وہ معانی بھی آجاتے ہیں جو حل لغات میں بیان کئے جا چکے ہیں اس لئے میں اِس جگہ حَنِیْف کے صرف اتنے معنے لیتا ہوں کہ "نیک میلانوں پر ثابت قدم رہنا"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اوپر کی تشریحات کے بعد صرف یہی ایک معنے باقی رہ جاتے ہیں جن کا الگ بیان کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہم تمہیں اوپر کا حکم اس مزید ہدایت کے ساتھ دیتے ہیں کہ تم اپنے آپ میں نیک باتوں پر استقلال پیدا کرو یعنی ہم چاہتے ہیں کہ ایک تو مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے جو معنے ہیں وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں اور دوسرے تم میں استقلال پیدا ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ نیکیوں پر چند دن تو بڑے جوش و خروش سے عمل کرو اور پھر تھک کر بیٹھ جاؤ۔ درحقیقت بڑی غلطی انسان کی یہ ہوتی ہے کہ وہ نیکیوں پر دوام اختیار نہیں کرتا صرف چند دن عمل کرتا اور پھر اُن کو چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کے حضور وہی نیکی مقبول ہو سکتی ہے جس پر دوام اختیار کیا جائے اور یہ دوام پیدا نہیں ہو سکتا جب تک انسان کے اندر استقلال کا مادہ نہ ہو۔ پس اللہ تعالےٰ نے یہ حکم دینے کے بعد کہ تمہاری اطاعت اور تمہارا غلبہ اور تمہارا حکم اور تمہاری سیرۃ اور تمہاری تدابیر اور تمہاری عبادات اور تمہاری نیکی اور تمہاری عادات سب کی سب اللہ تعالےٰ کے لئے ہونی چاہئیں۔ . . . . . حُنَفَآءَ کہکر یہ مزید حکم دے دیا کہ جب ایسے میلانات تمہارے اندر پیدا ہو جائیں تو پھر اُن پر ثابت قدم رہو ایسا نہ ہو کہ سُستی کرکے اس مقام پر سے تمہارا قدم لڑکھڑا جائے اور تمہاری نیکیاں سب ضائع چلی جائیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کے حضور وہی عبادت نفع رکھتی ہے جس میں دوام پایا جائے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کی ایک بیوی نے چھت سے ایک رسّہ لٹکا رکھا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کیسا رسّہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ یہ اس لئے ہے کہ جب عبادت کرتے کرتے اُونگھ آنے لگے تو اس سے سہارا لے لیا جائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے کھول دو۔ اللہ تعالےٰ کو وہی عبادت پسند ہے جس میں دوام پایا جائے اگرچہ وہ کتنی ہی قلیل ہو۔ وہ عبادت پسند نہیں جس کے نتیجہ میں انسان کی طبیعت میں ملال پیدا ہو جائے اور چند دن کے بعد وہ اُس کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائے۔

۲۱۱ حُنَفَآءَ کے معنے نیک میلانوں پر ثابت قدم رہنا

بعض لوگ غلطی سے اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دن کم اور کسی دن زیادہ عبادت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ہمیشہ ایک جیسی عبادت کرنی چاہیئے مگر یہ معنے بالبداہت باطل ہیں۔ کیونکہ انسان بعض دفعہ بیماری کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے

زیادہ عبادت نہیں کر سکتا اور بعض دفعہ تو اُس کو چھوڑنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ثابت ہے کہ بعض دفعہ آپ رات کو پورے آٹھ نفل نہیں پڑھ سکے پس اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تم نفلی عبادات کو کم و بیش نہ کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تم کوئی عبادت شروع کرو تو پھر اُسے کرتے چلے جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ چند دن نفل پڑھو اور پھر چھوڑ دو۔ یا بعض دفعہ تو ساری ساری رات تہجد پڑھتے رہو اور بعض دفعہ دو نفل بھی نہ پڑھو۔ یہ عدم استقلال کا مرض ہے جس سے ہر مومن کو کلی طور پر محفوظ ہونا چاہیئے اور اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ نیکی وہی ہے جس پر دوام اختیار کیا جائے۔

وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ :-

لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ کے بعد يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ کا ذکر کرنا صاف بتا رہا ہے کہ اس جگہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد محض عبادت نہیں۔ اگر محض عبادت اس جگہ مراد ہوتی تو اُس کے علیحدہ ذکر کرنے کے کوئی معنے ہی نہیں تھے لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ میں یہ مفہوم بڑی وضاحت سے آچکا تھا اور بتایا جا چکا تھا کہ مومنوں کا فرض ہے کہ وہ خالص اللہ تعالےٰ کی عبادت کریں اور اُسی کی پرستش کریں یعنی نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ میں اپنی عمر بسر کریں۔ پس جب وہاں عبادت کا وضاحتہً ذکر آچکا تھا تو اس کے بعد وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ کہنا کہ مومن وہ ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں صاف بتاتا ہے کہ اس جگہ اقامتِ صلوٰۃ عبادت کے علاوہ کوئی اور مفہوم رکھتی ہے اور وہ وہی مفہوم ہے جو میں نے اپنے خطبات اور تقاریر میں بارہا بتایا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد باجماعت نماز ادا کرنا ہے۔ یوں اقامتِ صلوٰۃ کے یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ عبادت کو کھڑا کرنا یعنی نماز کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ ادا کرنا مگر اقامت کے معنوں کو اگر ہم کلی طور پر دیکھیں تو پھر نماز کو کھڑا کرنے کے معنے یہ بن جائینگے کہ وہ دنیا میں قائم ہو جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اقامتِ صلوٰۃ کے ایک یہ معنے بھی لئے ہیں کہ مومن اپنی نماز کو بار بار کھڑا کرتے ہیں۔ نماز گرتی ہے تو وہ اُسے کھڑا کرتے ہیں پھر گرتی ہے تو وہ پھر کھڑا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں نماز میں خشوع و خضوع پیدا نہیں ہوتا یا اللہ تعالےٰ کی طرف کامل توجہ نہیں ہوتی تو وہ بار بار اپنی نمازوں کو سنوارنے اور اُن کو پورے طور پر درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس آیت میں یہ معنے مراد نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کے ایک یہ معنے بھی ہوتے ہیں اور ان معنوں پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بڑا زور دیا ہے کہ نماز گرتی ہے تو مومن اُس کو کھڑا کرتا ہے پھر گرتی ہے تو پھر کھڑا کرتا ہے۔ مگر چونکہ یہ مضمون وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ میں آچکا ہے اس لئے وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ کے یہاں کوئی زائد معنے ہوں گے جو میرے نزدیک دو ہیں۔

اوّل نماز کا کھڑا کرنا اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ دنیا میں نماز کا رواج قائم کر دیا جائے جیسے ہماری زبان میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے یہ رسم جاری کر دی ہے اسی طرح اللہ تعالےٰ مومنوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وہ لوگوں میں نماز قائم کریں یعنی صرف خود ہی نماز نہ پڑھیں بلکہ تمام لوگوں میں نماز کی خوبیاں بیان کریں۔ انہیں نماز پڑھنے کی تحریک کریں اگر انہیں نماز پڑھنی نہیں آتی تو انہیں نماز پڑھنا سکھائیں۔ اگر کوئی شخص نماز کا ترجمہ نہیں جانتا تو اُسے نماز کا ترجمہ پڑھائیں۔ غرض ہر شخص نماز کی ترویج اور اُس کو دنیا میں قائم کرنے میں مشغول ہو جائے۔ کوئی شخص نماز کی خوبیاں بیان کر رہا ہو، کوئی شخص نماز کا ترجمہ پڑھا رہا ہو، کوئی شخص نمازیں ادا کرنے کی لوگوں کو تحریک کر رہا ہو، کوئی شخص نماز پڑھنے والوں میں نماز کی مزید رغبت پیدا کر رہا ہو۔ اس طرح کوئی مومن ایسا نہ ہو جو يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ کے حکم پر عمل نہ کر رہا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارا صرف یہی کام نہیں کہ تم خود نمازیں پڑھو بلکہ تمہارا یہ بھی کام ہے کہ تم لوگوں کو نماز کی تحریک کرکے، اَن پڑھوں کو نماز کا ترجمہ سکھا کے، نماز پڑھنے والوں کو نماز کی مزید رغبت دلا کے دنیا میں پوری مضبوطی کے ساتھ نمازوں کا رواج قائم کر دو۔ یہ سب امور ایسے ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ سے مراد باجماعت نماز ادا کرنا اور نماز کا رواج دینا

دوسرے معنے جو اقامت صلوٰۃ کے یہاں چھپے ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمہارا صرف یہی فرض نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو بلکہ یہ بھی فرض ہے کہ تم جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں صرف عبادت کا حکم نہیں دیتے بلکہ باجماعت عبادت کا حکم دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام فردی مذہب نہیں بلکہ قومی مذہب ہے۔ باقی سارے مذاہب میں اگر افراد الگ الگ عبادت کرتے ہیں تو وہ بڑے زاہد بڑے عابد بڑے پرہیزگار اور بڑے عارف سمجھے جاتے ہیں۔ لوگ اُن کی نیکی اور تقدس کے قائل ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کا قرب اور اُس کا وصال حاصل ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص باجماعت نماز ادا نہیں کرتا تو خواہ وہ علیحدگی میں کتنی عبادتیں کرتا رہتا ہو وہ ہرگز نیک اور پارسا نہیں سمجھا جا سکتا اور اُسے ہرگز قوم میں عزت کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے جو اسلام اور غیر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ باقی سب مذاہب پر غور کر کے دیکھ لو وہ انفرادی عبادات کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں یہاں تک کہ بسا اوقات بڑی بڑی دُور سے پنڈت اور پادری اور راہب اور عوام الناس کے جوق در جوق یہ سُن کر کہ فلاں سادھو چالیس سال سے غار میں عبادت کر رہا ہے اُس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں، اُسے نذریں دیتے ہیں، اُس کے آگے سجدے کرتے ہیں، اُسے اپنا حاجت روا سمجھ کر اُس سے بڑی عاجزی سے التجائیں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سادھو سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ وہ ہے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چالیس سال سے پہاڑ کی ایک غار میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے ایسا شخص ہرگز خدا تعالیٰ کا مقرب نہیں۔ وہ تو بہت بڑا بے دین ہے جس نے اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جس نے یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے حکم کو پسِ پشت پھینک دیا ہے۔ جو شخص قوم سے کٹ گیا ہے۔ جس نے قوم کی بہتری اور اس کی فلاح و بہبود کی کبھی فکر نہیں کی، جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت سزا کا مستحق ہے کجا یہ کہ اُسے نیک اور خدا رسیدہ سمجھا جائے۔

پس وہ لوگ جن کو دوسری قومیں محض علیحدگی میں عبادت کرنے کی وجہ سے بزرگ قرار دیتی ہیں اسلام اُن کو مرتد اور مردود قرار دیتا ہے۔ دنیا اُن کو خدا رسیدہ سمجھتی ہے اور اسلام اُن کو اللہ تعالیٰ کے قرب سے راندہ ہُوا سمجھتا ہے۔ کیونکہ اسلام کہتا ہے یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ ہم نے تمہیں صرف اتنا حکم نہیں دیا کہ تم نمازیں پڑھو بلکہ ہمارا حکم یہ ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھو۔ اور اپنی ہی حالت کو درست نہ کرو بلکہ ساری قوم کو سنوار دو اور اُس کی روحانیت کو بلند کرو اور قوم سے دُور نہ بھاگو بلکہ اس کے ساتھ رہو اور ہوشیار چوکیدار کی طرح اُس کے اخلاق اور اُس کی روحانیت کا پہرہ دو۔

اقامت صلوٰۃ کے بعد ایتاء زکوٰۃ کا حکم دینے کی حکمت

اس آیت میں دوسرا حکم زکوٰۃ کا دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں جہاں بھی ایتاءِ زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے ہمیشہ اقامتِ صلوٰۃ کے بعد آتا ہے۔ اس میں ایک نہایت ہی لطیف اشارہ اس امر کی طرف پایا جاتا ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنی قوم کی شکستہ حالی سے واقف نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اُن کی کوئی خدمت بھی نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جو کسی پہاڑ کی کھوہ میں جا کر بیٹھ رہا ہے اور دن رات سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہتا ہے اُسے کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں یا غرباء ننگے پھر رہے ہیں یا مساکین پیسہ پیسہ کے لئے دربدر خاک چھان رہے ہیں یا روپیہ کی کمی کی وجہ سے وہ علم سے محروم ہو رہے ہیں۔ اُسے اِن میں سے کسی بات کا بھی علم نہیں ہو سکتا اور جب علم نہیں ہوگا تو وہ اپنی قوم کے لئے کوشش کیا کرے گا۔ غرباء کے لئے جدوجہد یا مساکین کی ترقی کے لئے کوشش اُسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان کو علم ہو کہ اُس کی قوم میں غرباء پائے جاتے ہیں، اُس کی جماعت میں مساکین موجود ہیں اور اُس کا فرض ہے کہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، پیاسوں کو پانی پلائے، ننگوں کو کپڑے دے اور بیماروں کا علاج کرے اور یہ علم اُسوقت تک

نہیں ہو سکتا جب تک انسان مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کا عادی نہ ہو۔ جب وہ مسجد میں آئے گا تو دیکھے گا کہ اُس کے پاس ہی ایک طرف تو ایسا شخص کھڑا ہے جس نے اعلیٰ درجہ کا لباس پہنا ہُوا ہے، قیمتی عطر لگایا ہُوا ہے، باصحت اور تنومند ہے اور دوسری طرف ایک ایسا شخص کھڑا ہے جس کے پھٹے پُرانے کپڑے ہیں، اُس کے لباس اور جسم کی بدبُو سے دماغ پھٹا جاتا ہے اور اُس کے چہرہ پر جُھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ یہ نقشہ دیکھے گا تو اُس کا دل تڑپ اُٹھے گا اور کہے گا میرا فرض ہے کہ میں قوم کے غرباء کے لئے اپنا روپیہ خرچ کروں اور اُن کی تکالیف کو دُور کروں۔ یا وہ مسجد میں جائے گا تو دیکھے گا کہ وہاں ایک نوجوان بیٹھا ہے، بیس پچیس سال اُس کی عمر ہے، اُٹھتی جوانی کا زمانہ ہے۔ مگر اُس کی حالت یہ ہے کہ کلّے پچکے ہوتے ہیں، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں، کپڑوں کا بُرا حال ہے اور ضعف اُس کے جسم سے ظاہر ہے۔ وہ یہ حالت دیکھ کر لازماً پوچھے گا کہ میاں! تمہارا کیا حال ہے، تم اتنے خستہ حال کیوں نظر آ رہے ہو؟ اس کے جواب میں یا تو وہ کہے گا کہ میں بیمار ہوں علاج کے لئے میرے پاس کوئی پیسہ نہیں اور یا کہے گا کہ بیمار تو نہیں مگر کھانے پینے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ اس پر دوسرا شخص اُسے کہہ سکتا ہے کہ تم جوان آدمی ہو کماتے کیوں نہیں؟ وہ کہے گا میں کیا کروں نجاری کا کام مجھے آتا ہے مگر نجاری کے آلات وغیرہ خریدنے کی مجھ میں استطاعت نہیں۔ یا معماری جانتا ہوں یا کپڑا بُننا جانتا ہوں یا لوہارے کا کام جانتا ہوں مگر سامانوں سے تہیدست ہونے کی وجہ سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اس پر اُسے فکر پیدا ہوگا کہ میرا فرض ہے میں اِس کی مدد کروں اور اِسی طرح قوم کے جو دوسرے غرباء ہیں اُن کی تکالیف دُور کرنے میں حصہ لُوں تاکہ یہ بھی باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ایتاءِ زکوٰۃ کی تحریک اقامتِ صلوٰۃ سے ہی ہوتی ہے اور اسلام نے پانچ وقت نماز باجماعت کی ادائیگی کا حکم دے کر ایک ایسا اعلیٰ درجے کا راستہ کھول دیا ہے کہ اگر اس حکم پر عمل کیا جائے تو قوم کے حالات سے نہایت آسانی کے ساتھ واقفیت ہو سکتی ہے۔ بھلا ایک انگریز لارڈ کو اپنی قوم کے حالات کی کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ وہ گھر میں رہتا ہے تو وردیاں پہنے ہوئے نوکر اُس کی خدمت کیلئے موجود ہوتے ہیں جو اُس کے دسترخوان سے اپنا پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر کر موٹے ہو رہے ہوتے ہیں۔ کلب میں جاتا ہے تو اُس کی سوسائٹی کے لوگ اُس کے دائیں بائیں ہوتے ہیں۔ اُسے کچھ علم نہیں ہو سکتا کہ غرباء پر کیا کچھ گذر رہی ہے۔ لیکن ایک مسلمان جو پانچ وقت مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتا ہے اور ہر روز پانچ دفعہ لوگوں کی شکلیں دیکھتا ہے اُسے بڑی آسانی سے پتہ لگتا رہتا ہے کہ اُس کی قوم کا کیا حال ہے اور اُسے قومی ترقی کے لئے کن امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کا مفہوم

وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کے یہ معنے ہیں کہ "یہ ہے قائم رہنے والی قوم کا دین"۔ یہاں مضاف حذف کر دیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ذٰلِكَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ یعنی دنیا میں جو اُمّت قائم رہنا چاہے اُسے ایسا ہی طریق اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس جگہ دین کے معنے طریق کے ہیں یا حال کے ہیں یا شان کے ہیں اور اس طرح اوپر کے بیان کردہ سب معنے اس میں آجاتے ہیں یعنی دنیا میں قائم رہنے والی اُمت کا یہی طریق اور یہی حال ہوتا ہے۔ اور چونکہ قَيِّمَةٌ کے معنے مُتَوَلِّيْ کے بھی ہیں اس لئے اِن معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ دنیا میں متولّی بنائے اُسے ایسا ہی طریق اختیار کرنا چاہیئے ورنہ وہ اپنے فرض کو پورا کرنے والی نہ ہوگی۔ بہرحال اس آیت کے دو معنے ہوئے ایک یہ کہ قائم رہنے والی قوم کے یہ آثار ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ متولّی بنائے اُسے ایسے ہی خصائل اپنے اندر پیدا کرنے چاہئیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس قوم میں یہ علامات پیدا ہو جائیں اللہ تعالیٰ اُسے دنیا کا متولّی بنا دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ نے دو امور کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ اقامتِ صلوٰۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مومن اللہ تعالیٰ سے صلح رکھتے

اور اس کے حقوق کو پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور
ایتاءِ زکوٰۃ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مومن بنی نوعِ انسان
سے حُسنِ سلوک کرتے۔ اُن کی خدمت میں پورے جوش سے
حصہ لیتے اور اُن کے حقوق کو پوری تندہی سے ادا کرتے ہیں۔
اب فرماتا ہے ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ جو اُمّت دنیا میں
قائم رہنا چاہے اُسے ایسا ہی طریق اختیار کرنا چاہیئے یعنی اگر
انسان اللہ تعالےٰ سے بھی صلح رکھیں اور بنی نوعِ انسان سے
بھی صلح رکھیں تو اُن پر کبھی تباہی نہیں آسکتی۔ بگاڑ ہمیشہ اُسی
وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ یا تو خدا تعالےٰ کو اپنے اوپر ناراض
کر لیتے ہیں اور اُس کی طرف سے عذاب اور تباہیاں آنے لگتی
ہیں یا پھر بنی نوعِ انسان کو اپنے خلاف بھڑکا لیتے ہیں اور
اس کے نتیجہ میں بغاوت۔ ڈاکے۔ قتل اور خونریزیاں شروع
ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں عذاب آخر کیوں آتا ہے۔ طاعون دنیا
میں کیوں آئی۔ زلازل کیوں آرہے ہیں؟ اسی لئے کہ لوگوں نے
خدا تعالےٰ سے اپنے تعلقات بگاڑ لئے۔ اس کے مقابل میں لوگ
آپس میں کیوں لڑتے ہیں؟ اسی لئے کہ کچھ لوگ دوسروں پر ظلم کرتے
اور اُن کے حقوق کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں
جب یہ بات لوگوں کی قوتِ برداشت سے بڑھ جاتی ہے تو وُہ
لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہی فساد کی دو وجوہ ہیں یا اللہ تعالےٰ
سے بگاڑ۔ یا بنی نوعِ انسان سے بگاڑ۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے
اگر کوئی قوم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ پر عمل کرلے، خدا تعالیٰ
سے بھی صلح رکھے اور اُس کے بندوں سے بھی۔ تو اُس پر کبھی تباہی
نہیں آسکتی۔ تباہی کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ لوگ خدا تعالےٰ
سے اپنے تعلقات بگاڑ لیتے ہیں اور اُن پر عذاب آنا شروع
ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح بندوں سے اپنے تعلقات بگاڑ لیتے
ہیں اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
دنیا کے لئے کیا پیغام لاتے تھے؟ یہی کہ خدا تعالےٰ سے بھی
صلح کرلو اور اُس کے بندوں سے بھی صلح کرلو تا کہ تم ہر قسم کے
زوال سے محفوظ رہو۔ اس میں بھلا کونسی چیز تھی جس کی بناء پر
لوگوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت شروع کر دی؟

یہ بات تو سراسر اُن کے فائدہ کے لئے کہی گئی تھی مگر انہوں نے
اُلٹا اپنے محسن کے خلاف جنگ شروع کر دی۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قوم کو اللہ تعالےٰ
دنیا میں متولی بنائے اُسے ایسا طریق اختیار کرنا چاہیئے ورنہ وہ اپنے فرائض
کی ادائیگی میں سخت کوتاہی سے کام لینے والی سمجھی جائیگی۔ ایک معنوں کے
لحاظ سے قوم کی ذاتی خوبی بیان کی گئی ہے اور دوسرے معنوں کے لحاظ
سے اُس کی نسبتی خوبی بیان کی گئی ہے۔ یہ معنے کہ صحیح راستہ پر
چلنے والی، دنیا میں قائم رہنے والی اور تباہی سے بچنے والی
قوم کی یہ علامات ہُوا کرتی ہیں اُس کی ذاتی خوبی پر دلالت کرتے
ہیں۔ اور یہ معنے کہ جس قوم کو اللہ تعالےٰ دنیا کا متولّی اور حاکم
بنائے اور اُسے اپنے اندر تمام بیان کردہ خوبیاں پیدا کرنی
چاہئیں ورنہ وہ حکومت کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا
کرنے والی نہیں سمجھی جاسکتی، اُس کے نسبتی کمالات کی طرف
اشارہ کرتے ہیں۔

افسوس کہ مسلمانوں نے اُن اخلاق کو جو یہاں بیان
ہوئے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تھوڑے
عرصہ بعد ہی چھوڑ دیا اور جوں جوں وہ ان اخلاق کو چھوڑتے
چلے گئے اللہ تعالےٰ بھی اُن کو چھوڑتا چلا گیا۔ اب احمدیت
کے لئے موقعہ ہے کہ وہ اِن اخلاق کو دوبارہ قائم کرے۔ مگر یہ
اخلاق کبھی مستقل طور پر قائم نہیں رہیں گے جبتک کہ قرآن کریم
لوگوں کے دماغوں میں بار بار اور زور سے داخل نہ کیا جائیگا
اور اُسے ساری قوم میں زندہ نہ کیا جائے گا۔

ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ پر ویری کا بودا اعتراض

ویری نے اس جگہ ایک عجیب اعتراض کیا ہے وُہ
ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کا ترجمہ کرتا ہے "یہ سچا دین ہے"
اور پھر اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محمد صاحبؐ
سمجھتے تھے اسلام۔ یہودیت اور مسیحیت ایک ہی مذہب ہے۔
یعنی انہوں نے اِن تینوں مذاہب کی ایک ہی تعلیم بتائی اور کہہ دیا
کہ یہودی۔ عیسائی اور مسلمان سب کا یہی مذہب ہے گویا دائمی
مذہب کے معنے اُنہوں نے یہ لئے کہ آدم سے لے کر آج تک دنیا
کا ایک ہی مذہب رہا ہے (مسلمانوں میں سے بھی بعض بیوقوف

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ

اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کفر پر قائم رہنے والے لوگ یقیناً جہنم کی آگ میں (داخل) ہوں گے

فِي نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَا ؕ أُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ

(اور وہ) اُس میں رہتے چلے جائیں گے ۔ وہی لوگ (ہاں وہی لوگ) بدترین

الْبَرِيَّةِ ۞ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

خلائق ہیں ۔ (اس کے مقابل پر) وہ لوگ جو (اہل کتاب اور مشرکوں میں سے) ایمان لے آئے اور انھوں نے

أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞

(ایمان کے) مناسب حال عمل بھی کئے ۔ وہ لوگ ہاں وہی لوگ بہترین خلائق ہیں ؎۵

یہی عقیدہ رکھتے ہیں) اور چونکہ یہ بات غلط ہے اس لئے اُنہوں نے اپنے جھوٹا نبی ہونے کا آپ ہی ثبوت مہیا کر دیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو پادری صاحب نے اس آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے (ترجمہ تو سیل کا ہے مگر چونکہ انہوں نے اس ترجمہ کو قبول کرکے اعتراض کیا ہے اس لئے یہ ترجمہ انہی کی طرف منسوب ہوگا) اس کا ترجمہ "سچا دین" نہیں بلکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "یہ قائم رہنے والی قوم کا دین ہے" یا "قائم رہنے والی قوم کی حالت ہے"، کیونکہ قَیِّمَۃ دین کی صفت نہیں ہے اور عربی زبان کے قواعد کے مطابق ایسا ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ دِین مذکر ہے اور قیّمہ مؤنث ہے اور مذکر کی صفت مؤنث نہیں بن سکتی۔ پس عربی زبان کے قواعد کے رُو سے قیّمہ کا موصوف محذوف سمجھنا ہوگا اور وہ سیاق و سباق عبارت سے اَلْمِلَّۃ یا ایسا ہی کوئی لفظ ہو سکتا ہے اور اسی عربی قاعدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس آیت کی یہ تشریح کی ہے کہ ذَالِكَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ

دوسرے اس آیت سے ایک دین ماننا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس جگہ پر تو باقی تمام مقامات سے زیادہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا دین مختلف ہے تبھی تو قرآن کریم

؎۵ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ بعضیہ

کے متعلق صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اور فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کہا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ جس جگہ قرآن کریم نے اختلاف پر زور دیا ہے وہیں پادری صاحب کو یہ اعتراض سوجھا ہے کہ اسلام مسیحیت اور یہودیت سب کو ایک ہی مذہب قرار دیا گیا ہے۔

؎۵ **تفسیر** ۔ میں نے جہاں لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ میں مِنْ کو بیانیہ قرار دیا تھا وہاں میرے نزدیک إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا میں مِنْ بعضیہ ہے اور كَفَرُوا سے ناواقفیت کا کفر مراد نہیں بلکہ وہ کفر مراد ہے جو جانتے بوجھتے ہوئے اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ایسے لوگوں کی یہ سزا ہوگی کہ وہ جہنم کی آگ میں داخل کئے جائیں گے اور اُس میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ سزا بتلا رہی ہے کہ یہاں اہل کتاب اور مشرکین میں سے ایسے کفار کا ہی ذکر کیا جا رہا ہے جنہوں نے جان بوجھ کر کفر کیا۔ جن پر حُجت کا اتمام ہو گیا اور جن کا اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی عُذر قابلِ شنوائی نہ رہا۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ وہ جہنم کی آگ میں داخل کئے جائیں گے

اور اُس میں رہتے چلے جائیں گے۔ پھر فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تمام مخلوق میں سے بدترین ہیں۔ اس کے مقابل میں مومنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ۔ وہ لوگ تمام مخلوق میں سے بہتر ہیں۔

شر اور خیر کے الفاظ ایسے ہیں جو ہیں تو اسمِ تفضیل مگر کثرتِ استعمال کی وجہ سے اُن کا ہمزہ اُڑ گیا ہے اس لئے اشر اور اخیر کی شکل میں استعمال نہیں ہوتے۔

شَرُّ الْبَرِيَّةِ کے معنے ہیں بنی نوعِ انسان میں سب سے بدتر یعنی یہ لوگ صرف بُرے نہیں بلکہ تمام مخلوق میں سے بدترین ہیں اور خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے وہ تمام مخلوق میں سے بہترین ہیں۔ گویا کفار سب سے بُرے ہیں اور مومن سب سے اچھے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکین کن دوسرے لوگوں سے بُرے ہیں جبکہ اہلِ کتاب اور مشرکین کے علاوہ غیر مسلم دنیا میں اور کوئی قوم ہی نہیں؟ میں بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم میں جب بھی اہلِ کتاب اور مشرکین کا ذکر کیا جائے تو اُس سے مراد تمام غیر مسلم دنیا ہوتی ہے کیونکہ غیر مسلم دو حلقوں میں ہی تقسیم کئے جا سکتے ہیں یا وہ اہلِ کتاب ہونگے یا وہ مشرک ہوں گے۔ پس جبکہ دنیا میں صرف دو ہی گروہ پائے جاتے ہیں۔ اہلِ کتاب اور مشرک۔ تو سوال یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرک بُرے کن سے ہوئے۔

اسی طرح جب مومنوں کے سوا دنیا میں اور کوئی ایماندار جماعت ہی نہیں تو وہ اچھے کن سے ہوئے؟ بے شک ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جب الگ الگ قوموں کی طرف الگ الگ انبیاء مبعوث ہُوا کرتے تھے اور ہر قوم صرف اپنے نبی پر ایمان لانے کی پابند تھی اُسے یہ ضرورت نہیں تھی کہ وہ دوسری قوم کے نبی پر بھی ایمان لائے اُس وقت اگر یہ کہا جاتا کہ مومن تمام مخلوق میں سے بہترین ہیں تو خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ زرتشتی مومنوں سے اچھے ہیں یا کرشنی مومنوں سے اچھے ہیں یا موسوی مومنوں سے اچھے ہیں۔ مگر جب مومنوں کا ایک ہی گروہ ہے تو وہ اچھے کس سے ہوئے۔ اسی طرح جب اہلِ کتاب اور مشرکین کے سوا اور کوئی کافر ہی نہیں تو وہ بُرے کس سے ہوئے؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جو اس مقام پر پیدا ہوتا ہے کہ جب کافروں کے سوا اور کوئی کافر ہی نہیں تو وہ بُرے کس سے ہوئے اور جب مومنوں کے سوا اور کوئی مومن ہی نہیں تو وہ اچھے کس سے ہوئے؟

درحقیقت اِن آیات میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا پہلے انبیاء کی اُمتوں سے مقابلہ کیا گیا ہے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کا مقابلہ پہلے انبیاء کے دشمنوں سے کیا گیا ہے اور اسی بناء پر شرالبریۃ اور خیرالبریۃ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا ہے وہ پہلے تمام انبیاء کے دشمنوں سے بدتر ہیں اور وہ لوگ جنہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے وہ پہلے تمام انبیاء کی اُمتوں سے اچھے ہیں۔ پس شرالبریۃ اور خیرالبریۃ کے الفاظ موجودہ زمانہ کی مخلوق کے لحاظ سے نہیں کہ یہ سوال پیدا ہو کہ جب مومنوں کے سوا اور کوئی مومن ہی نہیں تو وہ اچھے کس سے ہوئے اور جب کفار کے سوا اور کوئی کافر ہی نہیں تو وہ بُرے کس سے ہوئے؛ بلکہ یہ الفاظ پہلے زمانہ کے لوگوں کے مقابل میں ہیں۔ اور اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ کے معنے یہ ہیں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے منکر موسیٰؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں۔ عیسیٰؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں۔ کرشنؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں۔ زرتشتؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں اور اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کے معنے یہ ہیں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مومن موسیٰؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ عیسیٰؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ کرشنؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ زرتشتؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ غرض اُن کا مقابلہ پہلی اقوام کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس مقابلہ کی بناء پر ہی کفار کو شرالبریۃ اور مومنوں کو خیرالبریۃ کہا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

شَرُّ الْبَرِيَّةِ اور خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کا مطلب

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ

اُن کا بدلہ اُن کے رب کے حضور میں قائم رہنے والے باغات ہوں گے جن کے تلے نہریں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ

بہتی ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ ہمیش رہتے چلے جائیں گے اللہ اُن سے راضی ہوگیا

عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ ع ۲۲

اور وہ اُس (اللہ) سے راضی ہو گئے۔ یہی (جزا) اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ ۵۵

وہ تعلیم لائے تھے جو فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کی مصداق تھی، جو صحفِ مطہّرہ پر مشتمل تھی اور جس میں تمام انبیاء سابقین کی اعلیٰ تعلیم شامل تھی۔ پس نوحؑ کی اُمّت نے صرف نوحؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ موسیٰؑ کی اُمّت نے صرف موسیٰؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ عیسیٰؑ کی اُمّت نے صرف عیسیٰؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ کرشنؑ کی اُمّت نے صرف کرشنؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ زرتشتؑ کی اُمّت نے صرف زرتشتؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ مگر فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے ماتحت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت نے نوحؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، موسیٰؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، عیسیٰؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، کرشنؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، زرتشتؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا۔ جس قوم نے سب نبیوں کی تعلیم پر عمل کر لیا وہ پہلی تمام اقوام سے اچھی نہیں ہوگی تو کیا ہوگی۔ فرض کرو زید کے پاس آنہ ہے، بکر کے پاس دونی ہے، عمرو کے پاس چونی ہے، خالد کے پاس اٹھنی ہے، سلیم کے پاس روپیہ ہے۔ اسی اثناء میں ایک اور آدمی باہر سے آجاتا ہے اُس کا نام عبداللہ ہے اور اُس کے پاس روپیہ بھی ہے، اٹھنی بھی ہے، چونی بھی ہے، دونی بھی ہے اور اکنی بھی ہے تو لازماً عبداللہ۔ زید سے بھی مالدار ہوگا، بکر سے بھی مالدار ہوگا، عمرو سے بھی مالدار ہوگا، خالد سے بھی مالدار ہوگا اور سلیم سے بھی مالدار ہوگا۔ پس چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالےٰ نے یہ فرمایا تھا کہ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اور قرآن کریم کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ اس لئے فرمایا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ وہ قوم جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والی ہے باقی تمام اقوام سے اچھی ہے کیونکہ ساری قوموں کی تعلیموں پر اُس نے عمل کیا ہے۔ اِس کے مقابل میں دشمن کو شرّ البریّہ کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ نوحؑ کے دشمن نے صرف نوحؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا۔ موسیٰؑ کے دشمن نے صرف موسیٰؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا۔ عیسیٰؑ کے دشمن نے صرف عیسیٰؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا۔ کرشنؑ کے دشمن نے صرف کرشنؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا۔ زرتشت کے دشمن نے صرف زرتشتؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن نے نوحؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ موسیٰؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ عیسیٰؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ کرشنؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ زرتشتؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ اِسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء جو مختلف اوقات میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے اُن سب کی تعلیم کا اُس نے انکار کیا۔ پس وہ شرّ البریّہ یعنی تمام مخلوق میں سے بدتر ہے گویا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اور فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کا لازماً یہ نتیجہ تھا کہ منکر شرّ البریّہ ہوں اور مومن خیر البریّہ۔

جنّٰتُ عَدْنٍ سے مراد ہمیشہ کی جنات

۵۵ تفسیر۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ کے معنے بعض تفاسیر میں یہ لکھے ہوتے ہیں کہ "عدن کی جنّتیں"۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ عربی زبان میں عَدْن کے معنے "ہمیشہ" کے ہوتے ہیں۔ پس

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے معنے یہ ہیں کہ اُن کو ہمیشہ قائم رہنے والی جنّتیں ملیں گی جن کے ساتھ نہریں بھی متعلق ہوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ جیسے لائل پور اور سرگودھا وغیرہ میں زمیندار نہروں سے پانی حاصل کرتے ہیں اسی طرح جنّتیوں کو بھی دوسروں کی نہروں سے پانی لینا پڑے بلکہ ہر جنّت کی اپنی نہر ہوگی اور جنّتیوں کو اُن پر تصرّف کا پورا حق حاصل ہوگا۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ۔ "اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ تعالےٰ سے راضی ہو گئے" اللہ تعالےٰ اُن سے کیوں راضی ہُوا؟ اس لئے کہ لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوا الزَّكٰوةَ پر انہوں نے پوری طرح عمل کیا۔ جب یہ صفات اُن کے اندر پائی جاتی ہیں تو اللہ تعالےٰ اُن سے کیوں راضی نہ ہو اور وہ اللہ تعالےٰ سے کیوں راضی ہوگئے؟ اس لئے کہ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ ایک معاملہ اُنہوں نے خدا تعالےٰ سے کیا اور ایک معاملہ خدا تعالیٰ نے اُن سے کیا۔ دنیا میں تمام مذہبی لڑائیاں اور فسادات اِس وجہ سے واقعہ ہوتے ہیں کہ لوگ غلطی سے ایک جہت کا نام مذہب رکھ لیتے ہیں حالانکہ اصل مذہب نام ہے اِس بات کا کہ بندے اللہ تعالےٰ سے راضی ہوں اور اللہ تعالےٰ اپنے بندوں سے راضی ہو۔ اُن کے اعمال ایسے ہوں کہ خدا تعالیٰ کی رضاء اُن کو حاصل ہو رہی ہو اور خدا تعالےٰ کا سلوک اُن سے یہ ہو کہ وہ اُن پر اپنے انوار اور برکات کی بارش برسا رہا ہو۔ یہ بھی کیا مذہب ہے کہ نماز پڑھ رہے ہیں، روزے رکھ رہے ہیں، زکوٰۃ دے رہے ہیں، حج کر رہے ہیں اور خدا ہے کہ بولتا ہی نہیں وہ چُپ کر کے بیٹھا ہُوا ہے کسی نے کہا ہے ؎

اُلفت کا تب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ میں اللہ تعالیٰ نے یہی نکتہ بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ہم اِس مذہب کے قائل نہیں کہ بندہ محبت کی آگ میں پھنکا جا رہا ہو، فرقت کی گھڑیاں اُس کو تڑپا رہی ہوں، وصلِ یار کی آرزو اُس کے دلِ بیتاب میں جذبات کا ایک تلاطم برپا کر رہی ہو، اُس کے دن تڑپتے اور راتیں جاگتے گذر رہی ہوں اور خدا ہو کہ آسمان پر خاموش بیٹھا ہو اور اُس کی طرف سے کوئی محبت کی آواز اُس کے کانوں میں نہ آتی ہو۔ یا خدا تعالےٰ تو بُلا رہا ہو اور بندہ اُسکی محبت کے ہاتھ کو پرے کر رہا ہو۔ حقیقی عشق اور محبت میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ حقیقی محبت اِسی کو کہتے ہیں جب ؏

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

اِدھر بندہ اللہ تعالےٰ کی محبت میں گداز ہو رہا ہو اور اُدھر عرش پر اللہ تعالےٰ اپنے بندہ کی محبت کے لئے بے قرار ہو۔

حضرت رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ سے دینِ اسلام کی فضیلت

یہی وہ مقام ہے جو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا ہے۔ پس رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ایک معیار ہے جو ہر سچے مذہب میں پایا جاتا ہے۔ جو مذہب صرف ایک طرف کی چیز پیش کرتا ہے دوسری طرف کی نہیں وہ مذہب کچھ بھی چیز نہیں۔ جیسے عیسائی ہیں کہ وہ شریعت کو لعنت قرار دے رہے ہیں۔ اب اللہ تعالےٰ اُن کو خواہ کتنا بُلائے وہ اُس سے کبھی نہیں بولیں گے کیونکہ انہوں نے شریعت کو لعنت قرار دیا ہُوا ہے۔ جب شریعت اُن کے نزدیک لعنت ہے تو وہ اُس پر عمل کس طرح کر سکتے ہیں اور عمل کے نتائج اُن کو کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ اِس کے مقابل میں یہودیوں کو دیکھ لو یا موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر ہی نظر دوڑاؤ تمہیں دکھائی دیگا کہ وہ تسبیح پھیر رہے ہیں، ناکیں رگڑ رہے ہیں مگر اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی حرکت ہی نہیں ہوتی۔ مذہب یہی ہے کہ اِدھر بندہ کی طرف سے عبادت ہو اور اُدھر اللہ تعالےٰ کی طرف سے جواب ہو۔ بندہ اپنے رب سے راضی ہو اور اللہ تعالےٰ اپنے بندہ سے راضی ہو۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ۔ یہ آیت اس غرض کے لئے نازل کی گئی تھی کہ آئندہ زمانہ میں مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا مقام صرف صحابہؓ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے باوجود اِس واضح آیت کے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا انعام صرف صحابہؓ کے ساتھ مختص تھا اب آئندہ یہ انعام کسی اور شخص کو نہیں مل سکتا۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے صاف طور پر فرماتا ہے کہ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ۔ اس میں صحابہؓ کی کوئی خصوصیت نہیں اُنہوں نے چونکہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کر لی تھیں جو ہم چاہتے تھے اِس لئے اُنہیں یہ مقام حاصل ہوگیا اب اگر کوئی اور شخص یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لے تو ہم اُسے بھی یہ مقام دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ انعام کسی خاص قوم کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ صفاتِ حسنہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جو لوگ اپنے اندر ہماری بیان کردہ صفات پیدا کر لیں ہم اُنہیں فوراً اپنا انعام دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے انعامات کسی خاص فرد یا کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ ہماری یہ بات ہر اُس شخص کے متعلق پوری ہو جائیگی جو اپنے رب کی خشیت دل میں پیدا کرے۔ یہ سوال نہیں کہ زید کرے گا تو اُسے یہ انعام ملے گا اور بکر کرے گا تو اُسے نہیں ملے گا بلکہ ہمارا دروازہ اور ہماری رضاء کے مقام کا حصول ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ جو شخص اِس انعام کا طالب ہے وہ آئے اور ہماری رضاء حاصل کر لے۔

ذٰلِکَ لمن خشی میں ذٰلِکَ سے مراد رضا

ذٰلِکَ کا اشارہ رضاء کی طرف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہماری رضاء کا دروازہ ہر ایسے شخص کے لئے کھلا ہے جو اپنے قلب میں اللہ تعالےٰ کی خشیت رکھتا اور اُس کے احکام پر مستعدی سے عمل کرتا ہے۔ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے کام کے ذمہ وار ہو۔ تم اپنے اندر خشیت پیدا کرو اور ہم سے راضی ہو جاؤ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بھی تم سے راضی ہو جائیں گے۔ گویا پہلا قدم تمہاری طرف سے اُٹھنا چاہیئے پھر ہمارے قدم کا اُٹھنا تو بالکل لازمی اور یقینی ہے۔ تم اپنے اندر خشیت پیدا کروگے تو یہ یقینی بات ہے کہ ہم تم سے خوش ہو جائیں گے۔ یہ بات نہیں کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا انعام صرف صحابہؓ کے لئے تھا بلکہ جو شخص بھی اپنے اندر ہماری خشیت پیدا کر لے گا ہمارا یہ دروازہ اُس کے لئے کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ زلزال - یہ سورۃ مدنی ہے ف۵

وَهِيَ ثَمَانِي اٰيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے -

ف۵ مجاہد - عطاء اور ابن عباسؓ کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے قتادہ اور مقاتل اسے مدنی کہتے ہیں - چونکہ ایک صحابی کی تائید پہلے قول کو حاصل ہے اس لئے ترجیح اُسی قول کو ہوگی کہ اِسے مکی سمجھا جائے - مگر قرآن کریم کے مروّج نسخے جو ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں اُن کے اُوپر مدنی ہی لکھا ہُوا ہے - وہیری نے اِسے مکی قرار دیا ہے اور وُہ کہتا ہے کہ باوجود اس کے کہ اِس کی ابتدائی آیتیں مدنی سٹائل سے ملتی ہیں مگر ہے یہ مکی - یہ امر ہمیشہ ہی میرے لئے حیرت کا موجب رہتا ہے کہ یوروپین مستشرق جو زبان دانی کے لحاظ سے عام مولویوں سے بھی عربی کا علم کم رکھتے ہیں وہ سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کرتے وقت اُن کے سٹائل کو کیوں زیر بحث لے آتے ہیں جبکہ اُنکی علمی قابلیت ہرگز ایسی نہیں کہ وہ عربی کو اچھی طرح سمجھ سکیں کجا یہ کہ عربی زبان کے سٹائل کو پہچاننے کی قابلیت اُن میں موجود ہو - وہ جب بھی قرآن کریم کے متعلق اُس کے سٹائل کے لحاظ سے کوئی فیصلہ دیتے ہیں تو یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بچہ فلاسفۂ یونان یا فلاسفۂ جرمن کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر رہا ہو - اصل بات یہ ہے کہ وہ چونکہ روایت و تاریخ اسلام کے علم سے کورے ہوتے ہیں تاریخی شواہد اور علم الروایات کی شہادت سے چونکہ کوئی نئی روشنی نہیں ڈال سکتے ادھر اُنہیں اپنی علمیت جتانا بھی مقصود ہوتا ہے وہ کسی اسلامی متولہ کی تصدیق سٹائل کے نام سے کر دیتے ہیں اِس طرح کسی علمی روایت کا بھی ساتھ رہا اور سٹائل کے نام پر اپنی علمی مہارت کا بھی ثبوت دے دیا - گو حقیقتاً قرآن کریم تو الگ رہا وہ عام عربی کتب کا سٹائل بیان کرنے کی بھی قابلیت نہیں رکھتے -

ترتیب سُورۃ پچھلی سُورۃ میں قرآن کریم کا وہ اثر بیان کیا گیا تھا جو ابتدائی زمانہ میں اُس سے ظاہر ہونا تھا - اب اِس سورۃ میں اُس کے آخری زمانہ کے اثر کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ دوسری دفعہ یہ قرآن یا یہ رسُول پھر اُس وقت دنیا کی اصلاح کریگا جبکہ دنیا پر ایک زلزلۂ عظیمہ آجائے گا اور علوم کی ماہیت بدل جائے گی -

سورۃ زلزال کا سورۃ بینہ سے تعلق

وہیری نے اُس جوڑ کو نہ سمجھتے ہوئے جو اس سورۃ کے مضمون کو پچھلی سورۃ کے مضمون سے ہے لکھا ہے کہ یہ سورۃ کسی اور سورۃ کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی ہے - مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ناواقف آدمی اپنی ناواقفیت کے نتیجہ میں ایک بات کہہ دیتا ہے اور وہ ٹھیک نکل آتی ہے - درحقیقت وہیری کا یہ کہنا کہ یہ سورۃ اپنی ذات میں مکمل نظر نہیں آتی بلکہ کسی اور سورۃ کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے نادانستہ گو نامکمل اعتراف ہے اس امر کا کہ اس سورۃ کا مضمون پہلی سورۃ کا تتمہ ہے - چونکہ وہیری کو علمِ قرآن حاصل نہیں اُس کا ذہن اِدھر تو گیا کہ یہ سورۃ نامکمل ہے لیکن اس کا ذہن اِدھر نہ جا سکا کہ یہ کس دوسری سورۃ سے مل کر مکمل مضمون دیتی ہے - اُس کی مثال ابن صیاد یہودی کی طرح ہے جس کا دعویٰ تھا کہ دل کی بات بُوجھ لیتا ہے - جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۂ دخان کا مضمون دل میں رکھ کر اس سے پوچھا کہ بتا میرے دل میں کیا ہے تو دُخ دُخ کہہ کر رہ گیا - اسی طرح یہ پادری وہیری اصل نکتہ معلوم نہ کر سکا کہ اس کا مضمون تتمہ ہے سورۂ بینہ کے مضمون کا - اس نے غور سے دیکھنے والی لیکن ناتجربہ کار اور اسرار قرآنی سے ناواقف آنکھ کو یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سورۃ پہلی سورۃ کے مضمون سے شدید تعلق رکھتی ہے ہاں وہ اتنی بھانپ گئی کہ یہ سورۃ کسی

سورۃ زلزال مکی ہے

دوسری سورۃ کا ٹکڑا نظر آتی ہے۔

اس سورۃ کی نسبت عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے احمد ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے کہ اَتَی رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَقْرِءْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِقْرَأْ ثَلَاثًا مِنْ ذَوَاتِ الٓرٰ فَقَالَ الرَّجُلُ کَبُرَ سِنِّیْ وَاشْتَدَّ قَلْبِیْ وَغَلُظَ لِسَانِیْ قَالَ اِقْرَأْ ثَلَاثًا مِنَ الْمُسَبِّحَاتِ فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِہِ الْاُوْلٰی وَقَالَ وَلٰکِنْ اَقْرِئْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ سُوْرَۃً جَامِعَۃً فَاَقْرَأَہٗ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَہَا حَتّٰی فَرَغَ مِنْہَا۔ قَالَ الرَّجُلُ وَالَّذِیْ بَعَثَکَ بِالْحَقِّ لَا اَزِیْدُ عَلَیْہَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ الرُّوَیْجِلُ۔ اَفْلَحَ الرُّوَیْجِلُ یعنی ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا یا رسول اللہ مجھے قرآن شریف پڑھائیں۔ آپ نے فرمایا الٓر والی تین سورتیں پڑھا کرو۔ اُس آدمی نے کہا یا رسول اللہ میں بڈھا ہو گیا ہوں حافظہ خراب ہو گیا ہے زبان سخت ہو گئی ہے اس لئے مجھے کوئی اور سورۃ بتائیے۔ آپ نے فرمایا اچھا تین سَبِّحْ والی سورتیں پڑھ لیا کرو فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِہِ الْاُوْلٰی اُس نے وہی بات جو پہلے کہی تھی پھر دُہرائی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں حافظہ خراب ہو گیا ہے اور زبان سخت ہو گئی ہے۔ پھر اُس نے کہا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایک سورۃ ایسی بتا دیجئے جو جامع ہو۔ اِس پر آپ نے اُسے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَہَا والی سورۃ سُنائی اور کہا کہ یہ پڑھو یہاں تک کہ جب آپ یہ سُورۃ پڑھ چکے تو اُس نے کہا مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں پڑھوں گا۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ الرُّوَیْجِلُ۔ اَفْلَحَ الرُّوَیْجِلُ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چھوٹا آدمی یعنی کمزور اور بڈھا کامیاب ہو گیا۔ کامیاب ہو گیا۔

۲۰۱ سورۃ الزلزال کے متعلق بعض روایات اور مفسرین کا ان سے سورۃ الزلزال کی فضیلت ثابت کرنا

اس حدیث سے شراح اور مفسرین اس سورۃ کی فضیلت نکالتے ہیں لیکن درحقیقت اُس شخص کا مطلب یہ تھا کہ یا رسول اللہ ایک چھوٹی سی سورۃ مجھے بتا دیں جس کا میں ورد کیا کروں جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ کیونکہ اُس شخص نے الٓر کی سورتوں اور مسبّحات کی سورتوں کو لمبا بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے قرآن سُنا ہُوا تھا ورنہ اُسے یہ کیونکر معلوم ہُوا کہ الٓر والی سورتیں لمبی ہیں یا مسبّحات والی سورتیں اس کی طاقت سے بڑھ کر ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کئی معمولی قرآن شریف پڑھنے والوں کے سامنے اگر مسبّحات کا ذکر کیا جائے تو اُن میں سے کئی کہہ دیں گے کہ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مسبّحات سے آپ کی کیا مراد ہے۔ مگر اُس شخص نے آپ کی بات سُن کر کہا کہ یا رسول اللہ یہ میری طاقت سے بڑھ کر ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ نہ صرف اُس نے سارا قرآن سُنا ہُوا تھا بلکہ اس طرح سُنا ہُوا تھا کہ وہ سورتوں کو الگ الگ پہچانتا تھا۔

دوسرے آپ کا یہ فرمانا کہ تُو تین فلاں سورتیں پڑھ۔ اِس کے صاف معنے یہ ہیں کہ آپ بھی یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ضرور آپ سے ہی پڑھے بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے کوئی سورۃ پڑھنے کے لئے بتا دیں جیسے ہمارے ملک میں کئی لوگ آتے ہیں تو کہتے ہیں کوئی وظیفہ بتا دیجئے۔ اسی طرح حدیث کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اُس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ حضور مجھے کوئی ایسی سورۃ بتا دیں جس کا میں وظیفہ کیا کروں۔ آپ نے اُسے الٓر والی تین سورتیں بتا دیں۔ اگر زلزال کی کوئی خاص فضیلت ہوتی تو آپ اُسے پہلے الٓر والی تین سورتیں کیوں بتاتے پھر تو چاہیئے تھا کہ آپ پہلے اُسے سورۂ زلزال بتا دیتے۔ اس پر جب اُس نے کہا کہ میں بڈھا ہوں حافظہ خراب ہے اور زبان بھی سخت ہو گئی ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دوسری دفعہ بھی سورۂ زلزال نہیں بتائی بلکہ مسبّحات بتائیں۔ اگر اس حدیث سے سورۂ زلزال کی فضیلت کا استنباط کیا جا سکتا ہے تو کیا یہ عجیب بات نظر نہیں آتی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے اعلیٰ سورۃ تو نہ بتائی اور ادنیٰ سورتیں بتا دیں۔ پس اس حدیث سے شراح اور مفسرین کا یہ نتیجہ نکالنا کہ اس میں سورۂ زلزال کی خاص فضیلت

بیان کی گئی ہے درست نہیں ہاں یہ استدلال اس حدیث سے ضرور ہوتا ہے کہ یہ سورۃ بھی جامع سورتوں میں سے ہے۔

ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص سورۃ الزلزال پڑھے اُسے نصف قرآن کے برابر ثواب حاصل ہوتا ہے اور جو سورۂ اخلاص پڑھے اُسے تیسرے حصۂ قرآن کے برابر ثواب حاصل ہوتا ہے اور جو سورۂ کافرون پڑھے اُسے چوتھے حصۂ قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ ترمذی نے بالکل اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے۔ اسی طرح ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے وہ کہتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کہا کہ کیا تم نے نکاح کر لیا ہے؟ اُس نے جواب میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ نکاح کرنے کی توفیق حاصل ہے آپ نے فرمایا کیا قُلْ هُوَ اللّٰهُ تمہیں یاد ہے؟ اُس نے کہا ہاں یا رسول اللہ یاد ہے فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ قرآن کریم کے تیسرے حصہ کے برابر ہے۔ پھر فرمایا کیا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ تمہیں یاد ہے؟ اُس نے جواباً عرض کیا یا رسول اللہ یاد ہے۔ آپ نے فرمایا یہ سورۃ قرآن کریم کے چوتھے حصہ کے برابر ہے۔ پھر فرمایا کیا قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ یاد ہے؟ اُس نے جواباً عرض کیا ہاں یا رسول اللہ یاد ہے۔ آپ نے فرمایا یہ بھی قرآن کریم کے چوتھے حصہ کے برابر ہے۔ پھر فرمایا کیا اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا یاد ہے؟ اُس نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ یہ بھی یاد ہے فرمایا یہ بھی قرآن کریم کے چوتھے حصہ کے برابر ہے۔ پھر فرمایا شادی کر لو یعنی تمہارے پاس تو اتنی دولت ہے تم کیوں کہتے ہو کہ میرے پاس شادی کا کوئی سامان نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے وہ فرماتے ہیں سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَرَاَ فِيْ لَيْلَةٍ اِذَا زُلْزِلَتْ كَانَ لَهٗ عَدْلُ نِصْفِ الْقُرْاٰنِ اخرجہ ابن مردویہ (مذکورہ بالا سب روایتیں میں نے فتح البیان سے نقل کی ہیں) اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے جس نے کسی رات میں اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ والی سورۃ تلاوت کی اُسکو آدھے قرآن کے برابر ثواب ملے گا۔ امام احمد کی روایت جو میں نے اوپر فتح البیان کے حوالہ سے نقل کی ہے فتح البیان نے اسکو پورا نقل نہیں کیا اس روایت کا کچھ حصہ اُنہوں نے چھوڑ دیا ہے آخر میں یوں آتا ہے کہ جب اُس شخص نے کہا کہ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَزِيْدُ عَلَيْهَا اور آپ نے فرمایا اَفْلَحَ الرُّوَيْجِلُ اَفْلَحَ الرُّوَيْجِلُ۔ اور اس کے بعد وہ شخص چلا گیا تو اس کے چلے جانے کے بعد آپ نے فرمایا اُسے واپس بلاؤ۔ جب وہ واپس آیا تو آپ نے فرمایا اُمِرْتُ بِيَوْمِ الْاَضْحٰى جَعَلَهُ اللّٰهُ عِيْدًا لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ اَرَاَيْتَ اِنْ لَمْ اَجِدْ اِلَّا مَنِيْحَةً اُنْثٰى فَاُضَحِّيْ بِهَا قَالَ لَا وَلٰكِنَّكَ تَاْخُذُ مِنْ شَعْرِكَ وَتُقَلِّمُ اَظْفَارَكَ وَتَقُصُّ شَارِبَكَ وَتَحْلِقُ عَانَتَكَ فَذٰلِكَ تَمَامُ اُضْحِيَّتِكَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ یہی حدیث ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کی ہے مگر عبد اللہ بن عمرو سے نہیں بلکہ عبد الرحمٰن الحضرمی سے۔ گویا اصل حدیث کے آخر میں یہ بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے واپس بلا کر فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے یوم الاضحٰی یعنی عید الاضحیہ کا بھی حکم دیا ہے اللہ تعالےٰ نے یہ اس اُمت کے لئے عید بنائی ہے اس نے کہا یا رسول اللہ یہ تو بتلایئے یعنی آپ کی اس بارہ میں کیا رائے ہے کہ اگر میرے پاس اُونٹ یا بکری نہ ہو صرف میرے پاس ایک اونٹنی ہو جو کسی نے تحفۃً دی ہو تو کیا میں اُسے عید الاضحیہ پر ذبح کر دوں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ نہ۔ ایسا ہرگز نہ کرنا بلکہ اپنے بال منڈوانا، اپنے ناخن ترشوانا، اپنی مونچھوں کے اگلے حصے کے بال چھوٹے کروانا اور زیرِ ناف بالوں پر اُسترا پھیرنا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہاری قربانی ہوگی۔

اِن روایات کے متعلق یہ نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

اوّل یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی ایک چھوٹی سی سورۃ کو

نصف القرآن یا ثلث القرآن یا رُبع القرآن کس طرح کہا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے جو عالم جاہل بُڈھے جوان سب کے لئے ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم خود متواتر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ لوگ اس کو پڑھیں، یاد کریں اور اس پر عمل کریں اور یہ زور اس حد تک دیا گیا ہے کہ ایک سچا مسلمان اس سے شدید طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو شخص اسلام کے ساتھ کچھ بھی حقیقی دلچسپی رکھتا ہے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو وُہ اس بات کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُس کی ایمانی زندگی کا مدار صرف اور صرف قرآن کریم پر ہے اور یہ کہ وہ اتنا ہی خدا تعالیٰ کے قریب جاسکتا ہے جتنا قریب کہ وہ قرآن کریم کے گیا ہے۔

۲۱۱
کسی سورۃ کے ثلث یا ربع قرآن ہونیکا مطلب

اِن حالات میں ایک بڈھا جس کی زبان نہیں چلتی، ایک جاہل عورت جس کا حافظہ کام نہیں دیتا، ایک غیر عرب جو عربی زبان سے مانوس نہیں ہے اور اس قدر فرصت بھی اُس کو نہیں کہ وہ عمر کا معتد بہ حصہ لگا کر قرآن کریم کو حفظ کر سکے ایسے لوگوں کے دلوں کا اس تاکید کو سُن کر کیا حال ہو سکتا تھا؟ پس آپ نے اِن الفاظ میں ان لوگوں کی دلجوئی کی ہے اور بتایا ہے کہ ثواب قابلیت عمل کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ عمل کی کمیت کے لحاظ سے۔ کسی شخص میں زیادہ طاقت ہو اور وہ اپنی طاقت کے مطابق کام کرتا ہو اور دوسرے میں کم طاقت ہو اور وہ اپنی طاقت کے مطابق کام کرتا ہو تو اللہ تعالےٰ کے نزدیک وہ دونوں یکساں ثواب کے مستحق ہوں گے کیونکہ دونوں نے برابر کی قربانی کی ہے۔ پس نصف اور ثلث اور رُبع کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ اِن سورتوں میں نصف یا ثلث یا ربع کا مضمون آگیا ہے کیونکہ اگر یہ بات درست ہے کہ یہ چار مذکورہ بالا سورتیں مضمون کے لحاظ سے قرآن کریم کے نصف یا ثلث یا رُبع کے برابر ہیں تو دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے ہیں کہ ان سورتوں میں قرآن کریم کے مضامین سے بھی کچھ زیادہ آگیا ہے کیونکہ سورۂ زلزال کو نصف قرآن کے برابر، سورۂ اخلاص کو تیسرے حصہ قرآن کے برابر، سورۂ کافرون کو چوتھے حصۂ قرآن کے برابر اور سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کو بھی چوتھے حصہ قرآن کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ چار سورتیں ایک قرآن اور ایک ثلث قرآن کے برابر بنتی ہیں اور یہ بات عقلاً اور نقلاً دونوں طرح باطل ہے کہ اِن چار سورتوں میں سارے قرآن اور پھر اس سے بڑھکر ایک اور ثلث قرآن کا مضمون پایا جاتا ہو۔

اگر کہا جائے کہ یہ سورتیں آپس میں اوور لیپ (OVER LAP) کرتی ہیں یعنی جس رُبع کا مضمون ایک سورۃ میں ہے اُسی رُبع کا مضمون دوسری سورۃ میں ہے اور جس ثلث کا مضمون ایک سورۃ میں ہے اُسی ثلث کا مضمون دوسری سورۃ میں ہے تب بھی کم سے کم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ نصف قرآن کا مضمون اِن سورتوں میں ضرور آگیا ہے۔ کیونکہ ایک سورۃ کو نصف قرآن کے برابر قرار دیا گیا ہے پس اس صورت میں بھی لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نصف حصۂ قرآن نعوذ باللہ ایک بے ضرورت اور لغو کلام ہے کیونکہ جب وہی مضمون جو نصف قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے اِن چھوٹی سی سورتوں میں آگیا ہے تو پھر اُس کے نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اگر کہو کہ آپ لوگ سورۂ فاتحہ کو بھی تو سارے قرآن کا خلاصہ کہتے ہیں اور پھر باوجود اس کے آپ لوگ قرآن کریم کی ضرورت بھی تسلیم کرتے ہیں اگر سورۂ فاتحہ کو سارے قرآن کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے تو پھر کوئی دوسری سورۃ نصف یا ثلث یا رُبع کے برابر کیوں نہیں ہو سکتی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ سارے قرآن کریم کے مضامین کا خلاصہ اپنے اندر رکھتی ہے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میں قرآن کریم کے مضامین کا خلاصہ آگیا ہے تو ساتھ ہی ہم یہ بھی تو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ الٓـمّٓ سے لے کر وَالنَّاس تک کے تمام مضامین اس میں آگئے ہیں۔ اس نے ہمارے علم میں یقیناً زیادتی ہوتی ہے یعنی جب تفصیلی قرآن میں ہم کو کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو ہم سورۂ فاتحہ میں جو مجمل قرآن ہے اُس کو تلاش کرتے ہیں اور جب مجمل قرآن میں ہم کو کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو قرآنِ عظیم میں اُس مسئلہ کو تلاش کرتے ہیں۔ اس سے اُمت میں غور و فکر کا دوہ

پیدا ہوتا ہے اور اُس کے علم میں زیادتی ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے سورۂ فاتحہ کو سارے قرآن کریم کا قائم مقام نہ تو ہم مانتے ہیں اور نہ آج تک کسی نے ایسا کیا ہے۔ اور ان احادیث میں تو یہ کہا گیا ہے کہ جس نے فلاں سورۃ پڑھی اُسے نصف یا ثلث یا رُبع قرآن کریم پڑھنے کا ثواب مل گیا۔ مگر سورۂ فاتحہ کی نسبت تو ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ جس نے سورۂ فاتحہ پڑھی اُسے سارے قرآن کا ثواب مل گیا۔ مضمون کا ہونا اور شئے ہے اور ثواب کا ملنا بالکل اور شئے ہے۔ اگر یہاں بھی مضمون مراد ہے تو اُس نصف یا ثلث یا رُبع کی تعیین ہونی چاہیئے تھی۔ جس نصف یا ثلث یا رُبع کا یہ سورتیں خلاصہ ہیں۔ آخر قرآن کریم کا نصف کئی صورتوں میں ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی کہ پہلا نصف مراد لے لیا جائے۔ اِس صورت میں بھی کہ دوسرا نصف مراد لے لیا جائے اور اس صورت میں بھی کہ قرآن کریم کو متفرق جگہوں سے نکال کر اس کا نصف یا ثلث یا ربع مراد لے لیا جائے۔ سورۂ فاتحہ میں تو ایک تعیین کر دی گئی تھی کہ وہ سارے قرآن کریم کا خلاصہ ہے۔ اس تعیین کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں تو غور کرتے ہیں کہ اُس میں سارے قرآن کریم کا مضمون کس طرح آ گیا ہے یا جب ہم سورۂ بقرہ پڑھتے ہیں یا آل عمران پڑھتے ہیں یا نساء پڑھتے ہیں یا مائدہ پڑھتے ہیں یا انعام پڑھتے ہیں تو ہم غور کرتے ہیں کہ اُس میں سورۂ فاتحہ کے مضامین کس طرح بیان ہوئے ہیں مگر یہاں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ کونسا نصف ہے جس کے برابر سورۂ زلزال ہے یا کونسا ثلث ہے جس کے قائم مقام سورۂ اخلاص ہے یا کونسا رُبع ہے جس کی قائم مقام سورۃ کافرون اور سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ ہے۔ پس اِن سورتوں پر غور کر کے ہم کس دوسرے نصف یا ثلث یا رُبع کے مضمون پر غور کر کے ہم یہ سمجھیں کہ اُن میں اِن سورتوں کا مضمون زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پس محض یہ کہہ دینا کہ فلاں سورۃ نصفِ قرآن کے برابر ہے اور فلاں ثلث قرآن یا ربع قرآن کے برابر فائدہ کے لحاظ سے بالکل بے کار ہے۔ نہ ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان سورتوں میں کسی نصف یا کسی ثلث یا کسی ربع کا مضمون خلاصۃً بیان ہوا ہے نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس نصف یا ثلث یا رُبع میں اِن سورتوں کے مضامین کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ قرآن کریم کا وہ نصف یا ثلث یا ربع معیّن کیا جاتا جس کے مضامین کو اِن سورتوں میں بیان کیا گیا تھا تا کہ مومن اُس نصف یا ثلث یا ربع کے مضامین کا اُن سے مقابلہ کر کے اپنا ایمان تازہ کرتے جیسے سورۂ فاتحہ پر غور کر کے ہم سارے قرآن کریم کے مضامین کو اخذ کر سکتے ہیں اور سارے قرآن کریم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ وہی مضمون پاتے ہیں جو سورۂ فاتحہ میں بیان ہوا ہے مگر آپ نے اُس نصف یا ثلث یا رُبع کا کوئی ذکر نہیں کیا جس کے یہ برابر ہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ اشارہ مضمون کی طرف نہیں۔ خود حدیث کے الفاظ بھی اِسی پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت مروی ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ مَنْ قَرَءَ فِیْ لَیْلَۃٍ اِذَا زُلْزِلَتْ کَانَ لَہٗ عَدْلُ نِصْفِ الْقُرْاٰنِ۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اُس کا مضمون نصف قرآن کے برابر ہے جیسے سورۂ فاتحہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ خلاصہ ہے سارے قرآن کا۔ بلکہ آپ نے جو کچھ فرمایا اُس کا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کا ثواب نصف قرآن کے ثواب کے برابر ہے۔ مگر یہ معنے بھی ایسے ہیں جنہیں کوئی عقلمند درست تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر اِس چھوٹی سی سورۃ کا ثواب نصف قرآن کے ثواب کے برابر ہے تو پھر کسی کو سارا قرآن پڑھنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں رہتی اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ اس میں نصف قرآن یا رُبع قرآن کا مضمون بیان کیا گیا ہے تو پھر اُس نصف یا رُبع کی تعیین ہونی چاہیئے تھی جن کا مضمون اس سورۃ میں خلاصۃً بیان کیا گیا ہے تا کہ جو شخص بھی اس سُورۃ کو پڑھتا وہ سمجھتا کہ اس میں فلاں نصف یا فلاں رُبع کے تمام مضامین آ گئے ہیں۔ پس اگر ہم اِن احادیث کو صحیح تسلیم کر لیں تو پھر وہی بات بن جاتی ہے جو دعائے گنج العرش کے متعلق مشہور ہے کہ جس نے اُسے ایک دفعہ پڑھ لیا اُسے آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک سارے نبیوں ولیوں اور بزرگوں کی عبادت کا ثواب مل گیا۔ اس کے بعد انسان کو

اور کیا چاہیئے۔ جب اتنی آسانی سے کسی کو سارے نبیوں اور بزرگوں اور ولیوں کی عبادت کا ثواب مل رہا ہو تو اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ محنت کرے اور اپنے نفس کو مشقتوں میں ڈالکر اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کی کوشش کرے وہ دعائے گنج العرش پڑھ لے گا اور مطمئن ہو جائے گا کہ میں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو مجھ سے پہلے نبیوں اور ولیوں نے حاصل کیا تھا پس اگر ثواب مراد ہے تو اس حدیث کا وہی مفہوم بن جاتا ہے جو دعائے گنج العرش کا ہے مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان احادیث کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت اِن احادیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ایک کمزور انسان جس کا حافظہ کمزور ہے اگر تین چار چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کر لے تو اُسے ویسا ہی ثواب مل جائے گا جیسے ایک اچھے حافظہ اور علم رکھنے والے انسان کو جس نے سارا قرآن یاد کر لیا۔ اِس طرح ایک تو جزائے اعمال کا اسلامی فلسفہ بتا دیا گیا کہ اسلامی فلسفہ یہ نہیں کہ اگر کسی کے پاس زیادہ سامان ہوں گے تو اُسے زیادہ ثواب ملے گا بلکہ اگر کوئی شخص اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق قربانی کا حق ادا کر دیتا ہے تو وہ ثواب میں اُس شخص سے یقیناً بڑھ جائیگا جس نے گو بظاہر اس سے زیادہ قربانی کی مگر اپنی طاقت سے کم حصہ لیا۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس دس لاکھ روپیہ ہے اور وہ اُس میں سے دس ہزار روپیہ خدا تعالیٰ کی راہ میں دیدیتا ہے اور دوسرے شخص کے پاس صرف سَو روپیہ تھا مگر اُس نے سو کا سو روپیہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا تو ایک سَو روپیہ خرچ کرنے والا دس ہزار روپیہ چندہ دینے والے سے زیادہ ثواب حاصل کرے گا کیونکہ اس نے اپنی ساری پونجی خدا تعالیٰ کی راہ میں لُٹا دی لیکن دس لاکھ والے نے اپنی ساری پونجی خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کی بلکہ اُس کا سواں حصہ خرچ کیا پس وہ دس ہزار روپیہ خرچ کرنے کے باوجود ثواب میں اُس شخص سے بہت کم رہے گا جس نے سَو روپیہ خرچ کیا ہے۔ اس کی ایک موٹی مثال موجود ہے۔ حضرت ابوبکرؓ مال میں حضرت عثمانؓ سے بہت کم تھے۔ حضرت عثمانؓ نے صرف ایک غزوہ کے موقع پر اتنا چندہ دے دیا تھا کہ شاید ابوبکرؓ کو سالوں میں بھی مجموعی طور پر اتنا چندہ دینے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ مگر باوجود اس کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خدمات میں حضرت ابوبکرؓ کی تعریف حضرت عثمانؓ سے زیادہ کی ہے اِسکی وجہ درحقیقت یہی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بعض دفعہ اپنا سارا مال ہی خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ کے متعلق یہ بات ثابت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا ایک دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اب کی دفعہ صدقہ وخیرات میں ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں۔ اُن کا اندازہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں جو چندہ دیا ہے وہ نصف مال سے کم ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ میں اب کی دفعہ اپنا نصف مال دیدونگا اور اس طرح ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں میں مال لے کر بھاگا بھاگا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچا اور میں اپنے دل میں بڑا خوش تھا کہ آج ابوبکرؓ سے ضرور بڑھ جاؤں گا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ابوبکرؓ پہلے ہی کھڑے تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُنہیں یہ کہہ رہے تھے کہ ابوبکر تم نے اپنے گھر میں بھی کچھ چھوڑا؟ اور ابوبکرؓ اُس کے جواب میں یہ کہہ رہے تھے کہ یا رسول اللہ! اللہ اور اُس کے رسول کا نام چھوڑا ہے حضرت عمرؓ کہتے ہیں جب میں نے یہ بات سُنی تو میں نے اپنے دل میں سمجھ لیا کہ اس شخص سے بڑھنا ناممکن ہے اب دیکھو جہاں تک مال کا سوال ہے عثمانؓ زیادہ مالدار تھے، جہاں تک رقموں کا سوال ہے جو رقمیں حضرت عثمانؓ نے دیں ابوبکرؓ نے نہیں دیں مگر باوجود اس کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کی تعریف کرتے ہیں عثمانؓ کی اتنی تعریف نہیں کرتے۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے مال کی نسبت سے ابوبکرؓ نے جو قربانی کی وہ عثمانؓ نے نہیں کی۔ پس یہاں جزائے اعمال کا اسلامی فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جزائے اعمال کے متعلق اسلامی مسئلہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ کمیت کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ دیا گیا ہے وہ

جزائے اعمال کا اسلامی فلسفہ

دینے والے کی قربانی کی طاقت کے مقابلہ میں کیا نسبت رکھتا ہے
اگر دی ہوئی چیز بہت چھوٹی سی ہے مگر تمام حالات کو مدنظر
رکھتے ہوئے اُس میں ساری طاقت اتنی ہی تھی تو وہ اُس شخص سے
بڑھ جائے گا جس نے اُس سے زیادہ دیا۔ مگر وہ قربانی کی
طاقت زیادہ رکھتا تھا۔

دوسرے کمزور اور نحیف اور ناتوان آدمیوں کو حسرت اور
دلشکنی سے بچا لیا گیا ہے۔ جس کا حافظہ کمزور ہے وہ یہ نہیں
کہہ سکتا کہ مَیں تو مارا گیا نہ معلوم قیامت کے دن اچھے حافظوں والے
قرآن کریم کو حفظ کرنے کی وجہ سے کیا کیا ثواب لے جائیں گے وہ
جب اس حدیث پر آئے گا کہ جس نے سورۃ الزلزال پڑھی اُسے
نصف قرآن کا ثواب مل گیا اُس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگ جائیگا
اور وہ کہے گا سورۃ الزلزال یاد کرنے کی تو مجھے توفیق حاصل ہے
آؤ میں اسے یاد کرکے ثواب میں اُس شخص کے برابر ہو جاؤں جس
نے نصف قرآن یاد کیا ہُوا ہے یا سورۂ اخلاص تو میں آسانی سے
حفظ کر سکتا ہوں یا سورۂ کافرون یاد کرنا تو کوئی مشکل امر نہیں
یا سورۃ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ تو میں اچھی طرح یاد کر سکتا
ہوں اور اس طرح ان چار چھوٹی چھوٹی سورتوں کو یاد کرکے میں
ثواب میں اُس شخص کے برابر ہو سکتا ہوں جس نے سارا قرآن حفظ
کیا ہُوا ہے۔ مایوسی اُس کے دل سے دُور ہو جائے گی، اُس کے
حسرت واندوہ کے جذبات مسرت وانبساط سے تبدیل ہو جائینگے
اور اُس کا دل پکار اُٹھے گا کہ میرے لئے گھبراہٹ کی کوئی بات
نہیں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے بھی اپنے قرب وانعامات کا
دروازہ کھولا ہُوا ہے۔

اس کا مزید ثبوت کہ یہی معنے اس جگہ مراد ہیں یہ ہے
کہ وہ شخص جس نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ مجھے ایک جامع سورۃ
بتائیے جس کا میں ورد کیا کروں اُسے آپ نے پھر بُلا کر کہا کہ
عیدالاضحیہ کا بھی اسلام میں حکم پایا جاتا ہے۔ اب بظاہر یہ بات
آپ کی نعوذ باللہ کیسی بے جوڑ معلوم ہوتی ہے کہ آپ اُسے واپس
بلاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اُسے اسلام کے اور ضروری احکام
کی طرف توجہ دلائیں اُسے کہتے ہیں کہ عیدالاضحیہ منانا بھی
اسلامی احکام میں سے ایک حکم ہے۔ حالانکہ قرآن پڑھنے کے علاوہ
اسلام میں نماز کا بھی حکم ہے، روزے کا بھی حکم ہے، زکوٰۃ کا بھی
حکم ہے، حج کا بھی حکم ہے، جہاد کا بھی حکم ہے یہ عیدالاضحیہ منانا
کونسا حکم ہے کہ آپ نے اُسے خاص طور پر واپس بُلایا اور فرمایا
کہ میاں ذرا یہ بھی سُن جانا کہ اسلام میں عیدالاضحیہ منانے کا بھی
حکم ہے۔ اگر آپ اُسے بتاتے تو یہ بتاتے کہ صرف قرآن ہی یاد
نہیں کرنا بلکہ نماز بھی پڑھنا ہے۔ بتاتے تو یہ بتاتے کہ زکوٰۃ کا
بھی اسلام میں حکم دیا گیا ہے۔ بتاتے تو یہ بتاتے کہ صرف سورۂ
زلزال پڑھنے پر ہی اکتفا نہ کرنا بلکہ روزے بھی رکھنا۔ بتاتے تو یہ
بتاتے کہ تم نے جہاد بھی کرنا ہے یا اَور بڑے بڑے اہم مسائل
جن کا اسلام میں حکم دیا گیا ہے اُن کی طرف اُس کی توجہ کو پھیرتے
مگر آپ ان تمام باتوں کو چھوڑ کر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ اسلام
میں قربانی کا بھی حکم پایا جاتا ہے۔ یہ بات ایسی ہے کہ اگر اس پر
پورے طور پر غور کرکے اس کا صحیح مفہوم نہ نکالا جائے تو ظاہری
صورت میں یہ بات بالکل ویسی ہی بن جاتی ہے جیسے ایک لونڈی کے
متعلق مشہور ہے کہ وہ رمضان میں روزانہ سحری کے وقت اُٹھ کر
بیٹھ جاتی اور سحری بھی کھاتی مگر روزہ نہیں رکھتی تھی۔ گھر کی مالکہ رحمدل
اور نیک بہت عورت تھی اُس نے سمجھا کہ یہ ہماری خاطر اُٹھتی ہے
تاکہ کام میں کچھ مدد دے سکے ورنہ اس کا منشا اگر روزہ رکھنا
ہوتا تو روزہ بھی رکھتی چونکہ یہ روزہ نہیں رکھتی اس لئے معلوم ہوتا
ہے کہ سحری کے وقت یہ ہماری خاطر ہی تکلیف کرکے اُٹھ بیٹھتی ہے
ایک دن مالکہ نے اُس سے کہا تُو نے روزہ تو رکھنا نہیں ہوتا اس لئے
سحری کے وقت نہ اُٹھا کر ہم کام خود کر لیا کریں گے۔ وہ کہنے لگی
بی بی نمازیں نہیں پڑھتی روزہ میں نہیں رکھتی اگر سحری بھی نہ
کھاؤں تو کافر ہی ہو جاؤں۔ جس طرح اُس لونڈی نے نماز اور
روزہ سے سحری مقدم کر لی تھی اِسی طرح اس حدیث کا مفہوم
یہ بن جاتا ہے کہ ایک تورات کو سورۂ زلزال پڑھ لی اور ایک عید
کے دن قربانی کا بکرا کھا لیا بس اسلام کے سارے احکام پر
عمل ہو گیا مگر اس حدیث کے ہرگز یہ معنے نہیں ہیں۔ آپ کا
اُسے واپس بلانا اور اسلام کے اور تمام احکام کو نظر انداز کرکے

صرف اتنا فرمانا کہ عید الاضحیہ کا بھی اسلام میں حکم پایا جاتا ہے اور پھر اُس کے یہ کہنے پر کہ مجھے ایک اُونٹنی تحفہ میں ملی ہوئی ہے کیا میں اُسے قربان کر دوں آپ کا یہ فرمانا کہ تجھے جانور قربان کرنیکی ضرورت نہیں بلکہ اگر تُو بال منڈواتا ہے، مونچھوں کے بال ترشواتا ہے، ناخن کٹواتا ہے، زیرِ ناف بالوں پر اُسترا پھیرتا ہے تو یہ بھی تیری قربانی ہے درحقیقت اِس لئے تھا کہ آپ اپنی پہلی بات کی حقیقت اور فلسفہ اُسے اور دوسرے سننے والوں کو بتانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب اُس نے کہا کہ میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو مجھے تحفہ کے طور پر ملی ہوئی ہے کیا میں اُس اونٹنی کو ذبح کر دوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں۔ تمہارے جیسے غریب آدمی کے لئے بال منڈوانا اور ناخن ترشوانا ہی قربانی کا مترادف ہے اور اس طرح بتا دیا کہ جس طرح بال منڈوانا اور ناخن ترشوانا ایسے آدمی کے لئے قربانی کے برابر ہے جس کو قربانی کی طاقت نہ ہو۔ اسی طرح وہ شخص جس کا حافظہ کمزور ہے، جس کی صحت خراب ہے یا جو بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکا ہے اور اُس کی صحت۔ حافظہ اور قویٰ زیادہ قرآن حفظ کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے اُس کا سورۂ زلزال کو یاد کر لینا ہی بڑی سورتوں یا قرآن کریم کو یاد کر لینے کے برابر ہے۔ یہ فلسفہ تھا جس کے بیان کرنے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس بڈھے کو واپس بلاؤ تاکہ وہ بھی اس فلسفہ سے آگاہ ہو جائے اور صحابہؓ بھی سمجھ لیں کہ میرا اس سے کیا منشاء ہے۔ اگر معانی کی طرف اشارہ ہوتا تو طاقت والے کے لئے اور نہ طاقت والے کے لئے معانی کے لحاظ سے وہ سورۃ یکساں ہونی چاہیئے تھی مگر آپ دونوں کے لئے اِن سورتوں کا حفظ یکساں قرار نہیں دیتے بلکہ ایک مثال کے ذریعہ اس فرق کو واضح کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک غریب شخص قربانی کی استطاعت نہ رکھنے کی صورت میں صرف بال منڈوا کر اور ناخن ترشوا کر قربانی کے ثواب میں شریک ہو سکتا ہے اِسی طرح وہ شخص جس کا حافظہ اور صحت زیادہ قرآن حفظ کرنے کی اجازت نہیں دیتے اُس کا سورۂ زلزال کو یاد کر لینا ہی نصف قرآن کے ثواب کے برابر ہے۔ پس بیشک سورۃ الزلزال یا سورۃ الاخلاص یا سورۃ الکافرون یا سورۃ النصر کے یاد کر لینے سے انسان کو نصف القرآن یا ثلث القرآن یا رُبع القرآن کا ثواب مل جاتا ہے مگر ہر ایک کو نہیں۔ اُس کمزور انسان کو جس کو صرف سورۃ الزلزال ہی یاد ہو سکتی تھی یا سورۃ الاخلاص ہی یاد ہو سکتی تھی یا سورۃ الکافرون اور سورۃ النصر ہی یاد ہو سکتی تھیں وہ اگر سورۃ الزلزال پڑھ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حضور وہ ویسا ہی سمجھا جائے گا جیسے اُس نے نصف قرآن پڑھ لیا۔ پس یہاں معانی کا سوال نہیں نہ ہر شخص کا سوال ہے بلکہ صرف معذور کیلئے ثواب حاصل کرنے کا ایک رستہ کھولا گیا ہے۔

قرآن مجید کی سورتوں کے دولت قرار دینے میں حکمت

غرض اُس شخص کو خاص طور پر بلا کر وہ حکم بتانا جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے بہت کم ہے صاف بتاتا ہے کہ آپ کا منشاء یہ تھا کہ یہ حکمت اُس پر اور دوسروں پر واضح ہو جائے اور وہ اس دھوکے میں نہ پڑ جائیں کہ زلزال یا کوئی اور سورت درحقیقت نصف یا ثلث یا رُبع قرآن کے برابر ہو سکتی ہے اِس لئے ہمیں قرآن پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) دوسرا نکتہ قابلِ توجہ اِن احادیث میں یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی چند سورتوں کے یاد ہونے کو ایک دولت قرار دیا ہے اِس سے ایک طرف تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایمان اپنی رسالت پر ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اُس کلام کو جو آپ پر نازل ہوتا تھا کس قدر قیمتی سمجھتے تھے کہ جسے اُس کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی یاد ہو اُس کی نسبت خیال فرماتے تھے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اور محتاجوں اور ناداروں میں شامل کئے جانے کے قابل نہیں۔ یہ ایمان محض آپ کی راستبازی کا ہی ثبوت نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اِس امر کا بھی ثبوت ہے کہ اس کلام نے آپ کے جسم کے ذرہ ذرہ پر قابو پا لیا تھا اور آپ اس کی اہمیت کو ہر دوسری شئے پر مقدم سمجھتے تھے۔

(ب) اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہؓ کے ایمان پر بھی بڑا بھروسہ تھا اور آپ یقین رکھتے تھے کہ آپ کے صحابہ بھی قرآن کریم کو ایک عظیم الشان دولت سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کے صحابہؓ اِس خیال کے نہ ہوتے تو آپ کا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(مَیں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَہَا ۙ

جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا ؎۲

اُس صحابی کو یہ کہنا کہ جب تجھے چند سورتیں یاد ہیں تو تُو نکاح کر بے معنے ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی لڑکی ہی نہ دے گا تو وہ نکاح کیونکر کرے گا۔ اگر لڑکیاں اور لڑکیوں کے ماں باپ بھی قرآن کریم کو ایک عظیم الشان دولت نہ سمجھتے اور انہیں یقین نہ ہوتا کہ قرآن کریم کا ایک جزو بھی انسان کو دولتمند بنا دیتا ہے تو آپ یہ حکم کبھی نہ دے سکتے تھے اور وہ شخص اِس پر عمل بھی کبھی نہ کر سکتا تھا۔

(ج) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے مسلمانوں کے لئے قرآن پڑھنا قرآن سمجھنے کے مترادف تھا اور قرآن سمجھنا اُس پر عمل کرنے کے مترادف تھا اور نہ قرآن کی چند سورتوں کا یاد ہونا اُن کے لئے دولت کس طرح کہلا سکتا تھا۔ آجکل مسلمان اول تو قرآن پڑھتے ہی نہیں ایک بہت ہی چھوٹی تعداد قرآن پڑھنا جانتی ہے مگر اس چھوٹی تعداد میں سے اَور بھی تھوڑے لوگ ہیں جو قرآن کو سمجھتے ہیں اور اُن بہت ہی تھوڑے لوگوں میں سے بالکل قلیل گروہ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ایسا ہی جو اُس کو سمجھ کر باطن کو جانے دو اُس کے ظاہر پر عمل کرتا ہے۔ اِن حالات میں ایسے لوگوں کا ادب کون کر سکتا ہے اور ایسی قوم جس کا اپنی مذہبی اور الہامی کتاب کی نسبت یہ رویّہ ہے وہ کسی عزت کی مستحق ہی کس طرح ہو سکتی ہے۔

؎۲ **حل لغات۔** زُلۡزِلَتۡ: زَلۡزَلَ سے مؤنث مجہول کا صیغہ ہے اور زَلۡزَلَ اللّٰہُ الۡاَرۡضَ زَلۡزَلَۃً وَّ زَلۡزَالًا وَّ زَلۡزَالًا وَّ زُلۡزَالًا کے معنے ہیں اَرۡجَفَہَا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہلا دیا اور زَلۡزَلَ فُلَانًا کے معنے ہیں خَوَّفَہٗ وَحَذَّرَہٗ اُسے خوف دلایا اور ڈرایا۔ اور زَلۡزَلَ الۡاِبِلَ کے معنے ہیں سَاقَہَا بِعُنۡفٍ اونٹوں کو مار کوٹ کر چلایا اور اَلزَّلَازِلُ کے معنے اَلشَّدَائِدُ وَالۡاَھۡوَالُ کے ہیں یعنی سختیاں اور خوف (اقرب)۔ اِذَا جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے مستقبل کے معنے رکھتا ہے اور اِذۡ کا استعمال بالعموم ماضی پر ہوتا ہے۔

تفسیر۔ عام قاعدہ کے رُو سے یہ آیت یوں ہونی چاہیئے تھی اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالًا لیکن یہاں زِلۡزَالًا کی بجائے زِلۡزَالَہَا کہا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالًا کے تو صرف اتنے معنے ہوتے کہ زمین خوب ہلائی جائے گی۔ لیکن زِلۡزَال کو اَرۡض کی طرف اضافت دے کر اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس جگہ خاص مقدر زلزلہ مراد ہے نہ کہ عام زلزلہ خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔ عام زلازل تو آتے ہی رہتے ہیں خواہ سینکڑوں سال کے بعد آئیں۔ مگر وجہ اسکے کہ وہ متواتر اور بار بار آتے ہیں وہ زِلۡزَالَہَا کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ زِلۡزَالَہَا وہی زلزلہ کہا جا سکتا ہے جو زمین کے ساتھ تعلق رکھنے والا خاص زلزلہ کہلا سکتا ہو اور پھر ہو بھی ساری زمین پر تاکہ اُس کے آنے پر صرف یہ نہ کہا جائے کہ زمین پر ایک زلزلہ آگیا بلکہ یوں کہا جائے کہ زمین کا مخصوص زلزلہ یا مقدر زلزلہ آگیا۔ عبارت کی اس بناوٹ ہی کی وجہ سے مفسرین کا ذہن ادھر گیا ہے کہ یہاں زلزلۂ قیامت مراد ہے جبکہ اُن کے نزدیک ساری زمین پر زلزلہ آئیگا اور زمین تہ و بالا ہو جائے گی۔

زمین کی ایک دن تباہی تو قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے لیکن یہ کہ وہ زلزلہ کے ذریعہ سے ہوگی غیر مسلم ہیں

حاشیہ: اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالًا کا مصدر استعمال کرنے کی بجائے زِلۡزَالَہَا کہنے کی وجہ

زُلۡزِلَتۡ

کسی نص سے ثابت نہیں بلکہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج قریب آجائے گا اور سب دنیا اُس کی گرمی کی وجہ سے تباہ ہو جائے گی لیکن بہرحال اس آیت کے الفاظ ایسے ہیں کہ اُن سے یا تو قیامت مراد لی جا سکتی ہے یا پھر کوئی ایسا امر جو قیامت کے مشابہ ہو اور سب دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔ میری ذاتی رائے یہی ہے جیسا کہ میں اگلی آیات سے اپنے استدلال کو پیش کروں گا کہ اس جگہ قیامتِ کبریٰ مراد نہیں بلکہ اس کے قریب زمانہ میں ظاہر ہونے والا وہ عظیم الشان تغیّر مراد ہے جو زمانۂ مسیح موعود میں مقدر تھا اور جسے اُس کے پھیلاؤ، اُس کی اہمیت اور اُس کے خطرناک نتائج کے لحاظ سے قیامت کہا جا سکتا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ میں بیان شدہ پیشگوئی کے پورے ہونیکا زمانہ

زِلْزَال کے چار معنے

زِلْزَال کے معنے جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ہلانے، خوف زدہ کرنے اور ہوشیار اور چوکس کرنے کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ جب سب کی سب زمین کو ہلا دیا جائے گا، خوف زدہ کیا جائے گا اور ہوشیار کیا جائے گا۔ ان معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ لازماً نکلتا ہے کہ اس جگہ زمین کا لفظ صرف زمین کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ اہلِ زمین بھی اس جگہ پر مراد ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں قریہ سے اہلِ قریہ اور عِیر سے اہلِ عیر مراد لئے گئے ہیں سورۂ یوسف رکوع ۱۰ میں اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبان سے فرماتا ہے وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا۔ اسی گاؤں سے پوچھ لیجئے جس گاؤں میں ہم تھے اور اسی گدھوں کے قافلہ سے پوچھ لیجئے جس کے ساتھ ہم اس طرف آئے ہیں۔ اِس جگہ گاؤں سے مراد گاؤں والے اور گدھوں کے قافلہ سے مراد گدھے کے سواروں یا اُن کے چلانے والوں سے ہے اُردو میں بھی کہتے ہیں کہ سب گاؤں کو اس کا علم ہے گاؤں سے مراد اس جگہ گاؤں والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس جگہ بھی زمین اور اہلِ زمین دونوں آیت کے مفہوم میں شامل ہیں اور بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب سب زمین ہلائی جائے گی اور اہلِ زمین بھی ہلائے جائیں گے، خوف زدہ کئے جائیں گے اور ہوشیار کئے جائیں گے۔

زمین کے ہلائے جانے سے مراد اہلِ زمین کا ہلایا جانا

جہاں تک اس وقت تک کی تاریخ سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقشہ موجودہ زمانہ کا ہی کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ جس حد تک زمین کے ہلنے کا سوال ہے یہی زمانہ ہے کہ جس میں ریلوں اور کارخانوں کی کثرت کی وجہ سے زمین کانپتی رہتی ہے اور جہاں تک اہلِ زمین کا سوال ہے مقابلہ کا ایسا بازار گرم ہے کہ متمدن دنیا میں چلتا ہوا انسان نظر آنا مشکل ہے۔ سب دوڑ رہے ہیں رات کو دنیا کی حالت کچھ ہوتی ہے تو صبح کو کچھ اَور ہو جاتی ہے۔ زمین رات اور دن چلنے والی ریلوں کی وجہ سے لرزہ براندام رہتی ہے اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں ریلوں اور کارخانوں نے زمین کو جنبش نہیں دے رکھی۔ کبھی کارخانوں کے علاقوں میں جاؤ یا ریل کی پٹڑی کے پاس ریل کے گذرتے وقت گذرو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک زلزلہ آیا ہوا ہے۔

پھر لڑائی کے سامان ایسے ایجاد ہوئے ہیں کہ اُن سے زمین ہل رہی ہے۔ جنگیں ایسی خطرناک صورت اختیار کر گئی ہیں کہ شہروں کے شہر اڑا دئے جاتے ہیں اور زمین میں غار پڑ جاتے ہیں۔ پھر زلازل بھی الٰہی کلام کے ماتحت بکثرت آ رہے ہیں اور علاقوں کے علاقے اُن سے صاف ہو گئے ہیں۔ پس جہاں تک زمین کے ہلنے کا سوال ہے اِن ایام میں زمین ایسی ہلی ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر پہلے نہیں ملتی کیونکہ پہلے صرف زلزلوں سے جو ممکن ہے بعض موجودہ زلزلوں سے بھی بڑے ہوں زمین ہلا کرتی تھی مگر اب (۱) زلزلوں سے اور متواتر زلزلوں سے اور عالمگیر زلزلوں سے ہل رہی ہے (۲) توپوں، ہوائی جہازوں کے بموں، ڈائنامیٹ اور اب ایٹم بموں کے ذریعہ سے جو ساری دنیا اور ہر خطۂ زمین پر اثر انداز ہوتے ہیں زمین ہلی ہے اور بہت بُری طرح ہلی ہے اور یہ اشیاء پہلے زمانہ میں موجود ہی نہیں تھیں اِسی زمانہ میں ایجاد ہوئی ہیں۔ (۳) ریلوں، زمین دوز ریلوں اور کارخانوں کی وجہ سے جو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک اور مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے ہیں زمین روز و شب ہل رہی ہے اور اگر یہی ترقی جاری رہی تو ہلتی چلی جائے گی۔

دوسرے معنے اہل زمین کے ہیں۔اگر ہم دیکھیں تو وُہ
بھی اس طرح ہلائے گئے ہیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہلائے
گئے۔انسانوں کے ہلنے کے یہ معنے ہُوا کرتے ہیں۔اوّل لوگوں
میں بیداری پیدا کی جائے۔ دوم لوگوں میں خوف پیدا کیا جائے
سوم لوگوں میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جو علاوہ اور اقسام کے
مندرجہ ذیل امور سے ہُوا کرتی ہے (الف) سیاسیات میں
تبدیلی کی وجہ سے (ب) معاشیات میں تبدیلی کی وجہ سے
(ج) مذہبیات میں تبدیلی کی وجہ سے (د) اخلاقیات میں
تبدیلی کی وجہ سے (ہ) علوم میں تبدیلی کی وجہ سے (و)
اقتصادیات میں تبدیلی کی وجہ سے۔ یہ سارے کے سارے
امور دنیا کو ہلانے کے اس زمانہ میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

اوّل۔ بیداری کا پیدا ہونا۔ پہلے زمانہ میں اگر بیداری
پیدا ہوتی تھی تو صرف چوٹی کے چند آدمیوں میں پیدا ہوتی تھی
کیونکہ اس سے پہلے دنیا کا نظام بادشاہت یا حکومت امراء پر
چلا کرتا تھا اگر شاہی خاندان میں کوئی تبدیلی آتی یا حکومت امراء
میں کوئی تغیّر ہوتا تو وہ چند خاندانوں یا افراد تک محدود رہتا
تھا عوام الناس کو نہ اس سے کوئی تعلق ہوتا تھا نہ دلچسپی۔
سوائے اس کے کہ عوام الناس میں سے کچھ افراد نوکری کی وجہ
سے اس لپیٹ میں آجاتے تھے مگر اب جہاں دیکھو حکومت عوام
ہے۔اوّل تو بادشاہتیں مٹ گئی ہیں اگر قائم ہیں تو صرف نام کی۔
درحقیقت عوام کی بے پناہ طاقت اُن کے پردہ میں اپنا کام
کر رہی ہے جیسے انگلستان میں ہے، بلجیم میں ہے، ہالینڈ
میں ہے۔آج یہ بیداری عوام الناس میں ایسے طور پر پیدا
ہو رہی ہے اور یہ حِس کہ بادشاہت عوام کی ہے نہ کہ کسی
شخص یا اشخاص کی ایسا غلبہ پکڑ چکی ہے کہ بادشاہت کا تخت
اب قلعہ میں محدود نہیں رہا ہر شہر ہر قصبہ ہر گاؤں ہر گلی اور
ہر گھر میں خواہ وہ دنیوی وجاہت کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا
ہو یا کتنا ہی چھوٹا ہو آج ایک تختِ شاہی رکھا ہُوا نظر آتا
ہے۔ہر فرد اپنے دل میں بادشاہت کا برابر کا شریک اپنے
آپ کو محسوس کر رہا ہے اس لئے جو تغیّر بھی پیدا ہوتا ہے وُہ
صرف شاہی سینوں اور امراء کے سینوں میں حرکت پیدا نہیں
کرتا بلکہ ملک کے ہر فرد کے قلب کی گہرائیوں میں ایک حرکت
پیدا کر دیتا ہے وہ حرکت جو پہلے زمانہ میں سمندر کی سطح پر پیدا
ہوتی معلوم ہوتی تھی اب سمندر کو اُس کی تہ تک ہلا دیتی ہے۔
اس حد تک کہ اُس کے اندر رہنے والی مچھلیوں کے لئے زندہ
رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ تعلیم عام ہو چکی ہے، صنعت و حرفت
عام ہو رہی ہے، جو علوم اور جو فنون پہلے خاص خاص لوگوں
میں بطور ورثہ چلتے تھے اب دنیا میں الم نشرح ہو چکے ہیں۔
جو کام پہلے جادوگریاں سمجھے جاتے تھے اب گلی گلی میں اُن کے
جاننے والے پائے جاتے ہیں۔ بڑھنے اور ترقی کرنے کی اُمنگ
ہر کس و ناکس میں پیدا ہے اور پیدا کی جا رہی ہے۔

دوسرے: تخویف بھی اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے سیاسی
اور مذہبی اختلافات کو اس طرح بڑھایا جا رہا ہے کہ ہر سمجھدار
انسان کا دل آج دھڑک رہا ہے کہ کل کو کیا ہو جائے گا۔ فرد
فرد سے اور جتھہ جتھے سے اور قوم قوم سے اور ملک ملک سے
خائف ہے اور اُن کے خوف کو روز بروز اُن کے لیڈر بڑھاتے
چلے جا رہے ہیں کیونکہ مقابلہ کی روح اس قدر بڑھ چکی ہے کہ
انصاف اور عدل کا نام و نشان بھی دنیا میں باقی نہیں رہا اِس
وجہ سے کوئی قوم دوسری قوم سے مطمئن نہیں۔ کوئی حکومت
دوسری حکومت سے مطمئن نہیں اور چونکہ اب حکومت عوام الناس
کے ہاتھ میں ہے جنگ کرنا یا صلح کرنا اُنہی کے قبضہ میں ہے اس
لئے اپنی موجودہ حالت کو قائم رکھنے یا اُس کو اور بڑھانے کی خاطر
لیڈر اور حکومتیں عوام الناس کے جذبات کو اشتعال پر اشتعال
دلاتی چلی جاتی ہیں تا اُن کے اندر سکون پیدا ہو جانے کی وجہ سے
دوسری قوم یا دوسری حکومت اُن پر غالب نہ آجائے اس وجہ
سے ایک نہ ختم ہونے والی حرکت قوموں میں پیدا ہو رہی ہے۔

۲۱۱
ساکنینِ ارض میں بیداری اور تغیّر

تیسرے: تغیّر اور تبدیلی بھی حرکت کا موجب ہوتی ہے۔
یہ بھی اس حد تک پیدا ہو چکے ہیں کہ اب کوئی چیز پرانی کہلانے
کی مستحق نہیں (الف) سیاسیات کو لے لو سیاست اب وہ نہیں
رہی جو پہلے تھی۔ سیاست کے اصول ہی بالکل بدل چکے ہیں۔

پہلے سیاست نام تھا صرف ایک بادشاہ کے دوسرے بادشاہ سے تبادلۂ خیال کا۔ مگر اب تو حکومت عوام الناس کے ہاتھ میں ہے اب سیاست کا دائرہ صرف ملک کی حدود کے تصفیہ تک باقی نہیں رہ گیا بلکہ اب سیاست نام ہو گیا ہے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں دخل اندازی کا۔ پہلے زمانہ میں بادشاہوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا کہ غیر ملکوں کے لوگ کس طرح روزی کماتے، کھاتے یا کس طرح پڑھتے اور کیا سیکھتے ہیں یا کس قسم کی اُن کی معیشت ہے یا اُن کے ملکی قانون کیا ہیں اور کیا نہیں لیکن اب سیاست ان چیزوں میں دخل دیتی ہے اور ان چیزوں میں دخل دینا ضروری قرار دیتی ہے۔ ایک طرف تو حریت و آزادی کے ڈھول بجاتے جاتے ہیں دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ ہم غیر ملکوں میں ایسی ہی حکومت قائم ہونے دیں گے جو حکومت ہمارے اصولِ سیاست کے مطابق ہو۔ کبھی کمزور حکومتوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ زبردست حکومتوں کو اپنے ملک کی کانیں سپرد کر دیں۔ کبھی اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ اُن کا بنکنگ سسٹم اس زبردست ملک کے مطابق ہو اور وہ وزیرِ مالیات اُس دوسری حکومت سے مانگ کر لیں۔ کبھی مجبور کیا جاتا ہے کہ اُن کے کالج کھولنے کی اُن کو اجازت دی جائے۔ کبھی خاص خاص پابندیاں تجارت پر اور صنعت اور حرفت پر لگا دی جاتی ہیں کہ کیا کیا چیز وہ بنائیں یا کیا کیا چیز وہ نہ بنائیں۔ غرض پُرانی سیاست تو نئی سیاست کے مقابل پر ایک نادان بچہ معلوم ہوتی ہے۔ عوام کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور پُرانا نظام اُکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔

معاشیات میں تبدیلی (ب) معاشیات میں جو تبدیلی ہوئی ہے اُس کا بھی کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو اشیاء پہلے زمانہ میں تعیش اور اُمراء کا واحد حق سمجھی جاتی تھیں اب عوام کی ملکیت ہو رہی ہیں۔ جو کھانے آج متمدن ممالک کے غرباء کو مل رہے ہیں وہ پُرانے زمانہ کے اُمراء کو بھی میسر نہ تھے۔ متمدن ممالک کا ایک غریب آدمی بھی ہزاروں میل پر بیٹھے ہوئے سنگاپور کی سامن، پُرتگال کی سارڈین، جنوبی فرانس کے آڑو اور ناشپاتیاں، اٹلی اور افغانستان کے انگور، آسٹریا اور جاپان کے مالٹے اور سنگترے، افریقہ کے کیلے اور ہندوستان کے آم اِس بے تکلفی سے کھاتا ہے کہ پُرانے زمانہ کے امیر کو بھی یہ بات نصیب نہ تھی اور کھاتے ہوئے اپنی غربت کی شکایت بھی ساتھ ساتھ کرتا جاتا ہے۔ پُرانے زمانہ کا آدمی مثلاً فراعنۂ مصر کے وقت کا کوئی آدمی اگر زندہ ہو کر آ جائے اور یورپ کے مزدور کو اپنا کھانا کھاتے ہوئے دیکھے تو شاید وہ یہ خیال کرے گا کہ فراعنۂ مصر اب پہلے سے بہت زیادہ امیر ہو گئے ہیں اور شاید آرام و آسائش کے سامان انہیں اب پہلے سے بہت زیادہ میسر آنے لگ گئے ہیں جس قدر لباس پُرانے زمانہ میں میانی طبقہ کے لوگوں اور معمولی امیروں کو میسر نہ تھا آج کل متمدن ممالک کے غرباء کو اُس سے بڑھ کر میسر ہے۔ جو تماشے بڑے بڑے بادشاہ دیکھتے تھے اور لوگ اُن کی عیاشی پر انگشت بدنداں ہوتے تھے آج ایک غریب مزدور چار آنے کے پیسے دے کر انہیں دیکھتا ہے اور اُس سابق بادشاہ کی طرح کبھی کبھی نہیں دیکھتا بلکہ روزانہ دیکھتا ہے۔ اِندر سبھا اگر کوئی تھی تو آج کے سینماؤں کے سامنے وہ بالکل مات نظر آتی ہے۔ پُرانے زمانہ کے ہندوستانی مہاراجگان کے سامنے یا اگر اِندر بھی کوئی مہاراجہ گذرا ہے تو اُس کے سامنے جس لباس میں ملکائیں اور شہزادیاں آتی تھیں اگر اُس ادنیٰ لباس میں آج سینماؤں میں کوئی ایکٹرس آ جائے تو شاید حاضرین پُرانی جُوتیاں مار مار کے اُس کی سکرین کو پھاڑ ڈالیں۔

بیوی میاں کے تعلّقات، والدین اور اولاد کے تعلّقات، اُستاد اور شاگرد کے تعلّقات آج کل پُرانے تعلّقات سے ایسے مختلف ہیں کہ پُرانے زمانہ کا آدمی آج کل پیدا ہو تو شاید پاگل ہی ہو جائے۔ کسی وقت بیوی میاں کی خدمت کرتی تھی آج میاں بیوی کا کوٹ اور چھتری اُٹھائے اُٹھائے اُس کے پیچھے پھرتا نظر آتا ہے۔ کبھی میاں اور بیوی اپنے پیار کی باتوں کو اپنے عزیز ترین وجودوں سے الگ ہو کر بند کمروں میں ادا کیا کرتے تھے آج برسرِ عام میاں بیوی ایک دوسرے کو ڈارلنگ ڈارلنگ کہتے ہوئے نہیں تھکتے۔ سٹیشنوں پر ہزاروں آدمیوں کے

ہجوم میں مرد عورت کو اس طرح بوسہ دیتا نظر آتا ہے جس طرح پُرانے زمانہ میں جسم پر سے خاک جھاڑ لیا کرتے تھے۔

والدین کو اولاد پر آج کوئی حق حاصل نہیں نہ اولاد والدین کا حق تسلیم کرتی ہے۔ والدین کی خدمت ایک فرسودہ خیال سمجھا جاتا ہے۔ اُستاد پہلے آقا ہوتا تھا اب نوکر ہے۔ پہلے علم پڑھانے کو خواہ روپیہ کے بدلہ میں ہو احسان سمجھا جاتا تھا اب اُسے اور خدمتوں کی طرح ایک خدمت قرار دیا جاتا ہے۔ امام مالک صاحب کی خدمت میں خلیفۂ وقت جس کی بادشاہت یورپ سے لے کر ایشیاء کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی درخواست کرتا ہے کہ کچھ وقت میرے لڑکوں کی پڑھائی کے لئے بھی دیں اور وہ یہ منظور کر لیتے ہیں کہ وہ لڑکے بھی اُن کے گھر پر حاضر ہو کر سبق لے لیا کریں۔ ایک دن بادشاہ یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے لڑکے کس قسم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں خود امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے امام مالکؒ اُٹھتے ہیں تو مامون دَوڑ کر اُن کے آگے اُن کی جُوتی رکھ دیتا ہے۔ بادشاہ کو پیارا امین تھا کیونکہ اُس کی ماں اُسے بہت پیاری تھی مگر یہ نظارہ دیکھتے ہی ہارون الرشید نے کہا تخت کا وارث غالباً مامون ہی ہوگا۔ مگر آج کے حالات گذشتہ زمانہ کے بالکل اُلٹ نظر آتے ہیں۔

(ج) مذہبیات۔ مذہب ایسا اوندھے منہ گرا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پہلے زمانہ کے لوگ مذہب میں کمزوری دکھاتے تھے تو دل میں نادم ہوتے تھے اور اپنے اعمال کو لوگوں سے چھپاتے تھے اب جو مذہب کا ادب کرے احمق سمجھا جاتا ہے۔ پہلے مذہب کے خلاف بولنا ایک جُرمِ عظیم خیال کیا جاتا تھا اب مذہب کے حق میں بولنا اپنے احمق ہونے کا اعلان کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ پہلے مذہب انسانوں پر حکومت کیا کرتا تھا اب انسان مذہب پر حکومت کرتا ہے۔ ہر حکومت اپنے اغراض کے مطابق ایک مذہب کو دنیا کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ سوویٹ رشیا کا گرجا سوویٹ اصول کو عین مسیحی تعلیم قرار دیتا ہے۔ امریکہ کا گرجا مسیحیت کو کمیونزم کے اصول کے خلاف بتاتا ہے۔ انگلستان کا گرجا ایک محدود بادشاہی۔ ایک آئینی بادشاہی کو مسیحیت کا صحیح نقشہ بتاتا ہے۔ فرانس کا پادری ری پبلک کو انجیل کی حقیقی تصویر ثابت کرتا ہے۔ فاسسٹ پادری فاسزم کو مذہب کی روح بتاتا ہے۔ ہندوستان میں کانگرس کے زور کے علاقوں میں سارا قرآن باغیانہ تعلیم سے پُر نظر آتا ہے اور انگریزی اثر کے نیچے اُس کی تمام تعلیم مغربی ترقی کی تائید کرتی ہوئی ملتی ہے۔ جاپان میں شنٹوازم شہنشاہیت کی برکات کو پھیلانیوالی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے زمانہ میں کہا جاتا تھا جب مذہب کی آواز میں بھی کوئی اثر تھا، جب مذہب بھی انسانی زندگی کا کوئی جزو سمجھا جاتا تھا کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اب موجودہ فلسفہ بیانگِ بلند کمال دلیری سے علی الاعلان کہتا ہے ہم اُس خدا کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ دنیا کو ایسے خدا کی ضرورت ہے جسے دنیا نے پیدا کیا ہے۔ صفائی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ تمام خرابی اور تمام بربادی اور تمام تباہی جو دنیا پر آئی ہے وہ خدا تو کے اس خیال کی وجہ سے آئی ہے جس کو دنیا کا خالق قرار دیا جاتا ہے دنیا کا آئندہ امن اور دنیا کی آئندہ بہبودی اور دنیا کی آئندہ ترقی اِسی امر پر منحصر ہے کہ جسطرح عوام الناس اپنے لئے بادشاہت مقرر کرتے ہیں مگر اُس کے اختیارات وہ خود تجویز کرتے ہیں اِسی طرح کہا جاتا ہے وہی مذہب دنیا میں امن قائم کر سکتا ہے جو ایسا خدا پیش کرے جس کے خیالات اور جس کے اعمال عوام الناس آپ مقرر کریں۔ اس کے علاوہ علمی ترجمانی مذاہب کی ایسی ہوئی ہے کہ الامان والحفیظ۔ آج کی مسیحیت سو سال پہلے کی مسیحیت نہیں ہے نہ ہندوازم آج سے سو سال پہلے کی ہندوازم ہے اور نہ اسلام آج سے سو سال پہلے کا اسلام ہے۔ پُرانے اصول کو بوسیدہ اور فرسودہ خیالات بتایا جاتا ہے۔ نصوص صریحہ قطعیہ کی تاویل کی جاتی ہے۔ عبادات کو غیر ضروری اور عقائد کو اوہام قرار دیا جاتا ہے اور یہ دہریوں کی طرف سے نہیں ہو رہا خود مذاہب کے پیرو کاروں کی طرف سے ایسا ہو رہا ہے اور اس کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کو

۲۹۱ مذہب کے خلاف رد

مردود اور لامذہب قرار دیا جاتا ہے۔ غرض وہی حال ہے جو حسرتؔ نے کہا ہے کہ ؎

خرد کا نام جنون رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

(د) چوتھا اہم مسئلہ اخلاقیات کا ہے اس میں بھی ایک زلزلہ آگیا ہے۔ اخلاق میں سے بڑے بڑے مسائل صداقت امانت عفت اور انصاف ہیں۔ ان امور کے متعلق بھی اس زمانہ کا نظریہ بالکل بدل گیا ہے۔

اخلاق میں تنزل

صداقت کا جو مفہوم پہلے سمجھا جاتا تھا اب نہیں ڈپلومیسی یعنی سیاست مابین الحکومات میں صداقت کو عیب خیال کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے باحیثیت اور معزز لوگ فخر سے اپنے وہ جھوٹ بیان کرتے ہیں جو اپنے دشمنوں کو دھوکہ دینے کیلئے انہوں نے بولے تھے۔ جنگِ عالمگیر اوّل میں انگریزوں کی طرف سے اعلان ہُوا کہ جرمن لوگ مُردوں کی چربی سے صابن تیار کرتے ہیں۔ خوب اس کا چرچا ہُوا اور تمام غیر جانبدار ملکوں نے بھی اس پر لعنت ملامت کی مگر بعد از جنگ خود اُسی شخص نے جس نے یہ کہانی مشہور کی تھی تسلیم کیا کہ یہ کہانی ایک میس (M E S S) میں جس میں افسر کھانا کھایا کرتے تھے محض پراپیگنڈا کی خاطر میں نے بنا کر مشہور کی تھی۔ یہ بھی شدّت سے پراپیگنڈا کیا گیا کہ جرمن لوگ جہازوں کو غرق کرکے ڈوبنے والے سپاہیوں پر گولیاں چلاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جنگ کے بعد برطانوی بحری جہازوں کے ملازموں کی طرف سے ایک ڈھال جرمنی کے ملاحوں کو بھجوائی گئی جس پر یہ عبارت کندہ تھی کہ اُس ہمدردانہ اور شریفانہ رویہ کی یادگار کے طور پر جو جنگ کے ایام میں ڈوبنے والے سمندریوں کی نسبت آپ نے ظاہر کیا یہ ڈھال آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ اس کے مقابل پر جرمن والوں نے بھی وہ وہ جھوٹ بولے کہ جس کی حد نہیں۔ عالمگیر جنگ اوّل میں تو ریڈیو نہ تھا وہاں کے اخبار مزہ آتے تھے اس لئے اُس کے بارہ میں مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر اس جنگ میں ریڈیو کی وجہ سے مَیں نے خود کئی دفعہ وہاں کی خبریں سُنی ہیں اور جاپان کی بھی۔ اِن خبروں میں اس قدر افترا اور جھوٹ سے کام لیا جاتا تھا کہ تعجب آتا تھا۔ بسا اوقات جرمن ریڈیو پر ہندوستان کے بڑے بڑے فسادات اور شورشوں کا ذکر ہوتا تھا جنکا نام و نشان بھی ہمارے ملک میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اُن خبروں کو سُنکر شبہ ہوتا تھا کہ ہم کسی اور دنیا میں بس رہے ہیں یا جرمن زبان میں ہندوستان کسی اور ملک کا نام ہے۔ میں نے بعض کتب بھی عالمگیر جنگ کے بارہ میں پڑھی ہیں اُن میں سیاسیات کے چوٹی کے افراد نے ایسی بے تکلفی سے اپنے جھوٹوں کا ذکر کیا ہے کہ انہیں پڑھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اِس بے تکلف جھوٹ کے بارہ میں دو میرے اپنے تجربے بھی ہیں۔ میں انگلستان گیا تو مذہبی کانفرنس کے اُس اجلاس میں جس میں خواجہ کمال الدین صاحب کی تقریر پڑھی گئی میں گیا ہی نہیں تھا۔ شیخ یعقوب علی صاحب رپورٹر کے طور پر اُس کے نوٹ لینے کے لئے گئے تھے۔ "ڈیلی نیوز" اخبار جو لبرل پارٹی کا سب سے چوٹی کا اخبار تھا اور کئی لاکھ روزانہ چھپتا تھا اب اُسے ایک دوسرے زبردست اخبار "ڈیلی کرانیکل" میں ملا کر دونوں کو ایک کر دیا گیا ہے اور اس کا نام "نیوز کرانیکل" رکھ دیا گیا ہے اُس کا ایک ایڈیٹر خاص طور پر مجھے ملنے کے لئے آیا تھا پہلے بہت دیر تک چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب سے حالات معلوم کرتا رہا اور پھر مجھے بھی ملا۔ اِس اخبار میں رپورٹ شائع ہوئی کہ خواجہ صاحب کا مضمون بہت دلچسپ تھا اور وہ اس قدر پسند کیا گیا کہ امام جماعت احمدیہ جن کا رنگ سیاہ ہے اگلی صف میں بیٹھے ہوئے بڑے شوق سے اُس کے نوٹ لے رہے تھے۔ عزیزم مکرم چوہدری سر ظفر اللہ خان نے اُس کے ایڈیٹر کو فون کیا کہ یہ تمہارے اخبار میں کیا چھپ گیا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اُنہیں نوٹ لینے کی کیا ضرورت تھی نوٹ لینے والا تو رپورٹر تھا مگر اُس نے چوہدری صاحب کی آواز سُن کر ہی شور مچا دیا اور معذرت کرنی شروع کر دی کہ مجھے خود بڑا افسوس ہے مَیں تو انہیں مل آیا ہوں وہ کیا کہتے ہوں گے۔ نوٹ رپورٹر کی طرف سے تھا اور دوسرے ایڈیٹر نے احتیاط نہیں کی کل اس کی تردید ہو جائیگی۔ آپ

اُن سے بھی میری طرف سے معذرت کر دیں۔ چوہدری صاحب خوش خوش فون سے ہٹے اور مجھے آکر بتایا۔ دوسرے دن کا پرچہ آیا تو اُس میں یُوں تردید چھپی تھی:۔

"افسوس ہے کہ امام جماعت احمدیہ کی نسبت یہ الفاظ لکھے گئے ہیں کہ اُن کا رنگ سیاہ ہے۔ اُن کا رنگ سیاہ نہیں بلکہ ہاتھی دانت کے رنگ کے مشابہ ہے۔"

اسے پڑھ کر ہنسی کے مارے ہمارا بُرا حال ہُوا کہ اُس نے یہ کس امر کی تردید کی ہے۔ چوہدری صاحب نے پھر فون کیا اور کہا کہ جنابِ من! رنگ آپ کالے کی جگہ اس سے بھی زیادہ سیاہ لکھ دیتے اس کی پرواہ نہ تھی بات تو یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ لیکچر کی دلچسپی کی وجہ سے امام جماعت احمدیہ اُس کے نوٹ لے رہے تھے یہ غلط ہونے کے علاوہ ہتک آمیز بات ہے۔ اس کے جواب میں ایڈیٹر نے کہا مجھے بہت افسوس ہُوا مجھے کالے کا لفظ دیکھ کر ایسا صدمہ ہُوا تھا کہ میں نے آپ کی بات کو غور سے سُنا ہی نہیں اور یہی سمجھا کہ آپ بھی اسی امر کی شکایت کرنے لگے ہیں۔ مگر مجھے افسوس ہو کہ ہمارے اخبار کی یہ پالیسی ہے کہ ہم اپنی خبر کی تردید نہیں کیا کرتے۔ ایک دفعہ آپ کا لحاظ کر کے تردید کر دی اب دوسری بار تردید کریں تو اخبار کی سُبکی ہوتی ہے اِس لئے معذوری ہے۔

مارننگ پوسٹ وہاں کے بہت بڑے پرچوں میں سے تھا کنسرویٹو پارٹی سے تعلق تھا۔ سر اڈوائر غالباً اُس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے تھے۔ اُن کے تعلقات چونکہ مجھ سے تھے اِس لئے غالباً اُن کے اشارہ پر یہ اخبار ہمارے معاملات میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ یہ اخبار بھی اب بند ہو کر ڈیلی ٹیلیگراف میں مدغم ہو گیا ہے۔ اِس سے پہلے اس کا نامہ نگار جس دن ہم نے لنڈن پہنچنا تھا سٹیشن پر موجود تھا مگر اتفاقاً گاڑی لیٹ ہو گئی اور کئی گھنٹے دیر سے پہنچنے کی اطلاع سٹیشن پر کی گئی۔ جو لوگ استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے وہ واپس چلے گئے اور اُن کو بتا دیا گیا کہ ریلوے کی خبر ہے کہ گاڑی اتنے گھنٹے لیٹ ہے۔ لیکن اتفاق یہ ہُوا کہ گاڑی دوسرے اندازہ سے کچھ وقت پہلے پہنچ گئی۔ نیّر صاحب نے اخباروں کے نمائندوں کو خبر دینے کی کوشش کی۔ کچھ اخباروں کو خبر دے سکے اور کچھ کے دفاتر سے کنکشن نہ مل سکا۔ مارننگ پوسٹ کو بھی اطلاع نہ ہوئی دوسرے دن سب اخباروں میں ہماری خبر چھپی لیکن مارننگ پوسٹ میں نہ چھپی۔ نیّر صاحب نے اُن سے شکایت کی تو جواب دیا کہ ہمارے پرچہ کا اصول ہے کہ دوسرے پرچے سے خبر نقل نہیں کیا کرتے۔ انہوں نے کہا اب میں بتا رہا ہوں اب خبر چھاپ دیں جواب ملا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ مارننگ پوسٹ میں دوسرے اخباروں کی نسبت خبر ایک دن لیٹ چھپی ہے۔ بات آئی گئی ہوئی جب مذہبی کانفرنس ہوئی اور اُس میں میرے لیکچر کا بھی اعلان ہُوا تو مارننگ پوسٹ نے نہایت شاندار طور پر اعلان کیا کہ "امام جماعت احمدیہ کا لنڈن میں ورود" اور ساتھ فوٹو بھی شائع کیا۔ پڑھنے والوں نے سمجھا ہو گا کہ شاید امام جماعت احمدیہ کہیں چلے گئے ہونگے اور اب پھر لنڈن واپس آئے ہیں۔ بہرحال مہینہ کے بعد ہمیں دوبارہ لنڈن وارد کر دیا گیا محض اس لئے کہ لوگوں پر یہ اثر قائم رہے کہ مارننگ پوسٹ ہمیشہ تازہ واقعات پیش کیا کرتا ہے

یہ حالات ایسے دردناک ہیں کہ حیرت آتی ہے کہ اب صداقت کا مفہوم کیا ہو گیا ہے۔ درحقیقت اس زمانہ میں پراپیگنڈا کو اوّل اور صداقت کو دوسرا نمبر دے دیا گیا ہے جس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔

امانت کا یہ حال ہے کہ جنگِ عالمگیر اول میں کئی حکومتیں دوسری حکومتوں کا وہ سونا جو اُن کے پاس امانت رکھا گیا تھا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کھا گئیں۔ دنیا میں اِس وقت یہ عجیب نظارہ نظر آتا ہے کہ ایک گورنمنٹ جو اپنے آپ کو تہذیب کا علمبردار قرار دیتی ہے جو حُریت اور آزادی کے بلند بانگ دعاوی کرتے ہوئے نہیں تھکتی دوسرے ملک میں جاتی اور صرف چند سال کے لئے کوئی علاقہ یا شہر ٹھیکے پر لیتی ہے مگر رفتہ رفتہ اُس علاقے یا شہر پر مستقل قبضہ جما لیا جاتا ہے اور اُس کو واپس کرنے کا نام تک نہیں لیا جاتا۔ ہندوستان میں برار اس کی مثال ہے سو سال کے ٹھیکے پر حیدر آباد دکن سے برار لیا گیا تھا لیکن سو سال کی بجائے

سوا سو سال گذرنے کو آتے ہیں اور اُس کے واپس کرنے کا نام تک نہیں لیا جاتا۔ نظام نے جب اُس کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اُسے کہا گیا کہ یا تو برار کی واپسی کا دعویٰ کرو اور تخت سے اُتر جاؤ یا تخت پر قائم رہو اور برار کا ذکر چھوڑ دو۔ مرتا کیا نہ کرتا وہ خاموش ہو گیا۔ آخر پچھلی جنگ میں نظام کی عظیم الشان جنگی خدمات کو دیکھتے ہوئے اُن سے کہا گیا کہ ہم برار آپ کو واپس کرتے ہیں اس کے بدلہ میں آپ ہماری طرف یہ لکھ دیں کہ میں برار کو انتظام کی خاطر ہمیشہ کیلئے حکومتِ انگلشیہ کو دیتا ہوں اور ہم مزید یہ رعایت کریں گے کہ عثمانیہ ولی عہد آئندہ شہزادہ برار کہلائے گا۔ کس قدر تمسخر انگیز تجویز ہے۔ حیدر آباد کا شہزادہ حیدر آباد کا شہزادہ کہلاتے تو اُس کی عزت نہیں ہوتی شہزادہ برار کہلاتے تو اُس کی عزت ہوتی ہے لاحول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم۔ اسی طرح اس قسم کے قبضوں کی مثال چین کے مختلف بندرگاہ ہیں۔ مصر بھی ایک مثال ہے۔ عراق۔ شام اور فلسطین بھی اس کی مثال ہیں۔ عراق۔ شام اور فلسطین کے لوگوں نے ترکوں سے بغاوت کی اور اُن سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ ہم اس کے بدلہ میں تم کو آزاد کر دینگے مگر اب اُن کی طرف سے آزادی کا نام لیا جاتا ہے تو انہیں کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ آزاد ہی ہیں ہم تو یہاں آپ کی خدمت کے لئے بیٹھے ہیں ہمارے بیٹھنے کی وجہ سے آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آپ آزاد نہیں ہیں۔ اسی طرح سینکڑوں ملک ہیں جو عارضی طور پر لئے گئے اور پھر اُن پر مستقل طور پر قبضہ کر لیا گیا۔ اب ایران میں بھی ایسا ہی جھگڑا شروع ہو رہا ہے جنگ کے خاتمہ کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر اُسے خالی کرنے کے اعلان کئے گئے تھے مگر اب رُوس وہاں کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے اور وہاں کے لوگوں میں بغاوت پھیلائی جا رہی ہے۔ چنانچہ آئے دن اُن علاقوں میں بغاوت ہو رہی ہے اور روسی اخباروں میں یہ شائع کرایا جا رہا ہے کہ ایران میں بڑا ظلم ہو رہا ہے اور وہاں حریتِ ضمیر کو بُری طرح کچلا جا رہا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد کہا جائے گا کہ کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں بلکہ محض انسانیت کی حفاظت کیلئے روس اپنے اوپر یہ کمر توڑ دینے والا بوجھ اٹھانے لگا ہے کہ ایران کے اس حصہ کو اپنے قبضہ میں کرتا ہے۔ بلغاریہ اور رومانیہ کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔ گویا جو عیب افراد کو ذلیل کر دیا کرتا تھا اب حکومتوں کو اُس پر فخر ہے۔

عفت۔ عفت کا اب کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ زمانہ سابق میں عفت شکن چوری چھپے سب کام کیا کرتا تھا۔ اب علی الاعلان ہوتا ہے۔ مسٹرس کا رکھنا ایک عام بات ہے اور ملک کے چوٹی کے افراد اور بڑے بڑے فلسفی یہ کام کرتے اور علی الاعلان کرتے ہیں۔ ایک بڑے ملک کے عوام الناس کے اختیارات کے علمبردار لیڈر کے پاس دس بارہ سال سے ایک عورت رہتی ہے وہ کہتے ہیں وطن کی خدمت کے جذبات کی وجہ سے میں شادی نہیں کر سکتا مگر اُس عورت کو اپنے پاس رکھنے سے وطن کی خدمت میں کوئی حرج واقعہ نہیں ہوتا۔ ہٹلر کے مرنے کے بعد پتہ لگا ہے کہ اُس کے پاس بھی ایک مسٹرس تھی اور اُس سے دو بچے بھی تھے۔ مرنے سے چند دن پہلے اُس سے اُس نے شادی کی تاکہ بچے اُس کے وارث ہو سکیں۔ اب بھلا اس میں کیا لطف تھا کیوں نہ شادی ہی کر لی۔ مسولینی نے بھی ایک مسٹرس رکھی ہوئی تھی اُس کی بیوی نے اُس کے مرنے پر کہا کہ وہ اچھا آدمی تھا کسی نے اُس کی مسٹرس کا ذکر کیا تو کہا کہ اُس چڑیل نے اُس شریف آدمی کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اُس چڑیل سے جو سلوک لوگوں نے کیا اچھا کیا۔ کنچنی کو عیب سمجھا جاتا ہے لیکن قہوہ خانوں میں شریف گھروں کی عورتوں کا عصمت فروشی کرنا ایک عام رواج ہے اور کوئی اسے بُرا نہیں سمجھتا۔

ایک معروف بادشاہ کو ایک عورت سے محبت تھی۔ اُس کا خاوند موجود تھا وہ اکثر اُن کے پاس آتی جاتی تھی اور لوگ جانتے تھے کہ وہ اُس سے محبت کرتے ہیں خود ایسی دعوتوں میں بھی وہ عورت شریک ہوتی رہی جن میں گرجا کا سب سے بڑا بشپ بھی شامل ہوا لیکن اُس نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جب بادشاہ نے اُسے طلاق دلوا کر اپنے نکاح میں لانا چاہا تو تمام پادریوں نے شور مچا دیا کہ دین کی سخت ہتک ہونے والی ہے۔ یہ وہ

عفّت ہے جسے پہلے زمانہ کے لوگ اور قدیم صداقتوں پر ایمان لانے والے سمجھ ہی نہیں سکتے۔

انصاف کے اب کوئی معنے ہی نہیں رہے دنیا کا ⅘ حصہ لوگوں نے غلام بنا رکھا ہے۔ امریکہ جو آزادی کا علمبردار ہے وہاں کے اصل باشندے ریڈ انڈینز تھے جو اب صرف چند ہزار باقی رہ گئے ہیں۔ آسٹریلیا میں بھی پرانے باشندوں کی آبادی تھی مگر وہ بھی مر مرا کر ختم ہو گئے ہیں صرف چند افراد اُن میں سے باقی ہیں جن کو وہاں ذلیل ترین اور بے وارث بنا دیا گیا ہے افریقہ کے حبشی بھوکے مرتے ہیں لیکن اُن کی زمینیں اور جائدادیں لاکھ لاکھ ایکڑ کی شکل میں انگلستان کے نوابوں کو دے دی گئی ہیں۔ ساؤتھ افریقہ کے سفید باشندے حبشیوں کی جائدادوں پر قبضہ کر کے اُن کے ملک میں دندنا رہے ہیں اور وہاں کی کانوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر نام یہ ہے کہ ہم دنیا کو سویلائزڈ کر رہے ہیں۔ ہم دنیا کو مہذّب بنانے کے لئے اپنے گھروں کی قربانی کر کے آ گئے ہیں۔ اب تو خیر ہندوستان کی حالت بدل رہی ہے۔ آزادی اور حرّیت کا سانس لوگ لینے لگے ہیں اور ملک اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے قربانی کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ مگر پہلے یہ حالت تھی کہ ایک گورا ہندوستانی کو ٹھوکروں سے مار دیتا تھا اور عدالت کہتی تھی کہ اس کی تلی پھٹ گئی ہے اور یہ کوئی نہ پوچھتا کہ اُس غریب ہندوستانی کی تلی پھاڑنے کا حق اُسے کس نے دیا تھا اور وجہ کیا ہے کہ ہندوستانی جب بھی مرتا ہے تلی پھٹنے سے مرتا ہے۔ اس بات پر بھی کوئی غور نہ کرتا کہ آخر یہ کونسا اتفاق ہے کہ گورے صرف اُسی ہندوستانی کو مارتے ہیں جس کی تلی بڑی ہو۔ مگر الحمد للہ کہ اب ہندوستان آزادی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور یہ معاملات گذشتہ قصہ بن گئے ہیں۔

تجارتی ترقی کے لئے زبردست اقوام دوسری اقوام کی تجارت کو دباتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں ایکسچینج کے دھوکے سے کہیں اس بنا پر کہ تمہارا فائدہ ہی اسی میں ہے کہ صنعت و حرفت نہ کرو اور زراعت کرو، کبھی اپنے ملکی جہاز بنانے کی اجازت نہ دیکر، کبھی ناجائز مدد اپنے ہم قوموں کو دے کر، کبھی تجارتی حصے بنا کر، غرض ہر رنگ میں انصاف کو کچلا جا رہا ہے۔

علوم میں تغیر

(۵) علوم تو اب ایسے بدلے ہیں کہ پرانے علوم کا کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ فلسفہ کی شکل سو فیصدی بدل چکی ہے۔ سائنس ۹۰ فیصدی تبدیل ہو چکی ہے۔ پہلے تاریخ کی بنیاد روایات پر ہُوا کرتی تھی اب روایات کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اب تاریخ کی بنیاد یا اخبارات ہیں یا ڈائریاں یا خطوط ہیں اور پرانی تاریخ کے لئے آثار قدیمہ اور انتھرا لوجی اور جیالوجی اور علم طبقات الارض کی تلاش کی جاتی ہے۔

علم ہیئت قریباً بالکل بدل چکا ہے۔ سورج اب سیدھا چلنے لگا ہے۔ زمین گھومنے لگ گئی ہے۔ نظامِ شمسی کی جگہ نظام ہائے شمسی نے لے لی اور نظام ہائے شمسی کی جگہ نظام ہائے شمسی نے لے لی ہے۔ دنیا کا پھیلاؤ پہلے کروڑوں میل بتایا جاتا تھا اب دنیا چھتیس[۳۶] ہزار روشنی کے سالوں کے پھیلاؤ تک جا پہنچی ہے۔ چھتیس ہزار روشنی کے سالوں کے معنے یہ ہیں کہ ۳۶ ہزار × ۳۶۰ × ۲۴ × ۶۰ × ۶۰ × ایک لاکھ چھیاسی ہزار اگر انسان صبح سے شام تک بھی ان اعداد کو گننے لگے اور ضرب در ضرب شمار کرتا چلا جائے تو شام تک بھی ان اعداد کو ختم نہیں کر سکتا۔

طب نے بھی حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ جن باتوں کا پہلے وہم و گمان بھی نہ تھا اب روزہ مرّہ کا شغل بن گئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے زمانہ میں بھی اپریشن ہوتے تھے مگر شاذ و نادر کے طور پر کبھی بقراط کا نام اپریشن کے سلسلہ میں آ جاتا اور کبھی کسی اَور سرجن کا۔ مگر اب ہر ملک اور ہر شہر میں وہ سرجن پائے جاتے ہیں جو پیٹ کو پھاڑتے اور پھر اُسے سی دیتے ہیں۔ گُردوں کا اپریشن کرتے ہیں ناک کان آنکھ حلق اور دوسرے اعضاء کے نقائص کا اپریشن کے ذریعہ علاج کرتے ہیں بلکہ اس جنگ میں تو اس حد تک حیرت انگیز ترقی کر لی گئی ہے کہ اس جنگ کے دوران میں دل کے اپریشن بھی کئے گئے ہیں دل کو کھرچا گیا ہے اور پھر اُسے کھرچ کر اُس کے اصل مقام پر رکھ دیا گیا ہے۔

ایسے آلات نکل آئے ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ مریض جن کے دل حرکت نہیں کر سکتے یا سخت کمزوری سے کرتے ہیں اُن کی زندگی کے بھی سامان پیدا ہو گئے ہیں چنانچہ اُن کو اُن آلات میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی جو دوسری صورت میں گھنٹہ دو گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا اِس طرح بعض دفعہ مہینوں اور سالوں اُن آلات میں پڑا رہتا ہے اُس کا دل حرکت کرتا رہتا ہے اور قانونِ قدرت کو موقع دیا جاتا ہے کہ وُہ اس دَوران میں بیماری کو دُور کر کے اُسے اچھا کر دے۔ غرض پُرانی کتب مذہب کے سوا اب داستان امیر حمزہ بن کر رہ گئی ہیں اور دنیا روز بروز کہیں سے کہیں چلی جا رہی ہے۔

(۶) اقتصادیات کی حالت بھی بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے دنیا کی تمام تجارت بارٹر سسٹم پر چلتی تھی۔ لوگ ایک جگہ سے مال لیتے اور دوسری جگہ پہنچا دیتے وہاں سے اُس کے بدلہ میں کوئی ایسی چیز لے لیتے جس کی انہیں ضرورت ہوتی تھی۔ پھر وہاں کا مال اُٹھا کر تیسرے ملک میں لے جاتے اور اُس ملک کی کوئی ایسی چیز اُس مال کے تبادلہ میں لے لیتے جس کی اُنہیں احتیاج ہوا کرتی تھی اس طرح جنس کے بدلہ میں جنس دی جاتی اور اپنی اور دوسروں کی ضرورتیں پوری کی جاتیں۔ اِس ذریعہ سے ملک غریب نہیں ہوتے تھے کیونکہ جتنا مال کسی ملک سے لیا جاتا تھا اُتنا مال ہی اُس کو دوسری شکل میں دے دیا جاتا تھا۔ مگر اب بارٹر سسٹم بالکل ختم ہو گیا ہے بنکنگ کا زور ہے اور بنکنگ منڈی سے ہی ساری تجارت چلتی ہے اِس کی وجہ سے غریب اور کمزور ممالک بالکل لوٹے جا رہے ہیں۔ پھر افراد کی تجارت اب قریباً ختم ہو گئی اب زیادہ تر کمپنیاں بنتی اور تجارتی کاروبار میں حصہ لیتی ہیں۔ چنانچہ غور کر کے دیکھ لو بڑی بڑی تجارتیں سب کمپنیوں کے ہاتھ میں ہیں جن کو پہلے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ کمپنیوں سے اُوپر ٹرسٹ بن گئے ہیں جو آپس میں معاہدہ کر کے ملک کی تجارت کو اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔ مثلاً دس پندرہ بڑی بڑی کمپنیاں آپس میں مل جاتی ہیں اور وہ معاہدہ کر لیتی ہیں کہ ہم جو کچھ فروخت کریں گی ایک مقررہ قیمت پر کریں گی ایک دوسرے کا تجارتی رنگ میں

سورۂ زلزال میں بیان شدہ پیشگوئی کے واقعہ ہونے کا زمانہ

مقابلہ نہیں کریں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اُسی قیمت پر چیز خریدیں خواہ وہ کس قدر ہی مہنگی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ جس کے پاس بھی جاتے ہیں اُنہیں ایک ہی قیمت بتائی جاتی ہے۔ یہ تو ملک کے بڑے بڑے تاجروں کا آپس میں سمجھوتہ ہوتا ہے جو ٹرسٹ سسٹم کہلاتا ہے اِس کی مزید ترقی کر کے اب کارٹلز بن گئے ہیں یعنی مختلف ممالک کے بڑے بڑے تاجر یا مختلف ممالک کی بڑی بڑی کمپنیاں آپس میں کسی تجارت کے متعلق سمجھوتہ کر لیتی ہیں اور وہ فیصلہ کرتی ہیں کہ فلاں فلاں چیز اس نرخ کے علاوہ اَور کسی نرخ پر فروخت نہیں کی جائے گی۔ اس کے نتیجہ میں وہ تمام ممالک کی تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور جو قیمت چاہتے ہیں لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ یہی کارٹلز ہیں جو جنگوں کا باعث ہیں کیونکہ بعض ممالک کی ساری کی ساری اجناس کارٹل سسٹم کے ماتحت تاجر خرید لیتے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے ممالک کی تجارت تباہ ہو جاتی ہے اور وہ لڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ زلزلہ ہے جو اِس وقت دنیا پر آ رہا ہے اور جس کا ہزارواں حصہ زلزلہ بھی اس سے پہلے کسی ایک وقت میں دنیا پر نہیں آیا۔ اب یہ زلزلہ جو ایک طرف مادی زمین پر آ رہا ہے اور دوسری طرف اہلِ زمین پر آ رہا ہے قیامت کے مشابہ نہیں تو اَور کس کے مشابہ ہے؟ اللہ تعالیٰ اِسی زلزلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اُس دن جب دنیا کفر میں ڈوب جائے گی اور دین بے کس ہو جائے گا خدا تعالیٰ پھر اُس بیّنہ کے ذریعہ سے جو رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ ہے (یعنی اُس کے مثیل کے ذریعہ سے) دنیا کو کفر سے نجات دے گا۔ اِذَا ظرف جملۂ محذوف ہے اور اِس کا عامل ہے وَيَكُوْنُ هٰذَا ثَانِيًا اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا۔ یعنی ایک دفعہ تو اہلِ کتاب اور مشرکین کو ہم اپنے رسول کے ذریعہ جو صحف مطہرہ لے کر آیا ہے کفر سے نجات دے چکے ہیں اور ہم کہہ چکے ہیں کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝

اور زمین اپنے بوجھ نکال (کر پھینک) دے گی ۳۵

وَرَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ۔ مگر مقدر یُوں ہے کہ ہمارا یہ رسول ایک دفعہ پھر اُس زمانہ میں لوگوں کو کفر سے نجات دے گا جب دنیا میں گمراہی اور تباہی اور خرابی پیدا ہو جائے گی اور زمین اور اہل زمین دونوں پر زلزلۂ عظیمہ آجائے گا۔

پہلے مفسرین نے اِذَا کا عامل تُحَدِّثُ کو بتایا ہے اور یَوْمَئِذٍ کو اِذَا کا بدل بتایا ہے اور مطلب یہ لیا ہے کہ زمین اپنی خبریں اُس وقت بتائے گی جب زمین پر زلزلہ آئے گا۔ مگر میرے نزدیک تُحَدِّثُ عامل ہے یَوْمَئِذٍ کا اور یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی تُحَدِّثُ سے ایک نیا مضمون شروع کیا گیا ہے کہ اُس دن یہ بھی ہوگا کہ زمین اپنی اخبار بتائے گی۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا پہلے مضمون کے تسلسل میں ہی بیان کیا گیا ہے یعنی ایسا ہی واقعہ ایک دفعہ پھر ہونے والا ہے۔

۳۵ حل لغات۔ اَثْقَالَ ثِقْلٌ کی جمع ہے اور ثِقْلٌ کے معنے بوجھ کے بھی ہوتے ہیں اور قیمتی شئے کے بھی۔ ثِقْلٌ کے ایک معنے مَتَاعُ الْمُسَافِرِ وَحَشَمُهٗ کے ہیں یعنی مسافر کا سامان اور اُس کے خادم وغیرہ جب سفر پر جاتے ہوئے کسی کے ساتھ سامان یا خادم وغیرہ ہوں تو عربی زبان میں اُن کو اَثْقَال کہا جاتا ہے۔ اسی طرح لکھا ہے کُلُّ شَیْءٍ نَفِیْسٍ مَصُوْنٌ ہر اعلیٰ درجہ کی چیز جس کی حفاظت کی جائے اُس کو عربی زبان میں ثِقْل کہتے ہیں مِنْهُ اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ الْقُرْاٰنُ وَعِتْرَتِیْ۔ اسی کے مطابق حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَیں تم میں اپنے ثقلین چھوڑ رہا ہوں۔ اور وہ ثقلین کیا ہیں اَلْقُرْاٰنُ وَعِتْرَتِیْ ایک اُن میں سے قرآن ہے اور ایک میری عترت۔ پھر لکھا ہے اَصْلُ الثِّقْلِ مَا یَکُوْنُ مَعَ الْاِنْسَانِ مِمَّا یُثْقِلُهٗ۔ اصل میں جو چیز انسان پر بوجھ ڈالنے والی ہو اُسے ثقل کہتے ہیں اور اَلْاَثْقَالُ کے معنے ہیں کُنُوْزُ الْاَرْضِ زمین کے خزانے۔ اَلْاَحْمَالُ الثَّقِیْلَةُ۔ بھاری بوجھ۔ مَوْتَاهَا۔ مدفون اشیاء۔ مُردے (اقرب) غرض ثقل کے معنے ہوئے (۱) بوجھ (۲) وہ قیمتی شئے جس کی حفاظت کی جائے (۳) زمین کا خزانہ۔

تفسیر۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے ثقل کے معنے بوجھ کے بھی ہیں اور قیمتی شئے کے بھی جس کی حفاظت کی جائے۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ

اوّل۔ زمین اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دے گی یعنی بادشاہتوں اور حکومت امراء کو جو غرباء پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال رہے تھے نکال باہر کرے گی۔ سب سے بڑا بوجھ دنیا میں ناواجب اور ظالمانہ حکومت کا ہی ہوتا ہے اس سے بڑا بوجھ دنیا میں اور کوئی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کئے ہیں کہ یہ بوجھ اس طرح اُتار کر پھینکا گیا ہے کہ اس کا ہزارواں حصہ بھی پہلی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ دنیا کے تمام ممالک بادشاہتوں کو توڑ رہے ہیں یا اُن کو ناکارہ بنا رہے ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی پہلے زمانہ میں کوئی مثال ہی نہیں ملتی۔ پہلے زمانہ میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا جہاں بادشاہت نہ ہو سوائے چھوٹے چھوٹے قبائل کے کہ اُن کے مالک بادشاہ نہیں کہلاتے تھے بلکہ رئیس کہلاتے تھے۔ مگر اب دُنیا کے اکثر حصوں سے بادشاہتوں کو کلیۃً اُڑا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر ہم سرسری طور پر دنیا کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دیکھ جائیں تو یہ حقیقت ہم پر پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے مثلاً امریکہ کو لے لو۔ نارتھ امریکہ میں کینیڈا پر فرانس کا بادشاہ حکومت کر رہا تھا اور ساؤتھ امریکہ میں کچھ علاقوں پر پرتگال کا بادشاہ حکومت کر رہا تھا اور کچھ علاقوں پر سپین کا بادشاہ حکومت کرتا تھا مگر اب ان تمام مقامات سے بادشاہتیں اُڑ گئی ہیں۔

زمین کے اثقال اپھینکے کے پانچ معنے

اَثْقَال

اس کے بعد یورپ میں آئیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ انگلستان کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ ناروے کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ سویڈن کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ ڈنمارک کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ ہالینڈ کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ بلجیم کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ لیکن فرانس کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ سپین کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ پرتگیزوں کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ جرمنی کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ اٹلی کا بادشاہ تھا اور اب بھی ہے (اس درس کے چھپنے سے پہلے وہ بھی نہیں رہا) ہنگری کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ روس کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ یونان کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ یوگوسلاویہ کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ رومانیہ کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ بلغاریہ کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ زیکوسلویکیا پہلے جرمنوں کے ماتحت تھا اب اتحادیوں کے قبضہ میں آیا ہے مگر وہاں بادشاہت نہیں۔ اس کے بعد ہم ایشیا کی طرف آتے ہیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ ٹرکی کا بادشاہ تھا اب نہیں۔ ایران کا بادشاہ تھا اب بھی ہے۔ عراق میں بھی بادشاہت ہے شام اور فلسطین اور لبنان یہ علاقے بادشاہوں کے ماتحت تھے مگر اب اُن کے قبضہ سے نکل گئے ہیں۔ افغانستان میں نام کی بادشاہت باقی ہے۔ یہی حال ہندوستان کا ہے کہ اس کی بادشاہت بھی برائے نام ہے۔ چین کا بادشاہ ہوا کرتا تھا اب اُڑ گیا ہے۔ کوریا کا بادشاہ تھا مگر اب اُڑ گیا ہے۔ جاپان کا بادشاہ ہے مگر اب اتحادی اُس کو اڑانے کی فکر میں ہیں۔ گویا دنیا میں تین چوتھائی بادشاہتیں اُڑ چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ برائے نام ہیں جیسے انگلستان کا بادشاہ تو ہے مگر نام کا اُس کے اختیارات کچھ نہیں۔ پس فرماتا ہے زمین اُس دن اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دے گی۔ یعنی بادشاہتوں اور حکومتِ اُمراء کو نکال باہر کرے گی اور اس طرح اُس ناقابل برداشت بار کا خاتمہ ہو جائے گا جو غرباء پر پڑ رہا تھا۔

(۲) دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ مولویوں پادریوں اور پنڈتوں کے دباؤ سے لوگ آزاد ہو جائیں گے۔ مولویوں کا دباؤ بے شک حکومتی دباؤ کی طرح زیادہ سخت نہیں تھا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولویوں کے فتووں کی لوگوں کے دلوں میں عزت ہوتی تھی اور وہ بسا اوقات اُن کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے مگر اب مولویوں کا دباؤ بالکل اٹھ چکا ہے۔ یہی حال پنڈتوں کا ہے پنڈت جس جس رنگ میں کفارے دلواتے اور لوگوں کو گنگا اشنان کراتے تھے وہ اب جاتا رہا ہے۔ اسی طرح پادریوں کا دباؤ اب خاک میں مل چکا ہے۔ درحقیقت حقیقی دباؤ پادریوں کا ہی تھا مولویوں اور پنڈتوں کو اُس قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہوا جس قسم کا اقتدار پادریوں کو حاصل ہو چکا ہے۔ اُن کو ہر جگہ حکومت حاصل تھی، وہ لوگوں کو سزا دینے کا اختیار رکھتے تھے یہاں تک کہ لوگوں کو قید یا اُن کو قتل کر دینے کا اختیار بھی اُن کو حاصل تھا اور انہوں نے عوام پر وہ حکومت کی ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ مگر آج یہ سب چیزیں اُڑائی جا رہی ہیں۔

(۳) تیسرے معنے اَثْقَالَ کے ظاہری زمین کے لحاظ سے یہ بنیں گے کہ زمین میں سے قسم قسم کی کانیں نکل آئیں گی۔ چنانچہ دیکھ لو آج کروڑوں کروڑ ٹن مٹی کا تیل جس کا پہلے زمانہ میں خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا زمین میں سے نکل رہا ہے اور ہر شہر ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ تمام دنیا میں چکر لگا کر دیکھ لو ہر جگہ لیمپ مٹی کے تیل سے ہی جگمگاتے نظر آئیں گے سوائے اُن مقامات کے جہاں بجلی کی روشنی مہیا کی جاتی ہے۔ پہلے زمانہ میں عام طور پر سرسوں کا تیل دئے میں ڈال کر روشنی حاصل کی جاتی تھی مگر اب کہیں بھی سرسوں کا تیل استعمال نہیں ہوتا سب جگہ مٹی کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کارخانے وغیرہ مٹی کے تیل سے چلتے ہیں۔ پٹرول جس سے موٹریں چلتی ہیں وہ بھی زمین میں سے ہی نکلتا ہے۔ پھر پتھر کا کوئلہ جس سے انجن۔ ریلیں اور مشینیں وغیرہ چلتی ہیں یہ بھی زمین میں دبا پڑا تھا اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اُسے نکالا اور بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام آنے لگا۔ اسی طرح اور کئی قسم کی دھاتیں مثلاً یورینیم۔ پلاٹینم اور ریڈیم وغیرہ زمین میں چھپی پڑی تھیں اور لوگوں کو ان کا کچھ علم نہیں تھا آج

بہت سے کام اُن کے ذریعہ سے چل رہے ہیں اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ زمین نے آج اپنے بوجھ باہر نکال کر پھینک دئے ہیں۔

(۴) آثارِ قدیمہ جو زمین میں چھپے پڑے تھے وہ بھی اثقال تھے اور امانت کا رنگ رکھتے تھے جسے زمین نے اپنے پیٹ میں دبایا ہُوا تھا مگر آج یہ اثقال بھی باہر نکل رہے ہیں۔ بڑے بڑے شہر جو آج سے کئی کئی ہزار سال پہلے کے ہیں زمین میں سے نکل رہے ہیں کوئی شہر زمین میں نوّے فٹ نیچے مدفون تھا کوئی اسّی فٹ نیچے تھا اور لوگوں کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ زمین جس پر وہ چل پھر رہے ہیں اُس کے نیچے کتنے بڑے بڑے شہر چھپے ہوئے ہیں۔ آج محکمۂ آثارِ قدیمہ زمین کو کھود کر ان تمام شہروں کو باہر نکال رہا ہے اور کئی قسم کی پُرانی تہذیبوں کا لوگوں کو علم حاصل ہو رہا ہے۔ اِن شہروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے مثلاً دس ہزار سال پہلے برتن کیسے تھے۔ کس قسم کے کپڑے لوگ پہنا کرتے تھے۔ اُن کے مکانوں کی کیا شکلیں ہُوا کرتی تھیں سڑکوں کا کیسا انتظام تھا۔ اُن کی سواریاں کس کس قسم کی ہوتی تھیں اُنکی گاڑیاں کیسی تھیں۔ اُن کے چھپر کھٹ کیسے تھے۔ اُن کے سامان کیسے تھے۔ یہ ساری چیزیں زمین میں سے نکال کر آج دنیا کے سامنے لائی جارہی ہیں بلکہ اَور تو اَور مُردے بھی باہر نکالے جارہے ہیں اور عجائب گھروں میں لوگ اُن کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ غرض زمین کے نیچے جو چیزیں دبی ہوئی تھیں زمین نے اُن کا بوجھ محسوس کیا اور اُس نے ان تمام چیزوں کو باہر نکال کر کہہ دیا کہ لو میاں

عطائے تو بہ لقائے تو

(۵) اگر ارض سے اہلِ ارض مراد لئے جائیں تو اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کے یہ معنے ہوں گے کہ عیاشی، آزادی اور لامذہبی وغیرہ کے وہ خیالات جن کو پہلے زمانہ میں لوگ اپنے سینوں میں دبا کر رکھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر ہم نے ان خیالات کو ظاہر کیا تو گدّی سے ہماری زبان کھینچ لی جائے گی۔ علی الاعلان ظاہر کریں گے۔ اُن کے متعلق کتابیں لکھیں گے اور لوگوں سے بحثیں کرینگے کہ صحیح خیالات یہی ہیں تمہیں بھی اپنے سابق خیالات میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے۔

تھوڑے ہی دن ہوئے سوویٹ روس کے متعلق میں نے ایک عجیب بات پڑھی جس طرح عیسائی تثلیث کا عقیدہ رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ توحیدِ کامل عیسائیت نے ہی پیش کی ہے اِسی طرح سوویٹ روس نے بھی طریق تو کچھ اور اختیار کیا ہُوا ہے لیکن اپنے کام کا نام کچھ اَور رکھا ہُوا ہے۔ اُس کے ایک اخبار نے لکھا کہ لوگ ہمارے متعلق اعتراض کرتے ہیں کہ رُوس میں شادی کا دستور کم ہے گو حکومت کسی کو شادی کرنے سے روکتی نہیں اور اس لحاظ سے یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ اس کی ذمہ واری حکومت پر عائد ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو جتنی بدکاری شادی سے پھیلتی ہے اتنی مسٹرس رکھنے سے نہیں پھیلتی۔ اس نظریہ کو دیکھکر حیرت آتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مسٹرس رکھنا بدکاری نہیں تو وہ بدکاری کا مفہوم کیا سمجھتے ہیں یہی حال دوسرے ممالک کا ہے کہ علی الاعلان عیاشی، آزادی اور لامذہبی وغیرہ کے خیالات لوگوں میں پھیلاتے جاتے ہیں اور وہ باتیں جو پہلے سینوں میں چھپا کر رکھی جاتی تھیں اب علم نشرح ہونے لگ گئی ہیں۔

(۶) چھٹے معنے یہ ہیں کہ اُس زمانہ میں سائنس کی ایجادات کثرت سے ہوں گی اور زمین اپنے چھپے ہوئے راز نکال کر رکھ دے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ علامت بھی اس زمانہ میں نمایاں طور پر پوری ہوئی ہے چنانچہ ہر سال حیرت انگیز طور پر کئی قسم کی ایجادات ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ بڑی سرعت سے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ درحقیقت سائنس نام ہے زمین کے اثرات کے کیمیاوی نتائج کا۔ اور یہ کیمیاوی نتائج وہ اَثْقَال ہیں جو زمین میں مخفی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں سائنس کی بکثرت ایجادات کے ذریعہ اُن اَثْقَال کو نکالکر رکھ دیا ہے اور کوئی سال ایسا نہیں گذرتا جس میں قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت ظاہر نہ ہوتی ہو کہ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ

اور انسان کہہ اُٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے ۵۴ اُس دن وہ اپنی (ساری ہی پوشیدہ) خبریں بیان کر دیگی ۵۵

۵۴ تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے زمین اپنے اَثْقَال کو نکال باہر کرے گی یہاں تک کہ ان سب چیزوں کو دیکھکر انسان حیرت سے کہہ اُٹھے گا کہ مَا لَهَا۔ اِسے کیا ہوگیا ہے اس دنیا میں کیا کچھ رازہائے پوشیدہ تھے جو ظاہر ہو رہے ہیں اور کیا کیا چیزیں مخفی تھیں جن کو زمین اُگل رہی ہے۔

دوسرے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ اَلْاِنْسَانُ سے ہر انسان مراد نہ ہو بلکہ کامل انسان مراد ہو۔ اس صورت میں آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ کامل انسان دنیا کی عُریانی اور لامذہبیت کی حالت دیکھ کر کہے گا کہ اِس دنیا کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ سے اِس قدر دُور چلی گئی ہے۔

۵۵ تفسیر۔ یہ نیا مضمون بھی ہو سکتا ہے اور اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کی تشریح بھی ہو سکتا ہے۔ نئے مضمون کے لحاظ سے میرے نزدیک اِس کے یہ معنے ہیں کہ پیدائش زمین کے بارہ میں اس سے پہلے دنیا کو ایک مجمل اور ناقص علم حاصل ہوگا مگر فرماتا ہے اُس زمانہ میں علم سائنس جیالوجی کی شکل میں اِس قدر ترقی کر جائے گا کہ زمین کی بناوٹ اور شعاعوں اور لہروں وغیرہ کے ذریعہ سے زمین کی پیدائش کے مسئلہ پر بہت کچھ روشنی پڑنے لگے گی گویا اَخْبَارَهَا سے مراد یہ ہے کہ زمین اپنی حقیقت اور کیفیت پیدائش کے بارہ میں بہت کچھ باتیں بتانے لگ جائے گی۔ یہ اس لئے فرمایا کہ علم جیالوجی کا بڑا مدار خود مٹی کی ماہیت اور اُس کے رنگوں اور اُس کی تہوں پر ہے۔ یہ نہیں کہ کسی اور ذریعہ سے وہ اِن معلومات کو حاصل کرتے ہیں بلکہ علم جیالوجی کے ماہر یونہی مٹی کا رنگ دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اِس اِس قسم کے تغیرات زمین پر گذرے ہیں اُسکی تہوں سے اندازہ لگا کر بتا دیتے ہیں کہ اِس تہہ پر یہ شکل ہے اور اُس تہہ پر یہ شکل ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فلاں تغیر واقعہ ہُوا اور پھر فلاں تغیر پیدا ہُوا۔ اِسی طرح مٹیوں کے رنگوں اور اُن کی بُوؤں سے اب کانوں وغیرہ کے پتہ لگنے کا علم نکل آیا ہے۔ اس علم کے ماہر انجینئر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے جاتے ہیں اور پتھروں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتے یا زمین کو سونگھتے ہیں اور بتاتے جاتے ہیں کہ یہاں فلاں قسم کی کانیں دفن ہیں۔ اسی طرح بجلی کی رَو کے ذریعہ سے کانوں کی اقسام اور اُن کی گہرائیوں کا پتہ لیا جاتا ہے۔ یہ پتہ لگایا جاتا ہے کہ زمین میں کس چیز کی کان ہے۔ لوہے کی ہے یا پیتل کی ہے۔ اور پھر یہ پتہ لگایا جاتا ہے کہ وُہ سو گز نیچے ہے یا دو سو گز نیچے ہے یا چار سو گز نیچے ہے۔ غرض اس ذریعہ سے زمین اپنی خبریں بتا رہی ہے۔ وہ زمین جو پہلے گونگی تھی اب کلام کرنے لگ گئی ہے۔ عام لوگ گذرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ زمین خاموش ہے وہ کچھ کہہ نہیں رہی۔ لیکن ایک انجنیئر گذرتا ہے تو وہ سنتا ہے کہ زمین اُسے یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ میرے نیچے مٹی کا تیل ہے اور وہ یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ وہ اتنے گز نیچے ہے یا یہ بتا رہی ہوتی ہے میرے نیچے سونے کی کان ہے اور یہ بھی بتا رہی ہوتی ہے کہ وہ سونے کی کان اتنی دُور ہے یا یہ بتا رہی ہوتی ہے کہ میرے نیچے پتھر کا کوئلہ ہے اور یہ بھی بتا رہی ہوتی ہے کہ وہ پتھر کا کوئلہ اِتنی دُور ہے۔ اِسی طرح بتا رہی ہوتی ہے کہ میرے نیچے یورینیم یا پلاٹینم یا فلاں دھات ہے اور یہ بھی بتا رہی ہوتی ہے کہ یہ دھاتیں اتنی گہرائیوں پر ہیں۔

اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کے نیچے جو یہ معنے بتائے گئے تھے کہ لوگ اپنے گندے خیالات بیان کرنے لگ جائیں گے۔ اُن کے لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے بھی ہوں گے کہ نہ صرف لوگوں کے دبے ہوئے خیالات اُس زمانہ میں ظاہر ہونے لگ جائیں گے بلکہ اہلِ زمین اپنے اُن عیوب کو الم نشرح کرنے میں لذت محسوس کریں گے یا دوسروں کے عیوب شائع کرنے میں

نہیں خاص لطف محسوس ہوگا اور وہ انتہائی دلچسپی کے ساتھ اس کام میں حصہ لیں گے چنانچہ تمام یورپ۔ امریکہ بلکہ ایشیائی ممالک میں بھی آج کل ایسے اخبارات نکلتے ہیں جنکو سوسائٹی کا سپ کہا جاتا ہے۔ یہ اخبار اس کثرت سے دنیا میں شائع ہونے لگ گئے ہیں اور اس طرح مزے لے لے کر اُن کو پڑھا جاتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔ ان اخبارات کو چلانے والے بھی لاکھوں روپیہ اس بات پر خرچ کر دیتے ہیں کہ انہیں کسی بڑے شخص کے راز معلوم ہو جائیں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اور پھر جب وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اُن رازوں کو اخبارات کے ذریعہ شائع کیا جاتا ہے اور دنیا میں اُن کی خوب تشہیر کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لوگ خود اپنے شہوانی جذبات کی نسبت بالتفصیل کتب لکھنے لگ گئے ہیں صرف قانون کی زد سے بچنے کے لئے اُن کتابوں پر یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ کتابیں صرف ڈاکٹروں اور فلاسفروں کے لئے لکھی گئی ہیں عام لوگوں کے لئے نہیں۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ ان کتابوں کی اشاعت محض علمی اغراض کے ماتحت کی جارہی ہے کوئی نفسانی خواہش ان کتب کی اشاعت کی محرک نہیں ہو اس قسم کی بعض کتابیں میں نے بھی پڑھی ہیں۔ مثلاً امریکہ کے بارہ ڈاکٹروں نے آپس میں قسمیں کھا کر عہد کیا کہ علم شہوت چونکہ ایک مخفی علم ہے اور لوگوں کو اس کی تمام تفاصیل کا صحیح طور پر علم نہ ہونے کی وجہ سے کئی قسم کے دھوکے لگ جاتے ہیں اس لئے ہم اس قسم کی تمام باتوں کو بغیر کسی حجاب کے ظاہر کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے بارہ[؎] کتابیں لکھی ہیں جن میں اپنے جذبات کو انہوں نے ننگے الفاظ میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب ہم میاں بیوی آپس میں ملتے ہیں تو ہمارے یوں جذبات ہوتے ہیں، ہم اس طرح حرکات کرتے ہیں اور اس اس رنگ میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن بارہ کتابوں میں سے ایک کتاب میں نے بھی پڑھی ہے۔

ایک حدیث بھی ان معنوں کی تصدیق کرتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ حدیث اسی زمانہ کے بارہ میں ہے۔ احمد ترمذی اور نسائی نے روایت کی ہے (گو الفاظ روایت احمد کے ہیں) کہ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا اَخْبَارُهَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ اَخْبَارَهَا اَنْ تَشْهَدَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ وَّاَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلٰى ظَهْرِهَا اَنْ تَقُوْلَ عَمِلَ كَذَا وَكَذَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا فَهٰذِهٖ اَخْبَارُهَا۔ یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی کہ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ پھر آپ نے فرمایا اَتَدْرُوْنَ مَا اَخْبَارُهَا۔ اے میرے صحابہؓ! کیا تم جانتے ہو کہ اُس کی اخبار کیا ہیں؟ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ انہوں نے کہا اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں قَالَ فَاِنَّ اَخْبَارَهَا اَنْ تَشْهَدَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ وَّاَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلٰى ظَهْرِهَا۔ اُس کی خبریں یہ ہیں کہ وہ ہر انسان یعنی ہر مرد اور عورت کے متعلق یہ بیان کرے گی کہ اُس نے کیا کیا ہے۔ اَنْ تَقُوْلَ عَمِلَ كَذَا وَكَذَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا۔ وہ یہ کہے گی کہ اُس نے فلاں دن یہ کام کیا ہے اور فلاں دن یہ کام کیا۔ چونکہ اس آنے والے دن کے بارہ میں محدثین کو علم نہ تھا انہوں نے اِسے قیامت پر لگایا ہے حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ حدیث اسی زمانہ کے متعلق ہے۔ اسی زمانہ میں اس قسم کے اخبارات شائع ہو رہے ہیں جن میں لوگوں کے تمام عیوب بیان کئے جاتے ہیں اور لوگ اُن اخبارات کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ لنڈن کا ایک اخبار تھا جس کی نسبت میں نے سُنا ہے کہ ایک لاکھ چھپتا ہے اور صبح صبح چوری چھپے ہر شخص خواہ وہ اعلیٰ حیثیت کا مالک ہو یا ادنیٰ حیثیت کا اُسے مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ اُس اخبار میں یہی لکھا ہوتا تھا کہ فلاں کی بیوی نے یہ کیا اور فلاں کی بیٹی نے یہ کیا۔ حتّٰی کہ بعض جگہ شاہی خاندان کے متعلق بھی اشارے ہوتے تھے کہ آج صبح فلاں کو ایک بند گاڑی میں فلاں مکان کے دروازہ کے پاس

۲۰۱ زمین کے اپنے اخبار بیان کرنے سے مراد

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؕ

اِس لئے کہ تیرے رب نے اس (زمین) کے حق میں وحی کر چھوڑی ہے [۵۶]

دیکھا گیا ہم حیران ہیں کہ وہ وہاں کیوں گئے ؟ اور کیوں اُنکی گاڑی اُس دروازہ پر کھڑی دیکھی گئی ؟ میں سمجھتا ہوں حدیث میں اِسی طرف اشارہ ہے مفسّرین نے اِسے غلطی سے قیامت پر چسپاں کر دیا ہے حالانکہ قیامت کے ذکر میں قرآن کریم میں یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا کہ اُس روز زمین بھی کلام کرے گی۔ یہ تو آتا ہے کہ ہاتھ بولیں گے یا پاؤں بولیں گے اور وہ انسان کے خلاف شہادت دیں گے مگر یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اُس روز زمین بھی بولے گی۔ لیکن مسیح موعودؑ کے زمانہ کے متعلق بالوضاحت احادیث میں ذکر آتا ہے کہ اُس وقت زمین کلام کرے گی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ مسیح موعودؑ کے زمانہ میں وہ پتھر جس کے پیچھے کافر چھپا ہوا ہوگا بول اُٹھے گا اور کہے گا اے نبی اللہ یہ کافر چھپا ہوا ہے۔ غرض زمین کے بولنے کا حدیثوں میں جہاں بھی ذکر آتا ہے مسیح موعودؑ کے زمانہ کے متعلق ہے اور قرآن کریم میں جہاں قیامت کے دن شہادت دینے کا ذکر آتا ہے وہاں ہاتھوں اور پاؤں کے بولنے کا تو ذکر آتا ہے مگر زمین کا نہیں۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت موجودہ زمانہ کے متعلق ہے اور اس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہی خبر دی گئی ہے کہ لوگ اپنے گند اخباروں میں ظاہر کریں گے۔ کتابوں اور ڈائریوں میں اُن کو شائع کریں گے اور خوش ہوں گے کہ انہوں نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے گویا جن امور کو لوگ پہلے چھپایا کرتے تھے اُن کو مزے لے لے کر بیان کریں گے اور شرم اور حیا کا مفہوم اُس زمانہ میں بالکل بدل جائے گا۔ چنانچہ یہ اخبار ہر بڑے مرد اور عورت کے پیچھے آدمی لگاتے ہیں اور اُن کے مخفی حالات اخباروں میں چھاپتے اور اُن کی بکری سے لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ بعض ادنیٰ اخبار بلیک میلنگ سے روپے کماتے ہیں۔ اِسی طرح عورتیں۔ شریف کہلانے والی عورتیں بڑے بڑے معزز اور بارسوخ خاندانوں کی عورتیں ڈائریاں لکھتی ہیں جن میں نہایت بے حیائی سے اپنی کرتوتیں بیان کرتی ہیں اور پھر وہ ڈائریاں ہزاروں کی تعداد میں چھپتی اور لوگوں کے مطالعہ میں آتی ہیں۔ غرض ایک اندھیر ہے جو مچ رہا ہے اور ایک زلزلۂ عظیمہ ہے جو دنیا پر آیا ہوا ہے۔ گذشتہ تاریخ پر غور کر کے دیکھ لو اِس کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملے گی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں یہ زلزلۂ عظیمہ آیا اور جس میں اللہ تعالےٰ کی یہ پیشگوئی بڑی شان سے پوری ہوئی کہ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ؕ

(حاشیہ: اَوْحٰى [۵۶])

[۵۶] حل لغات

اَوْحٰى اِلَيْهِ اِيْحَاءً کے معنے ہوتے ہیں بَعَثَهٗ۔ اُس کو کسی مقصد کے لئے کھڑا کیا اور اَوْحٰى بِكَذَا کے معنے ہیں اَلْهَمَهٗ بِهٖ کسی کے دل میں کوئی بات ڈالی۔ اور وَحٰى بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ وَحٰى اِلَيْهِ (يَحِيْ وَحْيًا) کے معنے ہیں اَشَارَ اُس نے اشارہ کیا۔ اَرْسَلَ اِلَيْهِ رَسُوْلًا اُس کی طرف پیغامبر بھیجا۔ اور وَحَى اللّٰهُ فِيْ قَلْبِهٖ کے معنے بھی اَلْهَمَهٗ کے ہیں یعنی اللہ تعالےٰ نے اُس کے دل میں فلاں بات ڈالی۔ اور اَوْحٰى اِلٰى فُلَانٍ اَلْكَلَامَ کے معنے ہیں كَلَّمَهٗ خَفِيًّا اُس کے ساتھ دوسروں سے علیحدہ ہو کر مخفی رنگ میں بات کی۔ وَفِي الْاَسَاسِ وَحَيْتُ اِلَيْهِ وَاَوْحَيْتُ اِذَا كَلَّمْتَهٗ بِمَا تُخْفِيْهِ عَنْ غَيْرِهٖ۔ زمخشری کی کتاب اساس میں لکھا ہے کہ وَحَيْتُ اِلَيْهِ یا اَوْحَيْتُ اِلَيْهِ اُس وقت بولتے ہیں جب تم کسی سے کوئی ایسی بات کرو جو تم دوسروں سے چھپانا چاہتے ہو۔ وَفِي الْمِصْبَاحِ وَبَعْضُ الْعَرَبِ يَقُوْلُ وَحَيْتُ اِلَيْهِ وَوَحَيْتُ لَهٗ وَاَوْحَيْتُ اِلَيْهِ وَاَوْحَيْتُ لَهٗ۔ اور مصباح میں لکھا ہے کہ بعض عرب صرف وَحَيْتُ اِلَيْهِ اور اَوْحَيْتُ اِلَيْهِ ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ وَحَيْتُ لَهٗ اور اَوْحَيْتُ لَهٗ بھی استعمال کرتے

ہیں (اقرب الموارد) مجمع البحار میں لکھا ہے وَیَقَعُ الْوَحْیُ عَلَی الْکِتَابَۃِ کہ وحی کا لفظ کتابت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے یعنی اگر ہم وحی کا لفظ بولیں تو اُس کے صرف یہی معنے نہیں ہوں گے کہ کوئی بات کی بلکہ یہ بھی معنے ہوں گے کہ کوئی بات لکھ دی۔ وَالْاِشَارَۃِ اور اگر اشارہ سے بات کی جائے تو اس کے لئے بھی وحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ وَالرِّسَالَۃِ اِسی طرح کسی کی معرفت اگر کوئی پیغام بھیجا جائے تو اُسے بھی وحی کہہ دیتے ہیں وَالْاِلْھَامِ الہام کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے وَالْکَلَامِ الْخَفِیِّ اور وحی کا لفظ کلام خفی پر بھی دلالت کرتا ہے لیکن مجمع البحار والے اس کے ساتھ یہ تصریح کرتے ہیں کہ اِس کا صلہ ہمیشہ اِلٰی آتا ہے اُن کے نزدیک عربی زبان میں اس لفظ کو یونہی استعمال کریں گے کہ وَحَیْتُ اِلَیْہِ الْکَلَامَ وَاَوْحَیْتُ۔ پھر لکھتے ہیں وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی وَحْیُ اِعْلَامٍ لَا اِلْھَامٍ لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ۔ اور یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی یہ وحیٔ اعلام ہے نہ کہ وحیٔ الہام۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ ہم اُسے تیری طرف لوٹائیں گے یعنی لفظی وحی تھی دل کا خیال نہ تھا (علماء سابق اصطلاح میں دل کے خیال کو الہام کہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ وحی اور الہام میں فرق کرتے تھے حالانکہ یہ فرق اُن کا خیالی تھا شریعت سے اس کی سند نہیں ملتی بہرحال جب پُرانے علماء کی کتب میں الہام کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے اکثر دل میں خیال ڈالے جانے کے ہوتے ہیں) وَاَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ: اَمَرْتُھُمْ۔ یعنی قرآن کریم جو آتا ہے کہ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی اس کے معنے یہ ہیں کہ میں نے اُن کو حکم دیا۔ پھر لکھتے ہیں یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (النحل ۷۰) تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی اس کے معنے یہ ہیں اَلْھَمَھَا اس کو الہام کیا اُن کی طبیعت میں یہ خواہش پیدا کر دی۔ فَاَوْحٰی اِلَیْھِمْ۔ اَوْمٰی۔ اور یہ جو قرآن کریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ اَوْحٰی اِلَیْھِمْ زکریا نے اپنے ساتھیوں کی طرف وحی کی اس کے معنے ہیں اَوْمٰی انہوں نے اشارہ کیا۔ وَقِیْلَ کَتَبَ بِیَدِہٖ فِی الْاَرْضِ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ وحی کا لفظ بمعنی کتابت استعمال ہوا ہے اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ انہوں نے لکھ کر اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ اِن حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے معنے (۱) کسی کام پر مبعوث کرنا (۲) دل میں بات ڈالنا (۳) اشارے سے بات سمجھانا (۴) کسی پیغامبر کی معرفت پیغام بھیجنا (۵) لکھنا (۶) دوسروں سے چھپا کر بات کرنا اور (۷) حکم دینا کے ہیں۔

قرآن مجید میں لفظ وحی کا صلہ

تفسیر۔ قرآن کریم میں وحی کا لفظ اس مقام کے سوا پینسٹھ[۶۵] دفعہ استعمال ہوا ہے اور سب جگہ اِلٰی کا صلہ آیا ہے پانچ مقامات اور ہیں جہاں یا تو یہ لفظ مجہولاً استعمال ہوا ہے یا حذفِ صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ حذفِ صلہ سے میری مراد یہ ہے کہ وہاں مُوْحٰی اِلَیْہِ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان مقامات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال اِن سب استعمالات کی موجودگی میں جبکہ قرآن کریم میں پینسٹھ دفعہ یہ لفظ اِلٰی کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور اس امر کو دیکھ کر کہ احادیث میں بھی جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اِلٰی کے ساتھ استعمال ہوا ہے لام کا صلہ استعمال نہیں کیا گیا یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس جگہ بھی لَھَا سے یہ مراد نہیں کہ کہ زمین کی طرف وحی کی بلکہ لام کے معنے فِیْ کے ہیں یعنی زمین کے حق میں وحی کی اور جس کی طرف وحی ہوئی اُس کے ذکر کو چھوڑ دیا گیا ہے اگر زمین کی طرف وحی کرنا مراد ہوتا تو محاورۂ قرآن و محاورۂ حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اِس جگہ اَوْحٰی اِلَیْھَا آتا اَوْحٰی لَھَا نہ آتا۔ یہ بات ہر شخص جو قرآن کریم کو پڑھنے والا ہے جانتا ہے کہ قرآن کریم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اس لئے گو یہاں مُوْحٰی اِلَیْہِ محذوف ہے اور یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ وحی کس کو ہوئی۔ لیکن اس بات کا سمجھنا مشکل نہیں کہ اس جگہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ہی ذکر کیا جا رہا ہے اور

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا کے معنے یہ ہیں کہ اَوْحَى اللّٰهُ اِلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهَا۔ یعنی ان عظیم الشان تغیرات پر تمہیں کوئی استعجاب نہیں ہونا چاہیئے یہ سب تغیرات اس لئے ہوں گے کہ اس کے ان تغیرات کے متعلق پہلے سے قرآن کریم میں پیشگوئی موجود ہوگی گویا یہ آیت زمانہ بعد نزول کے لوگوں کو مدنظر رکھ کر ہے۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا اللہ تعالیٰ اس بارہ میں پہلے سے خبر دے چکا ہے اور اُس نے کہہ دیا ہے کہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ پس چونکہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ یہ خبر دے چکا ہے کہ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا۔ اہل زمین اپنے گند ظاہر کر دیں گے اس لئے اب یہ اٹل فیصلہ ہے اور خدائی تقدیر کا ہاتھ اس کو بہرحال پورا کرکے رہیگا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کی اپنی وحی کے ذریعہ خبر دے اور اُسے کسی مامور کی سچائی کی علامت قرار دے دے تو پھر وہ کبھی ٹلا نہیں کرتی۔ بہت سے خلافِ فطرت جرائم ایسے ہوتے ہیں کہ جب انسان اُن کی شناعت پر غور کرتا ہے تو اُس کا دل اُسے ملامت کرتا اور وہ ان کے ارتکاب سے رُک جاتا ہے مگر فرماتا ہے ان افعال سے زمانہ کبھی نہیں رُکے گا کیونکہ ہمارے علمِ غیب نے اس زمانہ کے لوگوں کے انجامِ عمل کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اگر اس کے خلاف انہوں نے کرنا ہوتا تو ہم وہ بات بتا دیتے مگر آئندہ زمانہ کی نسلیں ہمیں ان اعمال پر تُلی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ پس بےشک ان حالات کی خبریں سُن سُن کر تمہیں یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہوگی اور تم حیران ہوگے کہ ایسا کس طرح ہوگا یہ تو فطرت کے خلاف باتیں ہیں اور جب لوگ ان کا ارتکاب کرنے لگیں گے تو اُن کی فطرت خود بخود مقابلہ کرے گی اور اُنہیں سختی سے اس گناہ کے سیلاب میں بہنے سے روک لے گی۔ مگر یہ درست نہیں وہ کبھی نہیں رُکیں گے کیونکہ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا یہ خبر قرآن کریم میں آ چکی ہے اور قرآن عالم الغیب ہستی کی کتاب ہے وہ وہی کچھ آئندہ زمانہ کے متعلق لکھتا ہے جو ہونا ہوتا ہے۔ اگر لوگوں نے ان حالات سے پھر جانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا میں اَوْحٰى کا صلہ بیان نہ کرنے کی حکمت

سے یہ امر بھی مخفی نہ رہتا اور وہ اس کا حال بھی بیان کر دیتا۔

اَوْحٰى کا صلہ ہمیشہ اِلٰی استعمال ہوتا ہے مگر اس جگہ اَوْحٰى کے بعد لام استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ مفسرین نے اس کا یہ جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ بعض قبائل عرب میں اِلٰی کی بجائے لام بھی بطور صلہ استعمال ہوتا ہے جیسے وَحَيْتُ اِلَيْهِ اور اَوْحَيْتُ اِلَيْهِ کی بجائے بعض عرب وَحَيْتُ لَهٗ اور اَوْحَيْتُ لَهٗ بھی استعمال کر لیتے ہیں مگر ہم اس توجیہ کو درست تسلیم نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم میں پینسٹھ جگہ وحی کا لفظ آیا ہے اور ہر جگہ اِلٰی کا صلہ ہی استعمال ہوا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہاں اِلٰی کی بجائے لام کے صلہ کا جواز نکالا جائے۔ بعض اور مفسرین نے اس جواب کی غلطی کو محسوس کیا ہے اور انہوں نے اس کے معنے یہ کئے ہیں کہ اَوْحٰى اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ لَهَا یعنی جس کی طرف وحی کی گئی ہے اُس کے ذکر کو محذوف تسلیم کیا ہے۔ یہ توجیہ درست ہے لیکن میرے نزدیک یہاں اَوْحٰى اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ مراد نہیں بلکہ اَوْحٰى اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مراد ہے اور معنے یہ ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ یہ خبریں دے رکھی ہیں اس لئے اب ایسا ضرور ہو کر رہے گا یہ بات رُک نہیں سکتی۔ ہم نے اپنی وحی میں یہ خبر دے دی ہے کہ اُس زمانہ میں جب مسیح موعود آئے گا اور جو ہمارے رسول کی دوسری بعثت کا زمانہ ہوگا یہ علامات رُونما ہوں گی پس بےشک اَور باتیں ٹل سکتی ہیں مگر یہ علامت کبھی ٹل نہیں سکتی کیونکہ جس چیز کو کسی مامور کی شناخت کے متعلق بطور علامت قرار دیدیا جائے وہ کبھی ٹلا نہیں کرتی۔ اس اصول کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنی کتب میں بیان فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ بےشک انذاری خبریں ٹل جایا کرتی ہیں مگر وہ انذاری خبریں جو اللہ تعالیٰ کے کسی مامور کی علامت کے طور پر بیان ہوئی ہوں کبھی نہیں ٹلتیں بلکہ وہ اُسی طرح پوری ہوتی ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے غیب کے امور پورے ہوتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس آیت کے ایک اور معنے بھی فرمایا کرتے تھے جو میں نے خود آپ کی زبان سے سُنے ہیں آپ فرماتے تھے بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا سے مراد یہ ہے کہ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى اِلٰى اِمَامِ الزَّمَانِ یعنی جس کی طرف وحی کی گئی ہے اس سے مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور امام الزمان بھی جس کی طرف اس وقت کہ ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا وقت قریب ہوگا دوبارہ وحی کی جائیگی۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں مختلف قسم کے زلازل کے ظہور کے متعلق جو خبریں آپ کو دی گئی تھیں اُن کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ چونکہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ زلازل پہلے کیوں نہیں آئینگے اُس وقت کیوں آئیں گے جب مسیح موعود کی بعثت ہوگی؟ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ زلازل اُس وقت اس لئے آئیں گے کہ یہ اُس کی سچائی کی علامت قرار دیے گئے ہیں چنانچہ جب مسیح موعود آئے گا اور اس علامت کے ظہور کا زمانہ قریب آجائے گا اللہ تعالےٰ پھر اپنا الہام نازل کرکے مسیح موعود کو خبر دے گا کہ لو وہ زمانہ اب آگیا جس کی ہم قرآن کریم میں خبر دے چکے تھے۔ اس طرح تکرار الہام نہ صرف زمانہ زلازل کے قرب پر دلالت کرے گا بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہوگا کہ یہی وہ مامور ہے جس کی سچائی ثابت کرنے کے لئے زلازل کا ظہور ہو رہا ہے۔ پس اس وحی کے بعد دنیا میں زلازل کا سلسلہ اس لئے شروع ہوگا تاکہ یہ زلازل امام زمان کی سچائی کا ثبوت قرار پائیں اور دنیا غور کرے کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کا مامور نہیں تو آخر وجہ کیا ہے کہ جب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ بڑے بڑے زلازل سے دنیا کا نقشہ پلٹنے والا ہے اُس نے ان تاریک دنوں کی خبریں دیں اور پھر وہ حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ غرض مُوْحٰى اِلَيْهِ دونوں ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم وحیٔ اول کے لحاظ سے اور مسیح موعودؑ وحیٔ ثانی کے لحاظ سے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کی پہلی وحی چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور درحقیقت آپکی صداقت کے اظہار کے لئے ہی قیامت تک تمام نشانات کا ظہور ہوگا اور جو شخص بھی لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا ہوگا وہ بہرحال آپ کا غلام ہوگا اس لئے اول مصداق اس آیت کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس زلزلۂ عظیمہ کے اظہار کو رد کر رکھا جب تک کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر دوبارہ الہام نازل نہ ہوتا تا وہ بات پوری ہو جو لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ میں بیان کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے مثیل کے ذریعہ ایک اور زمانہ میں بھی ظاہر ہوں گے اور دوبارہ لوگوں کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نجات دیں گے اس لئے اس آیت کے دوسرے مصداق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہوا تھا کہ یہ زلزلہ اُس وقت تک نہیں آئیگا جب تک دوبارہ اُس شخص پر وحی نازل نہ ہو جائے جو مثیل ہوگا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اور جس کی سچائی کے لئے اسے علامت قرار دیا گیا ہے۔ پس مُوْحٰى اِلَيْهِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی۔ اور بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا میں ان دونوں وحیوں کی طرف اشارہ ہے وحیٔ اول کی طرف اس لئے کہ وہ ہادی ہے اور وحیٔ ثانی کی طرف اس لئے کہ وہ مثال کے رنگ میں وہی جلوہ دوبارہ ظاہر کرنیوالی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظاہر ہوا۔

آیت بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا کی تشریح مسیح موعود کی زبان سے

وحی کیا شئے ہے اس بارہ میں لغت کے حوالہ جات تو اُوپر لکھے جاچکے ہیں اب میں اس کی حقیقت شرعی کے متعلق کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس بارہ میں بہترین اجمالی حوالہ پُرانے علماء کے خیالات کے متعلق ایک لُغت ہی کی کتاب سے ملتا ہے اور وہ لغات قرآن کی کتاب مفردات راغب ہے اس میں لکھا ہے اَصْلُ الْوَحْيِ: اَلْاِشَارَةُ السَّرِيْعَةُ وحی کے اصل معنے اشارہ کے ہوتے ہیں مگر ایسا اشارہ جو جلدی سے کیا جائے۔

وحی کی تشریح علمائے سلف کے نزدیک

اشارے دو طرح ہوتے ہیں ایک تو آہستگی اور آرام سے کیا جاتا ہے مگر ایک ایسی جلدی سی کیا جاتا ہے کہ وہ شخص تو سمجھ جاتا ہے جس کو ہم نے اشارہ کیا ہوتا ہے مگر دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ پس مفردات والے کہتے ہیں کہ وحی کے حقیقی معنے اَلْاِشَارَۃُ السَّرِیْعَۃُ کے ہیں۔ اشارۃ سریعہ میں درحقیقت اخفاء شامل ہوتا ہے چنانچہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بات کرتے وقت جلدی سی آنکھ مار جاتے ہیں یا انگلی سے اشارہ کر دیتے ہیں یا سر کو کسی خاص طریق پر حرکت دے دیتے ہیں جس سے اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے مقصد کا اظہار اُس شخص پر کر دیں جسے بات بتانا چاہتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو ہمارے اشارہ کا علم نہ ہو گویا محض اشارہ اور اشارۃ سریعہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اشارے سے تو صرف اتنی غرض ہوتی ہے کہ دوسرے شخص کو کوئی بات سمجھا دی جائے خواہ اُس کا کسی اور کو علم ہو یا نہ ہو مگر اشارۃ سریعہ سے یہ غرض ہوتی ہے کہ اشارہ بھی ہو جائے اور مخاطب کے سوا دوسروں کو اس کا علم بھی نہ ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی حقیقۃ الوحی اور بعض دوسری کتب میں جہاں وحی کی تشریح فرمائی ہے وہاں اپنے تجربہ کی بنیاد پر لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہایت سُرعت کے ساتھ نازل ہوتا ہے۔ یہی حقیقت قرآن کریم نے بھی بیان کی ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں آتا ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامۃ ع۱) چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحیٔ الٰہی سُرعت کے ساتھ نازل ہوتی تھی اِس لئے آپ جلدی جلدی اُس کو دُہراتے جاتے تھے تاکہ الفاظ پر قابو پا سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دیتا ہے کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تیرا الہام شرعی ہے اور شرعی الہام بھولا نہیں کرتا کیونکہ اگر وہ بھولے تو وحیٔ متلو ادھوری رہ جائے۔ اس آیت کے بے شک اور بھی معنے ہیں مگر ایک ظاہری معنے یہ بھی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی وحی چونکہ سُرعت کے ساتھ نازل ہوتی تھی اس لئے آپ بھی جلدی جلدی اُس کلام کو اپنی زبان سے دُہرانے لگتے۔ پس قرآن کریم بھی اس حقیقت کو درست تسلیم کرتا ہے کہ وحی الٰہی جلدی جلدی نازل ہوتی ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنے تجربہ کی بنیاد پر یہی تحریر فرمایا ہے کہ وحی الٰہی میں بہت بڑی شان اور عظمت اور سرعت پائی جاتی ہے۔ لُغوی معنے بھی وحی کے اشارۃ السریعہ کے ہیں جو اُس کیفیت پر روشنی ڈالتے ہیں جو نزولِ وحی کے وقت ہوتی ہے۔ پھر کہتے ہیں وَذَالِكَ يَكُوْنُ بِالْكَلَامِ عَلٰى سَبِيْلِ الرَّمْزِ وَالتَّعْرِيْضِ کبھی یہ اشارہ کلام کے ذریعہ ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی تعریض یا رمز پائی جاتی ہے کھلا اور واضح کلام نہیں ہوتا وَقَدْ يَكُوْنُ بِصَوْتٍ مُجَرَّدٍ عَنِ التَّرْكِيْبِ اور کبھی صرف آواز اُس میں پائی جاتی ہے اور الفاظ نہیں ہوتے وَبِاِشَارَةِ بَعْضِ الْجَوَارِحِ اور کبھی بعض جوارح کے اشاروں سے کام لیا جاتا ہے جیسے بعض لوگ آنکھ سے اشارہ کرتے ہیں بعض انگلی سے اشارہ کرتے ہیں بعض سر کو ہلا کر اشارہ کر دیتے ہیں وَبِالْكِتَابَةِ اور کبھی کتابت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ مفردات والے یہاں وحیٔ الٰہی کا ذکر نہیں کر رہے بلکہ وحی کے صرف لغوی معنے بیان کر رہے ہیں کہ وہ کیا کیا ہیں۔ پھر لکھتے ہیں وَقَدْ حُمِلَ عَلٰى ذَالِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى عَنْ زَكَرِيَّا۔ اِنہی معنوں پر قرآن کریم کی اِس آیت کو محمول کیا گیا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق آتی ہے کہ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا یعنی قرآن کریم میں جو یہ آتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے گئے اور اُن کی طرف وحی کی کہ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا تم صبح اور شام خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہو تاکہ مجھ سے خدا تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے وہ جلد پورا ہو۔ چونکہ اُس وقت حضرت زکریا کو خاموش رہنے کا حکم تھا اس لئے حضرت زکریا کی باتوں کا جو ذکر قرآن کریم میں آتا ہے اس کے متعلق علماء میں اختلاف ہے چنانچہ قَدْ قِيْلَ رَمَزَ بعض لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ انہوں نے اشارہ سے

اپنی قوم کو سمجھایا کہ تم صبح و شام خدا تعالےٰ کی تسبیح کرو تاکہ اُس کا فضل نازل ہو۔ وَقِيْلَ اِعْتِبَارٌ اور بعض نے اس کے معنے اعتبار کے کئے ہیں۔ اعتبار کے معنے لغت میں کسی کے قول یا فعل سے استنباط کرنے اور عقلی طور پر ایک نتیجہ اخذ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے معنے یہ ہونگے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی عملی حالت اور اُن کے خشوع و خضوع اور تضرع اور زاری اور توجہ الی اللہ کو دیکھ کر قوم نے خود بخود یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہمیں یہی حکم دے رہے ہیں کہ ہم بھی اللہ تعالےٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہو جائیں وَقِيْلَ كَتَبَ اور بعض لوگوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ انہوں نے لکھ کر اپنی قوم کو یہ نصیحت کی۔ جیسے مجمع البحار کے حوالہ میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ چونکہ انہوں نے نذر مانی ہوئی تھی کہ میں نے لوگوں سے بولنا نہیں اس لئے انہوں نے اپنے ہاتھ سے زمین پر یہ الفاظ لکھ دئے کہ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا۔ وَعَلٰى هٰذِهِ الْوُجُوْهِ قَوْلُهٗ اور انہی وجوہ کے مطابق اللہ تعالےٰ کا یہ قول ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے کوئی نہ کوئی دشمن مقرر کیا ہے چنانچہ انسانوں اور جنوں میں سے جو شیطان ہیں اُن میں سے بعض بعض کی طرف ملمع سازی اور دھوکا و فریب کی باتیں وحی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہاں يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کہا تو یہ معنے ہیں کہ وہ رمز کرتے ہیں یا یہ معنے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو لکھتے ہیں اور یا پھر یہ معنے ہیں کہ وہ مختلف ذرائع سے اپنے مقصد و مدعا کو اُن تک پہنچا دیتے ہیں وَقَوْلُهٗ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيٰٓئِهِمْ فَذٰلِكَ بِالْوَسْوَاسِ الْمُشَارِ اِلَيْهِ بِقَوْلِهٖ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ وَبِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاِنَّ لِلشَّيْطٰنِ لَمَّةً الشَّرِّ اور یہ جو قرآن کریم میں آیت آتی ہے کہ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ شیطان اپنے اولیاء کی طرف وحی کرتے ہیں اِس سے مراد یہ ہے کہ وہ وسوسے ڈال کر اُن کے دلوں کو خراب کرتے ہیں اِسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ یعنی خنّاس کے وساوس کے شر سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ اور خنّاس وہی ہوتا ہے جو مختلف قسم کے وساوس و شبہات کے ذریعہ خدا اور اُس کے رسول کے خلاف دل میں باتیں پیدا کرے۔ وَبِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاِنَّ لِلشَّيْطٰنِ لَمَّةَ الشَّرِّ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اِس قول میں شیطانی وساوس سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے کہ اِنَّ لِلشَّيْطٰنِ لَمَّةَ الشَّرِّ شیطانی تحریکوں سے تمہیں ہر وقت اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ وہ نقصان کا موجب ہوتی ہیں۔ وَيُقَالُ لِلْكَلِمَةِ الْاِلٰهِيَّةِ الَّتِيْ تُلْقٰى اِلٰى اَنْبِيَآئِهٖ وَاَوْلِيَآئِهٖ وَحْيٌ اور وہ کلمہ الٰہیہ جو اللہ تعالےٰ کے انبیاء اور اولیاء کی طرف نازل کیا جاتا ہے اُسے بھی وحی کہتے ہیں۔ اِن الفاظ میں مفردات والوں نے ایک بہت بڑے مسئلہ کا حل کر دیا ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے ٹھوکر کا موجب بنا ہوا ہے۔ میں نے دیکھا ہے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ہماری جماعت کی طرف سے یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ پر وحی نازل فرمائی تو مسلمان شور مچا دیتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی الٰہی کہاں نازل ہو سکتی ہے حالانکہ مفردات والے لکھتے ہیں وَيُقَالُ لِلْكَلِمَةِ الْاِلٰهِيَّةِ الَّتِيْ تُلْقٰى اِلٰى اَنْبِيَآئِهٖ وَاَوْلِيَآئِهٖ وَحْيٌ۔ اللہ تعالےٰ کے انبیاء اور اُس کے اولیاء کی طرف جو کلام نازل ہوتا ہے اُسے وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہم تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبی تسلیم کرتے اور آپ کی نبوت و رسالت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم آپ کے الہامات کو وحی قرار دیں لیکن مفردات والوں نے تو اللہ تعالےٰ کے اُس کلام کو بھی جو ولی پر نازل ہوتا ہے وحی قرار دیا ہے اور درحقیقت یہی بات صحیح اور درست ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام بھی نازل ہو خواہ وہ نبی پر نازل ہو یا ولی پر بہرحال وحی ہوتا ہے۔اب تو اس قسم کی بحثیں کم ہوگئی ہیں لیکن جب میں بچہ تھا اُس وقت مخالفین کی طرف سے بڑے بڑے اشتہارات اس مضمون کے شائع ہُوا کرتے تھے کہ مرزا صاحب نعوذ باللہ کافر اور بے دین ہیں کیونکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔لوگوں میں اُس وقت مخالفت کا ایک عجیب طوفان بپا تھا اور وحی کے لفظ کے استعمال پر مخالفین کی طرف سے بڑے بڑے فتوے دیئے جاتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کافر اور بے دین قرار دیا جاتا تھا۔مگر امام راغب اِس جگہ کھلے الفاظ میں لکھتے ہیں کہ جو کلام اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور اُس کے ولیوں پر نازل ہوتا ہے اُس کلام کو بغیر کسی فرق اور امتیاز کے وحی کہا جاتا ہے۔پھر فرماتے ہیں وَ ذَالِكَ اَضْرُبٌ اور یہ کلام کئی اقسام کا ہوتا ہے حَسْبَ مَا دَلَّ عَلَيْهِ قَوْلُهٗ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (شوریٰ ع ۵) اسی کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا۔یعنی کسی بندے کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس سے کلام کرے سوائے اِن تین صورتوں کے کہ یا اُس پر وحی نازل کرتا ہے یا اُس سے مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کلام کرتا ہے یا اُس کی طرف رسول بھیجتا ہے فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اور وہ فرشتہ رسول اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُس انسان کی طرف وہ وحی نازل کرتا ہے جس کا نازل کرنا اللہ تعالیٰ کے منشاء میں داخل ہوتا ہے یا جس حد تک اللہ تعالیٰ کوئی کلام اُتارنا چاہتا ہے اُس حد تک اپنے رسول کے ذریعہ اُتار دیتا ہے اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بلند شان والا اور بڑی حکمت والا ہے۔امام راغب لکھتے ہیں وَ ذَالِكَ اِمَّا بِرَسُوْلٍ مُّشَاهَدٍ۔اِس وحی کے وقت یا تو ایسا رسول سامنے آتا ہے کہ تُرٰی ذَاتُهٗ اُس کی ذات نظر آتی ہے وَيُسْمَعُ كَلَامُهٗ اور وہ جو کچھ بات کرتا ہے وہ سُنی جاتی ہے كَتَبْلِيْغِ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِلنَّبِيِّ فِيْ صُوْرَةٍ مُّعَيَّنَةٍ۔جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر جبریل ایک خاص شکل میں ظاہر ہو کر خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کرتا تھا۔

حدیثوں میں آتا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تو اُس وقت غار حرا میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو دیکھا اور انہوں نے آپ سے کلام کیا۔پھر فترۃ کے بعد جب دوسری وحی نازل ہوئی تو اُس وقت بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو دیکھا مگر غار حرا میں نہیں بلکہ زمین اور آسمان کے درمیان ایک بہت بڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے۔اسی طرح بخاری اور بعض دوسری کتب احادیث میں ذکر آتا ہے کہ بعض دفعہ جبریل ظاہر ہوئے اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اس طرح بالمشافہ باتیں کیں جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے ہمکلام ہوتا ہے۔غرض جبریل کسی نہ کسی صورت میں متشکل ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اسی لئے مفردات والوں نے یہ نہیں کہا کہ فِي الصُّوْرَةِ الْمُعَيَّنَةِ اپنی معین صورت میں جبریل ظاہر ہوتا ہے بلکہ فِيْ صُوْرَةٍ مُّعَيَّنَةٍ کہا ہے یعنی کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔یہ امتیاز اُنہوں نے اس لئے کیا ہے کہ درحقیقت جبریل کی کوئی ایک شکل نہیں۔حدیثوں سے پتہ لگتا ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔جب حرا میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ظاہر ہُوا تو ایک شاب کی شکل میں ظاہر ہُوا۔جب فترۃ وحی کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو دیکھا تو وہ اتنی مہیب شکل میں ظاہر ہُوا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُسے دیکھ کر گھبرا گئے تھے وہ شکل اِس قدر وسیع طور پر پھیلی ہوئی تھی کہ سارے آسمان پر محیط تھی لیکن مدینہ منورہ میں جب جبریل ظاہر ہُوا تو اُس کی شکل آپ کے ایک خوبصورت صحابی دحیہ کلبی سے ملتی تھی۔غرض مختلف اوقات میں مختلف شکلوں اور صورتوں میں جبریل کا ظاہر ہونا صاف بتاتا ہے کہ جبریل کی کوئی ایک شکل نہیں۔جبریل تو ایک فرشتہ ہے اور اس لحاظ سے وہ ویسا ہی ہے جیسے اور فرشتے ہیں مگر جب وہ کسی بندے پر ظاہر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے کلام کے مطابق

ایک مثالی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

جب جبریل ایک خوبصورت شاب کی شکل میں آپ پر ظاہر ہوا اُس وقت اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی استمالتِ قلب کو مدّ نظر رکھ کر ایسا کیا کیونکہ اُس وقت وحی کے نزول کا ابتدا تھا اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا یقین دلائے کہ ڈر اور فکر کی بات نہیں اُس نے اپنے قرب کے لئے آپ کو مخصوص کر لیا ہے اور وہ آئندہ اپنے بہت بڑے فضلوں کا آپ کو مورد بنانے والا ہے پس چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی اور آپ سے اپنی محبت کا اظہار اللہ تعالیٰ کے مدّ نظر تھا اس لئے اُس نے جبریل کو ایک نوجوان کی شکل میں آپ پر ظاہر فرمایا۔ اِس کے بعد جب جبریل ایک نہایت ہی مہیب اور خوفناک شکل میں آپ کو دکھائے گئے تو اس میں حکمت یہ تھی کہ ابتدائے وحی پر چھ ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کا کلام اہل مکہ تک پہنچانا شروع کر دیا تھا گو زیادہ زور کے ساتھ تبلیغ بعد میں شروع کی گئی ہو مگر انفرادی رنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزولِ وحی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں کو سُنانا شروع کر دیا تھا اور اہل مکہ میں مخالفت اور تکذیب کے آثار شروع ہو گئے تھے اِسی وجہ سے جبریل آپ کو ایک سخت مہیب شکل میں دکھائے گئے تا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا اعلان ہو کہ اب انذار کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ وہ مہیب شکل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں تھی بلکہ اُس آنے والی وحی کے پیش خیمہ کے طور پر تھی جس میں مخالفین کی تباہی اور بربادی کی خبریں دی جانے والی تھیں۔ اِس کے بعد مدینہ منورہ میں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کلبی کی صورت میں جبریل کو دیکھا تو اُس میں حکمت یہ تھی کہ اگر کسی اجنبی کی شکل آپ کو دکھائی جاتی تو صحابہؓ کے دل میں شبہ گذرتا کہ ممکن ہے یہ کوئی اَور شخص ہو جسے ہم نہ جانتے ہوں باہر سے آیا ہو اَور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے باتیں کر کے چلا گیا ہو مگر دحیہ کلبی کی شکل میں جبریل کے آنے پر اُن کے دلوں میں اِس قسم کا کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ دحیہ کلبی اُنکا ہمسایہ تھا اور اگر اُن کے دلوں میں کوئی شبہ پیدا ہوتا کہ یہ شکل جو ہم نے دیکھی ہے دحیہ کلبی کی تھی یا جبریل کی تو وہ فوراً دحیہ کلبی سے پُوچھ سکتے تھے کہ میاں تم کل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے تھے یا نہیں اور جب وہ کہتا کہ مَیں تو نہیں آیا تھا تو اُنہیں یقین آجاتا کہ جو کچھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا وہی درست تھا اور درحقیقت جبریل ہی دحیہ کلبی کی شکل میں آپ کے پاس آیا تھا۔ پس صحابہؓ کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کہ جبریل ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہا ہے اللہ تعالیٰ اُسے دحیہ کلبی کی شکل میں نازل فرماتا تا کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو یہ بتائیں کہ ذَاكَ جِبْرِيْلُ یہ جبریل تھا جو ابھی تمہارے سامنے میرے ساتھ باتیں کر رہا تو اُن کے دلوں میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو کہ یہ تو دحیہ کلبی تھا وہ فوراً سمجھ جاتے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرما رہے ہیں درست ہے کیونکہ دحیہ کلبی تو اِس وقت فلاں جگہ موجود ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں دو مختلف مقامات پر اپنے جسم کے ساتھ دیکھا جا سکے۔ مثلاً بشارت الرحمٰن صاحب ہمارے کالج کے پروفیسر ہیں۔ بشارت کے معنے خوشخبری کے ہیں اور رحمٰن اُس ذات کو کہتے ہیں جو انسان پر بار بار رحم کرنے والی ہے۔ اگر وہ کسی شخص کو چلتے چلتے عین بیداری کی حالت میں نظر آجائیں اور اُس کا قلب محسوس کرے کہ یہ درحقیقت ایک کشفی نظارہ ہے جو مجھے دکھایا گیا ہے تو اس کے بعد اپنے مزید اطمینان اور تسلی کے لئے اگر وہ بشارت الرحمٰن صاحب کا واقف ہے تو اُن سے دریافت کرے گا کہ کیا کل ڈاکخانہ کے پاس یا فلاں جگہ فلاں وقت آپ ہی مجھے ملے تھے؟ وہ کہیں گے کہ مَیں تو آپ سے نہیں ملا۔ میں تو اُس وقت ڈاک خانہ میں گیا ہی نہیں اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ اِس بات سے اُسے یقین آجائے گا کہ وہ جو میرے دل میں یہ احساس تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشفی رنگ میں ایک نظارہ دکھایا گیا ہے بالکل درست ہے۔ اگر جسمانی نظارہ ہوتا تو اُنہیں بھی پتہ ہوتا کہ مَیں فلاں دن اَور

۳۱۱
جبریل کے صورت معینہ میں آنے کی وجہ

فلاں وقت اپنے دوست سے ملا تھا۔ اسی طرح اگر جبریل دحیہ کلبی کی شکل میں نہ آتے بلکہ کسی اور اجنبی انسان کی شکل اختیار کرکے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آجاتے آپ سے مصافحہ بھی کرتے باتیں بھی کرتے اور پھر چلے جاتے اور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ یہ جبریل تھا جو مجھ سے باتیں کرتا رہا تو صحابہؓ کے دلوں میں یہ خیال گذر سکتا تھا کہ ہم یہ کس طرح مان لیں ممکن ہے کوئی اجنبی آدمی ہو اور اُسے جبریل کہہ دیا گیا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات پر ایمان رکھتے تھے اور آپ جو کچھ بھی فرماتے وُہ شرحِ صدر کے ساتھ اُس کی تصدیق کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک یقین وہ ہوتا ہے جو تمام مادی ثبوتوں کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک یقین وہ ہوتا ہے جو سابق یقین کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کسی اجنبی انسان کے متعلق بھی فرما دیتے کہ ذَالِکَ جِبْرِئِیْلُ. وہ جبریل تھا جو میرے پاس آیا تو چونکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر بات پر یقین رکھتے تھے وہ اِسے بھی مان لیتے مگر دحیہ کلبی کی صورت میں جبریل کا آنا اور پھر صحابہؓ کا خود دحیہ کلبی سے پوچھ کر تسلی کر سکنا کہ بتاؤ تم تو کل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں نہیں آئے تھے اور اُس کا انکار کرنا ایک ایسا یقین تھا جو صرف سابق ایمان کی وجہ سے اُن کو حاصل نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یہ ایک زائد ثبوت تھا اس بات کا کہ اُن کے حواس بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے گویا وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس بات کی تصدیق کر سکتے تھے اس وجہ سے بھی کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایسا کہتے ہیں اس لئے ٹھیک ہے اور اس وجہ سے بھی کہ چونکہ ہمارے اپنے حواس بھی اس کی سچائی کی شہادت دیتے ہیں اس لئے یہ ٹھیک ہے اور اس وجہ سے بھی کہ چونکہ دحیہ کلبی بھی تصدیق کرتا ہے اس لئے یہ ٹھیک ہے۔ غرض تینوں مقامات پر تین الگ الگ مقاصد کے ماتحت جبریل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ظاہر ہُوا۔

بعض لوگ اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ تم کہتے ہو اللہ تعالےٰ کلام کرتا ہے کیا اُس کی زبان ہے جس سے وہ بولتا ہے۔ ہم کہتے ہیں اُس کی زبان تو نہیں مگر اُس میں قدرت موجود ہے اور وہ اپنی قدرت سے بغیر زبان کے کلام پیدا کر دیتا ہے۔ یہی حال جبریل کا ہے وہ مَلَک ہے مگر ہر موقع کے مناسب حال مختلف شکلیں بدل لیتا ہے کبھی ماں کی شکل اختیار کر لیتا ہے کبھی بیٹی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کبھی بیٹے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کبھی بیوی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کبھی مرد کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کبھی انسانی شکل کے علاوہ کبوتر یا کسی اَور جانور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور شکلوں کے اس اختلاف سے یہ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے کہ تم پر اللہ تعالےٰ کا جو کلام نازل ہو رہا ہے اُس کی کیا شان ہے یا تمہارے دوستوں کے لئے اُس کی کیا شان ہے یا تمہارے دشمنوں کے لئے اُس کی کیا شان ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ کی طرف سے دو صورتوں میں الہام نازل ہوتا ہے ایک الہام اُن فقرات کی صورت میں نازل ہوتا ہے جو جبریل کی زبان سے بندہ سُنتا ہے اور ایک الہام خود جبریل کی شکل میں ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک مہیب اور خوفناک شکل میں آسمان اور زمین کے درمیان ایک بہت بڑی کرسی پر بیٹھا ہُوا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نظر آیا تو اس کے معنے یہ تھے کہ وہ کلام جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونیوالا ہے اُس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ اب ساری زمین پر قضاء جاری کرنے والا ہے۔ ساری دنیا کی قضاء اب اس کلام کے ساتھ وابستہ ہے وہی عمل خدا تعالےٰ کے حضور مقبول ہوگا جو اس کلام کے مطابق ہوگا۔ اور وہ عمل جو اس کلام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انسان بجا لائے گا اُسے رد کر دیا جائیگا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی استمالتِ قلب مراد تھی اُس وقت جبریل آپ کو غار حرا میں ایک خوبصورت نوجوان کی شکل میں نظر آیا اور جب صحابہؓ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ یہ جبریل ہی ہے جو تم دیکھ رہے ہو تو اُس وقت جبریل ایک صحابی کی شکل میں نظر آیا تا کہ وہ خود بھی پتہ لگا سکیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے

جو شخص باتیں کر رہا تھا وہ دحیہ کلبی نہیں بلکہ جبریل ہی ہے۔ غرض جبریل ہمیشہ فِیْ صُوْرَۃٍ مُّعَیَّنَۃٍ نازل ہوتا ہے نہ کہ فِی الصُّوْرَۃِ الْمُعَیَّنَۃِ اپنی ذاتی شکل و صورت میں۔

پھر کہتے ہیں وَاِمَّا بِسَمَاعِ کَلَامٍ مِّنْ غَیْرِ مُعَایَنَۃٍ کَسَمَاعِ مُوْسٰی کَلَامَ اللّٰہِ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک کلام تو نازل ہوتا ہے مگر جبریل اُس کے ساتھ نہیں آتا۔ کان میں آواز آتی ہے انسان اُس آواز کو سنتا اور سمجھتا ہے مگر کوئی چیز نظر نہیں آتی جیسے موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ وَاِمَّا بِالْقَاءٍ فِی الرَّوْعِ کَمَا ذَکَرَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ اور کبھی کوئی بات بطور القاء دل میں ڈال دی جاتی ہے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ روح القدس نے ایک بات میرے دل میں ڈالی ہے کوئی معیّن الفاظ نہیں تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے ہوں ورنہ آپ اُن کا بھی ذکر فرماتے یا کہتے کہ جبریل نے مجھے آکر یوں کہا ہے آپ نے اِن میں سے کوئی بات نہیں کہی صرف اتنا فرمایا ہے کہ اَنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ روح القدس نے میرے قلب میں فلاں بات ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے کوئی بات ڈال دی جاتی ہے (مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ دل کے خیال کو الہام کہہ دیا جائے بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ انسان پر ساتھ یہ انکشاف ہوتا ہے کہ جبریل یا کوئی دوسرا فرشتہ یا خدا تعالیٰ بذاتِ خود باہر سے یہ بات میرے دل میں ڈال رہا ہے اور خود میرے دل سے یہ خیال پیدا نہیں ہو رہا) وَاِمَّا بِالْھَامٍ نَحْوُ اَوْحَیْنَا اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰۤی اَنْ اَرْضِعِیْہِ اور یا کبھی کلام الٰہیہ کا نزول الہام کے ذریعہ سے ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ ہم نے اُمّ موسیٰ کی طرف وحی کی۔ وَاِمَّا بِتَسْخِیْرٍ نَحْوُ قَوْلِہٖ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اور کبھی وحی تسخیر ہوتی ہے یعنی طبعی طور پر کسی چیز کی فطرت میں ایک بات پیدا کر دی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ اس جگہ وحی سے مراد وحی لفظی نہیں بلکہ وحی تسخیر ہے وحیٔ تسخیر سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عربی اُردو یا انگریزی زبان میں کوئی کلام نازل ہوتا ہے۔ یہ بھی مراد نہیں کہ تمثیل زبان میں کوئی نظارہ دکھایا جاتا ہے اور یہ بھی مراد نہیں کہ جبریل بھیجا جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض کام بعض چیزوں کی فطرت میں داخل کر دیتا ہے اور وہ مجبور ہوتی ہیں کہ اُسی رنگ میں کام کریں جس رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو مسخر کر دیا ہے۔ جیسے سورج مسخر ہے ایک مقررہ منزل کی طرف چلنے پر اور زمین مسخر ہے سورج کے گرد گھومنے پر۔ اسی طرح کوئی پودا پھول پیدا کرنے پر مسخر ہے کوئی پھل پیدا کرنے پر مسخر ہے کوئی کسی اور کام پر مسخر ہے۔ گویا فطرت میں جو بات ودیعت کر دی جائے اُسے وحیٔ تسخیر کہتے ہیں۔ اِسی قسم کی وحی مکھی کو ہوئی ہے اَوْ بِمَنَامٍ یا رؤیا اور خواب کی حالت میں کوئی نقشہ انسان کو نظر آجاتا ہے کَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَبَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وحی منقطع ہو گئی اور مبشرات باقی رہ گئے ہیں اور مبشرات سے مراد کیا ہے رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ۔ مومن جو سچے رؤیا دیکھتا ہے اُن کو مبشرات کہا جاتا ہے فَالْاِلْھَامُ وَالتَّسْخِیْرُ وَالْمَنَامُ دَلَّ عَلَیْہِ قَوْلُہٗ اِلَّا وَحْیًا۔ پس الہام تسخیر اور منام پر قرآن کریم کی آیت میں اِلَّا وَحْیًا کے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ دلالت کرتے ہیں وَسَمَاعُ الْکَلَامِ غَیْرَ مُعَایَنَۃٍ دَلَّ عَلَیْہِ قَوْلُہٗ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ اور وہ کلام جس کی کانوں میں تو آواز آتی ہے مگر کوئی شکل نظر نہیں آتی اُس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ وَتَبْلِیْغُ جِبْرِیْلَ فِیْ صُوْرَۃٍ مُّعَیَّنَۃٍ دَلَّ عَلَیْہِ قَوْلُہٗ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ۔ اور وحی کی یہ صورت کہ بعض دفعہ جبریل اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتا ہے اُس پر یہ آیت شاہد ہے کہ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا یعنی اللہ تعالیٰ اِس رنگ میں بھی وحی نازل کرتا ہے کہ بعض دفعہ اپنے کسی فرشتے کو بھیج دیتا ہے جو واسطہ بن کر اُس کا پیغام بندے کو پہنچاتا ہے۔ وحی الٰہی کے متعلق مفردات والوں کی مذکورہ بالا تشریح کے متعلق میں یہ امر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک اِس میں بعض غلطیاں ہیں جو زمانہ نبوت سے بُعد کی وجہ سے

اُن سے ظاہر ہوئی ہیں اور جن کا اس بحث کے ضمن میں مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

وحی کے معنی کرنے میں امام راغب کی تین غلطیاں

سب سے پہلی اور بڑی غلطی تو یہ ہے کہ وحی الٰہی کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے دو مختلف مضامین کو مخلوط کر دیا ہے۔ وُہ بتانا یہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو کلام نازل ہوتا ہے اُس کی کیا قسمیں ہیں۔ مگر اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اُس وحی کو بھی بیان کر دیا ہے جو مکھی کی طرف ہوئی۔ حالانکہ یہ بالکل واضح بات تھی کہ وہ یہ بحث نہیں کر رہے تھے کہ لُغت کے لحاظ سے وحی کے کیا معنے ہیں یا وحی کا اطلاق کن کن معانی پر ہو سکتا ہے بلکہ وہ بتانے یہ لگے تھے کہ بشر پر جو وحی الٰہی نازل ہوتی ہے اُس کی کیا قسمیں ہیں۔ مگر اُن کا ذکر کرتے ہوئے اُس وحی کا بھی اُنہوں نے ذکر کر دیا جو مکھی کی طرف ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بحث یہ اٹھائی تھی کہ وَيُقَالُ لِلْكَلِمَةِ الْاِلٰهِيَّةِ الَّتِيْ تُلْقٰى اِلٰى اَنْبِيَآءِهٖ وَ اَوْلِيَآءِهٖ وَحْيٌ۔ کہ اُن کلمات الٰہیہ کو بھی وحی کہا جاتا ہے جو اللہ تعالےٰ کے انبیاء اور اُس کے اولیاء کی طرف نازل ہوتے ہیں وَ ذٰلِكَ اَضْرُبٌ اور اس کی کئی قسمیں ہیں حَسَبَ مَا دَلَّ عَلَيْهِ قَوْلُهٗ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اِلٰى قَوْلِهٖ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ جیسا کہ خدا تعالےٰ کا یہ قول اُس پر دلالت کرتا ہے کہ کسی انسان سے اللہ تعالےٰ کلام نہیں کرتا مگر اس رنگ میں کہ اُس پر براہِ راست وحی نازل کرتا ہے یا اُس سے وراءِ حجاب گفتگو کرتا ہے یا اُس کی طرف کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں اللہ تعالےٰ اُس وحی کا ذکر کر رہا ہے جو بشر پر نازل ہوتی ہے مگر اُس کی تشریح کرتے ہوئے مفردات والے لکھتے ہیں وَ اِمَّا بِتَسْخِيْرٍ نَحْوَ قَوْلِهٖ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ یا وحیٔ تسخیر ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ جب اِس جگہ اُس وحی کا ذکر ہو رہا تھا جو بشر پر ہوتی ہے تو غیر بشر کی وحی کا اِس تشریح میں ذکر ہی کس طرح آ سکتا تھا۔ پس پہلی غلطی تو یہ ہے کہ آیت اور لُغت کو انہوں نے مخلوط کر دیا ہے۔ بیشک لُغت کے لحاظ سے یہ بات صحیح ہے کہ وحی کی ایک قسم وحیٔ تسخیر بھی ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کی طرف وحی ہوئی۔ مگر مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا میں بشر کا ذکر ہے غیر بشر کا نہیں۔ مگر تشریح کرتے ہوئے وہ مکھی کا ذکر بھی لے آئے اور اُن کے ذہن پر آیت قرآنی کی تشریح کی بجائے لُغت غالب آگئی سو انہیں یہ خیال نہ رہا کہ یہاں اُس وحی کا ذکر ہے جو بشر کی طرف ہوتی ہے اُس وحی کا ذکر ہی نہیں جو غیر بشر کی طرف ہو اس لئے وحیٔ تسخیر کا اس دوران میں کوئی ذکر ہی نہیں آ سکتا تھا۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں وَ ذٰلِكَ اِمَّا بِرَسُوْلٍ مُّشَاهَدٍ تُرٰى ذَاتُهٗ۔ یا تو یہ کلام کسی رسول کے ذریعہ آتا ہے جس کی شکل سامنے نظر آتی ہو وَيُسْمَعُ كَلَامُهٗ اور اُس کی آواز بھی سُنی جاتی ہے وَ اِمَّا بِسَمَاعِ كَلَامٍ مِّنْ غَيْرِ مُعَايَنَةٍ یا بغیر کسی چیز کے دکھائی دینے کے محض آواز آ جاتی ہے كَسَمَاعِ مُوْسٰى كَلَامَ اللّٰهِ جیسے موسیٰؑ سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا۔ وَ اِمَّا بِالْقَآءٍ فِي الرَّوْعِ یا اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی بات دل میں ڈال دی جاتی ہے مگر اس کے بعد کہتے ہیں وَ اِمَّا بِالْهَامٍ نَحْوَ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ یا یہ کلام الہام کے ذریعہ نازل ہوتا ہے جیسے اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ ہم نے اُمِّ موسیٰؑ کی طرف وحی کی۔ جب اللہ تعالےٰ کے کلام کی ایک وہ قسم بھی آ چکی جس میں جبریل کا نزول ہوتا ہے، وہ قسم بھی آ چکی ہے جس میں آواز سُنائی دیتی ہے، وہ قسم بھی آ چکی جس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک بات دل میں ڈال دی جاتی ہے تو پھر الہام کونسا باقی رہا جس کا وہ علیحدہ ذکر کر رہے ہیں اور جس کی مثال میں انہوں نے اُمِّ موسیٰ کا واقعہ پیش کیا ہے۔ یہ صاف بات ہے کہ جبریل کے ذریعہ جو کلام آتا ہے وُہ بھی الہام ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اگر آواز آتی ہے تو وُہ بھی الہام ہوتا ہے اور یہی الہام تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ہُوا مگر انہوں نے اِمَّا کہہ کر ایک اور شق قائم کر دی ہے کہ وحی کی ایک قسم الہام بھی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام ہُوا کہ اَنْ اَرْضِعِيْهِ حالانکہ یہ بات اُن کی

پہلی بیان کردہ قسموں میں ہی شامل ہے کوئی علیحدہ بات نہیں جسے زائد طور پر اِمَّا کہہ کر بیان کرنے کی ضرورت ہوتی۔ اس موقعہ پر یا تو اُنہیں یہ بتانا چاہیئے تھا کہ وحی اور چیز ہوتی ہے اور الہام اور چیز۔ اس لئے میں الہام کا علیحدہ ذکر کر رہا ہوں اور الہام اور وحی میں یہ فرق ہوتا ہے مگر انہوں نے کوئی فرق نہیں کیا اور بلا وجہ ایک علیحدہ شق اِمَّا کہکر قائم کر دی حالانکہ یہ پہلے مضمون سے کوئی مغائر مضمون نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ الہام کے معنے اُن کے نزدیک "در دل انداختن" کے ہوتے ہیں یعنی وہ بات جو دل میں ڈال دی جائے اُسے الہام کہتے ہیں اور جو کلام الفاظ کی شکل میں نازل ہو اُسے وحی کہتے ہیں اِسی لئے انہوں نے الہام کا علیحدہ ذکر کیا ہے تو یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ وہ اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ اِمَّا بِالْقَاءٍ فِي الرَّوْعِ كَمَا ذَكَرَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ کہ وحی بعض دفعہ القار فی الروع کی صورت میں بھی ہوتی ہے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رُوح القدس نے فلاں بات میرے دل میں ڈال دی ہے۔ جب القاء فی الروع کا پہلے ذکر آچکا ہے تو اس کے بعد اِمَّا بِالْهَامٍ نَحْوَ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ کہنا بتاتا ہے کہ اُن کا یہ منشاء نہیں ہوسکتا کہ الہام سے مراد در دل انداختن ہے کیونکہ یہ مضمون پہلے آچکا ہے۔

میرے نزدیک تو انہوں نے بھول کر دوبارہ اِمَّا بِالْهَامٍ نَحْوَ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ الخ لکھدیا ہے چنانچہ مجمع البحار والوں نے کہا ہے کہ مفردات راغب کی یہ بات غلط ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى اُمِّ مُوْسٰٓى وَحْىُ اِعْلَامٍ لَا اِلْهَامٍ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف یہ وحی جو نازل ہوئی تھی کہ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ ہم اُسے الہام نہیں کہہ سکتے کیونکہ الہام تو در دل انداختن کو کہتے ہیں اور یہاں صاف الفاظ موجود ہیں کہ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ۔ ہم اُسے تیری طرف واپس لوٹائیں گے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ دل میں کوئی بات ڈال دی جائے مگر اُس کے الفاظ معیّن صورت میں نہیں آتے۔ الفاظ کا معیّن صورت میں نازل ہونا بتا رہا ہے کہ الہام نہیں اعلام ہے۔ اعلام کے معنے اظہار کے ہوتے ہیں اور الہام سابق مفسّرین کے نزدیک در دل انداختن کو کہا جاتا ہے۔ یہ بھی عربی زبان کا ایک کمال ہے کہ حروف کے معمولی فرق کے ساتھ معانی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک آدمی سے کوئی بات کہی جائے تو اُسے اعلام کہتے ہیں لیکن اگر کئی آدمیوں سے بات کہی جائے تو اُسے اعلان کہتے ہیں چونکہ میم پہلے آتا ہے اور نون بعد میں اس لئے ایک آدمی سے تعلق رکھنے والی بات کو اعلام کہا جاتا ہے اور زیادہ آدمیوں سے تعلق رکھنے والی بات کو اعلان کہا جاتا ہے۔ بہرحال مجمع البحار والوں نے اِن الفاظ میں مفردات کی ہی تردید کی ہے کہ اس میں جو لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام ہوا یہ صحیح نہیں اُنہیں وحیٔ اعلام ہوئی تھی کیونکہ اُس کے معیّن الفاظ تھے وہ الہام نہ تھی کیونکہ الہام تو در دل انداختن کو کہا جاتا ہے۔ میرے نزدیک مفردات والوں نے بھولکر الہام کا دوبارہ ذکر کر دیا ہے۔ کیونکہ قلبی الہام کا وہ اس سے پہلے خود ذکر کر چکے ہیں یا ممکن ہے اُن کا مفہوم کچھ اور ہو مبہم عبارت کی وجہ سے اس کا مطلب صحیح سمجھ میں نہ آتا ہو۔

الغرض وحی کے معنے کرتے ہوئے امام راغب صاحب نے جو یہ تشریح کی ہے کہ فَالْاِلْهَامُ وَالتَّسْخِيْرُ وَالْمَنَامُ دَلَّ عَلَيْهِ قَوْلُهٗ اِلَّا وَحْيًا کہ الہام (جس کے معنے سابق علماء کے نزدیک در دل انداختن کے ہیں) اور تسخیر اور منام یہ وحی کے ماتحت آتے ہیں اور وراء حجاب سے مراد انہوں نے یہ لیا ہے کہ خدا تعالےٰ خود کلام کرے لیکن نظر نہ آئے اور يُرْسِلَ رَسُوْلًا کا مطلب یہ لیا ہے کہ خدا تعالےٰ خود کلام نہ کرے بلکہ جبریل کے واسطہ سے اپنا کلام بھجوائے اور جبریل نظر نہ آئے۔ میرے نزدیک اُن کی یہ تشریح درست نہیں کیونکہ نہ ہر وحی قرآنی کے وقت جبریل نظر آتے تھے نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا کلام من وراء حجاب تھا پھر اُن کا من وراء حجاب سے یہ مراد لینا کہ خدا تعالیٰ نظر نہ آئے تو یہ تعریف تو ہر وحی پر چسپاں ہوگی خواہ کسی قسم کی ہو کیونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات وراء الوراء ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو منام کا نام وحی رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی نقل کرتے ہیں کہ اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَبَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ وحی منقطع ہو گئی ہے اب صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں اور مبشرات سے مراد وہ سچے رویاء ہیں جو مومنوں کو ہوتے ہیں۔ اگر منام کا نام ہی وحی ہے تو پھر یوں کہنا چاہیئے تھا کہ اِنْقَطَعَ کَلَامٌ وَّرَآئِ الْحِجَابِ اِلَّا الْوَحْیُ۔ اللہ تعالےٰ کا وہ کلام جو پس پردہ ہوا کرتا تھا وہ اب بند ہو چکا ہے اب صرف وحی باقی رہ گئی ہے جس سے مراد خوابیں ہیں۔ پس یہ تشریح جو مفردات والوں نے کی ہے اِس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

الہام کے معنے سمجھنے میں پہلے علماء کی غلط فہمی

اصل بات یہ ہے کہ الہام کے معنے سمجھنے میں پہلے علماء کو بہت کچھ غلط فہمی ہوئی ہے اور اِسی بناء پر وہ الہام کی تعریف یہ کرتے رہے ہیں کہ در دل انداختن۔ ایسی بات جو دل میں ڈالی جائے اُس کو الہام کہتے ہیں حالانکہ الہام اور وحی دونوں ایک ہی چیز ہیں اور ان میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ یہ صرف صوفیاء کی اصطلاح تھی کہ انہوں نے اُس کلام کو جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُن پر نازل ہوتا تھا الہام کہنا شروع کر دیا تاکہ لوگ کسی فتنہ میں نہ پڑیں ورنہ الہام اور وحی میں کوئی فرق نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی کئی جگہ الہام کا لفظ استعمال کیا ہے مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ میں اِس کلام کو الہام صرف اس لئے کہتا ہوں کہ صوفیاء نے ایک اصطلاح قائم کر دی ہے اور لوگوں میں اس اصطلاح کا رواج ہو گیا ہے ورنہ میں اس بات کا قائل نہیں کہ الہام اور چیز ہے اور وحی اور چیز۔ جس چیز کا نام لوگ الہام رکھتے ہیں اُسی چیز کا نام وحی ہے۔ پس الہام وہ اصطلاح ہے جو لفظی کلام کے متعلق صوفیاء نے قائم کی ہے ورنہ قرآن کریم میں ہر جگہ وحی کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے الہام کا لفظ صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے اور وہ بھی وحی کے معنوں میں نہیں بلکہ میلانِ طبیعت کے معنوں میں جیسا کہ فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس ع۱) اللہ تعالےٰ نے انسان کو بُرائیوں اور نیکیوں کے متعلق الہام کیا ہے۔ اب اس کے معنے کسی خارجی الہام کے

الہامات کے ساتھ نزولِ ملائکہ کی وجہ

نہیں بلکہ صرف میلانِ طبع کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ تسخیر اور میلان میں فرق ہوتا ہے۔ میلان تو اختیاری ہوتا ہے لیکن تسخیر اختیاری نہیں ہوتی بلکہ جس لائن پر کسی چیز کو کھڑا کر دیا جائے وہ مجبور ہوتی ہے کہ اُسی لائن پر کھڑی رہے اور اُس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہو مثلاً مکھی یہ نہیں کر سکتی کہ وہ شہد بنانا چھوڑ دے لیکن انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو تقویٰ اختیار کرے اور چاہے تو فجور کے راستہ پر چل پڑے۔ پس الہام کا لفظ جو مفردات والوں نے استعمال کیا ہے قرآن کریم میں اُن معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوا جن معنوں میں انہوں نے استعمال کیا ہے اور نہ الہام کا لفظ آیت میں اُن معنوں میں استعمال ہوا ہے جو صوفیاء مراد لیتے ہیں یہ لفظ بعد کے زمانہ میں صوفیاء نے لفظی وحی کے لئے ایجاد کیا ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے متعلق یہ وضاحت فرما دی ہے کہ جو کلام اللہ تعالےٰ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی وحی ہے مگر چونکہ لوگوں میں اس کے متعلق الہام کا لفظ رائج ہے اس لئے میں بھی اِسے الہام کہہ دیتا ہوں ورنہ الہام اور وحی دونوں مترادف الفاظ ہیں ان میں کوئی فرق نہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام میں جو یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ بعض دفعہ اپنا کلام ملائکہ کے ذریعہ نازل فرماتا ہے اِس کے یہ معنے نہیں کہ ملائکہ صرف اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا والی وحی کے ساتھ نازل ہوتے ہیں بلا واسطہ وحی کے ساتھ نازل نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کے ہر الہام کے ساتھ ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور کوئی ایک الہام بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ اُس کے ساتھ فرشتہ نازل نہیں ہوتے مگر بعض لوگ غلط فہمی سے اس کا یہ مطلب لے لیتے ہیں کہ جبریل ہر الہام کے ساتھ آ کر کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے فلاں بات آپ کو پہنچانے کا حکم دیا ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ ملائکہ کے نزول کے صرف اتنے معنے ہیں کہ ہر الہام فرشتوں کی حفاظت کے ساتھ آتا ہے یہ معنے نہیں کہ ہر الہام کے ساتھ فرشتے آ کر یہ کہتے بھی ہیں کہ ہمیں فلاں بات پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہامات اس کی تائید میں موجود ہیں مثلاً ایک الہام میں تو یہ ذکر آگیا کہ جَآءَ نِیْ اٰئِلُ (تذکرہ صفحہ ۶۰۳) میرے پاس جبریل آیا، مگر باقی الہامات کے ساتھ یہ بات بیان نہیں ہوئی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اُس رنگ میں نہیں جس رنگ میں لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جب آپ کو یہ الہام ہُوا تھا کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَةً (تذکرہ صفحہ ۵۰۶) تو فرشتوں نے آکر یہ کہا ہو کہ ہمیں اللہ تعالےٰ نے یہ الہام نازل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایسا نہیں ہُوا کرتا بلکہ بندہ اُس وقت یہ محسوس کیا کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے براہِ راست ایک کلام مجھ پر نازل ہو رہا ہے مگر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے اس کلام کے ساتھ حفاظت کے لئے ضرور آتے ہیں۔ عام لوگوں کے الہامات کے ساتھ اس لئے نہیں آتے کہ اگر اُن الہامات میں کوئی گڑبڑ بھی ہو جائے تو پروا نہیں ہوتی لیکن انبیاء یا اُن سے اُتر کر وہ لوگ جو دنیا کی اصلاح کے لئے کھڑے کئے جاتے ہیں اُن کے الہامات چونکہ لوگوں کے لئے حجت ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کی حفاظت میں اُتارے جائیں۔ بہرحال الہامات کے ساتھ فرشتوں کا نازل ہونا یہ معنے نہیں رکھتا کہ مثلاً جب آیت الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ اُتری تھی تو اُس وقت جبریل نے آکر یہ کہا تھا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے کہ میں یہ آیت آپ تک پہنچا دوں۔ ایسا ذکر صرف چند سورتوں کے متعلق آیا ہے مثلاً سورۃ البیّنہ کے متعلق آتا ہے یا یہ آتا ہے کہ رمضان المبارک کے ایام میں جبریل آتے اور جس قدر حصہ قرآن نازل ہو چکا ہوتا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر اُس کا تکرار کیا کرتے مگر ہر الہام کے متعلق نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ احادیث سے کہ جبریل آکر یہ کہتا ہو کہ مجھے خدا نے فلاں بات پہنچانے کا حکم دیا ہے ہاں ہر الہام کے ساتھ حفاظتِ جبریل ضرور ہوتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ الہام کے وقت چونکہ اللہ تعالےٰ اپنی قدرت سے ایک آواز پیدا کرتا ہے اور اُس آواز میں شیطان بھی دخل دے سکتا ہے اس لئے فرشتوں کا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ بندہ کے دل میں وہ اُس وحی کی صداقت کے متعلق یقین پیدا کریں جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ خواہ مجھے صلیب پر لٹکا دیا جائے مجھے اِس بات میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کلام جو مجھ پر نازل ہوتا ہے اُسی خدا کا کلام ہے جس نے آدمؑ سے کلام کیا، جس نے نوحؑ سے کلام کیا، جس نے ابراہیمؑ سے کلام کیا، جس نے موسیٰؑ سے کلام کیا، جس نے عیسیٰؑ سے کلام کیا اور جس نے سب سے بڑھ کر محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے کلام کیا۔ یہ یقین فرشتوں کی حفاظت کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے مگر عام لوگوں کے الہامات کے ساتھ چونکہ فرشتے نہیں اُترتے اِس لئے باوجود الہام کے اُن کے اندر یقین اور ثبات اور استقلال نہیں پایا جاتا ہم نے دیکھا ہے بعض لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں ہم آپکی بیعت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں خدا نے بتایا ہے کہ آپ سچے ہیں۔ اُس وقت وہ روتے بھی ہیں گڑگڑاتے بھی ہیں اپنے سابق اعمال پر پشیمانی اور ندامت کا بھی اظہار کرتے ہیں اور آئندہ کے متعلق بڑے بڑے وعدے بھی کرتے ہیں مگر چند دنوں کے بعد ہی مُرتد ہو جاتے ہیں۔ اب جہاں تک اُن کی بات کا تعلق ہوتا ہے وہ سچی ہوتی ہے واقعہ میں اُنہیں الہام ہُوا ہوتا ہے اور اسی کی بناء پر وہ بیعت کے لئے آتے ہیں مگر چونکہ فرشتے اُن کے ساتھ نہیں ہوتے اُن کے قلب کو وہ ثبات نہیں بخشا جاتا جو انبیاء و اولیاء کے قلوب کو بخشا جاتا ہے اسی لئے وہ تھوڑے سے ابتلاء کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ٹھوکر کھا جاتے ہیں لیکن نبی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ پہلے الہام کے ساتھ ہی اُس کے دل کو غیر معمولی ثبات عطا کیا جاتا ہے اور اپنے الہام پر سب سے پہلا ایمان لانیوالا خود نبی کا وجود ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر نبی اپنے آپ کو اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام ع۲۰) یا اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الاعراف ع۱۷) قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اگر اُسے خود یقین نہ ہو تو وہ دوسروں کے دل میں کس طرح یقین پیدا کر سکتا ہے۔ چونکہ پہلا یقین خود نبی کے دل میں پیدا کیا جاتا ہے اس لئے باوجود اسکے کہ بعد میں ساری دنیا مخالف ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ

انذاری پیشگوئیاں اپنی مخفی یا ظاہر شرائط کی بناء پر ٹل بھی جاتی ہیں اُسے ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اپنے الہامات کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب آتھم والی پیشگوئی کی اور میعاد کے ختم ہونے کا دن آیا تو مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے کہ آج کل جہاں حکیم مولوی قطب الدین صاحب کا مطب ہے وہاں لوگ جمع ہوئے اور چیخیں مار مار کر دعائیں کرنے لگے کہ الٰہی یہ پیشگوئی ضرور پوری ہو جائے۔ ایک پٹھان عبد العزیز ہُوا کرتا تھا وہ تو دیوار کے ساتھ بے تحاشا اپنا سر مارتا اور کہتا خدایا اب یہ سورج نہ ڈوبے جب تک آتھم نہ مر جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کا علم ہُوا تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ چیخیں مار مار کر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے اگر جھوٹے ہوں گے تو ہم ہوں گے ان کو کس بات کا فکر ہے۔

اب دیکھو جماعت کے لوگ گھبرا رہے تھے مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ لوگوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے صرف کلام سُنا تھا ملائکہ کے نزول کی وجہ سے جو ثباتِ قلب عطا کیا جاتا ہے وہ انکو حاصل نہیں تھا۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب کو غیر معمولی ثبات حاصل تھا اور آپ سمجھتے تھے کہ یہ چیخ و پکار بےمعنی بات ہے جس خدا کا کلام مجھ پر نازل ہُوا ہے وہ اپنے کلام کو آپ پورا کرے گا اور اگر کسی شرط کی وجہ سے وہ ٹل جائے گا تب بھی کیا ہُوا انذاری پیشگوئیوں کے متعلق جو سُنّت چلی آرہی ہے بہرحال اُسی کے مطابق ہوگا اِس لئے گھبراہٹ اور فکر کی کوئی بات نہیں۔

پس اللہ تعالےٰ کے کلام کے ساتھ خواہ وہ بلا واسطہ نازل ہو فرشتوں کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال کر لینا کہ ہر کلام کے ساتھ فرشتہ آکر یہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے فلاں بات پہنچاتا ہوں بالکل غلط ہے۔ حدیثوں میں بھی صرف پانچ سات ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جن میں اَتَانِیْ جِبْرِیْلُ کے الفاظ آتے ہوں مگر اور کسی جگہ یہ ذکر نہیں آتا یا رمضان کے متعلق آتا ہے کہ ان ایام میں جبریل آتے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر قرآن کریم کی تلاوت کرتے مگر یہ صورت بالکل اَور ہے۔ اس میں جبریل کی حیثیت محض ایک سامع کی ہوتی تھی۔ اور *جبریل کا آنا اس لئے ضروری تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن کریم کا ہر لفظ یاد رکھنا ضروری تھا۔ باقی لوگ اگر قرآن کریم پڑھنے میں کوئی غلطی کرتے تو اَور لوگ اس کی اصلاح کر سکتے تھے لیکن اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوئی غلطی کرتے تو لوگ کس طرح درست کرتے وہ سمجھتے کہ شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اسی رنگ میں کلام نازل ہُوا ہے یا پہلے کلام میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے اِس لئے خدا تعالےٰ نے جبریل کو سامع بنا دیا تاکہ اگر تلاوت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی غلطی ہو جائے تو جبریل آپکو بتا دیں اور آپ اُس کی اصلاح کر لیں۔ پس یہ صورت بالکل اَور ہے اس سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ ہر کلام کے ساتھ اس رنگ میں فرشتے کا نازل ہونا ضروری ہے کہ وہ آکر یہ کہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے فلاں بات آپ کو پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ ایسا طریق صرف بعض الہامات میں اختیار کیا جاتا ہے باقی الہامات کے ساتھ فرشتوں کا نزول صرف اتنا مفہوم رکھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنا کلام فرشتوں کی حفاظت میں نازل فرماتا ہے۔

پھر امام راغب لکھتے ہیں وَقَوْلُهٗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ فَذَالِكَ لِمَنْ یَدَّعِیْ شَیْئًا مِنْ اَنْوَاعِ مَا ذَكَرْنَاهُ مِنَ الْوَحْیِ اَیَّ نَوْعٍ اِدَّعَاهُ مِنْ غَیْرِ اَنْ حَصَلَ لَهٗ۔ یعنی یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ اُس شخص سے بڑھکر اَور کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالےٰ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھے یا کہے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے حالانکہ اُس کی طرف کوئی وحی نہ ہوئی ہو۔ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ فَذَالِكَ لِمَنْ یَدَّعِیْ شَیْئًا مِنْ اَنْوَاعِ مَا ذَكَرْنَاهُ مِنَ الْوَحْیِ۔ یہ وعید اُس شخص کے بارہ میں ہے جو وحی کے متعلق ہماری بیان کردہ قسموں میں سے کسی شق کے ماتحت آجائے اور دعویٰ کرے کہ مجھ پر فلاں قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اَیَّ نَوْعٍ اِدَّعَاهُ مِنْ غَیْرِ اَنْ حَصَلَ لَهٗ۔ یہ سوال نہیں ہوگا کہ فلاں قسم کی

وحی کے متعلق اُس نے دعویٰ کیا ہے اور فلاں قسم کی وحی کے متعلق اُس نے دعویٰ نہیں کیا۔ اُوپر کی بیان کردہ قسموں میں سے خواہ کسی قسم کی وحی کا وہ دعویٰ کرے اور اُس کی حالت یہ ہو کہ اُس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی نازل نہ ہوتی ہو تو بہرحال وہ اس آیت کے ماتحت آجائے گا اور اللہ تعالیٰ کا عذاب اس پر نازل ہوگا یہ ایک نہایت ہی لطیف بات ہے جو مفردات والوں نے بیان کی ہے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ لُغت نے تو وحی کے کئی معنے بیان کئے ہیں جن میں سے بعض ایسے ہیں جن کا وحی الٰہی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں جیسے اشارہ یا ایماء وغیرہ ہے۔ اور جب لُغت کے اعتبار سے وحی کے کئی ایسے معنے ہیں جن کا وحی الٰہی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ میں کس قسم کی وحی کا ذکر کیا گیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اِس آیت میں صرف اُس وحی الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے جس کی مختلف اقسام کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں اگر کسی شخص کا دعویٰ وحی و الہام ان قسموں کے ماتحت نہیں آئیگا تو اُس پر اس آیت کا اطلاق بھی نہیں ہوگا۔ یہ آیت صرف اُسی شخص پر چسپاں ہوگی جو وحی الٰہی کی بیان کردہ قسموں میں سے کسی قسم کا اِدّعا کرتا ہو۔ یہ ایک لطیف نکتہ ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہائیوں کو سخت دھوکا لگا ہے۔ وہ اپنے پاس سے وحی کی ایک تعریف کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں جب بہاء اللہ اِس بات کا مدعی تھا کہ اُس پر وحی نازل ہوتی ہے اور تمہارے نزدیک وہ جھوٹ اور افتراء سے کام لے رہا تھا تو اُس پر عذاب کیوں نہ آیا حالانکہ عذاب صرف اُس شخص پر نازل ہو سکتا ہے جو وحی کے متعلق قرآن کریم کی بیان کردہ قسموں میں سے کسی قسم کا دعویٰ کرے نہ یہ کہ خلافِ قرآن اور خلافِ اسلام اور خلافِ مذہب وحی کی ایک نئی تعریف کرکے اور اپنے آپ کو اُس وحی کا مورد قرار دے کر یہ شور مچانا شروع کر دے کہ جب مَیں اپنے اُوپر وحی نازل ہونے کا مدعی ہوں تو مجھ پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے مفتری علی اللہ پر عذاب نازل کرنے کا وعدہ کیا ہُوا ہے مگر بہرحال یہ عذاب اُسی شخص پر نازل ہو سکتا ہے جو اُس قسم کی وحی کا دعویٰ کرے جس سے سابق انبیاء کی نبوتیں مشتبہ ہونے لگ جائیں۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھ پر اس قسم کی وحی نازل ہوتی ہے جس قسم کی وحی انبیاءِ سابقین پر نازل ہوا کرتی تھی۔ جس طرح آدمؑ سے خدا تعالیٰ نے کلام کیا تھا یا نوحؑ سے خدا تعالیٰ نے کلام کیا تھا یا ابراہیمؑ سے خدا تعالیٰ نے کلام کیا تھا یا موسیٰؑ سے خدا تعالیٰ نے کلام کیا تھا یا عیسیٰؑ سے خدا تعالیٰ نے کلام کیا تھا یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خدا تعالیٰ نے کلام کیا تھا اِسی طرح مجھ سے خدا تعالیٰ کلام کرتا ہے اور وہ کلام اپنی کیفیت اور کمیت کی رُو سے بھی ویسا ہی ہے جیسے انبیاء کا کلام ہوتا ہے تو پھر بیشک اُس کے جھوٹے ہونے کی صورت میں خطرہ ہو سکتا ہے کہ لوگ ٹھوکر نہ کھائیں اور بے شک اُس وقت ضروری ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے عذاب سے ہلاک کرے۔ لیکن اگر وہ وحی کی اپنے پاس سے ایک نئی تشریح کرتا ہے اور اُس نئی قسم کی وحی کا اپنے آپ کو مورد قرار دیتا ہے تو وہ قرآنی وعید کے ماتحت نہیں آسکتا جیسے بہائیوں کی حالت ہے کہ اُن کے نزدیک وحی صرف قلبی خیالات کا نام ہے۔ وہ بہاء اللہ کی نسبت لفظی الہام کے قائل نہیں ہیں اِلّا ماشاء اللہ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے دل میں جو بھی خیال پیدا ہوتا ہے وہ وحی ہوتا ہے۔ یہی حال لاہور کے میاں غلام محمد کا ہے کہ وہ بھی بلفظ دل کے خیالات کا نام وحی رکھ لیتے ہیں۔ اب اگر دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جو کہتا ہے کہ میرے دل میں جو بھی خیال اُٹھتا ہے وہ وحی ہے تو اللہ تعالیٰ کو اُسے سزا دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر شخص ایسے مدعی کا پاگل ہونا آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سزا دینے کی تو تب ضرورت محسوس ہو جب کسی کے دعویٰ وحی والہام سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت مشتبہ ہونے لگے یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی وحی کا معاملہ مشتبہ ہونے لگے۔ اور یہ معاملہ اُسی وقت مشتبہ ہو سکتا ہے جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر اُسی رنگ میں کلام نازل ہوتا ہے جس رنگ میں کلام موسیٰؑ پر نازل ہُوا۔ یا مجھ پر اُسی رنگ میں کلام نازل ہوتا ہے جس رنگ میں عیسیٰؑ پر کلام نازل ہُوا۔ یا مجھ پر اُسی رنگ میں کلام نازل ہوتا ہے

جھوٹے مدعی کی علامت

بہاء اللہ کی وحی دل کے خیالات کا نام ہے

دعویٰ نبوت کی وحی کے متعلق مصنف کا خیال اور اس کی تردید

جس رنگ میں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کلام نازل ہوا جب تک کوئی شخص اِس قسم کی وحی کا اپنے آپ کو مورد قرار نہیں دیتا اُس کے دعویٰ سے کوئی حقیقی خطرہ پیدا نہیں ہوتا پس اُس کا لازماً الٰہی گرفت میں آنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ پس مفردات والے کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں تقوّل اور افتراء علی اللہ سے کام لینے والوں کے لئے جس عذاب کی خبر دی گئی ہے وہ اسی صورت میں نازل ہو سکتا ہے جب کوئی شخص جھوٹے طور پر اُس وحی کا دعویٰ کرے جس کی مختلف اقسام کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سے خواہ کسی قسم کا وہ مدعی بن جائے اللہ تعالےٰ اُسے یقیناً عذاب دے گا۔ مثلاً وہ یہی کہہ دے کہ مجھ سے جبریل اُسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح اُس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کلام کیا تھا یا کہے کہ الفاظِ معیّنہ مجھ پر نازل ہوتے ہیں یا یہ کہے کہ حالتِ منام میں مجھے اللہ تعالےٰ کی طرف سے مختلف باتیں بتائی جاتی ہیں اور واقعہ یہ ہو کہ نہ جبریل اُس سے کلام کرتا ہو نہ الفاظِ معیّنہ اُس پر نازل ہوتے ہوں نہ تمثیلی نظاروں میں اُسے غیب کی خبروں سے مطلع کیا جاتا ہو تو ایسا شخص یقیناً قرآنی وعید کے ماتحت آئیگا لیکن اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے دل میں جو بھی خیال اُٹھتا ہے وہ وحی ہے تو چونکہ یہ قرآنی وحی کی قسموں میں شامل نہیں اور چونکہ اس طریق سے نہ کسی نبی کی نبوت مشتبہ ہوتی ہے اور نہ کسی دانا شخص کو دھوکا لگ سکتا ہے اِس لئے اللہ تعالےٰ کو اسے عذاب دینے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ہر انسان اپنی عقل سے کام لیکر فوراً فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ پاگل ہے یا شرارتی۔ اس میں دھوکا لگنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ مجھ پر جبریل نازل ہوتا ہے اور وہ مجھے اللہ تعالےٰ کا کلام پہنچاتا ہے یا کہے کہ خدا تعالیٰ میرے کانوں پر یا میری زبان پر معیّن الفاظ میں اپنا کلام نازل کرتا ہے یا حالتِ منام میں غیب کی خبروں سے اطلاع دیتا ہے تب بے شک اُس پر عذاب نازل ہوگا۔ یہ بہت عمدہ استدلال ہے جو مفردات والوں نے کیا ہے۔

پھر لکھتے ہیں یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء ع ۲) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم ہمیشہ اُس کی طرف یہ وحی نازل کرتے رہے ہیں کہ سوائے میرے اور کوئی خدا نہیں تم ہمیشہ میری ہی عبادت کیا کرو۔ فَهٰذَا الْوَحْيُ هُوَ عَامٌّ فِيْ جَمِيْعِ اَنْوَاعِهٖ وَذَالِكَ اَنَّ مَعْرِفَةَ وَحْدَانِيَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَعْرِفَةَ وُجُوْبِ عِبَادَتِهٖ لَيْسَتْ مَقْصُوْرَةً عَلَى الْوَحْيِ الْمُخْتَصِّ بِاُولِي الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ بَلْ يُعْرَفُ ذَالِكَ بِالْعَقْلِ وَالْاِلْهَامِ كَمَا يُعْرَفُ بِالسَّمْعِ فَاِذَا الْقَصْدُ مِنَ الْاٰيَةِ تَنْبِيْهٌ اَنَّهٗ مِنَ الْمُحَالِ اَنْ يَّكُوْنَ رَسُوْلٌ لَا يَعْرِفُ وَحْدَانِيَّةَ اللّٰهِ وَوُجُوْبَ عِبَادَتِهٖ یعنی اِس آیت میں جو وحی کا لفظ ہے اِس سے لفظی وحی مراد نہیں بلکہ انبیاء کی فطرت میں اللہ تعالےٰ نے جو توحید کا مادہ رکھا ہوا ہوتا ہے وہ مراد ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس فطرتی مادہ کے مطابق ہر نبی کو یہ علم ہوتا ہے کہ میں نے اللہ تعالےٰ کی ہی عبادت کرنی ہے اور کسی کی عبادت نہیں کرنی۔ گویا اُن کے نزدیک اس جگہ وحی سے مخصوص وحی مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر نبی کی فطرت میں یہ مادہ رکھ دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی عبادت کرے اور شرک کے کبھی قریب بھی نہ جائے۔ مگر میرے نزدیک یہ معنے بالکل غلط ہیں۔ اگر توحید کے متعلق اللہ تعالےٰ کو اپنے انبیاء کی طرف مخصوص وحی نازل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہی فطرتی مادہ کافی ہوتا ہے جو انہیں اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کیوں ایسی بیسیوں آیات نازل ہوئی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا مسئلہ بڑے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؟ یہ امر ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شرک نہیں کیا چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ مشرکین مکہ میں سے بعض آدمیوں نے آپ کے سامنے کچھ کھانا رکھا مگر چونکہ وہ کھانا بُتوں کے چڑھاوے کا تھا آپ نے اُس کے کھانے سے انکار کر دیا اور زید بن عمرو کی طرف سرکا دیا جو

حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے اور اُس وقت آپ کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر انہوں نے بھی وہ کھانا نہ کھایا بلکہ قریش کو مخاطب کرکے کہا کہ ہم بتوں کے چڑھاوے کا کھانا نہیں کھایا کرتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابتدار سے ہی توحید کے قائل تھے اور شرک کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر اس کے باوجود قرآن کریم میں توحید کا مضمون آیا ہے قرآن کریم کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ توحید کے مضامین سے بھرا پڑا ہے اور اُس میں جگہ جگہ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کا ذکر آتا ہے۔ پس یہ معنے جو مفردات والوں نے کئے ہیں صحیح نہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیاء کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا مادہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ طبعی طور پر شرک سے متنفر ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالےٰ کو اُن کی طرف توحید کے متعلق کسی وحی کے نازل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے کہ وہ ذاتی طور پر توحید کے قائل ہوتے ہیں شرک سے متنفر ہوتے ہیں اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اور کے سامنے سربسجود ہونے کو جائز نہیں سمجھتے پھر بھی اُن کی طرف توحید کے متعلق وحی نازل کی جاتی ہے اور قرآن کریم میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ اِس کے بعد لکھتے ہیں وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ فَذٰلِكَ وَحْیٌ بِوَاسِطَةِ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَام۔ اللہ تعالےٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ۔ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حواری کو رات کے وقت الگ الگ وحی ہوئی تھی کہ اُٹھ میاں! ہمارے نبی کی مدد کر۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی اور انہوں نے وہ وحی حواریوں تک پہنچا دی یہ بات واقعہ میں درست ہے اور اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ وَاَوْحَیْنَا اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ فَذٰلِكَ وَحْیٌ اِلَی الْاُمَمِ بِوَاسِطَةِ الْاَنْبِیَاءِ۔ اور یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ ہم نے اُن کی طرف وحی کی کہ وہ نیک کام کریں یہ وحی اُمتوں کی طرف اُن کے انبیاء کے واسطہ سے تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس موقعہ پر مفردات والوں نے قرآن کریم کو کھول کر نہیں دیکھا ورنہ وہ ایسا نہ لکھتے۔ انہوں نے اِلَیْهِمْ کے لفظ سے یہ سمجھ لیا کہ اس سے تمام بنی نوع انسان مراد ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔ یہ آیت سورۂ انبیاء میں آتی ہے اور وہاں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ (الانبیاء ع۵) ہم نے اُن کی طرف وحی کی کہ وہ نیک کام کریں۔ نمازوں کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ اور وہ لوگ ہمارے عبادت گذار بندے تھے۔ پس اس جگہ عام لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کا ذکر ہے مگر انہوں نے هُمْ کی ضمیر کی وجہ سے یہ خیال کر لیا کہ اس سے عامۃ المسلمین مراد ہیں۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ اس سے مراد صرف وہی وحی ہے جو انبیاء کے واسطہ سے اُمتوں سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ یہ احکام ایسے ہیں جو انبیاء کے ساتھ بھی تعلق رکھتے ہیں۔ کیا انبیاء کو فعل الخیرات کا حکم نہیں ہوتا یا انبیاء کو اقامۃ الصلوٰۃ کا حکم نہیں ہوتا یا انبیاء کو ایتاء الزکوٰۃ کا حکم نہیں ہوتا؟ جب انبیاء کے ساتھ بھی یہ احکام تعلق رکھتے ہیں تو اُن کا یہ کہنا درست نہ رہا کہ اس سے صرف وہ وحی مراد ہے جو انبیاء کے واسطے سے اُمتوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہوتی ہے۔

پھر لکھتے ہیں وَمِنَ الْوَحْیِ الْمُخْتَصِّ بِالنَّبِیِّ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وحی کی ایک قسم وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ مختص تھی جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (الانعام ع۱۳) تیری طرف جو وحی نازل کی گئی ہے اس کی اتباع کر یا قرآن کریم میں آتا ہے اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (الانعام ع۵) میں تو اُسی بات کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعہ نازل کی جاتی ہے۔ مگر یہ معنے بھی صحیح نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ سب کے لئے تھی صرف آپ کی ذات کیساتھ مخصوص نہیں تھی وَقَوْلُهٗ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ فَوَحْیُهٗ اِلٰی مُوْسٰی بِوَاسِطَةِ جِبْرَئِیْلَ وَوَحْیُهٗ تَعَالٰی اِلٰی هَارُوْنَ

بِوَسَاطَۃِ جِبْرِیْلَ وَمُوْسٰی۔ اور یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ اور اُس کے بھائی ہارونؑ کی طرف وحی کی فَوَحْیُہٗ اِلٰی مُوْسٰی بِوَسَاطَۃِ جِبْرِیْلَ۔ پس موسیٰؑ کی طرف اللہ تعالیٰ کی جو وحی نازل ہوتی تھی وہ جبریل کی وساطت سے نازل ہوتی تھی وَوَحْیُہٗ اِلٰی ھَارُوْنَ بِوَسَاطَۃِ جِبْرِیْلَ وَمُوْسٰی لیکن ہارونؑ کی طرف اللہ تعالیٰ کی جو وحی ہوتی تھی وہ جبریل اور موسیٰؑ دونوں کی وساطت سے ہوتی تھی یعنی کبھی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی کو ہارونؑ کی وحی بھی قرار دے دیا جاتا تھا اور کچھ وحی حضرت ہارونؑ پر براہ راست بھی نازل ہوتی تھی۔ یہاں مفردات والوں نے ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے جو پیغامیوں کے ردّ میں بہت کام آسکتا ہے۔

حضرت ہارونؑ کو کس طرح وحی ہوتی تھی

پیغامیوں کے ساتھ ایک نزاع کا فیصلہ

پیغامیوں کی طرف سے ہمیشہ یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ نبی کسی کا متبع نہیں ہوتا۔ میں نے اس کے جواب میں اُنہیں بارہا کہا ہے کہ تمہاری یہ بات بالکل غلط ہے تم حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف دیکھو وہ نبی تھے مگر باوجود نبی ہونے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے۔ پس تمہاری یہ بات درست نہیں کہ نبی کسی کا تابع نہیں ہوسکتا اگر درست ہوتی تو حضرت ہارونؑ موسیٰؑ کے کس طرح متبع ہوجاتے۔ ہارونؑ تو موسےٰؑ کے اِس قدر متبع تھے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر گئے اور اُن کی قوم شرک میں مبتلا ہوگئی تو وہ سخت ناراضگی اور غضب کی حالت میں واپس آئے اور حضرت ہارون علیہ السلام سے نہایت سختی کے ساتھ کہا کہ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ (طٰہٰ ع ۴) کیا میرے صریح حکم کی اس طرح خلاف ورزی کی جاتی ہے؟ اگر وہ متبع نہ ہوتے تو حضرت موسیٰؑ اُن پر کس طرح خفا ہوسکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خفا ہونا اور اُن سے جواب طلب کرنا بتاتا ہے کہ وہ موسیٰؑ کے تابع تھے۔ پس یہ صحیح نہیں کہ نبی کسی کا تابع نہیں ہوسکتا۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ہارونؑ موسےٰؑ کے تابع نہیں تھے تو دونوں پر وحی کس طرح نازل ہوتی تھی؟ اس کے جواب میں غیر مبایعین یہ کہا کرتے ہیں کہ دونوں پر برابر وحی نازل ہوتی تھی۔ جو وحی موسیٰؑ پر ہوتی تھی وہی وحی ہارونؑ پر بھی نازل کردی جاتی تھی۔ تورات بھی دونوں پر اُترتی تھی۔ اِدھر موسےٰؑ پر تورات کا نزول ہوتا تھا اور اُدھر ہارونؑ پر تورات کا نزول ہوتا تھا۔ یہ بات اتنی احمقانہ ہے کہ اسے سُن کر حیرت آتی ہے کہ ایک ہی وقت ایک ہی کلام دو مختلف انسانوں پر بغیر کسی حکمت کے نازل کیا جاتا ہو۔ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو شبہ تھا کہ ایسا نہ ہو میں کسی ایک کی طرف وحی نازل کروں تو وہ دوسرے کو جھوٹ بول کر کچھ اَور بتا دے۔ اِس لئے خدا تعالیٰ کو یہ احتیاط کرنی پڑی کہ اِدھر موسیٰؑ پر وہ کلام نازل کرتا اور اُدھر ہارونؑ پر نازل کرتا تاکہ اگر موسیٰ جھوٹ بولے تو ہارون پکڑ لے اور ہارون جھوٹ بولے تو موسیٰ پکڑ لے۔ مگر مفردات والوں نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں جو یہ آیت آتی ہے کہ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْہِ ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی ہارون کی طرف وحی کی اِس سے کیا مراد ہے؟ آیا یہ مراد ہے کہ موسیٰ کو الگ وحی کی اور ہارون کو الگ۔ تورات اِدھر موسیٰ پر نازل کی جاتی تھی اور اُدھر ہارون پر۔ یا اس سے کچھ اَور مراد ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ کی طرف جو وحی ہوتی تھی وہ جبریل کے واسطہ سے تھی۔ یعنی موسیٰؑ پر جبریل کی حفاظت میں وحی نازل ہوتی تھی۔ اِس کے بعد موسیٰؑ وہ بات ہارونؑ تک پہنچا دیتے تھے اور موسیٰ کی معرفت اِس الہام کا ہارون تک پہنچ جانا ہی ہارون کی وحی تھا۔ مگر چونکہ ہارون خود بھی نبی تھے اس لئے کبھی کبھی انہیں اپنے طور پر بھی الہام ہوجاتا تھا۔ مگر وہ الہامات جو شریعت اور احکام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے وہ براہِ راست موسیٰ کو ہی ہوتے تھے اور پھر موسیٰ علیہ السلام اُن احکام کو حضرت ہارون تک پہنچاتے تھے۔ گویا ہارون موسیٰ کو یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے تھے کہ مجھے آج فلاں وحی ہوئی ہے آپ اس کے مطابق عمل کریں ہاں موسیٰ یہ حق رکھتے تھے کہ ہارون کو اللہ تعالیٰ کی وحی سے باخبر کریں اور اُنہیں اس کے مطابق عمل کرنے کی تاکید کریں۔ البتہ ہارون چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اس لئے بعض دفعہ اُن پر بھی وحی نازل ہوجاتی تھی مگر ایسی ہی جس کا شریعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ آخر وحی کی صرف اتنی ہی غرض تو نہیں ہوتی

کہ اُس میں شریعت کے احکام بیان کئے جائیں بلکہ وحی اِس لئے بھی نازل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار کرنا چاہتا ہے، اُس کے ایمان کو ترقی دینا چاہتا ہے، اُس کے عرفان اور یقین میں زیادتی پیدا کرنا چاہتا ہے پس ہارون چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اس لئے بعض دفعہ اُن پر بھی اس قسم کی وحی نازل ہو جاتی تھی جو غیر تشریعی ہوتی اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اُن سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار کرتا۔ مگر بہرحال شرعی وحی صرف موسیٰؑ پر نازل ہوتی تھی اور حضرت موسیٰؑ وہ وحی ہارونؑ کو سُنا دیتے۔

غرض مفردات والوں نے اس آیت کی تشریح میں تابع اور متبوع کا فرق بیان کر دیا ہے اور وہ مسئلہ جس میں ہمارا پیغامیوں سے دیر سے نزاع چلا آ رہا ہے اُس کا نہایت عمدگی کے ساتھ فیصلہ کر دیا ہے۔

وَقَوْلُهٗ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَذٰلِكَ وَحْیٌ اِلَیْهِمْ بِوَسَاطَةِ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ۔ اور یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ تیرا رب ملائکہ کی طرف وحی کرتا ہے اور اُن سے کہتا ہے کہ اِنِّیْ مَعَكُمْ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ وحی اُن کی طرف لوح و قلم کے واسطے ہوتی ہے۔ اِس کے بعد کہتے ہیں فِیْمَا قِیْلَ یعنی بعض لوگوں کا یہی خیال ہے مجھے تو اس عقیدہ کے ساتھ اتفاق نہیں مگر پُرانے مفسرین کا یہی خیال تھا کہ خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو حکم دیا اور اُس نے لوح پر وہ سب کچھ لکھ دیا جو دنیا میں ہونے والا تھا۔ اب ملائکہ جو کچھ پہنچاتے ہیں وہ اسی لوح سے ماخوذ ہوتا ہے گویا اُن کے نزدیک وحی کا پہلا نزول قلم پر ہوا۔ قلم سے لوح پر لکھا گیا اور پھر لوح سے ملائکہ اخذ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق اُس کے احکام اور پیغام دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عقیدہ ایسا ہے جس کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث سے تردید ہوتی ہے۔ مثلاً حدیثوں میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو سب سے پہلے جبرئیل کو کہتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں اس کے بعد جبرئیل اور فرشتوں کو اطلاع دیتا ہے وہ فرشتے اور فرشتوں کو خبر دیتے ہیں یہاں تک کہ ہوتے ہوتے یہ بات تمام فرشتوں میں پھیل جاتی ہے اور اُس شخص کی لوگوں میں مقبولیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر لوح پر ہی سب کچھ لکھا ہوا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کو جبرئیل سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی وہ خود بخود لوح سے تمام حالات معلوم کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ پُرانے مفسرین کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنی وحی قلم پر نازل کی قلم سے لوح پر لکھا گیا اور لوح سے فرشتے پڑھ پڑھ کر بندوں پر وحی نازل کرتے ہیں۔

وَقَوْلُهٗ وَاَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا فَاِنْ كَانَ الْوَحْیُ اِلٰۤى اَهْلِ السَّمَآءِ فَقَطْ فَالْمُوْحٰۤى اِلَیْهِمْ مَحْذُوْفٌ ذِكْرُهٗ كَاَنَّهٗ قَالَ اَوْحٰۤى اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ لِاَنَّ اَهْلَ السَّمَآءِ هُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَیَكُوْنُ كَقَوْلِهٖ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ وَاِنْ كَانَ الْمُوْحٰۤى اِلَیْهِ هِیَ السَّمٰوٰتُ فَذٰلِكَ تَسْخِیْرٌ عِنْدَ مَنْ یَّجْعَلُ السَّمَآءَ غَیْرَ حَیٍّ وَنُطْقٌ عِنْدَ مَنْ جَعَلَهٗ حَیًّا۔ اور یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا اللہ تعالیٰ نے ہر سماء میں وحی کے ذریعہ اپنا حکم بھیج دیا۔ اگر اس آیت میں سماء سے اہل سماء مراد لئے جائیں تو چونکہ اہل سماء ملائکہ ہوتے ہیں اس لئے عربی زبان میں اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا کا ترجمہ یوں ہوگا کہ اَوْحٰۤى اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اُمُوْرًا مُتَعَلِّقًا بِالسَّمَآءِ۔ اُس نے ملائکہ کی طرف اُن اُمور کے بارہ میں وحی کی جن کا آسمان کے ساتھ تعلق تھا۔ اس مفہوم کی صورت میں قرآن کریم کی یہ آیت بھی اس کے ہم معنی سمجھی جائے گی کہ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ لیکن اگر کوئی شخص موحیٰ الیہ سے مراد سماوات لے تو اُن کے متعلق بھی یہ کلام ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں حذفِ اضافت کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ سماوات کو موحیٰ الیہ تسلیم کرنے کی صورت میں اس کے دو معنے ہوں گے۔ وہ جن کے نزدیک سماوات کوئی زندہ وجود نہیں۔ وہ تو اس سے تسخیر مراد لیتے ہیں یعنی

اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا کا مطلب اُن کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کاموں کے متعلق سماوات کو مسخر کر دیا ہے اور اسی تسخیر کو وحی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو آسمانوں کو زندہ وجود قرار دیتے ہیں اُن کے نزدیک اس کے معنے تسخیر کے نہیں بلکہ یہ مراد ہوں گے کہ خدا تعالیٰ نے اُن سے کلام کیا۔ وَقَوْلُهٗ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا فَقَرِيْبٌ مِّنَ الْاَوَّلِ اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے زمین کے متعلق فرمایا ہے کہ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا اس میں وحی کے معنے تسخیر کے ہی کرنے پڑیں گے کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ زمین بولتی نہیں اور نہ اُس میں عقل پائی جاتی ہے پس چونکہ زمین کی طرف بولنا منسوب کر دیا گیا ہے حالانکہ وہ بولتی نہیں اور اُس کی طرف عقل منسوب کر دی گئی ہے حالانکہ اُس میں عقل نہیں۔ اس لئے یہ حالات ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم یہاں مجازی معنے مراد لیں اور سمجھ لیں کہ اس جگہ وحی سے وحیٔ حقیقی یا وحیٔ لفظی مراد نہیں بلکہ اَوْحٰى کا لفظ زمین کو مسخر کرنے کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ (مفردات)

وحی کے معنے عربی زبان میں تو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اب مَیں اپنے معنے بیان کرتا ہوں۔ قرآن کریم اور احادیث کے مطالعہ نیز صاحب تجربہ لوگوں کی شہادت سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وحی کئی اقسام کی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ امر مدنظر رکھنا چاہیئے کہ اس بارہ میں ایک نصِ قرآنی موجود ہے جو یہ ہے

وحی کی اقسام کے متعلق نص قرآنی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الشوریٰ ع۵) اس آیت کے میرے نزدیک مفسرین نے صحیح معنے نہیں سمجھے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کے غلط معنے لے لئے ہیں۔ انہوں نے وحی کے معنے منام اور تسخیر وغیرہ کے کر دئے ہیں اور ورای حجاب کے یہ معنے کر لئے ہیں کہ جب خدا تو نظر نہ آتا ہو جس کی مثال میں وہ موسیٰؑ کا کلام پیش کرتے ہیں اور يُرْسِلَ رَسُوْلًا کے معنے یہ کئے ہیں کہ جب جبرئیل کلام کے ساتھ آئے اور وہ نظر بھی آتے۔ آخری صورت میں ہمارا اور اُن کا اس فرق سے اتفاق ہے کہ ہم جبرئیل کے ذریعہ سے کلام آنے کو تو صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہر ایسی وحی کے نزول کے وقت جبرئیل نظر بھی آتا ہے۔ چند مثالوں پر دھوکا کھا کر یہ غلط قیاس کر لیا گیا ہے۔ پہلی اور دوسری صورت پر ہمیں کُلّی طور پر اعتراض ہے۔ پہلی صورت پر تو یہ اعتراض ہے کہ قرآن کریم میں پینسٹھ دفعہ وحی کا لفظ اِلیٰ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے مگر کہیں بھی قرآن کریم میں وحی کا لفظ محض تصویری زبان کے معنوں میں نہیں آیا۔ بے شک بعض جگہ مجازی معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسے ایک جگہ وحی کے معنے تسخیر کے آگئے ہیں لیکن ان مجازی معنوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جہاں بھی وحی کا لفظ آیا ہے ایسے ہی اظہار کے متعلق آیا ہے جس کے ساتھ کلام بھی تھا۔ اب کیا یہ عجیب بات نہیں ہوگی کہ ہم قرآن کریم کی تفسیر کریں اور وحی پر بحث کرتے ہوئے پینسٹھ جگہ جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اُن معنوں کو تو نہ لیں اور وحی کے معنے خالص تصویری زبان کے کر لیں۔ اِن پینسٹھ مقامات کے علاوہ پانچ اور بھی جگہیں ہیں جہاں وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور وہاں بھی بمعنے کلام ہی استعمال ہوا ہے صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں وحی کے معنے تسخیر کے علاوہ اَور کچھ نہیں کئے جا سکتے اور وہ جگہ وہی ہے جہاں شہد کی مکھی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (النحل ع۹) یعنی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ اِس آیت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہ اس میں وحی کا لفظ مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے باقی سارے قرآن میں ہر جگہ وحی کا لفظ ایسے ہی اظہار کے متعلق استعمال ہوا ہے جس کے ساتھ کلام بھی ہو۔ اور جب ہر جگہ قرآن کریم یہی معنے مراد لیتا ہے تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ جن معنوں میں قرآن کریم اس لفظ کا استعمال کرتا ہے اُن معنوں کو تو ہم نہ لیں اور اس کے اَور معنے کرنے شروع کر دیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ جب کوئی مجبوری پیش آئے تو ہم اس کے معنوں میں مجاز اور استعارہ مراد لے لیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمیں کوئی مجبوری بھی پیش نہ آئے اور ہم قرآن کریم کے استعمال کو کُلّی طور پر نظر انداز کر کے اُن معنوں کو لے لیں جو قرآن کریم نے کسی ایک جگہ بھی نہیں کئے۔

مفسرین کی یہ تشریح کہ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ سے مراد موسیٰ کا کلام ہے یہ بھی کسی رنگ میں قابل قبول نہیں سمجھی جاسکتی۔ کیونکہ اِلَّا وَحْیًا کے بعد اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کے معنے اگر ہم موسیٰؑ کے کلام کے کریں تو اس کے معنے یہ بنیں گے کہ موسیٰؑ پر وحی نہیں ہوئی حالانکہ موسیٰؑ کا کلام رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے سب سے مقدم وحی ہے جسے کسی صورت میں بھی دائرہ وحی سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ خود یہ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَ بَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ۔ وحی منقطع ہوگئی ہے صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں جس سے مراد وہ سچے رویا ہیں جو مومن کو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ حدیث بھی بتاتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وحی کو اوّل درجہ دیا ہے اور منام کو دوسرا درجہ۔ اگر جیسا کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے منام کا نام ہی وحی ہوتا تو پھر بجائے یہ کہنے کے کہ اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَ بَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اِنْقَطَعَ کَلَامُ وَرَآئِ الْحِجَابِ وَ بَقِیَ الْوَحْیُ۔ وراء حجاب اللہ تعالےٰ جو کلام کیا کرتا تھا وہ منقطع ہوچکا ہے اب صرف وحی باقی رہ گئی ہے جس سے مراد خوابیں وغیرہ ہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ کہنے کے بعد بَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ فرمایا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی وحی کے معنے محض منام کے نہیں ہیں۔ پس اُن کے معنے بالبداہت باطل اور قرآنی محاورہ کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے معنے جہاں اشارہ رمز اور تحریر کے ہیں وہاں ایسے کلام کے بھی ہیں جو دوسروں سے مخفی رکھ کر کیا جائے چنانچہ لغت سے یہ امر ثابت کیا جاچکا ہے کہ وحی کے معنے اشارہ رمز اور تحریر کے بھی ہیں اور ایسے کلام کے بھی ہیں جو دوسروں سے مخفی رکھ کر کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں وحی کا لفظ زیادہ تر مؤخر الذکر معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے پہلے معنے بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً منام کے معنوں میں تو قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی وحی کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ رمز اشارہ یا تحریر کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے مگر صرف ایک جگہ یعنی حضرت زکریاؑ والی مثال میں رمز کے معنوں میں یا مکھی والی مثال میں تسخیر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے باقی کسی جگہ بھی اشارہ رمز تحریر یا تسخیر وغیرہ کے معنے نہیں آتے حالانکہ یہ لفظ قرآن کریم میں ستر جگہ استعمال ہوا ہے۔

مفسرین کی وراء حجاب کلام کرنے کی غلط تشریح

خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کلام کرنا نام وحی رکھنا اور اس کی وجہ

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے کلام کا نام وحی اس لئے رکھا ہے کہ یہ کلام دوسروں سے مخفی رکھ کر کیا جاتا ہے۔ چونکہ وحی ایک ایسی چیز ہے جو عام لوگوں کے تجربہ میں نہیں آتی وہ صرف اتنی بات جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص بات کرتا ہے تو اُسے سب لوگ سُن سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ زید سے بات کی جائے تو زید تو اُس کو سُن لے اور بکر جو پاس ہی بیٹھا ہوا ہے وہ نہ سُنے۔ اِس لئے جب وہ سنتے ہیں کہ دنیا میں ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اگر خدا اُس سے کلام کرتا تو کیا ہم اُس کلام کو نہ سُنتے؟ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُس سے کلام کرتا اور ہم اس کلام کو سُننے سے محروم رہتے۔ جب دنیا میں زید سے کوئی شخص گفتگو کرتا ہے تو بکر بھی سنتا ہے، خالد بھی سنتا ہے، عمرو بھی سنتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ صرف زید سُنے۔ اسی طرح اگر موسیٰؑ سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا تھا یا عیسےٰؑ سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا تھا یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا تھا تو ضروری تھا کہ ہمارے کانوں میں بھی اُس کی آواز آتی۔ چونکہ یہ اعتراض عام طور پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا کرتا ہے اس لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے کلام کا نام وحی رکھ دیا یہ بتلانے کے لئے کہ ایک کلام ایسا ہوتا ہے جو تم دوسروں سے چھپا کر کرتے ہو۔ جس سے تم بات کرنا چاہتے ہو وہ تو سنتا ہے مگر جس سے تم بات کو مخفی رکھنا چاہتے ہو وہ اس کو نہیں سُنتا۔ مثلاً بعض دفعہ انسان دوسرے کے کان میں ایک بات کہہ دیتا ہے اب وہ شخص تو تمہاری بات سُن لیتا ہے جس کے کان میں تم نے بات کہی ہوتی ہے مگر دوسرے لوگ اس کے سننے سے محروم رہتے ہیں۔ جب دنیا میں روزانہ تم ایسا

کہتے ہو اور تمہاری آنکھوں کے سامنے اس قسم کے واقعات آتے رہتے ہیں تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا کلام بھی اسی رنگ میں ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارا کلام اپنے اندر بہت بڑا شرف رکھتا ہے اور ہمارا کلام مخصوص ہوتا ہے ہر شخص کے روحانی قرب اور اُس کے درجہ کے لحاظ سے۔ اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے کلام کے سُننے میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جن کو ہم اس شرف کا مستحق نہیں سمجھتے یہی حکمت ہے جس کی بناء پر ہم نے اپنی قدرت سے ایک ایسا ذریعہ نکالا ہے جس کے نتیجہ میں ہم بات بھی کر جاتے ہیں اور کوئی غیر شخص ہماری بات کو سُن بھی نہیں سکتا۔ پس چونکہ وحی میں یہ حقیقت مدنظر ہوتی ہے کہ مخاطب سُنے اور غیر مخاطب نہ سُنے اور چونکر ساتھ ہی اس امر پر زور دینا بھی مدنظر ہوتا ہے کہ ایسا کلام واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے نفسانی خیالات کا نتیجہ نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا نام وحی رکھدیا یہ بتانے کے لئے کہ تم اس کلام کو بے حقیقت نہ سمجھو یہ ویسا ہی یقینی اور قطعی کلام ہوتا ہے جیسے تم آپس میں ملتے ہو تو بعض دفعہ مخفی طور پر دوسرے کے کان میں بات کہہ دیتے ہو سبتاؤ جس کے کان میں کوئی بات کہی جائے کیا اُسے بات کے سُننے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ نہ اُسے شبہ ہوتا ہے نہ بات کرنے والے کو کوئی شبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو مخفی طور پر بندے کے کان یا اُس کے دل یا اُس کی زبان وغیرہ پر نازل کر دیتا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ میں اس راز میں دوسروں کو شریک کرنا نہیں چاہتا یا اس کے واسطہ سے یہ کلام دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ اس کی قبولیت اور عظمت دنیا میں قائم ہو۔ ورنہ وہ ویسا ہی یقینی اور قطعی کلام ہوتا ہے جیسے دو دوست جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو اُن کا ایک دوسرے سے کلام کرنا قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ غرض وحی اس کلام کا نام رکھ کر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جو اپنے بندوں سے بولتا ہے اُس میں اور انسانی کلام میں کوئی فرق نہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آواز کو اس طرح پیدا کرتا ہے کہ صرف وہی اُسے سُنے جسے سُنانا مقصود ہے ورنہ وہ ویسا ہی یقینی کلام ہے جیسا کہ دو بولنے والوں میں استعمال ہوتا ہے۔

باقی رہے ایسے خواب جو تصویری زبان میں ہوں وہ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کلام ہوتا ہے یعنی تعبیر طلب۔ دکھایا کچھ اور جاتا ہے اور مضمون اُس کے پیچھے چُھپا ہُوا ہوتا ہے۔ وراء حجاب کے معنے بھی یہی ہیں کہ حقیقت ایک پردہ کے پیچھے مستور ہوتی ہے تم اُس پردہ کو اٹھاؤ تو وہ تمہیں نظر آجائے گی بغیر پردہ اٹھانے کے تم اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ گویا وحی کے معنے تو لفظی کلام کے ہیں جس کی غرض اس کلام کو غیروں سے چُھپانا ہوتا ہے اور مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کے معنے یہ ہیں کہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اس طرح کلام کرتا ہے کہ حقیقت کو خود اس شخص کے لئے بھی پردہ کے پیچھے مخفی کر دیتا ہے جس پر وہ نازل ہو رہا ہوتا ہے۔ جب تک اُس پردہ کو نہ اٹھایا جائے اُسوقت تک حقیقت کا انسان کو پورے طور پر علم نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے فرعون نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ سات پتلی گائیں سات موٹی گائیں کھا رہی ہیں۔ اب خواہ تم سارا دن کہتے رہو کہ پتلی گائیں موٹی گائیں کھا رہی ہیں۔ پتلی گائیں موٹی گائیں کھا رہی ہیں کوئی دوسرا شخص کچھ بھی نہیں سمجھے گا کہ تمہارا اس کلام سے منشاء کیا ہے۔ سب تمہاری بات کو سُن کر ہنسیں گے کہ پاگل ہو گیا ہے۔ لیکن پردہ اُٹھاؤ تو اس کے پیچھے یہ حقیقت مخفی ہوگی کہ قحط کے سات سال خوشحالی کے سات سالوں کے جمع کئے ہوئے غلّوں کو کھا جائیں گے۔ پس جس چیز کو متعدین نے موسیٰؑ کے کلام کی مثال قرار دیا ہے وہ درست نہیں موسیٰؑ کا کلام وحی میں ہی شامل ہے اور مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ ہم کلام مخفی بھی کرتے ہیں یعنی وہ شخص تو ہماری بات سُن لیتا ہے جس کو سُنانا ہمارے مدنظر ہوتا ہے لیکن دوسرا شخص ہماری بات کو نہیں سُن سکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کلام مشتبہ ہوتا ہے۔ وہ کلام مشتبہ نہیں بلکہ ویسا ہی یقینی ہوتا ہے جیسے زید اور بکر آپس میں باتیں کرتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کی گفتگو سننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا مگر چونکہ ہم دوسروں کو نہیں سُنانا چاہتے اس لئے جس طرح انسان

دوسرے کے کان میں بات کہہ دیتا ہے ہم بھی ایسے رنگ میں بات کرتے ہیں کہ صرف وہی شخص سنتا ہے جس کو ہم سنانا چاہتے ہیں دوسرا شخص ہماری بات کو نہیں سن سکتا۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ کسی کے کان میں بات کرنے والا تو طبعی قوانین سے مجبور ہوتا ہے اور وہ ڈرتا ہے کہ اگر میں نے زیادہ زور سے بات کی تو دوسرے لوگ بھی سن لیں گے اس لئے وہ آہستگی سے بات کرتا ہے مگر ہم بلند آواز سے بات کرتے ہیں اور پھر بھی صرف وہی شخص ہماری بات سن سکتا ہے جس پر ہم وحی نازل کرنا چاہتے ہیں دوسرے لوگ ہماری آواز کو نہیں سن سکتے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہم رمز سے بات کرتے ہیں یعنی جب تک انسان حجاب نہ اُٹھائے اُس پر حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔ اس کے بعد اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ایک وحی ایسی ہوتی ہے جو بالواسطہ آتی ہے یعنی ہم اپنے بندے سے بے شک کلام کرتے ہیں مگر براہ راست نہیں بلکہ ہم مَلک رسول سے بات کرتے ہیں اور مَلک رسول آگے بشر رسول سے کرتا ہے مگر بہرحال یہ بھی وحی ہی ہوتی ہے۔ مَلک رسول کے ذریعہ کوئی بات پہنچانے سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شق وحی کے دائرہ سے خارج ہے اِسی لئے يُرْسِلَ رَسُوْلًا کے بعد فَيُوْحِيَ کا لفظ دوہرایا گیا ہے یہ بتلانے کے لئے کہ یہ شق بھی وحی الٰہی میں ہی شامل ہے۔ اِس کے بعد بِاِذْنِہٖ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ مَلک رسول اپنے پاس سے کوئی بات نہیں کہتا ہمارے اذن اور منشاء سے وہ بات پہنچاتا ہے گویا ہے تو وہ بھی کلام مگر اُس کلام کے پہنچانے میں ایک واسطہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس طرح آیت کا لفظ لفظ بالکل اپنے مقام پر کھڑا ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا الگ چیز ہے اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ الگ چیز ہے اور يُرْسِلَ رَسُوْلًا الگ چیز ہے۔ یہ تین قسمیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں اور تینوں میں اَوْ کا لفظ رکھ کر بتایا ہے کہ ان تینوں میں مغایرت پائی جاتی ہے۔ اِلَّا وَحْيًا سے مراد ہے وَحْيًا بِغَيْرِ الْوَاسِطَةِ۔ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ سے مراد ہے فِي الْمَنَامِ دی ہے کہ میرا لڑکا بہت بڑا مقام حاصل کرنے والا ہے یا وہ

بِالْوَاسِطَةِ یعنی اللہ تعالیٰ مَلک رسول کو وحی کرتا ہے اور وہ بشر رسول کو کرتا ہے۔ چونکہ وحی کی یہ قسم بالواسطہ ہے اور شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ دائرۂ وحی سے خارج نہ ہو اس لئے ضروری تھا کہ اُس کے ساتھ وضاحت کر دی جاتی کہ یہ قسم بھی وحی الٰہی میں ہی شامل ہے چنانچہ اسی لئے فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ کہہ کر وحی کا لفظ اللہ تعالیٰ نے دُہرا دیا اور بتا دیا کہ یہ شق بھی وحی الٰہی میں شامل ہے۔

غرض اِس آیت کے ماتحت وحی کی تین اقسام ہو گئیں۔
(۱) حقیقی بلا واسطہ وحی۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام بندہ پر بغیر کسی واسطہ کے نازل ہو (۲) دوسری جسے قرآن نے تیسرے درجہ پہ رکھا ہے مگر میں تقریب تفہیم کے لئے اِسے پہلے بیان کر دیتا ہوں وہ حقیقی بالواسطہ وحی ہے جس میں خدا تعالیٰ اپنا کلام فرشتے پر نازل کرتا ہے اور فرشتہ بندے تک پہنچاتا ہے (۳) تیسری تابع وحی ہے جس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے الفاظ نازل نہیں ہوتے بلکہ مضمون کو تعبیر طلب امثال میں یا بے تعبیر طلب نظارہ میں دکھایا جاتا ہے اور اُس کو لفظوں میں تبدیل کرنا بندہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

وحی کی تین اقسام

چونکہ حقیقت حجاب کے پیچھے مخفی ہوتی ہے اس لئے انسان جب تعبیر طلب تمثیل یا نظارہ دیکھتا ہے تو وہ اپنے قیاس سے کام لے کر حقیقت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اور کہتا ہے مجھے خدا نے یُوں بتایا ہے۔ فرض کرو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ تیرا لڑکا کامل ہو جائے گا تو یہ ضروری نہیں کہ خدا نے اُسے یہ خبر ان الفاظ میں ہی دی ہو کہ "تیرا لڑکا کامل ہو جائے گا" بلکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ نظارہ دکھایا ہو کہ وہ اپنے بچے کو ذبح کر رہا ہے۔ چونکہ یہ نظارہ مشابہ ہے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واقعہ سے اِس لئے گو اُسے نظارہ یہ دکھایا گیا ہو کہ وہ اپنے بچے کو ذبح کر رہا ہے مگر وہ اسمٰعیلی واقعہ پر قیاس کر کے اس وراء حجاب کلام کو تعبیری زبان میں بیان کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا لڑکا بہت بڑا مقام حاصل کرنے والا ہے یا وہ

بڑے رتبہ پر پہنچ جائے گا - اب جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے وُہ
اُس کے اپنے ہیں اللہ تعالےٰ نے اُسے ان الفاظ میں خبر نہیں
دی کہ" تیرا لڑکا کامل ہو جائے گا" یا "بڑے رتبہ پر پہنچ جائیگا"
اُس نے صرف یہ نظارہ دکھایا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ذبح کر رہا ہے
مگر یہ اُس کی تعبیر کرتا اور لوگوں میں اُس کا اعلان کر دیتا ہے۔
اب اگر اُس کی تعبیر سو فی صدی درست ہو تب بھی وہ قسم کھا کر یہ
نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ" تیرا بچہ ایک
کامل شخص ہو گا"۔ وہ قسم کھا کر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ خدا نے مجھے
اِس اِس رنگ میں نظارہ دکھایا ہے مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ
مجھے اللہ تعالےٰ نے یہ پانچ الفاظ بتائے ہیں۔ یہ وہی شخص کہیگا
جس پر لفظاً الہام نازل ہُوا ہو وہ بے شک قسم کھا کر کہہ سکتا ہو
کہ مجھے خدا نے کہا ہے" تیرا"۔ مجھے خدا نے کہا ہے" بچہ"۔ مجھے
خدا نے کہا ہے" بڑا"۔ مجھے خدا نے کہا ہے" آدمی"۔ مجھے خدا نے
کہا ہے" ہو جائیگا"۔ مگر ایسا شخص جس نے صرف نظارہ دیکھا ہو
یہ تو قسم کھا کر کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ میں مفہوم بیان کر رہا ہوں
خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے مگر الفاظ کے متعلق قسم نہیں کھا سکتا۔
چونکہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا مافی الضمیر لفظوں
میں ہی بتا سکتا ہے خواہ بول کر خواہ لکھ کر اس لئے وہ وحی زیادہ
شاندار سمجھی جاتی ہے جو الفاظ میں آجائے۔ خواہ لکھے ہوئے الفاظ
اُس کے سامنے آجائیں۔ خواہ اُسے آواز سُنائی دے جس کے
معیّن الفاظ ہوں۔ خواہ الفاظ اُس کی زبان پر یا دل پر جاری
کر دیئے جائیں (دل میں آئیں نہیں بلکہ جاری کئے جائیں دونوں
میں زمین آسمان کا فرق ہے) اور وہ ایک ایک لفظ کے متعلق قسم
کھا کر کہہ سکتا ہو کہ وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں
اسی طرح خواہ یہ کلام بلا واسطہ نازل ہو یا بالواسطہ کسی مَلک رسول
کے ذریعہ سے نازل ہو جب بھی کوئی الٰہی کلام لفظوں میں موجود ہو
اور انسان دوسروں کو اُس کلام کے معیّن الفاظ سُنا کر کہہ سکتا
ہو کہ یہ الفاظ اللہ تعالےٰ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوئے ہیں تو وہ
وحی زیادہ اعلیٰ اور زیادہ شاندار سمجھی جاتی ہے اور جو تعبیری زبان
میں وحی نازل ہو یا تصویری زبان میں نازل ہو چونکہ اُس کے

بیان کرنے میں انسان کو اپنے الفاظ اختیار کرنے پڑتے ہیں اور
اِس میں غلطی کا زیادہ احتمال ہوتا ہے اس لئے اسے پہلی قسم کی دونوں
وحیوں سے ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ دراصل جس طرح لُغت والے کہتے
ہیں کہ وضع لغت کے لحاظ سے فلاں لفظ کے یہ معنی ہیں اِسی طرح ہم
کہہ سکتے ہیں کہ وضع وحی کے لحاظ سے وحی کے مقدّم معنے اُس وحی
کے ہیں جو الفاظ میں نازل ہو۔ پھر استعارہ اور مجاز کے طور پر دوسری
قسموں کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر بہر حال یہ
دونوں قسم کی وحی پہلی وحی سے ادنیٰ سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض
لوگ اِسے وحی کے نام سے موسوم ہی نہیں کرتے۔ چنانچہ اُمّتِ محمّدیہ
میں جو صوفیاء گذرے ہیں اُن کا یہ طریق رہا ہے کہ وہ صرف وحیٔ لفظی
کو وحی کہتے تھے باقی قسموں کو وحی قرار نہیں دیتے تھے بلکہ خواب یا
کشف کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ وحی۔ کشف اور رؤیاء کا لفظ بار بار
اُن کی کتابوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہ محاورہ اتنی کثرت
سے استعمال ہونے لگا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے حقیقت کُھل
جانے کے باوجود ہم بھی اکثر اسی محاورہ کو استعمال کرتے ہیں بلکہ خود
میں نے بارہا اپنی تقریروں اور تحریروں میں وحی۔ کشف اور
رؤیاء کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ چونکہ وحی کا لفظ کثرت سے
لفظی کلام کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے صوفیاء نے اِس لفظ
کو صرف لفظی وحی کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ باقی قسمیں جو درحقیقت
وحی کی ہی مختلف شقیں ہوتی ہیں اُن کو وہ وحی قرار نہیں دیتے بلکہ
کشف یا رؤیا کہہ دیتے ہیں۔ پھر بعض لوگ تو اَور بھی اُونچے
چلے گئے ہیں وہ صرف نبی کی وحی کو وحی کہتے ہیں غیر نبی کی وحی کو وحی
نہیں بلکہ الہام قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اِس امتیاز کی بنیاد
اِس امر پر ہے کہ اُن میں سے ایک چیز شبہ سے بالا ہے اور دوسری
چیز اپنے اندر شبہ کا احتمال رکھتی ہے۔ نبی کی وحی چونکہ شبہ سے
بالا ہوتی ہے اِس لئے وُہ اُسے وحی کہتے ہیں لیکن غیر نبی کی وحی
چونکہ احتمالِ شبہ رکھتی ہے اِس لئے وہ اُسے وحی نہیں الہام کہتے
ہیں۔ الہام کے معنے گو عام طور پر در دل انداختن کے کئے جاتے
ہیں مگر مَیں نے خود صوفیاء کی کتابوں میں وہ لفظی وحی دیکھی ہے

جو اُن کی طرف نازل ہوئی۔ وہ کئی جگہ لکھتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسا کہا اور پھر اُس وحی کے معیّن الفاظ اُن کی کتابوں میں درج ہوتے ہیں مگر باوجود لفظوں میں وحی نازل ہونے کے وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم پر وحی نازل ہوئی ہے بلکہ وہ اس کا نام الہام رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِنَّ الْوَحْیَ مِنْ خَوَاصِّ الْاَنْبِیَاءِ الْمُرْسَلِیْنَ وَالْاِلْهَامُ مِنْ خَوَاصِّ الْوَلَایَةِ (وَالثَّانِیْ) اِنَّ الْوَحْیَ مَشْرُوْطٌ بِالتَّبْلِیْغِ۔ یعنی وحی کا نزول خاص نبیوں سے جو مرسل ہو تعلق رکھتا ہے اور الہام ولایت کی خصوصیات سے ہے۔ دوسرے وہ کہتے ہیں کہ وحی کا لفظ اُسی کلام کے ساتھ مخصوص ہے جسے اُنہی الفاظ میں لوگوں تک پہنچانے کا حکم ہو۔ اس تشریح کے مطابق اگر اُن پر لفظی کلام نازل ہو تو وہ اُسے الہام کہہ دیتے ہیں۔ اگر آنکھوں دیکھا نظارہ ہو تو وہ اُسے کشف کہہ دیتے ہیں۔ اور اگر حالتِ منام میں تصویری زبان میں کوئی نظارہ دکھایا جائے تو وہ اُسے رویاء کہہ دیتے ہیں۔ بہرحال اپنے مذاق کے مطابق اُنہوں نے اس کو ایک نئی شکل دے دی ہے۔ اُن کے نزدیک وحی کے معنے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا وہ قطعی اور یقینی کلام جو انبیاء پر نازل ہوتا ہے۔ اور الہام کے معنے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا کسی غیر نبی پر لفظی کلام کی صورت میں اپنا منشاء ظاہر کرنا۔ چونکہ اس شق کو نہ وہ رویاء میں شامل کر سکتے تھے نہ کشف میں کیونکہ اس کے ساتھ کوئی نظارہ نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ اس کو وحی بھی قرار نہیں دے سکتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک وحی صرف اُسی کلام کو کہا جا سکتا ہے جو انبیاء پر نازل ہو اِس لئے اُنہوں نے اِس کا ایک نیا نام یعنی الہام رکھ دیا تاکہ نبی اور غیر نبی پر نازل ہونے والے کلام میں ایک امتیاز قائم ہو جائے بہرحال چونکہ وراء حجاب کلام میں غلطی کا زیادہ احتمال ہوتا ہے اور اُس کے بیان کرنے میں انسان کو اپنے الفاظ اختیار کرنے پڑتے ہیں اِس لئے پہلی قسم کی دونوں وحیوں یعنی حقیقی بلاواسطہ وحی اور حقیقی بالواسطہ وحی سے ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں اسے وحی کے لفظ سے موسوم ہی نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں ہم نے خواب میں ایسا دیکھا ہے یا ہم نے کشف میں فلاں نظارہ دیکھا ہے۔ پھر خواب یا کشف کا نظارہ اس لئے بھی ادنیٰ سمجھا جاتا ہے کہ خواب یا کشف وحیٔ متلو میں نہیں آ سکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ وحی متلو وحی ہے اور تصویری زبان کی وحی متلو نہیں ہو سکتی۔ متلو وحی وہ ہوتی ہے جسے پڑھا جا سکے مگر خواب یا کشف کی صورت میں جب کوئی بات بتائی جائے تو وہ پڑھی نہیں جا سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ انسان ایک نظارہ دیکھ لے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اُس نظارہ کو وہ پڑھ سکے یا دوسروں کو پڑھا سکے وہ اُس نظارہ کی کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے مگر یہ نہیں کر سکتا کہ کشف یا خواب کو پڑھ کر سُنا دے۔ پڑھ کر وہی چیز سُنائی جا سکتی ہے جو کہ الفاظ کی شکل میں ہو نہ کہ نظارہ کی شکل میں۔ پس وہ وحی جو من وراء حجاب ہوتی ہے چونکہ اُس میں کشفی طور پر ایک نظارہ دکھایا جاتا ہے یا حالتِ منام میں کوئی بات تصویری یا تعبیری زبان میں بتائی جاتی ہے اور اُسے پڑھا نہیں جا سکتا اِس لئے لفظی وحی سے اُس کا مقام ادنیٰ سمجھا جاتا ہے اور یہی تمام صاحب تجربہ لوگوں کا قول ہے کہ وحی الٰہی میں سے اعلیٰ مقام وحیٔ لفظی کو حاصل ہے کیونکہ وہ پڑھی جاتی ہے۔ خواب چونکہ پڑھی نہیں جاتی یا کشف چونکہ پڑھا نہیں جاتا اِس لئے اُسے لفظی وحی کا جو وحیٔ متلو ہوتی ہے مقام حاصل نہیں ہو سکتا مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ رویاء میں دیکھا کہ گائیں ذبح کی گئی ہیں۔ اب ہم اس کو ویسی ہی قطعی اور یقینی وحی سمجھتے ہیں جیسے آپ پر لفظی وحی نازل ہوئی۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر کس طرح آ سکتا تھا۔ کیا گائیوں کی تصویریں قرآن کریم میں بنا دی جاتیں اور اس طرح بتایا جاتا کہ یہ نظارہ تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا؟ اور اگر تصویر بنا دی جاتی تو پھر بھی یہ سوال رہ جاتا کہ اس کو پڑھا کس طرح جائے؟ پس چونکہ اِس وحی کو پڑھا نہیں جا سکتا اِس لئے اِسے دوسری وحیوں سے ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اِن تصویری زبان کی وحی میں بھی بعض خاص فوائد ہوتے ہیں اِس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وحی کا کیا فائدہ ہے نبی پر ہمیشہ کلام ہی کیوں نازل نہیں ہوتا؟ کیوں اُس پر کشف یا رویاء میں بعض دفعہ حالات کا انکشاف کیا جاتا ہے؟

بعض لوگوں کا وحی و الہام میں غلط طور پر امتیاز کرنا

اس کا جواب یہ ہے کہ تصویری زبان کی وحی میں بھی بعض ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اس کی ضرورت سے استغناء ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک فائدہ تو اس وحی میں یہ ہے کہ گو کلام میں بھی اجمال کو مدنظر رکھا جا سکتا ہے مگر تصویری زبان میں تو بعض دفعہ ایسا اجمال ہوتا ہے جو کسی فقرہ میں بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لو کہ اگر رویاء یا کشف کی حالت میں کسی کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرا دی جائے اُس کے ماتھے پر شکن پڑے ہوئے ہوں اور دس بیس مختلف قسم کے جذبات اُس کے چہرہ سے عیاں ہو رہے ہوں تو یہ نظارہ ایک ساعت میں ہی سے دکھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر انہی جذبات کو الفاظ کی صورت میں ادا کیا جائے تو خواہ کیسے ہی مجمل الفاظ ہوں اور کس قدر اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہو پھر بھی دس پندرہ فقروں میں وہ مضمون ادا ہوگا اور ممکن ہے پھر بھی کوئی خامی رہ جائے۔ پس ایسے مواقع پر جب اجمال در اجمال صورت میں اللہ تعالیٰ کوئی بات بتانا چاہتا ہو اور الفاظ سے زیادہ بہتر اور مؤثر پیرایہ میں قلیل سے قلیل وقت میں کوئی بات اپنے بندہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہو تو اُس وقت اللہ تعالیٰ تصویری زبان میں وحی نازل کرتا ہے ایک نظارہ آنکھوں کے سامنے پھرا دیتا ہے اور اس طرح وہ باتیں جو دس بیس فقروں کی محتاج ہوتی ہیں آن کی آن میں انسان پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح تصویری زبان میں وحی نازل کرنیکے اور بھی کئی فوائد ہوتے ہیں مثلاً بعض دفعہ کسی مومن بندے کی استمالتِ قلب مدنظر ہوتی ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ کلام کی بجائے تصویری زبان اختیار کر لیتا ہے۔ فرض کرو اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان کرنا چاہتا ہے کہ گھبراؤ نہیں دین کو تقویت حاصل ہو جائیگی اور نبی کا ایک مُرید ایسا ہے جس کا نام عبدالقوی ہے تو اللہ تعالیٰ رویاء یا کشف کی حالت میں عبدالقوی اُس کو دکھا دے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ عبدالقوی کو دکھانے سے گو یہ مضمون بھی بیان ہو گیا کہ دین کو تقویت حاصل ہوگی مگر ساتھ ہی عبدالقوی کا دل بھی خوش ہو جائے گا کہ میں بھی اپنے نبی کی خواب میں آ گیا ہوں یا مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اگر کبھی ابوبکرؓ کو دیکھا یا

من وراء حجاب وحی کرنے میں بعض حکمتیں

عمرؓ کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کا منشاء محض ایک مضمون بیان کرنا نہیں تھا بلکہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کی استمالتِ قلب بھی مدنظر تھی۔ اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ خواب سُن کر خوش ہو جائیں کہ ہم بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خواب میں آ گئے ہیں۔ پس بعض دفعہ مضمون بیان کرنے کے علاوہ زائد طور پر کسی مومن کی دلجوئی اور استمالتِ قلب بھی مدنظر ہوتی ہے جو تصویری زبان میں وحی نازل کرنے سے پوری ہو جاتی ہے پس تصویری زبان میں وحی کا نزول بے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اُس کے کئی اغراض ہوتے ہوتے ہیں اور کئی فوائد ہوتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ زائد طور پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ بے شک وہ فوائد مقصود بالذات نہیں ہوتے صرف ضمنی ہوتے ہیں مگر بہرحال وہ ضمنی فوائد تصویری زبان کے ذریعہ ہی ظاہر ہو سکتے ہیں لفظی کلام کے ذریعہ ظاہر نہیں ہو سکتے۔ انہی فوائد کی وجہ سے بعض دفعہ اہم معاملات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصویری زبان میں دکھائے جاتے ہیں مگر اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ ہے کہ اُسے وحیٔ لفظی میں دوبارہ بیان کر دیا جاتا ہے گویا تصویری زبان میں بھی ایک نظارہ دکھا دیا جاتا ہے اور کلامی زبان میں بھی اُس کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح دونوں فوائد پیدا کر دئیے جاتے ہیں۔ وہ فوائد بھی جو کلام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ فوائد بھی جو تصویری زبان سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعۂ معراج اور واقعۂ اسراء ہیں کہ دونوں ذرائع سے اُن کا اظہار کیا گیا۔ واقعہ معراج کا حدیثوں میں بھی تفصیل کے ساتھ ذکر آتا ہے اور قرآن کریم نے بھی سورۂ نجم میں اس کو بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح واقعۂ اسراء تصویری زبان میں بھی آپ کو دکھایا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل میں لفظی وحی میں بھی اس کا ذکر کر دیا گیا۔ قرآن کریم میں تو اس کا ذکر اس لئے کر دیا گیا کہ یہ واقعہ وحیٔ متلو میں آ جائے اور نظارہ اسلئے دکھایا گیا کہ جو زائد فوائد تصویری زبان کی وحی سے وابستہ ہوتے ہیں وہ بھی حاصل ہو جائیں۔ مثلاً اگر غور کیا جائے تو واقعۂ اسراء کا صرف اتنا مفہوم تھا کہ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر فضیلت عطا فرمائے گا۔ لیکن جب

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ نظارہ دکھایا گیا کہ جبرئیل آپ کے پاس براق لائے اور آپ اُس پر سوار ہو کر بیت المقدس تک پہنچے اور پھر آپ نے لوگوں کے سامنے یہ بات بیان فرمائی اور اُنہوں نے کہا کہ اگر آپ بیت المقدس سے ہو آئے ہیں تو ہمیں اُس کا نقشہ بتائیں جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں بتایا کہ بیت المقدس ایسا ہے ایسا ہے تو اس سے لوگوں کے ایمانوں میں جو تازگی پیدا ہوئی ہوگی وہ محض لفظی کلام سے کہاں پیدا ہو سکتی تھی یا مثلاً احادیث میں آتا ہے واپسی کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک قافلہ مکہ کی طرف آرہا ہے اور اُس قافلہ والوں کا ایک اُونٹ گم ہو گیا ہے جس کی وہ تلاش کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ بات بھی کفار کے سامنے بیان کر دی چنانچہ چند دن بعد معلوم ہوا کہ بعینہٖ یہ واقعہ مکہ کے ایک قافلہ سے پیش آیا تھا اور جب وہ قافلہ مکہ میں پہنچا تو اُس نے تسلیم کیا کہ بات درست ہے۔ اب یہ ایک زائد فائدہ تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اسراء کا نظارہ دکھانے سے حاصل ہوا کہ لوگوں کے ایمان بڑھ گئے اور کفار جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے تھے کہ آپؐ نعوذ باللہ افتراء سے کام لیتے ہیں اُن کا مُنہ بند ہو گیا۔ غرض اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنے اہم کلام کے اظہار کے لئے تصویری زبان کو بھی استعمال کر لیتا ہے یعنی تمثیلی زبان میں بھی ایک واقعہ بیان کر دیتا ہے اور پھر لفظی وحی میں بھی اُس کا ذکر کر دیتا ہے لیکن بہرحال دائمی کلام لفظی ہی ہوتا ہے تصویری کلام نہیں ہوتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک الہام بھی اسی قسم کا ہے جس میں دونوں صورتیں اختیار کی گئی ہیں تصویری زبان بھی اور لفظی الہام بھی۔ آپ کا الہام ہے جَآءَنِیْ اٰئِلٌ وَّاخْتَارَ وَاَدَارَ اِصْبَعَهٗ وَاَشَارَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ اٰتٰی فَطُوْبٰی لِمَنْ وَّجَدَ وَرَاٰی (تذکرہ صفحہ ۶۰۳) میرے پاس جبرئیل آیا اور اُس نے مجھے چُن لیا۔ اُس نے اپنی انگلی کو گردش دی اور اشارہ کیا کہ خدا کا وعدہ آگیا ہے پس مبارک وہ جو اُس کو پائے اور دیکھے۔ اب دیکھو یہ ایک نظارہ تھا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھایا گیا کہ جبرئیل آپ کے پاس آیا اُس نے اپنی اُنگلی کو گردش دی اور اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آگیا ہے مگر اللہ تعالیٰ پھر اس واقعہ کو کلام کی صورت میں بھی لے آیا تا کہ اور لوگ بھی اس سے متاثر ہوں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے ایک بڑا اونچا پہاڑ دیکھا ہے تو جو اثر اس کا دیکھنے والے پر ہوتا ہے وہ سننے والے پر نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض دفعہ کسی واقعہ کو نظارہ کی صورت میں لا کر اُس کے اثر کو زیادہ گہرا کرنا چاہتا ہے مگر پھر الہام میں بھی اُسے بیان کر دیتا ہے تا کہ دوسروں پر بھی اثر ہو۔ مثلاً جبرئیل نے اپنی انگلی سے جو اشارہ کیا ہوگا اُس کا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو اثر ہُوا ہوگا وہ اثر خالی لفظوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں پر صرف خواب کا ذکر کرنے سے کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا اُن کے لئے ضروری تھا کہ لفظی الہام نازل کیا جاتا۔ یہی حکمت ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ اپنے اہم کلام کو بعض دفعہ دونوں صورتوں میں بیان کر دیتا ہے تصویری زبان میں بھی اور لفظی الہام میں بھی۔ اس بحث کے بعد اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے جو تین اقسام وحی کی بیان کی ہیں اُن کی آگے تجربہ کی بناء پر اور بھی کئی قسمیں ہیں جو یہ ہیں :-

وحی کی تینوں اقسام
پہلی قسم

(۱) خواب تعبیر طلب منفرد و مشترک۔ مثلاً ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ فلاں شخص کے مکان کی دیوار گر گئی ہے۔ اب ضروری نہیں کہ اُس کے مکان کی دیوار ہی گرے بلکہ اِس کے معنے یہ ہوں گے کہ جو اُس کی حفاظت کا ذریعہ ہے یا اُس کو مشکلات و حوادث سے بچانے والے ہیں وہ اُس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے یا اُن پر وبال آجائے گا۔ یہ خواب کبھی منفرد ہوتی ہے یعنی صرف ایک شخص ہی دیکھتا ہے اور کبھی مشترک ہوتی ہے یعنی ایسی ہی خواب دوسرے کو بھی آجاتی ہے۔ دراصل غیر نبی کا کلام چونکہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ طریق رکھا ہُوا ہے کہ بعض دفعہ بعینہٖ ویسا ہی رویا دوسرے کو بھی دکھا دیا جاتا ہے۔ ہمنے اپنی زندگی میں اس کا کئی دفعہ تجربہ کیا ہے کہ بعض دفعہ

جس قسم کی خواب آتی ہے بعینہٖ اُسی قسم کی خواب دوسرے کو آجاتی ہے۔ مَیں نے ایک دفعہ اپنی مجلس میں ایک رویاء کا ذکر کیا جو ۲۴؍مئی ۱۹۴۴ء کے الفضل میں شائع ہوچکا ہے اس کے بعد ایک دوست نے بتایا کہ مجھے ایک غیر احمدی دوست نے اپنا ایک رویاء سنایا تھا اور بتایا تھا کہ اُسے خواب میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ رویاء خلیفۃ المسیح کو بھی دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ مَیں "الفضل" میں آپ کا رویاء پڑھ کر حیران رہ گیا کہ ایسا ہی رویاء اُس غیر احمدی دوست نے دیکھا تھا (الفضل ۲۸؍مئی ۱۹۴۴ء) پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظارے تو مختلف دکھائے جاتے ہیں مگر اُن کی تعبیر ایک ہی ہوتی ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے رُوس کے متعلق میں نے ایک رُویاء

تیسری قسم دیکھا جو الفضل یکم ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوچکا ہے۔ میں نے جس تاریخ کو یہ خواب دیکھا ہے اُس کے دوسرے دن ہی میاں الٰہی دین صاحب زرگر کا مجھے ایک خط ملا جس میں انہوں نے لکھا کہ میں نے رُوس کے متعلق یہ رویاء دیکھا ہے اور اُس کی تعبیر بھی وہی تھی جو میرے رویاء کی تھی سو اب دیکھو مجھے اُن کی خواب کا علم نہیں اُنہیں میری خواب کا علم نہیں۔ مَیں الفضل والوں کو خواب لکھتا ہوں اور میاں الٰہی دین

چوتھی قسم مجھے لکھتے ہیں اور دونوں کی تعبیر ایک ہی ہوتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنے بندے کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ تمہاری خواب بالکل سچی ہے ویسی ہی خواب دوسرے کو بھی دکھا دیتا ہے۔ بعض دفعہ تو دونوں کا ایک جیسا نظارہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ نظارہ تو جدا جدا ہوتا ہے مگر تعبیر ایک ہوتی ہے۔ غرض

پانچویں قسم پہلی قسم یہ ہے کہ انسان ایسا رویاء دیکھتا ہے جو تعبیر طلب ہوتا ہے یہ خواب منفرد بھی ہوتی ہے اور مشترک بھی۔ یعنی کبھی صرف خود ایک نظارہ دیکھتا ہے اور کبھی ویسا ہی نظارہ دوسروں کو بھی دکھا دیا جاتا ہے۔

چھٹی قسم (۲) خواب مثل فلق الصبح منفرد و مشترک۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان رویاء میں دیکھتا ہے کہ دیوار گر گئی اور دوسرے دن واقعہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بارش برستی ہے اور مکان کی دیوار گر جاتی ہے۔ یہ خواب بھی کبھی تو منفرد ہوتی ہے اور کبھی دوسرے کو بھی ویسی ہی خواب آجاتی ہے اور جو کچھ دیکھا جاتا ہے ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی تعبیر ظاہر ہو بلکہ جس رنگ میں خواب کے ذریعہ کوئی بات بتائی جاتی ہے اُسی رنگ اور اُسی شکل میں فلق الصبح کی طرح وہ بات پوری ہو جاتی ہے۔ اِس قسم کی خوابوں کا بھی مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت تجربہ ہے اور میں نے دیکھا ہے بسا اوقات جس طرح رات کو ایک نظارہ دیکھا جاتا ہے ویسا ہی دن کو ہونے لگ جاتا ہے۔ اور چونکہ اِس قسم کے واقعات بڑی کثرت سے ہوتے ہیں اِس لئے بعض دفعہ تو وہم سا ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ واقعہ دوبارہ تو نہیں ہو رہا۔ یہ خواب بھی بعض دفعہ منفرد ہوتی ہے اور بعض دفعہ مشترک۔ یعنی کبھی تو اِس قسم کی خواب دیکھنے میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا لیکن کبھی ویسا ہی نظارہ دوسرے لوگ بھی دیکھ لیتے ہیں۔

(۳) نظارہ نیم خواب تعبیر طلب منفرد و مشترک۔ بعض دفعہ انسان پورے طور پر سویا ہوا نہیں ہوتا بلکہ نیم خواب کی سی حالت اُس پر طاری ہوتی ہے۔ کچھ جاگ رہا ہوتا ہے اور کچھ غنودگی کی طرف اُس کی طبیعت مائل ہوتی ہے کہ اس حالت نیم خوابی میں وہ ایک نظارہ دیکھتا ہے جو تعبیر طلب ہوتا ہے۔ یہ نظارہ بھی دونوں قسم کا ہوتا ہے یعنی منفرد بھی ہوتا ہے اور مشترک بھی۔

(۴) نظارہ نیم خواب مثل فلق الصبح منفرد و مشترک۔ اِنسان بعض دفعہ نیم خوابی کی حالت میں ایک نظارہ دیکھتا ہے مگر وہ تعبیر طلب نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ اسی رنگ میں پورا ہو جاتا ہے جس رنگ میں اُس نے نظارہ دیکھا ہوتا ہے۔ یہ نظارہ بھی منفرد اور مشترک دونوں قسم کا ہوتا ہے۔

(۵) نظارہ بیداری تعبیر طلب منفرد و مشترک۔ بعض دفعہ بیداری میں ایک نظارہ دیکھا جاتا ہے لیکن وہ ہوتا تعبیر طلب ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا کہ میں نے فلاں دن آپ کو فلاں سٹیشن پر دیکھا تھا کیا آپ وہاں تشریف لے گئے تھے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تو وہاں نہیں گئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کشفی طور پر ہمیں دیکھا ہوگا۔ تو بعض دفعہ عین بیداری کی حالت میں ایک نظارہ دکھایا جاتا ہے مگر وہ ہوتا تعبیر طلب ہے۔ یہ نظارہ بھی منفرد اور مشترک دونوں قسم کا ہوتا ہے۔

(۶) نظارۂ بیداری مثل فلق الصبح منفرد و مشترک۔ کبھی بیداری میں ایک نظارہ دکھایا جاتا ہے مگر وہ تعبیر طلب نہیں ہوتا بلکہ فلق الصبح کی طرح اُسی رنگ میں ظاہر ہو جاتا ہے جس رنگ میں اللہ تعالیٰ انسان کو نظارہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کشوف میں ہمیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کشفی حالت میں دیکھا کہ مبارک احمد چٹائی کے پاس گر پڑا ہے اور اُسے سخت چوٹ آئی ہے۔ ابھی اس کشف پر تین منٹ سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہوگا کہ مبارک احمد جب چٹائی کے پاس کھڑا تھا اُس کا پیر پھسل گیا اُسے سخت چوٹ آئی اور اُس کے کپڑے خون سے بھر گئے۔ (تذکرہ ۵۳۶) اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ مجھے ایک دفعہ پیچش کی شکایت تھی اور چونکہ مجھے بار بار قضائے حاجت کے لئے جانا پڑتا تھا اس لئے میں چاہتا تھا کہ پاخانہ کی اچھی طرح صفائی ہو جائے تاکہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو۔ خاکروبہ آئی تو میں نے اُسے پوچھا کہ تم نے جگہ صاف کر دی ہے۔ اُس وقت شاید اُس نے جھوٹ بولا یا کوئی کونہ صاف کرنا بھول گیا تھا کہ اُس نے جواب میں کہا میں نے جگہ صاف کر دی ہے۔ اُسی وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کشفی حالت طاری ہوئی اور آپ نے دیکھا کہ ایک کونہ میں نجاست پڑی ہے۔ اس پر آپ نے اُسے کہا تم جھوٹ کیوں بولتی ہو فلاں کونہ تو ابھی گندا ہے اور تم نے اس کی صفائی نہیں کی۔ وہ یہ سُن کر حیران رہ گئی کہ انہیں اندر بیٹھے کس طرح علم ہو گیا ہے کہ میں نے پوری صفائی نہیں کی۔ (تذکرہ ۶۴۲) یہ نظارہ بھی منفرد اور مشترک دونوں رنگ رکھتا ہے یعنی کبھی صرف ایک شخص کو نظارہ دکھایا جاتا ہے اور کبھی ویسا ہی نظارہ دوسروں کو بھی دکھا دیا جاتا ہے۔

(۷) کلام بلا واسطہ جو کانوں پر گرتا ہے منفرد و مشترک
بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کا کلام الفاظ کی صورت میں انسانی کانوں پر نازل ہوتا ہے اور غیب سے آواز آتی ہے کہ یوں ہو گیا ہے یا یوں ہو جائے گا یا یوں کر۔ گویا ماضی کے صیغہ میں بھی یہ کلام نازل ہوتا ہے مستقبل کے صیغہ میں بھی نازل ہوتا ہے اور امر کی صورت میں بھی نازل ہوتا ہے۔ یہ بلا واسطہ کلام جس کی کانوں میں آواز سُنائی دیتی ہے اس کی بھی دونوں حیثیتیں ہیں یعنی یہ منفرد بھی ہوتا ہے اور مشترک بھی۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ صرف ملہم کو یہ آواز سُنائی دیتی ہے اور کبھی ویسی ہی آواز دوسرے کو بھی آجاتی ہے۔ اس قسم کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ حاصل ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہام ہوا کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً۔ میں اپنی افواج کے ساتھ اچانک تیری مدد کیلئے آؤنگا۔ جس رات حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو یہ الہام ہوا اُسی رات ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آج یہ الہام ہوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً۔ جب صبح ہوئی تو مفتی محمد صادق صاحب نے مجھے کہا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو تازہ الہامات ہوئے ہوں وہ اندر سے لکھوا لاؤ۔ مفتی صاحب نے اس ڈیوٹی پر مجھے مقرر کیا ہوا تھا اور میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تازہ الہامات آپ سے لکھوا کر مفتی صاحب کو لا کر دے دیا کرتا تھا تاکہ وہ انہیں اخبار میں شائع کر دیں۔ اُس روز حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب الہامات لکھ کر دئے تو جلدی میں آپ یہ الہام لکھنا بھول گئے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً۔ میں نے جب اُن الہامات کو پڑھا تو میں شرم کی وجہ سے یہ جرأت بھی نہ کر سکتا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس بارہ میں کچھ عرض کروں اور یہ بھی جی نہ مانتا تھا کہ جو مجھے بتایا گیا تھا اُسے غلط سمجھ لوں۔ اسی حالت میں کئی دفعہ میں آپ سے عرض کرنے کے لئے دروازہ کے پاس جاتا مگر پھر لوٹ آتا۔ پھر جاتا اور پھر لوٹ آتا۔ آخر میں نے جرأت سے کام لے کر کہہ ہی دیا کہ رات مجھے ایک فرشتہ نے بتایا تھا کہ آپ کو الہام ہوا ہے اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً۔ مگر ان الہامات میں اس کا ذکر نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا یہ الہام ہوا تھا مگر لکھتے ہوئے میں بھول گیا۔ چنانچہ کاپی کھولی تو اس میں وہ الہام بھی درج تھا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

وحی کی چھٹی قسم

وحی کی ساتویں قسم

پھر اس الہام کو بھی اخبار کی اشاعت کے لئے درج فرما دیا۔ ایسے ایک بلاواسطہ کلام تھا جو آپ کے کانوں پر نازل ہوا مگر ساتھ ہی مجھے بھی بتلا دیا گیا کہ آپ کو یہ الہام ہوا ہے۔

وحی کی آٹھویں قسم

(۸) کلام بلاواسطہ جو قلب پر گرتا ہے منفرد و مشترک یہ قسم ایسی ہے جو پہلی قسم سے علیحدہ ہے۔ پہلی قسم میں تو کان پر کلام نازل ہوتا ہے مگر اس قسم میں انسانی قلب پر کلام نازل ہوتا ہے۔ کان کی حس چونکہ معروف ہے اس لئے اُسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے مگر اس حس کو سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ لیکن بہرحال اللہ تعالےٰ کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ وہ بعض دفعہ انسانی قلب کو اپنی وحی کا مہبط بنا دیتا ہے۔ انسان یہ محسوس نہیں کرتا کہ اُس کے کان پر الفاظ نازل ہوئے ہیں بلکہ وہ اپنے قلب پر اُن الفاظ کا نزول محسوس کرتا ہے (یہ بات خیال سے بالکل مجداگانہ ہے) یہ کلام بھی منفرد اور مشترک دونوں قسم کا ہوتا ہے۔

وحی کی نویں قسم

(۹) کلام بلاواسطہ جو زبان پر نازل ہوتا ہے منفرد و مشترک یعنی الہام کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ بعض دفعہ کان کوئی آواز نہیں سُن رہے ہوتے لیکن زبان پر بے تحاشا ایک فقرہ جاری ہوتا ہے جسے بار بار وہ دُہراتی چلی جاتی ہے۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان کسی اَور کے قبضہ میں ہے اور وہ جلدی جلدی ایک فقرہ بولتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ربودگی کی کیفیت جو انسان پر طاری ہوتی ہے جاتی رہتی ہے مگر اس کے بعد بھی کچھ دیر تک زبان پر یہ تصرف جاری رہتا ہے اور وہ جلدی جلدی اُس فقرہ کو دُہراتی رہتی ہے تاکہ انسان کو اچھی طرح یاد رہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُس پر کیا الہام نازل کیا ہے۔ ایسے الہام میں بھی کبھی بطور گواہی دوسروں کو شریک کر دیا جاتا ہے۔

وحی کی گیارھویں بارھویں تیرھویں چودھویں قسم

وحی کی دسویں قسم

(۱۰) کلام بلاواسطہ جو آنکھوں پر نازل ہوتا ہے منفرد و مشترک کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا کلام آنکھوں پر نازل ہوتا ہے یعنی لکھے ہوئے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جن کو پڑھ کر انسان اللہ تعالےٰ کے منشاء سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یہ کلام بھی دونوں رنگ میں ہوتا ہے یعنی منفرد طور پر بھی اور مشترک طور پر بھی۔ کبھی تو صرف اُسے کوئی لکھی ہوئی چیز نظر آ جاتی ہے اور کبھی دوسرے لوگ بھی اس نظارہ میں شریک کر دئے جاتے ہیں۔ یہ امر بتایا جا چکا ہے کہ لُغت کے لحاظ سے وحی کے ایک معنے تحریر کے بھی ہیں۔ یہ معنے اس دسویں قسم میں آ جاتے ہیں کیونکہ اس میں الفاظ تحریر کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں۔ اور درحقیقت وحی کی قطعیت الفاظ کے ساتھ ہی تعلق رکھتی ہے کان۔ آنکھ۔ زبان یا دل کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی۔ جو وحی الفاظ کی صورت میں نازل ہو وہ بہرحال اَور تمام وحیوں کی زیادہ شاندار سمجھی جائے گی اور اُس کی قطعیت میں کوئی شبہ نہیں ہوگا خواہ یہ قطعیت کان سے حاصل ہو خواہ دل سے حاصل ہو خواہ زبان سے حاصل ہو خواہ آنکھ سے حاصل ہو جس وحی کے متعلق انسان قسم کھا کر کہہ سکتا ہو کہ اس کا لفظ لفظ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کی زبر اس کی زیر اس کا لام اور اس کا میم سب خدا نے نازل کیا ہے وہ وحی کی تمام قسموں میں سے زیادہ اعلیٰ سمجھی جائے گی۔

(۱۱) کلام بلاواسطہ جو کانوں پر گرتا ہے اور زبان بھی شریک کر دی جاتی ہے یعنی وہ کلام جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے صرف کانوں پر نازل نہیں ہوتا بلکہ زبان بھی اُس کو دُہراتی چلی جاتی ہے اور جب ربودگی کی حالت جاتی رہتی ہے تو کان محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم نے خدا تعالےٰ کا کلام سُنا اور ساتھ ہی زبان بھی گواہی دے رہی ہوتی ہے کہ مجھ پر اللہ تعالےٰ کا کلام نازل ہوا۔

(۱۲) کلام بلاواسطہ جو آنکھوں پر گرتا ہے اور زبان بھی اُس میں شریک کر دی جاتی ہے۔ یعنی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تختی دکھائی جاتی ہے جس پر الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی زبان بھی اُن الفاظ کو دُہراتی چلی جاتی ہے۔

(۱۳) کلام بلاواسطہ جو قلب پر گرتا ہے اور زبان بھی اُس میں شریک کر دی جاتی ہے۔

(۱۴) کلام بلاواسطہ جس میں دونوں حواس ظاہری اور تیسرا باطنی بھی شریک کر دئے جاتے ہیں۔ یعنی کبھی اتنے جلال سے خدا تعالےٰ کا کلام نازل ہوتا ہے کہ ادھر وہ قلب پر گر رہا ہوتا ہے اُدھر کانوں پر نازل ہو رہا ہوتا ہے اور پھر تیسری طرف زبان بھی اُس کو دُہراتی چلی جاتی ہے۔

(۱۵) کلام بالواسطہ جو نظر آنیوالے فرشتہ کے ذریعہ سُنایا جاتا ہے
اس کلام میں واسطہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ انسان براہ راست اللہ تعالےٰ کے کلام کو سنے اُسے فرشتہ نظر آتا ہے جو کہتا ہے کہ بات یُوں ہے جیسے غار حرا میں ہُوا۔

(۱۶) کلام بالواسطہ جو نظر آنیوالے فرشتہ کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے
جیسے بعض حدیثوں میں ذکر آتا ہے کہ غار حرا میں جبریل نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حریر پر لکھی ہوئی ایک تحریر بھی دکھائی

(۱۷) کلام بالواسطہ جو نہ نظر آنیوالے فرشتہ کے ذریعہ سُنایا جاتا ہے
اس میں کوئی فرشتہ نظر نہیں آتا مگر آواز سُنائی دیتی ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں یا فرشتہ کہتا ہے کہ مجھے خدا نے یہ بات پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

(۱۸) کلام بالواسطہ جو نہ نظر آنیوالے فرشتہ کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے
آنکھوں کے سامنے تختی آتی ہے جس پر کچھ لکھا ہُوا ہوتا ہے اور صاف پتہ لگتا ہے کہ کسی اور ہاتھ نے اس کو آگے کر دیا ہے مگر فرشتہ نظر نہیں آتا۔

(۱۹) کلام بالواسطہ جو نظر آنیوالے فرشتہ کے ذریعہ سے یقظہ میں سنایا جاتا ہے اور دوسرے اس میں شریک نہیں ہوتے
یعنی انسان کے حواس ظاہری پورا کام کر رہے ہوتے ہیں کہ اُسے فرشتہ نظر آتا ہے جو اللہ تعالےٰ کا کلام سُناتا ہے مگر کوئی دوسرا شخص اس میں شریک نہیں ہوتا نہ وہ فرشتہ کو دیکھتا ہے اور نہ اُس کی آواز سُن سکتا ہے۔

(۲۰) کلام بالواسطہ جو نظر آنیوالے فرشتہ کے ذریعہ سنایا جاتا ہے اور دوسرے اس میں سماعاً شریک ہوتے ہیں رویتہً نہیں
بخاری میں آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی سے باتیں کرتے سُنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جبریل آیا ہے جو مجھ سے باتیں کر رہا ہے اور وہ تمہیں السلام علیکم کہتا ہے۔ اب دیکھو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے باتیں سن لیں مگر انہیں فرشتہ نظر نہ آیا۔ پس یہ وہ قسم ہے جس میں اور لوگ سماعاً تو شریک کر دئے جاتے ہیں مگر رویتہً نہیں۔

(۲۱) کلام بالواسطہ جو نظر آنیوالے فرشتے کے ذریعہ سے سنایا جاتا ہے اور دوسرے لوگ اس میں سماعاً و رویتہً شریک ہوتے ہیں
جیسے دحیہ کلبی کی شکل میں جبریل کے آنے کا واقعہ ہے۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے آپ سے باتیں کرتے رہے اور صحابہؓ نے اُن کو اچھی طرح دیکھا۔ جب وہ چلے گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذَالِکَ جِبْرِیْلُ وہ جبریل تھے جو تمہیں دین کی باتیں سکھانے آئے۔ اس کلام کو صحابہؓ نے بھی سُنا اور فرشتہ کو بھی دیکھا۔

(۲۲) خواب، کلام اور حقیقت ظاہر تینوں کا اشتراک
بعض دفعہ ایک نظارہ میں تینوں صورتیں جمع کر دی جاتی ہیں۔ اُس میں خواب بھی ہوتی ہے، اُس میں کلام بھی ہوتا ہے اور اس میں حقیقت ظاہر بھی ہوتی ہے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ سُرخی کے چھینٹوں والا واقعہ پیش آیا جس کے نشانات آپ کے کُرتہ پر بھی پائے گئے۔ اس میں تینوں باتیں موجود تھیں یعنی خواب میں ایک نظارہ بھی دکھایا گیا۔ اللہ تعالےٰ نے آپ سے بات بھی کی اور پھر ظاہر میں سُرخی کے چھینٹوں کا نشان قائم کر دیا۔ پس وحی کی بائیسویں قسم وہ ہے جس میں خواب، کلام اور حقیقت ظاہر تینوں کا اشتراک پایا جاتا ہے۔

وحی کی بقیہ اقسام [201]

(۲۳) وحی کی تیئیسویں قسم وحیٔ قلبی خفی ہے یعنی وہ وحی جس میں الفاظ نہیں ہوتے صرف دل پر اللہ تعالےٰ کے منشاء کا القاء ہوتا ہے۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ روح القدس کی طرف سے فلاں بات میرے دل میں ڈال دی گئی ہے اور اب مجھے اُس میں کسی قسم کا تردد نہیں۔ یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ [illegible] الفاظ کی شکل میں نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ صرف قلبی وحی تھی [illegible] ارادی صورت میں نازل ہوئی۔

اس وحی کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وحی دوسری وحیوں کے ساتھ مل کر آتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وحی دوسری وحیوں کے بعد آتی ہے تاکہ لوگوں کو کسی قسم کا دھوکا نہ لگے۔

بہائیوں کو تمام تر دھوکہ اِسی آخری قسم کی وحی کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لگا ہے۔ ہم اس وحی سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کی وحی ہوتی ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

وحی کا مفہوم سمجھنے سے بہائیوں کو دھوکہ

کے ارشادات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی ایک قسم قلبی خفی وحی بھی ہے۔ پس ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ بہائی جس وحی کا ادعا کرتے ہیں اُس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ بہائیوں نے اِس وحی کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ وہ اپنے دل کے ہر خیال کا نام وحی رکھنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ بہاء اللہ کے دل میں جو خیال آتا تھا وہ کہہ دیتے تھے کہ یہ وحی ہے۔ اسی طرح وہ جو کچھ لکھتے ہیں اُس کو وحیٔ قلبی خفی قرار دے دیتے ہیں۔ ہمیں چونکہ خود اعتراف ہے کہ وحی کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جس میں الفاظ نازل نہیں ہوتے صرف قلب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کیا جاتا ہے اِس لئے وہ بعض دفعہ لوگوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک بات ایسی ہے جو اس بحث کے سلسلہ میں ہماری جماعت کے دوستوں کو یاد رکھنی چاہیئے اور جو بہائیوں کے پھیلائے ہوئے زہر کے ازالہ میں بہت کام آسکتی ہے اور وہ

بہائیوں کے ساتھ بحث کرنے میں ایک حربہ

یہ کہ ماموریں کے تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ یہ وحی دوسری وحیوں کے ساتھ مل کر آتی ہے اکیلی نہیں آتی۔ اگر اکیلی آجائے تو ہر آدمی کہہ سکتا ہے کہ مجھے بھی وحی ہوتی ہے اور پھر یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جائے کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون جھوٹ سے کام لے رہا ہے۔ اِس نقص کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت رکھی ہے کہ وہ پہلے اپنے بندہ پر اَور قسموں کی وحی نازل کرتا ہے اور جب اُس میں بیان کردہ واقعات کے پورا ہونے سے لوگوں کو یہ یقین آجاتا ہے کہ فلاں شخص سچ بول رہا ہے تو اس کے بعد اُس پر وحی قلبی خفی بھی نازل کر دیتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اُسے اپنی سچائی

وحی خفی کی پہچان

کا اَور تو کوئی نشان نہ دیا جائے اور صرف قلبی خفی وحی اُس کی طرف نازل کرنی شروع کر دی جائے۔ اور یہ لفظی وحی کے مقابلہ پر کمیت میں بہت ہی کم ہوتی ہے۔ میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ میرے پاس ایک دفعہ عبداللہ تیماپوری آئے اور کہنے لگے آپ مجھے کیوں نہیں مانتے اور مرزا صاحب کو کیوں مانتے ہیں۔ میں نے کہا مرزا صاحب کو ہم اس لئے مانتے ہیں کہ آپ کی صداقت کے ہم نے متواتر نشانات دیکھے اور ہمیں یقین آگیا کہ آپ سچے ہیں۔ کہنے لگے یہ تو بعد کی باتیں ہیں شروع شروع میں جو لوگ آپ پر ایمان لائے تھے اُنہوں نے کونسا نشان دیکھا تھا؟ مثلاً حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ آپ پر ایمان لائے سوال یہ ہے کہ وہ کس نشان کو دیکھکر آپ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے؟ میں نے کہا دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ابوبکرؓ کی طرح نشانات دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ سمجھتے ہیں اگر ہم نشانات دیکھ کر ایمان لائے تو اس سے ہمارا درجہ کم ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیثوں میں صاف طور پر آتا ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی اُن کو خبر پہنچی اور وہ آپ سے یہ دریافت کرنے آئے کہ کیا یہ درست ہے کہ آپ نے الہام کا دعویٰ کیا ہے تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اپنی صداقت کے متعلق کچھ وضاحت فرمائیں مگر حضرت ابوبکرؓ نے آپکو روک دیا۔ اور کہا آپ صرف اتنا بتائیں کہ کیا آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ اللہ تعالےٰ کے نبی ہیں۔ اور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ مَیں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور پھر کہا میں نے اِس لئے دلائل سننے سے انکار کیا تھا کہ اگر میں دلائل سُنکر ایمان لاتا تو میں اپنے ایمان کے کمزور ہونے کا ثبوت مہیا کرنے والا ہوتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ایمان کی بنیاد نئے دلائل اور نشانات پر ہو۔ بلکہ میں چاہتا تھا کہ میں جو مشاہدہ آپ کے اخلاق کا کر چکا ہوں اُسی کی بناء پر آپ پر ایمان لانے کی سعادت حاصل کروں۔ یہی حال حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کا تھا۔ عبداللہ تیماپوری کہنے لگے تو پھر میرے متعلق آپ یہ کیوں شرط قائم کرتے ہیں کہ میرے لئے نشان دکھانا ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ نبی کے دعویٰ کی ابتداء میں ایمان لانے والے اُن زبردست نشانات کے ظہور سے پہلے ایمان لاتے ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کیلئے

بھی اللہ تعالیٰ ایمان لانے کی یقینی صورتیں پیدا کر دیتا ہے اور وہ اُس نبی کا گذشتہ نمونہ اور عمل ہوتا ہے مگر اس سے وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو اُس کے ذاتی واقف ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت امانت اور بنی نوع انسان کی خدمت تھی حضرت خلیفہ اوّل کے سامنے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تعلق باللہ، اسلام کے احیاء کا جوش اور اُس کے لئے غیر معمولی علمی خدمت تھی جس کی وجہ سے آپ نے براہین احمدیہ جیسی معجزانہ کتاب لکھی۔ ابتدائی زمانہ کے راستباز لوگ دیکھ رہے تھے کہ آپ نے براہین احمدیہ کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھی ہے جس میں صداقتِ اسلام کے لیے زبردست دلائل دئے اور اس طرح تحدّی سے دشمنانِ دین کو مقابلہ کے لئے للکارا ہے کہ یہ کام بغیر تائیدالٰہی کے نہیں ہوسکتا۔ اس لئے نیک لوگ جن کے دل صاف تھے فوراً پکار اُٹھے کہ یہ شخص اسلام کا پہلوان اور دین کو دشمنوں کے نرغے سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ اس کے بعد جب آپ نے دعویٰ کیا تو جو لوگ آپ کے حالات سے واقف تھے وہ فوراً آپ پر ایمان لے آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ نے وہ نُور بخشا تھا جس کی بناء پر اُس نے براہین احمدیہ جیسی عظیم الشان کتاب لکھی وہ کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا جس نے اسلام کی پہلے حفاظت کی ہے وہ اگر اب بھی اس کی حفاظت کا دعویٰ کرتا ہے تو بالکل سچ کہتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے براہین کا نشان دیکھنے کے بعد کسی مزید نشان دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور آپ کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہوگئے۔ عبداللہ تیماپوری کہنے لگے تو پھر میرے متعلق آپ کیا تخمین چاہتے ہیں؟ میں نے کہا براہین احمدیہ نامکمل رہ گئی ہے اور شاید اللہ تعالیٰ نے اُس کو اسی لئے نامکمل رہنے دیا ہے کہ کوئی آنے والا اس کو مکمل کرے۔ اب آپ اس بات کے مدعی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامور بنایا ہے آپ اس کو مکمل کر دیں تو میں آپ کو آپ کے دعویٰ میں صادق تسلیم کر لوں گا اور سمجھ لوں گا کہ آپ کی صداقت کے لئے یہ نشان کافی ہے۔ اس پر وہ اچھا کہہ کر چلے گئے مگر آج تک ایک سطر بھی براہین احمدیہ کی تکمیل کیلئے نہیں لکھ سکے۔

جس طرح ماموریں کی بعثت والی زندگی سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایسے شواہد پیدا کر دیتا ہے جو لوگوں کے لئے ایمان کے محرک ہوتے ہیں۔ اسی طرح وحیٔ قلبی خفی کے نازل ہونے کا ادّعا کرنیوالے انسان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس پر دوسری وحی بھی نازل ہوتی ہو اور اُس کی صداقت کے ایسے دلائل اور شواہد پائے جاتے ہوں جن کی بناء پر کسی شخص کے دل میں اُس کے وہمی یا پاگل ہونیکا خیال نہ گذرے۔ مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ روح القدس نے فلاں بات میرے دل میں ڈالدی ہے تو صحابہ کو اُسکے ماننے میں کوئی تأمل نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فلق الصبح کیطرح پوری ہونیوالی وحی بھی نازل ہوچکی تھی جبرئیل کے ذریعہ بھیجی جانیوالی وحی بھی نازل ہوچکی تھی اور وہ کلام بھی آپ پر نازل ہوچکا تھا جو من وراء حجاب ہوتا ہے۔ اور وہ سمجھ سکتے تھے کہ جس شخص نے ہمیشہ سچی باتیں ہمارے سامنے بیان کی ہیں وہ اب بھی جو کچھ کہہ رہا ہے کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی آیا اور اُس نے کہا آپ نے میرا اتنا قرض دینا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تو تمہاری رقم واپس کر چکا ہوں۔ اُس نے کہا آپ واپس دے چکے ہیں تو کوئی گواہ پیش کریں۔ اس پر ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اس یہودی کے روپے ادا کر دئے ہیں۔ یہودی نے یہ بات سُنی تو اُس نے اقرار کر لیا کہ ہاں مجھے یاد آگیا آپ نے مجھے روپے دے دئے تھے۔ جب وہ واپس چلا گیا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس صحابی سے پوچھا تمہیں کس طرح پتہ ہے کہ میں نے یہ روپے ادا کر دئے تھے جب میں نے یہ قرض واپس کیا ہے اُس وقت تو تم موجود نہیں تھے؟ اُس نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ! یہ بھی دیکھئے آپ آسمان کی باتیں ہمیں بتاتے ہیں تو ہم آپ پر ایمان لے آتے ہیں کیا زمین کی بات آپ کہیں گے تو ہم اُس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ جس طرح ہم آپکی آسمان والی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اسی طرح ہم آپکو زمین سے تعلق رکھنے والی باتوں میں بھی سچا اور راستباز سمجھتے ہیں۔ یہ

علم غیبی کے سمجھنے کا ایک گُر

بات جو اُس صحابیؓ نے بیان کی بالکل درست ہے۔ کیونکہ جو شخص خدا تعالےٰ کا مامور اور مرسل ہے اگر وہ کوئی بات کہیگا تو بہرحال سچ ہی ہو گی۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ غلط بات کہے۔ چنانچہ جب اُس صحابی نے یہ بات کہی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے ملامت نہیں کی بلکہ آپ خوش ہوئے اور فرمایا آئندہ اس شخص کی گواہی دو گواہوں کے برابر سمجھی جائے۔ یہ فضیلت اُسے دوسروں پر اِسی لئے عطا کی گئی کہ اُس نے محض دوستی کی خاطر بات نہیں کی بلکہ اپنی گواہی کی بنیاد اُس نے کلام الٰہی پر رکھی اور کہا کہ جس شخص پر خدا تعالےٰ روزانہ اپنا کلام نازل کرتا ہے اور ہم اُس پر ایمان لاتے ہیں اُس کی دوسری بات بھی جو زمین سے تعلق رکھنے والی ہے کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اِسی طرح جس شخص پر اللہ تعالےٰ وحیٔ قلبی خفی نازل کرتا ہے اُسے دوسرے شواہد بھی عطا کرتا ہے تاکہ لوگوں کو کوئی دھوکا نہ لگے اور وہ سمجھ لیں کہ جو شخص پہلی وحی کے بیان کرنے میں راستبازی سے کام لے رہا ہے وہ اس وحی میں بھی ضرور صادق اور راستباز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ نہ اُس پر کثرت سے وحیٔ لفظی نازل ہوتی ہے نہ اُس پر وحیٔ جبریلی نازل ہوتی ہے نہ اُس پر تصویری یا تعبیری زبان میں وحی نازل ہوتی ہے اور وہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ مجھے وحیٔ قلبی خفی ہوتی ہے تو اُس کا یہ دعویٰ کسی عقلمند کی نگاہ میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کہے گا کہ وہ پاگل ہے جو اپنے دل کے خیالات کا نام وحی رکھ رہا ہے۔ غرض یہ وحی بڑا فتنہ پیدا کرنے والی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس وحی کو کلام لفظی اور جبریلی اور غیر جبریلی وحی کے تابع رکھتا ہے۔ جس شخص پر بکثرت یہ تین وحیاں نازل ہوں وہ اگر کہے کہ مجھ پر وحیٔ قلبی خفی نازل ہوتی ہے تو ہم اُسے فریب خوردہ نہیں کہیں گے اور اُس کی بات مان لیں گے۔ لیکن جب کوئی دوسرا شخص یہ کہے جس پر کوئی اَور وحی نازل نہ ہوتی ہو تو ہم سمجھیں گے وہ پاگل ہے۔ یہی حال بہاء اللہ اور لاہور کے غلام محمد کا ہے ہم ان لوگوں کو بھی عام معیارِ عقل سے گرا ہوا خیال کرتے ہیں۔

دوسرے یہ وحی امورِ غیبیہ کے متعلق ہوتی ہے امورِ احکامیہ کے بارہ میں نہیں تاکہ دھوکا نہ لگے۔ کیونکہ امورِ غیبیہ میں فتنہ کا اندیشہ نہیں ہوتا اُن کی تفسیر بعد میں ہو جاتی ہے مگر امورِ احکامیہ کے نزول کی کوئی تفسیر بعد میں نہیں ہوتی۔

کلامِ الٰہی کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ سب اقسامِ کلام حقیقت ظاہر اور مجاز دونوں قسم کی عبارتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اُس میں صرف حقیقت ظاہری پائی جاتی ہو۔ بلکہ جس طرح منام میں دیکھی گئی چیز تعبیر طلب ہوتی ہے اسی طرح وہ کلام بھی جو اللہ تعالےٰ اپنے بندہ پر نازل فرماتا ہے اُس میں مجاز اور استعارات پائے جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ منام میں جو نظارہ دکھایا جاتے وہ اکثر تعبیر طلب ہوتا ہے لیکن الفاظ کی صورت میں جو کلام نازل ہوتا ہے اُس میں سے بعض تاویل طلب ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جب غیر احمدیوں کے سامنے ہم قرآن کریم کی آیات کے وہ مطالب بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے اُن میں مخفی رکھے ہوئے ہیں تو وہ کہدیا کرتے ہیں تم تو کلامِ الٰہی کی تاویل کرتے ہو۔ بجائے اس کے کہ ظاہر الفاظ جس حقیقت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں تم اُس کو لو اُن الفاظ کی تاویل کرنا شروع کر دیتے ہو۔ اُن کے ذہن میں یہ بات مرکوز ہوتی ہے کہ کلامِ الٰہی کی تاویل نہیں کی جا سکتی بلکہ ہمیشہ اُس کے ظاہری معنوں کے لحاظ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے اور اگر تاویل کی جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر کلامِ الٰہی کی بھی تاویل کی جائے تو پھر تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ یہ ایسی عقل کے خلاف بات ہے کہ اسے سُن کر حیرت آتی ہے۔ آخر دنیا میں عام بول چال جو روزانہ بیداری کی حالت میں کی جاتی ہے اُس میں مجاز استعمال ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اور پھر اُن باتوں کے بعد دنیا میں کوئی ٹھکانہ رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو باتیں کی جاتی ہیں اُن میں استعارات بھی ہوتے ہیں، اُن میں مجاز بھی ہوتا ہے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ اگر کلام میں مجاز استعمال کیا گیا تو دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ غالبؔ کا کلام پڑھ لیا جائے، ذوقؔ کے کلام کو دیکھ لیا جائے وہ مجاز اور استعارے استعمال کرتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا اُن کے کلام کے بعد دنیا میں کوئی ٹھکانہ رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ ہم تو دیکھتے ہیں بڑے بڑے ادیب

اور بڑے بڑے شاعر روزانہ مجاز اور استعارے اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں اور کوئی شخص اُن کے اِس طریق پر اعتراض نہیں کرتا۔ اگر اُن کے کلام کے بعد دنیا میں ٹھکانہ قائم رہتا ہے تو کیا خدا تعالےٰ کا کلام ہی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر اُس میں مجاز یا استعارہ آجائے تو دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا؟ اِس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معترضین خدا تعالےٰ کے کلام کو اتنی خوبیوں کا حامل بھی نہیں سمجھتے جتنی خوبیاں اُن کے نزدیک انسانی کلام میں موجود ہونی چاہئیں۔ خدا تعالےٰ اپنے کلام میں مجاز اور استعارہ استعمال کرے تو انہیں اعتراض سُوجھ جاتا ہے لیکن اگر بڑے بڑے ادیبوں کے کلام میں مجاز اور استعارہ استعمال ہو تو اُس وقت وہ خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بڑا فصیح کلام ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ مجاز اور استعارہ کے استعمال کی وجہ سے ہمیں اس کلام کے سمجھنے میں اشتباہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ جب مجاز اور استعارہ استعمال کر لیا گیا ہے تو پھر تو کلام کا اعتبار اُٹھ گیا۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ مجاز اور استعارہ کے استعمال کی وجہ سے زبان بگڑ گئی ہے بلکہ وہ اس کلام سے مزہ اٹھاتے ہیں۔ اُس کی بلاغت کی تعریف کرتے ہیں اور اُسے سارے کلام پر ترجیح دیتے ہیں۔ آخر غالبؔ کو دوسروں پر کیا فوقیت حاصل ہے یا ذوقؔ کو دوسروں پر کیا فوقیت حاصل ہے یہی کہ وہ مجاز اور استعارہ میں حقیقت کو بیان کرتے ہیں اور لوگ سُن کر کہتے ہیں کہ غالب اور ذوق نے کمال کر دیا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جسے عام کلام میں اعلیٰ درجے کا کمال سمجھا جاتا ہے وُہ کمال اگر الٰہی کلام میں آجائے تو کہتے ہیں کہ پھر تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ جب عام بول چال جو بیداری میں کی جاتی ہے اُس میں بھی مجاز کثرت سے استعمال ہوتا ہے تو پھر وحی میں کیوں نہ ہو؟ استعارہ اور مجاز تو بلاغت کی جان ہوتے ہیں کلامِ الٰہی اُن کے برمحل استعمال سے کیوں محروم ہو؟ ہاں جس طرح انسانی بول چال میں مجاز اور استعارہ کے باوجود غلطی سے بچنے کے ذرائع موجود ہیں ویسے ہی ذرائع کلامِ الٰہی کو بھی حاصل ہیں۔ اُن کی موجودگی میں عقلمند کو دھوکا نہیں لگ سکتا اور بے وقوف کو تو ہر بات سے دھوکا لگ سکتا ہے جیسے ایک بے وقوف کی مثل ہے کہ اُس نے یہ سُن کر کہ اگر بتا دو میری جھولی میں کیا ہے تو اُن میں سے ایک انڈا تم کو دے دُوں کہا کہ کچھ اَتہ پتہ بتاؤ تو بتاؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو ذرائع انسانی کلام میں غلطی سے محفوظ رہنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں وہی کلامِ الٰہی کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ آخر یہ صاف بات ہے کہ جب مجاز استعمال کیا جائے گا تو لازماً اُس کا کوئی نہ کوئی قرینہ ہو گا۔ قرینہ کے بغیر ہی اگر مجاز استعمال ہونے لگے تو بے شک دنیا میں اندھیر پڑ جائے۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ کل فلاں وفات یافتہ شخص میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے یُوں کہا تو چونکہ وہ صاحب فوت شدہ ہوں گے اِس لئے میری یہ بات حقیقت پر مشتمل نہیں سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر میں کہوں کہ کل فلاں صاحب (جو زندہ ہوں) میرے پاس آئے اور یہ بات سُن کر بعض لوگ جھگڑا شروع کر دیں ایک کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواب میں آئے تھے اور دوسرا کہے کہ نہیں ظاہر میں آئے تھے تو یہ بے وقوفی ہو گی۔ کیونکہ پہلے قول میں یہ قرینہ موجود تھا کہ جن صاحب کا ذکر تھا وہ فوت ہو چکے ہیں اور وہ بہرحال خواب میں ہی آ سکتے ہیں ظاہر میں نہیں۔ لیکن دوسرے قول میں یہ قرینہ نہیں۔ پس مجاز اور استعارہ جب بھی کلام میں استعمال کیا جائیگا اُس کے لئے قرائن کا ہونا ضروری ہو گا تاکہ ہر شخص سمجھ سکے کہ جو بات بیان کی جا رہی ہے وہ کلامِ حقیقت ہے یا کلامِ مجاز۔ لیکن بہرحال دنیا میں ہمیشہ مجاز اور استعارات استعمال کئے جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ لوگوں پر ان استعمالات کی وجہ سے کسی کلام کا سمجھنا مشتبہ ہو جائے وہ ایسے کلام سے نہایت لطف اُٹھاتے اور استعارات کو فصاحت کی جان قرار دیتے ہیں۔ پس جس طرح مجاز اور استعارہ انسانی کلام میں چار چاند لگا دیا کرتا ہے اسی طرح الٰہی کلام میں بھی مجاز اور استعارات کا استعمال اُس کے حُسن کو دوبالا کر دیتے اور اُس کی شان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں پس یہ بالکل غلط خیال ہے کہ خدا تعالےٰ کے کلام میں مجاز اور استعارہ نہیں ہوتا یا مجاز اور استعارہ کے استعمال سے حقیقت چُھپ جاتی ہے۔ مجاز اور استعارہ پہچاننے کے دنیا میں کچھ قواعد مقرر ہیں۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝

اُس دن لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں جمع ہوں گے تاکہ (اپنی) اپنی کوششوں (کے نتائج) کو دیکھیں ۷ـ

جو بندوں کے کلام پر بھی چسپاں ہو سکتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے کلام پر بھی۔ اگر اِن قواعد کے مطابق مجاز و استعارہ کا استعمال بتایا جائے گا تو ماننا پڑے گا کہ وہ معنے درست ہیں اگر اُن کے خلاف معنے کئے جائیں گے تو اُن معنوں کو غلط قرار دیا جائیگا شُبہ پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

اَشْتَاتًا **۷ـ حل لغات۔** اَشْتَاتًا کے معنے ہیں مُتَفَرِّقِیْنَ یعنی گروہ در گروہ۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ کی تشریح پہلے مفسّرین کے نزدیک

تفسیر۔ مفسّرین نے اس کے معنے آخرت کے لحاظ سے کئے ہیں۔ چونکہ انہوں نے تمام سورۃ کو آخرت پر چسپاں کیا ہے اِس لئے اِس کے معنے بھی انہوں نے نیک و بد۔ جنتی و دوزخی اور سفید و سیاہ کے کئے ہیں۔ مگر سفید و سیاہ سے انگریز اور ہندوستانی مراد نہیں بلکہ اِن کا اشارہ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (آل عمران ع ۱۱) کی طرف ہے کہ آخرت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے چہرے سفید ہوں گے اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ یعنی کچھ سُرخ رُو ہوں گے کچھ زیر الزام آئیں گے (دیکھ لو یہیں مجاز آ گیا) اسی طرح وہ اَشْتَاتًا کے معنے دائیں طرف والے اور بائیں طرف والے کے کرتے ہیں۔ مَیں چونکہ اِسے آخری زمانہ کے متعلق سمجھتا ہوں جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ ثانیہ مقدّر تھی اِس لئے مَیں اِس کے یہ معنے کرتا ہوں کہ اُس وقت جتھہ بندی زوروں پر ہوگی اور پارٹی بازی بہت ہوگی۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ میں آخری زمانہ کے متعلق ایک پیشگوئی

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا۔ یہ ایک خاص علامت ہے جو پہلے کسی زمانہ میں رُونما نہیں ہوئی صرف موجودہ زمانہ ہی ایسا ہے جس میں یہ علامت نمایاں طور پر نظر آتی ہے پہلے زمانوں میں صرف منفرد کوششیں کی جاتی تھیں۔ اجتماع اور اتحاد کا رنگ اُن میں مفقود تھا۔ اُس زمانہ میں ایک اچھے تاجر کے صرف اتنے معنے تھے کہ زید نے کچھ روپیہ لیا اور اُس نے اپنے شہر میں تجارت شروع کر دی۔ یا اچھے صنّاع کے معنے صرف اتنے تھے کہ فلاں ترکھان اچھی چیزیں بناتا ہے یا فلاں لوہار لوہے کا کام خوب جانتا ہے یا مزدور کے معنے صرف اتنے تھے کہ ایک غریب شخص کسی امیر کے ہاں ملازم ہو گیا یا اُس کا کوئی اَور کام معیّن معاوضہ پر کرنے لگا اُس زمانہ میں بھی بے شک مزدور بعض دفعہ آقا سے لڑ رہا ہوتا تھا اور اگر آقا کو غصہ آتا تو وہ مزدور پر اپنا غصہ نکال لیتا۔ مگر بہرحال ہر تاجر ہر صنّاع ہر مزدور اور ہر سرمایہ دار انفرادی جدوجہد کرتا تھا۔ اُسے اپنے ہم پیشہ دوسرے لوگوں کے حقوق اور اُن کے مطالبات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ زید چاہتا تھا کہ میرا معاملہ سُدھر جائے اور بکر چاہتا تھا کہ میرا معاملہ سُدھر جائے مگر قرآن کریم اس جگہ یہ خبر دیتا ہے کہ آخری زمانہ میں یہ اختلافات جتھہ بندی کی شکل اختیار کر لینگے اور پارٹی سسٹم بہت ترقی کر جائیگا اور لوگ یہ پارٹی بازی اس لئے کریں گے لِيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ کہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھیں یعنی انہیں یقین ہوگا کہ جتھہ بندی سے کام کرنے کے نتائج اچھے نکلتے ہیں اگر جتھہ بندی نہیں ہوگی تو ہمارے کام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا پہلے زمانہ میں مزدور اگر آقا کے رویّہ سے بہت تنگ آ جاتا تو وہ کہہ دیا کرتا تھا کہ میری مزدوری مجھے دے دیں مَیں چلا جاتا ہوں۔ مگر اس زمانہ میں جب مزدوروں نے دیکھا کہ اس طرح مالکوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ زید کا نوکر زید کے پاس جائے، بکر کا نوکر بکر کے پاس جائے، خالد کا نوکر خالد کے پاس جائے اور انفرادی رنگ میں اپنا مطالبہ پیش کرے سب اکٹھے ہو جاؤ اور مل کر اپنے حقوق کا سوال اُٹھاؤ۔ چنانچہ زید کا نوکر اور بکر کا نوکر اور خالد کا نوکر اور سلیم کا نوکر اور حامد کا نوکر سب اکٹھے مل جاتے ہیں اور وہ اپنی ایک ایسوسی ایشن قائم کر لیتے ہیں جب کسی مطالبہ کا وقت آئے تو سارے نوکر مل جاتے ہیں اور متحدہ طور پر اپنے حقوق کے متعلق شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً تنخواہ بڑھانے کا سوال ہو تو بجائے اس کے کہ زید کا نوکر زید کو،

بکر کا نوکر بکر سے اور خالد کا نوکر خالد سے الگ الگ مطالبہ کرے سب مل کر اپنے مالکوں کے سامنے متحدہ طور پر مطالبہ رکھ دیتے ہیں اور مالک مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُن کے حق کو تسلیم کریں۔ پس فرماتا ہے يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا اُس دن انفرادی جد وجہد کی بجائے تمام لوگ جتھہ بندی کر کے آئیں گے اور اس لئے آئیں گے لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں یعنی اُن کے فعل کا نتیجہ نکل آئے۔ انفرادی رنگ میں کوشش کرنے سے چونکہ ہر شخص کی طاقت ضائع چلی جاتی تھی اور کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا اِس لئے وہ اُس دن جتھہ بندی اور پارٹی سسٹم کی طرف مائل ہو جائیں گے اور متحدہ محاذ قائم کر کے اپنے مطالبات پیش کریں گے تاکہ اُن کی آواز میں اثر پیدا ہو اور وہ مطالبات جو اُن کی طرف سے پیش کئے جائیں اُن کو قبول کرنے کے لئے دوسرے لوگ تیار ہوں۔ چنانچہ دیکھ لو کنسرویٹو۔ لبرل۔ لیبر۔ ڈیموکریٹ۔ ری پبلکن ریڈیکل۔ نہلسٹ۔ نیشنلسٹ۔ سوشلسٹ۔ نازسی۔ فاسی۔ فلانجے۔ کمیونسٹ۔ مہا سبھا۔ کانگرسی۔ مسلم لیگی۔ یونی نسٹ وفدسٹ۔ سعدسٹ وغیرہ وغیرہ ہزاروں پارٹیاں دنیا میں بن رہی ہیں اور سب ایک ہی وجہ بتلاتے ہیں کہ بغیر جتھہ کے اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ پس فرماتا ہے يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ۔ لوگ اُس زمانہ میں پارٹیاں بنا کر اس لئے کام کریں گے تاکہ اُن کے کاموں کے اچھے نتیجے نکلیں۔ بے شک یہ خیالات دنیا میں پہلے بھی موجود تھے اور یہی چیزیں جو آج دنیا میں نظر آتی ہیں پہلے بھی پائی جاتی تھیں۔ پہلے بھی کئی مزدور تھے جو یہ کہا کرتے تھے کہ غریبوں کو کوئی پوچھتا نہیں اور کئی آقا اپنے ملازموں سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم نے ذرا بھی گستاخی کی تو تمہیں کان پکڑ کر نکال دیا جائیگا مگر پہلے زمانہ اور اس زمانہ میں فرق یہ ہے کہ پہلے پارٹی بازی اور جتھہ بندی نہیں تھی اب ہر گروہ نے اپنی الگ الگ تنظیم کر کے الگ الگ سوسائٹیاں قائم کر لی ہیں۔ ایک طرف ایمپلائرز ایسوسی ایشن ہوتی ہے تو دوسری طرف ایمپلائرز ایسوسی ایشن کام کر رہی ہوتی ہے۔ ایک طرف ریلوے اونرز ایسوسی ایشن بنتی ہے تو دوسری طرف ریلوے ایمپلائز ایسوسی ایشن قائم ہو جاتی ہے اسی طرح کسی جگہ کول مائنرز ایسوسی ایشن قائم ہے تو کسی جگہ کول اونرز ایسوسی ایشن کام کر رہی ہے۔ غرض ایک دوسرے کے مقابلہ میں سوسائٹیاں بن چکی ہیں۔ ایک نوکروں کی ایسوسی ایشن ہے تو ایک مالکوں کی۔ ایک اُن لوگوں کی ایسوسی ایشن ہے جو سیاسیات میں غالب ہیں تو ایک اُن لوگوں کی ایسوسی ایشن ہے جو سیاسیات میں مغلوب ہیں۔ گویا ہر طرف جتھہ بن گیا ہے اور اب فرد فرد کوشش نہیں کرتا بلکہ گروہ گروہ کوشش کرتا ہے یہی خبر تھی جو اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں دی کہ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا۔ اُس دن فرد فرد کوشش نہیں کرے گا بلکہ گروہ گروہ کوشش کرے گا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ تاکہ اُن کی کوششوں کے اچھے نتائج برآمد ہوں اور وہ اپنی قوتوں کو ضائع کرنے والے نہ ہوں۔ اِس جگہ هُمْ کی ضمیر اسی لئے لائی گئی ہے کہ اس میں متعدد گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہر گروہ اپنے اپنے حقوق کے متعلق جدوجہد کرے گا۔ لیبر مل کر کوشش کریں گے کہ لیبر کے حق میں نتیجہ نکل آئے سوشلسٹ مل کر کوشش کریں گے کہ سوشلسٹ کے حق میں نتیجہ نکل آئے نیشنلسٹ مل کر کوشش کریں گے کہ نیشنلسٹ کے حق میں نتیجہ نکل آئے۔ کمیونسٹ مل کر کوشش کریں گے کہ کمیونسٹ کے حق میں نتیجہ نکل آئے۔ غرض ہر پارٹی جتھہ بازی کے ذریعہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرے گی۔ چنانچہ آج دنیا میں ہزاروں پارٹیاں بن رہی ہیں اور کتابوں میں صاف طور پر لکھا جاتا ہے کہ پہلے زمانوں میں ناکامی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ مل کر کام نہیں کیا جاتا تھا اب ہم مل کر کام کریں گے اور اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ٹھیک ہے ہمارا بھی یہی منشاء تھا کہ انفرادی کوشش کی بجائے اُس دن قومی کوشش ہو تا خوب اچھی طرح خیر و شر کا فرق ظاہر ہو جائے۔ اس جگہ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ میں جہاں بندوں کی طرف سے اپنے حقوق کے لئے جد وجہد شروع ہونے کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ

اجتماعی جد وجہد

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ

پھر جس نے ایک ذرہ کے برابر (بھی) نیکی کی ہوگی وہ اُس (کے نتیجہ) کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے

يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ ع ۲۴

ایک ذرہ کے برابر (بھی) بدی کی ہوگی وہ اُس (کے نتیجہ) کو دیکھ لیگا ۵۸

کی طرف سے بھی اُن کی تائید کا اشارہ پایا جاتا ہے یعنی جہاں وہ اپنے اپنے دائرہ اور اپنے اپنے رنگ میں کوشش کر رہے ہونگے وہاں خدا تعالےٰ بھی کوشش کر رہا ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (آل عمران ع۶) انہوں نے بھی تدابیر کیں اور اللہ تعالےٰ نے بھی تدبیر کی اور اللہ تعالےٰ تمام تدبیر کرنے والوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اِسی طرح فرماتا ہے لوگ یہ تجویزیں کریں گے کہ ہم مل کر کام کریں اور ہم بھی اُن کو پوری طرح موقع دیں گے تاکہ اُن کے دلوں میں کوئی حسرت نہ رہے اور لوگ قومی طور پر اپنے حوصلے نکال کر آخر اِس امر کو تسلیم کریں کہ قانون اور پارٹی وہی اچھی ہے جسے خدا تعالےٰ بنائے۔

احمدیت کے مقابلہ اجتماعی جدوجہد

پہلے زمانہ میں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ابوجہل اُٹھا اور وہ اپنی تمام کوششوں اور منصوبہ بازیوں کے باوجود ناکام و نامراد ہوا اور ناکامی و نامرادی کی حالت میں ہی مرا تو گو اللہ تعالےٰ کا یہ ایک بہت بڑا نشان تھا جو ظاہر ہوا اور جس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو آفتابِ نصف النہار کی طرح ظاہر کر دیا مگر پھر بھی یہ انفرادی مقابلہ تھا قومی نہیں۔ قومی مقابلہ ہجرت کے بعد شروع ہوا جس نے کفار عرب کی مجموعی طاقت کو توڑ دیا۔ اِسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام کے زمانہ میں بے شک آپ کا شدید مقابلہ ہوا مگر اُس وقت مقابلہ کی تمام تر صورت انفرادی جدوجہد تک محدود تھی۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی الگ مقابلہ کر رہے تھے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب الگ مقابلہ کر رہے تھے۔ مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی الگ مقابلہ کر رہے تھے۔ بے شک اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کے مطابق اُن تمام کے تیروں کا نشانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام کی ہی ذات تھی لیکن بہرحال انہوں نے آپ کا اکٹھا مقابلہ نہیں کیا۔ ہر شخص الگ الگ شہر میں الگ الگ رنگ میں مقابلہ کر رہا تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب کسی رنگ میں مخالفت کر رہے تھے تو مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی کسی اور رنگ میں۔ مگر چونکہ یہ زمانہ وہ تھا جس میں يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا کی پیشگوئی کا ظہور ہونے والا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ۱۹۳۴ء میں احرار کو جماعت احمدیہ کے مقابلہ کے لئے کھڑا کر دیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم جماعت احمدیہ کو کچل کر رکھ دینگے پہلے کیا تھا۔ پہلے کوئی لدھیانہ میں مخالفت کر رہا تھا۔ کوئی لاہور میں مخالفت کر رہا تھا۔ کوئی دہلی میں مخالفت کر رہا تھا کوئی بٹالہ میں مخالفت کر رہا تھا۔ اب ہم مل کر احمدیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالینگے چنانچہ احرار کے ساتھ کانگرس بھی مل گئی اور پھر کسی مصلحت کے ماتحت حکومت بھی اُن کے ساتھ مل گئی۔ یہ مخالفت کا طوفان درحقیقت مظاہرہ تھا يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا کا۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا وہ خدا کے فضل اور حمایتِ احمدیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ اب شیعوں نے ہمارے مقابلہ میں سر نکالنا شروع کر دیا ہے اور وہ بھی احرار کی طرح یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم جماعتِ احمدیہ کو کچل دیں گے۔ غرض وہ مقابلہ جو پہلے انفرادی رنگ میں کیا جاتا تھا اب قومی مقابلوں کے رنگ میں تبدیل ہو چکا ہے اور احمدیت اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں اسی منزل میں سے گذر رہی ہے۔

۵۸ تفسیر۔ فرماتا ہے لوگوں کے اکٹھا کام کرنے سے ہمارے اِس قانون کی سچائی ثابت ہوگی کہ جو شخص ایک ذرہ بھر بھی عملِ خیر دوسروں کے ساتھ مل کر کرے گا وہ اُس کا نتیجہ دیکھ لیگا اور جو شخص ایک ذرہ بھر بھی عملِ شر دوسروں کے ساتھ مل کر کریگا

وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔ یعنی اُس زمانہ میں چونکہ ہر شخص اپنی پارٹی سے مل کر کام کرے گا اس لئے ہر قسم کے کام کا نتیجہ نمایاں نکلے گا۔ کیونکہ مشترک کام ذرہ ذرہ مل کر بھی پہاڑ ہو جاتا ہے الگ کیا ہوا کام ذرہ کے مطابق ہو تو اُس کا نتیجہ محسوس کرنا مشکل ہوتا ہے مگر وہ ذرہ بھر کام جو قوم کے ساتھ مل کر کیا ہو چھپ نہیں سکتا کیونکہ دوسروں کے ذرّوں سے مل کر وہ پہاڑ بن جاتا ہے پس فرماتا ہے چونکہ اُس دن پارٹیاں مل کر کام کریں گی ہر کام کا نتیجہ نمایاں نظر آئے گا اور عمل کا ایک ذرہ بھی ضائع نہیں ہوگا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی عمل کا ایک ذرہ دنیا میں کوئی قیمت نہیں رکھتا اور وہ ہوا میں اُڑ کر لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے لیکن جب ایک گروہ کا گروہ اپنا اپنا ذرہ ملائے تو ہر ذرہ دوسرے ذرات کے ساتھ مل کر ایک پہاڑ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح کوئی ذرہ بھی نمایاں ہونے سے نہیں رہ سکتا یہ مضمون درحقیقت گذشتہ آیت کے تسلسل میں ہی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ اُس دن يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا کا کیوں ظہور ہوگا۔ فرماتا ہے یہ ظہور اس لئے ہوگا تا ہمارے اس قانون کی سچائی نمایاں ہو جائے کہ دنیا میں جو شخص چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی کرتا ہے وہ اُس کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے خواہ وہ عملِ خیر ہو یا عملِ شر اگر انفرادی اعمالِ خیر اور انفرادی اعمالِ شر پر اس آیت کو چسپاں کیا جائے تو اس کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیامت کے دن ہر شخص کا عملِ خیر اور ہر شخص کا عملِ شر نمایاں ہوگا اور ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا میں لوگ بڑے بڑے خیر کے کام کرتے ہیں اور وہ چھپے رہتے ہیں۔ اسی طرح بڑے بڑے شر کے کام کرتے ہیں اور وہ چھپے رہتے ہیں۔ اگر دنیا میں ہر خیر اور ہر شر نمایاں ہو تو لوگوں کو گناہوں پر دلیری ہی کیوں پیدا ہو۔ ہزاروں لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو بڑے بڑے خیر کے کام کرتے ہیں مگر چونکہ وہ فرداً فرداً کرتے ہیں اُن کا کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا جس سے لوگوں کے دلوں میں خیر کی تحریک پیدا ہو۔ اسی طرح ہزاروں ہزار لوگ شر کرتے ہیں مگر چونکہ وہ فرداً فرداً کرتے ہیں اس لئے اُن کے شر کا کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا جس کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہو جائیں اور اعمالِ شر کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں۔ مگر فرماتا ہے ہم جس زمانہ کی خبر دے رہے ہیں اُس میں خیر کرنے والے بھی اپنے اپنے عمل کا ذرہ لاکر ایک جگہ ڈال دیں گے اور شر کرنے والے بھی اپنے اپنے عمل کا ذرہ لاکر ایک جگہ ڈال دیں گے۔ اس کا طبعی طور پر یہ نتیجہ نکلے گا کہ جب ساری دنیا کے خیر اکٹھے ہو جائیں گے تو وہ بھی ایک پہاڑ بن جائیں گے اور جب ساری دنیا کے شر اکٹھے ہو جائیں گے تو وہ بھی ایک پہاڑ بن جائیں گے۔ گویا ان الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اُس دن کفر و اسلام کا نظامی مقابلہ ہوگا۔ ایک طرف کفر اپنے تمام لشکر کو اکٹھا کر کے نظام قائم کرے گا اور دوسری طرف اسلام کے احیاء اور اُس کی تقویت کے لئے اعمالِ خیر کرنے والوں کا ایک نظام قائم کیا جائے گا اور پھر ان دونوں نظاموں کا آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ کفر چاہے گا کہ وہ اسلام کو ختم کر دے اور اسلام چاہے گا کہ وہ کفر کو تباہ کر دے یہ پیشگوئی جو ان آیات میں کی گئی ہے اس پر غور کر کے دیکھ لو پہلے کسی زمانہ میں یہ پوری نہیں ہوئی۔ نہ کفر نے اجتماعی مقابلہ کے لئے کوئی نظام قائم کیا اور نہ اسلام میں کفر کا سر کچلنے کے لئے کوئی باقاعدہ نظام قائم ہوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی چندہ کی ضرورت محسوس ہوتی تو آپ صحابہؓ کو اکٹھا فرماتے اور انکے سامنے چندے کا اعلان کر دیتے۔ صحابہؓ اُسی وقت اپنی اپنی توفیق کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا چندہ پیش کر دیتے۔ یہ نظر نہیں آتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی بیت المال قائم کیا ہو اور ایک نظام کے ماتحت جماعت کے ہر فرد سے باقاعدہ چندہ وصول کیا جاتا ہو۔ مگر اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابتداء دعویٰ میں ہی پانچ مدات قائم فرما دیں جن کا "فتح اسلام" میں تفصیل کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ اور لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اسلام کے احیاء اور اُس کی ترقی کے لئے ان مدات میں روپیہ ارسال کریں۔ گویا آپ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی ایک نظام کی بنیاد رکھ دی اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بنیادوں کو اور بھی پختہ اور مضبوط بنا دیا یہاں تک

آپ نے اعلان فرمادیا کہ جو شخص تین ماہ تک اِس سلسلہ کے لئے کوئی معین ارسال نہیں کرتا اُس کا ہماری جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ غرض اسلام کے احیاء کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک نظام قائم فرمادیا ہے۔ اُدھر کفر نے بھی اپنی تمام طاقتیں جمع کر لی ہیں اور وہ اسلام کو کچلنے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر میں منہمک ہے۔ مسیحیت کی تبلیغ آریہ سماج کی تبلیغ، سکھوں کی تبلیغ، یہودیت کی تبلیغ انفرادی طور پر نہیں ہو رہی بلکہ بڑی بڑی سوسائٹیاں لاکھوں کروڑوں روپیہ جمع کر کے باقاعدہ طور پر کر رہی ہیں۔ پس فرماتا ہے جب وہ آخری زمانہ آئے گا جس میں ہمارے رسول کی بعثت ثانیہ مقدر ہے تو ہم ادھر خیر کرنیوالوں کو کہیں گے کہ تم اکٹھے ہو جاؤ۔ اُدھر شر کرنے والوں کو ملائکہ تحریک کریں گے کہ تم اکٹھے ہو جاؤ۔ اِس طرح کفر و اسلام کا عظیم الشان ٹکراؤ ہوگا جس میں آخر اسلام کو فتح ہوگی اور یہ سب کچھ ہم اِس لئے کریں گے تا دنیا کے لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تو غافل رہے ہمیں تو اپنے دل کے حوصلے نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگر ملتا تو ہم اسلام کو کبھی ترقی کرنے نہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نہیں چاہتے کہ کفر کے دل میں کوئی حسرت باقی رہ جائے اُسے اپنے حوصلے نکالنے کا موقع نہ ملے اور وہ کہہ سکے کہ اگر مجھے تیاری کا موقع ملتا تو میں بتا دیتا کہ اسلام دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔ ہم اُسے پوری طرح موقع دیں گے اور اعمال شر کرنیوالے اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں گے۔ وہ خوب سمجھتے ہوں گے کہ وہ کیا مقصد لے کر کھڑے ہوئے ہیں اور اُن کے کیا کیا ارادے ہیں۔ اسی طرح اعمال خیر کرنے والے بھی اپنی ذمہ واریوں سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔ اِس وجہ سے کفر و اسلام کی اس باہمی ٹکر کا جو نتیجہ نکلے گا وہ آخری اور قطعی ہوگا اور شر کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ مجھے خیر کے مقابلہ کی فرصت نہیں ملی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ کے معنے ترتیب مضمون کے لحاظ سے

یہ تو دینی معاملہ کی میں نے مثال پیش کی ہے اگر دنیوی مثالیں لے لو تب بھی تمہیں نظر آئے گا کہ جس طرح اس زمانہ میں مختلف پارٹیوں کی صورت میں مل کر کام کیا جاتا ہے اِس کی پہلے زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ مثلاً جہاں تک ظالم لوگوں کی موجودگی کا تعلق ہے یہ عنصر صرف اس زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر زمانہ میں ظالم لوگ ہوتے رہے ہیں اور ہر زمانہ میں لوگوں کو اُن سے شکایتیں ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ پہلے زمانوں میں بھی کئی ایسے نوکر ہوتے تھے جو اپنے آقاؤں کو مار ڈالتے تھے۔ ہزاروں واقعات ایسے پائے جاتے ہیں کہ آقا نے اپنے نوکر کو کسی بات پر گالی دی تو اُس نے بُرا منایا اور رات کو جب وہ سو رہا تھا اُسے قتل کر دیا۔ مگر اس کا کوئی گہرا یا دیرپا اثر نہیں ہُوا کرتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھا جاتا کہ زید کو اُس کے نوکر نے قتل کر دیا ہے یا بکر کو اُس کے نوکر نے قتل کر دیا ہے۔ دنیا کو اس کا کوئی نتیجہ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ یہ کام اَور دوسرے کاموں میں چُھپ جاتا۔ مگر اس زمانہ میں جب رُوس میں کمیونسٹوں نے سر اُٹھایا اور اُنہوں نے مل کر اپنے مالکوں کو مار ڈالا تو اِس کا کتنا عظیم الشان نتیجہ نکلا کہ حکومت ہی بدل گئی۔ اسی طرح مزدور ناخوش ہو کر پہلے زمانہ میں بھی کام چھوڑ دیا کرتے تھے اور کسی کو پتہ بھی نہیں لگتا تھا کہ دنیا میں کیا تغیر ہُوا ہے لیکن اس زمانہ میں لیبر سٹرائکس کے ذریعہ سے مالکوں کی گردنیں یوں جُھک جاتی ہیں کہ خدا یاد آجاتا ہے۔ یہی حال سُود کا ہے۔ سود لوگ پہلے ہی چلے آئے ہیں لیکن اِس زمانہ میں بنکوں کے ذریعے دنیا کو اس طرح قابو کر لیا گیا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ پہلے کسی گاؤں کے ایک کونہ میں بیٹھ کر بنیا چند لوگوں سے سُود لیتا اور کسی کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا تھا مگر اب ایسے بنک نکل آئے ہیں جن کی ساری دنیا میں شاخیں ہیں اور اس طرح سُود کا جال وسیع کر کے ساری دنیا کو قابو کر لیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت بھی ہمیشہ سے چلی آتی ہے لیکن اب کمپنیوں کے ذریعہ سے اس طرح دوسرے ملکوں کا دیوالہ نکالا گیا ہے کہ غریب حیران و پریشان نظر آتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں صرف معمولی تاجر ہُوا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں کمپنیاں نکل آئی ہیں۔ پہلے خواہ کوئی کتنا بڑا تاجر ہو جائے لوگوں کو اُس کا پتہ بھی نہیں لگتا تھا اور وہ لوگوں کی دولت کو بھی زیادہ نہیں کھینچ سکتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں کمپنیوں نے اس طرح دولت کھینچی ہے کہ بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ کمپنیوں میں

ملازمت اختیار کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ انہیں گورنمنٹ سروس میں کوئی جگہ ملے۔ لارڈ مانڈ انگلستان کا وزیر خزانہ تھا مگر وزارت چھوڑ کر وہ امپیریل کیمیکل انڈسٹری میں ملازم ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور مشہور شخص غالباً سرکینر نام تھا وہ بھی پہلے وزیر خزانہ تھا مگر پھر اس عہدہ سے الگ ہو کر ریلوے کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ وزارت کے عہدہ کی صورت میں اُسے پانچ ہزار پونڈ ملتے تھے مگر ریلوے کمپنی میں ملازمت اختیار کرنے پر اُسے تیس ہزار پونڈ ملنے لگ گئے گویا قریباً پانچ لاکھ روپیہ سالانہ اُس کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا۔ غرض کمپنیوں نے تجارت اور صنعت و حرفت کے ذریعہ اس قدر دولت کھینچی ہے کہ پرانے زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے صنّاع اور بڑے سے بڑے تاجر کی بھی اتنی آمد نہیں ہوتی تھی جتنی آج کل کمپنیوں کے نوکروں کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ پھر کمپنیوں سے ترقی کر کے ٹرسٹ بن گئے ہیں اور ٹرسٹ سے ترقی کر کے کارٹل بن گئے ہیں۔ اس طرح ہر کام لوگوں نے اجتماعی رنگ میں شروع کر کے اُسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔

غرض يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا نے یعنی ایک دوسرے کے بالمقابل ایک ایک کر کے نکلنے کی جگہ پارٹی پارٹی بن کر نکلنے نے وہ نمود دکھایا ہے کہ دنیا نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ پارٹیاں خیر کا کام کرتی ہیں تو وہ بھی ایک عظیم الشان شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اگر بُرا کام کرتی ہیں تو وہ بھی ایک مہیب اور دل پر کپکپی نازل کر دینے والی شکل میں نظر آتا ہے۔ چونکہ مومن بھی اُس دن مل کر کام کریں گے اس لئے اُن کے خیر کے نتائج بھی بڑے شاندار ہوں گے بلکہ چونکہ خیر کا دس گنا اجر ہے اس لئے اُن کے خیر کے نتائج شر کے نتائج پر غالب آجائیں گے۔

یہ معنے تو ترتیب کے لحاظ سے ہوئے۔ یوں بھی اپنی ذات میں یہ آیت نہایت اہم ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس آیت کی نسبت فرماتے ہیں۔ آپ سے گدھوں کے بارہ میں پوچھا گیا کہ اُن کے رکھنے کا کیا ثواب ہے تو فرمایا مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْھَا شَیْئًا اِلَّا ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ الْفَاذَّۃَ الْجَامِعَۃَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ فَاذَّۃٌ کے معنے ہیں منع کرنے والی اور جَامِعَۃ کے معنے ہیں سمیٹنے والی یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بارہ میں مجھ پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ ایک فاذّہ اور جامعہ آیت نازل ہو چکی ہے کہ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ یعنی ہر چیز جس کو نکالنا مقصود ہے اُس کو اس آیت کے ذریعہ نکال دیا گیا ہے اور ہر چیز جس کو سمیٹنا مقصود ہے اُس کو اس آیت کے ذریعہ سمیٹ لیا گیا ہے گویا یہ آیت جزائے خیر و شر کے متعلق ایک جامع مانع قاعدہ پر مشتمل ہے۔ جزائے خیر یا جزائے شر سے تعلق رکھنے والی کوئی بات نہیں جو اس میں بیان نہ کی گئی ہو۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں انسان ہزاروں کام خیر یا شر سے تعلق رکھنے والے کرتا ہے مگر وہ خیر اور شر کے سب کام مٹ جاتے ہیں اور کسی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ زید نے فلاں خیر کا کام کیا تھا یا بکر سے فلاں شر کا صدور ہوا تھا۔ بیسیوں انسان دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کی بدخواہی کے خیالات اپنے دلوں میں رکھتے ہیں مگر جن لوگوں کی بُرائی کے خیالات ہر وقت اُس کے دل و دماغ میں پرورش پاتے ہوتے ہیں اُن کو اس بات کا کچھ بھی علم نہیں ہوتا کہ فلاں شخص ہمارے متعلق کیسے بُرے خیالات رکھتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا جو شخص کسی کے متعلق غیبت میں کوئی بُرا کلمہ کہتا ہے اور ایک تیسرا شخص جو اس بات کو سُن رہا ہوتا ہے اُس جگہ سے اُٹھ کر دوسرے شخص کے پاس چلا جاتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ تمہارے متعلق آج فلاں نے یہ بات کہی ہے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی نے دوسرے کی طرف تیر پھینکا مگر وہ تیر اُس کو لگا نہیں بلکہ زمین پر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر ایک اور شخص دوڑا دوڑا آیا اور اُس نے وہ تیر اُٹھا کر اپنے ہاتھوں سے دوسرے کے سینہ میں پیوست کر دیا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہزاروں لوگ دوسروں کی بدخواہی کے خیالات اپنے دلوں میں رکھتے ہیں مگر اُن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا نہ دوسروں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے متعلق فلاں شخص کیسے گندے خیالات رکھتا ہے اور نہ اُس کے

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ کے معنے ترتیب آیت کے علاوہ

ان خیالات کا دنیا میں کوئی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ یا اسی طرح ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن کے دلوں میں دوسروں کے متعلق نیک خیالات پیدا ہوتے ہیں مگر اُن دوسرے اشخاص کو کچھ بھی علم نہیں ہوتا کہ فلاں شخص کو ہم سے محبت ہے یا اُس کا دل ہماری ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے لبریز ہے۔ ایک شخص کو دوسرے سے غائبانہ محبت ہوتی ہے مگر اس وجہ سے کہ محبت اُس کے دل میں مخفی ہوتی ہے دوسرا شخص محض بے خبر ہوتا ہے اور اُسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ فلاں شخص میرا دوست ہے۔ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میری مصیبت کی گھڑیوں میں میرا ساتھ دینے والا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو شخص آپس میں گہرے دوست ہوتے ہیں، اُن کے ایک دوسرے سے مخلصانہ تعلقات ہوتے ہیں اور وہ مصیبت میں ایک دوسرے کے ہمیشہ کام آتے رہتے ہیں مگر اس کے باوجود ایک کو دوسرے کے اندرونی جذبات کا علم نہیں ہوتا۔ اُن میں سے ایک شخص راتوں کو اُٹھتا اور اللہ تعالےٰ سے اُس کے لئے رو رو کر دعائیں مانگتا ہے مگر دوسرے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ رات کی تاریکیوں میں جب ساری دنیا محوِ استراحت ہوتی ہے میرا دوست میرے لئے اللہ تعالےٰ کے حضور سربسجود ہے اور وہ میری بھلائی کے لئے اللہ تعالےٰ کی رحمت کے دروازہ کو کھٹکھٹا رہا ہے۔

غرض دنیا میں ہمیں یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ ہزاروں ہزار اعمالِ خیر اور ہزاروں ہزار اعمالِ شر لوگوں کی نگاہ سے مخفی رہتے ہیں لیکن فرماتا ہے اللہ تعالےٰ کے معاملہ میں یہ بات نہیں اللہ تعالےٰ کے حضور کسی کا خفیف سے خفیف خیر اور کسی کا خفیف سے خفیف شر بھی ضائع نہیں جاتا۔ وہ ہر خیر سے آگاہ ہے وہ ہر شر سے واقف ہے اور خواہ کوئی کتنا ہی حقیر اور معمولی کام ہو وہ اُس کی نگاہ سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ تم مت سمجھو کہ جس طرح بنی نوع انسان کے معاملات میں تمہارے خیر کے اعمال بھی مخفی رہتے ہیں اور تمہارے شر کے اعمال بھی مخفی رہتے ہیں اسی طرح خدا تعالےٰ کا حال ہوگا ایسا ہرگز نہیں ہوگا مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔

بنی نوع انسان کے معاملہ میں بسا اوقات تمہارے خیر کے پہاڑ بھی غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح بنی نوع انسان کے معاملہ میں تمہارے شر کے پہاڑ بھی غائب ہو جاتے ہیں مگر خدا تعالےٰ کی نگاہ سے تمہارا کوئی عمل مخفی نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص عملِ شر کرے اور دوسرے لوگوں سے مخفی رہے مگر خدا تعالےٰ کے حضور ایسا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً دنیا میں ہزاروں واقعات ایسے ہوتے رہتے ہیں کہ بعض لوگ دوسروں کو چوری چھپے زہر دے دیتے ہیں اور باوجود تلاش و جستجو کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے زہر دی۔ یا اسی طرح ہزاروں قاتل ایسے ہوتے ہیں جو پکڑے نہیں جاتے۔ اب جہاں تک شر کا تعلق ہے قاتل نے دوسرے پر شر کا ایک پہاڑ گرا دیا مگر وہ مخفی رہا۔ کئی لوگ دوسرے کو جنگل میں اکیلا پا کر قتل کر دیتے ہیں اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کس نے قتل کیا ہے۔ بالکل ممکن ہے ایک شخص دوسرے کو علیحدگی میں قتل کر کے آ جائے اور پھر اُسی مقتول کے بیٹے کا دوست بن جائے۔ وہ دونوں دانت کاٹی روٹی کھانے لگیں اُس کا بیٹا اپنے دوست کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار رہے اور اسے یہ معلوم تک نہ ہو کہ میرے باپ کو اسی شخص نے قتل کیا تھا جس سے میں محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہوں۔ غرض دنیا میں ہمیشہ یہ نظارے نظر آتے ہیں کہ ایک شخص شر کا پہاڑ اُٹھا کر دوسرے پر گرا دیتا ہے مگر خود اس طرح غائب ہو جاتا ہے کہ دوسرے کو پتہ تک نہیں چلتا کہ میرے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے۔ اور چونکہ بہت سے اعمالِ خیر اور بہت سے اعمالِ شر دنیا میں ظاہر نہیں ہوتے اس لئے ضروری تھا کہ ایک ہستی ایسی ہوتی جس کے علم میں انسان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا فعل آ جاتا اور وہ اُس کے مطابق اُس کو بدلہ دیتا تاکہ خیر کرنے والے کو یہ حسرت نہ رہے کہ میری فلاں نیکی ضائع چلی گئی اور شر کرنے والے کو یہ غرور نہ رہے کہ میں نے فلاں شر تو کیا مگر میں اُس کے تلخ انجام سے محفوظ رہا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے اعمالِ خیر اور بہت سے اعمالِ شر ظاہر ہو جاتے ہیں بالخصوص وہ عملِ خیر یا وہ عملِ شر جو عظیم الشان ہو عام طور پر مخفی نہیں رہتا اور لوگوں کو اُس کا علم ہو جاتا ہے لیکن چھوٹے گناہ اور چھوٹی

نیکیاں تو ہزاروں ایسی ہیں جو بالکل مخفی رہتی ہیں مثلاً کسی کے دل میں نیکی کا خیال آنا یہ خود ایک عملِ خیر ہے اور کسی کے دل میں کسی بُرائی کا پیدا ہونا یہ خود ایک شر ہے مگر کون دوسرے کے دل کو پھاڑ کر دیکھ سکتا ہے کہ اُس میں شر پیدا ہے یا عملِ خیر پرورش پا رہا ہے۔ لیکن جب ایک زندہ اور علیم و خبیر ہستی موجود ہو تو پھر اس امر کا کوئی خدشہ نہیں رہ سکتا کہ میری نیکی مخفی رہ جائے گی یا بدی چھپ سکے گی کیونکہ وہ ہستی ہر وقت انسان کی نگران ہوگی اور اُس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی ضائع نہیں جانے دے گی۔

پھر اگر ہم انسانی اعمال پر نظر دوڑائیں اور بنی نوع انسان کی اکثریت کو دیکھیں تو ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسانی اعمال سب کے سب بڑے نہیں ہوتے بلکہ اُن میں سے اکثر چھوٹے ہوتے ہیں۔ بڑا عمل کرنے کی کسی کسی انسان کو توفیق ملتی ہے ورنہ ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ساری عمر گذر جاتی ہے مگر اُن کو کوئی بڑا کام کرنے کی توفیق نہیں ملتی اور اس وجہ سے وہ نمایاں طور پر لوگوں کے سامنے نہیں آتے۔ وہ دنیا کی نگاہوں سے مخفی رہتے اور مخفی ہونے کی حالت میں ہی اس دنیا سے گذر جاتے ہیں۔ اُن کی حیثیت بالکل اُن بوٹیوں کی سی ہوتی ہے جو پہاڑوں میں پیدا ہوتی اور کچھ عرصہ کے بعد مُرجھا جاتی ہیں نہ اُن سے کوئی فائدہ اُٹھاتا ہے نہ کسی کو اُن کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے۔ پس اگر دنیا کا کوئی خدا نہ ہوتا۔ اگر ایک ایسی ہستی موجود نہ ہوتی جس کی نظر انسان کے دل کے مخفی گوشوں تک وسیع ہے اور جو انسان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی جاننے والا اور انسان کو اُس کی جزا دینے والا ہے تو وہ لوگ تو زندہ ہی مر جاتے جن کی ساری عمر گذر جاتی ہے مگر اُن سے کوئی بڑا عمل ظاہر نہیں ہوتا۔ یہی حکمت ہے کہ اسلام نے بنی نوع انسان کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ اِس عالم کا ایک خدا ہے جس کی نگاہ میں انسان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا کام آجاتا ہے۔ اگر کوئی عملِ خیر کرتا ہے تو وہ بھی خدا تعالےٰ کے علم میں ہوتا ہے اور اگر کوئی عملِ شر کرتا ہے تو وہ بھی خدا تعالےٰ کے علم میں ہوتا ہے۔ تم مت سمجھو کہ تمہارے اعمال ضائع چلے جائیں گے اور اُن کا کوئی نتیجہ رُونما نہیں ہوگا۔ اگر دنیا میں تمہارے اعمالِ خیر مخفی رہے ہیں اور کسی نے اُن کو نہیں دیکھا تو تم مت گھبراؤ آسمان پر ایک زندہ خدا موجود ہے جو تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے وہ تمہیں نیکیوں کی جزا دے گا اور تمہارا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اُس کے سامنے اسی طرح آجائے گا جس طرح کوئی بڑے سے بڑا کام آتا ہے۔

غرض یہ آیت ایسی ہے جو انسانی زندگی کی کایا پلٹنے والی اور لوگوں کے قلوب میں ایک نئی اُمنگ، نئی رُوح اور نئی بیداری پیدا کرنے والی ہے اگر یہ آیت نہ اُترتی تو اکثر انسان اپنے آپ کو لاوارث سمجھتے کیونکہ اکثر انسان ایسے ہوتے ہیں جن کی نہ خیر عظیم الشان ہوتی ہے اور نہ شر عظیم الشان ہوتا ہے۔ دس کروڑ آدمیوں کی دنیا میں اگر تم قاتل تلاش کرنے لگو تو وہ بھی تمہیں زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ملیں گے اور تم دیکھو گے کہ دنیا میں شر کے لحاظ سے بھی صرف چند کی طرف لوگوں کی توجہ پھرتی ہے سب کی طرف نہیں۔ حالانکہ ایک قاتل یا ایک ڈاکو یا ایک چور جسے بُرا سمجھا جاتا ہے اُس کے مقابل میں اور بھی لاکھوں لوگ ہوتے ہیں جن سے شر ظاہر ہوتا رہتا ہے مگر لوگوں پر اُن کے شر کی کیفیت مخفی رہتی ہے۔ مثلاً قاتل تو اپنی زندگی میں صرف ایک یا دو قتل کرتا ہے مگر ایک اَور آدمی ایسا ہوتا ہے جس سے سارا دن شر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ کسی کو اچھے لباس میں ملبوس دیکھتا ہے تو اُس کا دل کباب ہو جاتا ہے۔ کسی کو اچھا کھانا کھاتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے اس کمبخت کا گلا بھی نہیں گھُٹتا۔ کسی کو آرام و آسائش میں زندگی بسر کرتے دیکھتا ہے تو جل بھُن کر رہ جاتا ہے اور کہتا ہے یہ مرتا بھی نہیں اِس کمبخت پر کوئی بیماری بھی نہیں آتی کہ اِسے بھی تکلیف کا احساس ہو۔ غرض سارا دن اُس سے شر ظاہر ہوتا رہتا ہے مگر اُس کے شر کی دنیا میں کوئی نمائش نہیں ہوتی اور اسی حالت میں اُس کی تمام عمر گذر جاتی ہے۔ اِس کے مقابل میں ایک اَور شخص ایسا ہوتا ہے جس کے پاس کروڑ دو کروڑ روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی قائم کرے یا کوئی اَور

علمی ادارہ قائم کرے بلکہ اکثر لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ کی راہ میں چند پیسے دینے کی بھی توفیق نہیں ہوتی مگر وہ سارا دن اپنے دل میں یہی کہتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا کا بھلا کرے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کو بلاؤں سے نجات دے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کی مصیبتوں اور اُن کی تکلیفوں کو دُور کرے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے لئے اپنے فضل کے دروازے کھولے۔ یہی دعائیں اُن کے ورد زبان رہتی ہیں اور وہ اسی حالت میں اس دنیا سے گذر جاتے ہیں کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اُن سے کیا کیا خیر ظاہر ہوتی رہی ہے۔ اگر لوگوں کا خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ نہ ہوتا تو ساری دنیا اسی طرح مر جاتے جس طرح پہاڑوں میں پیدا ہونے والی بوٹیاں چند دن اپنی بہار دکھا کر خاک ہو جاتی ہیں تو اُن کے اعمالِ خیر بھی فنا ہو جاتے اور اعمالِ شر بھی فنا ہو جاتے۔ نہ نیکوں کو اُن کی نیکی کا کوئی فائدہ پہنچتا اور نہ بدوں کو اُن کی شرارتوں کا کوئی خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ نیک لوگ اپنے آپ کو لاوارث سمجھتے اور بُرے لوگ تمرّد اور سرکشی میں بڑھ جاتے اور وہ سمجھتے کہ ہم سے کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے جو کچھ ہمارے جی میں آئے ہم کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال آئے تو غلطی کرو گے مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ ایک خدا ہے جو اس دنیا کو پیدا کرنے والا ہے اور جس کی نظر سے انسان کا باریک سے باریک عملِ خیر بھی پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اے کمزور اور بیمار انسان! اے لُولے لنگڑے انسان! اے غریب اور نادار انسان! تُو مت گھبرا۔ آسمان پر ایک خدا تیرے حالات کو دیکھ رہا ہے اور اُس کی نگاہ سے تیرا کوئی عمل پوشیدہ نہیں۔ اے کمزور اور ناطاقت انسان! جو کسی کی مدد نہیں کر سکتا اے لُولے لنگڑے انسان! جو کھڑے ہو کر نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اے بیمار اور نحیف انسان جو دینی خدمات کی ادائیگی کے لئے اپنے اندر چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا۔ تیرا دل گھبرا تا ہوگا کہ دوسرے لوگ تو نیکیوں میں حصہ لے گئے اور میں محروم رہ گیا۔ تُو پریشان مت ہو تیرا دل اپنی اس بیکسی کو دیکھ کر گھبرائے نہیں تیری وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی جو اِن حالات میں تجھ سے ظاہر ہوتی ہے، تیرا چھوٹے سے چھوٹا وہ نیک خیال بھی جو تیرے دل کے اندرونی گوشوں میں پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے حضور وہی قدر و قیمت رکھتا ہے جو دوسروں کے بڑے بڑے اعمالِ خیر رکھتے ہیں۔ بے شک تُو نے جب دین کی خدمت کے لئے ایک پیسہ یا دھیلہ نکال کر دیا تو لوگ تجھ پر حقارت کی ہنسی ہنسے۔ تُو نے ایک روٹی کا ٹکڑا پیش کیا تو وہ تجھ پر مسکرائے اور انہوں نے کہا اس روٹی کے ٹکڑے سے کیا بن جائے گا مگر تُو مت گھبرا۔ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ۔ تیرے عمل خواہ کتنے حقیر ہوں، تیری کوششیں خواہ کتنی ادنیٰ ہوں، تیری بیکسی خواہ کس قدر ظاہر ہو، بے شک دنیا نے تیرے اعمال کی قدر نہیں کی، اُس کی نگاہ تیرے خیر کو دیکھنے سے قاصر رہی ہے مگر خدا تیرے عملِ خیر کو دیکھ رہا ہے اور وہ ایک دن تجھ کو بھی اپنے ان کاموں کے نتائج دکھا دے گا۔

دوسری طرف یہ آیت عملِ شر کرنے والوں کو تنبیہ کرتی اور اُن سے کہتی ہے اے شریر انسان! تُو جو چوری چھپے شرارتیں کرتا ہے، تجھے چوروں میں بھی عظمت حاصل نہیں، تجھے ڈاکوؤں میں بھی عظمت حاصل نہیں اور تجھے شر کرتے ہوئے دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا مگر ہم تجھے دیکھ رہے ہیں اور ہم تجھ کو ان شرارتوں کا ایک دن پوری طرح مزہ چکھا دیں گے۔ غرض جزائے خیر و شر کے متعلق یہ ایک ایسا عظیم الشان اصل ہے کہ اگر اس کو پوری طرح سمجھ لیا جائے تو صحیح نیکی پیدا ہوتی اور بدی سے بچنے کا صحیح جذبہ انسانی قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ پھر تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ نہ جنت ہے نہ دوزخ۔ جب ہر بدی کا بدلہ ضرور دیکھنا ہوگا تو پھر بخشش اور توبہ کے کیا معنے ہوئے۔ اور جب ہر خیر کا بدلہ ضرور دیکھنا ہوگا تو پھر دوزخ میں لوگ کیوں ڈالے جائیں گے۔ گویا ایک آیت وہ ہے جو جنت کی نفی کرتی ہے اور دوسری آیت وہ ہے جو دوزخ کی نفی کرتی ہے مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ دوزخ کی نفی کر رہی ہے اور وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

جنت کی نفی کر رہی ہے۔ پس یہ کیسی آیت ہوئی کہ دودھاری تلوار بنکر اِس نے جنت کو بھی اُڑا دیا اور دوزخ کو بھی اُڑا دیا۔ جنت کو بھی بے کار قرار دے دیا اور دوزخ کو بھی بے کار قرار دے دیا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ سچ ہے کہ کوئی چیز ضائع نہیں جاتی۔ لیکن اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح دنیا میں حساب ہوتا ہے اِسی طرح خدا تعالےٰ کے قانون میں بھی حساب مقدر ہے۔ فرض کرو زید اور بکر دو آدمی ہیں اور زید کے بکر کے پاس ایک ہزار روپے ہیں لیکن زید کے ذمہ بکر کے دو ہزار روپے ہیں۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جب حساب ہوگا تو بکر اُس سے صرف ایک ہزار روپیہ مزید لے کر اپنے گھر چلا جائے گا۔ ایسی صورت میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بکر کا ہزار روپیہ ضائع گیا۔ بکر کا اُس کے دو ہزار کی جگہ ہزار لے جانا ہی بتاتا ہے کہ اُس کا ہزار ضائع نہیں گیا بلکہ کام آگیا کیونکہ بکر نے تو دو ہزار روپے لینے تھے مگر چونکہ زید کے ایک ہزار روپے اُس کے پاس پہلے موجود تھے اِس لئے دو ہزار میں سے ایک ہزار روپے وضع ہو گئے اور زید کو دو ہزار کی بجائے صرف ایک ہزار روپیہ زاید دینا پڑا۔ یہی حال نیکیوں اور بدیوں کا ہے۔ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ (ھود ع۱۰) تم نمازیں قائم کرو صبح کو بھی اور شام کو بھی۔ اِسی طرح رات کے دونوں کناروں میں یعنی ہر تغیر جو واقعہ ہوتا ہے اُس میں تمہیں اللہ تعالےٰ کی عبادت کرنی چاہیئے۔ دن آئے تو تم عبادت کرو دن جانے لگے تو تم عبادت کرو۔ رات آئے تو تم عبادت کرو رات جانے لگے تو تم عبادت کرو۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ دنیا میں ہر تبدیلی کوئی نہ کوئی اثر چھوڑ جاتی ہے اور وہ تغیر اور تبدیلی یا تو خیر کا موجب ہوتی ہے یا شر کا موجب ہوتی ہے۔ اگر تم اللہ تعالےٰ کی عبادت بجا لاؤ گے اور ہر تغیر کے وقت اللہ تعالےٰ کی طرف جھکو گے تو اگر وہ تغیر تمہارے لئے کسی شر کا موجب ہوگا تو عبادت کرنے سے وہ شر دور ہو جائے گا اور اگر کسی شر کا موجب نہیں ہوگا تو تمہارے اعمالِ خیر میں اضافہ ہوتا رہے گا دونوں طرح تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جب نیا دن آئے گا تو یا تمہارے لئے خیر لائے گا یا شر لائے گا اور جب دن جائے گا تو یا تمہارے لئے خیر چھوڑ جائے گا یا شر چھوڑ جائے گا۔ اِسی طرح رات آئے گی تو یا تمہارے لئے خیر لائے گی یا شر لائے گی اور جب رات جائے گی تو یا تمہارے لئے خیر چھوڑ جائے گی یا شر چھوڑ جائے گی۔ اگر تم ہر تغیر کے وقت اللہ تعالےٰ کی عبادت بجا لاؤ گے تو تمہاری نمازیں اور تمہاری عبادتیں اور تمہاری دعائیں شر کو اُڑا دیں گی۔ کیونکہ بہرحال رات اپنے آنے اور جانے کے وقت اِسی طرح دن اپنے آنے اور جانے کے وقت یا خیر لائے گا یا شر لائے گا یا خیر چھوڑ جائے گا یا شر چھوڑ جائے گا۔ اگر دن آتے اور جاتے تمہارے لئے شر چھوڑ گیا ہے اور تم نے نماز پڑھ لی ہے تو دن کا شر دور ہو جائے گا اور اگر رات آتے اور جاتے تمہارے لئے شر چھوڑ گئی ہے اور تم نے نماز پڑھ لی ہے تو رات کا شر دور ہو جائے گا۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ اللہ تعالےٰ کا یہ قانون ہے کہ نیکی بدی کا ازالہ کر دیا کرتی ہے اگر بدی ہو تو نیکی سے وہ فوراً کٹ جاتی ہے اور اگر خیر ہی خیر ہو تو پھر عبادت تمہاری نیکیوں کو اور بھی بڑھا دے گی۔ یہ ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ اُن نیکیوں کو شر کے ازالہ پر خرچ کیا جائے۔ بہرحال اللہ تعالےٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ جب تم سے کوئی شر ظاہر ہو یا کسی شر کا امکان تمہارے لئے پیدا ہو تو تم فوراً نیکی کر لیا کرو تاکہ بدی کٹ جائے اور تمہیں اُس کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ یہ ایک گُر ہے جو ہم نے تمہیں بتا دیا ہے اگر تم اپنے پہلو کو ہمیشہ مضبوط رکھنا چاہتے ہو تو ہماری اِس نصیحت کو یاد رکھو کہ دن اور رات کے آتے جاتے وقت ضرور عبادت کر لیا کرو۔ جب دن آئے گا تو یا تمہارے لئے خیر لائے گا یا شر لائے گا اِسی طرح جب رات آئے گی تو یا تمہارے لئے خیر لائے گی یا شر لائے گی۔ جب دن جائے گا تو یا تمہارے لئے خیر چھوڑ جائے گا یا شر چھوڑ جائے گا اور جب رات جائیگی تو وہ بھی تمہارے لئے یا خیر چھوڑ جائے گی یا شر چھوڑ جائے گی

تم ہر تغیر کے وقت عبادت کر لیا کرو اگر دن اور رات کا آنا جانا تمہارے لئے خیر لائے گا تو تمہاری خیر دُگنی ہو جائے گی اور اگر شر لائے گا تو عبادات سے وہ شر کٹ جائے گا اور تمہارا پہلو یقینی طور پر محفوظ ہو جائے گا۔

اس سوال کا جواب کہ جب ہر بدی کا بدلہ ملنا ہے تو توبہ کے کیا معنی

اِسی طرح فرماتا ہے فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ (القارعہ) جس کے وزن بھاری ہو جائیں گے (بھاری کا یہ مطلب ہے کہ بمقابلہ بدی کے اُس کی نیکیاں بڑھ جائیں گی) اُسے ہمارے قرب کا مقام حاصل ہوگا اور اُس کی اُخروی حیات سنور جائے گی۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ لیکن جس کے وزن ہلکے رہیں گے فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔ اُس کی ماں ہاویہ ہوگی۔

بدی کا کوئی وزن نہیں وزن صرف نیکی کا ہے

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وزن اصل میں نیکی کا ہی ہوتا ہے بدی کا نہیں ہوتا۔ اِس مسئلہ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے بھی لوگوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وزن والی چیز صرف نیکی ہی ہوتی ہے بدی کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ پس اَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ کا یہ مطلب ہے کہ جس کی بدیوں نے اُس کی نیکیوں کو کاٹ نہیں دیا اور اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ کا یہ مطلب ہے کہ جس کا وزن گھٹ گیا یعنی نیکیاں باقی نہ رہیں۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وہ دوزخ میں گرایا جائے گا۔

پھر فرمایا وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ا۟لْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (اعراف ع ۱) اُس دن وزن کا ہونا ایک قطعی اور یقینی بات ہے۔ جس کے وزن بھاری ہو جائیں گے یعنی بدیاں اُڑ جائیں گی اور نیکیاں باقی رہ جائیں گی وہ کامیاب ہو جائے گا اور جس کے وزن ہلکے ہو جائیں گے اور وزن کے ہلکا ہونے کے یہ معنے ہیں کہ اُس کی بدیاں زیادہ ہوں گی۔ نیکیاں اُن بدیوں کو اُڑانے کے لئے انسان کے پاس نہیں ہوں گی فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہ وہ لوگ ہیں جو نقصان پانے والے ہوں گے بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ کیونکہ یہ لوگ ہماری آیات کے ساتھ ظلم کیا کرتے تھے۔

اِن آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال کہ جب ہر بدی کا بدلہ انسان نے ضرور دیکھنا ہے تو پھر بخشش اور توبہ کے کیا معنے ہوئے اور جب ہر خیر کا بدلہ انسان نے ضرور دیکھنا ہے تو پھر دوزخ کا کیا فائدہ ہُوا بالکل غلط ہے ہر انسان نے جو عملِ خیر کیا ہوگا وہ بھی قیامت کے دن موجود ہوگا اور جو اُس نے عملِ شر کیا ہوگا وہ بھی قیامت کے دن موجود ہوگا۔ وہ اپنے خیر کو بھی دیکھے گا اور اپنے شر کو بھی دیکھے گا اور دونوں کے تقابل کے نتیجہ میں جو چیز زیادہ ہوگی وہ دوسرے حصہ کو کاٹ دے گی۔ خیر زیادہ ہوگا تو اس کی وجہ سے شر کٹ جائے گا اور اگر شر زیادہ ہوگا تو خیر کٹ جائیگا۔ بہرحال چھوٹا حساب بڑے حساب میں سے منہا کر لیا جائے گا مثلاً ایک شخص ایسا ہے جس نے دس ہزار نیکی کی اور ایک ہزار بدی۔ ایک اور شخص ایسا ہے جس نے دس ہزار نیکی کی اور پانچ سو بدی کی۔ ایک اور شخص ایسا ہے جس نے دس ہزار نیکی کی اور دو سو بدی کی۔ ایک اور شخص ایسا ہے جس نے دس ہزار نیکی کی مگر بدی کوئی ایک بھی نہیں کی تو لازماً وہ شخص جس نے کوئی بدی نہیں کی وہ اونچے درجہ پر ہوگا اُس سے نیچے وہ شخص ہوگا جس نے دو سو بدیاں کیں۔ اُس سے نیچے وہ شخص ہوگا جس نے پانچ سو بدیاں کیں۔ اُس سے نیچے وہ شخص ہوگا جس نے ایک ہزار بدیاں کیں۔ بے شک یہ سب لوگ جنت میں ہونگے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب نے اپنے شر کو دیکھ لیا۔ اُس نے بھی دیکھ لیا جس نے ایک ہزار بدیاں کی تھیں کیونکہ اُسے وہ مقام نہ ملا جو پانچ سو بدیاں کرنے والے کو ملا اور اُس نے بھی شر دیکھ لیا جس نے پانچ سو بدیاں کی تھیں کیونکہ اُسے وہ مقام نہ ملا جو دو سو بدیاں کرنے والے کو ملا۔

اور اُس نے بھی شر دیکھ لیا جس نے دو سو بدیاں کی تھیں کیونکہ اُسے وہ مقام نہ ملا جو اُس شخص کو ملا جس نے کوئی بدی بھی نہیں کی تھی۔ آخر یہ واضح بات ہے کہ کیوں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم محمدیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوں گے۔ ابوبکر کیوں ابوبکرؓ کے مقام پر ہوگا۔ عمر کیوں عمرؓ کے مقام پر ہوگا اور عام مومن کیوں عام مومنوں کے مقام پر ہوں گے۔ اسی لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بدی نہیں کی۔ اس لئے آپکو اللہ تعالیٰ کے قرب کا انتہائی مقام مل گیا۔ ابوبکرؓ سے کچھ غلطیاں ہوئیں اسلئے انہیں وہ مقام نہ ملا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ پس ابوبکرؓ نے اپنے شر کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد عمرؓ کو ابوبکرؓ کا مقام بھی نہ ملا پس عمرؓ نے بھی اپنے شر کو دیکھ لیا اسی طرح ہر مومن جو جنت میں گیا جب اُسے ابوبکرؓ اور عمرؓ کا مقام نہ ملا تو اُس نے بھی اپنا شر دیکھ لیا۔ کیونکہ جس قدر کسی کے اعمال میں شر کا دخل ہوتا ہے اُسی قدر اُس کے لئے اعلیٰ خیر میں کٹوتی ہو جاتی ہے اور یہی شر کو دیکھنے کا مفہوم ہے۔ عیسائی لوگ بڑی ہنسی اُڑایا کرتے ہیں کہ اسلام کا خدا بھی کھاتے والا خدا ہے حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس کے بغیر امن قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ خود عیسائیوں سے اگر پوچھا جائے کہ جس مقام پر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سمجھتے ہو کیا اسی مقام پر قیامت کے دن تمام مومن ہوں گے تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اَور مقام پر رکھے گا اَور مومنوں کو اَور مقام پر۔ اور جب خود اُن کا یہ اعتقاد ہے تو وہ اسلام پر کس مُنہ سے یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اسلام کا خدا بھی کھاتے والا خدا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (انعام ع) جو شخص نیک عمل کرے گا اُسے اُس کے عمل کی قیمت سے دس گنے زیادہ اجر ملے گا اور جو بدعمل کرے گا اُسے اُس کے عمل سے زیادہ کسی صورت میں بھی سزا نہیں ملے گی اور یقیناً ہماری طرف سے بدوں پر بھی کسی قسم کا ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ اس آیت نے اُس خطرہ کو دُور کر دیا جو فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ کی وجہ سے ہر مومن کو محسوس ہوتا تھا کہ جب ایک چھوٹی سے چھوٹی بدی کا انجام بھی مجھے دیکھنا پڑے گا تو میری مغفرت کی کیا صورت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ نیکی بڑھتی ہے اور اُس کا دس گنے اجر دیا جاتا ہے لیکن بدی کے متعلق ہمارا قانون ہے کہ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا اُس کا اُس کے مطابق بدلہ دیا جاتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اُسے دس بیس گنا بڑھا دیا جائے اس لئے اگر تمہیں یہ خطرہ ہے کہ تمہیں اپنے شر کا بُرا انجام نہ دیکھنا پڑے تو ہم تمہیں یہ علاج بتاتے ہیں کہ تم نیکی کا بیج بو دو نیکی کا بیج ہمارے قانون کے مطابق بڑھے گا اور ترقی کرے گا یہاں تک کہ تمہاری ایک ایک خیر دس دس نیکیوں کی شکل اختیار کرے گی۔ لیکن بدی کا بیج پنپ نہیں سکتا۔ اس لئے نیکیوں کے غلبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کے سامان پیدا فرما دیگا۔

درحقیقت قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر اور شر کی مثال ایک اچھے اور گندے بیج کی سی ہے۔ اچھا بیج پھل پیدا کرتا ہے لیکن سڑا ہُوا بیج کوئی پھل پیدا نہیں کرتا۔ اگر تم زمین میں کوئی سڑا ہُوا بیج بو دو تو یہ نہیں ہوگا کہ اُس کے نتیجہ میں ایک کروڑ سڑا ہُوا بیج پیدا ہو جائے لیکن اگر تم اچھا بیج بو دو تو ایک دانے سے کئی کئی سو دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بدی چونکہ سڑی ہوئی چیز ہے وہ اپنی ذات تک محدود رہتی ہے اور جس طرح سڑی ہوئی گٹھلی سے کوئی پودہ نہیں اُگ سکتا۔ آم کی سڑی ہوئی گٹھلی بو دو تو اُس سے سڑے ہوئے آم پیدا نہیں ہوں گے لیکن آم کی اچھی گٹھلی بو دو تو اچھے آم پیدا ہونے لگیں گے۔ اسی طرح نیکی ترقی کرتی ہے لیکن بدی اپنی ذات تک محدود رہتی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ بدیاں تمہاری نجات کی راہ میں حائل نہ ہوں تو تمہیں ہماری نصیحت یہ ہے کہ تم کثرت سے نیکیاں بجا لاؤ۔

خیر اور شر کی مثال اچھے اور گندے بیج کی

پھر فرماتا ہے وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (شوریٰ ع) وہ خدا ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرتا۔ اُن کی کوتاہیوں سے درگذر کرتا اور وہ سب کچھ جانتا ہے جو تم کرتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ ع ۵) تمہیں جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں پہنچتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ وہ انسان کے اکثر گناہوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔

اِن آیات سے وہ اعتراض باطل ہو گیا جو بعض لوگوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہر نیکی کا بدلہ ملنا ہے اور ہر بدی کی سزا مقدر ہے تو پھر جنّت اور دوزخ کے کیا معنے ہوئے۔ اگر ہر خیر کا بدلہ ہم نے ضرور دیکھنا ہے تو پھر دوزخ اُڑ گئی اور اگر ہر بدی کا بدلہ ہم نے ضرور دیکھنا ہے تو پھر جنّت اُڑ گئی۔ اُوپر کی بیان کردہ آیات نے اِس اعتراض کا باطل ہونا ثابت کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ باوجود اس کے کہ ہر نیکی قابلِ جزا ہے اور ہر بدی قابلِ پاداش پھر بھی جنّت اپنی جگہ قائم رہے گی اور دوزخ اپنی جگہ قائم رہیگی جس کی بدیاں زیادہ ہوں گی وہ دوزخ میں گرایا جائے گا اور جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی وہ جنّت میں داخل کیا جائیگا جس کی بدیوں کی کثرت اُس کی نیکیوں کو کھا جائے گی وہ دوزخ میں چلا جائے گا اور جس کی نیکیوں کی کثرت اُسکی بدیوں کو کھا جائے گی وہ جنّت میں چلا جائے گا۔ غرض جنّت بھی قائم رہی اور دوزخ بھی۔

اِسی طرح احادیث میں آتا ہے ابن جریر حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ كَانَ اَبُوْ بَكْرٍ يَاْكُلُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۚ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۚ حضرت ابو بکرؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص ایک ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا وہ اُس کا انجام دیکھے گا اور جو شخص ایک ذرہ بھر بھی بدی کرے گا وہ اُس کا انجام دیکھے گا فَرَفَعَ اَبُوْ بَكْرٍ يَدَهٗ ۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ آیت سُن کر گھبرا گئے اور انہوں نے کھانے سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا وَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُجْزٰى بِمَا عَمِلْتُ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ مِّنْ شَرٍّ اور کہا یا رسول اللہ کیا ایک ذرّہ بھر بدی بھی مجھ سے سرزد ہوئی تو قیامت کے دن مجھے اُس کی سزا ملے گی اگر ایسا ہُوا تب تو بڑی مشکل ہے فَقَالَ يَا اَبَا بَكْرٍ مَا رَاَيْتَ فِي الدُّنْيَا مِمَّا تَكْرَهُ فَبِمَثَاقِيْلِ ذَرِّ الشَّرِّ وَيَدَّخِرُ اللّٰهُ لَكَ مَثَاقِيْلَ الْخَيْرِ حَتّٰى تُوَفّٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ٹھیک ہے مگر اے ابو بکر تم گھبراؤ نہیں دنیا میں انسان کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں ذرّہ شر کی وجہ سے پہنچتی ہیں اس طرح خدا تعالیٰ شر کے ذرّوں کو یہیں ختم کر دے گا اور خیر کے ذرّوں کو باقی رکھے گا اور انہی کی بنا پر مومن کو جنّت میں داخل کیا جائے گا۔

اس حدیث کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ہر ایک کے لئے نہیں بلکہ ابو بکرؓ یا ابو بکرؓ جیسے مقام کے انسان کے لئے ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی اتنی ہی بدیاں تھیں جو دنیا میں ختم ہو سکتی تھیں اِسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا شر اتنا ہی ہے کہ اگر تمہیں کبھی بخار چڑھا یا روپیہ ضائع ہو گیا یا کوئی اور تکلیف پہنچی تو اِسی میں وہ ذرّہ شر ختم ہو جائے گا اور قیامت کے دن تمہارے اعمال میں خیر ہی خیر ہو گا۔

اِسی طرح ابن جریر ہی حضرت عمرو بن عاص سے روایت کرتے ہیں اِنَّهٗ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَبُوْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَاعِدٌ فَبَكٰى حِيْنَ اُنْزِلَتْ یعنی جب یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا تو اُس وقت حضرت ابو بکرؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ سورۃ سُنی تو رو پڑے۔ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يُبْكِيْكَ يَا اَبَا بَكْرٍ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا اے ابو بکر تمہیں کس بات نے رُلایا ہے؟ قَالَ يُبْكِيْنِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةُ ۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے

کہا یا رسول اللہ مجھے تو اس سورۃ نے رُلایا ہے یعنی اگر ہم نے شر کا ایک ذرّہ بھی دیکھنا ہے تب تو ہم جنّت سے محروم ہیں فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا أَنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ وَتُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرَ لَكُمْ لَخَلَقَ اللّٰهُ أُمَّةً يُخْطِئُوْنَ وَيُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرَ لَهُمْ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھبراؤ نہیں بے شک مومن شر بھی دیکھیں گے مگر شر دیکھنے سے مراد اُن کا اپنے گناہوں سے توبہ کرنا ہے۔ جب کوئی انسان سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو یہی اُس کا شر کو دیکھنا ہو جاتا ہے کیونکہ توبہ اُسی وقت کی جاتی ہے جب انسان کا دل ندامت سے پُر ہو جائے اور وہ اپنے گذشتہ گناہوں کو یاد کر کے سخت شرمندہ ہو اور محسوس کرے کہ اُس نے اپنی زندگی میں بڑی بھاری غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے جن کی اُسے تلافی کرنی چاہیئے۔ پس چونکہ توبہ کے وقت انسان کا دل زخمی ہوتا ہے اور وہ اپنے گناہوں کو یاد کر کر کے سخت شرمسار ہوتا ہے اِس لئے یہی اُس کا اپنے شر کو دیکھنا ہوتا ہے۔ اگر وہ شر نہ کرتا تو اُس کے دل کو اِس رنگ میں تکلیف بھی نہ پہنچتی۔

اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا ہی اِس رنگ میں کیا ہے کہ اُس نے اُن میں صفتِ قدرت رکھ دی ہے یعنی وہ بدی بھی کر سکتے ہیں اور نیکی بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ قدرت مخلوق نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی بعض صفات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکتیں۔ صاحبِ قدرت مخلوق ہونے کی وجہ سے چونکہ لوگوں سے بدیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور نیکیاں بھی اس لئے اُس کی کئی صفات ظاہر ہوتی رہتی ہیں کہیں غفاری کی صفت ظاہر ہو رہی ہے، کہیں ستّاری کی صفت ظاہر ہو رہی ہے، کہیں رزّاقیت کی صفت ظاہر ہو رہی ہے، کہیں اماتت کی صفت ظاہر ہو رہی ہے کہیں احیاء کی صفت ظاہر ہو رہی ہے اور یہ سب صفات وہ ہیں جو انسانی پیدائش کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اِسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم گناہ نہ کرو اور خدا تعالےٰ سے تمہاری توبہ پر مغفرت سے کام نہ لے تو لَخَلَقَ اللّٰهُ أُمَّةً يُخْطِئُوْنَ وَيُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرَ لَهُمْ اللہ تعالےٰ یقیناً اور لوگ ایسے پیدا کر دے جو گناہ کریں اور اللہ تعالےٰ اُن کو معاف کرے۔ اِس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالےٰ کو گناہ پسند ہیں بلکہ یہ کہ صاحبِ قدرت مخلوق ہی صفاتِ الٰہیہ کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر صاحبِ قدرت مخلوق دنیا میں نہ ہوتی تو اُس کی بعض صفات بھی ظاہر نہ ہوتیں اور جب انسان کو صاحبِ قدرت بنایا گیا ہے تو بہرحال صاحبِ قدرت مخلوق میں سے کچھ گنہگار بھی ضرور ہوں گے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ہوں تو صاحبِ قدرت مگر ہر شخص نیکی پر مجبور ہو۔ انسان کا صاحبِ قدرت ہونا ہی بتا رہا ہے کہ انسانوں میں کچھ بدیوں کا بھی ارتکاب کریں گے اور پھر اُن میں سے جو چاہیں گے اُن کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوگا تا اگر اُن کا دل شرمندہ ہو اور ندامت کی آگ میں جل کر صاف ہو جائے تو توبہ کے ذریعہ اُن کے گناہ معاف ہو جائیں اور اس طرح اللہ تعالےٰ کی صفات ظاہر ہوتی رہیں۔

اِسی طرح ابن ابی حاتم ابی سعید الخدری سے روایت کرتے ہیں کہ قَالَ لَمَّا أُنْزِلَتْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ، قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ لَرَاءٍ عَمَلِيْ قَالَ نَعَمْ۔ یعنی ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ تو میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا میں اپنے ہر عمل کا نتیجہ دیکھوں گا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ قُلْتُ تِلْكَ الْكِبَارُ الْكِبَارُ میں نے کہا بڑے بڑے عمل بھی نظر آئیں گے؟ قَالَ نَعَمْ فرمایا ہاں قُلْتُ تِلْكَ الصِّغَارُ الصِّغَارُ۔ میں نے کہا چھوٹے چھوٹے عمل بھی نظر آئیں گے؟ قَالَ نَعَمْ۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ قُلْتُ وَاثُكْلَ أُمِّيْ۔ میں نے کہا میری ماں مجھ کو روئے پھر تو میں مرا۔ قَالَ أَبْشِرْ يَا أَبَا سَعِيْدٍ فَإِنَّ الْحَسَنَةَ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا يَعْنِيْ إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَيُضَعِّفُ اللّٰهُ

لِمَنۡ تَشَآءُ۔ آپ نے فرمایا سے ابوسعید یہ آیت گھبراہٹ پیدا کرنے والی نہیں یہ تو نیکی اور بدی کی جزاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کے قانون کو بیان کرتی ہے۔ کافر بے شک گھبرا سکتا ہے لیکن مومن کے لئے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہر نیکی کا دس گُنے اجر ملے گا۔ پس یہ جو اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص نیکی کا ایک ذرّہ بھی کرے گا وہ اُسے دیکھے گا۔ اس میں خیر دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کی ایک نیکی ہوگی اُسے دس گُنا بڑا کرکے دکھایا جائے گا یعنی جو شخص کوئی ایک نیکی بجا لائے گا خدا تعالےٰ کے حضور اُس کی دس نیکیاں لکھی جائیں گی اور پھر اُن دس نیکیوں کو سات گُنا کیا جائے گا۔ گویا ایک نیکی کا اجر ستر گُنے تک پہنچا دیا جائیگا اور اللہ تعالےٰ جسے چاہے گا اس سے بھی زیادہ بدلہ دیگا۔ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اَوْ يَغْفِرُ اللّٰهُ۔ لیکن اگر کسی نے کوئی بدی کی ہوگی تو اُس کا بدلہ اُسے اُتنا ہی ملے گا جتنا اُس سے قصور سرزد ہُوا ہوگا یا اللہ تعالےٰ اُسے معاف کر دے گا۔ یعنی نیکی کے متعلق اللہ تعالےٰ کا جو قاعدہ ہے وہ بدی کے متعلق نہیں۔ پس مومن کے لئے گھبراہٹ کا کوئی مقام نہیں ہاں اگر کافر گھبرائے تو وہ اس کا سزاوار ہے۔ پھر آپ نے فرمایا وَلَنۡ يَّنۡجُوَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ بِعَمَلِهٖ۔ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنے عمل کے رو سے نجات حاصل کر سکے۔ نجات کا موجب عمل نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کا فضل ہوتا ہے قُلْتُ وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ بھی اپنے عمل سے نجات نہیں پائیں گے؟ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنۡ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَةٍ۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں بھی اپنے عمل سے نجات نہیں پا سکتا میری مغفرت بھی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے مجھے ڈھانپ لے۔ درحقیقت اگر ہم غور کریں تو بات وہی ہے جو غالب نے کہی کہ ؎

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

اگر نبی نیکی کرتا ہے تو وہ بھی خدا تعالےٰ کی دی ہوئی طاقتوں سے ہی کرتا ہے۔ پس منطقی طور پر اگر دیکھا جائے تو نبی کے ہاتھ میں بھی سوائے فضل کے اَور کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اگر اُس نے نماز پڑھی ہے یا روزہ رکھا ہے یا حج کیا ہے یا صدقہ و خیرات میں حصہ لیا ہے یا اَور نیکیاں کی ہیں تو وہ سب کی سب خدا تعالیٰ کی عطا کردہ طاقتوں سے کی ہیں۔ اس لئے خالص منطقی نظریہ سے اگر دیکھا جائے تو نبی کی نجات بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ بے شک عملی نظریہ میں ایک شخص نیک ہوتا ہے اور ایک بد۔ لیکن منطقی نظریہ کے ماتحت کوئی بڑے سے بڑا نیک بھی محض اعمال کی بناء پر نجات کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ اُس نے جو کچھ کیا اللہ تعالےٰ کی طاقتوں سے کام لیکر کیا ہے۔ اِس حدیث میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے خالص منطقی نظریہ کے ماتحت فرمایا ہے عملی نظریہ کے ماتحت نہیں۔

اِسی طرح ابن ابی حاتم سعید بن جبیر سے اللہ تعالیٰ کے اِس قول کے متعلق کہ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت کس واقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ روایات میں کسی آیت کا جو شانِ نزول بیان کیا جاتا ہے اُس کے صرف اتنے معنے ہوتے ہیں کہ یہ واقعہ بھی فلاں آیت پر چسپاں ہوتا ہے۔ یہ معنے نہیں ہوتے کہ اگر وہ واقعہ نہ ہوتا تو آیت کا نزول بھی نہ ہوتا۔ بہرحال سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ يُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا (الدھر ع ۱) وہ لوگ اُس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں تو اُس وقت صحابہؓ یہ خیال کیا کرتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں تھوڑی سی چیز دینے پر کیا اجر مل سکتا ہے اجر تو اُسی چیز پر ملے گا جو بہت بڑی ہوگی۔ ضمناً میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ يُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّاَسِيۡرًا کے کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ عَلٰى حُبِّهٖ کے یہ معنے بھی

ہوسکتے ہیں کہ عَلٰی حُبِّ الطَّعَامِ۔ یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ عَلٰی حُبِّ اِطْعَامِ الطَّعَامِ۔ اور یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ عَلٰی حُبِّ اللّٰہِ۔ یعنی اس آیت میں تین درجے بیان کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ مومن مسکین۔ یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ عَلٰی حُبِّ الطَّعَامِ باوجود مال کی محبت یا طعام کی محبت کے یعنی باوجود اس کے کہ انہیں خود کھانے کی ضرورت ہوتی ہے پھر بھی وہ غرباء و مساکین کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے اور اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر اُن کو کھانا کھلانا مقدم سمجھتے ہیں۔

دوسرے معنے اِس کے یہ ہیں کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں عَلٰی حُبِّ اِطْعَامِ الطَّعَامِ۔ جبکہ انہیں کھانا کھلانے سے محبت ہوتی ہے یعنی اُن کی طبیعت میں صدقہ و خیرات دینا اِس قدر گہرے طور پر داخل ہوچکا ہوتا ہے کہ اُنہیں اُس وقت تک چین اور آرام ہی نہیں آتا جب تک وہ دوسروں کو کھانا نہ کھلالیں۔

تیسرے معنے اِس کے یہ ہیں کہ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّ اللّٰہِ۔ وہ محض اللہ تعالےٰ کی محبت کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ اُن کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگ اُن کی تعریف کریں یا جن کو کھانا کھلایا گیا ہے اُن سے کوئی فائدہ حاصل کریں یا اُنہیں کوئی ثواب ملے بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اِس آیت میں صدقہ کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان ایسی حالت میں صدقہ کرے جبکہ وہ خود ضرورت مند ہو۔ اِس سے بڑا درجہ یہ ہے کہ انسان کو صدقہ سے ایسا لگاؤ پیدا ہوجائے کہ جب تک وہ صدقہ نہ کرلے اُسے چین اور آرام ہی نہ آئے اور پھر اس سے بڑا درجہ یہ ہے کہ یہ کام کسی بدلہ کی خواہش کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اللہ تعالےٰ کے فضل اور اُس کے احسانات کے شکریہ میں یہ کام کیا جائے۔ صحابہؓ نے اس کے معنے عَلٰی حُبِّ الطَّعَامِ کے ہی کئے ہیں یعنی ایسی چیز جو تم کو پسند بھی ہو اور تمہاری ضرورت کو پورا کرنے والی بھی ہو وہ چیز تمہیں صدقہ میں دینی چاہیئے۔

بہرحال سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی اور صحابہؓ نے اِس کے یہ معنے کئے کہ قرآن کریم یہ ہدایت دیتا ہے کہ مساکین یتامیٰ اور اسیروں کو ہمیں ایسا کھانا کھلانا چاہیئے جو ہمیں مرغوب بھی ہو اور ہماری ضرورت کو بھی پورا کرنے والا ہو تو کَانَ الْمُسْلِمُوْنَ یَرَوْنَ اَنَّھُمْ لَا یُؤْجَرُوْنَ عَلَی الشَّیْءِ الْقَلِیْلِ اِذَا اَعْطَوْہُ۔ اِس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اگر ہم کوئی تھوڑی سی چیز صدقہ دیں گے تو اُس کا کوئی ثواب نہیں ہوگا فَیَجِیْءُ الْمِسْکِیْنُ اِلٰی اَبْوَابِھِمْ فَیَسْتَقِلُّوْنَ اَنْ یُّعْطُوْہُ تَمْرَۃً وَالْکِسْرَۃَ وَالْجَوْزَۃَ وَنَحْوَ ذَالِکَ فَیَرُدُّوْنَہٗ وَیَقُوْلُوْنَ مَا ھٰذَا بِشَیْءٍ اِنَّمَا نُؤْجَرُ عَلٰی مَا نُعْطِیْ وَنَحْنُ نُحِبُّہٗ۔ چنانچہ جب کوئی مسکین اُن کے دروازہ پر آتا تو چونکہ اُن کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی تھی کہ وہ زیادہ صدقہ دے سکیں اور دوسری طرف اُن کا خیال تھا کہ اگر ہم نے کوئی تھوڑی سی چیز صدقہ میں دے دی تو ہمیں اُس کا کوئی اجر نہیں ملے گا اجر اُسی چیز کا مل سکتا ہے جو زیادہ ہو اور ایسی حالت میں صدقہ دی جائے جب انسان اُس کی خود ضرورت محسوس کرتا ہو۔ اِس لئے وہ ایک آدھ کھجور یا روٹی کا ایک ٹکڑہ یا اخروٹ کا ایک دانہ اُسے نہ دیتے اور کہتے جاؤ میاں ہمارے پاس کچھ نہیں۔ وَیَقُوْلُوْنَ مَا ھٰذَا بِشَیْءٍ اور سمجھتے کہ ہم نے یہ کیا خیرات کرنی ہے اِنَّمَا نُؤْجَرُ عَلٰی مَا نُعْطِیْ وَنَحْنُ نُحِبُّہٗ ہمیں تو اُسی چیز کا بدلہ ملے گا جو ہم ایسی حالت میں دیں گے جبکہ ہمیں خود اُس کی ضرورت ہوگی اور وہ بڑی ہوگی جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۔

وَکَانَ اٰخَرُوْنَ یَرَوْنَ اَنَّھُمْ لَا یُلَامُوْنَ عَلَی الذَّنْبِ الْیَسِیْرِ اَلْکِذْبَۃِ وَالنَّظْرَۃِ وَالْغِیْبَۃِ وَاَشْبَاہِ ذَالِکَ۔ پھر بعض لوگ ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ

ہمیں چھوٹے چھوٹے گناہوں پر کوئی سزا نہیں ملے گی جیسے کبھی جھوٹ بول لیا یا کسی غیر عورت پر نظر ڈال لی یا غیبت سرزد ہوگئی یا اسی قسم کا کوئی اور فعل ہوگیا تو ہمیں سزا نہیں ملے گی یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا وَعَدَ اللّٰہُ النَّارَ عَلَی الْکَبَائِرِ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کبائر پر سزا مقرر کی ہے صغائر پر نہیں فَرَغَّبَهُمْ فِي الْقَلِيْلِ مِنَ الْخَيْرِ اَنْ يَّعْمَلُوْهُ فَاِنَّهُ يُوْشِكُ اَنْ يَّكْثُرَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو تحریک کرنی شروع کی کہ اگر تمہیں کسی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کرنے کا بھی موقع ملے تو وہ تمہیں ضرور کر لینی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ نیکی بڑھتی ہے اگر تم نیکی کا بیج بو دوگے تو خواہ وہ بظاہر کیسا ہی حقیر اور معمولی دکھائی دے اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھائے گا اور جب قیامت کے دن تمہیں اُس کا اجر ملے گا تو تم اُس کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے اِس لئے کسی نیکی کو ضائع مت کرو۔ فَنَزَلَتْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ يعني وَزْنَ اَصْغَرِ النَّمْلِ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اِس فعل کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ جہاں تک اِس آیت کے مفہوم کا سوال ہے اُس حد تک تو مجھے راوی سے اتفاق ہے لیکن جہاں تک صحابہؓ کے ساتھ اِس آیت کا تعلق بیان کیا گیا ہے میں اِس راوی کی رائے کا قائل نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں اِس میں صحابہؓ کی سخت ہتک کی گئی ہے کیونکہ اُن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ نعوذ باللہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہمیں جنت ملے تب تو ہم کسی غریب کو کھلا سکتے ہیں لیکن اگر جنت نہ ملے تو ہم نہیں کھلا سکتے۔ یہ خیال ایسا ہے جو صحابہؓ کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔ صحابہؓ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور اُن کی حالت ہی بالکل بدل چکی تھی۔ ہم تو دیکھتے ہیں دنیا میں کئی دہریہ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کرتے ہیں لیکن اگر کوئی غریب اُن کے پاس آجائے تو وہ اُس کی مدد کے لئے فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ پس یہ بات کہ صحابہؓ نے مساکین کو روٹی کا ایک ٹکڑا تک دینا ترک کر دیا تھا اور جب کوئی مسکین اُن کے دروازہ پر آتا تو وہ اُسے واپس لَوٹا دیتے اور کہتے کہ جاؤ میاں ہمارے پاس کچھ نہیں قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد امر ہے۔ معلوم ہوتا ہے راوی نے خود بخود یہ خیال کر لیا ہے کہ صحابہؓ اِس طرح کرتے ہوں گے ورنہ صحابہؓ کی ذات اِس اتہام سے بالکل بری ہے صحابہؓ کی شان تو بہت بلند ہے وہ لوگ جو کسی نیکی کی جزاء کے قائل نہیں ہوتے، جو خدا تعالیٰ کی ہستی کو بھی تسلیم نہیں کرتے جو دن رات دنیوی کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور جن کے سامنے اگر عقبیٰ کا ذکر کیا جائے تو ہنسی اُڑانے لگتے ہیں وہ بھی بغیر اِس بات کو سوچنے کے کہ اُن کے فعل کا کوئی نتیجہ نکلے گا یا نہیں غریبوں کی مدد کرتے چلے جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو ہزاروں روپیہ اِس غرض کے لئے صرف کر دیتے ہیں۔ جب ایمان سے کلی طور پر محروم لوگ بھی مساکین کو کھانا کھلاتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ انہیں اِس کام کی کوئی جزا ملے گی یا نہیں تو صحابہؓ کے متعلق یہ کس طرح خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو خیرات سے روک لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب معمولی نیکی پر ہمارے لئے کوئی اجر مقرر نہیں تو ہم چھوٹی چھوٹی نیکیاں کیوں کریں۔ پس یہ خیال جس کا صحابہؓ کے متعلق اظہار کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ لیکن آیت کا جو مفہوم اُنہوں نے بیان کیا ہے وہ درست ہے لکھتے ہیں مِثْقَالَ ذَرَّةٍ کے معنے یہ ہیں کہ وَزْنَ اَصْغَرِ النَّمْلِ خَيْرًا يَّرَهٗ جو شخص ایک چھوٹی سی چھوٹی چیونٹی کے برابر بھی کوئی نیکی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا یعنی فِي كِتَابِهٖ وَيَسُرُّهٗ ذٰلِكَ وہ اُسے خدا تعالیٰ کی کتاب میں لکھا ہوا پالے گا اور اُسے دیکھ کر خوش ہوگا کیونکہ جس طرح اُس نے نیکی کی ہوگی اُسی طرح خدا تعالیٰ اُس نیکی کے بدلہ میں اُسے اپنے انعامات کے حصہ عطا فرمائے گا اور اُسے اپنے فضلوں کا وارث کرے گا۔

اِس کے بعد سعید بن جُبیرؓ کہتے ہیں یُکْتَبُ لِکُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ بِکُلِّ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ وَبِکُلِّ حَسَنَۃٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ۔ ہر شخص جو نیک یا بد ہوگا اُس کی نیکی بدی کی جزا کے متعلق اللہ تعالےٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے اُس کی ایک بدی کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور صرف ایک ہی بدی لکھی جاتی ہے لیکن جو شخص کوئی ایک نیکی بجالاتا ہے اُس کی ایک نیکی کے مقابلہ میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور یہ سلسلہ اِسی طرح چلتا چلا جاتا ہے یعنی بدی کے نتیجہ میں صرف ایک بدی لکھی جاتی ہے اور نیکی کے نتیجہ میں ایک نہیں بلکہ دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں فَاِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ جب قیامت کا دن آئے گا تو ضَاعَفَ اللّٰہُ حَسَنَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَیْضًا بِکُلِّ وَاحِدَۃٍ عَشْرًا اللہ تعالےٰ مومنوں کی حسنات کو پھر بڑھائے گا اور ایک ایک نیکی کو دس گُنا کرے گا یعنی ایک دفعہ تو وہ پہلے بڑھا چکا ہوگا اور ایک ایک نیکی کو دس دس نیکیوں کی شکل میں تبدیل کر چکا ہوگا لیکن جب قیامت کا دن آئے گا تو پھر اُن بڑھائی ہوئی نیکیوں میں سے ایک ایک دس گنا کرے گا۔ گویا ایک نیکی کی جزا سَو گُنے تک پہنچا دے گا۔ لوگوں نے تو

دَہ در دنیا ستّر در آخرت

ایک محاورہ ایجاد کیا ہُوا ہے لیکن اگر احادیث کے مفہوم کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ محاورہ یوں بنتا ہے کہ

دَہ در دنیا سَو در آخرت

وَیَمْحُوْا عَنْہُ بِکُلِّ حَسَنَۃٍ عَشْرَ سَیِّئَاتٍ۔ دوسری طرف اللہ تعالےٰ اُس کی ہر نیکی کے بدلہ میں اُس کی دس بدیوں کو دُور کر دے گا۔ یعنی اگر اُس نے ایک نیکی کی ہوگی تو اُس کی دس بدیاں مٹا دے گا۔ دس نیکیاں کی ہوں گی تو سو بدیاں مٹا دے گا اور اگر سو نیکیاں کی ہوں گی تو ہزار بدیاں مٹا دیگا گویا دونوں رنگ میں اُسے جزائے خیر عطا کی جائے گی۔ اِس رنگ میں بھی کہ اُس کی ایک ایک نیکی کو دس گُنے اور پھر سَو گُنے تک بڑھا دیا جائے گا اور اِس رنگ میں بھی اُس کی ہر نیکی کے مقابلہ میں دس بدیوں کو مٹا دیا جائے گا۔ بات یہ ہے کہ اصل چیز محبت الٰہی ہے اور یہ رستہ شریعت نے اُسی کے لئے تجویز کیا ہے جس کا دل اللہ تعالےٰ کے عشق اور اُس کی محبت سے لبریز ہوگا۔ اُس کے لئے نہیں جس کا دل سخت ہو اور جو اللہ تعالےٰ کی محبت کا کوئی شمّہ بھی اپنے قلب میں نہ رکھتا ہو اگر نیکی کرتا ہو تو وہ بھی اتفاقیہ طور پر اور اگر بدی سے بچتا ہو تو وہ بھی اتفاقیہ طور پر۔ نہ اُس کی نیکی کا باعث خدا تعالیٰ کی محبت ہو اور نہ اُس کا بدی سے بچنا خدا تعالےٰ کی ناراضگی کے ماتحت ہو۔ ایسا شخص اِس انعام سے حصہ نہیں لے سکتا یہ انعام اُسی کے لئے مقدر ہے جس کا دل اللہ تعالےٰ کی محبت سے سرشار ہوگا۔ اور جو اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود محبتِ الٰہی کی آگ اپنے اندر رکھتا ہوگا۔ اور یقیناً جس دل میں خدا تعالےٰ کی محبت ہوگی اُسے کبھی دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی طرح اُس کی نجات کا سامان پیدا کر دیگا اور حساب بنا بنا کر اور مختلف ذرائع اور طریق اختیار کر کے اُسے جنت میں لے جانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اسی روایت کا آخری حصہ یہ ہے کہ فَمَنْ زَادَتْ حَسَنَاتُہٗ عَلٰی سَیِّئَاتِہٖ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ اگر یہ تمام طریق اختیار کرنے کے بعد بھی کوئی شخص ایسا نکلا جس کی بدیوں سے اُس کی نیکیاں صرف ایک ذرّہ کے برابر بھی زیادہ ہوئیں تو اللہ تعالےٰ اُس کے متعلق اپنے فرشتوں سے فرمائے گا کہ جاؤ اِسے جنّت میں داخل کر دو۔ اِس کا مفہوم یہی ہے کہ جو شخص سچا مومن ہوگا اور جس کے متعلق اللہ تعالےٰ یہ جانتا ہوگا کہ اُسے ایمانِ صادق حاصل ہے اُس کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ ہر تدبیر اختیار کرے گا کہ وہ دوزخ میں نہ جائے جیسے ماں اپنے بچے کو مصیبت سے بچانے کے لئے اپنے سارے ذرائع صرف کر دیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو صحابہؓ سے جو محبت تھی اور صحابہؓ کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا جو عشق

پایا جاتا تھا وہ بھی اپنے اندر بعض اس قسم کی مثالیں رکھتا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاں سچی محبت ہو وہاں کوئی نہ کوئی ذریعہ دوسرے شخص کو مصیبت سے بچانے کے لئے نکال ہی لیا جاتا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا یا رسول اللہ مجھ سے فلاں خطا سرزد ہو گئی ہے اب میں کیا کروں۔ آپ نے فرمایا کیا تم غلام آزاد کر سکتے ہو؟ اُس نے کہا یا رسول اللہ مجھ میں غلام آزاد کرنے کی کہاں طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا کیا تم دو مہینے متواتر روزے رکھ سکتے ہو؟ اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ روزے رکھنے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں۔ آپ نے فرمایا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ کہنے لگا یا رسول اللہ میں کہاں سے کھلاؤں میرے پاس تو اُن کو کھلانے کے لئے کچھ نہیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کوئی شخص کھجوروں سے بھرا ہوا ٹوکرا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے فرمایا لو میاں یہ کھجوریں اُٹھاؤ اور مساکین میں تقسیم کر دو تمہارے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔ اُس نے کھجوریں اُٹھا لیں اور کہنے لگا یا رسول اللہ ایک اَور بات بھی عرض کرنے کے قابل ہے آپ نے فرمایا کیا؟ کہنے لگا مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر تو اَور کوئی غریب شخص نہیں۔ مَیں کسے تلاش کروں گا۔ آپ یہ سُنکر ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ یہ کھجوریں خود ہی کھا لو تمہاری طرف سے کفّارہ ہو گیا۔ اِسی طرح وہ شخص جو خدا تعالیٰ سے سچّی محبت رکھتا ہو گا اور جس نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش اور سعی اس بات کے لئے صرف کی ہو گی کہ اُس کا انجام بخیر ہو اور وہ اللہ تعالےٰ کے منعم علیہ گروہ میں شامل ہو جائے اگر کسی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں سو فیصدی کامیاب نہ ہو سکا تب بھی اللہ تعالیٰ اُس کی جوشِ محبت کو رائیگاں جانے نہیں دیگا بلکہ وہ اُس کے ایمان اور اُس کے دل کے اخلاص کے مطابق اُس سے سلوک کرے گا اور کوئی نہ کوئی راہ اُس کی نجات کی نکال لے گا اور اپنے فرشتوں کو حکم دیگا کہ جاؤ اور میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ العادیات - یہ مکی سورۃ ہے ۱؎

وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا گیارہ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

۱؎ ابن مسعودؓ۔ جابرؓ، الحسن۔ عکرمہ اور عطاء کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے۔ ابن عباسؓ۔ انسؓ اور قتادہؓ کے نزدیک مدنی ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ چونکہ پرانے صحابی اور السابقون الاولون میں سے ہیں اِس لئے اُن کی روایت عینی شہادت ہونے کی وجہ سے باقیوں سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت کے (بوجہ اس کے کہ ابن عباسؓ مدینہ میں بالغ ہوئے ہیں مکی زندگی میں تو وہ دو تین سال کے تھے) صرف اتنے معنے سمجھے جائیں گے کہ انہوں نے مدینہ میں یہ سورۃ سُنی۔ مگر اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ یہ سورہ مدینہ میں ہی نازل ہوئی ہے کیونکہ جو سورۃ مکہ میں نازل ہو وہ مدینہ میں بھی سُنی جاسکتی ہے۔ اسی طرح انسؓ (جو انصار میں سے تھے) کے قول کے بھی اتنے ہی معنے ہوں گے کہ انہوں نے یہ سورۃ مدینہ میں سُنی ہے مگر جب عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے تو بوجہ اس کے کہ وہ مکہ میں ایمان والوں میں سے ابتدائی لوگوں میں سے تھے اس کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے اِس سورۃ کو مکہ میں سُنا پس یہ روایت اُن کے السابقون الاولون میں سے ہونے کی وجہ سے دوسری روایتوں سے زیادہ مقدم اور اہم ہے مستشرقین نے بھی بالخصوص ویری نے تسلیم کیا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ریورنڈ ویری کا خیال اِدھر گیا ہی نہیں کہ اِس کو مکی ثابت کرنے کے نتیجہ میں ایک عظیم الشان پیشگوئی بن جائے گی۔ اگر یہ خیال انہیں آجاتا تو وہ کبھی سے مکی قرار نہ دیتے کیونکہ ریورنڈ ویری کے لئے تو یہ بڑی مصیبت ہے کہ کسی پیشگوئی اور پھر عظیم الشان پیشگوئی کا قرآن کریم سے ثبوت ملتا ہو۔ اگر اِس طرف اُن کا ذہن جاتا تو وہ حسبِ عادت کہہ دیتے کہ گو اکثر روایات اِسے مکی قرار دیتی ہیں لیکن اس کا سٹائل مدنی ہے اِس لئے روایتیں غلط ہیں یہ ہے مدنی۔

سورۃ عادیات مکی سورۃ ہے

ترتیبِ مضمون یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلی چند سورتوں سے (سوائے آخری ایک دو سورتوں کے) یہ طریق چلا آرہا تھا کہ ایک ہی سورۃ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ اُولیٰ کا بھی ذکر کیا جاتا تھا اور بعثتِ ثانیہ کا بھی۔ مگر اب باری باری ایک ایک سورۃ میں ایک ایک زمانہ کا ذکر آتا ہے چنانچہ سورۃ البیّنہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اُولیٰ کا ذکر کیا گیا تھا اور سورۃ الزلزال میں آپؐ کی بعثتِ ثانیہ کا ذکر کیا گیا۔ یہ ایک عجیب فرق ہے جو اِن آخری سورتوں میں پہلی سورتوں کے مقابل پر پیدا کر دیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آخر میں سُورتیں چھوٹی کر دی گئی ہیں تا کمزور حافظہ والے اور بچے بھی کچھ حصہ قرآن کریم کا آسانی سے یاد کر سکیں۔ پہلے چونکہ لمبی سورتیں تھیں اِس لئے ایک ہی سُورۃ میں دونوں زمانوں کا ذکر کر دیا جاتا تھا اب سورتیں چھوٹی ہو گئی ہیں اِس لئے یہ طریق اختیار کر لیا گیا ہے کہ ایک سُورۃ میں بعثتِ اُولیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری سُورۃ میں بعثتِ ثانیہ کا ذکر کیا جاتا ہے اِسی ترتیب کے ماتحت زیرِ تفسیر سُورۃ میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کی ترقیات کا ذکر کیا ہے اگلی سُورۃ میں پھر آپ کی بعثتِ ثانیہ کا ذکر کیا جائیگا اور کچھ سورتوں تک یہی ترتیب چلتی چلی جائے گی اِس کے بعد یہ ترتیب ایک نیا چکر کھائے گی اور پھر اِس میں کچھ تبدیلی پیدا ہوجائیگی۔ بہرحال سورۃ الزلزال میں چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ ثانیہ کا ذکر تھا اِس لئے سُورۃ العادیات میں

پارہ عمّ کی آخری سورتوں کی ترتیب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ○

(مجھے) قسم ہے جوش سے آوازیں نکالتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی ۲

سورۃ عادیات میں آنحضرت صلعم کی بعثتِ اولیٰ کا ذکر

پھر بعثتِ اولیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲ حل لغات۔ عٰدِیٰت

عَادِیَات: عَادِیَۃٌ سے جمع ہے جو عَدَا سے اسم فاعل کا مؤنث کا صیغہ ہے اور عَدَا (یَعْدُوْ عَدْوًا وَعَدَوَانًا وَتَعْدَاءً وَعَدًا) الرَّجُلُ وَغَیْرُہٗ کے معنے ہوتے ہیں جَرٰی وَرَکَضَ کوئی شخص تیزی کے ساتھ دوڑا۔ اسی طرح (عَدْوًا وَعُدْوَانًا) فُلَانًا عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں صَرَفَہٗ وَشَغَلَہٗ کسی کو کام سے روک دیا۔ اور عَدَا عَلَیْہِ کے معنے ہوتے ہیں وَثَبَ کسی کے اُوپر حملہ کیا یا جھپٹا مارا۔ اور عَدَا الْاَمْرُ یا عَدَا عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں تَرَکَہٗ۔ اُس کو چھوڑ دیا۔ اور عَدِیَ (یَعْدٰی عَدًا) لِفُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں اَبْغَضَہٗ۔ اُس سے بُغض رکھا (اقرب)

ضَبْحًا

ضَبْحًا: اَلضَّبْحُ نَوْعٌ مِنَ الْعَدْوِ۔ مفردات میں لکھا ہے کہ ضَبْحٌ جانور کی دوڑوں میں سے ایک دوڑ کا نام ہے۔ اِسی طرح لکھا ہے قِیْلَ الضَّبْحُ کَالضَّبْعِ وَھُوَ مَدُّ الضَّبْعِ فِی الْعَدْوِ۔ یعنی گھوڑے کا اگلے پاؤں لمبے کرکے مارنا جس سے بغلوں میں فاصلہ ہوتا چلا جائے اُس کو ضَبْحٌ کہتے ہیں۔ اور اقرب میں لکھا ہے اَلضَّبْحُ صَوْتٌ یُسْمَعُ مِنْ صُدُوْرِ الْخَیْلِ عِنْدَ الْعَدْوِ یعنی ضَبْحٌ اُس آواز کو کہتے ہیں جو دوڑتے وقت گھوڑوں کے سینوں میں سے نکلتی ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے مراد گھوڑوں کا ہنہنانا نہیں بلکہ دوڑتے وقت اُن کے سینوں میں سے جو خاص قسم کی آواز نکلتی ہے اُس کو ضَبْحٌ کہا جاتا ہے۔

لغت والوں نے لکھا ہے کہ یہ آواز اِس قسم کی ہوتی ہے جس طرح اہ اہ کیا جاتا ہے ہمارے ملک میں اِسے ہَا ہَا کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ ہا کو گلا سکیڑ کر ادا کیا جائے۔

ان معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا کا ترجمہ یہ ہوگا کہ :۔

۱۔ ہم اُن دوڑنے والی سواریوں کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ضَبْحٌ کی چال پر دوڑتی ہیں ضَبْحٌ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک قسم کی تیز دوڑ کا نام ہے اور غالبًا یہ کودنے والی دوڑ ہوگی جسے سرپٹ کہتے ہیں تبھی اُن کے سینوں میں سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ پس پہلے معنے یہ ہوں گے کہ ہم اُن گھوڑوں کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو دوڑتے وقت ضَبْح چال اختیار کرتے ہیں یعنی نہایت جوش سے کودتے جاتے ہیں۔

۲۔ دوسرے معنے یہ ہوں گے وہ دوڑنے والی سواریاں جو اگلے پاؤں لمبے کرکے مارتی اور اُچھل کر دوڑتی ہیں جس کے نتیجہ میں اُنکی بغلوں اور بازوؤں میں لمبا فاصلہ ہو جاتا ہے اُنکو ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرے معنے یہ ہوں گے کہ ہم اُن دوڑنے والی سواریوں کی قسم کھاتے ہیں جبکہ اُن کے سینوں میں سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہونے لگتی ہے۔

اِن میں سے کوئی معنے لے لئے جائیں خواہ یہ معنے لے لئے جائیں کہ ضَبْحٌ گھوڑے کی ایک تیز دوڑ کا نام ہے تب بھی۔ اگر یہ معنے لئے جائیں کہ اِس میں گھوڑوں کی

اُس حالت کا ذکر ہے جبکہ وہ لمبا کُود کُود کر پاؤں مارتے ہیں تب بھی۔ اور اگر یہ معنے لئے جائیں کہ اِس میں گھوڑوں کی اُس دوڑ کا ذکر ہے جس میں اُن کے سینہ میں سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہونے لگتی ہے تب بھی۔ اِن تینوں صورتوں میں یہ امر ظاہر ہے کہ اِس آیت میں ایسے گھوڑوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو جوش و خروش سے اور انتہائی رغبت اور شوق سے دوڑتے ہیں۔ یہ سیدھی بات ہے کہ گھوڑا خود نہیں دوڑتا بلکہ دوڑانے والا اُسے دوڑاتا ہے اِس لئے گو یہاں گھوڑوں کا ذکر ہے مگر اِس سے مراد وہ سوار ہیں جو گھوڑوں کو تیزی سے دوڑاتے ہیں یا گھوڑوں کو اس طرح دوڑاتے ہیں کہ اُن کے سینوں میں سے آواز نکلنی شروع ہو جاتی ہے وہ ذرا بھی پروا نہیں کرتے کہ اُن کا گھوڑا زندہ رہتا ہے یا مرتا ہے یا اِس قدر اُن میں جوش پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے گھوڑوں کو گراتے جاتے ہیں۔

تفسیر۔ مجھے اِس سُورۃ کے متعلق یہ خاص طور پر خوشی ہے کہ خود صحابہؓ نے اِس کے ایسے معنے کئے ہیں جن سے یہ ایک عظیم الشان پیشگوئی کی حامل قرار پاتی ہے بہت کم آیات ایسی ہیں جن کے معنے کرتے ہوئے گذشتہ مفسرین نے اُنکو کسی پیشگوئی کا حامل قرار دیا ہو۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایسی آیات کی تعداد پانچ سات سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بالعموم پُرانے مفسرین کا یہ طریق رہا ہے کہ وہ قرآن کریم کی آیات کو یا اُمت پر چسپاں کر دیتے ہیں یا بعض گذشتہ واقعات کی طرف اُن کو منسوب کر دیتے ہیں لیکن اِس آیت کے متعلق گو حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کا یہ بھی قول ہے کہ اِس میں حج کا ذکر ہے لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بڑے اصرار کے ساتھ اِس امر پر قائم تھے کہ اِس سورۃ میں غزواتِ اسلامیہ کا ذکر ہے اور اُن حملوں کی خبر دی گئی ہے جو مسلمانوں نے کفار پر کرنے تھے یہاں آکر ریورنڈ ویری کا ہمارے ساتھ متفق ہو جانا اور کہنا کہ یہ سورۃ مکّی ہے کوئی معمولی بات نہیں۔ غالباً اُنکا ذہن حج کی طرف ہی چلا گیا ہے ورنہ اگر اُنہیں پتہ ہوتا کہ مکہ میں گھڑ چڑھے سوارو

کا ذکر غزواتِ اسلامیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کو کفار سے لڑائیاں کرنی پڑیں گی تو وہ کبھی اِس سُورۃ کو مکّی قرار نہ دیتے۔

بہرحال گھوڑے کا کُودنا مالک کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے پس گو یہاں گھوڑوں کا ذکر ہے مگر در اصل وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا میں سواروں کے جوش کا اظہار ہے۔ ضَبْحًا خواہ تیز دوڑ کا نام ہو خواہ دوڑنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اُس کی طرف اشارہ ہو خواہ ٹانگیں اُٹھا اُٹھا کر دوڑنا یا گراتے چلے جانا مراد ہو بہرحال گھوڑا خود نہیں دوڑتا بلکہ اُسے سوار دوڑاتا ہے پس یہ تینوں حالتیں سوار کے قلب کی کیفیت کے متعلق ہیں اور مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں جہاد کا اِس قدر جوش ہوگا کہ وہ بے تحاشا اپنے گھوڑوں کو ایڑیاں مار مار کر دوڑاتے ہوئے دشمن کے ملک کی طرف جائیں گے اور اِس امر کی ذرا بھی پرواہ نہیں کریں گے کہ اُن کے گھوڑے مرتے ہیں یا زندہ رہتے ہیں۔

سورۃ عادیات میں غزوات اسلامیہ کے متعلق پیشگوئی

اگر ضَبْح کے معنے خاص قسم کی تیز چال کے کئے جائیں تو اِس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ سوار آہستہ چلنا برداشت نہیں کر سکیں گے اور اگر اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے جائیں گے تب بھی اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ منزلِ مقصود سے پیچھے رہنا برداشت نہیں کر سکیں گے۔ غرض تینوں صورتوں میں اِس کا ایک ہی مفہوم ہوگا کہ سوار منزلِ مقصود کی طرف اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا چلا جائے گا مگر اِس لئے نہیں کہ وہاں اُس کی محبوبہ بیٹھی ہے جس کی ملاقات کیلئے وہ بیتاب ہو رہا ہے۔ اِس لئے بھی نہیں کہ وہاں کسی نے بڑے بڑے اچھے کھانے تیار کئے ہوئے ہیں اور اُسے اُن کھانوں میں شمولیت کی دعوت دی گئی ہے۔ اِس لئے بھی نہیں کہ وہاں اُس کا مال و متاع پڑا ہوا ہے اور وہ ڈرتا ہے کہ کوئی چور اُسے اُٹھا کر نہ لے جائے۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہاں اُس کے دوست احباب موجود ہیں اور وہ اُن سے ملنے کے لئے مسافت کو جلد طے کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ اُس جگہ جا رہا ہے جہاں دشمن اُس کی جان لینے کا منتظر بیٹھا ہے اور اِس لئے جا رہا ہے کہ میں اُس مقام پر پہنچ کر اپنے آپکو

وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا میں مسلمانوں کی قلبی کیفیات کا ذکر

خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دُوں۔ گویا ڈر اور خوف کی بجائے اُس کے دل میں خوشی اور اُمنگ ہوگی اور وُہ انتہائی مسرت اور شادمانی کے جذبات کے ساتھ میدانِ قتال کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ پس وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا میں گو ذکر گھوڑوں کا ہے مگر حقیقتاً اِس میں اُن مسلمانوں کی قلبی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے جو اُن پر سوار ہوں گے۔

اِس آیت کے معنوں کے متعلق بھی مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں۔ عبد اللہ (بن مسعودؓ) کہتے ہیں کہ اِس سے مراد اُونٹ ہیں۔ حضرت علیؓ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اِس سے مراد اُونٹ ہیں۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ اِس کی مراد گھوڑے ہیں۔ چنانچہ وہ ذکر کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حج کے دنوں میں خانۂ کعبہ کے پاس حطیم میں بیٹھا ہُوا عبادت کر رہا تھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور اُس نے کہا میں نے آپ سے ایک آیت کا مطلب دریافت کرنا ہے۔ مَیں نے کہا پوچھو۔ کہنے لگا وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا کے کیا معنے ہیں؟ مَیں نے کہا اِس سے گھوڑے مراد ہیں۔ اُس نے جا کر حضرت علیؓ سے اِس کا ذکر کر دیا یا کسی اور طرح حضرت علیؓ کو یہ بات پہنچ گئی جس پر آپ نے فرمایا

وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا کے متعلق صحابہ کے اقوال

یومِ بدر میں تو ہمارے پاس گھوڑے نہ تھے گھوڑے تو پہلی دفعہ ایک سریّہ میں گئے تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھجوایا تھا۔ ابن جریر حضرت ابن عباسؓ کی ایک دوسری روایت میں اِس واقعہ کا یُوں ذکر کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بیٹھا ہُوا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا فَالمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا کے متعلق سوال کیا کہ اِس سے کیا مراد ہے؟ مَیں نے کہا گھوڑے سوار جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں دھاوا کرنے کے بعد واپس رات کو آتے ہیں تو کھانا پکانے کیلئے آگ جلاتے ہیں اُس نے جا کر حضرت علیؓ سے کہا۔ انہوں نے کہا کیا کسی اور سے بھی پوچھا ہے؟ اُس نے کہا ہاں عبد اللہ بن عباسؓ سے پوچھا ہے اُنہوں نے کہا جاؤ اور اُن کو بلا لاؤ۔ جب مَیں گیا تو حضرت علیؓ نے خفا ہو کر کہا کیا تُو اُس امر کا فتوٰے دیتا ہے جس کا تجھے علم نہیں۔ پہلا غزوہ اسلام میں بدر تھا اور اُس میں صرف دو گھوڑے ہمارے ساتھ تھے ایک گھوڑا زبیرؓ کا تھا اور ایک مقدادؓ کا۔ پھر کہا اَلعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا سے مراد حاجی ہیں جو عرفہ سے مزدلفہ کیطرف اور پھر مزدلفہ سے مِنیٰ کی طرف آتے ہیں (عرفہ سے مزدلفہ تیزی سے آتے ہیں) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے اِس پر اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ مگر باوجود اِس کے کہ ابن جریر نے یہ روایت لکھی ہے ابن جریر ہی کہتے ہیں کہ اِس کے معنے گھوڑوں کے سوا اَور کچھ نہیں بنتے۔ اِسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے سب شاگرد اِنہی معنوں کے قائل ہیں اور دوسرے علماء بھی یہی معنے مراد لیتے ہیں چنانچہ مجاہد۔ عکرمہ۔ عطاء۔ قتادہ اور ضحاک سب کا یہی قول ہے اور ابن عباسؓ اور عطاء کی یہ مروی ہے کہ گھوڑے اور کُتّے کے سوا کوئی ضَبۡح نہیں کرتا۔ حل لغات میں بھی بتایا جا چکا ہے کہ ضَبۡح اُس آواز کو کہتے ہیں جو تیز دوڑتے وقت گھوڑوں کے سینوں سے پیدا ہوتی ہے۔ پس باوجود اُس روایت کے جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ عبد اللہ بن عباسؓ کا آخر تک یہی مذہب رہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن کے سب شاگرد اِنہی معنوں پر کیوں عمر بھر زور دیتے رہتے۔

پس لُغت کی شہادت اور ائمۂ ادب کے اصرار کے بعد ہم مجبور ہیں کہ وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا سے گھوڑے ہی مراد لیں۔ گو استعارۃً اِس سے اُونٹ بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اِس آیت کو غزواتِ اسلامیہ پر اِس لئے چسپاں نہیں کیا جا سکتا کہ جنگِ بدر میں مسلمانوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے میرے نزدیک درست نہیں بے شک بدر کی جنگ میں صحابہؓ کے پاس زیادہ گھوڑے نہیں تھے مگر بعد کی جنگوں میں وہ کثرت کے ساتھ گھوڑے رکھنے لگ گئے تھے۔ بدر کی جنگ پر اِس آیت کو چسپاں کرتے ہوئے ہم عَادِیَات سے استعارۃً اُونٹ مراد لے لیں گے جس طرح وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا کے اصل معنے دوڑنے والے گھوڑوں کے ہیں لیکن ہم نے اِس کے معنے سواروں کے کئے ہیں کیونکہ گھوڑا خود نہیں دوڑتا بلکہ سوار اُسے دوڑاتا ہے اِسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو وَالعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا

سے گھوڑے مراد ہیں مگر بدر میں اِس سے استعارۃً اُونٹ مراد تھے کیونکہ عربی زبان میں یہ عام طریق ہے کہ بعض دفعہ ایک بڑی چیز کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور چھوٹی چیز کا ذکر اُس میں خود بخود شامل سمجھا جاتا ہے۔ مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو عورتیں اُس میں طبعی طور پر شامل سمجھی جاتی ہیں۔ اِسی طرح اغارات میں چونکہ گھوڑے زیادہ کام آیا کرتے ہیں اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کا ذکر کر دیا اونٹوں کا نام نہیں لیا مگر اُونٹ جب جنگی کاموں میں استعمال ہوں استعارۃً اِس میں خود بخود آجاتے ہیں۔ پس اگر جنگِ بدر پر اِن آیات کو چسپاں کرتے ہوئے عادیات سے اُونٹ مراد لے لئے جائیں تو اِس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ بعد میں جوں جوں دن گذرتے گئے صحابہؓ میں گھوڑوں کا استعمال بڑھتا چلا گیا خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھوڑے استعمال کرنے لگے یہاں تک کہ حدیثوں سے دس کے قریب گھوڑے اور گدھے ثابت ہیں جو مختلف وقتوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استعمال کئے۔ بہرحال اکثر صحابہ کی یہ رائے ہے کہ اِس سورۃ میں اُن غزوات کی خبر دی گئی ہے جو مسلمانوں کو کفار سے پیش آئے چنانچہ ایک حدیث بھی معیّن صورت میں اِس کی تائید میں آتی ہے۔ ایک صحابی یہ بیان کرتے ہیں وَالْعٰدِیٰتِ کی سُورۃ کا شانِ نزول یہ تھا کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بنوکنانہ کی طرف ایک سریّہ بھجوایا جس کے سردار المنذر بن عمرو الانصاری تھے (یہ لشکر گھوڑوں پر سوار تھا جیسا کہ حضرت علیؓ کی اُوپر بیان کردہ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ جب اُنکو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اِس قول کی خبر پہنچی کہ عَادِیَاتِ ضَبْحًا سے گھوڑے مراد ہیں تو آپ نے فرمایا کہ گھوڑے تو ایک سریّہ میں گئے تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھجوائے تھے) المنذران بارہ نقباء میں سے ایک تھے جنہوں نے مکہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جن کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اپنے اپنے قبیلہ کا سردار اور افسر مقرر فرمایا تھا۔

ایک ماہ تک اِس سریّہ کے بارہ میں کوئی خبر نہ آئی جس پر منافقوں نے شور مچا دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ سب کے سب مارے گئے ہیں۔ اُن کا مقصد اِن افواہوں سے یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل ٹوٹ جائیں اور آئندہ وہ کسی قسم کی قربانی کے لئے باہر نہ نکلیں جب اُنہوں نے اِس رنگ میں جھوٹا پراپیگنڈہ شروع کر دیا تو یہ سُورۃ نازل ہوئی جس میں اُس سریّہ کا نقشہ کھینچا گیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ وہ سلامت ہیں اُنہوں نے دشمن پر حملہ کیا ہے اور وہ اپنے حملہ میں کامیاب رہے ہیں چنانچہ چند دنوں کے بعد سریّہ واپس آگیا اور اُس نے بتایا کہ جس طرح پیشگوئی کی گئی تھی ویسے ہی واقعات اُس کے ساتھ پیش آئے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سورۃ تو مکی ہے لیکن اگر اِس روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی تھی مکہ میں نہیں۔ ایک طرف اسے مکی قرار دینا اور دوسری طرف اِس آیت کا شانِ نزول ایسا بتانا جس سے یہ مدنی ثابت ہو عجیب بات ہے۔ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ جیسا مَیں پہلے بھی کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں یہ امر کثرت سے ثابت ہے کہ ایک ایک آیت کے کئی کئی شانِ نزول بتائے گئے ہیں اور محققین کا قول ہے کہ درحقیقت شانِ نزول کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں واقعہ پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔ یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہی واقعہ اس آیت کا شانِ نزول تھا۔ اِس جگہ بھی یہی مراد ہے یعنی چونکہ یہ پہلا غزوہ تھا جس میں سب یا بکثرت گھوڑے استعمال کئے گئے تھے اِس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس پہلے سے نازل شدہ سورۃ کو اُن لوگوں پر جو ایسی خبریں مشہور کرتے تھے چسپاں کیا اور یہ استدلال فرمایا کہ جس سورۃ میں گھڑ سواروں کی خبر ہے وہ ضرور پہلی گھڑ سواروں کی فوج پر تو پوری ہوگی اور چونکہ اِس سورۃ میں اسلامی گھڑ سواروں کے جیتنے کی خبر ہے اِس لئے ضرور یہ لشکر جیت کر آئے گا۔ پس آپ نے اِس سُورۃ سے استنباط کر کے لوگوں کو بتا دیا کہ وہ سوار جنہیں مَیں نے

بھجوایا ہے اس پیشگوئی کے ماتحت جیت کر آئیں گے اور تمہاری مایوسانہ طبیعت کا پول کھل جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب منافقین نے یہ افواہیں مشہور کی ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اسی پرانے کلام کو دوبارہ نازل کر کے مسلمانوں کو تسلی دی ہو کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں سریّہ واپس آئے گا اور کامیاب کامران واپس آئے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بارہ میں پہلے سے پیشگوئی کر چکا ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ بہرحال اللہ تعالیٰ کی ہی پیشگوئی پوری ہوگی منافقین کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ اسکی ایسی ہی مثال ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"ایک مقدمہ میں کہ اس عاجز کے والد مرحوم کی طرف سے اپنے زمینداری حقوق کے متعلق کسی رعیت پر دائر تھا۔ اس خاکسار پر خواب میں یہ ظاہر کیا گیا کہ اس مقدمہ میں ڈگری ہو جائیگی چنانچہ اس عاجز نے وہ خواب ایک آریہ کو کہ جو قادیان میں موجود ہے بتلا دی۔ پھر بعد اس کے ایسا اتفاق ہوا کہ اخیر تاریخ پر صرف مدعا علیہ مع اپنے چند گواہوں کے عدالت میں حاضر ہوا اور اس طرف سے کوئی مختار وغیرہ حاضر نہ ہوا۔ شام کو مدعا علیہ اور سب گواہوں نے واپس آکر بیان کیا کہ مقدمہ خارج ہو گیا۔ اس خبر کو سنتے وہ آریہ تکذیب اور استہزاء سے پیش آیا۔ اُس وقت جس قدر قلق اور کرب گذرا بیان میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ قریب قیاس معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ایک گروہ کثیر کا بیان جن میں بے تعلق آدمی بھی تھے خلاف واقعہ ہو۔ اس سخت حزن و غم کی حالت میں نہایت شدت سے الہام ہوا کہ جو آہنی میخ کی طرح دل کے اندر داخل ہو گیا۔ اور وہ یہ تھا

ڈگری ہو گئی ہے مسلمان ہے

یعنی کیا تو باور نہیں کرتا اور باوجود مسلمان ہونے کے شک کو دخل دیتا ہے۔ آخر تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت ڈگری ہی ہوئی تھی اور فریق ثانی نے حکم سننے میں دھوکا کھایا تھا۔" (تذکرہ ص۹۵ ۹۶)

اب دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر ایک خبر دیتے ہیں اور واقعہ اُس کے مطابق ہوتا ہے مگر جب آریہ جھوٹی افواہ مشہور کر دیتا ہے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ تسلی دیتا ہے اور دوبارہ بتاتا ہے کہ "ڈگری ہو گئی ہے مسلمان ہے" یعنی تم مسلمان ہو تمہیں خدا تعالیٰ کے کلام پر یقین رکھنا چاہیئے واقعہ یہی ہے کہ ڈگری ہو گئی ہے۔ اسی طرح جب منافقین نے جھوٹی افواہیں پھیلانی شروع کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا والی آیات دوبارہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کر دی ہوں یہ بتانے کے لئے کہ تم نے ہی جیتنا ہے اور اس بارہ میں ہم پہلے سے پیشگوئی کر چکے ہیں منافقوں کا کیا ہے وہ تو جھوٹ بول رہے ہیں۔

غرض میرے نزدیک یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں یہ بھی کہ جب یہ پہلا سریّہ گیا اور منافقوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ مسلمان سب مارے گئے ہیں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ وہ کس طرح مارے جا سکتے ہیں۔ یہ پہلا سریّہ ہے جو گھوڑوں پر گیا ہے اور اس لحاظ سے اس پیشگوئی کا پہلا مصداق ہے جو خدا تعالیٰ نے وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا میں کی ہوئی ہے اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مارے جائیں اور سننے والے نے سمجھا ہو کہ اسی واقعہ پر یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کہہ چکا ہے کہ ہمیں فتح ہوگی تو منافقوں کی یہ بات کس طرح درست ہو سکتی ہے کہ مسلمان مارے گئے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مکی آیات دوبارہ مسلمانوں کی تسلی کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کر دی گئی ہوں بہرحال کوئی صورت ہو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کو پیشگوئی قرار دیا ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ غزوات اسلامیہ

پر ان آیات کو چسپاں کرنا بالکل درست ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید اِن معنوں کو حاصل ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لُغت میں بعض دوسرے جانوروں کی آواز کو بھی ضَبْح کہا جاتا ہے۔ مثلاً اُلّو کی آواز کو بھی ضَبْح کہتے ہیں۔ لُومڑ کی آواز کو بھی ضَبْح کہتے ہیں۔ کالے سانپ کی آواز کو بھی ضَبْح کہتے ہیں۔ خرگوش کی آواز کو بھی ضَبْح کہتے ہیں۔ اِن جانوروں کی آواز کے علاوہ کمان سے جو آواز نکلتی ہے اُسے بھی ضَبْح کہتے ہیں اور اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اتنی چیزوں کے لئے ضَبْح کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو پھر وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا کو گھوڑوں پر مخصوص طور پر کس طرح چسپاں کیا جا سکتا ہے کیوں نہ یہ سمجھ لیا جائے کہ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا والی آیت اُونٹوں پر بھی چسپاں ہو سکتی ہے اور حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بیان کردہ معنے بالکل درست ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک استعارہ اور مجاز کا سوال ہے ہم خود تسلیم کرتے ہیں کہ عٰدِيٰتِ ضَبْحًا میں اُونٹ بھی شامل ہیں۔ کیونکہ جب اُس چیز کا ذکر کر دیا گیا ہے جو اغارت میں زیادہ کام آتی ہے یعنی گھوڑے۔ تو اُونٹوں کا ذکر مجازی طور پر اس میں خود بخود شامل سمجھا جائے گا کیونکہ اُونٹ بھی اغارت میں کام آتے ہیں گو گھوڑوں کی نسبت کم۔ لیکن اگر صرف اِس بات کو دیکھتے ہوئے کہ اُلّو یا بعض دوسرے جانوروں کی آواز کے لئے بھی ضَبْح کا لفظ بول لیتے ہیں یہ کہا جائے کہ چونکہ اُلّو یا فلاں جانور کی آواز کو بھی ضَبْح کہا جاتا ہے اِس لئے ہم اِس جگہ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا سے اُونٹ مراد لیں گے تو یہ قیاس مع الفارق ہوگا کیونکہ اُونٹ اور اُلّو میں تو کوئی جوڑ ہی نہیں سوائے اِس کے کہ کوئی مزاحیہ رنگ میں کہہ دے کہ اُونٹ اور اُلّو میں کیوں جوڑ نہیں۔ اُلّو میں بھی الف واؤ آتا ہے اور اُونٹ میں بھی الف واؤ آتا ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ضَبْح کا لفظ بعض دوسرے جانوروں کی آواز کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مگر عٰدِيٰت کے ساتھ مل کر ضَبْحًا کے جو معنے بنتے ہیں وہ سوائے گھوڑوں کے اور کسی چیز پر چسپاں نہیں ہو سکتے۔ یُوں خالی ضَبْح کا لفظ بے شک خرگوش یا اُلّو یا لُومڑ کی آواز کے لئے استعمال کر لیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں خالی ضَبْح کا لفظ نہیں بلکہ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا کے الفاظ ہیں اِس لئے اِس آیت کے معنے کرتے ہوئے وَالْعٰدِيٰتِ سے ایسے دوڑنے والے ہی مراد لئے جائیں گے جن کے سینہ سے تیز دوڑتے ہوئے آواز نکلتی ہو اور اُس آواز کو ضَبْح کہا جاتا ہو۔ اور مَیں بتا چکا ہوں کہ لُغت میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ضَبْح اُس آواز کو کہا جاتا ہے جو تیز دوڑتے وقت گھوڑوں کے سینوں میں سے نکلتی ہے پس وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا سے گھوڑے ہی مراد ہوں گے نہ کہ کوئی اور چیز۔ اور ابل کا ذکر بھی استعارۃً سمجھا جائے گا نہ کہ حقیقی معنوں میں۔

اِس آیت کا یہ بھی ایک لطیف پہلو ہے کہ مکہ میں گھوڑے بہت کم ہوتے ہیں وہاں زیادہ تر اُونٹوں کا رواج ہے جب مَیں حج کے لئے گیا تو سواری کے لئے گدھا تو مل جاتا تھا مگر گھوڑا نہیں ملتا تھا۔ ہمارے ملک میں چونکہ گدھے پر سوار ہونا معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے مَیں نے کہا کہ گھوڑا تلاش کرو بڑی تلاش کے بعد گھوڑا تو نہ ملا ایک خچر مل گئی جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ تین ہزار روپیہ کی ہے مَیں اُس پر سوار ہو گیا۔ ہم اُس وقت غارِ ثور کی طرف جا رہے تھے اور میرے باقی ساتھی گدھوں پر سوار تھے۔ میرے ساتھی تو آدھ میل آگے نکل گئے مگر مَیں پیچھے رہ گیا آخر مَیں نے بھی خچر چھوڑی اور گدھے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ پس مکہ میں گھوڑے بہت کم ہوتے ہیں اور اُس زمانہ میں تو اور بھی کم تھے۔ جب یہ سورۃ نازل ہوئی زیادہ تر اُونٹوں کا رواج تھا مگر اللہ تعالیٰ نے وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا کی آیت نازل فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ مکہ کے اُونٹ سوار ایک دن گھوڑے سوار بننے والے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں بعد میں مسلمانوں کے پاس گھوڑے بڑھتے چلے گئے اور اُن کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی کیونکہ جنگ میں جتنا کام گھوڑا دے سکتا ہے اُتنا کام اُونٹ نہیں دے سکتا۔

اِس کے علاوہ مسلمانوں میں گھوڑوں کا رواج اس وجہ سے

فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًاۙ

پھر (مجھے قسم ہے) چوٹ مار کر چنگاری نکالنے والوں کی ۳؎

بھی ترقی پا گیا کہ قرآن کریم اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لئے گھوڑے رکھنا اللہ تعالےٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی کے حصول کا ایک ذریعہ قرار دے دیا تھا۔ مثلاً اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو واضح طور پر یہ حکم دے دیا تھا کہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ع ۸) تم اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں جو کچھ بھی تیاری کر سکتے ہو کرو اپنی قوت کو بڑھاؤ اور اپنے گھوڑوں کو خدا تعالےٰ کی راہ میں وقف کر کے تاکہ اس ذریعہ سے دشمن پر تمہارا رُعب قائم ہو جائے اور وہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آجائے۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ اگر وہ جہاد کے لئے گھوڑے رکھیں گے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا اجر ملیگا۔ مثلاً آپ نے فرمایا اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ کہ گھوڑوں کی پیشانی میں قیامت تک خیر بندھی ہوئی ہے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا مَنِ احْتَبَسَ فَرَسًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِيْمَانًا بِاللّٰهِ وَتَصْدِيْقًا بِوَعْدِهٖ فَاِنَّ شِبَعَهٗ وَرِيَّهٗ وَرَوْثَهٗ وَبَوْلَهٗ فِيْ مِيْزَانِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (بخاری جلد ۲ کتاب الجہاد والسیر) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایمان اور اخلاص کے ساتھ اُس کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے اپنا گھوڑا وقف کر دیتا ہے اُس گھوڑے کا کھانا، اُس کا پینا، اُس کی لید اور اُس کا پیشاب سب قیامت کے دن انسان کی میزان میں بطور اعمال نیک کے تولے جائینگے۔

گھوڑوں کے متعلق تو اس قسم کی متعدد احادیث آتی ہیں مگر اونٹ کے متعلق کسی حدیث میں نہیں آتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لئے اُس کا رکھنا بھی اسی طرح موجبِ حسنات قرار دیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منشاء الٰہی یہی تھا کہ مسلمان گھوڑے زیادہ رکھیں اور اغراض جہاد کے لئے اونٹوں کی طرف کم توجہ کریں۔

یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ اس جگہ عٰدِیٰت سے گھوڑے ہی مراد ہیں چنانچہ قرآن کریم سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی اور لُغت کی تائید بھی ان معنوں کو حاصل ہوگئی۔ کیونکہ لُغت بتاتی ہے کہ ضَبْحٌ گھوڑے کی ایک دوڑ کا بھی نام ہے اور ضَبْحٌ اُس خاص قسم کی آواز کو بھی کہا جاتا ہے جو دوڑتے وقت اُس کے سینہ میں سے نکلتی ہے اور وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا کے معنے یہ ہیں کہ اے مسلمانو! آئندہ زمانہ میں تمہیں جنگیں پیش آنے والی ہیں تمہاری ملکی چیز اونٹ ہے مگر ہماری نصیحت یہ ہے کہ تمہیں اپنے پاس زیادہ سے زیادہ گھوڑے رکھنے چاہئیں کیونکہ وہ جنگ میں اونٹوں سے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگر تم گھوڑوں سے کام لوگے تو وہ تمہاری فتح کا موجب ہو جائیں گے۔ چنانچہ صحابہؓ نے ایسا ہی کیا اور روز بروز اُن کے گھوڑے بڑھتے چلے گئے۔

۳؎ حل لغات ۔ مُوْرِیَات: اَوْرٰی سے اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے اور اَوْرَى الزَّنْدَ کے معنے ہوتے ہیں اَخْرَجَ نَارَهٗ۔ اُس نے چقماق میں سے آگ نکالی یعنی چقماق کو ٹکرایا جس کے نتیجہ میں آگ پیدا ہوئی اور قَدَحَ بِالزَّنْدِ کے معنے ہیں رَامَ الْاِيْرَاءَ بِهٖ اُس نے چقماق میں سے آگ نکالنے کا ارادہ کیا (اقرب) پس فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کے معنے یہ ہوئے کہ وہ قَدْح کرکے یعنی ارادہ کے ساتھ آگ نکالتے ہیں یا قَدْح کے معنے چونکہ بعض لوگ ٹکرانے کے لیتے ہیں اس لحاظ سے معنے یہ ہوں گے کہ وہ ٹکرا کر آگ نکالتے ہیں۔

تفسیر ۔ آگ جلانے سے بعض نے گھوڑوں کے سُموں سے پیدا ہونیوالی آگ مراد لی ہے (ابن جریر) اور بعض نے جنگ سے واپسی پر کھانا پکانے کی آگ یا مزدلفہ میں آگ جلانا مراد لیا ہے۔

مُوْرِیَات

قَدْحًا

حضرت ابن عباسؓ نے جنگ سے واپسی پر کھانا پکانے کے لئے آگ جلانا ہی اس کے معنے کئے ہیں۔ پُرانے زمانے میں چونکہ دیا سلائیاں نہیں ہوتی تھیں اِس لئے گھروں میں عام طور پر یہ دستور ہُوا کرتا تھا کہ رات کو کھانا پکانے کے بعد کسی قدر آگ راکھ میں دفن کر دی جاتی تھی بلکہ آج کل بھی دیہات میں یہی طریق رائج ہے جب شام کا کھانا تیار ہو جاتا ہے تو کوئی انگارا یا سُلگتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑہ راکھ کے نیچے دفن کر دیتے ہیں صبح کے وقت انگارا نکال کر تھوڑی سی مونج کی تیلی اُس پر رکھ دیتے ہیں یا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکٹھے کر کے اُس کے اردگرد رکھ دیتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد مُونج یا لکڑی کے ٹکڑے جل اُٹھتے ہیں اور آگ روشن ہو جاتی ہے وہ لوگ جن کی آگ بُجھ جاتی ہے اپنے ہمسایہ سے آگ لے لیتے ہیں مگر جنگ میں ایسا نہیں ہو سکتا اِس موقعہ پر پُرانے زمانہ میں آگ روشن کرنے کے لئے چقماق سے کام لیا جاتا۔ چقماق کو جب لوہے سے زور سے ٹکرائیں تو اُس میں سے آگ نکلتی ہے اُس وقت ذرا سا کپڑا یا سُوکھا ہُوا پتہ یا مُونج کا کوئی ٹکڑہ ساتھ رکھ دیا جائے تو وہ فوراً جل اُٹھتا ہے۔ آج کل بھی یورپین قوموں میں چقماق کا رواج پایا جاتا ہے مگر ہمارے مُلک میں اِس کا رواج مِٹ گیا ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو چقماق سے تماشہ کے طور پر آگ نکالا کرتے تھے اور گنوار لوگ جن کو حقیقت کا علم نہیں ہوتا تھا وہ سمجھتے تھے کہ بڑا معجزہ ہو گیا ہے مگر اب ہندوستان میں چقماق کا رواج نہیں رہا۔ جرمن قوم میں اس کا زیادہ رواج ہے کسی قدر انگریزوں میں بھی اِس کا رواج پایا جاتا ہے چنانچہ جنگ کے دنوں میں سگرٹ اور سگار جلانے کے لئے فوجیوں میں چقماق بھی دئے جاتے تھے۔ چقماق کو ایک گھومنے والے لوہے کے چکر کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور ساتھ ایک سپرنگ لگا ہُوا ہوتا ہے جب اُس سپرنگ کو دبایا جائے تو لوہے کا چکر تیزی کے ساتھ گھومنے لگتا ہے اور ساتھ کے چقماق کے ساتھ ٹکراتا ہے جس سے شعلہ پیدا ہوتا ہے پاس ہی بتی ہوتی ہے جس کے نیچے کچھ تیل ہوتا ہے وہ فوراً اُس شعلہ سے جل اُٹھتی ہے اور سگرٹ یا سگار جلا لیا جاتا ہے اور پھر فوراً بتی کو بُجھا دیا جاتا ہے۔ جرمنوں میں اِس کا رواج بہت زیادہ تھا مگر یہ جرمن تجارت کا یہ آلہ ایک جُزو تھا۔ تھوڑے دن ہوئے یہاں کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ فوجیوں کے لئے سگار لائٹر تیار کئے گئے ہیں۔ یہ سگار لائٹرز زیادہ تر برما میں کام کرنے والے فوجیوں کے لئے تیار کئے گئے تھے کیونکہ وہاں آگ آسانی سے نہیں جل سکتی۔

پُرانے زمانہ میں بوجہ دیا سلائی نہ ہونے کے فوجوں میں چقماق سے ہی زیادہ تر کام لیا جاتا تھا اِس لئے حضرت ابن عباسؓ کی یہ رائے ہے کہ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کے معنے یہ ہیں کہ جب وہ سوار جنگوں سے واپس آتے ہیں تو بیٹھ کر آگ جلاتے اور اپنے لئے کھانا تیار کرتے ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کے فقرہ کے معنے حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق کھانا پکانے کیلئے آگ جلانے کے بھی ہو سکتے ہیں مگر یہاں وہ بات مراد نہیں جو اُنہوں نے سمجھی ہے یعنی وہ حملہ سے لوٹ کر ایسا کرتے ہیں کیونکہ اِسکی تردید اگلی آیت سے ہی ہو جاتی ہے اگلی آیت میں حملہ کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے پہلے فاء ہے جو اکثر اور بیشتر ترتیب کے لئے آتی ہے۔ یہ ترتیب خود بتا رہی ہے کہ حملہ بعد میں ہے نہ کہ پہلے یعنی پہلے فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ہے اور پھر فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا۔ پس اگلی آیت میں مذکور بات اِس آیت میں بتائی ہوئی بات کے بعد ہونی چاہیئے۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کے معنے ابن عباسؓ کے نزدیک

میرے نزدیک فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کے معنے اگر کھانا پکانے کے لئے آگ جلانے کے ہی کرنے ہوں تو چونکہ اِس کے بعد حملہ کرنے کا ذکر ہے اِس کے یہ معنے کرنے زیادہ درست ہوں گے کہ صحابہؓ حسبِ سُنت نبویؐ جب حملہ کرنے کیلئے جاتے ہیں تو فوراً حملہ نہیں کر دیتے بلکہ قریب جا کر سواریوں سے اُتر جاتے ہیں اور کھانا وغیرہ پکاتے اور رات گذارتے ہیں پھر صُبح کو حملہ کرتے ہیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت میں یہ بات داخل تھی کہ آپ کبھی سیدھا حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں حملہ کرنا ہوتا اُس مقام سے ایک دو میل دُور اپنے ڈیرے لگا دیتے اور جب صُبح ہوتی تب حملہ کرتے۔ پس اگر اِس آیت سے کھانا پکانے کے لئے آگ جلانا ہی مراد ہو تو بھی

جنگ سے واپسی پر کھانا پکانا مراد نہیں بلکہ حملہ سے پہلے کھانا پکانا مراد ہے۔ اگر فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا میں حملہ کے بعد آگ روشن کرنے اور کھانا پکانے کا ذکر ہوتا تو اسکے بعد فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا نہ آتا۔ اللہ تعالیٰ کا پہلے فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا رکھنا اور پھر فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا کہنا صاف بتارہا ہے کہ اِس آیت میں حملہ سے واپسی کا ذکر نہیں بلکہ ذکر یہ ہے کہ جب وہ حملہ کرنے جاتے ہیں تو فوراً حملہ نہیں کردیتے بلکہ رات کو ٹھہرتے آگ جلاتے اور کھانا وغیرہ پکاتے ہیں جب صبح ہوتی ہے تب حملہ کرتے ہیں۔

اِن آیات میں ایک طرف تو یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی خدمت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی جان دینے کا اِس قدر جوش پایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے زبردست اور کثیر التعداد دشمنوں کے مقابل پر جاتے ہیں تو وہ اپنے گھوڑوں کو ایڑیاں مارتے اور اُن کو دوڑاتے اور اُڑاتے چلے جاتے ہیں اور اِس امر کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے کہ اُن کے گھوڑے زندہ رہتے ہیں یا مرتے ہیں۔ مگر دوسری طرف اُن میں ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاقِ اسلامی پائے جاتے ہیں کہ جب وہ عین دشمن کے سر پر پہنچ جاتے ہیں اُس وقت یکدم حملہ نہیں کرتے بلکہ منزل کرتے ہیں اور کھانا پکاتے ہیں اور رات بسر کرتے ہیں پھر جب صبح ہوتی ہے تب حملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تمام عمر یہ معمول رہا کہ آپ کبھی رات کو حملہ نہیں کرتے تھے اور نہ صحابہ کو شبخون مارنے کی اجازت دیتے تھے۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۲۱۱ میں مسلمانوں کے ایک خلق کی طرف اشارہ

دراصل عرب میں الگ الگ قبائل ہوا کرتے تھے اور وہ خانہ بدوش ہونے کی وجہ سے اپنی جگہیں بھی بدلتے رہا کرتے رہتے تھے اِس وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حملہ میں بہت محتاط پہلو اختیار فرماتے تھے۔ آپ فرماتے کہ کبھی رات کو حملہ نہ کرو ممکن ہے ایک قبیلہ اُٹھ جائے اور دوسرا قبیلہ اُس کی جگہ آ بیٹھے اور تم غلطی سے دشمن کی بجائے کسی اَور پر حملہ کردو۔ اِس لئے صبح تک انتظار کرو اگر صبح کو اُنکی

اذان کی آواز تمہارے کان میں آجائے تو تم حملہ نہ کرو اور اگر تم نے حملہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ تمہاری اذان کی آواز اُن کے کانوں تک پہنچ جائے اور اُنہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان حملہ کرنے کے لئے آگئے ہیں سوتے دشمن پر حملہ نہیں کرنا۔ پس فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا میں صحابہؓ کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آج مکہ میں مسلمان مغلوب ہیں وہ قریش کے بڑے بڑے رؤساء کی نگاہ میں مقہور اور ذلیل ہیں۔ دشمن اُٹھتا ہے اور اُنہیں بے دریغ تکالیف دینا شروع کر دیتا ہے اُسے کسی خُلق کی پرواہ نہیں وہ اپنا واحد مقصد یہ سمجھتا ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو دُکھ دے خواہ اخلاق میں سے کوئی ایک خلق بھی اُس کے پاس نہ رہے۔ مگر یاد رکھو ایک دن یہ بے کس اور کمزور نظر آنے والے لوگ بھی ترقی کر جائیں گے اور اونٹوں کی بجائے گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی جانیں خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے آئیں گے۔ عربوں کے لئے گھوڑا عجیب چیز تھی صرف نجدیوں کے پاس گھوڑے ہوا کرتے تھے اور نجدیوں سے مکّہ والے بڑے گھبراتے تھے مگر اللہ تعالیٰ پیشگوئی کرتا ہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب مسلمان طاقتور ہو جائیں گے اور اپنے پاس کثرت سے گھوڑے رکھنے لگیں گے تم سمجھتے ہو کہ چونکہ مسلمان کمزور ہیں اِس لئے جانیں دے رہے ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے جب یہ طاقتور ہو جائیں گے، جب یہ گھڑ چڑھے سوار بن جائیں گے اُس وقت بھی یہ اپنی جانیں قربان کرنا اپنے لئے انتہائی باعثِ فخر سمجھیں گے اور اُن میں اِس قدر جوش ہوگا کہ وہ اپنے گھوڑوں کو ایڑیاں مارتے اور اُنہیں منزلِ مقصود کی طرف دوڑاتے چلے جائیں گے۔ مگر دوسری طرف اُن کے اخلاق ایسے اعلیٰ درجہ کے ہوں گے کہ وہ کبھی غافل دشمن پر حملہ نہیں کریں گے، کبھی رات کو حملہ نہیں کریں گے کبھی اچانک حملہ نہیں کریں گے۔ تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم اخلاق کی پروا تک نہیں کرتے جب بھی کوئی مسلمان تمہارے قابو آجائے تم اُسے مارنے پیٹنے لگ جاتے ہو مگر یہ اخلاق کو

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝

پھر صبح ہی صبح حملہ کرنے والوں کی ۵۴

کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کریں گے جب یہ طاقت ور ہو جائیں گے۔ جب یہ گھڑ چڑھے سوار ہو جائیں گے تب بھی یہ فوراً حملہ نہیں کر دیں گے بلکہ جب آئیں گے رات بھر انتظار کرینگے صبح کے وقت اگر تمہاری اذان کی آواز ان کے کانوں میں آئے گی تو یہ تم پر حملہ نہیں کریں گے اور اگر تمہاری اذان نہیں ہوگی تو اپنی اذان کی آواز تمہارے کانوں تک پہنچائیں گے تاکہ تم ہوشیار اور بیدار ہو جاؤ اور مقابلہ کے لئے تیار ہو کر باہر نکلو۔ غرض اس آیت میں مسلمانوں کے نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق کیطرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر صرف اخلاق کی طرف ہی نہیں بلکہ اس آیت میں مسلمانوں کی دلیری کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جو لوگ دشمن سے لڑتے ہیں وہ رات کو آگ بجھا دیا کرتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ رات کو آگ روشن رکھیں اور دشمن کو اپنی موجودگی کا علم ہونے دیں مگر مسلمانوں کے متعلق فرمایا کہ وہ حملہ کرنے کے لئے جاتے ہیں تو آگ کو روشن رکھتے ہیں دشمن سے ڈر کر اُسے بجھاتے نہیں۔ اسی طرح اس آیت میں مسلمانوں کی سخاوت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ عرب لوگ آگ جلانے سے سخاوت اور دلیری دونوں مراد لیا کرتے تھے۔ عرب شاعر اپنے مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے کہ ہماری قوم کی آگ جلتی رہتی ہے لیکن تمہاری قوم کی آگ بجھ جاتی ہے۔ اس میں دونوں طرف اشارہ ہوا کرتا تھا اس طرف بھی کہ ہم بہادر ہیں ہم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اگر ہم نے آگ روشن کی تو دشمن کو پتہ لگ جائے گا کہ ہم یہاں بیٹھے ہیں اور اس طرف بھی کہ تم رات کو کھانا پکا کر آگ بجھا دیتے ہو تاکہ کوئی مسافر اس آگ کو دیکھ کر تمہارے پاس کھانا کھانے کیلئے نہ آجائے لیکن ہماری قوم مہمان نواز ہے ہماری آگ جلتی رہتی ہے اور جب کوئی مسافر آگ کو روشن دیکھ کر ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اُسے کھانا کھلاتے ہیں۔ پس فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا میں دونوں باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی کہ ہم بہادر ہیں ہم اپنی آگ کو ڈر سے بجھاتے نہیں بلکہ رات کو دلیری سے روشنی جلاتے ہیں اور یہ بھی کہ تم کَنُوْد ہو۔ بخل کی وجہ سے کسی کو کھانا کھلانا بھی پسند نہیں کرتے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنی روشنیاں جلائے رکھتے ہیں تاکہ مسافر اور غرباء و مساکین وغیرہ آئیں اور کھانا کھائیں۔ یہ معنے ایسے ہیں جو کَنُوْد کے مقابلہ میں اس مقام پر زیادہ عمدگی سے چسپاں ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی معنے کئے ہیں جو بہت لطیف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے لئے فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا کہا ہے اور صبح کے لئے فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا کہا ہے یعنی دونوں موقعوں پر جو چیز زیادہ ظاہر ہونے والی تھی اُس کا ذکر کیا گیا ہے۔ رات کو اُڑتی ہوئی گرد نظر نہیں آتی اور دن کو آگ کی روشنی نظر نہیں آتی پس مُوْرِيٰتِ قَدْحًا کو پہلے رکھ کر بتایا کہ وہ رات کو روشنیاں جلاتے ہیں اور دشمن کو للکار کر کہتے ہیں کہ دیکھ لو ہم آئے ہوئے ہیں اور صبح کو اپنے گھوڑوں سے گرد اڑاتے ہیں تاکہ وہ دُور سے ہی دیکھ لیں کہ ہم آرہے ہیں۔ گویا ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں کی جرأت اور اُن کی بہادری کا اعلان کیا گیا ہے۔

۵۴ حل لغات۔ مُغِيْرٰت: اَغَارَ سے اسم فاعل مؤنث کا جمع کا صیغہ ہے اور اَغَارَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں اَتَى الْغَوْرَ وہ پانی کے چشمہ پر آیا یا کسی غار وغیرہ پر پہنچا اور اَغَارَ زَيْدٌ کے معنے ہوتے ہیں ذَهَبَ فِي الْاَرْضِ اُس نے سفر کیا اور دُور نکل گیا۔ اور صرف اَغَارَ کے معنے ہوتے ہیں اَسْرَعَ وَدَفَعَ فِيْ عَدْوِهٖ۔ وہ تیزی سے گیا اور اُس نے اپنے گھوڑوں کو دشمن کی صفوں کے اندر ڈالدیا اور اَغَارَ عَلَى الْقَوْمِ غَارَةً وَاِغَارَةً وَمُغَارًا کے معنے ہوتے ہیں دَفَعَ عَلَيْهِمُ الْخَيْلَ وَاَخْرَجَهُمْ

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝

جس کے نتیجہ میں وہ اس (صبح کے وقت) میں غبار اُڑاتے ہیں ۵ؔ

مِنْ فَنَاءِ هِمْ بِهُجُوْمِهٖ عَلَيْهِمْ وَاَوْقَعَ بِهِمْ اُنہوں نے حملہ کرکے دشمن کو اُن کے صحنوں سے باہر نکالا اور پھر اُن پر ٹوٹ پڑے (اقرب) پس مُغِيْرَات کے معنے ہوں گے (۱) دَور دَور نکل جانے والی جماعتیں (۲) اپنے گھوڑوں کو دشمنوں کی صفوں میں ڈالنے والی جماعتیں (۳) دشمن پر حملہ کرکے اُسے اُن کے صحن سے نکال دینے والی جماعتیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کے اس وصف کو بیان کیا ہے کہ وہ رات کو کبھی حملہ نہیں کریں گے تا ایسا نہ ہو کہ دشمن بلا خفیت کی حالت میں مارا جائے۔ وہ صبح کے وقت حملہ کریں گے مگر حملہ ایسا شاندار ہوگا کہ دشمن فوراً اپنے گھروں سے نکل کر باہر آجائے گا۔ یہ کیسا بہادری کا طریق ہے جو اسلام نے بطور سُنّت جاری کیا۔ اِس وقت انصاف و بہادری کی مدعی یوروپین اقوام راتوں کو برابر دشمن پر حملہ کرتی ہیں اور غفلت میں حملہ کرنا اپنی خاص خوبی قرار دیتی ہیں۔ مگر اسلام بتاتا ہے کہ مسلمان ایسا نہیں کریں گے وہ ہمیشہ صبح کے وقت حملہ کریں گے جو ثبوت ہوگا اس بات کا کہ مسلمان بہادر، نڈر اور رحم کرنے والے ہیں۔ مُغِيْرَات کا لفظ بھی اُن کی دلیری کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ اغارت کے ایک معنے یہ ہیں کہ دشمن پر حملہ کرکے اُسے گھروں سے نکالنا اور پھر اُس کا مقابلہ کرنا گویا گھروں میں گھس کر بچوں، عورتوں، بوڑھوں کو مارنا اُن کا طریق نہ ہوگا بلکہ دشمن کے لڑنے والے لوگوں کو گھروں سے للکار کر نکالنا اور پھر اُن کی صفوف پر حملہ کرنا اُن کا طریق ہوگا جو اُن کے دلیرانہ حملہ کا ایک بہت بڑا ثبوت ہوگا اسی طرح صُبْحًا میں یہ اشارہ ہے کہ وہ رات کو حملہ نہیں کرتے بلکہ جب صبح ہوتی ہے تو اُس وقت حملہ کرتے ہیں تاکہ دشمن غافل نہ ہو اور اُسے مقابلہ کا پورا موقع ملے۔

(حاشیہ: مُغِيْرَاتِ صُبْحًا میں مسلمانوں کی بہادری کا ذکر)

(حاشیہ: فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا میں بِهٖ کی ضمیر صبح کی طرف)

۵ؔ حل لغات۔ النَّقْعُ۔ اَلْغُبَارُ۔ نَقْعٌ کے معنے غبار کے ہیں۔ نیز نَقْعٌ کے معنے اَلْاَرْضُ الْحُرَّةُ الطِّيْنِ يُسْتَنْقَعُ فِيْهَا الْمَآءُ کے بھی ہیں یعنی وہ پتھریلی زمین جہاں پانی جمع کیا جاتا ہے اور نَقْعٌ مکہ کے پاس ایک مقام کا نام ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ مقام مِنیٰ کا حصہ ہے حضرت علیؓ نے اِسی وجہ سے وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا سے وہ حاجی مراد لئے ہیں جو عرفہ سے مزدلفہ کی طرف اور پھر مزدلفہ سے منیٰ کی طرف تیزی سے آتے ہیں۔ اور نَقْعٌ کے معنے اَلْقَاعُ کے بھی ہوتے ہیں یعنی صاف میدان اور نَقْعٌ کے معنے مَحْبَسُ الْمَآءِ یعنی تالاب کے بھی ہیں (اقرب)

(حاشیہ: النَّقْعُ)

نَقْعٌ کے معنے ابوعبیدہ نے آواز بلند کرنے کے بھی کئے ہیں اور لَبِید کا ایک شعر اس کی تائید میں پیش کیا ہے کہ اُنہوں نے بھی نَقْعٌ کا لفظ آواز بلند کرنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ایک اثر منقول ہے جس میں اُنہوں نے نَقْعٌ کے معنے آواز بلند کرنے کے کئے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت خالدؓ بن ولید کی وفات کی خبر آپ کو ملی تو کسی نے کہا کہ عورتیں وہاں رو رہی ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کیا بات ہے کہ عورتیں بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں اور کوئی نقع اور لقلقہ نہیں یعنی بلند آواز سے شور کی کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔

تفسیر۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا میں بِهٖ کی ضمیر صبح کی طرف جاتی ہے یعنی فَاَثَرْنَ وَقْتَ الصُّبْحِ نَقْعًا وہ صبح کے وقت خوب غبار اُڑائیں گے۔ یہاں بھی ایک لطیف بات بیان کی گئی ہے جو مسلمانوں کی شجاعت کی طرف اشارہ کرتی ہے اصل بات یہ ہے کہ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا رات کو اطمینان سے بیٹھ جانا، کھانا پکانا اور دشمن پر پہلے ہی حملہ نہ کرنا شاید اس لئے ہے کہ ذبح . . . ان کا جوش جاتا رہتا ہے۔ پہلے اگر اُن سے جوش ظاہر ہوتا

ہے اور وہ اپنے گھوڑوں کو ایڑیاں مارتے اور اُن کو دوڑاتے اور کُداتے ہوئے میدان میں پہنچتے ہیں تو اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمیں پہنچتے ہی لڑائی نہیں کرنی پڑے گی بلکہ ہم اطمینان سے رات بھر آرام کرینگے پس اُنکا وہ جوش جس کا اُن کی طرف سے پہلے اظہار ہوتا ہے اِس قابل نہیں کہ اُس کی تعریف کی جائے کیونکہ یہ جوش وہ اُس وقت دکھاتے ہیں جب دشمن سے مقابلہ ابھی دُور کی بات ہوتا ہے قریب پہنچ کر اُن کا تمام جوش سرد ہو جاتا ہے اور وہ دشمن پر حملہ کرنے کی بجائے کھانا پکانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا میں اس شبہ کا ازالہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے مسلمان صرف اُسی وقت بہادری اور شوق نہیں دکھاتے جب دشمن دُور ہوتا ہے بلکہ اُس وقت بھی اُن کا جوش تیز ہوتا ہے جب دشمن سامنے آجاتا ہے اور اِس جوش سے حملہ کرتے ہیں کہ صبح کے وقت بھی گرد و غبار اُڑا کر جوّ کو بھر دیتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ صبح کے وقت شبنم سے گرد دبی ہوئی ہوتی ہے لیکن دوپہر اور شام کو گرد ڈھیلی ہو جاتی ہے اور ادنیٰ حرکت سے بھی اُٹھ پڑتی ہے۔ پس صبح کے وقت گرد اُڑانے میں جہاں اُن کے طریقِ عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ کبھی رات کو حملہ نہیں کرتے وہاں اللہ تعالیٰ نے اُن کے شوقِ جہاد کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ صبح کے وقت دشمن کو ہوشیار کر کے حملہ کرتے ہیں اور پھر اتنے جوش سے حملہ کرتے ہیں کہ صبح کی بیٹھی ہوئی غبار بھی اُڑنے لگ جاتی ہے شام کے وقت تو اُڑا ہی کرتی ہے چنانچہ دیہات میں شام کے وقت جب جانور چراگاہوں سے واپس آتے ہیں تو گرد و غبار سے تمام جوّ بھرا ہوا ہوتا ہے کیونکہ دن بھر کی دھوپ کی وجہ سے تمام ذرات خشک ہو کر ہوا میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن صبح کے وقت یہ حالت نہیں ہوتی اُس وقت شبنم پڑ کر غبار کو کم کر دیتی ہے مگر فرماتا ہے مسلمان اتنی شدت اور اتنے جوش سے حملہ کرتے ہیں کہ صبح کے وقت تمام جوّ گرد و غبار سے اَٹ جاتا ہے مگر وہ وقت ایسا ہوتا ہے جب گرد و غبار

سے جوّ صاف ہوتا ہے۔

فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا میں بِہٖ کی ضمیر بالمعنیٰ فعلِ اِغارت کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی فَاَثَرْنَ بِاِغَارَتِہِمْ یا اَثَرْنَ بِفِعْلِ اِغَارَتِہِمْ۔ اِس صورت میں اِسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اِغارت کے فعل کی وجہ سے گرد اُڑانے لگتے ہیں یعنی اِغارت اِس شدت سے کرتے ہیں کہ اُس سے گرد اُڑنے لگتی ہے۔ اِس طرح یہاں باء سببیہ ہو جائے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ اَثَرْنَ لِسَبَبِ اِغَارَتِہِمْ نَقْعًا۔

فَاَثَرْنَ بِہٖ میں ضمیر سے مراد فعلِ اغارت

نَقْعًا کی تنوین سے کثرت اور شدت مراد ہے یعنی اَثَرْنَ بِفِعْلِ اِغَارَتِہِمْ نَقْعًا کَثِیْرًا وہ بے انتہا گرد اُڑاتے ہیں۔ یہ بات بھی مسلمانوں کے شوق اور اُن کی دلیری پر دلالت کرتی ہے۔ اچانک حملہ کرنا ہو تو لوگ کہتے ہیں آہستہ چلو گرد نہ اُڑاؤ ایسا نہ ہو کہ دشمن کو پتہ لگ جائے۔ مگر خالی گرد نہیں اُڑاتے بلکہ بے انتہا گرد اُڑاتے ہیں۔

باء اِس جگہ ملابست کی بھی ہو سکتی ہے اِس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ بڑے ماہرِ فن ہیں کیونکہ بے تحاشا گھوڑا دوڑانا فی ذاتہٖ ایک فن ہے جو مہارت چاہتا ہے اور بے تحاشا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنا نیزہ سنبھال کر رکھنا تاکہ دشمن پر حملہ کیا جا سکے یہ دوسرا فن ہے۔ پس فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اِغارت کے ساتھ ساتھ گھوڑے بھی بے تحاشا دوڑاتے اور اُچھالتے چلے جاتے ہیں یعنی ایک طرف گھوڑے بھی دوڑاتے جاتے ہیں اور دوسری طرف لڑائی کا فن بھی قائم رہتا ہے بسا اوقات ایک شخص گھوڑا تو دوڑا لیتا ہے لیکن لڑائی کے فن کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ جب گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا ہو تو وہ نیزے کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتا اور نہ دشمن پر حملہ کر سکتا ہے بلکہ حملہ کرنے کے لئے اُسے ٹھہرنا پڑتا ہے۔ مگر ایک دوسرا شخص ایسا ہوتا ہے جو گھوڑے کو بھی تیز دوڑاتا جاتا ہے اور لڑتا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ نیزہ بازی کے وقت عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بعض سوار گھوڑے کو دوڑاتے چلے آتے ہیں مگر

جب میخ کے پاس آتے ہیں تو گھوڑے کو آہستہ کر لیتے ہیں تاکہ اُن کا نشانہ خطا نہ جائے مگر جو اپنے فن میں ماہر ہوتے ہیں وہ اُسی تیزی کے ساتھ گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے میخ پر نیزہ مارتے ہیں اور اُس کو اُکھاڑ کر لے جاتے ہیں۔ جب ملکِ معظم ہندوستان میں آئے اُس وقت جہاں اَور کئی قسم کی کھیلیں اُن کو دکھائی گئیں وہاں نیزہ بازی کے فن کا بھی اُن کے سامنے مظاہرہ کیا گیا۔ اُس وقت بعض سوار تو اتنی تیزی سے اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتے کہ ذرا بھی اُن کا گھوڑا نہ رُکتا اور میخ کو اُکھاڑ کر لے جاتے اور بعض میخ کے قریب پہنچکر رہ جاتے۔ پھر بعض لوگ تو اپنے فن میں ایسے ماہر تھے کہ وہ بجائے بیٹھنے کے گھوڑے کی پیٹھ پر لیٹ کر اُسے تیزی کے ساتھ دوڑاتے ہوئے آتے اور میخ اُکھاڑ کر لے جاتے حالانکہ اُس وقت معمولی سوار کیلئے بیٹھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ غرض گھوڑے کو تیز دوڑانا اپنی ذات میں ایک فن ہوتا ہے اور پھر اُسے تیز دوڑاتے ہوئے اپنے مفوضہ فرض کو کمال خوبی کے ساتھ سرانجام دینا یہ دوسرا فن ہوتا ہے۔ لڑائی میں صرف گھوڑے کو تیز دوڑانے کا فن کام نہیں آتا بلکہ اِس دوسرے فن میں بھی مہارت کا پیدا ہونا ضروری ہوتا ہے کہ گھوڑے کو تیز دوڑاتے ہوئے انسان دشمن پر بھی عمدگی سے حملہ کر سکے۔ فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا میں اِن دونوں باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی اَثَرْنَ مُلَابِسًا بِالْاِغَارَۃِ۔ مسلمانوں کی یہ حالت کہ اِدھر دشمن پر حملہ کرنے کے لئے وہ بالکل تیار ہوتے ہیں اور اُدھر وہ اپنے گھوڑوں کو انتہائی تیز دوڑا رہے ہوتے ہیں۔ گھوڑوں کا تیز دوڑنا اُنکو فعلِ اِغارت سے نہیں روکتا۔ یہ بات اُن کے کمال درجہ کے شوق اور مہارت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ مسلمان رات اور دن جہاد کے لئے تیاریاں کرتے رہتے تھے جس کے نتیجہ میں اُنہیں جنگی فنون میں کامل مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ میں حبشیوں کو نیزوں کے کرتب دکھلانے کی اجازت دی اور نہ صرف آپ نے اُن کو بڑے شوق سے دیکھا بلکہ اپنے اہلِ بیت کو بھی دکھایا۔ اسی طرح حدیثوں سے ثابت ہے کہ صحابہؓ ہمیشہ تیر اندازی کی مشقیں کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحابہؓ کی دو پارٹیوں میں تیر اندازی کا مقابلہ ہو رہا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک پارٹی میں شامل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر دوسری پارٹی نے اپنے تیر رکھ دیے اور کہا یا رسول اللہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اُس پارٹی کا مقابلہ کریں جس میں آپ ہوں۔

فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا میں مسلمانوں کے جنگی فنون میں ماہر ہونے کی طرف اشارہ

غرض صحابہؓ اپنے آپ کو ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رکھتے اور جنگی فنون میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اللہ تعالےٰ اُن کی اِسی مہارت کا ذکر فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا میں کرتا ہے اور فرماتا ہے آج مسلمان تمہیں کمزور اور بےکس نظر آتے ہیں مگر ہم بطور پیشگوئی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ کمزور نظر آنے والے مسلمان ایک دن نہایت اعلیٰ درجہ کے ماہرِ فن ہو جائیں گے۔ اِغارت اُن کو تیز دوڑنے سے روک نہیں سکے گی اور تیز دوڑنا اُنکو فعلِ اِغارت سے نہیں روک سکیگا۔ وُہ اِغارت بھی کریں گے اور جوش و خروش سے گرد و غبار بھی اُڑاتے جائیں گے یعنی وہ کچے سوار نہیں کہ دوڑیں تو اغارت کی طرف سے توجہ ہٹ جائے اور اغارت کریں تو دوڑ نہ سکیں بلکہ وہ دونوں کام ایک وقت میں کرتے ہیں گھوڑے تیز دوڑاتے ہوئے بھی اپنے جنگی فنون ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے یہ نہیں ہوتا کہ گھوڑے تیز دوڑا رہے ہوں تو اُنہیں اپنی تلواروں اور نیزوں کا ہوش نہ ہو اور تلواریں اور نیزے سنبھالے ہوئے ہوں تو گھوڑوں کو تیز دوڑانے سے قاصر ہوں یہ دونوں باتیں اُن میں بیک وقت پائی جائیں گی اور وُہ اپنے فن میں ماہر ہونگے ؏

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝

اور اُسی (صبح کے وقت) میں لشکر میں گھس جاتے ہیں ۵۶

۵۶ **تفسیر**۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں بِهٖ کی ضمیر نَقْعًا کی طرف بھی جاتی ہے اور صبح کی طرف بھی۔ اگر بِهٖ کی ضمیر نَقْعًا کی طرف پھیری جائے تو اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ دشمن تک برابر گرد اُڑاتے چلے جاتے ہیں یعنی جب دشمن کے پاس پہنچتے ہیں تب بھی اُن کا جوش و خروش کم نہیں ہوتا بلکہ جس طرح دُور سے گھوڑے دوڑاتے اور خاک اُڑاتے آتے ہیں دشمن کے پاس پہنچکر بھی اُن کی یہ حالت قائم رہتی ہے اور وہ خاک اُڑاتے ہوئے بے جھجک اور بے رُکے دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی اُن کی بہادری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور درحقیقت صحابہؓ ایسے ہی نڈر اور بہادر تھے اور تاریخی واقعات اُن کی اس بہادری پر شاہد ہیں۔

اگر فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں بِهٖ کی ضمیر صبح کی طرف پھیری جائے تو اس آیت سے مراد یہ ہوگی کہ وہ صبح کے وقت دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ اس میں پھر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ صحابہؓ کبھی اچانک حملہ نہیں کرتے بلکہ وہ اُسی وقت حملہ کرتے ہیں جب دشمن اُن کے مقابل میں نکل آئے۔ آج انگریزوں کو دیکھ لو۔ روسیوں کو دیکھ لو۔ امریکہ کے رہنے والوں کو دیکھ لو سب کوشش کرتے ہیں کہ وہ یکدم سوتے دشمن پر حملہ کریں اور اس کو اپنی بہت بڑی خوبی سمجھا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارے مومن بندے ایسے نہیں ہونگے وہ صبح کے وقت جائیں گے شور مچاتے جائیں گے اور اگر پھر بھی دشمن باہر نہیں نکلا تو وہ حملہ نہیں کریں گے بلکہ انتظار کریں گے یہاں تک کہ دشمن اُن کے مقابلہ میں اپنے گھروں سے نکل آئے اور یہ مضمون لفظ جمع سے نکلتا ہے کیونکہ یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ دشمن پر حملہ کرتے ہیں کہ اس میں عورت، بوڑھا بچہ سب شامل ہوں بلکہ فرمایا کہ جمع یعنی لشکر میں گھس جاتے ہیں یعنی اُن کا حملہ لگے ٹُکے کمزور ضعیف پر نہیں ہوتا ہمیشہ دشمن کے مجتمع لشکر پر حملہ کرتے ہیں پس فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں دونوں طرف اشارہ ہے اس طرف بھی کہ وہ حملہ کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ رات کے وقت حملہ نہ ہو بلکہ صبح کو ہو اور حملہ ایسی حالت میں ہو کہ جب جَمْعًا یعنی دشمن کا لشکر اُن کے سامنے کھڑا ہو۔ گویا اُن کے گھروں سے نکال کر وہ مقابلہ کریں گے سوتے دشمن پر اچانک حملہ نہیں کریں گے۔ دُوسرے جب دشمن اُن کے مقابل پر آتا ہے تب بھی اُن کا جوش و خروش قائم رہتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ دُور سے تو جوش و خروش دکھاتے جائیں اور دشمن کے پاس پہنچ کر اُن کے جوش سرد ہو جائیں۔ غرض بِهٖ کی ضمیر اگر صبح کی طرف لے جاؤ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ صبح کو وہ ایسے وقت حملہ کریں گے جب دشمن کا لشکر اُن کے مقابلہ میں جمع ہو جائے اور اگر بِهٖ کی ضمیر نَقْعًا کی طرف لے جاؤ تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اُن کا جوش دشمن کو دیکھ کر ڈھیلا نہیں ہوتا بلکہ جب دشمن کو وہ اپنے مقابل میں صفیں باندھے کھڑا دیکھتے ہیں تو اُن کا جوش اور بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ حملہ کرتے ہوئے اُس کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں۔ ان میں سے ایک معنوں میں اُن کے اخلاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسرے معنوں میں اُن کی اسلام کے لئے شیدائیت اور قربانی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

وَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں بِهٖ کی ضمیر نَقْعًا کی طرف یا صبح کی طرف

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں مسلمانوں کی شیدائیت اور قربانی کی طرف اشارہ

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں اگر بِهٖ کی ضمیر صبح کی طرف ہو تو اس کے ایک اور بھی لطیف معنے ہو جائیں گے یعنی اس کے صرف اتنے معنے نہیں ہوں گے کہ صحابہؓ کبھی رات کو حملہ نہیں کرتے بلکہ اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی پایا جاتا ہے کہ وہ صبح ہی صبح دشمن کی صفوں کو توڑ دیتے ہیں۔ ابن جنی نے بھی یہی معنے کئے ہیں وہ کہتے ہیں مَيَّزْنَ بِهٖ جَمْعًا اَیْ جَعَلْنَهٗ شَطْرَيْنِ اَیْ قِسْمَيْنِ وَشِقَّيْنِ (روح المعانی)

گویا اُن کا حملہ بڑا کامیاب ہوتا ہے زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ دشمن کی صفوں میں گُھس جاتے اور اُن کو پوری طرح مغلوب کر لیتے ہیں۔ وَسَطْنَ کا لفظ بھی اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ خالی سامنے کھڑا ہونے سے وَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا کے الفاظ صادق نہیں آ سکتے۔ یہ الفاظ اُسی صورت میں صادق آ سکتے ہیں جب دشمن کی صفوں کو توڑ کر اُن کے اندر داخل ہو جانا اِس کے مفہوم میں شامل ہو۔ اور درحقیقت اِس آیت کا یہی مطلب ہے کہ وہ کفار کے لشکر میں گُھس جاتے اور اُن کی صفوں کو توڑ کر پراگندہ کر دیتے ہیں۔ جرنیل کے فرائض میں سے یہ ایک اہم ترین فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی صفوں کو ٹوٹنے نہ دے کیونکہ جب دشمن صفوں کو توڑ کر اندر داخل ہو جائے تو فوج پراگندہ ہو جاتی ہے اور متحدہ مقابلہ کی قوت کو کھو بیٹھتی ہے۔ چنانچہ ہمیشہ ماہرِ فن جرنیل کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دشمن کے شدید حملہ کے باوجود اپنی صفوں کو قائم رکھے لیکن کبھی کبھی اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ (الانفال ع۲) کے مطابق دشمن کا زور اِتنا بڑھ جاتا ہے کہ افسر سمجھتا ہے کہ گو مجھ میں اِتنی طاقت ہے کہ میں واپس لَوٹ کر اِس پر دوبارہ حملہ کر سکتا ہوں مگر اِس وقت حالت ایسی ہے کہ دو یا چار یا دس منٹ کیلئے صفوں کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اُس وقت ماہرِ فن جرنیل کا یہ طریق ہوتا ہے کہ وہ اپنی صفیں پیچھے کر لیتا ہے انگریزی میں اِسے آرڈرلی رٹریٹ یعنی باقاعدہ پیچھے ہٹنا کہتے ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی صفوں کو قائم رکھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو پیچھے ہٹا لیا۔ پس صفوں کو قائم رکھنا جنگ کے ضروری اصول میں سے ہے۔ اِسی طرح حملہ کرنے والوں کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح دشمن کی صفوں میں گُھس جائیں۔ انگریزی میں اِس طرح داخل ہونے کی کوشش کو سپیئر ہیڈ SPEARHEAD کہتے ہیں جب دشمن کی صفوں میں مقابل کا لشکر داخل ہو جائے تو دشمن پراگندہ ہو جاتا ہے اور اُس کا جرنیل اپنے لشکر کو کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ ایک طرف والوں کو حکم دے تب بھی اور دوسری

وَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں مسلمانوں کے علاوہ دشمنوں پر غالب جانے کی طرف اشارہ

طرف والوں کو حکم دے تب بھی، درمیان میں غنیم کھڑا ہوتا ہے اور وہ آسانی سے اُن کی تمام تدابیر کا ازالہ کر سکتا ہے۔

غرض دشمن کے دباؤ کے وقت بچاؤ کی یہی صورت ہوتی ہے کہ یا تو جرنیل اتنا ہوشیار ہو کہ وہ فوراً اپنی فوجیں پیچھے ہٹا لے اور یا پھر اُن میں اتنی اخلاقی قوت باقی ہو کہ اگر جرنیل فوج کے انتشار اور اُس کی پراگندگی کی حالت میں بھی حکم دے کہ اتنا پیچھے ہٹ جاؤ تو فوج اُتنا پیچھے ہٹ جاتے ورنہ اُس کی شکست میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

پس فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ صبح ہی صبح دشمن کی صفوں میں گُھس بھی جاتے اور اُسی وقت اُنکو توڑ پھوڑ کر بھی رکھ دیتے ہیں دیر ہی نہیں لگتی۔

اِن معنوں سے اِس شبہ کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا میں یہ پہلے ہی بتایا جا چکا تھا کہ وہ صبح کے وقت حملہ کرتے ہیں اور اب فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ صبح ہی صبح دشمن پر حملہ کرتے ہیں جب صبح کے وقت حملہ کرنے کا ذکر پہلے بھی آ چکا تھا تو دوبارہ صبح کے وقت دشمن کی صفوں میں اُن کے داخل ہونے کا کیوں ذکر کیا گیا ہے اور یہ تکرار اپنے اندر کیا حکمت رکھتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا کے بعد فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں وہی مضمون بیان نہیں کیا گیا بلکہ ایک نیا مضمون بتایا گیا ہے۔

جیسا کہ مختصراً پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا اور فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ مسلمانوں کے حملہ اور اُن کی فتح میں کوئی لمبا وقت صرف نہیں ہوتا۔ اُن کا حملہ بھی صبح کے وقت ہوتا ہے اور اُن کی فتح بھی صبح کے وقت ہوتی ہے یعنی اِدھر حملہ کرتے ہیں اور اُدھر دشمن کو چند گھڑیوں میں ہی مغلوب کر لیتے ہیں۔ فرمایا ہے کہ تم مسلمانوں کی موجودہ کمزور حالت کو دیکھ کر یہ مت خیال کرو کہ اُن کا مستقبل بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمہیں آج یہ بے شک کمزور دکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایسے دلیر اور بہادر ہیں

کہ جب ہمارے حکم کے ماتحت یہ تلوار اپنے ہاتھ میں اٹھائیں گے تو ادھر حملہ کریں گے اور اُدھر منٹوں میں اپنا سارا کام ختم کر کے دشمن کو مغلوب کر لیں گے اور فتح و کامرانی کا پرچم لہرانے لگیں گے چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جسقدر غزوات ہوئے اُن میں قلعہ بند جنگوں کے سوا کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں جو چند گھنٹوں میں ختم نہ ہو گئی ہو۔ احزاب کی جنگ بے شک لمبی ہوئی مگر اِس لئے کہ وہاں صحابہؓ کو خود یہ حکم دیا گیا تھا کہ تم نے حملہ نہیں کرنا صرف دفاع کرنا ہے۔ خیبر کی جنگ لمبی ہوئی مگر وہ قلعہ بند جنگ تھی۔ بنو قریظہ سے جو جنگ ہوئی وہ بھی قلعہ بند جنگ تھی اُن کو چھوڑ کر جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں اُن میں سے کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں جس کا چند گھنٹوں میں فیصلہ نہ ہو گیا ہو۔ اِسی طرح آپ نے جو سرّیے بھجوائے وہ بھی اسی طرح حیرت انگیز طور پر کامیابی حاصل کر کے واپس آتے رہے۔ یہ ایک ایسی غیر معمولی بات ہے جسے دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ ایک جنگ نہیں دو جنگیں نہیں بیس سے زیادہ جنگیں ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پیش آئیں مگر تمام جنگیں ایسی ہیں جو دنوں کی بجائے گھنٹوں بلکہ منٹوں میں ختم ہو گئیں۔ بدر کی جنگ بہت بڑی جنگ تھی مگر اُس کا کتنی جلدی فیصلہ ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں میرے دائیں بائیں دو انصاری لڑکے کھڑے تھے اور میں اپنے دل میں افسوس کر رہا تھا کہ آج مجھے اپنے دل کے حوصلے نکالنے کا کوئی موقع نہ ملا کیونکہ میرے دائیں بائیں پندرہ پندرہ برس کے دو انصاری لڑکے کھڑے ہیں اگر ماہرِ فن سپاہی میرے ارد گرد ہوتے تو مَیں نڈر ہو کر حملہ کر سکتا اور سمجھتا کہ میری پیٹھ بچانے والے موجود ہیں وہ کہتے ہیں ابھی یہ خیال میرے دل میں پیدا ہی ہُوا تھا کہ مجھے دائیں طرف سے کہنی لگی مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو دائیں طرف کے انصاری لڑکے نے آہستگی سے میرے کان میں کہا چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دُکھ دیا کرتا تھا میرا جی چاہتا ہے کہ آج اُس سے بدلہ لوں۔ وہ کہتے ہیں ابھی مَیں اُس کے سوال کا کوئی جواب دینے نہیں پایا تھا کہ مجھے بائیں طرف سے کہنی لگی۔ مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو بائیں طرف کے انصاری لڑکے نے آہستگی سے جھک کر میرے کان میں کہا چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دُکھ دیا کرتا تھا میرا جی چاہتا ہے کہ آج اُس سے بدلہ لوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ باوجود تجربہ کار جرنیل ہونے کے میرے دل میں یہ خیال تک نہیں آتا تھا کہ مَیں ابوجہل کو مار سکوں گا۔ اس لئے جب اُن دو انصاری لڑکوں نے یہ سوال کیا تو میں حیران رہ گیا کہ میں اپنے دل میں کیا خیال کر رہا تھا اور انہوں نے مجھ سے کیا سوال کر دیا۔ مَیں نے اپنی انگلی اُٹھائی اور کہا وہ جو قلبِ لشکر میں کھڑا ہے جس کے آگے دو جرنیل ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے ہیں وہ ابوجہل ہے۔ وہ کہتے ہیں ابھی میری انگلی نیچے نہیں ہوئی تھی کہ جس طرح عقاب چڑیا پر حملہ کرتا ہے وہ دونوں لڑکے تیزی کے ساتھ گئے اور پیشتر اِس کے کہ وہ ننگی تلواریں سونت کر پہرہ دینے والے جرنیل سنبھلتے اُنہوں نے ابوجہل کو مار گرایا حالانکہ اُن جرنیلوں میں سے ایک ابوجہل کا اپنا لڑکا تھا۔ جب ابوجہل مارا گیا جو فوج کا کمانڈر تھا تو جنگ درحقیقت ختم ہو گئی بعد میں جو جنگ ہوئی اُس کی حیثیت صرف دفاعی رہ جاتی ہے مگر وہ جنگ بھی چند گھنٹے میں ختم ہو گئی یا اسی طرح اُحد کی جنگ میں ہُوا بے شک بعد میں مسلمانوں کی اپنی غلطی کی وجہ سے دشمن کچھ نقصان پہنچانے میں بھی کامیاب ہو گیا مگر بہرحال ایک دو گھنٹے میں ہی مسلمانوں نے دشمن کو مغلوب کر لیا تھا حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض دفعہ دس دس پندرہ پندرہ بیس بیس دن لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اور لڑائیاں بھی ایسی جو قلعہ بند نہیں تھیں کھلے میدانوں میں ایک دوسرے کا مقابلہ ہوتا تھا اور متواتر کئی کئی دن تک چلا جاتا تھا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چند سو ایک ہزار کے مقابلہ میں آتے تھے یا دو ہزار دس ہزار کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے تھے اور چند گھنٹوں میں فیصلہ ہو جاتا تھا۔ تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی تو ایسی نہیں ملتی کہ جنگ میں شام کے وقت یہ کہا گیا ہو کہ اب لڑائی بند ہو صبح سے پھر جنگ کی جائے گی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سب لڑائیاں

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝

انسان یقیناً اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے [۵]

گھنٹوں اور منٹوں میں ختم ہو جاتی تھیں۔ پس فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا میں اللہ تعالیٰ اس حقیقت کا انکشاف فرماتا ہے کہ مسلمان غیر معمولی طاقت رکھنے والے ہوں گے۔ دشمن کی صفوں میں صبح صبح گھس جائیں گے اور ابھی صبح ختم نہیں ہو گی کہ اُن کی لڑائی ختم ہو جائے گی۔ کوئی شخص ایک جنگ بھی تاریخ میں سے ایسی پیش نہیں کر سکتا جس میں لڑتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لشکر کو دوسرا دن آ گیا ہو بلکہ ابھی شام بھی ہونے نہیں پاتی تھی کہ لڑائی ختم ہو جاتی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ستائیس [۲۷] غزوات میں حصہ لیا اور اڑتیس [۳۸] سرایا ہیں جو مختلف مواقع پر آپ نے بھجوائے مگر کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جب شام کو دشمن سے کہا گیا ہو کہ اب ٹھہر جاؤ صبح پھر تم سے جنگ کی جائے گی۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی صحابہؓ تھے جو پندرہ پندرہ بیس بیس دن تک لڑائی کرتے چلے جاتے تھے تب انہیں فتح حاصل ہوتی تھی۔

اَلْكَنُوْدُ

حل لغات ۔ اَلْكَنُوْدُ: اَلْكَفُوْرُ يَسْتَوِيْ فِيْهِ الْمُذَكَّرُ وَالْمُؤَنَّثُ۔ كَنُوْد کے معنے كَفُوْر کے ہیں یعنی ایسا انسان جو ناشکرا ہو اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا انکار کرنے والا ہو۔ یہ لفظ مرد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور عورت کے لئے بھی۔ یعنی عورت کا ذکر ہو تو کہیں گے اَلْاِمْرَأَةُ الْكَنُوْدُ۔ اور مرد کا ذکر ہو تو کہیں گے اَلرَّجُلُ الْكَنُوْدُ اسی طرح كَنُوْد کے ایک معنے اَلْكَافِرُ کے بھی ہیں۔ كَنُوْد سے مراد تو ایسا شخص تھا جو اللہ تعالیٰ کے انعامات کا انکار کرنے والا تھا اور کافر سے مراد ایسا شخص ہے جس پر دینی اصطلاح میں کفر کا اطلاق ہوتا ہو۔ كَنُوْد کے ایک معنے اَللَّوَّامُ لِرَبِّهٖ کے بھی ہیں یعنی اپنے رب پر الزام لگانے والا اور اسے ملامت کرنے والا (اقرب) بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بات بات پر اللہ تعالیٰ کی ہتک کرتے ہیں کہتے ہیں خدا نے ہمیں کیا دیا ہے سب کچھ اُس نے امیروں کو دے دیا ہے۔ ہم اُس کا کیوں شکر ادا کریں۔ ہم کیوں نمازیں پڑھیں۔ ہمارے سر پر اُس نے کونسا احسان کیا ہے۔ غریب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں امیر نمازیں پڑھتے پھریں اور امیر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہماری صحتیں کمزور ہیں طاقت اور توانائی تو اُس نے غریبوں کو دے دی ہے ہم اُس کا کیوں شکر ادا کریں۔ غرض امیر ہوتا ہے تب بھی اور غریب ہوتا ہے تب بھی وہ ہر وقت خدا تعالیٰ پر عیب لگاتا رہتا ہے اور کہتا ہے میرے ساتھ خدا تعالیٰ نے کونسا سلوک کیا ہے کہ میں اس کی عبادت کروں اسی طرح كَنُوْد کے ایک معنے اَلْبَخِيْلُ کے بھی ہیں یعنی ایسا شخص جو اپنے مال کو خرچ کرنے میں بُخل سے کام لیتا ہے اور كَنُوْد کے معنے عاصی اور گنہگار کے بھی ہیں اور كَنُوْد کے ایک معنے اَلْاَرْضُ لَا تُنْبِتُ شَيْئًا کے بھی ہیں یعنی ایسی زمین جس میں سے کچھ پیدا نہیں ہوتا یُقَالُ هٰذِهٖ اَرْضٌ كَنُوْدٌ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ زمین كَنُوْد ہے اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس میں سے کچھ اُگتا نہیں۔ پھر كَنُوْد اسے بھی کہتے ہیں جو اکیلا کھائے اور اپنے مال کو خرچ نہ کرے اور اپنے غلام کو مارتا رہے چنانچہ لُغت میں لکھا ہے اَلْكَنُوْدُ مَنْ يَّاْكُلُ وَحْدَهٗ وَ يَمْنَعُ رِفْدَهٗ وَ يَضْرِبُ عَبْدَهٗ (اقرب) گویا کمینہ کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کھانا کھانے بیٹھے تو اکیلا کھائے گا کسی اور کو اپنے کھانے میں شریک نہیں کرے گا خدا تعالیٰ نے روپیہ دیا ہو تو اُسے خرچ نہیں کرے گا۔ رِفْدٌ کے معنے دراصل عطا کے ہوتے ہیں پس يَمْنَعُ رِفْدَهٗ کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کے پاس روپیہ ہوتا ہے مال و دولت ہوتی ہے مگر وہ کسی کو دیتا نہیں وَيَضْرِبُ عَبْدَهٗ اور بہادری یہ جتاتا ہے کہ غلام کو مارنے لگ جاتا ہے۔ گویا

اِس کے معنے کمینہ، بخیل اور بُزدل انسان کے ہیں۔ کمینہ کا مفہوم اکیلے کھانا کھانے میں آجاتا ہے کیونکہ کھانا ایسی چیز ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی کھا رہا ہو تو دوسرے کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ آئیے کھانا کھا لیں۔ مگر اِس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اکیلا چھپ کر کھاتا ہے اور کسی دوسرے کو اپنے کھانے میں شریک کرنا پسند نہیں کرتا۔ پھر ساتھ ہی بخیل بھی ہے کہ مال اُس کے پاس موجود ہوتا ہے مگر کسی کو دینا پسند نہیں کرتا اور پھر طرّہ یہ کہ وہ بُزدل بھی ہے اپنی ساری بہادری غلاموں یا عورتوں پر جتاتا ہے اور کہتا ہے مار کر تمہارے دانت توڑ دوں گا لیکن اگر کوئی طاقتور سامنے آجائے تو سر جھکا لیتا ہے۔ اِن معنوں میں سے آخری معنے حدیث میں بھی استعمال ہوئے ہیں چنانچہ ابن ابی حاتم اور ابن جریر دونوں کی روایت ہے ابی امامہ فرماتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْکَنُوْدُ الَّذِیْ یَاْکُلُ وَحْدَہٗ وَیَضْرِبُ عَبْدَہٗ وَیَمْنَعُ رِفْدَہٗ (ابن کثیر) کَنُوْد وہ ہے جو اکیلا کھانا کھائے، اپنے غلام کو مارے پیٹے اور اپنی عطا کو روک لے۔ مَیں نے اِس سے استنباط کرتے ہوئے کہا ہے کہ کَنُوْد وہ ہے جو کمینہ ہو کیونکہ کمینہ انسان ہی کھانا کھانے لگے تو کسی اور کو اِس میں شریک کرنا پسند نہیں کرتا۔ اِسی طرح کَنُوْد وہ ہے جو بُزدل ہو اپنے غلاموں یا عورتوں کو مارتا پیٹتا رہتا ہو بہادر کے سامنے اپنی آنکھیں اُونچی نہ کر سکتا ہو اور پھر کَنُوْد وہ ہے جو بخیل ہو اور اپنی عطا کو روک لے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اَلْکَنُوْدُ الَّذِیْ یَاْکُلُ وَحْدَہٗ میں صرف اُس کی کمینگی کی طرف ہی اشارہ نہیں بلکہ اِس کے ایک معنے متکبّر کے بھی ہیں کیونکہ متکبّر آدمی بھی دوسرے کو اپنے ساتھ کھلانا پسند نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ مَیں بڑا آدمی ہوں۔ اِسی طرح اکیلا کھانا کھانے کے ایک اور معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ وہ صرف اپنے طبقہ کے لوگوں کو دعوتوں وغیرہ میں شریک کرتا ہے نچلے درجہ کے لوگوں کو کھانے کے لئے نہیں بُلاتا۔ اِس صورت میں مَنْ یَّاْکُلُ وَحْدَہٗ کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ اکیلا کھاتا ہے کسی دوسرے کو شامل نہیں کرتا بلکہ اِس کے معنے یہ ہو جائیں گے کہ وہ صرف اپنے جیسے لوگوں کو جو اُس کے طبقہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں کھانے پر بُلا لیتا ہے لیکن اَور لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ دعوت کرتا ہے تو بڑے بڑے رئیسوں تک اُس کی دعوت محدود ہوتی ہے عوام الناس کو جن میں اکثریت غرباء اور مساکین کی ہوتی ہے پوچھتا تک نہیں۔ یہ معنے ایسے ہیں جو کفار پر نہایت عمدگی کے ساتھ چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ عرب میں بڑی کثرت سے رواج تھا کہ دعوتوں میں اُمراء وغیرہ کو تو بُلا لیا جاتا مگر غرباء کو دعوتوں میں نہ بُلایا جاتا تھا اور کھانا اُن میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اگلی آیت بھی اِن معنوں کی تائید کرتی ہے کیونکہ اُس میں مضمون یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر اُسے غرباء کو اپنے ساتھ کھانا کھلانا مشکل نظر آتا تھا تو روپیہ پیسہ سے تو وہ اُن کی مدد کر سکتا تھا مگر وہ یہ بھی نہیں کرتا۔

لُغت کی کتاب تعریفات میں لکھا ہے ھُوَ الَّذِیْ یَعُدُّ الْمَصَائِبَ وَیَنْسَی الْمَوَاھِبَ (اقرب) کَنُوْد وہ ہوتا ہے جو مصیبتیں گنتا رہتا ہے کہ فلاں مصیبت مجھے پہنچی۔ فلاں تکلیف مجھے پیش آئی وَیَنْسَی الْمَوَاھِبَ اور انعامات کو بھول جاتا ہے۔ اُسے یہ تو یاد رہتا ہے کہ فلاں وقت میں اپنے دوست کے پاس گیا اور اُس سے فلاں چیز مانگی جس کے دینے سے اُس نے انکار کر دیا مگر وہ دس ہزار چیزیں جو اُس نے مختلف اوقات میں دی ہوتی ہیں اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور وہ کبھی اُن کا ذکر تک نہیں کرتا۔

تفسیر۔ یہاں اَلْاِنْسَان سے ہر انسان مراد نہیں بلکہ یہ اشارہ ہے وَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا والے انسانوں کی طرف۔ یعنی جس جمع پر اُنہوں نے حملہ کرنا تھا وہ جمع جن انسانوں پر مشتمل ہے وہ اِس جگہ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ انسان جن پر یہ مسلمان حملہ کریں گے اُن کا اپنے ... کے ساتھ اِس طرح کا معاملہ ہے ایک تو وہ کا ... ہیں

خدا تعالیٰ کی باتوں کا انکار کر رہے ہیں اور دوسرے وہ سخت ناشکرے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے احسانات کی وہ ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے اُن پر کتنا بڑا احسان کیا تھا کہ ایک ریتلے علاقہ میں وہ چاروں طرف سے رزق جمع کر کے لاتا اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے مگر اُن کی حالت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے اُن انعامات کے شکر گذار ہوتے اور جب اُس کی طرف سے کوئی پیغام آتا تو وہ دوڑتے ہوتے اُس پر عمل کرتے اُلٹا خدا تعالیٰ کی باتوں کا انکار کر رہے ہیں غریبوں کو کھانا تک نہیں کھلاتے اور غلاموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ گرا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلی سورتوں میں مکہ والوں کی اس حالت کا ذکر آچکا ہے کہ وہ غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے۔ صدقہ و خیرات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یتامیٰ و مساکین کی خبر گیری نہیں کرتے بلکہ جو کچھ آئے اُسے عیاشی میں لُٹا دیتے ہیں۔ اب کَنُوْد کہہ کر اُن کی اس حالت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اُنہیں دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم بڑے بہادر ہیں مگر حالت یہ ہے کہ غلاموں کو ہر وقت مارتے پیٹتے رہتے ہیں گویا دناءت اور کمینگی کے ساتھ بُزدلی بھی اُن میں کمال درجہ کی پائی جاتی ہے کہ کسی طاقتور کا مقابلہ کرنے کی بجائے کمزوروں پر اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ بلالؓ قابو آئے تو اُن کو مارنے پیٹنے لگ گئے لیکن جب ابوذر غفاریؓ کو مارا تو کسی نے اُن سے کہہ دیا کہ جانتے ہو یہ شخص بنو غفار میں سے ہے جو تمہارے تجارتی راستہ پر آباد ہیں اگر اُن کو اِس بات کا علم ہُوا تو وہ تمہارا راستہ روک دیں گے یہ سُننا تھا کہ اُن کے اوسان خطا ہو گئے اور اُنہوں نے ابوذر کو چھوڑ دیا تا ایسا نہ ہو کہ اُن کی روٹی بند ہو جائے لیکن بلالؓ یا کوئی اَور ایسا غلام سامنے آتا جس کی پُشت پر کوئی قوم نہ تھی تو اُسے پیٹنے لگ جاتے۔ پس فرماتا ہے یہ بھی کوئی انسان ہیں۔ متکبر یہ ہیں۔ بخیل یہ ہیں۔ کمینہ یہ ہیں۔ بُزدل یہ ہیں۔ کمزور ملے تو اُس پر ظلم کرتے ہیں۔ غریب ملے تو اُسے کھانا نہیں کھلاتے۔ روپیہ پاس ہو تو کسی پر خرچ نہیں کرتے۔ جب ان کی حالت یہ ہے تو خدا تعالیٰ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ یہ لوگ ملک پر حاکم رہیں یہ تو سزا کے قابل ہیں چنانچہ آج یہ غلاموں کو مارتے اور بڑے فخر سے اس کا اظہار کرتے ہیں ہم اِنہی غلاموں کو ایک دن گھوڑوں پر چڑھا کر لائیں گے اور پھر اُنکو بتائیں گے کہ بہادر کیسے ہوتے ہیں۔ یہ تو اپنی تمام بہادری صرف اِس بات میں سمجھتے ہیں کہ غلام ملے تو اُن کو مار پیٹ لیا یا کسی عورت کی شرمگاہ میں نیزہ مارا اور اُس کو ہلاک کر دیا یا کوئی بے کس مسلمان قابو آ گیا تو اُس کی ایک ٹانگ ایک اُونٹ سے اور دوسری ٹانگ دوسرے اُونٹ سے باندھ دی اور پھر اُن اُونٹوں کو مخالف اطراف میں دوڑا کر اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یا یہ بڑی بہادری اِس بات میں سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے سینہ پر گرم گرم پتھر رکھے یا اُنہیں مکہ کے گلی کوچوں میں گھسیٹا اور نوکیلے پتھروں پر گھسیٹا اور اُن کو لہو لہان کر دیا۔ مگر ایک دن آنے والا ہے جب ہم اِن کَنُوْد کو یہ بتائیں گے کہ بہادر کیسے ہوتے ہیں اور بہادری کس چیز کا نام ہے۔ دیکھو چونکہ یہ مکی سورۃ ہے اور دشمن کو خواہ مخواہ اشتعال دلانا مقصود نہیں اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کی بُرائیاں بیان کرتے ہوئے ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس کے دوسرے معنے بھی ہو سکتے ہیں تا کہ اُن کی طبیعت میں اشتعال پیدا نہ ہو اور اُن کا ذہن دوسرے معنوں کی طرف چلا جائے ورنہ درحقیقت اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ سے کفار مکہ ہی مراد ہیں اور مراد یہ ہے کہ کفار خدا تعالیٰ کے ناشکرے ہیں خدا تعالیٰ کی مدد اُن کو کہاں مل سکتی ہے۔ چونکہ یہ اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں۔ غریبوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فقیروں کو کھانا نہیں کھلاتے۔ صدقہ و خیرات کو ایک عبث فعل قرار دیتے ہیں اِس لئے ایک دن بطور سزا ہم مسلمانوں سے ان پر حملہ کرائیں گے تا کہ انہیں معلوم ہو کہ بُرے اعمال کا کیسا عبرتناک انجام ہُوا کرتا ہے۔

---

۲۴۱ وَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۔ جمع ہونے سے مراد کنود انسان

وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ

اور وہ یقیناً اس پر (اپنے قول اور فعل سے) گواہی دے رہا ہے ۵۸ اور وہ یقیناً (باوجود اس کے) مال کی محبت میں

لَشَدِيْدٌ ۝

بہت بڑا تیز ہے ۵۹

۵۸ تفسیر۔ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ان لوگوں میں ایک طرف تو مذکورہ بالا عیوب پائے جاتے ہیں اور دوسری طرف یہ اُن عیوب پر فخر کرتے ہیں۔ غلاموں یا عورتوں کو مارنا کتنی قابلِ شرم حرکت ہے مگر ان کی حالت یہ ہے کہ غلاموں کو مارتے ہیں اور پھر فخر کرتے ہیں حالانکہ اگر انسان میں ذرا بھی شرم و حیا کا مادہ ہو اور وُہ کسی بچے کو مار رہا ہو یا غلام کو بے دردی سے پیٹ رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص اُسے کہے کہ تم کیا کر رہے ہو تو وہ ہزار بہانے بنانے لگ جاتا ہے کہ اس نے یہ خرابی کی تھی وہ خرابی کی تھی تا اُس کی کمینگی پر پردہ پڑ جائے۔ مگر فرماتا ہے یہ لوگ ایسے ہیں کہ بجائے نادم اور شرمندہ ہونے کے فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں آج ہم نے غلاموں کو خوب مارا۔ آج اُن کو پتھروں پر خوب گھسیٹا۔ آج اُن کو گلی کوچوں میں خوب لتاڑا۔ گویا یہ کمبخت انسان ایک تو گندہ اور ناپاک ہے اور پھر اپنی گندگی پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے میں نے یہ عیب کیا میں نے وہ عیب کیا۔ اسی طرح وہ غریبوں کو نہیں دیتا جب پُوچھا جائے تو کہتا ہے اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا میں نے تو ڈھیروں ڈھیر روپیہ خرچ کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ (البلد) کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اُسے کوئی دیکھ نہیں رہا یا لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے عزتِ نفس کے لئے کر رہا ہے قوم کی بہبودی یا غرباء کی ترقی کا خیال اُس کے ان اخراجات کا محرّک نہیں بے شک وہ دن میں کئی کئی اُونٹ ذبح کر دیتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ بھوکوں کو کھانا ملے بلکہ اس لئے کہ لوگوں میں اُس کی شہرت ہو۔ غرض نہ صرف اُس میں متعدد عیوب پائے جاتے ہیں بلکہ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ وہ ان عیوب پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو مجھ میں یہ یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ یا مثلاً روپیہ تو پاس ہُوا لیکن اگر کوئی شخص فاقہ زدہ ہُوا تو اُس کو کھانا نہ کھلایا۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ جب کفار سے یہ کہا جاتا کہ غریبوں کی مدد کرو اور اپنے مال میں سے صدقہ و خیرات دو تو وہ جواب میں کہتے کہ اُن کی مدد کرنا تو خدائی منشاء کی مخالفت کرنا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کے متعلق فرماتا ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (یٰس ع۳) جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور اللہ تعالےٰ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرو تو وہ کہتے ہیں ہم اُن کو کیوں کھانا کھلائیں ہم تو اللہ والا فعل کر رہے ہیں اللہ نے اُن کو نہیں کھلایا ہم نے بھی اُن کو نہیں کھلایا۔ تم ایسے لوگوں کو کیوں کھلاتے ہو جن کو خود اللہ تعالےٰ نے بھُوکا رکھنا پسند کیا ہے۔ اس آیت میں بھی یہی مضمون بیان ہُوا ہے کہ وہ ایک طرف تو غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور پھر اپنی اس کمینگی اور بے حیائی پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم تو اللہ والا فعل کر رہے ہیں تم ہمیں موردِ الزام کس طرح قرار دیتے ہو۔

۵۹ حل لغات۔ اَلْخَيْرُ۔ خَیْرٌ کے معنے ہوتے ہیں وِجْدَانُ الشَّيْءِ عَلٰى كَمَالَاتِهٖ اللَّائِقَةِ کسی چیز میں جو کمالات پائے جانے چاہئیں اُن تمام کمالات کے ساتھ

جب کوئی چیز ہو تو اُس کو عربی زبان میں خَیْرٌ کہتے ہیں اور خَیْرٌ کے معنے گھوڑوں کے بھی ہوتے ہیں اور خَیْرٌ کے معنے اُس چیز کے بھی ہوتے ہیں جس میں بہت سی خیر پائی جائے یعنی بہتر سے بہتر۔ اور خَیْرٌ مطلق مال کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

شَدِیْدٌ کے معنے شُجَاعٌ۔ بَخِیْلٌ۔ قَوِیٌّ۔ رَفِیْعُ الشَّانِ اور مضبوط کے ہوتے ہیں اور کنایۃً شَدِیْدٌ کا لفظ متکبر اور عظمت پسند کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اِس کی جمع شَدَائِد اور اَشِدَّاء آتی ہے (اقرب)

تفسیر۔ مختلف معانی کے لحاظ سے اِس کے معنے ایک تو یہ ہوں گے کہ (۱) اُوپر جس انسان کا ذکر ہوا ہے وہ مال کی محبت میں بڑا پکا ہے یعنی اُس کی محبت مال سے بہت بڑھی ہوئی ہے (۲) دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آدمی مال کی محبت میں بڑا شجاع ہے یعنی قومی رُوح اور قومی قربانی اُس میں نہیں پائی جاتی یا دینی قربانی اُس میں نہیں پائی جاتی اگر خدا تعالیٰ کے لئے کسی قربانی کی ضرورت ہو تو وہ کوئی قربانی نہیں کر سکتا۔ اگر قوم کی ترقی کے لئے کسی قربانی کی ضرورت ہو تو وہ اِس قربانی کو ادا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کہیں سے مال ملتا ہو تو پھر یہ بڑا دلیر ہو جاتا ہے۔ یا اس کا مال چھنتا ہو تو خوب مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دین کی ہتک ہو جائے، قوم کی ہتک ہو جائے، قوم کی عزت پر حملہ ہو جائے قوم کی آزادی اور حُریت پر حملہ ہو جائے اُس کی غیرت جوش میں نہیں آتی وُہ بُزدل بن کر اپنے گھر میں بیٹھا رہتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اُس کے مال پر ہاتھ ڈال دے تو پھر جان دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے (۳) تیسرے معنے اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ کے یہ ہوں گے کہ بِسَبَبِ حُبِّ الْخَيْرِ یعنی بخل کی کئی وجوہ ہوتی ہیں۔ بخل کے معنے ہوتے ہیں روپیہ روک لینا۔ لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ روپیہ روک لینے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں ضروری نہیں کہ ہر شخص ایک وجہ سے ہی بخل کا ارتکاب کرتا ہو۔ اُن وجوہ میں سے جو مال کو روک لینے کے محرک بن جاتے ہیں کبھی بخل ناداری کی وجہ سے ہوتا ہے مثلاً ایک غریب شخص ہے اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کھانے کے لئے صرف ایک روٹی پڑی ہے اور وہ ڈرتا ہے کہ اگر یہ ایک روٹی بھی خرچ ہو گئی تو جب بچے جاگیں گے اُن کے کھانے کے لئے کچھ نہیں ہو گا اِس لئے وہ روٹی کو سنبھال کر رکھ لیتا ہے ایسی حالت میں ایک فقیر اُس کے دروازہ پر آتا اور خیرات مانگتا ہے مگر وُہ اُسے روٹی نہیں دیتا اب اُس نے بخل تو کیا ہے مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کے پاس کافی مال نہیں تھا صرف حسبِ کفایت تھا یا حسبِ کفایت سے بھی کم تھا اِس وجہ سے وہ اپنا مال دوسرے کو دینے کے لئے تیار نہیں ہُوا۔ پس کبھی بخل ناداری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نادار انسان بے شک اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے مگر اِس لئے کہ اُس کے پاس صرف حسبِ کفایت ہوتا ہے اِس سے زائد نہیں۔ کبھی بخل یعنی مال کو روک لینا اِس لئے ہُوا کرتا ہے کہ جس مقصد کے لئے روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے وہ اس کے نزدیک اچھا نہیں ہوتا اگر ایسے مقصد کے لئے جس کو یہ اچھا نہیں سمجھتا کوئی دوسرا شخص لاکھ بار کہے کہ روپیہ خرچ کرو تو وہ کبھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ لوگ اسے بے شک طعنہ دیں اُسے بخیل اور کنجوس قرار دیں وہ کہیگا تم مجھے بخیل کہو یا کچھ مَیں روپیہ نہیں دُوں گا کیونکہ میرے نزدیک جس مقصد کے لئے روپیہ مانگا جاتا ہے وہ پسندیدہ نہیں۔ لیکن فرماتا ہے یہ شخص ایسا ہے کہ غریب بھی نہیں۔ پیسے اِس کے پاس ہیں ضرورت سے زائد ہیں اور پھر جو مقصد ہے وُہ بھی بُرا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قوم کے غریبوں کا خیال رکھو۔ قوم کے مساکین کا خیال رکھو۔ قوم کے یتامیٰ کا خیال رکھو۔ یہ کوئی بُرا مقصد نہیں کہ اِس کے لئے روپیہ خرچ کرنے سے انسان کو ہچکچاہٹ ہو۔ اگر کہا جاتا کہ اپنے روپیہ سے کنچنیاں نچواؤ یا آتشبازی پر اپنا روپیہ صرف کرو تو وہ شخص کہہ سکتا تھا کہ مَیں ایسا نہیں کر سکتا میرے نزدیک روپیہ کا یہ مصرف درست نہیں۔ مَیں اِس بارے میں تمہارے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ شخص نہ تو غریب ہے اور

نہ مقصد بُرا ہے بلکہ اِس کے بخیل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مال کی محبت جو فی ذاتہٖ ایک بے مقصد و بے مدعا شئے ہے اُسے مال خرچ کرنے سے روکتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مال کی محبت فی ذاتہٖ مقصود نہیں ہوتی بلکہ مال ذریعہ ہوتا ہے کچھ اور کام کرنے کا۔ مگر یہ بے مقصد و بے مدعا شئے جو مال کی محبت ہے اُس کے پیچھے روپیہ صرف کرنے سے رُکتا ہے اور اتنا احمق ہے کہ یہ اُس چیز کو جو ذریعہ ہے مقصود بنا لیتا ہے اور جس مقصد کے حصول کا وہ ذریعہ ہے اُسے بُھلا دیتا ہے اِس سے بڑھ کر حماقت بھلا کیا ہوگی کہ مال جو حوائج کے پورا کرنے کے لئے ذریعہ ہوتا ہے فی ذاتہٖ مقصود نہیں ہوتا اُس کو مقصود بنا لیا جائے اور جس غرض کے لئے روپیہ ہوتا ہے اُس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی کے پاس کپڑا تو ہو مگر وہ پھر بھی ننگا پھرے اور جب پوچھا جائے کہ تم کپڑا کیوں نہیں پہنتے تو جواب دے کہ اگر میں نے کپڑا پہنا تو پھٹ جائے گا۔ ایسا شخص اگر احمق نہیں کہلائے گا تو کیا کہلائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے بعض لوگوں کی بھی یہی حالت ہے چنانچہ صبح کے وقت کسی گاؤں کی طرف سیر کے لئے نکلو تو تمہیں نظر آئے گا کہ زمیندار ننگے پاؤں روڑوں اور کانٹوں پر چلتا چلا جا رہا ہے اور اُس نے اپنے ہاتھ میں جُوتی اُٹھائی ہوئی ہے یا سوٹی سے لٹکا کر اُس سوٹی کو اپنے کندھوں پر رکھا ہُوا ہے۔ حالانکہ جُوتی تو اِس لئے ہوتی ہے کہ کانٹوں اور جھاڑیوں اور کنکروں سے بچائے نہ اِس لئے کہ جُوتی کو اُٹھا لیا جائے اور ننگے پاؤں کانٹوں اور کنکروں پر چلنا شروع کر دیا جائے۔ مگر زمیندار بیچارہ تو غربت کی وجہ سے ایسا کرتا ہے جانتا ہے کہ میرے پاس ایک ہی جوتی ہے اور میرا فرض ہے کہ میں اِسے سنبھال کر رکھوں اگر جُوتی پھٹ گئی اور مجھے اپنی بیٹی کے پاس جانا پڑا تو لوگ اُسے کیا کہیں گے کہ تیرا باپ ننگے پاؤں آگیا ہے اور اُس کے پاس جُوتی کیلئے بھی پیسے نہیں۔ اِسی وجہ سے وہ اپنی جوتی سنبھال کر رکھتا ہے اور اُس کی حالت کو دیکھ کر اُس کی غربت پر بھی رحم آتا ہے اور اپنے ملک کی حالت پر بھی افسوس آتا ہے۔ مگر وجہ کچھ ہو بہرحال نظارہ یہی ہوتا ہے کہ جو ذریعہ ہے اُس کو مقصود بنا لیا جاتا ہے اور جس مقصد کے حصول کا وہ ذریعہ ہوتا ہے اُسے بُھلا دیا جاتا ہے۔ جُوتی اِس لئے ہوتی ہے کہ پاؤں کو زخم سے بچائے مگر زمیندار اپنے پَیر کو زخمی ہونے دیتا ہے اور جُوتی کو بچاتا ہے۔ اسی طرح روپیہ بھی اِسی لئے آتا ہے کہ انسان اُس کو خرچ کر کے فائدہ اُٹھائے۔ خواہ قومی مفاد پر اُس کو خرچ کرے خواہ ذاتی مفاد پر۔ مگر وہ اُس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا حالانکہ اگر وہ خدا تعالےٰ کی رضا اور اُس کے دین کی مدد کے لئے روپیہ خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا تو اُسے چاہیئے تھا کہ قومی مفاد کے لئے ہی روپیہ خرچ کرتا یا ذاتی فائدہ کے لئے روپیہ صرف کر دیتا۔ آخر کسی نہ کسی کام پر تو اُسے بہرحال روپیہ صرف کرنا چاہیئے تھا۔ خدا کے لئے نہ سہی قوم کے لئے ہی کارخانے جاری کر دیتا تاکہ لوگوں کو مزدوری مل جاتی یا اُنہیں سستا کپڑا ملنا شروع ہو جاتا۔ یا مثلاً آٹے کی مشین لگا دیتا یا غرباء اور یتامیٰ و مساکین کی ترقی کیلئے کسی صنعت و حرفت یا تجارت کی داغ بیل ڈال دیتا یا مدرسے کھول دیتا تاکہ بچے علم حاصل کریں اور قوم کو عروج حاصل ہو۔ غرض سینکڑوں طریق ایسے تھے جن سے کام لے کر وہ اپنے روپیہ کو ایسے رنگ میں خرچ کر سکتا تھا کہ اُس کی ذات کو بھی فائدہ پہنچتا اور اُس کی قوم کو بھی فائدہ پہنچتا۔ مگر وہ روپیہ کو غُلق میں بند کر کے رکھ لیتا ہے نہ خدا کے لئے خرچ کرتا ہے نہ قومی مفاد کے لئے خرچ کرنے پر تیار ہوتا ہے اور آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی دولت بڑھتی نہیں بلکہ سمٹ کر محدود ہو جاتی ہے۔ کسی صوفی کا قول ہے کہ تُو روپیہ دے تاکہ وہ تیری طرف واپس لَوٹے تُو روپیہ کو روک کر نہ رکھ کہ وہ تیرے لئے عار بن جائے۔ دُنیا میں جتنی قومیں روپیہ خرچ کرتی ہیں اُن کا مال بڑھتا ہے مگر جو روپیہ کو روک کر رکھ لیتی ہیں اُن کی دولت کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

پس فرماتا ہے اگر ان لوگوں کو خدا بُھول گیا تھا اور وُہ اُس کی رضاء کے لئے روپیہ خرچ کرنا ایک بے معنی بات سمجھتے تھے تو کم از کم انہیں اتنا تو چاہئے تھا کہ قوم کے لئے روپیہ خرچ کرتے مگر اِن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جن چیزوں کے لئے روپیہ رکھا جاتا ہے جن چیزوں کے لئے روپیہ کو تلاش کیا جاتا ہے جن چیزوں کے لئے روپیہ کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اُن چیزوں کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ اُن کے پاس روپیہ رہ جائے جو فی ذاتہٖ مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی اَور چیز کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا کا مطلب صوفیاء کے نزدیک

اُوپر کی آیات کا صوفیاء نے اپنے رنگ میں ایک اَور مطلب بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں عَادِیَات سے مراد سالکوں کے نفوس ہیں اور مراد یہ ہے کہ وہ کمالاتِ روحانیہ کے حصول کے لئے بے تاب ہو کر دوڑتے اور جدّوجہد کرتے ہیں حتیّٰ کہ اُن کا سانس پُھول جاتا ہے اور لفظ عَادِیَات میں اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خیرات اور نیکیوں کے حصول کے لئے صبح شام کام میں لگے رہتے ہیں ایک کام کر کے بس نہیں کر دیتے بلکہ اس کے بعد دوسرا کام شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کام ختم ہوتا ہے تو تیسرا کام شروع کر دیتے ہیں۔ تیسرا کام ختم ہوتا ہے تو چوتھا کام شروع کر دیتے ہیں۔ غرض ایک دوڑ ہے جس میں مشغول ہوتے ہیں۔ ابھی نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں پھر کسی غریب کی خدمت گزاری میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اُس سے فارغ ہوتے ہیں تو تعلیم کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ وہ کام ختم ہوتا ہے تو کسی اور نیکی کو سرانجام دینے لگ جاتے ہیں۔ غرض یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک دوڑ دوڑ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اِس میدان میں دوسروں سے سبقت لے جائیں۔ پس وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا سے مراد یہ ہے کہ سالک خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے ہر رنگ اور ہر طریق کو اختیار کرتے ہیں اور یکے بعد دیگرے نیکی کے کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا میں اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف عمل کے ذریعہ بے انتہاء تیزی دکھاتے ہیں ایک کے بعد دُوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا کام شروع کر دیتے ہیں بلکہ اُن کا دماغ بھی خالی نہیں رہتا وہ اپنے افکار کو ملاءِ اعلیٰ کی دہلیز پر مارتے ہیں یعنی غور و فکر اور تدبّر اور سوچ بچار اُن کا طرّۂ امتیاز ہوتا ہے وہ ایک طرف خدا تعالیٰ کے کلام کے معانی معلوم کرتے ہیں تو دوسری طرف قانونِ قدرت پر گہری نظر ڈال کر اُس کی حکمتیں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض اپنے افکار کو وہ شریعت اور قانونِ قدرت دونوں پر مارتے ہیں اور اِس کے نتیجہ میں انوار و معارف پیدا ہونے لگتے ہیں جیسے چقماق پر ضرب لگانے سے آگ پیدا ہوتی ہے اِسی طرح وہ اپنے افکار کے ذریعہ جب ایک طرف شریعت پر اور دوسری طرف قانونِ قدرت پر ضربیں لگاتے ہیں تو ایک نُور ظاہر ہوتا ہے اور اُس نُور سے صبح پیدا ہو جاتی ہے جس کا فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا میں ذکر آتا ہے۔ جب اُن کی کوششوں اور جدّوجہد کے نتیجہ میں صبح پیدا ہوتی ہے جس سے مراد انوارِ سماویہ کا ظہور ہے تو جیسے صبح کے وقت بیسیوں چیزیں جو رات کو نظر نہیں آتیں نظر آنے لگ جاتی ہیں اِسی طرح اُن کو اپنے اور اپنی قوم کے وہ عیوب نظر آنے لگ جاتے ہیں جو انوارِ سماویہ کے ظہور سے پہلے مخفی ہوتے ہیں۔ انسان کے چہرے پر مَیل ہوتی ہے۔ اِدھر اُدھر چیزیں بکھری ہوئی ہوتی ہیں مگر اُسے رات کی تاریکی کی وجہ سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اُس کی ذات میں یا اُس کے گرد و پیش کے لوگوں میں کیا کیا نقائص ہیں جب صبح ہوتی ہے تو اُسے فوراً نظر آجاتا ہے کہ فلاں چیز سیاہ ہے اور فلاں سفید۔ فلاں اچھی ہے اور فلاں بُری۔ اِسی طرح جب سالک اِس مقام پر پہنچتے ہیں تو انوارِ سماویہ کے ظہور سے جو صبح پیدا ہوتی ہے اُسکی روشنی میں انہیں اپنی وہ باریک کمزوریاں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جو اِن انوار کے ظہور سے پہلے مخفی ہوتی ہیں اور انہیں اپنی قوم کے وہ عیوب بھی نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں جو پہلے نظر نہیں آیا کرتے تھے گویا عِلم کامل نہ ہونے کی وجہ سے جو عیوب پہلے مخفی ہوتے ہیں وہ اِس صبح کے نتیجہ میں ظاہر

ہو جاتے ہیں اپنے نفس کے بھی اور اپنی قوم کے بھی جب اُنہیں
اپنے اور اپنی قوم کے عیوب نظر آتے ہیں تو فَالْمُغِیْرٰتِ
صُبْحًا وہ اِس کی وجہ سے مُغِیْر بن جاتے ہیں یعنی اپنے
عیوب پر بھی حملہ کر دیتے ہیں اور اپنی قوم کے عیوب پر بھی
حملہ کر دیتے ہیں۔ اپنی صفائی میں بھی مشغول ہو جاتے ہیں
اور اپنی قوم کی صفائی میں بھی مشغول ہو جاتے ہیں۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا۔ پھر اِس حالتِ ظہورِ انوار میں
وہ اپنی آوازوں کو بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے ہیں یعنی
جب وہ عادات اور ہواؤ ہوس پر حملہ کرتے ہیں۔ جب وہ
اپنے عیوب پر بھی حملہ آور ہو جاتے ہیں اور اپنی قوم کی
اصلاح کے لئے اُس کے عیوب کو مٹانے کے لئے بھی کمربستہ
تیار ہو جاتے ہیں تو اُس وقت جانتے ہیں کہ ہمیں محض اپنی
کوششوں اور تدابیر سے کامیابی نہیں ہو سکتی ہم جتنا زور
لگائیں گے وہ بہرحال ناقص ہو گا اور پھر بھی کچھ کمزوریاں ہماری
ذات میں باقی رہ جائیں گی اور ہماری قوم میں بھی باقی رہ جائینگی
ہم اگر کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اُس کی ایک ہی صورت ہے
کہ اپنی کوششوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی دعائیں کرنی
شروع کر دیں کہ وہ اِس اہم کام میں ہماری مدد فرمائے
اور اپنے فضل سے ہماری ناچیز مساعی میں برکت ڈالے
چنانچہ وہ خدا تعالیٰ کے دربار میں اپنی آوازیں بلند کرنی
شروع کر دیتے ہیں۔ آہ و زاری اور چیخ و پکار سے کام لیتے
ہیں۔ دردمندانہ دعاؤں سے اُس کے فضل کو جذب کرتے
ہیں اور کہتے ہیں خدایا تُو آ اور ہماری مدد کر اور ہمارے دشمن
کو تباہ و برباد کر۔ جب یہ دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں یعنی
ایک طرف وہ اپنے عیبوں اور اپنی قوم کے عیبوں کو دور کرنے
کے لئے ذاتی طور پر کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف خدا تعالیٰ
کے دربار میں چیخ و پکار شروع کر دیتے اور اُس سے دعائیں
مانگنے لگ جاتے ہیں کہ وہ اُن کی مدد کرے اور اُس دشمن کو
تباہ کرے جو اُنہیں خدا تعالیٰ کی محبت اور اُس کے قرب کے
راستوں سے دُور پھینکنا چاہتا ہے تو وہ کامیاب ہو جاتے
ہیں اور وہ اُس پہلی جماعت میں مل جاتے ہیں جو اُن سے پہلے
اعلیٰ علّیّین میں شامل ہو چکی ہے یہ معنے فَوَسَطْنَ بِهٖ
جَمْعًا کے ہیں یعنی وہ جَمْعًا جو حقیقت میں جماعت کہلانے
کی مستحق ہے اُس میں وہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اِس صورت
میں یہاں جَمْعًا کی تنوین عظیم الشان کے معنوں میں سمجھی جائیگی
اور آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ پھر وہ جماعت جو ایک ہی جماعت
کہلانے کی مستحق ہے یعنی اعلیٰ علّیّین والی جماعت اُس میں
جا کر شامل ہو جاتے ہیں اور اپنے اُس مقصد کو حاصل کر لیتے
ہیں جس کے لئے اُنہیں دنیا میں پیدا کیا گیا تھا۔

یہ نکتہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سالک ایک طرف تو
اپنی کوششوں سے کام لیتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ
سے بھی دعائیں کرنی شروع کر دیتے ہیں کہ وہ شیطان کے
مقابلہ میں اُن کی مدد کرے اِس کے متعلق ایک صوفی کا بھی
لطیف واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ اُن کے پاس
کوئی شاگرد تصوّف کے مسائل سیکھنے اور اُن کی صحبت سے
مستفیض ہونے کے لئے آیا اور کچھ مدت تک اپنی روح کی صفائی
کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد علم تصوف
سیکھ کر اُس نے چاہا کہ مَیں اب واپس جاؤں اور اپنی قوم کی
درستی کروں۔ جب وہ چلنے لگا تو اُس نے کہا حضور مجھے کوئی
آخری نصیحت کر دیں۔ اُنہوں نے کہا تم مجھے یہ بات بتاؤ کہ کیا
تمہارے ملک میں بھی شیطان ہوتا ہے؟ وہ حیران ہوا کہ مجھ
سے یہ کیا سوال کیا گیا ہے کہنے لگا حضور کیا شیطان کسی خاص
جگہ کی چیز ہے وہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا اچھا اگر
کبھی شیطان نے تمہیں پکڑ لیا اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے
راستہ میں اُس نے تمہیں بڑھنے نہ دیا تو تم کیا کرو گے۔ علم تو
سیکھ گئے ہو لیکن تم جانتے ہو کہ شیطان بھی ہر وقت گھات
میں لگا رہتا ہے اور وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لئے اپنا پورا
زور صرف کر دیا کرتا ہے۔ جب تم نے عبادتیں شروع کیں اور
کوشش کی کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے قرب کا کوئی مقام حاصل
ہو جائے اور اُدھر شیطان نے تمہاری ایڑی پکڑ لی اور وہ

تمہیں ورغلانے لگا تو تم کیا کرو گے ؟ اُس نے کہا حضور میں شیطان کا پورا مقابلہ کروں گا۔ اُنہوں نے کہا بہت اچھا مان لیا کہ تم نے شیطان کا مقابلہ کیا۔ شیطان کو شکست ہو گئی اور تم جیت گئے۔ لیکن جب پھر تم آگے بڑھنے لگے اور شیطان نے تمہیں پھر آ پکڑا تو تم کیا کرو گے۔ آخر شیطان مرتا تو نہیں کہ انسان یہ سمجھ لے کہ میں اِسے مار کر امن میں آ جاؤں گا۔ تم زیادہ سے زیادہ اُس کے حملہ سے وقتی طور پر محفوظ ہو سکتے ہو لیکن اس خطرہ سے آزاد نہیں ہو سکتے کہ ممکن ہے وہ تم پر دوبارہ حملہ کر دے۔ دوبارہ ہٹایا تو تیسری بار حملہ کر دے۔ بس میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ تم شیطان کا مقابلہ کرو گے اور پھر اُس سے اپنا پیچھا بھی چھڑا لو گے لیکن اگر اُس نے ہزار مقابلہ کے بعد بھی تمہیں آ پکڑا تو کیا کرو گے ؟ کہنے لگا میں پھر مقابلہ کروں گا۔ وہ بزرگ فرمانے لگے میں مان لیتا ہوں کہ اب کی دفعہ بھی تم کامیاب ہو جاتے ہو اور شیطان کو تم بھگا دیتے ہو لیکن تم پھر اپنے کام میں مشغول ہوتے ہو تو شیطان آ جاتا ہے ایسی حالت میں تم اُس کا کیا علاج کرو گے ؟ وہ حیران ہو کر کہنے لگا کہ پھر مقابلہ کروں گا۔ اُستاد نے کہا اگر ساری عمر تم نے شیطان کے مقابلہ میں ہی گذار دی تو خدا تعالیٰ کے پاس کب پہنچو گے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے اپنے شاگرد سے کہا اب مجھے ایک اَور بات بتاؤ۔ اگر تم اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے جاؤ اور اُس کے صحن میں کُتا ہو۔ تم اندر داخل ہونے لگو تو وہ تمہاری ایڑی پکڑ لے تو اُس وقت تم کیا کرو گے ؟ اُس نے کہا اگر میرے پاس ڈنڈا ہو گا تو میں اُسے ڈنڈا ماروں گا پتھر پڑا ہو گا تو میں پتھر اُٹھا کر ماروں گا۔ کہنے لگے بہت اچھا تم نے اُسے مارا اور وہ علیحدہ ہو گیا۔ لیکن جب پھر تم دوست کے دروازہ کی طرف بڑھنے لگے اور اُس نے تمہیں پکڑ لیا تو تم کیا کرو گے۔ کُتا تو مکان کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں مکان کے اندر داخل ہونے دے ؟ کہنے لگا میں پھر اُس کا مقابلہ کروں گا اور اُسے ہٹا دوں گا۔ اُنہوں نے فرمایا مان لیا کہ اب کی مرتبہ بھی وہ ہٹ گیا اور تم

کامیاب ہو گئے لیکن اگر تیسری بار تم پھر بڑھنے لگے اور اُس نے پھر تمہیں آ پکڑا تو تم کیا کرو گے ؟ وہ کہنے لگا میں گھر والے کو آواز دوں گا کہ ذرا باہر نکلنا تمہارا کُتا مجھے اندر آنے نہیں دیتا اِسے روکو کہ میں اندر داخل ہو سکوں۔ وہ بزرگ فرمانے لگے شیطان کا بھی یہی علاج ہے۔ شیطان اللہ میاں کا کُتا ہے جب وہ تمہاری ایڑی آ پکڑے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے قرب کی طرف بڑھنے نہ دے تو اللہ میاں کو ہی آواز دینا کہ شیطان مجھے آپ کے پاس آنے نہیں دیتا اِسے روک لیں۔ یہی طریق ہے جس سے شیطان تم پر حملہ کرنے سے رُک سکتا ہے ورنہ تمہارے ہٹانے سے کیا بنتا ہے۔ تم دس بار بھی ہٹاؤ گے تو وہ دس بار تم پر لوٹ لوٹ کر حملہ کرتا رہے گا۔ اِسی کی طرف فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا میں اشارہ کیا گیا ہے کہ سالک اِدھر شیطان کا مقابلہ شروع کرتے ہیں۔ اِغارتیں کرتے ہیں۔ تدابیر اور جدّ وجہد سے کام لیتے ہیں اور اُدھر دعائیں شروع کر دیتے ہیں کہ خدایا ہم مر گئے آ اور ہماری مدد فرما۔ جب یہ دونوں باتیں ملتی ہیں تب اللہ تعالیٰ کی طاقت میسّر آتی ہے۔ جیسے اُس بزرگ نے کہا کہ دوست کو ملنا چاہتے ہو تو اُس کا طریق یہ ہے کہ اپنے دوست سے کہو کہ وہ کُتا پکڑ لے۔ اِسی طرح اگر تم ایک طرف کوشش اور جدوجہد سے کام لو گے اور دوسری طرف خدا تعالیٰ سے انتہائی تضرّع اور عجز و نیاز کے ساتھ دعائیں مانگتے رہو گے تب دعوتِ شاہی پر جو لوگ پہلے بیٹھے ہیں اُن میں تم بھی شامل ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کے وارث قرار پاؤ گے۔ صوفیاء کے نزدیک فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا سے دعا یا دو انتہاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ نَقْعٌ کے معنے آواز کے بھی ہوتے ہیں۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ ۙ

کیا وہ نہیں جانتا کہ جب وہ (لوگ) جو قبروں میں ہیں اُٹھائے جائیں گے ۔ ۱۰ؔ

۱۰ؔ **حل لغات**۔ بَعْثَرَ کے معنے ہوتے ہیں نَظَرَ وَ فَتَّشَ۔ کسی بات میں غور و فکر کیا یا کسی پوشیدہ بات کی تفتیش کی۔ اور بَعْثَرَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں فَرَّقَهٗ۔ بَدَّدَهٗ۔ پراگندہ کر دیا۔ اِسْتَخْرَجَهٗ فَكَشَفَهٗ وَ اَثَارَ مَا فِيْهِ۔ کسی پوشیدہ چیز کو نکالا اُسکو ظاہر کر دیا اور اُس کی حقیقت کا اظہار کر دیا۔ قَلَبَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ یا نیچے کی چیز کو اُوپر کر دیا (اقرب) بُعْثِرَ مجہول کا صیغہ ہے۔ اس کے معنے ہونگے (۱) پراگندہ کر دیا گیا (۲) اُٹھایا گیا (۳) کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کیا گیا۔

تفسیر۔ اَفَلَا يَعْلَمُ ابتدائی ہمزہ استفہام انکاری کا ہے اور چونکہ استفہام کے بعد لا آیا ہے جو دوسری نفی ہے اس لئے اِس کے معنے مثبت کے بجائے نفی کے اور اَفَلَا يَعْلَمُ کے معنے ہوں گے "کیا وہ نہیں جانتا" اب ظاہر ہے کہ اِس فقرہ میں کیا بھی انکار کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے اور لا کے تو معنے ہی انکار کے ہوتے ہیں پس بوجہ دو انکار جمع ہو جانے کے ایک استفہام انکاری اور ایک لا اِس کے معنے مثبت کے ہوگئے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہی ہو کہ میں خبیر ہوں اس لئے سنبھل کر چلو۔

استفہام بہت سے امور کے لئے ہوتا ہے اِس جگہ تہدید و وعید کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے اور مراد یہ ہے کہ کیا وہ نہیں جانتا کہ ہم خبیر ہیں یعنی اُسے عقل سے کام لینا چاہیئے اور سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ اِن باتوں سے باز نہیں آئیگا تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ہماری زبان میں بھی یعنی پنجابی اور اُردو دونوں میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ "تم جانتے ہی نہیں میں کون ہوں"۔ اِس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ تمہیں معلوم نہیں بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ تم جانتے ہی ہو کہ مجھے سزا دینے کی طاقت حاصل ہے اور جب تم اس بات سے بخوبی آگاہ ہو تو پھر تمہیں ڈرنا چاہیئے۔ میں تمہیں ہوشیار کر دیتا ہوں کہ اِس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہاری خوب خبر لوں گا۔ یہاں بھی استفہام تہدید و وعید کے لئے آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا تعالیٰ خبیر ہے یعنی اِس بات کو بخوبی جانتے ہیں پھر جانتے بوجھتے ہوئے وہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ ہم اِس فقرہ سے اُنہیں پھر ہوشیار کر دیتے ہیں کہ سنبھل کر چلو۔ ایسی ہستی کا جو علیم و خبیر ہو مقابلہ اچھا نہیں ہوتا۔ کیونکہ واقف ہستی سے جاہل نیک اعمال والا نڈر ہوتا ہے بداعمال زیادہ ڈرتا ہے۔

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ میں مَا استعمال ہُوا ہے حالانکہ یہاں انسانوں کا ذکر ہے اور اُنہی کا انجام اِس میں بیان کیا گیا ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بعض دفعہ جب کسی صفت کو بیان کرنا مدنظر ہوتا ہے تو اُس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بھی مَا آجاتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ صفت اچھی ہو یا بُری۔ بعض دفعہ اچھی صفت کے لئے مَا استعمال ہو جاتا ہے جیسے حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق آتا ہے کہ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ (آل عمران ع۴) اور بعض دفعہ بُری صفت کے لئے مَا استعمال ہوتا ہے جیسے اِس جگہ ذوی العقول کے لئے مَا آیا ہے اِس لئے کہ اُن کی صفتِ تعطّل و عدم حرکت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

درحقیقت دنیا میں انسان وہ کہلاتا ہے جس میں حرکت ہو۔ جس کے اندر ترقی کی اُمنگ ہو۔ جس میں نیک تبدیلی کی خواہش ہو اور جس کے اعمال اُس کی زندگی کا ثبوت دے رہے ہوں۔ اگر کوئی شخص زندگی کی علامات اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اُس کی اُمنگیں مُردہ ہو چکی ہوں۔ اُس کی ہمت کوتاہ ہو۔ اُس کے خیالات افسردہ ہوں۔ اُس کے دل کے کسی گوشہ میں بھی اپنی ترقی کا کوئی جذبہ موجود نہ ہو۔ اُس کی

بَعْثَرَ

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ میں مَا کو مراد انسانوں کی صفات

قوتِ عملیہ پر مُردنی چھائی ہوئی ہو اور اُس کے اعمال سے نحوست ٹپک رہی ہو تو ایسے شخص کو قطعاً زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ زندہ وہی کہلاتا ہے جس کے اندر زندگی کے آثار پائے جاتے ہوں۔ اگر کوئی فرد اپنی زندگی کے آثار کو کھو بیٹھتا ہے یا کوئی قوم زندگی کے نشانات اپنے اندر نہیں رکھتی تو وہ ہرگز زندہ نہیں کہلا سکتی۔

اہل مکہ کو مَا فِی الْقُبُوْر کہنے کی وجہ

اِس جگہ مَا فِی الْقُبُوْرِ سے اہلِ مکہ مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ یہ قوم وہ ہے جو اُن تمام چیزوں سے محروم ہے جو کسی قوم کی زندگی کا نشان ہُوا کرتی ہیں۔ بے شک یہ لوگ بظاہر زندہ اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت مُردہ ہیں کیونکہ اُن کے دلوں میں کوئی اُمنگ نہیں۔ ترقی کی کوئی خواہش نہیں۔ عمل کا کوئی جوش نہیں۔ علم کے حصول کی کوئی تڑپ نہیں۔ نیک تغیّر پیدا کرنے کا کوئی احساس نہیں۔ یہ چلتے پھرتے زندہ درحقیقت مُردہ ہیں اور مُردہ بھی ایسے جو مَا فِی الْقُبُوْرِ ہیں۔ ایک چیز ایسی ہوتی ہے جو باہر پڑی ہوئی ہوتی ہے ایسی چیز کو کوئی دوسرا شخص ہلا بھی سکتا ہے۔ مثلاً پتھر پڑا ہُوا ہوتا ہے پتھر ایک بے جان چیز ہے مگر چونکہ وہ باہر زمین پر پڑا ہوتا ہے بچے اُسے ٹھوکر مارتے ہیں تو وہ کہیں کا کہیں چلا جاتا ہے لیکن وہ چیز جو قبور میں دبی پڑی ہو اُسے کوئی ہلا نہیں سکتا پس مَا فِی الْقُبُوْرِ کہہ کر اِس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اوّل تو خود اِن میں حرکت نہیں اور پھر یہ مٹی کے نیچے دفن ہیں کوئی دوسرا شخص بھی اِن کو ہلا نہیں سکتا۔ یہ اُن کی کمال درجہ کی مُردنی کا اظہار ہے کہ نہ اُن میں خود کوئی حرکت ہے اور نہ کوئی دوسرا اُنہیں حرکت دے سکتا ہے۔ کئی چیزیں بے جان ہوتی ہیں لیکن دوسرے لوگ اُن سے کام لے لیتے ہیں۔ مثلاً ڈول جس سے پانی نکالا جاتا ہے ایک بے جان چیز ہے مگر جب اُسے کنوئیں میں ڈالا جاتا ہے تو وہ ہلتا ہے اور پانی لے کر باہر آجاتا ہے۔ اِسی طرح چرخی خود بیجان چیز ہے مگر جب کوئی دوسرا اُسے حرکت دیتا ہے تو وہ فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔ مگر جو چیز قبر میں پڑی ہوئی ہو اُس میں نہ خود حرکت ہوتی ہے نہ کوئی دوسرا اُس میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اِس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ مکے کے لوگ وہ ہیں جن میں کسی رنگ میں بھی بیداری نہیں پائی جاتی۔ نہ اِن میں خود بیداری ہے نہ کسی بیدار قوم سے اِن کا تعلق ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی قوم میں خود تو بیداری نہیں ہوتی مگر بیدار قوم سے مل کر اُس کی حالت بدل جاتی ہے مثلاً ہندوستان کو دیکھ لو بظاہر ایک مُردہ ملک ہے مگر چونکہ ایک زندہ قوم یعنی انگریزوں سے اِس کا تعلق ہے اِس لئے وہ جنگ کے موقع پر دس بیس لاکھ فوج ہندوستان سے نکال ہی لیتے ہیں۔ اِسی طرح گو ہندوستان کی ساری دولت انگریز لے گئے مگر پھر بھی ایک زندہ قوم سے تعلق ہونے کی وجہ سے اُس کی تجارت کی طرف دنیا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اب روپیہ چاہے انگریز لے گئے ہوں لیکن ایک زندہ قوم سے تعلق ہونے کی وجہ سے ملک میں بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں پس زندگی کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو کوئی قوم خود زندہ ہو یا کسی زندہ قوم سے اُس کا تعلق ہو۔ مگر جو قبر میں دبی پڑی ہو اُس کی ترقی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ قبر میں پڑے ہونے کے معنے یہ ہیں کہ مکہ والوں میں نہ آپ زندگی پائی جاتی ہے نہ کسی زندہ قوم سے اُن کا تعلق ہے گویا اِن میں ذاتی زندگی بھی نہیں اور وہ اضافی زندگی بھی نہیں جو دوسروں سے تعلق رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اہلِ مکہ کی اِس انتہائی گری ہوئی حالت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ۔ اُن کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا زمانہ لانے والا ہے جب یہی قوم جو نہ ذاتی زندگی رکھتی ہے نہ کسی طاقتور قوم سے اِس کا تعلق ہے اِس میں بھی ہم حرکت پیدا کر دیں گے۔

وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۝

اور جو کچھ سینوں میں (چھپا پڑا) ہے نکال لیا جائے گا ۱۱؎

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے اِسی طرح اسلام کی بدولت آخر اہلِ مکہ میں بھی جو مَا فِی الْقُبُوْرِ تھے ایک حیرت انگیز بیداری پیدا ہوگئی وہ تھے تو مُردہ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اُن کی مُردہ ہڈیوں میں بھی ایک جان آگئی اور اُن میں ایسی حرکت پیدا ہوئی کہ جس کی مثال اُن کی زندگی کے دنوں میں دکھائی نہیں دیتی۔ آخر عرب لوگ ہمیشہ سے مردہ قوم نہیں تھے۔ اُن پر ترقی کا دَور بھی آچکا تھا مگر دنیا کی کوئی تاریخ ثابت نہیں کر سکتی کہ اسلام سے پہلے اُن میں زندگی کے وہ آثار پائے جاتے ہوں جو اسلام کے ظہور پر اُن میں پیدا ہوئے۔ اسلام سے پہلے سارے عرب کی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ مکہ کے لوگوں نے اپنے گھروں سے باہر نکل کر کسی قوم پر حملہ کیا ہو۔ مگر اسلام نے اِس مُردہ قوم کی ہڈیوں میں بھی ایسا ہیجان پیدا کر دیا اور ایسا جوش اور ولولہ اُن کے قلوب میں بھر دیا کہ وہ تین سو میل دُور اپنے شہر سے نکل کر باہر گئے اور اُحد میں اُنہوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ حالانکہ مکہ والوں نے کبھی اپنی بڑائی کے زمانہ میں بھی کسی غیر قوم پر حملہ نہیں کیا تھا۔ جیسے ٹمٹماتا ہُوا چراغ جب بُجھنے لگتا اور اُس کا تیل ختم ہونے کے قریب پہنچتا ہے تو آخری دفعہ وہ اُچھل کر جلتا اور پھر ختم ہو جاتا ہے اِسی طرح جب انہیں اسلام کے مقابلہ میں اپنی موت نظر آئی تو ٹمٹماتے چراغ کی طرح اُنہوں نے بھی آخری سنبھالا لیا اور تین سو میل پر جا کر اسلام سے ٹکر لی۔ چنانچہ احزاب میں اُنہوں نے حملہ کیا۔ اُحد میں اُنہوں نے حملہ کیا۔ بدرِ اُولیٰ میں اُنہوں نے حملہ کیا اور بدر ثانیہ میں اُنہوں نے حملہ کیا یہ چار جنگیں ایسی ہیں جن میں مکہ والے تین تین سو میل دُور اپنے گھروں سے باہر نکل کر گئے حالانکہ پہلے کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مکہ کے لوگوں نے اتنی دور جا کر کسی غیر قوم پر حملہ کیا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ۔ بیشک مُردہ ہیں مگر اِن مردوں کو بھی ایک دن ہم کھینچکر باہر لے آئیں گے۔ جیسے بجلی کی رَو کسی دوسری چیز پر ڈالو تو وُہ بھی اُچھلنے کُودنے لگ جاتی ہے اِسی طرح مکہ والوں کا حال ہُوا۔ اُن کی مُردہ ہڈیوں میں بھی جان آگئی۔ اور گو یہ مخالفت کی وجہ سے ہی آئی مگر بہرحال آئی اسلام اور مسلمانوں کے تعلق کی وجہ سے۔ اِس کے بغیر اُن میں خود بخود پیدا نہیں ہوگئی۔

۱۱؎ تفسیر۔ پہلی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ مکہ کے لوگ جو آج تمہیں مردہ دکھائی دیتے ہیں اِن کی رگوں میں بھی اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں زندگی کا خون دوڑنے لگے گا اور وہ مسلمانوں کو کچلنے کے لئے بڑھ بڑھ کر حملے شروع کر دیں گے اب اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ اُن کے دلوں میں جو کچھ ہے اُسے کھینچکر باہر نکال لیا جائے گا یعنی وہ گند اور خبث اور شرارت جو اِس قوم کے دل میں نبوت سے دُوری اور شرک کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے اُسے ظاہر کر دیا جائے گا اور لوگوں کو بتا دیا جائے گا کہ اندرونی طور پر یہ کیسے گندے اور ناپاک انسان ہیں۔

مکہ کے لوگ چونکہ مجاور تھے اُن کے کلام میں بڑا تکلّف پایا جاتا تھا جو بھی مکہ میں آتا اُسے بڑے تپاک سے ملتے اور کہتے آیئے تشریف لائیے۔ آپ لات کے پاس جائیں گے۔ عُزّیٰ پر چڑھاوا چڑھائیں گے۔ منات کے سامنے ماتھا ٹیکیں گے۔ جو بھی خدمت ہو ہم اُسے بجا لانے کے لئے حاضر ہیں۔ وُہ سمجھتا کہ مکہ والے بڑے مہذب ہیں

بڑے نیک اور دین کے خادم ہیں دیکھو کس محبت کے ساتھ پیش آتے اور کیسا اعلیٰ درجہ کا لوگوں سے سلوک کرتے ہیں ذرا بھی اُن کے ماتھے پر بل نہیں آتا۔ غرض اُن کی طبیعتوں میں تو گند بھرا ہُوا تھا لیکن بظاہر بڑے مؤدب تھے اور کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ اخلاق سے عاری ہو چکے ہیں اور دراصل یہی حال ہر منافق اور چالباز انسان کا ہوتا ہے کہ وہ بظاہر بڑا مؤدب ہوتا ہے مگر اندرونی طور پر اُس کی طبیعت میں گند بھرا ہُوا ہوتا ہے۔ لوگ جب حج کے لئے جاتے ہیں تو جہاز سے اُترتے ہی اُنہیں بعض ایسے آدمی مل جاتے ہیں جو بڑی محبت سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں آئیے تشریف لائیے ہم آپ کی ہر ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وُہ اُردو بھی جانتے ہیں۔ وہ پنجابی بھی جانتے ہیں۔ وہ کشمیری بھی جانتے ہیں۔ وہ پشتو بھی جانتے ہیں اور بعض لوگ تو ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ بڑے اطمینان سے جہاز پر آکر حاجیوں کا اسباب اُتارنا شروع کر دیتے ہیں اور قلیوں سے کہتے ہیں کہ اِدھر آؤ اور اسباب اُٹھاؤ۔ جو شخص اُن کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوتا ہے وہ تو جانتا ہے کہ یہ لُوٹنے کے لئے آئے ہیں مگر جو ناواقف ہوتا ہے وہ بڑا خوش ہوتا ہے کہ معلوم نہیں یہ لوگ کہاں سے میرے باپ دادا کے واقف نکل آئے ہیں اور الحمد للہ کہتے ہوئے اُن کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ وہ اسے عزت سے بٹھاتے ہیں ملازموں سے کہتے ہیں کہ ہاتھ دُھلاؤ کھانا لاؤ۔ پانی پلاؤ اور جب وہ کھا کر فارغ ہو جاتا ہے تو اُس کے سامنے ایک بہت بڑا بل پیش کر دیتے ہیں تب اُسے پتہ لگتا ہے کہ یہ تو مجھے لُوٹ کرنے گئے ہیں۔ غرض منافق بظاہر بڑا چکنا چُپڑا ہوتا ہے۔ دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ بڑا مؤدب ہے حالانکہ اُس کے اندرُونہ میں کھوٹ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہی حال مکہ والوں کا تھا کہ اُن کے کلام میں بڑا تکلف پیدا ہو گیا تھا مگر دل گند سے بھرے ہوئے تھے۔ پس فرماتا ہے اِن کی جو چُھپی ہوئی بدیاں ہیں اُن کو ہم کھینچکر باہر نکال دیں گے چنانچہ جب اسلام آیا اُن کے سارے تکلفات جاتے رہے اور اُن کے وُہ گند ظاہر ہوئے کہ الاَمان۔ اُنہوں نے غلاموں پر ظلم کئے۔ اُنہوں نے بچوں پر ظلم کئے۔ اُنہوں نے عورتوں پر ظلم کئے یہاں تک کہ بعض عورتوں کی شرمگاہوں میں اُنہوں نے نیزے مارے اور اِس طرح اُن کو ہلاک کیا۔ پھر تشبیب کے ذریعہ اِس طرح بُہتان تراشی سے کام لیا اور ایسی ایسی گندی گالیاں دیں کہ اگر انسان میں شرافت کا ایک شمہ بھی باقی ہو تو وہ ایسی حیا سوز حرکات نہیں کر سکتا۔ اِس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز کے لئے جاتے ہیں تو سجدہ کی حالت میں کفار آپ کے سر پر اُونٹ کی اوجھڑی رکھ دیتے ہیں اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑتے ہیں گویا اُنہوں نے بہت بڑا کمال کیا ہے۔ مکہ والوں کا مجاور ہونا درحقیقت یہ مفہوم رکھتا تھا کہ وہ قوم کے دینی پیشوا اور بزرگ ہیں مگر اِن دینی پیشواؤں اور بزرگوں کا یہ حال تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے جاتے ہیں خدا کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور وہ لوگ اُونٹ کی اوجھڑی جو غلاظت سے لت پت تھی اُٹھا کر آپ کے سر پر رکھ دیتے ہیں اور پھر خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے کتنا اچھا کام کیا۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اے مکہ والو آج تم بڑے اچھے نظر آرہے ہو اور دنیا تمہارے متعلق سمجھتی ہے کہ تم لات کے پجاری ہو۔ تم عُزّیٰ کے ماننے والے ہو۔ تم مناۃ کے آگے سر جھکانے والے ہو۔ تم خانہ کعبہ کی حفاظت کرنے والے ہو۔ تم بڑے بزرگ اور خدا رسیدہ ہو حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمہارے دل خبث اور شرارت سے بھرے ہوئے ہیں اور اُن میں گند ہی گند پایا جاتا ہے ہم محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کھڑا کر کے تمہارے ایک ایک گند کو ظاہر کر دیں گے اور دُنیا کو بتا دیں گے کہ تم کیسے ناپاک اور گندے اخلاق کے مالک ہو چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد اہل مکہ کے تکلفات کی چادر سب پارہ پارہ ہو گئی۔ مسلمانوں کو گالیاں دی گئیں۔ عورتوں اور غلاموں پر ظلم کئے گئے۔

ع ١ ٢٥

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝

اُس دن اُن کا رب یقیناً اُن کی نگرانی کرنے والا ہو گا ۱۲ؔ

صحابہؓ کو گھروں سے نکالا گیا۔ لڑائیوں میں مارے جانیوالوں کے اُنہوں نے ناک کان کاٹے اور اُن کے کلیجے چبائے۔ پھر احسان فراموشی کا اِس رنگ میں مظاہرہ کیا گیا کہ ایک دفعہ کفار میں سے کچھ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بطور مہمان آئے۔ مدینہ کی آب و ہوا کے ناموافق ہونے کی وجہ سے وہ بیمار ہو گئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے علاج کا خاص طور پر اہتمام کیا اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اِن کو اُونٹنیوں کا دُودھ خوب پلاؤ۔ چند دنوں کے بعد وہ اچھے ہو گئے تو جاتی دفعہ اُنہوں نے یہ شرافت کی کہ اُونٹوں کے نگران کو مار ڈالا اور اُونٹ چُرا کر لے گئے یہ کیسی حد درجہ کی خباثت ہے کہ بیماری میں علاج کرواتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور جب اچھے ہوتے ہیں تو اُونٹ چُرا کر لیجاتے ہیں۔ قادیان میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا اور اب بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے کہ بعض مخالف آتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، رہائش اختیار کرتے ہیں اور جب جانے لگتے ہیں تو بستر اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے احمدیوں کو خوب زک پہنچائی۔ وہ بھی اُونٹوں کا دُودھ پیتے رہے علاج کرواتے رہے اور جب اچھے ہو کر جانے لگے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُونٹوں کے نگران کو قتل کر دیا اور اُونٹ چُرا کر لے گئے۔

پھر اُن کی دھوکا بازی کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ بعض لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے وعظ و نصیحت کے لئے ہمارے ساتھ کچھ آدمی روانہ فرمائیں ہماری قوم ہدایت کی متلاشی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اسلام کے مبلغین سے اپنے معلومات میں اضافہ کرے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ستّر قاری روانہ کر دیئے۔ جب وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو سب نے مل کر اُن کو قتل کر دیا اور پھر بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے خوب کیا مسلمانوں کے ستّر آدمی ہم نے مار ڈالے۔ حالانکہ اس سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا بگڑا۔ انکو خدا تعالیٰ نے اور آدمی دے دیئے مگر بے حیائی تو کفار کی ظاہر ہوئی غرض ظلم۔ فساد۔ بخل۔ تکبر۔ شرارت۔ احسان فراموشی۔ دھوکے بازی۔ کمینگی۔ بے حیائی۔ اتہام تراشی۔ غلاموں کو ستانا۔ عورتوں اور بچوں کو دُکھ دینا سب عیوب اُن میں پائے جاتے تھے لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مکّہ کے لوگ ایسے بُرے ہیں۔ اہل عرب سمجھتے تھے مکہ والے کتنے اچھے ہیں دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے آج تم اچھے سمجھے جاتے ہو لیکن یاد رکھو ایک دن ہم تمہارے سب گند ظاہر کر دیں گے۔ چنانچہ اسلام کے آنے پر مکّہ والوں کا گند ایسا ظاہر ہُوا کہ مجاورت کا مصنوعی تقویٰ دھجی دھجی ہو گیا اور اُسی وقت اس کی اصلاح ہوئی جب وہ اسلام کی غلامی میں آکر داخل ہوئے۔

لفظ خبیر کا استعمال

۱۲ؔ تفسیر۔ مَیں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ بصیر اور علیم کے الفاظ صرف علمی حالت پر دلالت کرتے ہیں لیکن خبیر کا لفظ اُس علم کے مطابق عمل کرنے پر بھی دلالت کرتا ہے یعنی خبیر میں علاوہ خبر رکھنے کے مجرموں کی سزا اور اُن کی خبر لینے کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے چنانچہ یہ آیت میرے اِس دعوے کی مصدق ہے يَوْمَئِذٍ کا لفظ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ محض علم تو اللہ تعالےٰ کو ہمیشہ حاصل ہے اُس دن عالم ہونے کے کوئی معنے ہی نہیں۔ پس خبیر میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ اُس سے تمہارا کوئی جرم پوشیدہ نہ ہوگا اور دوسرے یہ کہ اِس علم تفصیلی کے مطابق وہ اُس دن جزا بھی دے گا۔ يَوْمَئِذٍ کے ساتھ قرآن کریم میں صرف خبیر کا استعمال ہُوا ہے علیم و بصیر کا استعمال نہیں ہُوا اُردو میں بھی "خبر لوں گا" کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جو شاید

خبیر کے لفظ سے ہی نکلا ہے۔اسی طرح پنجابی زبان میں بھی کہتے ہیں" میں تیری خبر لانگا" اور مراد یہ ہوتی ہے کہ مَیں تجھے تیرے اعمال کا بدلہ دُوں گا۔پس اللہ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ۔اُس دن اُن کا رب اُن کا خبیر ہوگا یعنی نہ صرف اُن کے حالات سے واقف ہوگا بلکہ اُن حالات کی اُن کو جزا بھی دے گا چنانچہ قرآن کریم میں ہمیشہ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ہی استعمال ہُوا ہے يَوْمَئِذٍ لَّعَلِيمٌ یا يَوْمَئِذٍ لَّبَصِيرٌ استعمال نہیں ہُوا۔اِس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں خبیر سے محض علم مراد نہیں بلکہ انکو سزا دینا مراد ہے اور اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ کے معنے یہ ہیں کہ اُس دن اُن کا رب اُنکی خوب خبر لیگا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس سورۃ کے آخر میں اللہ تعالےٰ نے اِن الفاظ کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم اُن کی خبر تو ضرور لیں گے مگر پہلے نہیں بلکہ حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ کے بعد۔جب تک اُنکے چُھپے ہوئے گند پوری طرح ظاہر نہیں ہو جائیں گے ہم اُن کو سزا نہیں دیں گے۔یہ مجرموں کی سزا کے متعلق ایک ایسا اصل ہے جسے بہت سے لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالےٰ کے فرستادوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ اگر آپ سچے ہیں تو لوگوں پر مخالفت کے فوراً بعد عذاب کیوں نازل نہیں ہو جاتا۔اِس شبہ کا اِس آیت میں جواب موجود ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو خطاب کرتے ہوئے اِس جگہ اِسی سوال کا جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم ایسا کریں تو لوگوں کے دلوں میں کئی قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہونے لگیں اور وہ یہ خیال کرنے لگ جائیں کہ یہ لوگ تو بڑے بزرگ اور نیک تھے اللہ تعالےٰ نے اِن کو کیوں ہلاک کر دیا۔اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا کہ کفار مکّہ کو قتل کر دو کیونکہ اِن کے دل گناہ اور ظلم کے ارادوں سے پُر ہیں تو لوگ کہتے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُنکے ساتھیوں نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔یہ لوگ تو بڑے شریف اور نیکوکار تھے۔خدمتِ دین کے لئے اُنہوں نے اپنی زندگیوں کو وقف کیا ہُوا تھا اِن کو مارنا کس طرح درست ہو سکتا تھا مگر اب جبکہ اِن لوگوں کے گند پوری طرح ظاہر ہو چکے ہیں۔اِن کا ظلم انتہاء کو پہنچ چکا ہے ہر شریف انسان کہتا ہے کہ اگر اِن لوگوں سے مسلمان نہ لڑتے تو کن سے لڑتے۔بچوں کو اِنہوں نے مارا۔عورتوں کو انہوں نے مارا۔مَردوں کو انہوں نے مارا غلاموں کو انہوں نے مارا اور اِس قدر شرمناک مظالم اُن پر توڑے کہ اُن واقعات کو پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔اِس سے زیادہ بے حیائی اور کیا ہوگی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک لڑکی کو جن کی شادی بعثت سے پہلے کفار میں ہو چکی تھی محض توحید سے نفار رکھنے کی وجہ سے کفارِ مکّہ نے طلاق دلوا دی۔ایک دوسری لڑکی کے خاوند سے آپ نے اُس کے قید ہونے کے بعد اقرار لیا کہ وُہ آپ کی لڑکی کو مدینہ روانہ کر دے گا اِس پر جب اُس نے اُن کو مکّہ سے روانہ کیا اور اُونٹ پر سوار ہونے پر کسی بدبخت نے اُن کے کجاوے کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور وُہ نیچے گر گئیں۔وہ اُس وقت حاملہ تھیں نتیجہ یہ ہُوا کہ مدینہ میں پہنچکر اِسی چوٹ کی وجہ سے اُن کا انتقال ہو گیا۔اب بتاؤ اِس میں کونسی شرافت ہے کہ ایک اکیلی لڑکی اُونٹ پر سوار ہو کر مدینہ جا رہی ہے وہ حاملہ ہے کسی کا کچھ بگاڑ نہیں رہی مگر کفار شرافت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس پر حملہ کرتے ہیں اُسے اُونٹ سے گرا دیتے ہیں اور اِس قدر تکلیف پہنچاتے ہیں کہ مدینہ پہنچکر اُس کا انتقال ہو جاتا ہے کیا دنیا کا کوئی بھی انسان اِس قسم کے سلوک کو جائز قرار دے سکتا ہے اور کیا کوئی شخص بھی اِس قسم کے حالات کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ مکّہ والوں میں انسانیت کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا تھا۔یہ ایسی ذلیل غیر شریفانہ حرکت تھی کہ ہند جیسی دشمنِ اسلام عورت نے اِس کو سُن کر اپنے کفر کی حالت میں بھی اِسے برداشت نہ کیا اور جب وہ شخص

اُس کے سامنے آیا تو اُسے طعنہ دیا کہ اب مکہ کے بہادر آدمیوں کا شغل بے کس اور حاملہ عورتوں پر حملہ کرنا رہ گیا مسلمان بہادروں کے سامنے وہ بھیگی بلی کی طرح دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔

جب مکہ والوں کے مظالم بڑھ گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آخر مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں اگر تم مجھے اِس شہر میں دیکھنا پسند نہیں کرتے تو مَیں تمہارا شہر ہی چھوڑ کر چلا جاتا ہوں تم اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مگر وہ پھر بھی باز نہیں آتے اور تین سو میل پر پہنچکر مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں۔ یہ وہ گند ہے جو اُن کے دلوں میں مخفی تھا اور جس کے ظہور پر اللہ تعالےٰ نے اُن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پس حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ کو پہلے اور اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ کو بعد میں رکھنا بے معنی نہیں بلکہ اِس میں بہت بڑی حکمت ہے اور وہ یہ کہ ہم پہلے ان لوگوں کے گند ظاہر کریں گے اور پھر ان پر مسلمانوں سے حملہ کرائیں گے تا دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے ظلم کیا۔ وہ اِن بُرائیوں کے ظاہر ہونے کے بعد ہمارے حکم کے ماتحت اِن کو ماریں گے اور خوب ماریں گے اور دنیا بھی تسلیم کرے گی کہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا درست کیا انہوں نے مارا تو اچھا کیا بلکہ اُنہیں اور زیادہ مارنا چاہیئے تھا کیونکہ وہ اِسی بات کے مستحق تھے۔ پس حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ کو پہلے رکھ کر اُس حجت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کفار پر پوری کی جائے گی۔ فرماتا ہے ہم اُنہیں پہلے سزا نہیں دیں گے بلکہ حجت تمام ہونے پر سزا دینگے بے شک پہلے بھی اُن کے دلوں میں وہی گند تھا جو بعد میں ظاہر ہُوا مگر پہلے اگر ہم سزا دیتے تو دنیا کہتی یہ تو بڑے بزرگ تھے۔ نیک اور پارسا تھے اِن کو کیوں سزا دی گئی ہے مگر اب لوگ یہ نہیں کہہ سکیں گے۔ وہ تسلیم کریں گے کہ جو کچھ اُن سے سلوک ہُوا وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ غرض اِس آیت میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ۔ ہم خبیر ہیں اِن لوگوں کے اندرونی حالات کو خوب جانتے ہیں مگر ہم حجت تمام ہونے کے بعد اِن کو سزا دیں گے۔ پہلے ان کے گند ظاہر کریں گے اور پھر مسلمانوں سے حملہ کرائینگے بے شک ہم خبیر ہیں اور ہم پہلے بھی اُن کے حالات کو جانتے تھے مگر ہم نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کے تقدّس کا کوئی خیال باقی رہے۔ ہم اُس وقت اُن کو سزا دیں گے جب حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ہو جائے گا اور اُن کے گند لوگوں پر اچھی طرح ظاہر ہو جائیں گے +

سُورَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ القارعہ یہ مکی سورت ہے [1]

وَهِيَ إِحْدَى عَشْرَةَ آيَةً دُونَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيهَا رُكُوعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا گیارہ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ

(دنیا پر) ایک شدید مصیبت (آنے والی ہے) وہ مصیبت کس قدر عظیم ہے۔ اور (اے مخاطب)

مَا الْقَارِعَةُ ۝

تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ (عظیم الشان) مصیبت کیا ہے [2]

سورۃ قارعہ مکی ہے

[1] سورۃ القارعہ بالاتفاق مکی سورتوں میں سے ہے مستشرقین یورپ بھی اس کے مکی ہونے کے متعلق متفق ہیں جرمن مستشرق نولڈکے اور سر میور نے اسے ابتدائی مکی سورتوں میں سے قرار دیا ہے۔

ترتیب سورۃ یہ سورۃ بھی پچھلی ترتیب کے لحاظ سے اس طرح پر آتی ہے کہ سورۃ العادیات میں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ ترقی اور کامیابی بیان کی گئی تھی جو ابتدائی زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور اب القارعہ میں اُس آخری دَور کے متعلق آپ کے سلسلہ کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ پھر اسلام کے لئے مصیبت اور تکالیف کے دن ہوں گے۔

القارعۃ

[2] **حل لغات** - اَلْقَارِعَةُ: قَرَعَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور قَرَعَ (يَقْرَعُ قَرْعًا) الْبَابَ کے معنے ہیں دَقَّهُ - دروازہ پر دستک دی اور قَرَعَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں ضَرَبَهُ کسی چیز کو مارا اور قَرَعَ صِفَاتَهُ کے معنے ہوتے ہیں تَنَقَّصَهُ وَ عَابَهُ اُس کی صفات کی تنقیص کی اور اُس پر عیب لگایا اور قَرَعَ زَيْدًا اَمْرٌ کے معنے ہوتے ہیں اَتَاهُ فَجْأَةً اچانک کوئی معاملہ اُس سے پیش آگیا اور قَرَعَ السَّهْمُ الْقِرْطَاسَ کے معنے ہوتے ہیں اَصَابَهُ بدف پر تیر لگ گیا (اقرب)

گذشتہ مفسرین نے قَارِعَة کے معنے قیامت کے کئے ہیں اور چونکہ قَرْعٌ کے ایک معنے شدید آواز کے بھی ہیں گو عام لُغت کی کتب میں یہ معنے نہیں نکلے مگر تفاسیر میں قَرْعٌ کے معنے شدید آواز کے بھی بتائے گئے ہیں اس وجہ سے بعض مفسرین نے قَارِعَة کے معنے یہ بھی کئے ہیں کہ اس سے مراد اسرافیل کی وہ گرج ہے جو قیامت کے قریب ہوگی اور جس سے سب لوگ مرجائیں گے (فتح البیان سورۃ القارعہ)

قَرَعَ کے معنے تو اُوپر بیان ہوچکے ہیں۔ لیکن اَلْقَارِعَة کی شکل میں اس لفظ کے کچھ الگ معنے بھی ہوتے ہیں چنانچہ اَلْقَارِعَة کے ایک معنے قیامت کے بھی کئے

گئے ہیں کیونکہ وہ مختلف قسم کے صدمات اور تخویف کے سامان اپنے ساتھ لائے گی۔ اِسی طرح اِس کے ایک معنے اَلدَّاھِیَۃ کے بھی ہیں یعنی اچانک آنے والی کوئی عظیم الشان مصیبت اور اَلْقَارِعَۃ کے معنے اَلنَّکْبَۃُ الْمُھْلِکَۃُ کے بھی ہیں یعنی ہلاک کر دینے والی مصیبت اور اَلْقَارِعَۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کو بھی کہتے ہیں جن کو اصطلاحاً سرایا کہا جاتا ہے۔ عام اصطلاح میں تو سریّہ اُس کو کہتے ہیں جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شامل نہ ہوں مگر اس کے اصل معنے چھوٹے چھوٹے لشکروں کے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ قرآن کریم میں قَارِعَۃ کا لفظ تین موقعوں پر آیا ہے (۱) سورۂ رعد (۲) سورۃ الحاقہ (۳) زیرِ تفسیر آیت۔ سورۂ رعد رکوع ۴ میں آتا ہے وَلَایَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا تُصِیْبُھُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَۃٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِھِمْ حَتّٰی یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (الرعد ع ۴) یعنی کفار کی حالت برابر اِس طرح رہے گی کہ اُن کے اعمال کی وجہ سے یعنی اُن تکالیف اور تعذیب کے ایک لمبے سلسلہ کی وجہ سے جو مسلمانوں کو ستانے کے لئے انہوں نے جاری کیا ہوا ہے یکے بعد دیگرے اُن کے اُوپر لشکر حملہ آور رہیں گے اور اِس طرح اُن پر ضرب پر ضرب پڑے گی اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِھِمْ یا پھر اسلامی لشکر ایک دن اُن کے گھروں کے پاس آکر اُترے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ آجائیگا یعنی کفار کی شکست اور اسلام کی فتح کا دن۔ پھر فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ اللہ تعالےٰ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اِس جگہ قَارِعَۃ سے مراد وہ لشکر ہیں جو متواتر ادھر اُدھر دشمنانِ اسلام پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اِن لشکروں کے ذکر سے چونکہ یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید اسلام نے جارحانہ حملے کئے ہیں اِس لئے جہاں اِس آیت میں غزواتِ اسلامیہ کے متعلق مخفی پیشگوئی فرمائی گئی وہاں اِس شبہ کا بھی ازالہ کر دیا گیا۔ چنانچہ فرماتا ہے تُصِیْبُھُمْ بِمَا صَنَعُوْا یہ لشکر کشی کفار کے عملوں کا نتیجہ ہوگی مسلمانوں کی طرف سے ابتداء نہ ہوگی۔ ہاں جب مسلمان جواب دینا شروع کریں گے تو کفار کی شرارت ایسی دب جائے گی کہ وہ روز بروز کمزور ہوتے جائیں گے اور اسلام بڑھتا جائے گا اور یہ سلسلہ اِسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دن اسلامی لشکر مکہ کے پاس جاکر اُترے گا اور انہیں فتح حاصل ہو جائیگی۔

قرآن مجید میں لفظ قارعہ کا استعمال

دوسری جگہ سورۃ الحاقہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُھْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ وَاَمَّا عَادٌ فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ (الحاقہ ع ۱) ثمود اور عاد نے قارعہ کا انکار کیا فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُھْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ۔ پس ثمود تو ایک ایسے عذاب سے ہلاک کئے گئے جو انتہاء کو پہنچا ہوا تھا وَاَمَّا عَادٌ فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ اور عاد پر ایک شدید ہوا چلائی گئی۔ اِس قدر شدید کہ اُس سے ہیبت ناک آواز پیدا ہوتی تھی اُس ہوا نے انکو ہلاک کر دیا۔ یہاں دو الگ الگ قسم کے عذاب بیان کئے گئے ہیں اور دونوں کا نام قَارِعَۃ رکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس جگہ قَارِعَۃ کا لفظ اَلدَّاھِیَۃ اور اَلنَّکْبَۃُ الْمُھْلِکَۃ کے معنوں میں آیا ہے اور اللہ تعالےٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ ثمود اور عاد دونوں قوموں کے نبیوں نے لوگوں سے کہا کہ تم ہمارا انکار نہ کرو اگر تم انکار کروگے تو مصائب میں مبتلا ہو جاؤ گے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی اور انبیاء کی باتیں ماننے سے انکار کر دیا اِس پر اُن نبیوں نے خبر دی کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے تم پر عذاب آئے گا اور تم تباہ کر دئے جاؤ گے۔ بجائے اِس کے کہ وہ اِس سے نصیحت حاصل کرتے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے وہ اَور بھی ہنسی مذاق کرنے لگے۔

آخر ثمود پر تو اللہ تعالیٰ نے ایک زلزلۂ عظیمہ بھیجا جس سے وہ تباہ ہو گئے اور عاد پر ایک شدید ہوا چلائی گئی جس نے اُنکو تباہ کر دیا۔ چنانچہ آجکل آثارِ قدیمہ والے جب اِن علاقوں کی زمینیں کھودتے ہیں تو ریت کے تودوں کے نیچے سے بڑے بڑے شہر نکل آتے ہیں۔

آیت زیرِ تفسیر میں بھی قَارِعَة کا لفظ اَلنَّكْبَةُ الْمُهْلِكَة کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے یعنی ایسی مصیبت جو ہلاک کر دینے والی ہو۔

القارعہ وہ عذاب ہے جو کسی نبی کی صداقت کے لئے آئے

اُوپر کی تمام آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اَلْقَارِعَة وہ عذاب ہے جو کسی نبی کی صداقت کے اظہار کے لئے آئے خواہ وہ اُس کے یا اُس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے ظاہر ہو۔ جیسے سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ۔ یہ قارعہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اور آپ کے ہی تیار کردہ ہوتے تھے۔ اور خواہ یہ بلا واسطہ الٰہی فعل سے ظاہر ہو۔ جیساکہ سورۃ الحاقہ سے پتہ چلتا ہے کہ ثمود پر زلزلہ آیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ یہ ایک بلا واسطہ الٰہی فعل تھا کسی انسان کا اس میں دخل نہیں تھا یا عاد پر ہوا چلی اور وہ ہلاک ہو گئے یہ بھی ایک بلا واسطہ الٰہی فعل تھا کیونکہ کوئی انسان یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ہوا چلا کر دوسروں کو ہلاک کر سکے۔ اور خواہ کسی ایسے الٰہی فعل سے ہو جس میں انسانوں کو واسطہ بنا لیا گیا ہو جیساکہ میرے نزدیک اِس سورۃ میں قارعہ سے ایسا عذاب ہی مراد ہے جو ہے تو الٰہی فعل کا نتیجہ مگر اُس میں انسانوں کو بھی واسطہ بنا لیا گیا ہے۔

ما القارعہ میں دوبارہ قارعہ کا لفظ دوہرانے میں ایک حکمت

قارعہ ایسے عذابوں کو اِس لئے کہا جاتا ہے کہ قَرَعَ کے معنے دستک دینے اور ٹھکرانے کے ہوتے ہیں۔ جب لوگ خدا تعالیٰ کے مامور کی آواز نہیں سُنتے اور روحانی طور پر سوئے رہتے ہیں تو خدا تعالیٰ دستک دیکر جگانے کے لئے کچھ عذاب بھجواتا ہے۔ اِن دستکوں سے آخر وہ روحانی نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں اور رسول کی آواز سننے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ پس قارعہ وہ عذاب ہیں جو نبیوں کو منوانے کے لئے دنیا میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْقَارِعَةُ۔ دنیا میں ایک قارعہ آنے والی ہے۔ پھر فرماتا ہے مَا الْقَارِعَةُ۔ یہاں مَا اظہارِ تفخیم کے لئے آیا ہے اور مراد یہ ہے کہ کیا ہی عظیم الشان وہ قارعہ ہے۔ جب انسان کسی چیز کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے تو کہتا ہے "کیا بلا آگئی" یا "کیا مصیبت آگئی"۔ اِس سے مراد نہیں ہوتی کہ وہ کسی سے اِس بارہ میں پوچھتا ہے بلکہ اِس جملہ سے اُس کا مقصود مصیبت کی شدت کا بیان کرنا ہوتا ہے۔ اُردو میں بھی محاورہ ہے کہ بعض دفعہ کسی چیز کی عظمت بیان کرنے کے لئے تکرار سے کام لیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے مصیبت۔ کیا بتاؤں کیسی مصیبت۔ بلا کیا بتاؤں کیسی بلا۔ پس اَلْقَارِعَةُ کے بعد مَا الْقَارِعَةُ میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مصیبت جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں معمولی نہیں بلکہ نہایت عظیم الشان ہوگی۔

خود قَرَعَ کا لفظ بھی عظیم الشان آواز اور عظیم الشان تباہی پر دلالت کرتا ہے لیکن مَا الْقَارِعَةُ نے بتا دیا کہ عذاب کی جس قدر شدت قارعہ کے لفظ سے ظاہر ہوتی ہے وہ قارعہ خود اِس سے بھی زیادہ شدید عذاب ہے حتیٰ کہ انسان اُس پر حیران ہو کر رہ جائے گا۔ اِس جگہ بجائے ضمیر لانے کے اللہ تعالیٰ نے جو اسم کو دُہرایا ہے یہ بھی اُس عذاب کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے۔ مَا الْقَارِعَةُ میں بجائے ضمیر لانے کے اسم کو دُہرانے میں حکمت یہ ہے کہ جب ضمیر آئے تو اصل لفظ اوجھل ہو جاتا ہے مثلاً کہتے ہیں جَآءَ زَيْدٌ فَقُلْتُ لَهٗ زید میرے پاس آیا اور مَیں نے اُسے کہا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ زید کا لفظ جتنی حقیقت ظاہر کرتا ہے اُتنی حقیقت ضمیر ظاہر نہیں کرتی۔ یہ کہنا کہ مَیں نے زید سے کہا اور یہ کہنا کہ میں نے اُس سے کہا گو مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہ کرے مگر زید کا لفظ دُہرانے سے

جو اثر پڑتا ہے وہ محض ضمیر سے نہیں پڑتا۔ اِس جگہ بھی اَلْقَارِعَةُ کے بعد مَا الْقَارِعَةُ میں بجائے ضمیر لانیکے اسم کو دُہرا دیا گیا ہے جس سے اُس کی عظمت کیطرف اشارہ کرنا مدنظر ہے اور اللہ تعالےٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وُہ ایسی عظیم الشان چیز ہے کہ انسانی نظروں سے غائب ہی نہیں ہوسکتی۔ ضمیر جب بھی آتی ہے گی غائب کے لئے آتی ہے گی لیکن وہ مصیبت اتنی بڑی ہوگی کہ انسان یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ مَا هِيَ اگر وہ ایسا کہیں تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وُہ اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مگر ایسا نہیں ہوگا پس مَا الْقَارِعَةُ نے یہ بتا دیا کہ وہ بھُولنے والی چیز نہیں نظروں سے اوجھل ہونے والی چیز نہیں اِسی لئے ضمیر کی بجائے اصل لفظ دُہرا کر اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اُسے بھُولو گے نہیں وہ نہایت عظیم الشان مصیبت ہوگی۔ الغرض دو چیزوں سے اِس قارعہ کی عظمت بیان کی گئی ہے ایک "ما" سے اور ایک ضمیر کی بجائے دوبارہ اُسی لفظ کو دُہرانے سے۔ اگر صرف "ما" کا لفظ آتا تب بھی اِس قارعہ کی عظمت کا ثبوت ہوتا مگر مَا الْقَارِعَةُ سے اُس کی دوہری عظمت بیان کر دی گئی ہے کہ انسان حیران ہوکر کہتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا چیز ہے۔ دُوسرے وہ اتنی عظیم الشان چیز ہوگی کہ اُس کی ہیبت انسانی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگی۔ جیسے دنیا میں جب کوئی بڑی عظیم الشان مصیبت آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں ہر وقت آنکھوں کے سامنے وہ نظارہ پھرتا ہے اِسی طرح وہ مصیبتِ عظمیٰ اتنی شدید ہوگی کہ بھُولے گی نہیں۔ ہر وقت لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رہے گی۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ کہہ کر اللہ تعالےٰ پھر تیسری بار اُس کی عظمت کو بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وُہ اِتنا بڑا واقعہ ہوگا کہ اُس کی حقیقت کا سمجھنا انسان کے لئے بالکل ناممکن ہے الفاظ میں اُسے ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ویسا ہی بیان ہے جیسے حدیثوں میں جنت کے متعلق آتا ہے کہ لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ بِقَلْبِ بَشَرٍ۔ نہ آنکھوں نے ایسا دیکھا ہے نہ کانوں نے سُنا ہے اور نہ کسی انسان کے واہمہ نے اُس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اِسی مضمون کی طرف قرآن کریم نے بھی اِن الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدہ ع۲) یعنی جو کچھ جنت میں ملنے والا ہے کوئی شخص اُس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بڑی تفصیل کے ساتھ یہ ذکر آتا ہے کہ جنت میں نہریں ہوں گی، باغات ہوں گے، کھانے پینے کے لئے ہر قسم کی چیزیں ہوں گی لیکن پھر جنت جنت ہی ہے۔ یہ الفاظ تو تقریب تفہیم کیلئے آتے ہیں تاکہ انسان کسی حد تک جنت کی نعماء کا اندازہ لگا سکیں ورنہ اِس کے یہ معنے نہیں کہ جنت میں بھی دنیا کا دُودھ اور دنیا کا پانی اور دنیا کے انگور اور دنیا کے انار اور دنیا کے کیلے ہوں گے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھتے ہوئے کہ قرآن کریم میں جنت کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرلیں کہ جنت میں بھی دنیا کی ہی چیزیں ہوں گی۔ اِسی قسم کی وہاں نہریں ہوں گی۔ اِسی قسم کے باغات ہوں گے۔ اِسی قسم کے پھل اور پھول ہوں گے گویا اِسی دنیا کو اُٹھا کر ایک دوسرے ماحول میں رکھ دیا جائے گا آپ نے فرمایا میں تمہیں جنت کی نعماء کے متعلق کیا بتاؤں لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ بِقَلْبِ بَشَرٍ۔ وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ نہ آنکھوں نے اُن کو دیکھا ہے اور نہ کانوں نے اُن کو سُنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اُن کا گذر ہوا ہے یعنی اگر تم قرآن کریم میں نعماء جنت کا ذکر دیکھتے ہو تو مت سمجھو کہ قرآن کریم کا اِن نعماء سے وہی مطلب ہے جو تم سمجھتے ہو۔ یہ الفاظ تو صرف اِس لئے لائے گئے ہیں تاکہ جس حد تک تم جنت کی نعماء کا اندازہ لگانے کے قابل ہو اُس حد تک لگا سکو ورنہ جنت

اصل میں ایک ایسی چیز ہے جسے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور نہ کسی کان نے اُس کا ذکر سُنا ہے یعنی اگر تمہیں کوئی شخص قرآن کریم کی آیتیں سُناتا ہے اور بتاتا ہے کہ جنّت ایسی ہوگی یا پُرانی کتابوں میں سے جنّت کی حقیقت بیان کرتا ہے تو تم مت خیال کرو کہ چونکہ ہم نے جنّت کی نعماء کا ذکر سُن لیا ہے اس لئے ہم نے حقیقت کو پا لیا۔ وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ آج تک کسی آنکھ نے اُن کو نہیں دیکھا اور نہ کوئی کان اُن سے آشنا ہوا ہے۔ پھر یہیں تک بس نہیں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی آنکھ ایک چیز کو نہیں دیکھتی اُس کے کان اصل حقیقت کو سُننے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے خیالات کی بلند پروازی میں اُس چیز کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کیونکہ خیالات کی پرواز اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انسان بعض دفعہ سورج میں جا پہنچتا ہے چاند میں جا پہنچتا ہے اور جو بات بظاہر ناممکن ہوتی ہے وہ خیالات کی بلند پروازی سے ممکن ہو جاتی ہے مگر فرماتا ہے جنّت کے معاملہ میں انسانی خیالات کی بلند پروازی بھی بالکل ہیچ ہے وَ مَا خَطَرَ بِقَلْبِ بَشَرٍ اگر کسی انسان نے اپنی قوتِ واہمہ کو آزاد کر کے جنّت کا کوئی زیادہ سے زیادہ نقشہ کھینچا ہے تو وہ بھی غلط ہے۔ اُس کی نعماء ایسی ہیں کہ انسان اپنے خیالات کی بلند پروازی کے بعد بھی اُن کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تین فقروں میں جنّت کی کیفیت بیان کر دی ہے اسی رنگ میں قرآن کریم نے تین فقروں میں اَلْقَارِعَۃُ کی عظمت بیان کی ہے۔ پہلے صرف اَلْقَارِعَۃُ کہا جس کا الف لام اُس کے کمال پر دلالت کرتا ہے یعنی شدید آواز یا شدید مصیبت۔ الف لام کبھی کمال کے اظہار کے لئے آتا ہے یعنی یہ بتانے کے لئے کہ اس لفظ سے جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ اس مسمّی میں بکمال و تمام پائی جاتی ہے۔ اس جگہ الف لام اسی مضمون کو ادا کرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ پھر مَا الْقَارِعَۃُ کہہ کر دوسری دفعہ اُس کی عظمت کا اظہار کیا اور وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَۃُ کہہ کر تیسری دفعہ بتایا کہ ابھی اُس کی عظمت کا پورا ذکر نہیں ہوا۔ درحقیقت وہ اتنی بڑی شے ہے کہ کوئی شخص اُس کی حقیقت کو صرف الفاظ سے سمجھ ہی نہیں سکتا اِس لئے آج تم اُس کی حقیقت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کی حقیقت کو انسان سمجھ نہیں سکتا یا جس کی عظمت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہوتا ہے جب اُس چیز کا ذکر کیا جاتا ہے تو لازماً یا تو تمثیل سے کام لینا پڑتا ہے یا پھر اُس کے بعض نتائج بیان کر دیتے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی بڑا عمدہ نظارہ ہو اور انسان اُس کو ایسے قویٰ سے دیکھے جو روحانی ہوں ظاہری قویٰ اُس کو نہ دیکھ سکتے ہوں تو دوسروں کے سامنے جب وہ اُس نظارہ کا ذکر کرنے لگے گا تمثیلات میں بیان کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن کبھی تمثیلات میں بیان کرنے کی بجائے اُس چیز کے اثرات بیان کر دیتے جاتے ہیں جیسے اللہ تعالےٰ کا وجود مادی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے اللہ تعالےٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا نُوْرٌ اَنّٰى اَرَاهُ اللہ تعالےٰ تو ایک نور ہے اُسے مَیں کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔ جہاں تک مادی آنکھوں یا جسمانی قویٰ سے اللہ تعالےٰ کو دیکھنے کا سوال ہے یہ ایک یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔ لیکن دوسری طرف اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رویت باری تعالےٰ کا مسئلہ درست ہے اور اللہ تعالےٰ اپنے محبوب بندوں کو نظر بھی آجاتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ اِسی طرح نظر آتا ہے کہ یا تو انسان اُس کی صفات سے رویت کرتا ہے اور یا کسی تمثیلی نظارہ میں اللہ تعالےٰ کے وجود کو دیکھ لیتا ہے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَیں نے خدا تعالےٰ کو ایک نوجوان کی صورت میں دیکھا ہے پس ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ تمثیلی رنگ میں

اللہ تعالیٰ کو دیکھا جائے اور دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ صفاتِ الٰہیہ پر غور کرتے ہوئے اُس کی رویت کی جائے۔ جب ہم صفتِ رب پر غور کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کا وجود ہمارے قریب ہو جاتا ہے۔ جب ہم صفتِ رحمانیت پر غور کرتے ہیں تو اُس کا وجود ہمارے اَور زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ جب ہم صفتِ رحیمیت پر غور کرتے ہیں تو وہ ہمارے اَور قریب آجاتا ہے۔ اسی طرح جب ہم اُس کی مالکیت پر غور کرتے ہیں تو وہ اَور زیادہ قریب آجاتا ہے اور اِس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ذریعہ انسان کو نظر آجاتا ہے مگر صفات بھی اپنی ذات میں نظر نہیں آتیں بلکہ نتیجہ سے نظر آتی ہیں۔ جب ہم دنیا میں ربوبیت کے مختلف نظّارے دیکھتے ہیں تو ایک رب خدا ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جب ہم دنیا میں رحمانیت کے نظّارے دیکھتے ہیں تو ایک رحمٰن خدا ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جب ہم دنیا میں رحیمیت کے نظارے دیکھتے ہیں تو ایک رحیم خدا ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جب ہم دنیا میں اُس کی مالکیت کے نظّارے دیکھتے ہیں تو مالک یوم الدین خدا کا ایک ناقص تصوّر ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی رویت ہے جو مومنوں کو نصیب ہوتی ہے پھر اِس سے اُوپر کوئی انسان ترقی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے انوار اُس کے قلب پر نازل ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور اُس کے اندر نئی طاقتیں۔ نیا جوش۔ نئی محبت اور نئی روحانی قوتیں پیدا کر دی جاتی ہیں۔ پھر اَور ترقی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کلام اُس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اِس طرح درجہ بدرجہ وہ ترقی کرتا چلا جاتا اور ایک رویت سے دوسری رویت کا مقام حاصل کرتا جاتا ہے مگر بہرحال وہ جتنا بھی بڑھ جائے آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مقام تو اُسے حاصل نہیں ہو سکتا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں کہ نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ تو اَور کون ہے جو کسی روحانی مقام پر پہنچکر یہ دعویٰ کرسکے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھ لیا ہے وہ جو کچھ بھی دیکھے گا خدا تعالیٰ کی ایک تجلّی ہوگی جو اُس کے اپنے مقام کے مطابق اُس پر ظاہر ہوگی۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام پر خدا تعالیٰ کی یہ تجلّی اِس رنگ میں ہوئی کہ رُوح القدس آپ پر کبوتر کی شکل میں نازل ہُوا اور اُس نے خدا تعالیٰ کا پیغام آپ کو پہنچایا۔ بعض اور انبیاء ایسے ہیں جن پر یہ تجلّی کسی اَور رنگ میں ہوئی۔ کسی کو خدا تعالیٰ نار میں نظر آگیا۔ کسی کو کامل انسان کی صورت میں نظر آگیا۔ کسی کو صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کی صورت میں نظر آگیا اور کسی کے قلب پر اُس کا پرتَو پڑ گیا۔ بہرحال وہ اُتنا ہی نظر آئے گا جتنا کسی کا قلب آسمانی انوار سے حصہ لیتا ہوگا اور تمثیل پر ہی ہر صورت میں کفایت کرنی پڑیگی۔ غرض ہر ایسی چیز جس کی حقیقت کا سمجھنا انسان کیلئے ناممکن ہو اُسے صرف اِسی رنگ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اُس کے نتائج بیان کر دئے جائیں یا تمثیلی رنگ میں اُس کا نقشہ کھینچ دیا جائے اِس لئے پہلے یہ بتا کر کہ اِس قارعہ کی حقیقت قبل از وقوع تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی اللہ تعالیٰ اِس قارعہ کے نتائج بیان کرکے اُسے قریب الفہم بناتا ہے اور فرماتا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ کونسی چیز تجھے بتا سکتی ہے کہ یہ قارعہ کیا ہے یعنی تمہاری قوت واہمہ ایسی نہیں کہ ہمارے بیان سے تم اُس کی حقیقت کو سمجھ سکو اِس لئے ہم اِس کے کچھ نتائج بیان کر دیتے ہیں تا تم کچھ اُس کی عظمت و ہیبت کا اندازہ کر سکو۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝

(یہ مصیبت جب آئے گی) اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح (حیران پھر رہے) ہونگے ۵

فَرَاش

۵ حل لغات۔ فَرَاشٌ اپنی ذات میں ایک علیحدہ لفظ بھی ہے اور فَرَاشَۃٌ کی جمع بھی ہے فَرَاشَۃٌ کی جمع ہونے کی صورت میں فَرَاش اُن پروانوں کو کہا جاتا ہے جو رات کو لیمپ کی روشنی میں اکٹھے ہو جاتے ہیں چنانچہ لُغت میں لکھا ہے حَيَوَانٌ ذُوْجَنَاحَيْنِ يَطِيْرُ وَيَتَهَافَتُ عَلَى السِّرَاجِ فَيَحْتَرِقُ۔ یعنی فراشہ اُس کیڑے کو کہا جاتا ہے جو لیمپ روشن ہونے پر بے تحاشا اُس کی طرف دوڑتا اور جل کر مر جاتا ہے اور فَرَاشٌ کے معنے غَوْغَاءُ الْجَرَادِ کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) یعنی جب ٹڈی دل آتا ہے تو اُس سے فضاء میں جو شور کی آواز پیدا ہوتی ہے اُس کو بھی فَرَاش کہتے ہیں کیونکہ ٹڈی جب آتی ہے تو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں آتی ہے اور اُس کے آنے سے بھنبھناہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ بعض مفسّرین نے جو ائمۂ لُغت میں سے ہیں انہوں نے فَرَاش کو ٹڈی کے معنوں میں بھی لیا ہے۔

جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں فَرَاشَۃٌ کی جمع ہونے کے علاوہ فَرَاش اپنی ذات میں ایک علیحدہ لفظ بھی ہے چنانچہ لُغت میں اِس کے معنے یہ لکھے ہیں کہ مَا يَبِسَ بَعْدَ الْمَاءِ مِنَ الطِّيْنِ عَلَى الْاَرْضِ آسمان سے پانی برسنے کے کچھ عرصہ بعد زمین پر جو پیپڑیاں جم جاتی ہیں اُن کو بھی فَرَاش کہتے ہیں (اقرب) اور فَرَاش اُن بُلبلوں کو بھی کہتے ہیں جو نبیذ پر آجاتے ہیں منقّیٰ کو جب پانی میں بھگویا جائے تو تھوڑی دیر کے بعد کچھ بُلبلے اُٹھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ دراصل جس قدر شکر والی چیزیں ہیں اُن کے اندر ایک خاص مادہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اگر اُن کو پانی میں بھگویا جائے تو جھاگ وغیرہ پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گُڑ میں سے گنّے کی رس میں سے۔ کھجور کی رس میں سے۔ منقّیٰ میں سے کچھ عرصہ کے بعد بُلبلے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جس وقت یہ بُلبلے اُٹھ اُٹھ کر پانی کی سطح پر پھیل جاتے ہیں تو اُن کو فَرَاشٌ کہتے ہیں (اقرب)

اَلْمَبْثُوْث: بَثَّ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور بَثَّ الْخَبَرَ (بَثًّا وَبَثَّثَهٗ وَاَبَثَّهٗ) کے معنے ہوتے ہیں نَشَرَهٗ وَاَذَاعَهٗ۔ خبر کو پھیلایا (اقرب) یعنی لوگوں میں نیکی پھیلائی یا صدقہ وخیرات کا عام چرچا کیا اور بَثَّ الْغُبَارَ کے معنے ہوتے ہیں هَيَّجَهٗ غبار کو زمین میں سے اُٹھایا (اقرب) جیسے قرآن کریم میں هَبَاءً مُّنْبَثًّا (الواقعہ ع) زمین میں سے غبار اُٹھانے کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ وَفِيْ مَعْنٰى نَشْرِهٖ وَاِذَاعِهٖ "بَثُّوا الْخَيْلَ فِي الْاِغَارَةِ"۔ اور یہ جو بَثَّ کا لفظ نَشْر وَاِذَاعَة کے معنوں میں آیا ہے اِسی کو وسیع کر کے لُغت میں کہتے ہیں بَثُّوا الْخَيْلَ فِي الْاِغَارَةِ انہوں نے حملہ کیا تو گھوڑے دوڑا کر لے گئے یا بَثَّ كِلَابَهٗ عَلَى الصَّيْدِ شکار کے پیچھے کتّے ڈال دئے۔ اِسی طرح کہتے ہیں خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَبَثَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی اور پھر اُسے زمین میں پھیلا دیا (اقرب) گویا بَثَّ کے معنے پھیلا دینے دوڑانے یا دُور تک لے جانے کے ہوئے۔

تفسیر۔ اُن تمام معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو لُغت نے بیان کئے ہیں يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ کے ایک معنے تو یہ ہوں گے کہ جیسے پراگندہ پروانے ہوتے ہیں ویسی ہی لوگوں کی کیفیت ہوگی۔ پروانے کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک تو

وہ جب وہ لیمپ کے سامنے ہو۔ اور ایک وہ حالت ہوتی ہے جب لیمپ سے علیحدہ ہو۔ جب روشنی سامنے ہو تو سارے پروانے روشنی کی طرف جاتے ہیں لیکن اگر لیمپ کو اُٹھا لو اور اندھیرا کردو تو کوئی پِنڈا اِس کونے کیطرف جارہا ہوتا ہے اور کوئی اُس کونے کی طرف۔ سب منتشر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں اور اگر برسات کا موسم ہو تو چھوٹے چھوٹے پروانے ہی نہیں بڑے بڑے پِنڈے بھی لیمپ کی طرف جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ علم الحیوانات کے ماہرین یہ بتاتے ہیں کہ پروانوں کی اصل جگہ زمین کے اندر ہوتی ہے جب بارش برستی ہے تو اُن کے دلوں میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ ہم باہر نکلیں۔ چنانچہ باہر نکلنے کی اُمنگ میں ہی وہ زمین سے باہر آتے ہیں اور جب لیمپ کو جلتا دیکھتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ یہ کوئی اور سوراخ ہے جس سے پرے کوئی اور عالم ہے وہ جوش کی حالت میں لیمپ پر کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ابھی ہمارے لئے آزادی کا مقام باقی ہے۔ بہرحال کوئی بھی وجہ ہو یہ امر ظاہر ہے کہ جب لیمپ روشن ہو تو پروانے اُسکے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور جب لیمپ بجھا دو تو وہ پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ پس یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ کے یہ معنے ہوئے کہ اُس وقت لوگ اِس حال میں ہوں گے جیسے پراگندہ پروانے ہوتے ہیں جن کو روشنی نظر نہیں آتی اور وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ گویا لوگوں کی حالت بالکل ایسی ہوگی جیسے بغیر لیمپ کے پروانوں کی حالت ہوتی ہے۔ اُنہیں کوئی روشنی نظر نہیں آئے گی۔ کوئی جہت ایسی دکھائی نہیں دے گی جو اُن کے لئے بچاؤ کا موجب ہوسکے۔ وہ حیران ہوں گے کہ ہم کہاں جائیں کدھر جائیں اور اپنے بچاؤ کی کیا صورت اختیار کریں گویا اُنکی بے بسی اپنے کمال کو پہنچی ہوگی۔

چونکہ فَرَاش کے ایک معنے ٹِڈیوں کے بھی ہیں اِس لئے کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ اُن کی حالت اُن ٹِڈیوں کی طرح ہوگی جو پراگندہ کردی جاتی ہیں۔ اَلْقَارِعَۃ پر بحث کرتے ہوئے میں نے بتایا تھا کہ ائمۂ لغت جو تفسیر کی طرف مائل ہیں اُن کے نزدیک قَرع کا لفظ شدید آواز پر بھی دلالت کرتا ہے اور مَیں نے ان معنوں پر زیادہ زور دیا تھا کیونکہ یہ معنے اگلی آیات کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اُس دن انسان اُن ٹِڈیوں کی طرح ہو جائیں گے جو پراگندہ کردی جاتی ہیں۔ اور ٹِڈیوں کو ڈرانے اور منتشر کرنے کے لئے سب سے بڑی چیز جس سے کام لیا جاتا ہے وہ آواز ہی ہے۔ جب ٹِڈی آتی ہے تو لوگ خالی پیپے لے کر اُنہیں ڈھم ڈھم بجانا شروع کردیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں ٹِڈی آواز سے ہی منتشر کی جاسکتی ہے کسی اور چیز سے نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ٹِڈی کی نظر تیز نہیں ہوتی لیکن اُس کے کان بہت تیز ہوتے ہیں اس لئے ٹِڈی کو ڈرانے کے لئے شدید آواز پیدا کی جاتی ہے جب تیز آواز پیدا ہو تو ٹِڈی بے تحاشا اُڑنے لگتی ہے۔ شہروں اور دیہات دونوں میں یہ دستور ہے کہ جب ٹِڈی کھیتوں پر آکر گرتی اور فصلیں تباہ کرنے لگتی ہے تو بے تحاشا ڈھول اور پیپے بجائے جاتے ہیں۔ اسی طرح گورنمنٹ کی طرف سے یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ جہاں ٹِڈی دل گرا ہو اُس کے آگے کچھ دُور پر بڑی بڑی کھائیاں کھود دی جاتی ہیں اور مزدور اپنے ہاتھ میں ٹوکریاں اور کُدالیں لے کر وہاں کھڑے رہتے ہیں۔ پھر ڈھول وغیرہ بجاکر ٹِڈی کو اُڑایا جاتا ہے۔ چونکہ چھوٹی ٹِڈی زیادہ نہیں اُڑسکتی وہ آواز سے ڈر کر اُڑتی اور کھائیوں میں گر جاتی ہے اُس وقت ڈھول بجانے بند کردئے جاتے ہیں اور مزدور جو ٹوکریاں اور کُدالیں لئے وہاں کھڑے ہوتے ہیں فوراً اُن کے اُوپر مٹی ڈال دیتے ہیں۔ اِسی طرح آج کل بموں کے ذریعہ ٹِڈی دل کو منتشر کیا جاتا ہے جہاں ٹِڈی آئے وہاں بم گراکر ایک ہیبت ناک آواز پیدا کی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹِڈیاں اُڑتی ہیں اور سامنے کی خندقوں میں گر جاتی ہیں جہاں اُنہیں

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝

اور پہاڑ اس پشم کی مانند ہو جائیں گے جو دھنکی ہوئی ہوتی ہے۔ ؎۵

دفن کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال ٹڈی جہاں نقصان پہنچانے کیلئے آئی ہوئی ہو وہاں ڈھول کے ذریعہ یا پیپوں کے ذریعہ یا بموں کے ذریعہ آواز پیدا کی جاتی ہے جس سے ڈر کر ٹڈی اپنی جگہ کو چھوڑ دیتی ہے پس یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ کے یہ معنے ہوئے کہ اُس وقت ایک شدید آواز پیدا کی جائے گی جو ایسی ہیبت ناک ہوگی کہ جس طرح ٹڈیاں جب اُن کو منتشر کرنے کیلئے ڈھول بجائے جاتے یا پیپے بجائے جاتے یا بم گرائے جاتے ہیں تو وہ ڈر کر اپنے اُس حملہ کو جو انہوں نے کھیتوں پر یا درختوں پر یا سبزہ پر کیا ہوتا ہے بھول جاتی ہیں اور اپنے اجتماع کی جگہوں کو چھوڑ دیتی ہیں۔ اِسی طرح جب وہ قارعہ آئے گی تو لوگ لشکروں کی صورت یا اجتماعی صورت کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں گے اور سمجھیں گے کہ آج ہمارے لئے بھاگنے کے سوا نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

العھن ؎۲

پھر فَرَاش کے ایک معنے مَا یَبَسَ بَعْدَ الْمَاءِ مِنَ الطِّیْنِ عَلَی الْاَرْضِ کے بھی ہیں یعنی بارش برسنے کے بعد زمین پر جو پیپڑیاں جم جاتی ہیں اُن کو بھی فَرَاش کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بتایا جا چکا ہے کہ مَبْثُوْث کے ایک معنے غبار اُڑانے کے بھی ہیں کیونکہ جب بَثَّ الْغُبَارَ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں هَیَّجَهٗ غبار کو زمین سے اُٹھایا۔ اِن معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ کے یہ معنے ہوں گے کہ جس طرح پانی گرتا ہے تو بعد میں پیپڑیاں جم جاتی ہیں مگر پیپڑی کوئی مضبوط چیز نہیں ہوتی بظاہر وہ سخت نظر آتی ہے مگر چونکہ اُس کا جسم بہت معمولی ہوتا ہے اِس لئے جب اُس پر گھوڑا دوڑایا جائے تو وہ ٹوٹ پھوٹ کر غبار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اِسی طرح جب وہ قارعہ آئے گی تو لوگ اِس طرح اُڑ جائیں گے جس طرح غبار اُڑ جاتا ہے۔

اِسی طرح یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جس طرح پروانہ ایک ہلکا پھلکا سا وجود ہے اِسی طرح وہ اِس چوٹ سے اِس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں اُڑ جائیں گے کہ یُوں معلوم ہوگا وہ پتنگے ہیں جو ہوا میں اُڑ رہے ہیں یعنی وہ قارعہ ایسی ہوگی کہ جب گویا چلتے پھرتے خوبصورت انسان ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اِس طرح اُڑ جائیں گے کہ پتہ بھی نہیں لگے گا کہ وہ کہاں گئے۔ اُن کی شکل انسانوں کی سی نہیں رہے گی یُوں معلوم ہوگا کہ وہ چھوٹے چھوٹے پروانے ہیں جو ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔

؎۵ حل لغات۔ اَلْعِهْنُ: اَلصُّوْفُ اَوِ الْمَصْبُوْغُ اَلْوَانًا۔ عِهْن کے معنے صوف کے بھی ہوتے ہیں اور عِهْن کے معنے کئی رنگوں میں رنگی ہوئی اُون کے بھی کئے جاتے ہیں (اقرب)

مَنْفُوْش۔ دُھنکی ہوئی رُوئی یا پراگندہ کی ہوئی اُون کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ اُون جُڑی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اُس وقت تک بُننے کے کام نہیں آسکتی جب تک اُس کے بال بال الگ نہ کئے جائیں اِس لئے عورتوں کا طریق ہے کہ وہ بیٹھ جاتی ہیں اور انگلیوں سے اُون کے بالوں کو نوچ نوچ کر الگ کرتی ہیں یہاں تک کہ وہ بالکل ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے چنانچہ لسان العرب میں لکھا ہے مَدَّہٗ حَتّٰی یَتَجَوَّفَ اُون کو کھینچ کھینچ کر اُس میں جوف پیدا کر دیا گیا اور اقرب میں لکھا ہے نَفَشَ الْقُطْنَ وَالصُّوْفَ نَفْشًا: شَعَّثَہٗ بِالْاَصَابِعِ حَتّٰی یَنْتَشِرَ۔ اُس نے انگلیوں کے ساتھ روئی یا اُون کو پراگندہ کیا یہاں تک کہ وہ پھیل گئی۔ پس وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ کے

معنے یہ ہوئے کہ پہاڑ اُس دن اُس پشم کی مانند ہو جائینگے جو دُھنکی ہوئی ہو۔

تفسیر۔ اِس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے عذاب کی کیفیت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ عذاب ایسا شدید ہوگا کہ ایک طرف انسانوں پر اِس کا یہ اثر ہوگا کہ اگر وہ لشکر کی صورت میں ہوں گے تو پراگندہ ہو جائینگے اور سمجھیں گے کہ اجتماع کی صورت ہمارے لئے خطرناک ہے اور اگر وہ شہروں میں بستے ہوں گے تو اِس عذاب کے ہیبت ناک اثرات کی وجہ سے وہ شہروں میں نہیں رہیں گے بلکہ گھروں سے نکل کر جنگلوں میں بھاگ جائیں گے اور سمجھیں گے کہ ہمارے لئے نجات کی اب کوئی صورت نہیں سوائے اِس کے کہ ہم منتشر اور پراگندہ ہو جائیں۔ دوسری طرف مصیبت کے لحاظ سے یہ اتنی خطرناک ہوگی کہ لوگ اندھے ہو جائیں گے جس طرح اندھیرے میں پروانے بھاگتے ہیں تو اُنکو کوئی رستہ نہیں ملتا وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں اِسی طرح اُن کو کوئی رستہ نظر نہیں آئے گا اور وہ مارے مارے پھریں گے اور پھر یہ حملہ اتنی شدت کا ہوگا کہ انسانوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ گویا اوّل تو پراگندہ ہو جائیں گے لیکن اگر وہ پراگندہ نہ ہوئے اور لشکر کی صورت میں کسی مقام پر جمع ہوئے یا گھروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں نہ بھاگے تو یہ عذاب ایسا شدید ہوگا کہ اُن کی بوٹیاں تک ہوا میں اُڑ جائیں گی اور یوں معلوم ہوگا کہ پتنگے اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں۔ پھر کچھ لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگیں گے کہ شاید ہمیں وہاں امن مل سکے مگر یہ عذاب اتنا خطرناک ہوگا کہ پہاڑوں پر گرے گا تو وہ دُھنکی ہوئی رُوئی کی طرح اُڑ جائیں گے۔

میں پہلے خیال کیا کرتا تھا کہ اِن آیات میں توپخانوں اور موجودہ زمانہ کی اُن ہلاکت آفرین ایجادوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے عام طور پر لڑائیوں میں کام لیا جاتا ہے مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ اَلْقَارِعَۃ سے ایٹم بم مراد ہے اور اِس عذاب کی ساری کیفیت ایسی ہے جو ایٹم بم سے پیدا شدہ تباہی پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ یہ بم ایسا خطرناک اور تباہ کُن ہے کہ اِس سے بچنے کی سوائے اِس کے اور کوئی صورت نہیں کہ لوگ منتشر اور پراگندہ ہو جائیں یہ بم جس جگہ گرتا ہے سات سات میل تک کا تمام علاقہ خس و خاشاک کی مانند جلا کر راکھ کر دیتا ہے بلکہ ایٹم بم کے متعلق اب جو مزید تحقیق ہوئی ہے وہ بتاتی ہے کہ سات میل کا بھی سوال نہیں چالیس چالیس میل تک یہ ہر چیز کو اُڑا کر رکھ دیتا ہے۔ ہیروشیما پر اٹومک بم گرایا گیا تو بعد میں جاپانی ریڈیو نے بیان کیا کہ اِس بم سے ایسی خطرناک تباہی واقعہ ہوئی ہے کہ انسانوں کے گوشت کے لوتھڑے میلوں میل تک پھیلے ہوئے پائے گئے ہیں۔ یہ بالکل وہی حالت ہے جس کا قرآن کریم نے اِن آیات میں ذکر فرمایا ہے کہ انسانوں کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔ ہڈی کیا اور بوٹی کیا سب باریک ذرّات کی طرح ہو جائیں گے اور پتنگوں کی مانند ہوا میں اُڑتے پھریں گے۔ یہی حال اس عذاب کے نتیجہ میں پہاڑوں کا ہوگا۔ ابھی تک پہاڑوں کے متعلق ایٹم بم کا تجربہ نہیں کیا گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اِس میں اِس قسم کی ترقی ہوگی کہ پہاڑ بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکینگے۔ جہاں تک پھیلاؤ کا سوال ہے یہ بم کسی چیز کو نہیں چھوڑتا لیکن جہاں تک گہرائی کا سوال ہے ابھی ماہرین کی تحقیق مکمل نہیں ہوئی۔ لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ اِس بم کو ترقی دیکر ایسا خطرناک بنا دیا جائے گا کہ پہاڑوں اور قلعوں کو بھی ایک آن میں اُڑا دے گا۔

القارعۃ سے مراد ایٹم بم

اَلْقَارِعَۃ کے ایک معنے قیامت کے بھی کئے گئے ہیں اور یہی لفظ ہے جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرائے جانے کے بعد آج تک متواتر استعمال کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اس کے بعد بھی جنگ نہ چھوڑی گئی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ دنیا پر قیامت آگئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اِس کے نتیجہ میں انسانی وجود ہی مٹ جائیگا اور بعض نے کہا ہے ممکن ہے انسانی وجود تو باقی رہے مگر یہ یقینی امر

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ

اس وقت جس کے (اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ تو (بہترین اور) پسندیدہ

رَّاضِيَةٍ ۙ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۙ

حالت میں ہوگا۔ اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا تو ہاویہ (ہی) ہوگا۔

ہے کہ موجودہ تہذیب کا نام ونشان تک باقی نہیں رہیگا کیونکہ شہر مٹ جائیں گے۔ قصبات برباد ہو جائیں گے دیہات تباہ ہو جائیں گے اور جو تھوڑے بہت متنفس باقی رہیں گے وہ جنگلوں میں اپنی زندگی کے دن گذارنے لگینگے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس بم کو آزادانہ استعمال کیا گیا تو ایسی خطرناک تباہی دنیا میں واقعہ ہوگی کہ وہ لوگ جو نسلِ انسانی میں سے باقی رہیں گے اس بات سے بھی ناواقف ہو جائیں گے کہ آگ کس طرح جلائی جاتی ہے کیونکہ کارخانے مٹ چکے ہوں گے۔ علم وفن کے جاننے والے سب تباہ ہو چکے ہوں گے اور غم کے اثرات زائل کرنے کے لئے لوگ اپنی گذشتہ روایات کو بھی فراموش کر دیں گے تب لوگ ایک بار پھر چقماق سے کام لینا شروع کر دیں گے۔ پھر وہی دَور دنیا میں آجائے گا جو اِس دورِ تہذیب سے پہلے ایک دفعہ آچکا ہے۔ پھر نئے سرے سے ایجادات عمل میں آئیں گی۔ اور پھر ایک لمبے عرصہ کے بعد دیا سلائی ایجاد کی جائے گی غرض لوگوں نے ابھی سے اِس قسم کے نقشے کھینچنے شروع کر دئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ میں ایٹم بم کا ہی نقشہ کھینچا گیا ہے اور واقعہ میں ایسی خطرناک تباہی دنیا میں اور کون سی ہو سکتی ہے کہ صرف دو بموں سے اس قدر بڑی حکومت نے جس کے پاس اب بھی نوّے لاکھ فوج تھی ہتھیار ڈال دئے اور اتحادیوں کے سامنے اُسے اپنا سر جھکانا پڑا۔

جَبَل کے معنے سردار قوم اور بڑے آدمی کے بھی ہوتے ہیں۔ اِن معنوں کے رُو سے آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ اُس دن بڑے بڑے آدمی دُھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے یعنی اُن کی طاقت زائل ہو جائے گی اور وہ کھوکھلے ہو جائیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ بڑے آدمیوں کی بڑائی اُن کی انتظامی قابلیت میں ہوتی ہے لیکن اِس قسم کے خطرناک ہتھیاروں کے مقابلہ میں تدبیر اور کوشش بیکار جاتی ہے اور لیڈروں کی عظمت اور ضرورت ہٹ جاتی ہے۔

۵۵ حلِ لغات۔ مَوَازِيْن: مِيْزَانٌ کی جمع ہے اور میزان اُس ترازو کو کہتے ہیں جس سے چیزیں تولی جاتی ہیں۔ اِسی طرح میزان کے ایک معنے اَلْعَدْل کے ہیں یعنی جزا اور مثل کے اور میزان مقدار کو بھی کہا جاتا ہے (اقرب)

اَلْاُمُّ : اَلْوَالِدَةُ۔ اُمّ کے معنے ماں کے ہیں اُمُّ الشَّیْءِ اَصْلُهٗ یعنی اُمُّ الشَّیْءِ سے مراد کسی چیز کی اصل یعنی جڑ ہوتی ہے اُمُّ الدِّمَاغِ وَاُمُّ الرَّأْسِ اَلْجِلْدَةُ الَّتِیْ تَجْمَعُ الدِّمَاغَ اور اُم الدماغ اور اُم الرأس اُس جھلّی کو کہتے ہیں جو دماغ کو گھیرے ہوئے ہے اُمُّ اَرْبَعٍ وَاَرْبَعِيْنَ دُوَيْبَّةٌ سَامَّةٌ اور اُمّ اربع ایک زہریلا کیڑا ہوتا ہے جسے ہماری زبان میں ہزار پایا کہتے ہیں (اقرب)

هَاوِيَة : هَوٰی سے ہے اور هَوَی الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں مَاتَ مرگیا۔ پس هَاوِيَه کے معنے ہوئے مرنے والی۔ اور هَوَى الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں سَقَطَ مِنْ عُلْوٍ اِلٰی اَسْفَلَ۔ اُوپر سے نیچے کی طرف گر گیا۔

اِس لحاظ سے اُمُّہٗ ھَاوِیَۃ کے یہ معنے ہوں گے کہ اُس کی ماں یا اصل (جیسا کہ اُمّ الشَّیء کے معنے اَصْلُہٗ کے بیان کئے جا چکے ہیں) ھَاوِیَۃ ہوگی یعنی نیچے کی طرف جانے والی ہوگی۔ بالفاظ دیگر یُوں کہہ لو کہ تنزّل کی حالت اُس کی ماں ہوگی یعنی تنزّل کا بیج اُس کے اندر پایا جائے گا اور وہ بیج اُسے نیچے ہی نیچے گراتا جائے گا۔ ھَاوِیَۃ جہنم کا نام بھی ہے (اقرب) اور اَلْھَاوِیَۃ کے معنے ہیں اَلثَّاکِلَۃ رونے والی (اقرب)

تفسیر قرآن کریم میں مِیْزَان کا لفظ بھی آتا ہے اور مَوَازِیْن کا بھی۔ خدا تعالیٰ کی طرف جب اِس کی نسبت ہوتی ہے تو مِیْزَان کا لفظ آیا ہے لیکن بندوں کے لئے جب استعمال ہوا ہے تو مَوَازِیْن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دنیا میں تو کئی دوسری میزانیں بھی ہیں۔ ہزاروں ہزار آدمی تول رہا ہے اور ہزاروں ہزار تُلوا رہا ہے لیکن قیامت کے دن جب انسانی اعمال کے نتائج ظاہر ہونے لگیں گے اُس وقت تُلوانے والے تو بہت ہوں گے لیکن تولنے والا ایک ہی ہوگا۔ اِسی حقیقت کو قرآن کریم نے دوسرے مقامات پر مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْن کے الفاظ میں بیان کیا ہے یعنی اُس روز تمام انسانی مالکیتیں ختم ہو جائیں گی صرف ایک خدا کی مالکیت کا کامل ظہور ہوگا۔ پس چونکہ اپنے اعمال کا وزن کرانے والے زیادہ ہوتے ہیں اِس لئے بندوں کے لحاظ سے قرآن کریم مَوَازِیْن کا لفظ استعمال کرتا ہے اور چونکہ وزن کرنے والا ایک ہی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے لحاظ سے مِیْزَان کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں قارعہ کا لفظ آیا ہے اُس نتیجہ پر دلالت کرنے کے لئے آیا ہے جو خدا تعالیٰ کا ہاتھ انبیاء کے زمانہ میں خود پیدا فرماتا ہے گویا قارعہ عام عذابوں کو نہیں کہا جاتا بلکہ اِس سے وہ مخصوص عذاب مراد ہوتے ہیں جو انبیاء کی صداقت کا اظہار کرنے کے لئے آئیں۔ خواہ بلاواسطہ آئیں یا بالواسطہ۔ اور جن کے پس پشت خدا تعالیٰ کا ہاتھ کام کر رہا ہوتا ہے۔

زیر تفسیر آیت میں فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ۔ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ۔ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ کے الفاظ اِسی قارعہ کے انجام پر دلالت کرنے کیلئے آئے ہیں کیونکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے پیچھے خدائی مشیّت کا ہاتھ کام کر رہا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے ان لشکروں کا حملہ اپنی طرف منسوب کیا جو انہوں نے کفار پر کیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس طاغیہ کو اپنی طرف منسوب کیا جو قوم ثمود کی ہلاکت کا موجب ہوئی اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس شدید ہوا کو اپنی طرف منسوب کیا جو عاد کی تباہی کا موجب ہوئی کیونکہ یہ سب عذاب خدائی مشیّت اور اُس کے ارادہ کے ماتحت آئے تھے اسی طرح اللہ تعالیٰ اِس جگہ قارعہ کو اپنی طرف منسوب کرکے اُس کے نتائج کا اعلان فرماتا ہے کیونکہ یہ قارعہ خدائی پیشگوئیوں کے ماتحت آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہامات کے ذریعہ پہلے سے خبر دے دی تھی کہ

"کئی نشان ظاہر ہوں گے۔ کئی بھاری دشمنوں کے گھر ویران ہو جائیں گے وہ دنیا کو چھوڑ جائیں گے۔ اُن شہروں کو دیکھ کر رونا آئے گا وہ قیامت کے دن ہوں گے۔ زبردست نشانوں کے ساتھ ترقی ہوگی۔" (تذکرہ صفحہ ۶۶۵)

اِن الہامات کے ذریعہ چونکہ اِس عذاب کی خبر پہلے سے دی جا چکی تھی اِس لئے گو ایٹم بم کو ایجاد کرنے والے بندوں کے ہاتھ تھے مگر اُس کو منسوب خدا تعالیٰ کی طرف ہی کیا جائے گا۔ جیسے صحابہؓ کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے کفار کو سزا دلوائی مگر قرآن کریم میں اُسے قارعہ قرار دیا گیا۔ کیونکہ وہ عذاب خدائی سکیم کے ماتحت کفار پر نازل ہوا تھا۔ بہرحال جو بلا اور مصیبت اتفاقی حادثہ نہ ہو بلکہ خدا تعالیٰ کی کسی سکیم اور پیشگوئی کے ماتحت آئے اُس کے لئے قارعہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یہ بتلانے کے لئے کہ اِس قسم کے عذاب کے

جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں اُن کے پیچھے الٰہی مشیت کام کر رہی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اِس آیت میں فرماتا ہے وہ قوم جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ تو راحت و آرام کی زندگی بسر کرے گی لیکن وہ قوم جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہ و برباد کر دی جائیگی جیسے آج اتحادی کہتے ہیں کہ ہمارا پلڑا بھاری ہو گیا اِس لئے ہم جیت گئے اور محوری طاقتیں کہتی ہیں کہ ہمارا پلڑا ہلکا ہو گیا اِس لئے ہم ہار گئے۔ پلڑا بھاری ہونے کے یہ بھی معنے ہیں کہ جن کے جہازوں کا وزن زیادہ ہوگا وہ جیت جائینگے یہ محاورہ اِس زمانہ میں بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور حکومتیں اپنے اعلانات میں ہمیشہ کہتی رہتی ہیں کہ ہمارے جہازوں کی اتنی 'ٹننیج' ہے یعنی اتنا وزن ہے یا اتنے ٹن بم ہماری طرف سے دشمن پر گرائے گئے ہیں۔ بہرحال جن کی 'ٹننیج' زیادہ ہوگی یا جن کے پاس دنیوی سامانوں کی دوسروں کے مقابلہ میں کثرت ہوگی فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ان کو فتح ہوگی اور وہ مزے اُڑائیں گے۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ لیکن جن کی 'ٹننیج' کم ہوگی وہ ہاویہ میں گرائے جائیں گے۔ جیسے جاپان کے بادشاہ نے کہا کہ ہماری شکست کی بڑی وجہ ہمارے سامانوں کی کمی ہے ہٹلر نے بھی یہی کہا کہ سامانوں کی کمی کی وجہ سے ہمیں شکست ہوئی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اِس وقت بہادری اور جسمانی طاقت کا زور نہ رہے گا شکست و فتح کا سارا انحصار اِس زمانہ میں سامانوں کی کثرت اور اُن کی قلت پر آ رہے گا۔ جن کی 'ٹننیج' بڑھ جائے گی وہ جیت جائیں گے اور جن کی 'ٹننیج' کم ہوگی وہ ہار جائیں گے۔

۲ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ سے مراد۔

یہ تو اِس آیت کے ایک معنے ہوئے قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ کے الفاظ اُن لوگوں کی نسبت استعمال کئے جاتے ہیں جن کی نیکیاں زیادہ ہوں اور خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ کے الفاظ اُن لوگوں کی نسبت استعمال ہوتے ہیں جن کی نیکیاں کم ہوں۔ اِس لحاظ سے دوسرے معنے اِس آیت کے یہ ہوں گے کہ جن کی نیکیاں زیادہ ہوں گی وہ جیت جائیں گے اور جن کی نیکیاں کم ہوں گی وہ ہار جائیں گے۔ گویا دو نتائج ظاہر ہوں گے دنیوی مقابلہ کے وقت جن کے پاس دنیوی سامان زیادہ ہوں گے وہ جیت جائیں گے اور جن کے پاس دنیوی سامان کم ہوں گے وہ ہار جائیں گے۔ اور روحانی مقابلہ کے وقت جن کے روحانی کام کام کہلانے کے مستحق ہوں گے وہ جیت جائیں گے اور جن کے روحانی کام کام کہلانے کے مستحق نہیں ہونگے وہ شکست کھا جائیں گے۔ پہلی فتح مادیات کے وزن پر ہوگی اور دوسری فتح روحانیات کے وزن پر ہوگی۔

مَیں نے اِس سورۃ کے شروع میں بتایا تھا کہ اِس میں اسلام کی دوبارہ ترقی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں جب اسلام پر مصیبت اور تکالیف کے دن آئیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے حالات پیدا کر دے گا جن کے نتیجہ میں اسلام کو فتح حاصل ہوگی چنانچہ یہ آیات میرے اِس دعویٰ کی تائید کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس زمانہ میں فساد اور کفر کا غلبہ دیکھ کر تمہیں مایوس نہیں ہونی چاہیئے۔ جب لوگ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ شدید لڑائیاں لڑی جائیں گی اور بڑی بڑی طاقتیں ٹوٹ جائیں گی اُس وقت جہاں ہم دنیوی مقابلہ میں اُن لوگوں کو غلبہ دیں گے جن کے پاس دنیوی سامانوں کی فراوانی ہوگی وہاں روحانی مقابلہ میں ہم اُن لوگوں کی ذرا بھی پروا نہیں کریں گے اور صرف اُن لوگوں کو فتح عطا فرمائینگے جن کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ جب دنیوی مقابلہ میں وہی قوم جیت سکتی ہے جس کے پاس دنیوی سامان زیادہ ہوں تو روحانی مقابلوں میں وہ قوم کس طرح جیت سکتی ہے جس کے پاس روحانی سامان کم ہوں۔ اصول تو آخر دونوں جگہ ایک ہی کارفرما ہوگا۔ جس طرح دنیوی مقابلہ کے وقت میزان کا بھاری ہونا کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح روحانی مقابلہ کے وقت صرف اُسی قوم کو فتح حاصل ہوسکتی ہے

جس کے پاس رُوحانی سامان زیادہ ہوں۔ وہ قوم کبھی فاتح نہیں ہو سکتی جس کے پاس روحانی سامانوں کی قلّت ہو۔ اِس آیت میں گو ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ کے مقابلہ میں خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے پاس وزن تو ہوں گے مگر کم۔ لیکن قرآن کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے پاس کچھ بھی وزن نہیں ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَزْنًا (الکھف ع۱۲) ہم قیامت کے دن اُن کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کرینگے پس چونکہ ایک جماعت کے پاس روحانی سامانوں کی فراوانی ہوگی اور دوسری جماعت کے پاس روحانی سامانوں کا کلیۃً فقدان ہوگا اِس لئے وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی محبت اپنے دل میں رکھتے ہوں گے اور جنہیں اُس کا قرب حاصل ہوگا اُن کا پلڑا تو بھاری ہو جائے گا۔ مگر جن کے وزن بہت کم ہوں گے یا جن کے وزن ہوں گے ہی نہیں اُن کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا گو یا پہلے اُن لوگوں کا پلڑا بھاری ہوگا جو دنیوی سامان اپنے پاس زیادہ رکھتے ہوں گے اور اُن لوگوں کا پلڑا ہلکا ہوگا جو دنیوی سامان اپنے پاس کم رکھتے ہوں گے۔ پھر ہم روحانی جنگ کا نتیجہ ظاہر کریں گے اور وہ بھی اِسی اصول پر۔ یعنی جن کی روحانیت بڑھی ہوگی جو تقویٰ اور خدا ترسی کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہوں، جن کی رات اور دن یہی کوشش ہوگی کہ خدا تعالیٰ کا نام بلند ہو اور اُس کے احکام پر عمل لوگوں کا شیوہ ہو۔ وہ تو فتوحات حاصل کریں گے اور جن کے پاس روحانی سامانوں کی کمی ہوگی یا روحانی سامان کلّی طور پر مفقود ہوں گے وہ خدائی نصرت سے محروم رہیں گے۔ بہرحال اُس وقت دو ہی قسم کے لوگ آرام میں رہیں گے یا تو وہ اقوام جو محنتی اور اور جفاکش اور بڑے سازوسامان والی ہوں گی یا وہ جو خدا تعالیٰ کے نزدیک اُس کی محبوب ہوں گی اور اِس کے بالمقابل جن کے وزن ہلکے ہوں گے یعنی اُن کے پاس سازوسامان نہ ہوگا اُن کی ماں ہاوِیہ ہوگی وہ دُکھ پائیں گے اور دینی لحاظ سے جو خدا تعالیٰ کے محبوب نہ ہوں گے وہ تباہ ہوں گے۔ گو یا پہلے زیادہ سازوسامان والے جیتیں گے اور پھر اُن لوگوں کا پلڑا بھاری ہوگا جن کا روحانی سامانوں کے لحاظ سے کوئی دوسرا شخص مقابلہ نہیں کر سکیگا۔ چونکہ دنیوی فتح سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید اُنہیں خدائی مدد حاصل ہے اِس لئے ثَقُلَتْ اور خَفَّتْ کے الفاظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اِس میں خدائی مدد کا کوئی سوال نہیں۔ ایک کے پاس سامان زیادہ ہوگئے تو وہ جیت گیا اور دوسرے کے پاس سامان کم ہوگئے تو وہ ہار گیا۔ اگر خدائی مدد اُن کے شامل حال ہوتی تو دوسرے مقابلہ میں بھی وہ جیت جاتے مگر دوسرے مقابلہ میں ایسا نہیں ہوگا۔ اِس مقابلہ میں وہ فاتح اقوام جو دنیوی مقابلہ کے وقت اپنے مادی سامانوں کی کثرت کی وجہ سے جیت گئی تھیں بُری طرح شکست کھائیں گی اور کمزور دکھائی دینے والے لوگ اپنے روحانی سامانوں کی کثرت کی وجہ سے فتح حاصل کر لیں گے۔ اِس جگہ گو محاورہ کے طور پر خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مگر درحقیقت مراد یہ ہے کہ اُن کے پاس کوئی وزن ہوگا ہی نہیں۔ جو مقابلہ کے وقت ظاہر کر سکیں۔ کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ لَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَزْنًا۔ بہرحال دنیوی مقابلوں میں وہ قوم جیتے گی جس کے پاس دنیوی سامان زیادہ ہوگا اور روحانی مقابلہ میں وہ قوم جیتے گی جس کے پاس روحانی سامان زیادہ ہوگا۔ یہ دونوں اٹل فیصلے ہیں اِس لئے جب اِن میں سے ایک ظاہر ہو جائے تو تمہیں دوسرے فیصلہ کے متعلق بھی یہ امید رکھنی چاہیئے کہ وہ جلدی ظاہر ہو جائے گا۔

ترقی اور تنزّل کے بنیادی وجوہ کا ذکر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ وہ قوم جس کی میزان ہلکی ہوگی اُس کی کیا حالت ہوگی فرماتا ہے: فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ

اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ کے چند مطالب

اُس کی ماں ہاویہ ہوگی۔ ھَاوِیَۃ کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے تنزّل کے ہوتے ہیں اِس لحاظ سے اِس آیت کا یہ مطلب ہُوا کہ تنزّل کی حالت اُس کی ماں ہوگی یعنی اُس کے اندر تنزّل کا بیج پایا جائے گا جس طرح ماں سے آئندہ نسل کا سلسلہ چلتا ہے اِسی طرح تنزّل صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں ہوگا بلکہ آئندہ نسلوں تک بھی اُس کا اثر پہنچیگا۔ درحقیقت تنزّل دو رنگ کا ہوتا ہے ایک تنزّل کسی قوم یا فرد کی ذات تک محدود رہتا ہے اور ایک تنزّل وہ ہوتا ہے جو بیج کے طور پر آئندہ نسل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ میں اِسی دوسرے تنزّل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح ماں بچے پیدا کرتی ہے اِسی طرح وہ قوم جس کی میزان ہلکی ہوگی اُس کے گرنے کی حالت ترقی کرتی چلی جائے گی یعنی جو قومیں اِس عذاب کے نیچے آئیں گی اُن کا تنزّل شروع ہو جائے گا اور پھر وہ تنزّل بڑھتا چلا جائیگا۔

اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ اُس کی ماں اُس پر روئے گی یعنی وہ قوم بالکل تباہ و برباد ہو جائیگی عربی زبان میں یہ محاورہ ہے کہ کہتے ہیں ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ تیری ماں تجھ کو روئے۔ چونکہ ھَاوِیَۃ کے ایک معنے ثَاکِلَۃ کے بھی ہیں پس اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ کے معنے ہوئے اُس دن اُس کی ماں اُس پر روئے گی یعنی وہ بالکل تباہ ہو جائے گی۔ یُوں تو رونے والے اور بھی ہو سکتے ہیں بیٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ بیٹیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ بیوی بھی ہو سکتی ہے لیکن محاورہ میں صرف ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ کہا جاتا ہے جس میں حکمت یہ ہے کہ ایک موت وہ ہوتی ہے جو طبعی عمر کے بعد آتی ہے اور ایک موت وہ ہوتی ہے جو طبعی عمر سے پہلے آجاتی ہے۔ جب کوئی شخص طبعی عمر پاکر وفات پاتا ہے تو اُس کے ماں باپ پہلے مر چکے ہوتے ہیں اِس لئے وہ اُس پر نہیں رو سکتے اِس پر اُس کے بیوی بچے روتے ہیں۔ لیکن جب کوئی غیر طبعی وفات پائے تو ماں باپ زندہ ہوتے ہیں اور اُنہیں اُس پر رونا پڑتا ہے پس اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگ غیر طبعی موت مرینگے بے وقت کی موت اُن پر آئے گی اور وہ تباہ ہو جائینگے چنانچہ دیکھ لو جاپان کی موت کتنی غیر طبعی ہے۔ جرمنی کی موت کتنی غیر طبعی ہے۔ قوموں کی زندگی دو دو چار چار سَو سال تک ہوتی ہے مگر اِن کی مثال تو بالکل ویسی ہی ہوئی جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ ابھی اپنی ترقی کے خواب ہی دیکھ رہے تھے کہ کچلے گئے پس فرمایا اُن کی ماں اُن کو روئے وہ کیسی غیر طبعی موت مرے ہیں۔

پھر میں نے بتایا تھا کہ اُمّ الدماغ اور اُمّ الرأس اُس جلد کو بھی کہا جاتا ہے جس نے دماغ کو گھیرا ہُوا ہے اِس لحاظ سے اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ ہاویہ اُنہیں چاروں طرف سے گھیرے گی ترقی کا اُنہیں کوئی راستہ نظر نہیں آئے گا ہلاکت ہی ہلاکت اور بربادی ہی بربادی اُن پر چاروں طرف سے مسلّط ہوگی۔ جس طرح اُمّ الدماغ نے دماغ کو چاروں طرف سے ڈھانپا ہُوا ہوتا ہے اِسی طرح ہلاکت اُن کو چاروں طرف سے ڈھانپ لیگی نجات کا کوئی راستہ اُن کے لئے باقی نہیں رہیگا۔

اِس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آتے ہیں اُن کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ بندوں کی اصلاح ہو اور وہ اپنے گناہوں سے باز آجائیں محض انتقام لینا اللہ تعالیٰ کے مدّنظر نہیں ہوتا۔ اِسی حقیقت کو اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ میں بیان کیا گیا ہے یعنی ہاویہ اُن کی ماں ہوگی۔ جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں جاتا اور ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (الزمر ع۱) سے حصہ لیتا ہے اور آخر ترقی پاکر رحمِ مادر سے باہر آتا ہے اِسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی بندوں پر کوئی عذاب نازل ہوتا ہے

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝

اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ (ہاویہ) کیا ہے۔ یہ ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

اُس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے گند دُور ہو جائیں اور وہ عذاب کی ظلمت میں اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں تاکہ آخر میں اُنہیں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے اور وہ اُس کے مقرب بندوں میں شامل ہو جائیں۔

۶ حل لغات۔ حَامِيَةٌ: حَمِيَ سے ہے اور حَمِيَ الشَّيْءَ مِنَ النَّاسِ (يَحْمِيْهِ حَمْيًا وَ حِمْيَةً وَ حِمَايَةً) کے معنے ہوتے ہیں مَنَعَهُ عَنْهُمْ اُس کو اُن سے روکا اور حَمِيَ مِنَ الشَّيْءِ (يَحْمٰى حَمِيَّةً) کے معنے ہوتے ہیں اَنِفَ اَنْ يَفْعَلَهُ اُس نے تکبر کا اظہار کیا۔ اور حَمِيَ الشَّمْسُ وَ النَّارُ حَمْيًا (وَحُمِيًّا وَحُمُوًّا) کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَدَّ حَرُّهَا اُس کی گرمی تیز ہو گئی۔ اور حَمِيَ عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں غَضِبَ وہ اُس پر غضبناک ہوا (اقرب) پس نَارٌ حَامِيَةٌ کے یہ معنے ہوتے کہ وہ ایک ایسی آگ ہوگی جس کی گرمی بے انتہاء ہوگی۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ۔ وہ تباہی اور بربادی جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے تجھے کیا پتہ کہ وہ کیا ہوگی یعنی وہ اس قدر زیادہ ہوگی کہ الفاظ سے تم اُس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے یہ الفاظ بالکل ایٹم بم پر چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ اس بم کے گرنے سے اتنی شدید گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ میلوں میل تک لوگ جھلس کر مر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِس بم کے اثرات کے نتیجہ میں انسانی جسم کی بناوٹ تک بدل جاتی ہے۔ جاپانیوں نے اعلان کیا ہے کہ ایٹم بم کے حادثہ سے جو لوگ مجروح ہوئے تھے ہم نے اُن کا بہت علاج کیا مگر وہ اچھے ہونے میں ہی نہیں آتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے جسم کے خلیے تک بدل گئے ہیں۔ اسوقت ایٹم بم کے اثر سے دو لاکھ آدمی جاپان میں بیمار ہیں جو باوجود ہر قسم کے علاج کے اچھے نہیں ہوئے۔ اِسی طرح ایک سائنسدان نے اپنے اِس خیال کا اظہار کیا ہے کہ چونکہ اُن کے جسم کے خلیے بالکل بدل گئے ہیں اس لئے آئندہ اُن کی نسل سے جو لوگ پیدا ہوں گے ہو سکتا ہے کہ اُن میں سے کسی کی آنکھیں نہ ہوں کسی کے کان نہ ہوں یا کسی کی دس دس آنکھیں ہوں اور پانچ پانچ سر یا چھ چھ بازو ہوں اور چار چار ٹانگیں۔ یا ہاتھ ہوں تو پاؤں نہ ہوں یا پاؤں ہوں تو ہاتھ نہ ہوں یا انسانی نسل کی بجائے کنکھجوروں کی طرح اُن کے ہاں اولاد پیدا ہونے لگ جائے کیونکہ اُن کے جسم کے خلیے بالکل ٹوٹ چکے ہیں اور اب اِن تمام باتوں کا امکان ہے۔ یہ تو ایک سائنسدان کا خیال ہے لیکن اتنا واقعہ خود جاپانیوں نے تسلیم کیا ہے کہ جو لوگ اِس حادثہ سے مجروح ہوئے تھے ہم سمجھتے تھے کہ وہ بیمار ہیں علاج سے تندرست ہو جائیں گے لیکن ہزاروں دواؤں کے باوجود اُن کے جسم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ ایسا تغیر اُن میں واقعہ ہو چکا ہے کہ خواہ اُنہیں کوئی دوائی کھلاؤ کچھ فائدہ ہی نہیں ہوتا۔

اِسی طرح نَارٌ حَامِيَةٌ کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ آگ اُن پر غضب کرنے والی ہوگی۔ نار خود اپنی ذات میں جلانے والی چیز ہے لیکن نار کے ساتھ جب حَامِيَةٌ کا لفظ ملا دیا جائے تو اِس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ آگ اپنی انتہائی شدت کو پہنچ جائے گی۔ پس نَارٌ حَامِيَةٌ کہہ کر اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم اسے معمولی آگ نہ سمجھو وہ ایسی خطرناک ہوگی کہ یوں معلوم ہوگا وہ انتہائی غضب کی حالت میں لوگوں پر حملہ کر رہی ہے۔ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ کے متعلق فرماتا ہے کہ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک ع) وہ ایسی

شدید ہوگی کہ قریب ہوگا غصہ سے پھٹ جائے۔ یہی کیفیت نَارٌحَامِیَۃ میں بیان کی گئی ہے کہ وہ آگ اس دنیا کی آگ کی گرمی سے سینکڑوں ہزاروں گُنے زیادہ گرم ہوگی مَیں نے سینکڑوں ہزاروں گُنے کے الفاظ استعمال کئے ہیں حالانکہ حدیث میں ستّر کا لفظ ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں سات اور ستّر مبالغہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ سات یا ستّر سے سات یا ستّر کے معنے مراد نہیں ہوتے بلکہ بے انتہاء زیادہ کے معنے مراد ہوتے ہیں اِسی وجہ سے جب بہت زیادتی کی طرف اشارہ کرنا ہو تو اکثر سات یا ستّر کا لفظ آتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زیادتی صرف سات یا ستّر گُنے نہیں ہوتی پس اصل میں صرف بہت زیادہ کا مفہوم بتانا مقصود ہوتا ہے۔

غرض اَلْقَارِعَۃ وہ عذاب ہے جو موجودہ زمانہ میں ایٹم بم کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ اور جس کے ہولناک نتائج آج دنیا پر ظاہر ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی کیا ہے ابھی تو صرف ایک قدم اٹھایا گیا ہے پھر اَور ایجادات ہوں گی پھر اَور ہوں گی یہاں تک کہ انہی ایجادات کی لپیٹ میں یوروپین اقوام اپنے آپ کو تباہ کرلیں گی۔ سَو سُنار کی اور ایک لوہار کی ضرب المثل کے ماتحت آخری حملہ خدا تعالٰے کا ہوگا اور جن لوگوں کے اعمال کو حقیقی وزن حاصل ہوگا وہ جیت جائیں گے اور دنیا پر اُن کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا۔

سُوْرَۃُ التَّکَاثُرِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ تکاثر - یہ مکی سورۃ ہے[1]

وَهِيَ ثَمَانِي اٰيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

[1] یہ سورۃ جمہور کے نزدیک مکی ہے مگر امام بخاری نے اس سے اختلاف کیا ہے وہ اِسے مدنی قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے مستشرقین بھی اِسے ابتدائی مکی سورتوں میں سے قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سورۃ مکی ہی ہے کیونکہ اِس میں سابق مکی سورتوں کی طرح کی پیشگوئیاں ہیں۔ صرف مال کا ذکر ہونے کی وجہ سے اِسے مدنی نہیں کہہ سکتے کیونکہ مکہ والوں کے پاس بھی اپنی ملکی دولت کے مطابق مال تھا اور اِس میں کافروں کے مال ہی کا ذکر ہے۔

اِس سورۃ کا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں تمام جماعت اُسے کفر کا ذکر کر کے بتایا گیا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے اپنے زمانہ میں بھی اصلاح فرمائیں گے اور آئندہ زمانہ میں بھی۔ خصوصاً پچھلی دو سورتوں میں اُن عذابوں کا ذکر تھا جو کفر کی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا آپ کے بعد کے زمانہ میں آنے والے تھے۔ اب اِس سورۃ میں کفر اور خدا تعالیٰ سے دُوری کی وجہ بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کیوں انسان میں کفر پیدا ہوتا ہے۔ کیوں اُسے خدا تعالیٰ سے بُعد ہوتا ہے اور کیوں لوگ باوجود نبیوں کے ذریعہ حق پالینے کے آخر دین سے دُور چلے جاتے ہیں۔

اِس سورۃ کے متعلق حاکم اور بیہقی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالُوْا وَمَنْ يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (فتح البیان) یعنی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا کیا تم میں سے کوئی شخص یہ طاقت نہیں رکھتا یعنی کیوں ایسا نہیں کرتا کہ وہ ہزار آیتیں روزانہ پڑھ لیا کرے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ طاقت کس انسان کو حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ ہزار آیات روز پڑھ سکے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی شخص یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ روزانہ پڑھ لیا کرے۔ اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۂ تکاثر کو ہزار آیات کے برابر بتایا ہے۔ اِسی طرح حضرت عمرؓ سے روایت ہے قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَاَ فِيْ لَيْلَةٍ اَلْفَ اٰيَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ ضَاحِكٌ فِيْ وَجْهِهٖ. قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّقْوٰى عَلٰى اَلْفِ اٰيَةٍ فَقَرَاَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ اِلٰى اٰخِرِهَا ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهَا لَتَعْدِلُ اَلْفَ اٰيَةٍ. اَخْرَجَهُ الْخَطِيْبُ فِي الْمُتَّفَقِ وَالْمُفْتَرَقِ وَالدَّيْلَمِيُّ (فتح البیان) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص روزانہ رات کو ہزار آیات پڑھ لیا کرے وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ خدا اُسے دیکھ کر خوش ہوگا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ طاقت کس انسان کو حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ ہزار آیات روزانہ پڑھا کرے۔ اس پر آپ نے سورۂ تکاثر کی تلاوت شروع کر دی یہانتک کہ آپ اِس کے آخر تک

سورۃ تکاثر مکی ہے

سورۂ تکاثر کا تعلق پہلی سورتوں سے

۲۴۱ سورۂ تکاثر ہزار آیات کے برابر

پہنچ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس
کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ یہ سورۃ ہزار آیات کے برابر
ہے (یہ روایت خطیب اور دیلمی دونوں نے نقل کی ہے)

سورۃ تکاثر کو ہزار آیات کے برابر قرار دینے کی وجہ

اِن احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دو قسم کے زمانے
ہوتے ہیں اور دو قسم کے تکاثر ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ میں
ایسا تکاثر ہوتا ہے جو قومی زندگی کا موجب ہو جاتا ہے اور
دوسرے زمانہ میں ایسا تکاثر ہوتا ہے جو قومی تباہی کا موجب
ہو جاتا ہے۔ چونکہ اِس سورۃ میں اُس تکاثر کا ذکر کیا گیا ہے
جو قومی تباہی کا موجب ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص نصیحت
حاصل کرنا چاہے تو وہ اِس سورۃ کے مطالب پر عمل پیرا
ہو کر اِس تباہی سے محفوظ رہ سکتا ہے اِس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اسے ہزار آیات کا قائم مقام قرار دیا ہے۔

اِس جگہ ہزار آیات سے قرآن کریم کا چھٹا حصہ مراد
نہیں (کیونکہ سارے قرآن کی قریباً چھ ہزار آیات ہیں)
بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو غرض قرآن ہے وہ اِس سورۃ میں بیان
کر دی گئی ہے کیونکہ عربی زبان میں ہزار سے صرف ہزار کا عدد
مراد نہیں ہوتا بلکہ اَن گنت اور بے انتہاء چیز کے لئے بھی
یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اَن گنت اور بے انتہاء فائدہ
اِنسان اُسی وقت اُٹھا سکتا ہے جب وہ اُس غرض کو سمجھ جائے
جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت قائم کیا ہے
اور جس کو پورا کرنے کے لئے آدمؑ سے لے کر وہ اپنے مامورین
دنیا کی اصلاح کے لئے بھجواتا رہا ہے پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کا یہ فرمانا کہ یہ سورۃ ہزار آیات کے برابر ہے اِس کا مفہوم یہ
ہے کہ اگر تم اِس سورۃ پر غور کرو اور اِس کے مطالب کو ہمیشہ
اپنے مدنظر رکھو تو تمہارے متعلق یہ کہا جاسکے گا کہ تم نے
اِس سورۃ سے وہ فائدہ اُٹھا لیا جو سارے نبیوں کی بعثت
کی اصل غرض ہے۔ نبیوں کی بعثت کی غرض یہ ہوتی ہے کہ
دنیا کی محبت لوگوں کے دلوں سے نکال دیں اور اللہ تعالیٰ
کا عشق اُن میں پیدا کریں۔ پس جب کوئی شخص اِس سورۃ پر
غور کرے گا اور حالتِ سیئہ سے لوٹ کر حالتِ طیبہ کی طرف
آئے گا تو لازماً وہ اُس مقصد کو حاصل کرے گا جس کے لئے
قرآن کریم نازل ہوا اور جس کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ
نے ابتدائے عالم سے سلسلۂ نبوت قائم فرمایا ہے۔ حضرت
مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنی کتابوں اور تقریروں
میں اِس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ انبیاء کی بعثت کی اصل
غرض یہ ہوتی ہے کہ دنیا کی محبت سرد کر کے خدا تعالیٰ
کی محبت لوگوں کے قلوب میں پیدا کریں۔ پس سورۃ تکاثر
نبوت کی اصل غرض بیان کرنے والی سورۃ ہے اور جو شخص
اِس سورۃ کے مطالب کو اپنے مدنظر رکھتا ہے وہ اپنی حالت
کو نبیوں کی حالت کے مشابہ بنا لیتا ہے۔

سورۃ تکاثر کے متعلق ایک روایت

اِس سورۃ کے مضمون کے متعلق بعض اَور بھی روایات
ہیں چنانچہ عبد اللہ بن شخیرؓ بیان کرتے ہیں اِنْتَهَيْتُ إِلَى
رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقْرَأُ
اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ وَفِيْ لَفْظٍ وَقَدْ اُنْزِلَتْ عَلَيْهِ
اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ وَهُوَ يَقُوْلُ. يَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ
مَالِيْ مَالِيْ وَهَلْ لَّكَ مِنْ مَّالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ
فَأَفْنَيْتَ (یہ روایت مسلم، ترمذی اور نسائی تینوں میں آتی
ہے) یعنی میں ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہوا تو آپ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ رہے تھے۔
ایک دوسری روایت میں یہ ذکر آتا ہے کہ قَدْ اُنْزِلَتْ
عَلَيْهِ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ آپ پر اِس وقت سورۃ تکاثر
نازل ہوئی تھی (غالباً اسی روایت سے متاثر ہو کر امام بخاریؒ
نے اِس سورۃ کو مدنی قرار دیا ہے) اور آپ فرما رہے تھے کہ
ابن آدم کہتا ہے۔ ہائے میرا مال۔ ہائے میرا مال۔ اِس کے
بعد آپ نے اپنے دماغ میں ایسے انسان کا خیالی وجود مستحضر
کرتے ہوئے فرمایا وَهَلْ لَّكَ مِنْ مَّالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ
فَأَفْنَيْتَ۔ اے اِس قسم کے انسان! کیا اِس کے سوا
تیرا اَور بھی کوئی مال ہے جو تُو نے کھایا اور ضائع کر دیا یعنی تجھے
اُسی مال سے تعلق ہے جو تُو نے کھا لیا۔ اور جو تُو نے کھایا
وہ باقی تو رہا نہیں۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یہ روایت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○

تم کو ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش نے غفلت میں ڈال دیا[1] اور تم اسی طرح غافل رہو گے یہانتک کہ تم مقبروں میں جا پہنچو گے[2]

نقل کی ہے مگر اس میں یہ ذکر نہیں آتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ رہے تھے یا یہ کہ سورۃ تکاثر اُس وقت آپ پر نازل ہوئی تھی۔ اس حدیث کے الفاظ لمبے ہیں۔

۲ حل لغات۔ اَلْهَاهُ اللَّعِبُ عَنْ كَذَا کے معنے ہوتے ہیں شَغَلَهٗ۔ لہو ولعب نے اُسکو دوسری طرف مشغول کر دیا (اقرب) گویا جب کوئی چیز انسان کی توجہ کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف پھیر دے تو عربی زبان میں اُس کے لئے اَلْهٰى کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اَلتَّكَاثُرُ کثرت سے نکلا ہے اور اس کے معنے کثرت میں مقابلہ کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ تَكَاثَرَ الْقَوْمُ کے معنے ہوتے ہیں كَثُرُوْا وَ تَغَالَبُوْا فِي الْكَثْرَةِ۔ قوم زیادہ ہوگئی۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں اُس نے اپنی کثرت پر فخر کیا اور کہا کہ ہم تم سے زیادہ ہیں (اقرب) اسی طرح مفردات میں لکھا ہے اَلْهٰىكُمْ اَیْ شَغَلَكُمُ التَّبَارِيْ فِي كَثْرَةِ الْمَالِ وَالْعِزِّ۔ تکاثر کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے کا مقابلہ مال اور عزت کی کثرت میں کرنا یعنی یہ کہنا کہ ہمارا مال زیادہ ہے یا ہماری عزت زیادہ ہے تم ہمارے مقابلہ میں حیثیت ہی کیا رکھتے ہو پس اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ کے معنے یہ ہوئے کہ تم کو ایک دوسرے سے مال، عزت اور تعداد میں زیادہ ہونے کے فخر نے غافل کر دیا ہے یا بعض دوسری چیزوں سے تمہاری توجہ ہٹا کر اپنی طرف پھیر لیا ہے۔

تفسیر۔ محاورہ زبان میں ہمیشہ اَلْهٰى کے بعد عَنْ آتا ہے یعنی اَلْهَاهُ عَنْ كَذَا۔ اسی طرح تکاثر کے بعد فِیْ آتا ہے یعنی جس چیز کے بارہ میں فخر ہو اس سے پہلے فِیْ آتا ہے۔ اور جس چیز سے کوئی چیز غافل کر دے اُس سے پہلے عَنْ آتا ہے۔ مگر قرآن کریم نے دونوں صلوں کو چھوڑ دیا ہے یعنی اُس نے نہ تو یہ کہا ہے کہ تم کو تکاثر نے کسی چیز سے غافل کر دیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ تمہیں اپنی کسی چیز کی کثرت سے مغرور بنا دیا ہے۔ درحقیقت دونوں صلوں کو چھوڑ دینے سے ایک بہت بڑا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ (۱) اگر اُس چیز کا بھی ذکر کر دیا جاتا جس سے تکاثر نے اُن کو غافل کر دیا تھا تو مضمون محدود ہو جاتا اور اس اجمال میں جو فصاحت پائی جاتی ہے وہ جاتی رہتی کیونکہ تکاثر کسی ایک نیک بات سے نہیں بلکہ ہر نیک بات سے انسان کو غافل کر دیتا ہے۔ تکاثر کے معنے ہوتے ہیں ذاتیات کا غلبہ۔ آخر دنیا میں کیوں ایک انسان دوسرے پر فخر کرتا ہے اسی لئے کہ بجائے اللہ تعالیٰ کا فضل دیکھنے کے وہ اپنی ذات کی بڑائی دیکھنے لگ جاتا ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اگر اُس میں کوئی خوبی پائی جاتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ اگر اُس میں کوئی کمال پایا جاتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اُس کی نگاہ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے صرف ذاتی بڑائی کو اپنے سامنے رکھ لیتی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ اُس نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنے زور بازو سے حاصل کیا ہے۔ پس دوسروں پر فخر کرنے کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے سامنے صرف اُس کی ذاتی بڑائی رہ جاتی ہے خدا تعالیٰ کا فضل جو تمام ترقیات کا اصل باعث ہوتا ہے اُسے بھول جاتا ہے۔

(حاشیہ: اَلْهٰىكُمْ — تَكَاثُرُ — اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ کے بہت مطالب)

احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک بڑائی بیان کی اور پھر فرمایا میں کوئی فخر نہیں کرتا کیونکہ مجھے یہ خوبی محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مومن باوجود بڑائی حاصل ہونے کے تفاخر سے کام نہیں لیتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو چیز میرے لئے موجب فخر ہے وہ مجھے خود بخود حاصل نہیں ہوئی بلکہ میرے اللہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے لیکن غیر مومن ایسا نہیں کرتا۔ اس لئے جب کسی انسان کے اندر تکاثر پیدا ہوگا اور وہ اپنی کثرت پر فخر کرے گا یا اپنی عزت پر فخر کرے گا یا اپنے مال پر فخر کرے گا یا اپنی طاقت پر فخر کرے گا تو لازمی طور پر خدا تعالیٰ کا وجود اُس کی نظر سے اوجھل ہو جائے گا اور وہ سمجھے گا کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔ پس تکاثر کی وجہ سے ایک تو خدا تعالیٰ کے فضل انسانی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں پھر اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی ذات بھی اوجھل ہو جاتی ہے۔ جو شخص شور مچا رہا ہو۔ کہ میں بڑا۔ میں بڑا۔ اُسے لازمی طور پر اپنے سے بڑا اور کوئی وجود نظر ہی نہیں آتا ورنہ کیا سورج کے سامنے کھڑے ہو کر بھی کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ دیکھو میرا دیا کتنا روشن ہے؟ رات کے وقت تو لوگ بے شک اپنے لیمپ کی روشنی پر فخر کر سکتے ہیں مگر دن کو نہیں۔ اور اگر کوئی دن کے وقت بھی اپنے دیئے پر فخر کرتا ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ سورج اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہے ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ سورج بھی اُسے نظر آتا اور وہ اپنے دیئے پر بھی فخر کر سکتا۔ اسی طرح جب کوئی شخص اپنی ذات کو دنیا میں بڑا دیکھتا ہے تو اس کا سوائے اس کے اور کوئی مفہوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اُس کی نگاہ سے اوجھل ہو چکا ہے۔ گویا تکاثر کے نتیجہ میں اوّل موجباتِ فخر یعنی صفاتِ الٰہیہ اُس کی نظر سے اوجھل ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ کی ذات بھی اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے پس اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے معنے یہ ہوئے کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ عَنْ صِفَاتِ اللّٰهِ وَعَنِ اللّٰهِ۔ تمہیں تکاثر نے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اُس کی ذات دونوں سے غافل کر دیا ہے۔

پھر دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے فضل نازل ہوتے ہیں سب ملائکہ کے ذریعہ نازل ہوتے ہیں۔ ملائکہ انسان کی ترقی اور اُس کو بلند شان تک پہنچانے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہیں اور انسان کا فرض ہے کہ اس توسط کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دے لیکن جب کوئی شخص اپنی ذات پر فخر کرتا ہے تو نہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات اور اُس کی ذات کو بھول جاتا ہے بلکہ وہ اس بات کو بھی فراموش کر دیتا ہے کہ میری عزت یا دولت یا شہرت کے حصول میں محض میری ذاتی کوششوں کا دخل نہیں بلکہ اُن ملائکہ کا بھی دخل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی کامیابی کے سامان مہیا کرتے ہیں۔

پھر جب بھی کسی کو بڑائی حاصل ہوتی ہے ہمیشہ اضافی طور پر ہوتی ہے غیر اضافی طور پر ہمیں دنیا میں کوئی شخص بڑا نظر نہیں آتا۔ یہ ایک بہت بڑا نکتہ ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے مگر بعض بے وقوف اِس کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم بھی عجیب کتاب ہے کہ اُس میں کسی جگہ پر تو یہ ذکر آتا ہے کہ فلاں سے بڑا کوئی نہیں اور بعض جگہ کسی اَور کو بڑا قرار دے دیا گیا ہے۔ کوئی ایک تو بڑا ہو سکتا ہے مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ سب لوگ بڑے ہوں۔ وہ نادان یہ نہیں جانتے کہ اِس اعتراض سے خود اُن کی اپنی حماقت کا ثبوت ملتا ہے۔ ورنہ قرآن کریم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سراسر حکمت اور دانائی پر مشتمل ہے۔ اُس کا منشاء یہ ہے کہ دنیا میں اگر تمہیں کوئی بڑا نظر آتا ہے تو اُس کی بڑائی محض اضافی ہے غیر اضافی نہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو جزئیات کا علم کامل نہیں۔ ایک قوم دنیا میں بڑھتی اور ترقی کرتی ہے تو وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ میں نے بہت بڑا کمال حاصل کر لیا۔ اتنا بڑا کمال کہ مجھ سے پہلے شاید ہی

کسی قوم نے حاصل کیا ہو۔ اِسی بنا پر وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتی اور اپنے مقابلہ میں دنیا کی تمام اقوام کو حقیر اور ذلیل خیال کرنے لگتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ جب گذشتہ تاریخی واقعات منکشف ہوتے ہیں تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی اِس قسم کے کمالات رکھنے والے لوگ دنیا میں پائے جاتے تھے۔ بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق آج سے پچاس سال پہلے یورپ اِسی اَمر کا مدعی تھا کہ ہم اِن چیزوں کے موجد ہیں مگر آج یورپ تسلیم کرتا ہے کہ ہم سے پہلے یہ چیزیں دنیا میں موجود تھیں۔ پھر جن زمانوں کی تاریخ کلیۃً مٹ چکی ہے نامعلوم اُن میں کتنی بڑی ایجادات ہو چکی تھیں اور جو تاریخ آئندہ مٹ جائے گی ہم نہیں کہہ سکتے کہ اِس کے بعد دنیا کی کیا صورت ہو جائے گی اور وہ کن کن اُمور پر بے جا فخر کرنے لگ جائیں گی۔

مَیں انگریزوں کی سرجری سے بڑا متأثر تھا اور مَیں سمجھتا تھا کہ انہوں نے اِس فن میں خوب ترقی کی ہے مگر ایک دن جب کہ مَیں بقراط کا ایک چھوٹا سا رسالہ سرجری کے متعلق پڑھ رہا تھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مَیں نے دیکھا کہ بقراط نے اِس رسالہ میں یہ بحثیں کی ہیں کہ مَیں نے گُردوں کے اِتنے اپریشن کئے ہیں اور فلاں عضو کے اِتنے اپریشن کئے ہیں۔ پھر اُس نے اُن آلات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ اُس نے یہ باریک در باریک اپریشن کئے۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرجری اِس سے پہلے بھی دنیا میں ترقی یافتہ صورت میں موجود تھی۔ پہلے بھی اپریشن کئے جاتے تھے۔ پہلے بھی مختلف قسم کے آلات ایجاد ہو چکے تھے اور پہلے بھی لوگ اِن فنون میں مہارت رکھتے تھے مگر پھر ایک زمانہ ایسا آیا جب یہ علوم دنیا سے مٹ گئے اِس لئے کئی ایسی ایجادات جو درحقیقت مسلمانوں کی تھیں اُن کے متعلق آج یورپ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے موجد ہیں حالانکہ وہ اُن کے مُوجد نہیں بلکہ اُن کے موجد مسلمان لوگ ہیں۔ اِسی طرح جراثیم کا علم موجودہ زمانہ کی جتنی تحقیق کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اِس سے پہلے دنیا کو جراثیم کا علم نہیں تھا لیکن ایک یوروپین مصنّف نے اپنی ایک کتاب میں اِس بات پر بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ جراثیم کا علم دنیا میں پہلے موجود نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُنہوں نے اِس علم کی تحقیق کی اور وہ تحقیق کرتے کرتے اِس کی آخری حد تک پہنچ گئے مگر چونکہ اُن کے پاس خورد بین نہیں تھی اِس لئے وہ نام نہیں رکھ سکے ورنہ باقی سب کیفیتیں جو جراثیم کے متعلق ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہیں اُنہوں نے دریافت کر لی تھیں۔ چنانچہ اُس نے مثال دی ہے کہ جب دارالسلام (بغداد) کی بنیاد رکھی جانے لگی تو بادشاہ نے ایک طبیب کو اِس غرض کے لئے مقرر کیا کہ وہ مشورہ دے کہ دارالسلام کی بنیاد کس مقام پر رکھی جائے۔ وہ لکھتا ہے بادشاہ کا ایک طبیب مقرر کرنا اور اُس سے یہ مشورہ حاصل کرنا کہ دارالسلام کی بنیاد کہاں رکھی جائے بتاتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو طب کا اِس قدر علم تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ شہر کی بنیاد کا تعلق بھی طب سے ہے۔ چنانچہ طبیب مقرر ہُوا اور اُس نے حکم دیا کہ بکرے ذبح کر کے تمام علاقوں میں مختلف جگہوں پر اُن کے ٹکڑے رکھ دئے جائیں۔ کئی دنوں کے بعد اُس نے تمام ٹکڑوں کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ اُن کی کیا حالت ہے آخر اُس نے بادشاہ کے پاس رپورٹ کی کہ آپ فلاں جگہ قلعہ شاہی بنائیں۔ فلاں جگہ چھاؤنی تیار کریں اور فلاں جگہ لوگوں کے لئے رہائشی مکانات تیار کرائیں کیونکہ اِن مقامات پر بکروں کا گوشت یا تو کم سڑا ہے یا بالکل ہی نہیں سڑا۔ اور فلاں فلاں مقامات پر اُس میں زیادہ تعفّن پیدا ہُوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات پر گوشت زیادہ سڑا ہے وہاں کی ہوا میں عفونت زیادہ ہے اور جن مقامات پر گوشت میں سڑاند پیدا نہیں ہوئی یا بہت ہی کم پیدا ہوئی ہے وہاں کی ہوا زیادہ صاف ہے۔ اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ یوروپین مصنّف لکھتا ہے کہ یہ

مختلف علوم میں مسلمانوں کی ایجادات

یہ حقیقت روشن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ آج سے سینکڑوں سال قبل مسلمانوں کو بکٹیریا کا علم حاصل تھا ہم نے صرف خوردبین کے ذریعہ اُس کو پکڑ لیا ہے ورنہ جہاں تک علمی تحقیق کا سوال ہے مسلمانوں نے بھی اِس کا پتہ لگا لیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہوا کی صفائی کا تعلق بعض غیر مرئی چیزوں کے ساتھ ہے جس جگہ وہ ہوتی ہیں وہاں تعفن پیدا ہو جانے سے انسانی صحت خراب ہو جاتی ہے اور جہاں نہیں ہوتیں وہاں انسان کی صحت اچھی رہتی ہے۔ پس یہ علم وہ ہے جسکی مسلمانوں نے داغ بیل ڈالی اور اپنے زمانہ میں اُنہوں نے اِس سے فائدہ بھی اُٹھایا مگر پھر اُن کی اپنی نسلیں بھی بھول گئیں اور باقی دنیا کو بھی یاد نہ رہا کہ اِس علم کا کون موجد تھا۔ چنانچہ آج جب یوروپین محققین نے جراثیم کا علم دریافت کیا تو اُنہوں نے یہ خیال کرنا شروع کر دیا کہ اِس علم کے اوّلین موجد ہم ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اِس سے پہلے یہ علم حاصل کر چکے تھے۔

پس جب بھی کوئی فخر کرتا ہے وہ اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ اُس سے پہلے بھی دنیا میں بہت لوگ گذر چکے ہیں اور وہ اپنے اپنے زمانوں میں بڑی شہرت کے مالک رہے ہیں میرے لئے فخر کا کون سا مقام ہے۔ پس تکاثر سے کام لینے والا صرف خدا تعالےٰ کی صفات کو نظر انداز نہیں کرتا اُس کی ذات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اُس کے ملائکہ کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ دنیا کے سابق علوم اور سابق ایجادات سے بھی انکار کر دیتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے باپ دادا تو محض جاہل تھے کمال صرف اُسی کو حاصل ہُوا ہے۔ پس تکاثر کا ایک نتیجہ واقعات کے انکار کی صورت میں رُونما ہوتا ہے۔ پھر اُس کے نتیجہ میں تکبّر بھی پیدا ہوتا ہے اور غرباء پر ظلم شروع ہو جاتا ہے۔ بجائے اِس کے کہ انسان کا ذہن اِس طرف جائے کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے اِس لئے مال دیا ہے کہ میں غریبوں کی خدمت کروں اُس کا ذہن اِس طرف چلا جاتا ہے کہ مَیں بڑا ہوں میرا کام یہ ہے کہ میں دوسروں سے خدمت لوں اور دوسروں کا کام یہ ہے کہ وہ میری غلامی اختیار کریں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ تمام اخلاقِ فاضلہ اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ پس چونکہ بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن سے تکاثر نے انسان کو محروم کر دینا تھا اِس لئے اگر یہ کہا جاتا کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنِ اللّٰہِ یا کہا جاتا اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنْ صِفَاتِ اللّٰہِ یا کہا جاتا اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنْ مَلٰٓئِکَۃِ اللّٰہِ یا کہا جاتا اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنْ اَنْبِیَاءِ اللّٰہِ یا کہا جاتا اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنِ الْاَخْلَاقِ یا کہا جاتا اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنِ الْعِبَادَاتِ یا کہا جاتا اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ عَنِ التَّارِیْخِ تو ایک لمبا مضمون بن جاتا اور پھر بھی اپنے بیان میں ناقص اور ناتمام ہی رہتا اِس لئے اللہ تعالےٰ نے اِس آیت کو مجمل الفاظ میں بیان کیا اور اَلْھٰی کے بعد عَنْ کا ذکر نہیں کیا یعنی یہ بیان نہیں کیا کہ تمہیں تکاثر نے کس چیز سے غافل کر دیا ہے تاکہ تمام وہ چیزیں جن سے تکاثر نے غافل کر دیا یا جن سے تکاثر غافل کر سکتا ہے وہ ایک ایک کر کے انسان کے ذہن میں آجائیں اور وہ اِس مضمون سے زیادہ سے زیادہ سبق حاصل کرے۔ غرض اِس ابہام میں یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالےٰ لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ جتنی باتوں سے تکاثر انسان کو غافل کر دیا کرتا ہے وُہ سب کی سب باتیں اِس آیت میں شامل ہیں اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ تم کسی ایک نیکی سے نہیں بلکہ سب کی سب نیکیوں سے اِس رُوحِ مفاخرت کی وجہ سے محروم ہو گئے ہو۔ پس عَنْ کے چھوڑ دینے کی وجہ سے اِس مضمون کو نہایت وسیع اور شاندار بنا دیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا صلہ فِیْ کا چھوڑا گیا ہے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تم کس چیز میں اپنی بڑائی بیان کرتے ہو اور بڑائی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اِس ابہام میں بھی یہ فائدہ مدنظر رکھا گیا ہے کہ کفار جہاں تک دنیوی طاقت کا سوال ہے ہر بات میں

مسلمانوں سے زیادہ تھے۔ وہ اپنی تعداد پر بھی فخر کرتے تھے اپنی تجارت پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنے وسیع تعلقات پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنے جمع کردہ اموال کی کثرت پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنے نوجوانوں کی جنگی مہارت پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنی اعلیٰ سواریوں پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنے مسحور کر دینے والے شعراء پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنے گرما دینے والے خطیبوں پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنے عقل و دانش میں مشہور بوڑھوں پر بھی فخر کرتے تھے۔ قومی جذبات سے معمور سینوں والی ماؤں پر بھی فخر کرتے تھے۔ قوم کی عزت پر مر مٹنے والے سپاہیوں پر بھی فخر کرتے تھے اور اسی طرح اور بہت سے امور میں مسلمانوں کو اپنے سے ادنیٰ اور کمزور قرار دے کر اُن کی تحقیر کرتے تھے اور اُن کے دعاوی کو غیر معقول اور بے ثبوت و دلیل دعاوی قرار دیتے تھے۔ قرآن کریم جہاں تک اُن کے ہر امر میں زیادہ ہونے کا سوال ہے اُن کے دعوے کو ردّ نہیں کرتا۔ وہ مانتا ہے کہ عدد میں، مال میں، سامانوں میں جتھا بندی میں تم زیادہ ہو۔ لیکن صرف اتنا کہتا ہے کہ ان چیزوں کی زیادتی نے تم کو اخلاقِ فاضلہ اور دین کی محروم کر دیا ہے۔ اور انسان مال اور دولت سے نہیں جیتا کرتا بلکہ اخلاق و انکسار سے جیتا کرتا ہے۔ پس یہ زیادتیاں اور بڑھوتیاں تمہارے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہیں کیونکہ سامان کم ہوتے تو تم اپنی ترقی کے لئے کوشش کرتے اب سامانوں کی فراوانی نے تم کو سست اور غافل بنا دیا ہے اور اُن اخلاق کے کمانے سے محروم کر دیا ہے جن کو کمائے بغیر انسان کو پائدار دولت حاصل نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے یہ دولت تم کو نجات نہ دلائے گی بلکہ تمہاری تباہی کا موجب ہوگی۔ گرتے ہوئے سوار ایک بچے سے بھی کمزور ہوتے ہیں اور بوسیدہ عمارت ایک جھونپڑی سے بھی بے قیمت ہوتی ہے۔

بعض روایات میں اس وسیع المطالب سورۃ کے مضامین کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ کلبی کہتے ہیں کہ بنو عبد مناف اور بنو سہم کے درمیان بحث ہوئی کہ اسلام میں کون زیادہ معزز ہے۔ چنانچہ بنو عبد مناف اور بنو سہم دونوں نے پہلے اپنے اپنے زندہ سردار اور لیڈر اور جرنیل گنانے شروع کئے۔ بنو عبد مناف نے کہا کہ ہم میں اتنے سردار ہیں، اتنے قاضی ہیں، اتنے جرنیل ہیں اور اتنے لیڈر ہیں اور بنو سہم نے اپنے سردار اور قاضی اور لیڈر اور جرنیل گنائے آخر بنو عبد مناف بڑھ گئے۔ جب بنو سہم نے دیکھا کہ یہ لوگ زندوں کا مقابلہ کرنے میں ہم سے جیت گئے ہیں تو انہوں نے کہا آؤ ہم سے مُردوں میں مقابلہ کر لو۔ دیکھو کہ ہم میں سے زیادہ لوگ اسلام کے لئے قربان ہوئے یا تم میں سے زیادہ لوگوں نے اسلام کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ چنانچہ بنو عبد مناف اور بنو سہم دونوں مقبروں میں گئے اور انہوں نے اپنے اپنے مُردے گنانے شروع کئے کہ ہم میں سے اتنے لوگوں کو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنیکا شرف حاصل ہوا ہے اور تم میں سے اتنے لوگوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ تمہیں تکاثر نے اس حد تک غافل کر دیا ہے کہ تم قبروں میں گئے اور تم نے مُردے گنانے شروع کر دئے۔ اس روایت کے برخلاف ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ انصار کے دو قبائل بنو حارثہ اور بنو الحرث نے یہ مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے پہلے اپنے زندہ لیڈر گنوائے اور پھر مُردے۔ لیکن مقاتل اور قتادہ کے نزدیک یہاں نہ بنو عبد مناف اور بنو سہم کا ذکر ہے نہ بنو حارثہ اور بنو الحرث کا۔ بلکہ یہاں یہود کا ذکر ہے۔ ان روایات کے تشتت اور اختلاف سے ہی پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی قطعی بات ثابت نہیں۔ اگر ثابت ہوتی تو یہ تین الگ الگ قسم کی روایات کیوں آتیں۔ کیونکہ بعض کا ذہن انصار کی طرف چلا جاتا بعض کا یہود کی طرف اور بعض کا بنو عبد مناف اور بنو سہم کی طرف۔ یہ کہنا کہ اس سورۃ کا شان نزول یہی ہے اس کا مطلب جیسا کہ میں نے بارہا بتایا ہے صرف اتنا ہے کہ اس واقعہ پر بھی یہ سورۃ چسپاں ہوتی ہے نہ یہ کہ اس

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے معانی کو محدود کرنے کی کوشش

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ میں ماضی کے صیغے استعمال کرنے کی وجہ

واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ کو نازل فرمایا۔ ممکن ہے بعض دفعہ بنو حارثہ اور بنو الحرث کا آپس میں اِس طرح مقابلہ ہوا ہو اور کسی نے کہا ہو کہ تمہاری تو وہی حالت ہے جو اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ میں بیان کی گئی ہے یا کبھی بنو عبد مناف اور بنو سہیم میں مقابلہ ہوا ہو اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی کہہ دیا ہو کہ تم یہ کیا لغو حرکت کر رہے ہو تمہاری تو وہی مثال ہے جو اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ میں بیان ہوئی ہے۔ مگر اِس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ یہ سورۃ اُن کے لئے نازل ہوئی تھی کیونکہ قرآن کریم نبوّتِ حقّہ کے قیام اور اسلام کے استحکام کے لئے آیا ہے بنو حارثہ اور بنو الحرث یا بنو عبد مناف اور بنو سہیم کے جھگڑوں کے قصّے بیان کرنے کے لئے نہیں آیا۔ ہاں مثال کے طور پر اگر کوئی جھگڑا ہو تو اُس پر اِس آیت کو چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہم کبھی بازار جائیں اور دیکھیں کہ ایک دوکاندار دوسرے سے لڑ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے مقابلہ میں تیری حیثیت ہی کیا ہے۔ میرے پاس بھینس ہے، میرے پاس گھوڑا ہے، میرے پاس مکان ہے، میرے پاس زمین ہے اور تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔ اُس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ تم یہ کیا لغو حرکت کر رہے ہو تمہیں تو تکاثر نے اعلیٰ اخلاق سے بالکل محروم کر دیا ہے۔ ہمارے اِس قول کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ یہ سورۃ صرف تمہارے لئے نازل ہوئی ہے بلکہ اِس کا مطلب صرف اتنا ہوگا کہ اِس سورۃ کا مضمون تمہارے اِس جھگڑے پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ پس اِس سورۃ کا جو شانِ نزول بتایا جاتا ہے اُس کے معنے صرف اِتنے ہیں کہ بعض واقعات صحابہؓ کے زمانہ میں بھی ایسے ہوئے جن پر یہ سورۃ چسپاں ہوتی ہے ورنہ یہ سُورۃ اپنے اندر بہت وسیع مطالب رکھتی ہے۔

چونکہ اِس سورۃ میں ماضی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اِس لئے بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس سورۃ میں ماضی کے الفاظ کس حکمت کے ماتحت استعمال کئے گئے ہیں اور چونکہ انہوں نے زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کے معنے انسان کے مرجانے اور اُس کے قبر میں داخل ہو جانے کے کئے ہیں اِس لئے بعض نے کہا ہے کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ تحقّق و قوع کے لئے آیا ہے یعنی تکاثر نے تم کو غافل کر دیا یہاں تک کہ تم مرگئے۔ یعنی چونکہ یہ بات ضرور ہو کر رہنی ہے اور موت ایسی چیز ہے جس سے کسی انسان کو مفر نہیں اِس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ماضی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ بتانے کے لئے کہ بات ایسی قطعی اور یقینی ہے کہ ہم اِس کے مضارع کا صیغہ استعمال کرنے کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں اِس لئے کہ تحقّق و قوع کا مسئلہ وہاں چسپاں ہوتا ہے جہاں وقوعہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو مثلاً قرآن کریم نے یہ پیشگوئی کی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جیتیں گے اور مکّہ کو ایک دن فتح کر لیں گے۔ اب مکّہ کا فتح ہونا کفار کی نظروں سے بالکل پوشیدہ امر تھا اور وہ اِس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن اپنے صحابہ سمیت مکّہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہونگے اور کفار اُن کے زیر نگین آجائیں گے۔ پس چونکہ یہ بات کفار کی نگاہ میں بالکل غیر ممکن تھی اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس پر زور دینے کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کر دیا اور بتلا دیا کہ تم تو اِس پیشگوئی کو نہیں مانتے لیکن ہم اسے ایسا قطعی اور یقینی سمجھتے ہیں جیسے ماضی یقینی ہوتی ہے اور جس کے وقوع میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ لیکن زیارتِ قبور یا قبروں میں داخل ہونا تو ایک ایسی بات ہے جس کا کفار بھی انکار نہیں کرتے تھے اور وہ تسلیم کرتے تھے کہ ہر انسان ایک دن لازماً مرجائے گا۔ پس اِس قاعدہ کا اطلاق یہاں درست نہیں یہ قاعدہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں مخاطب تو انکار کر رہا ہو اور متکلم کو اپنے کلام پر زور دینا مقصود ہو۔

بعض اور لوگوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ چونکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہمیشہ دنیا میں قومیں تکاثر کرتی آئی ہیں اور چونکہ دنیا میں

زندوں کی نسبت مُردے زیادہ ہیں اِس لئے کثرت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہاں ماضی کا صیغہ استعمال کر دیا ہے۔ وہ اپنی اِس توجیہہ کی بنیاد اِس امر پر رکھتے ہیں کہ حدیثوں سے پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آخری زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ سے پہلے دنیا میں بہت سی قومیں گذر چکی ہیں جن کا مجموعی زمانہ کئی ہزار سال کا ہے پس چونکہ ماضی کی کثرت ہے اِس لئے کثرت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہاں ماضی کا صیغہ استعمال کر دیا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جس جماعت کو کثرت اور غلبہ حاصل ہو اُسی کے مطابق صیغے استعمال کر لئے جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں کئی جگہ نماز روزہ کے احکام میں صرف مردوں کا ذکر کیا گیا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ عورتیں اِس میں شامل ہیں۔ اِسی طرح اُن لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ پہلے لوگ کثیر تھے اور بعد میں آنے والے قلیل ہیں اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

یہ معنے پہلے معنوں سے زیادہ معقول ہیں مگر یہ کہنا کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آخر میں تشریف لائے ہیں اِس لئے ضروری ہے کہ بعد میں آنے والے لوگ پہلوں کی نسبت کم ہوں یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آخری زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پہلے ساری دنیا کی بھی اتنی آبادی نہیں تھی جتنی آج صرف ہندوستان کی ہے۔ پہلے زمانہ میں نہ لوگوں کو امن کی قدر و قیمت معلوم تھی نہ آپس میں میل جول کی سہولتیں اُنہیں میسّر تھیں نہ علوم کی کثرت تھی نہ ایجادات کا دَور دَورہ تھا نہ زندگی کو بہتر بنانے کے اُصول لوگوں کو معلوم تھے نہ آبادی کو ترقی دینے کے ذرائع کی اُنہیں کچھ خبر تھی۔ اُس وقت تمدّن بھی ابتدائی حالت میں تھا، اُس وقت سیاست بھی ابتدائی حالت میں تھی، اُس وقت علم بھی ابتدائی حالت میں تھا اور اُس وقت دنیا کا آپس میں وہ رابطہ و اتحاد نہیں تھا جو موجودہ زمانہ میں نہایت وسیع طور پر پایا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو اللہ تعالیٰ نے چونکہ تکمیلِ ہدایت اور تکمیلِ اشاعتِ ہدایت کا زمانہ قرار دیا تھا اِس لئے آپ کی بعثت کے ساتھ ہی دنیا کی حالت میں ایک غیر معمولی تغیّر پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ وہ امن جس سے دنیا نا آشنا تھی اُس کی قدر و قیمت کا آپ کے ذریعہ لوگوں کو احساس پیدا ہُوا۔ علم کا چاروں طرف چرچا شروع ہو گیا۔ تمدّن اپنے ارتقاء کی منازل بڑی سُرعت سے طے کرنے لگا۔ ذرائع نقل و حرکت میں ایک نیا دور شروع ہو گیا اور دنیا کی آبادی جو پہلے متفرق قبائل کا رنگ رکھتی تھی ایک ملک کا رنگ اختیار کر گئی۔ قوموں کا قوموں سے اور ملکوں کا ملکوں سے ایک گہرا تعلق قائم ہو گیا۔ سفر کی سہولتیں میسّر آگئیں اور لوگ بڑی کثرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگ گئے۔ اِن وجوہ کا قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا کی آبادی بھی پہلے کی نسبت بہت بڑھ گئی اور زمین کو آباد کرنے کے ایسے وسائل نکل آئے جو اِس سے پہلے کسی کے واہمہ میں بھی نہیں آتے تھے پس بے شک یہ درست بات ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زمانہ کے آخری حصہ میں تشریف لائے ہیں مگر یقینی اور قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے زمانوں کے لوگ اِس زمانہ کے لوگوں سے اپنی تعداد میں زیادہ تھے۔ یہ تو ہم کہتے ہیں اور یقیناً کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آخری زمانہ میں آئے مگر یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے یوم ظہور سے لے کر قیامت تک جس قدر مومن اور کافر ہوں گے اُن کی تعداد پہلی اُمتوں کے مومنوں اور کافروں سے کم رہے گی۔ اِس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا غالباً یہ بات صحیح نہیں گو قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں

کہا جا سکتا۔

میرے نزدیک یہ سب دُور کی کوڑیاں ہیں اِس جگہ مکّہ والوں کو اللہ تعالےٰ مخاطب فرماتا ہے اور اُن کی دینی و دُنیوی پستی اور تباہی کی حقیقت بیان فرماتا ہے اور چونکہ عقلی دلیل ہر جگہ چسپاں ہو سکتی ہے اِس لئے اِس سے ایک قاعدۂ کلیہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو قانون اُن کے لئے تھا وہی اگلی قوموں کے لئے بھی ہوگا مثلاً ہم زید کو کہیں کہ تم زہر نہ کھاؤ ورنہ مر جاؤ گے۔ اب یہ فقرہ تو زید سے کہا گیا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ بات صرف زید سے تعلق رکھتی ہے بلکہ جو شخص بھی زہر کھائے گا مر جائے گا۔ پس گو اِس فقرہ کا پہلا مخاطب زید ہوگا اور ہماری نصیحت صرف زید کو ہوگی کہ تو زہر نہ کھا۔ مگر اس سے یہ قاعدہ کلیہ بھی نکل آئے گا کہ جو شخص زہر کھائیگا مر جائے گا۔

میرے نزدیک اِن آیات میں مقابر کے لفظ سے مٹی والی قبریں مراد نہیں بلکہ تباہی اور بربادی مراد ہے اور اگر ہم یہ معنے کریں تو یہ آیات اپنے مطالب کے لحاظ سے وسیع بھی ہو جاتی ہیں اور کسی غیر معمولی تاویل کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ۔ تم لوگوں کو تکاثر نے اتنا غافل بنا دیا ہے کہ جن چیزوں سے تکاثر نے تمہیں روکا تھا اُن کی طرف تم لوٹ نہیں سکے یہاں تک کہ تم تباہی کے سرے پر پہنچ گئے اور تمہاری بربادی کا وقت آ گیا۔ پس زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ سے مقبرۂ جسمانی مراد نہیں بلکہ یہ وہ مقبرہ ہے جس کا محاورۂ زبان میں ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم تو مر گئی یا فلاں شخص کے متعلق تم کیا پوچھتے ہو وہ تو مر گیا یعنی اُس کے اندر بیداری کی رُوح نہیں رہی، اُس میں اخلاقی زندگی نہیں رہی، اُس میں دینی زندگی نہیں رہی، اُس میں قومی زندگی نہیں رہی، اُس میں سیاسی زندگی نہیں رہی، اُس میں عائلی زندگی نہیں رہی۔ جب کسی قوم یا فرد کی یہ حالت ہو تو کہتے ہیں اُس پر موت طاری ہو گئی۔ پس یہاں اُن ساری چیزوں کی نفی کی گئی ہے جن سے تکاثر انسان کو محروم کر دیا کرتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ تم میں دین بھی نہیں رہا، تم میں دنیا بھی نہیں رہی، تم میں اخلاق بھی نہیں رہے، تم میں علم بھی نہیں رہا۔ ایسا آدمی کسی ایک موت کے نیچے نہیں ہزاروں موتوں کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے۔ پس اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے معنے یہ ہوں گے کہ قومی طور پر تم پر تنزل اور بربادی کا وہ دَور آ گیا ہے کہ جس کے بعد کوئی قوم زندہ نہیں کہلا سکتی۔ اور گو اِس میں مکّہ والے مخاطب ہیں مگر اس ذریعہ سے یہ قانون بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ جو قوم تکاثر کے پیچھے پڑتی ہے وہ مقبرہ کو پہنچ جاتی ہے یعنی وہ قوم آخر مر جاتی اور دنیا سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتی ہے۔ غرض اس سورۃ میں مکّہ والوں کی توجہ کو اس سبب کی طرف پھرایا گیا ہے جو اقوام کو خدا تعالےٰ اور اُس کے پیغام سے غافل کر کے آخر تباہ کر دیتا ہے چنانچہ دیکھ لو مکّہ والوں کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ذریعہ ایک بہت بڑی عزت حاصل ہوئی۔ ایک زمانہ میں دو رسول اُن کی طرف مبعوث ہوئے جنہوں نے اللہ تعالےٰ کا پیغام اُن کے کانوں تک پہنچایا۔ اِس کے نتیجہ میں اُن میں بیداری بھی پیدا ہوئی اور اُن میں زندگی کی رُوح بھی حرکت کرنے لگی مکّہ ایک بنجر اور غیر آباد علاقہ تھا۔ عاد اور ثمود کی قومیں اِس علاقہ پر مدتوں سے حکومت کرتی چلی آتی تھیں مگر اللہ تعالےٰ کے انبیاء پر ایمان لانے کے نتیجہ میں اُن کے اندر ایسا تغیر پیدا ہوا کہ حکومت اُن کے قبضہ میں آ گئی اور تمام عرب نے اُن کے سامنے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ اللہ تعالےٰ کا یہ قانون ہے کہ دنیا میں جب کسی قوم کو روحانی رنگ میں عزت ملتی ہے تو خدا تعالےٰ کے نبی اور اُس کے مامور کی بعثت کے نتیجہ میں ہی ملتی ہے مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دنیوی عزت بھی اُس قوم کو حاصل ہو جاتی ہے

اور لوگ اُن کی ظاہری عظمت کو دیکھ کر واہ واکرنے لگتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالےٰ کے نبی تھے بڑے صناع یا تاجر نہ تھے وہ اپنی قوم کو خدا دینے کیلئے آئے تھے صنعت یا تجارت یا حکومت میں غلبہ دینے کے لئے نہیں آئے تھے۔ مگر دین کے نتیجہ میں دُنیوی حکومت بھی اُس قوم میں آگئی اور اُس کو صرف خدا نہیں ملا بلکہ بادشاہت اور حکومت بھی مل گئی۔ پس خدا تعالےٰ کی یہ سُنّت کہ جب کسی قوم کو ایک نبی کے ذریعہ خدا ملتا ہے تو اُس کو دُنیا بھی مل جاتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قرب سے انسان کے اخلاق درست ہوتے ہیں اور اخلاق درست ہونے سے دنیا کی گردنیں بھی خود بخود جھکنے لگتی ہیں۔ آج تک کوئی نبی بھی دنیا میں ایسا نہیں آیا جس نے ایک ذلیل اور مقہور قوم کو اُٹھا کر بلند ترین مقام تک نہ پہنچا دیا ہو۔ موسوی قوم کیا تھی ؟ پتھیروں کا کام کرتی تھی مگر موسیٰؑ سے مل کر وہ بادشاہ بن گئے۔ عیسیٰؑ کے ماننے والے کیا تھے ؟ چند مچھلیاں پکڑنے والے معمولی افراد تھے مگر عیسیٰؑ کو مان کر دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماننے والے کیا تھے ؟ اُونٹوں کے چرواہے تھے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی برکت سے وہ دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ پس انبیاء صرف دین ہی نہیں لاتے بلکہ جوں جوں اُن کی جماعت ترقی کرتی جاتی ہے اُن کو دنیوی طور پر بھی غلبہ ملتا جاتا ہے اور جب یہ غلبہ انہیں حاصل ہو جاتا ہے تو وہ لوگ جن پر اُن کی نیکی اور تقویٰ اور روحانیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا وہ اُن کے ظاہری غلبہ کو دیکھ کر متأثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ان لوگوں کا مقابلہ کس طرح ہو سکتا ہے اِن کو تو بہت بڑی شوکت حاصل ہو گئی ہے۔

غرض ایک مومن جماعت کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک اُس کی ذاتی حیثیت ہوتی ہے اور ایک حیثیت وہ ہوتی ہے جس میں اُسے دوسرے لوگ دیکھتے ہیں۔ جب مومن اپنے نفوس پر ذاتی حیثیت سے غور کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں الحمدللہ ہم لوگ خدا تعالےٰ پر ایمان لانے والے، اُس کی توحید کو تسلیم کرنے والے، اخلاق پر عمل پیرا ہونے والے اور اُس کے اوامر کو پوری دیانتداری کے ساتھ بجا لانے والے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا کہ اُس نے اپنا نبی ہم میں بھیجا اور پھر اُس نے ہمیں توفیق بخشی کہ ہم اُس پر ایمان لائیں اور اپنی زندگی اُس کی غلامی میں بسر کریں۔ لیکن دوسرے لوگ اِس حقیقت کو نہیں دیکھتے وہ صرف اُن کی ظاہری عظمت کو دیکھ کر عش عش کر اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں انہیں کتنی بڑی طاقت حاصل ہو گئی ہے۔ جب ابوبکرؓ اور عمرؓ کو صحابہؓ دیکھتے تھے تو ابوبکر بادشاہ یا عمر بادشاہ کی حیثیت میں نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس حیثیت میں دیکھتے تھے کہ ابوبکرؓ وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا اور جسے اسلام کیلئے بہت بڑی قربانیاں کرنیکا موقع ملا اسی طرح عمرؓ وہ ہے جس نے اسلام کی بہت بڑی خدمات سرانجام دیں۔ وہ اُن کی خوبی اُن کی ظاہری شوکت میں نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن کی بڑی خوبی یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی نمازوں میں برکت رکھی ہے۔ اُن کی دعاؤں میں برکت رکھی ہے اُن کے روزوں میں برکت رکھی ہے۔ اُن کے تقویٰ میں برکت رکھی ہے اور اُنہیں اپنے قرب کے لئے چُن لیا ہے۔ یہ تو وہ چیز تھی جو صحابہ کو نظر آتی تھی مگر عیسائیوں اور یہودیوں کو کیا نظر آتا تھا ؟ وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ابوبکرؓ بڑا نمازی ہے یا اُس کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں یا اُس نے اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بڑی بھاری قربانیاں کی ہیں وہ ان ساری باتوں سے اندھے تھے۔ اُنہیں اگر نظر آتا تھا تو یہ کہ ابوبکرؓ بڑا بادشاہ ہو گیا ہے۔ عمرؓ بڑا بادشاہ ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے قیصر کو شکست دیدی ہے، اُنہوں نے کسریٰ کو تباہ کر دیا ہے، اُنہوں نے ملکوں پر قبضہ کر لیا ہے، اُنہوں نے بڑے بڑے لوگوں کو اپنے اندر شامل کر لیا ہے۔ پس جب نبی کے ذریعہ کسی جماعت کو حکومت ملتی ہے تو اس کے بعد اُس کے کان میں یہ ایک نئی آواز

آنی شروع ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ بہت بڑے ہو گئے ہیں۔ دنیوی ترقی سے پہلے تو یہ آوازیں آیا کرتی تھیں کہ یہ لوگ نمازیں پڑھنے والے، روزے رکھنے والے، دعائیں کرنے والے، صدقہ وخیرات میں حصہ لینے والے، غرباء اور یتامیٰ ومساکین کا خیال رکھنے والے ہیں۔ لیکن جب اُنہیں غیر قوموں پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ تو بڑے دولت مند ہیں، بڑے با اثر ہیں، بڑی رعایا ان کے ماتحت ہے۔ ان کا مقابلہ ہم کہاں کر سکتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب زمانۂ نبوت سے بُعد ہو جاتا ہے اور وہ لوگ مر جاتے ہیں جنہوں نے نبی کی صحبت میں اپنا وقت گذارا ہوتا ہے اور جو جانتے تھے کہ ہم کچھ نہیں تھے جو کچھ ہوا اللہ تعالےٰ کے فضل سے ہوا اور جو کچھ ہوگا اللہ تعالےٰ کے فضل سے ہوگا تو اُن کی اولادیں نفس کی آواز کی نسبت دوسرے لوگوں کی آوازوں پر زیادہ کان دھرنا شروع کر دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اب دوسروں کا فرض ہے کہ ہماری غلامی اختیار کریں۔ چنانچہ دیکھ لو ایک عرصہ کے بعد صحابہؓ کو بڑی عظمت حاصل ہوئی اور اللہ تعالےٰ نے اُنہیں حکومتیں بھی دے دیں مگر چونکہ وہ اپنے نفس میں یہ سمجھتے تھے کہ ہم اُونٹوں کے چرواہے تھے اِس لئے اُن میں حکومت کے زمانہ میں بھی کبر پیدا نہیں ہوا۔ جب کسریٰ کے خزانے فتح ہوئے تو مالِ غنیمت میں کسریٰ کا وہ رومال بھی آیا جو وہ اُس وقت اپنے ہاتھ میں لیا کرتا تھا جب وہ تخت پر بیٹھتا تھا۔ کسریٰ کو اِس رومال کی عظمت کا کوئی احساس ہوگا لیکن صحابہؓ اُس کی کیا عظمت سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک تو ساری عظمت نماز میں تھی، روزہ میں تھی، حج میں تھی، زکوٰۃ میں تھی، صدقہ وخیرات میں تھی، غریبوں کو کھانا کھلانے میں تھی، تعلیم میں تھی، تربیت میں تھی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے دلوں میں اِن چیزوں کی کوئی قدر نہیں تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے اِس انعام کے مقابلہ میں جو اُس نے اُن پر اِس رنگ میں کیا کہ اُنہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا نصیب ہوا اِن چیزوں کو بالکل حقیر سمجھتے تھے۔ جس طرح آج کل کے بعض فیشن ایبل نوجوان اپنی جیب میں رومال ذرا باہر نکال کر رکھتے ہیں تاکہ لوگوں کو بھی نظر آتا رہے اِسی طرح کسریٰ یہ رومال تخت پر بیٹھتے وقت اپنے ہاتھ میں رکھا کرتا تھا۔ یہ رومال مالِ غنیمت میں تقسیم ہو کر حضرت ابوہریرہؓ کے حصہ میں آیا۔ ایک دن اُنہیں کھانسی اُٹھی اور بلغم آیا تو انہوں نے وہ رومال نکال کر اُس میں تھوک دیا اور پھر کچھ خیال آنے پر کہا بَخٍ بَخٍ اَبُوْ هُرَيْرَه۔ واہ واہ ابوہریرہ تیری بھی کیا شان ہے کبھی بھوک کی وجہ سے تجھے جوتیاں پڑا کرتی تھیں اور آج تو کسریٰ کے رُومال میں تھوک رہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا مَیں نے جب اسلام قبول کیا تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا چنانچہ میرے ایمان لانیکے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین سال زندہ رہے چونکہ مَیں نے بہت بعد میں اسلام قبول کیا تھا اِس لئے مَیں نے عہد کیا کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ سے اب ہلوں گا نہیں۔ لوگوں نے تو بہت باتیں سُن لی ہیں مگر مَیں نے کچھ نہیں سُنا معلوم نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی زندگی باقی ہے اِس لئے اب مَیں آپ کے دروازہ پر پڑا رہونگا تا ہر بات آپ کی سُنوں اور اُسے یاد رکھوں۔ چنانچہ میں مسجد میں ہی بیٹھا رہتا اور اِس ڈر کے مارے کہ کہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف نہ لے آئیں اور آپکی باتیں سُننے سے محروم نہ رہوں اِدھر اُدھر بھی نہ جاتا اور نہ کوئی کمائی کرتا۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ اگر میں نے کوئی روزگار کیا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی باتیں پھر پُرانے لوگ ہی سُن لیں گے اور مَیں اُن کے سُننے سے محروم رہوں گا۔ چنانچہ مَیں مسجد میں ہی بیٹھا رہتا۔ بعض لوگ مجھے روٹی دے جاتے اور مَیں خدا تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُسے کھا لیتا لیکن بعض دفعہ مجھے سات سات وقت کا فاقہ ہو جاتا اور کوئی شخص میرے لئے روٹی نہ لاتا آخر اِس قدر ضعف ہو جاتا کہ مَیں

بے ہوش ہو کر گر جاتا اور لوگ سمجھتے کہ مجھے مرگی کا دورہ ہو گیا ہے۔ عربوں میں اسلام سے پہلے یہ رواج تھا کہ جب کسی کو مرگی کا دورہ ہوتا تو اُس کے سر پر جُوتیاں مارتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ اس کا علاج ہے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں جب میں بے ہوش ہوتا تو لوگ اِسی معمول کے مطابق میرے سر پر بھی جوتیاں مارنے لگ جاتے اور وہ سمجھتے کہ مجھے مرگی کا دَورہ ہو گیا ہے حالانکہ میں بھوک کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہوتا تھا۔ اب کُجا تو یہ حالت تھی کہ میں بھوک کی وجہ سے بیہوش ہو جاتا تو لوگ میرے سر پر مرگی کا دَورہ سمجھ کر جُوتیاں مارتے اور کُجا یہ حالت ہے کہ کسریٰ کا وہ رُومال جس کا میلا ہونا بھی کسریٰ برداشت نہیں کرسکتا تھا مَیں اُس میں بلغم تھوک رہا ہوں۔

غرض صحابہؓ کے سامنے ہمیشہ اپنے ابتدائی حالات رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہماری پہلے کیا حالت تھی اور ہم نے کس طرح ترقی کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری ترقی محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کی نصرت کا نتیجہ ہے ہماری کسی ذاتی خوبی کا اِس میں دخل نہیں یا اگر ہمیں یہ چیزیں ملی ہیں تو اِس لئے نہیں کہ یہ چیزیں بڑی تھیں بلکہ اصل چیز تو تقویٰ و طہارت ہے یہ چیزیں محض بطور انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوئی ہیں۔ مگر جب اُن کی اولادیں پیدا ہوئیں جب وہ لوگ آئے جنہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں دیکھا تھا۔ جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری کا مشاہدہ نہیں کیا تھا تو انہوں نے سمجھا کہ ہمارا خدا پر بھی حق ہے، ملائکہ پر بھی حق ہے، سلسلہ پر بھی حق ہے، لوگوں پر بھی حق ہے اور سب کا فرض ہے کہ ہمارے لئے آرام و آسائش کے سامان مہیا کریں۔ اِتنے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی آوازیں بھی اُن کے کانوں میں آنی شروع ہو گئیں کہ یہ لوگ بڑے دولت مند ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تکاثر میں مبتلا ہو گئے اور خدا تعالیٰ کے انعامات کو بھول گئے۔ ہر نبی کے بعد ایسا ہوا ہے۔ موسیٰؑ آئے تو اُن کے بعد ایسا ہی ہوا۔ عیسیٰؑ آئے تو اُنکے بعد ایسا ہی ہوا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو اُن کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ گو خدا تعالیٰ کے فضل مسلمانوں میں تقویٰ کا زمانہ بہت لمبا رہا ہے اور کم لوگ ایسے گذرے ہیں جنہوں نے تکاثر سے کام لیا۔ بہرحال جب ایسا زمانہ آتا ہے کہ انبیاء کی جماعتوں کی دنیوی عزت دیکھکر لوگ واہ واکہنے لگ جاتے ہیں تو تکاثر کا راستہ کھل جاتا ہے اور وہ اِس واہ وا کے اثر کے نیچے اُسی رستہ پر چلنے لگتے ہیں جس راستہ پر پہلی قومیں چلیں اور جو اصل چیز ہوتی ہے اُسے بھول جاتے ہیں اور جب دین کو بھول جاتے ہیں تو خالص مقصود دنیا رہ جاتی ہے اور وہ بے تحاشا اُس کیطرف بڑھنے لگتے ہیں آخر اس کے تین نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا طلبی کے تین نتائج

اوّل۔ بنی نوع انسان میں اُن کے خلاف ردّعمل پیدا ہوتا ہے اِس کی وجہ یہ ہے کہ تکاثر کے نتیجہ میں تکبر پیدا ہوتا ہے اور تکبر کے نتیجہ میں لُوٹ مار اور ظلم پیدا ہوتا ہے آخر بنی نوع انسان میں اُن کے خلاف جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ حکومت کو تباہ کرنے کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دوم۔ کبھی بنی نوع انسان میں تو اُن کے خلاف ردِّعمل پیدا نہیں ہوتا لیکن اُن کی اپنی اولاد اُن کی کمائی کو استعمال کرکے عیاش ہو جاتی ہے اور اس طرح اُن میں اندرونی زوال پیدا ہونے لگتا ہے۔ باپ دادا کی جائیداد چونکہ مفت ہاتھ میں آجاتی ہے اس لئے عیاشی میں مبتلا ہو کر وہ سب کچھ برباد کردیتے ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہ ہوتے ہیں مگر عیاشی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اُن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُنہوں نے کنچنیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ شراب پیتے رہتے ہیں اور حکومت کے کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ برباد ہو جاتے ہیں اور اُن کی حکومت اُمراء میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

سوم۔ یا پھر اللہ تعالیٰ سے ہی اُس قوم کی ٹکر ہو جاتی ہے یعنی کوئی ایسا سبب پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیوی تباہی کے سامان تو نہیں ہوتے لیکن خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہو کر

اُس قوم کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔
غرض جب کوئی قوم تکاثر کے نتیجہ میں زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کے مقام پر پہنچ جائے تو اُس میں اِن تین حالتوں میں سے کوئی ایک حالت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ یا تو رعایا میں ردّ عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے حاکموں کو توڑ دیتے ہیں یا اندرونی طور پر حکّام میں ایسا تنزّل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آپ ہی آپ ٹوٹنے لگ جاتے ہیں اور یا پھر خدائی غضب نازل ہو کر اُن کو تباہ کر دیتا ہے۔

چونکہ گذشتہ کئی سورتوں سے اہلِ مکّہ کو خطاب کیا جا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنہیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کھڑا ہونا اپنے آپ کو ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گرانا ہے۔ تم لاکھ کوشش کرو اس مقابلہ میں تمہیں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے ظاہر ہے کہ اس سورۃ میں بھی اہلِ مکّہ سے ہی خطاب کیا گیا ہے۔ پہلی سورتوں میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ تم غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے، مساکین کو دھکّے دیتے ہو، یتامیٰ کی کبھی خبر گیری نہیں کرتے، مال و دولت آئے تو سب عیاشی میں اڑا دیتے ہو اور اگر کوئی شخص روپیہ کو عیاشی میں نہیں اُڑاتا تو وہ اِتنے بُخل سے کام لیتا ہے کہ قومی ضرورتوں کے باوجود وہ اِس روپیہ کو تھیلیوں میں بند کر کے بیٹھ رہتا ہے اور اُسے کسی مفید مصرف میں نہیں لاتا۔ اِسی طرح بتایا گیا تھا کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم غلاموں کو مارتے ہو۔ عورتوں کو اُن کے حقوق نہیں دیتے اور ہر قسم کے ظلم و ستم سے کام لیتے رہتے ہو۔ اِسکے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ وہ ہیں جن میں نیکی اور تقویٰ بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ وہ غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں، وہ مساکین پر رحم و شفقت سے کام لیتے ہیں، وہ یتامیٰ کی خبر گیری کرتے ہیں، وہ مال و دولت کی حفاظت کرتے ہیں، وہ قومی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ غلاموں سے حسن سلوک کرتے ہیں، وہ عورتوں کو اُنکے حقوق پوری دیانتداری کیساتھ ادا کرتے ہیں اور کبھی ظلم و ستم کے قریب بھی نہیں جاتے جب تمہاری حالت اور اُنکی حالت میں اِس قدر بیّن فرق ہے تو تم کس طرح یہ خیال کر سکتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں تمہیں کامیابی حاصل ہو گی۔

مسلمانوں کے مقابل پر کفارِ مکہ کی حالت

اب فرماتا ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ تم کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے اور تمہیں اپنے دل کے اندرونی گوشوں سے یہ خیال بالکل نکال دینا چاہیئے کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر سکو گے۔ کیا تم اپنے نفس پر غور نہیں کرتے کہ تم گرتے گرتے کس مقام پر جا پہنچے ہو۔ دنیا کی محبت تم میں ہے، مال کی محبت تم میں ہے، عزّت کی محبت تم میں ہے اور تم نے زندہ رہنے کا مادہ بالکل مٹا ڈالا ہے۔ زندہ رہنے کے دو ہی مادے ہوتے ہیں یا دین ہوتا ہے یا دنیا ہوتی ہے۔ تکاثر والا دین کو بھی بھول جاتا ہے اور دنیوی لحاظ سے بھی ذلّت و رسوائی کے گڑھے میں جا پڑتا ہے۔ دین کو تو وہ اِس طرح بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اُس کی ذات دونوں اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور دنیا میں وہ اِس طرح ذلیل ہوتا ہے کہ تکاثر کے نتیجہ میں تکبّر اور خود پسندی میں مبتلا ہو کر دوسروں کے حقوق کو فراموش کر دیتا اور اُن پر مختلف رنگ کے مظالم شروع کر دیتا ہے۔ غرض دو ہی چیزیں ہیں جو کسی قوم کو زندہ رکھ سکتی ہیں یا تو دینی رُوح کسی قوم کو زندہ رکھا کرتی ہے اور یا پھر دُنیوی رُوح کسی قوم کے عروج کا باعث ہوا کرتی ہے مگر تکاثر اِن دونوں کو مٹا دیتا ہے۔ پس فرماتا ہے جب تمہارے اندر تنزّل کے آثار پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں تو کیا اب بھی تم سمجھتے ہو کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو کُچل دو گے اور جس مقصد کے لئے وہ دنیا میں کھڑے ہوئے ہیں اُس میں اُنہیں کامیاب نہیں ہونے دو گے۔

موت تمہارے سر پر کھڑی ہے اور تمہاری اپنی جان نکل رہی ہے مگر تمہاری حالت یہ ہے کہ تم بجائے اپنے حالات پر غور کرنے کے اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تباہی کے خواب دیکھ رہے ہو یہ تو ایسی ہی بات ہے۔ جیسے

بعض دفعہ کوئی امیر شخص مر رہا ہوتا ہے۔ موت دروازہ پر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے اور ہر شخص کو دکھائی دے رہا ہوتا ہے کہ وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے مگر اُس وقت جب اُس کے کسی نوکر سے دوائی گر جاتی ہے تو وہ انتہائی غصہ سے کہتا ہے تمہیں شرم نہیں آتی تم نے دوائی گرا دی ہے اگر تم نے پھر ایسی حرکت کی تو مَیں تمہاری خوب خبر لوں گا۔ حالانکہ دو منٹ کے بعد وہ خود مر جاتا ہے۔ یہی حالت اِس وقت تمہاری ہے کہ تکاثر کی عادت میں بڑھتے بڑھتے تم ایسے مقام پر پہنچ چکے ہو کہ تم قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو اور تمہاری تباہی اور بربادی بالکل یقینی ہے۔ جیسے قبر میں سے کوئی مُردہ نکل کر واپس نہیں آ سکتا اِسی طرح تم اس قدر ذلیل اور رُسوا ہو چکے ہو اور اِس قدر دینی اور دُنیوی موتیں تم پر وارد ہو چکی ہیں کہ تم اب اپنی اِس حالت سے لَوٹ ہی نہیں سکتے۔ پس اب تمہارا یہ کہنا کہ ہم جیت جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی ہار جائیں گے اگر پاگل پن کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ مُردہ اُسی وقت زندہ ہو سکتا ہے جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُس میں نئی رُوح داخل کی جائے۔ اگر نئی رُوح اُس میں نہ پھونکی جائے تو کوئی مردہ جسم دوبارہ زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ سورۃ تو اہلِ مکّہ کی نسبت ہے اور اُن کے پاس کوئی زیادہ مال نہیں تھا پھر وہ تکاثر کے مُجرم کس طرح ہو گئے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ ہر قوم کی دولت نسبتی ہوتی ہے اگر اُن کے مالدار چھوٹے تھے تو اُن کے غریب بھی تو بہت غریب تھے پس تکاثر نسبتی امر ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس کروڑوں نہیں اِس لئے میں تکاثر کا مجرم نہیں۔ امریکہ والوں کے لئے تکاثر کے اَور معنے ہیں انگلستان کے لئے اَور۔ اور ہندوستان کے لئے اَور۔ اِس میں سے ہندوؤں کے لئے اَور مسلمانوں کے لئے اور۔ پھر احمدیوں کے لئے اَور۔ جس قوم پر جو ذمہ داری ہے چھوٹی ہو یا بڑی، اگر وہ اُس ذمہ داری کو ادا کرنے سے قاصر ہے تو تکاثر کی مرتکب ہے بلکہ جب بھی دین یا دنیا کے کسی اچھے کام کے لئے کسی قربانی کی ضرورت ہے اور کوئی شخص اُس وقت اپنے ہاتھ کو پیچھے کھینچ لیتا ہے گو اُس کے پاس ایک ٹکڑہ روٹی کا ہی تھا وہ تکاثر کا مرتکب ہے کیونکہ اس نے ایک چیز اپنے پاس رکھ لینی چاہی جو دوسروں نے قربان کر دی تھی یا جس کی اُس کے دین یا اُس کی قوم کو ضرورت تھی۔

جس قوم میں یہ نقص پیدا ہو جائے اور قربانی میں دریغ کرنے لگے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اِسی لئے فرمایا حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ یعنی یہ مرض آخر قومی موت کی طرف لے جاتا ہے۔

اِس جگہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا تکاثر اور تفاخر کُلّی طور پر ممنوع ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس جگہ اُس تکاثر کا ذکر ہے جو انسان کو موت تک پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ اِس تکاثر نے تم کو تمام نیک باتوں سے غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ تم موت تک پہنچ چکے ہو۔ یعنی اگر نیک باتوں پر فخر ہو یا ایسی باتوں پر فخر ہو جو دوسروں کو نیکی اور تقویٰ کی طرف لانے میں ممد ہوں تو اِس قسم کا تفاخر منع نہیں۔ گویا تفاخر کی دو قسمیں ہیں ایک تفاخر وہ ہے جو انسان کو مقابر کی طرف لے جاتا ہے اور ایک تفاخر وہ ہے جو انسان میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ جو تفاخر انسان کو مقابر کی طرف لے جاتا ہے وہ قطعی طور پر ممنوع ہے اور جو تفاخر زندگی پیدا کرتا ہے وہ منع نہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ مجھے خدا تعالےٰ نے تمام بنی نوعِ انسان کا سردار بنایا ہے مگر اس کے باوجود میں اِس پر فخر نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہ میں تم کو ذلیل سمجھوں اور اپنے آپ کو تم سے کوئی علیحدہ ہستی قرار دوں میرا فرض ہے کہ میں سیّد وُلدِ آدم ہونے کے باوجود تمہاری خدمت کروں اور تمہیں ترقی کے میدان میں بہت آگے لے جاؤں

اِسی طرح فرماتے ہیں تَزَوَّجُوْا وُلُوْدًا وُدُوْدًا فَاِنَّا مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ وَمُفَاخِرٌ بِکُمْ (ابوداؤد) تم شادیاں کرو جننے والی اور محبت کرنے والی عورتوں سے کیونکہ تمہارے ذریعہ سے میں دوسری قوموں پر فخر کرنے والا ہوں اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کثرت تعداد کو صرف جائز ہی نہیں بلکہ پسندیدہ قرار دیتا ہے مگر چونکہ بعض کثرتیں نہایت گندی ہوتی ہیں اِس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ میں صرف یہ خواہش نہیں رکھتا کہ تم اپنی تعداد کے لحاظ سے دوسری قوموں سے بڑھ جاؤ بلکہ میری خواہش یہ بھی ہے کہ باوجود کثیر ہونے کے تم ایسے نیک اور پاک ہو کہ میں قیامت کے روز دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں تم پر فخر کر سکوں۔ اِس حدیث میں وُلُوْد کا لفظ کثرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وُدُوْد میں تفاخر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم محض کثرت پر نہیں بلکہ اپنی اُمت کے اعلیٰ اخلاق پر فخر کریں گے اور اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ماں باپ اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کریں اور کوشش کریں کہ اُن کی نیکی صرف اُن کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ اُس کا اثر نسلاً بعد نسلٍ اُن کی اولاد میں بھی منتقل ہوتا چلا جائے تو وہ ایسی اعلیٰ درجہ کی نسلیں پیدا کر سکتے ہیں جو اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے باعثِ فخر ہوں۔ افسوس کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی اولاد کی صحیح تربیت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اُن میں ذاتی طور پر تقویٰ بھی ہوتا ہے، روحانیت بھی ہوتی ہے، اعلیٰ اخلاق بھی ہوتے ہیں، رأفت اور شفقت کے جذبات بھی ہوتے ہیں، حلم بھی موجود ہوتا ہے، حصولِ علم کی بھی پیاس ہوتی ہے، نیکیوں میں بڑھنے کا مادہ بھی ہوتا ہے مگر اس بات کی طرف اُنہیں کبھی توجہ پیدا نہیں ہوتی کہ اپنی اولاد میں بھی وہ یہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ بے شک ورثہ کے ذریعہ بھی ماں باپ کے بعض خصائص اولاد میں منتقل ہو جاتے ہیں مگر اعلیٰ نسل کا بہت بڑا تعلق اعلیٰ تربیت سے ہوتا ہے اور مومن کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس پہلو میں کبھی غفلت سے کام نہ لے۔ اگر ہر شخص خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنی اولاد کی نیک تربیت میں مشغول ہو جائے اور کوشش کرے کہ اُس کی اولاد اُس سے بڑھ کر اسلام کی فدائی ثابت ہو تو مسلمانوں میں کبھی تنزل پیدا نہ ہو۔ بڑی وجہ قومی انحطاط کی یہی ہوتی ہے کہ اولاد کی تربیت کی طرف توجہ نہیں کی جاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کثرت محض بے کار بن کر رہ جاتی ہے اور قوم کا رُعب بالکل مٹ جاتا ہے۔ پس اصل چیز جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں نیکی اور تقویٰ کے میدان میں ہم سے بھی تیز تر ہوں کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فخر کر سکتے ہیں محض کثرت ایسی چیز نہیں جو کسی کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہو۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اَنَا قَطَعْتُ خُرْطُوْمَ الْکُفْرِ بِسَیْفِیْ فَصَارَ الْکُفْرُ مُثْلَةً (روح البیان) یعنی میں وہ شخص ہوں جس نے تلوار کے ذریعہ کفر کا ناک کاٹ دیا ہے چنانچہ اب وہ نکٹا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے خدمت اسلام کی ایسی اعلیٰ درجہ کی توفیق عطا فرمائی ہے کہ کفر و شرک سے تعلق رکھنے والے تمام اہم اُمور کا میرے ہاتھوں سے قلع قمع ہو چکا ہے۔ اب اُس میں طاقت نہیں کہ میرے مقابلہ میں اپنا سر اُٹھا سکے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت علیؓ میں تکبر پیدا ہو گیا تھا یا آپ اپنی خدمات کی وجہ سے دوسروں کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھنے لگ گئے تھے بلکہ مطلب یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے جس اہم کام کو سرانجام دینے کی مجھے توفیق عطا فرمائی ہے میری خواہش ہے کہ تم بھی وہی کام کرو اور اُسی رستہ پر چلو جس پر میں چلا ہوں۔

پھر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ (البقرہ ع ۱۸) اے مومنو! تم نیکیوں میں بڑھنے کی کوشش کرو۔ استباق کے معنے صرف خود بڑھنے کے نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کو بھی

اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھنے کے ہوتے ہیں۔ پس اِس حکم کا صرف اتنا مفہوم نہیں کہ تمہیں ذاتی طور پر نیکیوں میں ترقی کرنی چاہیئے بلکہ اِس کا یہ بھی مفہوم ہے کہ تمہیں دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ اِس دوڑ میں شامل کرنا چاہیئے اور شانہ بشانہ چلتے ہوئے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر کسی قوم میں استباق کی رُوح پیدا ہو جائے تو وہ اپنی ترقی کی منازل سالوں اور مہینوں کی بجائے دنوں اور گھنٹوں میں طے کر سکتی ہے مثلاً اگر کسی شخص نے قرآن مجید کا ایک پارہ پڑھ لیا ہے تو وہ اِس حکم کے مطابق کوشش کرے گا کہ دوسروں کو بھی وہ پارہ پڑھا دے اور اگر کسی نے ترجمہ پڑھ لیا ہے تو وہ کوشش کرے گا کہ دوسروں کو بھی قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا دے اور اگر کوئی شخص قرآن کریم کے معارف سے آگاہ ہو گیا ہے تو وہ کوشش کرے گا کہ مَیں دوسروں کو بھی قرآن کریم کے معارف سے آگاہ کروں غرض استباق کی رُوح اگر کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو وہ آن کی آن میں کہیں کی کہیں جا پہنچتی ہے۔ اِسی طرح فرماتا ہے وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ (فاطر ع۴) مومنوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو نیکیوں میں دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ پھر فرماتا ہے فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا (النازعات ع۱) مومنوں کی یہ علامت ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نیکیوں میں مقابلہ کرتے ہوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ علامت اُن اقوام کی ہے جو اپنے اندر زندگی کی رُوح رکھتی ہیں۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتی ہیں کہ دوسروں سے آگے نکل جائیں اور نیکی کے میدان میں کسی کو سبقت نہ لینے دیں۔ اِسی طرح فرماتا ہے سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (آل عمران ع۱۴) اے لوگو! تم اپنے رب کی مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے جلد پہنچنے کی کوشش کرو یعنی تیزی کے ساتھ اپنے قدم بڑھاؤ اور خدا تعالےٰ کی مغفرت کو جلد سے جلد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جو لوگ خدا تعالےٰ کی مغفرت کی طرف سرعت سے قدم بڑھائیں گے

اُن میں سے کوئی آگے نکل جائے گا اور کوئی پیچھے رہ جائیگا کسی شخص کو اس بات پر فخر ہو گا کہ مَیں نے دوڑ کر اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا مقام حاصل کر لیا اور کوئی حسرت و افسوس کے ساتھ آہ بھرے گا کہ میں نے وقت ضائع کر دیا اور خدا تعالیٰ کی مغفرت کو اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے حاصل نہ کر سکا۔ بہرحال یہ آیات بتاتی ہیں کہ بعض قسم کے تفاخر اسلام میں ممنوع نہیں۔ وہ تکاثر جو انسان کو بنی نوع انسان کی خدمت میں مشغول کر دے، جس تکاثر کے نتیجہ میں انسان کی رُوحانیت اور اُس کا تقوےٰ بڑھ جائے، جس تفاخر کے نتیجہ میں قوم کا معیار بلند ہو جائے وہ بُرا نہیں بلکہ اچھا ہے اور ہر سمجھدار انسان کا فرض ہے کہ وہ اس تکاثر میں حصہ لے کیونکہ بغیر اِس کے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر کسی لڑکے کو کالج میں بھیجا جائے اور وہ کہے کہ مَیں کالج میں نہیں جاتا کیونکہ میرے دوسرے ساتھی بھی نہیں جاتے۔ اگر میں کالج میں گیا اور وہاں میں نے تعلیم حاصل کی تو مَیں دوسروں سے بڑھ جاؤنگا تو یہ اُس کی حماقت کا ثبوت ہو گا کیونکہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس کا دوسروں سے بڑھنا قوم کیلئے مفید ہو گا مضر نہیں ہو گا۔ اگر وہ پڑھ کر آئے گا تو دوسروں کو بھی پڑھائے گا اور اِس طرح قوم کا تعلیمی معیار اونچا ہو جائیگا۔ پس تکاثر اور تفاخر کی ہر صورت ممنوع نہیں بلکہ صرف وہ تفاخر ممنوع ہے جو انسان کو مقابر کی طرف لے جاتا ہے اور یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے بعد زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کہا کیونکہ جسمانی موت تو خود آتی ہے لیکن یہ دینی یا اخلاقی یا قومی ہلاکت انسان خود بُلاتا ہے اور اپنے قدموں چلتا ہُوا اپنی قبر میں جا لیٹتا ہے۔ اگر حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کی جگہ حَتّٰى مُتُّمْ فرماتا تو یہ مضمون ادا نہ ہو سکتا۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے مضمون میں ایک خاص شان اور جدت پیدا کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو اس نہایت اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قومی تباہی کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ ناجائز تکاثر سے

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

(خوب یاد رکھو کہ تمہاری حالت) اس طرح نہیں (جس طرح تم سمجھتے ہو بلکہ) تم لوگ (قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت کو) جلدی ہی جان لوگے
پھر (ہم کہتے ہیں کہ تمہاری حالت) یوں نہیں (جس طرح تم سمجھتے ہو) تم عنقریب ہی (اس بات کو) جان لوگے۔ ۳ھ

کام لینا شروع کر دیتے ہیں اور وہ تمام نیک اخلاق جو انسان کی قومی اور مذہبی زندگی کا اصل باعث ہوتے ہیں اُنکو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس رُوحِ مفاخرت کی وجہ سے قوم اپنے مقام سے گرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے جب موت اُس پر پوری طرح سوار ہو جاتی ہے اور ترقی کی دَوڑ میں ایک بے جان جسم سی بڑھکر اُس کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔

۳ھ تفسیر۔ كَلَّا ہمیشہ زجر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس جگہ بھی اہل مکہ کو خبردار اور ہوشیار کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اللہ تعالٰے اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ خبردار تمہاری یہ حالت سخت خطرے والی ہے ہم نے جو کہا ہے کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ تمہیں تکاثر نے گراتے گراتے اِس حالت تک پہنچا دیا ہے کہ تم مقبرہ میں جا پہنچے ہو۔ ہماری اس بات کی سچائی کو ابھی تم سمجھے نہیں اور تم خیال کرتے ہو کہ یہ محض ایک بڑ ہے۔ مگر یاد رکھو تھوڑے ہی دنوں تک تمہیں اچھی طرح پتہ لگ جائے گا کہ ہماری بات بالکل سچی ہے اور زندگی کے آثار تم میں موجود نہیں رہے۔ دیکھو اگر یہاں مقابر سے ظاہری قبریں مراد ہوتیں تو كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ کے کیا کوئی بھی معنے ہو سکتے تھے۔ کیا ابوجہل۔ عتبہ اور شیبہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ ہم نے ایک دن مرجانا ہے۔ جب وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ انسان فانی ہے اور وہ تھوڑی سی عمر لے کر اس دنیا میں آیا ہے تو یہ کہنا کسقدر بے معنی ہو جاتا تھا کہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم نے ضرور مرنا ہے دیکھو ہم پھر تمہیں بتاتے ہیں کہ تم نے ضرور مرنا ہے۔ اس صورت میں تو یہ ایک ہنسی کے قابل بات بن جاتی ہے کہ جس بات کو ہر فرد تسلیم کرتا ہے اُس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ دیکھو تمہیں اُس کا عنقریب پتہ لگ جائے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تمہیں اُس کا عنقریب پتہ لگ جائے گا۔

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اِس جگہ تباہی اور ذلت و رُسوائی والی قبر ہی مراد ہے اور یہی وہ قبریں تھیں جن کا کفار مکہ کو بڑی سختی سے انکار تھا۔ مٹی کی قبروں کو تو ابوجہل بھی تسلیم کرتا تھا مگر وہ اِس بات کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مَیں ہار جاؤں گا۔ ورنہ جس بات کو کوئی دوسرا شخص مانتا ہو اُس پر زور دینا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی دوسرے شخص سے کہے کہ مَیں کہتا ہوں تم آدمی ہو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم آدمی ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آدمی ہو۔ ان فقرات کو جو شخص بھی سُنے گا ہنس پڑے گا کہ کہنے والا پاگل ہو گیا ہے پس اگر اِس جگہ مٹی کی قبریں ہی مراد ہوتیں تو كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ اِس موت کو تو کفار مکہ میں سے ہر فرد تسلیم کرتا تھا اور جس بات کو اُن کا ہر چھوٹا بڑا تسلیم کرتا تھا اُس پر زور دینا بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس جگہ قومی تباہی اور بربادی کو ہی مقابر قرار دیا گیا ہے اور اللہ تعالٰے اُن سے فرماتا ہے کہ دیکھو ہوشیار ہو کر سُن لو تم ضرور جان لوگے کہ تم قبروں میں پہنچ چکے ہو۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ ہوشیار ہو جاؤ تم کو پتہ لگ جائے گا کہ ہم سچ کہتے ہیں كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ میں جو تکرار آیا ہے اِس کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ تکرار تاکیدِ مضمون کے لئے آیا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی خاص مواقع پر بات کو بار بار دُہراتے تھے۔ اِس صورت میں ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ میں یہ محذوف سمجھا جائے گا کہ ثُمَّ اَقُوْلُ كَلَّا

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝

(حقیقت تمہارے خیالات کے مطابق) ہرگز نہیں ہے) کاش تم علم الیقین کیساتھ (حقیقت کو) جانتے (تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ) تم ضرور جہنم کو (اسی دنیا میں) دیکھو گے

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝

(بلکہ) پھر تم اسے یقین کی آنکھ سے (آخرت میں) بھی دیکھ لو گے ۵۴

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اِس جگہ تکرار محض نہیں بلکہ چونکہ واقعہ مکرر ہوگا اِس لئے دو دفعہ بیان کیا ہے۔ اُن کے نزدیک پہلا تَعْلَمُوْنَ قبر کے متعلق ہے اور دُوسرا نشر کے متعلق۔ وہ فرماتے ہیں اَلْاَوَّلُ فِي الْقُبُوْرِ وَالثَّانِيْ فِي النُّشُوْرِ۔ مگر میرے نزدیک اِس جگہ یا تو تکرار تاکید ہے یا پہلا جملہ دنیا کے متعلق ہے اور دُوسرا آخرت کے متعلق۔ جیسے فرمایا مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل ع ۸) یعنی تمہیں دنیا میں بھی اپنی اِن حرکات کا انجام معلوم ہو جائے گا اور آخرت میں بھی تم عذابِ الٰہی میں مبتلا کئے جاؤ گے۔

۵۴ تفسیر۔ سابق مضمون کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ کفارِ مکّہ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم پھر کہتے ہیں خبردار ہو جاؤ۔ کیوں تمہیں پتہ نہیں لگتا کہ تم ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گر چکے ہو۔ یہ بات تو بالکل قطعی اور یقینی ہے کہ تم مر چکے ہو۔ زندگی کی کوئی علامت تم میں باقی نہیں رہی۔ موت کے سب سامان تمہارے لئے پیدا ہو چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو تم بھلا چکے ہو۔ بنی نوعِ انسان کے حقوق کو کلیتہً فراموش کر چکے ہو اور یہی دو چیزیں ہیں کسی قوم کی زندگی کی علامت ہوا کرتی ہیں۔ قوم زندہ ہوتی ہے اِسی طرح کہ خدا اُس قوم کے افراد کے دلوں میں زندہ ہوتا ہے جس قوم یا جس فرد کے دل میں اللہ تعالیٰ زندہ ہو وہ انسان زندہ کہلاتا ہے اور یا پھر بنی نوعِ انسان کی خدمت کا جذبہ کسی انسان کے دل میں ہو تو وہ انسان زندہ ہوتا ہے مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ نہ تمہیں خدا تعالیٰ کی طاقتوں پر کوئی یقین ہے نہ بنی نوعِ انسان کی خدمت کا کوئی جذبہ تمہارے اندر پایا جاتا ہے کاش تمہیں علم الیقین ہی ہوتا تب بھی تم اس حقیقت کو بھانپ لیتے اور سمجھ لیتے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے۔ یعنی جانتے دو اس بات کو کہ ہم نے تمہاری ہلاکت کے متعلق پیشگوئی کی ہے اور تم کہتے ہو کہ ہمیں اِس پیشگوئی کے پورا ہونے کا کوئی اعتبار نہیں مگر دنیا میں ہر فعل کا ایک مادی نتیجہ بھی ہوتا ہے اور جب کوئی شخص کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ میرے اِس فعل کا کیا نتیجہ نکلے گا تو کیا تم اس نقطۂ نگاہ سے اپنی حالت پر غور نہیں کر سکتے۔

لطیفہ مشہور ہے کہ شیخ چلّی درخت پر چڑھا تو اُسی شاخ کو کاٹنے لگ گیا جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ نیچے سے کوئی شخص گذرا تو اُس نے شیخ چلّی سے کہا کہ میاں تم یہ کیا کر رہے ہو کہ اُسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر خود بیٹھے ہو تم تو گر جاؤ گے۔ شیخ چلّی نے کہا تو کوئی عالم الغیب ہے تجھے کس طرح پتہ لگا کہ میں گر جاؤں گا۔ جاؤ میں تمہاری بات نہیں مانتا۔ وہ چلا تو تھوڑی دیر کے بعد ہی شاخ کے کٹتے ہی شیخ چلّی بھی نیچے آ گرا۔ یہ دیکھ کر وہ اُس شخص کے پیچھے بھاگا اور کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تُو ولی ہے کیونکہ جو بات تُو نے کہی تھی وہ بالکل سچی نکلی اور میں گر پڑا اُس نے کہا میں ولی نہیں میں نے ایک طبعی نتیجہ نکالا تھا کہ چونکہ تم اُسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر خود بیٹھے ہو اس لئے تمہارا گرنا یقینی ہے۔ تو ہر فعل کا ایک طبعی نتیجہ ہوتا ہے

جو بہر حال نکلتا ہے اور عقلمند انسان سمجھتا ہے کہ مَیں نے جو کچھ کیا ہے اُس کا کیا اثر ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہاری عقلیں تو اتنی ماری ہوتی ہیں کہ تم ذرا بھی غور سے کام نہیں لیتے۔ اگر تم علمی طور پر ہی غور کرتے تو تمہیں یقین آجاتا کہ تم مر رہے ہو اور ہلاکت کے سامان تمہارے لئے چاروں طرف سے جمع ہیں۔ قومی ہلاکت کے ایک خدائی سامان ہوتے ہیں اور ایک دنیوی سامان ہوتے ہیں۔ خدائی سامان تو یہ ہوتے ہیں کہ مثلاً اللہ تعالیٰ کو نہ مانا۔ اُس کے نبیوں کو نہ مانا۔ اُس کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ اور دنیوی سامان یہ ہوتے ہیں کہ قوم میں ظلم پایا جائے۔ غرباء و مساکین کی طرف اُسے کوئی توجہ نہ ہو۔ عیاشی میں اُس کے دن رات بسر ہونے لگیں۔ یہ دونوں سامان تمہارے لئے جمع ہیں۔ تم نے خدا تعالیٰ کو بھی ناراض کر لیا ہے اور بنی نوع انسان سے بھی تمہارا سلوک سخت ناقص ہے اور جب حالت یہ ہے تو تم کیونکر سمجھتے ہو کہ تم موت سے بچ سکو گے۔ پس فرماتا ہے كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو نہ مانو، جو کچھ مَیں کہتا ہوں اُسے جھوٹ کہہ دو مگر کیا تم نے علمی رنگ میں بھی کبھی اپنے حالات پر غور نہیں کیا کاش تمہیں علم الیقین ہی ہوتا تو تم سمجھتے کہ جس قوم میں تعلیم نہ ہو، جس قوم میں صدقہ و خیرات کی عادت نہ ہو، جس قوم میں انصاف نہ ہو، جس قوم میں انتظام نہ ہو، جس قوم میں رأفت نہ ہو اور رحمت نہ ہو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتی ہے اِس میں کسی نبی کے بتلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پس اگر تم میری باتوں کو تسلیم نہ کرتے صرف اپنے اندر علم الیقین پیدا کر لیتے تب بھی تم دیکھ سکتے تھے کہ جہنم تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ تم دیکھتے کہ ہم قوم کو تعلیم نہیں دے رہے۔ تم دیکھتے کہ ہم قوم سے انصاف نہیں کر رہے۔ تم دیکھتے کہ ہم اُس کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تم دیکھتے کہ ہم میں دیانت کی رُوح موجود نہیں۔ تم دیکھتے کہ ہم میں امانت کی رُوح موجود نہیں۔ تم دیکھتے کہ ہم میں تقویٰ کی رُوح موجود نہیں۔ اگر تم دیکھتے کہ ہم میں عدل و انصاف کی روح موجود نہیں۔ اسی طرح تم دیکھتے کہ ہم روپیہ کو صحیح طور پر خرچ نہیں کر رہے ہم اپنے باپ دادوں کی جائیدادوں کو عیاشی میں برباد کر رہے ہیں۔ اگر تم اِن باتوں پر ذرا بھی غور کرتے تو لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ تم جہنم کو اپنے سامنے کھڑا پاتے یعنی تم میری باتوں کو بے شک جھوٹ سمجھ لو لیکن اگر تم اپنے حالات پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے تو تم دیکھ سکتے تھے کہ جہنم تمہارے سامنے موجود ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ قسم محذوف کا جواب ہے کیونکہ جحیم دیکھنا کفار کے علم یقین کے ساتھ لازم نہیں۔ ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ رؤیت بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ رؤیتِ عقلی۔ رؤیت عینی اور رؤیت مشاہدہ۔ علم الیقین کے بدلہ میں بھی ایک رؤیت حاصل ہوتی ہے جو رؤیت علمی ہوتی ہے۔ جب کسی شخص کو بہ دلائل کسی آنیوالی مصیبت کا علم ہو جاتا ہے تو اُس علم کے مطابق اُس کے قلب کو اُس مصیبت کے متعلق تکلیف بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی معنے مراد لئے ہیں اور فرمایا ہے کہ اِس سورۃ میں علم کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔ علم الیقین اور جو علم اس کے بعد آتا ہے یعنی عین الیقین۔ یقین کی ایک تیسری قسم بھی آپ نے بیان کی ہے یعنی حق الیقین جس کا ذکر سورۃ الحاقہ میں اِن الفاظ میں ہے کہ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (ع) پس اس جگہ رؤیت سے مراد رؤیتِ عقلی یا رؤیتِ علمی ہے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ کہہ کر فرمایا کہ یہ تو علمی بات تھی مگر مَیں پھر کہتا ہوں کہ تم ضرور دیکھ لوگے کہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ ابھی تک تو تمہیں علمی رؤیت بھی حاصل نہیں لیکن تھوڑے دنوں تک تمہیں صرف علمی رؤیت ہی نہیں بلکہ عینی رؤیت بھی حاصل ہو جائیگی یعنی صرف دنیوی احساس ہی تباہی کے قریب پیدا نہ ہوگا بلکہ واقعہ میں پھر بلا نازل ہو جائے گی اور اُسے تم اپنی آنکھوں

ع ۲۷

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

پھر (یہ بھی یاد رکھو کہ) تم سے اُس دن (ہر بڑی) نعمت کے متعلق سوال کیا جائیگا (کہ تم نے اُس کا شکر ادا کیا یا نہ) ۵۵

سے دیکھ لوگے کیونکہ مجھے خدا نے بتایا ہے کہ تم ضرور تباہ ہو جاؤ گے۔

یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ تم پہلے دنیا میں اپنی تباہی دیکھو گے اور پھر آخرت میں عذاب الیم کا شکار ہو گے۔

۵۵ تفسیر۔ نَعِیْم کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے اِس کے متعلق عربی سے ناواقف لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ جمع ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں مَیں بھی اسی غلطی میں مبتلا تھا۔ عام تراجم میں بھی غلطی سے نَعِیْم کے معنے نعمتوں کے ہی کئے جاتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ نَعِیْم کے معنے صرف نعمت کے ہیں نعمتوں کے نہیں۔ مگر اِس لفظ کی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

اَلنَّعِیْم سے میرے نزدیک اِس جگہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مراد ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے تباہ اور برباد ہو جاؤ گے تو اُس وقت مَیں تم سے پوچھوں گا کہ بتاؤ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نعمت تھے یا نہیں؟ اُنہوں نے کب سے تمہیں ہوشیار کرنا شروع کیا تھا کہ بچ جاؤ ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں اپنے آپ کو مت گراؤ۔ مگر تم نے اُن کی نصیحت پر کان نہ دھرا اور آخر وہ وقت آگیا جب تم سچ مچ تباہ ہو گئے۔ تم غور کرو کہ کتنی بڑی نعمت تھی جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی مگر تم نے اُس سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ اُس نے تمہیں وقت پر ہوشیار کر دیا تھا کہ دیکھو تم ایک خطرناک گڑھے میں گر رہے ہو سنبھل جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا لو مگر تم پھر بھی نہ بچے اور اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلنَّعِیْم سے ہر بڑی نعمت مراد ہو اِس صورت میں آیت کا یہ مفہوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ایک ایک کر کے اپنی تمام بڑی نعمتیں اُن کے سامنے پیش کرے گا اور کہے گا کہ مَیں نے تمہیں یہ نعمت بھی دی وہ نعمت بھی دی مگر تم نے میری ساری نعمتوں کو ضائع کر دیا۔ مَیں نے تمہیں روپیہ دیا تو تم نے اپنے گھروں میں رکھ لیا اور یہ پسند نہ کیا کہ تم غریبوں پر خرچ کرو یا صدقہ و خیرات دو یا یتامیٰ و مساکین کی خبر گیری کرو۔ مَیں نے تمہیں حکومت دی تو تم نے لوگوں پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ مَیں نے تمہیں عزت دی تو تم نے لوگوں کو ذلیل سمجھنا شروع کر دیا۔ غرض کونسی نعمت تھی جو مَیں نے تمہیں دی اور تم نے اُس کا بُرا استعمال نہ کیا۔ پس اَلنَّعِیْم کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اَلنَّعِیْم سے نعمتِ کاملہ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مراد ہو۔ اِس صورت میں اِس کا یہ مفہوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اپنی نعمتِ کاملہ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کرے گا کہ تم نے اُس کی نصیحتوں سے کیوں فائدہ نہ اُٹھایا اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اَلنَّعِیْم سے ہر بڑی نعمت مراد ہو یعنی مال و دولت، عزت و رسوخ اور حکومت جو خدا نے اُنہیں دی تھی اُس کے متعلق اُن سے سوال کیا جائیگا اور پوچھا جائے گا کہ خدا تعالیٰ کے اتنے بڑے احسانات کے ہوتے ہوئے تم نے اِن نعمتوں سے کیا فائدہ اُٹھایا۔

لے اَلنَّعِیْم سے مراد محمد رسول اللہ صلعم کا وجود

یہ بھی انسان کے لئے سخت شرمندگی کا باعث ہوتا ہے کہ جب کسی بُرے کام کا نتیجہ نکل آئے تو اُسے یاد دلایا جائے کہ دیکھو فلاں وقت مَیں نے تمہیں کہا تھا کہ ہوشیار ہو جاؤ مگر تم ہوشیار نہ ہوئے۔ فلاں وقت مَیں نے تمہیں نصیحت کی تھی مگر تم اُس سے متأثر نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ بھی

ایسا ہی کرے گا اور اُن کو اپنی ہر بڑی نعمت یا نعمت کاملہ یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود یاد دلائیگا اور کہے گا کہ بتاؤ کیا میرے اِس قدر احسانات کے باوجود تمہارا یہی شیوہ ہونا چاہیئے تھا کہ تم ابا اور استکبار سے کام لیتے۔ مَیں نے خدا ہوکر چاہا کہ تم کو بچاؤں مگر تم نے بندے ہوکر نہ چاہا کہ ہلاکت سے بچو۔ غرض اللہ تعالیٰ اپنی ہر بڑی نعمت اُنہیں گنائے گا اور اُنہیں شرمندہ اور ملزم کرنے کے لئے کہیگا کہ میری نعمتوں کی تم نے کچھ بھی قدر نہ کی۔

دنیا میں لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ کا نظارہ۔

یہ تو آخرت کے لحاظ سے معنے ہیں۔ دنیا میں بھی تباہ شدہ اقوام پر لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ کا ایک وقت آیا کرتا ہے۔ جب قومیں تباہ ہوتی ہیں اُس وقت کفِ افسوس ملتی ہوئی ایک دوسرے سے کہا کرتی ہیں کہ ہمیں فلاں موقع ملا مگر ہم نے ضائع کر دیا۔ فلاں موقع ملا مگر ہم نے اُس سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا کاش ہم سنبھل جاتیں اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے نہ کھودتیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ اپنی خلافت کے ایام میں حج بیت اللہ کے لئے مکّہ میں تشریف لے گئے۔ جب حج سے فارغ ہوئے تو جیسے ہمارے ہاں عید کے موقعہ پر لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اسی طرح بڑے بڑے رؤوسا آپ کی خدمت میں مبارکباد دینے اور سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں حضرت عمرؓ بیٹھے تھے بڑے بڑے ہال اُس زمانہ میں نہیں ہوتے تھے کہ زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کے لئے گنجائش نکل سکے تھوڑے لوگ بھی آجاتے تو کمرہ بھر جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ اُس خاندان میں سے تھے جو انساب کو یاد رکھا کرتا تھا اور جسے معلوم ہوتا تھا کہ فلاں شخص فلاں خاندان میں سے ہے اور فلاں شخص فلاں خاندان میں سے۔ اُس وقت بڑے بڑے رؤوسا جو کفارِ مکہ کی اولاد میں سے تھے آپ سے ملنے کے لئے آئے وہ سمجھتے تھے کہ حضرت عمرؓ چونکہ ہمارے خاندانوں کے حالات سے خوب واقف ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کتنی بڑی عزت رکھتے تھے اِس لئے دوسروں کے مقابلہ میں وہ ہمیں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے حضرت عمرؓ نے بھی اُن کو نہایت عزت سے بٹھایا۔ اپنے پاس جگہ دی اور مختلف امور پر اُن سے باتیں شروع کر دیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ایک نومسلم غلام آگیا حضرت عمرؓ نے اُن سے فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور انہیں بیٹھنے کیلئے جگہ دے دو۔ وہ پیچھے ہٹ گئے تو حضرت عمرؓ نے اُس غلام کو اپنے پاس بٹھایا اور اُس سے باتیں شروع کر دیں تھوڑی دیر گذری تو ایک اور نومسلم غلام آگیا حضرت عمرؓ نے پھر فرمایا کہ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور اُن کو جگہ دے دو۔ وہ بیٹھا تو ایک تیسرا نومسلم غلام آیا پھر چوتھا پھر پانچواں یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے سات نومسلم غلام آگئے اور حضرت عمرؓ ہر غلام صحابی کے آنے پر اُن سے یہی فرماتے کہ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور اُن کو بیٹھنے کی جگہ دے دو معلوم ہوتا ہے اِس ابتلاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اُن رؤوسا پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا تھا کہ اب ساری عزت اسلام کی خدمت میں ہے کسی بڑے خاندان میں سے ہونا انسان کو عزت کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ جب اِس طرح یکے بعد دیگرے نومسلم غلام صحابہؓ کے آنے پر اُن کو پیچھے ہٹنا پڑا تو ہٹتے ہٹتے وہ جوتیوں کی جگہ پر جا پہنچے یہ دیکھ کر وہ کمرہ میں سے باہر نکل گئے اور اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا دیکھا آج ہماری کیسی ذلت ہوئی ہے۔ پھر وہ افسوس کرنے لگے کہ عمرؓ سے ہمیں اِس بات کی توقع نہیں تھی۔ عمرؓ تو جانتا تھا کہ ہم کتنے بڑے خاندانوں میں سے ہیں مگر افسوس کہ اُنہوں نے بھی ہماری عزت کی کوئی پروا نہ کی اور ہم پر غلاموں کو ترجیح دے دی۔ اُن میں سے ایک جو زیادہ سمجھدار تھا اُس نے جب یہ باتیں سُنیں تو کہنے لگا تم کیا باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم سوچتے نہیں کہ اِس میں عمرؓ کا کوئی قصور نہیں ہمارا

اپنا قصور ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں آئے تو اُنہوں نے متواتر اور مسلسل لوگوں سے کہا کہ آؤ اور مجھ کو مان لو۔ مگر ہمارے باپ دادا نے ہر دفعہ اُن کا انکار کیا اور اُنہیں سخت سے سخت تکالیف پہنچائیں۔ اب اگر ہمیں اِس کا کوئی خمیازہ بھگتنا پڑا ہے تو اِس میں عمرؓ کا کیا قصور ہے۔ ہمارے باپ دادا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا لیکن اِن غلاموں نے آپ کو مان لیا اور اسلام کے لئے ہر قسم کی قربانی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج غلاموں کو ہم پر ترجیح دی گئی ہے۔ اگر ہمارے باپ دادا اسلام کے لئے قربانی کرتے تو ہمیں بھی عزت ملتی۔ جب اُنہوں نے اُس وقت قربانی نہیں کی بلکہ اسلام کو قبول تک نہیں کیا تو آج ہمیں یہ شکوہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ اُن لوگوں کی ہمارے مقابلہ میں کیوں زیادہ عزت کی گئی ہے۔ اُنہوں نے کہا یہ بات تو درست ہے مگر آخر اس ذلت کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا چلو یہی بات حضرت عمرؓ سے دریافت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ پھر حضرت عمرؓ کے پاس گئے اُس وقت مجلس برخاست ہو چکی تھی اور صحابہؓ اپنے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے اُنہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا آج جو کچھ واقعہ ہوا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے ہم اُس کے متعلق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ اُن رؤوساء کی گذشتہ شان و شوکت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ اِن کے باپ دادا مکہ میں کتنی بڑی عزت رکھتے تھے جب اُنہوں نے یہ بات کہی تو حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور آپ نے فرمایا میں معذور تھا کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُس وقت مانا جب ساری دنیا آپ کی مخالف تھی اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کے لئے بڑی بڑی تکلیف برداشت کیں جب خدا نے اُن کو اسلام میں عزت دی تو میرا بھی فرض تھا کہ میں اُن کو عزت کے مقام پر بٹھاتا۔ اُنہوں نے کہا ہم یہ سمجھ کر آئے ہیں کہ اِس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے۔ یہ لوگ واقعہ میں اِسی عزت کے مستحق تھے مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی کفارہ ایسا نہیں جس سے یہ ذلت کا داغ ہماری پیشانیوں پر سے مٹ سکے؟ حضرت عمرؓ پر یہ سوال سُنکر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آپ الفاظ میں اُنکو کوئی جواب نہ دے سکے صرف آپ نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر شام کی طرف اشارہ کر دیا۔ شام میں اُن دنوں قیصر کی فوجوں سے اسلامی فوجوں کی جنگ ہو رہی تھی اور آپ کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اِس جنگ میں شامل ہو جاؤ اور اپنی جانیں اسلام کے لئے قربان کر دو تو شاید اِن گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ وہ نوجوان اِس بات کو سمجھ گئے اُسی وقت باہر نکلے، اُونٹوں پر سوار ہوئے اور سب کے سب اِس جنگ میں شامل ہونے چلے گئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھر اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی زندہ واپس نہیں آیا سب کے سب اِس جنگ میں قربان ہو گئے۔

پس بے شک قیامت کے دن بھی خدا تعالےٰ اپنی نعمتوں کے متعلق لوگوں سے سوال کرے گا اور اُن سے دریافت کرے گا کہ میری نعمتوں سے تم نے کیا فائدہ اُٹھایا۔ مگر اِس دنیا میں بھی جب قوموں پر تباہی وارد ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے کہا کرتی ہیں کہ ہمیں ترقی کا فلاں موقع ملا مگر ہم نے اُس سے فائدہ نہ اُٹھایا فلاں موقع ملا مگر ہم نے اُسے ضائع کر دیا۔

غرض قرآن کریم نے اِس سورۃ میں نہایت مختصر الفاظ میں وہ گُر بتایا ہے جس سے قومیں تباہ ہوتی ہیں اگر اِس گُر کو ہمیشہ یاد رکھا جائے تو کبھی قومی تباہی نہ آئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہوشیار کر دیا تھا کہ قومی تباہی کی سب سے بڑی وجہ تکاثر ہوتی ہے مگر افسوس کہ باوجود اِس کے کہ قرآن کریم نے اِس حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا تھا پھر بھی قومیں اِسی طرح گرتی چلی جاتی ہیں۔ خدا تعالےٰ کی نعمتیں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور وہ تکاثر کو زیادہ اہمیت دے کر اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں گرا لیتی ہیں ؎

سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ العصر۔ یہ سورۃ مکی ہے ۱؎

وَهِيَ ثَلَاثُ اٰيَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اس کی بسم اللہ کے سوا تین آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

سورۂ عصر مکی ہے

۱؎ سورۃ العصر اکثر مفسرین کے نزدیک مکی ہے مستشرقین کے نزدیک بھی یہ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے میور نے اِسے خواطر نفسیہ SOLILOQUISE میں سے قرار دیا ہے۔ یعنی وہ سورتیں جو اُس کے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مکالمہ بالنفس سے تعلق رکھتی ہیں اُن سورتوں میں اُس نے سورۃ العصر کو بھی شامل کیا ہے اور چونکہ وہ اِن کو بالکل ابتدائی سورتیں قرار دیتا ہے اِس لئے اُس کے نزدیک یہ بالکل ابتدائی مکی سورۃ ہے۔

۲؎ سورۂ عصر کا پہلی سورتوں سے تعلق

بعض روایات میں جو ہیں تو غیر معروف ایک عجیب واقعہ اِس سورۃ کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ عمرو بن عاص سے جبکہ وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے یہ روایت کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے کسی کام کے لئے مسیلمہ کذاب کے پاس گئے۔ اُس نے پوچھا تمہارے شہر کے نبی پر کوئی تازہ کلام نازل ہُوا ہے تو سُناؤ۔ عمرو بن عاص نے کہا ایک مختصر سی نئی سورۃ اُن پر نازل ہوئی ہے مگر ہے بڑی لطیف اور سورۃ العصر اُسے سُنائی۔ مسیلمہ نے سورۃ العصر سُن کر تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی پھر ایک بیہودہ سی عبارت با قافیہ پڑھکر عمرو بن عاص کو سُنائی اور کہا کہ یہ کلام ابھی مجھ پر نازل ہُوا ہے۔ پھر پوچھا کہ آپ اِس کے بارہ میں کیا کہتے ہیں۔ عمرو بن عاص نے کہا مجھ سے کیا پوچھتے ہو تم کو معلوم ہی ہے کہ میں تم کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار پر بھی اِس مختصر سورۃ کا ایک گہرا اثر تھا۔ حضرت امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ سورۃ بڑے وسیع مطالب رکھتی ہے اگر کوئی شخص اِس سورۃ پر تدبر کرے تو اُس کی تمام دینی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ دو صحابی رضی اللہ عنہم تھے جب بھی وہ آپس میں ملنے کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہونے لگتے تو یہ سورۃ ایک دوسرے کو سُناتے اور پھر سلام کر کے رخصت ہوتے۔ اِس کے بغیر وہ کبھی جدا نہیں ہوتے تھے گویا صحابہ رضی اللہ عنہم اِس سورۃ کے مضمون کی وسعت سے خاص طور پر متاثر تھے۔

ترتیب جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں گذشتہ چند سورتوں سے یہ طریق چلا آرہا ہے کہ ایک سورۃ اسلام کے ابتدائی زمانہ کے متعلق آتی ہے تو دوسری سورۃ اسلام کے دوسرے زمانہ کے متعلق آتی ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ اسلام کے ابتدائی زمانہ کے متعلق تھی اور وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ آخری زمانہ کے متعلق ہے۔ اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیوی ترقیات کسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتیں۔ قوموں پر ترقی کا ایک زمانہ ایسا آیا کرتا ہے جب وہ سمجھتی ہیں کہ اب ہمارے تنزل کی کوئی صورت نہیں۔ چونکہ اسلام پر بھی ایک ایسا زمانہ آنے والا تھا جب اُس کے دشمنوں نے اپنی مادی ترقیات پر نظر رکھتے ہوئے کہنا تھا کہ اب ہماری تباہی کی کوئی صورت نہیں یا اِدھر مسلمانوں نے دشمنوں کی حالت کو دیکھ کر سمجھ لینا تھا کہ ہمارے لئے اب ترقی کی کوئی صورت نہیں

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝

(مجھے) قسم ہے (آنحضرت صلعم کے) زمانہ کی (کہ) یقیناً (زمیوں کا مخالف) انسان (ہمیشہ ہی گھاٹے میں (رہتا) ہے ۵؎

اِس لئے اس زمانہ کی حالت کا نقشہ سورۃ العصر میں کھینچا گیا ہے. گویا اسمیں زمانۂ مسیح موعود ۲؎ کی پیشگوئی ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود بھی اس سورۃ کو اپنے زمانہ پر چسپاں فرمایا ہے۔

۵؎ حل لغات۔ عَصْرٌ۔ کہتے ہیں عَصَرَ الْعِنَبَ وَنَحْوَہٗ عَصْرًا: اِسْتَخْرَجَ مَاءَہٗ۔ انگور نچوڑ کر اُس کا پانی نکالا اور عَصَرَ الشَّیْءَ عَنْہُ کے معنے ہوتے ہیں مَنَعَہٗ ایک چیز کو دوسری چیز کے پاس پہنچنے سے روک دیا اور عَصَرَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں اَعْطَاہُ الْعَطِیَّۃَ اسے تحفہ دیا۔ اور عَصَرَہٗ کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَہٗ اُکو روک دیا (اقرب) اور عَصْر اس کا مصدر ہے اِس لئے سب مصدری معنے بھی اِس میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عصر دن کو بھی کہتے ہیں اور عصر کے معنے رات کے بھی ہوتے ہیں اور عصر کے معنے سورج ڈھلنے سے لے کر شام کے وقت تک کے بھی ہیں اور عصر کے معنے صبح سے لے کر سورج کے ڈھلنے تک کے بھی ہیں۔ (اقرب) گویا یہ لفظ اپنے اندر متضاد معنے رکھتا ہے۔ اِس کے معنے دن کے بھی ہیں یعنی وہ دن جس میں سورج چڑھا ہوا ہوتا ہے کیونکہ دن کا لفظ عام طور پر رات اور دن دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کے معنے رات کے بھی ہیں۔ اِسی طرح اِس کے معنے صبح سے زوال تک کے بھی ہیں اور زوال سے شام تک کے بھی ہیں۔ اس کی جمع اَعْصُرٌ وعُصُورٌ آتی ہے اور اس کے معنے علاوہ اوپر کے معانی کے قبیلہ کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْعَصْرُ: اَلرَّھْطُ وَالْعَشِیْرَۃُ اور عصر کے معنے اَلْمَطَرُ مِنَ الْمُعْصِرَاتِ کے بھی ہیں۔ یعنی تیز گھنی بدلیوں میں سے جو بارش برستی ہے اُسے بھی عصر کہتے ہیں۔ اور عصر کے معنے تحفہ اور انعام کے بھی ہوتے ہیں اور عَصْرٌ: عِصْرٌ: عُصُرٌ: دَھْرٌ یعنی زمانہ کے معنوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ اُس وقت اِس کی جمع پہلی جمع کے علاوہ ایک اور بھی استعمال ہوتی ہے پہلے معنوں کے لحاظ سے تو اس کی جمع صرف اَعْصُر و عُصُور ہوتی ہے لیکن زمانہ کے معنوں میں اس کی جمع اَعْصُر بھی ہے عُصُور بھی ہے اور اَعْصَار بھی ہے۔ پھر آگے اَعْصَار کی جمع الجمع اَعَاصِر آتی ہے۔ وَالْعَصْرِ میں واؤ قسم کی ہے اور وَالْعَصْرِ کے معنے یہ ہیں کہ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں عصر کو۔ کس بات کی شہادت کے طور پر؟ وہ دوسری آیت میں بیان کی گئی ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ یعنی انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔

عَصْرٌ

خُسْرٌ

خُسْر کے معنے گھاٹے کے ہوتے ہیں چنانچہ خَسِرَ التَّاجِرُ فِیْ بَیْعِہٖ (خَسْرًا وخُسْرًا وخُسُرًا وخُسْرَانًا وخَسَارَۃً) کے معنے ہوتے ہیں وُضِعَ فِیْ تِجَارَتِہٖ اُس نے اپنی تجارت میں نقصان اُٹھایا وَضِدُّ رَبِحَ اور یہ نفع کے مقابل کا لفظ ہے۔ یعنی اِس کے معنے گھاٹے کے ہوتے ہیں۔ اِسی طرح جب خَسِرَ الرَّجُلُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں ضَلَّ وہ گمراہ ہوگیا۔ لیکن کبھی اِس کے معنے ھَلَکَ کے بھی ہوتے ہیں یعنی وہ ہلاک ہوگیا (اقرب) پس اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کے معنے یہ ہوئے کہ انسان یقیناً گھاٹے میں ہے یا انسان یقیناً گمراہی میں مبتلا ہے یا انسان یقیناً ہلاکت کی طرف جارہا ہے۔

تفسیر۔ عصر کے مختلف معانی جو اوپر بتائے گئے ہیں اُن کے لحاظ سے اِس آیت کے بھی مختلف معانی ہوجائینگے عصر کے ایک معنے دن کے پہلے حصہ یعنی صبح سے دوپہر تک کے ہیں اور دوسرے معنے دن کے پچھلے حصہ یعنی دوپہر سے شام تک کے ہیں۔ چونکہ قرآن کریم اپنے مطالب میں ذوالوجوہ ہے اور اُس کی ایک ایک آیت اپنے اندر کئی بطون رکھتی ہے اِس لئے جتنے معنے کسی لفظ کے لغتاً یا محاورۃً ہوسکتے ہوں

عصر کے مختلف معانی کے اعتبار سے والعصر کا مطلب۔

اور وہ کسی آیت پر چسپاں بھی ہوتے ہوں ہم اُن تمام معانی کو ملحوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ کے ماتحت اگر عصر کے معنے دن کے پہلے اور پچھلے حصہ کے کئے جائیں تو اس جگہ عرفی دن جس کا مادی سورج کے ساتھ تعلق ہے وہ مراد نہیں ہوگا بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ رسالت مراد ہوگا۔ کیونکہ قرآن کریم نے صراحتاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سورج قرار دیا ہے جیسا کہ سورۃ الشمس میں اس کا ذکر آتا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سورج ہوئے تو لازمی طور پر آپ کا زمانہ دن کہلا ئیگا۔ اور ایک دن کا ابتدائی حصہ ہوگا اور ایک آخری حصہ ہوگا پس عصر کے معنے اگر ہم دن کے ابتدائی اور آخری حصہ کے لیں تو جہاں مادی طور پر روزانہ چڑھنے والے سورج کو مدنظر رکھتے ہوئے دن کا ایک ابتدائی حصہ مراد لیتے ہیں اور ایک آخری حصہ مراد لیتے ہیں وہاں قرآن کریم نے چونکہ خصوصیت کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا نام دن رکھا ہے اس لئے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم زمانۂ نبوت محمدیہ کے ابتدائی حصہ کو بھی تمہارے سامنے شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ہم زمانۂ نبوت محمدیہ کے آخری حصہ کو بھی تمہارے سامنے بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ اگر تم

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ میں انسان سے مراد کافر انسان

اِن دونوں حصوں کو دیکھو گے اور ان پر غور اور تدبر سے کام لوگے تو تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔

اِن معنوں کے رُو سے الانسان سے وہ انسان سمجھا جائیگا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کھڑا ہوا۔ کیونکہ ہر جگہ الفاظ کے اُن کی نسبت کے لحاظ سے معنے ہوتے ہیں۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سورج ہوئے تو گھاٹا پانیوالا انسان بہرحال وہی ہوا جس نے سورج سے فائدہ نہ اُٹھایا پس الانسان سے اس جگہ سورج کے مخالف کھڑا ہونے والا انسان مراد ہے یعنی وہ جس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے فائدہ نہ اٹھایا۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں مومنوں کا استثنیٰ کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ الانسان سے غیر مومن انسان مراد ہیں نہ کہ مومن۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جگہ کفار کو الانسان کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کو الانسان اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ہمیشہ سے یہ سُنّت چلی آئی ہے کہ جب بھی اُس کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے اُس پر ابتداء میں ایمان لانے والے عام طور پر ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ بے شک وہ عالم ہوں، متقی ہوں، اللہ تعالیٰ کے احکام کو سمجھنے والے ہوں، دینی امور میں نہایت بالغ نظر رکھنے والے ہوں، روحانیت اور تقویٰ کے بلند مقام تک پہنچے ہوئے ہوں پھر بھی دنیوی لحاظ سے وہ ادنیٰ طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس نہ دولت ہوتی ہے نہ حکومت ہوتی ہے نہ ظاہری طاقت ہوتی ہے اور اُن کے دشمن ان میں سے ایک ایک چیز کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ صاحبِ دولت بھی ہوتے ہیں، وہ صاحبِ وجاہت بھی ہوتے ہیں اور وہ صاحبِ حکومت بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اُن کو کسی گنتی اور شمار میں نہیں سمجھتے۔ ہمارے ہاں بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کسی کی تحقیر کرنی ہو تو کہا جاتا ہے وہ کونسی گنتی میں ہے یا کہا جاتا ہے وہ بھی کوئی آدمی ہے۔ پس الانسان میں کفار کی اسی ذہنیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمان اُن کی نگاہ میں ایسے بے حقیقت ہیں کہ وہ اُن کو انسانوں میں شمار ہی نہیں کرتے۔ صرف اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں۔ پس چونکہ کفار نبیوں کے اتباع کے متعلق ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں کہ وہ بھی کوئی آدمی ہیں۔ آدمی تو ہم ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ اُن کے مقابل میں طنزیہ رنگ اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے یہ جو اپنے آپ کو آدمی سمجھتے اور الانسان قرار دیتے ہیں ہم عصر کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو بے شک انسان قرار دیں اور بے شک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانیوالوں کے متعلق کہتے رہیں کہ وہ بھی کوئی آدمی ہیں حقیقت یہی ہے کہ

یہ اپنے آپ کو انسان قرار دینے والے اور دوسروں کو دائرہ انسانیت سے خارج سمجھنے والے تباہی اور بربادی کے رستہ کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ گویا جس لفظ سے وہ اپنے آپ کو یاد کیا کرتے تھے اور جس لفظ کا استعمال وہ اپنے لئے فخر کا موجب سمجھتے تھے اُسی کو طنزیہ طور پر ان کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (الدخان ع۳) جب دوزخی دوزخ میں ڈالا جائے گا تو اُسے کہا جائے گا تو اِس عذاب کا مزہ چکھ۔ تُو تو بڑا عزت والا ہے تُو تو بڑے رُتبے والا ہے۔ حالانکہ وہ اُس وقت دوزخ میں داخل کیا جا رہا ہوگا اور اس لحاظ سے اُس کی عزت اور رُتبے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ عزت والا ہوتا تو دوزخ میں کیوں ڈالا جاتا اور اگر رُتبے والا ہوتا تو آخرت میں کیوں ذلیل ہوتا۔ اُس کا دوزخ میں ڈالا جانا ہی بتاتا ہے کہ نہ اُسے عزت حاصل تھی اور نہ اُسے رتبہ حاصل تھا۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ دوزخ میں ڈالتے وقت اُسے یہ کہا جائے گا۔ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ طنزیہ طور پر اِن الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تُو تو کہا کرتا تھا کہ میں بڑا عزیز ہوں اور تُو کہا کرتا تھا کہ میں بڑا کریم ہوں۔ آج تُو دوزخ میں جا اور دیکھ کہ تیرے عزیز اور کریم ہونے کا دعویٰ کہاں تک حق بجانب تھا۔ اِسی طرح الانسان میں وہ دعویٰ انسانیت مراد ہے جو دشمنانِ اسلام کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آدمی تو ہم ہیں یہ بھلا کس گنتی اور شمار میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے گنتی اور شمار والے انسان تجھے پتہ لگ جائے گا کہ تُو گھاٹے کی طرف جا رہا ہے تیرے دعوے سب خاک میں مل جائیں گے اور جن لوگوں کو تُو حقارت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتا کہ وہ بھی کوئی انسان ہیں اُن بظاہر ادنیٰ نظر آنے والے لوگوں کے مقابلہ میں تجھے ایسی ذلت اور رُسوائی نصیب ہوگی کہ دنیا تیرے وجود سے عبرت حاصل کرے گی۔ آخر یہ

غور کرنے والی بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو الانسان کیوں کہتے تھے۔ اُن کا اپنے آپ کو الانسان کہنا اِس وجہ سے تھا کہ جو چیزیں اُن کے پاس تھیں اُن کی وجہ سے لوگ یقینی طور پر جیتا کرتے ہیں اور جو چیزیں مسلمانوں کے پاس نہیں تھیں اُن کا فقدان لوگوں کے لئے یقینی طور پر شکست کا موجب ہُوا کرتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے آپ کو الانسان اِس لئے کہتے تھے کہ ہم حاکم ہیں اور مسلمان محکوم ہیں اور یہ ایک واضح امر ہے کہ دنیا میں عام طور پر حاکم ہی جیتا کرتے ہیں محکوم نہیں جیتا کرتے۔ بے شک حاکم بھی بعض دفعہ ہار جاتے ہیں مگر اُس وقت جب رعایا اُن کے خلاف ہو۔ اگر رعایا اُن کے ساتھ ہو تو وہ شکست نہیں کھاتے۔ اِسی طرح جب وہ کہتے تھے کہ ہم آدمی ہیں مسلمان بھلا کس گنتی اور شمار میں ہیں تو اُن کا مطلب یہ ہُوا کرتا تھا کہ ہم تو کثیر ہیں اور یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ (الشعراء ع۴) انہوں نے ہمارے مقابلہ میں کیا فتح حاصل کرنی ہے۔ اور یہ بھی ایک واضح امر ہے کہ عام طور پر اکثریت ہی فتح حاصل کرتی ہے اقلیت فتح حاصل نہیں کرتی۔ پھر قوموں کو جتھہ غلبہ دیا کرتا ہے اور یہ جتھہ بھی اہل مکہ کے پاس تھا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں تھا۔ اسی طرح قوموں کو دولت سے غلبہ حاصل ہُوا کرتا ہے مگر دولت بھی دشمنوں کے پاس تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں تھی۔ قوموں کو سیاست اور ارد گرد کی اقوام سے دوستانہ تعلقات کے نتیجہ میں غلبہ حاصل ہُوا کرتا ہے مگر سیاست بھی دشمنوں کے قبضہ میں تھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں نہیں تھی۔ قوموں کو صنعت و حرفت سے غلبہ حاصل ہُوا کرتا ہے مگر صنعت و حرفت بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ کفار مکہ کے ہاتھ میں تھی۔ غرض جتنی چیزیں دنیا میں کسی قوم کو ترقی دینے کا موجب ہوتی ہیں وہ سب کی سب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ہاتھ میں تھیں۔ اور جتنی چیزیں بظاہر کسی قوم کی شکست کا موجب ہوتی ہیں وہ سب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

آپ کے ساتھیوں میں پائی جاتی تھیں پس فرماتاہے بیشک تم اپنے متعلق کہتے ہو کہ ہم آدمی ہیں اور ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تمہارے پاس وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو انسان کو انسان بنادیتی ہیں۔ تمہارے پاس حکومت بھی ہے۔ تمہارے پاس دولت بھی ہے۔ تمہارے پاس سیاست بھی ہے۔ تمہارے پاس صنعت و حرفت بھی ہے۔ تمہارے پاس تجارت بھی ہے غرض وہ سب چیزیں تمہارے پاس ہیں جن سے دنیا میں قوموں کو عروج حاصل ہُوا کرتاہے مگر باوجود یہ تسلیم کرلینے کے کہ الانسان کہلانے کے تم ہی مستحق ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی دنیوی نقطۂ نگاہ سے کسی گنتی اور شمار میں نہیں ہیں پھر بھی ہم بطور پیشگوئی کے یہ اعلان کرتے ہیں کہ اے کامل انسان! اے ہر قسم کے ساز و سامان رکھنے والے انسان!! اِس زمانۂ محمدیہ میں تیرے ساز و سامان تیرے کام نہیں آئیں گے اور تُو گھاٹے میں ہی رہے گا۔ بیشک دنیا میں عام طور پر یہ قانون جاری ہے کہ جب کسی کے پاس سیاست ہو۔ جب کسی کے پاس جتھہ ہو۔ جب کسی کے پاس علم ہو جب کسی کے پاس حکومت ہو۔ جب کسی کے پاس دولت ہو۔ جب کسی کے پاس صنعت و حرفت ہو تو ایسا شخص ضرور جیتا کرتاہے مگر یہاں ایسا نہیں ہوگا۔ اب زمانہ نبوت محمدیہ آگیاہے اور اب اِس قانون کی بجائے ایک اور قانون جاری کردیاگیاہے۔ اب دولت کے باوجود تم ہاروگے سیاست کے باوجود تم ہاروگے جتھہ کے باوجود تم ہاروگے علم کے باوجود تم ہاروگے۔ حکومت کے باوجود تم ہاروگے صنعت و حرفت کے باوجود تم ہاروگے۔ اور تمہارا یہ ہارنا اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ رسالت میں سچے ہیں۔ ورنہ اگر کسی کے پاس جتھہ نہ ہو تو اس کا ہارنا کونسا ہارنا ہے۔ اگر کسی کے پاس علم نہ ہو تو اُس کا ہارنا کونسا ہارنا ہے اگر کسی کے پاس حکومت نہ ہو تو اُس کا ہارنا کونسا ہارناہے۔ اگر کسی کے پاس سیاست نہ ہو تو اُس کا ہارنا کونسا ہارنا ہے۔ یہ ساری چیزیں ہوتے ہوئے کسی قوم کا گھاٹے میں چلے جانا اصل گھاٹاہے اور یہی وہ تنزل اور بربادی کا مقام ہے جس کی اہل مکہ کو اِن الفاظ میں خبر دی گئی ہے کہ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ ہم اس زمانہ کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ انسان دنیوی طور پر خواہ کتنے ساز و سامان رکھتا ہو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ ضرور گھاٹے میں چلا جاتاہے

اب سوال پیدا ہوتاہے کہ یہ کس بات کی شہادت ہوئی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں عام قاعدہ یہ ہے کہ دنیوی سامانوں سے قومیں جیتا کرتی ہیں ہارا نہیں کرتیں۔ اِسی وجہ سے لوگ کہا کرتے ہیں کہ چونکہ دنیا میں تعلیم سے ترقی حاصل ہوتی ہے ہمیں بھی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے یا چونکہ سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے دنیا میں ترقی ہوتی ہے اس لئے ہمیں بھی سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ وہ اپنی تمام ترقی دنیوی تدابیر سے وابستہ قرار دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اگر کوئی ترقی کرنا چاہے تو اُس کے لئے واحد طریق یہی ہوتاہے کہ وہ دنیوی سامان اپنے پاس زیادہ سے زیادہ رکھے اُس کے پاس علم بھی ہو، اُس کے پاس دولت بھی ہو، اُس کے پاس طاقت بھی ہو، اُس کے پاس جتھہ بھی ہو، اُس کے پاس صنعت و حرفت بھی ہو۔ اور جب کسی کو یہ تمام چیزیں میسر آجائیں تو وہ خیال کرتاہے کہ اب اُس کا ترقی نہ کرسکنا بالکل محال اور ناممکن ہے۔ چونکہ عام طور پر دنیا میں ہمیں یہ نظارہ نظر آتاہے کہ قومی ترقی دنیوی تدابیر سے وابستہ ہوتی ہے اِس لئے جب کہا جاتاہے کہ اگر تم نے خدا تعالیٰ کے احکام پر عمل کیا تو ترقی حاصل کروگے اور اگر عمل نہ کیا تو گر جاؤگے۔ تو وہ لوگ جو دنیوی تدابیر کو ہی ہر قسم کی کامیابیوں کا علاج سمجھتے ہیں حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو کہ خدا تعالےٰ کے احکام پر عمل کیا تو ہمیں ترقی ہوگی اور اگر عمل نہ کیا تو ترقی نہیں ہوگی۔ دنیا میں تو ہمیں یہی نظر آتاہے کہ جو شخص دنیوی تدابیر کو اپنے کمال تک پہنچا دیتاہے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتاہے خواہ وہ خدا تعالےٰ کے شرعی احکام کا

کتنا ہی منکر ہو اور جب حالت یہ ہے تو تمہارا اللہ تعالیٰ کے وجود کو پیش کرنا اور کہنا کہ خدا تعالیٰ کے احکام سے انحراف کیا تو تم تنزّل میں گر جاؤ گے بالکل خلافِ عقل امر ہے۔ خدا تعالیٰ کی حکومت تو ہمیں اس دنیا میں نظر ہی نہیں آتی۔ دنیا خدا تعالیٰ کی منکر ہوتی ہے مگر پھر بھی ترقی کر جاتی ہے۔ اور جب دنیوی تدابیر سے کام لینے کے نتیجہ میں ہی تمام کارخانۂ عالم چل رہا ہے تو ہمیں تمہاری بات کا یقین کیونکر آئے اور کس طرح پتہ لگے کہ خدا تعالیٰ کی حکومت اور اُس کا رعب اور دبدبہ بھی اِس دنیا میں جاری ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ لوگ خدا تعالیٰ سے باغی ہوتے ہیں مگر پھر بھی ترقی حاصل کر لیتے ہیں۔ پس اگر تمہاری یہ بات اپنے اندر کوئی وزن رکھتی ہے تو تم خدا تعالیٰ کی حکومت کا ہمارے سامنے کوئی ثبوت پیش کرو۔ ورنہ یہ ایک واضح امر ہے کہ دنیوی ترقیات میں خدا تعالیٰ کا کوئی دخل نہیں۔ یہ چیز محض دنیوی تدابیر سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو شخص اِن تدابیر میں پورا حصہ لیتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو نہیں لیتا وہ ناکام رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اِس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ کسی وقت دنیوی تدابیر سے کام لے کر بعض لوگوں کا دنیا پر غالب آجانا یا ترقی کرنا اِس بات کا ثبوت نہیں کہ خدا تعالیٰ کی حکومت اِس دنیا میں نہیں۔ کیونکہ ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے جب دنیا کے پاس اپنی ترقی کے تمام سامان موجود ہوتے ہیں۔ مگر جب کوئی نبی آتا ہے تو اکیلا نبی ساری دنیا کے مقابلہ میں جیت جاتا ہے اور ساز و سامان رکھنے والے ناکامی اور نامرادی سے حصہ لیتے ہیں۔ اُس وقت پتہ لگ جاتا ہے کہ خدا ہے۔ ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اکیلا شخص تو جیت جاتا اور ساری دنیا اپنے تمام سامانوں کے ساتھ شکست کھا جاتی پس فرماتا ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ یہ جو اصول ہے کہ خدا تعالیٰ کا مقابلہ کر کے کوئی انسان جیت نہیں سکتا اِس اصول کو ہر زمانہ میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ صرف زمانۂ نبوت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ وقت ایسا ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی طاقت اور قوت اور جلال کا اظہار کرتا ہے۔ اگر اُس وقت بھی لوگ جیت جائیں تو بے شک کہا جا سکتا ہے کہ جب زمانۂ نبوت میں بھی لوگ غالب آگئے تو خدا تعالیٰ کی خدائی اور اُس کی حکومت کا کیا ثبوت رہا۔ مگر جب اُس زمانہ میں دنیا اپنے تمام سامانوں کے باوجود کامیاب نہیں ہوتی اور وہ اپنی ہر تدبیر میں بُری طرح ناکامی کا مُنہ دیکھتی ہے تو یہ ثبوت ہوتا ہے اِس بات کا کہ دنیا پر خدا کی حکومت ہے۔ اگر کسی زمانہ میں وہ اپنی حکومت ظاہر نہیں کرتا تو اِس سے اُس کی حکومت کی نفی نہیں ہو جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنی حکومت ظاہر نہیں کرنا چاہتا ورنہ اُس کی حکومت کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ زمانۂ نبوت میں جب وہ اپنی حکومت ظاہر کرتا ہے تو ساری دنیا اپنے سارے سامانوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کے نبی کے مقابلہ میں شکست کھا جاتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی حکومت اور اُس کے دبدبہ اور اُس کی شوکت کا فیصلہ صرف زمانۂ نبوت سے ہوا کرتا ہے۔ اگر زمانۂ نبوت نہ ہو تو دنیا کو دیکھ کر یہ قیاس کر لینا کہ چونکہ دنیا نے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کئے بغیر بڑی ترقی حاصل کر لی ہے اِس لئے معلوم ہوا کہ دنیا پر خدا تعالیٰ کی حکومت نہیں بالکل غلط اور باطل خیال ہوگا۔ کیونکہ اگر دنیا پر اُس کی حکومت نہیں تو وجہ کیا ہے کہ زمانۂ نبوت میں ایک کمزور انسان جو ہر قسم کے سامانوں سے تہیدست ہوتا ہے ساری دنیا کے مقابلہ میں جیت جاتا ہے۔ آخر اِس کی کوئی طبعی وجہ ہونی چاہیئے اور چونکہ طبعی وجہ کوئی نہیں، اِدھر ہمیں ایک نبی کا دعویٰ نظر آتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں اور وہ مجھے مخالف حالات کے باوجود کامیابی عطا فرمائے گا تو یہ ثبوت ہوتا ہے اِس بات کا کہ واقعہ میں خدا تعالیٰ کی حکومت اِس دنیا پر جاری ہے۔ دنیا میں بھی دیکھ لو ماں باپ کے پاس کئی دفعہ بچے شور مچا رہے ہوتے ہیں مگر وہ اُن کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے۔ لیکن ایک وہ وقت ایسا آتا ہے جب

کوئی بچہ ذرا بھی شور ڈالتا ہے تو باپ اُسے ایک تھپڑ رسید کر دیتا ہے اور وہ اُسی وقت خاموش ہو جاتا ہے تب پتہ لگتا ہے کہ باپ کی حکومت موجود ہے۔اسی طرح بعض دفعہ ایک طالبعلم سبق یاد کرکے سکول میں نہیں جاتا تو اُستاد اُسے کچھ بھی نہیں کہتا۔مگر ایک دن جب وہ سبق نہیں سناتا تو اُستاد اُسے بید کی سزا دے دیتا ہے اور لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اُستاد کی حکومت موجود ہے۔پس کسی وقت ماں باپ کا اپنے بچوں کو خاموش نہ کرانا یا اُستاد کا اپنے شاگرد کو بید کی سزا نہ دینا اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ ماں باپ کی بچوں پر حکومت نہیں یا استاد کی شاگردوں پر حکومت نہیں۔کیونکہ جب ماں باپ یا اُستاد سزا دیتے ہیں ہر ایک کو پتہ لگ جاتا ہے کہ انکی حکومت موجود تھی۔صرف اتنی بات تھی کہ پہلے اُنہوں نے اس حکومت سے کام نہیں لیا تھا۔اسی طرح بیسیوں دفعہ لوگ گورنمنٹ کے خلاف شور مچاتے ہیں مگر گورنمنٹ اُن کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کرتی۔لیکن ایک دن آتا ہے جب حکومت کے خلاف کوئی ذرا بھی شور مچائے تو اُسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے۔اب اگر گورنمنٹ کچھ عرصہ تک کسی کو گرفتار نہیں کرتی تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ گورنمنٹ موجود نہیں کیونکہ دوسرے وقت حکومت اسے گرفتار کرکے سزا دے دیتی ہے جو ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ گورنمنٹ موجود ہے پس گورنمنٹ کا کسی کو نہ پکڑنا اس بات کا ثبوت نہیں ہوتا کہ حکومت نہیں بلکہ اس کا پکڑنا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ حکومت ہے۔

یہی دلیل اللہ تعالیٰ اِس جگہ بیان کرتا ہے کہ زمانۂ نبوتِ محمدیہ کو ہم اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے طور پر کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔اور اگر کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُسے ڈھیل دی گئی ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر انسان ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب خدا چاہتا ہے کہ دنیا اُس کے احکام کے تابع چلے تو وہ اپنا نبی لوگوں میں بھیج دیتا ہے۔

پھر خواہ دنیا کے پاس کتنے بڑے سامان ہوں وہ اُن سے کام لے کر کبھی جیت نہیں سکتی۔

عَصر کے دوسرے معنے دن کے آخری حصہ کے ہیں اِن معنوں کے لحاظ سے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ جب اسلام پر تنزل کا زمانہ آئے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کے احیاء کے لئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ مبعوث فرمائے گا اُس وقت پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان رکھنے والوں کے پاس کسی قسم کے ظاہری سامان نہیں ہونگے۔ دنیا سمجھے گی کہ دشمن بڑا طاقتور اور قوی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جماعت سخت کمزور ہے۔یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت جیت جائے اور دشمن اپنے تمام سازو سامان کے ساتھ شکست کھا جائے۔مگر باوجود اس حقیقت کے کہ دشمن طاقتور ہوگا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے سخت کمزور ہوں گے آخر نتیجہ یہی نکلے گا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔اُن کے مقابل کے دشمن جو یہ کہا کریں گے کہ ہم ہی انسان ہیں یہ ہمارے مقابلہ میں بھلا کیا حیثیت رکھتے ہیں وہ انسان کہلانے والے ہار جائیں گے اور جن کو کسی گنتی میں نہیں سمجھا جاتا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اُسکی تائید کے ساتھ کامیاب ہو جائیں گے پہلے زمانہ میں لوگوں کو اس اصول کی صداقت کا تجربہ ہو چکا ہے۔دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع کو ذلیل سمجھا کرتے تھے ہار گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی سامان نہ رکھنے کے باوجود جیت گئے اور پھر فتح و کامیابی کا یہ زمانہ چند سالوں تک نہیں رہا بلکہ صدیوں تک چلتا چلا گیا۔مسلمانوں نے اس وقت سائنس کی ایجادات میں خاص طور پر دسترس حاصل نہیں کی تھی۔نہ اُن میں تجارت کا کوئی خاص ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔نہ انہیں علمی لحاظ سے دوسروں پر کوئی غیر معمولی فوقیت حاصل تھی۔وہ ویسی ہی تجارت

کرتے تھے جیسے دوسرے لوگ تجارت کرتے ہیں ویسا ہی اُن کے پاس مال تھا جیسے دوسروں کے پاس مال تھا۔ ویسا ہی اُن کا علم تھا جیسے دوسروں کا علم تھا۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی ترقی اسلام کی وابستگی کے ساتھ مخصوص کر دی تھی نہ یورپ میں یہ خوبی پائی جاتی تھی۔ نہ چین میں یہ خوبی پائی جاتی تھی۔ نہ جاپان میں یہ خوبی پائی جاتی تھی۔ مگر جو مسلمانوں سے ملتا تھا اُس میں ترقی کی رُوح پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی طرح علوم موجود تھے، محنت کرنے والی قومیں موجود تھیں، روپیہ خرچ کرنے والے لوگ موجود تھے۔ مگر اسلام کے سوا اور کوئی چیز دنیا کو صدیوں تک ترقی کی طرف نہ لے جا سکی۔ آخر وجہ کیا ہے کہ انسانی تدابیر اُس وقت ناکارہ ہو گئیں؟ اس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ وہ زمانہ ظہورِ نبوت تھا جس میں خدا تعالیٰ کا ایک نیا قانون جاری ہو جاتا ہے اور جس میں محض دُنیوی تدابیر سے کام نہیں چل سکتا بلکہ ایمان کو عمل کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اُس وقت خدا تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہی دنیا کی ترقی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں شامل کرے گا وہ جیت جائے گا اور جو اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں شامل نہیں کرے گا وہ ہار جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہر قوم جو اسلام سے دُور رہی ترقی سے بھی دُور رہی اور ہر قوم جو اسلام سے وابستہ ہوئی وہ ترقی سے بھی ہمکنار ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو نظارہ تم اسلام کے ابتدائی زمانہ میں دیکھ چکے ہو ویسا ہی نظارہ اسلام کے آخری زمانہ میں بھی رونما ہوگا۔ چنانچہ اب جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دوسری بعثت ہوئی ہے اِس زمانہ میں بھی ایسی قومیں موجود ہیں جو سمجھتی ہیں کہ ہم ہی انسان ہیں چنانچہ جب وہ ہیومینی ٹیرین HUMANITARIAN کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یورپ کے لوگوں کو یورپ کے لوگوں سے سختی نہیں کرنی چاہیئے یا امریکہ کے لوگوں کو امریکہ کے لوگوں سے سختی نہیں کرنی چاہیئے۔ اِس کے علاوہ اُن کا اور کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب وہ حُریت و مساوات کے نعرے بلند کرتے ہیں تو اِس حُریت اور آزادی سے بھی اُن کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ مغربی لوگوں کو آزادی ملنی چاہیئے ایشیا کے لوگ اُن کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں ہوتے کیونکہ ایشیا والوں کو وہ انسان ہی نہیں سمجھتے۔ پس فرماتا ہے وہ زمانہ پھر آنے والا ہے جب دنیا کا ایک طبقہ اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہوئے باقی سب دنیا کو ذلیل قرار دے گا۔ اِس زمانہ نبوت میں بھی باوجود اِس کے کہ دشمنانِ اسلام کے پاس ہر قسم کے سامان ہوں گے اور دنیا اُن کی طاقت کو دیکھتے ہوئے کہے گی کہ یہ لوگ کبھی ہار نہیں سکتے۔ اِن کی شوکت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اِن کا رُعب اور دبدبہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ چونکہ وہ زمانہ نبوت ہوگا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس زمانہ میں دوسری بعثت ہوگی اِس لئے باوجود سامان رکھنے کے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمزور نظر آنے والی جماعت کے مقابلہ میں ہار جائیں گے اُن کی طاقت کچل دی جائے گی اور یہ نشان دنیا میں پھر ظاہر ہوگا کہ زمانہ نبوت میں جو قوم اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے مقابلہ میں کھڑی ہوتی ہے وہ یقیناً خسران و تباب میں رہتی ہے۔

بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ تم ایسا کیوں کہتے ہو کہ نبی پر ایمان لائے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ دنیا کی ترقی تو دنیوی سامانوں سے وابستہ ہے نہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسل کے ساتھ۔ جب دنیا میں ہمیشہ سے وہی اقوام جیتتی چلی آئی ہیں جو اپنے ساتھ دنیوی سامان رکھا کرتی ہیں تو اس نظریہ کے خلاف تم یہ نیا نظریہ کیوں پیش کر رہے ہو کہ جب تک لوگ اللہ تعالیٰ کے مامور پر ایمان نہ لائیں وہ کبھی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ آج کل بھی احمدیت کے مقابلہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقوں کی طرف سے یہ سوال پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ترقی کا اصل ذریعہ تو یہ ہے کہ مدرسے جاری کئے جائیں

یونیورسٹیاں بنائی جائیں۔ کارخانے قائم کئے جائیں۔ صنعت و حرفت کو فروغ دیا جائے۔ سیاسی امور میں حصہ لیا جائے۔ اپنی طاقت اور جتھہ کو بڑھایا جائے۔ نہ یہ کہ ان امور کی طرف تو توجہ نہ کی جائے اور نبی پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دینی شروع کر دی جائے۔ نبی پر ایمان لانا کسی قوم کو ترقی نہیں دے سکتا۔ ترقی کی صورت صرف یہی ہے کہ دنیوی تدابیر کو اپنے کمال تک پہنچا دیا جائے اور ہر قسم کے مادی سامان جو ترقی کے لئے ضروری ہوتے ہیں اُن کو جمع کیا جائے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں دنیا دنیوی اسباب سے ترقی کرتی ہے لیکن زمانۂ نبوت میں دنیوی اسباب سے نہیں بلکہ روحانی اسباب سے ترقی کیا کرتی ہے تاکہ خدا کا جلال ظاہر ہو اور تا دنیا دین کی خادم ثابت ہو۔ اِس کے بغیر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت دنیا پر ثابت نہیں ہو سکتی وہ بادشاہت جس کے متعلق حضرت مسیح ناصریؑ نے بھی دعا کی اور کہا کہ اے خدا جس طرح تیری بادشاہت آسمان پر ہے ویسی ہی زمین پر بھی آئے۔ اگر دنیا ہمیشہ دنیوی سامانوں سے جیتتی چلی جائے تو لوگوں کو خدا تعالیٰ کی بادشاہت کا کس طرح پتہ لگ سکتا ہے اور وہ کیونکر معلوم کر سکتے ہیں کہ ایک زندہ خدا موجود ہے جس کے منشاء کے خلاف اگر دنیا کی تمام طاقتیں بھی متحد ہو جائیں تو وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بن کر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ یقیناً اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سے لوگ ہدایت پانے سے محروم رہ جاتے اور اکثر لوگوں پر دین کی برتری مشتبہ ہو جاتی مگر جب دنیوی سامانوں کے خلاف ہوتے ہوئے ایک نبی خبر دیتا ہے کہ میں جیت جاؤں گا اور میرے مقابلہ میں جس قدر طاقتیں کھڑی ہیں وہ ہر قسم کے سامان رکھنے کے باوجود ناکام رہیں گی اور پھر واقعہ میں ایسا ہی ہو جاتا ہے تو یہ ثبوت ہوتا ہے اِس بات کا کہ خدا کی حکومت دنیا میں موجود ہے۔

آج یورپین مصنف بڑے زور سے لکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر دنیا میں کامیاب ہو گئے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ قیصر کی حکومت اُس وقت اپنے اندرونی زوال کی وجہ سے ٹوٹ رہی تھی۔ کسریٰ کی حکومت میں ضعف و اضمحلال کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور سب لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ حکومتیں اب جلد مٹ جانے والی ہیں۔ ایسی حکومتوں پر اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غالب آ گئے تو اِس میں کوئی ایسی بات نہیں جسے معجزہ قرار دیا جا سکے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا عرب کی حالت قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے اچھی تھی؟ اگر اچھی ہوتی تب تو کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ عرب کی حالت اچھی تھی اور قیصر و کسریٰ کی حالت خراب تھی اِس لئے اہل عرب نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو تاراج کر دیا۔ مگر ہر شخص جو تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں عرب کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ پس سوال یہ ہے کہ کیا قیصر و کسریٰ کی حکومتوں نے عرب کے مقابلہ میں ہی ٹوٹنا تھا اور پھر اُن عربوں کے مقابلہ میں جن کا اپنا حال خراب تھا اور کیا عرب کے لوگوں میں سے بھی اُس شخص کے ہاتھ سے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں نے پاش پاش ہونا تھا جس کو کچلنے کے لئے خود عرب کے لوگ کھڑے ہوئے تھے؟ اور وہ سمجھتے تھے کہ قیصر و کسریٰ تو الگ رہے، عرب کے لوگ تو الگ رہے صرف مکہ کے رہنے والے ہی اِس کو کچلنے کے لئے کافی ہیں۔ ہر شخص جو حالات پر غور کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے کا ملکہ اپنے اندر رکھتا ہے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو وہ اکیلا شخص پاش پاش کرنے کی اپنے اندر اہلیت رکھتا تھا جس کے متعلق خود مکہ کی بستی والے یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے مقابلہ میں بھی نہیں ٹھہر سکتا ہم اِسے کچل کر رکھ دیں گے۔ مگر جب مکہ کی بستی والے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اس کو مٹا دیں گے اُس وقت وہ اپنی کمزوری کے باوجود دنیا کو پکار کر کہتا تھا کہ مکہ اور عرب تو کیا ہیں میں قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو بھی مٹا دوں گا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اُس نے کہا تھا ویسا ہی وقوع میں آ گیا۔ اگر یہ باتیں ایسی ہی ظاہر نہیں جیسے آج یورپین مصنف لکھتے ہیں

تو مکہ کے لوگ کیوں کہتے تھے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹا دیں گے ۔ عرب کے لوگ کیوں کہتے تھے کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مٹا دیں گے ۔ اُن کا بڑے زور سے یہ اعلان کرنا کہ اسلام کو ہم کچل کر رکھ دیں گے بتاتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اندر کوئی طاقت نہیں رکھتے ۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں تو کجا مکہ کی بستی والوں کا مقابلہ کرنا بھی اُن کی طاقت سے باہر ہے ۔ مگر پھر وہ زمانہ آیا جب وہ اکیلا اور کمزور شخص بڑھا اور بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچا کہ قیصر و کسریٰ بھی اس کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے ۔ یہی حالت اِس وقت ہماری ہے ۔ ہم دنیا میں سب سے زیادہ کمزور اور سب سے زیادہ بے سامان ہیں اور کوئی شخص ظاہری سامانوں کے لحاظ سے یہ خیال بھی نہیں کرسکتا کہ ہم کسی دن ساری دنیا پر غالب آجائیں گے ۔ لیکن آج سے دو تین سو سال کے بعد جب احمدیت کا سب جہان پر غلبہ ہو گیا یوروپین مصنفین کی طرح بعض ایسے مصنف پیدا ہو جائیں گے جو کہیں گے کہ احمدیت نے اگر غلبہ پالیا تو یہ کونسی بڑی بات ہے دنیا میں اُس وقت حالات ہی ایسے پیدا ہو رہے تھے کہ جن کے نتیجہ میں اُس نے جیت جانا تھا یورپ میں تنزّل کے آثار پیدا تھے ۔ ایشیا میں تنزّل کے آثار پیدا تھے اور حکومتوں کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو چکی تھیں ایسی حالت میں اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ پیشگوئی شائع کر دی کہ ایک زمانہ میں احمدیت سارے جہان پر غالب آجائے گی تو یہ کوئی پیشگوئی نہیں کہلا سکتی ۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا آج دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جو اس دعویٰ کو معقول قرار دے سکے اور کہہ سکے کہ واقعہ میں ایک دن احمدیت کا سب جہان پر غلبہ ہو جائے گا ۔ اگر آج نہیں کہتے تو دو تین سو سال کے بعد غلبہ میسر آنے پر یہ کہنا کہ غلبہ تو ہو ہی جانا تھا اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ یہ لوگوں کے جھوٹا ہونے کی ایک بیّن علامت ہوتی ہے کہ جب وقت گذر جاتا ہے تو نشاناتِ الٰہیہ پر پردہ ڈالنے کے لئے کئی قسم کے بہانے بنانے لگ جاتے ہیں اور پیشگوئیوں کی وقعت کم کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ زمانہ کے حالات ہی ایسے تھے جن سے یہ نتیجہ نکلتا ۔ گو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو گذر چکا ۔ اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ ہے اور آپ نے بطور پیشگوئی یہ اعلان فرمایا ہے کہ

احمدیت کی ترقی کی پیشگوئی

" اے تمام لوگو سُن رکھو کہ یہ اُس کی پیشگوئی ہے جس نے زمین و آسمان بنایا وہ اپنی اس جماعت کو تمام ملکوں میں پھیلا دے گا اور حجت اور بُرہان کی رُو سے سب پر اُن کو غلبہ بخشے گا ۔ وہ دن آتے ہیں بلکہ قریب ہیں کہ دنیا میں صرف یہی ایک مذہب ہو گا جو عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا ۔ خدا اِس مذہب اور اِس سلسلہ میں نہایت درجہ اور فوق العادۃ برکت ڈالے گا اور ہر ایک کو جو اس کے معدوم کرنے کا فکر رکھتا ہے نامراد رکھے گا اور یہ غلبہ ہمیشہ رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی ۔" (تذکرہ ص۴۶۲)

مولوی ثناء اللہ صاحب بارہا اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس پیشگوئی پر مدتیں گذر چکی ہیں مگر ابھی تک احمدیت کو غلبہ میسر نہیں آیا ۔ لیکن کچھ عرصہ گذرنے پر جب احمدیت کو دنیا میں کامل غلبہ حاصل ہو گیا اُس وقت مولوی ثناء اللہ صاحب کے جو چیلے موجود ہوں گے وہ کہیں گے کہ یہ تو نظر ہی آرہا تھا کہ جماعت احمدیہ نے جیت جانا ہے ۔ اُس وقت تنزّل کے آثار یورپ میں پیدا ہو چکے تھے ۔ اُس وقت تنزّل کے آثار ہندوؤں میں پیدا ہو چکے تھے ۔ اُس وقت تنزّل کے آثار مسلمانوں میں پیدا ہو چکے تھے اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ احمدیت اُن کے مقابلہ میں جیت جاتی ۔ غرض مخالفین کا ہمیشہ سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ پہلے تو غلبہ کو ناممکن بتلاتے ہیں اور جب غلبہ میسر آجاتا ہے تو کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس میں عجیب بات کوئی نہیں حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اُنہیں غلبہ میسر آجاتا ۔ بہرحال ہر زمانہ میں دنیا ، دنیا کے اسباب سے وابستہ ہوتی ہے لیکن زمانۂ نبوت میں اللہ تعالیٰ اِسے نبوت کے ساتھ وابستہ کرکے اپنی حکومت ظاہر کرتا ہے ۔ ورنہ دنیوی حکومت کا انبیاء سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔

وہ خدا کی خدائی ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں آتے ہیں اور یہ خدائی اُن کے زمانہ میں اس رنگ میں ظاہر ہوتی ہے کہ بغیر اوی اسباب کے ایک گری ہوئی قوم کو وہ اُٹھاتے اور اُسے دنیا پر غالب کرکے دکھا دیتے ہیں۔ تب لوگوں کو پتہ لگتا ہے کہ دنیوی ترقی میں صرف ہماری کوششوں کا دخل نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی حکومت کا بھی دخل ہے۔ جب تک وہ دخل نہ دے اُس وقت تک تو تدابیر کام کرتی رہتی ہیں لیکن جب وہ دخل دیدے تو ساری دنیا بے بس ہو جاتی ہے اور اُس کی کوئی تدبیر اُسے کامیاب نہیں کر سکتی۔

اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس وقت دنیوی تدابیر باطل ہو جاتی ہیں۔ باطل نہیں ہوتیں بلکہ ایمان کے ساتھ مل کر نتیجہ پیدا کرتی ہیں اِس کے بغیر نہیں جیسا کہ اگلی آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے زمانہ کو عصر کا زمانہ قرار دیا ہے گو اُن معنوں کے لحاظ سے نہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں بلکہ اور معنوں کے لحاظ سے۔ چنانچہ بخاری میں روایت آتی ہے کہ ایک شخص نے عمارت بنانے کے لئے بہت سے مزدور کام پر لگائے جنہوں نے ظہر تک کام کیا۔ پھر اُس نے ایک اور پارٹی مقرر کی جس نے عصر تک کام کیا۔ اِس کے بعد اُس نے ایک تیسری پارٹی مقرر کی جس نے شام تک کام کیا۔ جب دن ختم ہونے پر اُس نے مزدوری تقسیم کی تو سب کو برابر بدلہ دیا۔ اِس پر پہلوں نے اعتراض کیا کہ ہم نے زیادہ لمبا عرصہ کام کیا تھا مگر ہمیں بھی اُتنا ہی بدلہ دیا گیا ہے جتنا اُن لوگوں کو بدلہ دیا گیا ہے جنہوں نے ظہر سے عصر تک یا عصر سے مغرب تک کام کیا ہے۔ مالکِ مکان نے انہیں جواب دیا کہ میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا آیا اُس وعدہ کو میں نے پورا کر دیا ہے یا نہیں۔ جب میں نے اُس وعدہ کو پورا کر دیا ہے جو میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا اور تمہارا حق مارا نہیں تو تمہیں یہ شکوہ کیوں پیدا ہو کہ میں نے دوسروں کو تھوڑے وقت کی مزدوری پر بھی تمہارے برابر بدلہ دے دیا۔ اگر میں تمہیں کم مزدوری دیتا تو بے شک تم اعتراض کر سکتے تھے لیکن جب میں نے تمہیں پوری مزدوری دے دی تو اِس کے بعد اگر میں نے کسی کو کام سے زیادہ بدلہ دے دیا ہے تو اِس پر تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا پہلی مزدور قوم سے یہودی مراد ہیں۔ دوسری مزدور قوم سے نصاریٰ مراد ہیں اور تیسری مزدور قوم سے اے مسلمانو تم مراد ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک مفہوم کے لحاظ سے اپنے زمانہ کو عصر کا زمانہ قرار دیا ہے۔

عصر کے معنے رَهْط اور عَشِيْرَة کے بھی ہوتے ہیں یعنی قبیلہ اور قوم کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اِس لحاظ سے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم کو اِس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ انسان یقیناً گھاٹے کی طرف جا رہا ہے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے یہاں انسان سے عام انسان مراد ہے اور قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ باقی دنیا تو تمہاری نظروں سے اوجھل ہے لیکن مکہ والے تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم اَور لوگوں کے حالات کو نہیں دیکھ سکتے تو کیا مکہ والوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے کہ اُن کی حالت کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ مکے کے لوگ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ جیسے پاک انبیاء کی نسل میں سے ہیں۔ خانہ کعبہ کے پاس رہنے والے ہیں۔ اُن کی طرف دیکھو کہ باوجود اِس کے کہ یہ ایک اچھے خاندان میں سے ہیں اور خانہ کعبہ کی حفاظت کا کام اُن کے سپرد کیا گیا تھا پھر بھی یہ روز بروز خدا تعالےٰ سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بجائے اِس کے کہ اپنے فرائض اور ذمہ واریوں کو سمجھیں اور اللہ تعالےٰ کے نام کو بلند کرنے کی کوشش کریں یہ لوگ مجاور بن کر بیٹھ گئے ہیں اور انکی دن رات یہی کوشش رہتی ہے کہ لات اور منات اور عزیٰ کو لوگ سجدے کریں اور اُن پر چڑھاوے چڑھائیں جس سے اُن کا گذارہ ہو۔ پس وَالْعَصْرِ کے معنے یہ ہوئے کہ ہم

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ سب سے بڑھ کر یہ قوم اس بات کی مستحق تھی کہ خدا تعالیٰ کے نام کو دنیا میں پھیلاتی مگر یہ قوم بھی مجاور بن کر بیٹھ گئی ہے اور خدا تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کی بجائے نفسانی خواہشات کے پیچھے چل پڑی ہے۔ اِس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ ضلالت اور گمراہی اب پورے طور پر مسلّط ہو چکی ہے اور ضروری تھا کہ اِن حالات کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوتا۔

تیسرے معنے عصر کے رات کے ہیں۔ اِن معنوں کی رُو سے ایک عام قاعدہ اِس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب قوم پر تباہی کا زمانہ آتا ہے تو اُس سے نکلنے کی راہ صرف ایمان و عملِ صالح ہی رہ جاتا ہے یعنی بغیر خدائی ہدایت کے وہ قوم کبھی ترقی نہیں کرتی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ رات کا زمانہ تاریکی کا زمانہ ہوتا ہے پس اِس جگہ وَالْعَصْرِ سے وہ زمانہ مراد ہے جب کسی قوم پر تباہی وارد ہو جاتی ہے اور کامیابی کی کوئی شعاع اُسے دکھائی نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم رات کے زمانہ کو یعنی تباہی اور بربادی کے زمانہ کو اس بات کی شہادت کے طور پر تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جب قوموں پر تنزّل آ جاتا ہے تو اُس وقت ایسی قومیں جو کسی دینی سلسلہ سے تعلق رکھتی ہیں اِس تباہی سے کبھی بچ نہیں سکتیں سوائے اس کے کہ اُن کے احیاء کیلئے کوئی نبی آئے اور انہیں اُس پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کے خلاف دنیا میں کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی جب بھی کوئی مذہبی جماعت گری ہے ہمیشہ کسی نبی کے ذریعہ ہی اُس کا احیاء ہوا ہے اس کے بغیر کسی قوم کا آج تک احیاء نہیں ہوا۔ مثلاً تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے حضرت کرشنؑ آئے اور پھر حضرت رام چندرؑ آئے یا ہندوؤں کے خیال کے مطابق پہلے حضرت رامؑ آئے اور بعد میں حضرت کرشنؑ آئے ان میں سے کوئی صورت سمجھ لو۔ ہمارے نزدیک پہلے حضرت کرشنؑ کے ذریعہ ہندو قوم کو ترقی حاصل ہوئی اور پھر ایک لمبے عرصہ کے بعد جب اُن میں تنزّل پیدا ہوا تو وہ تنزّل اُس وقت دور ہوا جب حضرت رامؑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو گئے۔ یا ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق پہلے حضرت رامؑ کے ذریعہ اُن کو ترقی ملی اور بعد میں حضرت کرشنؑ نے اُن کو عروج تک پہنچایا۔ اس کے بعد جب پھر اُن میں تنزّل پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت بدھؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا جن پر ایمان لا کر قوم کا تنزّل دور ہوا بہرحال جب بھی کسی مذہبی جماعت کو تنزّل کے بعد عروج ہوا ہے ہمیشہ ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ حاصل ہوا ہے۔ دنیوی تدابیر سے کام لے کر آج تک کوئی ایک مذہبی جماعت بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکی یہ اللہ تعالیٰ کا ایک اٹل قانون ہے جس کے خلاف ہمیں کوئی نظارہ نظر نہیں آتا۔ اور کوئی شخص ایسی مثال پیش نہیں کر سکتا کہ فلاں جماعت جس کا مذہب کے ساتھ تعلق تھا ترقی کے بعد گر چکی تھی مگر محض دنیوی تدابیر سے کام لے کر اُس نے دوبارہ عروج حاصل کر لیا۔ مذہبی جماعتوں کی زوال کے بعد ترقی اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ وابستہ کر دی ہے۔ جو قوم یہ وابستگی پیدا کر لیتی ہے وہ عروج حاصل کر لیتی ہے اور جو اس وابستگی سے محروم رہتی ہے وہ خواہ لاکھ تدابیر اختیار کرے کبھی اپنے زوال کو دور نہیں کر سکتی۔ مثلاً یہودیوں کو دیکھ لو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کی طرف مبعوث ہوئے اور انہوں نے قوم کو عروج تک پہنچایا۔ اس کے بعد جب اُن میں تنزّل پیدا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوتے اور انہوں نے ایک گری ہوئی قوم کو ترقی کے بلند مینار تک پہنچا دیا۔ پھر تنزّل پیدا ہوا تو حضرت شمعونؑ آ گئے جنہوں نے قوم کی اصلاح کی پھر تنزّل پیدا ہوا تو حضرت داؤدؑ آ گئے اور انہوں نے اصلاح کی غرض ہمیشہ انبیاء کے ذریعہ ہی اُن کو ترقی حاصل ہوئی۔ ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ نبی پر ایمان لائے بغیر انہیں محض دنیوی تدابیر سے عروج حاصل ہو گیا ہو۔ اسی طرح بابل کی حکومت نے اُن کو تباہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے عزرا نبی کو کھڑا کر دیا جس نے

انکی ذلّت دور کی۔ پھر گرے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرما دیا۔ یہ نہیں ہُوا کہ دنیوی لیڈروں کی اتباع کرکے اُنہیں کامیابی حاصل ہوئی ہو یا مادی تدابیر نے اُن کو ترقی تک پہنچا دیا ہو۔ یہی قانون اب مسلمانوں کے متعلق بھی کام کر رہا ہے۔ مسلمان اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کامیابی کا ذریعہ یہ ہے کہ ہم انجمنیں بنائیں، مدرسے جاری کریں، یونیورسٹیاں اور کالج قائم کریں، صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف توجہ کریں۔ اور اس طرح اپنی ذلّت و نکبت کو دور کرکے ترقی یافتہ اقوام کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ آج تک کوئی ایک مثال بھی تو ایسی نہیں ملتی کہ کسی مذہبی جماعت کو تنزل کے بعد محض دنیوی تدابیر سے غلبہ حاصل ہو گیا ہو جب بھی کوئی مذہبی جماعت گری ہے اُسے نبی کے ذریعہ ہی دوبارہ عروج حاصل ہوا ہے۔ اس کے بغیر عروج حاصل ہونے کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر یہ بات درست ہے تو انگلستان کیوں ترقی کر گیا یا امریکہ کیوں ترقی کر گیا، یہ لوگ کس نبی پر ایمان لاتے تھے کہ اُنہیں ساری دنیا پر غلبہ حاصل ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات ہی غلط ہے کہ انگلستان اور امریکہ وغیرہ نے تنزل کے بعد ترقی کی ہے۔ ان قوموں میں سے سوائے جاپان کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس نے ترقی کے مقام سے گرنے کے بعد دوبارہ عروج حاصل کیا ہو۔ ان کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے وحشیانہ حالت سے ترقی کرتے کرتے عروج حاصل کر لیا۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک دفعہ ترقی حاصل کرنے کے بعد جب یہ لوگ بالکل گر گئے تھے تو دوبارہ اپنی تدابیر سے انہوں نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی مذہبی جماعت (یعنی جو سچے مذہب کی طرف منسوب ہو) جو ایک دفعہ ترقی حاصل کرنے کے بعد گر جائے وہ اُس وقت تک کبھی ترقی نہیں کر سکتی جب تک کوئی نبی اس کی طرف مبعوث نہ ہو۔ مگر یہ تو بس تو وہ ہیں جو ترقی حاصل کرنے کے بعد ابھی گری نہیں۔ اُنہوں نے بے شک ادنیٰ حالت سے ترقی کرتے کرتے یہ مقام حاصل کیا ہے مگر یہ نہیں ہُوا کہ تنزل کے بعد انہوں نے دوبارہ ترقی کی ہو۔ صرف جاپان کی مثال اس سوال میں پیش کی جا سکتی ہے مگر وہ بھی یہاں چسپاں نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اگر کوئی قوم خالص دنیوی ذرائع سے کام لے کر ترقی کر جاتی ہے تو وہ وہی قوم ہوتی ہے جس میں نورِ الہام بند ہو چکا ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم نورِ الہام سے دور نہیں ہوتی اور وہ کسی سچے نبی کو جس کا زمانۂ نبوت جاری ہوتا ہے مان رہی ہوتی ہے اُس وقت تک وہ قوم کبھی دوبارہ ترقی نہیں کر سکتی جب تک کسی مامور کے ذریعے اُسے ترقی نہ ملے۔ چونکہ آج کل مسلمانوں کے سوا باقی تمام اقوام زندہ دین سے دُور ہو چکی ہیں اس لئے ہندو اگر خالص دنیوی تدابیر سے کام لے کر ترقی کر لیں تو وہ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ سچے دین کی طرف منسوب نہیں۔ جب وہ ایک سچے دین کی طرف منسوب تھے اور جب تک ہندو مذہب زندہ تھا پہلے کرشنؑ آئے جن پر ایمان لا کر انہیں ترقی حاصل ہوئی۔ پھر رامؑ آئے جن پر ایمان لا کر اُنہیں ترقی حاصل ہوئی۔ پھر بدھؑ آئے جن پر ایمان لا کر اُنہیں ترقی حاصل ہوئی یا ہندوؤں کے نزدیک پہلے رامؑ پھر کرشنؑ اور پھر بدھؑ آئے اور اُن کے ذریعہ اُنہیں ترقی حاصل ہوئی لیکن بدھؑ کے بعد چونکہ ہندو مذہب اور پھر بُدھ مذہب منسوخ ہو گیا اس لئے اب اگر ہندو محض دنیوی تدابیر سے ترقی کر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن مسلمان کبھی دنیوی تدابیر سے ترقی نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمان ایک سچے مذہب کو ماننے والے ہیں۔ اور جس جماعت کی یہ حالت ہو وہ تنزل کے بعد بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی نبی کی بعثت کے دوبارہ ترقی نہیں کیا کرتی۔ عیسائی اگر تنزل کے بعد ترقی کر جائیں تو اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں کیونکہ عیسائیوں سے اب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے تمام تعلقات منقطع کر چکا ہے اور اُن کا مذہب منسوخ ہو چکا ہے۔

پس یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون کہ دنیا کی ترقی دین کے ساتھ وابستہ ہے ہر قوم کے

متعلق نہیں بلکہ اُن اقوام کے متعلق ہے جو ابھی اللہ تعالیٰ کے الہام سے محروم نہیں ہوئیں۔ اگر اُن کو بھی دین کے بغیر دنیا میں ترقی مل جائے تو پھر دین کا کسی قوم کے پاس بھی حصہ نہ رہے اور خدا تعالیٰ کا خانہ بالکل خالی ہو جائے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ اب مسلمانوں کو کبھی ترقی نہیں دے سکتا جب تک وہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں اپنے آپ کو شامل نہیں کر لیتے۔ آج اللہ تعالیٰ کنفیوشس مذہب کے پیروؤں کو بالکل چھوڑ بیٹھا ہے، زرتشتی مذہب کے پیروؤں کو بالکل چھوڑ بیٹھا ہے، بُدھ مذہب کے پیروؤں کو بالکل چھوڑ بیٹھا ہے، ہندو مذہب کے پیروؤں کو بالکل چھوڑ بیٹھا ہے، عیسائی مذہب کے پیروؤں کو بالکل چھوڑ بیٹھا ہے۔ اور اُن کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی زمیندار کا بَیل بڈھا ہو جائے تو وہ اُسے کھلا چھوڑ دیتا ہے اور اس بات کی پروا تک نہیں کرتا کہ وہ رات کو گھر میں واپس آتا ہے یا نہیں لیکن مسلمانوں کی مثال دُودھ دینے والی گائے کی سی ہے۔ ایک بڈھا بَیل جسے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اُس کے متعلق مالک کا اَور قانون ہوتا ہے اور گھر کی دُودھ دینے والی گائے کے متعلق مالک کا اَور قانون ہوتا ہے۔ بوڑھا بَیل اگر رات کو گھر میں نہیں آتا تو مالک اُس کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن اگر دُودھیلی گائے رات کو گھر میں نہ آئے تو وہ اِدھر اُدھر دوڑا پھرتا ہے اور ہر ایک سے پوچھتا ہے کہ میری گائے کدھر گئی۔ پس وہ جماعتیں جن کا خدا تعالیٰ سے تعلق کٹ چکا ہوتا ہے اگر دنیوی تدابیر سے ترقی کر جائیں تو اللہ تعالیٰ کو انکی کچھ پروا نہیں ہوتی لیکن وہ جماعتیں جن کا خدا تعالیٰ سے روحانی تعلق باقی ہوتا ہے اُن کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اُن کی اصلاح اور ترقی بغیر نبی کے نہیں ہوتی۔ پس انگلستان اور امریکہ اور جاپان وغیرہ کی مثالیں یہاں چسپاں نہیں ہوتیں۔ یہ قانون اُن اقوام کے متعلق ہے جن کا ابھی خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق ہوتا ہے نہ اُن کے متعلق جو خدا تعالیٰ سے بغاوت اختیار کر کے نورِ الہام سے کلیۃً محروم ہو جاتی ہیں۔

چوتھے معنے اِس کے یہ ہیں کہ دن کو ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ اِس سے اِس قاعدہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جب شمسِ رسالت کا طلوع ہوتا ہے تو کوئی قوم جو اُس کے مقابل پر ہو بغیر اُس پر ایمان لانے کے تباہی سے بچ نہیں سکتی۔

پانچویں معنے اِس کے یہ ہیں کہ ہم عطیہ کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی جب اللہ تعالیٰ دنیا پر احسان کرتا اور نبوت اور کلام بھیجتا ہے تو صرف مومن ہی ترقی کر سکتے ہیں دوسرے لوگ ترقیات سے محروم رہ جاتے ہیں۔

خُسر کے معنے جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے عربی زبان میں گھاٹے کے بھی ہیں گمراہی کے بھی ہیں اور ہلاکت اور بربادی کے بھی ہیں۔ ان تینوں میں سے ہلاکت کے معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر اس آیت کو اسلام کے آخری زمانہ پر چسپاں کیا جائے تو اَلْاِنْسَانَ سے مراد "مردِ مغرب" ہوگا اور اس میں یہ پیشگوئی پائی جائیگی کہ مغربی لوگ صرف اپنے آپ کو انسان سمجھیں گے باقی دنیا میں سے کسی کو بھی انسان سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور لَفِیْ خُسْرٍ کا مفہوم یہ ہوگا کہ جتنا جتنا وہ اپنے آپ کو کامل انسان بنائیں گے اُتنا ہی اُن کی ہلاکت کا سامان پیدا ہوتا چلا جائیگا۔ چنانچہ اب یہ حقیقت تمام دنیا پر منکشف ہو رہی ہے کہ جس قدر تہذیب ترقی کر رہی ہے اُسی قدر تباہی اور بربادی کے سامان بھی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ انہی سامانوں میں سے ایک ایٹم بم ہے جو اس جنگ میں ایجاد کیا گیا۔ یہ ایک ایسا خطرناک اور تباہ کن ہتھیار ہے کہ جنرل میکارتھر نے اپنے ایک اعلان میں صاف طور پر کہا ہے کہ اگر یا تو ہمیں اسلحہ کی اس ترقی کے مقابلہ میں اپنے اخلاق میں بھی نمایاں ترقی کرنی پڑے گی ورنہ اگر اخلاق میں ترقی نہ ہوئی تو دنیا کی تباہی میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اِس جگہ بیان فرمائی ہے کہ وہ جتنا جتنا اپنے آپ کو اَلْاِنْسَان قرار دیں گے اور یہ دعوے کریں گے کہ ہم میں بڑے بڑے سائنسدان ہیں۔ بڑے بڑے حساب دان ہیں۔ بڑے بڑے ماہرین تجارت ہیں۔ بڑے بڑے صنّاع ہیں بڑے بڑے مُوجد ہیں۔ اُتنا ہی وہ

ہلاکت کے قریب ہوتے جائیں گے اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں
سے کھودیں گے۔

اِسی طرح خُسر کے معنے ضلالت کے بھی ہیں اِس لحاظ
سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ آخری زمانہ میں لوگ مومنوں کو
ذلیل اور ادنیٰ سمجھیں گے اور اپنے آپ کو ہی انسان سمجھیں گے
لیکن ہدایت صرف مومنوں کے پاس ہوگی۔ اُس وقت ایک موعود
کا پیدا ہونا اور عصر کامل یعنی نبی کا وجود اس امر کا ثبوت ہوگا
کہ بظاہر کامل نظر آنے والا انسان گمراہی میں مبتلا ہے یعنی دنیا
پر مغربی لوگوں کی غلطی ثابت کرنے کا ذریعہ صرف نبی کا وجود
ہوگا۔ ورنہ اَور کوئی صورت نہ ہوگی کہ اُن کی گمراہی ثابت کیجاسکے
صرف روحانی طور پر ہی یہ امر ثابت ہوسکے گا۔ اِس صورت
میں اَلْعَصْر سے مراد کامل عصر ہوگا اور کامل عصر وہی ہوتا ہے
جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی نبی لوگوں کی ہدایت کیلئے مبعوث
ہو۔ پس فرماتا ہے اُس وقت ایک قوم کی ایسی حالت ہوگی کہ وُہ
اپنے آپ کو ہی انسان سمجھے گی کسی اَور کو انسان قرار دینے کیلئے
تیار نہیں ہوگی مگر ہوگی گمراہ۔ اور اُس کی گمراہی کے ثابت ہونیکا
دنیا کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوگا صرف روحانی طور پر یہ امر
ثابت ہوسکیگا۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
کی بعثت کے بعد مغربی لوگوں کی گمراہی ثابت کرنا کونسا مشکل
کام رہ گیا ہے ہم میں سے ہر شخص علی الاعلان کہہ سکتا ہے کہ
اہلِ مغرب گمراہ ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کا ایک نبی آیا جسے ہم
نے تو مان لیا مگر مغرب اُس کا منکر ہے اسلئے ہم ہدایت پر
ہیں اور وہ گمراہی پر۔ مگر باقی مذاہب کس ذریعہ سے یورپ پر
اپنی برتری ثابت کرسکتے ہیں۔ وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم
مغرب پر فوقیت رکھتے ہیں یا ہمارے پاس تو ہدایت ہے لیکن
مغرب کے پاس ہدایت نہیں۔ وہ حیران و پریشان کھڑے
ہیں اور اُن کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس کو وہ یورپ
کی گمراہی ثابت کرسکیں۔ اسلام زندہ باد یا غیر مذاہب مُردہ باد
کے فلک شگاف نعرے بلند کرنا کوئی مشکل امر نہیں جو شخص
چاہے یہ نعرے بلند کرسکتا ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا مسلمانوں
کے دلوں پر بھی اسلام کا اثر ہے یا محض زبان تک اُن کے
دعوے محدود ہیں؟ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے حالات پر گہرا
غور کرے تو اُسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج مسلمانوں پر اسلام
کا کچھ بھی اثر نہیں۔ وہ بظاہر اسلام زندہ باد کے نعرے بلند
کرتے ہیں مگر چلتے یورپ کے پیچھے ہی ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ
اسلام کی تعلیم تو ہمیں تباہی سے نہیں بچا سکتی لیکن یورپ کی
تقلید ہمیں بچا سکتی ہے۔ اگر اُس حصہ کو الگ کر لیا جائے جو
سیاسی جدوجہد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور یہ دیکھا جائے
کہ سیاسی رنگ میں یورپ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد
ایک مسلمان کیا بننا چاہتا ہے تو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے
کہ یورپ کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد ایک مسلمان
انگلستان کا چرچل تو بننا چاہتا ہے مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ
میں عرب کا ابوبکرؓ بن جاؤں۔ وہ یہ تو خواہش رکھتا ہے کہ میری
گردن مغرب کے سیاسی دباؤ سے آزاد ہو جائے مگر اُس
آزادی کے بعد اُس کا مقصد ابوبکرؓ بننا نہیں یا عمرؓ اور عثمانؓ
بننا نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ میں آزادی کے بعد انگلستان کا
ایٹلی بنوں یا امریکہ کا ٹرومین بن جاؤں یا روس کا سٹالن
بن جاؤں۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے یوروپین ممالک کی
با اقتدار شخصیتیں یکے بعد دیگرے آتی ہیں اور وہ ایک سرد آہ
کھینچکر کہتا ہے کہ کاش مجھے موقع ملے تو میں بھی مغرب کی طرح
دنیا پر حکمرانی کروں۔ مگر یہ بات کہ میں جلال الدین سیوطیؒ بن جاؤں
یا امام بخاریؒ بن جاؤں یا سید عبدالقادر جیلانیؒ بن جاؤں
کبھی بھولے کے طور پر بھی کسی مسلمان کے دل میں پیدا نہیں
ہوتی۔ پس فرماتا ہے اُس وقت کوئی جماعت ایسی نہیں ہوگی جو
مردِ مغرب کو گمراہی پر سمجھنے والی ہو۔ ہر قوم اُس کی نقل کرنا
چاہے گی اور اُس کی تقلید پر ہی اپنی تمام کامیابی کا دار و مدار
سمجھے گی۔ سیاسی آزادی بالکل الگ چیز ہے اِس آزادی کے
معنے صرف اتنے ہی ہیں کہ ہم کو بھی ویسی ہی برتری مل جائے
جیسے مغرب کو حاصل ہے ورنہ اِس سیاسی آزادی کے بعد
ہر قوم کے دل میں خواہش یہی پائی جاتی ہے کہ مجھے بھی

مغرب کی طرح اقتدار حاصل ہو۔ بہرحال اُس وقت کوئی قوم ایسی نہیں ہوگی جو مغربی لوگوں کی گمراہی ثابت کر سکے صرف نبی کا وجود ہوگا جس پر ایمان لانے کی وجہ سے ایک جماعت نہایت اطمینان کے ساتھ یہ کہے گی کہ یورپ کے لوگ کہاں جیت سکتے ہیں جیتنا تو ہم نے ہے جو ایک نبی پر ایمان لاتے ہیں۔ گویا امید جو جیتنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے صرف مومنوں کو نصیب ہوگا۔ دوسری اقوام جو نہ مومن ہوں گی اور نہ مردِ مغرب کی ساتھی وہ حیران و پریشان ہوں گی۔ نہ مردِ مغرب اُنکو اپنے ساتھ شامل کرے گا۔ اور نہ اُس کی کمزوری اور گمراہی اُنہیں نظر آ سکے گی۔ اِس لئے وہ سرگردان و حیران ہوں گی۔ امید کا کوئی پہلو اُنہیں نظر نہ آتا ہوگا یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر یورپ کے سامنے ہمیں اپالوجی APOLOGY کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کھلے اور واضح الفاظ میں مغرب کی بُرائی اُس پر ظاہر کر سکیں۔ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتب میں یوروپین مصنفین کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر انہوں نے سب جگہ اپالوجی سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یوروپین مصنفین کے اسلام کے خلاف اعتراضات درست ہیں مگر ہماری التجا صرف اس قدر ہے کہ اسلام کے متعلق زیادہ سخت رائے قائم نہ کی جائے کیونکہ اسلام ایسے زمانہ میں آیا تھا جب دنیا ابھی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے تھی۔ اِس لئے اُس کے کئی مسائل موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپالوجی کو بالکل رد کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں یوروپین لوگوں پر اُن کی گمراہی ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام نے جو کچھ کہا اُس کا ایک ایک حرف درست ہے۔ اِس پر اعتراض کرنا خود اپنی حماقت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔ چنانچہ آج تک ہم دشمنوں کی طرف سے اِسی وجہ سے گالیاں کھاتے ہیں کہ ہم نے آریوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے ہندوؤں پر بھی اعتراضات کئے ہم نے سکھوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے عیسائیوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے جینیوں اور بدھوں پر بھی اعتراضات کئے ہم نے زرتشتیوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے یہودیوں پر بھی اعتراضات کئے۔ غرض کوئی مذہب اور فرقہ ایسا نہیں جس کی اسلام کے مقابلہ میں ہماری طرف سے گمراہی ثابت نہ کی گئی ہو اور ہم نے اُن پر ایسے وزنی اعتراضات نہ کئے ہوں کہ جن کا جواب دینا اُن کے لئے بالکل ناممکن ہے مگر بجائے اِس کے کہ مسلمان ہمارے اِس کام کی قدر کرتے انہوں نے اُلٹا ہمیں گالیاں دینا شروع کر دیا اور کہنے لگے کہ ہم اسلام کے خلاف غیر مسلموں کو اشتعال دلا رہے ہیں۔ چنانچہ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مظہر علی صاحب اظہر کا ایک رسالہ مَیں نے دیکھا جس میں اُنہوں نے اِس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ آریوں نے اگر اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مرزا صاحب نے آریوں پر اعتراضات کرنے شروع کر دئے تھے۔ اگر وہ اعتراضات نہ کرتے تو آریہ بھی اسلام کی مخالفت نہ کرتے۔ گویا دوسرے الفاظ میں مظہر علی صاحب اظہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مرزا صاحب کو دشمن کے مقابلہ میں اپالوجی کرنی چاہیئے تھی۔ بجائے اِس کے کہ اُس کے اعتراضات کے جواب دیتے کہتے کہ خدا کے واسطے آپ ہم پر سختی نہ کریں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو نعوذ باللہ ایک جاہل اُمت کے سردار تھے وہ موجودہ زمانہ کے مسائل کو کہاں سمجھ سکتے تھے یا قرآن کریم کی تعلیم نعوذ باللہ موجودہ زمانہ میں کام نہیں آ سکتی۔ یہ تو صرف عرب کے لئے مخصوص تھی۔ موجودہ زمانہ میں مغربی علوم ہی لوگوں کو اعلیٰ مقام تک پہنچا سکتے ہیں۔ مگر چونکہ مرزا صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے کھلے طور پر کہا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب انبیاء سے افضل ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم دنیا کی تمام تعلیموں سے اعلیٰ ہے۔ جاہل اور احمق وہ لوگ ہیں جو آپ پر اعتراضات کرتے اور قرآنی تعلیم کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اِس لئے بقول مظہر علی صاحب آریوں کو جوش آ گیا اور وہ اسلام کا مقابلہ کرنے لگ گئے۔ اگر مرزا صاحب ایسا نہ کرتے تو اُن کو بھی مقابلہ کا جوش پیدا نہ ہوتا۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا

مگر وہ لوگ جو (انبیاء پر) ایمان لے آئے اور (پھر) انھوں نے (موقعہ کے) مناسب عمل کئے اور (اصول) صداقت پر قائم رہنے

بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪

کی آپس میں ایک دوسرے کو تلقین کی اور (مشکلات پیش آمدہ پر) صبر (سے کام لینے) کی ایک دوسرے کو ہدایت کرتے رہے (ایسے لوگ کبھی

ع ۱ ۲۸

غرض سب مسلمانوں کے دلوں میں آج امید بالکل مٹ چکی ہے صرف ہماری جماعت ایسی ہے جو اپنے اندر ایک آئیڈیل رکھتے ہوئے مغرب کی گمراہی ثابت کر رہی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ مغرب اُس کے مقابلہ میں کبھی جیت نہیں سکتا۔ پس وَالۡعَصۡرِ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ کے معنے یہ ہوئے کہ ہم اَلۡعَصۡرِ یعنی زمانۂ نبوت کو اس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ آخری زمانہ میں باقی ساری قومیں یورپ کے دبدبہ اور اُس کی شوکت و حشمت سے مرعوب ہو جائیں گی اور وہ سمجھیں گی کہ دنیا کی نجات صرف مغرب کی تقلید میں ہے۔ لیکن ایک جماعت جو ایمان اور عمل صالحہ کی دولت سے مشرف ہوگی اُس کے افراد اس خیال کو باطل قرار دیں گے وہ کہیں گے کہ یورپ ہمارے مقابلہ میں کہاں جیت سکتا ہے اُس نے تو یقیناً تباہ ہو جانا ہے۔ باقی قومیں چونکہ صرف دنیوی نقطۂ نگاہ سے مغرب کو دیکھیں گی اس لئے یورپ کا مرد اُنہیں مردِ کامل نظر آئے گا۔ لیکن وہ لوگ جو یورپ کو رُوحانی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے اُنہیں یورپ کا مرد "مردِ بیمار" نظر آئے گا۔ چنانچہ آج بالکل یہی کیفیت رُونما ہے آج یورپ کے لوگوں کو ٹرکی مردِ بیمار نظر آتا ہے اور ایشیائی ممالک کو یورپ مردِ توانا دکھائی دیتا ہے لیکن جماعت احمدیہ کے افراد کو باقی تمام دنیا کے خلاف یورپ مردِ بیمار نظر آتا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ مردِ بیمار کبھی ہم پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

۵۳ حل لغات - صَالِحَات صَلَحَ سے ہے اور صَلَحَ الشَّیۡءُ (صَلَاحًا وَ صُلُوۡحًا وَ صَلَاحِیَۃً) ضِدُّ فَسَدَ اَوۡ زَالَ عَنۡہُ الۡفَسَادُ یعنی صَلَحَ الشَّیۡءُ کے معنے ہوتے ہیں چیز درست ہوگئی یا اُس میں جو خرابی پائی جاتی تھی وہ دُور ہوگئی۔ اور اَلصَّالِحُ کے معنے ہوتے ہیں اَلۡقَائِمُ بِمَا عَلَیۡہِ مِنۡ حُقُوۡقِ الۡعِبَادِ وَ حُقُوۡقِ اللّٰہِ تَعَالٰی ایسا شخص جو اُن تمام حقوق کو ادا کرے جو خدا اور اُس کے بندوں کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں ھُوَ صَلِحٌ لِکَذَا اَیۡ لَہٗ اَہۡلِیَّۃٌ لِلۡقِیَامِ بِہٖ یعنی جب ھُوَ صَلِحٌ لِکَذَا کہا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس شخص میں کام کو کماحقہٗ سرانجام دینے کی اہلیت پائی جاتی ہے پس اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے معنے یہ ہوئے کہ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے ایسے عمل کئے جو فساد و خرابی سے پاک ہیں یا موقعہ کے مناسب ہیں یا جن سے حقوق اللہ و حقوق العباد ادا ہو جائیں۔

تَوَاصَوۡا - تَوَاصَی سے جمع کا صیغہ ہے اور تَوَاصَی الۡقَوۡمُ کے معنے ہوتے ہیں وَصَّی بَعۡضُھُمۡ بَعۡضًا قوم کے افراد نے ایک دوسرے کو تاکید کی (اقرب) پس تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ کے معنے یہ ہوئے کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی تاکید کرتے ہیں۔

اَلۡحَقُّ : ضِدُّ الۡبَاطِلِ۔ حق کے معنے ایسی بات کے ہیں جو جھوٹ کے خلاف ہو۔ اور حق کے معنے اَلۡاَمۡرُ الۡمَقۡضِیُّ کے بھی ہیں یعنی ایسا امر جو وقت اور حالات کے مطابق ہو۔ اور حق کے معنے عدل کے بھی ہیں اور حق کے معنے مِلۡک کے بھی ہیں اور حق کے معنے بادشاہت کے بھی ہیں اور حق کا لفظ اَلۡمَوۡجُوۡدُ الثَّابِتُ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی وہ چیز جو حقیقی وجود رکھتی ہو اور دنیا میں قائم

رہنے والی ہو۔ اور حق کے معنے اَلْيَقِيْنُ بَعْدَ الشَّكِّ کے بھی ہیں یعنی شک کے بعد اگر کسی شخص کے دل میں یقین پیدا ہو جائے تو اُس کو بھی حق کہا جاتا ہے۔ اور حق کے معنے موت کے بھی ہیں۔ اور حق کے معنے حزم اور احتیاط کے بھی ہیں اور حق اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے بھی ایک نام ہے (اقرب)

اَلصَّبْرُ: تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنَ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ یعنی صبر مصیبت کے وقت شکایت کو چھوڑ دینے کا نام ہے لیکن یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ صبر کے مفہوم میں صرف اِتنی بات شامل ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے پاس شکوہ نہ کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی شخص اپنی شکایات بیان کرتا ہے تو یہ بات صبر کے خلاف نہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ لَا يُقْدَحُ یعنی جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارے اور اُسے کہے کہ اے میرے رب میری فلاں مصیبت کو دُور کر دے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے صبر کے خلاف حرکت کی۔ (اقرب) وَفِي الْكُلِّيَّاتِ اَلصَّبْرُ فِي الْمُصِيْبَةِ۔ ابو البقاء جو ایک بہت بڑے ادیب گزرے ہیں اُنہوں نے اپنی کتاب کلیات میں لکھا ہے کہ صبر کا لفظ جو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور دوسروں سے کہا جاتا ہے کہ صبر کرو یہ صرف مصیبت کے وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی حادثہ کے وارد ہونے پر دوسرے شخص سے کہا جائے کہ آپ صبر سے کام لیں تو اس کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ آپ جزع فزع نہ کریں یا اللہ تعالیٰ کا شکوہ نہ کریں یا آہ و فغاں سے اپنی آواز بلند نہ کریں وَاَيَّا فِي الْمُحَارَبَةِ فَشُجَاعَةٌ لیکن کبھی لڑائی کے لئے بھی صبر کا لفظ استعمال ہوتا ہے اُس وقت اِس کے معنے شجاعت اور بہادری کے ہوتے ہیں۔ وَفِيْ اِمْسَاكِ النَّفْسِ عَنِ الْفُضُوْلِ فَقَنَاعَةٌ وَعِفَّةٌ۔ اِسی طرح صبر کا لفظ کبھی اِمْسَاكُ النَّفْسِ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی اگر انسان اپنے نفس کو لغو اور فضول کاموں میں مبتلا ہونے سے روکے تو اُس وقت بھی صبر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کی دو قسمیں ہیں۔ اگر مال کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا جائے اور مراد یہ ہو کہ دوسرے نے بے جا طور پر اپنا مال صرف کرنے سے اجتناب کیا ہے تو ایسی صورت میں صبر کے معنے قناعت کے ہوں گے اور جب یہ کہا جائے گا کہ فلاں شخص بڑا صابر ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ بڑا قانع ہے اپنے مال کی حفاظت کرتا اور اُسے بے جا طور پر صرف نہیں کرتا لیکن جب اخلاق کے متعلق یہ لفظ بولا جائے اور کہا جائے کہ فلاں شخص اپنے نفس کو روک کر رکھتا ہے تو اس کے معنے عفت اور پاکیزگی کے ہوں گے وَفِيْ اِمْسَاكِ كَلَامِ الضَّمِيْرِ كِتْمَانٌ۔ اِسی طرح کبھی صبر کا لفظ اپنے دل کی بات کو ظاہر نہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ غرض اس لفظ کے کئی معنے ہیں۔ صبر کے معنے جرأت اور بہادری کے بھی ہیں۔ صبر کے معنے قناعت کے بھی ہیں۔ صبر کے معنے عفت کے بھی ہیں اور صبر کے معنے رازداری کے بھی ہیں۔

الصّبر

تفسیر۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں اللہ تعالیٰ نے انسانی اعمال کے متعلق ایک نہایت اہم نکتہ بیان کیا ہے جسے نظر انداز کرنے کی وجہ سے بسا اوقات لوگوں کو کئی قسم کی ٹھوکریں لگ جاتی ہیں۔ دنیا میں عام طور پر یہ طریق ہے کہ لوگ بعض اعمال کو اچھا اور بعض کو بُرا قرار دیدیتے ہیں اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ جو اعمال اُن کے نزدیک اچھے ہیں اُن کو اختیار کریں اور جو اعمال اُن کے نزدیک بُرے ہیں اُن سے اجتناب کریں۔ جن اعمال کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اُن کو اعمالِ صالحہ قرار دیتے ہیں اور جن اعمال کو وہ بُرا سمجھتے ہیں اُن کو اعمالِ سیئہ کہتے ہیں۔ حالانکہ عملِ صالح کسی مخصوص عمل کا نام نہیں بلکہ ہر ایسا عمل جو مناسبِ حال ہو اور جو انسان کی روحانی یا جسمانی ضرورت کے مطابق ہو اُس کو عملِ صالح کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ اُس نے اُن اعمال کے متعلق جو دین کے مطابق

عملِ صالح

ہوتے ہیں ایک ایسی اصطلاح رکھی ہے جو اپنی ذات میں کامل ہے اور جس میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے کہ کس عمل کو تم اچھا کہہ سکتے ہو اور کس کو بُرا۔ باقی مذاہب بنی نوع انسان کو صرف اتنی تعلیم دیتے ہیں کہ تم اچھے اعمال بجالاؤ لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ اچھے اعمال کی تعریف کیا ہے۔ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اچھے اعمال بتاؤ تو وہ فوراً کہہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اچھا عمل ہے، روزہ رکھنا اچھا عمل ہے، غریبوں کی خدمت کرنا اچھا عمل ہے، صدقہ خیرات دینا اچھا عمل ہے۔ حالانکہ یہ مکمل جواب نہیں۔ اسلام صرف نماز کو عملِ صالح قرار نہیں دیتا۔ اسلام صرف روزہ اور زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کو عملِ صالح قرار نہیں دیتا بلکہ اسلام کے نزدیک عملِ صالح وہ عمل ہے جو مناسبِ حال ہو اور انسان کی روحانی یا جسمانی ضروریات کے مطابق ہو۔ مثلاً روزہ رکھنا کتنی بڑی نیکی ہے مگر روزہ رکھنا بھی کبھی اچھا ہو جاتا ہے اور کبھی بُرا۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص عید کے دن روزہ رکھتا ہے وہ شیطان ہے۔ اگر روزہ رکھنا ہر حالت میں عملِ صالح ہوتا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ عید کے دن روزہ رکھنے والا شیطان ہوتا ہے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ روزہ اپنی ذات میں اچھا نہیں بلکہ اُس وقت اچھا ہے جب خدا تعالیٰ کا حکم اُس کے متعلق موجود ہو۔ اسی طرح نماز بڑی اچھی چیز ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص ایسی حالت میں نماز پڑھتا ہے جب سورج اُس کے سر پر ہو یا سورج کے طلوع اور اُس کے غروب ہوتے وقت نماز پڑھتا ہے وہ شیطان ہے۔ اگر نماز اپنی ذات میں عملِ صالح ہوتا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم طلوعِ آفتاب یا غروبِ آفتاب کے وقت نماز پڑھنے والے کو گنہگار کیوں قرار دیتے یا اُس وقت جب سورج سر پر ہو جو شخص نماز پڑھے اُسے شیطان کیوں قرار دیتے۔ مگر یہ تو ایسے احکام ہیں جن کی حکمتیں سب کو معلوم نہیں ہوتیں۔ اتنی بات تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نبی دشمن کے مقابلہ میں کھڑا ہو دشمن اپنے پورے زور سے حملہ کر رہا ہو اور وہ نبی اور اُس پر ایمان لانے والے دشمن کے حملہ کے دفاع میں مشغول ہوں تو ایسی حالت میں اگر کوئی شخص میدانِ جہاد کو چھوڑ کر ایک طرف مصلّٰی بچھا کر نماز شروع کر دے تو ہر شخص اُسے دیکھ کر کہیگا کہ وہ شیطان ہے۔ اُس وقت یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ شخص کتنا بڑا نیک ہے مصلّٰے بچھا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا اور اُس سے رو رو کر دعائیں کر رہا ہے بلکہ جو شخص بھی اُسے دیکھے گا اُسے منافق اور غدّار قرار دے گا اور کہے گا کہ جو شخص جہاد کو چھوڑ کر ایک کونہ میں چھپ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہے اور اُسے اِس بات کی کوئی پروا نہیں کہ دشمن کا حملہ کتنا شدید ہے یا مسلمانوں کو اِس وقت کتنے بڑے مصائب کا سامنا ہے وہ نمازی نہیں بلکہ اسلام کا دشمن اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا ہے۔ اسی طرح روزہ بڑی اچھی چیز ہے مگر ایک دفعہ جبکہ ایک جہاد کے موقع پر بعض صحابہؓ نے روزے نہ رکھے اور بعض نے رکھ لئے۔ جنہوں نے روزے رکھے تھے وہ میدان پہنچ کر نڈھال ہو کر گر گئے اور جن کے روزے نہیں تھے وہ بڑی پھرتی سے جہاد کی تیاری کرنے لگ گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نظارہ دیکھ کر فرمایا آج روزہ داروں سے بے روزہ بڑھ گئے۔ اگر روزہ ہر حالت میں عملِ صالح ہوتا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ آج روزہ داروں سے بے روزہ بڑھ گئے۔ آپ کا روزہ داروں پر غیر روزہ داروں کو ترجیح دینا صاف بتاتا ہے کہ روزہ رکھنا بھی بعض حالات میں عملِ صالح ہوتا ہے اور بعض حالات میں عملِ غیر صالح۔ چونکہ جہاد میں طاقت اور ہمت کی ضرورت تھی اِس لئے جن لوگوں نے اُس دن روزہ نہ رکھا اُن کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے روزہ داروں سے زیادہ قابلِ تعریف سمجھا۔ غرض عملِ صالح کے معنے ایسے عمل کے ہوتے ہیں جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اگر ان حقوق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو کوئی عمل عملِ صالح نہیں کہلا سکتا خواہ بظاہر وہ کتنا اچھا نظر آتا ہو۔ دراصل اسلام یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ خالی عمل کوئی عمل نہیں بلکہ

ہمیشہ کسی عمل کی خوبی یا اُس کی بُرائی نسبتی طور پر دیکھی جاتی ہے بسا اوقات ایک عمل ایک وقت میں اچھا ہوتا ہے لیکن دوسرے وقت میں بُرا ہو جاتا ہے پس اس آیت میں عملِ صالح کے معنی محض اچھے کام کے نہیں بلکہ ایسے کام کے ہیں جو نسبتی لحاظ سے بھی اچھا ہو۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ ہر عمل جو تم کو اچھا نظر آتا ہو وہ کرو۔ بلکہ اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ تم وہ کام کرو جو وقت کے لحاظ سے بھی مناسب ہو کیونکہ ہر عمل خواہ بظاہر کتنا اچھا نظر آتا ہو ایک دوسرے وقت میں بُرا بن جاتا ہے۔ مثلاً رحم کا مادہ ہے جب کسی شخص سے پوچھا جائے کہ بتاؤ رحم کیسی چیز ہے وہ فوراً کہہ دے گا کہ رحم سے بڑھکر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے یہ تو بڑی نیکی ہے۔ حالانکہ انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسے بھی آجاتے ہیں جب رحم ایک خطرناک جرم بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں سے کسی چور کو سینده لگاتا دیکھے اور وہ خیال کرے کہ مجھے اس پر رحم کرنا چاہیئے اگر میں نے پولیس میں اطلاع دی یا اسکو خود ہی گرفتار کر لیا تو اس پر مقدمہ چلے گا اور ریکی ... کے لئے قید ہو جائے گا۔ اس کے بیوی بچے الگ پریشان ہوں گے اور یہ علیحدہ مصیبت میں مبتلا ہوگا تو کوئی شخص اس فعل پر اُس کی تعریف نہیں کرے گا۔ ہر شخص جو اس واقعہ کو سُنیگا کہیگا کہ اُس نے سخت بُرا کام کیا اُسے چاہیئے تھا کہ چور کو فوراً گرفتار کر لیتا۔ اُس کا رحم سے کام لینا اور چور کو گرفتار نہ کرنا خوبی نہیں بلکہ انتہا درجہ کا نقص اور عیب تھا۔ اب دیکھو رحم ایک وقت اچھی چیزوں میں شمار ہوتا ہے دوسرے وقت بُری چیز بن جاتا ہے اور ہر شخص اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرنے کے لئے جا رہا ہو اور اس راز کا ایک تیسرے شخص کو بھی علم ہو مگر وہ پولیس میں اس وجہ سے اطلاع نہ دے کہ اگر میں نے اطلاع دی تو وہ پکڑا جائے گا اور اُس کے بیوی بچوں کو تکلیف ہوگی تو یہ ہرگز رحم نہیں کہلائے گا۔ اسی طرح اور ہزاروں مواقع انسانی زندگی میں ایسے آتے ہیں جب بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا کام بھی بُرا بن جاتا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ اُس سے بچے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ عملِ صالح کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور مومنوں کو ہدایت دی ہے کہ تم صرف ایسے کام نہ کرو جو بغیر نسبت کے تمہیں اچھے نظر آتے ہیں بلکہ تم وہ کام کیا کرو جو ارد گرد کے حالات اور نسبت کے لحاظ سے بھی اچھے معلوم ہوتے ہوں پس اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے معنے یہ ہیں کہ سب لوگ گھاٹے میں ہیں سوائے اُن کے جو ایمان لاتے اور اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں یعنی ایسے کام کرتے ہیں جو اضافی لحاظ سے اچھے ہوتے ہیں۔ یورپ کے لوگ اس بات پر بڑا فخر کیا کرتے ہیں کہ نظریۂ اضافت آئن سٹائن نے ایجاد کیا ہے حالانکہ یہ وہ نظریہ ہے جو آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن کریم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہی جبکہ قرآن کریم میں ہر جگہ عملِ صالح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے نظریۂ اضافت کے ہی ہیں یعنی کام اپنی ذات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اضافی لحاظ سے اچھے قرار پاتے ہیں۔ میں اُوپر ایسے کاموں کی مثالیں پیش کر چکا ہوں جو بظاہر اچھے نظر آتے ہیں لیکن نسبتی لحاظ سے بعض دوسرے مقامات پر بُرے بنجاتے ہیں۔ اب میں ایک بُرے کام کی مثال پیش کرتا ہوں جو اضافی نقطۂ نظر سے قابلِ تعریف قرار پاتا ہے۔ فرض کرو کسی شخص کا باپ ایک جگہ بیٹھا ہے اور سانپ اُس کے جسم پر چڑھ رہا ہے مگر اُسے کوئی علم نہیں کہ میرے جسم پر سانپ چڑھا جا رہا ہے۔ یہ نظارہ اُس کا لڑکا دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر میں نے ذرا بھی غفلت کی تو سانپ میرے باپ کو ڈس لیگا ایسی حالت میں اگر اُس کے اندر کچھ بھی عقل اور شعور کا مادہ پایا جاتا ہو تو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کریگا کہ زور کر ایک ڈنڈا اُس سانپ کو مارے یا اگر جوتا اُس کے پاس پڑا ہو تو اُسی کو اُٹھا کر اس سختی کے ساتھ سانپ پر مارے کہ وہ مر جائے یا ڈر کر بھاگ جائے اور اُسے کاٹنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اب جہاں تک فعل کا سوال ہے یہی کہا جائے گا کہ

اُس نے اپنے باپ کو ڈنڈا مارا یا جوتا اُٹھا کر اُس نے اپنے باپ کی طرف پھینکا۔ مگر جو شخص بھی اِس واقعہ کو سُنے گا یہ نہیں کہیگا کہ وہ بڑا نالائق اور خبیث تھا اُس نے اپنے باپ کو جوتا مارا۔ بلکہ ہر شخص اُس کی تعریف کرے گا اور کہیگا کہ وہ بڑا نیک اور سعادت مند بچہ تھا اُس نے اپنے باپ کی حفاظت کی اور ایسی پھرتی سے کام لیا کہ سانپ کے لئے ڈسنے کا موقع ہی نہ آیا اور وہ مرگیا یا ڈر کر بھاگ گیا پس جس طرح اچھے کام بعض دفعہ اضافی لحاظ سے بُرے بن جاتے ہیں اِسی طرح بُرے کام بعض دفعہ اضافی لحاظ سے اچھے بن جاتے ہیں۔ اور یہ وہ نظریہ ہے جسے آئن سٹائن نے نہیں بلکہ سب سے پہلے قرآن کریم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قرآن کریم اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ عمل وہی اچھا ہے جو صالح ہو اور جس میں تمام حالات کو مدنظر رکھ لیا گیا ہو۔ پس نظریۂ اضافت عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں بتا دیا گیا ہے لوگ کہتے ہیں کہ نیک عمل کرو۔ وہ کسی کا نام گڈ ایکشن رکھتے ہیں تو کسی کا نام بیڈ ایکشن۔ لیکن وہ اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ایکشن اپنی ذات میں نہ کوئی اچھا ہے نہ بُرا۔ اگر کوئی ایکشن اچھا ہے تو نسبتی لحاظ سے اور اگر بُرا ہے تو نسبتی لحاظ سے۔ قتل کتنی بُری چیز ہے لیکن لڑائی میں یہ کتنی اچھی چیز بن جاتا ہے۔ پس کوئی ایکشن اپنی ذات میں اچھا نہیں اور کوئی ایکشن اپنی ذات میں بُرا نہیں۔ صرف نسبت کے لحاظ سے ایک ایکشن اچھا بن جاتا ہے اور نسبت کے لحاظ سے ہی دوسرا ایکشن بُرا بن جاتا ہے۔ اور یہی معنے عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ہیں یعنی مومنوں کو وہ اعمال بجا لانے چاہئیں جو اضافی طور پر اعلیٰ قرار دئے جا سکیں (مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کریم اس اضافی نیکی کو بیان نہیں کرتا بلکہ انسان پر چھوڑ دیتا ہے تمام اضافی ضروری تفصیلات وہ خود بھی بیان کرتا ہے اور انتخاب کے اُصول اُس نے خود بیان کئے ہیں یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بیان کروائے گئے ہیں)

یہ امر پہلے بتایا جا چکا ہے کہ خُسر کے معنے ضلالت کے بھی ہوتے ہیں۔ گھاٹے کے بھی ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں معانی پر روشنی ڈالنے کے لئے (۱) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲) وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۳) وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ میں تین قسم کے لوگوں کا ہی استثنیٰ کیا ہے۔ فرماتا ہے وہ لوگ جن میں یہ تین خاصیتیں پائی جائیں گی یعنی اُن کے اندر ایمان بھی ہوگا اُن کے اندر عمل صالح بھی ہوگا اور وہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ پر بھی عمل کرنے والے ہوں گے وہ خُسر سے محفوظ رہیں گے۔ گویا خُسر کے بھی تین ہی معنے تھے اور اُس کے بالمقابل استثنیٰ بھی تین قسم کے لوگوں کا ہی کیا گیا ہے اور اس طرح ایک ایک بات کا رد ایک ایک بات میں کر دیا گیا ہے یعنی ایک قسم کا خُسر ایک بات سے، دوسری قسم کا خُسر دوسری بات سے اور تیسری قسم کا خُسر تیسری بات سے رد کر دیا ہے۔ یہ بناوٹ اِس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن کریم لُغت کے معانی کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ خُسر کے بھی تین معنے تھے اور اس کے مقابل میں بھی تین باتیں ہی پیش کی گئی ہیں خُسر کے پہلے معنے گمراہی اور ضلالت کے ہیں اس کے مقابل میں اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کو رکھا۔ یہ بتانے کے لئے کہ اُس وقت صرف مومنوں کی جماعت گمراہی سے محفوظ ہوگی کیونکہ وہ وقت کے مامور پر ایمان لانے والی ہوگی اور سب لوگ گمراہ اور صداقت سے دُور ہوں گے۔ پس گمراہی کے معنوں کو اٰمَنُوْا نے رد کر دیا۔ دوسرے معنے خُسر کے گھاٹے کے ہیں۔ اس کو رد کرنے اور لوگوں کو یہ بتلانے کے لئے کہ گھاٹے سے بھی صرف مومنوں کی جماعت محفوظ ہوگی اللہ تعالیٰ نے عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے الفاظ رکھ دئے۔ گھاٹا آخر کیوں ہوتا ہے اِسی لئے کہ انسان مناسب حال اعمال نہیں کرتا۔ اگر کوئی تاجر وقت پر کسی چیز کو خریدے گا نہیں۔ وقت پر کسی چیز کو بیچے گا نہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ اُس کو اپنی تجارت میں خسارہ ہوگا

لیکن اگر وہ عملِ صالح اختیار کرے گا یعنی ایسے اعمال بجالائیگا جو تجارت کے مناسب حال ہوں تو وہ گھاٹے سے بچ جائیگا۔ پس مناسبِ حال اعمال انسان کو گھاٹے سے محفوظ رکھتے ہیں چونکہ مومن مناسبِ حال اعمال بجالائینگے اس لئے وہ گھاٹے سے بھی محفوظ رہیں گے۔

خُسر کے تیسرے معنے ہلاکت اور بربادی کے ہیں اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ نے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ رکھ دیا کہ مومن نہ صرف گمراہی سے محفوظ ہوں گے نہ صرف گھاٹے سے محفوظ ہوں گے بلکہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کی وجہ سے وہ ہلاکت اور بربادی سے بھی محفوظ ہوں گے۔ یہ صاف بات ہے کہ دنیا میں جب کوئی نئی صداقت آتی ہے لوگوں میں اُسکی مخالفت شروع ہو جاتی ہے اور اکثر لوگ اُس کو مٹانے کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اور جب کسی اقلیت کو اکثریت کی مخالفت کا سامنا ہو حکومت اُس کی مخالف ہو جائے، رعایا اُس کی دشمن ہو جائے، تاجر اُس کو مٹانے پر کمربستہ ہو جائیں، صنّاع اُس کی ہلاکت کے درپئے ہو جائیں۔ اسی طرح عالم کیا اور جاہل کیا، بڑے کیا اور چھوٹے کیا سب کے سب اس ارادہ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں کہ ہم اس کو کچل دیں گے تو ایسی حالت میں اُس کے لئے تباہی سے بچنے کے دو ہی ذرائع ہوتے ہیں۔

اوّل اُس کے پاس ہلاکت سے بچنے کے مکمل سامان ہوں۔
دوم اُن سامانوں سے کام لیا جائے۔

سامان نہ ہوں تب بھی انسان ہلاکت سے نہیں بچ سکتا اور اگر سامانوں سے کام نہ لیا جائے تب بھی انسان بربادی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پانی نہ ہو تب بھی انسان پیاسا مر جاتا ہے اور اگر پانی تو ہو مگر اُس کو پیا نہ جائے تب بھی انسان مر جاتا ہے۔

پہلا ذریعہ تو مومنوں کو حاصل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مامور پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کی عملی قوت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ ایسے اعمال بجالاتے ہیں جو موقع اور محل کے مناسب ہوں۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک زائد بات یہ بھی ہوتی ہے کہ اُنہیں اپنی کامیابی کے متعلق خدا تعالیٰ کا وعدہ نظر آرہا ہوتا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ دنیا خواہ کس قدر مخالفت کرے وہ ہمیں کبھی مٹا نہیں سکتی۔ پس جہاں تک ہلاکت سے محفوظ رہنے کے سامانوں کا سوال ہے وہ مومنوں کو پورے طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ اُن کے اندر ایمان بھی ہوتا ہے، اُن کے اندر قوتِ عمل بھی ہوتی ہے اور اُنہیں اپنی کامیابی کے متعلق خدا تعالیٰ کے وعدوں کی بنا پر کامل یقین بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ سامانوں سے کام لیا جائے۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خالی عملِ صالح انسان کے لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ جب تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کا مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے تب وہ ہلاکت سے بچا کرتی ہے اس کے بغیر نہیں۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کیا چیز ہے؟ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ حق کے ایک معنے صداقت کے بھی ہیں اس لئے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے ایک معنے تو یہ ہوں گے کہ مومن اصولِ صداقت پر خود بھی قائم ہوں گے اور دوسروں کو بھی قائم کریں گے یعنی مومنوں کی یہ حالت ہوگی کہ اُن میں سے ہر شخص نہ صرف خود صداقت کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے گا بلکہ دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرے گا کہ وہ ہمیشہ صداقت کو قبول کرنے کے لئے تیار رہا کریں پہلی اور بڑی چیز جو کسی قوم کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے وہ غلط نظریوں پر اُس قوم کا قائم ہو جانا ہے۔ جب کسی قوم کے سامنے غلط نظریے ہوں گے لازماً وہ غلط نتائج پر پہنچیگی اور غلط نتائج سے غلط اعمال ظاہر ہوں گے۔ پس تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ قوم غلط نظریوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔ ہاں جب کوئی سچی بات اُس کے سامنے پیش ہوگی تو وہ اُسے فوراً قبول کرے گی۔ یہ امر انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس چیز سے کسی کو وابستگی ہو جائے

وہ اُس سے ہٹا نہیں کرتا۔ صرف صداقت کی جستجو کا احساس
ہی اُسے ان بندھنوں سے نجات دیا کرتا ہے ورنہ جب ایک
لمبی عادت کسی غلطی کے متعلق قوم میں پائی جائے اور صداقت
کی جستجو کا احساس اُس کے قلب میں نہ رہے تو اُس غلطی کو
ترک کرنا لوگوں کے لئے سخت مشکل ہوتا ہے وہ سچائی پر اعتراض
کرنے کے لئے تو تیار ہو جاتے ہیں مگر یہ برداشت نہیں
کر سکتے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کریں۔

جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تو کئی لوگوں کے
دلوں میں اُس کے متعلق حسد پیدا ہو گیا مگر چونکہ وہ خود کوئی
ایسا کام نہیں کر سکتے تھے اِس لئے اُنہوں نے کہنا شروع
کر دیا کہ کولمبس نے اگر امریکہ دریافت کر لیا ہے تو اِس میں
کونسی بڑی بات ہے یہ کام تو ہم میں سے ہر شخص کر سکتا
تھا۔ جو بھی جہاز میں سوار ہو کر نکل پڑتا آخر ایک دن اُس
نے امریکہ پہنچ ہی جانا تھا۔ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں جسے
سراہا جائے اور جس کے سر انجام دینے پر کولمبس کی
تعریف کی جائے۔ جب کولمبس کو معلوم ہوا کہ میرے متعلق
بعض لوگ اِس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ تو اُس نے ایک
پارٹی میں بہت سے لوگوں کو مدعو کیا اور اپنی جیب میں سے
ایک انڈا نکال کر اُن سے کہا کہ اِسے میز پر کھڑا کر دو۔
سب اِدھر اُدھر دیکھنے لگے اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ انڈے
کو میز پر کس طرح کھڑا کیا جائے۔ کولمبس نے سوئی نکالی اور
انڈے میں سوراخ کر کے اُس میں سے تھوڑا سا لعاب نکالا
اور انڈے کو چپکا کر میز پر کھڑا کر دیا۔ اِس پر لوگ کہنے لگے
یہ کونسی بڑی بات تھی یہ تو ہم بھی کر سکتے تھے۔ کولمبس نے
کہا میں نے سُنا ہے کہ تم امریکہ کے متعلق یہ کہہ رہے ہو کہ
اگر کولمبس نے اُس کی دریافت کر لی ہے تو اِس میں کوئی بڑی
نہیں اگر ہمیں موقع ملتا تو ہم بھی دریافت کر لیتے۔ امریکہ
دریافت کرنے کا تو تمہیں موقع نہیں ملا لیکن انڈے کو میز پر
کھڑا کرنے کا تو تمہیں موقع مل گیا تھا پھر تم کیوں اِس کو
کھڑا نہ کر سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ صداقت کے اصول
بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ سوال صرف کام کرنے اور
صداقت سے وابستگی پیدا کرنے کا ہوتا ہے۔ جن لوگوں
کے دلوں میں سچائی کی تلاش کا جذبہ ہوتا ہے وہ معمولی معمولی
باتوں سے بڑے بڑے اہم نتائج اخذ کر لیتے ہیں اُنہیں اِس
سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ سچائی ہمیں کہاں سے ملی ہے۔ وہ
سچائی کی طرف ایک پیاسے کی طرح اُمڈ کر جاتے اور اپنے
سابق غلط خیالات کو فوراً ترک کر دیتے ہیں لیکن جن لوگوں
کے دلوں میں صداقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا اُن کے
لئے اپنی پُرانی غلطیوں کو چھوڑنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔

آخر یہ بھی کوئی مسئلہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مرے
نہیں بلکہ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ جب ساری دنیا آدم سے
لے کر اب تک مرتی چلی آئی ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ
حضرت عیسیٰ علیہ السلام موت سے بچ جاتے اور وہ تمام
بنی نوع انسان کے خلاف زندہ آسمان پر چلے جاتے مگر
چونکہ مسلمان اِس عقیدہ کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں اِس
لئے اُنہیں اِس کو چھوڑنا ایک مصیبت معلوم ہوتا ہے۔ اِسی
طرح اور کئی قسم کے غلط مسائل ہیں جو زمانۂ نبوت سے بُعد کی
وجہ سے مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں اور جن سے اِدھر اُدھر
ہونا اُن پر نہایت شاق گذرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ہمت
سے کام لے کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان
لے آتے تو یہ طوق و سلاسل ایک آن میں کٹ جاتے ہیں
اور اُسے کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اور لوگوں کو تو یہ نظر
آتا ہے کہ فلاں بات امام غزالیؒ نے کہی ہے ہم اُسے کس طرح
چھوڑ دیں۔ فلاں بات جنیدؒ نے کہی ہے ہم اُسے کس طرح
چھوڑ دیں۔ فلاں بات سید عبدالقادر جیلانیؒ نے کہی ہے ہم اُسے
کس طرح چھوڑ دیں۔ فلاں بات امام رازیؒ نے کہی ہے ہم
اُسے کس طرح چھوڑ دیں۔ فلاں مسئلہ امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا
ہے ہم اُسے کس طرح چھوڑ دیں۔ فلاں مسئلہ امام شافعیؒ نے بیان
کیا ہے ہم اُسے کس طرح چھوڑ دیں۔ لیکن ایک احمدی کے لئے
اِن میں سے کوئی بھی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے ایک مامور پر ایمان لا چکا ہوں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام لانے والے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم میرے سامنے ہے جو کچھ وہ کہیگا وہ درست ہوگا اور جس بات کی وہ تردید کرے گا وہ غلط ہوگی۔ مجھے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں کہ امام رازی یا امام غزالی یا امام ابو حنیفہ نے کیا کہا ہے میں نے تو یہ دیکھنا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا کہا ہے اور مسیح موعود علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے کیا ہدایت پائی ہے۔

غرض ہر قوم میں مختلف قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مامور آتا ہے تو پچھلے سارے تعلقات کٹ جاتے ہیں۔ آخر بڑے بڑے آدمی بھی تو غلطی کرسکتے ہیں۔ اگر ہزار مسائل وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے پیدا کرتے ہیں تو ایک دو مسئلوں میں اُن سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں مگر ایک ایک غلطی اکٹھی ہوتے ہوتے غلطیوں کا ایک طومار بنجاتا ہے جس میں لوگ پھنس جاتے ہیں اور وہ حیران ہوتے ہیں کہ ہم اس دلدل میں سے کس طرح نکلیں اگر ہم نکلے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم اپنے بزرگوں کے خلاف قدم اٹھا رہے ہیں پس جب تک کوئی شخص نبی پر ایمان نہیں لاتا وہ کئی قسم کی مشکلات میں پھنسا رہتا ہے۔ لیکن ادھر اُسے نبوت پر ایمان نصیب ہوتا ہے اور اُدھر یکدم اُس کے تمام بوجھ اُتر جاتے ہیں اور وہ رسّیاں جنہوں نے اُس کو جکڑا ہوتا ہے سب ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتی ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو ایمان نصیب ہوتا ہے اُس کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی نبی پر ایمان لاتا ہے اُس کی پچھلی تمام روایتی قیود ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ تمام رسّیاں جن سے اُس کا جوڑ جوڑ جکڑا ہوا ہوتا ہے کٹ جاتی ہیں اور وہ حرّیت اور آزادی کی فضا میں پہلی مرتبہ سانس لیتا ہے کیونکہ نبی کے ماننے والے اس اصل پر قائم ہوتے ہیں کہ جو سچی بات ہے اُس کو ہم نے ماننا ہے اور جو غلط بات ہے اُس کو ہم نے نہیں ماننا خواہ اُسے کسی کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہو۔ گویا وہ طوق جنہوں نے اُس کی گردن کو جھکایا ہُوا ہوتا ہے اور وہ سلاسل جو اُس کے پاؤں میں پڑی ہوتی ہیں سب کٹ جاتی ہیں اور وہ سچائی کا علمبردار بن جاتا ہے۔ پس تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے پہلے معنے یہ ہیں کہ مومن اصولِ صداقت پر خود بھی پوری طرح قائم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۲) حَقّ کے ایک معنے جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے یہ معنے ہیں کہ مومن خدا تعالیٰ سے خود بھی مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اُس سے مخلصانہ تعلقات پیدا کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ درحقیقت اقوام میں دیرینہ عادات کی وجہ سے آہستہ آہستہ خدا تعالیٰ کا وجود بالکل غائب ہو جاتا ہے اور اسکی بجائے ایک نئی شکل پیدا ہو جاتی ہے جس کی وہ پرستش کرنے لگتے ہیں۔ آج دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں سب کی یہی حالت ہے۔ عیسائیت کو دیکھ لو، ہندو مذہب کو دیکھ لو۔ اور مذاہب پر نظر ڈال لو۔ سب کی اصل شکل تو مٹ چکی ہے لیکن قولی روایات نے اُن کو ایک نئی شکل دے دی ہے جس کے وہ پرستار بنے ہوئے ہیں۔ یہ نئی شکل مذہب کی قائم کردہ نہیں ہوتی بلکہ قوم کے بگڑے ہوئے خیالات و تصورات کی قائم کردہ ہوتی ہے۔ جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آتا ہے تو یہ سارے بُت ایک ایک کر کے گر جاتے ہیں اور اصلی خدا لوگوں کے سامنے آجاتا ہے تب لوگ بُت پرستی کے گڑھوں میں سے نکلتے اور اللہ تعالیٰ کے قرب اور اُس کی محبت کے میدان میں بڑھنے لگتے ہیں۔ پس تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے ایک معنے یہ ہیں کہ مومن اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ تم حقیقی خدا کی پرستش کرو اور اُس سے اپنے تعلقات بڑھاؤ۔ بُتوں کی پرستش میں اپنا وقت ضائع مت کرو۔

(۳) حَقّ کے تیسرے معنے عدل کے ہیں۔ اس لحاظ سے تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے معنے یہ ہیں کہ مومن خود بھی عدل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی عدل سے کام لینے کی نصیحت کرتے ہیں۔ درحقیقت

۲۶۱ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے چھ معنے

ایک بڑی بھاری خرابی قومی روایات کی وجہ سے یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ عدل و انصاف سے کام لینا ترک کر دیتے ہیں۔ ہزاروں خاندان دنیا میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنی پُرانی روایات پر سختی سے جمے ہوئے ہیں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم میں سے فلاں نے یہ یہ خرابی کی مگر اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ ہم خاندان کے افراد کو چھوڑ نہیں سکتے ہم مجبور ہیں کہ اُن کا ساتھ دیں اور اپنے خاندان کو دوسروں کے مقابلہ میں ذلیل نہ ہونے دیں۔ پس قدیم تعلقات کی وجہ سے عدل کی رُوح بالکل مٹ جاتی ہے لیکن جب نبی آتا ہے تو دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی وہ رُوح جو پاؤں تلے مسلی جا رہی ہوتی ہے از سرِ نو زندہ ہو جاتی ہے وہ لوگ جنہیں اُس پر ایمان لانے کی سعادت نصیب ہوتی ہے کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں انصاف قائم کریں گے۔ ہم مظلوم کو اُس کا حق دلائیں گے۔ ہم ظالم کو اُس کے کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔ ہم یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ سرمایہ دار مزدور پر ظلم کرے یا امیر غریب کو لُوٹنے کی کوشش کرے وہ عدل و انصاف کے پیکر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لینا چاہیئے۔

(۴) حق کے چوتھے معنے اَلْيَقِيْنُ بَعْدَ الشَّكِّ کے ہیں۔ اس لحاظ سے تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے یہ معنے ہونگے کہ مومن شکوک و شبہات یا قیاس و تخمین پر اپنے ایمان کی بنیاد نہیں رکھتے بلکہ اپنے عقائد کی بنیاد یقین پر رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کے متعلق محض رسمی اعتقاد پیدا نہ کرو بلکہ وہ ایمان پیدا کرو جو مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ درحقیقت یقین پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ نبی کا وجود ہی ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے اور وہ اپنی صداقت کے زندہ نشانات لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو شکوک شبہات بالکل مٹ جاتے ہیں اور قیاس و تخمین کی بجائے ایمان کی بنیاد مشاہدہ پر آجاتی ہے پس تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے معنے یہ ہیں کہ مومن خود بھی یقین پر قائم ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی ہستی پر کامل یقین پیدا کرو رسمی ایمان تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

آج مسلمانوں کی یہی کیفیت ہے کہ اُن کے اندر اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر محض رسمی ایمان پایا جاتا ہے وہ ایمان جس کی یقین پر بنیادیں ہوتی ہیں اور وہ ایمان جو مستحکم اور غیر متزلزل ہوتا ہے اُس کا وجود اُن میں کُلّی طور پر مفقود ہے۔ بے شک وہ بظاہر اسلام کو سچا مذہب سمجھتے ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن اگر اُن سے پوچھا جائے کہ تم اسلام کو کیوں مانتے ہو یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیوں ایمان رکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو محض اِس لئے سچا مانتے ہیں کہ اُن کے ماں باپ یہ عقیدہ رکھتے تھے یا اس لئے سچا مانتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوگئے ہیں۔ اِس سے بڑھکر اُن کے پاس اپنے مذہب کی سچائی کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ مَیں نے خود کئی تعلیم یافتہ لوگوں سے یہ سوال کرکے دیکھا ہے مگر مجھے ہمیشہ اُن کی طرف سے مایوس کن جواب ملا ہے جو ثبوت ہوتا ہے اِس بات کا کہ آج مسلمانوں کے دلوں میں اپنے مذہب کی سچائی پر کوئی یقین نہیں وہ محض رسمی رنگ میں اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں ورنہ اُن کے دل کے اندرونی گوشے یقین اور وثوق سے بالکل خالی ہیں۔ ایک بہت بڑے آدمی جو اس وقت ہندوستان میں چوٹی کے علمی مقام پر ہیں اُن سے میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کیوں مانتے ہیں؟ اِس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کیوں مانتا ہوں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اب مسلمانوں میں محض رسمی ایمان رہ گیا ہے اور وہ مذہب پر غور کرنے کے عادی نہیں رہے۔ اسی وجہ سے

جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دُنیا میں ماموریت کا اعلان فرمایا تو مسلمان آپ پر اعتراض کرنے لگ گئے کیونکہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک خیالی وجود کو مان رہے تھے حقیقت اُن کی نظروں سے پوشیدہ تھی پس تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے معنے یہ ہیں کہ نبی کو ماننے والے خود بھی یقین پر قائم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی رسمی ایمان کے دائرہ سے نکالکر حقیقی ایمان کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ انکو عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر بات کو سوچ سمجھکر مانیں اندھی تقلید اختیار نہ کریں اِس لئے وہ ہر بات کی حکمت معلوم کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں تو سمجھ کر پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں تو سمجھ کر رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں تو سمجھ کر کرتے ہیں چندہ دیتے ہیں تو سمجھ کر دیتے ہیں، صدقہ و خیرات میں حصہ لیتے ہیں تو سمجھ کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے کاموں میں بشاشت پائی جاتی ہے اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اُس کا فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ اُن کے کاموں کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے تخمینہ اور قیاس پر نہیں ہوتی۔

(۵) حَقّ کے ایک معنے حزم اور احتیاط کے بھی ہیں۔ اِس لحاظ سے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے یہ معنے ہیں کہ مومن حزم پر قائم ہوتے اور دوسروں کو بھی اِس پر قائم کرتے ہیں۔ یہ خوبی بھی نبی پر ایمان لانے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے باقی تمام اقوام تہور کا شکار DESPERATE ہوکر اپنی طاقت کو بالکل کھو بیٹھتی ہیں لیکن نبی پر ایمان لانے والوں کے سامنے ایک بلند مقصد ہوتا ہے۔ دین کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری اُن میں سے ایک ایک فرد پر عائد ہوتی ہے اور چونکہ وہ ایک بہت بڑی امانت کے حامل ہوتے ہیں اِس لئے وہ اُونچ نیچ کو دیکھتے ہوئے سنبھل سنبھل کر اپنے قدم بڑھاتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ وہ گر پڑیں اور جس جھنڈے کو انہوں نے فتح و کامرانی کے ساتھ دشمن کے مقام پر گاڑنا ہے وہ سرنگوں ہو جائے۔ لیکن دوسری قومیں صرف اتنا جانتی ہیں کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم مرجائیں یا ماردیں۔ اِسی وجہ سے وہ اندھا دھند حملہ کرتی اور اپنی طاقت کو ضائع کر دیتی ہیں۔ پس اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مومن اپنے ہر کام میں حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہمیشہ محتاط راہ پر چلنے کی تاکید کرتے ہیں۔

(۶) اِسی طرح حَقّ کے ایک معنے موت کے بھی ہیں اِس لحاظ سے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے یہ معنے ہیں کہ مومن خود بھی موت کو خوشی سے قبول کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ ڈرو نہیں اپنی جان اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربان کر دو۔ گویا مومن جماعت قربانی اور اِیثار کی مجسمہ ہوتی ہے اور موت کا ڈر اُس کے دل کے کسی گوشہ میں بھی نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پیشگوئیاں ہماری کامیابی کے متعلق موجود ہیں اگر ہم زندہ رہے تو فاتح ہوں گے اور اگر مر گئے تو اگلے جہان میں آرام سے زندگی بسر کریں گے۔ دونوں صورتوں میں فائدہ ہی فائدہ ہے زندگی میں بھی فائدہ ہے اور موت میں بھی فائدہ ہے۔ زندہ رہے تو کامیابی یقینی ہے اور اگر مر گئے تو اگلے جہان میں ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کے وارث ہونگے۔ اِس یقین کی وجہ سے جو دلیری مومنوں میں پائی جاتی ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی کسی اور قوم میں نہیں ہوتا۔ جب بدر کے میدان میں کفار اور مسلمان ایک دوسرے کے مقابل میں پہنچ گئے تو کفار نے ایک شخص کو یہ پتہ لگانے کیلئے بھیجا کہ مسلمان کتنے ہیں اور اُن کے ساز و سامان کا کیا حال ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ آدمی نہایت ہوشیار تھا کیونکہ واپس جاکر اُس نے کہا میرا اندازہ یہ ہے کہ مسلمان تین سو سوا تین سو کے قریب ہیں اور یہ بات بالکل ٹھیک تھی کیونکہ مسلمان تین سو تیرہ تھے۔ مگر اُس نے کہا اے میرے بھائیو! میرا مشورہ یہ ہے کہ تم لڑائی کا خیال بالکل چھوڑ دو کیونکہ میں نے اُونٹوں اور گھوڑوں پر آدمیوں کو نہیں بلکہ موتوں کو سوار دیکھا ہے

یعنی اُن میں سے ہر شخص کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ وہ آج اِس نیت اور ارادہ کے ساتھ آیا ہے کہ میں زندہ
واپس نہیں جاؤں گا۔ اور جو قوم اِس نیت اور ارادہ
کے ساتھ میدان میں آئے اُس کا مقابلہ کرنا آسان
نہیں ہوتا۔ پس تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے معنے ہیں کہ مومن
نڈر اور بہادر ہوتے ہیں وہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ
خوشی سے اُس کو قبول کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی
یہی کہتے ہیں کہ تم موت سے مت ڈرو گویا تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ
میں مومنوں کے ایمان اور یقین کی طرف اشارہ ہے اور
بتایا گیا ہے کہ انہیں صداقت پر اتنا کامل یقین ہوتا
ہے کہ بجائے اِس کے کہ موت کو بُرا سمجھیں اُسے اپنے لئے
خوشخبری سمجھتے ہیں اور نہ صرف خود موت کے لئے تیار
رہتے ہیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر
تم کامیابی چاہتے ہو تو موت کے لئے تیار رہا کرو۔
پھر فرماتا ہے وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ مومنوں
کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود بھی صبر کرتے
اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ صبر کے
معنے یہ ہیں کہ اُن کے اندر مظالم کو برداشت کرنے کی طاقت
ہوتی ہے۔ اِسی طرح صبر کے ایک معنے استقلال کے
بھی ہیں گویا مومنوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی
سچائی کو قبول کرتے ہیں تو اس کے بعد انہیں اِس بات
کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ دشمن انہیں مصائب میں مبتلا
کرتا ہے یا اُن پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش
کرتا ہے وہ بڑی ہمت کے ساتھ تمام مشکلات کو برداشت
کرتے ہیں اِسی طرح نیکیوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں
یعنی استقلال کا مادہ اُن میں پایا جاتا ہے اور وہ دوسروں کو
بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ تمہیں اپنے اندر استقلال
اور مصائب کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کرنا چاہیئے۔

اِن آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومن
کا مذہب قومی مذہب ہوتا ہے اُس کی نیک خواہشات
صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ تمام بنی نوع
انسان تک وسیع ہوتی ہیں۔ وہ ایک عالمگیر مؤاخات
کا زبردست حامی ہوتا ہے اور تمام چھوٹوں اور بڑوں
کو ایک سلسلہ میں منسلک کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں
چاہتا کہ صرف میں نیک بنوں بلکہ یہ بھی چاہتا ہے
کہ میرا ساتھی بھی نیک ہو اور دنیا میں صلح اور آشتی
کی بنیاد ایسی مضبوط ہو کہ کوئی زلزلہ اُس کو جنبش میں
نہ لا سکے۔ یہی باتیں ہیں جو دنیا میں قوموں کو ہلاکت
سے بچایا کرتی ہیں۔ جس قوم کے افراد میں یہ باتیں پائی
جائیں اُس قوم کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا خواہ اُس کے
دس افراد ہوں، سَو ہوں، ہزار ہوں یا دس ہزار ہوں
وہ بہرحال غالب آتی اور دنیا میں قائم رہتی ہے۔ پس
فرماتا ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔
ہم زمانۂ نبوت کو یا دہر کو یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے آخری زمانہ کو اِس بات کی شہادت کے طور پر
پیش کرتے ہیں کہ چونکہ یہ تین صفتیں مومنوں کے
اندر پائی جائیں گی اِس لئے وہ یقیناً جیت جائیں گے
اور چونکہ یہ تین صفتیں اُن کے دشمنوں کے اندر نہیں
پائی جائیں گی اس لئے وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں
ضرور ہاریں گے ؛

سُوْرَۃُ الْھُمَزَۃِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ ھمزہ یہ مکی سورۃ ہے [1]

وَھِیَ تِسْعُ اٰیَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اس کی بسم اللہ کے سوا نو آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ۝

ہر غیبت کرنے والے (اور) عیب چینی کرنے والے کیلئے عذاب (ا ہی عذاب) ہے [2]

[1] سورۃ ہمزہ اکثر مفسرین کے نزدیک مکی ہے مستشرقین یورپ بھی اسے ابتدائی مکی سورتوں میں سے قرار دیتے ہیں۔ اس سورۃ میں زمانہ رسالت کے لوگوں کا حال بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دکھ دیتے تھے اور اپنے اموال پر مغرور تھے۔ ھُمَزہ و لُمَزہ کے معنے عیب چینی اور غیبت کے بھی ہوتے ہیں اور دکھ اور تکلیف دینے کے بھی ہوتے ہیں اور یہ دونوں معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں یعنی وہ دکھ بھی دیتے تھے اور عیب چینی اور غیبت بھی کرتے تھے۔ پھر اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ باوجود اہل مکہ کے مالدار ہونے کے اور باوجود اپنے اموال پر فخر کرنے کے اور باوجود اس کے کہ وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھتے تھے اُن کی طرف کئی قسم کے عیوب منسوب کرتے تھے اور اُن کی غیبتیں کیا کرتے تھے پھر بھی وہ لوگ ایک ایسے دکھ میں مبتلا ہو جائیں گے اور ایک ایسے عذاب سے پکڑے جائیں گے کہ اُن کے دلوں کا چین بالکل اُڑ جائے گا اور وہ آخر ہلاک اور برباد ہو جائیں گے۔

ترتیب | اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ سورتیں یکے بعد دیگرے باری باری اسلام کے ابتدائی دَور اور آخری دَور کے متعلق آ رہی ہیں پہلی سورۃ یعنی والعصر کا تعلق زیادہ تر آخری دَور کے ساتھ ہے۔ اب اس سورۃ میں اسلام کے پہلے دَور کا ذکر کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ چھوٹی چھوٹی سورتیں جو قرآن کریم کے آخر میں ترتیب مستقل کے طور پر رکھی گئی ہیں ترتیب نزول کے مطابق ابتدائے اسلام میں نازل ہوئی تھیں سوائے چند ایک کے جو بعد از ہجرت نازل ہوئیں۔ ان سورتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دونوں دَوروں کا متوازی ذکر کیا گیا ہے مگر جیسا کہ قرآن کریم کا اسلوب ہے یہ ذکر اس طرح ہے کہ اس زمانہ کے لوگ آخری دَور والی سورتوں سے بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے اور دَور اوّل والی سورتوں سے آج کل کے لوگ بھی برابر کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا عظیم الشان معجزہ ہے کہ جس وقت اسلام صرف چند افراد پر مشتمل تھا اُسی وقت اُس کی ترقی کے بعد تنزل اور اُسکے تنزل کے بعد کی ترقیات کا ذکر کیا جا رہا تھا۔ اس قدر عظیم الشان علم غیب اَور کسی کتاب میں نہیں پایا جا سکتا گویا اللہ تعالیٰ کے اظہار علی الغیب کا کمال قرآن کریم میں اپنی مکمل شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

(حاشیہ: سورۃ ہمزہ کا تعلق سورۃ عصر سے)

[2] **حل لغات** ۔ وَیْلٌ ۔ عذاب کے نازل ہونے یا وَیْلٌ

ہلاکت کے نازل ہونے کے معنوں میں آتا ہے یعنی اِس بات کے بتانے کے لئے کہ جس شخص کے متعلق یہ لفظ بولا جاتا ہے اُس کو اپنے مال یا عزت یا راحت و چین کے بارہ میں کوئی تکلیف پہنچے گی۔ گویا وہ تمام چیزیں جن کو انسان اچھا سمجھتا ہے یا جن کو اپنی عزت اور آرام کا موجب سمجھتا ہے اور جن کے ضائع ہونے پر وہ افسوس کا اظہار کرتا ہے اُن کے کھوئے جانے کی طرف جب اشارہ کرنا مقصود ہو تو وَیْلٌ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے پس وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کے معنے یہ ہوتے کہ عذاب آنے والا ہے ہر ہُمزہ اور لُمزہ پر یا اپنی عزت کی چیزیں اور راحت و آرام کی چیزیں ہُمزہ اور لُمزہ کھونے والا ہے۔ یہ لفظ جب کسی کے لئے استعمال کیا جائے تو اِس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اِس عذاب اور ہلاکت کا مستحق ہے یونہی اتفاقی یا ظلماً اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہوا مثلاً اگر کسی شخص پر ظلماً کوئی ایذا وارد ہو تو اس کے بارہ میں یہ نہ کہیں گے کہ وَیْلٌ۔

لَمَزَ هَمَزَ اور لَمَزَ عربی زبان کے لحاظ سے ایک ہی معنے رکھتے ہیں کیونکہ م اور ز ان دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ حروف بھی معنوں پر دلالت کرتے ہیں اور جب ایک قسم کے حروف ہوں تو اُن کے معنوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ اِن دونوں لفظوں میں م ز مشترک ہیں صرف فرق یہ ہے کہ ایک کے پہلے ہٗ ہے اور ایک سے پہلے لؔ آخری دو نوں حروف دونوں لفظوں میں مشترک ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ اُن کے معنوں میں شدید اتصال ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہے اور دونوں کے معنے بہت حد تک مشترک ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے هَمَزَهٗ هَمْزًا: غَمَزَهٗ۔ یعنی اسکو اشارہ کیا نَخَسَهٗ۔ اسکو انگلی ماری۔ دَفَعَهٗ اس کو دھکا دیا۔ ضَرَبَهٗ اس کو مارا۔ عَضَّهٗ اس کو کاٹا۔ اِغْتَابَهٗ اسکی غیبت کی۔ کَسَرَهٗ اس کو توڑ دیا۔ هَمَزَ الشَّیْطَانُ الْاِنْسَانَ: هَمَسَ فِیْ قَلْبِهٖ وَسْوَاسًا شیطان نے انسان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ هَمَزَ بِهِ الْاَرْضَ: صَرَعَهٗ اُس کو زمین پر دے مارا۔ هَمَزَ الْفَرَسَ: نَخَسَهٗ بِالْمِهْمَازِ لِیَعْدُوَ۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ تیزی سے دوڑے هَمَزَ الْعِنَبَ: عَصَرَهٗ۔ انگوروں کو نچوڑا (اقرب) الغرض ھمز کے معنے آنکھ مارنے کے بھی ہیں۔ انگلی مارنے کے بھی ہیں۔ دھکا دینے کے بھی ہیں۔ کاٹنے کے بھی ہیں۔ پیٹنے کے بھی ہیں۔ اِسی طرح ھمز کے معنے غیبت کے بھی ہیں۔ توڑنے کے بھی ہیں۔ دل میں وسوسہ پیدا کرنے کے بھی ہیں۔ زمین پر اٹھا کر دے مارنے کے بھی ہیں۔ گھوڑے کو ایڑ مارنے کے بھی ہیں اور کسی چیز کو نچوڑنے کے بھی ہیں۔

لَمَزَ (یَلْمِزُ لَمْزًا) کے معنے ہیں عَابَهٗ اُس پر عیب لگایا اور اس کے معنے اَشَارَ اِلَیْهِ بِعَیْنِهٖ وَنَحْوِهَا مَعَ کَلَامٍ خَفِیٍّ کے بھی ہیں (اقرب) یعنی جب مجلس میں لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی ایسا شخص آ جائے جسے ذلیل سمجھا جاتا ہو تو وہ لوگ جو آپس میں گہرے دوست ہوتے ہیں اُس کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لو جی فلاں شخص بھی ہماری مجلس کو خراب کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ مگر لمز اُس وقت آنکھ سے اشارہ کرنے کو کہتے ہیں جب اشارہ کے ساتھ کوئی بات بھی آہستگی سے کہی جائے مثلاً آنکھ سے اشارہ کیا اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ "تشریف لے آئے ہیں" مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ہماری مجلس کو خراب کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ گو الفاظ یہ استعمال کئے جاتے ہیں کہ "تشریف لے آئے ہیں" پس لمز کا لفظ اُس وقت استعمال کرتے ہیں جب اشارہ کے ساتھ بعض الفاظ بھی کہے جائیں۔ اِسی طرح اِس کے معنے دھکا دینے کے بھی ہیں۔ مارنے کے بھی ہیں اور عیب چینی کے بھی ہیں خصوصاً اُس عیب چینی کے جو کسی کے سامنے کی جائے۔

ان معنوں سے پتہ لگتا ہے کہ ھُمَزَہ اور لُمَزَہ کے معنوں میں شدید اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں کے معنے مارنے کے بھی ہیں۔ دونوں کے معنے دھکہ دینے کے بھی ہیں اور دونوں کے معنے عیب چینی کے بھی ہیں لیکن ھمز میں اُس عیب چینی کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو غیبت کا رنگ رکھتی ہو یعنی کسی کی پیٹھ پیچھے کی جائے اور لمز میں اُس عیب چینی کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو سامنے کی جائے۔ پھر ھمز میں توڑنے کے معنے بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے وہ حرکت جو ہاتھ یا سر سے اس طرح کی جائے جس طرح کوئی چیز ٹوٹ کر نیچے گرتی ہے مثلاً ہاتھ کو جھٹکا دے دیا جائے یا گردن کو خاص طریق پر حرکت دی جائے تو اُس کے لئے بھی ھمز کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

جہاں تک مارنے اور دھکہ دینے کا سوال ہے یہ معنے ھمز اور لمز دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح عیب چینی کے معنے بھی دونوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ھمز میں اِس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ پیٹھ پیچھے عیب چینی کی جائے اور لمز میں اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ مُنہ پر عیب چینی کی جائے پھر ھمز کے ایک زائد معنے نچوڑنے کے بھی ہیں۔

تفسیر ۔ مفسرین میں حتیٰ کہ صحابہؓ اور تابعین میں بھی اس آیت کے متعلق کثیر اختلاف پایا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ لغت میں قریباً ہم معنی ہیں۔ کسی نے ھمز کے معنے عیب چینی کے کئے ہیں اور لمز کے معنے غیبت کے کئے ہیں اور کسی نے لمز کے معنے عیب چینی کے کئے ہیں اور ھمز کے معنے غیبت کے کئے ہیں۔ لیکن اس اختلاف کی اصل وجہ وہی ہے جو میں نے اُوپر بیان کی ہے کہ یہ دونوں لفظ قریب المعنیٰ ہیں اور اس وجہ سے مختلف لوگوں کو اُن کے معنے کرنے میں شبہ واقع ہو گیا ہے چونکہ یہ دونوں الفاظ قریب المعنیٰ تھے وہ پورے طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس آیت میں ھمز کن معنوں میں استعمال ہُوا ہے اور لمز کن معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ لغت کی تدوین بعد کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ جب کسی علمی زبان کا دنیا میں رواج شروع ہوتا ہے اُسی وقت اُس کی لغت مکمل نہیں ہو جاتی بلکہ آہستہ آہستہ لغت کی کتابیں مدوّن ہونی شروع ہوتی ہیں تب لوگ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں اس سے پہلے نہیں۔ اسی وجہ سے جہاں تک لغت کا سوال ہے ابتدائی زمانہ کے مفسرین کے معنے ایسی تعیین نہیں کرتے جیسی تعیین بعد کے مفسرین کرتے ہیں کیونکہ بعد میں آنے والے مفسرین کو لغت کی مکمل کتابیں مل گئیں جو پہلے موجود نہیں تھیں۔ مثلاً ہمارے زمانہ میں تاج العروس موجود ہے۔ لسان العرب موجود ہے اور لغت کی یہ دونوں کتابیں اپنے اندر بہت وسیع معلومات رکھتی ہیں اور ان میں بڑی بڑی باریکیاں بیان ہیں لیکن تاج العروس آج سے تین سو سال پہلے لکھی گئی تھی اور لسان العرب آج سے چھ سات سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اِس سے قبل ایک لمبا عرصہ ایسا گذرا ہے جس میں لغت کی کتابیں مدوّن نہیں تھیں۔ گو عربی زبان کا یہ ایک بہت بڑا کمال ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہی اُس نے اپنی لغت کو عروج تک پہنچا دیا۔ مگر پھر بھی میرے نزدیک ابھی اس میں ترقی کی گنجائش ہے اور یہ لغت زیادہ بہتر طور پر مکمل ہو سکتی ہے کیونکہ ائمۂ لغت نے بعض جگہ سیر کن بحثیں نہیں کیں۔ لیکن پھر بھی ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس قدر عظیم الشان علمی ذخیرہ ہے کہ انگریز مصنف لین پول ایک جگہ عربی لغت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کاش ہماری زبان کی کوئی ایسی لغت ہوتی جیسی عربی زبان کی ہے۔ گو اس فقرہ کے ذریعہ اُس نے تسلیم کیا ہے کہ عربی زبان کی لغت کمل ہے مگر میرا خیال ہے جس رنگ میں ہم لغت کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں اور جس قسم کی تحقیق کی قرآن کریم کی تفسیر کے لئے ہمیں ضرورت پیش آتی ہے اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے ابھی اور زیادہ لغت کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ پرانی لغتوں میں ایک خفیف سا نقص یہ پایا جاتا ہے کہ بعض جگہ مفسرین کے اقوال کو بھی لغت میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اگر اس نقص کو دُور کر دیا جاتے اور لغت کی

لے
صحابہؓ اور تابعین میں آیت ویل لکل ھمزۃ لمزۃ کے معنے میں اختلاف

حکمت کو زیادہ واضح کیا جائے تو عربی زبان کی ایک ایسی
لغت مکمل ہو جائے گی جس کی مثال دنیا کی اور کسی زبان
میں نہیں مل سکے گی۔

بہرحال جب دو قریب المعنیٰ الفاظ آ جائیں تو اُن
دونوں کا آپس میں جو اختلاف ہوتا ہے صرف اسکو لیا جاتا
ہے۔ کیونکہ بلاغت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب دو لفظ بولے جائیں
اور وہ دونوں آپس میں مشترک معنے رکھتے ہوں تو دوسرے
لفظ کے صرف وہ معنے لینے چاہئیں جن میں اُس کا پہلے
سے اختلاف پایا جاتا ہو۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مشترک معنوں
کے لئے دو لفظوں کی ضرورت نہیں ہو سکتی ایک لفظ بھی پورا
کام دے سکتا ہے۔ پس جب دو لفظ اکٹھے استعمال ہوں اور
دونوں قریب المعنیٰ ہوں تو ہمیشہ دوسرے لفظ کے وُہ
معنے لئے جاتے ہیں جن میں وہ پہلے سے مختلف ہو۔ اِس
اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت تو
یہ ہے کہ ھمز کو مار پیٹ کے معنوں میں لیا جائے کیونکہ ھمز میں
مار یا جسمانی ضرب کے معنے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اصل
میں ھمز کے معنے کسر یعنی توڑنے کے ہوتے ہیں پس چونکہ اس
کے اصل معنے توڑنے کے ہیں اس لئے ھمز میں مارنے پیٹنے
کے معنے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پس ایک صورت تو یہ ہے
کہ ہم ھمز کے معنے مارنے پیٹنے کے لیں اور لمز کے دوسرے
معنے لیں یعنی عیب چینی وغیرہ کے۔ اور دوسری صورت
یہ ہو سکتی ہے کہ ھمز کے معنے ہم غیبت کے کر لیں اور لمز
کے معنے عیب چینی کے کئے جائیں۔ یہ فرق میں نے کیوں کیا
ہے؟ یعنی میں کیوں کہتا ہوں کہ ھمز کے معنے مارنے پیٹنے کے
ہیں اور لمز کے معنے عیب چینی کے ہیں یا ھمز کے معنے
غیبت کے ہیں اور لمز کے معنے عیب چینی کے ہیں۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ فصیح کلام میں ہمیشہ تدریج پائی جاتی ہے
اور یہ تدریج کبھی اقسام کے لحاظ سے ہوتی ہے اور کبھی
ڈگری کے لحاظ سے مثلاً ایک ادیب شخص اگر کسی کے متعلق
یہ بیان کرنا چاہے گا کہ وہ کافی بوجھ اٹھا سکتا ہے تو

۲۷۱
ھمز اور لمز کے معنے کی تعیین

کہے گا کہ فلاں شخص ایک من بوجھ اٹھا سکتا ہے بلکہ دو من بھی
اٹھا سکتا ہے لیکن جو ادیب نہیں وہ کہے گا کہ فلاں شخص دو من
بوجھ اٹھا سکتا ہے بلکہ ایک من بھی اُٹھا سکتا ہے۔ ہر شخص جو
اِس فقرہ کو سنے گا یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ یہ فقرہ فصاحت سے
گرا ہوا ہے کیونکہ جب اُس نے یہ کہہ دیا تھا کہ فلاں شخص
دو من بوجھ اٹھا سکتا ہے تو اُسے علیحدہ طور پر یہ کہنے کی
کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ایک من بوجھ بھی اُٹھا سکتا ہے
کیونکہ ایک من بوجھ دو من بوجھ میں شامل تھا۔ اِسی طرح
کوئی سمجھدار انسان یہ نہیں کہے گا کہ فلاں شخص بڑا کام بھی
کر سکتا ہے اور چھوٹا بھی۔ یا ایم اے پاس بھی ہے اور
بی اے بھی۔ ہاں یہ ضرور کہے گا کہ فلاں شخص بی اے پاس
ہے بلکہ ایم اے بھی پاس ہے یا فلاں بات کی مقدرت
رکھتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فلاں بات کے کرنے کی
بھی اُس میں اہلیت پائی جاتی ہے۔ یا ادیب ہی بلکہ شاعر
بھی ہے۔ مگر پہلے بڑی بات بیان کی جائے اور پھر چھوٹی۔
یہ فصیح کلام کے بالکل منافی ہوتا ہے۔ اِس نقطۂ نگاہ کے
ماتحت اگر ھمز و لمز میں سے ایک کے معنے ہم غیبت کے
کر لیں اور دوسرے کے معنے مُنہ پر عیب چینی کے کر لئے
جائیں تو یہ بالکل درست ہوں گے کیونکہ ان معانی میں
تدریج پائی جائے گی جو ہر فصیح کلام کی ایک ممتاز خوبی ہوتی
ہے۔ جو شخص غیبت کرنے کا عادی ہوتا ہے اُس میں بہادری
نہیں ہوتی۔ بُزدلی کچھ نہ کچھ اُس کی طبیعت میں پایا جاتا ہے۔ گو
عیب چینی کرنے کے لحاظ سے دونوں گنہگار ہوتے ہیں
وہ شخص بھی گناہ کرتا ہے جو کسی کی پیٹھ پیچھے عیب چینی کرتا ہے
اور وہ شخص بھی گناہ کرتا ہے جو کسی کے مُنہ پر اُسکے عیوب
بیان کرنے شروع کر دیتا ہے لیکن باوجود اس کے کہ وہ
دونوں گنہگار ہوتے ہیں پھر بھی اُن میں ایک فرق پایا جاتا
ہے۔ جس شخص میں بُزدلی زیادہ ہوتی ہے وہ پیٹھ کے پیچھے
عیب بیان کرتا ہے اور جو شخص شرارت میں بڑھ جاتا ہے
وہ پیٹھ پیچھے بھی عیب چینی کرتا ہے اور سامنے بھی کسی کا

عیب بیان کرنے سے باز نہیں آتا۔ اِس لحاظ سے ھمز اور لمز دونوں کے معانی میں ایک تدریج پائی جائے گی۔ ھمز سے وہ شخص مراد ہوگا جو غیبت کرتا ہے اور لمز سے وہ شخص مراد ہوگا جو غیبت ہی نہیں کرتا بلکہ مُنہ پر بھی گالیاں دینے لگ جاتا ہے۔

دوسری صورت میں نے یہ بتائی تھی کہ کبھی اقسام کے لحاظ سے بھی کلام میں تدریج پائی جاتی ہے۔ مگر اقسام سے میری مراد ظاہری قسمیں نہیں بلکہ وہ قسمیں ہیں جنکی علم النفس پر بنیاد ہوتی ہے۔ مثلاً مار پیٹ بظاہر اعتراض کرنے سے زیادہ سخت نظر آتی ہے لیکن دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ بعض دفعہ غصہ میں آکر انسان مار تو بیٹھتا ہے اور دوسرے کو بُرا بھلا بھی کہہ دیتا ہے لیکن سچائی کا انکار کرنا اُس کے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب بظاہر سچائی کا انکار کم نظر آتا ہے اور مار پیٹ زیادہ سخت چیز دکھائی دیتی ہے لیکن علم النفس کے ماتحت مار پیٹ کم درجہ رکھتی ہے اور سچائی کا انکار بڑی خطرناک چیز ہے۔ مارنے کو تو مائیں بھی اپنے بچوں کو مار لیتی ہیں۔ باپ بھی اپنے بچوں کو مار دیتے ہیں۔ اُستاد بھی اپنے شاگردوں کو مار لیتے ہیں لیکن اگر انہی کو پوچھا جائے کہ بتاؤ تمہاری مار پیٹ زیادہ سخت ہے یا بچوں کا جھوٹ بولنا یا کسی اور بُرائی میں اُن کا ملوث ہونا زیادہ خطرناک ہے؟ تو ہر شخص کہے گا کہ مار پیٹ اخلاقی خرابیوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ اِس تدریج کو مدنظر رکھتے ہوئے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ میں ھمز کے معنے مار پیٹ کے لئے جائیں گے اور لمز کے معنے عیب چینی کے ہوں گے یعنی وہ لوگ نہ صرف مارتے پیٹتے ہیں بلکہ یہاں تک اُن کی نوبت پہنچ چکی ہے کہ جن امور کی صداقت اُن پر واضح ہو چکی ہے اُن کا بھی انکار کرتے ہیں یعنی وہ تمام حُسن جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ میں پایا جاتا ہے۔ وہ تمام خوبیاں جو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں پیدا فرمائی ہیں اور وہ تمام بھلائیاں جو اسلامی تعلیم میں رکھی گئی ہیں اُن میں سے ایک ایک حُسن اور ایک ایک خوبی اور ایک ایک بھلائی کا وہ بڑی سختی سے انکار کر رہے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ سچی باتیں کہتے ہیں تو اُن کو جھوٹا قرار دیا جاتا ہے۔ وہ انصاف قائم کرتے ہیں تو انکو ظالم کہا جاتا ہے۔ وہ امن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انکو فسادی بتایا جاتا ہے۔ غرض کوئی خوبی اور بھلائی ایسی نہیں جس کا کفار کی طرف سے انکار نہ کیا جا رہا ہو اور یہ حالت یقیناً ایسی ہے جو پہلی حالت سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ مار پیٹ میں تو صرف غصہ کا اظہار ہوتا ہے لیکن کسی سچائی کا انکار یا طعنہ زنی یا دوسروں کی تحقیر و تذلیل کا ارتکاب ایسے امور ہیں جو اخلاق اور روحانیت کے کُلّی فقدان پر دلالت کرتے ہیں اور جن کے اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تلوار کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں مگر وہ زخم جو زبان کی چُھری دوسرے کے قلب پر پیدا کرتی ہے کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ غرض مار پیٹ کی نسبت طعنہ زنی اور تحقیر و تذلیل کے کلمات جو دوسروں کے متعلق استعمال کئے جائیں بہت زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ پس ھمز کے معنے مارنے پیٹنے کے ہیں اور لمز کے معنے تحقیر و تذلیل اور سچائیوں کا انکار کرنے کے ہیں۔ بظاہر مار پیٹ زیادہ سخت نظر آتی ہے لیکن علم النفس کے ماتحت مار پیٹ کم درجہ رکھتی ہے اور سچائی کا انکار زیادہ خطرناک ہوتا ہے یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ھمز کو پہلے رکھا اور لمز جس میں اخلاقی بُرائی زیادہ تھی اُسکو بعد میں بیان کیا۔ لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے یونہی ھمز کو پہلے رکھ دیا ہے اور لمز کو بعد میں۔ حالانکہ ھمز کو پہلے ہی رکھنا چاہیئے تھا اور لمز کو بعد میں ہی رکھنا چاہیئے تھا۔ اگر لمز کو پہلے اور ھمز کو بعد میں رکھا جاتا تو کلام اپنی فصاحت کھو بیٹھتا۔ یہ قرآن کریم کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے کہ اُس نے جہاں بھی کسی لفظ کو استعمال کیا ہے موقع اور محل کو مدنظر رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے اگر اُس لفظ کو ذرا بھی اِدھر اُدھر کر دیا جائے تو بہت بڑا

نقص واقع ہو جاتا ہے۔

اس سورۃ میں گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگوں کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے ایک عام قاعدہ کا بھی استنباط ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ وہ ایسے رنگ میں بات کرتا ہے کہ ہر زمانہ کے لوگ اُس سے فائدہ اٹھا سکیں اور کسی کے دل میں یہ وسوسہ پیدا نہ ہو کہ یہ بات میرے متعلق نہیں بلکہ کسی گذشتہ زمانہ کے لوگوں کے متعلق ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ ھمزہ اور لمزہ میں مغیرہ۔ عاص بن وائل اور شریک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ اسلام کے خلاف ہمیشہ ناجائز حرکات کیا کرتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے ذریعہ اُن کو انتباہ فرما دیا کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو اُن پر عذاب نازل کر دیا جائے گا۔ مگر میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ اس سورۃ کے وسیع مضمون کو اس طرح محدود کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر یہ سورۃ محض مغیرہ کے کسی فعل کی وجہ سے نازل ہوئی تھی یا صرف عاص بن وائل کو اس میں مخاطب کیا گیا تھا یا صرف شریک کا اس میں ذکر تھا تو اللہ تعالیٰ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وَيْلٌ لِّلْعَاصِ بْنِ وَائِلٍ یا وَيْلٌ لِّلْمُغِيْرَةِ یا وَيْلٌ لِّشَرِيْكٍ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا بلکہ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کہا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ کلام میں جب کسی خاص شخص کی تعیین کر دی جائے تو مضمون نامکمل ہو جاتا ہے مثلاً اگر ہم کہیں وَيْلٌ لِّزَيْدٍ زید کے لئے ہلاکت ہے تو ہر شخص یہ دریافت کرنے کی کوشش کرے گا کہ زید کیوں بُرا ہے یا اُس میں کونسی خرابی پائی جاتی ہے کہ اُس کے متعلق ویل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ تو ہر شخص کہیگا کہ یہ بالکل درست ہے جو غیبت کرتا ہے یا جسے عیب چینی کی عادت ہے یا سچائیوں کا انکار کرتا ہے وہ ضرور بُرا ہے اور اس قابل ہے کہ اُس کو سزا ملے۔

دوسرے قرآن کریم چونکہ ہر زمانہ کے لوگوں کی ہدایت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ایک مکمل دستور العمل قرار دیا ہے اس لئے اگر اس سورۃ میں کسی کا نام لے لیا جاتا تو اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً اگر یہ کہا جاتا کہ وَيْلٌ لِّلْعَاصِ بْنِ وَائِلٍ تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا تھا وہ مر گیا اُس کی اولاد بھی مر گئی۔ اولاد کی اولاد بھی مر گئی اور پھر اُس اولاد کی اولاد بھی مر گئی بلکہ اُس کی اولاد بعد میں مسلمان بھی ہو گئی اور اسلام کی خدمت میں اُس نے اپنی عمر بسر کر دی۔ اب ہمیں اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا کہ وَيْلٌ لِّلْعَاصِ بْنِ وَائِلٍ یا وَيْلٌ لِّلْمُغِيْرَةِ یا وَيْلٌ لِّشَرِيْكٍ لیکن جب یہ کہا گیا کہ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ تو قیامت تک ہر شخص کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ہر شخص کوشش کرے گا کہ میں ھمزہ لمزہ نہ بنوں پس چونکہ قرآن کریم ایک دائمی شریعت ہے جس میں ہر زمانہ کے لوگوں کی اصلاح کا سامان رکھا گیا ہے اس لئے قرآن کریم وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جو قیامت تک کام آنے والے ہوں اور جن سے ہر زمانہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہوں پس اگر بعض اشخاص کے نام لے لئے جاتے تو اس کلام کا فائدہ اُسی زمانہ میں ختم ہو جاتا اور ہمارے لئے یہ آیات محض ایک گذشتہ تاریخ کا ورق بن جاتیں۔ ہم سمجھتے کہ کوئی عاص بن وائل تھا جس پر عذاب آیا یا کوئی مغیرہ تھا جس میں فلاں فلاں خرابیاں پائی جاتی تھیں یا کوئی شریک تھا جو اس قسم کی عادات رکھتا تھا۔ چنانچہ جب ہم اس سورۃ پر پہنچتے فوراً کہہ اُٹھتے کہ ہمیں اس سے کیا غرض ہے یہ ایک پُرانا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے ہمیں اس کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اب ہم ایسا نہیں کہہ سکتے اب ہر شخص مجبور ہے کہ ان آیات کو پڑھے اور مجبور ہے اس امر پر کہ وہ ھمزہ اور لمزہ نہ بنے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد نہ بن جائے۔ پس خواہ یہ آیات مغیرہ کے متعلق ہوں یا عاص بن وائل کے متعلق یا شریک کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے

اس سورۃ میں شخصی بحث نہیں کی بلکہ فلسفیانہ بحث کی ہے اگر
شخصی بحث کی جاتی تو یہ کلام متروک ہو جاتا لیکن فلسفیانہ بحث
کی وجہ سے پہلے بھی یہ کلام بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچاتا رہا
ہے اب بھی پہنچا رہا ہے اور آئندہ بھی پہنچاتا رہے گا اور جس
شخص میں بھی یہ باتیں پائی جائیں گی اُس کے دل میں یہ احساس
پیدا ہوگا کہ میں اپنی اصلاح کی طرف توجہ کروں ایسا نہ ہو
کہ میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جاؤں۔ بہرحال
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ
ہر شخص جو دوسروں کو کچل کر آپ بڑا بننا چاہتا ہے یا دوسروں
کی عیب چینی میں مشغول رہتا ہے اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ
اگر وہ اپنی اِن حرکات سے باز نہیں آئے گا تو اللہ تعالیٰ
کا عذاب اُس پر نازل ہوگا۔ اِس صورت میں لمزہ کے معنے
تو عیب چینی کے ہوں گے۔ ھمزہ کے معنے متکبر اور مغرور
انسان کے ہوں گے کیونکہ مار پیٹ ہمیشہ مغرور انسان کا
شیوہ ہوتا ہے اور اُس کی غرض اِس قسم کے ظالمانہ سلوک
سے یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو کچل دے اور اُس پر اپنی
طاقت کا اظہار کرے۔

دوسری صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اپنی
نعمتوں کو کھو بیٹھے گا اور سخت حسرت اور افسوس کرے گا۔
ہر وہ شخص جو دوسروں کی غیبتیں کرتا ہے بلکہ غیبت پر ہی
منحصر نہیں مُنہ پر بھی دوسروں کے عیوب بیان کردیتا ہے اور
اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ میں جھوٹ بھی بول رہا ہوں
اور دوسرے کا دل بھی دُکھا رہا ہوں۔
غیبت کے متعلق بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ
اگر کسی کا کوئی سچا عیب اُس کی عدم موجودگی میں بیان کیا
جائے تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہوتا ہاں اگر جھوٹی بات
بیان کی جائے تو وہ غیبت ہوتی ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں غیبت
کا اطلاق ہمیشہ ایسی سچی بات پر ہوتا ہے جو کسی دوسرے کو
بدنام کرنے کے لئے اُس کی غیر حاضری میں بیان کی جائے
اگر جھوٹی بات بیان کی جائے گی تو وہ غیبت نہیں بلکہ بہتان ہوگا
احادیث میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ غیبت تو بُری چیز ہوتی
اگر اپنے بھائی کا کوئی سچا عیب اُس کی عدم موجودگی میں بیان
کیا جائے تو کیا یہ تو منع نہیں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کسی کی عدم موجودگی میں اُس کا سچا عیب بیان کرنا ہی
غیبت ہے ورنہ اگر دوسرے کے متعلق جھوٹی بات بیان کی جائے
تو یہ بہتان بن جائے گا۔ اسلام نے غیبت کی ممانعت کے متعلق
جو حکم دیا ہے اُس میں حکمت یہ ہے کہ بسا اوقات انسان دوسرے
کے متعلق ایک رائے قائم کرلیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اُس
رائے میں حق بجانب بھی سمجھتا ہے لیکن درحقیقت اسکی رائے
صحیح نہیں ہوتی۔ ہم نے بیسیوں دفعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص
دوسرے کے متعلق ایک قطعی رائے قائم کرلیتا ہے اور اُسے
یقین ہوتا ہے کہ میری رائے درست ہے لیکن ہوتی غلط ہے
ایسی صورت میں اگر دوسرا شخص سامنے بیٹھا ہوگا اور اُس
کے متعلق کسی رائے کا اظہار کیا جائے گا تو لازماً وہ اپنی برأت
کرے گا اور کہیگا کہ تمہیں میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے
میرے اندر یہ نقص نہیں پایا جاتا۔ پس خواہ کسی کے نزدیک
کوئی بات سچی ہو جب وہ دوسرے شخص کی عدم موجودگی میں
بیان کرتا ہے اور وہ بات ایسی ہے جس سے اُس کے بھائی کی
عزت کی تنقیص ہوتی ہے یا اُس کے علم کی تنقیص ہوتی ہے یا
اُس کے رتبہ کی تنقیص ہوتی ہے تو قرآن کریم اور احادیث کی
رُو سے وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اِس طرح اُس نے
اپنے بھائی کو اپنی برأت پیش کرنے کے حق سے محروم
کردیا ہے۔

چونکہ یہ سورۃ گذشتہ ترتیب کے مطابق
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے متعلق ہے اس لئے
اِس سورۃ میں اُس زمانہ کے کفار کا حال بتایا گیا ہے کہ اُن کا
رات دن یہ کام رہتا تھا کہ مسلمانوں کو مارتے انکو مصائب
اور تکالیف میں مبتلا کرتے اور اُن پر قسم قسم کے مظالم توڑتے
پھر اس کے ساتھ ہی اُن کا یہ بھی شیوہ تھا کہ وہ ہر جگہ

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ۝

جو مال کو جمع کرتا اور اُس کو شمار کرتا رہتا ہے ۳؎

مسلمانوں کے خلاف پروپاپیگنڈا کرتے رہتے یعنی صرف خود ہی اُن کے دشمن نہیں تھے بلکہ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ دوسرے لوگ بھی اُن کے دشمن بن جائیں۔ آخر کسی کا عیب بیان کرنے کی کیا غرض ہوتی ہے یہی کہ دوسروں کو بھی برانگیختہ کیا جائے۔ پس ھمز کے لحاظ سے تو اُن کی یہ حالت تھی کہ وہ مسلمانوں کو مارتے اور اُن کو مختلف قسم کے مصائب میں مبتلا کرتے لیکن لمز کے لحاظ سے وہ اِسباب کی کوشش کرتے تھے کہ باقی دنیا کو بھی مسلمانوں کا دشمن بنادیں کفار کی اِن شرمناک حرکات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اِس آیت میں بیان فرماتا ہے کہ وہ تمام اشخاص جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو دُکھ دیتے اور دوسری طرف اُن کے خلاف ہر وقت پراپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں اور اِس طرح پبلک کو بھی اِسلام کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُن پر ایسا عذاب نازل ہونے والا ہے جس سے اُن کے دلوں کا چین بالکل اڑ جائے گا اور اُنکی امیدیں سب خاک میں مل جائیں گی۔

عَدَّدَ **۳؎ حل لغات**۔ عَدَّدَ الْمَالَ حَسِبَہٗ عُدَّۃً لِلدَّھْرِ یعنی جب عَدَّدَ الْمَالَ کہا جائے تو اُسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس نے مصیبت کے دنوں میں کام آنے کے لئے اپنا مال جمع کیا (اقرب) دنیا میں جب کوئی شخص اپنی ذاتی ضروریات کے لئے مثلاً شادی بیاہ کے لئے یا بیماریوں اور مقدمات وغیرہ کے لئے کچھ روپیہ پس انداز کرتا ہے تو اُس مال کو عُدَّہ کہتے ہیں پس جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ کے معنے یہ ہوں گے کہ اُس نے روپیہ جمع کیا اور پھر یہ خیال کیا کہ یہ روپیہ میری مصیبت کے وقت کام آئیگا یا دشمن کے حملوں سے میری حفاظت کا ذریعہ ثابت ہوگا یا اور ضروریات کو پورا کرنے کا موجب ہوگا۔

پھر عَدَّدَ کے معنے گننے کے بھی ہوتے ہیں لیکن عام طور پر عربی زبان میں جب عَدَّدَ کا لفظ گننے کے لئے آئے تو متعدد چیزوں کے لئے آتا ہے۔ مثلاً کہا جائے گا عَدَّ الدَّرَاھِمَ۔ اُس نے دراہم گنے کیونکہ دراہم متعدد ہوتے ہیں۔ لیکن عَدَّدَ الْمَالَ کہیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اُس نے اپنا مال کسی ضرورت کے لئے سنبھال کر رکھا۔ گننے کے معنے اس میں نہیں پائے جائیں گے۔ ہاں اگر مال کو کلیکٹو ٹرم قرار دیا جائے یعنی ایسی چیز جو ہوتی تو ایک ہے مگر دلالت تعدد پر کرتی ہے تو اس لحاظ سے اِس کے معنے گننے کے بھی ہو سکتے ہیں اور جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ سخت لالچی اور حریص ہے۔ ایک طرف مال جمع کرتا ہے اور دوسری طرف اُس کو ہمیشہ گنتا رہتا ہے۔ کہ میرے پاس آج اتنا روپیہ جمع ہو گیا ہے کل اتنے روپے جمع ہو جائیں گے۔

اِسی طرح عَدَّدَ کا لفظ بعض دفعہ کسی چیز کے اوصاف بیان کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ عربی میں کہتے ہیں عَدَّدَ الْمَیِّتَ اُس نے میّت کو گنا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ عَدَّدَ مَنَاقِبَہٗ اُس نے میّت کے مناقب بیان کئے اور کہا کہ وہ بڑا سخی تھا، بڑا بہادر تھا یا بڑا سمجھدار تھا۔ چونکہ اخلاق کئی ہوتے ہیں اِس لئے مختلف صفات اور عادات کے لحاظ سے بھی عَدَّدَ کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اِس صورت میں جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ کے یہ معنے ہونگے کہ وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اُس کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دیتا ہے کہ اگر مال کو روک کر رکھا جائے اور اُن لوگوں کی تقلید نہ کی جائے جو ضروریات کے پیش آنے پر فوراً روپیہ خرچ کر دیا کرتے ہیں تو اس کے بڑے فوائد ہوتے ہیں۔

اصل قرأت تو عَدَّدَہٗ ہی ہے لیکن بعض قرّاء نے اس کو عَدَدَہٗ بھی پڑھا ہے۔

تفسیر۔ عام محاورہ کے مطابق اس آیت میں جَمَعَ الْمَالَ کے الفاظ ہونے چاہیئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے جَمَعَ الْمَالَ کی بجائے جَمَعَ مَالًا فرمایا ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا ہے اور مَالًا کی تنوین اپنے اندر کیا حکمت رکھتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تنوین اپنے اندر تین حکمتیں رکھتی ہے۔

اوّل۔ یہ تنوین تحقیر کی بھی ہو سکتی ہے۔

دوم۔ یہ تنوین تقبیح کی بھی ہو سکتی ہے۔

سوم۔ یہ تنوین تعظیم کی بھی ہو سکتی ہے۔

پہلی صورت میں اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا کے یہ معنے ہوں گے کہ جس نے تھوڑا سا مال جمع کیا اور پھر اُس پر فخر کرنے لگا۔ یہاں تھوڑے مال کا یہ مفہوم نہیں کہ اُس نے کم روپیہ جمع کیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا مال خواہ کسی نے ڈھیروں ڈھیر جمع کر لیا ہو بہرحال ایک فانی متاع ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی دین اور اُس کے بدلہ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں دنیا کے اموال کے متعلق یہ صراحتاً فرمایا گیا ہے کہ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ (التوبہ ع ۶) دنیا کی متاع آخرت کے مقابلہ میں نہایت قلیل چیز ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خواہ ساری دنیا کا مالک بن جائے بہرحال چالیس پچاس سال کے بعد مر جاتا ہے اور پھر اس لحاظ سے بھی متاع الحیٰوۃ قلیل ہے کہ انسان نے مر کر اگلے جہان جانا ہے اگر کسی انسان نے اُس مقام پر پہنچتے کوئی سرمایہ جمع نہیں کیا تو دنیا کے اموال اُسے کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور اگر کسی انسان نے اُس جگہ اپنے لئے سرمایہ جمع کیا ہوا ہے تب بھی اُس کے مقابلہ میں دنیا کا مال کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ غرض کوئی نقطۂ نگاہ لے لو بہرحال دنیا کا متاع قلیل ہے۔ پس جَمَعَ مَالًا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جَمَعَ مَالًا قَلِیْلًا۔ اُس نے دنیا کی تھوڑی سی پونجی جمع کر لی اور پھر اُس پر گھمنڈ شروع کر دیا کہ میں بڑا مالدار بن گیا ہوں۔

(۲) تقبیح کی صورت میں اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا حَرَامًا۔ ایسا مال اُس نے جمع کیا جو نہایت ردّی اور خبیث تھا۔ حالانکہ عقلمند انسان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب اُسے کوئی گندی چیز ملے تو اُسے اُٹھا کر پھینک دے نہ یہ کہ اُسے حفاظت کے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔ اگر کسی کو کوئی کھوٹا سکہ مل جائے تو وہ اُسے اُٹھا کر اپنی جیب میں نہیں رکھ لیتا یا اُسے نجاست سے لتھڑی ہوئی کوئی چیز مل جائے تو وہ اُسے اپنے گھر میں نہیں لے آتا مگر ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ مال اپنے پاس رکھتے ہیں جو گندہ ہے اور جسے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے اکٹھا کیا گیا ہے حالانکہ انہیں چاہیئے تھا کہ ایسا مال فوراً پھینک دیتے اور ایک لمحہ کیلئے بھی اُس کو اپنے پاس رکھنے کیلئے تیار نہ ہوتے۔

(۳) تعظیم کی صورت میں اِس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا کَثِیْرًا۔ جس نے بہت سا مال جمع کیا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں لاکھوں روپیہ بھی بالکل حقیر چیز ہے لیکن بندہ جب اپنی نگاہ سے اُس مال کو دیکھتا ہے تو اُسے بہت بڑا مال معلوم ہوتا ہے اگر کسی کے پاس ہزار روپے بھی جمع ہو جائیں تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے پاس بہت روپیہ جمع ہو گیا ہے۔ حالانکہ ہزار روپیہ موجودہ زمانہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ وہ مفسّرین جنہوں نے اِن آیات کو کفار کر چسپاں کیا ہے انہوں نے اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا کے ماتحت لکھا ہے کہ شریک کے پاس پندرہ ہزار درہم تھے جن کی وجہ سے وہ دوسروں پر فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ پندرہ ہزار درہم آج کل کے حساب سے صرف پانچ ہزار روپے بنتے ہیں اور یہ روپیہ موجودہ زمانہ کی دولت کے لحاظ سے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ ہندوستان میں ہی اگر کسی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ بڑا مالدار ہے اُس کے

پاس پانچ ہزار روپے ہیں تو سب لوگ ہنس پڑیں گے
کہ کیسی احمقانہ بات کہی گئی ہے پانچ ہزار روپے بھی کوئی
چیز ہیں۔ مگر عرب میں یہ بہت بڑی دولت سمجھی جاتی تھی
اور اگر کسی کے پاس اتنا روپیہ جمع ہو جاتا تو وہ خیال کیا
کرتا تھا کہ اب مجھ سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے میرے
پاس تو پانچ ہزار روپے جمع ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں دنیا
کی امارت کا یہ حال ہے کہ ہندوستان کے اکثر حصے ایسے
ہیں جہاں صرف اُسی شخص کو مالدار سمجھا جاتا ہے جس کے پاس
دس پندرہ لاکھ روپیہ ہوں۔ لیکن اگر بمبئی چلے جاؤ تو وہاں
دس پندرہ لاکھ والے کو کوئی شخص مالدار کہنے کے لئے تیار
نہیں ہوگا وہاں اَسّی نوّے لاکھ یا ایک کروڑ روپیہ رکھنے
والے کو مالدار کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگلستان چلے جاؤ
تو وہاں ایک کروڑ روپیہ رکھنے والے کو کوئی شخص مالدار نہیں
کہے گا وہاں دس پندرہ کروڑ رکھنے والے کو مالدار سمجھا جاتا ہے
پھر امریکہ چلے جاؤ تو وہاں دس پندرہ کروڑ والے کو کوئی شخص
مالدار نہیں کہتا وہاں ڈیڑھ دو کروڑ یا اس سے بھی زیادہ سالانہ
آمد رکھنے والے کو مالدار سمجھا جاتا ہے۔ غرض امارت کا معیار
موجودہ زمانہ میں بہت بلند ہو گیا ہے۔ لیکن عربوں کیلئے
یہی بات بڑی تھی کہ ان میں سے کسی کے پاس پانچ چھ
ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ پس جَمَعَ مَالًا میں تنوین تعظیم کی
بھی ہو سکتی ہے لیکن اس صورت میں یہ تعظیم اُس انسان یا
اُس قوم کے نقطۂ نگاہ سے ہوگی جس نے مال جمع کیا ہو اور
آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے
بڑا مال جمع کر لیا ہے۔ بہرحال اس آیت کے تینوں معنے
ہو سکتے ہیں۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس نے بہت سا
مال جمع کیا ہے۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس نے معمولی سا
مال جمع کیا ہے اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس نے
گندہ اور ردّی مال جمع کیا ہے۔

عَدَّدَہٗ۔ عَدَّدَ کے معنے جو اوپر بیان کئے
گئے ہیں وہ سب کے سب اِس مقام پر چسپاں ہوتے ہیں
چنانچہ دنیا میں جس قدر بخیل لوگ پائے جاتے ہیں اُن سب
میں یہ نقص ہوتا ہے کہ وہ روپیہ جمع کرتے ہیں اور پھر ہمیشہ
گنتے رہتے ہیں کہ اب ہمارے پاس اتنے روپے ہو گئے ہیں
اب ہزار روپیہ ہو گیا ہے۔ اب لاکھ روپیہ ہو گیا ہے۔ اب
کروڑ روپیہ ہو گیا ہے۔ اُنہیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اگر
اس مال کو کسی نفع مند کام پر لگایا جاتا یا بنی نوع انسان کی
بھلائی کے کاموں پر صرف کیا جاتا تو کیسا اچھا ہوتا اور کتنے
لوگوں کو اس سے فائدہ ہوتا۔ پھر یہ بھی ایک عام مرض بخیل
لوگوں میں ہوتا ہے کہ وہ روپیہ تو جمع کرتے ہیں مگر قومی
ضروریات تو الگ رہیں اپنی ذاتی ضروریات پر بھی اُسکو
خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بخیل کی بڑی علامت
یہ ہوتی ہے کہ جب اُس سے کہا جائے کہ تم روپیہ کیوں خرچ
نہیں کرتے تو وہ کہتا ہے کہ یہ روپیہ تو کسی دن کے لئے رکھا
ہوا ہے پہلے ہی اِس کو کس طرح خرچ کر دوں۔ مگر اس کی ساری
عمر گذر جاتی ہے اور اُس کا وہ دن کبھی نہیں آتا۔ روپیہ
غلق میں ہی بند رہتا ہے یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے بعد میں
اُس کی اولاد شراب اور جوئے میں اُس کے روپیہ کو برباد
کر دیتی ہے یا کنچنیوں کے ناچ گانے میں سب جائداد لٹا دیتی
ہے۔ لیکن اُس کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود بیمار رہو۔
اُس کی بیوی بیمار ہو۔ اُس کا بچہ بیمار ہو۔ اُس کا بھائی بیمار
ہو۔ اور اُسے کہا جائے کہ علاج کراؤ تو کہتا ہے یہ روپیہ تو
کسی دن کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اسی طرح اُس کی ساری
عمر کٹ جاتی ہے۔ وہ ننگا رہتا ہے، وہ بھوکا رہتا ہے، وہ
بیمار رہتا ہے، وہ مصائب میں مبتلا رہتا ہے، اُس کے بیوی
بچے تکالیف اُٹھاتے ہیں مگر اُس کا وہ دن نہیں آتا جس کے
لئے اُس نے روپیہ جمع کیا ہوا ہوتا ہے۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ
مال خرچ کرے اور پبلک کو روپیہ کے خرچ سے فائدہ پہنچے
وہ اپنے اِس فعل کی خوبیاں بیان کرتا رہتا ہے اور دوسروں
سے بھی یہی کہتا ہے کہ ہمیشہ روپیہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝

وہ خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس (کے نام) کو باقی رکھے گا ؎

اِس کا یہ یہ فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی بجائے اِس کے کہ وہ اپنے اِس فعل پر نادم اور شرمندہ ہو وہ فخر کرتا ہے اور دوسروں سے بھی یہی کہتا ہے کہ روپیہ کی انسان کو اپنی زندگی میں بڑی ضرورت پیش آتی ہے انسان کو چاہیئے کہ وہ ذاتی یا قومی ضروریات کو نظر انداز کر دیا کرے گویا نادم اور شرمندہ ہونے کی بجائے وہ اُلٹا گناہ پر فخر کرتا ہے۔

؎ تفسیر۔ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ۔ اِس آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ روپیہ خرچ کرنے میں بُخل سے کیوں کام لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ۔ وہ گمان کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس کی بقاء کا باعث ہوگا یعنی مالدار لوگوں میں بُخل کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کے دلوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ جمع کیا ہُوا مال ہمارے خاندان کی عزت کا موجب ہوگا اِسی وجہ سے وہ تکالیف برداشت کرتے ہیں مگر روپیہ خرچ نہیں کرتے۔ ایک ادنیٰ بخیل کے ذہن میں تو یہ بات ہوتی ہے کہ میں آج سے دس سال کے بعد اپنے بیٹے کی شادی پر یا اپنے مکان کی تعمیر پر روپیہ خرچ کرونگا مگر بڑے بخیل کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ چاہتا ہے کہ مَیں بھی روپیہ جمع رکھوں، میری اولاد بھی روپیہ جمع کرتی جائے اور اُس کی اولاد بھی روپیہ جمع کرتی جائے تاکہ ہمارے خاندان کا نام اور اس کی شہرت قائم رہے وہ سمجھتا ہے کہ مال رہنے کی وجہ سے ہمارے خاندان کو دائمی عزت حاصل ہو جائے گی۔ حالانکہ اگر وہ سوچے تو اُسے روزانہ یہ نظارے نظر آ سکتے ہیں کہ ایک شخص بڑی مشکل سے روپیہ جمع کرتا ہے وہ خود بھوکا رہتا ہے، پیاسا رہتا ہے، ننگا رہتا ہے، بیمار رہتا ہے مگر روپیہ خرچ نہیں کرتا۔ چاہتا ہے کہ اُس کے پاس کافی مال جمع ہو جائے مگر جب مر جاتا ہے تو اُس کی اولاد تمام روپیہ عیاشی میں برباد کر دیتی ہے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ چونکہ مہاراجہ جموں کے شاہی طبیب تھے اِس لئے ریاست کے کئی مالدار لوگوں سے آپ کے تعلقات رہا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے ایک دفعہ ایک بڑا مالدار شخص مر گیا تو تھوڑے دنوں کے بعد ہی مجھے ایک شخص نے آ کر کہا کہ اُس کے بیٹے نے عجیب طرح روپیہ لٹانا شروع کر دیا ہے۔ مَیں نے کہا کس طرح؟ وہ کہنے لگا ایک دن وہ بازار میں سے گذر رہا تھا کہ اُس نے ایک بزاز کو تھان میں سے کچھ کپڑا پھاڑتے دیکھا جس میں سے چر کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز اُسے ایسی پسند آئی کہ اب بس کا دن رات یہی کام ہے کہ وہ بازار سے کپڑے کے تھان منگواتا ہے اور اپنے نوکروں سے کہتا ہے کہ میرے سامنے انہیں صبح سے شام تک پھاڑتے رہو کیونکہ کپڑے کے پھاڑنے سے جو چر کی آواز نکلتی ہے وہ مجھے بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے میں نے اُسے بُلا کر سمجھایا اور کہا کہ اِس طرح روپیہ برباد مت کرو یہ بالکل لغو طریق ہے۔ اُس نے جواب دیا مولوی صاحب جو مزا اِس چر میں ہے وہ اور کسی چیز میں نہیں۔ تم اسے دماغ کی خرابی کہہ لو مگر آخر ہُوا کیا؟ یہی کہ باپ نے جو روپیہ جمع کیا تھا وہ سب برباد ہو گیا۔ باپ نے نہ معلوم کن کن مصیبتوں سے روپیہ جمع کیا ہوگا مگر اللہ تعالےٰ نے اُس کے بیٹے کے دماغ میں ایسی خرابی پیدا کر دی کہ اُس نے تمام روپیہ برباد کر دیا۔ اِسی طرح ایسے ایسے بخیل بنیے جو ساری عمر دال سے بھی روٹی نہیں کھاتے اور روپیہ جمع کرتے رہتے ہیں اُن کی اولادیں جوئے اور سٹّہ میں سب روپیہ برباد کر دیتی ہیں۔ پس فرماتا ہے يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اُسے ہمیشہ قائم رکھے گا حالانکہ مال قائم نہیں رکھتا

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ

ہرگز ایسا نہیں (جیسا اس کا خیال ہے بلکہ) وہ یقیناً (اپنے مال سمیت) حطمہ میں پھینکا جائے گا اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم

مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِىْ تَطَّلِعُ

ہے کہ یہ حطمہ کیا شے ہے یہ (حطمہ) اللہ تعالیٰ کی آگ ہے خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں کے

عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝

اندر تک جا پہنچے گی ۵ے

بلکہ خدا تعالیٰ کا فضل قائم رکھتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے کسی نیک آدمی کی اولاد کو سات پشت تک فاقہ کرتے اور بھیک مانگتے نہیں دیکھا حالانکہ کئی کروڑپتی ایسے ہوتے ہیں جن کی اولادیں اپنی زندگی کے دن ناقوں میں بسر کر دیتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ سے تعلق ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خلود بخشتا ہے۔ جو شخص انفاق فی سبیل اللہ سے کام لیتا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال کو بے دریغ خرچ کرتا رہتا ہے وہی شخص ہے جس کا مال اُس کی بقاء کا باعث ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ سے فرمایا بتاؤ کیا تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جسے اُسکے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پسندیدہ ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنے مال سے اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہو ہمیں تو وہی مال پسند ہوتا ہے جو ہمارا اپنا ہو۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر یاد رکھو تمہارا مال وہی ہے جسے تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہو ورنہ جو کچھ تمہارے مال میں سے باقی رہ جاتا ہے وہ تمہارا نہیں بلکہ تمہارے ورثاء کا ہے کیونکہ تمہاری آنکھ کے بند ہوتے ہی اُس پر قبضہ کر لیا جاتا ہے (مشکوٰۃ کتاب الرقاق فی النصائح) یہ حدیث اسی مضمون کو بیان کرتی ہے کہ مال وہی کام آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا گیا ہو کیونکہ دوسرا مال تو غیروں کے کام آتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جو قیامت کے دن پر ایمان نہ رکھتا ہو

حُطَمَة

اور اُس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ مرنے کے بعد کوئی شخص جنت میں جاتا ہے اور کوئی دوزخ میں۔ اور جس نے اللہ تعالےٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا ہوا ہوتا ہے اُسے بہت بڑا اجر ملتا ہے تب بھی اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگر قومی ضروریات پر روپیہ خرچ کیا جائے تو انسان کا نیک نام باقی رہ جاتا ہے اور لوگ تعریف کرتے ہیں کہ فلاں شخص قوم کا بڑا خادم تھا یا غرباء کا بڑا ہمدرد تھا یا یتامیٰ و بیوگان کا بہت خیال رکھنے والا تھا لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ لوگ ایک طرف تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دوسرے کے مال سے اُنہیں اپنا مال زیادہ پیارا ہوتا ہے مگر عملاً وہ یہ کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ مال جو انہوں نے اپنے ساتھ لے جانا ہوتا ہے یا جس نے اُن کی نیک نامی کا موجب بننا ہوتا ہے اُس سے تو وہ پیار نہیں کرتے اور جو مال دوسروں کے کام آنے والا ہوتا ہے اُس سے وہ پیار کرتے اور کوشش کرتے ہیں کہ مذہبی یا قومی ضروریات پر روپیہ خرچ کرنے کی بجائے اُسے جمع رکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال ہی انسان کو خلود بخشتا ہے جمع کیا ہوا مال خلود نہیں بخشتا۔

۵ے حل لغات۔ حُطَمَة کے معنے عربی زبان میں توڑنے کے بھی ہوتے ہیں اور حُطَمَة کے معنے آگ کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے حَطَمَهٗ: كَسَرَهٗ اَلْحُطَمَةُ: اَلنَّارُ الشَّدِيْدَةُ (منجد) پس حُطَمَة کے

معنے ہوئے توڑنے والی یا حُطَمَۃ کے معنے ہوئے ایسی آگ جو سخت بھڑکنے والی ہے۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ اِس آیت میں کفار کو اُنکا انجام بتاتا ہے کہ اِس وقت تو اُن کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مسلمانوں کو مارتے اور دکھ دیتے ہیں اسی طرح مال کے گھمنڈ میں وہ اپنے آپ کو معزز سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اُن کی ہمارے مقابلہ میں حیثیت ہی کیا ہے یہ ذلیل اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں یا جب مسلمان روپیہ خرچ کرتے ہیں تو کہتے ہیں یہ نیک نامی چاہتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں، صدقہ و خیرات دیتے ہیں تو کہتے ہیں نام و نمود کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ غرض اُن کے ہر نیک کام کو بُرے رنگ میں پیش کرتے ہیں لیکن اُن کی اپنی حالت یہ ہے کہ جس مقام پر وہ کھڑے ہیں وہ کوئی عزت بخشنے والا نہیں۔ فرماتا ہے کَلَّا۔ دشمن اِس خیال میں نہ رہے کہ جس مقام پر مسلمان کھڑے ہیں وہ تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والا ہے اور جس مقام پر وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے وہ قائم رہنے والا ہے لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وہ ایک بھڑکنے والی آگ میں ڈالا جائے گا یہ بھڑکنے والی آگ کیا ہے؟ مفسرین نے اپنی عادت کے مطابق اسے قیامت پر چسپاں کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے مگر میرے نزدیک چونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کیلئے دنیوی عذاب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنی شدت کے لحاظ سے دوزخ کا عذاب کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اِس لئے حُطَمَۃ سے یہاں دنیا کی آگ مراد ہے اور اگر اس کے معنے توڑنے کے لئے جائیں تب بھی اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم اُن کی شوکت کو بالکل توڑ پھوڑ دیں گے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ۔ قرآن کریم میں جہاں بھی مَآ اَدْرٰىكَ کے الفاظ آتے ہیں وہاں اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے اِس مقام پر جو لفظ رکھا ہے وہ عربی زبان کے لحاظ سے کئی معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس لفظ کے یہاں فلاں معنے ہیں۔ عام طریق تو یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسا لفظ آجائے جو کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہو تو اُس کے سارے معنے لئے جا سکتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کا یہ منشاء نہ ہو کہ سارے معنے لئے جائیں بلکہ یہ منشاء ہو کہ صرف فلاں معنے لئے جائیں تو اُس وقت کہہ دیا جاتا ہے کہ مَآ اَدْرٰىكَ تجھے کس نے بتایا ہے کہ اس کے کیا معنے ہیں یعنی اس لفظ کے کئی معنے ہو سکتے ہیں لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اس مقام پر ہمارے مدنظر کون سے معنے ہیں۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ

فرماتا ہے یہاں حُطَمَۃ کے معنے اللہ تعالیٰ کی اُس آگ کے ہیں جو خوب بھڑکائی گئی ہے۔ آگ دو قسم کی ہوتی ہے ایک آگ وہ ہوتی ہے جسے بندے بھڑکاتے ہیں وہ لکڑیاں جمع کرتے اور دیا سلائی سے آگ روشن کرتے ہیں اور ایک آگ وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ جلاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی آگ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک آگ تو اگلے جہان کی ہے جو دوزخ کی شکل میں ظاہر ہوگی اور ایک آگ ایسی ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں ہی بھڑکایا جاتا ہے اور یہی وہ آگ ہے جسے عذاب کہا جاتا ہے

لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ کے مراد دنیا میں عذاب کا شکار ہونا ہے

پس نَارُ اللّٰهِ سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب ہے جو کفار کے لئے اِس دنیا میں مقدر تھا۔ لکڑی کی آگ پر پانی ڈالو تو وہ بجھ جاتی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کے لئے کفار نے خوب آگ بھڑکائی مگر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج دئے۔ اِدھر آگ روشن ہوئی اور اُدھر بارش برسنی شروع ہو گئی جس سے تمام آگ بجھ گئی۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ جانے دو آج بارش نے ہماری آگ بجھا دی ہے پھر کسی وقت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دیں گے مگر کفر کا جوش چونکہ عارضی ہوتا ہے انہی میں سے کچھ لوگ بول پڑے کہ ابراہیم بھی تو ہمارے رشتہ داروں

ہیں سے ہے اُس کو جلانے کا کیا فائدہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعد میں دوبارہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی کوشش نہیں کی۔ پس بندوں کی جلائی ہوئی آگ بجھ سکتی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے بندوں کی جلائی ہوئی آگ سے سلامت نکال لیا لیکن خدا تعالےٰ کی جلائی ہوئی آگ میں سے کوئی شخص دوسرے کو نکال نہیں سکتا کیونکہ بسا اوقات دل میں آگ لگ رہی ہوتی ہے اور انسان کوشش بھی کرتا ہے کہ میں اس آگ سے نکلوں مگر وہ نکل نہیں سکتا۔ چنانچہ اِس آگ کی اللہ تعالےٰ نے خود ہی آگے تشریح کر دی ہے کہ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ہماری یہ آگ دلوں پر بھڑکائی گئی ہے لکڑیوں کی آگ نہیں کہ پانی سے بجھ سکے یہ دل کی آگ ہے جس کے شعلے اُن کو ہر وقت بھسم کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھتے ہیں تو اُن کے دل جلتے ہیں۔ غم واندوہ سے کباب ہوتے جاتے ہیں۔ حسرت وافسوس سے اُن کی زندگیاں تلخ ہو رہی ہیں مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دکھ کا ہم کیا علاج کریں۔

۲۱۱
ابوجہل کا دو انصاری لڑکوں کے ہاتھوں قتل

بدر کے موقع پر جب ابوجہل اپنے لشکر سمیت نکلا تو اُس کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ مسلمانوں سے ہماری جنگ ہونے والی ہے۔ خود مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ صرف کفار کے تجارتی قافلہ سے اُن کا مقابلہ ہوگا۔ اِسی وجہ سے بہت سے جاں نثار صحابہؓ اس جنگ میں شامل نہیں ہو سکے مگر اللہ تعالےٰ اپنی حکمت کے ماتحت کفار اور مسلمانوں کے لشکر کو آمنے سامنے لے آیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کو بتا دیا کہ اللہ تعالےٰ کا منشاء یہ ہے کہ کفار سے جنگ کی جائے جب دونوں لشکر صف بستہ ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں میرے دل میں بڑی مدت سے یہ ولولے تھے کہ کبھی کفار سے جنگ ہو تو اُن مظالم کا بدلہ لوں جو وہ مسلمانوں پر کرتے چلے آئے ہیں مگر سپاہی تبھی اچھا لڑ سکتا ہے جب اُس کا دایاں اور بایاں پہلو مضبوط ہو تا اُس کی پیٹھ کو دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھے۔ حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں جب میں نے یہ دیکھنے کے لئے اپنے اردگرد نظر ڈالی کہ آج میرے دائیں بائیں کون کھڑے ہیں تو میرا دل بیٹھ گیا کیونکہ میرے دائیں طرف بھی پندرہ برس کا ایک انصاری لڑکا کھڑا تھا اور میرے بائیں طرف بھی پندرہ برس کا ایک انصاری لڑکا کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حسرت پیدا ہوئی کہ آج میں اپنے دل کے حوصلے کس طرح نکالوں گا۔ کاش میرے دائیں بائیں کوئی مضبوط اور ماہر فن سپاہی ہوتے تا کہ میں بھی اپنی مہارت کے جوہر دکھا سکتا۔ اِن پندرہ پندرہ برس کے بچوں نے کیا کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں ابھی یہ خیال میرے دل میں گذرا ہی تھا کہ دائیں طرف کے انصاری نوجوان نے میرے پہلو میں آہستہ سے کُہنی ماری۔ میں نے اُس کی طرف مُڑ کر دیکھا تو اُس نے کہا چچا ذرا جھک کر اپنے کان میں میری بات سُننا (عرب میں رواج تھا کہ بڑی عمر والوں کو چھوٹے بچے اور نوجوان چچا کہا کرتے تھے) میں نے اُس کی طرف کان جھکایا تو اُس نے کہا چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دکھ دیا کرتا تھا میرا جی چاہتا ہے کہ آج اُس سے بدلہ لوں۔ وہ کہتے ہیں اِس سوال پر میرے دل میں سخت حیرت پیدا ہوئی کہ یہ چھوٹا سا بچہ مجھ سے کیا سوال کر رہا ہے۔ مگر ابھی میں نے اُس کو کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ بائیں طرف سے میرے پہلو میں کُہنی لگی۔ میں اُس کی طرف مُڑا تو اُس نے کہا چچا ذرا جھک کر اپنے کان میں میری بات تو سُننا۔ میں جھکا تو اُس نے کہا چچا ابوجہل کون ہے میں نے سُنا ہے کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت دکھ دیا کرتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ آج اُس سے بدلہ لوں۔ اُن دونوں نے آہستگی سے یہ بات اِس لئے کہی کہ اُن میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا دوسرا ساتھی اس بات کو سُن لے اور وہ بھی اِس شرف میں حصہ دار بن جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں باوجود تجربہ کار اور ہوشیار جرنیل ہونے کے میرے دل کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ میں ابوجہل کو مار سکوں گا۔ اِسی لئے جب

ان دو نوجوان لڑکوں نے مجھ سے یہ سوال کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنی انگلی اُٹھائی اور کہا دیکھو وہ جو فوج کے اندر کھڑا ہے جس نے سر پر خود پہنا ہُوا ہے جو سر سے پاؤں تک زرہ میں ملبوس ہے اور جس کے سامنے دو بہادر سپاہی ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے ہیں وہ ابوجہل ہے۔ ان دو سپاہیوں میں سے ایک ابوجہل کا اپنا بیٹا عکرمہ تھا اور دوسرا ایک اور بہادر سردار تھا وہ کہتے ہیں ابھی میرا ہاتھ نیچے نہیں گرا تھا کہ جس طرح باز چڑیا پر جھپٹا مارتا ہے اسی طرح وہ دونوں بے تحاشا دوڑ پڑے اور ایسی تیزی کے ساتھ دشمن کے لشکر میں جا گھسے کہ کفار حیرت سے مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ انہیں ہوش ہی نہ آیا کہ وہ ان لڑکوں کو روکیں یہاں تک کہ وہ بڑھتے ہوئے ابوجہل کے سر پر جا پہنچے اُس وقت ایک محافظ کو خیال آیا اور اُس نے تلوار چلائی جس سے ایک لڑکے کا ہاتھ کٹ گیا مگر اُس نے کوئی پرواہ نہ کی اور جھٹ اپنے لٹکے ہوئے بازو پر اُس نے پاؤں رکھا اور اُسے کھینچ کر جسم سے الگ کر دیا پھر دونوں نے آگے بڑھ کر ابوجہل کو ایسا شدید زخمی کیا کہ وہ زمین پر گر گیا گو مرا کچھ دیر بعد۔

غرض جنگ ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ مدینہ کے دو نوجوان لڑکوں نے جن کو مکہ والے حقارت سے ذلیل کیا کرتے تھے ابوجہل کو مار گرایا۔ مدینہ کے لوگ سبزی ترکاری بیچ کر گذارہ کیا کرتے تھے اور جس طرح ہمارے ملک میں بعض زمیندار اپنی بیوقوفی سے ارائیوں کو حقارت سے دیکھا کرتے ہیں اسی طرح مکہ والے مدینہ کے لوگوں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ سبزی ترکاری بیچنے والے لڑائی کے فنون کو کیا جانیں۔ مگر اللہ تعالےٰ کا نشان دیکھو کہ انہی مدینہ والوں میں سے دو نوجوان لڑکوں نے ابوجہل کو مار ڈالا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں جب لڑائی ختم ہو گئی تو میں یہ دیکھنے کے لئے نکلا کہ ابوجہل کا کیا حال ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ زخموں کی شدت کی وجہ سے کراہ رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا سناؤ کیا حال ہے؟ اُس نے کہا مجھے اپنی موت کا غم نہیں کیونکہ سپاہی جنگ میں مرا ہی کرتے ہیں مجھے افسوس ہے تو یہ کہ مدینہ کے نوجوانوں نے مجھے مارا۔ پھر اُس نے عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا مجھے زخموں کی وجہ سے سخت تکلیف ہے تم صرف اتنا کرو کہ تلوار سے میری گردن کاٹ دو مگر دیکھنا ذرا لمبی کاٹنا۔ کیونکہ جرنیلوں کی گردن ہمیشہ لمبی کاٹی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں میں نے اُسے کہا تیری اس آخری حسرت کو بھی پورا نہیں کروں گا چنانچہ میں نے ٹھوڑی کے قریب سے اُس کی گردن کاٹی۔ اب دیکھو ابوجہل کے دل میں اُس وقت کتنی جلن ہو گی۔ کجا یہ کہ ابوجہل اس امید پر میدان میں آیا تھا کہ آج میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مار ڈالوں گا اور کجا یہ کہ پندرہ پندرہ برس کے دو نوجوان لڑکوں نے اُسے مار ڈالا اور مارا بھی ایسی حالت میں کہ اُس کے سامنے پہرہ کے لئے دو زبردست جرنیل کھڑے تھے ایک اُن میں سے خود اُس کا اپنا لڑکا تھا اور ایک اور جرنیل تھا۔ پھر اُس نے زرہ بھی پہنی ہوئی تھی۔ خود بھی اُس کے سر پر تھا۔ مگر کوئی تدبیر کام نہ آئی اور وہ ہزاروں حسرتیں لئے ہوئے اس جہان سے گذر گیا۔ اُس وقت اُس کے دل میں جو آگ جل رہی ہوگی اور جس حسرت سے اُس نے اپنی جان دی ہوگی اُس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

ابوجہل کیلئے اس دنیا میں جہنم کا نظارہ

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار نے جس شخص کو صلح کی گفتگو کیلئے اپنا لیڈر بنا کر بھیجا وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا بڑے دھڑلے سے باتیں کر رہا اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر اپنی فوقیت جتا رہا تھا کہ عین اُسی وقت زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنی شروع ہوئی۔ لوگوں نے دیکھا تو اُسی سردار کا لڑکا گرتا پڑتا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اُس نے کہا یا رسول اللہ میں آپ پر ایمان لا چکا ہوں۔ میرے باپ نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر مجھے گھر میں قید کر رکھا تھا تاکہ میں بھاگ کر مدینہ نہ پہنچ جاؤں۔ آج یہ ادھر صلح کی گفتگو کے لئے آیا تو

مجھے موقع مل گیا اور میں گرتے پڑتے یہاں پہنچ گیا اُس وقت اپنے بیٹے کی گفتگو سُن کر کفار کے سردار کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ کیسی عبرتناک ہوگی۔ وہ کفار کی طرف سے صلح کی گفتگو کے لئے آیا ہوا تھا اور سینہ تان کر بڑے فخر سے باتیں کر رہا تھا کہ عین اسی مجلس میں اُس کا بیٹا آتا ہے اور اپنے آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈالتے ہوئے کہتا ہے یا رسول اللہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے سامان پیدا کئے کہ کفار کے دل ہر وقت جل کر خاکستر ہوتے رہتے تھے اور انہیں کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس آگ کو بجھانے کا ہم کیا انتظام کریں کوئی بڑا خاندان ایسا نہیں تھا جس کے افراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں نہ آچکے ہوں حضرت زبیرؓ ایک بڑے خاندان میں سے تھے حضرت طلحہؓ ایک بڑے خاندان میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ ایک بڑے خاندان میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک بڑے خاندان میں کر تھے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ ایک بڑے خاندان میں سے تھے۔ اسی طرح حضرت عمروؓ بن العاص اور خالدؓ بن ولید مکہ کے چوٹی کے خاندانوں میں سے تھے۔ عاصؔ مخالف تھے مگر عمرو مسلمان ہو گئے۔ ولیدؔ مخالف تھے مگر خالد مسلمان ہو گئے۔ غرض ہزاروں لوگ ایسے تھے جو اسلام کے شدید دشمن تھے مگر اُن کی اولادوں نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا اور میدان جنگ میں اپنے باپوں اور رشتہ داروں کے خلاف تلواریں چلائیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے میں شریک تھے کہ مختلف امور پر باتیں شروع ہو گئیں۔ حضرت عبد الرحمٰن جو حضرت ابوبکر رضی اللہ کے بڑے بیٹے تھے اور جو بعد میں مسلمان ہوئے بدر یا احد کی جنگ میں کفار کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے تھے انہوں نے کھانا کھاتے ہوئے باتوں باتوں میں کہا۔ ابا جان اس جنگ میں جب فلاں جگہ سے آپ گذر رہے تھے تو اُس وقت میں ایک پتھر کے نیچے چھپا بیٹھا تھا اور میں اگر چاہتا تو حملہ کر کے آپ کو ہلاک کر سکتا تھا مگر میں نے کہا اپنے باپ کو کیا مارنا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا نے تجھے ایمان نصیب کرنا تھا اِس لئے تُو بچ گیا ورنہ خدا کی قسم اگر میں تجھے دیکھ لیتا تو ضرور مار ڈالتا۔ غرض کفار کے لئے یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا کہ جس مذہب کو مٹانے کے لئے وہ کمربستہ رہتے تھے اُسی مذہب میں اُن کے اپنے بیٹے اور بھائی اور رشتہ دار شامل ہونے لگ گئے اِن واقعات کو دیکھ دیکھ کر اُن کے دلوں میں کس قدر حسرت پیدا ہوتی ہوگی۔ کہ ہم میں سے کسی کی بیوی اسلام میں داخل ہے کسی کا باپ اسلام میں داخل ہے، کسی کا بیٹا اسلام میں داخل ہے کسی کا کوئی اور دوست اور رشتہ دار اسلام میں داخل ہو گویا وہ تو اپنی جانیں اسلام کے مٹانے کے لئے صرف کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ انہیں میں سے ایک ایک کر کے لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ رہا تھا حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا کہ جس مذہب کو کچلنے کے لئے وہ کھڑے تھے اُسی مذہب میں اُن کے اپنے دوست اور عزیز ترین رشتہ دار شامل ہوگئے اور وہ اسلام کا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کے خلاف تلواریں چلانے لگ گئے۔ غرض فرماتا ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ۔ اللہ تعالےٰ کفار کے دلوں پر ایک شدید آگ بھڑکائے گا۔ لوگ بظاہر دیکھتے تو کہتے عاصؔ بن وائل کتنا بڑا آدمی ہے بڑے فخر سے اپنا تہ بند لٹکاتے چلا جا رہا ہے یا ولیدؔ کتنا بڑا آدمی ہے یا فلاں کتنا بڑا آدمی ہے مگر اُن بڑے آدمیوں کی یہ حالت ہوتی تھی کہ اُن کے دلوں میں ہر وقت ایک آگ لگی ہوتی تھی کہ ہمارا بیٹا مسلمان ہو گیا۔ ہمارا بھائی مسلمان ہو گیا۔ ہمارا فلاں رشتہ دار مسلمان ہو گیا ہم اب کریں تو کیا کریں۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ ع ۱ ۲۹

(پھر) وہ (آگ اور تیز کرنے کیلئے) اُن پر (سب طرف سے) بند کر دی جائیگی درانحالیکہ وہ لوگ اُس وقت لمبے ستونوں کے ساتھ بندھے ہوں گے ۵؎

۵؎ **حل لغات۔** مُؤْصَدَةٌ: اَلْمُؤْصَدُ اَلْمُطْبَقُ وَالْمُغْلَقُ: بند کی گئی۔ عَمَد۔ عَمُوْدٌ کی جمع ہے اور عَمُوْدٌ کے معنے ستون کے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں اُس آگ کی شدت بیان کی گئی ہے جو کفار کے قلوب پر بھڑکائی جانے والی تھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم اس آگ کو معمولی مت سمجھو جس طرح بھٹی کی آگ سب آگوں سے زیادہ شدید ہوتی ہے کیونکہ اسے ہر طرف سے بند کیا ہوا ہوتا ہے اسی طرح کفار کے قلوب پر جو آگ بھڑکائی جانیوالی ہے وہ بھی نہایت شدید ہوگی۔ اُسے چاروں طرف سے بند کر کے رکھا جائیگا اور اس کی بھڑاس بھی باہر نہیں نکلے گی۔

اس "بند آگ" کی مثال کفار مکہ کا وہ فیصلہ ہے جو اُنہوں نے جنگِ بدر کے بعد کیا۔ اس جنگ میں چونکہ مکہ والوں کے تمام چوٹی کے لیڈر ہلاک ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے سمجھا کہ اگر آج ماتم کیا گیا تو ہماری تمام عزت خاک میں مل جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ کوئی شخص بدر میں ہلاک ہونے والوں پر روئے نہیں۔ یہ حکم اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت شدید تھا مگر اپنی قوم کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے مکہ کا ایک ایک فرد اپنے سینہ میں غم والم کی ایک بے پناہ آگ دبا کر خاموش ہو گیا۔ اُن کی آنکھیں اپنے مرنے والوں کی یاد میں آنسوؤں کی موسلا دھار بارش برسانا چاہتی تھیں اُن کی زبانیں آہ وفغاں اور نالہ و فریاد سے ایک شور برپا کرنا چاہتی تھیں مگر وہ کیا کر سکتے تھے قوم کا فیصلہ تھا کہ آج تمہارے لئے ماتم جائز نہیں تم اپنی زبانوں کو بند رکھو۔ تم اپنے آنسوؤں کو مت گرنے دو السانہ ہو کہ مسلمانوں تک یہ خبریں پہنچیں تو وہ خوش ہوں کہ ہم نے خوب بدلہ لیا۔ یہ حالت ایک لمبے عرصہ تک رہی۔ عورتوں کو اپنے خاوندوں پر، ماؤں کو اپنے بیٹوں پر، بھائیوں کو اپنے بھائیوں پر اور دوستوں کو اپنے دوستوں پر رونے کی اجازت نہیں تھی۔ اُن کے سینے اس بند آگ کی تپش سے اندر ہی اندر جل رہے تھے مگر قوم کے فیصلہ کی خلاف ورزی کی اُن میں سے کسی میں جرأت نہیں تھی۔

آگ کے کفار پر بند کئے جانے سے مراد

ایک دن کسی مسافر کی اُونٹنی مر گئی اور اُس نے مکہ کی گلیوں میں سے گذرتے ہوئے اُس کے غم میں ماتم کا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ آواز سُن کر ایک بوڑھا شخص جس کے دو نوجوان بیٹے اِس جنگ میں ہلاک ہو چکے تھے کُود کر اپنے گھر میں سے باہر نکل آیا اور اُس نے بلند آواز سے کہا ہائے افسوس اس شخص کو اپنی اونٹنی پر رونے کی اجازت ہے مگر مجھے جس کے دو نوجوان بیٹے جنگ میں مارے گئے ہیں رونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اُس کا یہ کہنا تھا کہ یکدم تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں سے نکل آئے اور انہوں نے کہا ہم تو جل کر مر گئے ہیں۔ ہم آگ سے پُھنکے جا رہے ہیں ہم اب زیادہ صبر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انہوں نے چوکوں اور بازاروں میں جمع ہو کر پیٹنا شروع کر دیا اور تمام مکہ میں ایک کہرام مچ گیا۔

غرض فرماتا ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ آگ اُن کے دلوں پر خوب بھڑکائی جائے گی اور پھر وہ آگ چاروں طرف سے بند ہوگی۔ اُس کے شعلے اُن کی ایڑی سے لے کر چوٹی تک پہنچیں گے اور اُنہیں جھلس کر رکھ دیں گے۔

فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ۔ یہ عَلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور کا حال واقعہ ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ مُوْثَقِيْنَ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ کفار کا یہ حال ہوگا کہ جب آگ اُن پر

بھڑکائی جائے گی تو وہ بڑے بڑے اُونچے ستونوں سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ جس طرح ستون سے اگر کسی شخص کو باندھ دیا جائے تو اُس کا جسم اکڑا رہتا ہے اور باوجود کوشش کے وہ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا اِسی طرح فرماتا ہے ہم اِن کفار کو ایسا عذاب دیں گے کہ وہ باوجود کوشش اور خواہش کے اُس عذاب سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں پائیں گے چنانچہ یہ پیشگوئی اِس رنگ میں پوری ہوئی کہ اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے اپنے بیٹے، بھائی دوست اور رشتہ دار سب مسلمان ہو گئے۔ کوئی اَور قوم ابتداء میں مسلمان ہوتی تو شاید اُن کو اتنی تکلیف نہ ہوتی مگر جب اُن کے اپنے جگر گوشے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تو یہ اُن کے لئے ایسی ہی بات تھی جیسے کسی کو اونچے ستون سے باندھ دیا جائے اور وہ حرکت تک نہ کر سکے۔ اُونچے ستونوں کے الفاظ اِس لئے استعمال کئے گئے کہ عام طور پر سنگساری اور جلانے کے لئے کمر تک گڑی ہوئی لکڑی یا ستون سے باندھا کرتے تھے۔ بڑے ستون کہکر بتایا کہ جسم کا اُوپر کا حصہ بھی جکڑا ہُوا ہوگا۔

فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ کے دو معنے ۲۱۱

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ کو مُّؤۡصَدَۃٌ کی صفت قرار دیا جائے۔ مُمَدَّدَۃٌ کے معنی چونکہ مُطَوَّلَۃٌ کے ہیں اِس لئے اِس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ بڑے بڑے لمبے ستونوں میں آگ جل رہی ہوگی یعنی جس بھٹی میں وہ جلائے جائیں گے وہ بہت بلند ہوگی اور لمبے ستونوں سے بنی ہوئی ہوگی۔ یہ قاعدہ ہے کہ جتنی لمبی بھٹی ہوتی ہے اُتنی آگ زیادہ تیز ہوتی ہے پس فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ میں ایک طرف تو اُس آگ کی شدت بیان کی گئی ہے کہ وہ انتہاء درجہ کی حِدّت اپنے اندر رکھتی ہوگی اور دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ کفار کی حالت ایسی ہوگی جیسے ستونوں سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بچنے کی بہت کوشش کریں گے مگر انہیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی۔ چنانچہ آخر یہی حالت کفارِ مکہ کی ہو گئی جب اُنکے اپنے بیٹے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو اُن کی بات کون سنتا تھا۔ اگر وہ اُن سے کہتے بھی کہ تم ہم میں پھر واپس آجاؤ اور اپنا آبائی مذہب اختیار کر لو تو اُن کی بات ماننے کے لئے کون تیار ہو سکتا تھا۔ یہ ایمان کا معاملہ تھا اِس میں کسی باپ یا ماں کا کیا دخل تھا اور کون شخص اُن کی بات مان سکتا تھا۔

غرض فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ اُن کے لئے عذاب کی بھٹیاں بڑی بڑی اُونچی بنائی جائیں گی اور یہ بھی کہ وہ بالکل بے کس اور بے بس ہو جائیں گے۔ اُنہیں عذاب پہنچے گا مگر وہ سر سے پاؤں تک بندھے ہوئے ہوں گے کچھ کر نہیں سکیں گے ؁

کلیدِ مضامین

○

اشاریہ

مرتبہ

سید عبدالحی ایم اے

اشاریہ

جلد نہم

ٹو

کلیدِ مضامین

جلد نہم

ا

فضائل

تعلیم

ہستی باری تعالیٰ

صفات باری تعالیٰ

الہام نیز دیکھئے وحی

الہام کی تعریف

الہام اور وحی میں فرق

الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

(جو اس جلد میں مذکور ہیں)

ب

بُرائی

بہائیت

ج

خ

ذ

ر

ژ

ش

ص

ط

علمِ ہیئت

عمل

○

غ

ف

فقہ

ق

قبض و بسط

قرآنِ کریم

نزول

مقصدِ نزول

قراآتِ مختلفہ

ترتیب

صداقت

تعلیم

ژ

کشف

ز

کفّارہ

کفر

کلام اللہ

م

سچے مسلمان

موجودہ مسلمان

تنزل کا علاج

غرض بعثت

اسماء

پ

ت

ٹ

ث

○

ف

ق

ک

گ

○

ل

م

مقام

فضائل

عشقِ الٰہی

خُلقِ عظیم

ن

انڈیکس کی تیاری میں معاونت

۱۔ فضل کریم صاحب تبسم شاہد

۲۔ طاہر محمود احمد صاحب شاہد

مقامات

ق

ک

ن

و

ہ

ی

حَلّ اللّغات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر بحر محیط لابی حیان ۲۰۹

روح البیان ۵۳۸

تفسیر ابن کثیر ۱۵۵، ۱۵۶، ۲۹۹، ۳۲۵، ۳۹۱

تفسیر خازن ۲۰۴

تفسیر فتح البیان ۱۴۴، ۱۵۳، ۲۲۸، ۲۹۹،
۳۵۳، ۳۵۹، ۳۹۷، ۵۲۲

تفسیر قرطبی ۱۵۱

تفسیر الکشاف للزمخشری ۲۰۰

۵۲ LEAVES FROM THREE DIFFRENT QURANS

حدیث

جامع صحیح بخاری ۶۸، ۱۰۴، ۱۵۱، ۱۷۳،
۲۲۲، ۳۲۶، ۳۴۲، ۴۹۰، ۵۵۶

صحیح مسلم ۱۲۶، ۱۵۱، ۲۹۷، ۳۲۶، ۳۴۲، ۵۲۴

جامع صحیح ترمذی ۵۲۴، ۳۹۷

سنن ابی داؤد ۳۲۵، ۱۵۱

سنن ابن ماجہ ۱۵۱

سنن نسائی ۵۲۴

مشکوٰۃ المصابیح ۳۱۸

الجامع الصغیر ۲۰۴

مسند احمد بن حنبل
۹۳، ۲۲۰، ۲۹۹، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۴۰، ۳۴۶

مجمع البحار ۳۰۹، ۳۲۳، ۳۱۹

تشبیہ المبانی ۳۳۹

سیرت

سیرت ابن ہشام ۱۰۴

اسلامیات

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کتب اہلِ کتاب

اخبارات ورسائل

لغت وادب

متفرق

◎